وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

تیسیر القرآن (اردو)

صحیح احادیث کی روشنی میں

TAISEER UL QURAN

ترجمہ و تفسیر مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبۃ السلام سٹریٹ نمبر ۲۰ وسن پورہ لاہور

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (القمر)

تیسیر القرآن

(اردو مفصل)

جلد چہارم

سورۃ الزمر تا سورۃ الناس

مترجم و مفسر

فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ

تقدیم
الشیخ عبدالوکیل علوی حفظہ اللہ

اشراف
ڈاکٹر حبیب الرحمن کیلانی حفظہ اللہ

مکتبۃ السلام سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تیسیر القرآن (اردو مکمل)

اس تفسیر کی 4 جلدیں ہیں۔

- جلد اول سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام
- جلد دوم سورۃ الاعراف تا سورۃ الکہف
- جلد سوم سورۃ مریم تا سورۃ ص
- جلد چہارم سورۃ الزمر تا سورۃ الناس

ترجمہ و تفسیر —— مولانا عبدالرحمن کیلانیؒ

خطاطی قرآن مجید —— مولانا عبدالرحمن کیلانیؒ

تعداد —— 2200

طبع —— محرم الحرام 1432ھ

کمپوزنگ —— اشرف خلیل / حسن مدنی

اہتمام —— پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی

ناشر —— ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمن کیلانی ، انجینئر حافظ عتیق الرحمن کیلانی

مطبع —— انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور فون: 37232400

ہدیہ —— 660 روپے

ناشر: مکتبۃ السلام

سٹریٹ نمبر 20، وسن پورہ لاہور فون: 042-37844157 , 0321-8869902

ملنے کا پتہ

دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور

لندن • ہیوسٹن • نیویارک

ہیڈ آفس و مرکزی شوروم 36 - لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 711 1023 , 711 0081 , 723 2400 , 724 0024 فیکس: 735 4072

E-mail: darussalampk@hotmail.com Website: www.dar-us-salam.com

شوروم اردو بازار اقرأ سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 712 0054 فیکس: 732 0703

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید ولد آدم اجمعین۔ اما بعد

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جو ایک فرد ہونے کے باوجود ایک جماعت کا کام کرتے ہیں قرآن مجید کے بہترین خوش نویس ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں لغت عرب اور فہم قرآن کی دولت بھی وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی۔ مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب انہوں نے اپنی بے نظیر کتاب "مترادفات القرآن" لکھی اور نظر ثانی کیلئے مجھے دی۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن مجید میں ایک معنی میں استعمال ہونے والے متعدد الفاظ کے مفاہیم اور مواقع استعمال کا فرق بیان کیا ہے۔ مثلاً بیٹھنے کے لیے قرآن میں تین الفاظ 'جَلَسَ' 'قعد' 'جثا' آتے ہیں ان کا باہمی فرق کیا ہے؟ ایک ہزار سے زائد صفحات کی یہ کتاب قرآن مجید پر ان کی گہری نظر اور باریک بینی کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس تصنیف سے میری حقیری متاع علم میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ منکرین حدیث کے رد میں مختلف مجلات میں ان کے شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ آئینہ پرویزیت اپنے موضوع کی لاجواب کتاب ہے۔ اور میں ہر طالب علم کو اس کے مطالعہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں جو سب کی سب نہایت مفید ہیں۔

سلسلہ تصنیف کے ساتھ ساتھ انہوں نے قرآن کی تعلیم کے لئے وسن پورہ لاہور میں لڑکیوں کا ایک بہترین ادارہ "مدرسہ تدریس القرآن والحدیث" قائم کیا جو اب بہت بڑا دارالعلوم بن چکا ہے اور ہزاروں خواتین کو قرآن وحدیث کی تعلیم سے آراستہ کر چکا ہے اور آراستہ کر رہا ہے۔

مجھے مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب سے کئی چیزوں میں ہم مشربی کی وجہ سے بہت محبت تھی۔ اس دور میں جب اچھے اچھے سمجھدار لوگ سوشلزم کو تو کفر کہتے ہیں ۔ حتیٰ کہ اسے اسلامی سوشلزم کے نام سے بھی قبول کرنے کو تیار نہیں مگر جمہوریت (جس میں اللہ کا حکم ماننے کی بجائے عوام کا قانون چلتا ہے) کو یہ لوگ کسی صورت کفر کہنے کو تیار نہیں بلکہ اس باطل نظام کو جو پاکستان بلکہ دنیا بھر میں نفاذ اسلام کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں مولانا عبدالرحمٰن کیلانی وہ مرد حق گو تھے جنہوں نے "خلافت و جمہوریت" لکھ کر ثابت کیا کہ یہ دونوں الگ الگ نظام ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

قدرتی طور پر اس عقیدہ کا حامل شخص جہاد سے لاتعلق نہیں رہ سکتا چنانچہ جب افغانستان میں جہاد شروع ہوا تو مولانا کافی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بنفس نفیس دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے نورستان پہنچے اور انہوں نے اس سفر کی روئیداد بھی "سرگزشت نورستان" کے نام سے لکھی اس کے بعد ان کی جہاد اور مجاہدین سے محبت اور معاونت میں مزید

اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انہی ایام میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے اور اس کے لیے انہوں نے اپنی تمام مصروفیات کو تقریباً تقریباً ختم کر رکھا تھا۔ حتی الوسع وہ کسی پروگرام میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے حتی کہ انہوں نے مرکز الدعوۃ والارشاد کے پروگراموں میں بھی آنا کم کر دیا۔ ایک دفعہ مرکز کے نوجوانوں نے اپنے ایک پروگرام میں بلانے کے لیے مجھے ان کے پاس بھیجا۔ فرمانے لگے میں ضرور حاضر ہوتا مگر اس وقت ایک نہایت ضروری کام کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مکمل کر جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش پوری فرمائی۔ " تیسیر القرآن "مکمل ہو گئی اس تفسیر کا مطالعہ کرنے والے اس کے حسن سے تبھی آگاہ ہو سکیں گے جب وہ تفسیر سے پہلے بلکہ تفسیر سے زیادہ قرآن مجید کے ترجمے پر نظر رکھیں گے۔ اگر ان کے ترجمے کا وہ دوسرے تراجم سے موازنہ کریں تو وہ مصنف کی محنت اور دیدہ ریزی کے اور زیادہ معترف ہوتے نظر آئیں گے۔

جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے تو یہ ایک جامع تفسیر ہے جس میں آیات کا مطلب قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عقائد پر مشتمل آیات کی تفسیر میں توحید' آخرت' اعتصام بالکتاب والسنہ اور دوسرے اسلامی عقائد واضح اور مدلل طریقے سے سمجھاتے ہیں۔ باطل فرقوں مثلاً اسلام کے نام پر شرک وبدعت پھیلانے والے منکرین حدیث اور عقل پرستوں کے غلط نظریات وعقائد کی دل نشین دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے۔ جہاں احکام کی آیات آتی ہیں وہاں احکام کی تفصیل بیان کی ہے جس میں طوالت سے اجتناب کیا ہے مثلاً زکوۃ' صوم' حج' جہاد' مسئلہ غلامی' علم میراث وغیرہ۔ کسی آیت پر کوئی اعتراض پیدا ہوتا ہے تو اس کا جواب دیا ہے۔ جا بجا آیات سے حاصل ہونے والے نکات ومسائل اور مزید فوائد اختصار سے درج کیے ہیں اور خاص خوبی یہ ہے کہ یہ تفسیر ہر قسم کی فرقہ پرستی' مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہے۔ میں ہر بھائی سے جو قرآن سمجھنا چاہتا ہے۔ اس تفسیر کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے حسن قبول عطا فرمائے اور مصنف مرحوم اور اور ان کی کے جانشینوں کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین

عبدالسلام بن محمد۔

جامعہ الدعوۃ الاسلامیۃ۔ مرکز طیبہ مرید کے ۱۳ محرم ۱۴۲۳ھ

هدیه تشکر

نزول قرآن کے وقت سے لے کر آج تک تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے قرآن کریم کی تفاسیر لکھی جارہی ہیں اور یقیناً آئندہ بھی لکھی جاتی رہیں گی۔ یہ حقیقت تفسیر قرآن کی ضرورت واہمیت کی واقعاتی دلیل ہے۔ قرآن مجید کی تشریح وتوضیح کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کے سپرد کی اور سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا ﴿وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم﴾ (۱۶:۴۴) چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے مختلف آیات کا مفہوم واضح کیا اور انہیں عملی نمونہ بھی بن کر دکھایا۔

زیر نظر کتاب "تیسیر القرآن" میں بھی مصنف مرحوم نے پوری کوشش کی ہے کہ صحیح احادیث کے حوالے ہی سے تفسیر کی جائے۔ کوئی بھی غیر معتبر یا موضوع روایت کو انہوں نے دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا۔ مصنف مرحوم کی لکھی ہوئی تفسیر کو طباعت سے قبل پھر تخریج کی چھلنی سے گزارا گیا۔ اوران کی اسانید ومتون کو درست کیا گیا۔ یہ کام محترم عبدالوکیل علوی صاحب کے تعاون سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے میں وہ ڈھیروں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد محترم قارئین نے بھی ہمیں بعض تسامحات کی نشاندہی کی۔ جس کے نتیجہ میں دوسرے ایڈیشن میں مزید خوبیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ مثلاً صحابی رسول ثعلبہ بن حاطب کا زکوٰۃ دینے سے ٹال مٹول کرنے کا قصہ جو کہ بعض کتب تفاسیر میں درج ہے۔ اس کا علمائے سلف کی تفاسیر میں مجھے کوئی ماخذ نہ مل سکا۔ اس لیے بندہ ناچیز نے اس کو جلد دوم اور جلد سوم دونوں میں سے حذف کر کے اس کی جگہ اسی موضوع کی تائید کرنے والی دوسری احادیث درج کیں۔ اسی طرح کچھ دوسری تبدیلیاں بھی کیں جن سے قارئین کے اذہان میں بعض شکوک وشبہات پیدا ہوسکتے تھے۔ آج جبکہ یہ کام اللہ کے فضل وکرم سے پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے تو میں اپنے عزیز حسن مدنی کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کے مفید مشوروں سے تیسیر القرآن کی پہلی جلد طبع ہوئی۔ اور ہمارا کام سہل ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد محترم قارئین کی روزافزوں حوصلہ افزائیوں سے آج یہ کام مکمل ہوسکا۔

محترم حافظ عبدالسلام بھٹوی صاحب بھی نہایت شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے میری درخواست پر چند دنوں میں تفسیر کے لئے تقریظ لکھی۔ ابوالحسن مولانا مبشر احمد ربانی صاحب جن سے میں وقتاً فوقتاً حوالہ جات کی تصحیح کیلئے رابطہ کرتا رہا۔ اور ہر وقت ہی انہیں تعاون پر آمادہ پایا۔ اسی طرح پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب جنہوں نے "تیسیر القرآن" کیلئے مختصر تعارف لکھا۔ جسے بیک ٹائٹل کی زینت بنادیا گیا ہے۔ اس کے بعد محترم حافظ عبدالعظیم صاحب بھی حسن طباعت پر یقیناً شکریہ کے مستحق ہیں اور اشرف خلیل صاحب جنہوں نے اس کی کمپوزنگ کا کام مکمل کیا ہے۔ آخر میں اپنے تمام بہن بھائیوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے ...... تیسیر القرآن کی طباعت کے دوران ہر معاملہ میں مجھ سے تعاون کیا اور مجھے مفید مشورے بھی دیئے۔

جن جن لوگوں نے اس کار خیر میں حصہ لیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آخر میں والد گرامی جناب مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے شب وروز کی محنت سے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس تفسیر کو اتنے آسان اور عام فہم زبان میں مکمل کیا۔ جو بھی اس کو دیکھتا یا پڑھتا ہے اسی وقت اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف مرحوم کی اس کاوش کو قبول کرے۔ ان کی تفسیر اور دوسری تصانیف کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے اور ان کی قبر کو روضۃ من ریاض الجنۃ بنائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری والدہ مرحومہ کو بھی کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ جن کے تعاون سے مصنف مرحوم ایسا عظیم کام سرانجام دے سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ اس تفسیر کو مصنف مرحوم کے لواحقین کے لئے خصوصاً اور عامۃ الناس کے لئے بھی راہ نجات بنائے۔ آمین

پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی۔ جامع مسجد الایمان۔ شاہ فرید آباد ملتان روڈ لاہور

فہرست مضامین تیسیر القرآن

سورۃ الزمر تا سورۃ الناس

سورۃ الزمر مکیۃ ۳۹ — ۷۵ آیاتھا — رکوعھا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ② اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا

کلمات ۱۱۸۴ — آیات ۷۵ (۳۹) سورۃ الزمر مکی ہے (۵۹) رکوع ۸ — حروف ۴۹۶۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

یہ کتاب اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والے کی طرف سے نازل شدہ[1] ہے۔(۱) ہم نے اس کتاب کو آپ کی طرف حق[2] کے ساتھ نازل کیا ہے لہٰذا آپ خالصتاً اس کی حاکیت تسلیم کرتے ہوئے صرف اسی کی عبادت کیجئے(۲) یاد رکھو! بندگی[3] خالصتاً اللہ ہی کیلئے ہے اور جن لوگوں نے اللہ کے علاوہ کارساز بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ[4]

[1] مکی سورۃ کا آغاز عموماً ایسی ہی آیات سے ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کفار مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور کلام کو منزل من اللہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس آیت میں ایک تو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب نبی کی اپنی تصنیف نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ سب سے زبردست ہے اور اپنے فرامین واحکام کو نافذ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ چونکہ حکیم ہے لہٰذا اس کا یہ کلام بھی حکمتوں سے لبریز ہے۔

[2] یعنی یہ کتاب اس لئے نازل نہیں کی گئی کہ اس کی آیات کا مذاق اڑایا جائے بلکہ اس لئے اتاری ہے کہ اس سے مثبت اور تعمیری نتائج حاصل ہوں جنہیں سب لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس میں مذکور ہے

وہ ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔

[3] دین کا لفظ چار معنوں میں آتا ہے۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی مکمل سیاسی اور قانونی حاکیت کو تسلیم کیا جائے۔ (۲) دوسرا معنی اس کے بالکل برعکس ہے یعنی اپنے آپ کو ہمہ وقتی اللہ کا غلام سمجھا جائے اور صرف اسی کی عبادت کی جائے، (۳) قانون جزا و سزا (۴) اور اس قانون جزا و سزا کے مطابق اچھے اور برے لوگوں کو بدلہ دینا۔ آیت نمبر ۲ اور ۳ میں دین کا لفظ اپنے پہلے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

[4] ✿ توسل اور اللہ کا قرب ڈھونڈنا:۔ غیر اللہ کو پکارنے اور ان کے حضور نذر و نیاز پیش کرنے کے سلسلہ میں مشرکوں کی دلیل ہمیشہ یہ ہوا کرتی ہے کہ ہم یہ کام اس لئے کرتے ہیں کہ یہ چھوٹے خدا ہماری معروضات بڑے خدا تک پہنچا دیں۔ ہماری اللہ کے حضور سفارش کریں۔ ہم ان کی عبادت نہیں کرتے بلکہ ہم نے انہیں صرف اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا وسیلہ یا ذریعہ بنالیا

ہے۔ یہ جواب تو دور نبوی کے مشرکوں کا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ آج امت مسلمہ کا بھی بالکل یہی حال ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو مقام مشرکوں کے نزدیک اپنے بتوں کا تھا وہی مقام مسلمانوں کے نزدیک ان کے پیروں یا مشائخ کا ہے اور دوسرا فرق یہ ہے کہ مشرکوں کو تو بتوں کی نیاز مندی کے آداب و اطوار شیطان نے سمجھائے تھے۔ مگر مسلمانوں کے مشائخ خود اپنے مریدوں کو یہ آداب و اطوار بتاتے ہیں۔ ان پیروں اور بزرگوں نے شرک کی منزلیں طے کرانے کے لئے تین درجے مقرر کر رکھے ہیں۔ (۱) فنا فی الشیخ، (۲) فنافی الرسول اور (۳) فنافی اللہ۔

❁ تصور شیخ اور سلوک کی منزلیں:۔ فنافی الشیخ کے درجہ کی ابتدا تصور شیخ سے کرائی جاتی ہے۔ تصور شیخ سے مراد صرف پیر کی "غیر مشروط اطاعت" ہی نہیں ہوتی بلکہ اسے یہ بات باور کرائی جاتی ہے کہ اس کا پیر ہر وقت اس کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔ اور بوقت ضرورت ان کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اس عقیدہ کو مرید کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے اسے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ ہر وقت پیر کی شکل کو اپنے ذہن میں رکھے۔ یہی واہمہ اور مشق بسا اوقات ایک حقیقت بن کر سامنے آنے لگتا ہے اور صورت یہ بن جاتی ہے کہ:

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار ...... جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ان حضرات نے پیری کے فن کو خاص تکنیک دے کر عوام پر اس طرح مسلط کر دیا ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک اللہ کے ہاں رسائی نہیں پا سکتا۔ جب تک باقاعدہ کسی سلسلہ طریقت میں داخل نہ ہو۔ پہلے تصور شیخ کی مشق کرے۔ حتیٰ کہ فنافی الشیخ ہو جائے۔ یعنی اسے اپنی ذات کے لئے حاضر ناظر، افعال و کردار اور گفتار کو سننے والا اور دیکھنے والا سمجھنے لگے تب جا کر یہ منزل ختم ہوتی ہے اور عملاً ہوتا یہ ہے کہ مرید بیچارے تمام عمر فنافی الشیخ کی منزل میں ہی غوطے کھاتے کھاتے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا اللہ اور اس کے رسول سے بیگانہ کر کے اپنا غلام بنانے کا کارگر اور کامیاب حربہ ہے۔ یہ حضرات کس طرح اللہ سے بھی زیادہ اپنی پرستش کی تاکید کرتے ہیں یہ بات درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیے جو تصور شیخ، غیر اللہ کو پکارنا، توسل اور استمداد جیسے سب مسائل حل کر دیتا ہے۔

❁ اللہ کی بجائے مصیبت میں یا جنید پکارنے کی تلقین:۔ اس کے راوی جناب اعلیٰ حضرت رضا خان بریلوی ہیں۔ فرماتے ہیں "غالباً حدیقہ ندیہ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سیدی جنید بغدادی دجلہ پر تشریف لائے اور یا اللہ کہتے ہوئے اس پر زمین کی طرح چلنا شروع کر دیا۔ بعد میں ایک شخص آیا۔ اسے بھی پار جانے کی ضرورت تھی کوئی کشتی اس وقت موجود نہ تھی۔ جب اس نے حضرت کو جاتے دیکھا؟ عرض کیا: میں کس طرح آؤں؟ فرمایا یا جنید! یا جنید کہتا چلا آ۔ اس نے یہی کہا اور دریا پر زمین کی طرح چلنے لگا جب بیچ دریا میں پہنچا۔ شیطان لعین نے دل میں وسوسہ ڈالا کہ حضرت خود یا اللہ کہیں اور مجھ سے یا جنید کہلواتے ہیں۔ میں بھی کیوں نہ یا اللہ کہوں؟

❁ اللہ کے قرب کی بجائے دور رکھنے کا طریقہ:۔ اس نے یا اللہ کہا اور ساتھ ہی غوطہ کھایا۔ پکارا یا حضرت میں چلا۔ فرمایا: وہی کہہ یا جنید! یا جنید! جب کہا دریا سے پار ہوا۔ عرض کیا حضرت! یہ کیا بات تھی۔ آپ یا اللہ کہیں تو پار ہوں اور میں کہوں تو غوطہ کھاؤں؟ فرمایا: اے نادان! ابھی تو جنید تک تو پہنچا نہیں، اللہ تک رسائی کی ہوس ہے۔ اللہ اکبر" (ملفوظات مجدد مائۃ حاضر حضرت احمد رضا خان بریلوی ص ۱۱۷)

❁ پیر کس طرح اپنی پرستش کرواتے ہیں:۔ دیکھا آپ نے پیر کو وسیلہ پکڑنے کی کتنی زبردست دلیل ہے جو امام اہل سنت،

لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ
هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾ لَوْ أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ

سے قریب کر دیں۔ جن باتوں میں یہ اختلاف[۵] کر رہے ہیں یقیناً اللہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا اللہ ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور حق کا منکر[۶] ہو۔(۳)

اللہ اگر کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو وہ اپنی مخلوق سے جسے چاہتا چن[۷] سکتا تھا مگر وہ تو ایسی باتوں سے پاک ہے وہ یکتا

موجودہ صدی کے مجدد صاحب غالباً "حدیقہ ندیہ" کے حوالہ سے پیش فرما رہے ہیں۔ اور واقعہ بھی ایسا لاجواب گھڑا ہے کہ اس بیچارے کو تسلیم کرنا پڑا کہ میر اللہ کو پکارنا واقعی شیطانی وسوسہ تھا۔ یہ ہیں تصور شیخ جیسی بدعت کے کرشمے۔ یہ لوگ ایسے افسانے تراش تراش کر لوگوں کو شرک میں مبتلا کرتے اور اللہ سے دور رکھتے اور فی الحقیقت اپنی پرستش کراتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے خود جو اپنے قرب کا وسیلہ بتایا وہ درج ذیل قدسی حدیث سے واضح ہوتا ہے:

قرب الٰہی کا حقیقی وسیلہ اس کے نیک اعمال ہیں:۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں کیسے تیری عیادت کرتا جبکہ تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے وہاں پالیتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تو نے کھانا نہ دیا۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا۔ تو تو رب العالمین ہے؟ پروردگار فرمائے گا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو تو نے اسے کھانا نہ کھلایا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اس کا اجر میرے ہاں پالیتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ کہے گا کہ میں تجھے کیونکر پانی پلاتا، تو تو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے اسے پانی نہ پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلاتا تو اس کا اجر میرے ہاں پالیتا" (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب۔ باب فضل عیادۃ المریض)

[۵] پھر صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے عقائد پر جمے ہوئے ہیں بلکہ اگر انہیں سمجھایا جائے تو مخالفت پر اتر آتے ہیں اور اسے ولیوں کے منکر یا گستاخ کا طعنہ دیتے ہیں۔ ایسے اختلافات دنیا میں مٹ نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ معاملہ غور و فکر اور افہام کا نہیں بلکہ ضد اور چڑ کا بن جاتا ہے پھر کچھ دنیوی مفادات کا بھی دھندا چلتا ہے۔ لہٰذا ان اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ ہی کرے گا۔ اور وہاں ہر ایک کو ٹھیک سمجھ آجائے گی

[۶] یہ مشرک جھوٹے تو اس لحاظ سے ہیں کہ ان کے سب عقیدے من گھڑت ہوتے ہیں۔ اور حق کے منکر اس لحاظ سے کہ بات سمجھنے کی بجائے ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آتے ہیں۔ اور اگر کفار کا معنی ناشکر گزار کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کھاتے تو اللہ کا دیا ہوا رزق ہیں اور ان کی ہر طرح کی نیاز مندیاں اللہ کے بجائے دوسروں کے لئے وقف ہوتی ہیں۔

[۷] یہ دراصل مشرکوں کے اس عقیدہ کا جواب ہے جو کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ حالانکہ اپنے لئے بیٹیاں انہیں ناگوار ہیں۔ انہیں جواب یہ دیا گیا کہ اللہ کے لئے تو اولاد ہونا ہی محالات سے ہے۔ اس لئے کہ باپ اور بیٹے میں جنسی اور نوعی اشتراک

الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى
الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِّنْ
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۭ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ

ہے، سب پر غالب ہے(۴) اس نے زمین و آسمان کو حق[۸] کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا۔ ہر ایک، ایک مقررہ وقت تک یونہی[۹] چلتا رہے گا۔ یاد رکھو! وہی سب پر غالب[۱۰] اور بخش دینے والا ہے۔(۵) اس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اس سے اس کی بیوی[۱۱] بنائی اور تمہارے لیے مویشیوں سے آٹھ[۱۲] نر و مادہ پیدا کئے وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں،

ہوتا ہے۔ نیز بیٹا نہ باپ کا مملوک ہوتا ہے نہ مخلوق۔ جبکہ سب چیزیں اللہ کی مملوک و مخلوق ہیں۔ لہٰذا ان میں کسی قسم کا اشتراک ناممکن ہے۔ اور اگر بفرض محال اللہ اولاد بناتا تو پھر کیا بیٹیاں ہی اپنے لئے انتخاب کرتا؟ جیسا کہ تم کہتے ہو جبکہ تم انہیں اپنی ذات کے لئے قطعاً پسند نہیں کرتے۔

[۸] یعنی زمین و آسمان یا کائنات کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا بلکہ اس میں بے شمار حکمتیں ہیں اور ان کی تخلیق سے کثیر مقاصد حاصل ہو رہے ہیں۔

[۹] ❁ گردش لیل و نہار میں دلائل توحید:۔ یعنی شام کے وقت اگر مغرب کی طرف نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ادھر سے اندھیرا اوپر کو اٹھ رہا ہے۔ جو بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ تا آنکہ سیاہ رات چھا جاتی ہے۔ اسی طرح صبح کے وقت اجالا مشرق سے نمودار ہوتا ہے۔ جو بتدریج بڑھ کر پورے آسمان پر چھا جاتا ہے۔ اور سورج نکل آتا ہے تو کائنات جگمگا اٹھتی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹا جا رہا ہے۔ دن کو روشن کرنے اور رکھنے والی چیز سورج ہے۔ اور چاند رات کو روشنی دیتا ہے۔ یہ سورج اور یہ چاند جب سے پیدا کئے گئے ہیں۔ انسان کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور انسانوں کو ان سیاروں سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نظام شمس و قمر بھی ابدی نہیں ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ان کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔

[۱۰] اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز سے زبردست اور ان سب پر غالب ہے جو ایسے عظیم الجثہ کروں سے اپنی حسب پسند کام لے رہا ہے اور وہ بخش دینے والا یہاں اس نسبت سے مذکور ہے کہ حضرت انسان نے اس دنیا جو فتنہ و فساد بپا کر رکھا ہے اس کا تو یہی تقاضا ہے کہ یہ نظام درہم کر کے انسانوں کو تباہ کر دیا جائے۔ مگر وہ عفو و درگزر سے کام لے رہا ہے۔

[۱۱] یہ توحید باری پر دوسری دلیل ہے کہ وہ تم سب کا خالق ہے۔ بظاہر الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس واحدہ یعنی سیدنا آدم سے تمہیں پیدا کیا پھر اس کے بعد اس کی بیوی بنائی مگر یہاں ترتیب زمانی کے بجائے ترتیب بیان کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ایسی مثالیں ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر اس سے اس کی بیوی کو، پھر ان دونوں سے نسل چلا کر تمہیں پیدا کیا۔

[۱۲] ❁ مویشیوں کے آٹھ جوڑے جن میں اہل عرب شرک کرتے تھے:۔ یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، یہ چار نوع ہیں ان

أُمَّهَٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِى ظُلُمَٰتٍ ثَلَٰثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ ٱللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ ٱلْمُلْكُ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ
تُصْرَفُونَ ﴿٦﴾ إِن تَكْفُرُوا۟ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ عَنكُمْ ۖ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ ٱلْكُفْرَ ۖ وَإِن تَشْكُرُوا۟ يَرْضَهُ

تین تاریک پردوں میں، ایک کے بعد دوسری شکل دیتے ہوئے پیدا کرتا[۱۳] ہے۔

یہ ہے اللہ (ان صفات کا) تمہارا پروردگار، بادشاہی اسی کی ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پھر تم کہاں سے پھیر دیئے[۱۴] جاتے ہو؟(۶) اگر تم کفر کرو گے تو اللہ یقیناً تم سے بے نیاز ہے (لیکن) وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا۔ اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے[۱۵] ہی لئے پسند کرتا ہے۔

کے نر و مادہ ملا کر کل آٹھ جوڑے ہوئے۔ اور ان کا ذکر پہلے سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۴۳ کے تحت گزر چکا ہے یہی چار نوع یا آٹھ جوڑے تھے جو اہل عرب پالتے تھے۔ اور انہیں میں ان کی شرکیہ رسوم جاری تھیں۔ اسی لئے ان کا ہی ذکر کیا گیا جبکہ ہمارے ہاں اونٹ بہت کم ہوتا ہے اور دودھ وغیرہ کی اغراض کے لئے گائے کے بجائے بھینسیں زیادہ پالی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ان جانوروں کا دودھ مزاروں پر چڑھایا جاتا ہے۔

[۱۳] ❁ تین تاریکیوں میں جنین کی پیدائش:۔ اللہ تعالیٰ کے حیرت انگیز کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ ہر جنین کی، خواہ وہ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا تین تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر پرورش ہوتی ہے اور تینوں پردے اس جنین کو بیرونی آفتوں سے محفوظ رکھتے ہیں تب جاکر جنین پیدا ہونے کے قابل بچہ بنتا ہے۔ ان میں پہلا پردہ ماں کا پیٹ ہے دوسرا پیٹ کے اندر رحم اور تیسرا رحم کے اندر جھلی جس میں جنین ملفوف اور محفوظ ہوتا ہے۔ پھر اس عرصہ میں اس جنین پر کئی مراحل اور اطوار گزرتے ہیں۔ پہلے وہ نطفہ ہوتا ہے۔ پھر منجمد خون ہے پھر گوشت کا لوتھڑا، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے بعد ازاں اس کی شکل و صورت بنتی ہے اور یہ سب کچھ تین تاریکیوں کے اندر ہی ہوتا رہتا ہے۔ تاآنکہ وہ جنین مقررہ وقت کے بعد انسان کی شکل و صورت لے کر ماں کے پیٹ سے باہر آجاتا ہے۔

[۱۴] ❁ جاہل عوام کو شرک کی گمراہیوں میں پھنسانے والے حضرات:۔ تمہارے پروردگار کی یہ صفات ہیں کہ وہی تمہارا خالق ہے وہی تمہاری پرورش کرنے والا ہے اور وہی تمہارا اور ساری کائنات کا مالک ہے۔ لہٰذا وہی تمہاری نیاز مندیوں، نذروں نیازوں، قربانیوں اور عبادات کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اب تم جو اللہ کے علاوہ دوسروں کے لئے یہ افعال بجا لاتے ہو تو بتاؤ کیا یہ سیدھی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی اور وہ کون لوگ ہیں جو تمہیں اس سیدھی سی بات سے پھیر کر غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اور یہ تو واضح بات ہے کہ اس سیدھی سی بات سے بہکانے والے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے کچھ اپنے دنیوی مفادات ایسے غلط راستوں سے وابستہ ہوں اور یہ لوگ ہوتے ہیں مندروں کے گرو اور مہنت بت خانوں کے پنڈت اور پروہت اور مزاروں کے سجادہ نشین اور مجاور حضرات جنہوں نے عوام کو طرح طرح کی داستانیں سنا کر اس جال میں پھنسا رکھا ہے۔ اور اس طرح اپنا الو سیدھا کر لیا ہے۔ لیکن جاہل عوام کو شرک کی گمراہیوں میں دھکیل رکھا ہے۔

[۱۵] ❁ شکر کے فائدے:۔ اللہ تعالیٰ کے تم پر بے بہا انعامات کے باوجود بھی اگر تم کفران نعمت کرو گے اور اس کا حق عبادت دوسروں کو دیتے رہو گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمہارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تمہارے

لَكُمْ ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا
كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ڰ

کوئی بارِ گناہ اٹھانے والا کسی دوسرے[16] کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تمہیں اپنے پروردگار کے ہاں ہی واپس جانا ہے۔ وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو بلاشبہ وہ سینوں کے راز تک جاننے والا ہے۔(۷)

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسے پکارتا ہے پھر جب وہ اسے اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو یوں بھول جاتا ہے جیسے اس سے پہلے اس نے اپنے پروردگار کو پکارا[17] ہی نہ تھا اور اللہ کے شریک بنانے لگتا ہے تاکہ (دوسروں کو بھی) اس کی راہ[18] سے بہکا دے۔ اسے کہیے کہ اپنے کفر کا تھوڑا سا فائدہ اٹھا لے۔

کفرانِ نعمت یا ایسی نمک حرامی کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے ہاں پسندیدہ بات یہی ہے کہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور اسے بھی وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے پسند کرتا ہے۔ شکر کا تمہیں فائدہ یہ پہنچے گا کہ ایک تو تمہارا پروردگار خوش ہوگا دوسرے تمہیں اور بھی زیادہ نعمتیں عطا فرمائے گا۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۷ کا حاشیہ۔

[16] یعنی اگر آج تم کسی کو راضی رکھنے کے لیے یا اس کی ناراضگی سے بچنے کے لئے کفر یا گمراہی کی راہ اختیار کرو گے تو قیامت کے دن وہ تمہارا بوجھ اٹھا نہیں لے گا۔ اس کے تو اپنے گناہوں کا بوجھ اس کے لئے وبال جان بنا ہوگا وہ تمہارا بوجھ کیسے اٹھائے گا؟ لہٰذا اللہ سے شرک اور کفرانِ نعمت کے بارے میں انتہائی محتاط روش اختیار کرو۔ دوسروں کے بہکاوے میں نہ آؤ۔ اور خود سیدھی سی بات اور سیدھی راہ کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ جن لوگوں کو آج تم نے اپنا پیشوا سمجھ رکھا ہے وہ کل تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔

[17] ❁ جمعرات کو مزاروں پر حاضری دینے والے:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک دنیادار اور جاہل قسم کے انسان کی فطرت بیان فرمائی ہے جو مزاروں پر جمعرات کو حاضری دینے میں اپنی سب سعادت سمجھتا ہے۔ اس سے زیادہ اسے نہ دین کے سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ وہ اس کے لئے کوئی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا بس اللہ کے ان پیاروں کے سہارے ہی قائم ہے۔ جو ان مقبروں اور مزاروں میں موجود زندہ ہیں اور لوگوں کی دادرسی کر رہے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہی عقیدے مشرکینِ مکہ کے اپنے بتوں سے وابستہ تھے۔ ایسے لوگوں کو جب کوئی ایسی مصیبت بن جاتی ہے کہ موت سامنے کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں اور اللہ کے پیاروں کو بھول جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سارے مشرکوں کا کبھی اس بات پر اتفاق نہیں ہو سکا کہ فی الواقع اللہ کے بعد وہ کون سی ہستی ہے۔ جو دافع البلاء ہو سکتی ہے۔ کسی کے نزدیک ایک بزرگ ہوتا ہے تو کسی کے نزدیک کوئی دوسرا بزرگ۔ البتہ اللہ کی ذات پر سب متفق ہو جاتے ہیں اور اسے پکارنے لگتے ہیں۔ پھر جب اللہ اس مصیبت سے نجات دے دیتا ہے اور انہیں سکھ چین نصیب ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کو بھول جاتے ہیں اور اب ان کی ساری نیاز مندیاں بس اللہ کے پیاروں کے لئے رہ جاتی ہیں۔

[18] پھر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسروں سے یوں کہنے لگتا ہے کہ ہمیں تو فلاں آستانے سے شفا نصیب ہوئی تھی۔ اور

إِنَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ النَّارِ ۝۸ أَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ

ع

تو یقیناً اہلِ جہنم سے ہے۔ (۸) کیا (ایسا شخص بہتر ہے) یا وہ جو رات کے اوقات قیام اور سجدہ میں عبادت کرتے گزارتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے؟ آپ ان سے پوچھئے کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر [۱۹] ہو سکتے ہیں؟ مگر ان باتوں سے سبق تو وہی حاصل کرتے ہیں جو اہلِ عقل و خرد ہوں۔ (۹) آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو، اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو جو لوگ نیک کام کرتے ہیں۔ ان کے لئے اس دنیا میں (بھی) بھلائی [۲۰] ہے۔ اور اللہ کی زمین وسیع [۲۱] ہے۔ بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بلا حساب دیا جائے گا۔ (۱۰) آپ کہئے: مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ

فلاں بزرگ کی نظر کرم کی وجہ سے ہم اس مصیبت سے بچ نکلے تھے اور فلاں بزرگ کی بارگاہ سے ہماری فلاں حاجت پوری ہوئی تھی اور ہمارے دن پھرے تھے اسی طرح دوسرے بہت سے لوگ بھی ان حضرتوں کے معتقد بن جاتے ہیں اور ہر جاہل اپنے اسی طرح کے تجربے بیان کر کر کے عوام میں گمراہی پھیلاتا جاتا ہے۔

[۱۹] اللہ کے ہاں عالم کون اور جاہل کون؟ اب ایک یہ شخص ہے جو صرف مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارتا ہے۔ اور اسے قرآن "جاہل یا نہ جاننے والے" کے نام سے پکارتا ہے۔ خواہ وہ علامۂ دہر ہو اور دوسرا وہ شخص ہے جو تنگی ترشی اور خوشحالی غرض ہر طرح کے حالات میں صرف اللہ پر ہی تکیہ کرتا ہے اور اسے ہی پکارتا ہے۔ رات کے اندھیروں میں اس کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ اسی سے ڈرتا ہے اور اسی سے اس کی رحمت کی توقع بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو "عالم یا جاننے والے" کے نام سے پکارتا ہے۔ خواہ وہ پرائمری پاس بھی نہ ہو یا ابتدائی دینی کتابیں بھی نہ پڑھا ہو۔ اور اس مفہوم کی تائید قرآن کریم کے ایک اور جملہ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰۗؤُا﴾ (۲۸:۳۵) سے بھی ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اہلِ عقل و خرد کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ بتاؤ ان دونوں کی طرز زندگی ایک جیسی ہے یا ان دونوں کا انجام ایک جیسا ہو سکتا ہے؟

[۲۰] یہاں بھلائی سے مراد صرف مال و دولت ہی نہیں اگرچہ مال و دولت بھی اس بھلائی میں شامل ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ اس دنیا میں پرہیزگاروں کو مال و دولت عطا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں مال و دولت عطا نہ کیا جائے۔ البتہ بھلائی کی اور بھی بہت سی اقسام ہیں۔ جو انہیں یقیناً حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً ایسے لوگوں کی سب ہی عزت کرتے ہیں خواہ عزت کرنے والے دیندار ہوں یا دنیادار۔ ایسے لوگوں کی بات قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی ساکھ قائم ہوتی ہے اور آخرت کی بھلائی جو بہرحال ایسے لوگوں کے لئے یقینی ہے۔

[۲۱] حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے:۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ ہجرت حبشہ سے پہلے یا اس عرصہ

أَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۱۱ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۱۲ قُلْ إِنِّيْٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۳ قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ ۝۱۴ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ۭ قُلْ
إِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ أَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝۱۵

میں خالصتاً اسی کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کی عبادت [۲۲] کروں (۱۱) اور یہ بھی کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں (۱۲) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (۱۳) آپ کہئے کہ: میں تو اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے اللہ کی عبادت [۲۳] کرتا ہوں (۱۴) تم اسے چھوڑ کر جس کی عبادت کرنا چاہتے ہو کرتے رہو (نیز) کہئے کہ اصل میں تو خسارہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارہ میں ڈال دیا۔ دیکھو! یہی بات صریح خسارہ [۲۴] ہے (۱۵)

کے لگ بھگ نازل ہوئی تھی۔ جبکہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ اور انہیں احکام اسلام کی بجا آوری میں کفار مکہ کی طرف سے سخت دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ یعنی اگر مکہ کی سرزمین یا آس پاس کا علاقہ تمہارے لئے تنگ ہو گیا ہے تو اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے کسی دوسرے ملک میں چلے جاؤ۔ جہاں آزادی سے اسلام کے احکام بجا لا سکو۔ ترک وطن کے سلسلہ میں بھی تمہیں کئی طرح کی مشکلات پیش آئیں گی اور جہاں جاؤ گے وہاں بھی ابتداءً مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ ان مشکلات کو اگر صبر و ثبات سے برداشت کرو گے تو اس کا ثواب بھی بے حساب ملے گا۔ واضح رہے کہ صبر کا تعلق ان مسلمانوں سے بھی ہے جو ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور ان سے بھی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت یا کسی دوسری وجہ سے ہجرت نہ کی بلکہ مکہ میں ہی کفار کی سختیاں سہنے کے باوجود اپنے دین پر ڈٹے رہے۔

[۲۲] ۞ <u>ہر نبی سب سے پہلے اپنی نبوت پر ایمان لاتا ہے اور احکام الٰہی کا عملی نمونہ پیش کرتا ہے</u>:۔ ہر نبی پر یہ واجب ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خود اپنی نبوت پر ایمان لائے۔ پھر دوسروں کو دعوت دے۔ اسی طرح اس پر یہ بھی واجب ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو بھی حکم نازل ہو سب سے پہلے خود اس پر عمل کرے اور اپنی ذات کو بطور نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرے پھر دوسروں کو دعوت دے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ بات کہلوائی کہ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ خالصتاً اللہ اکیلے کی عبادت کروں اور اس حکم پر سب سے پہلے میں خود سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

[۲۳] ۞ <u>شرک سے سمجھوتہ ناممکن ہے</u>:۔ آپ ﷺ کو حکم یہ ہوتا تھا کہ خالصتاً اللہ اکیلے کی عبادت کریں۔ جبکہ کفار مکہ پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ آپ ﷺ سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اور وہ سمجھوتہ اس بات پر چاہتے تھے کہ ہم آپ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے بشرطیکہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں۔ بالفاظ دیگر آپ لاالٰہ الا اللہ نہ کہیں کیونکہ یہی کلمہ ان کے بتوں کو ناکارہ ثابت کرتا تھا جسے وہ اپنی، اپنے آباء و اجداد کی اور اپنے بتوں کی توہین سمجھتے تھے۔ اور اس کلمہ سے انکار ہی اللہ کی سب سے بڑی نافرمانی تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ کی زبان سے اس کا جواب یہ دلوایا گیا کہ مجھے تو حکم ہی یہی ہے کہ اکیلے اللہ کے سوا کسی بھی معبود کو تسلیم نہ کروں۔ اور اگر میں اس حکم کی نافرمانی کروں تو میں بھی اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ لہٰذا میں ایسا کام کسی قیمت پر نہیں کر سکتا۔

[۲۴] ۞ <u>شرک سے خسارہ کے مختلف پہلو</u>:۔ یہ صریح خسارہ اس لحاظ سے ہے کہ مشرکوں کے اگر کچھ نیک اعمال ہوئے بھی تو وہ

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾
وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ
يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ

ان کے اوپر بھی آگ کے سائبان[۲۵] ہوں گے اور ان کے نیچے بھی۔ اسی بات سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہو (۱۶) جو لوگ[۲۶] طاغوت کی عبادت کرنے سے بچتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا ان کے لئے بشارت ہے لہٰذا میرے بندوں کو بشارت[۲۷] کر دیجئے (۱۷) جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں پھر اس کے بہترین[۲۸] پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی دانشمند ہیں۔ (۱۸)

شرک کی وجہ سے برباد ہو جائیں گے۔ اب ان کے صرف گناہ ہی گناہ باقی رہ جائیں گے۔ دوسرے ان کے بال بچوں کے گناہوں سے حصہ رسدی کے طور پر انہیں بھی گناہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ دنیا میں تو خسارہ کی اس طرح تلافی ہو سکتی ہے کہ بعد میں کسی وقت نفع ہو جائے۔ قیامت میں یہ صورت بھی ممکن نہ ہوگی گویا ہر طرف سے خسارہ ہی خسارہ انہیں گھیرے ہوئے ہوگا۔

[۲۵] ظُلَلٌ ظلة کی جمع ہے جس کے معنی سایہ بھی ہے، بادل بھی اور ایسا خیمہ یا سائبان بھی جس کی صرف چھت ہی چھت ہو، دیواریں نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے صریح خسارہ پانے والوں کی سزا یہ ہوگی جیسے ان کے اوپر آگ کی گھٹا چھا رہی ہو اور ان کے نیچے سے بھی ایسی آگ کی گھٹا اٹھ رہی ہو اور انہیں دونوں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لے۔

[۲۶] ❁ طاغوت کا مفہوم:۔ طاغوت کا معنی عموماً بت یا شیطان کر لیا جاتا ہے۔ ان الفاظ سے اس لفظ کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ طاغوت سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ کے مقابلہ میں اطاعت یا عبادت کی جاتی ہو یا وہ خود اللہ کے مقابلہ میں اپنی اطاعت یا عبادت لوگوں سے کروانا پسند کرتا ہو، گویا طاغوت سے مراد دنیادار چودھری اور حکمران بھی ہو سکتے ہیں کوئی ادارہ یا پارلیمنٹ بھی ہو سکتی ہے۔ بت، شیطان اور جن بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے پیر فقیر بھی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے مقابلہ میں اپنی اطاعت کروانا پسند فرماتے ہیں اور شریعت پر طریقت کو ترجیح دیتے ہیں۔

[۲۷] یہ بشارت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ہر قسم کے طاغوت کی اطاعت یا عبادت سے بچتے رہے اور تنگی ترشی میں بھی اللہ کی ہی اطاعت و عبادت کرتے رہے، اسی کی طرف رجوع کیا اور اسی پر توکل کیا۔

[۲۸] ❁ اتباع احسن سے کیا مراد ہے؟ ان لوگوں کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین کی اس صورت میں پیروی کرتے ہیں جو بہتر سے بہتر ہو۔ مثلاً نماز کی ادائیگی کی جائے تو خلوص نیت اور اللہ کی رضا اور اس کی محبت کے جذبے سے ادا کرے۔ بروقت اور باجماعت ادا کرے۔ طہارت اچھی طرح کرے۔ نماز میں خشوع و خضوع ہو اور ظاہری ارکان و آداب بھی درست ہوں۔ تو یہ نماز کی اچھی سے اچھی صورت ہے۔ اب اگر کوئی شخص نماز تو باجماعت ادا کرتا ہے لیکن نماز میں خیال بس دنیوی باتوں کے ہی آتے رہیں۔ نماز میں بے توجہی ہو۔ فضول حرکتیں بھی کرتا رہے اور سست اور ڈھیلا ڈھالا کھڑا

حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۱۹ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا
غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۲۰ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ

کیا جس شخص پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی ہو تو (اے نبی) آپ ایسے شخص کو چھڑا سکتے ہیں[۲۹] جو آگ میں گر چکا ہو۔(۱۹) لیکن جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے ان کے لئے بالا خانے ہیں جن کے اوپر اور بالا خانے بنے[۳۰] ہوئے ہیں اور ان کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کبھی اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا(۲۰)

کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے پھر زمین میں چشمے بنا کر اس[۳۱] پانی کو آگے چلا دیتا ہے۔ پھر اس سے مختلف رنگوں کی کھیتی پیدا کرتا ہے پھر وہ جوبن پر آتی ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ جاتی ہے پھر وہ اسے بھس بنا دیتا ہے۔

رہے۔ تو نماز تو اس نے بھی ادا کر لی۔ اور اللہ کے حکم کی اطاعت بھی ہو گئی مگر یہ احسن صورت نہیں۔ اور پہلے اور اس شخص کی نماز میں بہت فرق ہے۔ یہی حال تمام اعمال کا ہے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ باتیں تو سب کی سنتے ہیں مگر قبول صرف وہ بات کرتے ہیں جو ان سے بہتر ہو پھر اسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

[۲۹] یعنی جن لوگوں پر ان کے عناد، ضد اور ہٹ دھرمی اور ان کی بداعمالیوں کے سبب سے عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہو کیا وہ ہدایت کی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ بھلا ایسے بدبختوں کو جو انہی بدعنوانیوں کے باعث آگ میں پڑ چکے ہیں۔ انہیں آپ یا کوئی دوسرا راہ راست پر لا سکتا ہے اور انہیں آگ سے نکال سکتا ہے؟

[۳۰] ❁ کیا جنت اور دوزخ تیار کی جا چکی ہیں:۔ بعض دفعہ امت میں ایسی بے کار بحثیں شروع ہو جاتی ہیں جن کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن جب شروع ہو جائیں تو اہل حق کو جواباً کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔ ایسے ہی مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ آیا جنت اور جہنم تیار کی جا چکی ہیں یا قیامت کے بعد لوگوں کے جزاوسزا کے فیصلوں کے بعد تیار ہوں گی۔ کتاب و سنت کے الفاظ میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ تیار ہو چکی ہیں۔ مگر ایک فرقہ نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ قیامت کے بعد تیار ہوں گی۔ اس آیت میں لفظ مبنیة سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ بالا خانے بنائے جا چکے ہیں۔ یہاں بالا خانوں سے مراد یہ نہیں ایک مکان پر کوئی چوبارہ ہوتا ہے جیسے دوسری منزل ہو۔ بلکہ اس سے درجات کی بلندی مراد ہے۔ یعنی ایک مکان سے دوسرا مکان بلندی پر واقع ہو گا اور تیسرا اس سے بلندی پر۔

[۳۱] بارش کا کچھ پانی زمین میں جذب ہو کر زمین کو سیراب کرتا ہے۔ زائد پانی اور نیچے چلا جاتا ہے۔ جو کبھی چشموں کی صورت میں پھوٹ نکلتا ہے اور کبھی کنوئیں وغیرہ کھود کر نکالا جاتا ہے۔ اور زائد پانی ندی نالوں میں بہتا ہوا دریاؤں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ سب پانی کے منابع ہیں۔ اور جو بھی صورت ہو بارش کے پانی سے انسانوں، حیوانوں اور نباتات کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

حُطٰمًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰي نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّـلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ

بلاشبہ اہل عقل کے لئے اس[۳۲] میں ایک سبق ہے۔(۲۱) بھلا جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول[۳۳] دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی[۳۴] پر ہو (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو کوئی سبق نہیں لیتا) لہٰذا ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جن کے دل اللہ کے ذکر سے (اور) سخت[۳۵] ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔(۲۲) اللہ نے بہترین کلام نازل[۳۶] کیا جو ایسی کتاب ہے

[۳۲] ❁ دنیا کے کمال کو بھی زوال آ کے رہے گا:۔ سبق یہ ہے کہ جو چیز بھی عروج کو پہنچے اسے زوال بھی ضرور آتا ہے۔ جب وہ جوبن پر ہو تو بڑی بہار دکھاتی اور اچھی لگتی ہے مگر اس کا انجام عبرت آموز ہوتا ہے۔ نباتات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ پھر انسان کی اپنی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ چیزیں تو ہر انسان کے مشاہدے میں آسکتی ہیں۔ مگر قوموں کے عروج و زوال کی بھی اگرچہ یہی کیفیت ہوتی ہے مگر وہ انسان کے مشاہدہ میں نہیں آتی۔ کیونکہ وہ صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ اور اس کا ہمیں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاں قوم پر فلاں وقت عروج کا دور تھا اور فلاں وقت انحطاط کا۔ پھر اس سے آگے اس دنیا کا بھی یہی حال ہے جو اس وقت اپنی بہاریں دکھا رہی ہے اور اکثر لوگ اسی پر ریجھ بیٹھے اور اسی میں مست اور مگن ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اس کا انجام بھی اللہ کی سنت کے مطابق وہی کچھ ہونے والا ہے جو دوسری چیزوں کا ہو رہا ہے۔ لہٰذا انسان کو ان مثالوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور اس پر ریجھنے کے بجائے اس گھر کی فکر کرنا چاہئے جسے کبھی زوال نہیں آئے گا۔

[۳۳] ❁ شرح صدر کا مفہوم:۔ اسلام کے لئے سینہ کھول دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت کا دل میں اس طرح یقین پیدا ہو جائے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور انسان اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے اس طرح آمادہ ہو جائے کہ اس سے پیچھے ہٹنا اسے کسی قیمت پر گوارا نہ ہو۔ گو ایسا شرح صدر اللہ ہی کی توفیق سے نصیب ہوتا ہے۔ تاہم یہ توفیق بھی اللہ اسی شخص کو دیتا ہے۔ جو خود بھی حق بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔

[۳۴] اس روشنی سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے جو زندگی کے ہر میدان میں اور اس کے ہر موڑ پر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ جنہوں نے اللہ کے احکام کو عملی جامہ پہنا کر اپنے آپ کو امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش فرمایا۔

[۳۵] یعنی ایک طرف تو ایسا شخص ہے جس کا اللہ نے سینہ بھی اسلام کے لئے کھول دیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روشنی میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اللہ کے راستہ پر گامزن ہے۔ دوسری طرف وہ شخص ہے جس کے دل میں حق بات سنتے ہی گھٹن پیدا ہو جاتی ہے اور ناگواری کے اثرات اس کے چہرہ پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔ پھر اس کی ضد، عناد اور ہٹ دھرمی نے اس کے دل کو پتھر کی طرح سخت بنا دیا ہو جس کے دل میں خیر کا ایک قطرہ بھی نہ گھس سکتا ہو۔ نہ کوئی نصیحت اس پر اثر کرے۔ نہ کبھی اللہ کی یاد کی توفیق نصیب ہو۔ وہ یا تو اپنے ہی نفس کی پیروی کرے یا اپنے آباء کی رسوم اور تقلید کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرے۔ کیا یہ دونوں انجام کے لحاظ سے ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟

[۳۶] ❁ قرآن بہترین کلام کیسے ہے؟:۔ قرآن بہترین کلام اس لحاظ سے ہے کہ اس کی آیات ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں۔ اس کا

الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

جس کے مضامین ملتے جلتے[۳۷] اور بار بار دہرائے[۳۸] جاتے ہیں۔ جن سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں پھر ان کی جلدیں اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب[۳۹] ہو جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی ہدایت ہے، وہ جسے چاہتا ہے۔ اِس (قرآن) کے ذریعہ راہِ راست پر لے آتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔(۲۳)

انداز بیان دلنشین ہے۔ اس کے دلائل عام فہم ہیں۔ جن سے ایک دیہاتی بھی ایسے ہی مستفید ہو سکتا ہے جیسے ایک جید عالم، اور اس کے احکام و فرامین دنیا میں بہترین زندگی گزارنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ نیز اس کے احکام محض نظریاتی نہیں بلکہ سب قابل عمل ہیں اور اگر ان پر عمل کیا جائے تو اخروی فلاح کے ضامن ہیں۔ اور یہ سب خوبیاں اللہ کے کلام کے علاوہ دوسرے کسی کے کلام میں نہیں ہو سکتیں۔

[۳۷] ❁ ملتی جلتی آیات سے مراد؟ یعنی قرآن میں ایک مضمون اگر بیس مقامات پر آیا ہے تو بھی اس میں اختلاف اور تضاد واقع نہیں ہوتا۔ انداز بیان اور اختلاف الفاظ کے باوجود ایک جگہ کا مضمون دوسری جگہ کے مضمون کی تائید و توثیق ہی کرتا ہے۔ جس سے بات پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ ﴿اِنَّ الْقُرْآنَ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا﴾ یہ تو ممکن ہے کہ ایک جگہ اجمال ہو اور دوسری جگہ تفصیل۔ مگر اختلاف اور تضاد واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن نے ایک حکم دیا ہے کہ کسی غیر مسلم کو اپنا دلی دوست اور راز دار نہ بناؤ، تو کسی جگہ آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ سیاست میں کوئی بات یا کوئی اصول حرف آخر نہیں ہوتا۔

[۳۸] ❁ مثانی سے مراد کیسی آیات ہیں:۔ مثانی سے مراد ایک تو ایسی آیات ہیں جو بار بار پڑھی اور دہرائی جاتی ہیں۔ اسی لحاظ سے سورہ فاتحہ کو سبع من المثانی کہا گیا ہے کہ یہ سورت کم از کم نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ پھر نماز کے علاوہ بھی پڑھی جاتی ہے۔ دوسری مراد وہ آیات ہیں جو قرآن میں بہ تکرار وارد ہیں۔ مثلاً ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ یا ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ یا ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اور ایسی آیات جو دو دو یا تین تین بار وارد ہیں وہ بہت ہیں۔ تیسری مراد اقوام سابقہ کے انجام سے خبردار کرنے والی آیات یا انبیاء کے قصص ہیں جو قرآن میں بار بار مختلف پیرایوں میں مذکور ہوئے ہیں۔ ایسے ہی شرک کے ابطال اور توحید کے دلائل ہر سورہ کی بے شمار آیات میں مذکور ہیں۔ جو سب ایک دوسری کی تائید کرتی ہیں اور چوتھی مراد ایسی آیات ہیں جن میں نوعی تقابل پایا جاتا ہے۔ مثلاً جہاں اہلِ جنت کا ذکر ہے وہاں اہلِ دوزخ کا ذکر بھی آ جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی۔ جہاں رات کا ذکر ہے وہاں دن کا بھی ذکر ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی صفت قہار کا ذکر ہے تو اگلی آیت میں صفت غفار یا غفور کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

[۳۹] ❁ قرآن سنتے پر حال پڑنا محض ریاکاری ہے:۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ جب قرآن پڑھا جاتا تو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا کیا حال ہوتا تھا۔ وہ کہنے لگیں کہ "ان کی آنکھوں میں آنسو

أَفَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ وَقِيلَ لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٢٤﴾
كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٥﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا

پھر جو شخص قیامت کے دن کے سخت [٤٠] عذاب کو اپنے چہرے پر روکے گا (اس کی بے بسی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے؟) اور ظالموں سے کہا جائے گا کہ اپنی ان کرتوتوں کا مزا چکھو جو تم کیا کرتے تھے۔(٢٤) ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی جھٹلایا تو ان کو ایسی جگہ سے عذاب آیا جس کا انہیں سان گمان تک نہ تھا۔ پھر اللہ نے انہیں دنیا کی زندگی میں ہی رسوائی کا مزا چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو کہیں [٤١] بڑھ کر ہے کاش وہ جانتے ہوتے (٢٦) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہر

آجاتے اور بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے" عبداللہ بن زبیر ﷺ کہنے لگے کہ "ہمارے زمانہ میں تو بعض لوگ ایسے ہیں کہ قرآن سننے سے ان کو غش آجاتا ہے" سیدہ اسماء نے کہا اللہ کی پناہ شیطان مردود سے "اور جلدوں اور دلوں کے نرم پڑنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی خوش دلی اور رغبت کے ساتھ اللہ کی عبادت بجالاتے ہیں۔ یہ تو صحابہ کرام اور ان لوگوں کی صفات ہیں جو فی الواقع قرآن کی تاثیر قبول کرتے ہیں۔ پھر کچھ لوگوں نے تصنع سے ایسے طریقے ایجاد کر لئے کہ قرآن سننے سے غش آجائے اور وہ گر پڑیں جسے ہماری زبان میں حال پڑنا یا حال کھیلنا کہتے ہیں۔ ریاکار اور مصنوعی پیر قسم کے لوگ عام لوگوں پر اپنی بزرگی کی دھاک بٹھانے کے لئے ایسے کام کرتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر ﷺ عراق کے ایک ایسے شخص پر سے گزرے جو مدہوش گرا ہوا تھا۔ انہوں نے پوچھا: اسے کیا ہوا؟" لوگوں نے کہا: "جب یہ قرآن سنتا ہے تو اس کا یہی حال ہو جاتا ہے" سیدنا عبداللہ کہنے لگے: "ہم بھی اللہ سے ڈرتے ہیں مگر گرتے نہیں اور ایسے لوگوں کے پیٹ میں شیطان ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا یہ طریقہ نہ تھا اور ابن سیرین سے کسی نے پوچھا: "کچھ لوگ قرآن سن کر گر جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا: ایسے لوگوں کو ایک چھت پر اس طرح بٹھاؤ کہ وہ نیچے کی طرف دیوار کے ساتھ پاؤں لٹکائے ہوئے ہوں پھر انہیں قرآن سناؤ۔ اگر وہ نیچے گر پڑیں تب وہ سچے ہیں ورنہ وہ جھوٹے اور ریاکار ہیں۔

[٤٠] انسان کی عادت ہے کہ جب اس کے بدن پر کوئی ضرب پڑنے والی ہو تو سب سے پہلے وہ اپنے ہاتھوں سے اس کی روک تھام کرتا ہے یعنی پڑنے والے وار کی ہاتھوں سے مدافعت کرتا ہے۔ اور اگر حملہ شدید ہو اور ہاتھوں سے اسے روکا نہ جا سکتا ہو تو باقی بدن کے ہر حصے پر ضرب پڑنا گوارا کر لیتا ہے لیکن جیسے بھی بن پڑے چہرے کو اس ضرب سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ قیامت کے دن ان کے ہاتھ تو بندھے ہوں گے اور بے بسی کا بھی یہ عالم ہوگا کہ اس عذاب کو مجبوراً انہیں اپنے چہروں پر برداشت کرنا پڑے گا۔ پھر ساتھ ہی انہیں یہ بھی کہا جائے گا کہ یہ تمہارے ہی اعمال کا بدلہ ہے۔ یہاں پھر سوال کا اگلا حصہ محذوف ہے اور یہ جملہ یوں مکمل ہوتا ہے کہ کیا ایسا شخص اس مومن کی طرح ہو سکتا ہے جسے آخرت میں کوئی تکلیف اور نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی نہ ہو بلکہ اسے اس دن ہر طرح سے راحت اور اطمینان میسر ہو؟

[٤١] ❁ دنیا میں سزا محض ظالم کا ہاتھ روکنے کیلئے دی جاتی ہے:۔ وہ اللہ کی آیات یا اس کی وعید کا مذاق اڑانے میں لگے رہے

الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٧﴾ قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٢٨﴾

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا

طرح کی مثالیں[۴۲] بیان کر دی ہیں تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔(۲۷) وہ قرآن جو عربی زبان[۴۳] میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔ تاکہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچ جائیں۔(۲۸)

اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے۔ ایک شخص چند بد سرشت اور اپنے حق کے لئے باہم جھگڑنے[۴۴] والوں کا غلام ہے اور دوسرا صرف ایک ہی آدمی کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں غلاموں کی حالت ایک جیسی ہو سکتی ہے؟

اور پیغمبروں سے یہی کہتے رہے کہ وہ عذاب کب آئے گا جس کی دھمکی دے رہے ہو۔ اسے لے کیوں نہیں آتے۔ وہ اپنے اس شغل میں ہی مگن تھے کہ انہیں اللہ کے عذاب نے آلیا اور یہ عذاب کوئی ان کے جرائم کی سزا نہیں تھی بلکہ اس طرح انہیں مزید ظلم اور زیادتیوں سے روک دیا گیا اور اصل سزا تو انہیں اس وقت دی جائے گی جب وہ میدان محشر میں پیش کئے جائیں گے۔

[۴۲] اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم نے شرک کی تردید میں ہر طرح کی مثالیں دلائل کے ساتھ پیش کر دی ہیں تاکہ لوگوں کو اصل حقیقت سمجھنے میں کوئی دشواری نہ رہے اور اس سے مراد دین کی سب ضروری باتیں بھی ہو سکتی ہیں جن میں اوامر ونواہی بھی شامل ہیں۔ ایسی بنیادی باتیں سب قرآن میں موجود ہیں اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کا مطلب اور مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر شخص کو دین سے متعلق جملہ ہدایات کتاب و سنت سے مل سکتی ہیں۔ اور اسے اپنے دین کی حفاظت کے لئے قرآن کریم اور حدیث کافی ہے۔

[۴۳] ❁ <u>قرآن ٹھیٹھ عربی زبان میں کیوں ہے:۔</u> قرآن اگر کسی دوسری زبان میں ہوتا تو اسے سمجھنے کے لئے ترجمانوں کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی دشواریاں پیش آ سکتی تھیں۔ یہ ان کی اپنی مادری اور ٹھیٹھ زبان میں ہے جسے سب لوگ بآسانی سمجھ سکتے ہیں پھر اس میں جو باتیں مذکور ہیں وہ صاف اور سیدھی ہیں جنہیں ہر عقل سلیم قبول کرتی ہے۔ اس کے انداز بیان اور دلائل میں کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں۔ علاوہ ازیں جو احکام اس میں بیان کئے گئے ہیں ان پر عمل کرنا محال نہیں اور لوگ بسہولت ان پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں اور جو لوگ کسی بھی درجہ میں معذور ہیں ان کے لئے رخصتوں یا مراعات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

[۴۴] ❁ <u>ایک انسان کے مختلف اور متشاکس آقا کون کون سے ہیں؟</u> تشاکس کے معنی بخل، تند خوئی اور بد مزاجی کی وجہ سے ایک دوسرے سے اپنے اپنے حق کے لئے کھینچا تانی کرنا ہے۔ مثال یہ ہے کہ ایک غلام کے ایک نہیں بلکہ متعدد آقا ہیں۔ اور ہر ایک کا جی یہ چاہتا ہے کہ وہ غلام کو اپنے ہی کام میں لگائے رکھے اور جتنا اس کا حق بنتا ہے اس سے زیادہ اس سے محنت لے۔ دوسروں کی خدمت خواہ وہ کر سکے یا نہ کرے۔ پھر وہ تند خو اور بد سرشت بھی ہیں ان میں سے ہر شخص اس غلام سے ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا ہے اور بد سلوکی سے بھی پیش آتا ہے۔ تو بتاؤ اس غلام کا کیا حال ہو گا اور وہ کس مشکل اور مصیبت میں پڑا ہو گا اور دوسرے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمۡ مَّیِّتُوۡنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ تَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۳۱﴾

الحمد [۴۵] للہ لیکن اکثر لوگ یہ بات جانتے نہیں (۲۹) (اے نبی!) بلاشبہ آپ کو مرنا [۴۶] ہے اور یہ بھی مرنے والے ہیں (۳۰) پھر قیامت کے دن تم اپنے پروردگار کے ہاں اپنا اپنا [۴۷] مقدمہ پیش کرو گے۔ (۳۱)

غلام کا مالک صرف ایک ہی ہے تو بتاؤ ان دونوں غلاموں کی حالت ایک جیسی ہو سکتی ہے؟ اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسے بدسرشت لوگ جو اپنے مشترکہ غلام سے اپنا زیادہ سے زیادہ حق وصول کرنے کے لئے جھگڑتے ہیں۔ غلام کو اس کا حق دینے میں سخت بخیل ہوتے ہیں۔ ایسے غلام کو نہ کوئی صرف اپنا غلام سمجھتا ہے نہ اس کی خبر لیتا ہے نہ اس کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ اور دوسرا غلام جو صرف ایک شخص کا ہو وہ اسے اپنا ہی غلام سمجھتا ہے اور اس کے حقوق کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ غلام جس کا ایک ہی آقا ہو وہ بہتر ہوا۔

یہ مثال دراصل ایک مشرک اور ایک موحد کی مثال ہے۔ مشرک کئی معبودوں کا غلام ہوتا ہے۔ اسے یہ فکر بھی دامنگیر رہتی ہے کہ اگر ایک کی حاضری اور نذر و نیاز دے کر اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے تو دوسرے کہیں بگڑ نہ بیٹھیں اور اسے کوئی گزند نہ پہنچادیں۔ اسی کھینچا تانی میں وہ پریشان اور پراگندہ دل رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک موحد کو صرف ایک اکیلے اللہ کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے پھر چونکہ موحد اللہ کا ہی بن کر رہتا ہے اللہ بھی ہر آڑے وقت میں اس کی دستگیری فرماتا، مصائب سے نجات دیتا اور انعامات سے نوازتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی حالت ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے سمجھنے کے لئے کسی لمبے چوڑے غور و فکر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس مثال میں معبودوں سے مراد پتھر کے بت نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کا بخیلی، تندخوئی اور بدمزاجی سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی وہ اپنے حقوق کے لئے جھگڑا کر سکتے ہیں۔ لامحالہ ان سے مراد ایسے جیتے جاگتے آقا ہی ہو سکتے ہیں جو عملاً آدمی کو متضاد احکام دیتے ہیں اور فی الواقع اس کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا آقا تو انسان کا اپنا نفس ہے جو طرح طرح کی خواہشات اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ انہیں پورا کرے۔ دوسرے بے شمار آقا گھر میں، خاندان میں، برادری میں، قوم میں اور ملک کے معاشرے میں، مذہبی پیشواؤں میں، حکمرانوں اور قانون سازوں میں، کاروبار اور معیشت کے دائروں میں اور دنیا کے تمدن پر غلبہ رکھنے والی طاقتوں میں ہر طرف موجود ہیں جن کے متضاد تقاضے اور مختلف مطالبے ہر وقت آدمی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اور ان میں سے جس کا تقاضا پورا کرنے میں بھی وہ کوتاہی کرتا ہے وہ اپنے دائرہ کار میں اس کو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ البتہ ہر ایک کی سزا کے ہتھیار الگ الگ ہیں۔ کوئی دل مسوستا ہے، کوئی روٹھ جاتا ہے، کوئی مقاطعہ کرتا ہے، کوئی دیوالیہ نکالتا ہے، کوئی مذہب کا وار کرتا ہے اور کوئی قانون کی چوٹ لگاتا ہے۔ اس پریشانی اور تنگی سے نکلنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسان صرف ایک اللہ کا بندہ بن جائے اور اللہ کے احکام میں کسی دوسرے کی قطعاً پرواہ نہ کرے۔ یہی اس کے لئے سلامتی، اطمینان اور نجات کا راستہ ہے۔

[۴۵] الحمد للہ کے استعمال کا خاص موقع:۔ یہاں الحمد للہ کا استعمال ان معنوں میں ہوا ہے کہ بہت سے آقاؤں کے پرستار اس سوال کا جواب دیں تو بھی مرتے ہیں اور اگر نہ دیں تو بھی مرتے ہیں پھر اگر جواب نہ دیں تو گویا یہ ان کے خلاف مسکت دلیل

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَالَّذِىْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ لَهُمْ

پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچی بات اس کے سامنے آئی تو اسے [۴۸] جھٹلا دیا۔ کیا ایسے کافروں کا دوزخ میں ہی ٹھکانا نہیں؟(۳۲) اور جو شخص سچی بات لایا اور جس نے [۴۹] اس کی تصدیق کی۔ یہی لوگ پرہیزگار ہیں (۳۳)

ہوئی۔ اور اگر جواب دیں تو وہ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ ان دونوں غلاموں کی حالت برابر ہے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ آقا رکھنے والا غلام بہتر ہے۔ لہذا اللہ کا شکر ہے کہ اتنی بات تو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایک آقا رکھنے والا غلام ہی بہتر ہو سکتا ہے۔ پھر جب عملی زندگی کا وقت آتا ہے تو یہ سب باتیں بھول کر نادان بن جاتے ہیں۔

[۴۶] کفار مکہ بسا اوقات یہ آرزو کرتے تھے کہ اگر یہ نبی مر جائے تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اس آیت میں ان کی اسی بری آرزو کا نہایت سنجیدہ انداز میں جواب دیا گیا ہے اور اس نبی کو ہی مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر آپ کو موت آتی ہے تو یہ کیا موت سے بچ سکتے ہیں؟ پھر یہ کیا معلوم پہلے موت کس کو آئے گی؟ موت آنے کی حد تک تو سب یکساں ہیں مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ موت کے بعد کس کا انجام بخیر ہوگا۔ اور کون اپنی سرکشی کی پاداش میں ماخوذ ہوگا۔

[۴۷] ❁ اللہ کے ہاں کس کس قسم کے لوگ آپس میں جھگڑا کریں گے؟:۔ یہ جھگڑے بھی کئی قسم کے ہوں گے۔ مظلوم ظالم کو دامن سے پکڑے اللہ کے حضور پیش کرے گا اور اپنے ظلم کے بارے میں اللہ کے حضور دلائل پیش کرے گا۔ دوسری قسم یہ کہ کافر اور مشرک اپنے جرم کا انکار کر دیں گے۔ پھر ان کے خلاف رسولوں کی اور ایمانداروں کی شہادتیں ہوں گی۔ پھر ان کے اپنے اعضاء بھی ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ تیسری قسم اہل حق اور اہل باطل یا موحدوں اور مشرکوں میں جھگڑوں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کریں گے۔ چوتھی قسم مشرکین اور ان کے معبودوں یا بڑے لوگوں اور ان کے تابعداروں میں جھگڑا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ غرض کئی قسم کے جھگڑے ہوں گے۔ جن کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں نہایت انصاف کے ساتھ کیا جائے گا۔

[۴۸] ❁ سب سے بڑھ کر ظالم کون کون ہیں؟ یعنی قیامت کے دن سب سے زیادہ ظالم اور سزا کا مستحق وہ شخص ہوگا جس نے ایسے عقیدے گھڑے کہ اللہ نے اپنے بہت سے اختیارات اور تصرفات اپنے پیاروں کو سونپ دیئے ہیں۔ اور ان کے پاس جو ایسے اختیارات ہیں وہ اللہ ہی کے عطا کئے ہوئے تھے۔ ان کے ذاتی نہیں ہیں۔ پھر جب انہیں حقیقت حال سے خبردار کیا جائے تو سمجھانے والے کو ہی جھوٹا سمجھیں اور اس کی مخالفت پر اتر آئیں۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹ موٹ کہہ دے کہ وہ اللہ کا نبی ہے۔ اور اس پر اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے تو ایسا شخص سب سے بڑا ظالم ہے۔ اور وہ اپنی بات میں سچا اور فی الواقع اللہ کا نبی اور اللہ ہی کا کلام پیش کر رہا ہو۔ لیکن سننے والا اسے جھٹلا دے تو پھر یہ شخص سب سے بڑھ کر ظالم ہوگا۔ پہلے مطلب کے لحاظ سے اس آیت کا مصداق ایک ہی شخص ہے اور دوسرے مطلب کے لحاظ سے اس کا مصداق دو الگ الگ اشخاص ہیں۔ اور یہ سب ہی بڑے بڑے ظالموں کی قسمیں ہیں۔

[۴۹] یہ آیت سابقہ آیت کا عکس ہے۔ اور اس کا مصداق ایک بھی ہو سکتا ہے اور دو الگ الگ بھی۔ یعنی جو شخص خود بھی سچ بات

مَا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا
وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ
بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ

وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لئے ان کے پروردگار کے ہاں موجود[۵۰] ہے۔ نیکی کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے(۳۴) تاکہ اللہ ان سے وہ برائیاں دور کر دے جو انہوں[۵۱] نے کی تھیں اور جو اچھے کام وہ کرتے رہے انہی کے لحاظ سے انہیں ان کا اجر عطا کرے(۳۵) کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں؟ اور یہ لوگ آپ کو ان سے ڈراتے ہیں جو اس کے سوا[۵۲] ہیں۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔(۳۶) اور جسے اللہ ہدایت دے دے اسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں۔

پیش کرتا ہے۔ سچ ہی بولتا ہے اور اگر کوئی سچی بات اس کے سامنے پیش کی جائے تو اس کی تصدیق بھی کر دیتا ہے تو ایسا شخص فی الواقع متقی ہے اور دوسری صورت میں سچ بولنے والا تو رسول ہے۔ اور اس کی تصدیق کرنے والے مومنین ہیں۔ اور ایسے لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

[۵۰] ہر انسان موت کے دروازے پر پہنچتے ہی اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے انعامات کا سلسلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے اور دخول جنت سے پہلے کافی مراحل ہیں جہاں ایسے متقین پر اللہ کی عنایات ہوں گی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی خواہشات پوری فرمائے گا۔ مثلاً وہ چاہیں گے کہ عذاب قبر سے بھی محفوظ رہیں اور روزِ قیامت کی ہولناکیوں اور حساب و کتاب میں سختی سے بھی تو ان کی ایسی خواہشات پوری کی جائیں گی۔

[۵۱] یعنی ایسے متقین نے اگر اپنے دور جاہلیت میں کچھ گناہ کے کام کئے بھی تھے تو اللہ ان کو محو کر دے گا۔ پھر اسلام لانے کے بعد انہوں نے جو اچھے کام کئے تھے ان میں سے جو کام سب سے بہتر ہو گا اسی کی جزا کے مطابق دوسرے عملوں کی بھی جزا دی جائے گی خواہ وہ اس پایہ کے نہ ہوں۔

[۵۲] مشرکوں کا اپنے معبودوں کے انتقام سے ڈرانا:۔ اس جملہ کے مخاطب مشرکین مکہ ہیں۔ جو اکثر آپ ﷺ سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے معبودوں کی توہین کرنا چھوڑ دو۔ ان کی شان میں جس کسی نے گستاخی کی وہ تباہ و برباد ہو کے رہ گیا۔ لہٰذا اگر تم ایسی باتوں سے باز نہ آئے تو تمہارا بھی یہی حشر ہو گا۔ اسی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں؟ واضح رہے کہ یہ خطاب صرف مشرکین مکہ کے لئے مختص نہیں بلکہ ہر دور کے اور ہر جگہ کے مشرکوں کے لئے ہے۔ دور کیوں جائیں۔ اپنے ہاں کے ہی اولیاء اللہ کے متداول تذکرے ملاحظہ فرمالیجئے۔ ان میں آپ کو ایسا خاصا مواد مل جائے گا کہ فلاں شخص نے فلاں آستانے کی توہین کی تو چند ہی دنوں میں اس کا کاروبار تباہ ہو گیا۔ اور فلاں شخص نے فلاں بزرگ کے حق میں گستاخانہ کلمے کہے تو ایسا بیمار پڑا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔ پھر یہ انتقام کا سلسلہ صرف زندہ بزرگوں اور پیروں سے مخصوص نہیں کہ فوت شدہ بزرگوں کے حق میں گستاخی کی جائے تو وہ بھی اپنا انتقام لے کر چھوڑتے ہیں۔ گویا انبیاء کا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ

مُضِلٍّ ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ۝ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ
بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ

کیا اللہ سب پر غالب اور انتقام لینے والا[۵۳] نہیں ؟(۳۷) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یقیناً کہیں گے کہ ''اللہ نے'' آپ انہیں کہئے بھلا دیکھو، جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو تمہارے معبود اس کی پہنچائی ہوئی تکلیف کو دور ہٹا سکتے ہیں؟ یا اگر وہ مجھ پر رحمت کرنا چاہے تو یہ اس کی رحمت کو روک سکتے[۵۴] ہیں؟ آپ ان سے کہئے:

کے بندوں کو صرف اللہ سے ڈرائیں اور ماسوا اللہ سے بے نیاز کر دیں جبکہ ان مشرکوں کا مشن انبیاء کے مشن کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ بس اپنے معبودوں اور بزرگوں کے انتقام سے ہی ڈرا ڈرا کر ان کے جال میں پھنسائے رکھتے ہیں۔ پھر ان اللہ کے پیاروں کے ذکر میں اللہ تعالیٰ خود ہی پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

[۵۳] اللہ کی توہین کیسے ؟۔ ان مشرکوں کو اپنے اپنے معبودوں اور بزرگوں کی عزت کا تو بڑا خیال رہتا ہے اور اس غرض کے لئے وہ بہت سے قصے اور افسانے بھی گھڑ گھڑ کر لوگوں میں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس بات کا انہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ ان سب کے اوپر ایک ایسی زبردست ہستی ہے جس کی یہ لوگ، اپنے معبودوں کی عزت بڑھانے کی آڑ میں زبردست توہین کر رہے ہیں۔ اور وہ ان سے پوری طرح انتقام بھی لے سکتی ہے اور انہیں یہ موٹی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ زبردست کے مقابلہ میں ان کے معبودوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ جو اللہ اکیلے کے پرستار کو اسطرح کی گیدڑ بھبکیوں سے ہراساں کرنا چاہتے ہیں۔

[۵۴] یہ بات تو مشرکین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زمین و آسمان یعنی اس کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اور خالق اپنی پیدا کی ہوئی یا بنائی ہوئی چیز میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اور ایسے تصرف کا اختیار خالق کے علاوہ دوسری کسی ہستی کو نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جب کہ وہ خود بھی اللہ کی مخلوق اور اسی کے زیر تصرف ہے۔ اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ ہے جو اپنی مخلوق میں تصرف کے وسیع اختیارات رکھتا ہے اور دوسری طرف جو بھی معبود ہوگا بہرحال وہ اللہ کی مخلوق ہی ہوگا اور اللہ کے مقابلہ میں اس کا کچھ اختیار بھی نہیں چل سکتا اب بتاؤ کہ ان دونوں میں سے کس پر بھروسا کرنا چاہئے اور کس کو اپنی مدد کے لئے کافی سمجھنا چاہئے۔ اور ان معبودوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ سب مل کر بھی میری اس تکلیف کو دور نہیں کر سکتے جو اللہ نے میرے مقدر میں لکھ دی ہے اور اگر اللہ مجھے اپنی رحمت سے نوازنا چاہے تو یہ سب مل کر بھی اسے روک نہیں سکتے۔ کیونکہ اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی اختیارات نہیں ہیں۔ پھر جو چیزیں میرے نفع و نقصان سے متعلق مجبور محض ہیں۔ ان پر بھروسہ کرنا تو سخت نادانی کی بات ہوگی۔ واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اور بھی کئی رسولوں کو مشرکوں کی طرف سے اس قسم کی دھمکیاں دی جاتی رہیں کہ اگر تم ہمارے معبودوں کی گستاخی سے باز نہ آئے تو وہ تمہیں مخبوط الحواس بنا دیں گے اور تمہیں تباہ کر کے رکھ دیں گے اور یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے تو اس کے جواب میں رسول یہی کہتے رہے۔

حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۳۸ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ
عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳۹ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۴۰ اِنَّآ
اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۴۱ ع اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ
مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۴۲ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا

مجھے اللہ کافی ہے (اور) بھروسہ کرنے والے اسی پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔(۳۸) آپ ان سے کہئے: "اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کرتے جاؤ[۵۵]، میں اپنی جگہ کر رہا ہوں پھر جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا(۳۹) کس پر ایسا عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے اور اس پر دائمی عذاب[۵۶] نازل ہوتا ہے۔(۴۰) بلاشبہ ہم نے یہ کتاب تمام لوگوں کے لئے آپ پر حق کے ساتھ[۵۷] نازل کی ہے، پھر جو سیدھی راہ پر آ گیا تو اس کا اپنا ہی فائدہ ہے اور جو بھٹک گیا تو اس کے بھٹکنے کا وبال (بھی) اسی پر ہے۔ اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں(۴۱) اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرا نہ ہو اس کی روح نیند کی حالت میں قبض کر لیتا ہے پھر جس کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہو اس کی روح کو تو روک لیتا ہے اور دوسری روحیں ایک مقررہ وقت تک کیلئے واپس بھیج دیتا ہے۔ غور و فکر کرنے والے لوگوں کیلئے اس میں بہت سی[۵۸] نشانیاں ہیں۔(۴۲) کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اور سفارشی بنا رکھے ہیں؟ آپ ان سے کہئے کہ:

❁ **مشرکوں کی دھمکی کا جواب:۔** ان معبودوں سے کہو کہ میرا جو کچھ بگاڑنا چاہتے ہیں بگاڑ لیں اور فوری طور پر سب مل کر میرے خلاف کارروائی کر دیکھیں اور مجھے مہلت بھی نہ دیں۔ تاکہ مجھے بھی علم ہو جائے کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں اور تمہیں بھی۔

[۵۵] تمہارے کام یہ ہیں کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاؤ۔ ایمانداروں کو اذیتیں پہنچاؤ۔ اسلام کی راہ روکنے کے لئے سازشیں اور منصوبے تیار کرو اور اپنے آبائی دین اور شرکیہ رسوم پر ڈٹے رہو سو یہ کام تم کرتے جاؤ۔ اس کے مقابلہ میں میں اور میرے پیروکار تمہاری طرف سے ہر طرح کے دکھ سہہ کر بھی اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے ان شاءاللہ کام کرتے رہیں گے۔

[۵۶] رسوا کرنے والے عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے۔ گویا تھوڑی ہی مدت بعد تم اس رسوائی کے عذاب سے دوچار ہو جاؤ گے اور دائمی عذاب سے مراد آخرت کا عذاب ہے جس کا علم تمہیں مرنے کے ساتھ ہی ہو جائے گا۔

[۵۷] یعنی ہمارا کام یہ تھا کہ ہم لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک ایسی کتاب نازل کریں جو ٹھوس حقائق پر مبنی ہو تاکہ لوگوں پر اتمام حجت ہو جائے سو ایسی کتاب ہم نے آپ پر نازل کر دی ہے اور آپ کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا دیں اور وہ پیغام آپ نے پہنچا دیا۔ لوگوں کو زبردستی ان حقائق کا قائل بنانا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ آگے ہر شخص خود اپنا نفع سوچ لے۔ اگر نصیحت قبول کرے گا تو اس میں اس کا اپنا ہی بھلا ہے اور اگر اکڑ جائے گا اور مخالفت پر اتر آئے گا تو اس کی سزا خود بھگتے گا۔

[۵۸] اس آیت سے درج ذیل امور کا پتہ چلتا ہے بالفاظ دیگر اس میں مندرجہ ذیل نشانیاں موجود ہیں۔

۱۔ روح حیوانی اور روح نفسانی:۔ روح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک روح حیوانی جس کا تعلق دوران خون سے ہوتا ہے۔ اور یہ نیند کی حالت میں بھی جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔ دوسری روح نفسانی یا نفس ناطقہ ہے جو نیند یا خواب کی حالت میں بدن کو چھوڑ کر سیر کرتی پھرتی ہے اور ہر طرح کے واقعات سے خواب میں ہی دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اسی روح کو اللہ تعالیٰ مخاطب فرماتے ہیں۔

دوام روح نفسانی کو ہے:۔ اور اسی روح کو دوام ہے یہ روح جب بدن کو چھوڑ دیتی ہے تو انسان کے حواس خمسہ میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران انسان کی قوت باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قوت سامعہ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ہاں اگر غل غپاڑا ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوئے ہوئے کو بلند آواز سے پکار کر جگادے تو روح نفسانی دوبارہ اپنے جسم میں لوٹ آتی ہے۔ اس روح کو اپنے جسم سے عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی جسم اس روح کی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔

۲۔ عذاب قبر کی ماہیت:۔ ان دونوں قسم کی روحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو جزو ہوتے ہیں۔ روح نفسانی اگر خواب میں کسی بات پر یا کسی چیز سے لطف اندوز ہوتی ہے تو انسان جاگنے پر ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ اور اگر اس روح نفسانی کو خواب میں کوئی ناگوار حادثہ پیش آجائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چیخنے چلانے لگتا ہے اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے اور کہیں مار پٹے تو حیرت کی بات ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ جنہیں جاگنے کے بعد انسان خود بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس حقیقت سے عذاب قبر یا عالم برزخ کے عذاب کی ماہیت کو کسی حد تک سمجھا جاسکتا ہے۔

۳۔ روح حیوانی موت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے:۔ روح حیوانی کا تعلق محض بدن سے ہے۔ بدن نہ ہو تو اس روح کا کوئی وجود ہی نہیں رہتا۔ بلکہ یہ روح تو بدن کے بوسیدہ ہونے یا فنا ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتی بلکہ موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ختم ہونے سے بدن بدن نہیں کہلاتا ہے بلکہ جسد، میت، لاش اور نعش کہلاتا ہے۔

۴۔ ان دونوں قسم کی روحوں میں سے کسی بھی ایک قسم کی روح کے خاتمہ سے دوسری قسم کی روح کا از خود جسم سے تعلق ختم ہو جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص سوتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہے کہ کسی دوسرے شخص نے اسے سوتے میں قتل کر دیا۔ تو اب روح نفسانی خواہ کہیں بھی سیر کرتی ہوگی، دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ اسے وہیں قبض کرلے گا۔ اس کے برعکس صورت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کی روح نفسانی کو خواب میں قبض کرلیں تو بستر پر سونے والا آدمی بغیر کسی حادثہ یا بیماری کے مر جائے گا۔

۵۔ نیند آدھی موت ہوتی ہے:۔ اللہ تعالیٰ موت کی حالت میں بھی روح نفسانی کو قبض کرتا ہے۔ اور نیند کی حالت میں بھی۔ اور یہی وہ روح ہے جسے انا یا (EGO) کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے نیند بھی بہت حد تک موت کے مشابہ ہوتی ہے۔ اسی لئے سوتے وقت ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ (اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰى) "یعنی اے اللہ! میں تیرے ہی نام سے مرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے زندہ ہو جاؤں گا" اور بیدار ہوتے وقت یہ دعا سکھائی گئی ہے۔ (اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَمَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ) "سب طرح کی تعریف اس اللہ کو سزاوار ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھا دیا اور اسی کے حضور حاضر ہونا ہے"

لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ

اگر وہ کسی چیز کا اختیار ہی نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے [۵۹] ہوں (تو سفارش کیسے کریں گے؟) (۴۳) آپ ان سے کہئے کہ سفارش پوری کی پوری اللہ ہی کے [۶۰] اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کی حکومت ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (۴۴) اور جب اللہ اکیلے کا ذکر کیا جائے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل گھٹ جاتے [۶۱] ہیں اور جب اللہ کے علاوہ دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں (۴۵) آپ کہئے: اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے،

۶۔ نیند سے اٹھنے اور دوبارہ اٹھنے میں مماثلت:۔ وہ اللہ جو ہمیں ہر روز سلا کر موت کا نمونہ دکھاتا اور پھر اس کے بعد زندہ کرتا رہتا ہے وہ اس بات پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے کہ حقیقی موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دے۔

[۵۹] مشرکین مکہ اپنے بتوں کی پرستش کے لئے یہ دلیل دیتے تھے کہ یہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں۔ ان ہی کی سفارش سے کام بنتے ہیں۔ سو پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کے شفیع ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اسے معبود بنا لیا جائے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ان بتوں کو نہ عقل ہے، نہ سمجھ ہے، نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں۔ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے کسی بھی بات کا یہ اختیار نہیں رکھتے تو پھر تمہاری سفارش کیسے کریں گے؟

[۶۰] سفارش سے متعلق جملہ اختیارات اللہ کو ہیں:۔ اس آیت میں سفارش کا ضابطہ واضح فرمادیا کہ سفارش کے جملہ اختیارات تو اللہ کو ہیں اور سفارش تو وہ کر سکے گا جسے اللہ اجازت دے گا۔ اب کیا تمہیں معلوم ہے کہ جن بتوں کو یا ان کی روحوں کو یا بزرگوں کو تم نے شفیع بنا رکھا ہے یا سمجھ رکھا ہے انہیں سفارش کی اجازت بھی دے گا یا نہیں؟ سفارش کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ سفارش اسی کے حق میں قبول ہوگی جن کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اللہ تمہارے حق میں سفارش کی کسی کو اجازت دے دے گا؟ گویا جس سفارش پر تم بھروسہ کیے بیٹھے ہو اس کا خیال دل سے نکال دو۔ یعنی اگر سفارش کرنے والا اپنی مرضی سے سفارش کر ہی نہ سکے جب تک اللہ کی طرف سے اجازت نہ ہو تو پھر یہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہوئی اس کا اختیار کہاں سے آگیا؟ قیامت کے دن کچھ لوگ دوسروں کی سفارش کریں گے ضرور۔ لیکن اس پر پابندیاں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی کے تحت ہوگا۔ اس میں سفارش کرنے والے بھی اللہ کے حکم کے پابند اور جن کے حق میں سفارش ہوگی وہ بھی اللہ کی رضا کے تحت۔ تو جملہ اختیارات تو اللہ کے ہوئے اور کسی دوسرے کے اختیار یا پسند کو اس میں کچھ دخل نہ ہوگا۔

[۶۱] مشرکوں کی ایک پکی علامت، توحید خالص سے چڑ:۔ اس آیت میں مشرکوں کی ایک پکی خصلت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مشرک بتوں کے پجاری ہوں یا قبروں کے یا پیروں فقیروں کے نیز کسی بھی دور کے مشرک ہوں سب میں یہ خصلت پائی جاتی ہے

الْأَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٤٦﴾
وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ
الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ ﴿٤٧﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ

غیب اور حاضر کو جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ایسی چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے[۶۲] ہیں (۴۶) اور اگر ان ظالموں کو زمین کی ساری دولت میسر ہو اور اتنی اور بھی ہو تو وہ روز قیامت کے بُرے عذاب سے بچنے کے لئے فدیہ میں دینے[۶۳] کو تیار ہو جائیں گے۔ اس دن اللہ کی طرف سے ان کے لئے ایسا عذاب ظاہر ہوگا جو ان کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا (۴۷) اور جو کام وہ کرتے رہے اس کے بُرے نتائج[۶۴] ان کے سامنے

کہ اگر اللہ اکیلے کی ہی صفات بیان کی جائیں' اس کے محیر العقول کارنامے بیان کیے جائیں' اس کی حکمت سے لبریز آیات کی تشریح بیان کی جائے تو اس سے مشرکوں کے سینے ٹھنڈے نہیں ہوتے بلکہ ان میں انقباض اور گھٹن پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ بیان کرنے والے کو بتوں کا یا اولیاء اللہ کا منکر ہونے کا طعنہ دینے لگتے ہیں۔ اس کے بجائے اگر ولیوں کی کرامات بیان کی جائیں۔ اور یہ بتایا جائے کہ فلاں بزرگ نے اپنی گستاخی کا یوں انتقام لیا تھا۔ فلاں شخص کی قسمت میں ایک لڑکا بھی نہیں لکھا تھا لیکن فلاں بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے اصرار اور تکرار کر کے اس شخص کے حق میں سات بیٹے اللہ تعالیٰ سے منوا لیے۔ چنانچہ اس کے ہاں سات بیٹے پیدا ہوئے۔ جب کوئی ایسے من گھڑت قصے بیان کرتا ہے تو سامعین سبحان اللہ کے نعرے لگانے لگتے ہیں اور بڑے خوش رہتے ہیں البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے بزرگوں کے بیان میں اگر کہیں اللہ کا نام آ جائے تو اسے گوارا کر لیتے ہیں۔ لیکن اصل محبت انہیں اپنے اولیاء سے ہی ہوتی ہے۔

[۶۲] ❁ مشرکوں کو سمجھانے کے بعد دعا: یعنی جب اتنی موٹی موٹی باتوں میں بھی اختلاف اور جھگڑے ہونے لگیں۔ اللہ کے وقار اور اس کی عظمت کا احساس تک نہ رہے۔ اور ساری وفاداریاں اور نیاز مندیاں اللہ کے بجائے اللہ کے پیاروں کے لئے ہی وقف ہو کر رہ جائیں۔ تو اے اللہ اب تجھ سے فریاد ہے اور تیرا ہی حوصلہ ہے جو یہ سب کچھ برداشت کیے جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو مہلت دیئے جاتا ہے۔ اور ان کا فیصلہ قیامت کے دن پر ٹال رکھا ہے۔ جب کوئی شخص حق بات سننے کو تیار نہ ہو اور ناحق جھگڑا کرتا ہو تو ہر شخص کو یہ دعا پڑھنی چاہیے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو سکھائی ہے۔

[۶۳] ❁ شرک کا فدیہ: اس آیت میں ظالموں سے مراد بھی مشرک ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفات دوسروں میں بانٹتے پھرتے ہیں۔ پھر ایسی من گھڑت باتوں کا خوب پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ اللہ اکیلے کی توحید بیان کی جائے تو سمجھتے ہیں کہ یہ درپردہ ہمارے اولیاء کی توہین کی جا رہی ہے ایسے لوگوں کا قیامت کے دن یہ حشر ہوگا کہ اگر زمین و آسمان کے سب خزانے ان کے قبضہ میں ہوں تو وہ بھی چاہیں گے کہ یہ سب کچھ دے دلا کر اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کر لیں جو ان کے ان گناہوں کے سلسلہ میں ان کو لاحق ہوگا۔ لیکن یہ صورت بھی ناممکن ہوگی اور انہیں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہی پڑے گی۔

[۶۴] ❁ اللہ کی گستاخی کیسے ہوتی ہے؟ یعنی مشرکین اپنے معبودوں کی شان بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے معبودوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ قیامت کے دن ان کو ٹھیک طرح سے یہ علم ہو جائے گا کہ ہر

مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ۭ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

آجائیں گے اور جس (عذاب) کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ انہیں آگھیرے گا (۴۸) انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا [۶۵] ہے، پھر جب ہم اسے اپنی نعمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے: مجھے تو یہ چیز علم [۶۶] (اور تجربہ) کی بنا پر حاصل ہوئی ہے (بات یوں نہیں) بلکہ یہ ایک آزمائش [۶۷] ہوتی ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔ (۴۹)

طرح کا اختیار اور قدرت صرف اللہ کے پاس ہے اور ان کے معبود بالکل بے بس ہیں۔ اس دن وہ اللہ کی شان میں گستاخیوں کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اور اللہ کے جس عذاب کا صرف اس لیے مذاق اڑایا کرتے تھے کہ روزِ آخرت کے ہی منکر تھے، وہی عذاب انہیں ہر طرف سے گھیرے میں لے لے گا۔

[۶۵] یعنی خوشحالی کے دور میں اپنے معبودوں کی شان بڑھاتے اور اللہ کی گھٹاتے ہیں۔ لیکن مصیبت پڑنے پر پھر اللہ ہی کو پکارتے ہیں اور جن معبودوں کی شان بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے، مصیبت کے وقت وہ کام نہیں آتے۔

[۶۶] اس جملہ کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جو مال و دولت کی فراوانی مجھے نصیب ہوئی ہے۔ پہلے ہی اللہ کے علم میں تھی اور میرے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ دوسرا یہ کہ اللہ کو میری اِستعداد معلوم تھی اور قیاس چاہتا تھا کہ مجھے یہ مال و دولت ملنی چاہئے۔ تیسرا یہ کہ جو کچھ مجھے ملا ہے۔ میرے علم، میرے تجربہ اور میری اِستعداد کے مطابق ہی مجھے ملا ہے۔

[۶۷] ❁ مال کی آزمائش بڑی سخت ہے۔ بحرین کے جزیہ کی رقم کی تقسیم:۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے اور اس دنیا میں ہر انسان کی ہر حال میں آزمائش ہو رہی ہے اور ہر وقت ہو رہی ہے۔ اور جن چیزوں سے انسان کا امتحان ہو رہا ہے ان میں سے ایک نہایت اہم چیز مال و دولت کی فراوانی ہے۔ یہ انسان کے لئے کتنی بڑی آزمائش ہے؟ درج ذیل احادیث سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو بحرین سے جزیہ لانے کے لئے بھیجا۔ جب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جزیہ کا مال لے کر واپس آئے تو اگلے دن صبح کی نماز میں معمول سے زیادہ لوگ شریک ہوئے اور سلام پھیرتے ہی (حسن طلب کے طور پر) آپ ﷺ کے سامنے آئے۔ آپ ﷺ بات سمجھ کر مسکرا دیئے اور فرمایا: تم خوش ہو جاؤ اور خوشی کی امید رکھو۔ (یعنی تم کو روپیہ ضرور ملے گا) پھر فرمایا: "اللہ کی قسم! مجھ کو تمہاری محتاجی کا ڈر نہیں ہے بلکہ مجھ کو تو یہ ڈر ہے کہ تم پر سامانِ زیست کی یوں فراوانی ہو جائے جیسے اگلے لوگوں پر ہوئی اور تم بھی اسی طرح دنیا کے پیچھے پڑ جاؤ جس طرح وہ پڑ گئے اور یہ مال کی کشادگی تمہیں آخرت سے اسی طرح غافل نہ کر دے جس طرح ان لوگوں کو کیا تھا" (بخاری۔ کتاب الرقاق۔ باب مایحذر من زهرة الدنیا والتنافس فیها)

۲۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! مجھے یہ ڈر نہیں کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگ جاؤ گے بلکہ میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم دنیا پر ریجھ نہ جاؤ"

قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے [۶۸] پہلے گزر چکے۔ پھر وہ چیز ان کے کسی کام نہ آئی جو وہ کما رہے تھے (۵۰) چنانچہ اپنی کمائی کے بُرے نتائج انہیں بھگتنے پڑے اور ان لوگوں [۶۹] میں سے جو ظلم کر رہے ہیں وہ بھی عنقریب اپنے کاموں کے بُرے نتائج بھگت لیں گے اور یہ لوگ (ہمیں) عاجز کر سکنے والے نہیں (۵۱) کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ جس کے لئے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ اس میں بھی ان لوگوں کے لئے کئی نشانیاں [۷۰] ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ (۵۲)

۳۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: "ہر امت کی ایک آزمائش ہے اور میری امت کی آزمائش مال ہے" (ترمذی۔ بحوالہ مشکوۃ۔ کتاب الرقاق۔ دوسری فصل)

[۶۸] انہیں لوگوں میں سے ایک قارون تھا۔ جس نے یہی بات کہی تھی کہ مجھے جو مال و دولت ملا ہے تو اس کی وجہ میرا ذاتی علم، تجربہ اور قابلیت ہے۔ پھر جب اسے اسی کے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا تو اس وقت نہ اس کا مال و دولت کسی کام آ سکا اور نہ جاہ و حشم۔

[۶۹] ❁ مال کی کشادگی اللہ کی رضا کی دلیل نہیں:۔ پہلی قومیں بھی اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ ہماری آسودہ حالی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا پروردگار ہم سے راضی اور خوش ہے۔ پھر اس بات کو وہ اپنے آبائی شرکیہ دین کی صداقت پر دلیل لاتے تھے۔ سو انہیں ان باتوں کا جو انجام دیکھنا پڑا وہ سب کو معلوم ہے اور اب جو مشرکین انہی کی ڈگر پر چل رہے ہیں تو یہ بھی ایسے ہی انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ یہ کہیں بھاگ کر اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

[۷۰] ❁ رزق کا انحصار مشیت الٰہی پر ہے:۔ نشانیوں سے مراد یہ ہے کہ رزق کی اس کی بیشی کی حکمتوں پر غور صرف اہل ایمان ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ رزق کے حصول کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کا انحصار محض اللہ کی مرضی اور حکمت پر ہے۔ رزق کا انحصار نہ عقل پر ہے نہ علم پر، نہ قابلیت اور تجربہ پر، نہ جسمانی قوت اور استعداد پر۔ سب انسان ہی یہ چاہتے ہیں اور اس کام کے لئے بھرپور کوشش بھی کرتے ہیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مال و دولت حاصل ہو۔ الا ماشاءاللہ مگر تھوڑے ہی لوگ ہوتے ہیں جو آسودہ حال ہوتے ہیں زیادہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو رزق کی تنگی کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ اگر رزق کا انحصار عقل پر ہوتا تو بے وقوف بھوکے مر جاتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر عقلمند تو پریشان حال ہوتے ہیں جبکہ عقل سے کورے لوگ مال و دولت میں کھیلتے ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات راست باز اور نیک لوگ پریشان حال ہوتے ہیں۔ جبکہ ظالم اور اللہ کے نافرمانوں کو وافر مقدار میں رزق دیا جاتا ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جس کو مال و دولت ملا ہے اللہ اس سے خوش ہے۔ قطعاً غلط ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ رزق کی تقسیم کے لئے ضابطہ الٰہی دوسرا ہے اور اس کی حکمتیں قرآن کریم میں جابجا مذکور ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ

آپ لوگوں سے کہہ دیجئے: اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں [۷۱] پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ یقیناً سارے ہی گناہ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ غفور رحیم ہے (۵۳) اور اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کا حکم مان لو قبل اس کے کہ تم پر

[۷۱] اسلام لانے سے پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں:۔ اس آیت کے انداز سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہے اور ان لوگوں کے لئے پیغام امید لے کر آئی ہے جو دور جاہلیت میں قتل، زنا، چوری، ڈاکے اور ایسے ہی سخت گناہوں میں غرق رہ چکے تھے اور اس بات سے مایوس تھے کہ یہ قصور کبھی معاف نہ ہو سکیں گے۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

۱۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ مشرکوں نے بہت خون کیے تھے اور بکثرت زنا کرتے رہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگے: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں اور جس دین کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ اچھا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یہ بتا دیں کہ ہمارا اسلام لانا ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟" اس وقت (سورہ فرقان کی) یہ آیت ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ...... ﴾ تا آخر اور (سورہ زمر کی) یہ آیت ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ ...... ﴾ تا آخر نازل ہوئی۔" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندو! تم رات دن گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہ معاف کر دیتا ہوں تم مجھ ہی سے معافی مانگو۔ میں معاف کر دوں گا" (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ۔ باب تحریم الظلم)

تحریف معنوی کی ایک مثال:۔ اس آیت کی بعض لوگوں نے بہت عجیب سی تاویل کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے کہہ رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو! یعنی بندے اللہ کے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ یہ تاویل دراصل تاویل نہیں بلکہ بدترین قسم کی تحریف ہے۔ کیونکہ یہ تاویل قرآن کی ساری تعلیم کے برخلاف ہے۔ نیز اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بڑھتی نہیں بلکہ ان پر سخت الزام آتا ہے۔ آپ اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ سب لوگوں کو دوسرے معبودوں کی بندگی سے ہٹا کر خالص اللہ کے بندے بنائیں۔ نہ یہ کہ اپنے ہی بندے بنانا شروع کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اللہ کے بندے تھے اور اس بندگی کا اقرار کرنے سے ہی ایک شخص اسلام میں داخل ہو سکتا ہے اور اس بندگی کا اقرار ہم سب نمازوں میں کئی بار کرتے ہیں۔ اس تاویل کو دیکھ کر بے اختیار ڈاکٹر اقبالؒ کے یہ شعر یاد آ جاتے ہیں:

زمن بر صوفی و ملا سلامے ...... کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شان در حیرت انداخت ...... خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

(ترجمہ: میری طرف سے صوفی و ملا کو سلام ہو جنہوں نے ہمیں اللہ کا پیغام پہنچایا۔ لیکن ان کی تاویل نے اللہ، جبرئیل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کو حیرت میں ڈال دیا (کہ ہم نے کیا کہا تھا اور ان لوگوں نے اس کا کیا مطلب لے لیا ہے)

أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿٥٤﴾ وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٥٥﴾ أَن تَقُولَ نَفْسٌ يَا حَسْرَتَىٰ عَلَىٰ مَا فَرَّطتُ فِي جَنبِ اللَّهِ وَإِن كُنتُ لَمِنَ السَّاخِرِينَ ﴿٥٦﴾ أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿٥٧﴾ أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾

عذاب[۷۲] آئے پھر تمہیں کہیں سے مدد بھی نہ مل سکے۔(۵۴)

اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوا ہے اس کے بہترین[۷۳] پہلو کی پیروی کرو پیشتر اس کے کہ اچانک تم پر عذاب آ جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو(۵۵) (کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت) کوئی کہنے لگے: "افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں[۷۴] اللہ کے حق میں کرتا رہا اور میں تو مذاق اڑانے والوں میں سے تھا(۵۶) یا یوں کہے کہ: "اگر اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں پرہیزگاروں سے ہوتا(۵۷) یا جب عذاب دیکھے تو کہنے لگے: مجھے ایک اور موقعہ مل جائے تو میں نیک کام کرنے والوں میں شامل[۷۵] ہو جاؤں"(۵۸)

[۷۲] یعنی اللہ کی معافی کی دو شرطیں ہیں۔ ایک تو اس کی طرف رجوع کرو یعنی اسلام لے آؤ اور دوسری اس کے احکام بجا لاؤ۔ یعنی آئندہ ایسے گناہوں سے پرہیز کرو گے تو پھر تمہارے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کا اعلان عام ہے۔ لہٰذا جلد از جلد اللہ تعالیٰ کے اس اعلان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ اور یہ خطاب صرف مشرکین مکہ سے ہی نہیں بلکہ اس کا حکم عام ہے اور ہر غیر مسلم کے لئے ہے۔

[۷۳] ❁ اتباع احسن سے کیا مراد ہے؟ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ قرآن کریم سارے کا سارا ہی احسن الحدیث ہے۔ لہٰذا اس میں جو اوامر ہیں ان کی تعمیل کرے، نواہی سے اجتناب کرے' امثال اور قصوں میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ اس کے برعکس جو شخص جو نہ اوامر کی تعمیل کرے نہ نواہی سے اجتناب کرے اور نہ وعظ و نصیحت سے کوئی اثر قبول کرے۔ ایسا شخص وہ پہلو اختیار کرتا ہے جسے کتاب اللہ بدترین پہلو قرار دیتی ہے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کے اوامر کو اچھی سے اچھی شکل میں بجالائے۔ نواہی سے پوری طرح اجتناب کرے بلکہ جس بات میں شک ہو اسے بھی چھوڑ دے اور پند و نصیحت سے بھی وہ مطلب لے اور اثر قبول کرے جو ایک قلب سلیم کا تقاضا ہوتا ہے۔ اپنے نظریات اور خواہشات کو قرآن سے کشید کرنے کی کوشش نہ کرے۔

[۷۴] یعنی میں نے اللہ کے احکام کے مقابلہ میں اپنے آباء کی تقلید کو ترجیح دی۔ اللہ کے حقوق دوسروں کو دیتا رہا۔ اللہ کے بجائے دوسروں کو پکارتا اور ان کی عبادت کرتا رہا۔ اللہ کے دین کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا رہا اور اللہ کی آیات اور اس کی وعید کا مذاق اڑاتا رہا۔ اور ان چیزوں کی کوئی حقیقت تب نہ سمجھی۔ کاش! میں ایسے ایسے کام نہ کرتا جس کے نتیجہ میں مجھے آج یہ برا وقت دیکھنا پڑا۔

[۷۵] مگر اس حسرت کا کچھ فائدہ نہ ہو گا کیونکہ عمل کا وقت گزر چکا ہو گا۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد اب وہ یہ آرزو کرے گا کہ کاش اسے ایک بار پھر دنیا میں بھیج کر موقعہ دیا جائے۔ تو میں یقیناً اچھے عمل کروں گا تاکہ میں بھی نیک لوگوں میں شامل ہو سکوں۔

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٩﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى
الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٦٠﴾
وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْۗءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ
كُلِّ شَيْءٍ ۡ وَّهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿٦٢﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

(اللہ فرمائے گا) کیوں نہیں۔ تیرے پاس میری آیات آئیں تو تو نے انہیں جھٹلا دیا اور اکڑ بیٹھا اور تو تھا ہی کافروں میں[٧٦] سے'' (٥٩) جن لوگوں نے اللہ پر جھوٹ بولا تھا![٧٧] قیامت کے دن آپ دیکھ لیں گے کہ ان کے چہرے سیاہ ہو رہے ہوں گے۔ کیا جہنم میں تکبر کرنے والوں[٧٨] کا ٹھکانا نہیں؟(٦٠) اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے رہے اللہ انہیں ان کی کامیابی کی (وجہ سے) ہر جگہ پر نجات[٧٩] دے گا؛ انہیں نہ تو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے (٦١) اللہ ہی ہر چیز[٨٠] کا پیدا کرنے والا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے(٦٢) آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا۔۔۔۔

[٧٦] یعنی تو جھوٹ بکتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اگر مجھے ایک بار پھر موقعہ دیا جائے تو میں نیکوکار بن جاؤں گا۔ جب تو دنیا میں تھا تو اس وقت تجھے میری آیات پہنچی تھیں۔ لیکن تیری فطرت ہی ایسی ہے جس میں اکڑ اور تکبر ہے جس کی وجہ سے تو میری آیات کو جھٹلاتا رہا۔ اور اب بھی تیری طبیعت ویسی کی ویسی ہے۔ وہ دوبارہ دنیا میں جا کر بدل نہیں جائے گی۔ آج جو کچھ تو کہہ رہا ہے وہ صرف عذاب کو دیکھ کر کہہ رہا ہے۔ جب تو نے اس سے نجات پالی تو تیری اصل فطرت پھر عود کر آئے گی۔

[٧٧] ❁ **اللہ پر افترا کی صورتیں:۔** اللہ پر جھوٹ بولنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے فلاں فلاں معبودوں یا بتوں یا پیاروں کو فلاں فلاں اختیارات سونپ رکھے ہیں۔ لہٰذا رزق کے لئے فلاں کے پاس اور اولاد کے لئے فلاں درگاہ پر اور شفا کے لئے فلاں آستانے پر حاضری دینے سے مراد حاصل ہو جاتی ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کی آیات اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے اور کہا جائے کہ اللہ نے تو کوئی چیز نازل نہیں کی۔ حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ تھی۔

[٧٨] ان کے جھٹلانے کی سزا یہ ہے کہ ان کے منہ کالے کر دیئے جائیں گے جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ ''جھوٹے کا منہ کالا'' اور تکبر کی سزا جہنم کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتی تاکہ اس کے سب کس بل نکل جائیں اور دماغ ٹھکانے پر آ جائے۔

[٧٩] یعنی اللہ تعالیٰ نیکوکار لوگوں کو اتنے بلند مقام پر پہنچا دے گا۔ جہاں انہیں روز محشر کی لو اور تپش نہ پہنچ سکے گی۔ وہاں وہ ہر طرح کی تکلیف سے محفوظ ہوں گے۔ جو اعمال انہوں نے دنیا میں کیے ہوں گے ان پر وہ مطمئن ہوں گے اور انہیں کسی قسم کا غم لاحق نہ ہو گا۔

[٨٠] یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ ہر آن ہر چیز کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ جس سے یہ نظام کائنات باقاعدگی سے چل رہا ہے۔ اس نظام کائنات کی باقاعدگی سے تمام جانداروں کا رزق وابستہ ہے۔ بارش سے زمین نباتات اگاتی ہے۔ نیز ہر طرح کی معدنیات اور دوسرے خزانے جو زمین میں مدفون ہیں سب اللہ ہی کے علم اور تصرف میں ہیں۔ آج بھی اس کے تصرف میں ہیں اور کل بھی اسی کے تصرف میں ہوں گے۔ نیز جنت اور دوزخ بھی اسی کے تصرف میں ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ کی آیات کا

اللّٰهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٦٣﴾ قُلْ أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٦٦﴾ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ

وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں (۶۳) آپ ان سے کہیے: نادانو! کیا تم مجھے یہ مشورہ دیتے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت[۸۱] کروں؟ (۶۴) حالانکہ آپ کی طرف یہ وحی کی جا چکی ہے اور ان لوگوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے تھے، کہ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے عمل برباد[۸۲] ہو جائیں گے اور آپ خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔ (۶۵) بلکہ آپ اللہ ہی کی عبادت کیجئے اور اس کے شکر گزار بن کر رہیے۔ (۶۶) ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں کی

منکر اور اس کا باغی ہے وہ کیسے فلاح کی امید رکھ سکتا ہے ایسے لوگ یقیناً خسارہ میں ہی رہیں گے۔

[۸۱] کفار کے سمجھوتہ کی شکلیں:۔ کفار مکہ نے اسلام کی راہ روکنے کے لئے کئی قسم کے حربے استعمال کئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ عام طریقہ یہ تھا کہ اسلام لانے والوں پر اس قدر ظلم و ستم ڈھائے جائیں کہ اگر وہ اپنے دین پر واپس نہ آئیں تو دوسروں کو ضرور عبرت حاصل ہو اور وہ اسلام قبول کرنے کا نام تک نہ لیں۔ ان سختیوں کے باوجود بھی جب اسلام پھیلتا گیا تو پھر اس کے سیاسی حل سوچے جانے لگے اور مذاکرات کے سلسلے شروع ہوئے۔ کبھی ابو طالب کی وساطت سے آپ کو دھمکی دی گئی۔ کبھی لالچ کی راہیں دکھائی گئیں اور کبھی باہمی سمجھوتہ کی۔ پھر باہمی سمجھوتہ کی بھی کئی شکلیں تھیں۔ ایک یہ کہ تم بھی لچک اختیار کرو کچھ ہم کرتے ہیں اور اس شکل کا ذکر سورہ القلم کی آیات نمبر ۹ میں مذکور ہے۔ انہیں میں سے ایک شکل یہ تھی کہ زیادہ نہیں تو صرف ایک دفعہ ہی آپ ہمارے بتوں کو سجدہ کر دیں تو پھر ہم آپ ﷺ کی باقی باتیں تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ انہیں مذاکرات کی ایک قسم ایسی بھی تھی جس پر غور کرنے کے لئے آپ ﷺ آمادہ ہو چلے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے خیال سے بھی آپ کو سختی سے روک دیا اور اس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۴ میں آیا ہے۔ یہاں بھی آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان مشرکوں کو نہایت سختی سے دوٹوک جواب دے دیں اور کہہ دیں کہ اے نادانو! ہم سب کا خالق بھی اللہ ہو، مالک بھی اللہ ہو، رازق بھی اللہ ہو، کائنات میں ہر قسم کے تصرفات پر قبضہ بھی اللہ کا ہو، تو آخر میں کس خوشی میں ان بتوں کی عبادت کروں۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی نادانی کی بات ہو سکتی ہے؟ یہ تم مجھے کیسا غلط مشورہ دے رہے ہو؟ علاوہ ازیں مجھ پر بھی یہ وحی آچکی ہے اور سابقہ تمام انبیاء پر بھی اسی قسم کی وحی آئی تھی کہ جو شخص بھی اور اسی طرح اگر میں خود بھی شرک کروں تو میرے تمام تر اعمال برباد ہو جائیں گے۔ پھر بھلا میں تمہارا یہ مشورہ کیسے قبول کر سکتا ہوں؟

[۸۲] واضح رہے کہ انبیاء سے شرک کا صدور محال ہے۔ کیونکہ وہ جن مقاصد کے لئے مبعوث کئے جاتے ہیں ان میں اولین مقصد شرک کی بیخ کنی اور توحید کی ترویج ہوتا ہے۔ اسی بات پر وہ خود قائم رہتے اور دوسروں کو دعوت دیتے ہیں۔ یہاں جو آپ کو مخاطب کرکے یہ بات کہی گئی ہے۔ تو اس سے شرک کی انتہائی مذمت مقصود ہے۔

قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ

جیسا کہ اس کی قدر [٨٣] کرنے کا حق ہے۔ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے [٨٤]۔ وہ ان باتوں سے پاک اور بالاتر ہے جو یہ لوگ اس کے شریک ٹھہراتے ہیں(٦٧) اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں موجود مخلوق ہے سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر جسے [٨٥]

[٨٣] یعنی جن مشرکوں نے آپ ﷺ کو بتوں کو سجدہ کرنے کا مشورہ دیا تھا، ان کم بختوں نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا مقام کس قدر ارفع واعلیٰ ہے ان کو اللہ کی عظمت وکبریائی کا کچھ بھی اندازہ نہیں۔ بھلا اللہ کے مقابلہ میں یہ بتوں جیسی حقیر ہستیاں کیا شے ہیں۔ اگر انہیں اللہ کی عظمت اور اس کے مقام کا کچھ اندازہ ہوتا تو ایسی نادانی کی بات کبھی نہ کہتے۔

[٨٤] ❁ قیامت کے دن اللہ کا دنیا کے بادشاہوں سے خطاب:۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی اور پوری کائنات پر کلی تصرف کا یہ حال ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اس کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہے اور اسی مضمون کی تفسیر درج ذیل احادیث بھی پیش کرتی ہیں:

١۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) زمین کو ایک مٹھی میں لے لے گا اور آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا۔ پھر فرمائے گا: "میں بادشاہ ہوں (آج) زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

٢۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کا ایک عالم آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا محمد ﷺ! ہم (اپنی کتابوں میں یہ لکھا ہوا) پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) آسمانوں کو ایک انگلی پر، زمینوں کو ایک انگلی پر، درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور گیلی مٹی کو ایک انگلی پر اور باقی تمام مخلوق کو ایک انگلی پر اٹھا لے گا پھر فرمائے گا: "میں بادشاہ ہوں" یہ سن کر آپ ﷺ اتنا ہنسے کہ آپ ﷺ کی کچلیاں ظاہر ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے اس عالم کے قول کی تصدیق کی۔ پھر یہی آیت پڑھی ﴿ وما قدروا الله ...... ﴾ تا آخر (بخاری۔ کتاب التفسیر) گویا مشرکوں کے سب معبود بھی اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہوں گے۔ جنہیں آج یہ اللہ کا ہمسر قرار دے رہے ہیں۔

[٨٥] ❁ نفخہ صور کی بے ہوشی سے کون مستثنیٰ ہو گا؟:۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسی مخلوق بھی ہو گی جو بے ہوش نہیں ہو گی۔ بعض نے اس استثناء سے چاروں بزرگ فرشتے یعنی جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل مراد لیے ہیں۔ بعض نے ان میں حاملین عرش کو بھی شامل کیا ہے اور بعض نے انبیاء صلحاء اور شہداء کو بھی۔ لیکن اگلے حاشیہ میں مندرج حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں میں سے کوئی بھی اس بے ہوشی سے نہ بچے گا۔ جب رسول اللہ ﷺ بھی بے ہوش ہوں گے تو دوسرے کیسے بچ رہ سکتے ہیں۔ البتہ موسیٰ علیہ السلام کو آپ ﷺ نے مستثنیٰ کیا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ شاید وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے ہوں یا بے ہوش ہوئے ہی نہ ہوں۔ اس لئے کہ وہ دنیا میں ایک بار بے ہوش ہو چکے۔

شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۞ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ
الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۞ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ

اللہ (بچانا) چاہے۔ پھر جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو فوراً سب کے سب اٹھ کر[۸۶] دیکھنے لگیں گے (۶۸) اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے[۸۷] جگمگا اٹھے گی اور (سب کی) کتاب اعمال لا کر رکھ دی جائے گی اور انبیاء اور تمام گواہ[۸۸] حاضر کیے جائیں گے اور لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (۶۹) اور ہر شخص نے جو عمل کیا ہو گا اسے اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا

[۸۶] ❁ اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صور دو بار پھونکا جائے گا۔ درج ذیل احادیث اسی آیت کی تفسیر پیش کرتی ہیں:

❁ نفخۂ صور دو بار یا تین بار:۔ "سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دونوں نفخۂ صور میں چالیس کا فاصلہ ہو گا۔ لوگوں نے پوچھا: "ابو ہریرہؓ کیا چالیس دن کا؟" انہوں نے کہا: یہ میں نہیں کہہ سکتا" پھر لوگوں نے کہا: "کیا چالیس برس کا؟" کہنے لگے یہ میں نہیں کہہ سکتا" پھر لوگوں نے کہا "کیا چالیس ماہ کا؟" کہنے لگے "یہ میں نہیں کہہ سکتا" اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا سارا جسم (مٹی میں) گھل جاتا ہے ماسوائے ریڑھ کی ہڈی کے سرے کے۔ (جو رائی کے دانہ برابر ہوتی ہے) اسی سے تمام خلقت کو ترکیب دے کر اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۲۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "دوسری دفعہ صور پھونکنے پر سب سے پہلے میں سر اٹھاؤں گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش تھامے لٹک رہے ہیں۔ اب میں نہیں جانتا کہ وہ پہلے صور پر بے ہوش ہی نہ ہوں گے یا دوسرے صور پر مجھ سے پہلے ہوش میں آ جائیں گے۔ (کیونکہ دنیا میں وہ ایک دفعہ بے ہوش ہو چکے) لیکن سورہ نمل کی آیت ۸۷ میں ایک اور نفخہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ جسے سن کر زمین و آسمان کی ساری مخلوق دہشت زدہ ہو جائے گی۔ پھر اس کی بعض احادیث سے بھی تائید ہو جاتی ہے اسی لئے بعض علماء کہتے ہیں کہ نفخۂ صور تین بار ہو گا۔ پہلے نفخہ پر صرف گھبراہٹ واقع ہو گی دوسرے نفخہ پر لوگ بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے اور مر جائیں گے۔ اور تیسرے نفخہ پر سب انسان جی اٹھیں گے اور اپنی قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کے حضور چل کھڑے ہوں گے۔

[۸۷] یعنی آج تو زمین سورج کی روشنی سے منور ہوتی ہے مگر میدان محشر کے لئے جو زمین تیار کی جائے گی۔ وہ براہ راست اپنے پروردگار کے نور سے جگ مگ جگمگ کر رہی ہو گی۔

[۸۸] ❁ قیامت کو گواہی کس کس کی ہو گی؟:۔ شہداء سے مراد سر فہرست انبیاءؑ ہیں اور ان کا ذکر اس آیت میں پہلے ہی الگ طور پر آ گیا ہے پھر ان سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے ذریعہ انہیں اللہ کا پیغام پہنچا تھا پھر وہ فرشتے بھی جو ان کے اعمال قلم بند کرتے رہے اور اگر وہ مجرم پھر بھی اپنے گناہوں کا اعتراف نہ کریں گے تو ان کے اپنے اعضاء اور اس ماحول کے در و دیوار اور شجر و حجر سب مجرموں کے خلاف گواہی دیں گے۔

مَا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا
جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ
الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى

اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جاننے والا[۸۹] ہے۔(۷۰) اور جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا انہیں گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکا[۹۰] جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ جہنم پر پہنچ جائیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے داروغے انہیں کہیں گے: "کیا تمہارے پاس تمہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہیں تمہارے پروردگار کی آیات پڑھ کر سناتے اور اس دن کے لئے پیش ہونے سے تمہیں ڈراتے[۹۱] تھے؟ وہ کہیں گے: "کیوں نہیں" مگر کافروں پر عذاب کا حکم ثابت ہو کر رہا۔(۷۱) انہیں کہا جائے گا کہ: جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔

[۸۹] ❁ کیا قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ دے سکتا ہے؟:۔ اگرچہ اللہ ان کے اعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ پھر بھی ان پر گواہیاں قائم کی جائیں گی۔ حتیٰ کہ یا تو مجرم خود اپنے گناہ کا اقرار کر لے یا پھر اس کے خلاف گواہیوں کی بنا پر الزام پوری طرح ثابت ہو جائے اور ان کی سزا کے لئے اتمام حجت ہو جائے۔

اس آیت سے نیز اسی آیت کی تائید میں بعض احادیث سے شریعت کا ایک نہایت اہم مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ قاضی محض اپنے علم کی بنا پر کسی مقدمہ کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فیصلہ کا انحصار گواہیوں پر ہونا ضروری ہے۔ یہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔ اور اسی عدل و انصاف کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ گواہیاں قائم کریں گے۔ بعض علماء نے اس مسئلہ میں اتنی لچک ضرور رکھی ہے کہ اس اصول کا اطلاق حدود و تعزیرات یعنی فوجداری مقدمات پر ہوتا ہے لین دین کے معاملات یا دیوانی مقدمات میں قاضی اپنے علم کی بنا پر فیصلہ دے سکتا ہے لیکن بعض آثار سے اس گنجائش کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مالی مقدمات میں بھی قاضی اپنے علم کو فیصلہ تو دور کی بات ہے، ایک شہادت کے طور پر بھی استعمال میں نہ لائے۔

[۹۰] اس لئے کہ کفر کی بھی بیسیوں اقسام ہیں۔ اور اسی لحاظ سے ان کافروں کی قیامت کے دن گروہ بندی ہوگی۔ اور ان کی گروہ بندی کرنے کے بعد انہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ جیسے ان مجرموں کو، جو عدالت کے فیصلہ کے بعد واقعی مجرم ثابت ہو جاتے ہیں' پابہ زنجیر کر کے جیل خانہ کی طرف لے جایا جاتا ہے اور جس طرح ان مجرموں کے جیل خانہ پہنچنے پر جیل کا پھاٹک کھول دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کافروں کے گروہوں کے جہنم کے پاس پہنچنے پر جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔

[۹۱] ❁ جہنم کے داروغے اور ان کا سوال:۔ جب یہ گروہ جہنم پر پہنچ جائیں گے تو جہنم کے داروغے یا سپرنٹنڈنٹ ملامت کے طور پر انہیں پوچھیں گے، ارے کم بختو! تمہارے پاس اللہ کے رسول تمہیں آج کے حالات سے خبردار کرنے یا ڈرانے کے لئے نہیں پہنچے تھے؟ مجرم جواب دیں گے: آئے تو تھے مگر ہماری بدبختی اور نالائقی کہ ہم نے انہیں سچا نہ سمجھا جس کے نتیجہ میں آج ہم

الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٧٢﴾ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴿٧٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ

تکبر کرنے والوں[۹۲] کے لئے یہ کیسا برا ٹھکانا ہوگا۔(۷۲) اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے انہیں گروہ در گروہ[۹۳] جنت کی طرف چلایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو اس کے دارو غے انہیں کہیں گے: ”تم پر سلامتی ہو، خوش ہو جاؤ اور ہمیشہ کیلئے جنت میں داخل ہو جاؤ(۷۳) وہ کہیں گے: اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور ہمیں اس سر زمین کا وارث[۹۴] بنادیا کہ اس جنت میں ہم جہاں چاہیں رہیں“

یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال کی سزا ہمیں مل کر ہی رہے گی۔

[۹۲] انکارِ حق کی سب سے بڑی وجہ تکبر:۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تکبر یا پندارِ نفس ہوتا ہے۔ حق کو قبول نہ کرنے کی دوسری وجوہ بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ جیسا کہ ابلیس کا بھی اصل جرم تکبر ہی تھا۔ اگرچہ اس نے بھی اپنے موقف کی حمایت میں کئی دلائل پیش کئے تھے۔ اسی طرح کافر قبول حق سے انکار کی خواہ کئی وجوہ بتائیں۔ اللہ کی آیات کا تمسخر اڑائیں۔ اللہ کے عذاب کو چیلنج کریں ان سب کی تہ میں یہی تکبر یا پندارِ نفس ہی کام کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سب جرموں سے بڑا جرم ہوا۔ اسی لئے تمام گروہوں کے الگ الگ جرائم کا نام لینے کے لئے صرف اس جرم کا نام لے لیا گیا ہے جو سب گروہوں میں بطور قدر مشترک پایا جاتا ہے۔

[۹۳] جنت کے درجات:۔ جس طرح کفر کے بہت سے درجات اور اقسام ہیں اسی طرح ایمان اور تقویٰ کے بھی بہت سے درجات ہیں۔ اور ایک حدیث کے مطابق جنت کے سو درجات ہیں جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایمان و تقویٰ کے بھی اتنے ہی درجات ہیں۔ ان متقین کی بھی درجوں کے لحاظ سے گروہ بندی کی جائے گی۔ انہیں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ جب یہ گروہ جنت کے پاس پہنچیں گے۔ تو ان کے پہنچنے سے پہلے ہی جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ جنت کے محافظ فرشتے ان کے استقبال کو آگے بڑھ کر ان پر سلام پیش کریں گے۔ انہیں داخلہ کی بشارت اور مبارک باد دیں گے اور اعلان عام ہوگا کہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

[۹۴] جنت کے بطور وراثت دائمی اور مالکانہ حقوق:۔ اہلِ جنت کو وہاں مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے کہ وہ اپنی اپنی وسیع و عریض الاٹ شدہ جنت میں جس جگہ کو اپنے حالات کے موافق سمجھیں وہاں رہیں۔ کیونکہ تَبَوَّا کا لفظ ایسی جگہ پر رہائش کے لئے آتا ہے جہاں کی آب و ہوا اور ماحول رہنے والے کی طبیعت کے موافق اور سازگار ہو۔

[۹۵] اس جملہ کی نسبت متقین کی طرف بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے یہ بات کہیں گے۔ فرشتوں کی طرف بھی اور

فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾ ع ۸

عمل کرنے والوں کے لئے یہ کیسا اچھا[۹۵] اجر ہے۔(۷۴)

نیز (اس دن) آپ دیکھیں گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ باندھے، اپنے پروردگار کی تعریف[۹۶] کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں۔ اور لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور سب کہیں گے کہ: "سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔" (۷۵)

اللہ تعالیٰ کی طرف بھی۔

[۹۶] ❁ دربار برخواست ہونے پر الحمد للہ رب العالمین کی صدائیں:۔ یعنی جس دن اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے میدان محشر میں نزول اجلال فرمائے گا اس وقت فرشتے اللہ تعالیٰ کے عرش کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گے۔ اور جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان علی رؤس الاشہاد مبنی بر انصاف فیصلہ فرما چکے گا تو ہر طرف سے جوش و خروش کے ساتھ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کا نعرہ بلند ہوگا۔ اسی نعرہ تحسین پر اللہ تعالیٰ کا دربار برخاست ہوگا۔ پھر تمام لوگوں کو ان کے فیصلہ کے مطابق ان کے ٹھکانوں پر بھیج دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ دن موجودہ دن رات کے حساب سے پچاس ہزار برس کا ہوگا۔

۸۵ آیاتها سورۃ المؤمن مکیۃ رکوعها ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝١ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝٢ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ

ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝٣ مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا

کلمات ۱۲۴۲ آیات ۸۵ (۴۰) سورۃ المومن مکی ہے (۶۰) رکوع ۹ حروف ۵۲۱۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ (۱) یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو غالب ہے سب کچھ جاننے والا ہے (۲) وہ گناہ بخشنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا اور صاحب فضل ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اسی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے[1]۔ (۳) اللہ کی آیات میں صرف وہی لوگ جھگڑا کرتے ہیں جو کافر ہیں لہٰذا ان کا دنیا کے ملکوں میں

[1] قرآن کو نازل کرنے والے کی چند جامع صفات:۔ آیت نمبر ۲ اور ۳ اس سورہ کی تمہید ہیں۔ جن میں مکہ کے حالات حاضرہ اور حق و باطل کے جھگڑوں کا ذکر بھی آ گیا ہے اور اس کتاب کے نازل کرنے والے کی چند متعلقہ صفات اس انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ کفار کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ کلام اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں بلکہ تمہاری اپنی اختراع ہے۔ آغاز ہی میں فرمادیا کہ یہ کتاب کسی کمزور ہستی کی طرف سے نہیں بلکہ اس اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے جو کائنات کی ہر چیز پر غالب ہے اور تمہاری معاندانہ کوششوں اور سازشوں کے علی الرغم اپنے کلمہ کو سربلند اور نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا براہ راست اور پورا پورا علم رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں اے کفار مکہ! جو خبریں بھی دی گئی ہیں سب درست اور یقینی ہیں۔ تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنے فرمانبردار بندوں کے بہت سے گناہ از خود ہی بخشتا رہتا ہے۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ کافر توبہ کر کے حلقہ اسلام میں داخل ہو جائیں ان کی توبہ قبول کر کے ان کے سابقہ گناہوں کو معاف کر دینے والا ہے اور اس صفت کا تعلق صرف نو مسلموں سے نہیں بلکہ جو بندہ بھی اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اس کی طرف رجوع کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اس کے گناہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ اپنے باغیوں کو سخت سزا دے کر ان کی اکڑی ہوئی گردنیں توڑ سکتا ہے۔ خواہ وہ یہ عذاب دنیا میں دے یا آخرت میں اور اس کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ کشادہ دست ہے۔ ہر وقت انعامات کی بارش کرتا رہتا ہے۔ اور اس سے اپنے نافرمانوں کو بھی محروم نہیں فرماتا" اتنی صفات بیان کرنے کے بعد ان دو بنیادی جھگڑوں کی حقیقت بیان فرما دی۔ جو رسول اللہ ﷺ اور کفار مکہ کے درمیان چل رہے تھے۔ ان میں پہلا یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ باقی تمام معبود جھوٹے، باطل اور بے کار ہیں اور دوسرا یہ کہ روز آخرت کا قیام یقینی ہے اور تم سب کو یقیناً اللہ کے حضور پیش ہونا ہوگا۔

يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ﴿٤﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ ۖ وَهَمَّتْ
كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ ۖ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ
كَانَ عِقَابِ ﴿٥﴾ وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ﴿٦﴾ الَّذِينَ

چلنا پھرنا آپ کو کسی دھوکے[۲] میں نہ ڈال دے۔(۴) ان سے پہلے قوم نوح اور (رسولوں کے مخالف) کئی جتھوں[۳] نے انہیں[۴] جھٹلایا اور ہر قوم نے اپنے رسول کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا اور باطل کے ساتھ جھگڑا کیا تاکہ باطل سے حق کو شکست دے سکیں، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا تو دیکھ لو میری سزا کیسی تھی۔(۵)

اسی طرح آپ کے پروردگار کا یہ حکم ان لوگوں پر صادق آ گیا کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہی اہل دوزخ[۵] ہیں(۶)

[۲] یہاں سے حالات حاضرہ پر تبصرہ شروع کیا جا رہا ہے کہ کفار مکہ جو اللہ کی آیات کا کبھی مذاق اڑاتے ہیں کبھی ان میں اعتراضات کر کے شکوک پیدا کرتے ہیں کبھی اسلام کی راہ روکنے کے لئے مسلمانوں کو اذیتیں دیتے ہیں اور کبھی سازشیں تیار کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ ہم اگر جھوٹے ہوتے تو اب تک ہم پر اللہ کا عذاب آ جانا چاہئے تھا تو ان لوگوں کا تاحال صحیح و سلامت بچے رہنا اور زمین میں دندناتے پھرنا تم لوگوں کو اس وہم اور دھوکہ میں نہ ڈال دے کہ شاید یہ اللہ کی گرفت سے بچ جائیں گے۔

[۳] ❁ حزب کا مفہوم: احزاب، حزب کی جمع ہے اور ان سے مراد ایسی جماعتیں، گروہ یا پارٹیاں ہیں جن میں سختی اور شدت پائی جائے۔ وہ آپس میں ہم خیال ہوں اور ان کا مقصد اقتدار میں عمل دخل حاصل کرنا ہو۔ یا اس سے چمٹے رہنا ہو اور اس سے مراد وہ اقوام سابقہ ہیں جن پر رسولوں کی دعوت کو جھٹلانے کی بنا پر اللہ کا عذاب آیا تھا۔

[۴] ❁ انبیاء کی مخالفت کرنے والی قوموں کا انجام تاریخی شواہد کی روشنی میں:۔ یہ کفار مکہ اس لئے اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے کہ ان سے پہلے کئی قومیں ان جیسی گزر چکی ہیں۔ مثلاً قوم نوح اور اس کے بعد قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، اور قوم لوط اور آل فرعون وغیرہ۔ یہ سب لوگ اللہ کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے اور آخرت کے دن کے منکر تھے۔ پھر جب ہمارے رسول ان کے پاس آئے تو انہوں نے صرف انہیں جھٹلانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے درپے آزار ہو گئے۔ انہیں قتل اور رجم کی دھمکیاں دینے لگے اور ان کے خلاف سازشیں تیار کرنے لگے۔ غرضیکہ انہوں نے ہر وہ حربہ استعمال کیا جس کے ذریعہ وہ اللہ کے دین کو سرنگوں کر سکیں اور انبیاء کی دعوت کو اور ان کے متبعین کو کچل دیں (اور یہی سب دھندے یہ کفار مکہ کر رہے تھے) پھر جب ان پر میرا عذاب آیا تو دیکھ لو ان کا کیا حشر ہوا۔ کیا ان قوموں کا کوئی نام و نشان نظر آتا ہے۔ آج وہ کہیں دندناتے دکھائی دے رہے ہیں؟ اور ان مشرکین مکہ نے بھی اسی ڈگر پر چلنا شروع کر دیا ہے تو پھر یہ میری گرفت سے کیونکر بچ سکتے ہیں۔ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو تاریخی شواہد کی روشنی میں ان کے انجام سے خبردار کیا ہے۔

[۵] ایسے منکرین حق کے معاملہ میں ایک تو یہ بات حق ثابت ہو کے رہتی ہے کہ اللہ انہیں ایسا کچل کے رکھ دیتا ہے کہ ان کا زمین میں دندنانا یکسر موقوف ہو جاتا ہے۔ اور یہ سزا تو انہیں دنیا میں ملتی ہے اور دوسری یہ بات حق ثابت ہوتی ہے کہ آخرت میں

يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ

جو (فرشتے) عرش اٹھائے ہوئے ہیں[۶] اور جو اس کے گرد ہیں سب اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے اور اس پر ایمان[۷] رکھتے ہیں اور ایمانداروں کے لئے بخشش طلب کرتے (اور کہتے) ہیں "اے ہمارے پروردگار! تو نے اپنی رحمت اور علم سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے لہٰذا جن لوگوں نے توبہ کی اور تیری راہ کی پیروی کی انہیں بخش دے اور دوزخ[۸] کے عذاب سے بچا لے(۷) اے ہمارے پروردگار! انہیں ان ہمیشہ رہنے والے باغات[۹] میں داخل کر جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے آباء و اجداد،

انہیں جہنم کے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

[۶] ❁ حاملین عرش فرشتوں کی مومنوں کے حق میں دعا:۔ ان دندنانے والے کفار مکہ کے مقابلہ میں دوسری طرف مسلمان تھے جن پر کافروں نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور اسی وجہ سے کچھ مسلمان مکہ کو خیر باد کہہ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ ان کی تسلی اور دلجوئی کی خاطر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تمہارے حق میں تو عرش کو اٹھانے والے فرشتے اور ان کے آس پاس رہنے والے سب کے سب دست بدعا رہتے ہیں۔ اور اللہ کی حمد و ثنا جو ان کا وظیفہ اور روحانی خوراک ہے کے ساتھ ہی تمہارے لئے دعائیں کرتے ہیں اور چونکہ فرشتے وہی کچھ کرتے ہیں جو اللہ کی طرف سے انہیں حکم ملتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں یہ حکم دیا ہے کہ وہ مومنوں کے حق میں دعا و استغفار کرتے رہا کریں۔

[۷] ان کا اللہ پر ایمان اس لحاظ سے مضبوط ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قریب رہتے ہیں۔ ان عرشیوں کی سب ہمدردیاں زمین والے مومنوں کے ساتھ ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایمان کا رشتہ نہ صرف یہ کہ جغرافیائی حدود کا پابند نہیں بلکہ عرشیوں اور فرشیوں سب کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔

[۸] یعنی تیرا علم اتنا وسیع ہے کہ تو اپنے بندوں کے سارے حالات ان کے گناہوں اور ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات تک سے واقف ہے تو تیری رحمت اس سے بڑھ کر وسیع ہے۔ لہٰذا جو لوگ توبہ کر چکے اور تیری راہ پر گامزن ہو چکے ہیں تو ان کے گناہ معاف کر کے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

[۹] ❁ جہنم کے عذاب سے بچ جانا بھی بڑی کامیابی ہے:۔ اگرچہ دوزخ کے عذاب سے بچ جانا بھی بہت بڑی کامیابی ہے اور یہ خالصتاً اللہ کی مہربانی اور اس کے فضل سے ہوگا۔ تاہم اگر اللہ تعالیٰ دوزخ سے بچا کر اپنی جنت میں بھی داخل کر دے تو یہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا بڑا انعام اور اس کی مہربانی ہوگی۔ واضح رہے کہ دوزخ کے عذاب سے بچ جانے کا یہ لازمی نتیجہ نہیں کہ اسے جنت میں داخلہ بھی مل جائے۔ اصحاب اعراف دوزخ کے عذاب سے تو بچا لئے جائیں گے۔ لیکن وہ جنت اور دوزخ کے ایک درمیانی مقام

وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ

ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے[۱۰] جو صالح ہیں انہیں بھی' بلاشبہ تو ہر چیز پر غالب، حکمت والا ہے(۸) اور انہیں برائیوں[۱۱] سے بچالے۔ اس روز جسے تو نے برائیوں[۱۲] سے بچالیا گویا تو نے اس پر رحمت کر دی اور یہی بڑی کامیابی ہے(۹) اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے (قیامت کے دن) انہیں پکار کر کہا جائے گا کہ: "(آج) جتنا غصہ تمہیں اپنے آپ پر آ رہا[۱۳] ہے۔

اعراف میں ہوں گے اور وہ اس بات کے منتظر بیٹھے ہوں گے کہ کب ان پر اللہ کی مہربانی ہوتی ہے اور انہیں جنت میں داخلہ کی اجازت ملتی ہے۔

[۱۰] کم درجہ والی اولاد کو بھی اللہ والدین سے ملا دے گا:۔ آخرت میں ہر شخص کو بس اپنی ہی فکر لاحق ہوگی نہ باپ بیٹے کی طرف توجہ دے سکے گا نہ بیٹا باپ کی طرف۔ کوئی رشتہ دار کسی دوسرے کے کام نہ آ سکے گا۔ پھر جب فیصلہ کے بعد نیک لوگوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور ان کے بھی کئی درجات ہوں گے۔ تو اس وقت بعض لوگوں کو اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کی یاد آنے لگے گی۔ ان کی بیویاں اور بیٹے بھی اگرچہ اہل جنت میں سے ہی ہوں گے لیکن ان کے درجات نچلے ہوں گے یعنی وہ اپنے والدین کے درجہ کے برابر صالح نہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی خاص مہربانی سے یا ان فرشتوں کی دعا کی وجہ سے جو اس نے خود ہی فرشتوں کو سکھائی ہوگی، ان کم درجہ والی اولاد کو اونچا درجہ عطا کر کے ان کے والدین سے ملا دے گا۔ اسی طرح بیویوں کو بھی ان کے شوہروں سے ملا دے گا اور سارا کنبہ ایک جگہ اکٹھا ہو جائے گا۔

[۱۱] سیئات کے تین معنی:۔ السَّیِّاٰت کے تین معنی ہیں۔ ایک غلط عقائد، بگڑے ہوئے اخلاق اور برے اعمال، دوسرے، گمراہی اور اعمال بد کا وبال، تیسرے آفات و مصائب اور تکلیفیں خواہ وہ دنیا کی ہوں، عالم برزخ کی ہوں یا عالم قیامت کی ہوں۔ یہاں تینوں قسم کی برائیاں مراد ہیں۔

[۱۲] روز محشر کی برائیوں سے مراد اس دن کی ہولناکیاں، انتہائی تپش اور شدت پیاس، اپنا محاسبہ کا خوف، مجرمین کی برسر عام رسوائی وغیرہ ہیں۔

[۱۳] یعنی جب دیکھیں گے کہ جن چیزوں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ تو ایک حقیقت بن کر سامنے آ گئی ہے اور جس طرح بے راہ روی کی زندگی انہوں نے گزاری ہوگی اور مومنوں پر ظلم و ستم ڈھانے کے لئے انہوں نے جو جو ہتھکنڈے استعمال کئے تھے۔ ان سب چیزوں کا ایک ایک کر کے انہیں بدلہ دیا جانے والا ہے۔ تو وہ اپنے ہاتھ اپنے دانتوں میں چبائیں گے اور انہیں اپنے آپ پر غصہ آئے گا کہ ہم نے کیوں ایسی سرکشی کی راہ اختیار کی تھی۔ اس وقت انہیں فرشتے پکار کر کہیں گے کہ آج جس قدر تمہیں اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے اللہ تعالیٰ کو تم پر اس وقت اس سے بھی زیادہ غصہ آتا تھا جب رسول تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتے اور اس کی آیات پڑھ کر سناتے تھے لیکن تم پہلے تو سنتے ہی نہ تھے اور اگر سنتے تھے تو مانتے نہیں تھے اور ان کا مذاق اڑانے لگتے تھے۔

اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ﴿١٠﴾ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا
اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿١١﴾ ذٰلِكُمْ
بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿١٢﴾
هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ۚ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿١٣﴾

اللہ کو تم پر اس سے زیادہ غصہ آتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم انکار کر دیتے تھے"(۱۰) وہ کہیں گے "ہمارے پروردگار! تو نے دو دفعہ ہمیں مارا اور دو دفعہ زندہ کیا، ہم اپنے گناہوں کا اعتراف[۱۴] کرتے ہیں۔ اب (بتاؤ) کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی راہ ہے؟"(۱۱) (جواب ملے گا کہ) تمہارا یہ حال اس لئے ہے کہ جب تمہیں اللہ اکیلے کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کر دیتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کوئی شریک بنایا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ تو اللہ ہی کے ہاتھ میں[۱۵] ہے جو عالی شان اور کبریائی والا ہے۔(۱۲) وہی تو ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لئے رزق[۱۶] اتارتا ہے مگر (ان باتوں سے) سبق تو وہی حاصل کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہو(۱۳)

[۱۴] ❁ زندگی اور موت کے چار مراحل:۔ موت و حیات کے یہ وہی چار مراحل ہیں جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے آغاز میں آچکا ہے۔ یعنی وہ مردہ تھے اللہ نے انہیں زندگی بخشی اور وہ اپنے والدین کے گھر پیدا ہوئے پھر اس زندگی کے بعد موت کے بعد چوتھا مرحلہ دوبارہ قیامت کو جی اٹھنا۔ ان میں سے پہلے تین مراحل کو سب لوگ ہی جانتے ہیں کیونکہ وہ ہر ایک کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ انکار صرف بعث بعد الموت کا ہوتا ہے جو کسی کے مشاہدہ میں نہیں آیا۔ اور یہ بات ہمیں وحی کے ذریعہ معلوم ہوئی پھر بہت سے عقلی دلائل بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یوم آخرت کو دیکھ کر کافر کہیں گے کہ آج ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ رسولوں کا کہنا برحق تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج ہمیں جو اپنا برا انجام نظر آرہا ہے اس سے بچنے کی بھی کوئی راہ ہے؟

[۱۵] ❁ مشرک کی یہی علامت توحید خالص سے بدکنا:۔ اللہ تعالیٰ کی ایک عاجز مخلوق ہونے کے باوجود تمہارا اپنے پروردگار سے یہ سلوک تھا کہ تمہیں جب کہا جاتا تھا کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہی ہے تو فوراً ناگواری کے آثار تمہارے چہروں پر نمایاں ہو جاتے تھے۔ تمہاری سب نیاز مندیاں اور محبت غیروں کے ساتھ تھیں۔ جب اللہ کے شریکوں کا ذکر ہوتا تو تمہاری باچھیں کھل جاتی تھیں۔ اور آج جو تم التجا کر رہے ہو اس کا فیصلہ اس اللہ کے ہاتھ میں ہے جو تمہاری طرح عاجز مخلوق نہیں۔ بلکہ سب کا خالق اور بڑی بلند شان والا ہے۔ اب تم خود ہی سوچ سکتے ہو کہ اس کا رویہ تمہارے حق میں کیا ہونا چاہئے؟

[۱۶] ❁ بارش کے نظام میں اللہ کی نشانیاں:۔ یعنی آسمان سے بارش نازل فرماتا ہے جو زمینی پیداوار اور تمہارے رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس پورے نظام پر اگر غور کیا جائے کہ اس کائنات میں کون سی قوتیں سرگرم عمل ہوتی ہیں جن کے نتیجے میں بارش برستی ہے پھر اس بارش سے رزق حاصل ہونے تک کون کون سی کائناتی اور زمینی قوتیں کام میں لگی رہتی ہیں۔ کس طرح سورج کی حرارت سے سطح سمندر پر سے آبی بخارات اوپر اٹھتے ہیں، پھر کس طرح ہوائیں انہیں اپنے دوش پر اٹھائے پھرتی ہیں اور جس

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ
يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ هُمْ

لہٰذا اللہ کو خالصتاً اسی کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے پکارا کرو اگرچہ کافر اسے بُرا[۱۷] ہی مانیں۔(۱۴)

وہ بلند[۱۸] درجوں والا ہے، عرش کا مالک ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح[۱۹] (وحی) نازل کرتا ہے تاکہ وہ (لوگوں کو) ملاقات کے دن[۲۰] سے ڈرائے(۱۵) جس دن سب لوگ

طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے، لے جاتی ہیں۔ پھر یہی آبی بخارات کیونکر پھر سے بارش کے قطروں میں منتقل ہوتے ہیں۔ پھر جب کسی خطہ زمین پر بارش برستی ہے تو زمین کی تاریکیوں میں بیج کی پرورش کون کرتا ہے اور کس طرح پودے کی نہایت نرم و نازک کونپل سطح زمین کو چیرتی ہوئی باہر نکل آتی ہے۔ غرضیکہ اس نظام میں بے شمار عجائبات قدرت ہیں۔ پھر ان قوتوں کے باہمی تعاون سے جو مثبت قسم کے نتائج برآمد ہوتے ہیں اس سے از خود معلوم ہو جاتا ہے کہ ان تمام قوتوں پر کنٹرول کرنے والی صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے۔ اگر ہواؤں کا دیوتا الگ ہوتا، سورج کا الگ، بارش کا الگ اور زمین کا کوئی الگ ہوتا تو ان میں ایسا باہمی ارتباط ناممکن تھا کہ ان قوتوں سے ہمیشہ مثبت نتائج ہی حاصل ہو سکیں۔ لیکن یہ باتیں تو صرف وہ لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں جو اللہ کی ان نشانیوں میں کچھ غور و فکر بھی کرتے ہوں۔

[۱۷] ﴿کائنات کی تمام قوتیں ایک ہی حاکم اعلیٰ کے حکم کے تحت سرگرم عمل ہیں:۔﴾ ان آیات الٰہی میں غور کرنے سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں ایک ہی حاکم اعلیٰ کے زبردست کنٹرول کے تحت سرگرم عمل ہیں۔ لہٰذا تمہیں بھی خالصتاً اسی کی حاکمیت تسلیم کر کے باقی ساری کائنات کے ہم آہنگ ہو جانا چاہئے۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کی ان قدرتوں میں غور و فکر گوارا ہی نہیں کرتے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کی آنکھوں پر غفلت، تعصب اور تقلید آباء کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اور انہی باتوں میں مگن رہنے میں ہی وہ خوشی محسوس کرتے ہیں اور اگر انہیں حقائق کی طرف توجہ دلائی جائے تو ان کا تسلیم کرنا تو درکنار، انہیں اس طرف توجہ دلانا بھی ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

[۱۸] یعنی وہ اتنے بلند درجات کا مالک ہے کہ مخلوق کا اس کے قریب ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ اللہ کی صفات اور ان کے اختیارات میں کسی دوسری مخلوق کے شریک ہونے کا تصور کیا جا سکے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مخلص اور فرمانبرداروں کے درجات کو بلند کرنے والا ہے جس حد تک کوئی شخص اللہ کا فرمانبردار بنتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند کرتا جاتا ہے اور قیامت کے دن انہیں درجات کے لحاظ سے اہل جنت کو جنت میں مقام عطا کیا جائے گا۔

[۱۹] (روح کے مختلف معانی کے لئے دیکھئے سورہ النحل کی آیت نمبر ۲ کا حاشیہ نمبر ۳) مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اپنے کسی بندے پر وحی بھیجنے کے سلسلہ میں تمہارے کسی مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی تم وحی کے ٹھیکیدار ہو کہ تمہاری مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کسی کی طرف وحی نہ بھیج سکے۔ وہ خالصتاً اپنی مرضی اور اپنی صوابدید کے مطابق جس پر چاہتا ہے اپنی وحی نازل فرماتا ہے۔

[۲۰] ملاقات سے مراد بندے کی اپنے پروردگار سے ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ اور جنوں، انسانوں اور شیطانوں کی ایک دوسرے سے بھی۔ قیامت کے دن سب کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو جائے گی۔

بٰرِزُوْنَ ۚ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾
اَلْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾ وَ اَنْذِرْهُمْ

کھلے میدان میں ہوں گے اور ان کی کوئی بات بھی اللہ سے چھپی نہ رہے گی (اور پوچھا جائے گا کہ) آج حکومت کس[۲۱] کی ہے؟ (پھر خود ہی فرمائے گا) اللہ اکیلے کی جو سب پر غالب ہے (۱۶) آج ہر شخص کو اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا ہوگا کسی پر آج ظلم[۲۲] نہیں ہوگا۔ بلاشبہ اللہ فوراً حساب لے لینے[۲۳] والا ہے۔ (۱۷)

[۲۱] ❁ قیامت کے دن اللہ تبارک و تعالیٰ کا دنیا کے بادشاہوں سے خطاب:۔ قیامت کے دن ایک وقت ایسا آئے گا جب ہر ایک کو اپنی اپنی ہی پڑی ہوگی۔ سب قیامت کی ہولناکیوں سے دہشت زدہ ہوں گے کسی کو کلام کرنے کی نہ فرصت ہوگی اور نہ جرأت۔ ہر طرف مکمل سکوت اور سناٹا چھایا ہوگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سب کو مخاطب کر کے پوچھے گا۔ آج دنیا کے بادشاہ کہاں ہیں؟ جابر کہاں ہیں اور متکبرین کہاں ہیں؟ بولو! آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے گا۔ حتیٰ کہ چالیس برس ایسے ہی سناٹے میں گزر جائیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ خود ہی اس سوال کا جواب دیں گے کہ آج بادشاہی صرف اکیلے اللہ کی ہے۔ جو ہر چیز کو دبا کے رکھے ہوئے ہے۔

[۲۲] ❁ ظلم کی ممکنہ صورتیں:۔ ظلم کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً پہلی یہ کہ کسی نے ظلم نہ کیا ہو لیکن اسے خواہ مخواہ سزا دے دی جائے۔ دوسری یہ کہ جرم تو تھوڑا ہو مگر اسے سزا زیادہ دے دی جائے۔ تیسری یہ کہ آدمی مستحق تو اجر کا ہوگا مگر اسے سزا دے دی جائے۔ چوتھی یہ کہ جرم تو زید نے کیا ہو مگر اس کی سزا بکر کو دے دی جائے پانچویں یہ کہ آدمی جتنے اجر کا مستحق ہو اسے اس سے کم دیا جائے۔ چھٹی یہ کہ آدمی سزا کا مستحق ہو مگر اسے سزا نہ دی جائے اور مظلوم منہ دیکھتا رہ جائے۔ غرضیکہ ظلم کی جتنی بھی صورتیں ممکن ہیں ان میں کسی بھی صورت کا ظلم اللہ کی عدالت میں ہونے نہ پائے گا۔

[۲۳] ❁ فیصلہ میں دیر لگنے کی وجہ:۔ اللہ تعالیٰ کو ساری مخلوق کا حساب چکانے اور فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس لئے کہ دیر لگنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ انصاف کے تقاضے پورے نہ ہو رہے ہوں جیسے یہاں دنیا کی عدالتوں میں ہوتا ہے کہ کبھی مدعی حاضر نہیں ہوتا اور کبھی مدعا علیہ، کبھی گواہ غیر حاضر ہوتے ہیں اور بار بار کے نوٹسوں کے باوجود عدالت میں حاضر ہی نہیں ہوتے اور اس طرح انصاف کے تقاضے پورے کرتے کرتے ہی سالہا سال لگ جاتے ہیں۔ اللہ کی عدالت میں یہ بات نہ ہوگی۔ وہاں مدعی، مدعا علیہ اور گواہ سب موجود اور اللہ کے علم میں ہوں گے اور جس کی ضرورت ہوگی وہ فوراً حاضر ہو جائے گا یا حاضر کر لیا جائے گا۔ دیر کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں قاضی ایک وقت میں ایک ہی مقدمہ کی سماعت کر سکتا ہے لیکن اللہ کے ہاں یہ معاملہ نہیں۔ وہ جس طرح بیک وقت ہر ایک کو دیکھتا، ہر ایک کی سنتا، ہر ایک کی دادرسی کرتا اور ہر ایک کو رزق دے رہا ہے۔ اسی طرح وہ بیک وقت اپنی تمام مخلوق کے مقدمات کی سماعت بھی کر سکتا ہے اور ان کے فیصلے بھی کر سکتا ہے۔

يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ۬ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ
يُّطَاعُ ؕ﴿۱۸﴾ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۲۰﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا

اور (اے نبی!) انہیں قریب آ پہنچنے[۲۴] والے دن سے ڈرایئے جب غم کے مارے کلیجے منہ کو آ رہے[۲۵] ہوں گے (اس دن) ظالموں کا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ ایسا سفارشی[۲۶] جس کی بات مانی جائے (۱۸) اللہ تعالیٰ نگاہوں کی خیانت[۲۷] کو بھی جانتا ہے اور ان مخفی باتوں کو بھی جو سینوں نے چھپا رکھی ہیں (۱۹) اور اللہ ہی انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ اور اللہ کے علاوہ جنہیں[۲۸] یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو کچھ بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے (۲۰) کیا ان لوگوں نے زمین

[۲۴] ❁ اٰزِف کا لغوی مفہوم: اٰزِفَۃ۔ اَزِف میں وقت کی تنگی کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ گاڑی یا جہاز کے روانہ ہونے میں وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ لہٰذا جلدی کرو۔ اسی طرح قیامت کا دن جو یقینی طور پر آنے والا ہے اسے بس آیا ہی سمجھو اور اس کے لئے جو کچھ سامان کرنا ہے جلدی جلدی کر لو۔

[۲۵] ❁ کَظم کا لغوی مفہوم:۔ کَاظِمِیْنَ۔ کظم سانس کی نالی کو کہتے ہیں اور کظم السقاء بمعنی مشک کو (پانی سے نبالب بھر کر اس کا منہ بند کر دینا ہے اور کاظم، کظیم اور مکظوم اس شخص کو کہتے ہیں جو غم و غصہ سے سانس کی نالی تک بھرا ہوا ہو مگر اسکا اظہار نہ کرے اور اسے دبا جائے۔ یعنی مجرموں کو اپنی دنیا کی زندگی کی کرتوتوں پر اس قدر غم ہوگا جس کی گھبراہٹ کی وجہ سے ان کے کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے۔

[۲۶] ❁ سفارش کا عوامی عقیدہ:۔ شفاعت کے متعلق مشرکوں نے جو غلط سلط عقیدے گھڑ رکھے ہیں، بالکل بے کار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مثلاً فلاں حضرت کا دامن پکڑ لیا جائے اور اس کی بیعت کر لی جائے تو بس بیڑا پار ہے۔ وہ اللہ کے حضور سفارش کر کے ہمیں چھڑا لیں گے۔ حالانکہ قرآن کی صراحت کے مطابق یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ جن حضرات کو وہ شفیع سمجھ رہے ہیں وہ خود کس حال میں ہوں گے۔ نیز انہیں شفاعت کی اجازت بھی ملے گی یا نہیں اور اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انہیں اجازت مل جائے گی تو پھر بھی یہ کب لازم آتا ہے کہ اس کی بات مان بھی لی جائے گی۔ لہٰذا کسی کی شفاعت پر انحصار کرنا بالکل عبث ہے۔

[۲۷] ❁ آنکھوں کی حرکات کی اقسام:۔ آنکھوں کی بے شمار حرکات ہوتی ہیں۔ جن میں اکثر مذموم اور خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ کے ضمن میں آتی ہیں۔ مثلاً بطور طعن و تشنیع آنکھیں مارنا پھر استہزاء کی نظر اور طرح ہوتی ہے پھر آنکھوں آنکھوں میں باتیں بھی ہوتی ہیں۔ دوسروں سے آنکھیں بچا کر غیر محرم عورتوں کو بدنظری سے چوری چھپے دیکھا بھی جاتا ہے۔ اللہ آنکھوں کے ان سب قسم کے اشاروں کو بھی جانتا ہے اور دلوں میں پیدا ہونے والے جن خیالات کے نتیجہ میں آنکھیں ایسے اشارے اور حرکات کرتی ہیں وہ ان خیالات تک سے بھی واقف ہے۔

[۲۸] یعنی انصاف کے ساتھ وہی ہستی فیصلہ کر سکتی ہے جس کی وسعت علم کا یہ حال ہے کہ وہ آنکھوں کے اشاروں سے اور ان

فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ
قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ﴿۲۱﴾
ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ
الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿۲۳﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ

میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں ان کا کیا انجام ہوا۔ وہ ان سے قوت میں بھی زیادہ تھے۔ اور اپنی یادگاریں بھی ان سے زیادہ چھوڑ گئے تھے۔ پھر ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ اور انہیں اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا[۲۹] کوئی نہ تھا۔(۲۱)

یہ اس لئے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل[۳۰] لے کر آئے تو انہوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً بڑی قوت والا اور سخت سزا دینے والا ہے۔(۲۲) نیز ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزات اور صریح[۳۱] سند دے کر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا تھا(۲۳) مگر انہوں نے کہا کہ

خیالات تک سے واقف ہے جن کے تحت آنکھوں میں یہ اشارے اور حرکات پیدا ہوئیں۔ اب اللہ کے سوا دوسری ہستیاں جنہیں پکارا جاتا ہے خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان وہ تو خود کئی مقدمات میں مسئول ہوں گے اور کئی مقدمات میں ماخوذ ہوں گے۔ وہ بھلا دوسروں کا کیا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب انہیں یہ علم ہی نہ ہو کہ جس شخص کے حق میں وہ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں اس کے کرتوت کیا تھے تو وہ فیصلہ کیا کر سکتے ہیں؟

[۲۹] ❁ اپنی یادگار چھوڑنے کا شوق:۔ اپنی یادگار چھوڑنے کا شوق اس آدمی کو ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھتا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس معاملہ میں بھی ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہے۔ ان لوگوں نے ایسی یادگاریں چھوڑیں جو ان کی شان و شوکت پر دلالت کرتی تھیں۔ پھر جب اللہ کا عذاب آیا تو نہ شان و شوکت ان کے کسی کام آئی اور نہ چھوڑی ہوئی یادگاریں۔ پھر جب دنیا میں انہیں کوئی چیز اللہ کے عذاب سے بچا نہ سکی تو آخرت میں انہیں کون بچا سکے گا۔

[۳۰] ❁ بینات کے مختلف معانی:۔ بَيِّنَاتٌ (بینة) کی جمع دراصل ایسی دلیل کو کہتے ہیں جس کے سامنے فریق ثانی لاجواب ہو جائے۔ پھر اس لفظ کا اطلاق معجزات انبیاء پر بھی ہو سکتا ہے اور قرآن کی آیات پر بھی کیونکہ بار بار کے چیلنج کے باوجود کافر قرآن کی مثل پیش نہ کر سکے تھے۔ اور ایسے عقلی دلائل پر بھی جو فریقین میں مسلم ہوں۔ اور ایسی واضح ہدایات پر بھی جنہیں دیکھ کر ہر معقول آدمی یہ سمجھ سکے کہ ایسی تعلیم کوئی جھوٹا خود غرض آدمی نہیں دے سکتا۔

[۳۱] ❁ سلطان کا مطلب:۔ سلطان کا معنی ایسی دلیل ہے جو سند یا دستاویز کی حیثیت رکھتی ہو اور جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ شخص جو کچھ کر رہا ہے وہ صرف اپنی ہی نہیں کسی دوسری قوت کے بل بوتے پر کر رہا ہے۔ اور ایسے حالات و واقعات موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بارہا پیش آتے تھے۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی حکومت کے مفرور مجرم تھے۔ اس کے باوجود آپ خود ہی سیدھے اس کے دربار میں پہنچ گئے اور اسے اللہ کا پیغام سنا کر اپنی اطاعت کی دعوت دی اور یہ بھی کہا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ہمراہ روانہ کر دے۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جن سے وہ جل بھن گیا تھا۔ مگر اس

فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ

"یہ تو جادو گر ہے بڑا[۳۲] جھوٹا" (۲۴) پھر جب وہ ہماری طرف سے دین حق ان کے پاس لایا تو کہنے لگے: "جو لوگ ایمان لا کر موسیٰ کے ساتھ مل گئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو" مگر کافروں کی یہ چال[۳۳] ناکام ہی رہی۔ (۲۵) اور فرعون کہنے لگا: "مجھے چھوڑو[۳۴]

کے باوجود آپ پر ہاتھ اٹھانے یا آپ کو کوئی تکلیف پہنچانے کی جرأت نہ کر سکا اور کہا تو بس یہی کہا کہ اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو کوئی معجزہ ہے تو وہ پیش کرو۔ پھر جب بھی مصر پر کوئی عذاب نازل ہوتا تو فرعون سیدنا موسیٰؑ سے التجا کرتا ہے اگر یہ مصیبت دور ہو جائے تو میں ایمان لے آؤں گا۔ پھر جب سیدنا موسیٰؑ دعا کرتے تو وہ مصیبت ٹل بھی جاتی تھی۔ ایسی تمام باتوں سے صاف واضح ہوتا تھا کہ سیدنا موسیٰؑ کی پشت پر کوئی غیبی طاقت موجود ہے۔ جس سے فرعون اور اس کے سب درباری خائف تھے اور یہی سلطان مبین کا مطلب ہے۔

[۳۲] ان کے یہ الزام محض زبانی اور دوسرے لوگوں کو مطمئن رکھنے کی غرض سے تھے آپ نے جو لاٹھی کے سانپ بن جانے اور ید بیضاء کے معجزات پیش کیے تھے اس لحاظ سے وہ سیدنا موسیٰؑ کو جادوگر کہہ دیتے تھے۔ اور آپ کے دعوائے رسالت کے لحاظ سے آپ کو جھوٹا کہتے تھے۔ مگر خود وہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ سیدنا موسیٰؑ نہ جادوگر ہیں اور نہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ کیونکہ جادوگر تو فرعون کے ملک میں بے شمار تھے۔ مگر کسی جادوگر سے یہ تو نہ ہو سکا کہ وہ اپنے جادو کے زور سے ملک بھر میں قحط مسلط کر دے اور جب اس سے اس قحط کو دور کرنے کی درخواست کی جائے تو وہ اپنے جادو کے زور سے بارشیں برسا کر قحط ختم کر دے۔ بلکہ جادوگروں نے ہی تو بھرے میدان میں سیدنا موسیٰؑ پر ایمان لا کر فرعون کی مکارانہ سازشوں کی قلعی کھول دی تھی۔

[۳۳] ❁ بنی اسرائیل کے استیصال کے لئے فرعون کا اقدام:۔ سیدنا موسیٰؑ پر ایمان لانے والوں کے لئے یہ سزا فرعون نے اس لئے مقرر کی تھی کہ اس طرح وہ لوگوں کو دہشت زدہ کر کے سیدنا موسیٰؑ کا ساتھ دینے سے روک دے وہ چاہتا یہ تھا کہ اس طریقہ سے بنی اسرائیل کی قوم کا ہی استیصال کر دیا جائے مگر اس کی ان دھمکیوں اور سزاؤں کے باوجود سیدنا موسیٰؑ پر ایمان لانے والوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔

[۳۴] ❁ فرعون کی گیدڑ بھبکی:۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب سیدنا موسیٰؑ پر ایمان لانے والوں میں کمی ہونے کے بجائے ان کی تعداد بڑھتی ہی گئی تو فرعون نے سوچا کہ اب اس مصیبت کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ سیدنا موسیٰؑ ہی کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے درباریوں نے جو صحیح صورت حال سے واقف ہو چکے تھے اسے اس کام سے منع کر دیا کہ کہیں ملک میں کوئی بڑی بغاوت نہ اٹھ کھڑی ہو، تو ان درباریوں کو فرعون نے یہ جواب دیا ہو کہ اب یہ کام کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔ لہٰذا مجھے یہ کام کرنے سے مت روکو۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے کسی نے بھی روکا نہ ہو مگر وہ محض اپنی بہادری جتلانے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہو۔ مگر چونکہ وہ خود بھی دل میں ڈرا اور سہما ہوا تھا اس لئے وہ اس طرح بات کر رہا تھا۔

أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۖ إِنِّي أَخَافُ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَن يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ
الْفَسَادَ ﴿٢٦﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ
ع الْحِسَابِ ﴿٢٧﴾ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن

میں خود موسیٰ کو قتل کئے دیتا ہوں اور وہ اپنے پروردگار کو پکار کر دیکھ لے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ یہ تمہارے دین کو بدل ڈالے گا[۳۵] یا ملک میں فساد[۳۶] بپا کر دے گا" (۲۶)

اور موسیٰ نے کہا' میں نے اپنے اور تمہارے پروردگار کی ہر ایسے متکبر سے جو روز[۳۷] حساب پر ایمان نہیں رکھتا، پناہ لے لی ہے۔(۲۷) اور (اس موقعہ پر) آل فرعون میں سے ایک مومن آدمی، جو اپنا ایمان چھپائے[۳۸] ہوئے تھا، بول اٹھا: "کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ

ورنہ اگر وہ خود خائف نہ ہوتا اور اس کام کا ارادہ کر لیتا تو اسے کون روکنے والا تھا؟

[۳۵] ❁ دین سے مراد تمدن اور ملکی نظام ہے:۔ یہاں دین سے مراد صرف سورج دیوتا یا بچھڑے کی پوجا ہی نہیں بلکہ پورے کا پورا انتظام سلطنت اور نظام تمدن ہے۔ یعنی فرعون کو اصل خطرہ تو یہ تھا کہ کہیں اس ملک کی فرمانروائی اس سے چھن نہ جائے۔ مگر اس نے اس بات کو مکار سیاسی لیڈروں کے انداز میں پیش کیا کہ تمہارا دین، جس سے تمہیں محبت ہے۔ وہی نہ بدل ڈالے، جیسے ہمارے ہاں سیاسی لیڈر ایسے بیان دیتے رہتے ہیں کہ عوام یہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد نئے انتخابات کرائے جائیں۔ حالانکہ عوام بیچارے آئے دن کے انتخابات سے پہلے ہی بیزار بیٹھے ہوتے ہیں۔

[۳۶] یعنی اگر وہ اس نظام کو بدل نہ سکے تب بھی یہ خطرہ ضرور ہے کہ ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا تحفظ امن عامہ کی خاطر ضروری ہے کہ جیسے بھی بن پڑے موسیٰ کو قتل کر کے ان آنے والی پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

[۳۷] ❁ متکبر اور ظالم وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو آخرت کے منکر ہوں:۔ فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی بات خواہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں کی ہو یا انہیں کسی واسطہ سے فرعون کی اس دھمکی کا علم ہوا ہو۔ بہرحال جب انہوں نے یہ بات سنی تو اپنی قوم سے کہنے لگے: مجھے فرعون کی ایسی دھمکیوں کی کچھ بھی پروا نہیں۔ فرعون اکیلا تو کیا دنیا بھر کے متکبر اور جابر جمع ہو جائیں تب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ میں اپنے آپ کو اپنے پروردگار کی پناہ میں دے چکا ہوں اور وہ مجھے ان کے شر سے بچانے کے لئے کافی ہے۔ ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متکبر، جابر اور ظالم صرف وہ لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو روز آخرت پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔

[۳۸] ❁ اپنے ایمان کو چھپانے والا مرد مومن:۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص فرعون کا چچازاد بھائی تھا۔ یا کوئی اور بھی ہو تو کم از کم فرعون کے درباریوں اور قریبی لوگوں میں سے تھا۔ اور وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے جب ایک قبطی مارا گیا تھا تو اسی شخص نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی تھی کہ تمہارے قتل کے منصوبے ہو رہے ہیں لہٰذا جلد از جلد یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس وقت اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نبی نہیں تھے اور اس وقت آپ پر ایمان کا سوال بھی پیدا نہیں

يَقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝۲۸

میرا پروردگار اللہ ہے حالانکہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلائل[۳۹] لے کر آیا ہے؟ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر ہے اور اگر وہ سچا ہے تو جس (عذاب) کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے اس کا کچھ نہ کچھ حصہ تمہیں پہنچ کے[۴۰] رہے گا۔ اللہ یقیناً ایسے شخص کو راہ پر نہیں لاتا جو حد سے بڑھنے[۴۱] والا اور کذاب ہو (۲۸)

ہوتا تھا۔ تاہم وہ سیدنا موسیٰؑ کے اخلاق و عادات سے متاثر تھا اور اسی لئے آپ کا ہمدرد بھی تھا اس جملہ سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ فرعون کی سختیوں کے باوجود سیدنا موسیٰؑ کی دعوت اندر ہی اندر پھیل گئی تھی۔ حتیٰ کہ فرعون کے ایوانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اور دوسری یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی ایماندار شخص کافر معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے اپنے ایمان کو ظاہر نہ کرے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

[۳۹] ❁ فرعون اور مردِ مومن کا مکالمہ:۔ جب فرعون نے بھرے دربار میں یہ بات کہی تو اس مردِ مومن سے ضبط نہ ہو سکا اور فوراً بول اٹھا کہ جس شخص کو تم قتل کرنے کے درپے ہو آخر اس کا جرم کیا ہے۔ جس کی بنا پر تم اسے قتل کرتے ہو؟ کیا اس کا یہی جرم نہیں کہ وہ تمہیں پروردگار کی طرف بلاتا ہے۔ پھر اس کے پاس واضح دلائل موجود ہیں، جنہیں تم بھی جانتے ہو، کہ وہ اپنے قول میں سچا ہے۔ کیا یہ ایسا ہی جرم ہے کہ اسے مستوجب قتل قرار دیا جائے؟

[۴۰] اس مردِ مومن نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس کی دعوت کے متعلق دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے قول میں جھوٹا ہو۔ اس صورت میں تم اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟ جھوٹ کے پاؤں کہاں ہوتے ہیں وہ جلد یا بدیر اپنی موت آپ ہی مر جائیگا۔ اور اگر وہ سچا ہوا اور تم نے اسے قتل کر دیا تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری خیر نہیں۔ پھر تو جس عذاب کی وہ تمہیں دھمکی دیتا ہے وہ لازماً تم پر نازل ہو کے رہے گا۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔

[۴۱] یہ جملہ جو اس مردِ مومن نے بولا یہ جیسے سیدنا موسیٰؑ پر فٹ آتا تھا ایسے ہی فرعون پر آتا تھا۔ یعنی اگر موسیٰؑ نعوذ باللہ جھوٹ سے کام لے رہے ہیں کہ اس کام میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ تم سیدنا موسیٰؑ کو قتل کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہو تو یاد رکھو اللہ ایسے شخص کو کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا اور وہ سچا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جھوٹے تم ہو اور جھوٹا ہونے کے باوجود اس حد تک آگے بڑھے جا رہے ہو کہ اسے قتل کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہارا بیڑا غرق ہو کے رہے گا۔

❁ عقبہ بن ابی معیط کا آپ کا گلا گھونٹنا:۔ بالکل ایسا ہی ایک واقعہ دور نبوی ﷺ میں پیش آیا۔ ایک بدبخت مشرک عقبہ بن ابی معیط نے آپ ﷺ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ اتفاق سے سیدنا ابو بکرؓ موقعہ پر پہنچ گئے تو انہوں نے بھی اس موقعہ پر یہی آیت پڑھی تھی۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے پوچھا: "مجھے بتاؤ کہ مشرکین مکہ نے نبی اکرم ﷺ کو

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَاۗءَنَا ۭ
قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝۲۹ وَقَالَ الَّذِيْٓ
اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝۳۰ۙ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ

"اے میری قوم! آج تمہاری ہی حکومت ہے اور ملک میں تم ہی غالب ہو لیکن اگر اللہ کا عذاب آجائے تو کون ہماری مدد[۴۲] کرے گا؟" فرعون کہنے لگا "میں تو تمہیں وہی کچھ دکھاتا ہوں جو خود دیکھ[۴۳] رہا ہوں اور میں تمہیں وہی راہ دکھاتا ہوں جو بھلائی کی راہ ہے" (۲۹)

اور جو شخص ایمان لایا تھا وہ کہنے لگا "اے میری قوم مجھے ڈر ہے کہ تم پر بھی ایسا دن نہ آجائے جیسا (رسولوں کے مخالف) جتھوں پر آیا تھا۔ (۳۰) جیسے قوم نوح، عاد، ثمود، اور ان کے بعد آنے والوں کی بری حالت[۴۴] ہوئی

سب سے زیادہ جو تکلیف دی وہ کیا تھی؟ وہ کہنے لگے کہ "ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ بن ابی معیط آگے بڑھا، آپ ﷺ کے مونڈھے کو پکڑا پھر آپ ﷺ کی گردن میں کپڑا ڈال کر مروڑا دیا اور اتنی زور سے گلا گھونٹا (جیسے مار ہی ڈالے گا) اتنے میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آگئے، انہوں نے عقبہ کا مونڈھا تھاما اور آپ ﷺ سے اس کو پرے دھکیل دیا اور فرمایا "کیا تم اس شخص کو صرف اس لئے مار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح نشانیاں بھی لے کر آیا ہے" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۴۲] کیا تم اس کے قتل کی بات محض اس لئے کرتے ہو کہ آج تمہارے ہاتھ میں حکومت ہے اور اگر تم ایسا کر بھی لو گے تو تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن اگر وہ سچا ہوا اور ہم پر اللہ کی طرف سے عذاب آگیا تو اس وقت تمہاری یہ حکومت کسی کام نہ آئے گی۔ اور سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک بھی اس نے اپنا ایمان ظاہر نہ کیا تھا۔ اور فرعون اور اس کے درباریوں سے غیر جانبدار رہ کر ناصحانہ قسم کی باتیں کر رہا تھا۔

[۴۳] فرعون کے اس جملہ سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ فرعون اسے تاحال اپنا مخالف یا مومن نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسے اپنا ناصح ہی سمجھ رہا تھا۔ اسی لئے اس نے اس مرد مومن کو یہ جواب دیا کہ مجھے تو اسی بات میں بھلائی نظر آتی ہے کہ اس شخص کو قتل کر دینا ہی بہتر ہے اور میں اپنی سمجھ اور بصیرت کے مطابق جو حالات سامنے دیکھ رہا ہوں وہی تمہیں بتا رہا ہوں اور اسی میں تمہاری بھلائی سمجھتا ہوں۔

[۴۴] فرعون کے جواب سے اس مرد مومن کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ فرعون نے اس کی نصیحت کا خاک بھی اثر قبول نہیں کیا۔ اور اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی تو اس نے مزید وضاحت سے سمجھانا شروع کیا اور کہا کہ تم سے پہلے بہت سی ایسی قومیں گزر چکی ہیں جو شان و شوکت میں تم سے بھی بڑھ کر تھیں۔ جیسے قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ، ان لوگوں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا اور ان کے درپے آزار ہو گئے تھے جس کے نتیجہ میں ان پر عذاب آیا جس نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا تھا اور مجھے یہ خدشہ ہے کہ ہم پر بھی کہیں ایسا ہی عذاب نازل نہ ہو جائے۔

وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿ۙ۳۲﴾ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۚ مَا لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ ﴿۳۳﴾ وَ لَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّا

تھی۔اور اللہ تو یہ نہیں چاہتا کہ (اپنے) بندوں پر ظلم[۴۵] کرے(۳۱)اے میری قوم! میں تم پر آہ و فغان کے دن[۴۶] (کے آنے) سے ڈرتا ہوں(۳۲)جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگے بھاگے پھرو گے مگر تمہیں اللہ سے[۴۷] کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور جسے اللہ گمراہ کرے اسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں(۳۳)اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آئے تھے، مگر جو کچھ وہ لائے اس کے متعلق تم شک[۴۸] ہی میں پڑے رہے۔

[۴۵] ❁ پیغمبر اللہ کے سفیر ہوتے ہیں:۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر ظلم کرنے یا ان پر عذاب نازل کرنے کا شوق ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ بندوں کے اپنے ہی اعمال ہوتے ہیں جو سزا کا موجب بن جاتے ہیں جیسے دنیا کی کوئی حکومت بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس کے سفیر کو رسوا کیا جائے یا اسے قتل ہی کر دیا جائے۔ بلکہ فوراً انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ تو بھلا اللہ تعالیٰ جو سب پر غالب ہے اور انتقام لینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنے رسولوں کو رسوا ہوتا دیکھ کر ان کی مدد نہ کرے گا اور رسوا کرنے والوں سے انتقام نہ لے گا؟

[۴۶] ❁ یوم التناد کے مختلف مفہوم:۔ اکثر مفسرین نے ﴿یَوۡمَ التَّنَادِ﴾ سے مراد قیامت کا دن لیا ہے جس دن تابعداری کرنے والے اپنے بڑوں (مطاع حضرات) کے متعلق فریاد کر رہے ہوں گے۔ مظلوم ظالم کو پکڑے ہوئے فریاد کر رہا ہوگا۔ عابد اپنے معبودوں سے نالاں ہوں گے وغیرہ یا اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل جنت اہل دوزخ سے، اہل اعراف اہل دوزخ سے، دوزخی آپس میں جنتی آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہوں گے لیکن جن مفسرین نے ﴿یوم التناد﴾ سے مراد عذاب الٰہی کے نازل ہونے کا دن مراد لیا ہے۔ وہ ربط مضمون کے لحاظ سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یعنی عذاب الٰہی کے وقت وہ سب آہ و فغاں کرتے ہوں گے اور اسی حال میں ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

[۴۷] اس سے مراد قیامت کا دن بھی ہو سکتا ہے اور کسی قوم پر عذاب کا دن بھی۔ لیکن اس وقت اگر کوئی پیٹھ پھیر کر بھاگنا بھی چاہے تو وہ اللہ کی گرفت سے کبھی بچ نہیں سکتا۔

[۴۸] ❁ یوسف علیہ السلام کے متعلق افراط و تفریط کی انتہا:۔ یہ بھی اس مرد مومن کی تقریر کا حصہ ہے۔ اس نے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک مصر میں یوسف علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ جن کی حسن تدبیر سے یہ ملک سات سالہ قحط کے دور میں امن کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا اور آس پاس کے ملکوں کو بھی غلہ مہیا کرتا رہا جن کے پاکیزہ سیرت و اخلاق سے بادشاہ مصر اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس نے حکومت ہی سیدنا یوسف علیہ السلام کے حوالہ کر دی تھی اور جن کا دور حکومت عدل و انصاف کے لحاظ سے تم بہترین دور تسلیم کرتے ہو لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے جیتے جی تم شک و شبہ میں ہی پڑے رہے اور ان پر ایمان نہ لائے۔ یہ تمہاری ایک انتہا تھی۔ پھر جب وہ فوت ہو گئے تو تم نے ان کی شان یوں

جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ
مُسْرِفٌ مُّرْتَابُۨ ۝٣٤ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝٣٥ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ
لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝٣٦ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ

یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے تو تم کہنے لگے کہ اس کے بعد اللہ ہرگز کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ ایسے لوگوں کو گمراہ کردیتا ہے جو حد سے بڑھنے والے اور شک کرنے والے ہوں(۴۸) جو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل[۴۹] آئی ہو۔ یہ چیز اللہ اور ایمانداروں کے نزدیک بڑی بیزاری کی بات ہے۔ اسی طرح اللہ ہر تکبر کرنے والے سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے" (۳۵)

اور فرعون کہنے لگا: "اے ہامان: میرے لئے ایک بلند عمارت بناؤ تاکہ میں ان راستوں تک پہنچ سکوں(۳۶) جو آسمانوں کے راستے ہیں، پھر موسیٰ کے الٰہ کی طرف جھانک سکوں اور میں تو اسے جھوٹا ہی خیال[۵۰] کرتا ہوں۔

بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کی کہ یوں کہنے لگے کہ اب سیدنا یوسف علیہ السلام جیسا رسول کہاں آئے گا؟ اور یہ خیال کرکے باقی جو انبیاء آئے انہیں جھٹلانا شروع کردیا۔ یہ تمہاری دوسری انتہا تھی۔ اور آج تم سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا بھی انکار کر رہے ہو۔ وہ بھی تمہاری غلط روش تھی اور یہ موجودہ روش بھی غلط ہے۔ وہ بھی حق کا انکار تھا' یہ بھی حق کا انکار ہے۔ اس وقت بھی تم شک میں پڑے رہے اور اب بھی شک میں پڑے ہوئے ہو۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں گمراہی لکھی ہوتی ہے۔

[۴۹] ❁ گمراہ ہونے والوں کی صفات:۔ گمراہ ہونے والوں کی دو صفات تو اوپر مذکور ہو چکیں۔ ایک یہ کہ حق سے انکار کرتے اور اپنی بداخلاقی اور فسق و فجور میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم جس کا اکثر حصہ توحید اور آخرت سے متعلق ہوتا ہے' سے ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کی تیسری صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے اور ان میں اس طرح کج بحثی کرتے ہیں جس کی بنیاد نہ کسی عقلی دلیل پر ہوتی ہے اور نہ نقلی دلیل پر۔ اور اس کی وجہ محض ان کی ضد، ہٹ دھرمی اور تکبر یا پندار نفس ہوتا ہے۔ ان کی یہ صورت حال اللہ اور مومنوں کے نزدیک انتہائی نفرت انگیز ہوتی ہے اور جو انسان اس حالت کو پہنچ جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے جس کے بعد ان کے دلوں میں ہدایت اور بھلائی کی بات داخل ہو ہی نہیں سکتی۔

[۵۰] ❁ ہامان کو بلند عمارت بنانے کے لئے کہنا: فرعون نے اس مرد مومن کی باتوں کا کچھ اثر نہ لیا اور نہایت متکبرانہ شان سے اپنے وزیر ہامان سے کہنے لگا ہامان ایک بلند عمارت تعمیر کراؤ۔ تاکہ میں یہ تو دیکھوں کہ جس اللہ کی موسیٰ علیہ السلام بات کرتا ہے وہ ہے کہاں اور کتنی بلندی پر رہتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے سورہ قصص کی آیت نمبر ۳۸ کا حاشیہ نمبر ۵۰ دیکھئے)

وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾
وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ

اس طرح فرعون کی بد عملی اس کے لئے خوشنما[۵۱] بنا دی گئی اور وہ راہ راست سے روک دیا گیا۔ اور فرعون کی چال بازی[۵۲] میں اس کی اپنی ہی تباہی (مضمر) تھی۔(۳۷)

اور جو شخص ایمان لایا تھا، وہ کہنے لگا: ''اے میری قوم! میری پیروی کرو تو میں تمہیں بھلائی کی راہ بتاؤں گا(۳۸) اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی تو بس چند روزہ ہے اور ہمیشہ کے قیام کا گھر آخرت[۵۳] ہی ہے۔(۳۹) جو شخص برائی کرے گا اسے اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا اور جو نیک عمل کرے گا

[۵۱] یعنی فرعون جو بھی بنی اسرائیل پر ظلم ڈھا رہا تھا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں جو بھی ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا وہ سب اسے اچھے ہی لگتے تھے اور وہ انہیں اپنی حسن تدبیر پر محمول کرتا تھا۔ برے کام کرتے کرتے اس کی کچھ ایسی مت ماری گئی تھی اور ایسی مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگا تھا جس کے بعد اس کے راہ راست پر آنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

[۵۲] ❁ فرعون کی وہ مکارانہ چالیں جن میں وہ خود گھر گیا:۔ فرعون دل سے یہ سمجھ چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام فی الواقع اللہ کے رسول ہیں اور یہ اسے پہلے دن ہی یقین ہو گیا تھا۔ مگر وہ اپنے اقتدار اور اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے ہمیشہ مکارانہ چالیں ہی چلتا رہا اس کی پہلی چالاکی یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بس جادو کے کرشمے ہی ہیں۔ اور اپنی اس چال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جادوگروں سے مقابلہ کا ڈھونگ رچایا۔ پھر جب جادوگروں نے یہ تسلیم کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ لائے ہیں وہ جادو نہیں بلکہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزات ہیں اور انہوں نے بھرے مجمع میں اپنے ایمان کا اعلان بھی کر دیا تو لوگوں کو ان اثرات سے بچانے کے لئے جادوگروں پر یہ الزام لگا دیا کہ تم تو خود اندر سے موسیٰ علیہ السلام سے ملے ہوئے ہو وہ تمہارا گرو ہے اور تم اس کے چیلے ہو اور میں تمہیں ایسی اور ایسی سزائیں دوں گا۔ لیکن فرعون کی اس دھمکی کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اور لوگ چوری چھپے سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے رہے پھر اس نے اعلان کروایا کہ جو لوگ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے میں ان کے بچوں کو قتل کر دوں گا۔ پھر اس قضیہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے منصوبے بنانے لگا۔ انہی ایام میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ہجرت کا حکم ہو گیا۔ اب اگر وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب نہ کرتا تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ بنی اسرائیل اس کے ہاتھ سے نکل جاتے۔ وہ خود تو نہ غرق ہوتا اور نہ اس کی سلطنت ہاتھ سے جاتی مگر اس کی تدبیر اسے اس کی تباہی کی طرف ہی دھکیلتی رہی۔

[۵۳] اب وہ مرد مومن کھل کر سامنے آتا ہے۔ فرعون نے کہا تھا کہ میں اپنی بصیرت کے مطابق جو راہ بھلائی کی دیکھتا ہوں وہی تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس مرد مومن نے فرعون کی اس بات کے جواب میں کہا کہ بھلائی کی راہ وہ نہیں جو تم کہتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا جائے بلکہ بھلائی کی راہ چاہتے ہو تو میری بات مانو۔ میں تمہیں بھلائی کی راہ بتاتا ہوں اور وہ راہ یہ ہے کہ یہ دنیا چند روزہ

صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ

خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں انہیں بلا حساب رزق دیا جائے گا(۴۰) اے میری قوم! کیا بات ہے کہ میں تو تمہیں نجات[۵۴] کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو۔(۴۱) تم مجھے یہ دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور ایسی چیزوں کو اس کا شریک بناؤں جن کے متعلق مجھے کچھ علم[۵۵] نہیں حالانکہ میں تمہیں اس کی طرف بلاتا ہوں جو سب پر غالب ہے اور بخشنے والا ہے۔(۴۲) اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جس کی طرف تم مجھے دعوت دیتے ہو اسے پکارنے کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے[۵۶] اور نہ آخرت میں۔ اور یہ کہ ہماری واپسی اللہ کی طرف ہے

ہے عیش و آرام سے گزر جائے تو بھی کوئی بات نہیں اور تنگی ترشی میں گزرے تو بھی گزر ہی جائے گی فکر تو اخروی زندگی کی کرنی چاہئے جو دائمی اور لازوال ہے۔ یہ دنیا تو صرف دارالامتحان ہے۔ پھر اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانبرداروں کے لئے بہت مراعات ملحوظ رکھی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی براکام کرے گا تو اسے اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا اور کوئی اچھے کام کرے گا تو اس کا بہت ہی زیادہ اجر دیا جائے گا لہٰذا دنیا کی اس چند روزہ زندگی کو غنیمت سمجھو اور زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرکے اجر عظیم کے مستحق بن جاؤ۔

[۵۴] ❁ مرد مومن کی تقریر:۔ یہ ہے تمہاری بھلائی، خیر خواہی اور نجات کا راستہ کہ اللہ کے رسول پر ایمان لے آؤ اور نیک اعمال بجالاؤ وہ بھلائی کی راہ نہیں کہ رسول کی دعوت کا نہ صرف یہ کہ انکار ہی کر دیا جائے بلکہ اسے قتل کرنے کے ارادے کیے جانے لگیں۔ یہ بھلائی کی راہ نہیں یہ تو جہنم کی راہ ہے۔

[۵۵] تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی تمہاری طرح سورج دیوتا کے آگے سر جھکاؤں اور گئو ماتا کی پوجا کروں میری معلومات کی حد تک ایسی چیزوں کی پرستش کے لئے تم کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی الہامی کتاب سے یہ ثابت کر سکتے ہو یہ چیزیں بھی عبادت کے لائق ہیں۔ یہ تو بس باپ دادا کی تقلید کی اندھی روش ہے پھر تم یہ بھی چاہتے ہو کہ میں ایسے نظام حکومت کا کل پرزہ بن کر رہوں جو رسولوں کی مخالفت پر اتر آئی ہے۔ اور طبقاتی تقسیم کو ہوا دے کر بنی اسرائیل پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی ہے۔ میں ان باتوں سے سخت بیزار ہوں۔ اس کے بجائے میں تمہیں اس پروردگار کی عبادت اور اطاعت کی طرف دعوت دیتا ہوں جس نے کائنات کی ہر چیز کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ ان پر پوری طرح کنٹرول بھی رکھے ہوئے ہے۔ اور جو شخص اس کی طرف رجوع کرے اس کے گناہ بھی معاف فرما دیتا ہے۔

[۵۶] اس جملہ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ پہلا تو وہی مطلب ہے جو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں

الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ

اور بلاشبہ حد[۵۷] سے بڑھنے والے ہی دوزخی ہیں۔(۴۳) جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں عنقریب تم اسے یاد[۵۸] کرو گے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بلاشبہ اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔"(۴۴) ان لوگوں نے جو چالیں اس مردِ مومن کے خلاف چلی تھیں[۵۹] اللہ نے ان سے اسے بچالیا اور آلِ فرعون

کو نہ دنیا میں یہ حق پہنچتا ہے نہ آخرت میں کہ ان کی خدائی تسلیم کرنے کے لئے لوگوں کو دعوت دی جائے۔ تیسرا یہ کہ انہیں تو لوگوں نے زبردستی خدا بنا رکھا ہے ورنہ وہ خود نہ اس دنیا میں خدائی کے مدعی ہیں، نہ آخرت میں یہ دعویٰ لے کر اٹھیں گے کہ ہم بھی تو خدا تھے ہمیں کیوں نہ مانا گیا۔

[۵۷] اگرچہ ہر کام میں حد اعتدال سے آگے نکل جانے کو اسراف کہہ سکتے ہیں مگر یہاں مُسْرِفِيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو عاجز مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے اختیارات و تصرفات میں شریک بنالیتے ہیں۔ ایسے مسرفین ہی وہ دوزخی ہیں جنہیں کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔

[۵۸] ❁ مردِ مومن کی تقریر کا فرعون پر رد عمل:۔ اس مرد مومن کی تقریر کا یہ آخری حصہ ہے اور اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس نے یہ تقریر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کی تھی۔ اور یہ کہ اب فرعون اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں رہنے دے گا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مردِ مومن کسی معمولی عہدے پر فائز نہ تھا بلکہ کسی انتہائی نازک اور ذمہ دارانہ منصب اس کے سپرد تھا۔ جسے فرعون فوری طور پر گرفتار کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ فرعون کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ سیدنا موسیٰؑ کی دعوت اس کی انتہائی پابندیوں اور سختیوں کے باوجود ایوان بالا تک سرایت کر چکی ہے۔ لہٰذا اب یہ معاملہ صرف اکیلے اس مرد مومن کا یا موسیٰؑ ہی کے قتل کا نہ رہا تھا بلکہ اب وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ دعوت اسلامی کے اثرات اس کے اپنے دربار اور اس کی اپنی آل میں کہاں تک نفوذ کر چکے ہیں اس لئے سردست اس نے ان دونوں کو التواء میں ڈال دیا کہ مبادا ان دونوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو قتل کرنے سے کوئی ایسا ہنگامہ نہ اٹھ کھڑا ہو جس پر بعد میں قابو نہ پایا جاسکے۔ اور تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو کچھ اس مرد مومن کے دل میں تھا وہ اس نے پوری جرأت کے ساتھ برملا کہہ ڈالا۔ اور اپنی سچائی کی مزید توثیق کے لئے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ عنقریب تم لوگ میری باتوں کو یاد کرو گے کہ جو کچھ اس آدمی نے باتیں کہی تھیں وہ فی الواقع درست تھیں۔ عنقریب سے مراد روز آخرت بھی ہو سکتا ہے اور وہ دن بھی جبکہ آلِ فرعون پر عذاب آیا تھا اور وہ بحیرۂ قلزم میں غرق کر دیئے گئے تھے۔

[۵۹] معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فرعون اس مردِ مومن کو فوری طور پر قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کو گرفتار کر کے اسے جسمانی تعذیب دینا چاہتا تھا تاکہ اس سے وہ سب باتیں اگلوالے جن باتوں کی اسے ضرورت تھی۔ ان لوگوں نے اس مرد مومن کے خلاف کیا چالیں چلی تھیں۔ ان کی وضاحت معلوم نہیں ہو سکی۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد جلد ہی سیدنا موسیٰؑ کو ہجرت کا حکم مل گیا اور یہ مردِ مومن بھی مہاجرین میں شامل تھا۔ اس طرح اسے فرعون کی چالوں سے نجات مل گئی۔ اور جب فرعون اور

سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ

خود ہی بُرے عذاب میں گھر گئے۔(۴۵) وہ صبح و شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن[۶۰] قیامت قائم ہوگی

آلِ فرعون نے ان مہاجرین کا تعاقب کیا تو خود ہی اپنی اس چال میں پھنس گئے۔

[۶۰] ❁ فرعون اور آلِ فرعون کا انجام اور عذابِ قبر کا ثبوت:۔ ان غرق ہو کر مرنے والوں میں سے صرف فرعون کی لاش کو اللہ نے بچالیا۔ باقی سب لوگوں کی لاشیں سمندر میں آبی جانوروں کی خوراک بن گئیں یا سمندر کی تہہ میں چلی گئیں۔ فرعون کی لاش کو سمندر کی موجوں نے اللہ کے حکم سے کنارے پر پھینک دیا۔ تاکہ عامۃ الناس اس خدائی کا دعویٰ کرنے والے شہنشاہ کا حشر دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ اور یہ مدتوں ساحل سمندر پر پڑی رہی۔ اور گلی سڑی نہیں بلکہ جوں کی توں قائم رہی۔ کہتے ہیں کہ اس کے مردہ جسم پر سمندر کے نمک کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا جسم گلنے سڑنے سے محفوظ رہا۔ اب ان غرق ہونے والوں کی لاشیں خواہ سمندر کی تہہ میں ہوں یا آبی جانوروں کے پیٹ میں یا فرعون کی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں پڑی ہو ان سب کی ارواح غرق ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں چلی گئی تھیں۔ غرق ہونے کے دن سے لے کر قیامت تک ان ارواح کو ہر روز صبح و شام اس دوزخ پر لا کھڑا کیا جاتا ہے جس میں وہ قیامت کے دن اپنے جسموں سمیت داخل ہونے والے ہیں۔ ان کی موت سے لے کر قیامت تک کے عرصہ میں، جسے اصطلاحی زبان میں عالم برزخ کہا جاتا ہے، صرف آگ پر پیشی ہوتی ہے اور صرف ارواح کی ہوتی ہے لیکن قیامت کے دن وہ آگ میں داخل ہوں گے اور جسموں سمیت داخل ہوں گے۔ اس لحاظ سے عالمِ برزخ کا عذاب قیامت کے عذاب کی نسبت بہت ہلکا اور قیامت کا عذاب عالم برزخ کے مقابلہ میں شدید تر عذاب ہے۔

اس آیت میں عالمِ برزخ کے عذاب یا عذاب قبر کی ٹھیک ٹھیک صراحت موجود ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے ایک فرقہ نے عذاب قبر سے انکار کر دیا ہے اور ان حضرات کا تعاقب میں نے اپنی تصنیف "آئینہ پرویزیت" میں پیش کر دیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ یہاں سرِدست صرف بخاری سے چند احادیث درج کر رہا ہوں جن سے واضح طور پر عذاب قبر کا ثبوت ملتا ہے:

۱۔ سیدنا انس بن مالک ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "آدمی جب اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور دفن کرنے والے واپس لوٹتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اسے بٹھا دیتے ہیں پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ تو ان صاحب محمد ﷺ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا تھا؟ اس سوال کے جواب میں مومن یہ کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے۔ اللہ نے اس کے بدلہ تجھ کو جنت میں ٹھکانا دیا۔ پھر اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔ لیکن کافر یا منافق سے جب یہی سوال کیا جاتا ہے کہ تو اس شخص کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟ تو وہ کہے گا۔ میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ لوگ کہتے تھے میں بھی وہی کچھ کہہ دیتا تھا" پھر اس سے کہا جائے گا کہ نہ تو تو خود سمجھا اور نہ سمجھانے والے کی رائے پر چلا۔ پھر اسے لوہے کے ہتھوڑے سے اتنی مار پڑتی ہے کہ وہ چلا اٹھتا ہے اور جن اور انسان کے سوا سب اس کے آس پاس والے اس کی چیخ و پکار کو سنتے ہیں" (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب ماجاء فی عذاب القبر)

اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

(تو حکم ہوگا کہ) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کردو۔(۴۶) اور جب وہ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے تو کمزور لوگ بڑا بننے[۶۱] والوں سے کہیں گے: ہم (دنیا میں) تمہارے تابع فرمان تھے تو کیا تم دوزخ کے عذاب کا کچھ حصہ ہم سے ہٹا کر ہمارے کسی کام آؤ گے؟(۴۷) وہ بڑا بننے والے جواب دیں گے: ہم سب اسی میں پڑے ہیں۔ (اور) اللہ بندوں کے درمیان[۶۲] فیصلہ کرچکا ہے۔(۴۸) اور جو لوگ

۲۔ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سورج غروب ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر گئے وہاں ایک آواز سنی تو فرمایا: "یہ یہودیوں کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے" (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب التعوذ من عذاب القبر)

۳۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں پر سے گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑی بات میں عذاب نہیں ہو رہا۔ ان میں سے ایک تو چغلی کھاتا پھرتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا۔ پھر آپ نے ایک ہری ٹہنی لی۔ اس کے دو ٹکڑے کیے اور ہر قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔ پھر فرمایا: "امید ہے کہ جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں ان پر عذاب ہلکا رہے" (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب عذاب القبر من الغيبة والبول)

۴۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا مانگا کرتے تھے: "اے اللہ! میں قبر کے عذاب سے، دوزخ کے عذاب سے، زندگی اور موت کی بلاؤں سے اور کانے دجال کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں" (بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب التعوذ من عذاب القبر)

[۶۱] ❁ مطیع اور مطاع کا مکالمہ:۔ بڑا بننے والوں سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کا اپنا حلقہ اثر ہو اور اس حلقہ میں اس کی بات تسلیم کی جاتی ہو۔ یہ گاؤں کے چودھری بھی ہو سکتے ہیں۔ حکمران بھی اور سرکاری درباری حضرات اور حکومت کے افسر بھی، سیاسی لیڈر بھی اور علمائے کرام اور مشائخ عظام بھی۔ جب ایسے بڑے حضرات بھی جہنم پر جا پہنچیں گے تو ان کے تابعدار ان سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم تمہاری اطاعت کرتے رہے۔ آج جو ہمیں عذاب ہو رہا ہے اس کا کچھ حصہ تو اپنے ذمہ لو اور ہمارا بوجھ بٹاؤ اور وہ یہ بات انہیں اس لئے نہیں کہیں گے کہ وہ فی الواقع کچھ بوجھ بٹا سکتے ہیں۔ اس بات کی انہیں خوب سمجھ آچکی ہوگی کہ آج بے بسی میں دونوں فریق ایک جیسے ہیں بلکہ وہ یہ بات انہیں ذلیل کرنے کی خاطر کہیں گے اور اس لئے بھی کہ وہ اپنے اندر کی جلن کو کچھ ہلکا کرسکیں اور دل کے پھپھولے پھوڑ سکیں۔

[۶۲] بڑے حضرات جواب دیں گے کہ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے حق میں جتنی سزا کا فیصلہ کر چکا ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾ قَالُوا أَوَ
لَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۚ قَالُوا فَادْعُوا ۗ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ
إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿٥٠﴾ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ ع ۱۰
الْأَشْهَادُ ﴿٥١﴾ يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ ۖ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿٥٢﴾

دوزخ میں ہوں گے وہ جہنم کے محافظوں[۶۳] سے کہیں گے "اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ایک دن تو ہمارے عذاب میں کچھ تخفیف کر دے (۴۹) وہ کہیں گے "کیا تمہارے پاس رسول واضح دلائل لے کر نہیں[۶۴] آئے تھے؟" دوزخی کہیں گے "کیوں نہیں" (ضرور آئے تھے) تو وہ کہیں گے "پھر تم خود[۶۵] ہی دعا کرلو" اور کافروں کی دعا تو گم ہی ہو جانے والی[۶۶] ہے۔ (۵۰) ہم یقیناً اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں[۶۷] بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جب گواہ کھڑے[۶۸] ہوں گے (۵۱) جس دن ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان کے لئے لعنت ہے اور برا گھر ہے (۵۲)

[۶۳] یعنی جب کمزور اور تابعداری کرنے والوں اور بڑا بننے والوں میں یہ مکالمہ ہو چکے گا تو سب مل کر دوزخ کے فرشتوں سے التجا کریں گے کہ اب تم اپنے پروردگار سے ہمارے حق میں سفارش کرو کہ وہ کسی ایک دن تو ہمارے عذاب میں کچھ تخفیف کر دے۔ اسے ہی ہم اپنے لئے تعطیل یا چھٹی کا دن سمجھ لیں گے۔

[۶۴] وہ کہیں گے کہ سفارش بھی آخر کسی عذر کی بنا پر ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن تم نے معذرت کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تو سفارش میں ہم کیا کہیں۔ یا تو تم یہ کہو کہ ہمارے پاس نہ رسول آئے تھے نہ ہمیں اللہ کا پیغام پہنچا تھا۔ اور جب تمہارے پاس اللہ کے رسول واضح دلائل لے کر گئے تھے اور تمہیں ہر طرح کے انجام سے مطلع کر دیا تھا تو پھر سفارش کس بنیاد پر کی جا سکتی ہے؟

[۶۵] یہ فرشتوں کا دوسرا جواب ہے۔ کہ ہمارا کام سفارش کرنا نہیں اور جو ہمارا کام ہے وہ ہم کر ہی رہے ہیں سفارش کرنا رسولوں کا کام ہے اور ان کی مخالفت کر کے تم نے انہیں پہلے ہی ناراض کر رکھا ہے۔ لہٰذا اب خود ہی دعا کر کے دیکھ لو۔

[۶۶] یعنی بے اثر، بے نتیجہ اور بے کار ثابت ہوتی ہے۔ کافروں کی پکار اللہ تعالیٰ تک پہنچتی ہی نہیں۔ راستے میں ہی گم ہو جاتی ہے۔

[۶۷] ❁ اللہ کی امداد کی صورتیں:۔ دنیا میں رسولوں اور مومنوں کی مدد کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے دشمنوں کو تباہ کر دیا جائے اور انہیں ظالموں کے پنجہ استبداد سے نجات دلا دی جائے۔ دوسری یہ کہ انہیں سیاسی تفوق بھی حاصل ہو جائے۔ اور تیسری یہ کہ دنیا میں انہیں کا بول بولا ہو یعنی جس مقصد کے لئے وہ کھڑے ہوتے ہیں اللہ کی مدد ان کے شامل حال رہتی ہے۔ اور حق پرستوں کی قربانیاں کسی بھی حال میں ضائع نہیں جاتیں۔ ان تینوں صورتوں میں سے کسی نبی کو صرف ایک قسم کی مدد حاصل ہوئی، کسی کو دو قسم کی اور کسی کو تینوں قسم کی۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کی طرف سے تینوں طرح کی مدد سے فیض یاب ہوئے۔

[۶۸] یعنی قیامت کے دن جب ہر نبی سے اس کی امت کے متعلق گواہی لی جائے گی۔ علاوہ ازیں ان نیک بندوں کی بھی جن کی

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ ۝ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ

ہم نے موسیٰ کو ہدایت[۶۹] عطا کی اور بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) کا وارث بنا دیا[۷۰]۔ (۵۳) جو اہل عقل کے لئے ہدایت اور نصیحت تھی۔ (۵۴) پس آپ صبر کیجئے۔ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی معافی مانگئے[۷۱] اور صبح و شام اپنے پروردگار کی حمد[۷۲] کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے۔ (۵۵)

جو لوگ بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں ان کے دلوں

معرفت لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا گیا۔ اس دن میدان محشر میں جمع شدہ تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء اور صلحاء کا مقام عام لوگوں سے کس قدر بلند ہے۔ نیز وہ یہ بھی دیکھ لیں گے کہ اس دن جب کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا۔ اللہ اپنے نبیوں اور ایمانداروں کی کس طرح مدد اور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

[۶۹] یعنی سیدنا موسیٰؑ کو فرعون جیسے جابر اور ظالم حکمران کے پاس بھیجا۔ تو ساتھ ہی ساتھ ان کی رہنمائی بھی کرتے رہے کہ اب آگے انہیں کون سا قدم اٹھانا چاہئے تاآنکہ انہیں اور ان کی مظلوم قوم کو فرعون کی چیرہ دستیوں سے نجات دلا کر انہیں کامیابی سے ہمکنار کریں۔

[۷۰] کتاب کے وارثوں کی ذمہ داریاں:۔ فرعون کی غرقابی کے بعد موسیٰؑ کو جو کتاب تورات عطا فرمائی اس میں اہل عقل و خرد کے لئے سبق حاصل کرنے کے لئے بھی بہت کچھ سامان موجود تھا اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے بھی وہ زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی مہیا کرتی تھی۔ ہم نے اس عظیم الشان کتاب کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا تاکہ وہ دنیا میں ہدایت کے علمبردار بن کر اٹھیں۔ ان آیات میں دراصل مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی ہے اور خوشخبری بھی۔ مسلمان اس وقت ایسے ہی حالات سے دوچار تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ وہ اپنے نبی اور مسلمانوں کو اسی حال میں نہیں چھوڑے گا بلکہ قدم قدم پر ان کی رہنمائی بھی فرمائے گا۔ تاآنکہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں پھر انہیں جو کتاب (قرآن) دی جا رہی ہے مسلمانوں کو ہی اس کا وارث بنایا جائے گا تاکہ وہ اسے دنیا کے کونے کونے تک پہنچائیں اور تمام لوگوں کی ہدایت کا فریضہ سر انجام دیں۔

[۷۱] انبیاء کے گناہوں سے مراد معمولی قسم کی اجتہادی لغزشیں ہیں:۔ انبیاء سے عمداً کسی گناہ کا سرزد ہونا ناممکنات سے ہے۔ ان کے گناہ سے مراد ان کی چھوٹی چھوٹی اجتہادی لغزشیں ہی ہو سکتی ہیں جو بھول چوک کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہیں اور یہ بشریت کا خاصہ ہے۔ یہاں ان لغزشوں کا تعلق یقیناً صبر سے ہے۔ جیسے آپ کو کبھی کبھی یہ خیال آ جاتا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کفار مکہ کے مطالبہ کے مطابق کوئی معجزہ عطا فرما دے تو اس سے اسلام کو کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یا جب کفار آپ ﷺ سے سمجھوتہ کی راہیں ہموار کرنا چاہتے تھے تو آپ ﷺ کو ایسا خیال آنے لگا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے خیال سے بھی سختی سے روک دیا تھا۔ اس بنا پر یہاں آپ ﷺ کو پہلے صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

[۷۲] آیت کے اس ٹکڑا میں اجمالاً پانچوں نمازوں کا ذکر آ گیا ہے۔ ایک پہلے حصہ دن کی اور چار پچھلے حصہ دن کی۔ یہ دراصل

اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِیْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ
الْبَصِیْرُ ۝ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَ مَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ ۙ۬ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا

میں تکبر بھرا[۴۳] ہوتا ہے مگر وہ اس بڑائی کو پا نہیں سکتے (جس کی وہ آرزو رکھتے ہیں) لہٰذا آپ (ان کی شرارتوں سے) اللہ کی پناہ مانگیے[۴۴]۔ بلاشبہ وہ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔(۵۶) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے[۴۵](۵۷) نابینا اور بینا یکساں نہیں ہو سکتے اور جو لوگ ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، وہ اور بدکردار[۴۶] یکساں

ان پانچ نمازوں اور ان کے اوقات کا تمہیدی حکم تھا جو بعد میں فرض کی گئیں۔

قرآن کریم میں کئی مقامات پر مشکل پڑنے پر صبر اور نماز کا اکٹھا ذکر آیا ہے۔ کیونکہ اللہ کی یاد میں جس قدر طبیعت مصروف ہو اس قدر دوسری پریشانیاں خود بخود کم ہو جاتی ہیں۔

[۴۳] ❁ اللہ کی آیات سے مراد:۔ آیات الٰہی سے مراد یہاں دلائل توحید اور دلائل بعث بعد الموت ہیں۔ کیونکہ انہی دو باتوں میں کفار مکہ زیادہ تر تکرار کرتے تھے اور فضول قسم کی بحث اور استہزاء کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے پاس کوئی عقلی دلیل تو ہے نہیں جس کی بنیاد پر وہ مدلل بحث کر سکیں بلکہ ان کے جھگڑا کی اصل وجہ ان کا تکبر ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے رسول کی بات مان لی تو پھر ہمیں اس کا مطیع بن کر رہنا پڑے گا۔ اور یہی پندار نفس ان کے ایمان لانے میں آڑے آ رہا ہے۔ مگر جس بڑا بنے رہنے کی انہیں فکر دامنگیر ہے وہ بڑائی ان کے پاس رہ نہیں سکتی۔ کیونکہ عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والا کبھی عزت نہیں پا سکتا۔ جس بلند مقام پر وہ اپنے آپ کو کھڑا سمجھ رہے ہیں لازماً انہیں اس مقام سے نیچے اترنا اور ذلیل ہونا پڑے گا۔

[۴۴] یعنی ان جھگڑا کرنے والے متکبرین کے شر سے بچنے کے لئے اللہ سے پناہ مانگتے رہیے۔ جو ان کی ہر ایک سازش اور ہر ایک شرارت کو دیکھ بھی رہا ہے اور ان کی باتوں کو سن بھی رہا ہے۔ پھر انہیں سزا دینے اور ان کے شر سے آپ کو بچانے کی پوری قدرت بھی رکھتا ہے۔

[۴۵] یہاں سے ان آیات کا آغاز ہوتا ہے جن میں یہ لوگ جھگڑا کیا کرتے تھے ان میں پہلے بعث بعد الموت کو لیا گیا ہے۔ اور سوال اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ کفار مکہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور سوال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس قدر عظیم الجثہ مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے تو کیا انسان کو ہی دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا؟ یہ گویا عقلی دلیل ہوئی کہ ایسا ہونا یقیناً ممکن ہے۔

[۴۶] ❁ ایک دنیادار اور متقی کے کردار کا موازنہ:۔ یہ بعث بعد الموت پر دوسری دلیل ہے۔ یعنی ایک شخص اپنا تمام طرز زندگی وحی الٰہی کی روشنی میں استوار کرتا ہے۔ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے ہر طرح کے مصائب برداشت کرنے کے لئے تیار

الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِیْٓءُ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا وَ
لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِیْنَ
یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۝ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ

نہیں ہو سکتے (مگر) تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔(۵۸) بلاشبہ قیامت آنے والی ہے[۷۷] جس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔(۵۹) آپ کے پروردگار نے فرمایا ہے "مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا جو لوگ میری عبادت سے ناک بھوں چڑھاتے[۷۸] ہیں عنقریب ذلیل و خوار[۷۹] ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔(۶۰) اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی[۸۰]

ہو جاتا ہے۔ پھر اپنی زندگی اور اپنی خواہشات پر کئی طرح کی پابندیاں عائد کرتا ہے جو حکم الٰہی کے مطابق ضروری تھیں۔ ہمیشہ راست بازی اور دیانتداری سے کام لیتا ہے۔ کسی کو نہ فریب دیتا ہے نہ کسی پر زیادتی کرتا ہے اور ایک شریف انسان کی طرح اللہ سے ڈرتے ہوئے محتاط زندگی گزار رہا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کے پاس تقلید آباء اور جہالت کی تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ لوگوں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ اس کی زندگی کا اصول مفاد پرستی ہوتا ہے۔ جس کی خاطر وہ ہر طرح کی زیادتی کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ پھر اس کے سامنے اللہ کے حضور جواب دہی کا تصور ہوتا ہی نہیں۔ اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جس طرح سے بھی اور جتنی بھی دنیا اکٹھی کر لی جائے اور عیش و عشرت کر لی جائے بس وہی غنیمت ہے۔ تو بتاؤ کہ کیا ان دونوں کا انجام ایک جیسا ہی ہونا چاہئے۔ کہ دونوں مر کر مٹی ہو جائیں۔ نہ نیک انسانوں کو ان کے اچھے اعمال کا صلہ ملے اور نہ بد کردار لوگوں کو ان کی کرتوتوں کی سزا ملے؟ اور اگر تمہارے خیال میں یہ دونوں شخص ایک جیسے نہیں اور دونوں کا انجام ایک جیسا نہ ہونا چاہئے تو پھر ضروری ہے کہ انسان کو دوسری زندگی دی جائے جس میں اسے اس کے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ دیا جا سکے۔ گویا اصل دلیل کا ماحصل یہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور دوسری دلیل کا ماحصل یہ ہے کہ ایسا ہونا چاہئے۔

[۷۷] ❁ جہاں عقل کی حد ختم ہو جائے وہاں سے وحی کا آغاز ہوتا ہے اور وحی کی بنیاد یقینی علم پر ہے:۔ اس آیت میں بڑے زوردار الفاظ میں انسان کو اللہ تعالیٰ متنبہ فرما رہے ہیں کہ قیامت کے آنے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ آ کے رہے گی کسی کے روکنے یا نہ چاہنے سے رک نہیں سکتی۔ عقلی دلائل کا ماحصل تو یہی ہو سکتا تھا کہ فلاں چیز کا ہونا ممکن ہے یا ہونا چاہئے لیکن عقل یہ حکم نہیں لگا سکتی کہ فلاں چیز یقیناً واقع ہو کے رہے گی۔ یہ بس وحی الٰہی کا کام ہے جو کائنات کے خالق اور اس کے آغاز اور انجام سے پوری طرح واقف ہے۔ ضمناً اس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ دین کی بنیاد محض قیاس و استدلال پر نہیں رکھی گئی بلکہ اس کی بنیاد وحی الٰہی یا یقینی علم پر رکھی گئی ہے۔

[۷۸] ❁ دعا اور عبادت ایک ہی چیز ہے بلکہ دعا عبادت کا مغز ہے:۔ اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعا یا کسی کو حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارنا اور عبادت ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس آیت کے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے

پکارا کرو میں تمہاری پکار کو قبول کرتا ہوں اور دوسرے جملہ میں فرمایا کہ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں۔ جو اس آیت پر واضح دلیل ہے کہ دعا اور عبادت ایک ہی چیز ہے پھر اس مفہوم کی تائید احادیث صحیحہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ﴿الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ﴾ (یعنی پکارنا ہی اصل عبادت ہے) اور ایک مرتبہ یوں فرمایا ﴿الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ﴾ (یعنی دعا ہی عبادت کا مغز یا اصل عبادت ہے) (ترمذی، ابواب التفسیر زیر آیت ہذا)

❁ دعا عبادت کیسے ہے؟ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ دعا عبادت کیسے ہے؟ دعا کرنے والا دعا اس وقت کرتا ہے جب کسی چیز کے حصول یا کسی مصیبت کے دفعیہ کے ظاہری اسباب مفقود ہوں۔ اور جس کو پکارتا ہے وہ یہ سمجھ کر پکارتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے میری پکار کو سن رہا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ اس کا باطنی اسباب پر اتنا تصرف ضرور ہے کہ وہ میری تکلیف کو رفع کر سکتا ہے یا میری حاجت پوری کر سکتا ہے۔ گویا پکاری جانے والی ہستی کا ایک تو عالم الغیب نیز سمیع و بصیر ہونا ضروری ہوا۔ اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے جب تک اسباب کائنات میں اس کا تصرف تسلیم نہ کیا جائے اس سے دعا کرنا ایک فعل عبث قرار پاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات کو کسی دوسری ہستی میں تسلیم کرنا اسے اللہ کا ہمسر یا شریک سمجھنا ہے اور یہی چیز عین شرک ہے۔ اور جس شخص نے اللہ کے علاوہ کسی دوسری ہستی کو الوہیت کا یہ مقام دے دیا تو وہ اس کے مقابلہ میں از خود بندگی کے مقام پر اتر آیا گویا پکاری جانے والی ہستی اس کی معبود بن گئی اور یہ پکارنے والا عبادت گزار اور اس کی پکار عین عبادت ہوئی۔

❁ اللہ مانگنے سے خوش اور نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے اور یہی عبادت کا خاصہ ہے: واضح رہے کہ انسان اللہ سے دعا کرتا ہے اور وہ کبھی قبول ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی، کبھی بہت مدت بعد جا کر ہوتی ہے تو اس کے کچھ آداب ہیں اور کچھ اسباب ہیں اور کچھ موانع ہیں۔ جن کی تفصیل احادیث میں مذکور ہے۔ یہاں صرف یہ بات ذہن نشین کرانا مطلوب ہے کہ دعا قبول نہ بھی ہو تو بھی اس کا بہت فائدہ ہے۔ کیونکہ دعا بذات خود عبادت ہے۔ اور جتنی دیر اس نے دعا مانگنے میں لگائی وہ مدت گویا اس نے عبادت ہی میں گزار دی۔ لہٰذا ہمیں یہی حکم ہے کہ ہم اللہ سے دعا مانگتے رہیں۔ مانگتے رہیں۔ اس کا قبول کرنا نہ کرنا یا بدیر قبول کرنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تابع ہے۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ سے مانگنا اور مانگتے رہنا عین تقاضائے بندگی ہے۔ اور جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا تو یہ بات عبادت سے انکار یا تکبر کی علامت ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ مانگنے سے خوش اور نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے اور یہ سب مفہوم عبادت کے لفظ میں شامل ہیں۔

[۷۹] یہ ان کے تکبر کی سزا ہو گی۔ قیامت کے دن خوب جوتے کھائیں گے اور ذلت اور رسوائی کے ساتھ جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

[۸۰] ❁ ہر جاندار میں کام اور آرام کا خودکار نظام:۔ رات کو نہ سورج کی گرمی ستاتی ہے اور نہ ہی سورج جیسی تیز روشنی ہوتی ہے۔ تاریکی اور مناسب حد تک ٹھنڈک یہ دونوں باتیں نیند اور آرام کرنے کے لئے سازگار ہیں۔ اور دن کو کام کاج کے لئے روشن بنایا کہ اس میں کسی مصنوعی روشنی کے بغیر ہی کام چل سکتا ہے۔ رات اور دن کو اللہ تعالیٰ نے دلیل توحید کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دن اور رات سورج کے اور زمین کے درمیان ایک انتہائی باقاعدہ نظام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سورج اور اس زمین کا خالق، مالک اور ان پر کنٹرول کرنے والی ہستی ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اگر ان

لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦١﴾ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٦٢﴾ كَذَٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِينَ كَانُوا بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٦٣﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا

تاکہ تم اس میں آرام کر سکو اور دن کو روشن بنا دیا۔ اللہ تو یقیناً لوگوں پر بڑا صاحب فضل[۸۱] ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔(۶۱)

یہ ہے تمہارا پروردگار! جو ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پھر تم کہاں سے بہکائے جاتے ہو[۸۲](۶۲) اسی طرح وہ لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔(۶۳) اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو جائے قرار[۸۳] اور

سیاروں کے مالک الگ الگ دیوتا ہوتے جیسا کہ مشرکوں کا خیال ہے تو یہ دن رات کا نظام کبھی باقاعدگی کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا۔ پھر اسی رات اور دن کے نظام میں اور رات کو آرام کرنے اور دن کو کام کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حیران کن عجائبات ہیں۔ دن کو کام کرتے وقت انسان کے بے شمار خلیے ضائع اور تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ رات کو جب انسان آرام کرتا ہے تو نیند کی حالت میں ان ضائع شدہ خلیوں کی جگہ دوسرے نئے خلیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جب یہ کام ٹھیک طور پر مکمل ہو چکتا ہے تو انسان جاگ اٹھتا ہے۔ گویا اس کا آرام کا وقت پورا ہو گیا۔ پھر وہ نئے سرے سے تازہ دم ہو کر صبح کو پھر سے کام کاج کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا یہ نظام خودکار ہے۔ اگر انسان کام کرنے کے بعد آرام نہ کرے تو نیند اسے جہاں بھی ہو دبا لیتی ہے اور اسے اضطراراً آرام کرنا پڑتا ہے۔ اگر پھر بھی انسان اپنے اس فطری تقاضے کو پورا نہ کرے یا پورا کرنے میں کوتاہی کرے تو انسان کی صحت تباہ ہو جاتی ہے۔

[۸۱] یعنی اللہ تعالیٰ کی تو انسان پر اس قدر عنایات ہیں۔ مگر انسان ایسا ناشکرا اور نمک حرام واقع ہوا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

[۸۲] یعنی ایک عام اور معمولی عقل رکھنے والے انسان کو بھی ایسے سادہ اور عام فہم دلائل کی سمجھ آسکتی ہے مگر اسے بہکانے والے کوئی اور حضرات ہیں جن کے شرکیہ رسوم کے ساتھ اپنے ذاتی مفادات وابستہ ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے عام الناس کو اپنے جال میں اس طرح پھنسا رکھا ہے کہ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں آنے دیتے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ انہیں اصل راہ سے پھیر دیا گیا ہے۔

[۸۳] ۞ زمین کے جائے قرار ہونے کے مختلف پہلو۔ زمین کے جائے قرار ہونے کے بھی کئی پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ ہچکولے کھاتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے توازن و تناسب سے اس میں پہاڑ رکھ دیئے کہ وہ انسانوں اور تمام جانداروں کے لئے جائے قرار بن گئی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اسی زمین پر پیدا ہوتا ہے اسی پر زندگی گزارتا ہے اسی میں مرنے کے بعد دفن ہوتا ہے اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کے کھانے، پینے، لباس اور دوسری تمام ضروریات اسی

وَالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

آسمان کو (بمنزلہ) چھت [۸۴] بنایا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت عمدہ [۸۵] بنائیں اور تمہیں پاکیزہ چیزوں [۸۶] کا رزق دیا۔ یہ (ان صفات کا مالک) ہے تمہارا پروردگار

زمین سے وابستہ ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ زمین میں ایسی خصوصیات نہ رکھ دیتا تو نہ یہاں کوئی جاندار زندہ رہ سکتا اور نہ ہی زمین جائے قرار بن سکتی تھی۔

[۸۴] آسمان ایک محفوظ چھت کیسے؟ اس مقام پر آسمان کو چھت قرار دیا گیا ہے جبکہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۳۲ میں اسے ﴿سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ یعنی محفوظ چھت قرار دیا گیا ہے۔ اور چھت کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آفات سماوی سے محفوظ رکھتا ہے یہی فائدہ آسمان دنیا کا ہے۔ اس وسیع کائنات میں لاتعداد سیارے، دمدار ستارے اور ٹوٹنے والے ستارے انتہائی تیز رفتاری سے تیرتے پھرتے ہیں۔ یہ آپس میں بعض دفعہ ٹکرا کر پاش پاش بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر اللہ نے ہمارے اوپر یہ محفوظ چھت بنا دی ہے۔ ورنہ عالم بالا کی آفات زمین پر بارش کی طرح برس کر زمین والوں کو تہس نہس کر دیتیں۔ اس آسمان سے گزر کر کوئی تباہ کن چیز ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ حتیٰ کہ آفاق کی مہلک شعاعیں بھی ہم تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اسی وجہ سے ہم اس زمین پر امن و چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

[۸۵] جسمانی اعتبار سے انسان دوسرے جانوروں سے کن باتوں میں ممتاز ہے؟:۔ تمہاری شکل و صورت تمام جانداروں سے اعلیٰ قسم کی بنائی۔ دوسرے جانداروں سے انسان کی نمایاں جسمانی خصوصیات یہ ہیں کہ تمام جاندار اپنے منہ سے غذا کھاتے ہیں جبکہ انسان اپنے ہاتھ سے خوراک منہ تک لے جاتا ہے اکثر جاندار زمین پر ہی رینگتے یا چار پیروں پر چلتے ہیں۔ جبکہ انسان دو پاؤں پر چلتا ہے اور اپنا جسم سیدھا رکھ کر چلتا ہے۔ انسان کے ہاتھ اور پاؤں کثیر المقاصد ہیں جتنا کام انسان اپنے ہاتھ پاؤں سے لے سکتا ہے۔ دوسرا کوئی جاندار نہیں لے سکتا اس کے بے نظیر جسم اور جسمانی صلاحیتوں کے علاوہ جتنی ذہنی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بخشی ہیں وہ کسی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئیں۔ اور یہ صلاحیتیں عطا کرنا محض اللہ کا فضل و کرم ہے۔ جس میں کسی دیوتا، کسی نبی اور ولی اور بزرگ کا کچھ دخل نہیں ہوتا۔

[۸۶] زمین کی پیداوار کا بہترین حصہ انسان کے لئے ہے۔ زمینی پیداوار سے انسان کا بیشمار اشیاء بنا کر لطف اٹھانا:۔ جتنی بھی پیداوار زمین سے اگتی ہے اس کا بہترین حصہ انسان کی خوراک کے کام آتا ہے کسی جاندار کو اتنی عمدہ اور لذیذ چیزیں کھانے کو میسر نہیں آسکتیں۔ جتنی انسان کو یہ میسر آتی ہیں۔ یہ ٹھنڈا میٹھا اور نکھرا ہوا صاف شفاف پانی، یہ غلے، یہ پھل، یہ ترکاریاں، یہ دودھ، یہ شہد، یہ گوشت، یہ نمک مرچ اور مسالے انسان کی صرف غذا کا ہی کام نہیں دیتے بلکہ انسان ان سے اور پھر ان سے دوسری بہت چیزیں تیار کر کے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے۔ پھر انسان خوشبودار پھولوں اور ان سے عطریات تیار کر کے جو لطف اٹھاتا ہے وہ دوسرے کسی جاندار کے حصہ میں نہیں آتے۔ یہ سب چیزیں آخر کس نے اتنی فراوانی کے ساتھ زمین پر پیدا کی ہیں اور کس نے یہ انتظام کیا ہے کہ غذا کے یہ بے حساب خزانے زمین سے پے در پے نکلتے چلے آتے ہیں اور ان میں کبھی انقطاع واقع نہیں ہوتا اگر اللہ تعالیٰ تمہارے پاکیزہ رزق کا یہ انتظام نہ فرماتا تو تم خود سوچ لو کہ تمہاری زندگی کیسی بے کیف ہوتی۔ کیا یہ بات اس امر کا صریح

رَبُّكُمْ ۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٥﴾ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَاۗءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا
ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى

جو بڑا برکت والا اور تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔(۶۴) وہی زندہ[۸۷] ہے (جسے موت نہیں) اس کے سوا
کوئی الٰہ نہیں۔ لہٰذا تم خالص اسی کی حاکمیت[۸۸] تسلیم کرتے ہوئے اسے پکارا کرو۔ ہر طرح کی تعریف اللہ
رب العالمین کے لئے ہی ہے۔(۶۵) آپ ان سے کہئے کہ مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنہیں
تم اللہ کو چھوڑ[۸۹] کر پکارتے ہو، جبکہ میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس واضح دلائل بھی آچکے ہیں
اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں اللہ رب العالمین کا فرمانبردار بن کر رہوں(۶۶) وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے،
پھر نطفہ سے، پھر لوتھڑے سے پیدا کیا، پھر تمہیں بچے کی شکل میں (ماں کے پیٹ سے) نکالتا ہے۔ پھر
(انہیں بڑھاتا ہے) تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ۔ پھر (اور بڑھاتا ہے) تاکہ تم بڑھاپے کو جا پہنچو۔ پھر تم
میں سے کسی کو پہلے ہی وفات دے دی[۹۰] جاتی ہے تاکہ تم اس مدت کو پہنچو جو تمہارے لئے مقرر ہے

ثبوت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق ہی نہیں بلکہ وہ حکیم اور رحیم بھی ہے۔

[۸۷] اللہ کی صفات ازلی اور ابدی ہیں:۔ وہی ایک ذات ایسی ہے کہ ازل سے زندہ ہے اور ابدالآباد تک زندہ رہے گی۔ باقی سب چیزیں حادث ہیں اور وہ کسی نہ کسی وقت فنا سے دوچار ہو جائیں گی خواہ وہ جاندار ہیں یا بے جان۔ باقی تمام جانداروں کی زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے جب کہ اس کی زندگی ذاتی ہے۔ لہٰذا اصل میں زندہ کہلانے کا وہی مستحق ہے پھر جس طرح اس کی زندگی ازلی اور ابدی ہے اسی طرح اس کی دوسری تمام صفات بھی ازلی ابدی ہیں۔ اور معبود برحق صرف وہی ذات ہو سکتی ہے جس کی حیات اور دوسری صفات مستقل اور دائمی ہوں۔ دوسرے کسی الٰہ میں یہ صفات موجود نہیں ہیں۔

[۸۸] اس کی تشریح کے لئے سورۂ زمر کی آیت نمبر ۲ اور ۳ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

[۸۹] دعا اور عبادت ہم معنی ہیں:۔ اس آیت میں بھی دعا اور عبادت کو ایک دوسرے کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ نیز اس آیت میں ان کافروں کو دوٹوک اور کھرا کھرا جواب دے دیا گیا ہے جو کچھ لینے اور کچھ دینے یعنی مداہنت کے اصول پر سمجھوتہ کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔

[۹۰] انسان کی تخلیق اور زندگی کے مختلف مراحل سے بعث بعد الموت پر دلیل:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کے بے جان ذروں سے تمہارے لئے خوراک پیدا کی۔ اسی بے جان خوراک سے کئی مراحل طے کرنے کے بعد تمہارے اندر منی پیدا ہوئی اور اطباء کے قول کے مطابق منی چوتھے ہضم کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر اسی منی کا قطرہ جب ماں کے رحم میں داخل ہوتا ہے

ع ۱۲ وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾ هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٦٨﴾

اور (یہ سب کچھ اس لئے ہے) تاکہ تم عقل سے کام لو۔(۶۷) وہی تو ہے جو تمہیں زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ پھر جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اسے اتنا ہی کہتا ہے کہ ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتا[91] ہے۔(۶۸)

اور اسے رحم مادر قبول کر لیتا ہے تو اس پر کئی ادوار آتے ہیں بعد میں اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ اور ایک مقررہ مدت کے بعد خوبصورت شکل اور محیر العقول صلاحیتیں لے کر رحم مادر سے باہر آجاتا ہے۔ اس وقت وہ نہ چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے نہ کچھ سمجھ سکتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں وہ قوتیں نشوونما پانے لگتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں رکھ دی ہیں۔ انسان کے بڑھنے کے ساتھ اس کی عقل، اس کا فہم، اس کی جسمانی قوت، اس کا قد و قامت غرض ہر چیز بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر اس پر بڑھاپے کا وقت آتا ہے تو پہلے جیسی غذائیں کھانے کے باوجود قد بڑھنا رک جاتا ہے اور دوسری قوتوں میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اور آخری مرحلہ موت ہے۔ جو کبھی تو بچپن میں ہی آجاتی ہے، کبھی اسقاط ہو جاتا ہے کبھی جوانی میں انسان مرتا ہے اور کبھی بوڑھا کھوسٹ ہونے کے باوجود بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتا رہتا ہے مگر اسے موت نہیں آتی۔ ذرا سوچو! ان مراحل میں سے کوئی مرحلہ بھی تمہارے اپنے اختیار میں ہے۔ پھر اگر بعث بعد الموت کا ایک اور مرحلہ تم پر گزر جائے تو تم اسے کیسے محال سمجھتے ہو؟

موت سے متعلق چند اٹل حقائق:۔ پھر موت ایک ایسا اضطراری امر اور اٹل حقیقت ہے جو اپنے اندر کئی تلخ حقائق سمیٹے ہوئے ہے۔ کوئی فقیر، کوئی امیر، کوئی بادشاہ اس کی گرفت سے نہ آج تک بچ سکا ہے نہ آئندہ بچ سکے گا۔ پھر اس کا جو وقت مقرر ہے وہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعہ انسان بے شمار حوادث سے بچ نکلتا ہے اور موت کے منہ سے بچا رہتا ہے۔ اور بعض دفعہ ایک معمولی سا حادثہ اس کا جان لیوا ثابت ہو جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ ہسپتال سے داخل ہو کر اور ماہر ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنے کے باوجود موت کے وقت کو آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ اور اس میں جو ایک مرد مومن اور صاحب عقل کے لئے سبق ہے وہ یہ ہے کہ دشمن اسلام طاقتیں جتنا بھی زور لگا لیں، جتنی بھی سازشیں تیار کر لیں کسی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتیں جب تک کہ اس کی موت کا وقت نہ آئے۔ سیدنا خالد بن ولید تقریباً ایک سو جہاد کے معرکوں میں شریک ہوئے لیکن موت آئی تو بستر مرگ پر گھر میں ہی آئی۔ یہ عقیدہ ایک مجاہد میں بے پناہ جرأت پیدا کر دیتا ہے۔

پھر اس کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے ایک خطہ زمین جس میں ایک ہی قسم کا بیج ڈالا جائے۔ سیراب ایک ہی طرح کے پانی سے ہو، موسم اور آب و ہوا ایک جیسی ہو۔ نگہداشت ایک جیسی ہو اس خطہ زمین کے سارے پودے تقریباً ایک ہی جیسی پرورش اور زندگی پاتے ہیں۔ مگر ایک ہی والدین کے چھ بچے جن کی خوراک ایک، آب و ہوا ایک، گھر ایک ماں باپ ایک، لیکن عمریں سب کی جدا جدا ہوتی ہیں کوئی بچپن میں مرتا ہے، کوئی جوانی میں اور کوئی اتنا بوڑھا اور ذلیل ہو جاتا ہے کہ وہ خود چاہتا ہے کہ اللہ اسے دنیا سے اٹھا لے مگر اسے موت نہیں آتی۔ کیا یہ سب باتیں اس حقیقت کی نشاندہی نہیں کرتیں کہ کوئی قادر مطلق ہستی ہماری موت و حیات پر حکمران ہے۔ کسی دیوتا، کسی پیر، پیغمبر، کسی ستارے اور آستانے والے کا اس میں کچھ دخل نہیں یا کم از کم حکیم اور ڈاکٹر خود تو نہ مرتے۔ ہر کسی کی بے بسی ایک جیسی ہے تو ایسے بے بسوں کو عبادت کا مستحق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اور کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو اللہ کے سوا دوسروں کی خدائی تسلیم کر لیتے ہیں۔

[91] ﴿كُن فَيَكُونُ﴾ کی تشریح کے لئے دیکھئے سورہ یٰسین کی آیت نمبر ۸۲ کا حاشیہ نمبر ۴۷

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنَّىٰ يُصْرَفُونَ ﴿٦٩﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٧٠﴾ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ﴿٧١﴾

آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں؟ وہ کہاں سے پھرا دیئے[۹۲] جاتے ہیں؟(۶۹) ان لوگوں نے اس کتاب (قرآن) کو بھی جھٹلایا اور ان کتابوں کو بھی جو ہم نے رسولوں کو دے کر بھیجی[۹۳] تھیں۔ عنقریب انہیں (سب کچھ) معلوم ہو جائے گا(۷۰) جبکہ ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہوں گے اور ایسی زنجیریں جن سے پکڑ کر وہ کھولتے پانی میں گھسیٹے[۹۴] جائیں گے۔(۷۱)

[۹۲] قرآن کی آیات سے اپنے نظریات کشید کرنا اور ان میں جھگڑا اور فرقہ بازی:۔ اللہ کی آیات سے مراد آیات آفاق و انفس بھی ہو سکتی ہے جن کا قرآن نے بے شمار مقامات پر اور یہاں بھی توحید کے دلائل کے طور پر ذکر کیا ہے۔ پھر بھی مشرک لوگ ان میں جھگڑا کرتے اور اللہ کے پیاروں کو اللہ کے اختیارات میں شریک بنا لیتے ہیں اور اگر ان آیات سے مراد اللہ کے احکام و ارشادات لئے جائیں تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ایک پہلو کی انتہا کو پہنچ کر ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں پھر جو آیات اپنے اس قائم کردہ نظریہ کے خلاف نظر آئیں ان کی تاویل کر لیتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں نے جب موت و حیات اور رزق وغیرہ کے معاملہ میں انسان کی بے بسی دیکھی تو یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان مجبور محض اور قدرت کے ہاتھوں میں محض ایک کھلونے کی حیثیت رکھتا ہے پھر جن آیات سے انسان کا اختیار ثابت ہوتا تھا ان کی تاویل کر ڈالی۔ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں کچھ دوسرے لوگ اٹھے جنہوں نے قرآن ہی کی آیات سے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان مختار مطلق ہے اور جو کام بھی وہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اور ایسی آیات جن سے انسان کی بے بسی ثابت ہوتی تھی ان کی تاویل کر ڈالی۔ اس طرح اللہ کی آیات میں بحث و جدال اور ایک ہی طرف انتہا کو پہنچنے اور دوسرے پہلو سے صرف نظر کرنے کی بنا پر آغاز اسلام میں دو فرقے جبریہ اور قدریہ ایک دوسرے کے مدمقابل کے طور پر سامنے آگئے۔ وہی مسئلہ تقدیر جس پر بحث کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے سختی سے روک دیا تھا۔ اسی مسئلہ پر بحث و جدال کے نتیجہ میں یہ دو فرقے پیدا ہوئے اور اپنے اپنے نظریہ کی حمایت میں قرآن کی آیات میں بحث و جدال اور انہی سے استدلال کرنے لگے...... حالانکہ اس مسئلہ میں راہِ صواب اور راہِ اعتدال یہ ہے کہ انسان بعض معاملات میں مجبور ہے اور بعض میں مختار۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت ہے اب اللہ تعالیٰ کا عدل یہ ہے کہ جس کام میں انسان مجبور ہے وہاں اس پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ مؤاخذہ یا باز پرس صرف اس کام کے متعلق ہوگی جس میں وہ مختار ہے۔ یا جس حد تک مختار ہے...... بعد ازاں جتنے بھی بدعی فرقے پیدا ہوئے ہر ایک نے اپنی بنائے استدلال قرآن ہی پر رکھی اور من مانی تاویل حتیٰ کہ اپنی بات کی اونچ میں آکر معنوی اور لفظی تحریف تک سے باز نہ آئے اور ایسی چند تاویلات ہم اپنے حواشی میں پیش کر چکے ہیں۔

[۹۳] کیونکہ سابقہ کتب سماوی کی بنیادی تعلیم وہی کچھ ہے جو قرآن کریم کی ہے اور ان لوگوں کا قرآن یا پہلی کتابوں کو جھٹلانا یہ ہے کہ وہ قرآن سے ہدایت لینے کے خواہشمند نہیں ہوتے بلکہ قرآن میں اپنے قائم کردہ نظریات کو داخل کرنا چاہتے ہیں۔

[۹۴] یعنی ایسے اہلِ دوزخ مشرکوں کو جب پیاس لگے گی تو فرشتے ان کو گھسیٹتے ہوئے ایسے مقام پر لے جائیں گے جہاں گرم پانی کے چشمے ابل رہے ہوں گے۔ انہیں وہاں سے گرم پانی پلانے کے بعد پھر اپنے اصل مقام پر لا کر دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

0000953

فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـــًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا

پھر دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے (۷۲) پھر ان سے پوچھا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنہیں تم اللہ کے سوا شریک بنایا کرتے تھے (۷۳) وہ کہیں گے وہ ہماری یاد سے گم ہو چکے ہیں۔ بلکہ ہم تو اس سے پہلے کسی چیز کو بھی پکارتے[۹۵] ہی نہ تھے۔ اللہ اسی طرح کافروں کو بھول بھلیوں[۹۶] میں ڈال دیتا ہے (۷۴) (پھر انہیں کہا جائے گا کہ) تمہارا یہ انجام اس وجہ سے ہے کہ کسی معقول وجہ کے بغیر زمین میں پھولے نہ سماتے تھے اور اکڑ اکڑ کر چلتے تھے (۷۵) (اب) دوزخ کے دروازوں میں سے داخل ہو جاؤ، تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ تکبر[۹۷] کرنے والوں کا کیسا برا ٹھکانا ہے (۷۶) پس (اے نبی!) آپ صبر کیجئے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے،

[۹۵] اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور وہ دونوں ہی درست ہیں۔ ایک جو ترجمہ سے واضح ہے کہ مشرک لوگ سب کچھ بھول بھلا کر اپنے شرک سے ہی یکسر انکار کر دیں گے۔ اور دوسرا یہ کہ جن چیزوں کو ہم دنیا میں پکارتے رہے فی الواقع ان کے اختیار میں کچھ بھی نہ تھا اور وہ لاشی محض تھے۔ یہ ہماری ہی غلطی تھی کہ ہم انہیں "کوئی چیز" سمجھتے رہے۔

[۹۶] مشرکین کی بدحواسی۔ ایک ہی سوال کے متضاد جوابات:۔ اس جملہ میں مشرکوں کی بدحواسی کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک ہی سوال کے مختلف اور متضاد جواب دیئے جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ آج وہ تمہارے شریک کہاں ہیں جنہیں تم اللہ کے شریک بنایا کرتے تھے اس کا ایک جواب وہ تو یہ دیں گے کہ ہمیں تو کچھ یاد نہیں پڑتا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو پکارا کرتے تھے اور اگر کوئی ایسی بات تھی بھی تو وہ ہمیں آج دکھائی نہیں دے رہے۔ یا ہماری یاد سے محو ہو چکے ہیں۔ دوسرا جواب یہ کہ وہ صاف مکر جائیں گے کہ ہم کب اللہ کے سوا کسی کو پکارا کرتے تھے۔ اور تیسرا جواب وہ ہے جو الگ کئی مقامات پر مذکور ہے کہ عبادت کرنے والے اپنے معبودوں پر الزام لگائیں گے کہ یا اللہ! ان بڑے بزرگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا لہٰذا انہیں دگنا عذاب دے۔ اس جواب میں وہ اپنے جرم کا پورا اعتراف کر رہے ہوں گے۔ یعنی سوال ایک ہے مگر جواب میں کیسی گومگو کی حالت ہے کبھی انکار ہے اور کبھی اعتراف۔ انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی ہو گی کہ ہم کون سا جواب دے کر اس پر ڈٹ جائیں جس کی وجہ یہ ہے کہ باطل کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی۔

[۹۷] تکبر کی تعریف اور متکبرین کا انجام:۔ ان دو آیات سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ قبول حق سے انکار کی سب سے بڑی وجہ تکبر ہوتی ہے۔ اور دوسری یہ کہ دوزخ میں سب سے زیادہ بھرتی متکبرین کی ہو گی۔ اور انہی باتوں کی مزید تفاصیل احادیث میں بھی ملتی ہے:

۱۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص جنت میں داخل نہ ہو گا جس کے دل میں رائی بھر بھی

نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٧٧﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن

ہم نے جس عذاب کا ان سے وعدہ کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو (آپ کی زندگی میں ہی) دکھا دیں یا آپ کو اٹھا لیں (اور انہیں بعد میں عذاب دیں) آخر انہیں ہماری ہی طرف لوٹ[۹۸] کر آنا ہے۔(۷۷)

آپ سے پہلے ہم کئی رسول بھیج چکے ہیں ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے بیان کر دیا ہے اور کچھ ایسے جن کا حال بیان نہیں کیا اور کسی رسول میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اللہ کے اذن[۹۹] کے

تکبر ہو" ایک شخص کہنے لگا ہر انسان اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کی جوتی اچھی ہو۔ (کیا یہ تکبر ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا اللہ خوب صورت ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو یہ ہے کہ تو حق کو ٹھکرا دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے" (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب تحریم الکبر وبیانہ)

۲۔ حارثہ بن وہب خزاعی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں اہل جنت کی خبر نہ دوں؟ وہ ایسے کمزور اور گمنام لوگ ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دے۔ اور کیا میں تمہیں اہلِ دوزخ کے متعلق نہ بتاؤں۔ ہر اکھڑ مزاج، بد خلق اور متکبر دوزخی ہوتا ہے" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب الکبر)

۳۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب تحریم الکبر و بیانہ)

[۹۸] ❁ **کفار مکہ پر عذاب کی تین صورتیں:۔** یعنی یہ کفار مکہ جو آپ کو ستا رہے ہیں اور اسلام کی راہ روکنا چاہتے ہیں ان کے متعلق اللہ کے عذاب کا وعدہ پورا ہوتا ہی ہے۔ اور اس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کے جیتے جی ان پر عذاب آ جائے۔ جیسا کہ جنگ بدر، جنگ احزاب اور فتح مکہ کے وقت کافروں کی رسوائی ہوئی۔ دوسری صورت یہ کہ اس عذاب کا کچھ حصہ آپ کی زندگی کے بعد ان پر آئے۔ اور اس سے مراد وہ جنگیں ہیں جو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مرتدین، ملحدین اور کافروں سے لڑیں اور اسلام کا پوری طرح بول بالا ہوا اور کافروں اور کفر کو رسوائی نصیب ہوئی۔ اور تیسری اور حتمی صورت یہ ہے کہ آخر مرنے کے بعد انہوں نے ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ اس وقت ہم ان کے سب کس بل نکال دیں گے اور انہیں ان کے جرائم کا پورا پورا بدلہ دیں گے۔

[۹۹] ❁ **حسی معجزہ اور اس کے تقاضے:۔** کیونکہ معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ براہ راست اللہ کا فعل ہوتا ہے البتہ اس کا صدور نبی کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ معجزہ محض کھیل تماشا کے طور پر عطا نہیں ہوتا بلکہ اس سے مقصود کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ بعض انبیاء کو کچھ معجزات ان کے طلب کرنے کے بغیر کافروں پر دلیل نبوت اور اتمام حجت کے طور پر عطا کئے گئے اور اگر کوئی پیغمبر کوئی حسی معجزہ پیش نہ کرے اور قوم اس سے حسی معجزہ کا مطالبہ کرے پھر اللہ تعالیٰ قوم کے مطالبہ پر ایسا معجزہ نبی کو دے دے لیکن کافر قوم پھر بھی ایمان نہ لائے تو اس پر یقیناً عذاب الیم

يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٧٨﴾ ع ۱۳

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٧٩﴾ وَلَكُمْ فِيهَا

مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿٨٠﴾

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللَّهِ تُنْكِرُونَ ﴿٨١﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ

بغیر کوئی معجزہ از خود لا سکتا۔ پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو انصاف کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت غلط کار[۱۰۰] لوگ ہی خسارہ میں رہے۔(۷۸)

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے مویشی پیدا کیے ان میں بعض پر تم سوار ہوتے ہو اور بعض (کا گوشت) کھاتے ہو(۷۹) نیز تمہارے لئے ان میں اور بھی کئی فائدے ہیں اور جہاں جانے کی ضرورت تمہارے جی میں آئے۔ ان پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے ہو، نیز ان پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو(۸۰) اللہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا رہا ہے پھر تم اس کی کن کن[۱۰۱] نشانیوں کا انکار کرو گے؟(۸۱)

کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟

نازل ہوتا ہے۔ جیسے قوم ثمود نے صالح علیہ السلام سے اونٹنی کا معجزہ طلب کیا تھا۔ لیکن ان کے اس معجزہ ملنے کے بعد بھی جب وہ ایمان نہ لائے تو انہیں تباہ کر دیا گیا۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے آسمان سے پکا پکایا اور تیار دستر خوان اترنے کا مطالبہ کیا۔ تو بعض روایات کے مطابق ان کا یہ مطالبہ تو پورا کر دیا گیا۔ مگر پھر بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے تو انہیں بندر و سور بنا دیا گیا تھا۔ کفارِ مکہ بھی آپ ﷺ سے کئی طرح کے حسی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے جن کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے یہ منہ مانگے معجزات رسول اللہ ﷺ کو اسی وجہ سے عطا نہیں فرمائے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ قوم قریش کو کچل کے رکھ دیا جائے کیونکہ بعد میں انہیں لوگوں میں سے بہت لوگوں نے اسلام لا کر بیش بہا خدمات سر انجام دیں۔

[۱۰۰] "اللہ کے حکم" سے یہاں مراد اللہ کے عذاب کا حکم ہے اور اس کا اطلاق کسی قوم پر دنیا میں عذاب کے دن پر بھی ہو سکتا ہے اور آخرت کے دن پر بھی۔ جو بھی صورت ہو اللہ تعالیٰ رسولوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان منصفانہ فیصلہ کر دیتا ہے اس وقت رسول سرخرو اور کامیاب ہوتے ہیں اور باطل پرستوں کے حصہ میں ذلت و خسران کے سوا کچھ نہیں آتا۔

[۱۰۱] مویشیوں میں انسان کیلئے خوئے غلامی کس نے پیدا کی' مویشیوں سے انسان کو حاصل ہونے والے فوائد:۔ کفار مکہ رسول اللہ ﷺ سے طرح طرح کے حسی معجزات کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ جس کا ایک جواب تو سابقہ آیت میں دیا گیا ہے کہ ایسا معجزہ پیش کرنا کسی رسول کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان آیات میں کفار کے اسی مطالبہ کا دوسرا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تو تمہیں اپنے دائیں بائیں، اوپر نیچے اندر باہر ہر طرف ہی مل سکتی ہیں۔ اگر تم سوچو تو تمہارے راہ راست کو قبول کرنے کے لئے رہنمائی ان میں بھی موجود ہے۔ مثلاً جو مویشی تم پالتے ہو ان پر بھی نظر ڈال کر دیکھ لو۔ ان کی ساخت اور ان کی فطرت

عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ

وہ تعداد میں ان سے زیادہ، قوت میں ان سے سخت، اور زمین میں اپنے آثار چھوڑنے میں[۱۰۲] ان سے بڑھ کر تھے، مگر جو وہ کام کر رہے تھے یہ سب چیزیں ان کے کچھ کام نہ آسکیں (۸۲) پھر جب ان کے رسول، ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو جو علم[۱۰۳] ان کے پاس تھا وہ اسی میں مگن رہے اور

ہی ہم نے ایسی بناوٹ دی ہے کہ وہ فوراً تمہارے تابع بن جاتے ہیں۔ پھر ان سے تم ہزاروں قسم کے فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان کے دودھ سے بالائی، مکھن، پنیر، گھی اور لسی بناتے ہو۔ اور یہ چیزیں تمہارے جسم کا انتہائی اہم جزو ہیں۔ پھر ان پر سواری کرتے ہو۔ تمہارے بوجھل سامان کو یہ اٹھاتے ہیں۔ تمہاری کھیتی میں ہل یہ چلاتے ہیں۔ کنوئیں سے پانی یہ کھینچتے ہیں۔ مشقت کے سب کام تم ان سے لیتے ہو۔ پھر انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ ان کے بالوں سے اپنی پوشاک تیار کرتے ہو۔ اور مرنے کے بعد ان کی ہڈیوں، دانتوں اور کھالوں تک کو اپنے کام میں لاتے ہو۔ ان مویشیوں میں انسان کے لئے یہ خوئے غلامی کس نے پیدا کی؟ تمہاری پیدائش سے بھی بہت پہلے تمہاری ضروریات کا اس قدر خیال رکھنے والا کون ہے؟

❁ **اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کا کیوں محاسبہ نہ کیا جائے:۔** اب دوسری طرف نظر ڈالو۔ زمین کے تین چوتھائی حصہ پر پانی یا سمندر پھیلے ہوئے ہیں۔ خشکی صرف چوتھا حصہ ہے جس پر تم اور تمہارے مویشی سب رہتے ہیں۔ اتنے سے خشکی کے حصہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا پانی کا ذخیرہ کیوں پیدا کر دیا؟ کیا کبھی تم نے اللہ کی اس نشانی پر غور کیا؟ پھر پانی اور ہواؤں کو ایسے طبعی قوانین کا پابند بنا دیا کہ تم دریاؤں اور سمندروں میں کشتی بانی اور جہاز رانی کے قابل بن گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے لئے طبعی قوانین ہی بدل ڈالے اور وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اس میں جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے تو کیا تم جہاز رانی کر سکتے تھے؟ یا اس زمین پر زندہ رہ سکتے تھے؟ پھر یہ بھی سوچو کہ جس حکمتوں والے پروردگار نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں تمہارے تصرف میں دے رکھی ہیں کیا وہ انسان کو اتنے اختیارات دے کر اس کو یونہی چھوڑ دے گا اور اس سے اپنی ان نعمتوں کا کبھی حساب نہ لے گا؟ اور یہ نہ پوچھے گا کہ جس رحیم پروردگار نے تمہاری جملہ ضروریات کا اس قدر خیال رکھا۔ پھر ساتھ کے ساتھ اپنی رحمتیں بھی نازل فرماتا رہا تو کیا انسان نے اللہ کی ان نعمتوں کی قدر کی؟ اس کا شکریہ ادا کیا؟ یا وہ نمک حرام اور ناشکرا ثابت ہوا اور اپنی نیاز مندیاں اللہ کے بجائے دوسرے کے سامنے نچھاور کرنے لگا؟

[۱۰۲] ❁ **اقوام سابقہ کی شان و شوکت:۔** سابقہ اقوام اپنے قدو قامت، جسمانی قوت، فن تعمیر اور فن زراعت پر کام میں ان کفارِ مکہ سے بہت آگے تھے۔ اور یہ لوگ تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں مگر جب انہوں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا اور اللہ کا احسان ماننے کی بجائے بغاوت پر اتر آئے۔ پھر جب ان پر اللہ کا عذاب آیا تو ان کی یہ ساری خوبیاں اور شان و شوکت دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پھر آخر تم ان سے کمزور اور کمتر ہو کر کیوں ایسی اکڑ دکھا رہے ہو؟ اور تم اپنی کرتوتوں کے انجام سے کیونکر بچ سکو گے؟

[۱۰۳] ❁ **وحی کے علاوہ لوگوں کے پاس اپنے علوم کون سے تھے؟** وہ علم ان کے پاس کیا تھا؟ یہی دیومالائی علم

الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ
وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ
الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

ع ۱۴

جس (عذاب) کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے انہیں آگھیرا(۸۳) اور جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ [۱۰۴] لیا تو کہنے لگے "ہم اللہ اکیلے پر ایمان لائے اور جنہیں ہم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے ان سے انکار کرتے ہیں" (۸۴)

مگر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کے ایمان نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ یہی سنتِ الٰہی ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہی ہے اور اس (عذاب کے) موقعہ پر کافر لوگ خسارہ میں پڑ گئے۔ (۸۵)

(Mythology) جس کی رو سے انہوں نے ہزاروں دیوتاؤں اور دیویوں کو اللہ کے اختیارات میں شریک بنا رکھا تھا۔ پھر ان کا آپس میں بھی اور اللہ سے نسبی رشتہ قائم کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں علم سے مراد ہر قوم کے اختراعی مذہبی فلسفے اور سائنس اور اپنے ضابطہ حیات سے متعلق قوانین وغیرہ ہیں۔ جب انبیاء ان کے پاس آئے اور انہیں وحی الٰہی کے علم کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے ہاں مروجہ علوم کے مقابلہ میں وحی الٰہی کے علم کو ہی ہیچ سمجھا اور اس طرف توجہ ہی نہ دی۔ کہتے ہیں کہ ارسطو حکیم کو، جو خود اپنے فلسفہ الٰہیات کا موجد تھا جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے دین کی طرف دعوت دی گئی تو وہ کہنے لگا کہ میں سوچ کر بتاؤں گا۔ بعد میں اس نے یہ جواب دیا کہ ہم خود ہی راہ پائے ہوئے ہیں۔ دوسروں کو ہمیں راہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

[۱۰۴] ایمان کی شرط اول ایمان بالغیب ہے اور عذاب دیکھ لینے یا موت کے وقت تو سب حقیقت مشاہدہ میں آ جاتی ہے، غیب رہتی ہی نہیں اور مشاہدہ پر تو سب ہی لوگ یقین رکھتے ہیں خواہ کافر ہوں یا دہریے ہوں یا مشرک ہوں۔ لہٰذا عذاب دیکھنے یا موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد ایمان لانا بے سود ہے۔ بلکہ اس طرح مشاہدے پر لفظ ایمان کا اطلاق بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔

۵۴ آیاتها سورۃ حم السجدۃ مکیۃ رکوعها ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳ بَشِيْرًا

کلمات ۸۰۹ آیات ۵۴ (۴۱) سورۃ حم السجدۃ[1] مکی ہے (۶۱) رکوع ۶ حروف ۳۶۰۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ (۱) یہ (قرآن) بڑے مہربان نہایت رحم والے کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ (۲) ایسی کتاب جس کی آیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، عربی زبان میں ہے اور ان لوگوں کیلئے جو علم رکھتے ہیں (۳) یہ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا[2] ہے

[1] سردارانِ قریش دعوتِ اسلام کو نیچا دکھانے کے لیے کئی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی طرح رسول اللہ ﷺ اور مشرکین مکہ میں بالفاظ دیگر حق و باطل میں سمجھوتہ ہو جائے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ حرم کے ایک گوشہ میں اور چند سردارانِ قریش دوسرے گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ ایک معزز قریشی سردار، نہایت بہادر اور فطرتاً نیک دل انسان تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ میں ''محمد ﷺ پر کچھ باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے وہ ان میں سے ایک نہ ایک ضرور مان لے گا اور اگر اس نے قبول کر لی تو ہم اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکیں گے۔'' اس کے ساتھیوں نے کہا: ابوالولید! آپ ضرور یہ کام کیجئے۔ چنانچہ عتبہ وہاں سے اٹھ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آ بیٹھا اور کہنے لگا بھتیجے! ہماری قوم میں جو تفرقہ پڑ چکا ہے اسے آپ جانتے ہیں۔ اب میں چند باتیں پیش کرتا ہوں ان میں سے جو بھی چاہو پسند کر لو۔ مکہ کی ریاست چاہتے ہو یا کسی بڑے گھرانے میں شادی یا مال و دولت؟ اور اگر آپ ﷺ کے پاس کوئی جن بھوت آتا ہے تو اس کے علاج کی بھی ذمہ داری ہم قبول کرتے ہیں۔ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ مکہ تمہارا زیرِ فرمان ہو مگر تم ان باتوں سے باز آ جاؤ''

❁ عتبہ بن ربیعہ کی آپ کو پیشکش اور آپ کا جواب (حق و باطل میں سمجھوتہ کی کوشش):۔ رسول اللہ ﷺ عتبہ کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔ جب عتبہ خاموش ہو گیا۔ تو آپ نے عتبہ سے کہا کہ جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ اب میرا جواب سن لو۔ پھر آپ ﷺ نے ان سب باتوں کے جواب میں اسی سورہ کی چند ابتدائی آیات پڑھیں۔ جب آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ تو عتبہ کے آنسو بہنے لگے اور آپ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں ایسا عذاب اسی وقت نہ آن پڑے۔ پھر وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ مگر اب وہ پہلا عتبہ نہ رہا تھا۔ جا کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا ''محمد (ﷺ) جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری نہیں کچھ اور ہی چیز ہے۔ تم اسے اسکے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس میں تمہاری ہی عزت ہے اور اگر وہ خود ہی ختم ہو گیا تو بھی کچھ تم لوگ چاہتے ہو'' اس کے ساتھیوں نے کہا: ابوالولید! معلوم ہوتا ہے کہ تم پر بھی اس کا جادو چل گیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۱۵۹ تا ۱۶۱)

[2] ❁ قرآن کی چار صفات کا ذکر:۔ یہ تمہیدی آیات ہیں جن میں قرآن کی چند صفات بیان کر کے اسے متعارف کرایا جا رہا

وَنَذِيرًا ۚ فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٤﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي
آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ ﴿٥﴾ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ

مگر اکثر لوگوں نے اس سے اعراض کیا اور اسے سنتے ہی نہیں۔(۴) اور کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کان (یہ کلام سننے سے) بہرے ہوگئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان[۳] ایک پردہ حائل ہے لہٰذا تم اپنا کام کئے جاؤ ہم اپنا کام[۴] کئے جائیں گے(۵) آپ ان سے کہئے کہ: میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان[۵] ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

ہے اس کی پہلی صفت یہ ہے کہ یہ نہ محمد (ﷺ) کا اپنا کلام ہے نہ ہی کسی دوسرے آدمی کا ہے بلکہ یہ اس ہستی کی طرف سے نازل شدہ ہے جو رحمان و رحیم ہے۔ اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان ہے اور یہ اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی فلاح و سعادت کے لیے قرآن جیسی عظیم نعمت نازل فرمائی ہے اور اگر کوئی شخص اس نعمت سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو وہ انتہائی ناشکرا اور ناقدر شناس ہے۔ اس کتاب کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کی آیات کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ نئے سے نئے پیرائے میں بار بار بیان کیا گیا ہے تاکہ سمجھنے میں کوئی ابہام، کوئی پیچیدگی اور کھٹک باقی نہ رہے۔ نیز اس میں سینکڑوں قسم کے مضامین ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کی تیسری صفت یہ ہے کہ یہ قرآن عربی زبان میں ہے۔ تاکہ اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے اور قوم کے لیے نافہمی کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ تاہم اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو اہل علم و دانش ہیں۔ جہالت کی بنا پر اڑ جانے والے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کی چوتھی صفت یہ ہے کہ یہ کتاب نہ کوئی افسانوی تخیل ہے اور نہ ہی انشاپردازی کا نمونہ ہے بلکہ یہ تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اس کی تعلیم کو مان لینے کے نتائج شاندار اور نہ ماننے کے نتائج نہایت ہولناک ہیں۔

[۳] قرآن کی ان گوناگوں خوبیوں کے باوجود زیادہ تر لوگ اس کی مخالفت پر اتر آئے ہیں وہ اس کی آیات کو تسلیم کرنا تو در کنار سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ پھر اپنی اس خصلت پر فخر بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی تعلیم ہمارے دلوں پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ہمارے دل ایسے اثرات قبول کرنے سے کلیتاً محفوظ ہیں۔ بلکہ ہمیں تو ان آیات کا سننا بھی گوارا نہیں۔ ایسی باتیں سن سن کر ہمارے کان پک گئے ہیں۔ لہٰذا وہ سننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اے محمد (ﷺ!) تمہاری اس دعوت سے ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت کی ایک دیوار حائل ہو چکی ہے اور اس دعوت نے ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ لہٰذا ہم تمہاری اس دعوت کو کسی قیمت پر قبول کرنے کو تیار نہیں۔

[۴] اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ ہمیں تم سے اور تمہیں ہم سے اب کوئی سروکار نہیں اور ہم دونوں کبھی مل کر بیٹھ نہیں سکتے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی دعوت سے باز نہیں آتے تو اپنا کام کئے جاؤ۔ ہم بھی تمہاری مخالفت سے کبھی باز نہ آئیں گے۔ اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں کی ایذا رسانیوں اور معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود اسلام کی دعوت میں اتنی پیش رفت ہو چکی تھی کہ مخالفین مساویانہ سطح پر گفتگو کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

[۵] اس لیے میں نہ تو تمہارے دلوں کے پردوں کو ہٹا سکتا ہوں، نہ تمہاری ثقل سماعت کو دور کر سکتا ہوں اور جو عداوت و

أَنَّمَآ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوٓا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ﴿٦﴾ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ
الزَّكٰوةَ وَهُم بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُونَ ﴿٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿٨﴾ ع ١٥
قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهٗٓ أَندَادًا ۚ ذٰلِكَ رَبُّ
الْعٰلَمِينَ ﴿٩﴾ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا فِيٓ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۭ

کہ تمہارا الٰہ بس ایک ہی الٰہ ہے۔ لہٰذا سیدھے اسی کی طرف متوجہ رہو اور اسی سے معافی مانگو اور ان مشرکوں کے لئے ہلاکت ہے (۶) جو زکوٰۃ[۶] ادا نہیں کرتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں (۷) بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی منقطع[۷] نہ ہوگا۔ (۸)

آپ ان سے کہئے: "کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا؟ اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو؟ یہ (اس صفت کا مالک) ہے سب جہانوں کا پروردگار (۹) نیز اس نے زمین کے اوپر مضبوط پہاڑ بنا دیئے اور اس میں برکت رکھی اور ٹھیک اندازے سے چار دنوں میں اس میں روئیدگی کی قوتیں رکھ دیں

مخالفت کی دیوار تم نے حائل کر رکھی ہے میں اسے بھی گرا دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہی ہوں اور یہ کام ایک انسان کی بساط سے باہر ہیں۔ ہاں تمہارے جیسا انسان ہونے کے باوجود میں یہ ضرور دعویٰ رکھتا ہوں کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل کی جاتی ہے۔ جس کا بنیادی مضمون یہی ہے کہ تمہارا الٰہ صرف ایک ہی الٰہ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ بات میں کوئی وہم و گمان اور قیاس کی بنا پر نہیں کہتا بلکہ وحی جیسے یقینی علم کی بنا پر کہتا ہوں۔ اور وحی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں میں خدائی اختیارات و تصرفات کو تسلیم کرنا چھوڑ دو۔ اور اپنے ذہن کو ایسے مشرکانہ عقائد سے پاک صاف کر کے اپنی سب امیدیں ایک اللہ کے ساتھ وابستہ کر دو۔ فریاد کے لیے پکارو تو اسی کو پکارو۔ اور پہلے جو غلط روش تم نے اختیار کر رکھی تھی اس کے لیے پروردگار سے معافی مانگو۔ ورنہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی پکارنے والوں کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

[۶] ❁ <u>زکوٰۃ کے دو معنی</u>:۔ اس جملہ کے دو مطلب ہیں۔ ایک لغوی اعتبار سے زکٰی کے معنی بالیدگی، نشوونما پانا اور عمدہ ہونا اور زکی اور زکیٰ کے معنی نفس کو روحانی آلائشوں، عقائد کی خرابیوں، بیماریوں اور اخلاق رذیلہ سے پاک کر کے اوصاف حمیدہ پیدا کرنا ہے۔ اس لحاظ سے اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ ان مشرکوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنے مشرکانہ عقائد سے اپنے آپ کو پاک صاف نہیں بناتے اور دوسرا مطلب شرعی اصطلاح کے اعتبار سے یہ ایسے مشرک جو شرک کر کے اللہ کے حقوق تلف کرتے ہیں اور زکوٰۃ کی عدم ادائیگی سے لوگوں کے حقوق تلف کرتے ہیں۔ اور ان دونوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت میں جوابدہی کے منکر ہیں۔

[۷] ❁ <u>مَنّ کا لغوی مفہوم</u>:۔ غَيْرَ مَمْنُونٍ کے بھی دو معنی ہیں۔ مَنّ کا معنی کسی چیز کا آہستہ آہستہ کم ہو کر ختم ہو جانا اور اس کا سلسلہ منقطع ہو جانا بھی ہے اور اس کا دوسرا معنی احسان کرنا اور احسان جتلانا بھی ہے۔ پہلے معنی تو ترجمہ سے واضح ہیں۔ دوسرے

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ⑩ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا

یہ زمین سب حاجت مندوں کے لئے یکساں[۸] ہے۔(۱۰) پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت دھواں[۹] تھا تو اس نے (اس طرح کے) آسمان اور زمین سے کہا کہ وجود میں آجاؤ خواہ تم چاہو

معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ اہل جنت کو جو نعمتیں بھی میسر ہوں گی ان کا کبھی احسان نہیں جتلایا جائے گا۔

[۸] ❁ زمین کی اشیاء سے انتفاع کا یکساں حق اور حق ملکیت:۔ بعض علماء نے ﴿سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ﴾ کا یہ ترجمہ کیا ہے "برابر ہے واسطے پوچھنے والوں کے" (شاہ رفیع الدین) "ٹھیک جواب پوچھنے والوں کو" (احمد رضا خان) انسانی تاریخ کا ایک بنیادی اور اہم سوال یہ بھی رہا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کیونکر ہوئی؟ ان آیات میں اسی بنیادی سوال کا جواب دے کر فرمایا کہ ایسا سوال کرنے والوں کے اطمینان کے لیے اتنا جواب کافی ہے۔ اور اس جملہ کا دوسرا ترجمہ جو اوپر درج کیا گیا ہے، بہت سے علماء اور مفسرین اس ترجمہ کے بھی مؤید ہیں۔ اور اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ زمین کی پیداوار سے انتفاع کا حق سب ضرورت مندوں کے لیے یکساں ہے۔ خواہ یہ ضرورت مند انسان ہوں یا حیوانات ہوں یا چرند پرند ہوں۔ اور انتفاع کے حق کی یکسانی کی مثال یوں سمجھئے۔ جیسے جنگل میں ایندھن پڑا ہو۔ اب جو شخص اسے اٹھا کر اپنے قبضہ میں کر لے گا۔ تو اب اس ایندھن پر اس کا حق ثابت ہو گیا۔ اور جب تک وہ جنگل میں پڑا تھا اسے وہاں سے اٹھانے کا ہر شخص یکساں حق رکھتا تھا۔ اس کی دوسری مثال چشمہ کا یا دریا کا پانی ہے۔ ہر شخص وہاں سے پانی لانے کا یکساں حق رکھتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص وہاں سے پانی لے کر اس پر اپنا قبضہ کر لے گا تو اب یہ پانی اسی کا ہو گیا۔ اس میں دوسروں کا حق نہ رہا۔ اسی طرح بنجر زمین آباد کرنے کا حق اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق سب کے لیے یکساں ہے مگر جب کوئی شخص محنت کر کے اس کو آباد کر لے تو اس کا حق ثابت اور دوسروں کا حق ختم ہو گیا یہ ہے حق ملکیت کا اسلامی اصول اور اسی لحاظ سے ہم نے یہ ترجمہ اختیار کیا ہے۔ مگر جب سے روس میں اشتراکی نظام قائم ہوا ہے (جو کہ اب ناکام بھی ہو چکا ہے) اور اس نے دوسرے ملکوں میں اس نظام کے بپا کرنے کے لیے فضا کو سازگار بنانے کے لیے اپنے ایجنٹ بھی چھوڑ رکھے ہیں اور چونکہ یہ نظام زمین اور اسی طرح دوسری اشیاء پر انفرادی حق ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا ان لوگوں نے قرآن سے حق ملکیت زمین کے عدم جواز کا کھوج لگانا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ مسئلہ انسان کی معاش سے تعلق رکھتا اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو زمین کی ذاتی ملکیت کو ناجائز یا حرام قرار دینا مقصود ہوتا تو قرآن میں ایسے واضح احکام نازل کیے جاتے جن سے سابقہ مروجہ حق ملکیت کی تردید کی جاتی۔ لیکن قرآن میں کوئی ایسا حکم موجود نہیں۔ چند دوسری متشابہ آیات کی طرح اس آیت سے بھی ان لوگوں نے اپنا یہ نظریہ کشید کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اور ہم نے وہی ترجمہ درج کیا ہے جو ان حضرات کا پسندیدہ ہے۔ وہ اس آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ زمین کی پیداوار پر سب انسانوں کا ایک جیسا اور برابر کا حق ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ حکومت زمین کو اپنی تحویل میں لے لے پھر اس کی پیداوار لوگوں میں تقسیم کرے۔

❁ حق ملکیت کے متعلق اشتراکیوں کی دلیل اور اس کا جواب:۔ ان لوگوں کی اس تاویل پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ ضرورتمند، طلبگار یا حاجتمند صرف انسان ہی نہیں بلکہ حیوانات، چرند پرند، کیڑے مکوڑے سب ہی خوراک کے محتاج ہیں اور سب کے لیے یہ خوراک زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے تو کیا یہ ساری مخلوق زمین یا زمین کی پیداوار میں برابر کی حصہ دار ہو گی؟ اگر زمین کو انفرادی

طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ⑪ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ

یا نہ چاہو، دونوں نے کہا ہم فرمانبرداروں کی طرح آ گئے۔(۱۱)

پھر اس نے دو دنوں میں سات آسمان بنا[۱۲] ڈالے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی[۱۳] کیا۔

ملکیت سے نکال کر اس کی پیداوار کو صرف انسانوں میں برابر تقسیم کیا جائے تو دوسری مخلوق کو ﴿سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ﴾ کے زمرہ سے نکالنے کی کیا دلیل ہے؟ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین سب مخلوقات میں برابر برابر تقسیم ہوگی یا اس کی پیداوار؟ اور تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا عملاً ایسا ممکن بھی ہے؟ اگر حکومت زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لے تو یہ ﴿سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ﴾ کیسے ہوئی۔ اور اگر حکومت زمین کی پیداوار کو اپنی مرضی سے افراد کو دیتی یا ان میں تقسیم کرتی ہے تو بھی عملی طور پر ﴿سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ﴾ کے تقاضے پورا کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا ان حضرات کی یہ تاویل باطل ہی نہیں ناممکن العمل بھی ہے۔ اور اس کا اصل مطلب یہی ہے کہ زمین کی پیداوار سے اللہ کی ساری مخلوق کو انتفاع کا حق ایک جیسا ہے۔ جیسا کہ پہلے ایک دو مثالوں سے واضح کیا جا چکا ہے۔ اور انسانوں کے علاوہ دوسری جاندار مخلوق بھی زمین کی اشیاء سے فیض یاب ہو رہی ہے اور اس بات کا حق بھی رکھتی ہے۔

[۹] زمین و آسمان کا ملا جلا ملغوبہ:۔ اس آیت میں ثم کا لفظ زمانی ترتیب کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ زمین و آسمان کی تخلیق کے ایک پہلو سے ہے۔ بالفاظ دیگر یہ زمین کی تخلیق کے بعد کا واقعہ نہیں ہے بلکہ پہلے کا ہے۔ جسے بعد میں بیان کیا گیا ہے اور اس کی واضح دلیل یہ آیت ہے۔ ﴿اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾(۲۱:۳۰) یعنی زمین و آسمان پہلے ملے جلے اور گڈمڈ تھے؟ تو ہم نے انہیں جدا جدا بنا دیا۔ اور یہاں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اس وقت فضائے بسیط میں صرف دھواں ہی دھواں یا مرکب قسم کی گیسیں تھیں۔ یعنی کائنات کا ابتدائی ہیولیٰ بھی گیسوں کا مجموعہ تھا۔ اس گیس کے مجموعے سے ہی اللہ تعالیٰ نے زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے سب کچھ بنا دیئے۔ کائنات کے جس نقشہ کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا تھا کہ زمین فلاں مقام پر اور اتنی جسامت کی ہونی چاہئے۔ آسمان ایسے ہونا چاہئیں سورج فلاں مقام پر اور زمین سے اتنے فاصلہ پر اور اتنی جسامت کا ہونا چاہئے۔ ستارے اور کہکشائیں چاند اور ستارے ایسے اور ایسے ہونے چاہئیں۔ غرض اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق گیسوں کے اس ہیولیٰ سے یہ سب چیزیں بنتی چلی گئیں اور اس طرح کائنات کی تخلیق پر چھ یوم (ادوار) صرف ہوئے۔

[۱۰] زمین و آسمان کی تخلیق ترتیب اور زمانہ تخلیق:۔ قرآن میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان یعنی کائنات کو چھ ایام (یا ادوار) میں بنایا۔ پھر بعض روایات میں بھی یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہفتہ میں فلاں کام کیا تھا اور اتوار کو فلاں اور پیر کو فلاں اسی طرح چھ دنوں کے الگ الگ کام بھی مذکور ہیں۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ایسی سب روایات ناقابل احتجاج اور اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ لہٰذا ان کا کچھ اعتبار نہیں البتہ کسی مقام پر تو یہ مذکور ہے کہ زمین آسمانوں سے پہلے پیدا کی گئی اور کسی مقام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین بعد میں پیدا ہوئی اور کبھی یہ اشتباہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ کائنات کی پیدائش میں چھ کے بجائے آٹھ دن لگے تھے۔ ایسے شبہات و اختلافات کا بہترین جواب وہ ہے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک سائل کو دیا تھا۔ اور یہ جواب سورہ نساء کی آیت نمبر ۸۲ کے حاشیہ میں ملاحظہ کر لیا جائے۔

[۱۱] آسمان زمین سے لاکھوں گنا زیادہ جسامت رکھتے ہیں۔ اور زمین میں جب ہزاروں قسم کی مخلوق آباد ہے اور لاکھوں قسم کے

أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿١٢﴾ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ
أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿١٣﴾ إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ
خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿١٤﴾

اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں[۱۲] سے سجادیا اور (ان سے) حفاظت کا کام[۱۳] لیا یہ سب پر غالب اور ہر چیز کو جاننے والے کی منصوبہ بندی[۱۴] ہے۔(۱۲) پھر اگر وہ اعراض کریں تو آپ ان سے کہئے کہ میں تمہیں ایسی ہی کڑک (کے عذاب) سے ڈراتا[۱۵] ہوں جیسی قوم عاد اور ثمود پر گری تھی۔(۱۳) جب ان کے پاس ان کے آگے سے اور پیچھے[۱۶] سے رسول آئے (اور کہا) کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو تو کہنے لگے کہ: اگر اللہ (ہماری ہدایت) چاہتا تو فرشتے نازل کرتا لہٰذا تم جو پیغام دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کا انکار[۱۷] کرتے ہیں(۱۴)

کارخانے ہیں تو آسمان کیسے خالی رہ سکتا ہیں۔ آسمانوں میں فرشتوں کی موجودگی کا ذکر تو قرآن میں صراحت سے موجود ہے اور واقعہ معراج سے پتہ چلتا ہے کہ ہر آسمان میں طرح طرح کی مخلوق آباد ہے۔ اگرچہ اس کی تفصیلات معلوم کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔

[۱۲] تشریح کے لیے دیکھئے سورۃ والصافات کا حاشیہ نمبر ۴

[۱۳] تشریح کے لیے دیکھئے سورۃ والصافات کا حاشیہ نمبر ۵

[۱۴] اشیاء کائنات کا کثیر المقاصد ہونے کے ساتھ حسین اور مربوط ہونا: اس کائنات کی ہر چیز جہاں کئی کئی مقاصد پورے کر رہی ہے وہاں ذوقِ جمال کے لحاظ سے بھی راحت بخش ہے۔ یہ ممکن تھا کہ ایک چیز سے فائدے تو کئی حاصل ہوں مگر وہ کریہہ المنظر ہو مگر کائنات میں ایسی کوئی بات نہیں ہے پھر ان تمام اشیاء میں باہمی ربط بھی ہے اور تعاون بھی۔ جس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کا خالق صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور اتنا زور آور ہے کہ ہر چیز سے اپنی مرضی کے موافق کام لے رہا ہے اور لے سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ خالقِ کائنات کی ایک ایک چیز کی کیفیت اور ماہیت دونوں چیزوں کا مکمل علم رکھتا ہے۔

[۱۵] یعنی اس قرآن کی صفات اور اس قرآن کو نازل کرنے والی ہستی کی عظیم الشان آیات قدرت سننے کے بعد بھی اگر کفار مکہ نصیحت قبول کرنے اور توحید اور اسلام کی راہ اختیار کرنے سے اعراض کرتے ہیں تو پھر ان پر بھی ایسی بجلیاں گر سکتی ہیں جیسے عاد و ثمود پر گری تھیں۔

[۱۶] اس آیت کے کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے پاس رسول آتے رہے۔ دوسرا یہ کہ ان کے پاس جو رسول آئے انہوں نے ان لوگوں کو ہر پہلو سے سمجھانے کی کوشش کی اور تیسرا یہ کہ ان کے اپنے علاقہ میں بھی رسول آئے اور ان کے گرد و پیش کے علاقہ میں بھی اور ان کی تعلیم بھی ان تک پہنچ چکی تھی۔

[۱۷] یعنی تم تو بشر ہو۔ تمہیں ہم کیسے اللہ کا رسول مان سکتے ہیں۔ کوئی فرشتہ ہمارے پاس رسول بن کر آتا تب بھی کوئی بات تھی۔ ہر منکر حق قوم کو یہ اعتراض رہا ہے اور اس اعتراض کی حقیقت "خوئے بدرا بہانہ بسیار" سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اس اعتراض کے جواب بھی قرآن میں جابجا مذکور ہیں۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ
الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿١٥﴾ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي
أَيَّامٍ نَحِسَاتٍ لِنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ ۖ وَهُمْ لَا
يُنْصَرُونَ ﴿١٦﴾ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ فَأَخَذَتْهُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ

ان میں سے جو قوم عاد تھی اس نے ملک میں ناحق تکبر کیا اور کہنے لگے: ”ہم سے بڑھ کر طاقتور کون ہے؟“ کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ جس نے انہیں پیدا کیا وہ ان سے یقیناً زیادہ طاقتور[۱۸] ہے۔ اور وہ (دیدہ دانستہ) ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔(۱۵) پھر ہم نے ان پر چند منحوس[۱۹] دنوں میں سناٹے کی آندھی چھوڑ دی[۲۰] تاکہ ہم انہیں دنیا میں ہی رسوائی کا عذاب چکھائیں اور جو آخرت کا عذاب ہے وہ تو اور زیادہ رسوا کرنے والا ہے۔ اور انہیں کہیں سے مدد بھی نہ ملے گی(۱۶) رہے ثمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھائی مگر انہوں نے راہ دیکھنے کے مقابلہ میں اندھا[۲۱] رہنا ہی پسند کیا۔ آخر انہیں کڑک کی صورت میں ذلت کے عذاب نے

[۱۸] حق کو قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تکبر ہی ہوا کرتا ہے۔ رسولوں کی بات مان لینے سے ان کی اپنی سرداریوں اور چودھراہٹوں پر زد پڑتی ہے۔

لہٰذا یہ چودھری ٹائپ لوگ سینہ تان کر رسولوں کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں اور یہ قوم عاد تو تھے بھی بڑے قد و قامت والے اور بڑے زور آور گھمنڈ میں آ گئے۔ اور رسولوں سے کہنے لگے کہ ہم تمہیں کیا سمجھتے ہیں؟ اس وقت انہیں اتنا خیال نہ آیا کہ رسول تو ان سے طاقت میں کمزور ہو سکتا ہے لیکن جس ہستی نے انہیں اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے وہ تو ان سے کمزور نہیں۔

[۱۹] ❁ کوئی دن بذات خود نحس نہیں ہوتا (ذکر قوم عاد):۔ یعنی وہ دن قوم عاد کے لیے منحوس تھے ورنہ کوئی دن بذات خود نہ سعد ہوتا ہے اور نہ نحس جیسا کہ جوتشیوں اور انسانی زندگی پر سیاروں کے اثرات تسلیم کرنے والوں کا نظریہ ہوتا ہے۔ وہی دن جو قوم عاد کے لیے منحوس تھے۔ سیدنا صالح علیہ السلام اور مومنوں کے لیے مبارک تھے۔ جس دن فرعون اور اس کے ساتھی بحیرہ قلزم میں غرق ہوئے۔ فرعون اور آل فرعون کے لیے منحوس تھا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے لیے مبارک تھا۔ علاوہ ازیں اگر یہ دن بذاتہ منحوس ہوتے تو عذاب صرف قوم عاد کے مجرموں پر ہی نہ آتا بلکہ ساری دنیا پر آتا۔

[۲۰] ❁ قوم عاد پر ٹھنڈی اور تیز ہوا کا عذاب:۔ ان لوگوں کو اپنی طاقت اور قد و قامت پر غرور تھا۔ اللہ نے ان کا غرور توڑنے کے لیے ایک کمزور سی مخلوق ہوا کو، جس کی روانی اور جھونکوں کے لیے سب لوگ ترستے ہیں۔ ان پر مسلط کر دیا۔ ٹھنڈی ہوا انسان کو بہت خوشگوار لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ہوا کو لگاتار چلنے کا حکم دیا اور اس کی ٹھنڈک بڑھا دی۔ یہی ہوا سخت ٹھنڈی آندھی کی شکل اختیار کر گئی۔ جو ان کے پتھر کے بنے ہوئے مکانوں اور ایوانوں میں گھس گئی۔ اس کی تیزی کا یہ حال تھا کہ اس نے نہ کوئی

ع۲ ۱۶

الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَ

پکڑ لیا جو ان کی کرتوتوں کا بدلہ تھا۔(۱۷) اور ہم نے ان لوگوں کو (اس عذاب سے) بچا لیا جو ایمان [۲۲] لائے اور (نافرمانی سے) بچتے رہے تھے۔(۱۸) اور جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف ہانک کر لائے جائیں گے تو انہیں (گروہ در گروہ بننے کیلئے) روک [۲۳] لیا جائے گا۔(۱۹) یہاں تک کہ جب دوزخ کے قریب آ پہنچیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں ــــ

درخت صحیح وسالم چھوڑا نہ مکان، نہ مواشی اور انسان۔ سب ایک دوسرے پر گرے پڑے تھے۔ گر گر کر مر جاتے تھے اور مر مر کر گرتے جاتے تھے۔ آٹھ دن اور سات راتیں آندھی نے اسی طرح اپنا زور دکھایا۔ اور مغرور قوم کے صرف غرور کو ہی نہ توڑا بلکہ پوری قوم کے افراد کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ یہ تو تھا ان کے لیے دنیا کا عذاب اور اخروی عذاب جو ان کی کرتوتوں کا اصل بدلہ ہوگا وہ تو اور بھی زیادہ رسوا کرنے والا ہوگا۔ دنیا میں بھی انہیں اللہ کے عذاب سے کوئی چیز نہ بچا سکی تو آخرت میں تو ان کی کسی جانب سے مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[۲۱] ❁ **قوم ثمود پر زلزلہ اور چیخ کا عذاب:۔** جسے عاد ثانیہ کہا جاتا ہے اور جن کی طرف سیدنا صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے سیدنا صالح علیہ السلام سے اونٹنی کے پہاڑ سے برآمد ہونے کا مطالبہ کیا تھا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا تھا۔ جس سے انہیں یقین بھی ہو چکا تھا کہ سیدنا صالح علیہ السلام کی پشت پر کوئی مافوق الفطرت ہستی موجود ہے۔ اور وہ فی الواقع اللہ کا رسول ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود انہوں نے سیدنا صالح علیہ السلام کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول نہ کیا اور اپنے جاہلانہ اور مشرکانہ رسم ورواج کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہ لوگ بھی قد و قامت، ڈیل ڈول اور قوت میں اپنی پیشرو قوم عاد سے کسی طرح کم نہ تھے۔ فن تعمیر سنگ تراشی کے بہترین ماہر تھے۔ پہاڑوں کے اندر پتھر تراش تراش کر صرف مکان ہی نہیں بناتے تھے بلکہ راستے بھی بنا کر پہاڑوں کے اندر ہی بستیاں آباد کر رکھی تھی۔ ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے جب ان کے دن گنے جا چکے تو ان پر دوہرا عذاب نیچے سے زلزلہ جس سے ان کے پہاڑوں کے اندر واقع مکانوں میں دراڑیں اور شگاف پڑ گئے اور اوپر سے کڑک اتنی شدید تھی جس سے ان کے جگر پھٹ گئے۔

[۲۲] یعنی سیدنا صالح علیہ السلام کو عذاب نازل ہونے سے پہلے ہجرت کا حکم دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ایمانداروں کے ہمراہ جن کی تعداد ایک سو بیس کے لگ بھگ تھی، بحکم الٰہی ہجرت کر کے فلسطین کی طرف چلے گئے اور رملہ کے قریب جا کر آباد ہوئے۔ اسی مقام پر سیدنا صالح علیہ السلام نے وفات پائی۔

[۲۳] روکنے کی دو صورتیں یا وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ مجرموں کی الگ الگ جرائم کے مطابق گروہ بندی کی جائے۔ دوسری یہ کہ پہلی نسل کو بعد میں آنے والی نسلوں کے آنے تک روک دیا جائے۔ تاکہ پہلی نسلوں نے جو شرکیہ عقائد اور رسوم چھوڑے اور انہیں بعد والی نسلوں نے تقلید آباء کے طور پر قبول کیا۔ تو ان بعد والی نسلوں کے گناہوں کی سزا کا کچھ حصہ ان پہلی نسلوں پر بھی ڈالا جائے گا۔ جنہوں نے ان شرکیہ عقائد و رسوم کو رواج دیا تھا یا کسی دوسرے برے کام کی طرح ڈالی تھی۔

جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۚ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ
الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ
تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ

اور ان کی کھالیں ان کے خلاف[۲۴] وہی گواہی دیں گے جو عمل وہ کیا کرتے تھے (۲۰) وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ کہیں گی: ہمیں اسی اللہ نے قوت گویائی دے دی جس نے ہر چیز کو گویائی[۲۵] دی ہے۔ اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے (۲۱) اور (گناہ کرتے وقت) تم اس بات سے نہیں چھپتے تھے کہ کہیں تمہارے کان، تمہاری آنکھیں اور تمہاری جلدیں ہی تمہارے خلاف گواہی[۲۶] نہ دے دیں۔ بلکہ تم تو یہ خیال کرتے تھے کہ جو کچھ تم کرتے ہو ان میں سے

[۲۴] ❁ اعضاء اور جوارح پر اعمال کے اثرات اور ان کی گواہی:۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا میں جو بھی اچھے یا برے اعمال بجالاتا ہے۔ یہی نہیں کہ کراما کاتبین اس کے اعمال نامہ میں اس کے سب اعمال واقوال درج کرتے جاتے ہیں بلکہ ان اعمال وافعال کے اثرات ان اعضاء پر بھی ثبت ہوتے جاتے ہیں جن کو اس کام کے دوران استعمال کیا گیا ہے۔ جو مجرم اپنے گناہوں کا اور پھر خارجی گواہیوں کا بھی انکار کر دیں گے ان پر انہیں کے اعضاء کو گواہ بنا کر لایا جائے گا۔ اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن ذرات سے ہمارا جسم مرکب ہے۔ انہی ذرات سے ہمارا وہ جسم بھی مرکب ہوگا جو قیامت کے دن ہماری روح کو ملے گا۔

[۲۵] ❁ گویائی کے اعضاء اور ان کی ساخت:۔ زبان بھی ویسے ہی گوشت اور پٹھوں کا ایک ٹکڑا ہے جیسے دوسرے اعضاء ہیں۔ اور قوت گویائی میں صرف زبان ہی کام نہیں کرتی۔ بلکہ گلے کی رگیں، جن کی وجہ سے کسی کی آواز سریلی ہوتی ہے کسی کی کرخت، پھر ہونٹ اور تالو وغیرہ سب استعمال میں آتے ہیں۔ تب جاکر انسان بولتا ہے۔ جسم کے اعضاء کا مواد ایک جیسا ہے صرف ساخت کا فرق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان اعضاء کی ایسی ساخت بنائی ہے جس سے کوئی جاکر بولنے کے قابل ہو جاتا ہے تو جو ہستی ان اعضاء کی ساخت اور بالخصوص پہلی بار کی ساخت پر قادر ہے اس کے لیے بوقت ضرورت کسی دوسرے عضو کی ساخت میں ایسی تبدیلی کر دینا کیا مشکل ہے جس سے وہ بولنے لگے۔ اس طرح جب مجرموں کے دوران جرم مستعمل اعضاء ہی ان کے خلاف گواہی دے دیں گے تو پھر ان کے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے گی۔ اس طرح علیٰ رؤس الاشہاد ان کا فیصلہ کر کے انہیں سزا دی جائے گی۔

[۲۶] یعنی یہ بات تمہارے حاشیہ خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ ہمارے خلاف گواہی دینے والے ہمارے اپنے اعضاء بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان سے بھی بچنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم یہ سوچ لیتے تو تم سے گناہ کا سرزد ہونا ہی ناممکن تھا۔ کیونکہ نہ تم خود اپنے اعضاء سے چھپ سکتے تھے اور نہ ان سے گناہ کو چھپا سکتے تھے۔ نہ ان کے بغیر گناہ کا کام کر سکتے تھے۔

لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢٢﴾ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ

اکثر باتوں کو اللہ جانتا[۲۷] ہی نہیں (۲۲) تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے پروردگار کے متعلق کر رکھا تھا تمہیں لے ڈوبا[۲۸]

[۲۷] اللہ کی صفات سمیع و بصیر ہونے میں شک کا نتیجہ۔ بداعمالیاں:۔ بات صرف اتنی نہ تھی کہ تمہیں یہ علم نہ تھا کہ ہمارے اعضاء ہمارے خلاف گواہی دے سکتے ہیں۔ بلکہ تم اللہ تعالیٰ کے علم کے بھی منکر تھے اگر تمہیں یہ یقین ہو تا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے یا ہماری باتیں سن رہا ہے یا ہمارے حالات سے پوری طرح باخبر رہتا ہے تو بھی تم سے گناہ سرزد ہونے کا امکان نہ تھا۔ تمہارا اللہ کے متعلق بھی ایسا یقین انتہائی کمزور تھا کہ وہ تمہارے تمام حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حرم کعبہ میں تین آدمی بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان تینوں میں سے دو تو قریشی تھے اور ایک ان کا برادر نسبتی تھا۔ جو ثقفی تھا۔ یہ تینوں خوب موٹے تازے تھے توندیں نکلی ہوئی تھیں مگر عقل کے سب ہی پورے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اللہ ہماری باتیں سن سکتا ہے؟ دوسرا بولا: ہاں! اونچی آواز سے بات کریں تب تو سن لیتا ہے۔ اور اگر آہستہ آہستہ آواز سے چپکے چپکے بات کریں تو پھر نہیں سنتا'' تیسرا کہنے لگا اگر وہ اونچی آواز کو سن لیتا ہے تو آہستہ آواز والی بات بھی سن سکتا ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورہ حٰم السجدۃ)

[۲۸] اللہ کے متعلق جیسا بندہ گمان رکھے گا ویسا ہی اللہ اس سے معاملہ کرے گا:۔ تمہارا اللہ کے متعلق علم اس قدر کمزور اور مشکوک قسم کا گمان رہا۔ اس لیے تم نے گناہوں سے بچنے کی کبھی کوشش ہی نہ کی تھی اور اس سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ تم نہ روز آخرت کے قائل تھے اور نہ اللہ کے حضور جواب دہی کے تصور سے خائف تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم گناہوں پر دلیر ہوتے گئے اور ساری زندگی ہی گناہوں میں گزار دی۔ اپنے پروردگار سے تمہاری یہی بے یقینی تمہاری ہلاکت کا باعث بن گئی۔ اس سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان جس قسم کی معرفت اپنے پروردگار کی نسبت رکھتا ہے اس طرز اور اسی سانچے میں اس کی پوری زندگی ڈھل جاتی ہے۔ اگر اللہ کی معرفت درست ہو گی تو اس کا طرز عمل پورے کا پورا درست رہے گا اور اس کے نتائج بھی درست نکلیں گے اور اگر معرفت ہی مشکوک یا غلط ہو گی تو اس کے دنیوی یا اخروی نتائج بھی ویسے ہی نکلیں گے۔ چنانچہ درج ذیل حدیث قدسی اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے: سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي) (بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب قوله تعالى يريدون ان يبدلوا كلام الله) یعنی میرا بندہ میرے متعلق جیسا گمان رکھتا ہے ویسا ہی اس کا میرے بارے میں معاملہ ہو گا اور اسی کے گمان کے مطابق میں اس سے سلوک کروں گا۔ اس کی مزید وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے زندگی میں کوئی نیکی کا کام نہ کیا تھا۔ اس نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ میری لاش کو جلا کر آدھی راکھ دریا میں پھینک دینا اور آدھی ہوا میں بکھیر دینا۔ اللہ کی قسم! اگر اس نے مجھے پکڑ لیا تو مجھے ایسی سزا دے گا جو سارے جہانوں میں کسی دوسرے کو نہ دی گئی ہو۔ اللہ نے دریا اور ہوا کو حکم دیا اور اس کے تمام اجزا اکٹھے کر لیے۔ پھر اسے اپنے پاس حاضر کر کے پوچھا: تم نے ایسا کام کیوں کیا تھا؟ اس نے جواب دیا: ''اے اللہ

فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿٢٤﴾ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاۗءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ

اور تم خسارہ پانے والوں میں ہو گئے۔(۲۳) اب اگر وہ صبر کریں[۲۹] (یا نہ کریں) آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور اگر وہ توبہ[۳۰] کرنا چاہیں تو ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی(۲۴) اور ہم نے ان پر کچھ ایسے ہم نشین[۳۱] مسلط کر دیے جو آگے سے اور پیچھے سے ان کے سارے کام خوشنما کر کے دکھاتے تھے۔

تو جانتا ہی ہے کہ میں نے یہ کام تیرے ڈر کی وجہ سے کیا تھا" پھر اللہ نے اسے بخش دیا۔ (بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب قولہ تعالی یریدون ان یبدلوا......)

[۲۹] یعنی دنیا میں صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ لیکن وہاں صبر کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ وہ صبر کریں یا نہ کریں عذاب سے نجات نہ مل سکے گی۔

[۳۰] ❁ **استعتب کے مختلف مفہوم:۔** ﴿يَسْتَعْتِبُوْا﴾ کا مادہ عتب ہے اور عتب کے یا عتاب کے معنی ناراضگی دور کرنے کے لیے میٹھے انداز میں خفگی کا اظہار کرنا ہے یعنی ایسی میٹھی میٹھی سرزنش اور ملامت جس کا مقصد بالآخر رضامند ہونا اور مان جانا ہو اور اِسْتَعْتَبَ کے معنی کسی روٹھے ہوئے کو منا لینا اور اعتب کے معنی سبب ناراضگی کو دور کرنا ہے۔ اس لحاظ سے اس جملہ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک تو وہی ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ دوبارہ دنیا میں آنے کی خواہش کریں تو ان کی یہ خواہش تسلیم نہیں کی جائے گی اور تیسرا یہ کہ اگر وہ خوشامد یا منت سماجت کر کے منانا چاہیں جیسا کہ دنیا میں اس طرح بھی کام چل جاتا ہے تو ان کی اس خوشامد یا منت سماجت کا بھی کچھ اثر نہ ہوگا۔

[۳۱] ❁ **قرین کا مفہوم نیز آدمی کا کردار اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے:۔** قُرَنَاءُ قرین کی جمع ہے۔ جس کا معنی ہم عمر ساتھی ہے جو بہادری، قوت اور دیگر اوصاف میں اس کا ہمسر ہو، ہجولی اور اس لفظ کا استعمال برے معنوں میں ہوتا ہے یعنی جو لوگ اللہ کو بھول کر بداعمالیوں میں لگے رہتے ہیں تو ان کے ہجولی بھی انہی کی قسم کے شیطان سیرت ہوتے ہیں۔ جو اس کے ہر برے عمل پر اسے شاباش اور داد تحسین ہی دیے جاتے ہیں۔ مثلاً چوروں یا ڈاکوؤں کے گروہ میں سے اگر ایک شخص اپنی چوری یا ڈاکہ کی داستان سنائے گا تو دوسرے ساتھی اس کے اس کارنامہ کو بہادری پر محمول کر کے فخریہ انداز میں اس کی داستان سنیں، سنائیں گے۔ ان میں سے کسی کو یہ خیال نہ آئے گا کہ وہ لوگوں کے اموال غصب کر کے کتنے بڑے کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ برے اور بدکردار آدمیوں کو ان جیسے ہی دوست اچھے لگتے ہیں اور کسی بدکردار آدمی کی کسی نیک فطرت آدمی سے دوستی ہو بھی جائے تو وہ زیادہ دیر چل نہیں سکے گی۔ اسی طرح نیک لوگوں کے دوست بھی ہمیشہ نیک لوگ ہی ہوا کرتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ نیک سیرت انسان سے کسی بدکردار کی دوستی کبھی نبھ نہیں سکتی۔ لہٰذا بعض آدمیوں کا یہ کہنا کہ فلاں آدمی خود تو اچھا تھا مگر اسے ساتھی برے مل گئے یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر وہ فی الواقع اچھا تھا تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو وہ دوسروں کو بھی اچھا بنا لیتا اور یا پھر ان سے الگ ہو جاتا۔ اور اگر اس نے یہ دونوں کام نہیں کیے تو پھر وہ اچھا کیسے ہوا؟

عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا
خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع

چنانچہ ان پر بھی وہی حکم الٰہی ثابت ہو گیا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں پر ثابت ہو چکا تھا (یعنی یہ کہ) وہی خسارہ اٹھانے [۳۲] والے ہیں۔(۲۵)

اور کافر (ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ: اس قرآن کو نہ سنو [۳۳] اور (جب پڑھا جائے تو) خوب شور مچاؤ۔ اس طرح شاید تم غالب رہو۔(۲۶)

[۳۲] یعنی جو لوگ اپنے برے ساتھیوں کی باتوں پر لگ جاتے ہیں۔ اور ان کے بھرے میں آ جاتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ وہ خود ہی اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

[۳۳] ❁ ابن دُغنہ کا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پناہ دینا بشرطیکہ قرآن بلند آواز سے نہ پڑھیں:۔ جو شخص بھی قرآن سنتا تھا تو قرآن کی بات اس کے دل میں اتر جاتی تھی اور یہی بلا کی تاثیر قرآن کا اعجاز تھا جس سے قریش مکہ سخت خائف رہتے تھے۔ اور قرآن سے متعلق انہوں نے تین طرح کے اقدام کیے تھے تاکہ اس کی آواز کو دبایا جا سکے۔ ان میں سے پہلا اقدام تو مسلمانوں پر پابندی تھی کہ وہ قرآن کو اونچی آواز سے نہ پڑھا کریں کیونکہ اس طرح ان کی عورتیں اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی جرم کی پاداش میں خود رسول اللہ ﷺ پر کئی بار حملے ہوئے اور مسلمانوں کی بھی پٹائی ہوئی۔ اسی جرم کی پاداش میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا اور آپ ہجرت کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ برکِ غماد کے مقام پر پہنچے تھے کہ قبیلہ قارہ کا سردار ابن دغنہ انہیں اپنی پناہ میں لے کر واپس مکہ لے آیا۔ سرداران قریش نے اس پناہ کو صرف اس شرط پر منظور کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ قرآن بلند آواز سے نہ پڑھا کریں گے۔ مگر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ زیادہ دیر اس شرط پر قائم نہ رہ سکے تو قریشی سرداروں نے ابن دغنہ کے پاس جا کر شکایت کی۔ ابن دغنہ نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر انہیں اپنا عہد یاد دلایا اور کہا کہ اگر تم بر سر عام قرآن بلند آواز سے پڑھنا نہ چھوڑو گے تو میں تمہاری پناہ سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اس کے جواب میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”تم اپنی پناہ اپنے پاس رکھو اور میرا معاملہ اللہ کے سپرد ہے“ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب هجرة النبی ﷺ)

❁ ابو جہل کا قرآن سے متاثر ہونا:۔ ان کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ ان سرداروں نے آپس میں بھی پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ عمداً قرآن نہیں سنا کریں گے۔ اور یہ ایسی پابندی تھی جسے یہ پابندی لگانے والے سردار خود بھی نباہ نہ سکے۔ کیونکہ ان کے کان اور ان کے دل قرآن کی بلا کی تاثیر سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ ﷺ رات کو کعبہ میں کھڑے ہو کر بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے اور تین قریشی سردار ایک دوسرے سے چھپتے چھپاتے آپ ﷺ کا قرآن سن رہے تھے۔ بعد میں یہ راز فاش ہو گیا تو ان میں سے ایک سردار نے ابو جہل سے پوچھا کہ جو قرآن تم نے سنا ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب دینے کی بجائے ابو جہل نے بات کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا کہ ہم (یعنی بنو مخزوم) اور بنو عبد مناف سب باتوں میں ہمسر تھے۔ اب ہم ان کے نبی کو تسلیم کر کے ان کی برتری کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟ گویا اس کا صحیح جواب

فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٧﴾
ذَٰلِكَ جَزَاءُ أَعْدَاءِ اللَّهِ النَّارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ ۖ جَزَاءً بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا
يَجْحَدُونَ ﴿٢٨﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذَيْنِ أَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ
نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ ﴿٢٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا

ہم ایسے کافروں کو یقیناً سخت عذاب چکھائیں گے اور جو بُرے سے بُرے کام وہ کرتے [۳۴] رہے ان کا ضرور بدلہ دیں گے (۲۷) اللہ کے ان دشمنوں [۳۵] کا بدلہ یہی دوزخ ہے۔ ہمیشہ کے لئے ان کا گھر اسی میں ہو گا۔ یہ بدلہ ہے جو وہ جان بوجھ کر ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔ (۲۸) اور (قیامت کے دن) کافر کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں جنوں [۳۶] اور انسانوں میں سے وہ لوگ دکھادے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ ہم انہیں اپنے پاؤں تلے روندیں تاکہ وہ ذلیل و خوار ہوں۔ (۲۹) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر ڈٹ گئے [۳۷]

کو گول کر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قرآن کی تاثیر سے متاثر ہو چکا تھا اور آپ ﷺ کی نبوت تسلیم کرنے میں محض قبائلی رقابت اور تکبر اس کے آڑے آ رہا تھا۔

❁ قرآن کی آواز کو دبانے کا جدید طریقہ: لاؤڈ سپیکر۔ اور ان کا تیسرا اقدام یہ تھا کہ جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو وہاں خوب شور مچاؤ، تالیاں بجاؤ اور اتنا غل غپاڑہ کرو کہ قرآن کی آواز اس شور میں دب جائے اور کسی کے کان میں نہ پڑنے پائے۔ آج بھی جاہلوں کو ایسی ہی تدبیریں سوجھا کرتی ہیں۔ اور مکہ کے کافروں کو تو شور مچانے کی زحمت برداشت کرنا پڑتی تھی آج یہ زحمت بھی گوارا نہیں کرنا پڑتی۔ بس لاؤڈ سپیکر کے طاقتور اور زیادہ ہارن لگا دینے سے ہی یہ مقصد حاصل کر لیا جاتا ہے۔

[۳۴] ان کے بُرے سے بُرے کام یہی تھے کہ ایک تو وہ خود اللہ کی آیات کا انکار کر دیتے تھے۔ دوسرے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ کوئی دوسرا بھی اسلام کی دعوت کو قبول نہ کرنے پائے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے مندرجہ بالا پابندیوں کے علاوہ اور بھی بہت سے مذموم طریقے اختیار کر رکھے تھے اور نئی سے نئی سازشیں تیار کرتے رہتے تھے۔

[۳۵] ایسے لوگ صرف منکر حق ہی نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے، اللہ کے رسول کے، اللہ کے دین کے، سب کے پکے دشمن ہوتے ہیں۔ پھر اللہ انہیں سزا دینے میں کیوں کمی کرے گا؟

[۳۶] ❁ گمراہوں کی اپنے لیڈروں کو پاؤں تلے روندنے کی آرزو:۔ یہاں جنوں سے مراد شیطان ہیں یعنی بدکردار جن جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ قیامت کے دن کافر جب اپنا انجام دیکھیں گے تو انہیں اپنے وہ قائد، وہ سیاسی لیڈر وہ مذہبی پیشوا یاد آئیں گے جن کے پیچھے لگ کر یہ گمراہ ہوئے تھے۔ وہ اللہ سے التجا کریں گے کہ آج وہ قائد ہمیں دکھا دے تاکہ ہم انہیں اپنے پاؤں کے نیچے مسل کر کچھ تو انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کر لیں۔

[۳۷] ❁ دین کی تفہیم مختصر ترین الفاظ میں:۔ یہ ایک ایسا جامع جملہ ہے جس میں شریعت کی ساری تعلیم سمٹ کر آ گئی ہے۔ چنانچہ سفیان بن عبداللہ ثقفی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ: "مجھے اسلام کے متعلق ایک ہی ایسی بات بتا دیجئے جس کے بعد مجھے کسی دوسرے سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے" آپ ﷺ نے فرمایا: "کہو! میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾
نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا

ان پر فرشتے نازل[۳۸] ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں۔ نہ ڈرو اور نہ غمگین[۳۹] ہو اور اس جنت کی خوشی مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے(۳۰) ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست[۴۰] ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں تمہارا جو جی چاہے گا تمہیں ملے گا اور جو کچھ مانگو گے تمہارا ہوگا۔(۳۱)

پر ڈٹ جاؤ" (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب جامع اوصاف الاسلام) یعنی جن لوگوں نے دل و جان سے توحید باری تعالیٰ کا اقرار کیا۔ پھر تازیست اپنے اس قول و قرار کو پوری دیانتداری اور راست بازی سے نبھایا۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت میں کسی کو شریک نہیں کیا۔ نہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے جو کچھ زبان سے کہا تھا اس کے تقاضوں کو اعتقاداً اور عملاً پورا کیا۔ جو عمل کیا خالص اس کی خوشنودی اور شکر گزاری کے لیے کیا۔ اپنے رب کے مقرر کردہ حقوق و فرائض کو سمجھا اور ادا کیا۔ ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے جنت کی خوشخبری دینے والے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔

[۳۸] ❁ فرشتوں کے نزول کا مفہوم:۔ جس طرح ہر افاک اور اثیم پر شیطان نازل ہوتے ہیں جو ان کے دلوں میں القاء کرتے اور وسوسے ڈالتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کے دین پر ڈٹ جانے والوں اور مشکلات کے دور میں صبر و استقامت اختیار کرنے والوں پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ جس سے ان کے دلوں کو اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے۔ فرشتوں کے نزول کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مرئی اور محسوس طور پر ہو۔ فرشتے میدان بدر میں نازل ہوئے تھے اور ان کے نزول کا مقصد بھی یہی مذکور ہے۔ کہ ان کے نزول سے مسلمانوں کے دلوں کو ڈھارس بندھائی جائے مگر وہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے کسی کو نظر نہیں آتے تھے اور جب تک یہ مادی زندگی ختم نہیں ہو جاتی اور مادیت کے پردے چاک نہیں ہو جاتے تب تک فرشتوں کا نزول اسی صورت میں ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ البتہ مرنے کے ساتھ ہی جب یہ پردے اور حجاب اٹھ جائیں گے تو موت کے وقت پھر قبر میں پھر قیامت میں ہر جگہ فرشتے انسانوں کو یقیناً نظر آئیں گے۔

[۳۹] ❁ فرشتوں کے نزول کا مقصد:۔ یعنی فرشتے جب ایمان پر ڈٹ جانے والوں پر نازل ہوتے ہیں تو انہیں یہ تلقین کرتے ہیں یا ان کے دل میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ باطل کی طاقتیں خواہ کتنی ہی چیرہ دست ہوں ان سے خوف زدہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور حق پرستی کی وجہ سے جو مظالم تم پر ڈھائے جا رہے ہیں ان پر رنج نہ کرو کیونکہ اللہ نے تمہارے لیے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی سب نعمتیں ہیچ ہیں۔ اور موت کے وقت بھی فرشتے ہر مومن سے یہی کلمات کہتے ہیں۔ اس وقت وہ فرشتوں کو دیکھتا بھی ہے اور ان کی بات بھی سمجھتا ہے تو اس وقت ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو اس سے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ جنت تمہاری منتظر ہے اور دنیا میں جنہیں تم چھوڑ کر جا رہے ہو ان کے لیے بھی رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم تمہارے ولی اور رفیق ہیں۔

[۴۰] اس آیت میں یہ دونوں احتمال ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ یہ بھی ان فرشتوں کا ہی کلام ہو جو ایمان پر ڈٹ جانے والوں پر نازل ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو۔ فرشتوں کی دنیا میں ولایت کا ذکر کر چکا، آخرت میں یوں ہوگی کہ وہ ہر ہر مقام پر

تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ ع ۴/۱۸
اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ
بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ

یہ بخشنے والے مہربان کی طرف سے مہمانی ہوگی (۳۲) اور اس شخص سے اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف [۴۱] بلایا اور نیک عمل کیے اور کہا کہ میں (اللہ کا) فرمانبردار ہوں (۳۳) (اے نبی) نیکی اور بدی [۴۲] کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ آپ (بدی کو) ایسی بات سے دفع کیجئے جو اچھی ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ جس شخص کی آپ سے عداوت تھی وہ آپ کا گہرا دوست بن گیا ہے۔ (۳۴)

اور یہ بات صرف انہیں نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ کسی بڑے بختوں [۴۳] والے کو ہی

ان کا استقبال کریں گے۔ انہیں سلامتی کی دعائیں اور جنت کی بشارت دیں گے۔

[۴۱] ❁ اصلاح نفس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو تبلیغ:۔ پچھلی آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہوا جو اللہ پر ایمان لانے کے بعد ساری زندگی اپنے اس قول و قرار پر پہرہ بھی دیتے ہیں۔ اس آیت میں ان سے بھی اگلے درجہ کے ایمانداروں کا ذکر ہے۔ یعنی وہ لوگ جو صرف خود ہی احکام الٰہی کی بجا آوری پر جمے نہیں رہتے بلکہ دوسروں کو اسی بات کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ سب سے پہلے خود عمل پیرا ہو کر اللہ کی فرمانبرداری کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دوسروں کو بلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا پہلے خود عمل پیرا ہونا پھر اس کے بعد اللہ کے دین کی طرف بلانا انتہائی بہترین عمل ہے۔

[۴۲] ❁ بدی کا جواب بدی سے دینے سے دعوت کو نقصان پہنچتا ہے اور بھلائی سے دینے سے دشمن بھی دوست بن جاتا ہے۔ اس آیت میں دعوت الی اللہ کا ایک زریں اصول بیان کیا گیا ہے۔ پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ نیکی اور بدی کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اور یہ اس لیے بتایا گیا ہے کہ کفار مکہ دعوت اسلام کو کچلنے کے لیے بدترین ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے۔ مسلمانوں کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ بدی کا انجام کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ بدی بالآخر بدی کرنے والے کا ہی بھٹہ بٹھا دیتی ہے۔ لہٰذا داعی الی اللہ کو بدی کا جواب کبھی بدی سے نہ دینا چاہئے۔ بلکہ اسے برداشت کرنا چاہئے اسے کوئی فوری جواب نہ دینا چاہئے اور اس سے اگلا اقدام یہ ہونا چاہئے کہ اس کی بدی کا جواب بھلائی سے دیا جائے۔ اس طرح دشمن خود نگوسار اور شرمندہ ہوگا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ میں نے کیا سلوک کیا تھا۔ اور فریق مخالف کا میرے حق میں سلوک کیا ہے؟ وہ آپ کے خلوص اور آپ کی خیر خواہی اور راست بازی کا معتقد ہو جائے گا حتیٰ کہ آپ کی مخالفت چھوڑ کر آپ کے ساتھ آ ملے گا اور آپ کا جگری دوست بن جائے گا۔ اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کی دعوت الی اللہ کی منزل کھوٹی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس میں مزید پیش رفت ہو جائے گی۔ اور اگر آپ برائی کا جواب برائی سے دیں گے تو پھر ادھر سے مزید برائی اٹھے گی اس طرح ایک تو مخالفت پہلے سے بھی بڑھ جائے گی۔ دوسرے تمہارا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا اور دعوت الی اللہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔

[۴۳] ❁ بدلہ لینے کے لحاظ سے لوگوں کی تین قسمیں:۔ دنیا میں لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو برائی کا بدلہ برائی

عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٦﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ
اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن

حاصل ہوتی ہے۔(۳۵) پھر اگر کسی وقت آپ کو کوئی شیطانی وسوسہ[۴۴] آنے لگے تو اللہ کی پناہ[۴۵] مانگیے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔(۳۶) یہ رات اور دن، سورج[۴۶] اور چاند سب اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ نہ تو تم سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر

سے اور نیکی کا بدلہ نیکی سے دیتے ہیں۔ اور عام لوگوں کی اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جو نیکی کا بدلہ بھی برائی سے دیتے ہیں۔ یہ بدترین لوگ ہوتے ہیں جو بچھو کی سرشت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ بالآخر آپ ہی اپنا نقصان کرتے ہیں۔ ان کی اس بدفطری کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرتے اور ان سے پرے ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو برائی ہونے پر بھڑک نہیں اٹھتے بلکہ اسے برداشت کر جاتے ہیں۔ بعد میں برائی کرنے والے سے خیر خواہی اور بھلائی کا سلوک کرتے ہیں۔ اور یہ کام کوئی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ بڑے حوصلہ اور دل گردہ کا کام ہے۔ اور ایسے کام کی اسی سے توقع کی جا سکتی ہے جو بڑا صاحب عزم اور عالی حوصلہ شخص ہو۔ ایسے لوگ سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

[۴۴] ❁ برائی پر غصہ سے بھڑک اٹھنا شیطانی انگیخت ہے:۔ یعنی جب کوئی شخص برائی کرے اور انسان غصہ سے بھڑک اٹھے اور بدلہ لینے پر تیار ہو جائے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ شیطانی انگیخت ہے۔ شیطان اسے یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ اس قسم کی بے عزتی کو ہرگز برداشت نہ کرنا چاہئے۔ پھر وہ اسے انتقام لینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ایسی صورت حال پیش آئے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیجئے اور شیطان مردود سے، جو اس بات کا محرک بنا تھا، اللہ کی پناہ میں آ جائیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کی حرکات و سکنات کو بھی دیکھ رہا ہے اور تمہارے احوال سے بھی خوب واقف ہے لہٰذا وہ خود ہی تمہاری چارہ جوئی فرمائے گا۔

[۴۵] ❁ غصہ کا علاج:۔ سیدنا سلیمان بن صُرد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو آدمیوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے گالی گلوچ کی اور ایک کو اتنا غصہ آیا کہ اس کا چہرہ پھول گیا۔ اور رنگ بدل گیا آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے۔ اگر غصہ کرنے والا شخص وہ کلمہ کہے تو اس کا غصہ جاتا رہتا ہے۔" ایک دوسرا شخص اس کے پاس گیا اور آپ ﷺ نے جو فرمایا تھا اسے اس کی خبر دی اور کہا: "شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ" وہ کہنے لگا کیا تم نے مجھے دیوانہ سمجھ لیا ہے یا مجھے کوئی روگ ہو گیا ہے؟" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب ما ینھی من السباب واللعن) حالانکہ اس کا یہ جواب ہی دیوانگی کی علامت ہے۔ غصہ میں انسان کی عقل پر جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ اور عقل جاتی رہتی ہے اور دیوانہ بھی اسے کہتے ہیں جس میں عقل نہ ہو۔ رہا یہ سوال کہ وہ کلمہ کون سا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اللہ سے پناہ مانگے یا ﴿أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ کہے۔

[۴۶] ❁ پیکر محسوس اور غیر اللہ کی پوجا:۔ مشرکین اور بعض صاحبانِ طریقت یا وحدت الوجود کے قائلین رہبان اور پیرو فقیر قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سورج اور چاند وغیرہ اللہ تعالیٰ کے مظاہر ہیں۔ لہٰذا ہم جو سورج اور چاند کی پرستش کرتے ہیں تو فی الحقیقت انہیں اللہ کا پیکرِ محسوس سمجھ کر اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اللہ کے مظاہر یا پیکرِ محسوس نہیں بلکہ اللہ کی یہ نشانیاں ہیں اور اس کے غلام ہیں۔ ان کا تعلق دن اور رات سے ہے۔ دن کو سورج نکلتا

كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۳۷﴾ فَإِنِ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ﴿۳۸﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ

تمہیں (فی الواقع) اسی کی عبادت کرنا منظور ہے۔(۳۷) پھر اگر یہ لوگ اکڑ بیٹھیں تو آپ کے پروردگار کے پاس جو لوگ ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح [۴۷] میں لگے رہتے ہیں اور کبھی نہیں اکتاتے (۳۸)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ زمین سونی (بے آباد) پڑی ہوئی ہے۔ پھر ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ جس (اللہ) نے اس زمین کو زندہ کیا وہ یقیناً مردوں کو [۴۸] بھی زندہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے (۳۹) بلاشبہ جو لوگ ہماری آیات سے غلط مفہوم [۴۹] لیتے ہیں وہ ہم سے

ہے تو چاند روپوش ہوتا ہے اور رات کو چاند ہوتا تو سورج روپوش ہوتا ہے۔ اس سے ایک تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قدر پابندی سے اپنا کام سرانجام دینے والی چیزیں الٰہ نہیں ہو سکتیں۔ اور دوسرا یہ کہ جو چیزیں عروج وزوال سے دوچار ہوں وہ الٰہ نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر تم فی الواقع اللہ کی عبادت کرنا چاہتے ہو تو براہ راست اللہ کی عبادت کرو جو ان چیزوں کا خالق اور مالک ہے اور ان درمیانی وسائط کو درمیان سے نکال دو۔ کوئی چیز بھی اللہ کا مظہر نہیں یہ تو اس کی نشانیاں ہیں تاکہ ان سے تم اس کی معرفت حاصل کرو۔

[۴۷] اللہ کی تسبیح میں ہمہ وقت مشغول رہنے والے فرشتے:۔ اپنے شرک اور اپنی جہالت پر ڈٹے رہیں اور آپ کی بات تسلیم کرنے میں اپنی توہین سمجھیں تو اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں کیونکہ اللہ ان کی نافرمانی یا فرمانبرداری سے بے نیاز ہے اور اس کے پاس فرشتوں کی ایک عظیم جمعیت موجود ہے جو اس کے حکم سے تدبیر امور کائنات کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ انہیں اللہ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں۔ وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے علاوہ ازیں وہ اس کی تسبیح و تحمید میں بھی ہر وقت مشغول رہتے ہیں یہی ان کی غذا اور یہی ان کا وظیفہ حیات ہے۔ وہ اپنے قول اور فعل سے اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ کائنات کی ایک ایک چیز کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر اگر یہ لوگ ان حقائق کے علی الرغم اللہ کے شریک بنانے پر ہی تلے بیٹھے ہیں تو ان کی اس جہالت سے حقائق تو نہیں بدل سکتے۔

[۴۸] زمین کی روئیدگی سے معاد پر دلیل:۔ اس قدر خشک ہو چکی تھی کہ اس کی اوپر کی سطح خشکی کی وجہ سے پتھر کی طرح بن چکی تھی۔ اوپر سے پانی برسا تو وہ پھولنے لگی۔ بارش کے پانی کی اس مٹی میں آمیزش سے اس میں روئیدگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اور وہ بیج جو کبھی کے زیر زمین پڑے ہوئے تھے۔ ان میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے تو اس پھولی ہوئی زمین سے ان بیجوں کے پودوں کی کونپلیں زمین سے باہر نکل آئیں۔ حتیٰ کہ زمین نباتات سے لہلہا اٹھی اور اس پر جوبن آ گیا پھر اس بارش سے کئی جانور مینڈک، چیچڑ اور حشرات الارض بھی پیدا ہو گئے۔ بالکل ایسی ہی صورت قیامت کے قریب واقع ہو گی آسمان سے ایک خاص قسم کی بارش برسے گی جس سے تمام مردوں میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی۔ پھر نفخہ صور ثانی

عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴۰ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝۴۱ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ

پوشیدہ نہیں۔ بھلا وہ شخص جو دوزخ میں ڈالا جائے گا وہ بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن و امان سے آئے گا؟ تم جو چاہتے ہو[۵۰] کرو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے (۴۰) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے پاس ذکر (قرآن) آیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ ایک زبردست[۵۱] کتاب ہے (۴۱) جس میں باطل نہ آگے سے راہ پا سکتا ہے اور نہ پیچھے[۵۲] سے۔

کے وقت تمام مرے ہوئے انسان اپنی قبروں سے اس طرح نکل آئیں گے جیسے کونپل زمین سے نکل آتی ہے پھر وہ میدان محشر کی طرف چل کھڑے ہوں گے۔

[۴۹] ❁ الحاد کے معنی:۔ ﴿يُلْحِدُوْنَ﴾ کا مادہ لحد ہے اور لحد بمعنی قبر اور اس کا بغلی حصہ اور الحد بمعنی راہ راست سے کسی ایک طرف ہو جانا اور الحد السھم کے معنی تیر کا نشانہ کے کسی ایک پہلو میں لگنا اور الحد عن الدین کے معنی دین میں طعن کرنا۔ (مفردات القرآن) اور اس الحاد کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے (فق۔ل ۱۸۹) جیسے اللہ کی ذات و صفات میں شک کرنا یا اس کے غلط معنی لینا یا معجزات سے انکار کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ﴾ (۷:۱۸۰) یعنی جو لوگ اللہ کے ناموں (صفات) میں کجی اختیار کرتے ہیں۔

❁ الحاد کا تعلق اللہ کی صفات سے۔ ملحدین کون کون سے فرقے ہیں؟:۔ اس لحاظ سے اس مقام پر اللہ کی آیات سے مراد اللہ کی صفات بیان کرنے والی آیات ہوگا اس کی مثال جیسے اللہ کی تقدیر سے تعلق رکھنے والی آیات میں الحاد کی بنا پر قدریہ اور جبریہ دو فرقے وجود میں آ گئے۔ خوارج نے بھی اللہ کے حکم ہونے سے مراد یہ لی کہ اللہ کے علاوہ نہ اللہ کا قرآن حکم بن سکتا ہے اور نہ ہی انسان حکم بن سکتا ہے۔ معتزلہ نے اللہ کی صفات کو اللہ کی ذات سے جدا کر کے اللہ کی صفات کو حادث قرار دیا اور مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ اٹھا کھڑا کیا۔ علاوہ ازیں جتنے بھی گمراہ فرقے ہیں سب ہی اللہ کی صفات میں الحاد کر کے اس سے اپنا مفید مطلب مفہوم کشید کر لیتے ہیں۔ ایسے ملحدین جو خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنتے ہیں سب اللہ کی نظر میں ہیں۔ اور وہ اس سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے۔

[۵۰] انداز بیان میں سخت دھمکی پائی جاتی ہے اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی حاکم کسی مجرم کو کہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو اللہ کی آیات میں الحاد کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

[۵۱] یعنی قرآن کریم زبردست کتاب ہے۔ زیردست نہیں۔ اس کے بیان کردہ دلائل اور حقائق کو نہ جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ نیچا دکھایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب نیچا رہنے کے لیے نازل نہیں کی گئی۔ بلکہ زبردست رہنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں ان کا انجام زیردستی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

[۵۲] ❁ قرآن میں باطل کی عدم مداخلت کے مختلف پہلو:۔ یہ آیت کتاب اللہ کے زبردست ہونے کی وجہ یہ بتا رہی ہے کہ اس میں نہ آگے سے، نہ پیچھے سے، نہ اوپر سے، نہ نیچے سے غرض کسی طرف سے بھی باطل داخل نہیں ہو سکتا اور اس جملہ کے بھی کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا کلام ہے جسے اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے دل پر نازل کیا۔ جبرئیل علیہ السلام فرشتہ ایسا ہے جو امین بھی ہے اور قوی بھی۔ یعنی نہ تو وہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں خود کوئی کمی بیشی کرتا ہے اور نہ کوئی

يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۭ

یہ حکمت والے اور لائق ستائش اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔(۴۲)
آپ سے بھی وہی کچھ کہا جارہا ہے جو آپ سے پہلے رسولوں کو کہا[۵۳] جا چکا ہے۔

جن یا شیطان یا کوئی دوسری طاقت اس سے کسی کلام کا کچھ حصہ چھین سکتی یا اس میں آمیزش کر سکتی ہے۔ پھر جب جبرئیل ؑ نے آپ کے دل پر اتار دیا اور آپ ﷺ کی صداقت و دیانت پر آپ ﷺ کے دشمن بھی شاہد تھے اور آپ نے وہ کلام جوں کا توں امت تک پہنچا دیا تو اب بتاؤ کہ اس کلام میں باطل کی آمیزش کے لیے کہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے۔ اسی وقت سے مسلمانوں کے سینوں کے اندر محفوظ ہو کر نسلاً بعد نسل تواتر کے ساتھ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور ہر زمانہ میں لاکھوں کی تعداد میں اس کے حافظ موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور یہ شرف کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔ دوسری طرف اس کے نزول کے ساتھ ہی اس کی کتابت شروع ہو گئی تھی اس دور سے لے کر آج تک مسلسل اور متواتر اس کی اشاعت ہو رہی ہے اور کروڑوں اور اربوں تک اس کے نسخے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ شرف بھی اسی کتاب کو حاصل ہے کہ یہ دنیا بھر کی سب سے زیادہ کثیر الاشاعت کتاب ہے۔ اب ایک طرف یہ کتاب سامنے رکھئے دوسری طرف ایک چھوٹے سے حافظ بچے کو سنانے کے لیے کہہ دیجئے۔ آپ پر اس قرآن کا اعجاز ثابت ہو جائے گا۔ قرآن کے شائقین نے اس کی آیات، اس کے الفاظ، اس کے حروف، اس کے نقاط اور اس کے اعراب (زیر، زبر، پیش) غرضیکہ ایک ایک چیز کو گن کر ریکارڈ کر رکھا ہے۔ اب بتائیے کہ اس کتاب میں کسی ایک لفظ بلکہ حرف کی بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔؟ اور باطل اس میں کسی طرح راہ پا سکتا ہے؟ اور اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے جو حقائق بیان کیے ہیں، کوئی علم ایسا وجود میں نہیں آسکتا جو فی الواقع علم ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجربہ کوئی مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کرے کہ قرآن نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور سیاست کے باب میں انسان کی جو رہنمائی دی ہے وہ غلط ہے۔ باطل خواہ سامنے سے آکر حملہ آور ہو یا ادھر ادھر کے راستوں سے ہو کر چھاپے مارے وہ کسی طرح بھی اس حقیقت کو شکست نہیں دے سکتا جو قرآن نے پیش کی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق انسان کا علم خواہ کتنا ہی ترقی کر جائے وہ محدود ہی ہو گا اور اس کے بعد بھی اس چیز کے متعلق مزید انکشافات ہوتے رہیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود ہے۔ علاوہ ازیں وہ ہر چیز کا خالق ہے اور خالق اپنی بنائی ہوئی چیز کے متعلق جتنی معلومات رکھتا ہے دوسرا کوئی نہیں جان سکتا۔

[۵۳] ❁ رسولوں کو قوم سے کیا کچھ سننا پڑا؟:۔ اس طرح کی آیات کا نزول وقتاً فوقتاً ہوا اور بار بار ہوا اور ہونا چاہئے بھی تھا۔ کیونکہ تیرہ سالہ دور نبوت سارے کا سارا ہی کفار کے ہاتھوں ایذا رسانیوں میں گزرا۔ جن کی ایک قسم استہزاء اور اعتراضات بھی تھے۔ استہزاء اللہ کی آیات سے ہوتا تھا۔ اللہ کے رسول سے بھی اور مسلمانوں سے بھی۔ مثلاً یہی کہ کیا یہی شخص اللہ کو رسالت کے لیے ملا تھا؟ یہ تو جادوگر ہے، کاہن، شاعر ہے مجنون ہے۔ اسی طرح یہ کہ اگر تم اپنے اس کام سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے یا مار ہی ڈالیں گے۔ یا یہ کہ تمہارے پیروکار کچھ کمینے اور رذیل سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہم تو ان کی موجودگی میں تمہارے پاس بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتے چہ جائیکہ تمہاری باتیں سنیں۔ ایسی باتیں جو آپ کفار سے سنتے رہتے ہیں۔ پہلے رسولوں کو بھی یہ سب باتیں سننا پڑی تھیں۔

إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ
ءَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ
وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۴۴﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ ع ۵ ۱۹

بلاشبہ آپ کا پروردگار معاف کر دینے والا بھی ہے۔ اور دردناک[۵۴] عذاب دینے والا بھی۔(۴۳) اور اگر ہم اس قرآن کی زبان غیر عربی[۵۵] بنا دیتے تو کافر کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں کی گئیں۔ یہ کیا کہ کتاب تو عجمی زبان میں ہو اور مخاطب عربی ہوں؟" آپ ان سے کہئے کہ "جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے[۵۶] لئے تو یہ کتاب ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ثقل ہے۔ اور وہ (قرآن) ان پر دھندلا[۵۷] ہی رہتا ہے ان لوگوں کا حال تو ایسا ہے جیسے کہیں دور جگہ سے انہیں پکارا[۵۸] جا رہا ہو۔(۴۴) ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو اس

[۵۴] یہ اللہ تعالیٰ کی صفت حلم اور عفو ہی ہے کہ وہ اپنے دین کی اور اپنے فرمانبردار بندوں کی اس طرح توہین ہوتے دیکھ کر بھی ان سے درگزر کیے جاتا اور انہیں مہلت دیے جاتا ہے۔ ورنہ اس کے صاحب انتقام ہونے کا تو یہی تقاضا تھا کہ انہیں فوراً کسی دردناک عذاب سے تباہ کر ڈالتا۔ مگر وہ اس عذاب کو مؤخر کیے جا رہا ہے اور یہ سب کچھ اس کی مشیت کے تحت ہو رہا ہے۔

[۵۵] ❁ **اگر قرآن عجمی زبان میں نازل ہوتا تو کفار کے اعتراض کی صرف نوعیت ہی بدلتی:۔** یہ ضد اور ہٹ دھرمی کافروں کی خوئے بد کی ایک اور مثال ہے۔ اعتراض کرتے وقت وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ان کے اس اعتراض میں کچھ معقولیت ہے بھی یا نہیں؟ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ رسول عربی ہے اور عربی زبان میں ہی کلام سناتا ہے۔ تو اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام اس کا اپنا تصنیف کردہ ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ کلام کسی دوسری زبان مثلاً فارسی یا رومی زبان میں ہوتا اور یہ فرفر ہمیں سناتا۔ اور ہم سمجھتے کہ یہ زبان تو یہ جانتا ہی نہ تھا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اللہ کا رسول ہو اور فرشتہ ہی اس کو ایسا کلام پڑھاتا ہو۔ اسی اعتراض کا اس آیت میں جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر ہم قرآن غیر عربی زبان میں نازل کرتے تو ان کے اعتراض کی شکل یہ ہوتی کہ واہ! یہ بھی عجب معاملہ ہے۔ یہ نبی کلام ایسی زبان میں پیش کرتا ہے جسے ہم سمجھ بھی نہیں سکتے تو اس پر ایمان کیا لائیں؟ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے بہرحال اعتراض ہی کرنا ہے جو بھی صورت ہو اور یہی کام یہ لوگ کر رہے ہیں۔

[۵۶] آپ ایسے اعتراض کرنے والوں سے کہئے کہ جن لوگوں کی عقل سلیم ہے وہ اسی قرآن سے راہ ہدایت بھی حاصل کر رہے ہیں اور اپنی روحانی بیماریوں سے شفا بھی پا رہے ہیں۔ اگر تم خود سننا، دیکھنا اور ہدایت حاصل ہی نہ کرنا چاہو تو اس میں اللہ کی کتاب کا کیا قصور ہے جو اسے مورد الزام ٹھہراتے ہو؟

[۵۷] ❁ **کافروں پر قرآن کے دلائل دھندلائے ہی رہتے ہیں:۔** ایک پرندہ ہے چمگادڑ جس کی آنکھیں سورج کی روشنی میں چندھیا جاتی ہیں اور وہ دن کی روشنی میں اپنی آنکھیں بند ہی رکھتا ہے۔ حالانکہ سورج سب کے لیے ایک عظیم نعمت ہے لیکن چمگادڑ کو بھلا نہیں لگتا۔ یہی حال ان کافروں کا ہے کہ آفتاب ہدایت نکلا تو ان کو بھلا نہیں لگتا۔ اس میں چشمہ آفتاب یا آفتاب ہدایت کا کیا قصور ہے۔ یہ اگر کچھ کلام اللہ سنتے بھی ہیں تو کانوں کے اندر پہنچنے ہی نہیں دیتے اور قرآن کے مضامین ہدایت اور دلائل توحید و معاد ان پر واضح ہوتے ہی نہیں بلکہ دھندلائے ہی رہتے ہیں۔

[۵۸] دور سے پکارنے والے کی آواز کانوں میں پڑ تو جاتی ہے۔ مگر یہ سمجھ نہیں آسکتی کہ کہنے والا کہہ کیا رہا ہے؟ یہی حال ان

فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ

مُرِيبٍ ﴿٤٥﴾ مَّنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٤٦﴾

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِن ثَمَرَاتٍ مِّنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ

میں (بھی) اختلاف[۵۹] کیا گیا۔ اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے شدہ نہ ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا اور یہ لوگ بھی اس (قرآن) کی نسبت ایسے شک میں پڑے ہیں جو انہیں بے چین کیے دیتا ہے۔(۴۵) جس شخص نے کوئی نیک عمل کیا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو برائی کرے گا۔ اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں[۶۰] پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔(۴۶)

قیامت کا علم اللہ ہی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ اور جو بھی پھل اپنے شگوفہ سے نکلتا ہے یا مادہ حاملہ ہوتی ہے یا بچہ جنتی[۶۱] ہے

کافروں کا ہے کہ اگر قرآن کی آواز ان کے کانوں میں پڑ بھی جائے تو چونکہ ان کی خواہش ہی نہیں ہوتی کہ اس سے کچھ ہدایت حاصل کریں۔ لہٰذا قرآنی آیات کے مفاہیم و مطالب اُن پر دھندلائے ہی رہتے ہیں۔

[۵۹] یعنی جو کتاب تورات موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی اس میں بھی جامع ہدایات موجود تھیں۔ اور لوگوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔ کچھ ایمان لائے تھے اور بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ بالکل ایسی ہی صورت حال اب قرآن کے معاملہ میں پیش آرہی ہے اور اگر اللہ کی مشیت میں یہ بات نہ ہوتی کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے تو ابھی ان لوگوں کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا جو اپنے بعض مفادات اور سرداریوں کی بقا کی خاطر دعوت حق کو بہرحال جھٹلانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اور پوری سرگرمیاں اس دعوت کو مٹانے پر صرف کر رہے ہیں۔ جبکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ ان کے دل دعوت کو درست تسلیم کرتے ہیں اور انہیں اندر ہی اندر یہ خدشہ کھائے جا رہا ہے کہ اگر اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر ہماری خیر نہیں۔

[۶۰] ۞ یعنی آپ کے پروردگار کو اپنے بندوں کو خواہ مخواہ سزا دینے کا کوئی شوق نہیں۔ نہ وہ یہ ظلم کر سکتا ہے کہ نیکی کرنے والوں کو کچھ بدلہ نہ دے اور نہ یہ کہ بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کی کوئی سزا نہ دے۔

[۶۱] ۞ جواب کا رخ اس طرف موڑ دینا جس کا تعلق عملی زندگی سے ہو:۔ اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کا یہ حال ہے کہ شگوفہ کے اندر اس کے پھل کے نکلنے تک جو کیفیات گزرتی ہیں اور رحم مادر میں جنین پر جو جو مرحلے پیش آتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ ایسی ہی علیم ہستی جب یہ خبر دے رہی ہے کہ قیامت یقینی طور پر آنے والی ہے تو تمہیں اس بات پر یقین کر لینا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ وہ کب آئے گی تو اس کا علم بھی صرف اللہ کو ہے اور یہ بات بتانا مشیت الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس طرح تخلیق انسانی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کافروں کا یہ مشغلہ سا بن گیا تھا کہ وہ بار بار رسول اللہ ﷺ سے یہی سوال کرتے رہتے تھے تو اس کے جواب میں مختلف مقامات پر مختلف جوابات دیے گئے ہیں اور ان میں وہ پہلو اختیار کیا گیا ہے جس کا تعلق عملی زندگی سے ہو، رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی دستور تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ ﷺ سفر میں کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں کسی شخص نے زور سے پکارا "یا محمد ﷺ! قیامت کب آئے گی؟" تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: "تجھ پر افسوس! کیا تو نے اس کے لیے کچھ تیاری کر لی ہے" (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب۔ باب المرء مع من احب)

مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ؀ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ؀ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَاۗءِ الْخَيْرِ ۡ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَــُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ؀ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ

تو یہ سب کچھ اللہ کے علم سے ہوتا ہے۔ اور جس دن اللہ ان مشرکوں کو پکار کر پوچھے گا کہ "کہاں ہیں میرے شریک؟" تو کہیں گے: "ہم آپ سے عرض[۴۲] کر چکے ہیں کہ (آج) ہم میں سے کوئی (ایسی) گواہی دینے والا نہیں"(۴۷) اور اس سے پہلے جنہیں وہ پکارا کرتے تھے ان سے گم ہو جائیں گے[۴۳] اور وہ یقین کر لیں گے کہ اب ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔(۴۸)

انسان (اپنے لئے) بھلائی کی دعا کرنے سے کبھی نہیں اکتاتا[۴۴] اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس[۴۵] اور دل شکستہ ہو جاتا ہے(۴۹) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھائیں

[۴۲] ﴿اٰذَنّٰكَ﴾ کے معنی ہیں ہم آپ کے گوش گزار کر چکے ہیں یعنی قیامت کے دن مشرک لوگ شرک کا انجام دیکھیں گے تو اپنے شرک کا اقرار کرنے کی بجائے صاف مکر جائیں گے۔ بعض علماء نے یہاں شہید سے شاہد مراد لیا ہے۔ یعنی آج ہمیں اپنے معبودوں میں سے کوئی بھی یہاں نظر نہیں آ رہا۔

[۴۳] یعنی قیامت کی ہولناکیوں سے اس قدر گھبرائے ہوئے اور حواس باختہ ہوں گے کہ انہیں سمجھ ہی نہ آئے گی کہ اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا کیا جواب دیں اور دنیا میں وہ اپنے معبودوں کے متعلق جو تصورات جمائے بیٹھے تھے کہ وہ اللہ سے سفارش کر کے ہمیں بچالیں گے، سب کچھ بھول جائیں گے کیونکہ انہیں صاف نظر آ رہا ہوگا کہ آج کوئی کسی کے کام نہیں آ سکتا، نہ ہی عذاب سے بچنے کی کوئی صورت یا کوئی جگہ نظر آتی ہے۔

[۴۴] ❁ انسان کی حرص کی انتہا:۔ یعنی ایک عام اور دنیادار انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ مال و دولت سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر طرح کی بھلائیاں میرے ہی لیے ہوں۔ رزق بھی کشادہ اور وافر ملے، خوشحالی اور عیش و عشرت نصیب ہو، تندرستی بھی ہو اور اولاد بھی اچھی ہو۔ غرض بھلائی کی جو قسم ہو سکتی ہے وہ چاہتا ہے کہ سب کچھ اسے مہیا ہو اور اگر یہ سب چیزیں مہیا ہو بھی جائیں تو پھر یہ چاہتا ہے کہ ان میں ہر آن اضافہ بھی ہوتا رہے اور اس کی یہ حرص کبھی ختم ہونے کو نہیں آتی۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر آدمی کو ایک وادی بھر سونا مل جائے جب بھی (قناعت نہیں کرنے کا) دوسری وادی چاہے گا اور اگر دوسری مل جائے تو تیسری چاہے گا۔ بات یہ ہے کہ آدمی کا پیٹ مٹی ہی بھرتی ہے" (بخاری۔ کتاب الرقاق۔ باب ما يتقى من فتنة المال)

[۴۵] ❁ تکلیف میں مایوس اور شاکی:۔ اور اس کی طبیعت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب اسے کوئی تنگی، فاقہ یا بیماری یا اسی قسم کا کوئی دوسرا دکھ پہنچتا ہے اور اسے اس تکلیف کے دور ہونے کے ظاہری اسباب نظر نہیں آتے تو اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر

بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ

تو کہنے لگتا ہے کہ "میں اسی کا مستحق[۶۶] تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ کبھی قیامت بھی آئے گی اور اگر مجھے اپنے پروردگار کے پاس جانا ہی پڑا تو وہاں بھی میرے[۶۷] لئے بھلائی ہی ہو گی"

ہم ایسے کافروں کو ضرور بتادیں گے کہ وہ کیا کرتے تھے اور انہیں گندے[۶۸] عذاب کا مزا چکھائیں گے (۵۰)

ناشکری کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ ان ظاہری اسباب کے علاوہ بے شمار باطنی اسباب بھی موجود ہیں جو اسے نظر نہیں آسکتے اور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں۔ اگر وہ اللہ پر بھروسہ کرنا سیکھ جائے تو یقیناً اس کی یہ حالت نہ ہو۔

[۶۶] ❁ آسائش میں اپنی تدبیر پر ناز:۔ اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ہم اس کی تنگی، فاقہ یا بیماری کو دور کر دیں اور اس پر بھلے دن آجائیں تو پھر بھی اللہ کی طرف نہیں ہوتا، نہ اس ذات کا شکر ادا کرتا ہے جس نے اس کی تکلیف کو دور کر دیا جس سے وہ قطعاً مایوس ہو چکا تھا۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ بس اس کی حسن تدبیر اور محنت کا نتیجہ تھا اور اگر میرے دن پھر گئے ہیں تو میں فی الواقع اس بات کا مستحق تھا۔

[۶۷] ❁ مالدار اور دنیادار لوگوں کا نظریہ کہ اگر اللہ آج مجھ پر خوش ہے تو قیامت کو کیوں نہ ہو گا:۔ ایسا شخص اگر اللہ کی ہستی کو مانتا بھی ہے تو اس کی معرفت انتہائی ناقص ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ بس میں ہی ہوں۔ میرے اوپر کوئی ایسی ہستی نہیں جو کلیتاً میرے نفع و نقصان کی مالک ہو اور میری زندگی کی باگ ڈور اسی کے ہاتھوں میں ہو۔ اسی طرح روز آخرت اور اعمال کی جزا و سزا پر بھی اس کا ایمان انتہائی ناقص ہوتا ہے اور لوگوں کے کہنے پر وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ اگر مجھے اپنے پروردگار کے سامنے جانا بھی پڑا تو کیا وجہ ہے کہ وہ مجھے عذاب دے۔ میری موجودہ خوشحالی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ یقیناً مجھ سے خوش ہے۔ پھر اس دن آخر کیوں خوش نہ ہو گا۔ گویا ایسے لوگوں کے نزدیک دنیا کی خوشحالی ہی ان کے پروردگار کی خوشنودی کی دلیل ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ جس شخص کا اپنے پروردگار اور آخرت کے بارے میں ایسا غلط اور کمزور قسم کا ایمان ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کافر بھی ہوتا ہے اور مشرک بھی۔ جیسا کہ سورہ کہف کے پانچویں رکوع میں بالکل ایسے ہی شخص کا قصہ گزر چکا ہے۔ اور ایسے شخص کی صحیح ذہنیت درج ذیل حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے:

سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مکہ میں لوہار کا پیشہ کرتا تھا۔ میں نے عاص بن وائل سہمی کے لیے ایک تلوار بنائی۔ اس کی مزدوری کے تقاضا کے لیے میں عاص کے پاس گیا اس نے کہا میں تجھے یہ مزدوری اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک تو محمد ﷺ (کے دین) سے پھر نہ جائے۔ میں نے کہا۔ میں تو اس وقت تک بھی اس دین سے نہیں پھر سکتا جب کہ تو مر کر دوبارہ جی اٹھے گا۔ اس نے کہا: کیا میں مرنے کے بعد پھر جیوں گا؟ میں نے کہا، "بیشک" وہ کہنے لگا اچھا پھر جب میرے مرنے کے بعد اللہ مجھ کو زندہ کرے گا تو آخر مال اور اولاد بھی دے گا۔ اس وقت میں تیرا قرضہ ادا کر دوں گا" (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ مریم۔ باب قولہ اطلع الغیب)

[۶۸] غلیظ کے معنی موٹا۔ دبیز، گاڑھا، سخت اور گندہ سب کچھ آتا ہے۔ اور یہاں یہ لفظ سخت اور گندہ دونوں معنوں میں استعمال

غَلِيظٍ ﴿٥٠﴾ وَإِذَآ أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۚ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَآءٍ
عَرِيضٍ ﴿٥١﴾ قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُم بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي
شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿٥٢﴾ سَنُرِيهِمْ ءَايَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِيٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ

اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو منہ موڑ لیتا اور پہلو پھیر کر چل دیتا ہے اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی[۶۹] دعائیں مانگنے لگتا ہے۔(۵۱) آپ ان سے پوچھئے بھلا دیکھو، اگر یہ قرآن اللہ ہی کی طرف سے ہو[۷۰] اور تم نے اس سے انکار کر دیا تو اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اس کی مخالفت میں دور تک چلا گیا ہو؟(۵۲) عنقریب ہم انہیں کائنات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے اور ان کے اپنے اندر[۷۱] بھی، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔

ہو رہا ہے۔ غلاظت مشہور لفظ ہے۔ اور یہ عذاب گندہ اس لحاظ سے ہوگا کہ ایسے لوگوں کو پینے کے لیے پیپ، کچ لہو، زخموں کا دھوون، انتہائی متعفن بدبودار اور شدید ٹھنڈا پانی، ایسی ہی چیزیں پینے کو ملیں گی جن سے انسان کو گھن آتی ہے۔ اور اس کے سخت ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔

[۶۹] ❁ خوشحالی میں اکثر انسانوں کا اللہ کو بھول جانا:۔ یعنی جب انسان پر خوشحالی اور آسودگی کا دور آتا ہے تو پھولا نہیں سماتا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس وقت دراصل وہ خود خدا بنا بیٹھا ہوتا ہے۔ اور اگر اسے اللہ کی آیات سنائی جائیں اور یہ بتایا جائے کہ یہ سب انعام اللہ ہی نے کیا لہٰذا تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس کے حقوق ادا کرنے چاہیں اور اپنے برے انجام سے ڈرنا چاہئے تو اسے ایسی باتیں ناگوار اور تلخ محسوس ہوتی ہیں جنہیں وہ سننا بھی گوارا نہیں کرتا اور اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ لیکن جب پھر کسی بلا میں پھنس جاتا ہے تو اس وقت اسے اپنا وہ پروردگار یاد آنے لگتا ہے جس کی آیات سننے سے بھی بدکتا تھا۔ دل میں تو مایوس ہوتا ہے کیونکہ اسے اس مصیبت سے نجات کے ظاہری اسباب نظر نہیں آتے۔ مگر جب تکلیف اسے پریشان کر دیتی ہے تو بے اختیار اس کے ہاتھ اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ اللہ سے لمبی چوڑی دعائیں بھی کرتا ہے اور وعدے وعید بھی کرنے لگتا ہے۔ اور یہ حالت چونکہ اس کی اضطراری کیفیت ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اللہ اسے اس مصیبت سے نجات دے بھی دے تو بعد میں پھر وہ وہی کچھ بن جاتا ہے جو پہلے تھا۔ إلا ماشاءاللہ تھوڑے ہی لوگ ہوتے ہیں جو بعد میں اللہ سے کئے ہوئے اس قول و قرار کو یاد رکھتے اور حقیقتاً اس کے فرمانبردار بن جاتے ہیں۔ اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے جو خوشحالی کے دور میں اپنے پروردگار کو یکسر بھول ہی جاتی ہے۔

[۷۰] ❁ آخرت کے منکر کیسے خسارہ میں رہتے ہیں؟:۔ اس قرآن میں جو بعث بعد الموت اور اللہ کے حضور پیشی کا عقیدہ پیش کیا گیا ہے وہ ایک ٹھوس حقیقت ہو تو بتاؤ تمہارا کیا حال ہوگا؟ فرض کرو کہ تمہارے زعم کے مطابق سب انسان مر کر مٹی میں مل جائیں گے اور یہی انسان کا انجام ہو تو جو شخص روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کا کیا بگڑے گا؟ اور اگر قرآن کی بات سچی ہوئی اور تمہیں اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہونا پڑا تو بتاؤ تمہاری گمراہی کا کوئی ٹھکانا ہے جس کے نتیجہ میں لازماً تمہیں جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا؟

[۵۱] آفاق و نفس کے دو مفہوم:۔ اس آیت کے دو مطلب ہیں اور وہ دونوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ آفاق سے مراد عرب کے قرب وجوار کے ممالک مراد لیے جائیں اور انفس سے عرب قوم اور بالخصوص قریش قوم مراد لی جائے جس سے رسول اللہ ﷺ نسبی تعلق رکھتے تھے اس لحاظ سے اس آیت کا جو مطلب ہے وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ چند ہی سالوں میں قریشی سرداروں کو ذلت سے دوچار ہونا پڑا اور کفر و شرک کی کمر ٹوٹ گئی۔ آپ کی زندگی ہی میں کفر و شرک کو عرب کی سرزمین سے دیس نکالا مل گیا اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں عرب کے ارد گرد کے ملکوں میں اسلام کا جو بول بالا ہوا وہ ہر ایک نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ اللہ کی نشانیاں صرف ان معنوں میں نہ تھیں کہ مسلمان ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے گئے اور وہ مفتوح قوموں کے جان و مال کے مالک بن گئے جیسا کہ اس دنیا میں عموماً ہوتا ہے بلکہ یہ ان معنوں میں اللہ کی نشانیاں تھیں کہ یہ فتوحات اپنے جلو میں ایک عظیم الشان مذہبی، اخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب بھی لا رہی تھی اور ان فتوحات کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے انسان کے بہترین جوہر کھلتے اور بدترین اوصاف مٹتے چلے گئے۔

اور دوسرا یہ کہ آفاقی آیات سے مراد کائنات میں ہر سو بکھرے ہوئے اللہ کے عجائبات مراد لیے جائیں اور آیات انفس سے مراد انسان کے اندر کی دنیا لی جائے۔ جنہیں بالترتیب عالم اکبر اور عالم اصغر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کائنات میں اور انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نشانیاں موجود ہیں۔ اور ان سب کا نہ انسان آج تک احاطہ کر سکا ہے اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گا۔ جبکہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی نئی سے نئی نشانی انسان کے علم میں آجاتی ہے اور آئندہ بھی آتی رہے گی۔ جو قرآن کے بیان کی صداقت پر گواہی دیتی رہے گی۔ نئے سے نئے عجائبات قدرت انسان کے علم میں آتے رہیں گے۔ خواہ ان کا تعلق انسان سے باہر کی دنیا سے ہو یا اس کے اندر کی دنیا سے۔

"انسان کو کائنات اصغر کہنے کی بھی کئی وجوہ ہیں۔ جن میں ایک یہ ہے کہ کائنات میں موجود چیزوں کی خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ مثلاً زمین پر جو اشیاء پائی جاتی ہیں وہ یا جمادات سے تعلق رکھتی ہیں یا نباتات سے اور یا حیوانات سے۔ جسامت کے لحاظ سے انسان جمادی ہے۔ پھر یہ بڑھتا بھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا نفس نباتی ہوا۔ پھر یہ حرکت بھی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نفس حیوانی ہوا۔ پھر اس سے بھی زیادہ کامل ہوا تو اسے نفس انسانی ملا۔ جس طرح کسی عرق کو ایک آتشہ، پھر دو آتشہ، پھر سہ آتشہ کر کے اسے انتہائی لطیف اور سریع التاثیر بنایا جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مشت خاک کو کمال دیتے دیتے انسان بنا دیا۔ اور اسے ایسی قوائے انسانیہ عطا کی گئیں جن سے وہ امور کلی دریافت کرنے کے قابل بن گیا۔ اب انسان کے اندر جس جس قسم کی قوتیں اور قدرتیں رکھ دی گئی ہیں ان کا احاطہ کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ حالانکہ وہ اس کے اندر ہر وقت موجود ہیں اور موجود رہتی ہیں۔ پھر انسان کے اندر نصب شدہ مشینری کو دریافت کر کے انسان کئی طرح کی ایجادات معرض وجود میں لانے کے قابل ہو گیا۔ پھر اس کے نفس انسانی کا تعلق عالم ملکوت سے بھی ہے۔ اس طرح انسان کے اندر کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی لاانتہا قدرتیں اور عجائبات موجود ہیں جن کا اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۵۳﴾ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ﴿۵۴﴾ ع ۶

کیا یہ بات کافی نہیں کہ آپ کا پروردگار ہر چیز پر حاضر وناظر [۷۲] ہے(۵۳) سن لو! یہ لوگ اپنے پروردگار کی ملاقات سے [۷۳] شک میں پڑے ہوئے ہیں (اور یہ بھی) سن لو کہ اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے(۵۴)

[۷۲] اس جملہ کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ربطِ مضمون کے لحاظ سے یہ مطلب ہو گا کہ اگر یہ لوگ قرآن کی حقانیت کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ کریں۔ اس کی حقانیت پر کیا تمہارے پروردگار کی گواہی کافی نہیں جو ہر جگہ موجود اور ہر چیز کو بچشم خود دیکھ رہا ہے؟ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کیا ان لوگوں کو اپنے کرتوتوں سے رک جانے کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ آپ کا پروردگار ان کی ہر ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے؟ اور تیسرا مطلب یہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کافر آپ کو کن کن طریقوں سے ستا رہے ہیں پھر کیا آپ ﷺ کے اطمینان کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر خود گواہ ہے اور وہ انہیں ان کی کرتوتوں کی سزا دیے بغیر چھوڑے گا نہیں؟

[۷۳] یعنی کافروں کی فتنہ انگیزیوں اور شرارتوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں نہ روز آخرت پر ایمان ہے اور نہ اللہ کے حضور جوابدہی کے تصور پر۔ اگر انہیں یہ یقین ہوتا تو کبھی ایسی حرکتیں نہ کرتے۔ لیکن انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احاطہ اختیار میں کس طرح گھرے ہوئے اور مجبور محض ہیں اور اس کی گرفت سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے۔

۵۳ آیاتہا سورۃ ۴۲ الشوریٰ مکیۃ ۶۲ رکوعہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝۱ عٓسٓقٓ ۝۲ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۴ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ

کلمات ۸۶۹ آیات ۵۳ (۴۲) سورۃ الشوریٰ مکی ہے (۶۲) رکوع ۵ حروف ۳۵۸۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ (۱) ع۔ س۔ ق (۲) اللہ جو زبردست اور حکمت والا ہے، آپ کی طرف [۱] اور آپ سے پہلے (رسولوں) کی طرف اسی طرح وحی کرتا رہا ہے (۳) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور وہ عالی شان [۲] اور عظمت والا ہے۔ (۴) (جو کچھ یہ مشرکین کہتے ہیں) قریب ہے کہ آسمان اوپر [۳] سے پھٹ پڑیں درآنحالیکہ فرشتے

[۱] نام لیے بغیر مابہ النزاع مسائل کے جوابات:۔ مکی دور میں حق و باطل کے درمیان اختلافی مسئلے بنیادی طور پر دو ہی تھے۔ ایک یہ کہ مشرکوں کے بتوں کا کائنات میں کچھ تصرف ہے یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ کیا انسان کا مر کر جی اٹھنا پھر اپنے پروردگار کے حضور جواب دہی کے لیے پیش ہونا درست ہے یا نہیں؟ یہی دو مسائل تھے جن کا اکثر مجلسوں اور نجی گفتگو میں ہر وقت چرچا رہتا تھا۔ پھر ان میں ایک تیسرا مسئلہ از خود شامل ہو جاتا تھا کہ آیا محمد ﷺ فی الواقع اللہ کا رسول ہے یا نہیں؟ جو کچھ وہ کلام پیش کرتا ہے۔ فی الواقع اللہ کا کلام ہے؟ اور قرآن کا انداز خطاب یہ ہے کہ اکثر سورتوں میں تمہید کے طور پر کافروں کے اعتراضات کا ذکر کیے بغیر انہیں سوالوں میں سے کسی سوال کے جواب سے اس سورہ کا افتتاح کرتا ہے۔ اس سورہ کی تیسری آیت میں دراصل ان تینوں اعتراضات کا اجمالی جواب پیش کر دیا گیا ہے۔ جو یہ ہے کہ جو کچھ توحید اور معاد کے متعلق اس قرآن میں مذکور ہے۔ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں بلکہ پہلے تمام انبیاء کو بھی یہی باتیں وحی کی جاتی رہی ہیں۔ اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ قرآن فی الواقع اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور اس کی آیات حکمت سے لبریز ہیں کیونکہ وہ خود حکیم ہے۔ علاوہ ازیں وہ سب پر غالب اور زبردست بھی ہے۔ وہ مخالفین کی مخالفت کے باوجود اپنے کلمہ کا بول بالا کرنے کی قوت اور قدرت بھی رکھتا ہے۔

[۲] مملوک الٰہ نہیں ہو سکتا:۔ اس آیت میں بتوں یا ماسوا اللہ کی خدائی کا عقلی دلیل سے رد پیش کیا گیا ہے کہ خالق ارض و سماء تو اللہ کی ذات ہے۔ وہ ان سب چیزوں کا مالک اور وہ چیزیں اس کی مخلوق اور اس کی ملکیت ہیں اور وہ اس تمام کائنات سے بلند تر اور بزرگ تر ہے۔ پھر بھلا اس کی مخلوق کو، اس کی مملوکہ چیز کو اس کے مقابلہ میں حقیر ترین مخلوق کو اس کا شریک کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اور اس کے اختیارات و تصرفات میں ان چیزوں کو کیسے حصہ دار سمجھا جا سکتا ہے؟

[۳] اگر کوئی اور الٰہ ہوتا تو آسمان پھٹ پڑتا اور نظام تباہ ہو جاتا: مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اس طرح وہ اللہ کی دوہری توہین کے مرتکب ہوتے تھے ایک اولاد قرار دینا یا نسبی رشتہ قائم کرنا اور دوسرے اللہ کے لیے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں تجویز کرنا۔ اور بیٹا مملوک نہیں بلکہ ہمسر ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کائنات کا خالق اگر ایک کی بجائے دو بھی ہوتے تو یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جاتا پھر ان لوگوں نے تو اللہ کے کئی نسبی رشتہ دار بنا ڈالے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق تو

يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ أَلَآ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ أَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝ وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۗ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ

اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے اور زمین میں رہنے والوں کے لئے بخشش طلب کرتے رہتے ہیں۔ سن رکھو! اللہ ہی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے(۵) اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا سرپرست[۴] بنا رکھے ہیں اللہ ہی ان پر نگران ہے، آپ ان کے ذمہ دار نہیں۔(۶) اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا تاکہ آپ اہل مکہ اور اس کے گرد و پیش[۵] والوں کو ڈرائیں اور انہیں جمع ہونے کے دن سے بھی ڈرائیں جس (کے واقعہ ہونے) میں کوئی شک نہیں (اس دن) ایک گروہ تو جنت[۶] میں جائے گا

آسمانوں کو کب کا پھٹ پڑنا چاہئے تھا۔ لیکن تدبیر امور کائنات پر مامور فرشتے ایسی باتوں سے اللہ کی ہر وقت پاکیزگی بیان کرتے اور اس کی حمد و ثنا میں مشغول رہتے ہیں۔ پھر وہ اہل زمین کے ایسے گندے خیالات پر ان کے لیے بخشش کی دعا بھی کرتے رہتے ہیں۔ پھر اللہ ان کی دعا قبول کرتا اور ایسے مجرموں سے درگزر کیے جاتا ہے۔ ورنہ ان کے اعمال تو ایسے ہیں کہ ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا کر انہیں فوراً ہلاک کر دیا جاتا۔

[۴] ❁ ولی کے مختلف مفہوم:۔ ولی کا لفظ بہت جامع ہے اور بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مثلاً کارساز دوست، حمایتی، مددگار اور سرپرست سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اور اس کا عام مفہوم وہ شخص ہے جو کسی کی موت، مصیبت اور سخت پریشانی کے وقت اس کی مدد کو پہنچے یا اس کی وراثت کا اولین حقدار ہو۔ اور یہ باپ اور بیٹے کے علاوہ کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے جب کہ مشرکین اپنے بتوں اور معبودوں کو ایسا سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ وہ ہر مصیبت میں ان کے کام آتے اور ان کی حاجات کو پورا کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نیز قیامت کے دن ہم ان کی سفارش سے اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔ اللہ ایسے مشرکوں کو مہلت تو دیتا ہے مگر یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ بچے رہیں گے۔ یہ سب لوگ اللہ کی نظر میں ہیں۔ لہٰذا آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ مانتے کیوں نہیں یا نہ ماننے کی صورت میں تباہ کیوں نہیں کر دیے جاتے۔ یہ باتیں آپ کے ذمہ نہیں۔ وقت آنے پر اللہ خود ان سے نمٹ لے گا۔

[۵] ❁ قرآن ساری دنیا کی ہدایت کے لیے:۔ اُمُّ الْقُرٰى سے مراد مرکزی بستی یا بڑا شہر اور اس سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ جہاں اللہ کا گھر موجود ہے۔ اور تمام دنیا کے لوگوں کے جمع ہونے کے لیے مرکز بنا دیا گیا ہے۔ اور اس کے گرد سے مراد صرف آس پاس کے علاقے یا ملک نہیں بلکہ پوری روئے زمین ہی مراد ہے۔ کیونکہ یہ پوری روئے زمین کا مرکز بنایا گیا ہے۔ گویا اس آیت میں چند بنیادی باتوں کا نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ قرآن اہل عرب کی اپنی ہی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور لوگ مخصوص قسم کے علماء کے محتاج ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ تمام اہل عرب اس سے براہ راست استفادہ کر سکیں، دوسری یہ کہ آپ کی دعوت صرف اہل مکہ کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے ہے اور تیسری یہ کہ آپ کی بعثت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ دنیا بھر کے لوگوں کو قیامت کے دن واقع ہونے والے واقعات اور ان کے اعمال کی جزا و سزا سے پوری طرح خبردار کر دیں۔

[۶] یعنی جتنے بھی انسان اور جن پیدا ہوئے ہیں ان سب کو اس دن اکٹھا کر لیا جائے گا۔ دنیا میں تو کئی مذاہب ہیں پھر ہر مذہب کے

فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴿۷﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ
وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۸﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ
ع يُحْيِ الْمَوْتٰى ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۹﴾ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ

اور دوسرا دوزخ میں۔(۷) اگر اللہ چاہتا تو انہیں ایک ہی امت رہنے دیتا مگر وہ جسے چاہتا[۷] ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ اور ظالموں کے لئے نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار(۸) کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے؟ حالانکہ کارساز تو صرف اللہ ہے اور وہی مُردوں[۸] کو زندہ کرے گا۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۹) اور جس بات میں بھی تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ کرنا[۹] اللہ کا کام ہے۔ وہی اللہ

بیسیوں فرقے ہیں۔ مگر اس دن ساری مخلوق صرف دو گروہوں میں تقسیم ہو گی۔ ایک اہل جنت، دوسرے اہل دوزخ۔ ایک تیسرے فریق اعراف والوں کا ذکر بھی سورہ اعراف میں آیا ہے لیکن وہ فریق کوئی مستقل فریق نہ ہو گا بلکہ جلد یا بدیر اہل جنت سے مل جائے گا۔

[۷] ❁ انسان کو اختیار دینے کا نتیجہ اختلاف اور گروہ بندی:۔ اس کی بڑی آسان صورت یہ تھی کہ اللہ انسانوں کو قوت ارادہ و اختیار نہ بخشتا۔ پھر جس طرح کائنات کی باقی سب چیزیں اللہ کی مطیع فرمان ہیں اور ان کی یہ اطاعت اضطراری ہے انسان بھی اسی طرح اللہ کا مطیع فرمان ہوتا۔ اور اختلاف یا فرقوں میں بٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مگر اللہ کی مشیت تو یہ تھی کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جائے جس کو اختیار دیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ کون اپنے اختیار سے اس کی اطاعت کرتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے۔ اور یہ اختیار ہی وہ چیز ہے جو اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ پھر جو لوگ اپنے اختیار سے اللہ کے فرمانبردار بن جاتے ہیں۔ اللہ انہیں رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔ دنیا میں بھی مہربان اور آخرت میں بھی۔ لیکن جو نافرمانی اختیار کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ دنیا کی زندگی میں ان کا محاسبہ کیا جائے۔ بلکہ آخرت میں ان کا ضرور محاسبہ کیا جائے گا۔ پھر اس دن ان کا کوئی ایسا سرپرست یا مددگار نہ ہو گا جو انہیں ان کے اعمال کی سزا سے بچا سکے۔

[۸] ❁ آستانوں کے کارساز اصل میں مریدان باصفا ہی ہوتے ہیں:۔ آپ کسی کافر کے یا مشرک کے بت خانے یا آستانے پر تشریف لے جائیے اور دیکھئے کہ کارساز یا کام بنانے والے کون ہیں؟ کارساز تو وہ ہیں جو نذرانے دیتے اور نیازیں چڑھاتے ہیں انہیں کارسازوں یا مریدوں کے ذریعہ تو آستانوں کا کاروبار چمکتا ہے۔ اور آستانوں کے مجاوروں اور خادموں کی چاندی بنی ہوئی ہے۔ دنیا میں تو عبادت گزار مریدان باصفا ہی ان کے کارساز ہوتے ہیں۔ رہی آخرت کی بات جس کی وجہ سے یہ ان کے کارساز بنے ہوئے ہیں تو یہ بات آج نہیں آخرت کو انہیں ٹھیک طرح معلوم ہو جائے گی۔ کہ یہ اولیاء بھی انہی کی طرح عاجز مخلوق اور اللہ کے دربار میں بالکل بے بس ہیں۔ کارساز تو وہ ہو سکتا ہے جو تصرف کے وسیع اختیارات رکھتا ہو اور وہ اللہ کی ذات ہی ہو سکتی ہے جو مُردوں تک کو زندہ کر سکتی ہے اور ہر آن کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا اگر کارساز بنانا ہے تو ایسی ذات کو بناؤ جو دنیا اور آخرت دونوں جگہ تمہارے کام بھی آ سکے۔

[۹] ❁ اختلافات کا فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے؟:۔ اصل دین چونکہ اللہ نے ہی بذریعہ وحی اپنے رسول اور بندوں کی طرف بھیجا تھا

اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝١٠ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝١١ لَهٗ

میرا پروردگار ہے میں اسی پر بھروسہ کر چکا[۱۰] اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔(۱۰) جو آسمانوں اور زمین کو پیدا[۱۱] کرنے والا ہے۔ جس نے تمہارے لئے تمہاری اپنی جنس سے بھی جوڑے بنا دیئے اور چوپایوں کے بھی (اس طرح) وہ تمہیں زمین میں پھیلا دیتا ہے۔ کوئی چیز اس کے مشابہ[۱۲] نہیں اور وہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔(۱۱)

لہٰذا اگر بندے اس دین میں اختلاف کریں تو ان میں فیصلہ کا حق بھی اللہ ہی کو ہے کہ وہ لوگوں کو بتائے کہ میں نے جو دین بھیجا تھا وہ تو یہ تھا اور تم نے فلاں فلاں مقام پر غلط تاویلات کر کے باہم اختلاف کر لیا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر صاحب شریعت نبی ایمان لانے والوں کو ایک امت بناتا ہے۔ بعد میں لوگ اس میں اختلاف پیدا کر کے کئی فرقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ پھر جو بعد میں نبی آتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر وحی کر کے لوگوں کو اصل دین سے مطلع کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ دنیا میں لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کر دیتا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ اختلافات کا جو فیصلہ فرمائے گا وہ کھلی عدالت میں فرمائے گا۔ اختلاف کرنے والے لوگوں کی باقاعدہ پیشی ہو گی۔ پھر ان پر شہادتیں قائم ہوں گی اور انہیں بتایا جائے گا کہ اصل دین کیا تھا اور تم نے کیا کچھ حیلے اور مکاریاں کر کے اصل دین کا حلیہ بگاڑا تھا۔ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا تھا۔

اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اختلافی مسائل میں اللہ کے کلام یعنی قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ پھر چونکہ قرآن رسول کی اطاعت کو واجب اور اپنی ہی اطاعت قرار دیتا ہے۔ لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ تفرقہ بازی اور اختلافات سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان کتاب و سنت کے سامنے کھلے دل سے سر تسلیم خم کر دے اور اس مطلب کی تائید سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ اور ۶۴ سے بھی ہو جاتی ہے۔

[۱۰] یعنی میں ہمیشہ کے لیے اللہ پر توکل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ پھر جب بھی مجھے کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

[۱۱] میرے اللہ پر توکل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت بڑی قوت اور قدرت کا مالک ہے جس نے اس پوری کائنات کو وجود بخشا ہے اور اس زمین کو اس نے بڑے محیر العقول طریقوں سے انسانوں اور دوسرے جانوروں کے جوڑے بنا کر اور ان سے نسلیں پھیلا کر اس زمین کو آباد کر رکھا ہے۔

[۱۲] ❁ اللہ پر توکل کیوں کرنا چاہئے؟ اس کی مختلف وجوہ:۔ یہ اللہ پر توکل کرنے کی دوسری وجہ ہے۔ یعنی وہ ایسی ذات ہے جس کے مثل کائنات کی کوئی چیز نہیں۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کا لفظی معنی یہ بنتا ہے کہ "کوئی چیز اس کے مثل کی مانند نہیں" اور اس انداز بیان میں مزید مبالغہ پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مثلاً اس کے ہاتھ تو ہیں۔ مگر ایسے نہیں جیسے ہمارے ہیں یا کسی دوسرے جاندار کے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں جو مخلوق کو روزی پہنچانے کے لیے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ ہماری طرح نہیں اور نہ ہی ہماری طرح اس کا جسم ہے۔ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ جبکہ انسان بھی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اس میں فرق یہ ہے کہ انسان ایک وقت میں صرف ایک کی بات سن

مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٢﴾ شَرَعَ

آسمانوں اور زمین کی چابیاں اسی کے پاس ہیں [۱۳]۔ وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کیلئے چاہتا ہے کم کر دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے (۱۲) اس نے تمہارے [۱۴] لئے

سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں اپنی ساری مخلوق کی بھی پکار اور دعائیں سنتا ہے۔ یہی صورت اس کے دیکھنے کی ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے یہ سمجھنا ہماری بساط سے باہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی ذات ہی بھروسہ کے قابل ہو سکتی ہے جو ہر وقت ہر ایک کی پکار اور فریاد سن سکتی ہو اور وہ ہر چیز کو بچشم خود دیکھ بھی رہی ہو۔

[۱۳] یہ اللہ پر توکل کرنے کی تیسری وجہ ہے کہ آسمان وزمین کے تمام تر خزانوں کی چابیاں اسی کے پاس ہیں۔ وہ ایسا داتا ہے جو ہر آن اپنی مخلوق پر بے انداز خرچ کرتا ہے اور رزق مہیا کر رہا ہے۔ البتہ بعض مصلحتوں کے پیش نظر اس نے رزق کی تقسیم تمام لوگوں میں یکساں نہیں رکھی۔ اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رزق کے اس تفاوت کی وجہ سے ہی دنیا کا یہ نظام چل رہا ہے۔ اور سب لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اب اگر وہ کسی کو زیادہ رزق دیتا ہے یا کسی کو کم دیتا ہے تو یقیناً اس میں کوئی نہ کوئی حکمت کار فرما ہوتی ہے۔ جسے وہ خود ہی سب سے زیادہ جانتا ہے۔

[۱۴] ۞ دین اور شریعت میں فرق اور متبدل احکام کی مثالیں:۔ اس آیت میں ایک شرع کا لفظ آیا ہے اور شریعت کا لفظ اسی سے مشتق ہے۔ اور دوسرا دین کا۔ اور ﴿مِنَ الدِّيْنِ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بھی دین کا حصہ ہی ہوتی ہے۔ اس فرق کو ہم یہاں ذرا وضاحت سے پیش کرتے ہیں:

دین کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مختصراً یہ چار معانی میں استعمال ہوتا ہے (۱) اللہ کی کامل اور مکمل سیاسی اور قانونی حاکمیت، (۲) انسان کی مکمل عبودیت اور بندگی، (۳) قانون جزا و سزا یا تعزیرات ملکی، (۴) قانون جزا و سزا کے نفاذ کی قدرت، پھر یہ لفظ کبھی ایک معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زیادہ معنوں میں۔ اب دین کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کچھ باتوں کا حکم دے، کچھ کاموں سے منع کرے اور جو شخص ان احکام کے مطابق عمل کرے انہیں اچھا بدلہ دے اور جو حکم عدولی کرے اسے سزا بھی دے۔ چنانچہ ایسے احکام جو سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد ﷺ پر غیر متبدل رہے ہیں یہی اصل دین ہے مثلاً شرک کی حرمت، آخرت اور اس کا محاسبہ، نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم، قتل ناحق، چوری، زنا اور فواحش سے اجتناب وغیرہ۔

اور شرع کا لغوی معنی واضح راستہ متعین کرنا ہے۔ (مفردات القرآن) اور شریعت سے مراد وہ احکام ہیں جو زمانہ کی ضرورتوں اور احوال و ظروف کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً سیدنا آدم علیہ السلام کی اولاد میں بہن بھائی کا نکاح جائز تھا اور یہ ایک اضطراری امر تھا۔ جو بعد کی شریعتوں میں حرام قرار دیا گیا۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی زوجیت میں دو حقیقی بہنیں تھیں جو بعد کی شریعتوں میں حرام قرار دی گئیں۔ اسی طرح اس دور میں سجدہ تعظیمی جائز تھا۔ جو بعد میں حرام کر دیا گیا۔ سابقہ شریعتوں میں اموال غنیمت سے استفادہ ناجائز تھا جو امت مسلمہ کے لیے حلال قرار دیا گیا۔ سابقہ شریعتوں میں نمازوں کی تعداد اور ان کی ادائیگی کا طریقہ، زکوٰۃ کی شرح اور روزوں کی تعداد ہماری موجودہ شریعت سے بالکل مختلف تھی۔ غرضیکہ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ دین اور شریعت

لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى
وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَي الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ

دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا ابراہیم[۱۵]، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ[۱۶] نہ ڈالنا۔ آپ ان مشرکوں کو جس بات کی دعوت دیتے ہیں وہ ان پر گراں[۱۷] گزرتی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے

کے اس فرق کو خود رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں واضح فرمایا کہ: "تمام انبیاء علاتی (سوتیلے) بھائی ہیں۔ ان کی مائیں (شریعتیں) تو الگ الگ ہیں مگر ان کا باپ (دین) ایک ہی ہے" (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب واذکر فی الکتاب مریم......) گویا اصول اور بنیادی احکام کا نام دین ہے اور دین کا یہ حصہ غیر متبدل ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں ان اصول احکام کی جزئیات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے۔ اسی متبدل حصہ کا نام شریعت ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے اور خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ صاحب شریعت نبی کی شریعت اگرچہ مختلف رہی ہے مگر وہ اس مخصوص نبی کے دین کا حصہ ہی ہوتی ہے اور دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ چونکہ آخری نبی ہیں۔ لہٰذا آپ کو جو شریعت ملی ہے وہ بھی اب غیر متبدل ہے اور زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل اب پوری شریعت اسلامیہ سے بذریعہ اجتہاد معلوم کیا جائے گا۔

[۱۵] اس آیت میں پانچ اولوالعزم انبیاء کا ذکر ہوا ہے۔ سب سے پہلے صاحب شریعت نبی نوح علیہ السلام تھے پہلے ان کا ذکر ہوا اور سب سے آخری محمد رسول اللہ ﷺ تھے پھر ان کا ذکر ہوا پھر اس درمیانی عرصہ کے تین صاحب شریعت انبیاء سیدنا ابراہیم، سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر ہوا اور بتایا یہ گیا ہے کہ جس طرح ہم نے سابقہ انبیاء کے لیے دین کے ساتھ شریعت بھی وضاحت کے ساتھ وحی کر دی تھی۔ اسی طرح آپ کے لیے ایسے ہی طریقہ پر وحی کی جا رہی ہے۔ یعنی دین کا غیر متبدل حصہ بھی اور متبدل حصہ یا شریعت بھی۔ پھر بعض دفعہ دین کے صرف غیر متبدل حصہ پر بھی لفظ دین کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث سے واضح ہے۔

[۱۶] یعنی سب انبیاء کو دین اور شریعت دے کر یہ تاکید کی گئی تھی کہ اس دین کو قائم رکھو۔ قائم رکھنے سے مراد ہے کہ پہلے اس کے احکام خود بجا لاؤ۔ پھر ایمان لانے والوں میں ان احکام کو نافذ کرو۔ اور دین کے جو غیر متبدل اصول ہیں۔ یعنی توحید اور معاد وغیرہ جو اوپر مذکور ہوئے ان میں اختلاف نہ ڈالو۔ اس جملہ کے مخاطب اگرچہ بظاہر انبیاء معلوم ہوتے ہیں تاہم اس کے مخاطب ان انبیاء کے متبعین ہیں اور یہ انداز تاکید مزید کے لیے ہے کیونکہ انبیاء کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ سابقہ اختلاف کو ختم کریں چہ جائیکہ نئے اختلافات ڈالیں۔

[۱۷] یعنی وہی توحید اور روز آخرت کا محاسبہ جو تمام سابقہ انبیاء کے دین کا غیر متبدل حصہ رہا ہے اور جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی بات کی جب ان مشرکین مکہ کو دعوت دی جاتی ہے تو ان پر گراں گزرتی ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام سے لے کر آج تک جو چیز معقول اور سب انبیاء کی متفق علیہ تعلیم تھی وہی انہیں بھاری معلوم ہونے لگی۔ اور اسی بنیادی تعلیم سے ہی اختلاف کر کے یہ اس کے مخالف بن گئے ہیں گویا ان کی جہالت اور بدبختی کی حد ہو چکی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ

يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ

اپنے لئے چن لیتا ہے اور اپنی طرف سے اسی کو راہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔(۱۳) ان لوگوں میں فرقہ بندی اس وقت پیدا ہوئی جبکہ اس سے پہلے ان کے پاس علم (وحی) آ چکا تھا (اور اس کی وجہ محض) ان کی باہمی ضد بازی[۱۸] تھی۔ اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک مقررہ مدت تک کا حکم پہلے سے طے شدہ[۱۹] نہ ہوتا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔ اور ان کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث ہوئے وہ ایسے شک[۲۰] میں پڑ گئے جو انہیں بے چین کئے رکھتا تھا۔(۱۴) لہٰذا آپ اسی دین کی دعوت دیجئے اور جو آپ کو حکم[۲۱] دیا گیا ہے اس پر ڈٹ جائیے۔

اس سادہ اور صاف ستھری تعلیم سے استفادہ وہی شخص کر سکتا ہے جو خود بھی ہدایت کا طالب ہو اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ جس قدر زیادہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو گا اتنا ہی زیادہ اللہ کی ہدایت سے فیض یاب ہو گا۔

[۱۸] ❁ فرقہ بازی کے اسباب:۔ لوگوں میں اختلاف اور تفرقہ بازی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اللہ کی کتاب میں کوئی بات مبہم اور مختلف فیہ ہوتی ہے۔ جس کی لوگوں کو پوری طرح سمجھ نہیں آتی بلکہ اس کی اصل وجہ اپنا اپنا جھنڈا بلند کرنے کی خواہش، باہمی ضد، اپنی نرالی اپج دکھانے کی خواہش، ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش یا مال و جاہ کی طلب ہوتی ہے۔ یہی وہ اسباب تھے جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرز عبادت اور مذہبی مراسم اور نئے نئے نظام حیات ایجاد کرنے کا محرک بنے اور خلق خدا کے ایک بڑے حصے کو دین کی سیدھی اور کشادہ راہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا اور امت کے ٹکڑے کر ڈالے۔

[۱۹] پہلے سے طے شدہ بات یہ ہے کہ انسان کو اختیار دے کر اس دنیا میں اس کا امتحان کیا جائے۔ اور اگر ایسی کرتوتوں کے بدلہ میں ان پر فوراً عذاب نازل کر دیا جائے تو امتحان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انہیں مہلت دی جاتی ہے۔ اور اس امتحان کا آخری وقت ان کی موت ہے۔

[۲۰] ❁ پہلی الہامی کتابیں مشکوک کیسے ہوئیں؟ ان وارثوں کے اپنی الہامی کتابوں کے بارے میں شک میں پڑنے کی کئی وجوہ تھیں جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں کی اصل زبان اور اصل عبارت کو محفوظ رکھ کر آنے والی نسلوں تک نہ پہنچایا گیا۔ اور صرف تراجم سے کام لیا جانے لگا۔ اور ان تراجم کو ہی الہامی کتاب سمجھا جانے لگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بزرگوں کے اقوال اور الحاقی مضامین ان میں شامل کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ ان دونوں قسم کی عبارتوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کی تاریخی سند بھی ضائع کر دی گئی۔ ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ بعد میں آنے والے علماء خود اس کتاب سے شک میں پڑ گئے کہ اس کا کون سا حصہ درست اور الہامی ہے اور کون سی عبارت بزرگوں کے اقوال وغیرہ ہیں۔ اور کسی بات کا صحیح فیصلہ کرنے میں یہی شک و شبہ انہیں اضطراب میں ڈالے رکھتا تھا۔

[۲۱] یعنی آپ پر اب جو وحی کی جا رہی ہے یہ بالکل پاک صاف اور ستھرا دین ہے جو ہر قسم کی آمیزشوں اور آلائشوں سے مبرا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ

اور ان کی خواہشات پر نہ چلیے اور کہہ دیجئے کہ: "میں اس کتاب پر ایمان لایا جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں[۲۲]۔ اللہ ہی ہمارا پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے[۲۳]۔ ہمارے اور تمہارے درمیان[۲۴] کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ہم سب کو (روزِ قیامت) جمع کر دے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ (۱۵) جو لوگ اللہ (کی ہستی) کو تسلیم کر لئے جانے کے بعد اس کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں ان کی حجت ان کے پروردگار[۲۵] کے ہاں

لہٰذا آپ اہلِ کتاب کی سب باتوں سے بے نیاز ہو کر اسی دین پر ڈٹ جایئے اور اس میں کسی قسم کا ردو بدل اور کمی بیشی گوارا نہ کیجئے۔ نہ ان لوگوں سے کسی قسم کا کوئی مذاکرہ یا سمجھوتہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ان کے عزائم خطرناک ہیں۔ ایسے لوگوں کو دو ٹوک فیصلہ سنا دیجئے کہ میں تو صرف وہی بات تسلیم کروں گا جو اللہ نے مجھ پر نازل کی ہے۔

[۲۲] یعنی تمہارے فرقوں میں سے کسی کا جانبدار نہ بنوں بلکہ انصاف پسندی سے کام لیتے ہوئے صرف حق بات کہوں اور حق کا ہی ساتھ دوں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں اس دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں اور اگر تمہارا کوئی جھگڑا میرے پاس آئے تو مجھے یہی حکم ہے کہ میں انصاف کے ساتھ اس کا فیصلہ کروں۔

[۲۳] یعنی تمہارے اعمال کے نہ ہم ذمہ دار ہیں اور نہ ہمیں ان کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر بُرے کام کرو گے تو اس کی سزا ہم نہیں بلکہ تم ہی بھگتو گے اور اگر اچھے کام کرو گے تو اس کا اجر بھی تمہیں ہی ملے گا۔ ہمیں نہیں مل جائے گا۔ یہی صورت حال ہمارے اعمال کی ہے۔ ہمارے بُرے اعمال کے جواب دہ تم نہیں ہو گے۔ نہ ہی ہمارے اچھے اعمال کے تم مستحق بن سکتے ہو۔

[۲۴] ❁ کج بحثی سے اجتناب کا حکم:۔ یعنی جہاں تک معقول دلائل پیش کرنے کا تعلق تھا وہ ہم کر چکے۔ اور اگر تم کج بحثی کرنا چاہو تو اس کے لیے ہم تیار نہیں۔ ہمارا تمہارا اختلاف اور جھگڑا اللہ کے سپرد۔ قیامت کے دن وہ ہمیں اور تمہیں سب کو جمع کرے گا۔ وہاں اللہ تعالیٰ خود ہی انصاف کے ساتھ سب جھگڑوں کا فیصلہ کر دے گا۔

[۲۵] ❁ دحض کا لغوی مفہوم:۔ اس آیت میں حُجَّةٌ کے بجائے دَاحِضَةٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دحض کے مفہوم میں تین باتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) پھسلنا، (۲) کمزور ہونا اور (۳) زائل ہو جانا، اور یہ دحض الرجل سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کہ پاؤں نے ٹھوکر کھائی اور اپنی جگہ سے پھسل گیا اور دَاحِضَةٌ کے معنی میں ایسی دلیل ہے جو حق کے مقابلہ میں اپنے پاؤں پر قائم نہ رہ سکے، پھسل کر کمزور اور زائل ہو جائے، یعنی زائل ہو جانے والی اور بودی دلیل۔

مکہ میں اگر کوئی شخص مسلمان ہو جاتا تو اس کے مشرک دوست اور لواحقین ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے اور اس سے بحثیں اور لڑائی جھگڑے کر کر کے اسے زچ کر دیتے اور اس بات پر مجبور کر دیتے کہ وہ پھر سے اسلام چھوڑ کر ان کے آبائی دین

رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَ
مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍ

باطل ہے ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے۔(۱۶)

اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اور میزان [۲۶] نازل کی ہے۔ اور آپ کو کیا پتا کہ شاید قیامت قریب [۲۷] ہی ہو۔(۱۷) جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لئے جلدی مچاتے ہیں اور جو ایمان لاتے ہیں وہ اس سے ڈرتے [۲۸] ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ایک حقیقت ہے یاد رکھو! جو لوگ قیامت کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں دور تک چلے گئے ہیں (۱۸)

میں شامل ہو جائے۔ یہ تو انفرادی صورت تھی اور اجتماعی صورت یہ تھی کہ کفار کی مخالفت اور اذیت کے باوجود بھی اسلام پھیل رہا تھا اور مسلمانوں کی تعداد میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کافر متحد ہو کر میدان میں اتر آئے تھے اور اس دعوت کو روکنے کے لیے کبھی دھمکی، کبھی لالچ، کبھی سمجھوتہ اور کبھی مکمل بائیکاٹ اور کبھی مذاق و استہزاء اور کبھی فضول قسم کے اعتراضات اور بحثوں کے راستے کھولے جا رہے تھے۔ اس صورت حال کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب سنجیدہ اور عقل مند طبقہ اسلام کے دلائل سے متاثر ہو کر اس کی حقانیت پر ایمان لا چکا ہے اور اللہ کی توحید کو علی وجہ البصیرت تسلیم کیا جا چکا ہے تو اب کافروں کے یہ جھگڑے عبث اور بے کار ہیں۔ یہ جو کچھ بھی چاہیں کر لیں اللہ ان کی سازشوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دے گا اور حق سربلند ہو کے رہے گا۔ البتہ حق کو دبانے کے لیے جتنا زور یہ صرف کر رہے ہیں اتنا ہی اللہ کا غضب ان پر بھڑکتا ہے اور اتنی ہی شدید سزا انہیں دی جائے گی۔

[۲۶] ﷺ اللہ کے میزان اتارنے کے مختلف مفہوم:۔ یعنی اللہ نے صرف حق ہی نازل نہیں فرمایا بلکہ حق معلوم کرنے کا معیار بھی نازل فرمایا اور یہ معیار میزان ہے۔ اللہ نے مادی میزان یا ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں اور علمی ترازو بھی جسے عقل سلیم کہتے ہیں۔ عقل سلیم سرسری نظر میں ہی معلوم کر لیتی ہے کہ حق کس طرف ہے اور باطل کس طرف یا کسی چیز میں حق کا کتنا حصہ ہے اور باطل کا کتنا؟ علاوہ ازیں اخلاقی ترازو بھی ہے یعنی عدل و انصاف کی ترازو۔ اور سب سے بڑی ترازو کتاب و سنت ہے۔ جو خالق و مخلوق کے حقوق و فرائض کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتی ہے جس میں بات پوری تلتی ہے نہ کم نہ زیادہ۔

[۲۷] یعنی شریعت کے ترازو میں رکھ کر اپنے اعمال کا خود ہی محاسبہ کر لو۔ کیا معلوم کہ قیامت کی گھڑی قریب ہی آ گئی ہو۔ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اچھے اعمال بجا لانے میں جلدی کر لو۔

[۲۸] یعنی جو لوگ عذاب آخرت اور قیامت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور بار بار پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ روز آخرت اور اعمال کی باز پرس پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا تو کبھی عذاب کے لیے جلدی نہ مچاتے۔ اور جو لوگ روز آخرت پر اور اعمال کی جوابدہی پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ تو اپنے محاسبہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور یقین نہ

بَعِيْدٍ ﴿۱۸﴾ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ
حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان[۲۹] ہے جسے (جتنا) چاہتا ہے رزق دیتا[۳۰] ہے اور وہ طاقتور اور زبردست ہے۔(۱۹) جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کی کھیتی بڑھا[۳۱] دیتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں

رکھنے والوں کو چونکہ اپنے اعمال کے محاسبہ کا کچھ خوف نہیں ہوتا اس لیے وہ گناہ کے کاموں پر دلیر ہوتے ہیں اور حق اور عدل و انصاف کی راہ سے ہٹ کر اپنی سرکشی اور گمراہی میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

[۲۹] ❁ لطیف کا مفہوم:۔ لطیف کا معنی عموماً مہربان کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا معنی اردو میں کسی ایک لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے مادہ لطف کے بنیادی معنی میں دو باتیں پائی جاتی ہیں (۱) دقت نظر، (۲) نرمی، (مقاییس اللغۃ) اور لطیف کے معنی میں کبھی صرف ایک ہی بات یعنی دقت نظر یا باریک بینی یا ازیا چھوٹی چھوٹی جزئیات تک سے آگاہی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسے ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ (۶:۱۰۳) میں ہے۔ اور کبھی دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے اس مقام پر دونوں چیزیں موجود ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی چھوٹی چھوٹی اور رتی رتی تکالیف کا علم اور اس کی خبر بھی رکھتا ہے پھر از راہ مہربانی ان کا ازالہ بھی کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے بندوں کی چھوٹی چھوٹی حاجات اور ضروریات کا خیال رکھتا ہے پھر از راہ مہربانی انہیں پورا بھی کرتا رہتا ہے۔

[۳۰] یعنی اللہ تعالیٰ کا لطف تو عام ہے جو بندوں کو یکساں پہنچ رہا ہے۔ لیکن رزق میں معاملہ اس سے الگ ہے۔ وہ ہر ایک کو یکساں نہیں ملتا۔ بلکہ اپنی حکمت کے پیش نظر کسی کو زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو کم یہ اس کی مشیت پر منحصر ہے۔ البتہ ہر ایک کو دیتا ضرور ہے۔ جتنا رزق اس نے کسی کے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ کوئی طاقت یا کوئی ہستی اس کی مقدار کو نہ بڑھا سکتی ہے اور نہ اس کا رزق کم کر سکتی یا روک سکتی ہے۔ کیونکہ وہ خود سب سے بڑھ کر طاقتور اور زبردست ہے۔

[۳۱] ❁ ایک دنیادار اور دیندار کے انجام کا موازنہ:۔ اس آیت میں دو آدمیوں کے طرز زندگی کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک تو روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا اس سے منکر ہے اور سب کچھ اسی دنیا کو ہی سمجھتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص جو کام بھی کرے گا آخرت کے لیے کرے گا اور آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دے گا۔
ایسا شخص جو کچھ بھی اس دنیا کی کھیتی میں آخرت کے دن پھل کاٹنے کے لیے بوئے گا اللہ تعالیٰ اس میں بہت زیادہ اضافہ کر دے گا۔ جیسا کہ اس دنیا میں غلہ کا ایک دانہ بیجنے سے بعض دفعہ سات سو سے بھی زیادہ دانے حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اس کی آخرت کا معاملہ تھا۔ اور دنیا میں جتنا رزق یا جتنی بھلائی اس کے مقدر میں ہے وہ بھی اسے مل کے رہے گی۔ اس کے مقابلہ میں جو شخص روز آخرت کا منکر ہے اور بس دنیا ہی دنیا کا مال اور بھلائی چاہتا ہے۔ وہ خواہ کتنی ہی کوشش کر دیکھے اسے اتنی ہی دنیا ملے گی جتنی اس کے مقدر میں ہے اس سے زیادہ نہیں۔ رہا اس کی آخرت کا معاملہ تو اگر اس نے دنیا میں کچھ نیک کام کئے بھی ہوں گے تو ان کا اسے کچھ بدلہ نہ ملے گا کیونکہ وہ کام اس نے اس نیت سے کیے ہی نہیں تھے کہ ان کا آخرت میں اسے کچھ بدلہ ملے، نہ ہی اس کا آخرت پر کچھ یقین تھا۔

الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ
وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ
رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾
ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ

اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔(۲۰)

کیا ان لوگوں کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کا ایسا طریقہ مقرر کیا ہو جس کا اللہ نے اِذن[۳۲] نہیں دیا؟ اور اگر فیصلے کی بات طے شدہ نہ ہوتی تو ان کا فیصلہ کر دیا گیا ہوتا۔ یقیناً ان ظالموں کے لئے[۳۳] دردناک عذاب ہے۔(۲۱) (اس دن) آپ دیکھیں گے کہ یہ ظالم اپنے اعمال سے ڈر رہے ہوں گے مگر وہ (عذاب) ان پر واقع ہو کے رہے گا اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے۔ اپنے پروردگار کے ہاں جو چاہیں گے، انہیں ملے گا۔ یہی بہت بڑا فضل ہے۔(۲۲)

یہی وہ فضل ہے جس کی اللہ اپنے ان بندوں کو بشارت دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ آپ ان سے کہئے کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا البتہ قرابت کی محبت[۳۴] ضرور چاہتا ہوں۔

[۳۲] ❁ اللہ کے مقابلہ میں کن کن لوگوں کا حکم چلتا ہے؟:۔ ظاہر ہے کہ یہاں شریک سے مراد پتھر کے بت نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ نہ سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں وہ کسی کو کوئی قانون یا ضابطہ کیا دیں گے؟ لامحالہ اس سے مراد، انسان یا انسانوں کی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ جنہوں نے اللہ کی شریعت کے مقابلہ میں اپنی شریعت چلا رکھی ہو۔ حرام و حلال کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہوں یا لوگوں کے لیے وہ ضابطہ حیات، فلسفے یا نظام پیش کرتے ہوں جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہوں اور پھر انہیں لوگوں میں رائج اور نافذ بھی کرتے ہوں۔ اور ایسے لوگ پارلیمنٹ یا ایوانوں کے ممبر بھی ہو سکتے ہیں۔ خودسر حکمران بھی، آستانوں اور مزاروں کے متولی اور مجاور بھی اور گمراہ قسم کے فلاسفر اور مصنف بھی۔ انہیں ہی طاغوت کہا جاتا ہے۔

[۳۳] یعنی اللہ ایسے باغیوں کے بارے میں عفو و درگزر سے کام لیے جاتا ہے اور انہیں فوراً تباہ نہیں کر دیتا۔ جس کی وجہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو دیئے ہوئے اختیار کو اضطرار میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ہر انسان کو اختیار دے کر ہی اس دنیا میں آزمانا چاہتا ہے۔ البتہ جب یہ اختیار کا عرصہ ختم ہو جائے گا اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو پھر ایسے ظالموں کو ان کی ساری کرتوتوں کی دردناک سزا دی جائے گی۔

[۳۴] ❁ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے مختلف مفہوم:۔ اس جملہ کی کئی تفسیریں بیان کی گئی ہیں مگر بہترین تفسیر وہی ہے جو صحیحین میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور وہ یہ ہے:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی﴾ کا کیا مطلب ہے؟ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے (جھٹ) کہا

فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى

اور جو کوئی نیکی کمائے گا ہم اس کے لئے اس میں خوبی[۳۵] کا اضافہ کر دیں گے بلاشبہ اللہ معاف کرنے والا اور قدر دان ہے۔(۲۳) کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے؟

دیا کہ اس سے آپ ﷺ کی آل مراد ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہنے لگے: تم جلد بازی کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ قریش کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس سے آپ ﷺ کی کچھ نہ کچھ قرابت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ انہیں کہیے کہ اگر تم اور کچھ نہیں کرتے (مسلمان نہیں ہوتے) تو کم از کم قرابت ہی کا لحاظ رکھو۔ (اور مجھے ایذائیں دینا چھوڑ دو) (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اس کی دوسری تفسیر یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہاں قُرْبٰی سے مراد قرب یا تقرب ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے اس کام پر اس بات کے سوا کوئی اجر نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قرب کی محبت پیدا ہو جائے۔ یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ اور اللہ سے محبت کرنے لگو۔ بس یہی میرا اجر ہے۔

تیسرا گروہ اس آیت میں قُرْبٰی سے مراد اقارب لیتا ہے۔ پھر ایک فریق تو اس محبت کو بنی عبدالمطلب سے محبت مراد لیتا ہے۔ اور دوسرا سیدنا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے۔ یہ تفسیر درج ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔

❁ مودۃ فی القربیٰ سے شیعہ حضرات کا استدلال اور اس کا جواب:۔ ۱۔ آپ ﷺ کی والدہ اور آپ ﷺ کی زوجہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے آپ ﷺ کی رشتہ داری صرف بنو عبدالمطلب سے ہی نہیں تھی۔ بلکہ تقریباً قریش کے سب قبیلوں سے تھی اور بنی عبدالمطلب میں سے کچھ لوگ آپ ﷺ کے حق میں تھے اور کچھ سخت دشمن بھی تھے۔ اور ابولہب کی آپ سے دشمنی تو سب ہی جانتے ہیں۔ یہی حال قریش کے باقی قبیلوں کا تھا۔ لہٰذا اس تخصیص کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۲۔ قُرْبٰی سے مراد سیدہ فاطمہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد لینا اس لحاظ سے غلط ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہی مدینہ جانے کے بعد ہوا تھا۔

۳۔ اور اس تفسیر کے غلط ہونے کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا مطالبہ کرنا کہ میں تم سے اس تبلیغ کے کام کا اس کے سوا کوئی اجر نہیں مانگتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو، رسول اللہ ﷺ کی شان رفیع کے مقابلہ میں یہ مطالبہ انتہائی گھٹیا اور فروتر ہے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ وہ مطالبہ بھی کافروں سے ہو۔ کافروں سے بھلا اجرت کے مطالبہ کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجرت تو اس سے طلب کی جا سکتی ہے جسے وہ کام پسند آئے اور کافر تو اس تبلیغ کے کام کی وجہ سے آپ کی جان کے لاگو بنے ہوئے تھے۔ ان سے بھلا کوئی ایسا مطالبہ کیا جا سکتا تھا؟

البتہ یہ واضح رہے کہ آپ کے اہل بیت ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپ کی بیٹیوں اور دوسرے تمام اقارب سے محبت رکھنا جن میں سیدہ فاطمہ سیدنا علی اور ان کی اولاد بھی شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت و تعظیم اور حقوق شناسی کے لحاظ سے اہل ایمان کے لیے ضروری ہے اور ان سے درجہ بدرجہ محبت رکھنا حقیقت میں آپ ﷺ سے محبت ہی کا تقاضا ہے۔ اور ایسی محبت کا تقاضا مسلمانوں سے تو کیا جا سکتا ہے، کافروں سے نہیں جبکہ اس آیت میں روئے سخن کافروں سے ہے۔

[۳۵] یعنی جو نیک بننا چاہتا ہے اللہ اسے اور زیادہ نیک بنا دیتا ہے۔ اس کے کام میں اگر کچھ کوتاہیاں رہ گئی ہوں تو انہیں معاف کر دیتا ہے اور جو کچھ بھی وہ نیک اعمال بجا لاتے ہیں ان کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انہیں زیادہ اجر فرماتا ہے۔

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ

پس اگر وہ چاہتا تو آپ کے دل پر[۳۶] مہر کر دیتا اور اللہ تو باطل کو مٹاتا اور اپنے کلمات[۳۷] سے حق کو حق ثابت کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ دلوں کے راز تک[۳۸] جانتا ہے(۲۴) وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور (ان کی) برائیوں کو معاف کرتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو[۳۹] وہ اسے جانتا ہے(۲۵) اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان کی دعا قبول کرتا ہے[۴۰] اور اپنے فضل سے انہیں زیادہ بھی دیتا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کیلئے

[۳۶] ایک عام آدمی پر بھی ایسا الزام لگانا شدید جرم ہے مگر یہ لوگ اس قدر بے باک ہو گئے ہیں کہ آپ ﷺ پر بھی الزام لگانے سے نہیں چوکتے اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن اس نے خود ہی تصنیف کر ڈالا ہے۔ یہ بدبخت آپ ﷺ کو بھی اپنے ہی جیسا سمجھتے ہیں اور اللہ ایسے ہی بدبختوں کے دلوں پر مہر لگا دیا کرتا ہے۔ اور اگر ان کا الزام درست ہوتا تو اللہ آپ کے دل پر بھی مہر لگا دیتا۔ آپ کے دل پر مہر نہ لگنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہی بدبخت جھوٹے اور الزام تراش ہیں۔

[۳۷] یعنی اللہ تعالیٰ باطل کو کبھی پائیداری نصیب نہیں کرتا اور وہ سرنگوں ہو کے رہتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق از خود ثابت اور برقرار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ ان کے اس الزام کی مطلق پروا نہ کریں عنقریب ان کا یہ الزام اور جھوٹ واضح ہو جائے گا اور حق نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ اللہ کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔

[۳۸] یعنی آپ کو جھٹلانے اور آپ پر اس طرح کے گھناؤنے الزام لگانے کی تہ میں جو ان کے ذاتی مفادات مضمر ہیں اور جن کی وجہ سے یہ ایسے کام کرتے ہیں اللہ انہیں خوب جانتا ہے۔

[۳۹] ❁ توبہ کی شرائط:۔ یہ خطاب صرف ایمانداروں سے نہیں بلکہ ان کافروں کو بھی شامل ہے جو آپ ﷺ پر الزام تراشیاں کرتے تھے۔ اس آیت میں انہیں اپنے انہی بداعمالیوں سے توبہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ کافروں کی توبہ اسلام لانا ہے۔ اسلام لانے سے ہی ان کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اس کا خطاب ایمانداروں سے ہو تو توبہ کی شرائط اپنے گناہ پر نادم ہونا، پھر اللہ کی طرف رجوع اور توبہ استغفار کرنا اور آئندہ اس کام کو مطلقاً چھوڑ دینے کا عہد کرنا ہے۔ توبہ کی سب سے اہم شرط یہی ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے یہ کام چھوڑا جائے۔ اور کوئی شخص کسی دوسری وجہ سے کوئی گناہ کا کام چھوڑ دے تو اس پر توبہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ مثلاً کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ شراب اس کی صحت تباہ کر رہی ہے اور وہ اپنے کیے پر نادم بھی ہو تا اور آئندہ کے لیے شراب نوشی ترک کر دے تو اس پر توبہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی طرح کوئی زانی اپنے اس فعل پر نادم ہو اور یہ فعل آئندہ کے لیے ترک کر دینے کا عہد کرے کہ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور زنا کے قابل ہی نہیں رہا۔ تو یہ اس کی توبہ نہ ہوگی۔ اور اللہ کو تو معلوم ہے کہ کوئی کس نیت سے توبہ کر رہا ہے۔

[۴۰] ❁ دعا کی قبولیت کے لئے نیک اعمال کی شرط:۔ دعا کی قبولیت کے لیے نیک اعمال کی شرط لگائی۔ ان نیک اعمال میں کسب حلال بہت بڑا نیک عمل ہے۔ کیونکہ اگر انسان کی کمائی حلال نہ ہوگی تو اس کی دعا قبول نہ ہوگی جیسا کہ آپ نے فرمایا: "ایک شخص

عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلٰكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ بِعِبَادِهٖ خَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۚ وَهُوَ

سخت عذاب ہے۔(۲۶)اور اگر اللہ اپنے سب بندوں کو وافر رزق عطا کر دیتا تو وہ زمین میں سرکشی سے اودھم[۴۱] مچا دیتے۔ مگر وہ ایک اندازے سے جتنا رزق چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، انہیں دیکھ رہا ہے۔(۲۷)وہی تو ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت عام کر دیتا ہے اور وہی کارساز[۴۲] ہے،

دور سے آتا ہے پریشان حال اور پراگندہ بال ہے، اور اگر کعبہ کا غلاف پکڑ کر کہتا ہے کہ یارب، یارب میری دعا قبول فرما۔ مگر اس کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے جبکہ اس کا کھانا حرام پینا حرام اور گوشت پوست بھی حرام کمائی سے بنا ہو"(مسلم۔ کتاب الزکوۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علیٰ کل نوع من المعروف)

[۴۱] ❁ رزق کی کمی بیشی میں اللہ کی حکمتیں:۔ پنجابی زبان کی ایک مختصر سی مثال اس آیت کے مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے۔ مثال یہ ہے "رج آون تے کد آون" یعنی ایک عام دنیادار انسان کی عادت یہ ہے کہ اگر اللہ اسے خوشحالی سے ہمکنار کرے تو وہ کسی کو بھی حتیٰ کہ اللہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور سرکشی کی راہ اختیار کرتا ہے یہی صورت حال سردارانِ قریش کی تھی جو دیہاتی قبائل عرب کی نسبت خوشحال تھے اور اسی خوشحالی نے ان کے دماغوں کو خراب کر رکھا تھا اور اس آیت میں بتایا یہ گیا ہے کہ اگر اللہ سارے ہی لوگوں کو وافر رزق عطا کر دے تو اس سے اس کے خزانوں میں تو کچھ کمی نہ آئے گی۔ لیکن لوگ دولت کی مستی میں ہر جگہ اودھم مچا دیں گے۔ اور ایک دوسرے کا جینا بھی حرام کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اپنے اندازے اور اپنی حکمت کے مطابق رزق مہیا کرتا ہے۔ تاکہ لوگ اپنے آپے سے باہر نہ ہوں اور دنیا کا نظام بھی ٹھیک طور پر چلتا رہے۔ امیر کام لینے کے لیے غریبوں کے محتاج رہیں اور غریب امیروں کے۔

[۴۲] ❁ بارش اور مصنوعی آبپاشی کا تقابل:۔ زمین کو سیراب کرنے کا کام اگرچہ مصنوعی طریقوں سے یعنی کنوئیں، چشمے، نہریا ٹیوب ویل کے پانی سے بھی چلا لیا جاتا ہے مگر ایک تو اس پر محنت اور خرچ بہت اٹھتا ہے دوسرے اس کے خوشگوار اثرات بارش کی نسبت بہت کمتر ہوتے ہیں۔ مصنوعی طریق آبپاشی کو اللہ کی رحمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ کی رحمت بارش ہے اور یہ ایک نہیں بے شمار نعمتوں جیسی نعمت ہے۔ پہلے راحت بخش اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ جو انسان کو فطری سرور بخشتی ہیں اور اس کی مایوسی کو دور کرتی ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو اس سے موسم میں خوشگوار تغیر آ جاتا ہے۔ درختوں پر سے گرد و غبار دھل جاتا ہے۔ مصنوعی آبپاشی کی طرح بارش کسی مخصوص قطعہ زمین میں نہیں ہوتی بلکہ وسیع رقبہ میں ہوتی ہے۔ جس سے صرف انسان ہی نہیں اللہ کی ساری مخلوق فیض یاب ہوتی ہے۔ پھر اس پر نہ کچھ لاگت آتی ہے نہ محنت صرف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مصنوعی آبپاشی کی صورت میں بھی پانی کے سب ذخیرے بارش ہی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ لہٰذا اور اصل بارش ہی وہ اصل نعمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کی حاجات پوری کرتا ہے۔ اور ولی کا لفظ یہاں یہی معنی دے رہا ہے۔ اور حمید اس لحاظ سے کہ تمام مخلوق اس کی رحمت سے فیض یاب ہو کر اس کے گن گانے لگتی ہے۔

الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي
جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾
وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ښ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ

حمد کے لائق ہے۔(۲۸) اور اس کی نشانیوں میں ایک نشانی اس کا آسمانوں، زمین اور ان جانداروں کا پیدا کرنا ہے جو اس نے ان میں [۴۳] پھیلا دیئے ہیں اور وہی جب چاہے [۴۴] انہیں اکٹھا کر لینے پر بھی قادر ہے۔(۲۹) اور تمہیں جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اپنے ہی کرتوتوں [۴۵] کے سبب سے آتی ہے اور وہ تمہارے بہت [۴۶] سے گناہوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے(۳۰) اور نہ تم اسے زمین عاجز کر سکتے ہو (کہ تمہیں سزا نہ دے سکے) اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔(۳۱)

[۴۳] اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں میں اللہ کی بے شمار مخلوق موجود ہے۔ جن میں فرشتے سرفہرست ہیں اور درمیانی فضا میں بھی۔ اور اگر آسمانوں اور زمین سے مراد پوری کائنات لی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاندار مخلوق صرف زمین پر ہی موجود نہیں بلکہ اور بھی کئی اجرام میں موجود ہے۔ جس کا انسان کو تاحال علم نہیں ہو سکا۔

[۴۴] یعنی اگر وہ اپنی مخلوق مثلاً انسان کو تمام روئے زمین پر بکھیر سکتا ہے تو پھر انہیں اکٹھا بھی کر سکتا ہے اور اکٹھا کر کے اپنے حضور حاضر بھی کر سکتا ہے۔

[۴۵] ❁ مصائب کی قسمیں اور مختلف اسباب:۔ یہاں ایک عام اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ اکثر عذاب مثلاً قحط، وبائیں، زلزلے اور سیلاب وغیرہ لوگوں کے اپنے ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک قحط کا عذاب اہل مکہ پر بھی نازل ہوا تھا۔ جو سات سال تک مسلط رہا۔ بارشیں بھی بند ہو گئیں اور باہر سے غلہ آنا بھی بند ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں لوگوں کا یہ حال ہو گیا کہ جانوروں کے چمڑے اور ہڈیاں کھانے تک مجبور ہو گئے۔ شدت بھوک کی وجہ سے یہ حال ہو رہا تھا کہ آسمان کی طرف دیکھتے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ اور یہ قحط کفار مکہ پر رسول اللہ ﷺ کی دعا کی وجہ سے نازل ہوا تھا۔ آخر ابو سفیان نے آپ ﷺ کے پاس آکر قرابت کا واسطہ دیا اور بارش کے لئے دعا کرنے کی درخواست کی تو آپ ﷺ کی دعا سے یہ مصیبت دور ہوئی۔ گویا جب اکثر لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب آتا ہے تو وہ سب مخلوق کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ انسان کو اکثر بیماریاں غذا میں بدپرہیزی کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں اور دودھ پیتے بچوں کو ماں کی بدپرہیزی کی وجہ سے۔ تاہم اس اصول میں بھی چند مستثنیات موجود ہیں۔ مثلاً ایماندار بندوں پر جو تکلیفیں آتی ہیں وہ ان کی شامت اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مومن کو اگر ایک کانٹا بھی چبھے تو وہ بھی کسی خطا کا کفارہ بن جاتا ہے۔ پھر مصیبتوں اور تکلیفوں کی ایک قسم وہ ہے جو اللہ کے پیغمبروں اور مخلص بندوں کو حق کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ ان کے متعلق گناہوں کے کفارہ کا تصور ہی غلط ہے۔ ان کے ذریعہ تو اللہ تعالیٰ ان بزرگ ہستیوں کے درجات بلند کرتا ہے اور ایسے مصائب سب سے زیادہ اللہ کے نبیوں کو پھر درجہ بدرجہ دوسرے مخلص بندوں کو پیش آتے ہیں۔

[۴۶] یعنی اگر اللہ بندوں کے سب بُرے اعمال کے بدلے ان پر مصائب نازل کرتا تو وہ چند دن بھی جی نہ سکتے تھے۔ یہ تو اللہ کی

الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَىٰ ظَهْرِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ
لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۳۳﴾ أَوْ يُوبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَن كَثِيرٍ ﴿۳۴﴾ وَيَعْلَمَ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ
فِي آيَاتِنَا مَا لَهُم مِّن مَّحِيصٍ ﴿۳۵﴾ فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِندَ اللَّهِ

اور اس کی نشانیوں میں ایک وہ کشتیاں ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح (نظر آتی ہیں) (۳۲) اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے اور وہ کشتیاں سطح سمندر پر کھڑی کی کھڑی [۴۷] رہ جائیں۔ اس میں بھی ہر صبر کرنے والے اور شکر گزار کیلیے [۴۸] کئی نشانیاں ہیں (۳۳) یا ان کے برے اعمال کے سبب کشتیوں کو تباہ [۴۹] کر دے اور وہ بہت سے لوگوں کو معاف ہی کر دیتا ہے (۳۴) اور ان لوگوں کو جو ہماری آیات میں جھگڑا کرتے ہیں [۵۰] یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔ (۳۵) تمہیں جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا ساز و سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر [۵۱]

رحمت ہے کہ وہ اکثر گناہوں پر مؤاخذہ ہی نہیں کرتا ورنہ یہ زمین بھی انسانوں سے بے آباد ہو جاتی۔

[۴۷] قرآن میں اکثر مقامات پر کشتیوں کی روانی کو اللہ کی آیات میں شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ قریش مکہ کو تجارتی سلسلہ میں افریقہ کے ساحلی علاقہ سے تجارت کے لیے بحیرہ احمر کا سفر در پیش رہتا تھا۔ اس دور میں بادبانی کشتیاں ہوتی تھیں جن کی روانی اور رفتار کا انحصار باد موافق پر اور اس کی رفتار پر ہوتا تھا۔ انہیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ تمہاری بے بسی کا یہ عالم ہے کہ جب تمہاری کشتی وسط سمندر میں پہنچ جائے اور اللہ تعالیٰ ہوا کو ساکن کر دے تو بتاؤ اس وقت تم کیا کر سکتے ہو؟

[۴۸] صبار اور شکور دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور یہ دو ایسے الفاظ ہیں جن میں مومن کی ساری زندگی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی مومن پر جب بھی کوئی مصیبت یا تکلیف آتی ہے تو وہ صبر اور برداشت سے کام لیتا ہے۔ اور جب بھی اللہ کی کوئی نعمت ملتی ہے یا اسے بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کا احسان مند ہوتا اور اس کا شکر ادا کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک کافر اور دنیادار انسان کا یہ وطیرہ ہوتا ہے کہ مصیبت پڑنے پر جزع فزع کرتا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر اسے کوسنے لگتا ہے۔ اور جب اسے کوئی بھلائی نصیب ہوتی یا خوشحالی کا دور آتا ہے تو پھر وہ اللہ کو بھول ہی جاتا ہے۔ گویا ایک مومن کو سمندر کے سفر میں صبر اور شکر کا اکثر موقع ملتا رہتا ہے۔ وہ سازگار حالات میں اللہ کا شکر کرتا ہے اور اگر ہوا بند ہو جائے تو اس کی نظر اللہ ہی پر رہتی ہے اور صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔

[۴۹] یعنی ہوا کو ایک دو دن کے لیے ساکن اور بند ہی رہنے دے یا باد مخالف چلا دے یا کشتی کو بھنور میں پھنسا دے یا سمندر کی تلاطم خیز موجوں سے دوچار کر دے اور کشتی کو ڈبو کر تباہ کر دے تو اس کا سبب کشتی پر سوار لوگوں کی بداعمالیاں ہی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی بہت بداعمالیوں سے تو درگزر ہی کر جاتا ہے۔

[۵۰] یعنی اللہ کی آیات میں جھگڑا کرنے والے منکرین کو اس دنیا میں بھی ایسا حادثہ پیش آ سکتا ہے کہ کوئی جائے پناہ کہیں نہ مل سکے جیسے مثلاً سمندری سفر میں۔ آخرت میں تو یہ لوگ اور بھی زیادہ بے بس اور لاچار ہوں گے۔

[۵۱] یعنی دنیا میں جتنا بھی مال و دولت اور سامان عیش و عشرت کسی کو مل جائے۔ اس سے وہ زیادہ سے زیادہ اپنی موت تک فائدہ اٹھا

خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ
الْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

اور باقی رہنے والا ہے وہ ان لوگوں کیلئے ہے جو ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر بھروسہ[۵۲] کرتے ہیں۔(۳۶) اور جو بڑے بڑے گناہوں[۵۳] اور بے حیائی[۵۴] کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آئے تو معاف کر دیتے[۵۵] ہیں(۳۷) اور جو اپنے پروردگار کا حکم مانتے اور نماز قائم کرتے ہیں

سکتا ہے۔ بالآخر اسے بالکل خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہونا ہوگا۔ اس کے مقابلہ میں ایمانداروں کو جو آخرت میں سامان عیش و عشرت ملے گا۔ وہ سامان بھی لافانی اور لازوال ہوگا اور ایماندار لوگ ان اشیاء سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ لہٰذا عقلمند انسان وہ ہے جو ناپائیدار اور فنا ہونے والے سامان کے بجائے دائمی اور پائیدار زندگی اور اس کے سامان کی فکر کرے۔

[۵۲] ❁ توکل کا معنی اور یہ مومن کی اہم صفت ہے:۔ یعنی جب ظاہری اسباب مفقود نظر آ رہے ہوں، حالات مایوس کن ہوں۔ اس حال میں بھی وہ مایوس اور شکستہ دل نہیں ہو جاتے بلکہ اس حال میں بھی ان کی آنکھ اللہ کی طرف لگی رہتی ہے اور وہ اللہ کے وعدہ پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ضرور اس مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا کر دے گا اور اسی کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ان کے پاس ظاہری سامان موجود بھی ہو تو وہ اس پر بھروسا نہیں کرتے بلکہ ان کا بھروسا اللہ کی ذات پر ہی ہوتا ہے۔ گویا ظاہری اسباب موجود ہوں یا مفقود، تھوڑے ہوں یا زیادہ، مومن آدمی ان اسباب کو فراہم کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے مگر اس کا ان اسباب پر تکیہ نہیں ہوتا۔ تکیہ اللہ کی ذات پر ہی ہوتا ہے گویا اللہ پر توکل ایک مومن کی نہایت اہم صفت ہے جسے اللہ نے سب سے پہلے بیان فرمایا۔ اسی طرح اللہ پر عدم توکل ایک مسلمان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ جنگ حنین کے موقعہ پر ہر مسلمان ظاہری اسباب اور اپنی کثرت تعداد پر نازاں ہوئے تو اللہ نے انہیں عارضی طور پر شکست سے دوچار کر کے فوراً انہیں اس کمزوری پر متنبہ کر دیا۔ توکل کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ بس انسان اللہ پر توکل کر کے بیٹھ جائے۔ اور ظاہری اسباب کی فکر ہی چھوڑ دے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ حتی الامکان ظاہری اسباب مہیا کرے اور اپنی مقدور بھر کوشش بھی کرے پھر اس کے انجام کو اللہ کے سپرد کر دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے توکل کی تعریف یوں فرمائی کہ پہلے اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھ پھر توکل کر۔ (طبرانی۔ بروایت ابوہریرہ بحوالہ الموافقات للشاطبی، ج ۱ ص ۲۹۰) اور کسی شاعر نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

توکل کے یہ معنی ہیں کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

[۵۳] بڑے بڑے گناہوں کی تفصیل کے لیے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۱ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے

[۵۴] ❁ فحاشی اور اس کا دائرہ:۔ فحاشی سے مراد ہر وہ کام ہے جو انسان کی قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اسلام نے جنسی چھیڑ چھاڑ اور حاجت پوری کرنے کے لیے شرعی نکاح کی راہ کھول دی ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی طریقے ممکن ہیں ان سب پر پابندی لگا

دی ہے۔ مثلاً زنا، اغلام، لواطت، مشت زنی، عورتوں کی عورتوں سے ہمبستری۔ جانوروں سے بدفعلی وغیرہ۔ سب حرام اور بدترین جرم ہیں۔ اور ان سب کو ﴿فَاحِشَةٌ مُّبِيِّنَةٌ﴾ کہا جاتا ہے اور جو باتیں زنا سے قریب لے جانے والی ہیں وہ سب فواحش میں داخل ہیں۔ مثلاً بدنظری یا غیر محرم کی طرف دیکھنا، عورتوں کا اپنی زینت اور حسن کے مقامات کی کھلے بندوں نمائش کرنا۔ آزادانہ اختلاط مرد وزن، فحش گالی گلوچ، غیر مرد اور غیر عورت کی خلوت، یا عورتوں کا بغیر محرم کے سفر کرنا وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں فحش قسم کی خبروں کو پھیلانا بھی فحاشی میں داخل ہے آج کل فحاشی کی اشاعت کی اور بھی بہت سی صورتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ مثلاً تھیٹر، سینما گھر، کلب ہاؤس، ہوٹل، ریڈیو پر زہد شکن گانے، ٹی وی پر شہوت انگیز پروگرام، فحاشی پھیلانے والا لٹریچر، ناول، افسانے اور ڈرامے وغیرہ اخبارات واشتہارات وغیرہ میں عورتوں کی عریاں تصاویر۔ غرضیکہ فحاشی کی اشاعت کا دائرہ آج کل بہت وسیع ہو چکا ہے۔ ایمانداروں کا کام یہ ہے کہ ایسے فحاشی کے سب کاموں سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بچنے کی تلقین کریں۔

[۵۵] غصہ اور اس کا جائز استعمال:۔ اس جملہ میں قوت غضبیہ پر کنٹرول میں رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ غصہ میں عموماً آدمی کی عقل پر جذبات غالب آجاتے ہیں اور بعض دفعہ وہ ایسی غلط حرکتیں کر بیٹھتا ہے جن پر اسے بعد میں سخت ندامت ہوتی ہے۔ مومن کی سرشت انتقامی نہیں ہوتی وہ اپنی ذات سے متعلق انتقام کے معاملہ میں اللہ سے ڈر کر درگزر اور چشم پوشی سے کام لیتے ہیں اور اگر کسی بات پر غصہ آجائے تو اسے پی جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ غصہ اتنی بری چیز نہیں کہ انسان کو کسی وقت بھی نہ آئے بلکہ جہاں دین کی تضحیک ہو رہی ہو اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جا رہا یا خلاف شرع کام ہو رہا ہو وہاں انسان کو غصہ آنا ہی چاہیے۔ غصہ اگر کلیتاً بری ہی چیز ہوتی تو اللہ اسے پیدا ہی نہ کرتا۔ اسے ہم دوسرے الفاظ میں دینی حمیت یا غیرت بھی کہہ سکتے ہیں اور ایسے مقام پر غصہ بعض دفعہ بڑے بڑے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا غصہ ایسا ہی تھا۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "اللہ کی قسم! آپ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا جب وہ آپ کے سامنے لایا گیا۔ البتہ اگر کسی نے اللہ کی قابل احترام باتوں کی توہین کی تو آپ نے اللہ کے لیے اس سے بدلہ لیا" (بخاری۔ کتاب الحدود۔ باب اقامۃ الحدود والانتقام لحرمات اللہ) اور آپ ﷺ کو جب غصہ آیا تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا جیسے کسی نے چہرہ پر انار نچوڑ دیا ہو مثلاً فاطمہ مخزومی قریشی کی چوری کا مقدمہ پیش ہوا تو قریشیوں نے سیدنا اسامہ بن زید کو سفارش کے لیے کہا۔ سیدنا اسامہ نے سفارش کی تو آپ ﷺ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا: "اسامہ! تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو؟" (بخاری۔ کتاب الحدود۔ باب کراھیة الشفاعة فی الحد۔۔۔۔۔۔۔۔) اسی طرح ایک دفعہ سیدنا معاذ بن جبل ؓ نے عشا کی نماز میں سورہ بقرہ شروع کر دی ایک دیہاتی نے نماز توڑ کر اپنی الگ نماز پڑھ لی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو جب یہ بات پہنچی تو آپ ﷺ سیدنا معاذ پر سخت ناراض ہوئے اور تین بار فرمایا: "افتان انت یامعاذ؟ معاذ کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہو؟" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب من لم یر اکفار من قال ذلك متاولا او جاھلا) اور ایسی اور بھی مثالیں بہت ہیں۔

غصہ کو ضبط کرنے کا حکم:۔ رہا ذاتی انتقام کا مسئلہ تو اس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو کسی کو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ کو ضبط میں رکھے" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب الحذر من

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ

اور ان کے کام باہمی مشورہ[56] سے طے پاتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔(۳۸)

اور جب ان پر زیادتی[57] ہوتی ہے تو وہ بدلہ لے لیتے ہیں(۳۹)

الغضب) نیز سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ: مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "غصہ مت کیا کر۔ اس نے دوبارہ، سہ بارہ یہی بات پوچھی تو آپ ﷺ ہر بار یہی کہتے رہے کہ غصہ مت کیا کر" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب الحذر من الغضب)

[56] مشورہ اور اس کے متعلقات:۔ مشورہ سے متعلق قابل ذکر امور یہ ہیں:

(۱) مشورہ انفرادی امور میں کیا جاسکتا ہے جیسا کہ آپ نے واقعہ افک کے دوران کئی صحابہؓ سے مشورہ لیا اور اجتماعی امور میں بھی جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے۔

(۲) مشورہ صرف اسی سے لینا چاہئے جو مشورہ دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ہر کس و ناکس سے نہ مشورہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کوئی لیتا ہے۔ اجتماعی امور میں مومنوں کا امیر مجلس شوریٰ منتخب کرتا ہے اور اس سے مشورہ لیتا ہے۔

(۳) مشورہ صرف ایسے امور میں کیا جاسکتا ہے۔ جہاں کتاب و سنت میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو۔ اور اس کا تعلق بالعموم تدبیری امور سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے اسارٰی بدر کے معاملہ میں صحابہ سے مشورہ کیا تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا جنگ احد کے متعلق یہ مشورہ کیا تھا کہ یہ جنگ مدینہ میں رہ کر لڑی جائے یعنی صرف مدافعت کی جائے یا کھلے میدان میں لڑی جائے۔

(۴) مشورہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ کے سب پہلو سامنے آجائیں۔ اور جو پہلو اقرب الی الحق ہو اسے اختیار کیا جائے۔ مختصر لفظوں میں اس کا مقصد دلیل کی تلاش ہوتا ہے۔

(۵) اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہر صاحب مشورہ کو اپنی رائے کے اظہار کی پوری آزادی دی جائے۔

(۶) یہ تشخیص کرنا کہ اقرب الی الحق کون سا پہلو ہے؟ میر مجلس کا کام ہے۔ اس کا انحصار آراء کی کثرت اور قلت پر نہیں۔ بلکہ اگر ایک دو شخصوں کی رائے بھی اقرب الی الحق ہو تو اسے ہی اختیار کیا جائے گا۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے اسارٰی بدر کے موقعہ پر فرمایا تھا کہ اگر سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ دونوں ایک رائے پر متفق ہو جاتے تو میں اسی کے مطابق عمل کرتا۔ یا جنگ احد کے متعلق آپ کو یہ مشورہ دینے والے کہ جنگ کھلے میدان میں لڑی جائے چند جوشیلے نوجوان مسلمان تھے لیکن آپ نے ان کی قلت کے باوجود انہی کی رائے کو اختیار کیا۔

(۷) آخری فیصلہ کا اختیار میر مجلس کو ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (۱۵۹:۳) جب کسی فریق کے پاس کوئی دلیل موجود نہ ہو یا دونوں طرف دلائل یکساں ہوں تو اس وقت کثرت رائے کے مطابق فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور ایسی صورت میں کثرت ہی بذات خود ایک دلیل بن جاتی ہے۔ اس طرح قطع نزاع تو ہو جاتا ہے مگر اس صورت میں وضوح حق ضروری نہیں۔ اور اس کی مثال بالکل قرعہ اندازی کی سی ہوتی ہے۔

يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا
يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾ اِنَّمَا

اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے [۵۸] اور صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ وہ ظالموں کو [۵۹] قطعاً پسند نہیں کرتا۔(۴۰) اور جو شخص ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔(۴۱)

❁ اسلام میں خلیفہ کا انتخاب:۔ رہی یہ بات کہ آیا امیر کا انتخاب بھی مشورہ سے ہوگا یا یہ معاملہ مشورہ سے باہر ہے۔ تو اکثر علماء کا خیال ہے یہ معاملہ مشورہ سے باہر ہے۔ اس پر پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ سورہ مکی ہے جبکہ مسلمانوں کی ریاست کا تصور تک نہ تھا اور دوسری دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں کا اولین امیر خود نبی ہوتا ہے اور اس کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین کا انتخاب کسی ایک مخصوص طریق پر نہیں ہوا۔ پہلے خلیفہ کا انتخاب صرف مدینہ میں بعض صحابہ کے اجتماع میں ہوا۔ سیدنا عمرؓ نے نام پیش کر کے بیعت کی۔ پھر سب نے بیعت کر لی۔ دوسرے خلیفہ سیدنا عمرؓ کو سیدنا ابو بکرؓ نے نامزد کیا۔ تیسرے خلیفہ سیدنا عثمانؓ کو ایک چھ رکنی کمیٹی نے منتخب کیا اور چوتھے خلیفہ کو سیدنا عثمانؓ کے قاتلوں نے زبردستی نامزد کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ خلیفہ یا امیر المومنین کا سب مسلمانوں کے مشورہ کے تحت منتخب ہونا ضروری نہیں۔ مسلمانوں کا امیر جس راستے سے آئے اگر ان کو کتاب و سنت کے مطابق چلاتا ہے تو وہ ان کا فی الواقع امیر ہے، ورنہ نہیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے میری تصنیف خلافت و جمہوریت ملاحظہ فرمائیے)

[۵۷] ❁ ظلم کے مقابلہ میں ڈٹ جانا اور ظالم سے بدلہ لینا:۔ یعنی متکبر اور جابر قسم کے لوگ ان پر زیادتی کرتے ہیں تو وہ ان کے آگے دبتے نہیں بلکہ ان کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ کمزوری نہیں دکھاتے جیسا کہ مکہ میں مسلمانوں نے کافروں کے مصائب برداشت کیے مگر ان کے آگے جھکے نہیں۔ اور اگر ان میں بدلہ لینے کی ہمت ہو تو بدلہ لے کے چھوڑتے ہیں۔ ان کی شان یہ ہوتی ہے کہ جب غالب ہوں تو اگر چاہیں تو مغلوب کو معاف بھی کر دیں اور چاہیں تو اتنا ہی بدلہ لے لیں جتنی ان پر زیادتی ہوئی ہو اور معاف کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کسی ظالم یا متکبر کے سامنے جھکتے یا دبتے نہیں۔

[۵۸] یعنی اگر کوئی برائی اور زیادتی کا بدلہ لینا ہی چاہے تو اتنا ہی لے جتنی اس پر زیادتی ہوئی ہے۔ اور اگر اس کے معاف کر دینے سے آپس میں صلح ہو سکتی ہو یا بگڑے ہوئے حالات سنور سکتے ہوں اور حالات کے بہتر ہو جانے کی بنا پر معاف کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہوگا۔

[۵۹] یعنی اگر وہ بدلہ لینے میں زیادتی کرے گا تو وہ مظلوم ہونے کے بجائے خود ظالم بن جائے گا اور اللہ ظالموں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔

السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٤٣﴾ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا
لَهُ مِن وَلِيٍّ مِّن بَعْدِهِ وَتَرَى الظَّالِمِينَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ مِّن سَبِيلٍ ﴿٤٤﴾
وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَاشِعِينَ مِنَ الذُّلِّ يَنظُرُونَ مِن طَرْفٍ خَفِيٍّ وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ

الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے اور زمین[۶۰] میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے(۴۲) اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ بڑی ہمت[۶۱] کا کام ہے۔(۴۳)

اور جسے اللہ گمراہ کر دے[۶۲] تو اس کے بعد کوئی اس کا کارساز نہیں۔ اور آپ ظالموں کو دیکھیں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے کہ: کیا واپس[۶۳] پلٹنے کی بھی کوئی راہ ہے؟(۴۴) اور آپ دیکھیں گے کہ جب انہیں اس (دوزخ) پر پیش کیا جائے گا تو ذلت کے مارے جھکے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ[۶۴] رہے ہوں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے تھے وہ کہیں گے کہ

[۶۰] زیادتی کا بدلہ لینے کے اصول:۔ یعنی جو لوگ بدلہ لینا ہی چاہیں مگر بدلہ لینے میں زیادتی نہ کریں وہ موردِ الزام نہیں۔ موردِ الزام وہ لوگ ہیں جو ظلم کی ابتدا کرتے ہیں اور بلاوجہ کرتے ہیں۔ پھر اگر بدلہ لیں تو بدلہ لینے میں بھی حد سے بڑھ جاتے اور مزید ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ دراصل فسادی ہیں جن کا بدلہ دردناک عذاب ہے۔

[۶۱] یعنی زیادتی کو برداشت کر جانا بذاتِ خود بڑی ہمت اور حوصلہ کا کام ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو کنٹرول اور ضبط میں رکھے۔ پھر اگر وہ صرف برداشت ہی نہ کرے بلکہ زیادتی کرنے والے کو معاف بھی کر دے تو پھر اس کے کیا ہی کہنے ہیں؟ مگر یہ بڑے ہی دل گردہ کا کام ہے اور صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جنہیں اللہ کی توفیق حاصل ہو۔

[۶۲] یعنی ان لوگوں کو کتاب وہ دی گئی جو ہدایت انسانی کے لیے بہترین کتاب ہے اور رسول وہ بھیجا گیا جس کی سیرت و کردار کی بلندی میں ان کو بھی کوئی شک نہیں۔ پھر بھی اگر یہ لوگ ہدایت قبول نہیں کرتے تو اللہ ایسے لوگوں کو کبھی ہدایت نہیں دیا کرتا۔

[۶۳] یعنی آج دنیا میں یہ اپنی سرکشی کی حالت کو چھوڑ تو سکتے ہیں مگر پلٹتے نہیں اور اس دن اپنی حالت کو پلٹنے کی کوئی گنجائش نہ ہوگی تو اس دن پلٹنے کی راہ پوچھیں گے اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ پوچھیں گے کیا ہمارے دوبارہ واپس دنیا میں جانے کی کوئی صورت ہے تاکہ ہم بھی نیک عمل کر سکیں۔

[۶۴] جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر اپنی موت کے ڈر سے آنکھیں بند کر لیتا ہے ویسے ہی جب وہ جہنم کے عذاب کو دیکھیں گے تو ڈر اور ذلت کی وجہ سے آنکھیں بند کر لیں گے۔ پھر جب مزید گھبراہٹ پیدا ہوگی تو کن اکھیوں سے جہنم کی طرف دیکھیں گے جس میں عنقریب وہ ڈالے جانے والے ہوں گے۔

الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ
لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَاۗءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾ اِسْتَجِيْبُوْا
لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ
اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ

اصل میں خسارہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں[۶۵] کو خسارہ میں رکھا۔ سن لو! ظالم لوگ دائمی عذاب میں رہیں گے (۴۵) اور ان کے کوئی حمایتی نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کریں۔ اور جسے اللہ گمراہ کردے اس کے لئے (بچاؤ کی) کوئی راہ نہیں (۴۶) اس دن کے آنے سے پہلے پہلے اپنے پروردگار کا حکم مان لو جس کے ٹلنے کی کوئی صورت[۶۶] اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ اور تم اظہار ناراضگی بھی نہ[۶۷] کرسکو گے۔ (۴۷) پھر اگر وہ منہ موڑیں تو ہم نے آپ کو ان پر نگران[۶۸] بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ کے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے۔ اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ پھول[۶۹] جاتا ہے

[۶۵] یعنی یہ بدبخت صرف خود ہی گمراہ نہ ہوئے بلکہ اپنے ساتھ اپنے متعلقین اور گھر والوں کو بھی لے ڈوبے سبھی کو تباہ و برباد کر کے چھوڑا۔

[۶۶] یعنی دنیا میں ان سے عذاب ٹلتا رہا اور انہیں مہلت دی جاتی رہی۔ مگر اس دن ایسی کوئی صورت نہ ہوگی اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو عذاب اللہ نے ان کے لیے مقرر کردیا ہے کسی میں ہمت نہ ہوگی کہ وہ اسے ان سے ٹال سکے۔

[۶۷] ❁ نکیر کے مختلف مفہوم:۔ نکیر کا مادہ نکر ہے اور اس میں بنیادی طور پر دو باتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) اجنبیت، (۲) ناگواری (نکرہ کی ضد معرفہ ہے) نکر بمعنی ناگوار۔ نازیبا اور نامعقول چیز اور نکیر کے معنی ناگوار، نازیبا، نامعقول چیز بھی اور ایسی چیز کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھانا یا ناراضگی کا اظہار کرنا بھی اور نکر کے معنی کسی چیز کو بگاڑ دینا اور اس کی شکل بدل دینا بھی ہے۔ اس لحاظ سے اس جملہ کے کئی معنی بن سکتے ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ تم اجنبی نہیں ہو گے سب تمہیں جانتے پہچانتے ہوں گے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ بھیس بدل کر چھپ نہ سکو گے۔ چوتھا مطلب یہ ہے کہ اس دن تم جیسی بھی حالت میں ہو گے اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکو گے۔

[۶۸] یعنی ہم نے آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ انہیں راہ راست پر لا کے چھوڑو۔ نہ ہی آپ سے ایسی باز پرس ہوگی۔

[۶۹] ❁ ایک دنیادار انسان کسی حال میں بھی اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتا:۔ دراصل ایسی آیات کے مخاطب قریش مکہ ہی تھے۔ لیکن قرآن کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ مخاطب کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے براہ راست انہیں مخاطب نہیں کرتا تاکہ وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے اور نہ چڑ جائیں۔ اسی لحاظ سے اس آیت میں ایک عام دنیادار انسان کی فطرت بیان کی گئی ہے کہ جب اس پر بھلے دن آتے ہیں تو اترانے لگتا ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور جب بُرے دن آتے ہیں اور یہ بُرے

بِهَا ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ ۢبِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۝ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ
مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ

اور اگر انہیں کی بدعملیوں کے سبب کوئی تکلیف پہنچے تو اس وقت انسان ناشکرا (ہی ثابت ہوا) ہے۔(۴۸) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے جسے چاہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہے لڑکے(۴۹) یا لڑکے اور لڑکیاں ملا کر دیتا ہے اور جسے چاہے بانجھ [۷۰] بنا دیتا ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا قدرت والا ہے(۵۰)

کسی انسان کیلئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات چیت کرے۔ البتہ یہ وحی کی صورت میں یا پردے کے پیچھے سے

دن بھی ان کی اپنی شامت اعمال سے آتے ہیں تو اس وقت وہ اپنے پروردگار کو کوسنے لگتا ہے اور اللہ کے ان سارے انعامات کو بھول جاتا ہے جو اس نے اسے خوشحالی کے دور میں عطا کئے ہوئے تھے اس طرح نہ خوشحالی اس کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی بدحالی اسے راہ راست پر لا سکتی ہے کسی حال میں بھی ان کی طبیعت اللہ کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔

[۷۰] ❁ اولاد کے بارے میں انسان کی بے بسی:۔ اس سے پہلی آیت کا آغاز یوں فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں جملہ تصرفات صرف اللہ اکیلے کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر ان تصرفات کے صرف ایک پہلو کو دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے کہ دیکھ لو انسان اولاد کے بارے میں کس قدر بے بس ہے۔ انسان کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہو۔ مگر اللہ جسے بانجھ بنا دے یا اولاد نہ دینا چاہے وہ خواہ کتنے ہی جتن کر دیکھے اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ اس کی دوسری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹے ہوں بیٹیاں نہ ہوں۔ لیکن اللہ بعض لوگوں کو بیٹیاں ہی دیئے جاتا ہے اور اس طرح بعض دفعہ بڑے بڑے متکبروں کی اکڑ توڑ کے رکھ دیتا ہے اور وہ کچھ بھی مداوا نہیں کر سکتے۔ اور کسی کو ایک آدھ لڑکی کی خواہش کے باوجود صرف لڑکے ہی لڑکے دے دیتا ہے کبھی کسی کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہو جاتے ہیں اور کسی کے ہاں بیک وقت تین، چار، پانچ بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص جب سے دنیا میں خاندانی منصوبہ بندی کا چرچا شروع ہوا ہے۔ ایسے واقعات بکثرت سامنے آنے لگے ہیں۔ یہ گویا قدرت کی طرف سے خلاف فطرت کام کرنے والوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ الغرض انسان اولاد کی تمنا رکھنے کے باوجود اس مسئلہ میں اس قدر بے بس ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسری ہستی کوئی بت کوئی آستانہ اور کوئی پیر پیغمبر اس کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ بلکہ پیغمبر اس سلسلہ میں خود بھی ایسے ہی بے بس ہیں جیسے عام انسان مثلاً سیدنا لوط علیہ السلام اور سیدنا شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں ہی بیٹیاں

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ

ہو سکتی ہے یا وہ کوئی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ اللہ کے حکم سے جو کچھ اللہ چاہتا ہے وحی [۷۱] کرتا ہے وہ یقیناً عالی شان اور حکمت والا ہے۔(۵۱) اور اسی طرح [۷۲] ہم نے اپنے حکم سے ایک روح [۷۳] آپ کی طرف وحی کی۔

تھیں۔ بیٹا کوئی نہ تھا۔

[۷۱] ﷺ وحی کے مختلف طریقے:۔ اس آیت میں لفظ وحیا اپنے لغوی معنی (سریع اور تیز اشارہ۔ یعنی القاء والہام) کے معنوں میں آیا ہے اور لفظ یوحی اپنے اصطلاحی معنوں میں (یعنی اللہ کا اپنے نبی کو فرشتہ کے ذریعہ پیغام بھیجنا) استعمال ہوا ہے۔ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے کسی انسان سے کلام کرنے کے تین طریقے مذکور ہیں:

(۱) القاء یا الہام۔ اس قسم کی وحی غیر نبی کو بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے ام موسیٰ کو ہوئی تھی۔(۲۸:۷) بلکہ غیر انسان کی طرف بھی ہو سکتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی (۱۶:۶۸) اور ایسی وحی انبیاء کو خواب میں بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ خواب آیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔(۳۷:۱۰۲)

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے سے بات کرے اور پردہ کا مطلب ہے کہ انسان اللہ کا کلام سن تو سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتا۔ انسان کے اس مادی جسم اور ان ظاہری حواس سے اللہ تعالیٰ کا دیدار نا ممکن ہے۔ ایسی بات چیت اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور کے دامن میں کی تھی۔ مگر آپ دیدار الٰہی کی تمنا اور سوال کے باوجود اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکے تھے۔

(۳) فرشتہ بھیجنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ جبرئیل علیہ السلام نبی کے دل پر نازل ہو اور اسے اللہ کا پیغام پہنچائے۔ تمام کتب سماویہ کا نزول اسی طرح ہوا ہے۔ اور دوسری یہ کہ فرشتہ انسانی شکل میں سامنے آکر کلام کرے۔ جیسے فرشتے سیدنا ابراہیم اور سیدنا لوط علیہ السلام کے پاس آئے تھے۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے اسحٰق علیہ السلام کی خوشخبری دی تھی۔ اور سیدنا لوط علیہ السلام کو ان کی قوم پر عذاب آنے کی خبر دی تھی اور ایسی وحی غیر نبی کی طرف بھی ہو سکتی ہے جیسے سیدنا جبرئیل علیہ السلام نے سیدہ مریم کے سامنے آکر بیٹے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

[۷۲] ﷺ آپ کو وحی کی تمام صورتوں میں وحی ہوئی:۔ اسی طرح سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ان تمام قسموں کی وحی آپ کی طرف بھی کی ہے۔ القاء والہام سے متعلق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پہلے جو وحی رسول اللہ ﷺ پر ہوئی وہ سچا خواب تھا جو کچھ آپ ﷺ نیند کی حالت میں دیکھتے وہ (بیداری میں) صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوتا۔(بخاری۔ باب کیف کان بدء الوحی)

ایسا ہی خواب آپ ﷺ کو صلح حدیبیہ سے پیشتر آیا تھا کہ مسلمان امن واطمینان سے کعبہ کا طواف اور عمرہ کر رہے ہیں جس کا ذکر سورہ فتح کی آیت نمبر ۲۷ میں موجود ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ دوسری صورت اللہ تعالیٰ کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا ہے۔ وحی کی یہ صورت آپ کو واقعہ معراج کے دوران پیش آئی جبکہ نمازیں فرض ہوئی تھیں اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے کئی بار ہم کلام ہوئے تھے اور اس کا ذکر سورہ نجم کی آیات نمبر ۹ اور ۱۰ میں موجود ہے۔

تیسری صورت جبرئیل علیہ السلام کے آپ ﷺ کے دل پر نازل ہونے کی ہے۔ اور قرآن سارے کا سارا اسی صورت میں نازل ہوا

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ
لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى

اس سے پہلے آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان [٧٤] کیا ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے اس روح کو ایک روشنی بنادیا۔ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس روشنی [٧٥] سے راہ دکھا دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ سیدھی راہ کی طرف [٧٦] راہنمائی کر رہے ہیں۔ (٥٢) اس اللہ کی راہ کی طرف [٧٧] جو آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز کا مالک ہے۔

ہے۔ یہ صورت آپ کے لیے سخت تکلیف دہ ہوتی تھی۔ پہلے آپ گھنٹیاں بجنے جیسی آوازیں سنتے تھے۔ یہ گویا ایک قسم کا انتباہ ہوتا تھا۔ جس سے آپ ﷺ کا رشتہ اس مادی دنیا سے کٹ کر عالم بالا سے جڑ جاتا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کے حواس ظاہری کام نہیں کرتے تھے۔ اور تمام تر توجہ وحی کی طرف مبذول ہو جاتی تھی۔ اس شدت تکلیف سے آپ کو بعض دفعہ سخت سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجاتا تھا۔ نیز اس وقت آپ پر شدید بوجھ پڑتا تھا۔ چنانچہ سیدنا زید بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ مجھ سے وحی لکھوا رہے تھے۔ آپ کی ران میری ران پر تھی۔ وحی آنے سے آپ کی ران اتنی بھاری ہو گئی کہ میں ڈرا کہ کہیں میری ران (بوجھ سے) ٹوٹ نہ جائے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ النساء۔ باب لایستوی القاعدون ......) اور اگر آپ اونٹنی پر سوار ہوتے اور وحی آنا شروع ہوتی تو اونٹنی بوجھ کے مارے بیٹھ جاتی تھی۔ اور چوتھی صورت سیدنا جبریل علیہ السلام کے انسانی شکل میں آپ کے سامنے آکر بات کرنے کی ہے۔ حدیث جبریل علیہ السلام کے مطابق سیدنا جبریل علیہ السلام اس وقت ایک اجنبی انسان کی شکل میں آئے تھے۔ اور بسا اوقات جبریل علیہ السلام دحیہ کلبی کی شکل میں آپ کے پاس آتے تھے۔

[٧٣] روح سے یہاں مراد صرف قرآن نہیں بلکہ ہر طرح کی وحی ہے جس کا تفصیلی ذکر سابقہ حاشیہ میں کیا گیا ہے۔

[٧٤] یعنی نبوت ملنے سے پہلے آپ کو اس بات کا خواب و خیال تک نہ تھا کہ آپ کو نبوت یا کتاب الٰہی ملنے والی ہے یا ملنی چاہئے۔ اسی طرح آپ ایمان کی تفصیلات سے واقف نہ تھے۔ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ اس کائنات کا خالق و مالک صرف اللہ ہی اکیلا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے اختیارات میں شریک اور اس کا ہمسر نہیں۔ لیکن آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس ایمان کے تقاضے کیا ہیں! نیز یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اللہ کی کتابوں، نبیوں، فرشتوں اور روز آخرت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

[٧٥] یعنی اس کتاب قرآن کو روشنی بنادیا ہے اور اس روشنی میں ہدایت کی راہ صاف صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اور جو لوگ قرآن کی اس روشنی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، ہم انہیں سعادت و فلاح کے راستہ پر لے چلتے ہیں۔

[٧٦] ہدایت کے سرچشمے کون کون سے ہیں؟ ان دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کے ذرائع تین ہیں اور اقسام دو ہیں۔ پہلی قسم کی ہدایت یہ ہے کہ کوئی شخص کفر و شرک کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو جائے۔ اور ایسی ہدایت خالصتاً اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ورنہ قرآن جیسی دل نشین اور پرتاثیر کتاب ہو اور اس کے مبلغ افضل الانبیاء ہوں تو چاہئے تو یہ تھا کہ سب قریش مکہ ایمان لے آتے مگر آپ کی انتہائی تمنا اور سعی کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔ ہدایت کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو لوگ اسلام لے آئے ہیں ان کی سیدھی راہ کے لیے رہنمائی کی جائے۔ اور یہ کام قرآن کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے

اَللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾

یاد رکھو! سارے معاملات اللہ ہی [۷۸] کی طرف لوٹتے ہیں۔(۵۳)

بھی۔اور آپ کے بعد صحابہ اور علماء کرام کے ذریعہ سے۔

[۷۷] یعنی جو رستہ یہ قرآن دکھاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کی رہنمائی کرتے ہیں وہی اس اللہ کا راستہ ہے جو فرمانروائے کائنات ہے۔اسی راہ پر چل کر انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے اور جو اس راہ سے بھٹکا تو وہ اللہ کی راہ نہیں، سب شیطان کی راہیں ہیں۔

[۷۸] یعنی صرف انسان ہی نہیں، ان کے اعمال وافعال اور دوسرے سب امور کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔لہٰذا انسان کو اس دنیا میں بقائمی ہوش وحواس وہ راہ اختیار کرنا چاہیے جو سیدھی اللہ کی بارگاہ تک پہنچتی ہو۔

۸۹ آیاتہا سورۃ الزخرف مکیۃ رکوعہا ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٣ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا

کلمات ۸۴۸ آیات ۸۹ (۴۳) سورۃ الزخرف مکی ہے (۶۳) رکوع ۷ حروف ۳۶۵۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ (۱) اس واضح کتاب کی قسم [۱] (۲) کہ ہم نے عربی زبان [۲] کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو (۳) بلاشبہ یہ قرآن ام الکتاب (لوح محفوظ) میں درج [۳] ہے جو ہمارے پاس بڑی بلند مرتبہ [۴] اور

[۱] واضح کتاب کا لفظ بڑا وسیع مفہوم اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ کیونکہ یہ کتاب بہت سی باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔ مثلاً یہ کتاب شرک کی جملہ اقسام کی وضاحت کرتی ہے۔ دین حق اور شریعت کے امور کی وضاحت کرتی ہے۔ احوال آخرت اور جنت و دوزخ کی وضاحت کرتی ہے۔ الغرض حق اور باطل کی ایک ایک چیز کو پوری وضاحت سے پیش کر رہی ہے۔

[۲] اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ تمہیں اس کے مضامین و مطالب سمجھنے میں آسانی ہو۔ تم عربی زبان بولتے ہو اور قرآن عربی زبان میں اس لیے اتارا گیا کہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم تھوڑی سی بھی عقل و فکر سے کام لو' اس کے شیریں اندازِ بیان' اس کی فصاحت و بلاغت، اس کی تاثیر، اس کے احکام کی حکمت میں غور کرو تو تمہیں از خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

[۳] یعنی اس کے مضامین اور اصول دین چونکہ ایک ہی جیسے رہے ہیں۔ اور پہلی آسمانی کتابوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے یہ سب کچھ پہلے سے ہی ہمارے پاس اصل کتاب میں لکھا ہوا موجود ہے۔ جسے ہم مختلف ادوار میں، مختلف انبیاء پر انہی کی اپنی اپنی زبانوں میں نازل کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہم نے قرآن کو لوح محفوظ سے عربی زبان میں رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا ہے۔

[۴] ❁ قرآن کے مخلوق ہونے سے متعلق معتزلہ کا استدلال اور اس کا جواب:۔ اس سے مراد ام الکتاب بھی ہو سکتی ہے۔ اور قرآن کریم بھی۔ یعنی تم لوگ اگر اس کی قدر و منزلت نہیں کرتے تو اس سے حقیقت میں کچھ فرق نہیں پڑ سکتا۔ واضح رہے کہ عقل پرست فرقہ معتزلہ نے قرآن کے متعلق اِنَّا جَعَلْنٰهُ سے یہ استدلال کیا کہ قرآن مخلوق ہے۔ یہ استدلال غلط اور باطل ہے کیونکہ جَعَلَ کا لفظ صرف ایجاد اور تخلیق کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ اور بھی کئی معنی دیتا ہے مثلاً درج ذیل مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى﴾ (۹:۴۰) "اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات کو نیچا کر دیا"

﴿جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ﴾ (۱۲:۷۰) "اور (یوسف علیہ السلام نے) پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا"

﴿وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (۱۷:۹۹) "اور ان کے لیے ایک مدت مقرر کی جس میں کوئی شک نہیں"

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ قدیم ہے۔ اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ اور قرآن اللہ کا کلام ہے اور یہ اس کی

لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝ أَفَنَضْرِبُ عَنكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا أَن كُنتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِينَ ۝ وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ
فِي الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ فَأَهْلَكْنَا أَشَدَّ مِنْهُم
بَطْشًا وَمَضَىٰ مَثَلُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ

حکمت والی کتاب ہے۔(۴) تو کیا ہم تمہیں درگزر کرتے ہوئے تمہاری طرف یہ ذکر بھیجنا چھوڑ دیں گے صرف اس لئے کہ تم حد سے بڑھے[۵] ہوئے لوگ ہو؟(۵) ہم نے پہلی قوموں میں بھی کتنے ہی رسول بھیجے(۶) اور جب بھی ان کے پاس کوئی نبی آیا تو انہوں نے اس کا مذاق[۶] ہی اڑایا(۷) تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا (حالانکہ) وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور پہلے لوگوں میں ایسی کئی مثالیں گزر چکی[۷] ہیں۔(۸) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یقیناً کہیں گے کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا جو

صفت ہے۔ اس کے مقابلہ میں معتزلہ کا استدلال یہ ہے کہ اگر اللہ کے ساتھ اللہ کی صفات کو بھی قدیم مانا جائے تو تعدد قدماء لازم آتا ہے اور یہ شرک ہے اسی لیے وہ اپنے آپ کو اہل العدل والتوحید کہتے تھے اور دوسرے سب مسلمانوں کو مشرک سمجھتے تھے۔ مگر انہوں نے اس طرف غور نہ کیا کہ جو چیز مخلوق یا حادث ہو وہ کسی وقت فنا بھی ضرور ہو گی تو کیا نعوذ باللہ اللہ کی صفات یا مثلاً یہی قرآن کسی وقت فنا بھی ہو سکتا ہے؟ چونکہ کچھ عباسی خلیفے بھی اس اعتزال سے متاثر تھے اور مامون الرشید پکا معتزلی تھا۔ لہٰذا قرآن کے مخلوق ہونے کی بحث یا مناسب الفاظ میں اس فتنہ نے پوری ایک صدی طوفان کھڑا کیے رکھا۔ بعد میں خلیفوں کو ہی اللہ نے سیدھی راہ دکھادی تو یہ اپنی موت آپ مر گیا۔ سیدنا امام احمد بن حنبل نے اسی فتنہ کے خلاف بڑی مدت تک قید و بند اور مار پیٹ کی مصیبتیں جھیلی تھیں اور ایسی ہی باتیں اللہ کی صفات میں الحاد کے ضمن میں آتی ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے میری تصنیف آئینہ پرویزیت۔ معتزلہ سے طلوع اسلام تک) اور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زبان میں کلام کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ام الکتاب یا لوح محفوظ کس زبان میں ہے تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ اس کی دوسری صفت کی کیفیت اور ماہیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

[۵] یعنی اے کفار مکہ! اگر تم اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ قرآن کی آیات کا مذاق اڑاتے ہو، کبھی اسے پہلوں کی کہانیاں قرار دیتے ہو، کبھی اسے بندوں کا کلام کہتے ہو۔ تو کیا ہم تمہاری ایسی شرارتوں کی وجہ سے خلقت کی رہنمائی کا کام چھوڑ دیں گے اور قرآن کو نازل کرنا بند کر دیں گے؟ اس کے نزول کے دو فائدے تو بہرحال ہو ہی رہے ہیں ایک یہ کہ بہت سی سعید روحیں اس سے مستفید ہو رہی ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ تم لوگوں پر حجت پوری ہو رہی ہے۔

[۶] جس طرح تم اس کتاب کو پہلے لوگوں کی کہانیاں قرار دے رہے ہو اس کی مثال بالکل وہی ہے جیسے پہلی قوموں کے پاس اللہ کے نبی اللہ کی کتاب لے کر گئے تو انہوں نے اللہ کی کتاب کا اور اپنے نبی کا مذاق اڑایا تھا۔ تم بھی انہی لوگوں کی ڈگر پر چل کر اس کتاب کا مذاق اڑانے لگے ہو اور اپنے نبی کو استہزاء اور دوسری شرارتوں سے تنگ کر رہے ہو۔

[۷] پہلی قومیں قدوقامت، ڈیل ڈول، طاقت و قوت غرض ہر لحاظ سے تم سے آگے تھیں۔ جب انہوں نے ہماری آیات اور ہمارے رسولوں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا تھا اور اب تم بھی وہی کام کر رہے ہو لہٰذا سمجھ لو کہ اب تمہاری تباہی کی باری آچکی ہے۔

الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠﴾
وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿١١﴾ وَالَّذِي خَلَقَ

بڑا زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے (۹) جس نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ[۸] بنایا اور اس میں تمہارے لئے راستے[۹] بنا دیئے تاکہ تم (اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے) راہ پاسکو (۱۰) اور جس نے ایک خاص مقدار[۱۰] میں آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح تم (بھی زمین سے) نکالے[۱۱] جاؤ گے۔ (۱۱) اور جس نے تمام

[۸] زمین گہوارہ کیسے ہے؟ گہوارہ میں بچہ بڑے آرام سے جھولے لیتا ہے، آرام کرتا اور سوتا ہے۔ اس لیے کہ جھولے کی رفتار میں یکسانیت ہوتی ہے۔ بالکل یہی صورت زمین کی ہے جو ایک بہت بڑا عظیم الجثہ کرہ ہے۔ اور فضائے بسیط میں معلق ہزارہا میل فی منٹ کی تیز رفتاری سے محوِ گردش ہے۔ مگر اس کی اس تیز رفتاری میں بھی یکسانیت ہے۔ جس کی وجہ سے تمہیں اس کی یہ حرکت محسوس تک نہیں ہوتی اگر اس کے اندر سے کوئی آتش فشاں پہاڑ یا آتش گیر مادہ پھٹ پڑے اور اس میں زلزلہ پیدا ہو جائے تو اسی وقت تمہاری جان پر بن جاتی ہے۔ اور پروردگار یاد آنے لگتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس کی رفتار میں بے ترتیبی واقع ہو جائے تو تمہاری تباہی یقینی ہے۔ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اس مہیب کرہ کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر اسے تمہارے حق میں گہوارے کی طرح آرام دہ بنا دیا ہے۔ تم اس پر بڑے سکون و اطمینان سے چلتے پھرتے اور رہتے سہتے ہو۔

[۹] راستوں سے راہ پانے کے دو مفہوم:۔ اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی تو ایک جیسی نہیں بنائی کہیں نشیب ہیں کہیں فراز، کہیں پہاڑ ہیں اور کہیں ریت کے تودے، پھر ان پہاڑوں کی بلندی بھی یکساں نہیں بنائی۔ کہیں کٹاؤ ہیں کہیں درے ہیں۔ جنہیں پار کر کے انسان ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ یا دوسرے علاقہ کی طرف جا سکتا ہے۔ پھر ان پہاڑوں میں وادیاں بنائیں جو پانی کی گزرگاہیں ہیں۔ انہیں گزرگاہوں پر چلنے کے راستے بن گئے۔ پھر زمین پر بے شمار امتیازی نشانات بنا دیئے۔ ان سب باتوں کا فائدہ یہ ہوا کہ انسان انہیں نشانات اور راہوں کی مدد سے دنیا کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک سفر کر سکتا ہے اور بھولتا نہیں۔ اگر ایسے نشانات نہ ہوتے اور ساری زمین ایک جیسی ہوتی تو انسان نہ سفر کرنے کے قابل ہو سکتا اور نہ ہی راستے بن سکتے تھے۔ راستے اگرچہ انسان ہی بناتا ہے لیکن چونکہ راستوں کے ذرائع اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اس لیے انہیں براہِ راست اپنی طرف منسوب کیا۔ اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے واضح ہے اور دوسرا یہ کہ ان امتیازی نشانات میں غور کر کے ہدایت کی راہ پا سکو اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر سکو۔

[۱۰] دنیا میں نازل ہونے والی بارش کی مجموعی مقدار یکساں رہتی ہے:۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ سمندر، جس سے آبی بخارات بن کر اوپر اٹھتے ہیں، کا رقبہ خشکی کے رقبہ سے تین گناہ زیادہ ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا ایک کثیر حصہ آبی بخارات میں تبدیل ہو جاتا، پھر بارش کی صورت اختیار کر لیتا جس سے زمین کا کثیر حصہ زیرِ آب آجاتا اور مخلوق تباہ ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہونے دیتا اور آبی بخارات اتنے ہی بنتے ہیں یا اتنی ہی بارش ہوتی ہے جو مخلوق کے لیے فائدہ بخش ہو۔ دوسرا پہلو یہ ہے زمین کے ہر علاقہ میں بارش کی سالانہ اوسط مقدار دوسرے علاقوں سے الگ ہوتی ہے۔ پھر اس اوسط مقدار میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے۔ کہیں سیلاب آجاتا ہے اور کہیں خشک سالی ہوتی ہے۔ ان باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ پانی کی مجموعی مقدار اتنی ہی نازل فرماتا ہے جو ساری زمین کی مخلوق کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

[۱۱] نباتات سے بعث بعد الموت پر دلیل:۔ اللہ تعالیٰ کے لیے نباتات کو زمین سے نکالنا یا اگانا اور تمہیں زمین سے نکالنا یا اگانا

الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ
رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّآ
اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا

مخلوق کے جوڑے بنائے نیز تمہارے لئے کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو(۱۲) تاکہ تم ان کی پشت پر جم کر بیٹھ سکو۔ پھر جب اس پر ٹھیک طرح بیٹھ جاؤ تو اپنے پروردگار کا احسان یاد کرو اور کہو: پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے اسے مطیع کر دیا اور ہم تو اسے قابو میں نہ لا[۱۲] سکتے تھے۔(۱۳) اور بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف[۱۳] لوٹنے والے ہیں۔(۱۴) اور ان لوگوں نے اللہ کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزو[۱۴] بنا ڈالا۔ بلاشبہ انسان صریح احسان فراموش ہے(۱۵) کیا اس نے اپنی مخلوق میں سے (اپنے لئے)

ایک ہی بات ہے اور اس میں کچھ فرق نہیں اور اس کی وضاحت سورہ نوح میں یوں بیان فرمائی۔ ﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا، ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا﴾ (اور اللہ نے تمہیں زمین سے نباتات کی طرح اگایا پھر اسی زمین میں تمہیں لوٹا دے گا۔ پھر تمہیں اسی زمین سے (قیامت کے دن) نکال بھی لے گا) یعنی زمین سے غلے پھل اور غذائیں اگتی ہیں۔ انہی سے انسان کا گوشت پوست، خون اور نطفہ بنتا ہے۔ جو انسان کی پیدائش کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کو براہ راست زمین سے اگانے سے منسوب کر دیا ہے۔ گویا جس طرح آج نباتات کو اور پھر تمہیں زمین سے اگا رہا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی تمہیں زمین سے نکال کر اٹھا کھڑا کرے گا۔

[۱۲] ❁ سواری پر سوار ہونے کے وقت کی دعا:۔ مثلاً ایک انسان اونٹ پر سواری کرتا ہے جو اس سے طاقت اور قد و قامت میں بیسیوں گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ بگڑ جائے تو آن کی آن میں کئی انسانوں کو ہلاک بھی کر سکتا ہے۔ اب یہ انسان پر اللہ کا خاص فضل ہے جس نے انسان کو اتنی عقل بخشی کہ وہ بڑے بڑے جانوروں سے سواری لیتا ہے اور وہ اس کی خادم بن جاتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی ایسا بھی دیکھا کہ ایک بکری کسی اونٹ یا گائے پر سواری کر رہی ہو۔ اور اپنی مرضی سے اسے جہاں چاہے لے جا سکے؟ جبکہ انسان کا ایک چھوٹا سا بچہ اونٹوں کی قطار کو جہاں چاہے لیے پھرتا ہے۔ علاوہ ازیں پہلے انسان صرف جانوروں پر سوار ہوتا تھا مگر آج بھاپ اور پٹرول کی گاڑیوں پر سوار ہوتا اور اس سے ہزاروں کام لیتا ہے۔ اگر ان کی ایک کل بگڑ جائے تو سینکڑوں انسان موت کے گھاٹ اتر سکتے ہیں۔ اللہ نے انسان کو اتنی عقل دی ہے کہ وہ ان چیزوں کو کنٹرول میں رکھ سکتا اور ان پر سواری کرتا ہے۔ پھر بھی انسان اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی سواری پر سوار ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ اور ہمیں بھی ایسا ہی حکم ہے۔

[۱۳] یعنی اس دنیا میں ہماری ساری زندگی ہی مسافرانہ ہے اور ہماری منزل آخرت ہے۔ اب سوچئے اگر کوئی شخص سفر پر روانہ ہوتے وقت یا سواری پر بیٹھ کر سوچ سمجھ کر یہ دعا پڑھے تو کیا وہ کسی گناہ کے کام کے لیے سفر کر سکتا ہے؟

[۱۴] یہ تو تھے اللہ کے بندوں پر احسانات، چاہئے تو یہ تھا کہ انسان اللہ کے ان احسانات اور انعامات کے بدلے اس کا ممنون احسان ہوتا اور اس کا شکر ادا کرتا۔ مگر اس نے نہ صرف یہ کہ اللہ کی ناقدر شناسی کی، بلکہ مزید ستم یہ ڈھایا کہ اس کی ذات اور صفات کے

يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ
مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا

بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا ہے؟(۱۶) اور جب ان میں سے کسی کو وہ مژدہ سنایا جاتا ہے جسے یہ رحمٰن سے منسوب کرتے ہیں (یعنی لڑکی کا) تو اس کا چہرہ سیاہ[۱۵] پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔(۱۷) کیا (اللہ کے لئے وہ اولاد ہے) جو زیور[۱۶] میں پرورش پاتی ہے۔ اور بحث و حجت[۱۷] میں اپنا مدعا واضح بھی نہیں کر سکتی؟(۱۸)

اور ان لوگوں نے فرشتوں کو جو رحمٰن کے بندے ہیں۔ عورتیں قرار دے دیا۔ کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت[۱۸] موجود تھے؟ ان کی ایسی شہادت ضرور لکھی جائے گی اور ان سے باز پرس[۱۹] بھی ہوگی۔(۱۹) اور کہتے

حصے بخرے کر ڈالے اور کئی چیزوں کو اس کی ذات و صفات میں اس کا حصہ دار اور ہمسر بنا ڈالا۔ اس نے اللہ کی اولاد قرار دی۔ حالانکہ اللہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے۔ جبکہ اولاد نہ مخلوق ہوتی ہے اور نہ مملوک۔ اولاد تو اسی کی جنس سے اور اس کا حصہ ہوتی ہے۔ اس طرح انہوں نے اللہ سبحانہ کی ذات کو کئی حصوں میں بانٹ ڈالا۔

[۱۵] ❁ بیٹی کی خبر پر اہل مکہ کے تیور بگڑنا:۔ یہ ستم ہی کیا کم تھا کہ اللہ کی اولاد قرار دی جائے۔ اس پر مزید یہ ستم ڈھایا کہ اولاد میں سے بھی صرف لڑکیاں اللہ کے لیے تجویز کیں۔ جنہیں وہ اپنے لیے سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور اگر اسے بتایا جائے کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کے تیور ہی بدل جاتے ہیں۔ شرم اور ندامت سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اندر ہی اندر اسے اس بات کا غم کھائے جاتا ہے۔ اور جب کوئی بس نہیں چلتا تو اسے زندہ درگور کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ اہل عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ عورتوں کی شکل کے ان کے خیالی مجسمے بناتے اور پھر ان کی پوجا کرتے تھے۔ عزیٰ اور لات و منات ان کی ایسی ہی دیویاں تھیں۔

[۱۶] یعنی جس کا فطری لگاؤ ہی چوڑیوں، زیورات، آرائش و زیبائش اور نمائش سے ہوتا ہے۔ جسمانی قوت کے لحاظ سے کمزور ہوتی ہے۔ ایسی کمزور جنس کو اللہ کی اولاد تجویز کرتے ہیں۔ اور لڑکے جو صاحب عزم و ہمت اور مرد میدان ہوتے ہیں۔ اپنے لیے وہ پسند کرتے ہیں۔

[۱۷] خصم ایسے فریقین مقدمہ کو کہتے ہیں جن کے درمیان اپنے اپنے حقوق کا جھگڑا ہو اور خصام ایسے ہی مقدمہ یا جھگڑا کو کہتے ہیں۔ یعنی عورتیں شور و غل سے ہنگامہ تو خوب پیدا کر سکتی ہیں۔ آپس میں لڑ بھی خوب سکتی ہیں۔ لیکن بحث و جدال کے وقت انہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ کون سی بات اس کے موقف کی حمایت میں جاتی ہے اور کون سی مخالفت میں۔ نیز وہ غیر متعلقہ باتوں سے تو طوفان اٹھا سکتی ہیں مگر کام کی بات (ToThePoint) کم ہی کہتی ہیں۔ نہ وہ یہ بات پوری طرح سمجھ سکتی ہیں۔

[۱۸] اس جملہ کے دو مطلب ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے واضح ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ کیا انہوں نے فرشتوں کی جسمانی ساخت کو اچھی طرح دیکھا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فرشتے مذکر نہیں بلکہ مونث ہوتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فرشتوں میں تذکیر و تانیث یا توالد و تناسل کا سلسلہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہ خالصتاً اللہ کے بندے ہیں اور اس کے حکم کے پابند۔ اپنے اختیار سے وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

[۱۹] یعنی وہ پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے اور اپنی اس بیان بازی پر مصر ہیں۔ کہ فرشتے واقعی عورتیں ہیں۔ اللہ کی بیٹیاں ہیں

لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ٭ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ
كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی
اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ

ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ انہیں اس (مشیت الٰہی) کا کچھ علم نہیں۔ یہ محض تیر تکے چلاتے[20] ہیں۔(۲۰) کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی جس کی بنا پر وہ (ملائکہ پرستی پر) استدلال کرتے ہیں؟(۲۱) نہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد[21] کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں(۲۲) اسی طرح ہم نے کسی بستی میں جو بھی ڈرانے والا بھیجا تو اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ:

اور قابل پرستش دیویاں ہیں۔ تو ان کا یہ بیان ریکارڈ ہو جائے گا پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ کس بنیاد پر تم خود بھی گمراہ ہوئے اور بہت سی خلقت کو گمراہ کیا تھا۔

[20] ❁ **گناہوں پر مشیت کی دلیل باطل ہے:۔** جاہلوں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنے مذموم عقائد اور معصیت کے کاموں کے لیے مشیت الٰہی کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ ان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اللہ کی مشیت اور اللہ کی رضا کے فرق کو نہیں سمجھتے، تبھی ایسی دلیل دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو ایک ظالم اور ڈاکو انسان بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس پر اللہ راضی ہے تبھی تو مجھے ایسے کام کرنے کے مواقع دیے جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے دنیا میں کوئی کام شر رہتا ہی نہیں بلکہ سب کچھ خیر ہی خیر ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس بات کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ دنیا میں کفر و شرک اور فتنہ و فساد عام ہے۔ حالانکہ اللہ ان باتوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا جو کچھ بھی دنیا کے اندر ہو رہا ہے یہ تو فی الواقع مشیتِ الٰہی کے تحت ہو رہا ہے۔ لیکن جو کچھ ہونا چاہیے یا جو کچھ اللہ کی رضا ہے وہ اللہ کی کتاب میں مذکور ہے۔

[21] ❁ **محض تقلید آباء سب سے بڑی گمراہی ہے:۔** یعنی ملائکہ پرستی کے لیے ان کے پاس کوئی نقلی دلیل موجود نہیں۔ کسی آسمانی کتاب میں انہیں یہ لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ فرشتے واقعی اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اللہ کی الوہیت میں حصہ دار ہیں۔ لہٰذا تمہیں ان کی بھی عبادت اور پوجا پاٹ کرنا چاہیے اور اپنی مشکل کشائی اور حاجت روائی کے وقت انہیں پکارنا چاہیے۔ لے دے کے ان کے پاس یہی جواب ہوتا ہے۔ کہ یہ رسوم ہمارے اسلاف سے چلی آرہی ہیں جو ہم سے زیادہ نیک اور پارسا تھے۔ لہٰذا ہم ان کے دین کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ تقلید آباء یا اسلاف کا مرض صرف اس دور کے مشرکوں میں ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ آج کے مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کی ایک شکل اپنے اپنے اماموں یا کسی مخصوص شخصیت کی تقلید بھی ہے۔ ایسے لوگوں کا بھی یہی جواب ہوتا ہے کہ فلاں حضرت ہم سے زیادہ نیک، پارسا اور دین کا علم رکھنے والے تھے۔ لہٰذا ہم ان کے قول کو چھوڑ نہیں سکتے۔ حالانکہ اللہ کا دین صرف وہ ہے جو کتاب و سنت میں مذکور ہے۔ کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی بھی بزرگ سے بزرگ ہستی کا قول تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ ﴿٢٣﴾ قُلْ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِأَهْدَىٰ مِمَّا
وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ ۖ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿٢٤﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
ع ۲ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٥﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِمَّا تَعْبُدُونَ ﴿٢٦﴾ إِلَّا الَّذِي

ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک طریقے[۲۲] پر پایا اور ہم ان کے نقش قدم کی اقتدا کر رہے ہیں۔(۲۳)

اس نبی نے کہا: ”خواہ میں تمہارے پاس اس سے زیادہ صحیح راستہ[۲۳] لے کر آؤں جس پر تم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے؟ (تب بھی تم انہی کی پیروی کرو گے؟) وہ کہنے لگے: ”جو پیغام دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں“(۲۴) چنانچہ ہم نے ان سے بدلہ لے لیا تو دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟(۲۵) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: جن کی تم بندگی کرتے ہو، میں[۲۴] ان سے قطعاً بیزار ہوں(۲۶) میں تو صرف اس کی بندگی کرتا ہوں جس نے

[۲۲] ❁ تقلید آباء کے مؤید مترفین کا طبقہ ہوتا ہے:۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید آباء کے سب سے زیادہ مؤید اور اس پر اصرار کرنے والے کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں یعنی جو آسودہ حال اور چودھری قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ رسول کی بات مان لیں تو انہیں اپنی اس چودھراہٹ کے منصب سے نیچے اتر کر عام لوگوں کی صف میں شامل ہونا اور رسول کا مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ رسول ان کے کسب معاش کے طریقوں پر بھی کئی طرح کی پابندیاں لگاتا ہے۔ مال و دولت کے کمانے پر بھی اور اس کے خرچ کرنے پر بھی۔ اگر یہ پابندیاں گوارا کر لیں تو ان کی آسودہ حالی ہی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی عاقبت اسی میں سمجھتے ہیں کہ تقلید آباء پر ڈٹ جائیں اور عوام کو اپنے ساتھ ملائے رکھیں۔

[۲۳] زیادہ صحیح اس لحاظ سے کہ اس کی نقلی دلیل موجود ہے سب آسمانی کتابوں میں یہی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ اکیلا ہی معبود برحق ہے۔ کوئی دوسرا اس کی ذات اور صفات میں اس کا شریک یا اس کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں عقلِ سلیم بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے۔

[۲۴] ❁ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور تقلید آباء کے دو پہلو:۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یہاں اسی نسبت سے آیا ہے۔ کہ کفارِ مکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا اور نبی مانتے تھے۔ لہٰذا انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ اگر اسلاف کی تقلید ہی کرنا چاہتے ہو تو اپنے اس پیشوا کی کرو جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی بندگی سے سخت بیزار تھے۔ ان اسلاف کی کیوں پیروی کرتے ہو جنہوں نے خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تقلید کو چھوڑ دیا تھا۔ اور گمراہی کے راستوں پر چل کھڑے ہوئے تھے۔ بالفاظ نبی کی تقلید کرنا درست ہے لیکن شرعی اصطلاح میں اس کا نام تقلید نہیں بلکہ اتباعِ رسول ﷺ ہے۔

فَطَرَنِىْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿٢٧﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِىْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾ بَلْ مَتَّعْتُ
هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى جَاۗءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٩﴾ وَلَمَّا جَاۗءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ
اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰي رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾ اَهُمْ

مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے راہ [۲۵] دکھائے گا (۲۷) اور (ابراہیم) یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے۔ تاکہ وہ [۲۶] اس کی طرف رجوع کریں (۲۸) بلکہ میں نے انہیں اور ان کے آباء و اجداد کو زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا [۲۷] تاآنکہ ان کے پاس حق اور کھول کر بیان کرنے والا [۲۸] رسول آیا۔ (۲۹) اور جب ان کے پاس حق آگیا تو کہنے لگے کہ: ”یہ تو جادو [۲۹] ہے اور ہم اسے قطعاً نہیں مانتے“ (۳۰) نیز یہ (کفار مکہ) یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں [۳۰] نازل نہ کیا گیا؟ (۳۱)

[۲۵] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنا یہ حال تھا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے آباء و اجداد اور ان کی قوم سب کے سب اللہ کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرنے لگ گئے ہیں تو انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں اپنے باپ دادا کے دین کو کیسے چھوڑوں۔ بلکہ انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ مجھے ان بتوں کی بندگی سے سخت نفرت ہے۔ اور ساتھ ہی یہ دلیل بھی پیش کر دی کہ میں تو صرف اسی ذات کی بندگی کر سکتا ہوں جس نے مجھے پیدا بھی کیا ہے اور ہدایت کی راہ بھی دکھاتا ہے اور جن چیزوں کا نہ میری پیدائش میں دخل ہے اور نہ ہی ہدایت دے سکتے ہیں بلکہ خود بے جان مخلوق ہیں اور سنتے بولتے بھی نہیں ہیں آخر ایسی بے کار چیزوں کی بندگی میں کیوں کروں؟

[۲۶] سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بھی یہی تعلیم دی تھی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ اگر تم میں کوئی اختلاف واقع ہو جائے تو اسی کلمہ توحید کی طرف رجوع کرنا اور میری اس تعلیم کو کبھی نہ بھولنا۔ اور وہ تعلیم یہی تھی کہ اللہ کے سوا کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو پرستش کے قابل ہو۔

[۲۷] بات یہ نہیں جو تم کہہ رہے ہو بلکہ اس کے برعکس معاملہ یہ ہے کہ تم نے جان بوجھ کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم کو بھلا رکھا ہے اور ان کی وصیت کی کوئی پروا نہیں کی۔ اللہ نے تمہیں اور تمہارے آباء و اجداد کو جو سامان زیست اور نعمتیں عطا کی تھیں ان کے مزوں میں پڑ کر اللہ کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے۔ یہ شرکیہ رسوم تمہارے سامان عیش و عشرت کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔ جنہیں اب تم چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

[۲۸] ﴿وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ﴾ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ یہ رسول تمہیں شرک اور توحید کی راہیں صاف صاف اور کھول کھول کر سمجھانے والا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایسا رسول آیا جس کا رسول ہونا بالکل واضح تھا۔

[۲۹] وہ جادو اس لحاظ سے کہتے تھے کہ قرآن کی تعلیم اور اس کی قراءت دل میں اترنے اور تاثیر کے لحاظ سے جادو کا سا اثر رکھتی تھی۔ اور اس بات سے کفار سخت خطرہ محسوس کر رہے تھے اور اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جو شخص قرآن کی اس دعوت کو قبول کر لیتا تھا۔ وہ اپنے سب رشتہ کو چھوڑنا تو گوارا کر لیتا تھا مگر ایمان سے پیچھے ہٹنا کبھی گوارا نہ کرتا تھا اور کافر اسے اس لیے جادو کہتے تھے کہ یہ تعلیم ایسی ہے جو باپ بیٹے، بہن بھائی غرضیکہ ہر ایک کو دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔

[۳۰] ❁ قریش کے آپ کی ذات پر اعتراضات:۔ قریش مکہ کا پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ ہم جیسا ایک بشر کیسے رسول ہو سکتا ہے

يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٣٢﴾ وَلَوْلَا أَنْ

کیا آپ پر تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرنیوالے[۳۱] یہ لوگ ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کا سامانِ زیست ان کے درمیان ہم نے تقسیم کیا ہے اور کچھ لوگوں کو دوسروں پر بدرجہا فوقیت بھی دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے خدمت لے سکیں اور آپ کے پروردگار کی رحمت[۳۲] اس چیز سے بہتر ہے کہ جو یہ جمع کر رہے[۳۳] ہیں(۳۲) اور اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ

پھر جب انہیں دلائل کے ساتھ سمجھایا گیا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے انسان ہی رسول ہو سکتا ہے اور تم لوگوں کی ہدایت کے لیے تمہاری زبان جاننے والا ہی رسول ہو سکتا ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ تو اب تیسرا اعتراض یہ جڑ دیا کہ مکہ اور طائف دو مرکزی شہر ہیں۔ مکہ کا رئیس ولید بن مغیرہ تھا اور طائف کا عروہ بن مسعود ثقفی ہے۔ ان شہروں کا کوئی بڑا آدمی رسول بن جاتا تو بھی کوئی بات تھی۔ بھلا اللہ تعالیٰ کو رسول بنانے کے لیے ایسا ہی آدمی ملا تھا جو یتیم پیدا ہوا تھا اور جس کے پاس نہ دولت ہے اور نہ کسی قبیلے یا خاندان کی سربراہی۔ اگلی آیت میں ان کے اسی اعتراض کے دو جواب دیئے جا رہے ہیں۔

[۳۱] یہ لوگ کس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو نبوت عطا کرنے سے پہلے اللہ میاں کو ان سے مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔ کہ نبوت و رسالت کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے۔ دوسرے انعامات بھی اللہ تعالیٰ نے جس جس کو دیئے ہیں ان میں بھی ان کا کچھ عمل دخل نہیں۔ اللہ نے کسی کو عقل زیادہ دی ہے کسی کو علم دیا ہے۔ کسی کو دولت زیادہ دی ہے اور کسی کو اولاد زیادہ اور کسی کو کم اور کسی کو بالکل نہیں دی۔ کسی کو قوت کار زیادہ دی ہے کسی کو جسمانی قوت زیادہ دی ہے، کسی کو حسن دیا ہے، کسی کو کوئی خوبی دی ہے، تو کسی کو کوئی دوسری خوبی دے دی ہے۔ اب یہ کیا چاہتے ہیں کہ ایک ہی شخص کو ساری خوبیاں دے دی جائیں یا کسی شخص کو کوئی بھی خوبی نہ دی جائے؟ حالانکہ جو کچھ اللہ نے تقسیم کر دی ہے۔ اسی سے دنیا کا نظام قائم ہے۔ امیر کو غریب کی ضرورت ہے کہ وہ اس کے کام کاج کرے اور غریب کو امیر کی ضرورت ہے کہ اس کا کام کاج کر کے اپنے لیے روزی کمائے۔ اسی طرح شاگرد کو استاد کی اور استاد کو شاگردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ غرضیکہ اسی اختلاف صفات کی بنا پر ہر شخص دوسرے کا محتاج ہے اور ان صفات کی تقسیم میں وہ خود بھی بے بس ہیں چہ جائیکہ دوسروں کے متعلق اور بالخصوص نبوت جیسی اعلیٰ درجہ کی نعمت کے متعلق دخل در معقولات کرنے لگیں۔

[۳۲] نبوت اللہ کی خاص نعمت اور رحمت ہے:۔ یہاں رحمت سے مراد رحمت خاص یا نبوت ہے۔ یعنی نبوت و رسالت کا شرف اس مال و دولت، ساز و سامان اور چودھراہٹوں سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے جن کے پیچھے تم پڑے ہوئے ہو۔ جب اللہ نے دنیا کی روزی اور دوسرا ساز و سامان بھی انہی کی تجویز پر تقسیم نہیں کیا تو کیا نبوت ان کی تجویز اور رائے کے مطابق کسی کو دے گا؟ اللہ تعالیٰ ٹھیک جانتا ہے کہ اس رحمت خاص کا اصل مستحق کون ہے اور کسے اس رحمت سے نوازنا چاہیے؟

[۳۳] کیونکہ دنیا کا مال فنا ہو جانے والا ہے اور اس کا کوئی بھروسا نہیں اور اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت خاص یعنی نبوت تو دونوں جہانوں میں نہایت اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔

يَّكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ
عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿٣٤﴾ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٥﴾ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ ع
شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿٣٦﴾ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٣٧﴾ حَتّٰٓى اِذَا

تمام لوگ ایک ہی دین (کفر) کی طرف مائل ہو جائیں گے تو ہم رحمٰن کے ساتھ کفر کرنے والوں کے گھر اور سیڑھیاں جن پر چڑھتے ہیں (۳۳) اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر تکیہ لگاتے ہیں (۳۴) یہ سب چیزیں چاندی [۳۴] کی اور بعض سونے کی بنا دیتے یہ سب کچھ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور آخرت آپ کے پروردگار کے ہاں صرف متقین [۳۵] کے لئے ہے۔ (۳۵) اور جو شخص رحمٰن کے ذکر سے آنکھیں [۳۶] بند کر لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے (۳۶) اور ایسے شیطان انہیں سیدھی راہ سے روک دیتے ہیں جبکہ وہ یہ سمجھ رہے [۳۷] ہوتے ہیں کہ وہ ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں (۳۷) حتیٰ کہ جب وہ

[۳۴] یعنی دنیا کا مال و دولت، ساز و سامان اور سیم و زر، جس کو یہ لوگ کسی انسان کی عظمت کا معیار قرار دے رہے ہیں۔ اللہ کی نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام کافروں کے گھر، ان کے دروازے، مکانوں کی چھتیں، ان کے تخت اور چارپائیاں، ان کی سیڑھیاں غرضیکہ ان کی ایک ایک چیز سونے، چاندی کا بنا دیتا۔ لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ تمام انسان ہی کفر کا راستہ اختیار کر لیتے، کیونکہ انسان فطرتاً مال و دولت کے لیے بہت حریص واقع ہوا ہے۔ جبکہ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ کسی کو مال و دولت زیادہ دے کر اور کسی کو کم دے کر ہر طرح سے لوگوں کی آزمائش کرے۔ نیز دنیا میں رزق کی اس کمی بیشی سے ہی اس دنیا کا نظام چل رہا ہے ورنہ مال و دولت تو ایسی حقیر چیز ہے جو حرام خوروں اور خبیث ترین قسم کے انسانوں کے پاس عام لوگوں سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس مال و دولت کو تم نے بڑائی کا معیار سمجھ رکھا ہے۔ اور کہتے ہو کہ نبوت بھی اس طرح کے کسی بڑے رئیس کے حصہ میں آنا چاہئے تھی؟

[۳۵] یعنی آخرت کی تمام تر نعمتیں صرف متقی لوگوں کے لیے مخصوص ہیں اور دنیا میں بھی انہیں اتنا حصہ مل ہی جاتا ہے جتنا ان کے مقدر میں ہے اور یہ حصہ زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کافروں کا آخرت میں تو کوئی حصہ نہیں اگر دنیا میں انہیں کچھ زیادہ مال و دولت مل بھی جائے تو پھر بھی بہر حال خسارے میں کافر ہی رہتے ہیں۔

[۳۶] یعش (مادہ عشو) عشا کے بنیادی معنی اندھیرے کی وجہ سے چیزوں کا واضح نظر نہ آنا اور کبھی یہ لفظ محض اندھیرے کے وقت کے لیے آ جاتا ہے۔ اور بمعنی رات کو نظر نہ آنا، رتوندا ہونا، شب کوری اور یہاں یعش سے مراد عمداً کسی چیز کو دیکھنے کی کوشش نہ کرنا اور آنکھیں بند کر لینا ہے۔ یعنی جو شخص اللہ کی یاد سے یا اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت سے یا قرآن سے عمداً بے نیاز رہنا چاہتا ہے اس پر ایک شیطان خصوصی طور پر مسلط کر دیا جاتا ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا، اس کے دل میں وسوسے ڈالتا اور اللہ کی یاد سے غافل کیے رکھتا ہے حتیٰ کہ اسے دوزخ تک پہنچا کے چھوڑتا ہے۔

[۳۷] یہ شیطان جو ہر وقت اس کے ساتھ لگا رہتا ہے کوئی جن بھی ہو سکتا ہے اور انسان بھی۔ اور یہ اسے کسی وقت نیکی کی طرف

جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ
ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ

ہمارے پاس آئے گا تو (اپنے ساتھی سے) کہے گا: کاش! میرے اور تمہارے درمیان مشرق و مغرب[۳۸] کا بعد ہوتا، تو تو بہت بُرا ساتھی نکلا ہے۔(۳۸) اور (انہیں کہا جائے گا) جب تم ظلم کر چکے ہو تو آج تمہیں (ایسی گفتگو) کچھ نفع نہیں دے سکتی۔ تم سب عذاب میں برابر[۳۹] کے شریک ہو۔(۳۹)

کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں؟ یا اندھوں کو اور ایسے لوگوں کو جو صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہوں ہدایت دے سکتے[۴۰] ہیں؟(۴۰) خواہ ہم آپ کو (دنیا سے) اٹھا لیں ہم ان سے بہرحال انتقام لیں گے(۴۱) یا جس (عذاب) کا ہم نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے، وہ آپ کو بھی دکھا دیں، ہم ہر طرح ان پر پوری قدرت[۴۱] رکھتے ہیں(۴۲)

یا اللہ کے راستہ کی طرف نہیں آنے دیتا پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی ایسی مت ماری جاتی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ اپنے برے کاموں کو ہی اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ اور اسے اپنی یہ بدروی اور گمراہی ہی صحیح راہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

[۳۸] یعنی آج تو اپنے اس برے ساتھی کو اپنا حقیقی خیر خواہ سمجھ رہا ہے مگر قیامت کو جب ہمارے پاس حاضر ہو گا تب جا کر اسے معلوم ہو گا کہ وہ اس کا کیسا برا ساتھی تھا۔ پھر وہ حسرت اور غصہ سے اسے کہے گا: کاش! میرے اور تیرے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہوتا اور میں ایک لمحہ بھی تیری صحبت میں نہ گزارتا۔ آج تو کم از کم میری آنکھوں سے دور ہو جا۔ تو تو بہت ہی برا ساتھی ہے۔

[۳۹] یعنی آج اس برے ساتھی سے بیزار ہونے کا کیا فائدہ؟ اس نے جو کام کرنا تھا وہ کر چکا اور تمہیں جہنم تک پہنچا چکا۔ آج تو جیسے وہ مجرم ہے ویسے ہی تم بھی مجرم ہو۔ نہ اس کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی اور نہ تمہارے عذاب میں۔ اس عذاب میں دونوں برابر کے شریک ہو۔ دنیا میں تو قاعدہ ہے کہ جس مصیبت میں سب چھوٹے بڑے شریک ہوں وہ کچھ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثل مشہور ہے۔ "مرگ انبوہ جشنے دارد" مگر دوزخ میں یہ صورت بھی نہ ہو گی اور سب کا عذاب میں شریک ہونا کسی کو کچھ فائدہ نہ دے گا۔

[۴۰] یعنی آپ اپنی تمام تر توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول کیجئے جو ہدایت کے خواہشمند ہیں یا جو اسلام لا چکے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کا کلام سننا ہی نہیں چاہتے اور اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں۔ انہیں راہ راست پر لانا یا نہ لانا آپ کا کام نہیں۔ آپ ان کی فکر چھوڑ دیجئے جو اپنے آپ کو اللہ کے عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔

[۴۱] مشرکین مکہ کا یہ خیال تھا کہ ان کی ساری پریشانیوں اور مصیبتوں کا باعث رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے۔ یہ کانٹا اگر درمیان سے نکل جائے تو سارا معاملہ درست ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ آپ کی جان کے لاگو بنے ہوئے تھے۔ اس آیت میں اگرچہ

مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ
لِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔــلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔــلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ

آپ بس (اس کتاب کو) مضبوطی سے تھامے رکھئے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ آپ یقیناً سیدھی [۴۲] راہ پر ہیں (۴۳) اور یہ کتاب بلاشبہ آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے نصیحت [۴۳] ہے اور جلد ہی تم سے (اس کے متعلق) باز پرس ہوگی (۴۴) اور ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھیجے تھے ان سے پوچھ [۴۴] لیجئے کہ: "آیا ہم

روئے سخن رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے لیکن یہ وعید دراصل مشرکین مکہ کو سنائی جا رہی ہے۔ کہ رسول زندہ رہے یا نہ رہے۔ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا بہرحال مل کے رہے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا عذاب رسول کی زندگی میں ہی تمہیں پہنچ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد آئے۔ لہٰذا جو کچھ تم رسول کے متعلق سوچ رہے ہو اس سے تمہاری پریشانیوں اور مصیبتوں میں اضافہ تو ہو سکتا ہے، کمی نہیں ہو سکتی۔

[۴۲] اور آپ ﷺ بھی یہ فکر چھوڑ دیجئے کہ ان مشرکوں پر اللہ کا عذاب کب نازل ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری حکمت اور صوابدید پر منحصر ہے۔ نہ آپ یہ فکر کریں کہ اسلام کو کب غلبہ نصیب ہوگا۔ آپ کے اطمینان کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آپ ٹھیک راہ پر جا رہے ہیں۔ بس اتنا کیجئے کہ آپ کو اللہ کی طرف سے ساتھ کے ساتھ جو ہدایات مل رہی ہیں ٹھیک اس کے مطابق عمل کرتے جائیے اور یہ بات اللہ پر چھوڑ دیجئے کہ وہ کب باطل کا سر کچلتا ہے اور حق کو غلبہ نصیب فرماتا ہے۔

[۴۳] یعنی یہ کتاب قرآن کریم ایک بہت بڑی نعمت ہے جو آپ کو اور آپ کی قوم کو دی جا رہی ہے۔ تمہاری اور تمہاری قوم کی اس سے زیادہ خوش نصیبی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم آپ کی طرف وہ کتاب نازل کر رہے ہیں جو تا قیام قیامت ساری دنیا کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنے گی اور دوسری قوموں کو چھوڑ کر آپ کی قوم اس پیغام الٰہی کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے کا ذریعہ بنے گی۔ لہٰذا اس وقت جو لوگ اس عظیم نعمت کا مذاق اڑاتے ہیں یا اسے سننا بھی گوارا نہیں کرتے ان سے یقیناً باز پرس ہونے والی ہے۔ اور اے مسلمانو! تم سے بھی پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اللہ کا یہ پیغام دنیا والوں کو پہنچا دیا تھا؟

[۴۴] ❁ بعد از موت انبیاء کی زندگی کے قائلین اور ان کا رد:۔ اس آیت میں وَاسْئَلْ کا مطلب اکثر مفسرین نے دو طرح سے بیان کیا ہے ایک یہ کہ ان انبیاء کے وارث علماء یا علمائے بنی اسرائیل سے پوچھ لیجئے۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ ان رسولوں کی کتابوں میں تلاش کر کے دیکھو کہ ان میں کہیں یہ لکھا ہے کہ ہم نے اپنے علاوہ کچھ اور بھی الٰہ بنا دیئے ہیں جن کی عبادت کی جایا کرے۔ لیکن کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو انبیاء و اولیائے کرام کی عرصہ برزخ میں مکمل زندگی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگوں کی پکار سنتے بھی ہیں اور ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے ان کے تصرف کا یہ حال ہے۔ وہ پکارنے والے کی مشکل کشائی اور حاجت روائی بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک صاحب اس آیت کا ترجمہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "اگر انبیاء کرام میں حیات نہ ہوتی۔ وہ خطاب و ندا کو نہ سمجھتے ہوتے اور جواب دینے کی قدرت ان میں نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو انبیاء و رسل سے دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا" ایسے حضرات چونکہ عموماً بریلوی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہاں ترجمہ احمد رضا خان بریلوی (کنزالایمان) پر حاشیہ نمبر ۵۴ از نعیم الدین مراد آبادی درج کرتے ہیں:

الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَقَالَ اِنِّىْ
رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٦﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِىَ

نے رحمٰن کے سوا کوئی اور الٰہ بنائے ہیں جن کی عبادت کی جائے؟" (۴۵)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں[۴۵] دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا تو موسیٰ نے جا کر کہا کہ: میں پروردگار عالم کا رسول ہوں (۴۶) پھر جب موسیٰ نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ان کی ہنسی[۴۶] اڑانے لگے۔ (۴۷) اور ہم نے انہیں جو بھی نشانی دکھائی وہ اپنے

"رسولوں سے سوال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ادیان و ملل کی تلاش کرو۔ کہیں بھی کسی نبی کی امت میں بت پرستی روا رکھی گئی ہے؟ اور اکثر مفسرین نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ مومنین اہل کتاب سے دریافت کرو۔ کیا کسی نبی نے غیر اللہ کی عبادت کی اجازت دی؟ تاکہ مشرکین پر ثابت ہو جائے کہ مخلوق پرستی نہ کسی رسول نے بتائی نہ کسی کتاب میں آئی۔ یہ بھی ایک روایت ہے کہ شب معراج سید عالم نے بیت المقدس میں تمام انبیاء کی امامت فرمائی۔ جب حضور نماز سے فارغ ہوئے جبرئیل نے عرض کیا کہ اے سرور اکرم ﷺ! اپنے سے پہلے انبیاء سے دریافت فرمایئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی اور کی عبادت کی اجازت دی؟ حضور نے فرمایا کہ اس سوال کی کچھ حاجت نہیں یعنی اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ تمام انبیاء توحید کی دعوت دیتے آئے۔ سب نے مخلوق پرستی کی ممانعت فرمائی" (سورۂ زخرف کا حاشیہ نمبر ۴۵ از نعیم الدین مراد آبادی)

اب دیکھیے اس حاشیہ میں جس روایت کا ذکر ہے وہ غلط معلوم ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سورہ زخرف کی یہ آیت واقعہ معراج سے کافی عرصہ بعد نازل ہوئی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل جس میں واقعہ اسراء کا ذکر ہے، کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۵۰ ہے۔ جبکہ سورۂ زخرف کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۶۳ ہے۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے ڈیڑھ دو سال پہلے کا ہے۔ جبکہ سورۂ ہذا اس وقت نازل ہوئی جبکہ کفار آپ کی جان کے درپے تھے۔ جیسا کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۷۹۔۸۰ سے واضح ہے۔ لہٰذا قبل از نزول آیت مذکورہ جبرئیل کا حضور ﷺ سے یہ کہنا کہ ان رسولوں سے پوچھ لیجئے اور پھر پوری آیت پڑھ جانا کیسے ممکن ہے؟

[۴۵] یہاں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس نسبت سے آیا ہے کہ فرعون بھی اپنے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کو حقیر سمجھتا تھا۔ جس طرح کہ قریش مکہ اپنے سرداروں کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کو حقیر سمجھ رہے تھے اور انہیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ بالآخر فرعون اللہ کے عذاب سے تباہ ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نجات اور کامیابی عطا فرمائی۔ تم اگر سمجھو تو تمہارا بھی ایسا ہی حشر ہونے والا ہے۔

[۴۶] یعنی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے سانپ بن جانے کو اور ید بیضاء کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ نشانیاں سمجھنے کی بجائے اسے جادو کے کرشمے قرار دیئے اور باتیں بنانے لگے اور ہنسی مذاق اڑانے لگے۔

أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا ۖ وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤٨﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهَ السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ ﴿٤٩﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ﴿٥٠﴾
وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۖ

سے پہلی نشانی[۴۷] سے بڑھ کر ہوتی تھی اور ہم انہیں عذاب میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید وہ باز آ جائیں۔(۴۸)
اور (ہر بار) وہ یہی کہتے: "اے ساحر! تیرے پروردگار نے جو تجھ سے (دعا کی قبولیت) کا عہد کر رکھا ہے تو ہمارے لئے[۴۸] دعا کر، ہم ضرور راہ راست پر آ جائیں گے(۴۹) پھر جب ہم ان سے عذاب ہٹا لیتے تو وہ فوراً اپنا عہد[۴۹] توڑ دیتے(۵۰) اور فرعون نے (ایک دفعہ) اپنی قوم کے درمیان پکار[۵۰] کر کہا: "اے میری قوم! کیا یہ مصر کی بادشاہی میری نہیں؟ اور یہ نہریں (بھی) جو میرے نیچے بہ رہی ہیں؟

[۴۷] ان نشانیوں سے مراد وہ پے در پے عذاب ہیں جن کا ذکر سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۳۳ میں گزر چکا ہے۔ وہی حاشیہ ملاحظہ فرما لیا جائے۔ یہ ہلکے ہلکے عذاب دراصل تنبیہات تھیں جن سے غرض یہ تھی کہ شاید وہ ڈر کر اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں۔

[۴۸] ❁ سیدنا موسیٰ کو قوم کی طرف سے ایذا دہی:۔ اس آیت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً (۱) فرعون اور آل فرعون کو یہ پوری طرح معلوم ہو چکا تھا کہ آپ جادوگر نہیں بلکہ فی الواقع اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ ان کی دعا سنتا ہے اور اسے قبول بھی کرتا ہے۔ اسی لیے وہ عذاب اور مصیبت کے وقت آپ کی طرف رجوع کرتے اور دعا کی درخواست کرتے تھے۔

(۲) ان کی اکڑ کا یہ عالم تھا کہ التجا کے وقت بھی وہ آپ کو "ساحر" ہی کہتے تھے۔ جیسا کہ تمام انبیاء کو اس لقب سے نوازا جاتا رہا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ انہوں نے اپنی قوم کو مطمئن رکھنے اور الو بنانے کے لیے "ساحر" کے طور پر ہی مشہور کر رکھا تھا۔ یہی وہ باتیں تھیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو موسیٰ علیہ السلام کو دکھ پہنچاتے رہے" (۶۹:۳۳)

(۳) جس طرح دوسرے انبیاء کو یہ حکم تھا کہ وہ کافروں کی باتوں کو صبر و تحمل سے برداشت کریں۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم تھا اور یہ پے در پے عذاب چونکہ اللہ کی طرف سے تنبیہات تھیں لہٰذا سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی اس توہین کو بھی برداشت کرتے۔ پھر اللہ کے حکم کے تحت ان کے لیے عذاب کے دور ہونے کی دعا بھی کرتے تھے۔

[۴۹] یعنی وہ ہر بار عہد شکنی کر کے اپنے سرکشی کے جرم کو سخت سے سخت تر بناتے چلے گئے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنے جرائم کی مناسبت سے کس قدر سخت سزا ملنے والی تھی۔

[۵۰] یہاں "اپنی قوم میں" سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے درباریوں سے پکار پکار کر یہ باتیں کی ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی ان باتوں کا تشہیر زور پروپیگنڈا کیا ہو کہ اس کی قوم کے ہر فرد کے کانوں تک فرعون کی یہ آواز پہنچ گئی ہو۔

أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٥١﴾ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ ﴿٥٢﴾ فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّن ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلَائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ﴿٥٣﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا

کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟(۵۱) بھلا میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ایک ذلیل [۵۱] آدمی ہے اور بات بھی صاف طور پر نہیں کر سکتا۔(۵۲) (اگر یہ رسول ہے تو) اس پر سونے کے کنگن کیوں نہ اتارے گئے یا فرشتوں کی گاردی [۵۲] اس کے ساتھ آئی ہوتی؟"(۵۳)

اس طرح اس نے اپنی قوم کو اُلو بنا لیا اور وہ اس کی بات مان گئے۔ وہ تھے ہی نافرمان [۵۳] لوگ(۵۴)

[۵۱] فرعون کا اپنی قوم میں پروپیگنڈہ:۔ فرعون کے اس اعلان سے واضح طور پر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی جڑیں اندر ہی اندر کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ اور وہ اس دعوت سے خائف تھا مگر اپنی رعایا میں اپنا بھرم قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اور اپنی قوم سے اسی طرح کا استصواب چاہتا تھا۔ جیسے الیکشن کے دنوں میں امیدوار اپنی خوبیاں اور اپنے حریف کے نقائص بیان کیا کرتے ہیں۔ اس نے اپنا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تقابل پیش کرتے ہوئے کہا۔ دیکھو! یہ ملک مصر میں میری حکومت کس قدر مضبوط ہے۔ آبپاشی کا نظام بہت عمدہ ہے۔ جس پر تمہاری معیشت کا دارومدار ہے۔ ہم لوگوں نے دریائے نیل سے کئی نہریں ملک بھر میں جابجا بچھا دی ہیں۔ یہ سب کچھ تو میرے نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ پھر تم ایک ایسے شخص کے پیچھے کیوں لگے جا رہے ہو جو میرے مقابلہ میں نہایت کمتر درجہ کا آدمی ہے۔ نہ اس کے پاس مال و دولت ہے اور نہ حکومت اور وہ کھل کر صاف صاف باتیں بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں کچھ تو سوچ و بچار سے کام لینا چاہئے۔

[۵۲] فرعون کا قوم کے سامنے اپنا اور سیدنا موسیٰ کا تقابل پیش کرنا:۔ پرانے زمانے میں یہ رواج عام تھا کہ بادشاہ، نواب اور راجے مہاراجے سونے اور جواہرات کے کنگن پہنا کرتے اور اپنے جس درباری پر خوش ہوتے تو اسے بھی انعام و اکرام کے طور پر کنگن پہناتے اور جب کبھی سیر و سفر کو نکلتے تو ان کے آگے پیچھے فوجوں کے محافظ دستے ہوتے تھے اور یہ رواج آج کل بھی عام ہے۔ فرعون نے اپنے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے تقابل میں ایک تو دولت اور حکومت کا ذکر کیا۔ دوسرے موسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر یہ اعتراض کیا کہ اگر وہ فی الواقع اللہ کا زمین پر نائب ہے۔ تو کم از کم نشانی کے طور پر اسے سونے کے کنگن تو پہنائے گئے ہوتے یا کم از کم اس کی حفاظت کے لیے اس کے آگے پیچھے فرشتوں کے محافظ دستے ہی اس کی حفاظت پر مامور ہوتے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں پھر وہ اللہ کا نائب کیسے ہوا؟ تمہاری عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں کہ تم میرے مقابلہ میں اس کی باتیں تسلیم کرنے لگے ہو؟

[۵۳] ایسی ہی باتیں کہہ کر فرعون نے اپنی قوم کو الو بنایا اور وہ الو بن گئے۔ اس لیے کہ وہ فاسق لوگ تھے۔ جن کو اپنے دنیوی مفادات کے علاوہ اور کسی بات سے غرض ہی نہ تھی۔ اور وہ انہیں فرعون کا غلام بنا رہنے میں ہی نظر آ رہے تھے۔ فرعون پر اگرچہ حقیقت واضح ہو چکی تھی مگر وہ یہ سارے پاپڑ اس لیے بیل رہا تھا کہ اس کی حکومت میں کمزوری اور تزلزل واقع نہ ہو۔ وہ عام لوگوں کی ذہنیت کو بھی خوب جانتا تھا کہ ایسے بے ضمیر، بے اصول اور بے عقل لوگوں سے کیسے کام نکالا اور انہیں اپنی

فٰسِقِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۵۵ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝۵۶
وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝۵۷ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ
اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝۵۸ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝۵۹

پھر جب انہوں نے ہمیں غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا(۵۵) پھر ہم نے انہیں گئے گزرے[۵۴] اور پچھلوں کے لئے نظیر بنا دیا(۵۶)

اور جب عیسیٰ ابن مریم کی مثال بیان کی گئی تو آپ کی قوم نے اس پر غل[۵۵] مچا دیا(۵۷) اور کہنے لگے: "کیا ہمارے الٰہ اچھے ہوئے[۵۶] یا وہ (عیسیٰ)؟ وہ آپ کے سامنے یہ مثال صرف کج بحثی کی خاطر لائے ہیں۔ بلکہ یہ ہیں ہی جھگڑالو[۵۷] قوم(۵۸) وہ تو محض ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل[۵۸] کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنا دیا(۵۹)

باتوں پر لگایا جا سکتا ہے؟

[۵۴] یعنی انہیں صفحۂ ہستی سے ایسا مٹا دیا کہ کوئی ان کا ذکر خیر کرنے والا باقی نہ رہ گیا۔ البتہ وہ پچھلے لوگوں کے لیے ایک نمونہ عبرت ضرور بن گئے کہ اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کا کیا انجام ہوتا ہے کیونکہ فرعون اور آلِ فرعون دراصل اللہ کے باغیوں کے پیش رو تھے۔

[۵۵] ❁ معبودوں کا جہنم میں داخلہ اور سیدنا عیسیٰ کا معاملہ:۔ جب سورۂ انبیاء کی یہ آیت ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (۲۱:۹۸) "یعنی تم بھی اور اللہ کے سوا تم جن چیزوں کو پوجتے ہو، وہ سب جہنم کا ایندھن بنیں گے" نازل ہوئی تو مشرکین مکہ نے یہ اعتراض اٹھایا کہ عبادت تو عیسیٰ علیہ السلام کی بھی کی جاتی ہے۔ تو کیا وہ بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے؟ پھر اس اعتراض کا خوب پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ عبداللہ بن الزبعریٰ نے یہی سوال رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ خاموش رہے کیونکہ آپ خود کوئی جواب دینے کی بہ نسبت یہ بات زیادہ پسند فرماتے تھے کہ مشرکوں کے ایسے اعتراضات کے جو جواب بذریعہ وحی نازل ہوں وہی ان کو جواب دیا جائے۔ آپ کی خاموشی پر مشرکین قہقہے لگانے اور کھل کھلا کر ہنسنے لگے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری اس دلیل نے محمد ﷺ کو چپ کرا دیا۔ بالفاظ دیگر ایسی مسکت دلیل پیش کر کے میدان مار لیا ہے۔

[۵۶] مشرکین مکہ نے غل یہ مچایا تھا کہ اللہ کے سوا سارے ہی معبود جہنم کا ایندھن بنیں گے تو پھر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہمارے معبودوں سے اچھے کیسے ہوئے اور ہمارے معبود ان سے کمتر کیسے ہوئے؟ پھر تو ہم اپنے ہی معبودوں کو اچھا کہیں گے۔

[۵۷] یعنی مشرکین ایسی بحث اس لیے نہیں چھیڑتے کہ اگر انہیں معقول جواب مل جائے تو اسے تسلیم کر لیں گے۔ بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ ایسی کج بحثی ان کی فطرت میں داخل ہو چکی ہے۔ اور وہ حق بات کو کج بحثیوں میں الجھا کر لوگوں کو حق کے قریب آنے سے روکنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

[۵۸] ❁ مشرکوں کو ان کی اس مسکت دلیل کا جواب:۔ اس آیت میں مشرکوں کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَإِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ
اتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾ وَلَمَّا

اور اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتے پیدا کر دیتے[۵۹] جو زمین میں تمہارے جانشین ہوتے۔(۶۰)

اور وہ (عیسیٰ) تو قیامت کی ایک علامت[۶۰] ہے۔ لہٰذا اس (کے آنے) میں ہرگز شک نہ کرو اور میری پیروی کرو یہی سیدھی راہ ہے۔(۶۱) کہیں شیطان تمہیں اس راہ سے روک نہ دے[۶۱] وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے(۶۲)

السلام معبود نہیں تھے نہ انہوں نے کبھی اپنے معبود ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ بلکہ وہ تو اللہ کے انتہائی مخلص بندے تھے۔ ہم نے ان پر کئی قسم کے انعامات بھی کیے تھے۔ ان کی بن باپ پیدائش اللہ کی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ تھی۔ پھر انہیں ایسے معجزات بھی دیئے تھے جو نہ پہلے کسی نبی کو دیئے گئے تھے اور نہ بعد میں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ مقام عبودیت سے بلند ہو کر معبود کے مقام پر جا پہنچے تھے۔ بلکہ وہ اللہ کے بندے ہی رہے اور تادم زیست وہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ ہی کہتے رہے۔ اور بنی اسرائیل کی اتباع کے لیے ایک نمونہ تھے۔

[۵۹] قریش مکہ کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اللہ کا رسول کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا۔ اس اعتراض کے مختلف مقامات پر مختلف جواب مذکور ہیں۔ یہاں یہ جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ہمیں یہ قدرت حاصل ہے کہ تم میں سے ہی فرشتے بنا دیتے۔ پھر جو فرشتہ رسول بن کر آتا سب اس کو دیکھ سکتے۔ اسکی بات سن سکتے اور سمجھ سکتے۔ مگر فرشتوں کی فطرت میں "اختیار" نہیں رکھا گیا۔ وہ تو حکم کے بندے ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت اضطراری ہوتی ہے اختیاری نہیں ہوتی۔ اور یہ بات ہماری مشیت کے خلاف ہے۔

[۶۰] یعنی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور پہلی مرتبہ دنیا میں آنا تو خاص بنی اسرائیل کے لیے ایک نشان تھا اور دوبارہ آنا قیامت کا نشان ہوگا۔ ان کے نزول سے لوگ معلوم کر لیں گے کہ اب قیامت بالکل نزدیک آ گئی ہے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب لیا ہے۔ اور بے شمار احادیث صحیحہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نزول کی تائید بھی کرتی ہیں جو بالکل قیامت کے قریب ہوگا۔ تاہم اس سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش اور آپ کو عطا کردہ معجزات بذات خود قیامت کی علامت بن سکتے ہیں۔ یعنی جو ہستی عام عادی طریقے سے ہٹ کر کسی کو بغیر باپ کے پیدا کر سکتی ہے اور اسے محیر العقول معجزات عطا کر سکتی ہے وہ قیامت کو قائم کرنے کی بھی یقیناً قدرت رکھتی ہے۔ یہ مطلب صرف اس لحاظ سے درست معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں کوئی ایسا قرینہ نہیں پایا جاتا جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد یا نزول مسیح پر دلالت کرتا ہو۔

[۶۱] یعنی جو شخص بھی قیامت کے آنے میں شک کرتا ہے وہ سمجھ لے کہ وہ شیطان کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لے کہ شیطان کی سب سے بڑی دشمنی اور سب سے بڑی گمراہی یہی ہے کہ کوئی شخص قیامت کے بارے میں شک کرنے لگ جائے۔ اور شیطان سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی ہدایات پر ناک کی سیدھ چلتا جائے۔ ادھر ادھر بالکل نہ مڑے۔

جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾
فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ

اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لے کر آئے تھے تو کہا میں تمہارے پاس دانائی [۶۲] کی باتیں لایا ہوں اور اس لئے بھی تاکہ تم پر بعض وہ باتیں واضح [۶۳] کر دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ لہٰذا اللہ سے ڈر جاؤ اور میری اطاعت کرو (۶۳) اللہ ہی میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ لہٰذا اس کی عبادت کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ (۶۴) پھر ان میں سے کئی گروہوں نے آپس [۶۴] میں اختلاف کیا۔ پس ایسا ظلم کرنے والوں کیلئے دردناک دن کے عذاب سے تباہی ہے۔ (۶۵) کیا یہ لوگ اب اس انتظار میں

[۶۲] ❁ بنی اسرائیل کی فرقہ بندی اور اختلافات کی وجوہ اور سیدنا عیسیٰ کی بعثت کا مقصد:۔ حکمت سے مراد شرعی احکام کی بصیرت اور ان کے مصالح کا علم بھی ہے، شرعی احکام پر عمل پیرا ہونے کا طریق کار بھی اور انہیں عملی طور پر معاشرہ میں نافذ کرنے کا طریقہ بھی۔

[۶۳] یعنی میری بعثت کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں شرعی احکام کے متعلق تمام حکمت کی باتیں بتاؤں اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ جن جن باتوں میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ اس کی حقیقت تم پر واضح کر دوں۔ واضح رہے کہ یہود یا بنی اسرائیل بہت سے فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ کچھ اختلاف تو ان کے قیامت سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی قیامت کے متعلق انہوں نے ایسے عقائد گھڑ لیے تھے جو عنداللہ مسئولیت کے مقصد کو ہی ختم کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔ یا وہ چونکہ انبیاء کی اولاد ہیں۔ لہٰذا جنت صرف انہی کا حق ہے۔ نیز یہ کہ انہیں دوزخ کی آگ چھو ہی نہیں سکتی مگر صرف چند دن کے لیے اور کچھ اختلاف ان کے حلت و حرمت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ پر بعض چیزوں کو حرام کر لیا تھا جنہیں اللہ نے حرام نہیں کیا تھا۔ پھر بعد میں اللہ نے سزا کے طور پر واقعی ان چیزوں کو ان پر حرام کر دیا تھا۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا: ﴿وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ (۳:۵۰) "اور میں اس لیے آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو (تمہاری سرکشی کی وجہ سے) تم پر حرام کر دی گئی تھیں ان کو (اللہ کے حکم سے) تم پر حلال کر دوں" لہٰذا اللہ سے ڈر کر ایسے اختلاف چھوڑ دو اور کچھ اختلافات اس وجہ سے پیدا ہو گئے تھے کہ ان کی کتاب تورات اپنی اصلی زبان اور عبارت و الفاظ کے لحاظ سے محفوظ نہ رہی تھی۔ اس میں بزرگوں کے اقوال اور مضامین کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے کہ انہیں خود بھی یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ اس میں الہامی الفاظ اور عبارت کون سی ہے اور الحاقی کون سی؟

[۶۴] ❁ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق بنی اسرائیل کے اختلافات:۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کے باوجود بنی اسرائیل اپنے اختلاف اور فرقہ بازی سے باز نہ آئے۔ مزید ستم یہ ڈھایا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بھی اختلاف پیدا کر کے ان اختلافات کو اور بھی زیادہ کر دیا۔ بنی اسرائیل کے ایک فرقہ نے سیدہ مریم پر تہمت لگائی اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ایسے دشمن بنے کہ حکومت وقت کے تعاون سے بزعم خویش انہیں سولی پر چڑھا کے دم لیا۔ اور جو لوگ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے وہ دوسری انتہا کو جا پہنچے۔ کسی نے انہیں اللہ کا بیٹا، کسی نے تین خداؤں میں سے ایک خدا اور کسی نے انہیں اللہ ہی قرار دے دیا۔ پھر اپنے اپنے موقف کی

إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٦﴾ الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا
الْمُتَّقِينَ ﴿٦٧﴾ يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٦٨﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا
مُسْلِمِينَ ﴿٦٩﴾ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ
وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٧١﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ

ہیں کہ ان پر یکدم قیامت آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو (۶۶) اس دن پرہیزگاروں [۶۵] کے علاوہ سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے (۶۷)۔

اے میرے بندو! آج تمہیں نہ کوئی خوف ہوگا [۶۶] اور نہ تم غمزدہ ہو گے۔(۶۸) جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور فرمانبردار بن کر رہے (۶۹) تم خود اور تمہاری بیویاں [۶۷] جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں (کے پر بہار اور پاکیزہ ماحول میں) تم خوش رکھے جاؤ گے (۷۰) ان کے سامنے سونے کی پلیٹوں اور ساغر کا دور چلے گا اور وہاں وہ سب کچھ موجود ہوگا جو دلوں کو بھائے اور آنکھوں کو لذت [۶۸] بخشے اور تم وہاں ہمیشہ رہو گے (۷۱) یہی وہ جنت ہے جس

حمایت میں ایسی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا کہ بے شمار فرقے وجود میں آ کر ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔

[۶۵] ❁ قیامت کو دینی دوستی کے علاوہ سب قسم کے دوست باہم دشمن بن جائیں گے:۔ قیامت کے دن صرف وہ دوستی برقرار رہے گی جس کی بنیاد تقویٰ پر ہوگی اور جنہوں نے صرف اللہ کی خاطر اور اللہ کے دین کی خاطر ایک دوسرے سے دنیا میں دوستی رکھی ہوگی باقی سب قسم کی دوستیاں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اور ایسی دوستیاں بھی کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً مشرکوں کی اپنے بتوں سے محبت اور آپس میں دوستی۔ اسلام کے خلاف متحدہ محاذ بنانے میں ہر قسم کے کافروں سے دوستی۔ مجرموں کی مجرموں سے جیسے ڈاکوؤں کی ڈاکوؤں سے دوستی، دنیوی مفادات کی خاطر دوستی۔ ایسی سب دوستیاں اور رشتے نہ صرف یہ کہ منقطع ہو جائیں گے بلکہ یہ سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے اور سب ایک دوسرے پر یہ الزام دھریں گے کہ فلاں میری گمراہی کا باعث بنا اور فلاں اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبا۔

[۶۶] یعنی وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ کی بنا پر دوستی رکھی ہوگی۔ نیکی کے کاموں پر ایک دوسرے سے تعاون کیا ہوگا۔ اللہ کے دین کے قیام کی خاطر آپس میں مشترکہ کوششیں کی ہوں گی۔ دین کے رشتہ کو سب رشتوں اور محبتوں سے مقدم سمجھا ہوگا۔ ایسے بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان عام ہوگا۔ کہ آج قیامت کے دن تمہیں کسی پریشانی کا خوف نہیں رکھنا چاہئے اور انہیں اپنی سابقہ زندگی پر کچھ ملال بھی نہ ہوگا۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں اپنی زندگی اللہ کی فرمانبرداری میں گزاری تھی۔

[۶۷] ازواج کا ایک مطلب تو ترجمہ سے واضح ہے اور اس کا دوسرا مطلب تمہاری ہی طرح کے تمہارے دوسرے ساتھی اور دوست، جن کی دنیا میں دوستی کی بنیاد محض تقویٰ پر تھی۔

[۶۸] اگرچہ جنت کی ساری نعمتیں ہی ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر ہوں گی مگر جو لذت و سرور اہل جنت کو دیدار الٰہی سے حاصل ہوگا۔ اتنا اور کسی نعمت سے نہ ہوگا اور یہ نعمت بھی اہل جنت کو وہاں حاصل ہوگی۔

الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ
الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا
ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ اِنَّكُمْ
مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا

کے تم وارث[۶۹] بنائے گئے ہو، ان اعمال کے عوض جو تم (دنیا میں) کرتے رہے۔(۷۲) وہاں تمہارے لئے بہت سے میوے ہوں گے جنہیں تم کھاؤ گے(۷۳) (اور) مجرم لوگ جہنم میں ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے(۷۴) ان سے عذاب کبھی کم[۷۰] نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں مایوس ہو کر پڑے رہیں گے(۷۵) اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود[۷۱] ہی ظالم تھے(۷۶) وہ پکاریں گے: "اے مالک! تمہارا پروردگار ہمارا کام ہی تمام کر دے (تو اچھا ہے) وہ کہے گا: تم ہمیشہ یہیں رہو گے(۷۷) ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے لیکن تم میں[۷۲] سے اکثر حق سے نفرت کرتے تھے"(۷۸) یا ان لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ[۷۳] کر لیا ہے (ایسی بات ہے) تو ہم بھی فیصلہ کئے دیتے ہیں(۷۹)

[۶۹] یعنی اب تم اس جنت کے ہمیشہ کے لیے مالک بن چکے۔ دنیا کی طرح عارضی ملکیت نہ ہو گی جو مرنے کے بعد دوسرے ورثاء کو از خود منتقل ہو جاتی ہے۔ وہاں نہ موت ہے اور نہ اس قسم کا کوئی خطرہ ہے۔

[۷۰] یُفَتَّرُ فتر بمعنی کسی چیز کی قوت یا رفتار میں بتدریج کمی واقع ہوتے جانا۔ قوت کے بعد کمزوری، تیز رفتاری کے بعد آہستہ آہستہ رفتار سست ہوتے جانا اور فتور کے معنی تیزی کے بعد سستی یا ٹھہراؤ۔ گویا اہل دوزخ کو جو عذاب دیا جائے گا اس میں نہ تو کمی واقع ہو گی اور نہ ہی کبھی کوئی وقفہ پڑے گا۔ مدت ہائے مدید جب ان پر ایسا سخت عذاب ہی ہوتا رہے گا اور اس میں کوئی کمی یا وقفہ نہ آئے گا تو ایسی کمی یا وقفہ سے وہ بالآخر مایوس ہو جائیں گے۔

[۷۱] یعنی ہم نے انہیں ایسے عذاب سے بچاؤ کے لیے پوری طرح بروقت خبردار کر دیا تھا۔ اور اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ سمجھنے کو انہیں عقل بھی دی تھی۔ رسول بھی بھیجے تھے اور کتاب ہدایت بھی۔ اس طرح ہم نے ہر طرح سے ان پر حجت تمام کر دی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اگر عذاب سے بچنے کی کوشش نہیں کی تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ قصور تو ان کا اپنا ہی ہے۔

[۷۲] اہل دوزخ عذاب کی شدت میں کمی یا وقفہ سے سخت مایوس ہو کر دوزخ کے فرشتہ کو، جس کا نام مالک ہو گا، پکار کر کہیں گے، مالک! نہ ہمارے عذاب میں کمی واقع ہوتی ہے نہ کبھی وقفہ پڑتا ہے تو اپنے پروردگار سے کہہ کہ ہمیں ایک ہی دفعہ مار ڈالے۔ اور یہ عذاب کا قصہ ختم ہو۔ مالک کہے گا۔ تمہارے جرائم کی سزا کے لیے بہت طویل مدت درکار ہے۔ لہٰذا مر جانے کا تصور ذہن سے نکال دو۔ تمہیں زندہ رکھ کر ہی سزا دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا تمہیں یہیں رہنا ہو گا اور زندہ ہی رکھا جائے گا۔

[۷۳] یہ کلام دوزخ کے فرشتہ مالک کا بھی ہو سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی حیثیت سے بات کر رہا ہو۔ اور خود اللہ تعالیٰ کا بھی۔ یعنی ایسی سخت سزا تمہیں اس لیے دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی سچی باتیں تم سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے تمہاری اسی اکڑ کا یہ علاج کیا جا رہا ہے۔

[۷۴] کفار مکہ کا اقدام یہ تھا کہ اسلام کی دعوت کو کبھی پروان نہ چڑھنے دیں گے۔ اس دعوت کو روکنے کے لیے بھی وہ قرآن اونچی

مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ قُلْ اِنْ
كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا
يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ
اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

یا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کے راز اور مشورے سن نہیں رہے۔ کیوں نہیں بلکہ ہمارے فرشتے [۷۵] ان کے پاس ہی لکھتے رہتے ہیں۔(۸۰) آپ ان سے کہئے کہ اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے میں اس کی عبادت [۷۶] کرنے والا ہوتا (۸۱) وہ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا مالک، عرش کا مالک ان سب باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں (۸۲) آپ انہیں چھوڑیے کہ وہ اپنی کج بحثوں اور کھیل کود میں لگے رہیں تا آنکہ وہ دن دیکھ لیں جس کا انہیں خوف دلایا جاتا ہے۔(۸۳) آسمانوں میں بھی وہی الٰہ ہے اور زمین میں بھی وہی [۷۷] الٰہ ہے اور وہ حکمت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔(۸۴) بابرکت ہے وہ ذات جس کی آسمانوں اور زمین اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں،

آواز سے پڑھنے پر مسلمانوں پر پابندی لگاتے اور کبھی اپنے آپ پر اور کہتے کہ یہ ہماری ہی غفلت اور سستی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کی دعوت پھیلتی جا رہی ہے۔ کبھی باہر سے مکہ آنے والوں سے ملاقاتیں کرتے اور کہتے اس شخص کے قریب نہ جانا جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے کیونکہ یہ رشتہ داروں میں پھوٹ ڈال دیتا ہے۔ اور کبھی پیغمبر اسلام کو مار ڈالنے کی تدبیریں کرتے غرض اس جملہ میں کفار مکہ کی سب معاندانہ سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ اور جو بھی تدبیر وہ سوچتے تھے اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر ان کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی تھی۔ تا آنکہ ان کی سب تدبیریں ناکام ہو گئیں۔ ان کے سینے جلتے رہے اور اسلام غالب ہوتا چلا گیا۔

[۷۵] ان کی خفیہ تدبیروں کی ناکامی کی اصل وجہ یہ تھی کہ جنہیں وہ اپنی خفیہ تدبیریں سمجھتے تھے وہ خفیہ نہیں ہوتی تھیں۔ ہم ان کے سب خفیہ مشورے، ان کی باہمی گفتگو ان کی سازشیں سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے فرشتے یہ سب کچھ ریکارڈ بھی کرتے جاتے ہیں۔ جو قیامت کے دن ہم ان کے سامنے لا رکھیں گے۔

[۷۶] یعنی تم کہتے ہو کہ اللہ کی اولاد ہے۔ اگر مجھے تمہاری یہ بات دل لگتی اور مجھے ایسا یقین حاصل ہو جاتا تو میں یقیناً سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوتا۔ لیکن یہ بات میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد ہو۔ اور کائنات کے تصرف میں اس کا بھی کچھ اختیار ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسی صورت ہوتی تو کائنات کے پورے کے پورے نظام میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایک سے زیادہ خداؤں کی صورت میں یہ کبھی برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔

[۷۷] ۞ مشرکوں کے کچھ خدا آسمان میں اور کچھ زمین میں:۔ مشرکوں نے کچھ خدا تو آسمان میں بنا رکھے ہیں۔ جیسے فرشتے، شمس و قمر اور کئی دوسرے سیارے اور کچھ زمین میں جیسے بت، آستانے، شجر و حجر اور بزرگوں کے مزارات۔ پھر وہ سمجھتے بھی نہیں اور اپنی بات پر اکڑ گئے ہیں۔ اور فضول قسم کی کج بحثیوں پر اتر آئے ہیں۔ لہٰذا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ قیامت کے دن ان کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ معبود برحق صرف ایک ہی ذات ہو سکتی ہے۔ اور پوری کائنات کا وہی خالق و مالک ہے۔ صرف اسی کی

بَيْنَهُمَا ۚ وَعِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ
الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ
فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾ وَقِيلِهِ يَا رَبِّ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ

سب پر حکومت ہے، قیامت کا علم اسی کو ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(۸۵)

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہیں وہ سفارش کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اِلا یہ کہ جس نے علم و یقین [۷۸] کے ساتھ حق کی گواہی دی(۸۶) اور اگر آپ انہیں پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر انہیں کہاں سے [۷۹] دھوکا لگ جاتا ہے(۸۷) اور قسم ہے رسول کے اس قول کی کہ: اے میرے پروردگار اب یہ ایسے لوگ ہیں جو کبھی ایمان [۸۰] نہ لائیں گے(۸۸) لہٰذا ان سے درگزر کیجئے اور کہئے

حکومت ہے اس کا تصرف اور اختیار کار فرما ہے۔ باقی سب چیزیں اس کی مخلوق اور مملوک ہیں جو دوسروں کے نفع و نقصان تو کجا اپنی ذات کے لیے بھی کسی طرح کے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتیں۔

[۷۸] ❁ سفارش کی اجازت کیسے لوگوں کو ہوگی اور کن کے حق میں ہوگی؟:۔ یعنی ایسے معبود جن کو لوگوں نے معبود قرار دے لیا تھا حالانکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت حق کے گواہ اور اس کے علمبردار تھے، وہ سفارش کر سکیں گے۔ جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام یا سیدنا عزیر علیہ السلام یا فرشتے یا وہ بزرگ جنہیں لوگوں نے الوہیت کا مقام دے رکھا تھا مگر وہ خود ساری عمر شرک سے منع کرتے رہے اور کلمہ حق یعنی توحید کے علمبردار بنے رہے ایسے لوگوں کو اللہ سفارش کرنے کی اجازت دے گا مگر ان لوگوں کی نہیں جنہوں نے انہیں معبود بنا رکھا تھا بلکہ صرف ان گنہگاروں کے حق میں سفارش کر سکیں گے جنہوں نے کلمہ حق یعنی توحید کی علم و یقین کے ساتھ شہادت دی ہوگی اور ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہو گئے ہوں گے۔ ضمناً اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گواہی وہی معتبر ہو سکتی ہے جس کی بنیاد علم و یقین پر ہو۔ اور مشرک جو اپنے معبودوں کے معبود ہونے پر گواہی دیتے ہیں۔ چونکہ اس گواہی کی بنیاد نہ علم (یعنی نقلی دلیل) پر ہے اور نہ یقین پر ہے بلکہ وہم و قیاس پر ہے۔ لہٰذا ان کے معبودوں کے حق میں ان کی گواہی مردود ہے مقبول نہیں۔ دنیا میں تو وہ ایسی گواہی دے رہے ہیں مگر آخرت میں ایسی گواہی نہیں چلے گی۔

[۷۹] یعنی مقدمہ کا اقرار کرتے ہیں مگر اس کے منطقی نتیجہ کا انکار کر دیتے ہیں۔ اصل میں یہ سوال یوں بنتا ہے کہ تمہارے بتوں نے نہ تو تمہیں پیدا کیا ہے۔ نہ تمہارے نفع و نقصان کے مالک ہیں پھر وہ تمہاری عبادت کے حقدار کیسے بن گئے؟ یہ دھوکا تمہیں کہاں سے لگ جاتا ہے کہ تمہیں پیدا کرنے والا اور تمہاری حاجات پوری کرنے والا تو اللہ ہو اور پرستش تم اللہ کی بجائے دوسروں کی کرنے لگ جاؤ؟

[۸۰] ایسا وقت غالباً سب پیغمبروں پر آتا ہے۔ جب وہ اپنی قوم کو سمجھانے میں اپنی جان تک کھپا دیتے ہیں۔ پھر بھی اکثر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں تو پیغمبروں کی بات سمجھنے کی بجائے ان کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ تو اس وقت پیغمبر ایسی قوم کے ایمان

سَلٰمٌ ۭ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۸۹

سلام[۸۱] ہو تمہیں۔ عنقریب انہیں (سب کچھ) معلوم ہو جائے گا۔(۸۹)

لانے سے سخت مایوس ہو جاتے ہیں اور ان کی زبان سے بے ساختہ ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے بھی اسی طرح مایوس ہو کر دعا کی تھی کہ: "یااللہ! اب ان کافروں میں سے کسی ایک کو زندہ نہ چھوڑ۔ کیونکہ ان بدبختوں کے ہاں جو اولاد ہو گی مجھے ان سے بھی ایمان لانے کی توقع نہیں رہی۔ ان کی اولاد بھی فاسق اور کافر ہی پیدا ہو گی" (۷۱: ۲۷) کچھ ایسی صورت حال رسول اللہ ﷺ کی بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اس مخلصانہ التجا اور درد بھری آواز کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ بہرحال نہ ماننے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا اللہ اپنے رسول کی ضرور مدد کرے گا اور اپنی رحمت سے ان کو غالب اور اپنے کلمہ کو سربلند کرے گا۔

[۸۱] یہ سلام دراصل ترکِ ملاقات کا سلام ہے جو کسی کی شرارتوں اور حرکتوں سے تنگ آ کر کہا جاتا ہے کہ تم اپنے حال میں مگن رہو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ یعنی آپ ان کافروں سے اور ان کی کج بحثیوں سے درگزر کیجئے۔ وہ وقت بس آنے ہی والا ہے جب ساری حقیقت کھل کر ان کے سامنے آ جائے گی۔ چنانچہ اس حقیقت کا بہت حد تک تو ان مشرکوں کو دنیا میں ہی پتا چل گیا۔ اور پورا پتا آخرت کو لگ جائے گا۔

سورۃ الدخان مکیۃ ۵۹ آیاتھا رکوعھا ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾ فِيْهَا يُفْرَقُ

کلمات ۳۴۹ آیات ۵۹ (۴۴) سورۃ الدخان مکی ہے (۶۴) رکوع ۳ حروف ۱۴۹۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

حا۔ م (۱) اس واضح کتاب کی قسم (۲) کہ ہم نے اسے خیر و برکت والی[۱] رات میں نازل کیا ہے کیونکہ ہمیں بلاشبہ اس سے ڈرانا[۲] مقصود تھا (۳) اس رات ہمارے حکم سے ہر

[۱] لیلۃ القدر اور شب برات ایک ہی رات ہے:۔ یعنی جس رات قرآن نازل ہوا وہ بڑی خیر و برکت والی رات تھی۔ کیونکہ اس رات کو تمام دنیا کی ہدایت کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ اس مقام پر اس رات کو ﴿لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ کہا گیا اور سورۃ القدر میں ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ﴾ یعنی بڑی قدر و منزلت والی رات یا وہ رات جس میں بڑے اہم امور کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

مطلب دونوں کا ایک ہی ہے بالفاظ دیگر ایک ہی رات کو یہاں ﴿لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ کہا گیا ہے اور سورۃ القدر میں ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ﴾۔ اور سورۂ بقرہ میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ یہ رات ماہ رمضان المبارک کی رات تھی۔ (۲:۱۸۵) اور احادیث صحیحہ میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ یہ رات ماہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ہوتی ہے۔ اور اکثر اقوال کے مطابق یہ رمضان کی ستائیسویں رات ہوتی ہے۔ مگر بعض ناقابل احتجاج روایات کی بنا پر بعض لوگوں نے اس رات کو دو الگ الگ راتیں قرار دے لیا یعنی ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ﴾ کو تو رمضان کے آخری عشرہ میں ہی سمجھا اور ﴿لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ کو ماہ شعبان کی پندرہ تاریخ قرار دے دیا۔ اور اس کا نام شب قدر یا شب برات رکھ لیا۔ حالانکہ شب کا لفظ لیلۃ کا فارسی ترجمہ ہے اور برات کا لفظ قدر کا۔ گویا ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ﴾ کا ہی فارسی زبان میں ترجمہ کر کے ایک دوسری رات بنا کر اس کا تہوار منانے لگے اور اس میں پٹاخے اور آتش بازی چلانے لگے۔ گویا جو کام ہندو اپنے دسہرہ کے موقع پر کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں نے شب برات سے متعلق کر کے اپنے تہوار منانے کے شوق کو پورا کر لیا۔

رہی یہ بات کہ کیا سارے کا سارا قرآن اسی رات اترا تھا جیسا کہ بظاہر اس سورت اور سورۃ القدر سے معلوم ہوتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سارے کا سارا قرآن ہی لوح محفوظ سے نقل کر کے فرشتوں اور بالخصوص جبرئیل علیہ السلام کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔ یا یہ سارا قرآن آسمان دنیا پر اتار دیا گیا تھا۔ پھر یہ وہاں سے حسب موقع و ضرورت تئیس سال تک رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔ البتہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات اسی رات رسول اللہ پر غار حرا میں نازل ہوئی تھیں۔

[۲] یعنی قرآن کریم کے نازل کرنے سے ہمارا مقصود یہ تھا کہ اس سے تمام اہل عالم کو ان کے انجام سے خبردار کیا جائے اور ان کی گمراہی اور برے اعمال کی سزا سے انہیں ڈرایا جائے۔

كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝٤ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝٥ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ۝٦ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝٧ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ

معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ کر دیا[۳] جاتا ہے(۴) بلاشبہ ہم ہی رسول بھیجنے والے ہیں(۵) اور یہ آپ کے پروردگار کی رحمت کی بنا[۴] پر تھا بلاشبہ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے(۶) وہ آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے سب چیزوں کا مالک ہے، اگر تم واقعی یقین[۵] کرنے والے ہو(۷)

اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، وہ تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباء واجداد[۶]

[۳] ❁ لیلۃ القدر کو کس قسم کے فیصلے ہوتے ہیں؟:۔ یعنی جس رات قرآن کا نزول ہوا اس رات آئندہ سال میں دنیا پر واقع ہونے والے اہم امور کے نہایت ٹھوس اور پائیدار فیصلے کر کے فرشتوں کے حوالہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ فیصلے سراسر حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور اسی مضمون کو سورۃ القدر میں یوں بیان فرمایا کہ ''اس رات ملائکہ اور جبریل اپنے پروردگار کے اذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اترتے ہیں'' (۹۷:۴) اس آیت سے معلوم ہوا کہ کائنات کے نظم و نسق کے بارے میں یہ ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ افراد، اقوام اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے کر کے اپنے فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے۔ پھر وہ انہی فیصلوں کے مطابق عملدر آمد کرتے رہتے ہیں۔ یعنی افراد یا اقوام کی زندگی اور موت، فتح و شکست، عروج و زوال، قحط اور ارزانی اور رزق وغیرہ سے متعلق فیصلے اسی رات میں کر دیئے جاتے ہیں۔

[۴] ❁ آپ رحمۃ للعالمین تھے:۔ یعنی تمام اہل عالم کے لئے ایک خبردار کرنے والا رسول بھیجنا صرف ہماری حکمت کا ہی تقاضا نہ تھا بلکہ یہ اہل عالم پر ہماری رحمت کا بھی تقاضا تھا۔ وہ لوگوں کی پکار اور فریاد بھی سنتا ہے اور ان کے حالات کو جانتا بھی ہے۔ اسی لیے اس نے عین ضرورت کے مطابق خاتم النبیین ﷺ کو قرآن دے کر اور تمام اہل عالم کے لیے رحمت کبریٰ بنا کر مبعوث فرمایا۔ تاکہ کفر و شرک کی گمراہیوں میں پھنسی اور ظلم و جور میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ دکھادی جائے کہ کس طرح وہ اپنی باہمی نہ ختم ہونے والی لڑائیوں، لوٹ مار اور قتل و غارت سے نجات حاصل کر کے دنیا میں امن و چین کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

[۵] یعنی اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ کائنات میں موجود ساری مخلوق کی ربوبیتِ عامہ کی ذمہ داری صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو پھر تمہیں یہ بھی یقین کر لینا چاہئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے ہی تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ کیونکہ وہ صرف تمہاری جسمانی تربیت کا ہی ذمہ دار نہیں بلکہ تمہاری روحانی تربیت اور تمہیں ہدایت کی راہ بتانا بھی اس کے ذمہ ہے۔

[۶] یعنی تم ہی نہیں بلکہ تمہارے آباء واجداد بھی اس غلطی اور گمراہی میں مبتلا تھے۔ ان کا پروردگار بھی وہی معبودِ برحق ہے جو زندہ کر سکتا اور مار سکتا ہے۔ لہٰذا انہیں بھی اسی معبود کی عبادت کرنا چاہئے تھی۔ اب تم اپنے آباء کی اس غلطی اور گمراہی کو ہی سند

وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ۝۸ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ۝۹ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ۝۱۰
يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝۱۱ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ۝۱۲ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ

کا بھی(٨) مگر وہ اس معاملہ میں شک [٧] میں پڑے کھیل رہے ہیں(٩) سو آپ اس دن کا انتظار کیجئے جب آسمان سے صریح [٨] دھواں ظاہر ہوگا(١٠) جو لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ دردناک عذاب ہوگا(١١) (اس وقت لوگ واویلا کریں گے) اے ہمارے پروردگار! ہم سے اس عذاب کو دور کردے ہم ایمان لاتے ہیں(١٢) اس وقت انہیں نصیحت کیونکر کارگر ہوگی

بنا کر اپنے لیے غیر اللہ کی عبادت کا جواز پیش کرنا چاہتے ہو؟۔

[٧] اس شک کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس معاملہ کے مقدمہ میں بھی شک میں مبتلا ہیں۔ محض باپ دادا کی تقلید میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ زمین و آسمان اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی پورا یقین نہیں ہے۔ لہٰذا اس مقدمہ کا نتیجہ بھی ان کے نزدیک مشکوک ہوگیا ہے اور وہ ان سب باتوں کو محض کھیل تماشا ہی سمجھتے ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ خواہ وہ بڑے زور شور سے اس بات کے مدعی ہیں کہ قیامت اور آخرت وغیرہ کوئی چیز نہیں اور نہ ہی ہمیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ مگر ان کے دلوں کے اندر یہ شک موجود رہتا ہے کہ اگر قیامت کا عقیدہ درست ہوا تو ہماری شامت آجائے گی۔ لہٰذا وہ دونوں طرف سے شک و شبہ میں پڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی چیز کا بھی یقین نہیں ہوتا۔ اور جو قیامت کے متعلق باتیں بناتے اور مذاق اڑاتے ہیں یہ سب کچھ شغل اور کھیل تماشے کے طور پر کرتے ہیں۔

[٨] ❁ قریش پر قحط کا عذاب:۔ آیت نمبر ١٠ سے نمبر ١٦ تک تفسیر میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بڑے زور شور اور یقین کے ساتھ ان آیات کی تفسیر درج ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کی بات نہ مانی اور شرارتوں پر کمر باندھی تو آپ ﷺ نے یوں بددعا فرمائی اے اللہ! ان پر سیدنا یوسف علیہ السلام کے زمانہ کی طرح سات سال کا قحط بھیج کر میری مدد فرما۔ آخر ان پر ایسا سخت قحط نازل ہوا کہ وہ ہڈیاں اور مردار تک کھانے لگے اور نوبت بایں جا رسید کہ ان میں سے اگر کوئی شخص بھوک کی شدت میں آسمان کی طرف دیکھتا تو ایک دھواں سا دکھائی دیتا۔ اس وقت ابوسفیان آپ ﷺ کے پاس آکر کہنے لگا: محمد ﷺ! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، دعا کرو اللہ یہ قحط ختم کردے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔ اور مشرک بھی کہنے لگے: پروردگار! ہم پر یہ عذاب دور کردے۔ ہم ایمان لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا۔ دیکھو جب یہ عذاب موقوف ہوا تو یہ لوگ پھر شرک کرنے لگیں گے۔ خیر آپ کی دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ عذاب اٹھالیا تو وہ پھر کفر شرک کرنے لگے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ ﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ﴾ میں بطشۃ سے مراد بدر کی سزا ہے۔ رہا آخرت کا عذاب تو وہ ان سے کبھی موقوف نہ ہوگا۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ پانچ چیزیں ہیں جو گزر چکیں۔ لزام (بدر میں قیدیوں کی گرفتاری)، روم کا دوبارہ غلبہ' بطشۃ (بدر کی ذلت آمیز شکست) چاند (کا پھٹنا) اور دخان (دھوئیں کا عذاب) (بخاری۔ کتاب التفسیر)

❁ دخان مبین سے کون سا دھواں مراد ہے؟:۔ اور سیدنا عبداللہ بن عباسؓ آیت نمبر ١٠ میں مذکور دھوئیں سے مراد وہ

جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ
قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ
فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا

حالانکہ ان کے پاس کھول کر بیان کرنے والا رسول آچکا (۱۳) پھر ان لوگوں نے اس (رسول) سے منہ پھیر لیا اور کہنے لگے: یہ تو سکھایا پڑھایا[9] دیوانہ ہے (۱۴) ہم تھوڑی مدت کے لئے عذاب ہٹادیں گے مگر تم لوگ پھر وہی[10] کچھ کرو گے جو پہلے کرتے رہے (۱۵) (پھر) جس دن ہم بڑی سخت گرفت کریں گے تو پھر انتقام لے کے رہیں گے (۱۶)

ان سے پہلے ہم فرعون کی قوم کو آزما چکے[11] ہیں۔ ان کے پاس ایک معزز[12] رسول آیا (۱۷) (جس نے کہا کہ) اللہ کے بندوں کو میرے حوالے[13] کر دو۔ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں (۱۸) اور یہ کہ اللہ کے مقابلہ میں

دھواں لیتے ہیں جو قیامت کے قریب چھا جائے گا اور وہ قیامت کی ایک علامت ہو گا روایات کے مطابق یہ دھواں چالیس دن زمین کو محیط رہے گا۔ نیک آدمی پر اس کا اثر خفیف ہو گا جس سے انہیں زکام سا ہو جائے گا اور کافر و منافق کے لیے یہ دھواں سخت تکلیف دہ ثابت ہو گا۔ یہ دھواں شاید وہی سماوات کا مادہ ہو جس کا ذکر ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾ (۴۱:۱۱) میں ہوا ہے اور وہ ﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى﴾ سے مراد قیامت کا عذاب لیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب، تاہم ان آیات میں مذکور واقعات رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی تفسیر زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے۔

[9] یعنی کبھی تو کہتے تھے کہ کوئی عجمی اسے قرآن سکھا جاتا ہے پھر وہ اپنی طرف سے ہم پر پیش کر کے کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ اور جب آپ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اگر تم لوگ اللہ کی دعوت پر ایمان لے آؤ تو تم عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے۔ تو آپ ﷺ کو دیوانہ کہنے لگتے تھے۔ گویا یہ دونوں الگ الگ مواقع پر کافروں کے الزامات ہیں۔ جو یہاں اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔

[10] یعنی اگر ہم ان پر سے یہ قحط کا عذاب کچھ مدت کے لیے ہٹا بھی دیں تو پھر وہی حرکتیں کرنے لگیں گے جو پہلے کرتے رہے اور اس قحط کے طبعی اسباب تلاش کرنے لگیں گے۔ پھر بھی انہیں یہ خیال نہیں آئے گا کہ ہمیں ہماری شرارتوں کی سزا اس صورت میں ملی تھی۔

[11] فرعونیوں کی بار بار کی عہد شکنی:۔ یعنی وہ بھی انتہائی ہٹ دھرم اور عہد شکن لوگ تھے۔ جب ان پر کوئی عذاب آتا تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے التجا کرتے کہ اللہ سے دعا کرو ہم پر سے یہ عذاب ہٹا دے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ پھر جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ عذاب دور ہو جاتا تو وہ پھر اکڑ جاتے۔ اور انہوں نے بار بار ایسی عہد شکنی کی تھی۔ یہ کفار مکہ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

[12] یعنی ایسا رسول جو نہایت اعلیٰ اور بلند سیرت و کردار کا مالک تھا۔ مراد سیدنا موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

[13] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مطالبہ:۔ اس آیت کے دو مطلب یہ ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے واضح ہے اور قرآن میں

عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْۤ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

سرکشی نہ کرو[۱۴]۔ میں تمہارے سامنے صریح سند پیش کرتا ہوں(۱۹) اور میں نے اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ لے لی کہ تم مجھے[۱۵] سنگسار کر سکو(۲۰) اور اگر تم میری بات پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ[۱۶] سے الگ ہو جاؤ(۲۱) پھر موسیٰ نے اپنے پروردگار کو پکار کر کہا[۱۷] کہ: "یہ لوگ مجرم ہیں" (۲۲) (اللہ نے حکم دیا کہ) اور میرے بندوں کو رات کے وقت لے کر نکل جاؤ۔ یقیناً تمہارا تعاقب[۱۸] کیا جائے گا۔(۲۳)

متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے پہلا مطالبہ یہ تھا کہ میں اللہ کا رسول ہوں لہٰذا مجھ پر ایمان لاؤ اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ قوم بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر کے میرے ہمراہ روانہ کر دو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ "اے اللہ کے بندو! میرا حق مجھے ادا کرو" یعنی میری بات مانو اور مجھ پر ایمان لاؤ۔ یہ اللہ کی طرف سے تم پر میرا حق ہے۔ اور مابعد کا جملہ کہ "میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں" اس دوسرے مطلب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

[۱۴] یعنی جب میں اللہ کی طرف سے تمہارے سامنے صریح سند یا ایسے معجزات پیش کر رہا ہوں جو اس کی طرف سے میرے رسول ہونے پر واضح ثبوت ہیں تو پھر جو کچھ دعوت میں پیش کر رہا ہوں وہ اللہ ہی کی دعوت ہے۔ اگر تم میری مخالفت کرو گے اور سرکشی پر اتر آؤ گے تو یہ دراصل اللہ ہی کی سرکشی اور بغاوت کے مترادف ہے۔ اب خود سوچ لو کہ اللہ سے سرکشی کرنے کے بعد تم اس کی گرفت سے بچ سکتے ہو؟

[۱۵] **فرعون کا سیدنا موسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ:** یہ اس وقت کی بات ہے جب اندر ہی اندر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پھیل رہی تھی۔ بنی اسرائیل کے علاوہ قوم فرعون کے بھی بہت سے آدمی در پردہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے اور فرعون کو اپنی سلطنت کے چھن جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اس نے اپنے درباریوں سے اور قوم کے لوگوں سے کہا تھا کہ "مجھے چھوڑو میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں ورنہ وہ تمہارا دین بھی تباہ کر دے گا اور ملک میں سخت بدامنی پھیلا دے گا" اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے پروردگار کی پناہ میں آ چکا ہوں۔ لہٰذا تم میرا بال بھی بیکا نہ کر سکو گے۔ مجھے رجم کرنا تو دور کی بات ہے۔

[۱۶] یعنی اگر تم میری دعوت قبول نہیں کرتے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور مجھے ایذا نہ پہنچاؤ۔ ورنہ تم کبھی اللہ کی گرفت سے بچ نہ سکو گے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو نہ لاؤ۔ مگر میری راہ نہ روکو اور بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ جانے دو۔

[۱۷] **سیدنا موسیٰؑ کی اپنے اللہ سے فریاد:** موسیٰ علیہ السلام کی یہ فریاد ویسی ہی فریاد ہے جو انبیائے کرام اپنی قوم کو سمجھانے اور ان کی طرف سے پوری طرح مایوس ہو جانے کے بعد کیا کرتے ہیں۔ گویا اس فریاد کا زمانہ ٹھیک وہی زمانہ ہے۔ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل اور ایمانداروں کے ہمراہ ہجرت کرنے کا حکم ملا تھا۔

[۱۸] **سیدنا موسیٰؑ کو ہجرت کا حکم اور تعاقب کی خبر:** بنی اسرائیل تو سب کے سب ہی آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ گو ان

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ
كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۣ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ
السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ

اور سمندر کو کھڑے کا کھڑا چھوڑ کر پار نکل جاؤ۔ (تمہارے بعد) ان کا تمام [۱۹] لشکر ڈبو دیا جائے گا (۲۴) وہ کتنے ہی باغ اور چشمے چھوڑ گئے (۲۵) اور کھیت اور عمدہ عمارتیں بھی (۲۶) اور نعمت کے سامان بھی جن سے وہ مزے اڑاتے تھے (۲۷) اسی طرح ہوا۔ اور ہم نے ایک دوسری [۲۰] قوم کو ان کا وارث بنا دیا۔ (۲۸) پھر نہ آسمان ان پر رویا [۲۱] اور نہ زمین اور نہ ہی انہیں کچھ مہلت دی گئی (۲۹) اور بنی اسرائیل کو ہم نے رسوا کرنے والے عذاب سے نجات دی۔ (۳۰)

میں سے اکثر اپنے ایمان کو فرعون کی ایذا رسانی کے خوف سے ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ قوم فرعون کے بھی آپ پر ایمان لا چکے تھے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ان سب ایمانداروں کو ساتھ لے کر خفیہ طریقے سے مصر سے ہجرت کر جائیں۔ یہ لوگ ایک لاکھ سے زائد نفوس تھے۔ چنانچہ آپ نے خفیہ طریقہ سے سب کو ہجرت کا پیغام پہنچایا اور وقت اور جگہ بھی مقرر کر دی گئی جہاں وہ سب اکٹھے ہو کر ہجرت کے لیے روانہ ہوں گے۔ ساتھ ہی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع بھی دے دی گئی کہ فرعون اور آلِ فرعون تمہارا تعاقب کریں گے۔ لہٰذا یہ ہجرت کا سفر چاک و چوبند رہ کر اور ہر احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرنا ہو گا۔

[۱۹] سمندر کو کھڑے کا کھڑا چھوڑنے کی ہدایت اور فرعون کی غرقابی:۔ اس مقام پر جستہ جستہ واقعات کی طرف اشارے ہی کیے گئے ہیں۔ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی سمندر سے پار اتر چکے تو انہوں نے دیکھا کہ فرعون اور اس کا عظیم لشکر ان کے تعاقب میں سمندر کے دوسرے ساحل پر پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو خیال آیا کہ سمندر کے پانی پر پھر اپنا عصا ماریں تاکہ سمندر کا پانی پھر سے رواں ہو جائے۔ اور فرعون اور اس کا لشکر سمندر کے دوسرے ساحل پر ہی کھڑے کے کھڑے رہ جائیں اور سمندر میں بنے ہوئے خشک راستے سے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا تعاقب نہ کر سکیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ ایسا مت کرو۔ قوم اور اس کے لشکر کو دریا میں داخل ہونے دو۔ اسی سمندر میں ہی تو ہم نے ان لوگوں کو غرق کرنا ہے۔

[۲۰] یہ دوسری قوم کون تھی جو فرعون اور آل فرعون کے محلات، باغات، چشموں اور کھیتوں کی وارث بنی تھی؟ اس کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل ہی کے کچھ لوگ مصر میں باقی رہ گئے تھے۔ جو فرعون اور آلِ فرعون کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد ان چیزوں کے وارث بن گئے تھے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے علاوہ کوئی اور لوگ تھے۔ قرآن کریم سے دو باتوں کی تائید ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ یہاں بھی ﴿قَوْمًا اٰخَرِيْنَ﴾ کے الفاظ دوسری صورت کی تائید کرتے ہیں۔ نیز تاریخ سے بھی فرعون کی غرقابی کے بعد مصر میں بنی اسرائیل کی حکومت ثابت نہیں ہوتی۔

[۲۱] زمین اور آسمان کے رونے کے مختلف مفہوم:۔ زمین اور آسمان کے نہ رونے سے مراد یہ ہے کہ ان پر نہ زمین کی مخلوق کو رونا آیا یا افسوس لگا اور نہ آسمان میں بسنے والی مخلوق کو۔ بلکہ زمین والے تو ایسے ظالموں کے مرنے پر خوشی مناتے ہیں کہ ان کے

فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ
مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰۗــؤٌا مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ اِنْ هِىَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ

(یعنی) فرعون[۲۲] سے وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے سر نکال[۲۳] رہا تھا۔(۳۱) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی بنا پر اہل عالم[۲۴] پر ترجیح دی(۳۲) اور ہم نے انہیں ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح آزمائش[۲۵] تھی(۳۳) یہ لوگ تو یہ کہتے ہیں(۳۴) یہ ہماری بس پہلی موت ہی ہے اور ہم دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے(۳۵)

ظلم و تشدد سے جان چھوٹی اور "خس کم جہاں پاک" کے مصداق اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں وہ بھلا روئیں گے کیوں؟ یہی حال آسمانوں کی مخلوق کا ہے۔ ایسے لوگوں کی روح کو جب مرنے کے بعد اوپر لے جایا جاتا ہے تو ان کے لیے آسمان کا دروازہ کھلتا ہی نہیں وہ ایسی ارواح پر پھٹکار بھیجتے ہیں وہ ان کی موت پر کیسے رو سکتے یا افسوس کر سکتے ہیں۔ تاہم اگر ان الفاظ کو ان کے ظاہری مفہوم پر ہی محمول کیا جائے تو بھی اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال کے اثرات ہمارے اعضاء و جوارح پر اور خود زمین پر ثبت ہو رہے ہیں تو پھر ہمیں آسمان و زمین کے رونے یا افسوس کرنے پر بھی تعجب نہ کرنا چاہیے۔ اور بعض روایات سے ایسی باتیں ثابت بھی ہیں۔ علاوہ ازیں ہر زبان میں ایسے الفاظ محاورتاً بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جن پر نہ کسی نے کبھی تعجب کیا ہے اور نہ اعتراض۔

[۲۲] یعنی فرعون کی ذات ہی بنی اسرائیل کے حق میں مجسم عذاب بنی ہوئی تھی جس کا ہر وقت کام یہ سوچنا ہوتا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو زیادہ سے زیادہ رسوا کن سزائیں کیسے دے سکتا ہے؟

[۲۳] یعنی حد سے بڑھنے والے تو اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ ایسے لوگوں میں بھی فرعون کا سر سب سے اونچا تھا۔ جس کی حکومت اپنے دور میں سب سے بڑی اور مستحکم تھی۔ جس کا خاندان اپنے آپ کو سورج جیسی خاندان سے منسوب کرتا تھا اور جو اپنی رعایا کا قانونی اور سیاسی خدا بنا ہوا تھا اور ایسی خدائی کا دھڑلے سے دعویٰ بھی رکھتا تھا۔ اس نے جب اللہ کے رسول کو جھٹلایا اور اس کی مخالفت پر اتر آیا تو اے کفار مکہ! تم نے اس کا حشر دیکھ لیا اور تم تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اپنی چھوٹی چھوٹی قبائلی سرداریوں پر اتراتے پھرتے ہو۔ تم اگر وہی فرعون والی سرکشی کی راہ اختیار کرو گے تو اپنا انجام خود سوچ لو۔

[۲۴] یعنی یہ بات عرب جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں کئی قسم کی خامیاں موجود ہیں۔ تاہم دوسری قوموں کی نسبت پھر بھی بہتر ہیں۔ لہٰذا ہم نے اہل عالم کی دینی قیادت انہیں کے سپرد کر دی۔

[۲۵] ❁ بلاء کا لغوی مفہوم' قوم موسیٰ پر اللہ تعالیٰ کے احسانات:۔ بلاء کا بنیادی معنی ایسی آزمائش ہے جو ایسے حادثات اور واقعات سے تعلق رکھتی ہو جسے دوسرے لوگ بھی دیکھ سکتے ہوں۔ اور یہ آزمائش خیر اور شر دونوں صورتوں میں ہو سکتی ہے۔ یعنی احسانات سے نواز کر بھی اور تنگی یا تکلیف پہنچا کر بھی اس مقام پر یہ آزمائش خیر کی صورت میں ہوئی۔ اسی لیے بعض مترجمین نے اس لفظ کا ترجمہ احسان سے کیا ہے بعض نے مدد سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل پر ایسے احسانات کیے جن میں ان کی مدد بھی تھی اور آزمائش بھی اور اس سے مراد اللہ کے وہ احسانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے میدان تیہ میں بنی اسرائیل پر کیے تھے جن کے بغیر ان کا زندہ رہنا بھی محال تھا اور یہ سب احسانات معجزات کی قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ جیسے من و سلویٰ کا

بِمُنْشَرِينَ ﴿۳۵﴾ فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۶﴾ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۳۷﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ﴿۳۸﴾ مَا

اگر تم سچے ہو تو ہمارے آباء و اجداد کو لا کے [۳۶] دکھاؤ۔(۳۶) کیا یہ بہتر ہیں یا قوم تبع [۳۷]؟ اور اس سے پہلے [۳۸] کے لوگ؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ کیونکہ وہ مجرم تھے (۳۷) نیز ہم نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو چیزیں ان کے درمیان ہیں انہیں کھیل کے طور پیدا نہیں کیا (۳۸)

نزول۔ بارہ چشموں کا پھوٹنا اور بادل کا ان پر سایہ کیے رہنا وغیرہ وغیرہ۔

[۳۶] کفار کا یہ اعتراض کہ ہمارے آباء کو زندہ کر کے دکھاؤ:۔ کفار کا یہ مطالبہ تین وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔ ایک یہ کہ رسول کی ذمہ داری صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ خدائی اختیارات کا نہ وہ کبھی دعویٰ کرتا ہے اور نہ اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں کہ جب کوئی کافر ایسا مطالبہ کرے تو اس کا کوئی بڑا بزرگ اسے دوبارہ زندہ کر کے دکھا دے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی نبی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اسی دنیا میں بھیجا جائے گا بلکہ وہ جہاں ہی دوسرا ہو گا جس میں مردے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ نبی یہ خبر دیتا ہے کہ تمہاری دوبارہ زندگی قیامت کے دن ہو گی تو کیا یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قیامت سے پہلے ہی ایک اور قیامت آ جائے۔ حالانکہ قیامت کا وقت مقرر ہے اور وہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ پھر جب ان کے باپ دادا یا یہ خود زندہ ہوں گے تو انہیں اپنے اس مطالبہ کی ہوش بھی رہے گی بلکہ دوسرے کئی قسم کے فکر دامن گیر ہو جائیں گے۔

[۳۷] قوم تبع کا ذکر:۔ تُبع شاہان یمن کا لقب ہے۔ جو حمیری قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جیسے ایران کے بادشاہوں کا لقب کسریٰ، روم کے بادشاہوں کا لقب قیصر اور حبشہ کے بادشاہوں کا لقب نجاشی تھا۔ تبع 'قوم تبع کے جد امجد کا نام تھا۔ یہ بذات خود ایک ایماندار آدمی تھا اور اپنے وقت میں اس کا ڈنکا بجتا تھا۔ اس نے بہت سے علاقے بھی فتح کر لیے تھے۔ مگر اس کے بعد میں آنے والے لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے اور اللہ سے سرکشی کی راہ اختیار کر لی تھی۔ ان بادشاہوں کا زمانہ ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک ہے۔ عرب میں صدیوں تک ان کی عظمت کے افسانے زبان زد خلائق رہے۔

[۳۸] کفار کے اعتراض کا پہلا جواب تاریخ سے متعلق:۔ پہلے کے لوگوں سے مراد قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم نیز نمرود، شداد اور فراعنہ مصر وغیرہ ہیں۔ اپنے اپنے دور میں ان سب قوموں کی عظمت کا ڈنکا بجتا تھا۔ اور یہ سب لوگ اللہ کے نافرمان اور آخرت کے منکر تھے اور یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ اخلاقی انحطاط فتنہ و فساد اور ظلم و جور میں مبتلا ہو گئی اور بالآخر اسے تباہ کر دیا گیا۔ کفار مکہ سے پوچھا یہ جا رہا ہے کہ ان قوموں نے جب آخرت کا انکار کیا اور سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان کو ہلاک کر ڈالا گیا تھا۔ حالانکہ وہ تم سے ہر لحاظ سے بہتر تھے تو پھر تم کس کھیت کی مولی ہو کہ تم اپنے انجام سے بچ جاؤ گے۔ یہ گویا کفار مکہ کی اس کٹ حجتی "کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے آباء و اجداد کو لا کے دکھا دو" کا پہلا جواب ہے جو تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔

خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ

بلکہ انہیں حقیقی مصلحت سے پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ [۲۹] یہ بات جانتے نہیں۔(۳۹)

فیصلے کا دن ان سب سے وعدہ کا وقت [۳۰] ہے (۴۰) جس دن کوئی دوست اپنے دوست کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ہی انہیں کہیں سے مدد ملے گی۔(۴۱) مگر جس پر اللہ نے رحم کر دیا۔ کیونکہ وہ ہر چیز [۳۱] پر غالب اور رحم [۳۲] کرنے والا ہے۔(۴۲)

[۲۹] دوسرا عقلی جواب: یہ کائنات بیکار پیدا نہیں کی گئی:۔ یہ کفار مکہ کی اس کٹ حجتی کا عقلی جواب ہے۔ یعنی جو شخص روز آخرت اور اپنے اعمال کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ دراصل یہ سمجھتا ہے کہ یہ کارخانہ کائنات بس ایک کھیل تماشا ہی ہے۔ اور اس دنیا میں کوئی شخص جو چاہتا ہے کرتا رہے۔ وہ مر کر مٹی ہو جائے گا اور اسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔ اور خالق کائنات نے بس یونہی ایک شغل اور کھیل تماشے کے طور پر پیدا کر دیا ہے۔ حالانکہ اس کائنات کی ایک ایک چیز میں باہمی ربط، نظم و نسق، انضباط، باقاعدگی اور ہر چیز کا کثیر المقاصد اور اسی نسبت سے افادیت سے معمور ہونا اس بات پر کھلی شہادت ہے کہ اس کائنات کا خالق انتہا درجہ کی دانا اور مدبر ہستی ہی ہو سکتی ہے۔ اور کوئی دانا بے کار اور عبث کام نہیں کیا کرتا۔ لامحالہ یہ کائنات کسی نتیجہ پر منتج ہونی چاہئے۔ اور اسی نتیجہ کا نام دوسرا جہان یا روز آخرت ہے۔ قرآن میں بہت سے دوسرے مقامات پر روزِ آخرت پر ایک دوسری عقلی دلیل پیش کی گئی ہے جو یہ ہے کہ جو شخص روز آخرت کا منکر ہے وہ دراصل سمجھتا ہے کہ نیک اور بد (یا نیکی یا بدی) سب برابر ہیں۔ دونوں کا انجام یہی ہے مر کر مٹی میں مل کر مٹی بن جائیں۔ حالانکہ اس بات کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا کہ نیک اور بد ایک جیسے ہوتے ہیں یا ان دونوں کا انجام ایک ہی جیسا ہونا چاہئے گویا روزِ آخرت سے انکار اللہ تعالیٰ کی صفات حکمت اور عدل دونوں کی نفی کر دیتا ہے۔

[۳۰] تیسرا جواب: دوبارہ زندگی کا اصل وقت:۔ یہ بھی کافروں کے مطالبہ کا جواب ہے۔ یعنی اس دن صرف تمہارے باپ دادا ہی زندہ نہیں ہوں گے تمہیں بھی ان کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔ اس وقت مقررہ پر تم سب کو اکٹھا کر دیا جائے گا۔ کوئی بھی باقی نہ رہے گا اور تم سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہو گے۔ مگر سب اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں گے۔ اس دن تمہیں ایسی سب کٹ حجتیاں بھول جائیں گی اور کوئی ایک دوسرے کی مدد کرنے کے قابل ہی نہ رہے گا۔

[۳۱] یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کسی کے حق میں جو فیصلہ کر دے گا وہ نافذ ہو کے رہے گا اور اس کی کہیں اپیل بھی نہ ہو سکے گی کیونکہ وہی سب پر غالب ہے۔

[۳۲] یعنی وہ فیصلہ کرتے وقت کسی پر رحم تو کر سکتا ہے۔ مگر کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ بات اس کی صفت عدل کے خلاف ہے۔ وہ یہ تو کر سکتا کہ ایک قصوروار کو معاف کر دے یا اس کے جرم سے کم سزا دے یا اس کے عمل سے بہت زیادہ بدلہ دے دے اور بیشتر مقدمات میں وہ اپنی اسی صفت رحیمیت کا ہی مظاہرہ کرے گا۔ سزا صرف ان لوگوں کو دے گا جنہوں نے شرک کیا ہو۔ یا ازراہِ تکبر دعوتِ حق کو ٹھکرا دیا ہو اور پھر معاندانہ سرگرمیوں میں ہی لگے رہے ہوں۔

ع ۲ ۱۵

الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ
الْحَمِيْمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۸﴾
ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ
اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ

بلاشبہ تھوہر کا درخت (۴۳) گنہگار کا کھانا [۳۳] ہوگا (۴۴) جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں جوش مارے گا (۴۵) جیسے کھولتا ہوا پانی جوش مارتا ہے (۴۶) (پھر حکم ہوگا کہ) اسے پکڑ لو پھر اسے گھسیٹتے گھسیٹتے جہنم کے درمیان تک لے جاؤ (۴۷) پھر کھولتے پانی کا عذاب اس کے سر پر اوپر سے انڈیل دو (۴۸) (پھر اسے کہا جائے گا کہ اب سزا) چکھ، تو بڑا معزز اور شریف [۳۴] بنا پھرتا تھا (۴۹) یہ کچھ ہے جس میں تم لوگ شک کیا کرتے تھے (۵۰) (اس کے مقابلہ میں) پرہیزگار لوگ امن کی جگہ میں ہوں گے (۵۱) باغوں اور چشموں میں (۵۲) باریک اور گاڑھے ریشم کا لباس پہنے، آمنے سامنے [۳۵] بیٹھے ہوں گے (۵۳) اور ہم انہیں بڑی بڑی آنکھوں والی اور گوری گوری [۳۶] عورتوں سے بیاہ دیں گے (۵۴)

[۳۳] ❁ اہل جہنم کی خوراک:۔ یعنی جب اہل دوزخ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو جائیں گے اور کچھ کھانے کی چیز کا مطالبہ کریں گے تو انہیں ہانک کر جہنم کے اس خطہ کی طرف لے جایا جائے گا جہاں تھوہر کا درخت کثیر مقدار میں اگا ہوا ہوگا۔ یہی چیز انہیں کھانے کو ملے گی اور وہ مجبوراً اسے کھائیں گے۔ خاردار ہونے کی وجہ سے پہلے تو وہ حلق سے نیچے اترے گا ہی نہیں بمشکل پیٹ میں پہنچے گا تو اس کا کڑوا کسیلا اور زہریلا مادہ اپنی حدت کی وجہ سے یوں جوش مارے گا جیسے پانی کھول رہا ہو۔ جب وہ اس قسم کے کھانے سے فارغ ہو جائیں گے تو فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان بدبختوں کو پھر جہنم میں دھکیل دو تا آنکہ وہ جہنم کے عین وسط میں پہنچ جائیں۔

[۳۴] جب اہل دوزخ کی یہ گت بنائی جارہی ہوگی تو اس وقت دوزخ کا فرشتہ ان سے مخاطب ہو کر کہے گا۔ ارے تم تو دنیا میں بڑے معزز اور شریف بنے پھرتے تھے۔ رسولوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اللہ کے احکام کے مقابلہ میں اکڑ بیٹھے تھے اور سرکشی اور شرارتیں کیا کرتے تھے۔ اور جب تمہیں اس برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا تو رسولوں کا اور اس دن کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کیا آج بھی تمہیں اس معاملہ میں کچھ شک باقی رہ گیا ہے؟ اس آیت کا روئے سخن دراصل ان معزز سرداران قریش کی طرف ہے جنہیں نبی کے مقابلہ میں معزز سمجھا جاتا تھا جو مظلوم مسلمانوں کو ایک کمتر درجہ کی مخلوق سمجھ کر ان کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

[۳۵] ❁ تکبر کرنے والوں کا انجام:۔ یعنی اہل دوزخ تو اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے ندامت کی وجہ سے چھپتے پھریں گے۔ اس کے مقابلہ میں اہل جنت ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے آرام و اطمینان سے محو گفتگو ہوں گے۔ ایک دوسرے سے پیار و محبت اور سلام و دعا کی باتیں کریں گے۔ دنیا میں گزشتہ ایام کی یادیں تازہ کریں گے اور اللہ کا شکر بجالائیں گے۔

[۳۶] حور حوراء کی جمع ہے اور حوراء بہشتی گورے رنگ کی عورت اور عین عیناء کی جمع ہے۔ بہشتی عورت جس کی آنکھیں

بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٥٤﴾ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ
وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٥٧﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ

وہ وہاں امن و اطمینان سے ہر قسم کے میوے طلب کریں گے۔(۵۵) وہاں وہ موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔ بس پہلی موت جو دنیا میں[۳۷] آچکی (سو آچکی) اور (اللہ) انہیں جہنم کے عذاب سے بچالے گا(۵۶) یہ آپ کے پروردگار کا فضل[۳۸] ہوگا۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے(۵۷) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان[۳۹] بنا دیا ہے

موٹی ہوں۔ آنکھ کی پتلی خوب سیاہ ہو اور سفیدی خوب سفید ہو۔ اور ایسی عورت انتہائی خوب صورت ہوتی ہے۔ اہل جنت کو ایک تو ایسی عورتیں ملیں گی دوسرے وہ جو دنیا میں ان کی بیویاں تھیں اور مومن تھیں۔

[۳۷] اخروی زندگی میں موت نہیں:۔ سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا ابو ہریرہ دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "ایک پکارنے والا جنت کے لوگوں کو پکارے گا اور کہے گا آئندہ تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، تم ہمیشہ زندہ رہو گے، کبھی مرو گے نہیں، تم ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے، اور تم ہمیشہ امن اور چین میں رہو گے کبھی کوئی رنج نہ ہو گا" (مسلم۔کتاب الجنة و صفة نعيمها و اهلها)

[۳۸] جنت میں داخلہ صرف اللہ کے فضل سے ہوگا اور اس کی وجہ:۔ یعنی اصل کامیابی یہی ہے کہ انسان دوزخ کے عذاب سے بچ جائے اور اگر اللہ تعالیٰ دوزخ کے عذاب سے بچا کر جنت میں بھی داخل کر دے تو یہ اللہ کا خاص فضل ہوتا ہے۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ فرماتے تھے: "کسی شخص کو اس کے عمل بہشت میں نہیں لے جائیں گے" لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ ﷺ کے اعمال بھی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں! میں بھی اپنے اعمال کے سبب بہشت میں نہیں جاؤں گا۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت مجھے ڈھانپ لے" (بخاری۔ کتاب المرضیٰ۔ باب تمني المريض الموت) علماء کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خواہ کتنی ہی عبادت اور فرمانبرداری کرے اس سے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسانات کا بھی بدلہ نہیں چکایا جاسکتا۔ چہ جائیکہ اسے بہشت بھی عطا کی جائے۔ اور اگر کسی کو جنت میں داخلہ ملتا ہے تو یہ محض اس کا فضل ہوا۔ نیز حدیث میں ہے کہ مومن کو قبر میں اس کا جنت میں ٹھکانا دکھایا جاتا ہے اور دوزخ میں بھی اور کہا جاتا ہے کہ اگر تم اللہ کی فرمانبرداری نہ کرتے تو تمہارا یہ ٹھکانا تھا اور دوزخ میں ٹھکانہ اس لیے دکھایا جاتا ہے کہ جب تک انسان اللہ کی کسی نعمت کے مقابلہ میں اس کے برعکس کوئی تکلیف دیکھ نہ لے وہ اللہ کی نعمت کا صحیح اندازہ کر ہی نہیں سکتا۔ انسان کو اپنی صحت کی قدر بھی اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ بیمار پڑتا ہے۔

[۳۹] کیا قرآن آسان ہے یا مشکل ترین؟ اللہ نے تو واقعی قرآن کو آسان ہی بنایا تھا لیکن ہمارے فرقہ باز علماء نے اسے مشکل ترین کتاب بنا دیا ہے اور یہی کچھ عوام کو ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اس کی دلیل درس نظامی کا وہ نصاب ہے جو دینی مدارس میں چھ، سات، آٹھ حتیٰ کہ نو سال میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس نصاب میں قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کی باری عموماً آخری سال میں آتی ہے۔ پہلے چند سال تو صرف و نحو میں صرف کیے جاتے ہیں۔ ان علوم کو خادم قرآن علوم کہا جاتا ہے۔ ان علوم کی افادیت مسلم لیکن جس طالب علم کو فرصت ہی دو چار سال کے لیے ملے اسے کیا قرآن سے بے بہرہ ہی رکھنا چاہیے؟ پھر اس کے بعد فقہ پڑھائی جاتی

۳ ع ۱۹

بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُرْتَقِبُونَ ﴿٥٩﴾

تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔(۵۸) سو آپ انتظار کیجئے وہ بھی انتظار کر رہے [۴۰] ہیں۔(۵۹)

ہے۔ تاکہ قرآن اور حدیث کو بھی فقہ کی مخصوص عینک سے ہی دیکھا جاسکے۔ تقلید شخصی کے فوائد بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جس فرقہ کے مدرسہ میں طالب علم داخل ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی سانچہ میں ڈھل کر نکلتا ہے۔ اسی طرح فرقہ بازی کی گرفت کو تو واقعی مضبوط بنادیا جاتا ہے۔ مگر حقیقتاً ان طالب علموں کو قرآن کریم کی بنیادی تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ جب تک ان ابتدائی علوم کو پڑھا نہ جائے اس وقت تک قرآن کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی۔ اور اس طرح عملاً اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تردید کی جاتی ہے کہ ہم نے قرآن کو آسان بنادیا ہے، تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ قرآن کریم شرک کا سخت دشمن ہے۔ کوئی سورت اور کوئی صفحہ ایسا نہ ہوگا جس میں شرک کی تردید یا توحید کے اثبات میں کچھ نہ کچھ مذکور نہ ہو۔ مگر ہمارے طریقہ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ شرک کی کئی اقسام مسلمانوں میں رواج پاگئی ہیں اور انہیں عین دین حق اور درست قرار دیا جاتا ہے۔ بلکہ شرک سے روکنے والوں کو کافر کہہ کر ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہمارا مشورہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی اولین فرصت میں قرآن کریم کا ترجمہ خود مطالعہ کرنا چاہئے اور سیکھنا چاہئے اور اس کے لیے کسی ایسے عالم کے ترجمہ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ جو متعصب نہ ہو اور کسی خاص فرقہ سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ یا ایسے عالم کا جس کی دیانت پر سب کا اتفاق ہو اور یہ ترجمہ بالکل خالی الذھن ہو کر دیکھنا چاہئے۔ قرآن سے خود ہدایت لینا چاہئے۔ اپنے سابقہ یا کسی کے نظریات کو قرآن میں داخل نہ کرنا چاہئے۔ نہ اس سے اپنے نظریات کھینچ تان کر اور تاویلیں کر کے کشید کرنا چاہئیں۔ یہی طریقہ ہے جس سے قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

[۴۰] یعنی آپ تو اس بات کے منتظر ہیں کہ کب ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کی شامت آتی ہے۔ اور وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ آپ پر کب کوئی ناگہانی افتاد پڑتی ہے۔ جو آپ کو اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دے اور کام تو وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے اور اسی وقت ہوگا جب اللہ کو منظور ہوگا۔

۳۷ آیاتھا سورۃ الجاثیۃ مکیۃ رکوعھا ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۲﴾ إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۳﴾
وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ

کلمات ۴۹۲ آیات ۳۷ (۴۵) سورۃ الجاثیہ مکی ہے (۶۵) رکوع ۴ حروف ۲۱۳۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰم (۱) یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے[۱] جو زبردست اور حکمت والا ہے۔(۲) بلاشبہ آسمانوں اور زمین میں ایمان[۲] لانے والوں کیلئے کئی نشانیاں ہیں(۳) اور خود تمہاری[۳] اور ان جانوروں کی[۴] پیدائش میں بھی جو اس نے (زمین میں) پھیلا رکھے ہیں، یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں(۴) نیز رات اور دن کے ادل بدل کر

[۱] بطور تمہید سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب کسی انسان کی تالیف یا اختراع نہیں ہے بلکہ اس اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے جو سب پر غالب ہے۔ اور اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے کوئی اس کے فیصلوں میں نہ دخل دے سکتا ہے اور نہ روک سکتا ہے۔ نیز وہ حکیم بھی ہے۔ اس کے فیصلوں اور احکام میں کسی جھول اور غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ اس کے تمام فیصلے اور احکام بنی نوع انسان کے مصالح پر مبنی ہوتے ہیں۔

[۲] ❁ توحید کے دلائل:۔ تمہید کے بعد توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر دلائل کا آغاز ہوا ہے۔

❁ توحید کی پہلی نشانی کائنات کا نظم و نسق:۔ پہلی دلیل یہ کائنات اور اس کا نظام ہے اسی کے ایک پہلو پر ہی اگر غور کر لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں الگ الگ خداؤں کی خدائی چلنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ بادلوں کا دیوتا کوئی اور ہو، ہواؤں کا کوئی دوسرا ہو، بارشوں کا کوئی تیسرا ہو، سورج کا کوئی اور ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اس کائنات کے نظام میں کبھی باقاعدگی اور ہم آہنگی برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر اس کائنات میں ایسی نشانیاں تو اس شخص کے لیے ہی سودمند ہو سکتی ہیں جو خود ہدایت کا طالب ہو اور اللہ کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ لیکن جو اللہ کی ہستی اور اس کی قدرت پر ایمان ہی نہ لانا چاہتا ہو۔ اس کے لیے اس میں کوئی نشانی نہیں۔

[۳] ❁ توحید کی دوسری نشانی 'انسان کی تخلیق اندرونی اور بیرونی ساخت:۔ یعنی اگر انسان خود اپنے جسم کی اندرونی ساخت پر غور کرے تو اسے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے اس کے اعضاء کی بیرونی ساخت اور اس کا کثیر المقاصد فوائد کا حامل ہونا اس کے اندر بے شمار خودکار مشینوں کا کام کرنا، تکلیف کی صورت میں خود طبیعت کا مقابلہ کرنا۔ پھر انسان کے اندر جو جو قوتیں اور جو جو جذبات رکھ دیئے گئے ہیں ان میں کسی ایک بات پر بھی غور کرنے سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

[۴] ❁ تیسری نشانی 'توالد و تناسل اور بعث بعد الموت:۔ یعنی تمہاری اور جانوروں کی پیدائش کا طبعی پہلو ایک جیسا ہے۔ دونوں ہی زمین سے پیدا شدہ پیداوار سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ غذائیں بالکل بے جان ہوتی ہیں جن میں زندگی کی رمق تک

اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

آنے میں[۵]، اور جو اللہ نے آسمان سے رزق نازل فرمایا۔ پھر اس سے[۶] زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیا، اور ہواؤں کی گردش[۷] میں ان لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں(۵)

موجود نہیں ہوتی۔ انہیں غذاؤں سے جانداروں کی جسمانی ضروریات پوری ہوتی ہیں جسم بڑھتا ہے، خون بنتا ہے۔ پھر خون سے منی بنتی ہے پھر توالد و تناسل کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہر وقت مردہ اور بے جان غذاؤں کو کئی مراحل سے گزار کر جاندار چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے۔

❁ چوتھی نشانی' زمین کو انسانوں اور جانوروں سے آباد کرنا:۔ پھر زمین اور سمندروں میں راستے بنا کر اس نے ان جانداروں کو تمام روئے زمین پر پھیلا دیا ہے اس طرح زمین کا کثیر حصہ بھی آباد کر دیا اور مخلوق کی روزی کا بھی مناسب انتظام کر دیا۔ ان باتوں میں غور کرنے سے بھی اللہ کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے مگر صرف اسے جو اللہ کی ذات اور اس کی قدرتوں پر یقین رکھتا ہو اور اسے یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ ان امور میں اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کا کچھ عمل دخل نہیں ہے۔

[۵] ❁ پانچویں نشانی گردش لیل و نہار:۔ رات آتی ہے تو بتدریج آتی ہے یکدم گھٹا ٹوپ اندھیرا نہیں چھا جاتا نہ ہی سورج یک دم پوری آب و تاب کے ساتھ نکل آتا ہے۔ بلکہ وہ بھی بتدریج آتا ہے۔ راتیں لمبی ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان میں تدریج کا قانون کام کرتا ہے۔ پھر موسم بدلتے ہیں تو بھی ان میں تدریج پائی جاتی ہے۔ پھر اس تدریج کے لیے بھی ایک قانون ہے ایک ضابطہ ہے جس میں نہ کمی بیشی ہوتی ہے اور نہ بے ضابطگی۔ نیز تبدیلیاں بھی اس انداز سے ہوتی ہیں جس سے بنی نوع کی کئی مصلحتیں متعلق ہوتی ہیں۔ جن عظیم الجثہ اور مہیب کروں کو کنٹرول میں رکھ کر اللہ نے یہ دن رات اور موسموں میں نظام بنایا ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا پورا تصرف صرف ایک ہی ہستی کے اختیار میں ہے۔

[۶] ❁ چھٹی نشانی' بارش کا نزول اور مخلوق کے لئے پیدائش رزق:۔ یہاں رزق سے مراد بارش ہے جو تمام جاندار مخلوق کے رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ بارش کے برسنے، پھر اس بارش کے پانی سے زمین کی پیداوار اگنے میں بہت سے عوامل کام کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے آگے بالکل بے بس ہیں۔ یہ سارے عوامل اپنی اپنی مقررہ ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں۔ تب جا کر انسانوں اور جانداروں کو رزق حاصل ہوتا ہے۔

❁ عوامل سب ایک جیسے نباتات ہزاروں اقسام کی:۔ اس میں ایک نشانی تو یہ ہے کہ ان عوامل پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا کچھ بھی اختیار نہیں تو پھر ان کی خدائی کہاں سے آگئی اور دوسری نشانی یہ ہے کہ زمین ایک، پانی ایک، آب و ہوا ایک اور موسم ایک لیکن نباتات مختلف انواع کی اور مختلف رنگوں کی اگ آتی ہے اور تیسری نشانی یہ ہے کہ آسمان سے رزق کا انتظام تو سب کے لیے مشترکہ ہوتا ہے اور ہر کوئی انتفاع کا برابر کا حق رکھتا ہے۔ مگر رزق ہر ایک کا جدا جدا ہے۔ کسی کو کم ملتا ہے کسی کو زیادہ۔ اور جتنا رزق کسی کے مقدر ہو چکا وہ کتنی ہی کوشش کر دیکھے اس کا رزق بڑھ نہیں سکتا۔ نہ ہی کوئی شخص دوسرے کے رزق میں کمی کر سکتا ہے جو اسے ملنا ہوتا ہے مل کے رہتا ہے۔

[۷] ❁ ہواؤں کی گردش اور اقسام:۔ ہوائیں بارش سے بھرے ہوئے بوجھل بادلوں کو بلا تکلف اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتی

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ وَيْلٌ لِّكُلِّ
اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸ وَاِذَا
عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا ۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹ مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ

یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ پھر اللہ اور اس کی آیات کے بعد آخر وہ کون سی بات ہے جس پر[۸] یہ لوگ ایمان لائیں گے (۶) تباہی ہے ہر اس بہتان تراش اور گنہگار کے لئے (۷) جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ انہیں سنتا ہے پھر ازراہ تکبر اپنی بات پر یوں اڑ جاتا ہے جیسے[۹] اس نے انہیں سنا ہی نہیں۔ ایسے شخص کو آپ دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔ (۸) اور جب ہماری آیات میں سے کچھ اس کے پلے پڑ بھی[۱۰] جاتا ہے تو وہ اسے مذاق بنا لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ذلت کا عذاب ہوگا (۹) پھر اس کے بعد[۱۱] ان کیلئے جہنم ہے اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں

ہیں۔ کچھ لوگوں پر رحمت کا پیغام لاتی ہیں اور کچھ لوگوں پر عذاب الٰہی بن کر چلتی ہیں۔ پھر یہ موسم میں تبدیلی لانے میں بھی موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ ہوائیں بھی اس فضا میں آزادانہ گردش نہیں کر رہیں۔ بلکہ جس طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے ادھر ہی چلتی ہیں۔ اگرچہ ہواؤں کی گردش کے لیے بھی اللہ نے قوانین مقرر کر دیے ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ اپنے ہی بنائے ہوئے طبعی قوانین کے سامنے مجبور و بے بس نہیں ہے۔ بلکہ جب وہ چاہے اور جس طرح چاہے اپنی مخلوق کی ہر چیز سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

[۸] یعنی اللہ کی آیات تو وہ ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ یہ نظام کائنات، یہ بے جان چیزوں سے جانداروں کی تخلیق، یہ گردش لیل و نہار، یہ آسمان سے تمام مخلوق کی روزی کا نزول یہ ہواؤں کے رخ اور ان میں تبدیلی۔ یہ سب تو اللہ اکیلے ہی کی نشانیاں ہیں اب اگر تم ان پر ایمان نہیں لاتے تو ان کے علاوہ کسی دوسری ہستی کی بھی کچھ نشانیاں ہیں جو ان سے بڑھ کر ہوں اور تم اللہ کو چھوڑ کو اس کی نشانیوں اور اس کی باتوں پر ایمان لانا چاہتے ہو؟ اگر تمہارے خیال میں کوئی ایسی ہستی ہے تو اس کی نشاندہی کیوں نہیں کرتے؟

[۹] ایسے لوگ جو زبانی طور پر تو اللہ کی مذکورہ بالا آیات کو تسلیم کرتے ہیں مگر عملاً ان چیزوں پر تصرف اور اختیار دوسروں کا تسلیم کرتے ہیں یہ در حقیقت اللہ پر بہتان لگانے والے ہوتے ہیں جو اللہ کے تصرفات میں دوسروں کو شریک کر لیتے یا پورے کا پورا اختیار انہیں کو سونپ دیتے ہیں۔ ان کی دوسری صفت یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگ مجرم ضمیر ہوتے ہیں انہیں ایسی کوئی تعلیم یا ہدایت راس نہیں آتی جو ان پر اخلاقی پابندیاں عائد کرتی ہو اگر وہ کسی کی بات مان لیں تو ان کی انا مجروح ہوتی ہے۔ اور ان کی تیسری صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے غرور اور گھمنڈ کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت اونچی چیز سمجھتے ہیں اور اللہ کی آیات اس لیے سننا گوارا نہیں کرتے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں یہ سب باتیں پہلے ہی معلوم ہیں۔ ہمیں کوئی کیا سکھائے گا؟

[۱۰] ❁ مشرکین کن آیات کا تمسخر اڑاتے ہیں:۔ قریشی سردار نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو قرآن کی ایک بھی آیت سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ مگر ایسی آیات کی ٹوہ ضرور لگائے رکھتے تھے جن میں انہیں کوئی ایسا نکتہ ہاتھ آ جائے کہ وہ آیات الٰہی کا مذاق اڑا سکیں۔ ان کا نشانہ تضحیک پہلے نمبر پر تو وہ آیات تھیں جن میں دوبارہ جی اٹھنے اور روز آخرت اور حشر و نشر کا ذکر ہوتا۔

مَّا كَسَبُوا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠﴾ هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿١١﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا ع ۱۱/۱۴

کمایانہ تو وہ ان کے کچھ کام[۱۲] آئے گا اور نہ وہ جنہیں انہوں نے اللہ کے سوا کارساز[۱۳] بنا رکھا تھا، اور انہیں بڑا سخت عذاب ہوگا۔(۱۰) یہ قرآن تو سراسر[۱۴] ہدایت ہے اور جو لوگ اپنے پروردگار کی آیات کے منکر ہیں ان کیلئے بلا کا دردناک عذاب ہے۔(۱۱) اللہ ہی ہے جس نے سمندر[۱۵] کو تمہارے تابع کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں۔ اور تم

سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے عاص بن وائل سہمی سے اپنی کچھ مزدوری لینا تھی۔ انہوں نے مزدوری کا مطالبہ کیا تو کہنے لگا محمد (ﷺ) کا دین چھوڑ دو تو مزدوری مل جائے گی۔ سیدنا خباب رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "وہ تو میں تمہارے دوبارہ جی اٹھنے کے دن تک بھی نہیں چھوڑ سکتا" عاص کہنے لگا اچھا پھر جب میں دوبارہ جی اٹھوں گا تو تمہارا حساب بیباق کر دوں گا" پھر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "اللہ نے ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی" تو کفار نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور کہنے لگے بتاؤ اب اس کی دیوانگی میں کیا کسر رہ گئی۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اہل دوزخ کا کھانا زقوم کا درخت ہوگا تو بھی کفار نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ جہنم پر انیس داروغے مقرر ہیں۔ تو ایک پہلوان صاحب اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ "اٹھارہ کو تو میں اکیلا سنبھال لوں گا، تم سب مل کر ایک کو بھی نہ سنبھال سکو گے" اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ مشرک اور ان کے معبود سب دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو عبداللہ بن الزبعریٰ کہنے لگا پھر تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بھی جہنم میں جائیں گے۔ ان سے تو پھر ہمارے معبود ہی اچھے ہوئے" اور ایسی آیات اور بھی بہت ہیں اور کفار مکہ ایسی ہی آیات معلوم کرنے کے درپے رہتے تھے جن کا مذاق اڑایا جا سکے۔

[۱۱] ❁ وراء کا لغوی مفہوم:۔ وراء کا معنی آگے بھی اور پیچھے بھی، ادھر بھی اور ادھر بھی۔ اس لحاظ سے اس کے دو مطلب ہوئے۔ ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو دنیا میں ذلت کا عذاب ہوگا پھر اس کے بعد ان کے لیے عذاب جہنم بھی تیار ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اس ذلت کے عذاب کے بعد جہنم بھی ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

[۱۲] یعنی مال و دولت کام آئے گی اور نہ آل اولاد اور نہ ان کے اچھے اعمال۔ کیونکہ دنیا میں اگر انہوں نے کچھ اچھے عمل کئے بھی ہوں گے وہ برباد ہو جائیں گے اور ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ کام اس نیت سے کیے ہی نہ تھے کہ وہ آخرت میں ان کے کام آئیں گے بلکہ ان کا آخرت پر یقین ہی نہیں تھا۔

[۱۳] ❁ کارسازوں کی اقسام:۔ یہ اولیاء بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہستیاں جن کی سفارش پر اعتماد کر کے لوگ بے دھڑک گناہ کے کام کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم فلاں حضرت کی بیعت ہیں وہ ہمیں سفارش کر کے اللہ کی گرفت اور عذاب سے بچا لیں گے۔ دوسرے وہ چودھری قسم کے لوگ یا حکمران یا سیاسی لیڈر جن کی اللہ کے احکام کے مقابلہ میں اس لیے اطاعت کی جاتی ہے کہ اطاعت کرنے والوں کے دنیوی مفادات ان سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کارساز وہاں کام نہ آئے گا۔

[۱۴] جو بروقت تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ قیامت کے دن تمہارا کوئی کارساز تمہارے کام نہ آ سکے گا۔ نیز یہ قرآن تمہیں دنیا میں زندگی گزارنے کا بھی نہایت مناسب اور متوازن راستہ بتاتا ہے۔ نیز وہ راہ بھی جس سے تمہیں اخروی عذاب سے نجات حاصل ہو۔

[۱۵] ❁ سمندر کو مسخر کرنا:۔ پانی کے لیے اللہ نے یہ قانون بنایا ہے کہ وہ ہر چیز کو اوپر اپنی سطح کی طرف اچھالتا ہے۔ لہٰذا جو

مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا

اس کا فضل[۱۶] تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو(۱۲) اور جو کچھ آسمانوں میں ہے یا زمین میں۔ سب کچھ ہی اس نے تمہارے لئے کام[۱۷] پر لگا رکھا ہے۔ غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں(۱۳) جو لوگ ایمان لائے ہیں آپ انہیں کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے[۱۸] دن آنے کی توقع نہیں رکھتے

چیزیں اپنے مساوی الحجم پانی سے ہلکی ہوتی ہیں وہ پانی کی سطح پر آ کر تیرنے لگتی ہیں۔ جیسے لکڑی، کاغذ، تنکے، گتا وغیرہ اور جو بھاری ہوتی ہیں، وہ پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ جیسے پتھر اور دھاتیں، تاہم پانی میں اچھالنے کی قوت کی وجہ سے ان کا وزن کم ہو جاتا ہے اور اتنا ہی کم ہوتا ہے اس کے مساوی الحجم پانی کا وزن ہوتا ہے پھر اگر کسی چیز کی شکل ہی کشتی یا پیالہ یا گلاس کی بنا دی جائے تو بھاری چیزیں مثلاً لوہا وغیرہ کی طرح کی چیزیں پانی میں تیرنے اور بہت سا بوجھ اٹھا کر پانی میں تیرنے کے قابل بن جاتی ہیں۔ بس یہی وہ قانون ہے جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسان دریاؤں اور سمندروں میں کشتیوں اور لوہے کے دیو ہیکل جہازوں کے ذریعے سفر کرنے کے قابل ہو گیا ہے اور اسی بات کو اللہ نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے سمندر کو انسان کے تابع بنا دیا۔

[۱۶] سمندروں سے انسان کئی طرح کے فوائد حاصل کرتا ہے۔ ان سے موتی اور جواہرات نکالتا ہے۔ آبی جانوروں کا شکار کر کے گوشت حاصل کرتا ہے۔ تجارتی سفر کر کے روزی کماتا ہے اور خشکی کے ایک حصہ سے منتقل ہو کر زمین کے کسی دوسرے حصہ میں میں جا آباد ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہوا کہ اللہ نے سمندروں جیسی خوفناک چیز کو بھی انسان کے بس میں کر دیا ہے۔

[۱۷] تمام اشیائے کائنات سے انسان کا استفادہ:۔ یعنی کائنات کی تمام چیزیں انسان کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں اور ہر چیز کا انسان کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مثلاً پانی، ہوا، زمین کی پیداوار اور اس میں مدفون خزانے، سمندر، پہاڑ، سورج، چاند، ستارے غرض ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ان کا اپنا کچھ بھی فائدہ نہیں ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر چیزوں میں سے ایک بھی نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا یا اس کی زندگی مشکلات میں پڑ جاتی ہے اور وہ کئی طرح کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر انسان میں یہ صلاحیت بھی رکھ دی گئی ہے کہ وہ اشیائے کائنات کے خواص معلوم کر کے نئے سے نئے فوائد حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ انسان کو تو ان اشیاء کا فائدہ ہی فائدہ ہے اور انسان انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور یہ سب اللہ کا انسان پر فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنی مہربانی سے تمام اشیائے کائنات کو انسان کے کام پر لگا دیا ہے تو کیا اللہ کے ان احسانات کا یہی بدلہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے محسن پروردگار کا شکر بھی ادا نہ کرے؟ یا اس کی عبادت اور بندگی کرنے کی بجائے اس کے سامنے اکڑنا شروع کر دے؟

[۱۸] ایام اللہ کا مفہوم اور تذکیر بایام اللہ:۔ ایام اللہ کا لفظی اور لغوی معنی صرف "اللہ کے دن" ہے۔ مگر اس سے مراد عموماً وہ دن لیے جاتے ہیں جو کسی قوم کے تاریخی یادگار دن ہوں۔ اور یہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور بُرے بھی۔ بلکہ بسا اوقات وہی دن ایک کے لیے بُرے اور دوسرے کے لیے اچھے ہوتے ہیں۔ مثلاً جس دن فرعون اور آلِ فرعون غرق ہوئے تو یہ دن ان کے لیے سب

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿١٥﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾

ان سے درگزر[19] کردیں تاکہ اللہ خود اس قوم کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔(۱۴) جس نے کوئی اچھا عمل کیا وہ اسی کے لئے [20] ہے اور اگر برا کرے گا تو وہی اس کا خمیازہ بھگتے گا پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے (۱۵) ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت[21] اور نبوت دی، انہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور دنیا بھر کے لوگوں پر فضیلت دی (۱۶)

سے برا دن تھا لیکن وہی دن بنی اسرائیل کے لیے سب سے اچھا دن تھا کہ انہیں فرعون جیسے ظالم اور جابر حکمران سے نجات نصیب ہوئی۔ اور عرفاً ایام اللہ سے مراد عموماً برے ہی دن لیے جاتے ہیں۔ "تذکیر بایام اللّٰه" ایک شرعی اصطلاح ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جن جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا تھا اس کی وجوہ تلاش کر کے انسان ان واقعات سے عبرت اور سبق حاصل کرے۔ اور یہ قرآن کا ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ اور بار بار اس کا ذکر ہوا ہے۔

[19] اس سے مراد کفار مکہ ہیں۔ جو نہ اللہ کا عذاب آنے پر یقین رکھتے ہیں، نہ آخرت پر، بلکہ اللہ کے عذاب کے وعدوں کا مذاق اڑاتے اور پیغمبر ﷺ کو کہتے کہ جس عذاب کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے؟ ایسے ہی لوگوں کے متعلق مومنوں کو ہدایت دی جارہی ہے کہ وہ ان کی باتوں کا برا نہ منائیں۔ ان سے الجھیں نہیں۔ بلکہ درگزر سے کام لیں۔ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ خود ان سے نمٹ لے گا اور ان کے اعمال کی انہیں پوری پوری سزا دے گا۔ اس آخری جملہ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر مومن صبر اور برداشت سے کام لیتے ہوئے ان کافروں سے درگزر کریں گے تو اللہ انہیں اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

[20] یعنی اگر کوئی شخص اچھا کام کرتا ہے تو اس سے اللہ کی نہ کوئی ضرورت پوری ہوتی ہے اور نہ اسے کچھ فائدہ ہوتا ہے بلکہ اس کا فائدہ اچھا کام کرنے والے کی ذات ہی کو پہنچتا ہے اور وہ اس دنیا میں بھی پہنچتا ہے اور آخرت میں بھی پہنچے گا۔ یہ خطاب ربطِ مضمون کے لحاظ سے ان مسلمانوں سے ہے جو کفار مکہ کی سختیاں برداشت کر رہے تھے اور انہیں درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور برے کام کرنے والے یعنی اسلام کی راہ روکنے، مسلمانوں پر سختیاں کرنے اور مذاق اڑانے والے اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اس کا وبال انہیں پر پڑے گا اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور آخرت میں جب تم سب کو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں حاضر کرے گا تو تم سب لوگ ایک دوسرے کا انجام دیکھ لو گے۔

[21] ❁ حکم کے مختلف مفہوم:۔ حکم کا ایک معنی تو حکومت ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے، اس کا دوسرا معنی حکمت ہے۔ اور حکمت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ جس سے دینی معاملات اور احکام کی سمجھ اور فہم بھی شامل ہے۔ احکام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے علمی ذرائع بھی اور عملی تدابیر اور طریق کار کا علم بھی۔ اور حکم کا تیسرا معنی فیصلہ اور قوتِ فیصلہ ہے۔ یعنی فریقین مقدمہ کا بیان لینے کے بعد ان کے درمیان صحیح اور مبنی بر عدل فیصلہ کرنے کا ملکہ۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْ ۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٧﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ

نیز انہیں دین کے واضح احکام[۲۲] دیئے۔ پھر جو انہوں نے اختلاف کیا تو (لاعلمی کی بنا پر نہیں بلکہ) علم آجانے کے بعد کیا اور اس کی وجہ ایک دوسرے[۲۳] پر زیادتی کرنا تھی۔ اور جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے تھے، قیامت کے دن آپ کا پروردگار ان کے درمیان[۲۴] فیصلہ کر دے گا۔(۱۷) پھر ہم نے آپ کیلئے دین[۲۵] کا ایک طریقہ مقرر کیا ہے۔

۞ بنی اسرائیل پر اللہ کے احسانات:۔ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو تمام دینی اور دنیوی نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں پیغمبر مبعوث کیے گئے۔ ان میں سے کئی بادشاہ بھی تھے۔ انہیں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے کتاب تورات بھی دی تھی۔ اور کھانے پینے کو بہت وافر اور پاکیزہ رزق عطا کیا تھا۔ گویا اپنے دور میں بنی اسرائیل کو باقیا تمام اقوام پر ترجیح دے کر انہیں ہم ہی نے اپنے خصوصی انعامات سے نوازا تھا۔

[۲۲] یہاں امر سے مراد اقامت دین ہے۔ کہ اللہ کے دین کو دنیا میں قائم اور نافذ کرنے کے لیے انہیں تمام ہدایات دے دی گئی تھیں اور یہ ہدایت بالکل واضح تھیں۔

[۲۳] ۞ فرقہ بازی کی اصل وجوہ نفسانی خواہشات:۔ یعنی اختلافات یا تفرقہ بازی کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ کسی اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایات موجود نہیں ہوتیں اور معاملہ اختلافی بن جاتا ہے۔ بلکہ ان اختلافات اور تفرقہ بازی کی وجوہ کچھ اور ہی ہوتی ہیں۔ ان وجوہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے مسلمانوں کے موجودہ فرقوں پر ہی نظر ڈال لیجئے۔ کتاب و سنت ایک ہی ہے۔ اور وہ سب فرقوں کے پاس موجود ہے اور ہر فرقہ کتاب و سنت سے ہی استدلال کر کے اپنے فرقہ کے مخصوص عقائد و اعمال کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر کوئی تو کتاب اللہ کی غلط سلط تاویل کر کے اسے اپنے نظریہ کے مطابق بنا لیتا ہے۔ کوئی کتاب و سنت کو اپنے اماموں کے اقوال کے تحت رکھ کر ان سے وہی مفہوم اخذ کرتا ہے جو اس کے امام کے قول کے مطابق ہو۔ پھر اس میں اپنے اپنے ذاتی مفادات یعنی طلب مال اور جاہ کا حصول بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنا اپنا جھنڈا بلند رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔ پھر فرقوں کی آپس میں باہمی کھینچا تانی اور ضد م ضدی سے ان میں اختلافات کی خلیج مزید وسیع ہوتی جاتی ہے۔ پھر کچھ اختلافات مذہبی قسم کے ہوتے ہیں اور کچھ سیاسی قسم کے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب و سنت ایک ہونے کے باوجود امت مسلمہ بیسیوں فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا۔

[۲۴] ۞ کوئی بھی تعصب چھوڑنا گوارا نہیں کرتا:۔ یہ فرقے اپنے اپنے مخصوص نظریات و عقائد میں اس قدر متشدد ہو جاتے ہیں اور اس قدر تعصب ان میں پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کے لیے اختلاف کو ختم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں تو وہ کبھی ان اختلافات کو چھوڑنا تو درکنار، یہ سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے کہ ان کا فلاں عقیدہ یا فلاں مسئلہ کتاب و سنت کی رو سے غلط ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان پر خوب واضح کر دے گا کہ میں نے تو یہ حکم اس طرح دیا تھا اور تم نے اس حکم کے الفاظ کو غلط جامہ پہنچا کر اپنا الو سیدھا کر لیا تھا یا تمہارے اختلاف کی اصل وجہ دین کی اشاعت نہ تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی۔ پھر اس وقت وہ اللہ کے فیصلہ کے سامنے چوں و چرا تک نہ کر سکیں گے۔

[۲۵] ۞ بنی اسرائیل سے امت محمدیہ کو اقامت دین کی پیشوائی:۔ اس آیت میں امر سے مراد اقامت دین ہے۔ یعنی اے نبی!

فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

آپ بس اس کی پیروی کیجئے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے جو علم نہیں رکھتے (۱۸) یہ لوگ اللہ کے مقابلہ میں آپ کے کچھ کام نہ آسکیں [۲۶] گے۔ بلاشبہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی [۲۷] ہیں اور پرہیزگاروں کا دوست اللہ ہے۔(۱۹)

یہ (قرآن) لوگوں کے لئے دلائل بصیرت کا مجموعہ ہے اور یقین رکھنے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت [۲۸] ہے۔(۲۰) جو لوگ بداعمالیاں کر رہے ہیں کیا وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں

ہم نے پہلے اہل عالم کی رہنمائی کیلیے بنی اسرائیل کو اقامت دین کا علمبردار بنایا تھا۔ وہ آپس میں ہی کئی فرقوں میں بٹ کر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ اس حال میں وہ اقامت دین کا فریضہ کیا سرانجام دے سکتے تھے۔ بلکہ اس قابل ہی نہ رہ گئے تھے۔ اب ہم نے آپ کو اقامت دین کی پیشوائی کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ اور جو تمہیں شریعت دی جا رہی ہے اس میں اقامت دین کے لیے مکمل اور واضح ہدایات موجود ہیں۔ آپ بس ان احکام و ہدایات کے مطابق عمل کرتے جائیے۔ بنی اسرائیل کا ہر فرقہ آپ سے یہ توقع رکھے گا کہ آپ اس کے موقف کی حمایت کریں۔ آپ ان میں سے کسی کی بات نہ مانئے کیونکہ ان لوگوں نے یہ فرقے علم کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی وجہ سے بنائے تھے۔

[۲۶] اگر آپ ان میں سے کسی فرقہ کے موقف کی حمایت کر دیں گے تو اس دنیا میں تو شاید وہ آپ کا حامی بن جائے گا لیکن قیامت کے دن وہ آپ کے کسی کام نہ آسکیں گے وہ تو خود اپنی گمراہیوں کے عذاب میں ماخوذ ہوں گے، دوسروں کے کیا کام آئیں گے؟۔

[۲۷] یعنی حق کے مقابلہ میں سب بے انصاف اور ظالم لوگ مل بیٹھتے ہیں اور آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان میں خاصے باہمی اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اللہ کے فرمانبرداروں اور اس سے ڈرنے والوں کا حامی و ناصر صرف اللہ ہوتا ہے جو ان کے سب کام سیدھے کیے جاتا ہے اور اس کی یہ کارسازی دائمی اور پائیدار ہے جو اس دنیا سے آگے آخرت میں بھی برقرار رہے گی۔

[۲۸] ❁ قرآن سب لوگوں کے لئے رحمت کیسے ہے؟ یعنی اس قرآن میں بصیرت افروز دلائل تو سب لوگوں کے لیے موجود ہیں۔ لیکن ان دلائل سے فائدہ صرف وہ لوگ اٹھا سکتے ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ پھر جو لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں انہیں یہ کتاب دنیا میں زندگی گزارنے کے طریقہ کی مکمل رہنمائی کرتی ہے۔ اس طریقہ زندگی پر عمل کرنے سے انسان کی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت کا ایک پہلو ہوا کہ اس نے اس دنیا میں ہی اخروی زندگی کی فلاح و نجات کا طریقہ بتا دیا۔ اور اللہ کی رحمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ قرآن زندگی گزارنے اور اس دنیا میں پرامن رہنے کے

الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ

اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا[۲۹] کر دیں گے کہ ان کا جینا[۳۰] اور مرنا[۳۱] یکساں ہو گا یہ کیسا برا فیصلہ کر رہے ہیں (۲۱) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حقیقی مصلحت کے تحت[۳۲] پیدا کیا ہے اور اس لئے بھی

لیے سب انسانوں کے لیے ایسے متناسب اور متوازن اصول پیش کرتا ہے۔ جن سے سب لوگوں کے حقوق کی ٹھیک تعیین ہو جاتی ہے اور کسی کی حق تلفی نہیں ہوتی۔ انسان کی عقل اگر ہزاروں سال بھی تجربے کرتی اور ٹھوکریں کھاتی پھرتی تب بھی ایسے متوازن اور متناسب اصول دریافت نہ کر سکتی تھی۔ اللہ کی لوگوں پر خاص رحمت ہے کہ اس نے اس قرآن کے ذریعہ لوگوں کو ایسی ہدایات مفت میں دے دی ہیں۔

[۲۹] آخرت پر عدل کے تقاضا سے دلیل:۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے جو روز آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ روز آخرت پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی اخلاقی پابندی کا پابند نہیں رہ سکتا۔ وہ بے لگام ہو کر اور بلا خوف و خطر دوسروں کے حقوق پامال کرنے لگتا ہے اور صرف اپنے ہی مفادات سوچنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ بدکرداروں اور نیک عمل کرنے والوں کا انجام ایک ہی جیسا ہونا چاہئے کہ سب مر کر مٹی میں مل کر مٹی بن جائیں اور کسی سے اس کے اعمال کی باز پرس نہ ہو نہ ہی انہیں ان کے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ دیا جائے؟ کیا تم پروردگار عالم سے یہی توقع رکھتے ہو کہ وہ ایسی بے انصافی کو گوارا کرے گا؟ اگر فی الواقع تمہارا یہی گمان ہے تو اللہ کے متعلق تمہارا یہ گمان بہت برا ہے۔

[۳۰] بدکردار اور نیکوکار کی دنیوی زندگی کا تقابل:۔ ان کا جینا بھی ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کو حیات طیبہ نصیب ہوتی ہے۔ لوگ ان کی عزت کرتے اور ان کی راستبازی پر اعتماد کرتے ہیں۔ انہیں دنیا کی زندگی میں سکھ اور چین نصیب ہوتا ہے۔ دل مطمئن رہتا ہے۔ اس کے برعکس فریب کاروں، چوروں، ڈاکوؤں، زانیوں اور شراب خوروں کو کبھی حقیقی مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ لوگوں میں بدنام ہوتے ہیں، ضمیر ملامت کرتا ہے۔ کوئی شخص دل سے کبھی ان کی عزت نہیں کرتا۔ مقدمات اور حکومت کا ڈر الگ رہتا ہے۔ غرض کہ بدکاروں کی دنیوی زندگی بھی تلخیوں اور بے چینیوں میں گزرتی ہے۔ موت کا وقت مقرر ہے اس سے پہلے کیسے مر جاتے ہیں۔ پھر ان دونوں کی زندگی ایک جیسی کیسے ہوئی؟

[۳۱] اگر ان کی زندگی ایک جیسی نہیں تو یقین جانو کہ مرنا بھی ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ دنیوی مقدمات کا نتیجہ نکل کے رہے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ دونوں طرح کے انسان مر کر مٹی میں مل کر مٹی بن جائیں۔ کسی سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ نہ نیک لوگوں کو ان کے اچھے اعمال کا بدلہ دیا جائے نہ بدکاروں کو سزا دی جائے اور یہ معاد پر پہلی عقلی دلیل ہے جو اللہ کی صفت عدل کے تقاضا کے مطابق ہے۔

[۳۲] آخرت پر دوسری عقلی دلیل 'اللہ کی حکمتیں اور ان کا تقاضا' کوئی چیز عبث پیدا نہیں کی گئی:۔ یہ معاد یا عالم آخرت کے قیام پر دوسری دلیل ہے اور یہ اللہ کی صفت حکیم ہونے کے تقاضا کے مطابق ہے۔ یعنی اللہ کا کوئی کام بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر کیا یہ سارا کارخانہ کائنات حکمت سے خالی ہو سکتا ہے۔ جس کی ایک ایک چیز انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے اور

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ

وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ

کہ ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا (۲۲) بھلا آپ نے اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو الٰہ [۳۳] بنا رکھا ہے اور اللہ نے علم کے باوجود [۳۴] اسے گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب کون ہے جو اسے ہدایت دے سکے؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ (۲۳) یہ لوگ کہتے ہیں۔ "یہ بس ہماری دنیا ہی زندگی ہے۔ یہاں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی [۳۵] ہمیں ہلاک کرتا ہے" حالانکہ ان باتوں کا انہیں کچھ علم نہیں

انسان ہر چیز سے فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔ اب اگر انسان اچھے یا برے اعمال، جیسے بھی اس سے بن پڑیں اس دنیا میں کر کے مر جاتا ہے اور اس سے کچھ بھی مؤاخذہ نہیں کیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کائنات کو پیدا کرنا، پھر اس کائنات کی چیزوں سے انسان کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ دینا سب کچھ بے سود، عبث اور ایک بے نتیجہ کھیل تھا۔ اور ایسا کام کرنا اللہ کی حکمت کے سراسر منافی ہے۔ لہٰذا لازمی ہے کہ اس دنیا کا نتیجہ ایک دوسرے عالم کی صورت میں نکلے جس میں ہر طرح کے انسانوں کا پورا پورا محاسبہ کیا جائے۔

[۳۳] ❁ اپنی خواہشات کو معبود بنانا:۔ یہ بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جسے اللہ کے سامنے حاضر ہونے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کا یقین نہ ہو۔ ایسے شخص کی زندگی کا مقصد بس یہی رہ جاتا ہے کہ اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرتا جائے۔ کوئی اخلاقی پابندی یا شریعت کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول نہ کرے۔ ایسا شخص نہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل کرنا گوارا کر سکتا ہے اور نہ نواہی سے اجتناب کر سکتا ہے وہ تو ظلم و عصیان میں شتر بے مہار کی طرح آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

[۳۴] ❁ علم گمراہی کا سبب کیسے بنتا ہے:۔ ﴿اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ﴾ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے ازلی علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ گمراہ ہو گا۔ تو اللہ نے اسے اسی گمراہی کے راستہ پر چلا دیا جس پر وہ چل رہا تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص خیر و شر کی پوری تمیز اور اس کا علم رکھتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ گیا تو اللہ نے اسے اس کے علم کے باوجود گمراہ کر دیا۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے منکرین اور دہریوں کا بھی ایک فلسفہ ہوتا ہے جو انہیں گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اللہ بھی ایسے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور چوتھا یہ کہ سب مذہبی فرقوں کے بانی عموماً عالم اور ذہین لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ جو اپنی خواہشات کے پیچھے لگ کر کتاب و سنت میں تاویل کر کے اپنا نظریہ کشید کر لیتے ہیں۔

[۳۵] ❁ فلسفہ دہریت اور اس کا رد:۔ ان لوگوں کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ کائنات ایک اتھاہ سمندر ہے۔ جس میں ہر وقت لہریں اٹھتی ہیں پھر اسی سمندر میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ حباب اٹھتے ہیں تو وہ پھر اسی میں جذب ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال اس دنیا میں واقعات و حوادث کی ہے اور ہماری مثال بس ایک حباب یا بلبلہ کی ہے جو پیدا ہوتا پھر اسی سمندر میں گم ہو جاتا ہے۔ ہم پیدا ہوتے

إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٢٤﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتُوا

وہ محض گمان[۳۶] سے یہ باتیں کرتے ہیں۔(۲۴) اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی دلیل نہیں ہوتی کہ وہ یہ کہہ دیتے کہ: "اگر تم سچے ہو تو ہمارے آباء و اجداد[۳۷] کو اٹھا لاؤ"(۲۵)

ہیں پھر مر کر اسی میں مل جاتے ہیں۔ یہ زمانے کے حوادث ہیں کہ ہم پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ کائنات اسی طرح چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ جس میں کسی کے مر کر دوبارہ جینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[۳۶] ❁ آخرت سے انکار کی بنیاد محض وہم و قیاس ہے جس پر کوئی علمی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی:۔ اس فلسفہ سے نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی آپ سے آپ ظاہر ہے۔ سمندر میں ایک موج اٹھی پھر اسی میں گم ہو گئی پھر اسی سمندر سے موج اٹھی گویا اگر سمندر سے دوبارہ بھی موج اٹھ سکتی ہے تو مٹی سے پیدا ہو کر انسان مٹی میں مل جانے کے بعد دوبادہ اسی مٹی سے کیوں پیدا نہیں ہو سکتا؟ نیز مرنے کے بعد کے حالات سے متعلق اگر کچھ انسانی علم کی بنا پر کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی ہے یا نہیں"۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "مرنے کے بعد دوسری زندگی نہیں ہے" انسان کے پاس تحقیق کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے وہ دعویٰ کے طور پر کہہ سکے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں" پھر یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ تو نہیں مرتی کیونکہ روح کے متعلق سب لوگوں کا ایسا ہی عقیدہ رہا ہے۔ انسان کی موت کوئی ایسا حادثہ تو نہیں جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رک جائے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ظن غالب بھی دوبارہ زندہ ہونے کی طرف ہی ہے۔ مر کر بالکل فنا ہو جانے کی طرف نہیں۔ اور یہ لوگ جو دوبارہ زندگی کا انکار کرتے ہیں تو یہ بات کسی علم کی بنا پر نہیں کہتے بلکہ ان کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو۔ جس میں ان سے ان کے برے اعمال کی باز پرس ہو لہٰذا وہ اس کا سرے سے انکار کر دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ اور یہ محض ان کا وہم و گمان ہی ہوتا ہے۔ کوئی علمی دلیل اس پر وہ کبھی پیش نہیں کر سکتے۔

❁ دہریوں کی فریب خوردگی 'دہر تو اللہ ہے':۔ دہریہ لوگ دراصل فریب خوردگی میں مبتلا ہوتے ہیں اور اسی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ حالانکہ زمانہ تو گردش لیل و نہار کا ہی دوسرا نام ہے۔ جس میں نہ حس ہے نہ شعور، نہ تصرف نہ اختیار پھر وہ ہمیں ہلاک کیسے کرتا ہے؟ لامحالہ ان کے ذہن میں کوئی اور چیز ہوتی ہے جو حس شعور، تصرف اور اختیار رکھتی ہو مگر وہ اس کا نام نہیں لینا چاہتے اور اس کے بجائے زمانہ کا نام لے لیتے ہیں اور جس چیز کا وہ نام نہیں لینا چاہتے وہ اللہ ہے۔ جس کا وجود اور علی الاطلاق تصرف واضح دلائل سے ثابت ہے اور زمانہ کا الٹ پھیر اور گردش لیل و نہار بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: "ابن آدم مجھے دکھ پہنچاتا ہے جب وہ دہر (زمانہ) کو گالی دیتا ہے۔ حالانکہ دہر میں خود ہوں۔ تمام معاملات میرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ میں ہی رات اور دن پھیر کر لاتا ہوں" (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورہ الجاثیہ۔ زیر آیت مذکورہ)

[۳۷] ❁ منکرین آخرت کا اعتراض 'کوئی مردہ زندہ کر کے دکھاؤ':۔ لے دے کے ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اچھا اگر مرنے کے بعد زندگی یقینی ہے تو ہمیں ہمارا کوئی بڑا بزرگ زندہ کر کے دکھا دو۔ حالانکہ پیغمبروں کا دعویٰ یہ ہوتا ہی نہیں کہ جب کوئی انکار کرے تو قبر سے مردہ زندہ کر کے اسے دکھا سکتے ہیں تاکہ اسے پوری طرح یقین آ جائے بلکہ ان کا دعویٰ صرف یہ ہوتا ہے کہ قیامت کے بعد اللہ

بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ

۳ ع ۱۹ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ

تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ

تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ

آپ انہیں کہیے: "اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے پھر تمہیں موت[۳۸] دے گا پھر قیامت کے دن تم کو جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ[۳۹] جانتے نہیں (۲۶) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن باطل پرست خسارہ میں پڑ[۴۰] جائیں گے (۲۷) اور آپ ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل پڑا[۴۱] دیکھیں گے۔ ہر گروہ کو اس کے اعمال نامہ کی طرف بلایا جائے گا۔ آج تمہیں ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے۔ (۲۸) یہ ہمارا (لکھوایا ہوا) اعمال نامہ ہے جو تمہارے متعلق ٹھیک ٹھیک بیان کر دے گا جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ ہم (ساتھ ساتھ انہیں) لکھواتے[۴۲] جاتے تھے۔ (۲۹)

تعالیٰ بیک وقت تمام انسانوں کو از سر نو زندہ کرے گا۔ یہ نہیں کہ قیامت سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً مردے زندہ کیے جاتے رہیں گے۔ پھر جب وہ تمہارے آباء و اجداد کو زندہ کرے گا اس وقت تمہیں بھی زندہ کرے گا اور ساری حقیقت تم سب کے سامنے آ جائے گی۔

[۳۸] ❁ اعتراض کا جواب:۔ یعنی تم نہ اتفاقی طور پر پیدا ہوتے ہو اور نہ اپنے اختیار سے پیدا ہوتے ہو۔ اسی طرح تمہاری موت نہ اتفاقی طور پر آتی ہے۔ اور نہ تمہارے اپنے اختیار سے آتی ہے بلکہ تمہاری زندگی اور تمہاری موت کی باگ ڈور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی تمہیں زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اور جب چاہے گا تمہیں دوبارہ بھی زندہ اٹھا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس میں تمہارا اپنا عملی دخل یا اختیار کچھ بھی نہیں ہوگا۔

[۳۹] یعنی تمہیں متفرق طور پر زندہ نہیں کرے گا کہ کچھ لوگوں کو ایک وقت زندہ کیا۔ دوسروں کو کسی اور وقت اور باقی کو کسی تیسرے وقت جیسا کہ اس دنیا میں ہوتا ہے بلکہ سب اگلوں پچھلوں کو ایک ہی وقت زندہ کر کے جمع کر دے گا اور وہ وقوع قیامت کے بعد ہوگا۔ اس سے پہلے نہیں۔

[۴۰] باطل پرستوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو آخرت کے منکر ہوں۔ خواہ وہ دہریے ہوں، نیچری یا صرف آخرت کے منکر ہوں۔ ان لوگوں کو چونکہ اپنے اعمال کی باز پرس کا خیال تک نہ ہوگا۔ لہٰذا ایسے لوگوں نے اس خیال سے کوئی بھی نیک عمل نہ کیا ہوگا۔ اس دن انہیں پتا چلے گا کہ وہ کس قدر دھوکے میں پڑے ہوئے تھے اور اپنا کس قدر نقصان کر چکے ہیں۔

[۴۱] یعنی پہلے ہر قسم کے مجرموں کے الگ الگ گروہ بنائے جائیں گے۔ اور قیامت کے مناظر کی دہشت اس قدر زیادہ ہوگی کہ وہ کھڑے نہ رہ سکیں گے اور گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے اور سہمے ہوئے اس انتظار میں ہوں گے کہ ان کے حق میں کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے اس وقت متکبروں کی سب اکڑ ختم ہو جائے گی۔

[۴۲] ❁ انفرادی اور اجتماعی اعمال نامے اعمال ناموں کی حقیقت:۔ لکھنے اور لکھوانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کسی کاغذ پر

تَعْمَلُونَ ۝٢٩ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهٖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْمُبِينُ ۝٣٠ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَمْ تَكُنْ آيٰتِي تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا
مُّجْرِمِينَ ۝٣١ وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ
إِنْ نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ۝٣٢ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهٖ

رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو اللہ انہیں اپنی رحمت[۴۳] میں داخل کرے گا۔ یہی واضح کامیابی ہے (۳۰) اور جن لوگوں نے کفر کیا (انہیں کہا جائے گا) کیا تمہیں میری آیات پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟ مگر تم اکڑ گئے[۴۴] اور تم تھے ہی مجرم لوگ (۳۱) اور جب تمہیں کہا جاتا کہ: "اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں" تو تم کہہ دیتے تھے: ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے؟ ہم تو اسے ایک ظنی چیز ہی خیال کرتے ہیں[۴۵] اور ظنی چیز پر ہم یقین نہیں کر سکتے۔ (۳۲) اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں ظاہر[۴۶] ہونے لگیں گی اور جس (عذاب) کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ انہیں آگھیرے گا۔ (۳۳)

قلم اور روشنائی کے ساتھ کچھ تحریر کیا جائے۔ انسان خود ایسی ایجادات کر چکا ہے جس سے کسی کے اعمال، حرکات و سکنات، گفتگو اور لب و لہجہ سب کچھ دوسروں کے سامنے آجاتا ہے اور دوسرے اسے دیکھ اور سن سکتے ہیں اور ابھی جو کچھ مزید انسان ایجادات کرے گا وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ لکھوایا ہوا ریکارڈ صرف حرکات و سکنات اور اقوال ہی پیش نہیں کرے گا، بلکہ دلوں میں پیدا شدہ خیالات اور وساوس تک کو سامنے لا رکھے گا۔ پھر یہ ریکارڈ ہر شخص کا انفرادی بھی موجود ہوگا اور ایک ہی قسم کے لوگوں کا اجتماعی بھی اور ان کی اجتماعی کوششوں کا بھی۔ اور یہ اعمال نامے انفرادی طور پر بھی ہر ایک کے حوالہ کیے جائیں اور اجتماعی بھی۔ ایسے ہی الگ الگ فرقوں کے گروہوں کو اپنے اپنے اعمال نامے دیکھنے کے لیے بلایا جائے گا۔

[۴۳] سب کامیابیوں کا اصل اللہ کی رحمت میں داخل ہونا ہے:۔ اللہ جسے اپنی رحمت میں داخل کرلے تو اس کی واضح کامیابی کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو عذاب سے نجات مل جائے گی اور دوسرے قیامت کی ہولناکیوں سے امن میں رہے گا۔ تیسرے حساب کتاب بالکل سرسری اور آسان سا ہوگا۔ چوتھے جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ پھر مزید انعامات بھی ہوتے رہیں گے۔ گویا اللہ کی رحمت میں داخل ہونا اتنی بڑی کامیابی ہے کہ باقی ہر طرح کی کامیابیاں از خود اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔

[۴۴] یعنی کبر و نخوت تم میں اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ اللہ کی آیات سننا بھی تم اپنی شان سے فروتر سمجھتے تھے۔

[۴۵] ایمان کے کسی جزو میں بھی شک کرنے والے کافر ہیں:۔ اس آیت سے ایک اہم حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے منکر اور قیامت میں شک رکھنے والے کے درمیان کوئی فرق نہیں، دونوں ہی ایک جیسے مجرم اور کافر ہیں۔ اور اس سے آگے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ جن جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر، اس کے فرشتوں پر اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، روز آخرت پر اور خیر و شر کے اللہ کی طرف سے مقدر ہونے پر۔ ان میں سے کسی بھی ایک چیز کا انکار کر دینا یا اسے مشکوک سمجھنا ایک ہی بات ہے اور ایسا شک کرنے والا مومن نہیں بلکہ کافر ہی ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ

يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٣٣ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ ھٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٣٤ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ
مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝٣٥ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٣٦ وَلَهُ
الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٣٧ ع

اور انہیں کہا جائے گا آج ہم تمہیں ایسے ہی بھلا دیں گے جیسے تم نے اس دن کی ملاقات[۴۷] کو بھلا دیا تھا اور اب تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے اور تمہارا کوئی مددگار بھی نہیں (۳۴) یہ اس لئے کہ تم اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور دنیا کی زندگی نے تمہیں دھوکا میں ڈال رکھا تھا لہٰذا آج نہ انہیں دوزخ سے نکالا جائے گا اور نہ یہ کہا جائے گا کہ معذرت کر کے اپنے پروردگار[۴۸] کو راضی کر لو۔(۳۵)

پس تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ آسمانوں اور زمین میں کبریائی[۴۹] اسی کے لئے ہے اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے(۳۶)

آخرت میں شک کرنے والے مجرم کیوں ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو احکامِ الٰہی کا پابند بنانے اور بنائے رکھنے والی چیز صرف اللہ کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کا تصور ہے۔ اب اگر کوئی شخص آخرت کا منکر ہو یا اس میں شک رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ یعنی انسان بلاخوف گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

[۴۶] یعنی جن چیزوں کو انہوں نے دنیا میں اپنی کامیابی کا معیار سمجھ رکھا تھا اور اس کامیابی کے لیے دنیا میں وہ جو کچھ پاپڑ بیلتے رہے تھے۔ ایسے سب اعمال کے نتائج صرف ان کے سامنے ہی نہیں آئیں گے بلکہ ان کے گلے پڑ جائیں گے۔ اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے غیر جواب دہ سمجھ رکھا تھا وہ ایک ایسی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کا پورا کارنامہ حیات غلط ہو کر رہ گیا۔

[۴۷] اس کا یہ مطلب نہیں کہ حساب کتاب کے وقت انہیں بھلا دیا جائے گا۔ بلکہ حساب کتاب یا سزا کے فیصلہ اور جہنم میں پھینک دیئے جانے کے بعد انہیں وہیں پڑا رہنے دیا جائے گا۔ وہ خواہ چیخیں پکاریں، فریاد کریں۔ ان کی کوئی بات سنی ہی نہ جائے گی۔ اور جو حال بھی ان پر گزرے ان کی خبر تک نہ لی جائیگی۔

[۴۸] ❁ استعتب کا معنی:۔ عَتَبَ کے معنی سرزنش کرنا، خفگی کرنا اور عاتب کے معنی ملامت کرنا اور غصہ کرنا بھی ہے اور ناز سے خطاب کرنا بھی (گویا یہ لفظ لغت اضداد سے ہے) اور اَعتب کے معنی ناراضگی کو دور کرنا اور اِستعتب کے معنی کسی کو راضی کر لینا اور روٹھے ہوئے کو منا لینا ہے۔ گویا ان دوزخ میں پڑے ہوئے لوگوں کو کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے گا کہ معذرت اور منت سماجت کر کے یا توبہ کر کے اپنے پروردگار کو راضی کر لیں۔

[۴۹] ❁ ۱۔ تکبر کی مذمت۔ ۲۔ کبریائی صرف اللہ کو لائق ہے:۔ تکبر اور غرور ایسا جرم ہے جس کی سزا دنیا میں بھی مل کے

رہتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا ہر شخص دنیا میں ہی مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اور آخرت میں تو متکبرین کا یہ انجام ہوگا کہ کوئی ایسا متکبر نہیں ہوگا جسے جہنم میں ذلیل و رسوا کر کے داخل نہ کیا جائے۔ بہت سی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جہنم میں زیادہ تر متکبر قسم کے لوگ ہی ہوں گے۔ نیز سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عزت پروردگار کی ازار ہے اور بزرگی اس کی چادر ہے۔ (پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) جو کوئی اسے مجھ سے کھینچنے کی کوشش کرے گا میں اسے ضرور عذاب دوں گا" (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب۔ باب تحریم الکبر) نیز ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کبریائی میری چادر اور عظمت میرا ازار بند ہے۔ لہٰذا جو شخص ان دونوں میں سے کسی چیز کو مجھ سے کھینچنے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے اٹھا کر آگ میں پھینک دوں گا" (حوالہ ایضاً) گویا کبریائی اور تکبر ایسی صفت ہے جو صرف اللہ اکیلے کو سزاوار ہے اور ایک مومن کبھی متکبر نہیں ہو سکتا۔ تکبر اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں جو کسی ایک انسان میں جمع نہیں ہو سکتے۔

سورۃ الاحقاف مکیۃ
۳۰ آیاتھا رکوعھا ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝ قُلْ
اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ

کلمات ۶۵۰ آیات ۳۵ (۴۶) سورۃ الاحقاف مکی ہے (۶۶) رکوع ۴ حروف ۲۷۰۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

حا م (۱) یہ کتاب اللہ غالب، حکمت [۱] والے کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ (۲) ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے سب چیزوں کو حقیقی مصلحت کی بنا پر اور ایک مقررہ مدت [۲] تک کیلئے پیدا کیا ہے اور جو کافر ہیں وہ اس چیز سے اعراض کر جاتے ہیں جس سے انہیں ڈرایا [۳] جاتا ہے۔ (۳) آپ ان سے کہئے: بھلا دیکھو اللہ کے سوا جنہیں تم پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین کی کیا چیز انہوں نے پیدا کی ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کچھ حصہ [۴] ہے؟

[۱] تمہیدی کلمات ہیں جن میں قرآن کا تعارف کرایا گیا ہے کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ اور اس آیت کی تفسیر پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سورۃ الزمر۔ المومن و حم السجدۃ۔ حاشیہ نمبر ۱

[۲] اللہ کی حکمت سے معاد پر دلیل:۔ اس کارخانۂ کائنات کے نتیجہ کے طور پر قیامت کے قائم ہونے پر عقلی دلیل جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے۔ اور اس کی تفسیر بھی پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے۔

[۳] اللہ کی صفت عدل سے معاد پر دلیل:۔ قیامت کے قیام پر دوسری عقلی دلیل جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفت عدل سے ہے۔ یعنی انسان کو اس دنیا میں ایسے نہیں پیدا کیا گیا کہ جو کچھ وہ چاہے کرتا رہے اور اس سے کچھ بھی محاسبہ نہ ہو۔ اور جب انہیں یہ بات سمجھائی جاتی ہے تو اسے سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور منہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ محض ان کا تکبر ہے۔ وہ اپنی ذات پر اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیاں گوارا نہیں کرتے اور اس بات کو اپنی شان سے فروتر سمجھتے ہیں۔

[۴] مشرکین سے شرک پر عقلی دلیل کا مطالبہ: سابقہ آیات میں مشرکین مکہ کے انکار آخرت کا رد پیش کیا گیا ہے۔ اس آیت اور اس سے مابعد کی آیات میں ان کے شرک پر تنقید کی جا رہی ہے۔ ان سے پوچھا یہ جا رہا ہے کہ اللہ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو اس کی کوئی وجہ تو بتاؤ۔ عبادت کے لائق تو وہی ہستی ہو سکتی ہے جس کا کائنات کی پیدائش میں کچھ عمل دخل ہو۔ بتاؤ اس کائنات کی کون سی چیز انہوں نے پیدا کی ہے۔ یا زمین یا آسمانوں کا کون سا حصہ انہوں نے بنایا تھا؟ اور اگر انہوں نے کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی تو پھر وہ اس کی ملکیت کیسے بن گئی جس میں تصرف کے اختیارات انہیں حاصل ہوں۔

ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤﴾ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ﴿٥﴾ وَإِذَا حُشِرَ

اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب الٰہی یا علمی [۵] روایت میرے پاس لاؤ۔(۴)

اور اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر انہیں پکارتا ہے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے [۶] سکتے بلکہ وہ ان کی پکار سے ہی بے خبر ہیں(۵) اور جب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے

[۵] کتاب اللہ یا آثار سے نقلی دلیل کا مطالبہ:۔ ایک طرف تو تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ کائنات کی تخلیق میں تمہارے معبودوں کا کوئی حصہ نہیں، کوئی شراکت نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی رٹ لگائے جاتے ہو کہ ان کو کائنات میں تصرف کے اختیار حاصل ہیں۔ یہ ہماری بگڑی بنا بھی سکتے ہیں اور اگر ان کی گستاخی کی جائے تو یہ انتقام بھی لے سکتے ہیں۔ تو یہ بات عقلی لحاظ سے غلط ہے۔ پھر اگر عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے تو کوئی نقلی دلیل ہی پیش کر دو۔ کہیں بھی اللہ کی کتاب میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی دکھا دو کہ اللہ کے سوا کائنات میں دوسروں کو بھی کچھ اختیارات حاصل ہیں۔ یا اللہ کے فلاں قسم کے اختیارات مثلاً رزق دینے کے فلاں بت یا دیوتا یا بزرگ کو تفویض کر رکھے ہیں اور فلاں قسم کے مثلاً زندگی بخشنے کے اختیارات فلاں کو سپرد کر دیے ہیں اور اگر کتاب الٰہی میں ایسی تحریر موجود نہ ہو تو کسی علمی اثر میں ہی دکھا دو۔

آثار سے کیا مراد ہے؟ علمی اثر سے مراد کتاب اللہ کی وہ تفاسیر و شروح ہیں جو مستند ہوں۔ (جیسے ہمارے پاس کتاب اللہ تو قرآن کریم ہے اور علمی اثر احادیث ہیں۔ جن میں سلسلہ اسناد بھی درج ہوتا ہے جس سے یہ تحقیق کی جا سکتی ہے کہ فلاں حدیث کس درجہ کی ہے اور آیا وہ مقبول ہے یا مردود) اور اگر تمہارے پاس نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہو اور نہ نقلی تو پھر سمجھ لو کہ تمہارے عقائد محض ظن اور اوہام پر مبنی ہیں۔

[۶] استجاب کے دو معنی اور مشرکوں کا رد:۔ یہاں استجاب کا لفظ دو قسم کے معنی دے رہا ہے اور دونوں ہی اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ جو سن ہی نہیں سکتا وہ جواب کیا دے گا؟ جیسے کسی پتھر یا درخت سے یہ پوچھا جائے کہ مثلاً لاہور کس طرف ہے؟ تو جب وہ سنتا ہی نہیں تو جواب کیا دے سکتا ہے۔ اور اس لفظ کا دوسرا معنی کسی کی دعا یا پکار کو سن کر اس کو قبول کرنا اور اس پر عمل درآمد کرنا ہے۔ مثلاً میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس بیماری سے شفا دے اور اللہ تعالیٰ واقعی میری پکار کو شرف قبولیت بخشتا ہے اور میری بیماری دور کر دیتا ہے تو میں کہوں گا میری دعا مستجاب ہو گئی۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ یہاں معبودوں سے مراد بے جان قسم کے معبود بھی ہیں۔ جو سن ہی نہیں سکتے اور جاندار بھی مثلاً فرشتے، جن اور زندہ بزرگ وغیرہ جو سن تو سکتے ہیں مگر اس دعا یا درخواست پر عمل درآمد کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اور مشرکوں کی گمراہی اور انتہائی گمراہی یہ ہے کہ وہ اپنی درخواست اس چیز یا ہستی کے سامنے پیش کرتے ہیں جن پر عملدرآمد اس کے دائرہ اختیار میں ہے ہی نہیں۔ اس کی معمولی سی مثال یہ سمجھئے کہ ایک شخص اپنے گھر میں ٹیلیفون لگوانا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی درخواست محکمہ پولیس کو بھیج دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس بے وقوف کی درخواست پر کبھی عملدرآمد نہ ہو سکے گا۔ بالکل یہی مثال ان مشرکوں کی ہے جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو

النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ﴿٦﴾ وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ

تو وہ ان کے دشمن بن جائیں[۷] گے اور ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔(۶) اور ہم جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں

پکارتے ہیں۔

[۷] من دون اللہ سے مراد یہاں بت نہیں بلکہ فوت شدہ بزرگ ہیں:۔ آیت نمبر ۵ اور ۶ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بے جان قسم کے معبود مراد نہیں ہیں۔ کیونکہ بے جان معبود ہی ایسے ہو سکتے ہیں جن کا دشمنی اور دوستی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی وہ عبادت سے انکار کر سکتے ہیں۔ لامحالہ یہاں جاندار معبود ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ پھر جانداروں میں سے بھی فرشتے خارج از بحث ہیں۔ کیونکہ ان کا حشر نہیں ہوگا۔ باقی صرف جن، نبی، پیر، اولیاء وغیرہ ہی رہ جاتے ہیں۔ جن پر حسد، دشمنی اور عبادت سے انکار سب باتیں چسپاں ہو سکتی ہیں۔ پھر ایسے معبودوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک پیغمبر اور صحیح العقیدہ اولیاء کرام یہ اپنے عابدوں سے کہیں گے کہ کم بختو! ہم تو ساری زندگی خود بھی اللہ سے ہی دعا کرتے رہے اور تمہیں بھی یہی تلقین کرتے رہے۔ پھر تم نے کیا الٹی گنگا بہا دی کہ ہم کو ہی پکارنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کا اپنے عابدوں کا دشمن ہونا صاف واضح ہے۔ دوسرے ایسے معبود ہیں جو خود بھی یہی چاہتے تھے کہ لوگ ان میں خدائی اختیارات تسلیم کریں اور انہیں پکارا کریں۔ ایسے لوگ جب قیامت کے ہولناک مناظر اور شرک کا انجام دیکھیں گے تو صاف مکر جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے کب کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کرنا۔ اور یہ بات عابدوں کو سخت ناگوار گزرے گی۔ لہٰذا وہ بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔

سماع موتی کی حقیقت:۔ یہاں ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا فوت شدہ حضرات دنیا والوں کی پکار سنتے ہیں یا نہیں؟ جسے عرف عام سماع موتی کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ سو اس آیت میں اس بات کی مکمل نفی ہے۔ کہ وہ قیامت تک بھی دنیا والوں کی پکار نہیں سن سکتے۔ تاہم بعض آیات سے اتنا اور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جسے چاہے سنا سکتا ہے۔ نیز صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو امت کا سلام فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی قرآن میں صراحت سے مذکور ہے۔ کہ مرنے کے بعد نیک لوگوں کی ارواح علیین میں اور بدکاروں کی ارواح سجین میں ہوتی ہیں۔ اور وہاں وہ دنیا والوں کی کوئی آواز براہ راست اور بلاواسطہ سن نہیں سکتے کیونکہ وہ عالم بھی دوسرا ہے۔

اللہ کا فوت شدہ لوگوں کو سنانے کا ضابطہ:۔ اب سنانے کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا ضابطہ یہ ہے کہ نیک لوگوں کو صرف وہی خبر پہنچائی جاتی ہے جس سے ان کی راحت میں اضافہ ہو۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کو امت کا سلام پہنچایا جاتا ہے۔ یا نیک اولاد کی دعائیں ان کے والدین کو پہنچا دی جاتی ہیں۔ انہیں کوئی ایسی خبر نہیں پہنچائی جاتی جو ان کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔ اور بدکاروں کو کوئی راحت انگیز خبر نہیں سنائی جاتی۔ انہیں صرف ایسی خبریں سنائی جاتی ہیں جو ان کے لیے مزید سوہان روح بن جاتی ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے کنوئیں میں پھینکے ہوئے مقتول کافروں سے ان کی سرزنش اور زجر و توبیخ کے طور پر خطاب کیا تھا اور اللہ نے وہ بات ان تک پہنچا دی تھی۔ اور صحابہ کے استفسار پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ جواب دیا تھا کہ وہ تم سے کچھ کم نہیں سن رہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے میری تصنیف روح، عذاب قبر اور سماع موتی)

قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ
افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ
شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا

تو کافر اس حق کے بارے میں جو ان کے پاس آچکا ہے، کہتے ہیں کہ: "یہ تو صریح[۸] جادو ہے" (۷) یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ خود ہی اسے بنا لایا[۹] ہے۔ آپ ان سے کہئے: اگر میں نے خود بنا لیا ہے تو تم مجھے اللہ (کی گرفت) سے بچانے کی کچھ بھی[۱۰] طاقت نہیں رکھتے۔ جن باتوں میں تم لگے ہوئے ہو اللہ انہیں خوب جانتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لئے کافی ہے اور وہ بخش دینے والا[۱۱] اور رحم کرنے والا ہے۔ (۸) آپ ان سے کہئے کہ "میں کوئی نرالا رسول[۱۲] نہیں ہوں،

[۸] ❁ **کافر قرآن کو جادو کیوں کہتے تھے؟**:۔ کفار مکہ کے قرآن کو صریح جادو کہنے کی دو وجوہ تھیں ایک یہ کہ اس کلام میں بلا کی تاثیر تھی جو بھی یہ کلام سنتا اس کے دل میں اتر جاتا تھا۔ کافر خود بھی قرآن کی اس تاثیر کے معترف اور اس سے متاثر ہو جاتے تھے۔ مگر چونکہ وہ خود اس کو نہ ماننے کا تہیہ کر چکے تھے اس لیے قرآن کی اس خوبی کو بھی برے انداز میں پیش کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ صریح جادو یا جادو کا کرشمہ یا جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جادوگروں کا عموماً یہ کام ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان پھوٹ ڈال دیں یا رشتہ داروں کو آپس میں لڑا دیں۔ ادھر صورت حال یہ تھی کہ جو شخص اسلام لے آتا تھا۔ وہ اس کے مقابلہ میں اپنے کسی رشتہ دار کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی کافر قرآن کو جادو اور آپ ﷺ کو جادوگر کہہ دیتے تھے۔

[۹] ❁ **خود ساختہ کلام یا جادو؟** یعنی اپنے سابقہ بیان کی خود ہی تردید کر دیتے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ اگر یہ قرآن جادو ہے تو آپ کا کلام نہیں اور آپ کا اپنا بنایا ہوا کلام ہے تو پھر وہ جادو نہیں ہو سکتا۔

[۱۰] یعنی اگر میں نے خود ہی کلام تالیف کر کے اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے اور اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ تو یقیناً اللہ مجھے اس افتراء کی سزا دے گا۔ تم مجھے اس سے چھڑا تو نہیں لو گے۔ نہ ہی تم میں یہ قدرت ہے۔ البتہ جن کاموں میں تم لگے ہوئے ہو وہ ضرور اس قابل ہیں کہ اللہ تمہیں ان کاموں کی سزا دے اور وہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ بھی رہا ہے۔ لہٰذا تم اپنے کاموں اور ان کے انجام کی فکر کرو۔

[۱۱] یہاں اس جملہ کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ ہم سب کے اعمال دیکھ رہا ہے لیکن سزا نہیں دیتا، ورنہ اگر وہ بے رحم بادشاہوں کی طرح ہوتا تو کب سے لوگوں کا قصہ پاک ہو چکا ہوتا۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ ایسی سب باتوں کو برداشت کر کے درگزر کیے جاتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر اب بھی تم اپنی ہٹ دھرمی سے باز آ جاؤ تو اللہ تعالیٰ از راہ کرم تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔

[۱۲] یعنی رسالت کا سلسلہ کچھ مجھ سے ہی شروع نہیں ہوا مجھ سے پہلے ہزاروں پیغمبر اور سینکڑوں رسول گزر چکے ہیں۔ سب کی تعلیم

أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ

میں یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھ سے کیا سلوک [۱۳] کیا جائے گا اور تم سے کیا؟ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو محض ایک واضح طور پر ڈرانے والا ہوں" (۹)

آپ ان سے کہئے: "بھلا دیکھو، اگر یہ (قرآن) اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے ایسی ہی گواہی بھی دے دی [۱۴] چنانچہ وہ تو ایمان لے آیا اور تم اکڑ بیٹھے؟

بھی تھی جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں کوئی نئی اور نرالی بات تم سے نہیں کہتا۔ جسے تم صریح جادو یا بناوٹی باتیں کہہ رہے ہو۔

[۱۳] کسی کے انجام کی یقینی خبر صرف اللہ کو ہے:۔ اس جملہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اور تمہارے خیال کے مطابق اللہ پر جھوٹ باندھ رہا ہوں اور جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اس کا نتیجہ میرے حق میں کیا نکلنے والا ہے اور تمہارے حق میں کیا ہو سکتا ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم نہ ہی کوئی بات میرے اختیار میں ہے۔ میرے اختیار میں تو صرف یہ بات ہے کہ جو کچھ میری طرف وحی کی جا رہی ہے اس کی پیروی کرتا جاؤں اور جو پیغام مجھے اللہ کی طرف سے ملا ہے وہ تمہیں پہنچا دوں اور تمہیں تمہارے انجام سے مطلع کر دوں اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے یا تم سے کیا سلوک ہونے والا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا میں صرف تمہیں یہ بتائے دیتا ہوں کہ برے اعمال کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ اور اس پہلو کی تائید درج ذیل حدیث سے بھی واضح ہوتی ہے۔

خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ام علاء انصار کی ایک عورت تھی جس نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی اس نے کہا کہ جب انصار نے مہاجرین کی آبادکاری کے لیے قرعہ ڈالا تو عثمان بن مظعون کا قرعہ ہمارے نام نکلا۔ وہ ہمارے پاس رہنے لگے۔ وہ بیمار ہو گئے ہم نے ان کی تیمارداری کی۔ آخر ان کا انتقال ہو گیا۔ ہم نے انہیں کفن پہنایا تو رسول اللہ ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ اس وقت میں نے کہا: "ابوالسائب! یہ عثمان بن مظعون کی کنیت تھی) اللہ تم پر رحم کرے۔ میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ اللہ نے تمہیں عزت دی" رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا: "تجھے کیسے معلوم ہوا کہ اللہ نے اسے عزت دی؟" میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے معلوم نہیں" تب آپ نے فرمایا۔ عثمان بن مظعون کی موت واقع ہو گئی اور مجھے اس کی بھلائی کی امید ہے۔ (لیکن یقین کے ساتھ میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا) اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں لیکن میں بھی نہیں جانتا کہ اس سے کیا سلوک کیا جانے والا ہے" ام علاء کہتی ہیں: اللہ کی قسم! اس کے بعد میں نے کبھی کسی کی ایسی تعریف نہیں کی۔ (بخاری۔ کتاب الشہادات۔ باب القرعة فی المشکلات)

[۱۴] بنی اسرائیل کے شاہد سے مراد عبداللہ بن سلام ہیں: یہ بنی اسرائیل میں سے شہادت دینے والا کون تھا؟ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیدنا عبداللہ بن سلام تھے۔

عبداللہ بن سلام کے بھتیجے سے روایت ہے کہ جب باغیوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا ارادہ کیا تو عبداللہ بن سلام ان کے پاس گئے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "کیسے آنا ہوا" عبداللہ نے کہا: "آپ رضی اللہ عنہ کی مدد کو آیا ہوں" سیدنا عثمان نے کہا: "تم باغیوں

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ⑩ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ اٰمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَآ ع ۱

(تو تمہارا کیا انجام ہوگا؟) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔⑩ اور کافر ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: اگر یہ (دین) کوئی اچھی چیز ہوتا تو یہ (ایمان والے) اسے قبول کرنے میں ہم سے سبقت[۱۵] نہ لے جاتے۔

کے پاس جاؤ اور انہیں مجھ سے دور رکھو۔ تمہارا باہر رہنا اندر رہنے سے زیادہ مفید ہے۔" چنانچہ عبداللہ بن سلام لوگوں کے پاس آئے اور کہا: لوگو! جاہلیت میں میرا نام فلاں (حصین) تھا تو رسول اکرم ﷺ نے میرا نام عبداللہ رکھا۔ اور اللہ کی کتاب میں کئی آیات میرے بارے میں نازل ہوئیں۔ چنانچہ آیت ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ......﴾ میرے بارے میں نازل ہوئی۔ نیز یہ آیت ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا...... مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد میں ہوں۔ (سنو) اللہ تعالیٰ کی ایک تلوار ہے جو تم سے پوشیدہ ہے۔ اور اسی شہر میں فرشتے تمہارے ہمسایہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں تمہارے نبی آئے تھے۔ لہٰذا اس شخص (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ) کو قتل کرنے کے بارے میں اللہ سے ڈر جاؤ۔ اللہ کی قسم! اگر تم نے اسے قتل کیا تو تمہارے ہمسایہ فرشتے تمہارے ہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ اور اگر اللہ کی چھپی ہوئی تلوار نکل آئی تو تاقیامت پھر میان میں نہ جائے گی۔" باغیوں نے عبداللہ کی تقریر سن کر کہا: "اس یہودی کو بھی مار ڈالو اور عثمان کو بھی مار ڈالو" (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

❁ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے متعلق یہود کا تبصرہ:۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو عبداللہ بن سلام آپ کے پاس حاضر ہوئے اور چند باتیں پوچھنے کے بعد اسلام لے آئے۔ پھر کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ یہودی لوگ بہتان تراش ہیں۔ آپ ان سے میرا حال پوچھئے مگر انہیں میرے مسلمان ہونے کی خبر نہ ہو۔ چنانچہ یہودی آئے تو آپ نے ان سے پوچھا: "تم میں عبداللہ بن سلام کیسا آدمی ہے؟" وہ کہنے لگے: ہم سب سے اچھا اور اچھے کا بیٹا اور ہم سب سے افضل اور افضل کا بیٹا ہے" آپ نے پوچھا: اگر وہ مسلمان ہو جائے تو کیا تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے؟" کہنے لگے: خدا نہ کرے، اللہ اسے اسلام سے محفوظ رکھے" آپ ﷺ نے ان سے دوبارہ یہی سوال کیا اور یہود نے پھر یہی جواب دیا۔ اب عبداللہ بن سلام (جو وہیں چھپے بیٹھے تھے) شہادتین پڑھتے ہوئے باہر نکل آئے۔ یہودی یہ کلمے سن کر کہنے لگے، عبداللہ تو ہم سب سے خراب آدمی اور خراب آدمی کا بیٹا ہے اور انہیں برا بھلا کہنے لگے۔ عبداللہ بن سلام نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! مجھے اسی بات کا ڈر تھا" (بخاری۔ کتاب المناقب) تاہم بعض علماء اس گواہ سے مراد سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو سمجھتے ہیں کہ سب سے بڑے گواہ تو وہ خود تھے۔ جو ہزاروں سال پہلے یہ گواہی دے چکے کہ بنی اسرائیل کے اقارب اور بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے انہی کی نسل سے ایک رسول آنے والا ہے۔ یہی سبب تھا کہ بعض منصف اور حق پرست احبار یہود مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ رسول اللہ کا چہرہ دیکھتے ہی اسلام لے آئے اور بول اٹھے کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے کا نہیں ہو سکتا، لہٰذا انہوں نے اس نبی کے اور قرآن کے برحق ہونے کی گواہی دی۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام ایک چیز کے ظہور میں آنے سے ہزاروں سال پہلے ایمان رکھیں۔ علمائے یہود اس کی سچائی کی گواہی دیں۔ بعض احبار یہود زبانی اور قلبی شہادت دے کر اسلام لے آئیں مگر تم ان سب شہادتوں کے باوجود اپنے تکبر اور غرور کی بنا پر اسے قبول نہ کرو تو سمجھ لو کہ اس سے بڑھ کر ناانصافی اور گناہ کیا ہوگا؟ اور ایسے ظالم اور گنہگار کی نجات و فلاح کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟۔

[۱۵] ❁ یہود کی اپنے متعلق غلط فہمی:۔ بایں ہمہ وہ یہ بھی سمجھے بیٹھے ہیں کہ کسی چیز کے حق ہونے کا معیار ہماری ذات والا

إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴿١١﴾ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ
وَهَٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا
رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٣﴾ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ
فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ

اور چونکہ انہوں نے اس (قرآن) سے ہدایت نہیں پائی لہٰذا اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ[۱۶] ہے۔(۱۱) حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (تورات) جو رہنما اور رحمت تھی، موجود تھی۔ اور یہ کتاب (قرآن) اس کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جو عربی[۱۷] زبان میں ہے تاکہ ظالموں کو متنبہ کرے اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دے۔(۱۲) یقیناً جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر ڈٹ گئے انہیں کوئی خوف نہ ہوگا[۱۸] اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۱۳) یہی لوگ اہل جنت ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے جو وہ کرتے رہے۔(۱۴) ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنے والدین سے اچھا[۱۹] سلوک کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی جنا[۲۰]۔

صفات ہے۔ حق وہی ہو سکتا ہے جسے ہم حق قرار دے دیں۔ پھر جب ہم ہی اسے حق نہیں سمجھتے تو چند کمزور درجہ کے لوگوں کے اس کو حق سمجھنے سے وہ چیز حق کیسے بن سکتی ہے۔ اگر یہ دین کوئی اچھی چیز ہوتی تو ہم جیسے عقلمند اور معزز لوگ ان لونڈی غلاموں سے پیچھے کیسے رہ جاتے؟

[۱۶] جھوٹ تو وہ اس لیے کہتے تھے کہ وہ اپنی ذات کو ہی حق کا معیار سمجھتے تھے اور قرآن ان کے معیار کے خلاف تھا۔ اور پرانا اس لیے کہتے تھے کہ سابقہ انبیائے کرام کی تعلیم بھی بعینہ وہی کچھ تھی جو اس نبی آخر الزمان کی تھی۔ وہ اسے نیا جھوٹ کہہ ہی نہیں سکتے تھے اور نہ انہیں یہ کہنا گوارا تھا کہ یہ پرانا سچ ہے۔ کیونکہ ابتدا سے انبیائے کرام یہی کچھ تعلیم دیتے رہے ہیں۔

[۱۷] نبی آخر الزمان کی بعثت سے ہزاروں برس پہلے تورات نے جو اصولی تعلیم دی تھی۔ انبیاء و اولیاء کی ایک کثیر تعداد اسی تعلیم سے رہنمائی حاصل کرتی رہی۔ اس کتاب نے بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے راستی اور ہدایت کی راہ ڈال دی اور یہ لوگوں پر اللہ کی بہت بڑی رحمت تھی۔ اور یہ موجودہ کتاب قرآن بھی تورات کو سچا ثابت کرتا ہے۔ گویا یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور ان دونوں کتابوں میں مجرموں کے لیے وعید اور نیک لوگوں کے لیے جنت کی بشارت موجود ہے۔

[۱۸] اس آیت کی تفسیر کے لیے سورۂ حٰم السجدۃ کی آیت نمبر ۳۰ کے حواشی ملاحظہ فرمایئے۔

[۱۹] والدین سے بہتر سلوک کے سلسلہ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۲۳ اور ۲۴ کے حواشی ملاحظہ فرمایئے۔

[۲۰] والدہ حسن سلوک کی والد سے زیادہ حقدار ہے:۔ اس آیت میں پہلے ایک دفعہ ماں اور باپ دونوں سے بہتر سلوک کا حکم دیا۔ پھر تین بار صرف ماں کی خصوصی خدمات کا ذکر فرمایا۔ اور اس آیت کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میرے بہتر سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری ماں، اس نے دوبارہ پوچھا، پھر کون؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تیری ماں" تیسری بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا۔ پھر چوتھی بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "تیرا باپ" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب من احق الناس بحسن الصحبة)

كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ڕ

اس کے حمل اور دودھ چھڑانے [۲۱] میں تیس ماہ لگ گئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بھرپور جوانی کو پہنچا اور چالیس سال [۲۲] کا ہو گیا تو اس نے کہا: "میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور یہ بھی کہ میں ایسے اچھے [۲۳] عمل کروں جو تجھے پسند ہوں اور میری خاطر میری اولاد [۲۴] کی اصلاح کر

[۲۱] ❁ رضاعت کی مدت شمار اور اس کے نتائج:۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رضاعت کی پوری مدت دو سال ہے۔ البتہ اگر والدین کسی ضرورت کے تحت اس مدت میں کمی کرنا چاہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح سورۂ لقمان کی آیت نمبر ۱۴ میں فرمایا کہ ماں کو دودھ چھڑانے میں دو سال لگ گئے۔ اور اس مقام پر فرمایا کہ حمل اور رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ ان سب آیات کو سامنے رکھنے سے درج ذیل مسائل کا پتا چلتا ہے۔

(۱) رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ اس میں کمی ہو سکتی ہے۔ زیادتی نہیں۔ لہٰذا اگر کسی نے دو سال سے زیادہ عمر میں کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس پر احکام رضاعت کا اطلاق نہ ہو گا یعنی وہ احکام جن کا نکاح سے تعلق ہے۔

(۲) حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ چھ ماہ سے پہلے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ موجودہ خاوند کا نہیں بلکہ کسی اور مرد کا بچہ ہو گا۔ زیادہ واضح الفاظ میں وہ لڑکا ولد الزنا ہو گا۔ اور اس کا وراثت سے بھی کچھ تعلق نہ ہو گا اور بچے کی ماں کو زنا کی حد پڑ سکتی ہے۔ واضح رہے کہ موجودہ طبی تحقیقات کے مطابق حمل کی کم از کم مدت ۲۸ ہفتے قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ تحقیق صحیح ہو تو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے اس مسئلہ کے ہر دو پہلوؤں سے نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر اس مدت میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے چھ ماہ کی مدت قرار دی ہے۔ چھ ماہ کے بعد بچہ پیدا ہو تو والدیا عورت کا خاوند اس کے نسب سے انکار کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔

(۳) رضاعت کی مدت کی بہتر صورت یہ ہے کہ اگر بچہ چھ ماہ بعد پیدا ہو تو رضاعت کی مدت پورے دو سال یا چوبیس ماہ قرار دی جائے۔ اگر سات ماہ بعد پیدا ہو تو ۲۳ ماہ، آٹھ ماہ بعد پیدا ہو تو ۲۲ ماہ اور نو ماہ بعد پیدا ہو تو ۲۱ ماہ قرار دی جائے۔

(۴) مدت کا شمار قمری مہینوں کے حساب سے ہو گا شمسی مہینوں سے نہیں۔

[۲۲] ❁ پختگی کی عمر کتنی ہے؟:۔ اگرچہ انسان کی جسمانی قوت اور طاقت چالیس سال سے پہلے ہی اپنے نقطہ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ تاہم اس میں عقل کی پختگی چالیس سال تک ہی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کو نبوت چالیس سال کی عمر میں یا اس کے بعد عطا کی جاتی رہی۔ البتہ عیسیٰ علیہ السلام اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے آپ کی اور بھی کئی باتیں اعجازی حیثیت رکھتی ہیں۔ ویسے ہی نبوت بھی آپ کو تیس سال کی عمر میں عطا ہوئی اور ۳۳ سال کی عمر میں آپ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔

[۲۳] یہ انسان کی عقل کی پختگی کی دلیل ہے کہ اسے اپنے پروردگار کے اور اپنے والدین کے احسانات کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور شکر کے لیے اللہ سے توفیق بھی طلب کرتا ہے۔ اور عملی طور پر اللہ کا شکریوں ادا کرتا ہے اور اس کی توفیق چاہتا ہے جو اللہ کو پسند ہو۔ واضح رہے اللہ تعالیٰ کو وہی اعمال پسند ہیں جو خالصتاً اس کی رضامندی کے لیے کیے جائیں۔ شریعت کی پابندیوں یعنی اسوۂ رسول کے مطابق ہوں۔ ان میں ریا کا شائبہ تک نہ ہو۔ اور بعد میں کوئی ایسا فعل نہ کیا جائے جو اس عمل کو برباد کرنے کا سبب بن جائے۔

[۲۴] ❁ سیدنا ابوبکر صدیق پر خصوصی احسان:۔ صحابہ کرام میں صرف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ایسے خوش قسمت تھے جو خود بھی

إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ
سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿١٦﴾ وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا
أَتَعِدَانِنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ
حَقٌّ فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٧﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ

میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور بلاشبہ میں فرمانبردار ہوں۔(۱۵) یہی لوگ ہیں جن کے بہترین اعمال[۲۵] کو ہم قبول کرتے اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ اہل جنت میں شامل ہیں۔ (اللہ کا) وعدہ سچا ہے جو ان سے کیا جاتا تھا۔(۱۶) اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: ''تف ہو تم پر، تم مجھے اس بات سے ڈراتے ہو کہ میں (زندہ کر کے زمین سے) نکالا جاؤں گا حالانکہ مجھ[۲۶] سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں۔ (اور ان میں سے کوئی بھی جی کر نہیں اٹھا) اور وہ دونوں اللہ کی دہائی دے کر اسے کہتے: ''تیرا ستیاناس۔ ہماری بات مان جا کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے'' تو وہ کہتا ہے: ''یہ تو بس پہلے لوگوں کی داستانیں[۲۷] ہیں''(۱۷) یہی لوگ ہیں جن پر جنوں اور انسانوں کی ان سے پہلے کی جماعتوں سمیت اللہ کا (عذاب کا) قول صادق[۲۸] آتا ہے

مسلمان، ان کے والدین بھی مسلمان اور اولاد بھی مسلمان تھی اور ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ صحابہ میں یہ خصوصیت اور کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

[۲۵] یعنی ان کے اچھے اعمال میں سے جو بہترین ہوں گے، ان کی مناسبت سے ہی ہم ان کے سارے اچھے اعمال کا بدلہ دے دیں گے۔ اگرچہ وہ بہترین اعمال کے پایہ کے نہ ہوں گے۔ اور ان کی خطاؤں اور کوتاہیوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیں گے۔

[۲۶] یہ کوئی مخصوص کردار نہیں ہے۔ بلکہ مکہ میں ایسی مثالیں بھی موجود تھیں۔ بعض لوگ خود مشرک تھے اور ان کی اولاد مسلمان ہو گئی تھی اور بعض بڑے بوڑھے خود مسلمان تھے مگر ان کی نوجوان اور متکبر اولاد مشرک اور عقیدہ آخرت سے منکر تھی۔ اس آیت میں ''خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کے مصداق ایسے ہی ایک گھرانے کا مکالمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ مشرک بیٹے کی دلیل پرانی اور گھسی پٹی دلیل ہے جو کہ آخرت کے منکر عموماً جواب میں کہا کرتے ہیں کہ ہزار سال سے لوگ مرتے رہے ہیں کوئی زندہ ہو کر واپس تو آیا نہیں۔ پھر تم مجھے یہ کیسی دھمکی دیتے ہو۔ اس سوال کا جواب یہاں چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اکثر مقامات پر قرآن میں اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔

[۲۷] ❁ اگر عقیدہ آخرت پرانا ہے تو اس کا جواب بھی تو اتنا ہی پرانا افسانہ ہے:۔ پہلے لوگ بھی کچھ ایسی باتیں کرتے رہے ہیں مگر آج تک چونکہ کوئی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر واپس نہیں آیا تو پھر ہم ان کی یہ بات کیسے درست تسلیم کر لیں۔ یہ تو محض پرانے افسانے ہی ہیں۔ مگر اسے یہ بات یاد نہیں رہتی کہ اگر یہ پرانے افسانے ہیں تو اس کا جواب بھی تو ویسا ہی پرانا افسانہ ہے جو آخرت کے منکر دیتے رہے ہیں۔

[۲۸] یعنی ایسے ضدی لوگ جو نہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور نہ عقلی دلائل کو تسلیم کرتے ہیں ان پر اللہ کا یہ قول فٹ آتا ہے کہ

قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَ
هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا

بلاشبہ یہی لوگ خسارہ [۲۹] اٹھانے والے ہیں۔(۱۸)

(ان دونوں قسموں کے لوگوں میں سے) ہر ایک کے ان کے اعمال کے لحاظ سے درجے ہوں گے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ [۳۰] دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔(۱۹) اور جس دن کافر دوزخ پر پیش کیے جائیں گے (تو انہیں کہا جائے گا) تم دنیا کی زندگی میں پاکیزہ چیزوں [۳۱] سے اپنا حصہ لے چکے

میں جنوں اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اور یہ قول بھی دراصل ابلیس کی اس بات کے جواب میں ہے۔ جو اس نے اللہ تعالیٰ سے کہی تھی کہ میں تیری ساری مخلوق کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ کوئی چند تیرے مخلص بندے میرے داؤ سے بچ جائیں تو الگ بات ہے۔ یہ آخرت کا منکر بیٹا بھی انہی جہنم میں داخل ہونے والوں یا بالفاظ دیگر ابلیس کے پیچھے چڑھنے والوں میں سے ہے۔

[۲۹] **آخرت کے منکر دنیا اور آخرت دونوں جگہ خسارے میں:۔** آخرت کے منکر کو دنیا میں تو یہ خسارہ ہوتا ہے کہ وہ گناہوں پر دلیر ہو کر ایمان و سعادت کا وہ بیج بھی ضائع کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہر آدمی کے دل میں فطری طور پر ڈال رکھا تھا۔ پھر جب وہ گناہوں پر ملامت کرنے والے ضمیر کا ہی گلا گھونٹ دیتا ہے تو اسے راہ راست پر لانے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور آخرت میں اس کا خسارہ یہ ہے کہ اگر اس نے زندگی میں کوئی اچھے کام کیے بھی تھے تو ان کا اسے کوئی صلہ نہ ملے گا۔ اس لیے کہ اس نے آخرت میں اجر ملنے کی نیت سے وہ کام کیے ہی نہ تھے۔ اس طرح اس کے گناہ ہی گناہ باقی رہ جائیں گے۔

[۳۰] نیک لوگوں پر ظلم کی صورتیں یہ ہیں کہ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ نہ دیا جائے یا کم دیا جائے۔ اور مجرموں پر ظلم کی صورتیں یہ ہیں کہ انہیں جرم سے زیادہ سزا دے ڈالی جائے یا مجرموں کو سزا دیے بغیر چھوڑ دیا جائے غرضیکہ ظلم کی کوئی بھی صورت وہاں ممکن نہ ہو گی۔

[۳۱] **کافروں کو ان کے اچھے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے:۔** کافروں اور آخرت کے منکروں کو ان کے اچھے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص رفاہ عامہ کے لیے کوئی ہسپتال یا اس کا کوئی کمرہ بنواتا ہے۔ تو اس سے اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی سخاوت کی شہرت ہو اور لوگ اس کو اچھے لفظوں میں یاد کریں۔ تو یہ بدلہ اسے دنیا میں مل جاتا ہے۔ اس کے نام کا کتبہ ہسپتال کے کمرہ کے باہر لگا دیا جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ کسی دوسرے کی طرف سے اخبارات و رسائل میں اشتہار یا خبر بھی شائع کرا دی جاتی ہے اس طرح اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لیے اس نے یہ اچھا کام کیا تھا۔ غرضیکہ ایسے کافروں کو ان کے اچھے اعمال کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مال و اولاد، حکومت، تندرستی، عزت و شہرت وغیرہ کی شکل میں دے دیا جاتا ہے۔ رہا آخرت میں اجر کا معاملہ تو یہ نہ ان کا مطلوب تھا اور نہ ہی اسے یہ مل سکے گا اور انہیں واضح طور پر یہ بتا دیا جائے گا کہ تم اپنے اچھے کاموں کا بدلہ دنیا میں لے چکے ہو اور ان سے فائدہ اٹھا چکے ہو۔ لہٰذا آج

وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝ وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ

اور ان سے مزے اڑا چکے آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ یہ ان باتوں کا بدلہ ہے کہ تم زمین میں ناحق اکڑ[۳۲] رہے تھے اور نافرمانی کیا کرتے تھے۔(۲۰) اور ان (کفار مکہ) سے قوم عاد[۳۳] کے بھائی (ہود) کا ذکر کیجئے۔ جب اس نے احقاف[۳۴] میں اپنی قوم کو (برے انجام سے) ڈرایا۔ جبکہ ہود سے پہلے بھی انہیں ڈرانے والے آئے

تمہارے لیے کچھ نہیں۔

دنیا میں مال و دولت کی فراوانی، اولاد، عزت اور تندرستی وغیرہ نعمتیں کافروں کو ہی نہیں ملتیں۔ اللہ کے نیک بندوں کو بھی ملتی ہیں اور مل سکتی ہیں۔ مگر ان کا انداز فکر اور ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا طریق کافروں اور آخرت کے منکروں سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

❁ مومنوں کا انداز فکر:۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بیٹے ابراہیم کہتے ہیں کہ ایک دن عبدالرحمٰن بن عوف (ان کے والد) نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ شام کے وقت روزہ افطار کرنے کے لیے جب ان کے سامنے کھانا رکھا گیا تو (کھانے کی نعمتیں دیکھ کر) کہنے لگے۔ مصعب بن عمیرؓ (احد کے دن) شہید ہوئے۔ وہ مجھ سے اچھے تھے۔ ایک ایسی چادر میں ان کو کفن دیا گیا کہ اگر سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے رہ جاتے اور اگر پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگا رہ جاتا تھا اور حمزہ بن عبدالمطلبؓ بھی اسی دن شہید ہوئے وہ بھی مجھ سے اچھے تھے۔ پھر اس کے بعد ہم لوگوں کو آسودگی اور فراوانی دی گئی اور ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہماری نیکیوں کا ثواب جلدی سے ہمیں دنیا میں نہ مل گیا ہو۔ پھر اس کے بعد رونے لگے اور اتنا روئے کہ کھانا بھی نہ کھایا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۂ احد)

[۳۲] ❁ یعنی بلاوجہ تم دنیا میں اکڑتے تھے۔ احکام الٰہی کو تسلیم کرنے میں اپنی توہین سمجھتے تھے اور ایماندار لوگوں کو ذلیل سمجھتے تھے۔ لہٰذا آج تمہاری اکڑ توڑ دی جائے گی اور نافرمانی کے بدلے تمہیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اور دوسروں کو ذلیل سمجھنے کے بدلے تمہیں رسواکن عذاب دیا جائے گا تاکہ جہنمی بھی تمہیں ذلیل مخلوق سمجھیں۔

[۳۳] یہاں قوم عاد کا ذکر اس مناسبت سے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ قریشی سرداروں سے بھی زیادہ مغرور، متکبر اور سرکش تھے۔ یہ قوم کفار مکہ کی نسبت قد و قامت، ڈیل ڈول اور جسمانی قوت کے لحاظ سے بھی بہت بڑھ کر تھی۔

[۳۴] ❁ احقاف قوم عاد کا مسکن:۔ احقاف، حقف کی جمع ہے۔ بمعنی ریت کے بڑے بڑے میلوں میں پھیلے ہوئے ٹیلے۔ یہی علاقہ قوم عاد کا مسکن تھا۔ جو کسی زمانہ میں سرسبز اور شاداب علاقہ تھا۔ قوم عاد نے اسی جگہ زمین دوز مکان بنا رکھے تھے۔ یہ علاقہ جنوبی عرب میں حضر موت کے شمال میں واقع ہے۔ اور آج کل وہاں ریت ہی ریت کے ٹیلے ہیں جو سینکڑوں میل تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اس علاقہ کو آج کل ربع خالی بھی کہتے ہیں۔ کوئی شخص اس صحرا میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا۔ اور جو چیز اس ریت میں گر پڑے وہ بھی ریت میں دھنس کر ریت ہی بن جاتی ہے۔ جیسے کوئی چیز نمک کی کان میں گر پڑے تو وہ بھی نمک ہی بن جاتی ہے۔

مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَ مِنۡ خَلۡفِهٖۤ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَاۡفِکَنَا عَنۡ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰهِ ۫ۖ وَ اُبَلِّغُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖ وَ لٰکِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا رَاَوۡهُ عَارِضًا مُّسۡتَقۡبِلَ اَوۡدِیَتِهِمۡ ۙ قَالُوۡا هٰذَا عَارِضٌ مُّمۡطِرُنَا ؕ بَلۡ هُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِهٖ ؕ رِیۡحٌ فِیۡهَا

اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔ اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت[٣٥] نہ کرنا۔ بلاشبہ میں تمہیں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔(٢١) وہ کہنے لگے: "کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ کرو۔ اگر تم سچے ہو تو جس عذاب کی ہمیں دھمکی دیتے ہو وہ لے آؤ۔(٢٢) ہود نے کہا: اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ میں تو تمہیں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نادان[٣٦] لوگ ہو۔(٢٣) پھر جب انہوں نے اس (عذاب کو) بادل (کی صورت میں) اپنے میدانوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو کہنے لگے: "یہ بادل ہے جو ہم پر برسے گا" بلکہ یہ وہ چیز تھی جس کے لئے تم جلدی[٣٧] مچا رہے تھے یعنی ایسی آندھی جس

[٣٥] اس علاقہ میں ہود علیہ السلام سے پہلے بھی کئی نبی آئے تھے اور بعد میں آتے رہے۔ ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ اللہ ہی کائنات کا اور تمہارا خالق اور مالک ہے۔ لہٰذا وہی ہستی عبادت کے لائق ہے۔ صرف اسی کی عبادت کرو۔ کیونکہ اور کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اگر تم نے اللہ کا حکم نہ مانا، شرک اور اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو تم پر سخت عذاب نازل ہوگا۔

[٣٦] ❁ کسی بات کا نتیجہ غلط نکالنا بھی جہالت ہے اور قوم ہود کی جہالت:۔ ان کی نادانی اور جہالت یہ تھی کہ جو بات انہیں ہود علیہ السلام سمجھانا چاہتے تھے انہوں نے اس کے برعکس نتیجہ نکالا۔ سیدنا ہود علیہ السلام نے انہیں یہ سمجھایا تھا کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کسی کو کسی بھی طرح کے تصرف کا اختیار حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ خود مجھے بھی نہیں۔ میں بھی محض اللہ کا پیغام پہنچانے والا اور تمہیں تمہارے برے انجام سے ڈرانے والا ہوں۔ لیکن انہوں نے جواب میں یہ کہہ دیا کہ جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو وہ لے آؤ۔ حالانکہ ہود علیہ السلام کا یہ دعویٰ تھا ہی نہیں کہ اگر تم انکار کرو گے تو میں تم پر عذاب بھی لا سکتا ہوں اور مجھے ایسے تصرف کے اختیار حاصل ہیں۔ اور ان کی دوسری نادانی یہ تھی کہ اچھی بات کو تو قبول نہیں کرتے تھے اور عذاب کے لیے جلدی مچاتے تھے۔

[٣٧] ❁ قوم عاد پر عذاب بادل کی شکل میں نمودار ہوا تھا:۔ یہ لوگ بڑی مدت سے بارش کو ترس رہے تھے۔ قحط سالی کا دور دورہ تھا۔ ایک کالی گھٹا اٹھی اور اپنے علاقہ کی طرف آگے بڑھتی دیکھی تو خوشی سے جھوم اٹھے کئی طرح کی امنگیں انگڑائیاں لینے لگیں۔ بارش کے بعد سیرابی اور خوشحالی کی توقعات باندھنے لگے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ یہ گھٹا باران رحمت کی گھٹا تھی یا ان کو نیست و نابود کرنے کے لیے اللہ کا عذاب کالی گھٹا اور آندھی کی صورت میں ان کے سروں پر پہنچنے والا تھا۔ یہ آندھی انتہائی تیز رفتار، سخت ٹھنڈی تھی جو آٹھ دن اور سات راتیں مسلسل ان پر چلتی رہی۔ اس واقعہ سے جو سبق ہمیں ملتا ہے کہ کسی چیز کی ظاہری شکل و صورت پر ہی تکیہ نہ کر لینا چاہئے۔ بلکہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب بھی ابر یا آندھی دیکھتے تو آپ ﷺ کے چہرے پر فکر معلوم ہوتی۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ لوگ

عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۝۲۴ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيۡءٍۢ بِاَمۡرِ رَبِّهَا فَاَصۡبَحُوۡا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمۡ ؕ كَذٰلِكَ
نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ۝۲۵ وَلَقَدۡ مَكَّنّٰهُمۡ فِيۡمَاۤ اِنۡ مَّكَّنّٰكُمۡ فِيۡهِ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ
سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا وَّاَفۡـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ
ع ۳ شَيۡءٍ اِذۡ كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۲۶ وَلَقَدۡ
اَهۡلَكۡنَا مَا حَوۡلَكُمۡ مِّنَ الۡقُرٰى وَصَرَّفۡنَا الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝۲۷ فَلَوۡلَا نَصَرَهُمُ
الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ قُرۡبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلۡ ضَلُّوۡا عَنۡهُمۡ ۚ وَذٰلِكَ اِفۡكُهُمۡ وَمَا

میں دردناک عذاب تھا۔(۲۴) وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تہس نہس کر رہی تھی[۳۸]۔ آخر ان کا یہ حال ہوا کہ ان کے گھروں کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ ہم مجرموں کو ایسے ہی سزا دیا کرتے ہیں۔(۲۵) ہم نے انہیں اتنی قدرت دے رکھی تھی جتنی تمہیں نہیں دی۔ اور ہم نے انہیں کان، آنکھیں[۳۹] اور دل سب کچھ دے رکھا تھا۔ مگر یہ ان کے کان، آنکھیں اور دل ان کے اس وقت کچھ بھی کام نہ آئے جب انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کر دیا اور انہیں اسی چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔(۲۶) اور تمہارے اردگرد ہم بہت سی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں اور دلائل کو طرح طرح سے بیان کر دیا ہے تاکہ وہ باز آجائیں۔(۲۷) پھر ان ہستیوں نے ان کی کیوں مدد نہ کی۔ جنہیں[۴۰] ان لوگوں نے اللہ کے سوا تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھ کر الٰہ بنا رکھا تھا؟ بلکہ وہ ان سے گم ہو جائیں گی اور یہ نتیجہ ہوگا

تو جب بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ اب بارش ہوگی۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ جب بادل آئے تو آپ ﷺ کے چہرہ پر ناگواری معلوم ہوتی ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "عائشہ رضی اللہ عنہا! مجھے یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں اس میں عذاب نہ ہو۔ ایک قوم (عاد) پر آندھی کا عذاب آیا۔ جب انہوں نے بادل دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے۔
(بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۳۸] ❁ عاد پر عذاب کی نوعیت:۔ اس عذاب کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر گزر چکا ہے۔ اس آندھی کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ وہ درختوں اور پودوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پرے پھینک دیتی تھی یہی آندھی ان کے زمین دوز مکانوں کے اندر گھس گئی۔ اس دوران وہ اپنے گھروں سے نکل بھی نہیں سکتے تھے۔ سردی کی شدت سے وہیں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے۔ لے دے کے اگر کوئی چیز وہاں نظر آتی تھی تو وہ ان کے مکان ہی تھے جن میں دراڑیں پڑ گئیں تھیں۔

[۳۹] یعنی سننے کے لیے کان، دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سوچ بچار کے لیے دل دیئے تھے۔ مگر وہ ان سے اتنا ہی کام لیتے تھے جو ایک جانور لیتا ہے۔ یعنی اتنا ہی جو دنیا کے مال و متاع کے حصول کے لیے مفید ہو۔ دنیا کے کام میں عقلمند تھے لیکن وہ عقل نہ آئی جس سے آخرت درست ہو، آیاتِ الٰہی سنتے وقت ان کے کان بہرے ہو جاتے تھے اور آیاتِ الٰہی دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں بند ہی رہتی تھیں۔ پھر جب ان پر عذابِ الٰہی آیا تو ان کی عقلمندی ان کے کسی کام نہ آسکی۔

[۴۰] اہل مکہ کے اردگرد کسی زمانہ میں ایسی بے شمار بستیاں آباد تھیں۔ جو اب تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ انہیں وہ بچشم خود ملاحظہ

كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ

ان کے جھوٹ کا اور اس بات کا جو جھوٹے عقیدے انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔(۲۸) اور (وہ واقعہ بھی یاد کیجئے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو آپ کی طرف لے آئے تھے جو قرآن سن [۴۱] رہے تھے۔ جب وہ اس مقام پر آ پہنچے تو

کر سکتے تھے اور اگر چاہتے تو ان سے عبرت بھی حاصل کر سکتے تھے۔ ان قوموں کا سب سے بڑا اور مشترکہ جرم یہ تھا کہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر کئی ایسے الٰہ بنا رکھے تھے جن کے متعلق ان کا یہ گمان تھا کہ وہ مصیبت کے وقت ہمارے کام آتے ہیں۔ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرتے ہیں اور یہ اللہ کے ہاں ہماری فریادیں پہنچانے اور ہمیں اللہ کے قریب کر دینے کا ذریعہ ہیں۔ پھر چاہئے تو یہ تھا کہ جب اسی جرم کی پاداش میں ان پر عذاب آیا کہ اس مصیبت میں وہ ان کی مدد کو پہنچتے۔ مگر کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جب اللہ کا عذاب آیا تو ان معبودوں کے شیدائی پرستاروں کو یہ یاد ہی نہ رہا کہ ہمیں تو اپنے معبودوں کو پکارنے کا وقت ہے۔ اس سے زیادہ مشکل اور کون سا وقت ہوگا۔ اس سے از خود یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جو افسانے ان لوگوں نے اپنے معبودوں کی دھاک بٹھانے کے لیے تراش رکھے تھے سب جھوٹ ہی جھوٹ تھے۔

[۴۱] ❁ انسان سے پہلے زمین پر جنوں کی آبادی:۔ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سے دو نوع ایسی ہیں جو شریعت الٰہی کی مکلف ہیں۔ ایک جن، دوسرے انسان۔ پھر انسانوں کی پیدائش سے پہلے جن ہی اس زمین پر آباد تھے۔ اور ان کی طرف بھی پیغمبر مبعوث ہوتے تھے۔ اور جس طرح انسانوں کی اکثریت اللہ تعالیٰ کی نافرمان ہی رہی ہے۔ اسی طرح جنوں کی اکثریت بھی نافرمان ہی تھی اور اب بھی ہے۔

❁ بعد میں نبوت صرف انسانوں میں:۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو اسے بھی اشرف المخلوقات بنایا اور جنوں کی حیثیت انسان کے بالتبع بن جانے کی ہو گئی۔ نبوت کا سلسلہ جنوں کی طرف سے بند ہو کر انسانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اب جو پیغمبر انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ بھیجتے رہے وہی جنوں کے لیے بھی پیغمبر ہوتے تھے گویا ہمارے نبی آخر الزمان جس طرح ہمارے لیے اللہ کے پیغمبر تھے، جنوں کے لئے بھی تھے' جنوں کے آپ ﷺ سے قرآن سننے کا ذکر ایک تو اس مقام پر آیا ہے اور دوسرا سورہ جن میں۔ لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی دور میں تقریباً چھ دفعہ ایسا موقع آیا تھا۔ جب آپ ﷺ سے جنوں نے قرآن سنا تھا۔ ان میں سے ہم چند روایات درج کرتے ہیں۔ ان میں جو کچھ اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ وہ صرف الگ الگ موقع کی وجہ سے ہے:۔

۱۔ ❁ جنوں کا آپ کی زبان سے قرآن سننا:۔ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں، ایک دفعہ آپ ﷺ اپنے چند صحابہ کے ہمراہ عکاظ کے بازار جانے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ ان دنوں شیطانوں کو آسمانوں کی خبر ملنا بند ہو گئی اور ان پر انگارے پھینکے جاتے تھے۔ وہ (زمین کی طرف) لوٹے اور (آپس میں) کہنے لگے۔ یہ کیا ہو گیا۔ ہمیں آسمان کی خبر ملنا بند ہو گئی اور ہم پر انگارے پھینکے جاتے ہیں۔ ضرور کوئی بات واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں آسمان کی خبر ملنا بند ہو گئی ہے اب یوں کرو کہ ساری زمین کے مشرق و مغرب میں پھر کر دیکھو کہ وہ کیا نئی بات واقع ہوئی ہے ان میں سے کچھ شیطان تہامہ (حجاز) کی طرف بھی آئے اور آپ ﷺ تک پہنچ گئے۔ اس وقت آپ ﷺ نخلہ میں تھے اور عکاظ کے بازار جانے کا قصد رکھتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کو نماز فجر پڑھا رہے تھے جب ان جنوں نے قرآن سنا تو ادھر کان لگا دیا۔ پھر کہنے لگے: یہ وہی چیز ہے جس کی وجہ سے ہم پر آسمان کی

قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ

(ایک دوسرے سے) کہنے لگے: خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب قرآن پڑھا [۴۲] جاچکا تو وہ ڈرانے والے بن کر اپنی قوم کے پاس واپس [۴۳] آئے۔(۲۹) کہنے لگے: "اے ہماری قوم! ہم نے ایسی کتاب سنی ہے جو

خبر بند کر دی گئی۔ پھر اسی وقت وہ اپنی قوم کی طرف لوٹے اور کہنے لگے ﴿يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا .... اَحَدًا﴾ تک اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر سورۃ جن نازل فرمائی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنوں کی گفتگو آپ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوئی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ الجن)

۲۔ جنوں کی خوراک:۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ یک دم ہم سے غائب ہوگئے۔ ہم نے آپ ﷺ کو پہاڑ کی وادیوں اور گھاٹیوں میں تلاش کیا، مگر آپ نہیں ملے۔ ہم سمجھے کہ آپ کو جن اڑا لے گئے یا کسی نے چپکے سے مار ڈالا اور رات ہم نے بڑی پریشانی میں بسر کی جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپ حرا کی طرف سے آرہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ رات کو آپ ہم سے غائب ہوگئے ہم نے آپ کو تلاش کیا مگر آپ نہ ملے تو رات ہم نے بڑی پریشانی میں گزاری۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے جنوں کی طرف سے ایک بلانے والا آیا، میں اس کے ساتھ گیا اور جنوں کو قرآن سنایا۔ پھر وہ ہم کو اپنے ساتھ لے گئے اور ان کی نشانیاں اور ان کی آگ کے نشان ہمیں بتائے۔ پھر جنوں نے آپ سے توشہ کا مطالبہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس جانور کی ہر ہڈی جو اللہ کے نام پر کاٹا جائے، تمہاری خوراک ہے۔ تمہارے ہاتھ میں پڑتے ہی وہ گوشت سے پر ہو جائے گی اور ہر اونٹ کی مینگنی تمہارے جانوروں کی خوراک ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ہڈی اور مینگنی سے استنجا مت کرو۔ کیونکہ وہ تمہارے بھائی جنوں اور ان کے جانوروں کی خوراک ہے۔" عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "میں لیلۃ الجن کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ تھا لیکن مجھے آرزو رہی کاش میں آپ کے ساتھ ہوتا" نیز ایک دوسری روایت میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کو جنوں کے آنے کی خبر ایک درخت نے دی تھی۔ (مسلم۔ کتاب الصلوۃ۔ باب الجهر بالقرآة فی الصبح والقراءة علی الجن)

[۴۲] جو روایات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مختلف کتب احادیث میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کی پہلی حاضری کا یہ واقعہ جس کا اس آیت میں ذکر ہے وادی نخلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ اہل طائف سے مایوس ہو کر مکہ معظمہ کی طرف واپس آرہے تھے۔ راستہ میں آپ نے وادی نخلہ میں قیام فرمایا وہاں عشا یا فجر یا تہجد کی نماز میں آپ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا اور وہ آپ کی قراءت سننے کے لیے وہاں ٹھہر گیا۔ اس موقعہ پر جن رسول اللہ ﷺ کے سامنے نہیں آئے تھے۔ نہ آپ نے ان کی آمد کو محسوس کیا تھا بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت یا مذکورہ حدیث نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے۔

[۴۳] سننے والے جنوں کی تبلیغ سے بہت سے جنوں کا ایمان لے آنا:۔ جنوں کے اس گروہ نے قرآن سنا تو اس سے بہت متاثر ہوئے اور فوراً رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔ (یہ واقعہ ان کفار مکہ کو سنایا جا رہا ہے جو دل سے قرآن کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود اسے بہر حال نہ ماننے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے) یہ جن صرف

مِنۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا
دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ
اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ
اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰي

موسیٰ کے بعد نازل[۴۴] ہوئی ہے، وہ اپنے سے پہلے کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔(۳۰) اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات مان لو اور اس پر ایمان لے آؤ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچالے گا۔(۳۱) اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کی بات نہ مانے گا تو وہ اسے زمین میں (بھاگ کر) اسے عاجز[۴۵] نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کے بغیر اس کا کوئی حامی ہوگا (جو اسے اللہ کے عذاب سے بچالے) یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔(۳۲) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور انہیں پیدا[۴۶] کرکے تھک نہیں گیا۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کردے۔ کیوں نہیں۔

خود ہی ایمان نہیں لائے بلکہ اپنی قوم میں جاکر انہیں قرآن کا پیغام سنایا۔ جنوں نے قرآن کی کون سی آیات سنی تھیں؟ اس کی صراحت کہیں مذکور نہیں البتہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی ہی آیات تھیں جن میں اللہ کے نافرمانوں اور مشرکوں کو ان کے برے انجام سے ڈرایا گیا ہو۔ چنانچہ جنوں کی اپنی قوم کو تبلیغ کے نتیجہ میں ایک کثیر تعداد میں جن مسلمان ہوگئے۔ جو بعد میں کئی بار وفود کی شکل میں آپ کے پاس حاضر ہوتے رہے۔

[۴۴] ❁ یہ جن پہلے تورات پر ایمان لاچکے تھے:۔ جنوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب تورات کا نام لیا انجیل کا نام نہیں لیا۔ اس لیے سابقہ آسمانی کتابوں میں سے کوئی کتاب احکام و شرائع کے لحاظ سے تورات جیسی جامع اور اس کے ہم پلہ نہیں تھی۔ اسی پر علمائے بنی اسرائیل کا عمل رہا۔ خود سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا تھا کہ میں تورات کو بدلنے نہیں آیا بلکہ اس کی تکمیل کرنے آیا ہوں۔ اور سیدنا سلیمان ﷤ کے وقت سے جنوں میں تورات ہی مشہور چلی آتی تھی۔ نیز خود تورات میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے متعلق جو پیشین گوئی مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ (اے موسیٰ) میں تیری مانند ایک نبی بھیجوں گا"

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جن پہلے تورات اور کتب سماویہ پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ جب قرآن سنا تو انہیں فوراً معلوم ہوگیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو سابقہ انبیاء دیتے چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا وہ فوراً ایمان لے آئے۔

[۴۵] کیونکہ جن اب اوپر آسمان کی طرف تو جا نہیں سکتے اور اگر جائیں تو فرشتے انہیں مار بھگاتے ہیں۔ لہٰذا اب زمین ہی ان کی پناہ گاہ ہے۔ اب زمین سے بھاگ کر جائیں تو کہاں جائیں؟

[۴۶] ❁ یہود کا اللہ پر تھک جانے کا الزام:۔ اللہ کی ذات کے متعلق تھکنے، آرام کرنے، سونے اور اونگھنے کا تصور ہی یکسر باطل ہے۔ اور ایسا خیال وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اللہ کو بھی اپنے جیسی عاجز اور محتاج مخلوق سمجھتے ہیں حالانکہ کسی بھی چیز سے اللہ کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ ان الفاظ سے یہود کے اس عقیدہ کا رد ہوا جو کہتے تھے کہ اللہ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان پیدا کیے پھر ساتویں دن آرام کیا۔

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٣﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا قَالَ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٤﴾ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل
لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ
إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٣٥﴾

وہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔(۳۳) اور جس دن کافر دوزخ پر پیش کیے جائیں گے (تو ان سے پوچھا جائے گا) کیا یہ (جہنم) حق[۴۷] نہیں؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں۔ ہمارے پروردگار کی قسم (یہ حق ہے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو اب عذاب کا مزا چکھو یہ اس چیز کا بدلہ ہے جو تم کفر کیا کرتے تھے۔(۳۴) پس آپ صبر کیجئے جیسے اولوالعزم[۴۸] پیغمبر صبر کرتے رہے اور ان کے بارے میں جلدی نہ کیجئے۔ جس دن یہ لوگ وہ چیز دیکھ لیں گے جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے تو وہ یوں سمجھیں گے جیسے (دنیا میں) بس دن کی ایک ساعت[۴۹] ہی ٹھہرے تھے۔ بات پہنچا دی گئی ہے۔ تو اب کیا نافرمان لوگوں کے علاوہ کوئی[۵۰] اور ہلاک ہوگا۔(۳۵)

[۴۷] کافر اور آخرت کے منکر آخرت کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ اگر وہ اس کا اقرار کر لیں تو اس سے ان کی آزادی میں خلل آتا ہے۔ اور اس کی مثال بالکل وہی ہے جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ حالانکہ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے کے باوجود بھی بلی وہاں موجود ہی رہتی ہے اور حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اسی طرح منکروں کے آخرت کے انکار کر دینے سے حقیقت میں کچھ فرق نہیں پڑتا اور قیامت کے دن انہیں کہا جائے گا کہ اب ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو کیا عذاب ایک ٹھوس حقیقت ہے یا نہیں جس سے تم آنکھیں بند کر کے اس کا انکار کر دیا کرتے تھے؟ اور اس دن انہیں اقرار کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

[۴۸] ❁ اولوالعزم انبیاء کون کون سے ہیں:۔ ویسے تو سب انبیاء ہی اولوالعزم ہوتے ہیں تاہم عرف عام میں پانچ ہیں، سیدنا نوح علیہ السلام، سیدنا ابراہیم علیہ السلام، سیدنا موسیٰ علیہ السلام، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور محمد مصطفیٰ ﷺ آپ یہ چاہتے تھے کہ یا تو کفار مکہ ایمان لے آئیں یا پھر اللہ ان پر عذاب نازل کر دے۔ جس کا یہ ہر وقت مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ دیکھ لو اولوالعزم انبیاء نے کتنی مدت اپنے مخالفوں کی ایذا رسانیوں پر صبر کیا تھا۔ لہذا آپ ﷺ کو بھی اس معاملہ میں جلدی نہ کرنا چاہئے اور صبر و برداشت سے کام لینا چاہئے۔

[۴۹] یعنی آج تو عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں کہ آتا کیوں نہیں، جب قیامت کو عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو کہیں گے اتنی جلدی عذاب کیوں آ گیا۔ ہم تو دنیا میں بس ایک گھڑی ہی ٹھہرے تھے کہ عذاب آ گیا ہے۔ ویسے بھی انسان کی فطرت ہے کہ اسے مصیبت کی گھڑیاں تو بڑی طویل محسوس ہوتی ہیں لیکن عیش و آرام میں گزرے ہوئے سال ہا سال بھی چند گھڑیاں معلوم ہوتے ہیں۔ قیامت کا دن کس قدر سخت ہوگا۔ اس کا اندازہ کچھ ان کے جواب سے بھی ہو جاتا ہے۔

[۵۰] یعنی اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اللہ کے عذاب سے تباہ صرف اس کے نافرمان ہی کیے جاتے ہیں۔ جو اللہ کے عذاب کی تنبیہ کو مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔

۳۸ آیاتها سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَدَنِيَّةٌ رکوعها ٤

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ

کلمات ۵۵۸ آیات ۳۸ (۴۷) سورۂ محمد[۱] مدنی ہے (۹۵) رکوع ۴ حروف ۲۴۷۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) اللہ کی راہ[۲] سے روکا اللہ تعالیٰ نے ان کے عمل ضائع کر دیئے (۱) اور جو لوگ ایمان[۲-الف] لائے اور نیک عمل کیے اور جو

[۱] سورۂ محمد (ﷺ) کے نزول کا پس منظر:۔ سورۂ محمد ﷺ ان ابتدائی سورتوں میں سے ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مکہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن صرف قریش تھے۔ لیکن مدینہ جانے کے بعد جب مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست بھی قائم ہوگئی تو مسلمانوں کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ قریش مکہ نے بھی اپنی دشمنی ترک نہیں کی۔ یہود سے اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ جاتے ہی ایک دفاعی سمجھوتہ کر لیا تھا لیکن یہود ایک عہد شکن قوم ہے۔ ان کی ساز باز قریش مکہ کے ساتھ رہتی تھی اور قریش مکہ بھی اس دفاعی سمجھوتہ کے باوجود انہیں اپنا ہی حلیف سمجھتے تھے۔ منافقین بھی مسلمانوں کے لیے مار آستین بنے ہوئے تھے اور درپردہ ان کی سب ہمدردیاں یہود کے ساتھ تھیں اور یہ اس لحاظ سے بھی خطرناک تھے کہ مسلمانوں کے راز اور تدبیروں سے یہود اور دوسرے دشمنوں کو باخبر رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں اردگرد کے مشرک قبائل عرب بھی اس چھوٹی سی نئی مسلم ریاست کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد پیدا ہونے والے شدید مسائل اور صرف دو ہی راستے:۔ مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کو یہ فائدہ تو ہوگیا کہ اب وہ آزادی کے ساتھ قرآن پڑھ سکتے، ارکان اسلام بجالاتے اور علی الاعلان تبلیغ کر سکتے تھے۔ مگر یہاں آکر وہ اندر اور باہر کے چاروں طرف کے دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری اور معاشی پریشانیوں کا مسئلہ الگ تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے بس دو ہی راستے تھے ایک یہ کہ ان مشکلات سے گھبرا کر کفر کے آگے گھٹنے ٹیک دیں اور دوسرا یہ کہ سردھڑ کی بازی لگا کر کفر کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں اور اللہ پر توکل کریں۔ اسی پس منظر میں یہ سورہ نازل ہوئی، مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی۔ اور اللہ پر توکل رکھتے ہوئے قتال فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے۔

[۲] صدّ کا لغوی مفہوم:۔ صَدَّ کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی اعراض کرنا اور خود رک جانا بھی ہے۔ اور دوسروں کو روکنا بھی۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا۔ پھر کفر کی حمایت میں دوسروں کو اسلام لانے سے روکتے رہے۔ مسلمانوں کو ایذائیں اور دکھ پہنچانے اور اسلام کی اشاعت کو روکنے کے لیے خفیہ تدبیریں اور سازشیں تیار کرتے رہے اور معاندانہ سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ان کی یہ سرگرمیاں یہاں بے نتیجہ اور بے اثر ثابت ہوں گی۔ اور وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہیں گے۔ اللہ ان کی کوششوں کو برباد کر دے گا اور کبھی بار آور نہ ہونے دے گا۔

[۲-الف] آپ ﷺ کی بعثت کے بعد سب کو آپ کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے

اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّھُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّہِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ② ذٰلِكَ

بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ

اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا

کچھ محمد (ﷺ) پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لائے، اور وہی ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے، اللہ نے ان کی برائیاں دور کر دیں [۳] اور ان کا حال درست کر دیا (۲) یہ اس لئے کہ کافروں نے تو باطل کی پیروی کی اور ایمان والوں نے اس حق کی پیروی کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے (نازل ہوا) اسی طرح اللہ لوگوں سے ان کی ٹھیک ٹھیک [۴] حالت بیان کر دیتا ہے۔(۳)

(مسلمانو!) جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب بے دریغ قتل کر چکو

محمد ﷺ پر اور قرآن پر ایمان لانے کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ مدینہ میں کچھ ایسے یہود موجود تھے جو ایمان بالغیب کی جملہ جزئیات پر ایمان رکھتے تھے اور نیک اعمال بھی بجالاتے تھے۔ انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ اب سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر اور تورات پر ایمان لانا سود مند نہ ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ سابقہ تمام انبیاء کی شریعت علاقائی یا قومی بھی تھی اور عارضی بھی۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ سارے جہاں کے لیے اور تاقیام قیامت رسول ہیں۔ اسی طرح قرآن بھی جملہ اہل عالم کے لیے ایک تاقیام قیامت ہدایت کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا اب ایسے یہود کو بھی سیدنا محمد ﷺ قرآن پر ایمان لانا ہوگا۔

سیدنا عمرؓ کا تورات کے اوراق پڑھنا:۔ اس مفہوم کی وضاحت اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ایک دفعہ سیدنا عمرؓ تورات کے چند اوراق لائے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے لگے جوں جوں سیدنا عمرؓ پڑھتے جاتے آپ کا چہرہ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ سیدنا ابو بکرؓ نے سیدنا عمرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تمہیں گم کرنے والیاں گم پائیں کیا تم رسول اللہ ﷺ کے چہرہ کو نہیں دیکھتے؟ سیدنا عمرؓ نے جب آپ کے چہرہ کی طرف دیکھا تو کہنے لگے کہ "میں اللہ سے اور اس کے رسول کے غضب سے پناہ پکڑتا ہوں۔ ہم اللہ کے پروردگار ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ اگر آج خود موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہو جائیں اور تم مجھ کو چھوڑ کر اس کی پیروی کرو تو سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے اور اگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو انہیں میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا" (دارمی بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ فصل ثالث)

[۳] یعنی کافروں اور ان کی معاندانہ سرگرمیوں کے مقابلہ میں اللہ پر، سیدنا محمد ﷺ پر اور قرآن پر ایمان لائے۔ اور نیک اعمال بجا لاتے رہے۔ کافروں کا ظلم و ستم سہتے رہے، صبر اور برداشت سے کام لیتے رہے۔ اللہ ان کی سابقہ کوتاہیاں اور قصور معاف فرما دے گا اور جن مشکلات سے اس وقت دوچار ہیں ان سے انہیں نکال کر ان کے حالات کو بہتر بنا دے گا اور ان کی کوششیں بار آور ثابت ہوں گی۔

[۴] کفار کی نیکیاں برباد گناہ لازم جبکہ مومنوں کی حالت ان کے بالکل برعکس ہے:۔ اللہ تعالیٰ حق کی پیروی کرنے والوں اور

الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ڃ ذٰلِكَ ۭ وَلَوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ

تو ان کی مشکیں کس (کر انہیں قیدی بنا) لو۔ پھر اس کے بعد یا تو ان پر احسان کر دیا تاوان لے کر چھوڑ دو۔ تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے[۵]۔ (تمہارے لئے) یہی (حکم) ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو خود بھی

باطل کی پیروی کرنے والوں کی ٹھیک ٹھاک مثالیں بیان کرتا ہے۔ حق کی پیروی کرنے والوں کی صورت حال یہ ہوگی کہ ان کی نیکیاں برقرار رہیں گی اور گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ اور باطل کی پیروی کرنے والوں کی صورت حال یہ ہوگی کہ ان کی نیکیاں برباد اور گناہ لازم و برقرار رہیں گے۔ کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی نیک عمل قبول نہیں ہوتا۔

[۵] دو سابقہ تمہیدی آیات کے بعد اب مسلمانوں کو جنگ سے متعلق ہدایات دی جارہی ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کے نزول سے بیشتر مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت تو مل چکی تھی مگر تاحال کوئی معرکہ پیش نہیں آیا تھا۔ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت کے سلسلہ میں جو پہلی آیت نازل ہوئی وہ سورہ الحج کی آیت نمبر ۳۹ ہے پھر اس سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی آیات نمبر ۱۹۰ تا ۱۹۳ ہیں۔ اور یہ ہدایات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جب معرکہ کارزار پیش آئے تو پورے جوش و خروش اور جرأت ایمانی سے ڈٹ کر کافروں کا مقابلہ کرو اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگو! دشمن سے بھڑنے کی آرزو مت کرو اور اللہ سے عافیت مانگو لیکن اگر بھڑ جاؤ تو پھر ثابت قدم رہو اور جان لو کہ بہشت تلواروں کے سائے تلے ہے" (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب لاتتمنّوا لقاء العدو)

۲۔ ❁ جنگ کے متعلق عام ہدایات:۔ تمہارا اصل ہدف یہ ہونا چاہئے کہ دشمن کی جنگی طاقت اور کفر کی کمر توڑ دی جائے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ توجہ کافروں کے قتل کی طرف رکھو۔ ہاں جب لڑائی کا زور ٹوٹ جائے اور دشمن ہتھیار رکھ دے تو اس وقت ان کے بچے کھچے آدمیوں کو قید کرو۔ اس سے پہلے قید نہ کرنے لگ جاؤ۔

۳۔ ❁ جنگی قیدیوں کے متعلق ہدایات:۔ جو قیدی تمہارے ہاتھ لگ جائیں ان سے متعلق دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کی جائے یا تو انہیں احسان رکھ کر چھوڑ دیا جائے یا ان کا فدیہ لے لیا جائے اس سے معلوم ہوا کہ قیدیوں کو قتل کرنا عام قاعدہ نہیں۔ تاہم قتل کی ممانعت بھی نہیں کی گئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کفر کے قیدیوں کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔ جن کا جرم صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ جنگ میں شامل ہوئے تھے۔ بلکہ ان کے اور بھی کئی سخت قسم کے جرائم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ قتل کے مستحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد قیدیوں کے عفو عام کے باوجود چار شخصوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ جنگ بنو قریظہ کے بعد محصور یہود نے سیدنا سعد بن معاذ کو ثالث تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار ڈالے۔ تو سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ ان کے نوجوانوں کو قتل کر دیا جائے۔ بچوں اور عورتوں کو لونڈی غلام بنالیا جائے۔ اور ان کے اموال کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد کے اس فیصلہ کو بالکل درست قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ان کا یہ فیصلہ آسمانوں والے پروردگار کے فیصلہ کے مطابق ہے چنانچہ انہیں قتل کر دیا گیا ان کا جرم صرف یہ نہ تھا کہ وہ جنگی قیدی تھے بلکہ اصل جرائم یہ تھے وہ کئی بار سمجھوتہ کے معاہدہ کی عہد شکنی کر چکے تھے اور جنگ احزاب میں عین جنگ کے درمیان دشمن کی اتحادی فوجوں سے مل کر مسلمانوں کو سخت مشکل حالات سے دوچار کر دیا تھا۔

❁ اسارٰی بدر کے متعلق مشورہ اور فدیہ:۔ اسارٰی بدر کے متعلق آپ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ

مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ④

ان سے[۳] انتقام لے سکتا تھا۔ مگر (یہ حکم اس لئے ہے) تاکہ تمہیں ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔(۴)

مشورہ دیا کہ یہ قیدی چونکہ صنادید کفر ہیں۔ لہٰذا انہیں قتل کر دینا ضروری ہے۔ مگر آپ ﷺ نے اس آیت کے عام قاعدہ اور سیدنا ابو بکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اس پر مسلمانوں پر عتاب نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی منشا سیدنا عمرؓ کے فیصلہ کے مطابق تھی۔ اس لیے کہ بدر کے قیدی محض جنگی قیدی نہ تھے۔ بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن اور مسلمانوں اور پیغمبر اسلام کے خلاف بہت سی معاندانہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ امام وقت کو اس عام قاعدہ کے استثناء کا اس وقت حق حاصل ہوتا ہے جبکہ جنگی قیدی اور بھی کئی جرائم میں ملوث ہوں اور امام وقت کو انہیں نہ احسان رکھ کر چھوڑنا چاہئے نہ فدیہ لے کر بلکہ انہیں قتل کر دینا چاہئے کیونکہ قتال فی سبیل اللہ کا سب سے اہم مقصد کفر کی کمر توڑنا ہے۔

❀ قیدیوں پر احسان کی مختلف صورتیں:۔ پھر احسان رکھ کر چھوڑنے کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ ان سے کسی طرح کی کوئی خدمت نہ لی جائے اور اگر حالات اجازت دیں تو محض اللہ کی رضا اور اسلام کی اخلاقی برتری قائم کرنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ جیسا کہ فتح مکہ کے دن آپ نے عفو عام کا اعلان کر دیا تھا۔ یا جنگ حنین کے بعد جنگی قیدیوں کی تقسیم کے بعد آپ ﷺ نے اہل ہوازن کی ایما پر انہیں آزاد کر دیا تھا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان کی جان بخشی اس صورت میں کی جائے کہ انہیں مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور مسلمانوں کو تلقین کی جائے کہ ان سے بہتر سے بہتر سلوک کیا جائے۔ جیسا کہ جنگ حنین کے بعد پہلے آپ نے ایسے قیدیوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی مواقع پر آپ نے جنگی قیدیوں کو مجاہدین میں تقسیم فرمایا تھا۔ تیسری یہ کہ اگر انہیں قید کرنا ہی پڑے تو ان سے بہتر سلوک کیا جائے اور یہ قید دائمی اور مستقل نہ ہونی چاہئے۔ اور چوتھی یہ کہ ان سے جزیہ لے کر ذمی بنا لیا جائے اور انہیں اسلامی مملکت میں آزادانہ رہنے کا حق دیا جائے۔ جیسا کہ اہل نجران سے معاملہ کیا گیا تھا۔

❀ فدیہ کی مختلف صورتیں:۔ اور فدیہ کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان سے زر فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ جیسا کہ اساری بدر سے لیا گیا تھا اور یہ زر فدیہ ہر شخص سے اس کی حیثیت کے مطابق لیا جائے گا۔ دوسری یہ کہ ان قیدیوں سے پیسہ کی بجائے کوئی اور خدمت لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے جیسا کہ اسی اساری بدر کے موقعہ پر جن لوگوں کے پاس زر فدیہ کی رقم نہیں تھی۔ ان سے یہ خدمت لی گئی کہ ایسا ہر قیدی مسلمانوں کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے اور تیسری یہ کہ جنگی قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کر لیا۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ایک مسلمان کے بدلے ایک کافر چھوڑا جائے بلکہ ایک دفعہ آپ نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک کافر چھوڑا تھا۔ یہ ہیں وہ مختلف صورتیں جو اس آیت کے اس مختصر سے جملہ میں داخل ہیں۔ ان تمام صورتوں میں سے جو صورت بھی حالات کے مطابق اور مسلمانوں اور اسلام کے حق میں بہتر ہو، امام وقت وہی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

[۳] یعنی اللہ تعالیٰ یہ کر سکتا تھا کہ باطل پرستوں اور اسلام دشمنوں پر بجلی کی کڑک یا زلزلہ بھیج کر یا سیلاب کا پانی چھوڑ کر انہیں جادو

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا
اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۝۷ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝۸ ذَٰلِكَ

وہ ان کی رہنمائی کرے گا اور ان کا حال درست کر دے گا۔(۵) اور انہیں اس جنت میں[۷] داخل کرے گا جس کا اس نے انہیں تعارف کرا دیا[۸] ہے۔(۶) اے لوگو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت[۹] قدم رکھے گا۔(۷) اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لئے تباہی[۱۰] ہے اور وہ ان کے اعمال برباد کر دے گا۔(۸)

برباد کر دے۔ جیسا کہ وہ پہلی سرکش اقوام پر ایسے عذاب بھیج چکا ہے اور اس طرح وہ ان سے تمہارا بدلہ لے لے۔ لیکن جب تک معرکہ حق و باطل قائم نہ ہو اور میدانِ کارزار گرم نہ ہو تب تک بندوں کا امتحان نہیں ہو سکتا کہ کون کس درجہ میں اسلام سے مخلص اور جرأت ایمانی رکھتا ہے۔ نیز کافروں میں سے کتنے لوگ ان تنبیہی کارروائیوں سے سبق حاصل کرتے ہیں اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ نے انہیں دے رکھی ہے۔

[۷] یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جاتے ہیں اس کا صرف یہی فائدہ نہیں کہ وہ قومی زندگی کا سبب بنتے ہیں۔ بلکہ خود ان کی ذات کو بھی کئی فائدے پہنچتے ہیں۔ خواہ وہ دنیوی لحاظ سے بظاہر کامیاب نظر نہ آتے ہوں۔ مثلاً یہ کہ اللہ ان کی صحیح راستے کی طرف رہنمائی فرماتا ہے اور ان کی سرگرمیوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ دوسرے یہ کہ ان کے دلوں سے ہر قسم کی کدورت دور کر کے اور ان کی حالت کو درست کر دے گا۔ پھر انہیں جنت میں داخل کرے گا۔

[۸] ❁ عرّف کے مختلف مفہوم:۔ اس جملہ کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایسے باغوں میں داخل ہوں گے جن کا انہیں کتاب و سنت کے ذریعہ تعارف کرایا جا چکا ہے اور اس کی صفات کو سب جنت میں داخل ہونے والے جانتے ہوں گے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر جنتی جنت میں اپنے مکان اور مسکن کو پہچانتا ہو گا۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب بدأ الخلق میں مذکور ہے کہ جنتی اپنے مکانوں اور رہائش گاہوں کو اس سے زیادہ پہچانتے ہوں گے جتنا وہ دنیا میں اپنے گھروں کو پہچانتے ہیں۔ یعنی انہیں اپنی رہائش گاہ پہچاننے میں نہ کوئی الجھن پیش آئے گی اور نہ راستہ بھولیں گے اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عَرَفَ کے معنی پہچاننا اور عرّف کے معنی پہچان کراتا ہے اسی طرح عَرَفَ کے معنی خوشبو لگانا اور عرّف کے معنی معطر کرنا اور خوشبو چھوڑ دینا بھی ہے۔ (مفردات القرآن) اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لیے جنت کو خوشبو سے بسا دیا ہے۔

[۹] اللہ کی مدد کرنے سے مراد اللہ کے دین کی مدد کرنا ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ یقیناً جلد میں ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنے دے گا۔ بندہ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اقامت دین کے لیے کمربستہ رہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔

[۱۰] ❁ تعسا کا لغوی مفہوم:۔ تعسا کے معنی ٹھوکر کھا کر گرنا اور پھر اٹھ نہ سکنا ہے یا کسی گڑھے میں گر کر ہلاک ہو جانا ہے (مفردات) گویا اللہ کے دین کی مدد کرنے والوں کے تو اللہ تعالیٰ پاؤں جما دیتا ہے اس کے برعکس منکروں کو منہ کے بل گرا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور مومنوں کی تو مدد کی جاتی ہے جبکہ کافروں کے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔

بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۹﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴿۱۱﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ

یہ اس لئے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا تھا اسے انہوں نے ناگوار سمجھا تو اللہ نے ان کے اعمال
ضائع کر دیئے۔(۹) کیا وہ زمین میں چل پھر کر دیکھتے نہیں کہ جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں ان
کا کیا انجام ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں تہس نہس کر دیا اور کافروں کے لئے ایسی ہی (سزائیں)
ہوتی[۱۱] ہیں۔(۱۰) یہ اس لئے کہ ایمان لانے والوں کا تو اللہ حامی ہے اور کافروں[۱۲] کا کوئی بھی
حامی نہیں۔(۱۱) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ یقیناً انہیں ایسے باغوں میں داخل کرے
گا جن میں نہریں بہ رہی ہیں اور جو کافر ہیں وہ چند روز فائدہ اٹھا لیں، وہ اس طرح کھاتے ہیں

[۱۱] اس آیت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ پہلی قوموں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تو اللہ نے مختلف قسم کے عذاب بھیج کر انہیں تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اسی طرح کے عذاب بھیج کر ان موجودہ کافروں کو بھی تباہ کر سکتا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس طرح کافروں کو دنیا میں طرح طرح کی سزائیں دی ہیں۔ اسی طرح کئی طرح کی سزائیں آخرت میں بھی دے گا۔

[۱۲] غزوہ احد کے اختتام پر ابوسفیان کی نعرہ بازی اور اس کا جواب:۔ یعنی کافر یہ سمجھتے ضرور ہیں کہ ان کی دیویاں اور دیوتا ان کی مدد کو پہنچتے ہیں حالانکہ یہ محض ان کا وہم ہوتا ہے۔ دور نبوی ﷺ کے حق و باطل کے معرکوں میں صرف غزوہ احد ہی وہ جنگ ہے جس میں ابتداءً مسلمانوں کو ان کی اپنی ہی غلطی سے عارضی طور پر شکست سے دوچار ہونا پڑا اور آخر میں میدان برابر رہا۔ ابوسفیان نے اپنی اتنی سی کامیابی کو بھی غنیمت سمجھ کر اپنے سب سے بڑے دیوتا اور بت ہبل کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا کہ اُعْلُ هُبَل (ہبل سربلند ہوا) تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے کہا اسے یہ جواب دو! اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلّ (سربلند تو صرف اللہ ہے اور وہی بزرگ و برتر ہے) پھر ابوسفیان نے کہا: لنا عزّٰی ولا عزّٰی لکم (ہمارے لیے تو عزت دینے والی دیوی عزّیٰ ہے اور تمہارے لیے کوئی عزّیٰ نہیں) آپ ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا: (اَللّٰہُ مولانا ولا مولی لکم) (ہمارا تو اللہ حامی و ناصر ہے لیکن تمہارا کوئی حامی و ناصر نہیں) آپ ﷺ کا جواب اسی آیت کی تفسیر تھا۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ ابوسفیان جب احد کے میدان کو چھوڑ کر کئی میل مکہ کی طرف جا چکا تو اسے خیال آیا کہ اس جنگ کا فیصلہ تو کچھ بھی نہ ہوا لہٰذا واپس جا کر مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کر کے اسے نتیجہ خیز بنانا چاہئے۔ لیکن اللہ نے مسلمانوں کی نصرت کا یہ سبب پیدا کر دیا کہ مسلمان خود اس سے پہلے ہی ابوسفیان کے لشکر کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ جب ابوسفیان کو یہ صورت حال معلوم ہوئی تو اللہ نے کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور انہوں نے مکہ کی راہ لی۔

الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ
اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا
اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ

جیسے چوپائے[۱۳] کھاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔(۱۲) اور کتنی ہی بستیاں تھیں جو آپ کی اس بستی سے بڑھ کر طاقتور تھیں، جن (کے رہنے والوں) نے آپ کو نکال[۱۴] دیا ہے۔ ہم نے انہیں ہلاک کیا تو ان کا کوئی بھی مددگار نہ ہوا۔(۱۳) بھلا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل[۱۵] پر ہو اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کے بُرے عمل اسے خوشنما بنا کر دکھائے جا رہے ہوں اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہوں(۱۴) جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس میں پانی کی نہریں ہیں جو کبھی باسی نہ ہوگا اور دودھ کی نہریں ہیں

[۱۳] ❁ کافروں کا کھانا پینا حیوانوں کی طرح ہے:۔ اس جملہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح چوپایوں کو یہ تمیز نہیں کہ ان کا کھانا حلال ذرائع سے آیا ہے یا حرام ذرائع سے اسی طرح کافروں کو بھی یہ تمیز گوارا نہیں ہوتی۔ چوپائے جہاں سے بھی ملے کھا لیتے ہیں انہیں اپنے بیگانے کی تمیز نہیں نیز کمزور جانور کو مار دھاڑ کر طاقتور جانور کمزوروں کا کھانا بھی خود کھا جاتے ہیں۔ یہی حال کافروں کا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جانوروں یا چوپایوں کا کھانا کھانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی بھوک دور کریں اور اپنی زندگی کو باقی رکھیں۔ کافروں کا بھی کھانے سے اتنا ہی مقصد ہوتا ہے۔ اس سے آگے وہ یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے ہمیں جو عقل اور تمیز چوپایوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ دی ہے آخر یہ کیوں دی گئی ہے؟

[۱۴] ❁ ہجرت کے وقت آپ کے الوداعی کلمات:۔ بظاہر کافروں نے آپ کو مکہ سے نکالا تھا۔ بلکہ انہوں نے تو سو اونٹ انعام بھی مقرر کیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ کو پکڑ کر لے آئے اسے سو اونٹ انعام دیا جائے گا۔ لیکن چونکہ ان کافروں نے آپ کو ایذائیں اور دکھ پہنچا پہنچا کر وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے نکالنے کے اصل سبب کی طرف نسبت فرمائی۔ جیسا کہ خود بھی رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے نکلنے لگے تو نہایت حسرت سے مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے: "مکہ تو اللہ کے نزدیک بڑی عزت والا اور محبوب ہے اور مجھے بھی بہت محبوب ہے اگر تیرے باشندے مجھے یہاں سے نکل جانے پر مجبور نہ کر دیتے تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا" (ترمذی۔ ابواب المناقب۔ باب فی فضل مکۃ)

[۱۵] واضح دلیل سے مراد وہ صاف ستھرا راستہ ہے جو وحی الٰہی کی روشنی میں پوری طرح نظر آ رہا ہو۔ یعنی ایک شخص تو پورے علم اور یقین کے ساتھ روشنی میں اپنی زندگی کا سفر طے کر رہا ہے۔ دوسرے کے پاس وہم و گمان کی تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں۔ وہ اپنے نفس کی خواہش کا پیروکار ہوتا ہے۔ اور دنیا کا زیادہ سے زیادہ مال کمانا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو بھی وہ جائز اور ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے سب اسے اچھے ہی نظر آتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں آدمیوں کا طرز زندگی ایک جیسا ہو سکتا ہے؟ یا ان دونوں کا انجام ایک ہی جیسا ہونا چاہیے؟

لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ﴿۱۵﴾

جس کا مزہ کبھی نہ بدلے گا اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے لذیذ ہوگی اور کچھ نہریں صاف شدہ شہد کی ہوں گی [۱۶]۔

نیز ان کے لئے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت [۱۷] ہوگی۔ ایسا شخص کیا ان لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہوں اور انہیں پینے کو کھولتا ہوا پانی دیا جائے جو ان کی آنتیں بھی کاٹ [۱۸] کر رکھ دے؟ (۱۵)

[۱۶] جنت کے چار مشروبات کی صفات:۔ اس آیت میں جنت کے حالات بیان کرتے ہوئے پہلے چار مشروبات اور ان کی صفات کا ذکر فرمایا۔ پہلے نمبر پر پانی کی صفت یہ بیان فرمائی کہ غَیْرَ آسِنٍ ہوگا۔ یعنی نہ وہ متعفن ہوگا نہ اس کا رنگ بدلا ہوگا اور نہ ذائقہ۔ دنیا میں پانی کے گھڑے ذخیروں کا عموماً رنگ ذائقہ اور بو تینوں چیزیں بدل جاتی ہیں اور بارش کے پانی میں گرد و غبار مل جاتا ہے۔ اور دریاؤں کا پانی مٹی کی آمیزش سے گدلا ہو جاتا ہے۔ جنت میں پانی کے چشموں سے جو پانی جاری ہوگا وہ نہایت صاف ستھرا، نتھرا ہوا، بے رنگ، بے بو ہوگا۔ اس کا ذائقہ بھی میٹھا ہوگا بدلا ہوا نہ ہوگا۔ دوسرے نمبر پر دودھ کا ذکر فرمایا۔ دنیا میں جو دودھ جانوروں کے تھنوں سے نکلتا ہے۔ اس میں کچھ تو تھنوں کی آلائش کی آمیزش ہو جاتی ہے پھر اگر دودھ کچھ دیر پڑا رہے تو پھٹ جاتا ہے۔ اور اس کا ذائقہ ترش اور بدمزہ ہو جاتا ہے۔ جنت میں دودھ بھی پانی کی طرح چشموں سے رواں ہوگا اور اپنی اصلی حالت میں بدستور قائم رہے گا۔ اس کے ذائقہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ تیسرے نمبر پر شراب کا ذکر فرمایا۔ دنیا کی شراب کا ذائقہ تلخ، بو ناگوار ہوتی ہے۔ حواس کو مختل کر دیتی ہے اور بعض دفعہ سر چکرانے لگتا ہے۔ جنت میں شراب بھی چشموں کی صورت میں رواں ہوگی۔ وہ مذکورہ تمام عیوب سے پاک اور مزیدار ہوگی۔ چوتھے نمبر پر شہد کا ذکر فرمایا۔ جو شہد کی مکھی کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ شہد کے چھتے میں موم اور چھتے کی آمیزش ہوتی ہے اور اوپر جھاگ ہوتا ہے۔ جنت میں شہد بھی چشموں سے نکل کر رواں ہوگا۔ نہایت صاف ستھرا اور ایسے عیوب سے پاک ہوگا۔

[۱۷] مشروبات کے بعد پھر مختصراً ماکولات کا ذکر فرمایا کہ کھانے کے لیے انہیں ہر طرح کے بہترین اور مزیدار پھل مہیا کیے جائیں گے۔ اور اللہ کی سب سے بڑی نعمت یہ ہوگی کہ ان کی دنیا کی زندگی کی تمام کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔ جو کسی کے ذہن میں نہ آسکیں گی۔ اور ایسی کوتاہیوں کو اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔

[۱۸] یعنی ایک طرف تو وہ شخص ہے جو جنت کی متذکرہ بالا نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اور دوسری طرف ایسا شخص ہے جو ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ میں جل رہا ہے۔ کھانے کو اسے خاردار اور زہریلا تھوہر کا درخت ملے گا اور پینے کو سخت گرم کھولتا ہوا پانی۔ کیا ان دونوں کا انجام ایک جیسا ہے؟

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ
اٰنِفًا ۣ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ ۝۱۶ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ
هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝۱۷ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَاۗءَ

اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں (یعنی منافقین) جو آپ کی بات کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر جب تمہارے ہاں سے باہر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے، جنہیں علم دیا گیا ہے، پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی اس (نبی) نے کیا کہا تھا؟ یہی لوگ ہیں، جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی[19] خواہشوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں(۱۶) اور جن لوگوں نے ہدایت پائی ہے اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے[20] اور تقویٰ عطا کرتا ہے۔(۱۷)

کیا اب یہ لوگ بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ یکدم ان پر آپڑے؟ اس کی نشانیاں[21] تو آچکی ہیں

[19] یعنی منافقین آپ کی مجلس میں آتے تو آپ کی باتوں کو اس لیے کان لگا کر سنتے تھے کہ کوئی ایسا نکتہ ہاتھ آجائے جس سے نبی کی اس تعلیم کو مشکوک بنایا جاسکے۔ پھر وہ یہی باتیں جا کر بعض علمائے یہود یا بعض مسلمانوں سے پوچھتے تھے کہ ابھی اس نبی نے کیا بات کہی تھی اور اس سے ان کا مقصد یہ ہرگز نہ ہوتا تھا کہ وہ اس سے ہدایت حاصل کریں بلکہ یہ کہ دوسروں کو بھی شک و شبہ میں ڈال دیں۔ یا خود آپ کے ارشادات کا وہ مفہوم لیتے تھے جو آپ کا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی مرضی کے کاموں پر کسی طرح کی پابندی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ جب کسی کی یہ حالت ہو جائے تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جبکہ اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور کوئی بھی ہدایت کی بات اس کے لیے کارگر ثابت نہیں ہوتی۔

[20] یعنی وہی باتیں اور ارشادات نبوی ﷺ جو ان منافقوں کے لیے ایک معمہ بن جاتے تھے وہی اہل ایمان کے لیے ہدایت میں اضافہ کا ذریعہ ہوتے تھے۔ اور ان میں مزید تقویٰ پیدا ہو جاتا تھا۔

[21] ❁ علاماتِ قیامت:۔ قیامت کی سب سے بڑی نشانی تو آپ ﷺ کی بعثت ہے کیونکہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی قیامت کی نزدیکی پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی اور وسطی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "بعثت انا والساعة کھاتین" (بخاری۔ کتاب الرقاق۔ عنوان باب) اس حدیث کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان تیسری کوئی انگلی یا کوئی چیز نہیں اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور اس مطلب کی طرف لفظ بعثت سے واضح اشارہ ملتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وسطی انگلی جتنی شہادت کی انگلی سے آگے نکلی ہوئی ہے۔ اتنی ہی دنیا کی عمر باقی رہ گئی ہے۔ پھر قیامت آجائے گی۔ علاوہ ازیں قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی چاند کا پھٹنا بھی تھا جو دور نبوی میں واقع ہو چکا۔ نیز آپ نے اپنے بہت سے ارشادات میں قیامت کی نشانیاں بیان فرمائیں جن میں سے چند احادیث درج ذیل ہیں:

سیدنا حذیفہ بن اسید کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آپس میں مذاکرہ کر رہے تھے کہ آپ ﷺ نے ہماری طرف جھانکا اور پوچھا: "کس چیز کا ذکر کر رہے ہو" ہم نے کہا: "قیامت کا" آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ اس سے پہلے

أَشْرَاطُهَا ۚ فَأَنَّىٰ لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرَاهُمْ ﴿١٨﴾ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ
وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ ﴿١٩﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ ع ۲

جب قیامت آ جائے گی تو پھر ان کے لئے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا۔(۱۸) پس آپ جان لیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اپنے لئے نیز مومن مردوں اور عورتوں کے لئے بھی گناہ کی معافی[۲۲] مانگیے۔ اور اللہ تمہارے چلنے پھرنے کے مقامات کو بھی جانتا اور آخری ٹھکانے[۲۳] کو بھی۔(۱۹) اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ (جنگ سے متعلق) کیوں کوئی سورت نازل نہیں ہوتی؟

تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ دخان، دجال، دابۃ الارض، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ بن مریم کا نزول، یاجوج ماجوج اور تین (جگہ) زمین کا دھنس جانا۔ مشرق میں، مغرب میں اور جزیرۃ العرب اور آخری نشانی آگ ہے جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہنکا کر ان کے جمع ہونے کی جگہ پر لے جائے گی" (مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب فی الآیات تکون قبل الساعۃ)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "قیامت کی کچھ نشانیاں یہ ہیں۔ علم گھٹ جائے گا، جہالت پھیل جائے گی، شراب کثرت سے پی جائے گی، زنا عام ہوگا' عورتیں زیادہ ہوں گی اور مرد کم حتیٰ کہ پچاس عورتوں کا کفیل ایک مرد ہوگا" (بخاری۔ کتاب العلم۔ باب رفع العلم وظہور الجہل)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "دین کا علم اٹھ جائے گا۔ جہالت اور فتنے پھیل جائیں گے اور حرج بکثرت ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ "حرج کیا ہے؟" آپ ﷺ نے ہاتھ کو ترچھا ہلا کر بتایا جس سے آپ ﷺ نے قتل مراد لیا۔ (بخاری۔ کتاب العلم۔ باب الفتیا باشارۃ الید والراس)

اور یہ بھی قرآنی تصریحات سے ثابت ہے کہ جب موت کا وقت آ جائے یا ایسی واضح علامت جو قیامت کا پیش خیمہ ہوں جیسے سورج کا مغرب سے طلوع ہونا یا قیامت کے آنے پر کسی شخص کا ایمان لانا اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

[۲۲] کوئی مومن جس درجے کا بھی وہ مومن ہو اسے اللہ کے حضور اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرتے رہنا چاہئے۔ قصور کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی جس قدر عبادت اور اطاعت کا ہم پر حق تھا وہ ہم پوری طرح نبھا نہیں سکے۔ اور ایسا اعتراف تمام انبیاء بھی کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ انبیاءؑ سے گناہ کا اور بالخصوص دیدہ دانستہ گناہ کا سرزد ہونا محالات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسی ارشاد کے مطابق آپ ایک دن میں سو سے زیادہ مرتبہ استغفار فرمایا کرتے تھے۔ اور تمام مسلمان بھی اپنی نمازوں کے دوران اور نمازوں کے بعد یہ تکرار استغفار کرتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو اپنے اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ آپ کی دعا اللہ کی بارگاہ میں دوسروں کی نسبت بہت زیادہ مستجاب ہے۔

[۲۳] یعنی اللہ تعالیٰ تم سے ہر ایک شخص کی، خواہ وہ مومن ہے یا کافر، نقل و حرکت کو اور اس کی سرگرمیوں کو خوب جانتا ہے کہ وہ کس راہ میں صرف ہو رہی ہیں۔ پھر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کس جگہ مر کر دفن ہوگا اور مَثْوٰکُمْ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو مرنے کے بعد جنت یا دوزخ میں جو ٹھکانا ملے گا۔ اللہ اسے بھی خوب جانتا ہے۔

سُورَةٌ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ
إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٠﴾ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ
صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿٢١﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا

پھر جب ایسی محکم سورت نازل کی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا۔ تو آپ نے دیکھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے وہ آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے کسی شخص پر موت کا دورہ پڑ رہا ہو۔ ایسے[۲۴] لوگوں کے لئے ہلاکت ہے۔(۲۰)

(چاہئے تو یہ تھا کہ وہ نبی کی) اطاعت کرتے اور بھلی بات کہتے۔ پھر جب (جہاد کا) معاملہ طے پا گیا تو اگر وہ اللہ سے (کئے ہوئے عہد میں) سچے رہتے تو یہ ان کے لئے[۲۵] بہتر تھا۔(۲۱) پھر (اے منافقو!) تم لوگوں سے کیا بعید ہے کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو زمین[۲۶] پر فساد کرنے لگو اور قطع رحمی کرنے لگو(۲۲)

[۲۴] جہاد کے حکم پر منافقوں کی حالت زار:۔ مکہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا ہو چکی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی حکم تھا کہ سب کچھ صبر کے ساتھ برداشت کرتے جاؤ۔ اور اپنی تمام تر توجہ نمازوں کے قیام، زکوٰۃ کی ادائیگی اور اس کے ذکر کی طرف مبذول کئے رہو۔ اس وقت کئی جرأت مند مسلمان یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش انہیں کافروں سے لڑنے کی اجازت مل جائے۔ اور ہم بھی ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لے سکیں۔ مدینہ میں پہنچنے کے ایک سال بعد مسلمانوں کو جنگ کی اجازت تو مل گئی۔ لیکن ابھی کوئی صریح حکم نازل نہیں ہوا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ جہاد کے متعلق صریح احکام و ہدایات نازل ہوں پھر جب ایسی ہدایات بھی نازل ہو گئیں تو اس وقت بہت سے منافق بھی مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو چکے تھے علاوہ ازیں کچھ ضعیف الاعتقاد اور کمزور مسلمان بھی تھے۔ جب جہاد کے احکام نازل ہوئے تو یک لخت ان پر موت کا خوف طاری ہو گیا۔ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے موت انہیں سامنے کھڑی نظر آ رہی ہے۔ منافقوں کو تو بس ٹھنڈا ٹھنڈا اسلام قبول تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھ لیتے تھے اور روزے بھی رکھ لیتے تھے مگر جب جان کی بازی لگانے کا وقت آیا تو فوراً ہمت ہار بیٹھے۔ اور ہر شخص کو یہ معلوم ہو گیا کہ کون شخص ایمان کے حق میں کس قدر مخلص ہے؟

[۲۵] حالانکہ انہیں چاہئے یہ تھا کہ جب اسلام کا اقرار کر کے مسلمانوں میں شامل ہو چکے تھے تو اجتماعی کاموں میں دل و جان سے ان کا ساتھ دیتے۔ اور اللہ اور اس کے رسول سے اطاعت کا جو انہوں نے پختہ عہد کیا تھا۔ اسے سچ کر دکھاتے، اور اسی میں ان کی بہتری تھی تاکہ وہ دنیا میں بھی مسلمانوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا نہ ہوتے اور اخروی عذاب سے بھی بچ جاتے۔

[۲۶] منافقوں سے کسی بھلائی کی توقع محال ہے:۔ منافقوں کو جہاد صرف اس لیے ناگوار تھا کہ وہ اسلام اور اس کے مفادات کے مقابلہ میں اپنی جان اور مال کو عزیز تر سمجھتے تھے۔ یعنی ان کا اولین مقصد مال کا حصول اور اپنی جان کو بچانا تھا۔ ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر انہیں دنیا میں حکومت مل بھی جائے تو ان سے کسی بھلائی کی توقع نہیں جا سکتی یہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے ملک میں فتنہ و فساد ہی بپا کریں گے۔ اور اس سلسلہ میں اپنے رشتہ داروں کے گلوں پر چھری پھیرنے سے باز نہیں آئیں گے۔

أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا[۲۷] کر دیا۔(۲۳) کیا یہ لوگ قرآن میں غور

اور اگر تَوَلَّيْتُمْ کا معنی پھر جانا اور اعراض کرنا لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم جہاد سے بدک کر اسلام سے پھر جاؤ تو تمہارے متعلق یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ تم پر پھر اسلام سے ماقبل کی حالت عود کر آئے۔ انہی پہلی سی قبائلی جنگوں میں تم پڑ جاؤ جن سے نکلنے کی تمہیں کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی تم وہی پہلی سی لوٹ مار، قتل وغارت اور فتنہ وفساد کرنے لگو گے۔

❁ قطع رحمی ام ولد کی خرید وفروخت کی ممانعت:۔ اس آیت نیز قرآن کی بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع رحمی بہت بڑا گناہ کبیرہ ہے۔ اسی آیت کے حکم کو مدنظر رکھ کر سیدنا عمرؓ نے اپنی مجلس شوریٰ کے مشورہ سے ام الولد کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا تھا۔ چنانچہ سیدنا بریدہ کہتے ہیں کہ وہ ایک دن سیدنا عمرؓ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ محلہ میں یکایک ایک شور مچ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک لونڈی فروخت کی جارہی ہے جبکہ اس لونڈی کی لڑکی کھڑی رو رہی ہے۔ سیدنا عمرؓ نے اسی وقت یہ مسئلہ اپنی شوریٰ میں پیش کر دیا تاکہ دیکھیں پوری شریعت میں ایسی قطع رحمی کا کوئی جواز نظر آتا ہے؟ سب نے نفی میں جواب دیا تو آپؓ نے فرمایا کہ اس سے بڑی قطع رحمی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ماں کو اس کی بیٹی سے جدا کر دیا جائے؟ اس وقت آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اس مسئلہ کی روک تھام کے لیے آپ جو مناسب سمجھیں اختیار فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے سارے بلاد اسلامیہ میں یہ فرمان جاری کر دیا کہ جس لونڈی سے مالک کی اولاد پیدا ہو جائے وہ اسے فروخت نہیں کر سکتا۔

اس روایت کو اگرچہ بعض مفسرین نے درج کیا ہے مگر اس کا حوالہ مذکور نہیں۔ علاوہ ازیں یہ روایت ویسے بھی درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ام الولد کی فروخت کی تحریم سنت نبوی سے ثابت ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے:۔

۱۔ سیدنا ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس شخص نے اپنی لونڈی سے مباشرت کی۔ پھر اس سے اس کا بچہ پیدا ہو گیا تو وہ لونڈی اس کے مرنے کے بعد آزاد ہو گی“ (احمد۔ ابن ماجہ۔ بحوالہ نیل الاوطار ج ۶ ص ۲۳۱)

۲۔ سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ام ابراہیم (ماریہ قبطیہ) کا ذکر کیا۔ تو آپ نے فرمایا: ”اس کا بچہ اس کی آزادی کا سبب بن گیا“ (ابن ماجہ، دار قطنی، بحوالہ ایضاً)

۳۔ سیدنا ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اولاد والی لونڈیوں کو بیچنے سے منع فرمایا اور کہا کہ وہ نہ بیچی جاسکتی ہیں نہ ہبہ کی جاسکتی ہیں اور نہ ترکہ میں شمار ہو سکتی ہیں۔ جب تک ایسی لونڈی کا مالک زندہ ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جب وہ مر جائے تو وہ لونڈی آزاد ہے“ (موطا امام مالک، دار قطنی بحوالہ ایضاً)

ان احادیث میں موطا امام مالک اول درجہ کی کتب میں شمار ہوتی ہے۔ ابن ماجہ درجہ دوم اور دار قطنی درجہ سوم میں۔ تاہم یہ سب احادیث ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہیں اور مرفوع ہیں۔ اور اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈال رہی ہیں یعنی ایسی لونڈی کا مالک خود بھی اپنی زندگی میں اسے نہ فروخت کر سکتا ہے اور نہ ہبہ کر سکتا ہے۔

[۲۷] ❁ جہاد کی برکات:۔ یعنی انہیں سمجھ نہیں آرہی کہ جہاد بھی ان کے لیے سراسر خیر وبرکت ہے۔ جب تک جہاد نہ کیا جائے گا۔ کبھی کفر اسلام کو جینے اور پھلنے پھولنے نہیں دے گا بلکہ اس کی تو یہ کوشش ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ

عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ
سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ

نہیں کرتے یا ان لوگوں کے دلوں پر[۲۸] قفل چڑھے ہوئے ہیں۔(۲۴) جن لوگوں پر ہدایت واضح ہو چکی پھر اس کے بعد وہ الٹے پاؤں پھر گئے، شیطان نے ان کی کرتوتوں کو خوشنما کر کے انہیں دکھایا اور انہیں[۲۹] (تادیر زندہ رہنے کی) آرزو دلائی(۲۵) یہ اس لئے کہ ان (منافقین) نے ان لوگوں (یہود) سے کہا جو اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرتے تھے، کہ ہم تمہاری کچھ باتیں[۳۰] مان لیں گے اور اللہ ان کے راز کی باتوں کو خوب جانتا ہے(۲۶) پھر اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو ان کے چہروں اور پشتوں[۳۱] پر مار رہے ہوں گے(۲۷) یہ اس لئے کہ

پھینک دیا جائے۔ جہاد سے ہی مسلمانوں کی پریشانیوں اور مصائب کا دور ختم ہوگا۔ فتنہ و فساد کا قلع قمع ہوگا۔ اللہ کا دین سر بلند ہوگا۔ توحید پھیلے گی، شرک کا خاتمہ ہوگا اور یہ ملک امن و چین کا گہوارہ بن جائے گا۔

[۲۸] یعنی قرآن کے احکام اور ان احکام کی مصلحتوں میں غور کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے یا اگر غور کریں بھی تو ایسے بدھو اور عقل کے کورے واقع ہوئے ہیں کہ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں آتی کہ جہاد کا حکم انہیں کن کن مصلحتوں کے تحت دیا جا رہا ہے۔

[۲۹] یعنی شیطان نے انہیں یہ پٹی پڑھائی ہے کہ اگر تم نے جہاد میں شمولیت کی تو یہ اپنی موت کو خود دعوت دینے کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں مال کا بھی نقصان ہوگا۔ پھر اگر مسلمانوں کو فتح ہو بھی جائے تو موت کی صورت میں انہیں کیا فائدہ ہوگا؟ لہٰذا مالی نقصان سے بچنے، اپنی جان سلامت رکھنے اور تادیر زندہ رہنے کا نسخہ کیمیا یہی ہے کہ جہاد سے گریز کی راہ اختیار کی جائے۔

[۳۰] ❁ منافقین کا یہود سے درپردہ معاہدہ:۔ شیطان کی انہیں ایسی پٹی پڑھانے کی ایک وجہ یہ بھی بن گئی کہ ان بدبخت منافقوں نے اندر ہی اندر یہود سے ساز باز کر رکھی تھی اور ان منافقوں نے یہود سے ان کے مطالبہ پر کچھ ایسے دعوے بھی کر رکھے تھے کہ وہ انہیں مسلمانوں کی نقل و حرکت اور ان کی جنگی سرگرمیوں سے مطلع کرتے رہیں گے۔ اور اگر جنگ ہوئی تو ہم تم سے لڑیں گے نہیں بلکہ مسلمانوں کو چکمہ ہی دیتے رہیں گے۔ اور جنگ کے دوران منافقوں نے ایسا ہی کردار ادا کیا تھا اور اس کے عوض یہود نے بھی ان سے کچھ وعدے کر رکھے تھے۔ گویا منافق یہودیوں کے لیے تو گھر کا بھیدی اور مسلمانوں کے حق میں مار آستین بنے ہوئے تھے۔ مگر اللہ تو ہر شخص کے دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو ان منافقوں کی کرتوتوں سے وقتاً فوقتاً مطلع کر دیتا تھا تو یہ ذلیل اور ننگے ہو جاتے تھے۔

[۳۱] ❁ موت سے فرار ناممکن ہے اور عذاب قبر کا ثبوت:۔ یعنی آج تو جہاد سے گریز کی راہ اختیار کر کے اپنی جانوں کو بچانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں مگر اس دن اپنے آپ کو کیسے بچا سکیں گے جب فرشتے ان کی جان نکالنے کے لیے آئیں گے اور لوہے کے گرزوں سے انہیں خوب مار رہے ہوں گے۔ یہ آیت بھی منجملہ ان آیات کے ہیں جن سے عذاب قبر یا عذاب برزخ ثابت ہوتا

اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ

وہ ایسی بات کے پیچھے لگ گئے جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی رضا (کی راہ اختیار کرنا) پسند نہ [۳۲] کیا تو اللہ نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیئے۔(۲۸) جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے کیا وہ یہ سمجھے [۳۳] ہوئے ہیں کہ اللہ ان کے کینے ظاہر نہیں کرے گا(۲۹) اور اگر ہم چاہیں تو ایسے لوگ آپ کو دکھا دیں اور آپ انہیں ان کے چہروں سے خوب پہچان لیں گے۔ تاہم آپ انہیں ان کے انداز کلام سے پہچان ہی لیں گے [۳۴]

ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ عذاب قیامت کے دن کے عذاب سے پہلے ہوگا۔ قیامت کے عذاب کی نسبت سے ہلکا ہوگا اور مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جائے گا۔

[۳۲] ❁ حق و باطل کی جنگ میں جس شخص کی ہمدردیاں کافروں سے ہوں وہ مسلمان نہیں رہتا:۔ اللہ کی رضا یہ تھی کہ مسلمانوں کا ساتھ دیتے، یہودیوں کا نہ دیتے۔ لیکن انہوں نے اللہ کی رضا کے بجائے نفاق کی راہ اختیار کی اور یہودیوں کی رضا کو پسند کیا۔ لہٰذا جو نیک اعمال انہوں نے زبانی طور پر اسلام لانے کے بعد کیے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ نمازیں ادا کی ہیں، روزے رکھے ہیں یا اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا ہے۔ اللہ ان کے ایسے سب اعمال ضائع کر دے گا اس سے ایک نہایت اہم بات معلوم ہوئی ہے جو یہ ہے کہ اگر مسلمانوں اور کافروں کی جنگ میں کسی مسلمان کی ہمدردیاں کافروں کے ساتھ ہوں تو وہ مسلمان نہیں رہتا اور اس کے نیک اعمال اگر کچھ ہوں تو وہ بھی اکارت جاتے ہیں۔

[۳۳] یعنی جو کچھ بھی وہ اندر ہی اندر کافروں سے گٹھ جوڑ کر رہے ہیں اور انہیں اپنی ہمدردیاں جتا رہے ہیں اور اسلام کے خلاف اپنی وفاداریاں انہیں پیش کر رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کینہ وہ رکھتے اور زہر اگلتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ایسی سب باتوں سے مسلمانوں کو خبردار کر دے گا۔

[۳۴] ❁ منافقوں کو برسرِ عام ننگا کرنا اللہ کی حکمت کے خلاف ہے:۔ یعنی ایسے منافقوں کو برسرِ عام ننگا کر دینا بھی اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ ورنہ ہم آپ کو سب کچھ بتا دیتے۔ جس سے دوسرے مسلمانوں کو بھی ٹھیک ٹھیک پتا چل جاتا کہ ہم میں فلاں فلاں منافق گھسا ہوا ہے۔

❁ نورِ فراست سے منافق پہچانے جا سکتے ہیں:۔ تاہم آپ کو ہم نے اتنا نورِ فراست ضرور دے دیا ہے کہ آپ ان کے لب و لہجہ اور اندازِ گفتگو سے ہی یہ معلوم کر سکیں گے کہ فلاں شخص منافق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سیدھے سادے اور صاف دل کے مومن کی گفتگو میں ایسی پختگی اور سنجیدگی پائی جاتی ہے جو دل میں کھوٹ رکھنے والے شخص کے اندازِ گفتگو میں پائی ہی نہیں جا سکتی۔ چنانچہ آپ اسی نورِ فراست سے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں تمام منافقوں کو نام بہ نام جانتے تھے۔

❁ سیدنا حذیفہ بن یمان رازدانِ رسول:۔ جب غزوہ تبوک سے واپسی پر منافقوں نے آپ ﷺ کو ایک گھاٹی کی راہ پر ڈال کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی تو اس وقت سیدنا حذیفہ بن یمان ؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اور آپ ﷺ کے کہنے پر ان منافقوں کی سواریوں کے چہروں پر اپنی ڈھال سے پے در پے وار کر رہے تھے۔ بعد میں یہی منافق اہل عقبہ کے نام سے مشہور

الْقَوْلِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَاۗقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْــــًٔا ۭ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا

اور اللہ تم سب کے اعمال خوب جانتا ہے۔(۳۰)

ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے تا آنکہ یہ معلوم[35] کر لیں کہ تم میں سے مجاہد کون ہیں اور صابر کون؟ اور تمہارے احوال کی جانچ پڑتال کریں گے(۳۱) بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے (دوسروں کو) روکتے رہے اور ان پر ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کی۔ وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اور اللہ ایسے لوگوں کے اعمال[36] برباد کر دے گا(۳۲) اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو[37] اور اپنے عملوں کو ضائع نہ کر لو(۳۳) جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے روکا۔

ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان چودہ یا پندرہ منافقوں کے نام اور ان کے باپوں تک کے نام بھی بتا دیئے تھے۔ تاہم آپ ﷺ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ ان ناموں کو دوسروں پر ہرگز ظاہر نہ کرنا۔ اسی لیے سیدنا حذیفہ بن یمان کو راز دان رسول ﷺ بھی کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کا مجملاً ذکر مسلم۔ کتاب صفات المنافقین میں موجود ہے۔

[35] ۞ بد لیعنی اللہ کے حدوث علم کا گمراہ کن عقیدہ:۔ لِنَعْلَمَ کے لفظ سے بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حدوث علم کا شبہ ظاہر کیا۔ یعنی اللہ کو بھی کوئی واقعہ ہو چکنے کے بعد علم ہوتا ہے پہلے نہیں ہوتا۔ حالانکہ بے شمار آیات اللہ تعالیٰ کے ازلی اور کلی علم کی صراحت پیش کرتی ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے الفاظ صرف اس وقت استعمال فرماتے ہیں کہ جبکہ اس علم کا تعلق اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے دیکھنے سے ہو۔ یعنی جہاد کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ کفر کا سر توڑ کر مسلمانوں کی مدد کر سکتا تھا۔ لیکن اس طرح کسی کے صبر و استقلال اور ایمان کی آزمائش نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نہ ہی مختلف لوگوں کی مختلف طرح کی سرگرمیوں کا پتا لگ سکتا تھا۔

[36] یعنی مسلمانوں سے غداری کر کے نہ وہ اللہ کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ اللہ کے رسول اور مسلمانوں کا۔ بلکہ وہ سراسر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں وہ اس طرح کہ اللہ ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیتا ہے علاوہ ازیں ان کے کچھ اچھے اعمال بھی برباد ہو جاتے ہیں۔

[37] ۞ اعمال کو برباد کرنے والے کام:۔ یعنی تم جو کام بھی کرو وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبہ سے اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہونے چاہئے۔ مثلاً جہاد سے اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کے کلمہ کی سربلندی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اور جذبہ کے تحت مثلاً شہرت اور ناموری کی غرض سے یا قبائلی عصبیت کی وجہ سے یا مال غنیمت کے حصول کی بنا پر جہاد کرے گا تو اس کا ایسا نیک عمل بھی مقبول نہ ہو گا۔ پھر اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنے نیک عمل کی حفاظت کرے اور کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھے جس سے اس کے عمل کے برباد ہونے کا خطرہ ہو۔ مثلاً ارتداد، شرک، اپنے کئے ہوئے کام پر فخر کرنا یا صدقہ کی صورت

وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿٣٤﴾ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَ

پھر اسی کفر کی حالت میں مر گئے اللہ انہیں کبھی معاف نہیں [۳۸] کرے گا۔(۳۴)

پس تم سستی نہ دکھاؤ اور نہ (دشمن سے) صلح کی درخواست [۳۹] کرو۔ تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال [۴۰] سے کچھ بھی کمی نہ کرے گا(۳۵)

میں احسان جتلانا ایسے کام ہیں جو نیک اعمال کو برباد کر دیتے ہیں۔

[۳۸] یعنی ان کا جرم صرف یہی نہیں کہ انہوں نے خود اسلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ ان کے اصل جرائم تو ان کے وہ اعمال ہیں جو وہ اسلام کی راہ روکنے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے اور انہیں ایذائیں اور دکھ پہنچانے کے لیے سرانجام دیتے رہے۔ کفر و شرک جس پر وہ تادم مرگ اڑے رہے بذات خود ایسا جرم ہے جس کی معافی نہیں ہو سکتی۔ اور ان کے جرائم کی فہرست تو بڑی طویل ہے پھر ان کی معافی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ بعض علماء کی رائے کے مطابق اس سے مراد وہ کافر ہیں جو بدر کے میدان میں قتل ہوئے اور بدر کے کنوئیں میں پھینکے گئے۔ تاہم اس آیت کے عموم کو صرف انہیں کافروں سے مختص نہیں کیا جا سکتا۔ ہر دور میں ایسی صفات رکھنے والے کافر موجود رہے ہیں اور آئندہ بھی موجود رہیں گے۔ وہ سب اس عموم میں داخل ہیں۔

[۳۹] ﴿دشمن سے صلح یا سمجھوتہ کی درخواست نہ کی جائے:﴾ یعنی جب تم دشمن سے بھڑ جاؤ تو پھر سستی کا ہرگز مظاہرہ نہ کرو بلکہ سر دھڑ کی بازی لگا دو۔ اور نہ ہی کافروں سے صلح اور سمجھوتہ کی درخواست کرو جس سے تمہاری کمزوری ان پر عیاں ہو جائے اور وہ تمہیں مزید دباتے چلے جائیں گے۔ واضح رہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں۔ جب مدینہ کی ریاست نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ ایک سو کے لگ بھگ مہاجر اور کچھ انصار تھے اور ان کے جنگی جوانوں کی تعداد ایک ہزار تک بھی بمشکل پہنچی تھی۔ سامان جنگ کی فراوانی تو درکنار ان کی معاشی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ دوسری طرف صرف قریش مکہ ہی نہیں سارا عرب ہی مسلمانوں کی مخالفت پر اتر آیا تھا اور اس ریاست کو اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ ان حالات میں یہ ہدایت دی گئی کہ میدان جنگ میں نہ اپنی کمزوری دکھاؤ اور نہ ہی اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہوئے دشمن سے صلح کی درخواست کرو۔ ہاں اگر دشمن سے اپنی طاقت کا لوہا منوا لو تو وہ خود مسلمانوں سے صلح کی درخواست کریں تو اس صورت میں آپ ان کی صلح کی درخواست کو قبول فرما لیجئے۔ جیسا کہ سورہ انفال کی آیت نمبر ۶۱ میں اس کی صراحت موجود ہے۔

[۴۰] ﴿غلبہ سے مراد سیاسی غلبہ ہی نہیں بلکہ دلیل و حجت کا غلبہ بھی ہے:﴾ اگر تم سستی نہ دکھاؤ گے اور پامردی اور استقلال سے جہاد کرو گے تو یقیناً تم ہی غالب رہو گے کیونکہ اس صورت میں اللہ تمہاری مدد پر موجود ہے۔ تم نے جہاد کے سلسلہ میں جو خرچ کیا ہو گا یا جو محنت و مشقت اٹھائی ہو گی اللہ اس کا تمہیں پورا پورا اجر عطا کر دے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ تم ہی غالب رہو گے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہر جنگ میں اور ہر حال میں غالب ہی رہو گے۔ جیسا کہ مسلمانوں کو جنگ احد میں اور جنگ حنین میں ان کی اپنی ہی غلطی کی وجہ سے عارضی طور پر شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بالآخر تم ہی غالب رہو گے۔ چنانچہ اللہ نے مسلمانوں سے اپنا یہ وعدہ پورا کر دیا اور آپ ﷺ کی زندگی میں ہی سارے عرب میں کفر و شرک کا زور ختم ہو گیا اور مسلمان اور اسلام ہی غالب آئے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ غلبہ سے مراد ضروری نہیں کہ سیاسی غلبہ ہی لیا جائے۔ علمی غلبہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ یعنی دلیل و حجت کے لحاظ سے کفر کے تمام مذاہب پر غالب رہو گے اور مسلمان اللہ کے فضل سے آج

لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا
يَسْـَٔــلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْـَٔــلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تُدْعَوْنَ
لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ
وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ ع ۴

یہ دنیا کی زندگی تو بس ایک کھیل [۴۱] اور تماشا ہے۔ اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہیں تمہارے اجر دے گا اور تم سے تمہارے اموال کا مطالبہ نہیں کرے گا (۳۶) اگر وہ تم سے مال کا مطالبہ کرے پھر تم سے اس مطالبہ [۴۲] پر اصرار کرے تو تم بخل کرنے لگو اور وہ تمہارے دلوں کے کھوٹ ظاہر کر دے۔ (۳۷)

سنو! تم وہ لوگ ہو جنہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے [۴۳]، پھر تم میں سے کوئی بخل کرنے لگتا ہے حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ تو بے نیاز ہے اور تم ہی اس کے محتاج ہو اور اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تمہاری جگہ (دوسرے لوگ) لے آئے گا جو تم جیسے نہ ہوں گے۔ (۳۸)

تک دلیل و حجت کے میدان میں کسی دوسرے مذہب والے سے مغلوب نہیں ہوئے۔ تاہم پہلا مطلب ہی ربط مضمون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

[۴۱] دنیادار کے لئے دنیوی زندگی کھیل تماشا ہے:۔ یعنی یہ دنیا بس ولفریبیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں انسان زیادہ سے زیادہ مال و دولت اکٹھی کرنے کی ہوس رکھتا ہے اور مرتے دم ہی سب کچھ یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ لہٰذا تمہیں آخرت کی کمائی کی فکر کرنی چاہئے جو دائمی اور پائیدار ہے۔ اور اس کے مقصد کے حصول کے لئے وہ تم سے تمہارے سارے اموال کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ تو خود غنی ہے اور ساری مخلوق پر خرچ کرتا ہے اسے تمہارے اموال کی کیا پروا یا ضرورت ہے۔ اگر کچھ تھوڑا سا مال تمہیں جہاد کی خاطر خرچ کرنے کو کہتا ہے تو اس میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو تھوڑے ہی دن اپنی گرہ سے پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے کئی ملک فتح کرا دیئے۔ اور جتنا مسلمانوں نے خرچ کیا تھا اس سے سو سو گناہ زیادہ اموال غنیمت کی صورت میں ہاتھ لگ گیا۔ اموال غنیمت نے مسلمانوں کی معاشی تنگدستی کو آسودگی میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ فتح خیبر کے بعد مہاجرین نے انصار کو کھجوروں کے وہ درخت واپس کر دیئے جو انہوں نے مدینہ آنے پر شراکت کے طور پر انصار سے لئے تھے۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں کی معاشی آسودگی بڑھتی ہی گئی۔

[۴۲] یُحْفِکُمْ: حفا کا لغوی معنی کسی چیز کی طلب میں مبالغہ اور اصرار ہے پھر اسی مبالغہ اور اصرار سے بعض دفعہ تنگ کرنے کے معنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تم سے سارے ہی مال کا مطالبہ کر لیتا کیونکہ یہ مال اسی کا دیا ہوا تھا تو کتنے لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جو فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے اس حکم پر لبیک کہیں گے۔ اکثر ایسے ہی لوگ ہوں گے جو بخل اور تنگ دلی کا ثبوت دیں گے اور مال خرچ کرتے وقت ان کے دل کی کبیدگی اور گھٹن از خود ظاہر ہو جائے گی۔

[۴۳] دوسروں سے مراد اہل فارس ہیں:۔ اللہ اگر تمہیں جہاد میں یا دوسرے نیکی کے کاموں پر خرچ کرنے کو کہتا ہے تو اس

میں تمہارا فائدہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی وہ تمہیں اس کا نعم البدل عطا فرمائے گا اور آخرت میں تو ایک ایک کا ہزار ہزار ملے گا اور اگر تم بخل کرو گے اور جہاد کی ضرورتوں پر خرچ نہ کرو گے تو اس کا سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ اور کافروں کے سامنے تمہیں ذلیل و رسوا ہونا پڑے گا۔ اللہ کے نافرمان الگ بنو گے۔ اللہ کو اپنے لئے تمہارے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تو بے نیاز ہے اور محتاج تم ہی ہو۔ اور اگر تم جان و مال کے خرچ کرنے میں بخل کرنے سے کام لو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسرے لوگ لے آئے گا جو جان اور مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں بخیل نہ ہوں گے۔ اللہ کو تو بہر حال اپنے دین کو سر بلند کرنا ہے وہ اگر تمہارے ہاتھوں ہو جائے تو اسے اپنے لئے غنیمت سمجھو۔ اور دوسرے لوگوں سے مراد اہل فارس ہیں چنانچہ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے تین بار یہی سوال کیا۔ اس وقت ہم لوگوں میں سلمان فارسی بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ ان پر رکھ کر فرمایا: اگر ایمان ثریا پر ہو تا تب بھی ان لوگوں میں سے کئی وہاں تک پہنچ جاتے" (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورہ جمعہ)

❁ اہل فارس کی شاندار دینی خدمات:۔ الحمد للہ صحابہ کرامؓ نے جہاد کے سلسلہ میں ایسی بے نظیر قربانیاں پیش کیں کہ ان کی جگہ کسی دوسری قوم کو لانے کی نوبت نہ آئی۔ تاہم اہل فارس نے اسلام میں داخل ہو کر علم و ایمان کا وہ شاندار مظاہرہ کیا اور ایسی لاجواب دینی خدمات سرانجام دیں جنہیں دیکھ کر ہر شخص یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کے عین مطابق یہی لوگ تھے۔ جو بوقت ضرورت عرب کی جگہ پر کر سکتے تھے۔ نامور محدثین اور ائمہ فقہا کی اکثریت اسی علاقہ سے تعلق رکھتی ہے۔

۲۹ آیاتھا سُوْرَۃُ الفَتْحِ مَدَنِیَّۃٌ ۴۸ رکوعھا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ

کلمات ۵۶۸ آیات ۲۹ (۴۸) سورۃ الفتح مدنی ہے (۱۱۱) رکوع ۴ حروف ۲۵۵۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

(اے نبی!) ہم نے آپ کو واضح فتح[1] عطا کر دی۔ (۱) تاکہ اللہ آپ کی سب اگلی اور پچھلی لغزشیں معاف کر دے[2] اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دے

[1] آپ کو بیت اللہ کے طواف کا خواب میں آنا: جنگ احزاب کے بعد قریش کی مسلمانوں پر بالادستی کا تصور ختم ہو چکا تھا تاہم ابھی تک بیت اللہ پر قریش کا ہی قبضہ تھا۔ مسلمان جب سے ہجرت کر کے مدینہ گئے تھے ان میں سے کسی نے حج، عمرہ یا طواف کعبہ نہیں کیا تھا جس کے لئے ان کے دل ترستے رہتے تھے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ کو خواب آیا کہ آپ بہت سے مسلمانوں کی معیت میں بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ نبی کا خواب چونکہ وحی ہوتا ہے۔

۱۴۰۰ اصحابہ کے ساتھ مکہ کو روانگی:۔ لہٰذا آپ ﷺ نے عمرہ کا اعلان فرمادیا۔ چونکہ اس سفر سے جنگی مقاصد یا غنائم کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لہٰذا آپ کی معیت صرف ان صحابہ کرام نے ہی اختیار کی جو محض رضائے الٰہی کے لئے عمرہ کی نیت رکھتے تھے۔ جو صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ جانے پر تیار ہوئے ان کی تعداد چودہ سو کے لگ بھگ تھی۔

کافروں کا روکنا اور آمادہ جنگ ہونا: اہل مکہ کو پہلے ہی آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی اور ان کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ کیونکہ اس میں وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ دستور کے مطابق اہل مکہ کسی بھی طواف اور عمرہ کرنے والے کو نہیں روک سکتے تھے۔ پھر یہ مہینہ بھی ذیقعد کا تھا جن میں اہل عرب کے دستور کے مطابق لڑائی منع تھی۔ ان دونوں باتوں کے باوجود قریش مکہ مسلمانوں کا مکہ میں داخلہ روکنے کے لئے لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ خالد بن ولید ایک فوجی دستہ لے کر مقابلہ کے لئے نکل آئے۔

حدیبیہ کے مقام پر فروکشی:۔ آپ ﷺ کو جب یہ صورت حال معلوم ہوئی تو آپ سیدھی راہ میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے مکہ کے زیریں علاقہ حدیبیہ میں فروکش ہو گئے۔ آپ ﷺ نے اہل مکہ کو بہتیرا سمجھایا کہ ہم لڑنے کی غرض سے نہیں آئے فقط عمرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور قربانی کے جانور بھی دکھائے لیکن انہیں مسلمانوں کا مکہ میں داخل ہونا بھی گوارا نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو واپس چلے جانے پر ہی اصرار کیا۔

سیدنا عثمان کی شہادت کی افواہ اور بیعت رضوان:۔ اسی دوران فریقین کی طرف سے کئی سفارتیں بھی آئیں اور گئیں۔ مسلمانوں کی طرف سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر بھیجا گیا تو انہیں وہیں روک لیا گیا۔ اور افواہ یہ مشہور ہو گئی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔ چنانچہ قصاص عثمان کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے ایک کیکر کے درخت کے نیچے سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

سے خون پر بیعت لی۔ جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے۔

❁ سیدنا عثمان کی بیعت:۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اہل مکہ کے لئے سیدنا عثمانؓ سے کوئی زیادہ کوئی قابل احترام ہوتا تو آپ سفارت کے لئے اسے بھیجتے یہ بیعت سیدنا عثمانؓ کی غیر موجودگی میں ہوئی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے یوں کیا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اس کو بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا کہ یہ عثمان کی بیعت ہے۔ (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب عثمان بن عفان ـــ) بعد میں معلوم ہوا کہ سیدنا عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی۔

❁ سفارتوں کے تبادلے اور صلح حدیبیہ:۔ دو تین دفعہ سفارتوں کے تبادلہ کے بعد بالآخر صلح کی شرائط پر سمجھوتہ ہو گیا۔ یہ شرائط بظاہر مسلمانوں کے لئے توہین آمیز تھیں اور بیعت رضوان کے بعد بالخصوص ایسی شرائط پر رضامند بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان شرائط کو منظور فرمالیا اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح مبین قرار دیا۔ صلح کی شرائط یہ تھیں۔

۱۔ آئندہ دس سال تک مسلمان اور قریش ایک دوسرے پر چڑھائی نہ کریں گے اور صلح و آشتی سے رہیں گے۔

۲۔ قبائل کو عام اجازت ہے کہ وہ جس فریق کے حلیف بننا چاہیں بن سکتے ہیں۔

۳۔ اگر مکہ سے کوئی مسلمان اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہنچ جائے تو مسلمان اسے واپس کر دیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ آجائے تو وہ واپس نہ کیا جائے گا۔

۴۔ مسلمان اس دفعہ عمرہ کئے بغیر واپس چلے جائیں۔ آئندہ سال وہ تلواریں نیام میں کئے ہوئے آئیں۔ تین دن تک ان کے لئے شہر خالی کر دیا جائے گا اور انہیں مکہ میں رہنے اور عمرہ کرنے کی اجازت ہوگی۔

❁ شرائط قبول کرنے کی وجوہ:۔ مسلمانوں کو جب یہ سورۃ سنائی گئی تو وہ خود حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ ایسی توہین آمیز صلح فتح مبین کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ بحث بڑی تفصیل طلب ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ ہم یہاں ایسی وجوہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن کی بنا پر آپ نے ایسی شرائط کو مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر بلکہ ان کی مرضی کے علی الرغم منظور فرمالیا تھا۔ البتہ یہ بات ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ سب وحی الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق ہوا تھا۔ وہ وجوہ یہ ہیں:

۱۔ جب سے آپ مدینہ گئے تھے آپ کے دشمنوں میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا تھا اور مسلسل چھ سال سے ہنگامی حالات میں زندگی گزار رہے تھے۔ ان دشمنوں میں سب سے بڑے دشمن یہی قریش تھے۔ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ ان کی طرف سے اطمینان نصیب ہو تاکہ دوسرے دشمنوں سے بطریق احسن نمٹا جاسکے۔ چنانچہ آپ نے یہاں سے واپسی پر سب سے پہلے بنو نضیر کی سرکوبی کی اور خیبر فتح ہوا۔

۲۔ انہی ہنگامی حالات کی وجہ سے آپ ﷺ کے بہت سے تبلیغی پروگرام مؤخر ہوتے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس صلح کے بعد آپ نے آس پاس کے بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط ارسال فرمائے۔

۳۔ اس صلح نے تمام عرب پر یہ بات ثابت کر دی کہ مسلمان فی الحقیقت امن پسند قوم ہے جو جنگ سے حتی الامکان گریز کرتی

ہے اور مقابلہ کی قدرت رکھنے کے باوجود صلح و آشتی کو ترجیح دیتی ہے۔ اسی تاثر کے نتیجہ میں اس صلح کے بعد بعض بڑے بڑے سردار از خود اسلام لے آئے مثلاً خالد بن ولید سیف اللہ اور عمرو بن عاص فاتح مصر وغیرہم۔

۴۔ جنگ کی صورت میں مکہ میں موجود مسلمانوں کی تباہی یقینی تھی۔ قرآن کریم نے یہ ایک ایسی وجہ بیان فرمائی جس کا مسلمانوں کو خیال تک نہ آیا تھا۔

❁ جانوروں کی قربانی:۔ اس معاہدہ صلح کی تحریر کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی اپنی قربانیاں ذبح کرنے کا حکم دیا۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس توہین آمیز صلح کا کچھ ایسا غم لاحق ہو گیا تھا کہ آپ ﷺ کے اس حکم پر کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ (شاید وہ اسی انتظار میں ہوں کہ ابھی اللہ کی طرف سے کوئی اور حکم آ جائے گا) اس سفر میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے ہمراہ تھیں۔ آپ ﷺ نے ان سے جب یہ صورت حال بیان کی تو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ آپ اپنی قربانی ذبح کر دیں پھر صحابہ اپنی قربانیاں خود بخود ذبح کر دیں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی قربانی ذبح کی۔ بال منڈائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی اتباع میں قربانیاں کیں۔ بال منڈائے اور احرام کھول کر واپس مدینہ آ گئے۔ (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجہاد و المصالحۃ)

❁ عمرہ قضا:۔ پھر اگلے سال انہیں مسلمانوں نے عمرہ قضا ادا کیا۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب عمرۃ القضاء)

اب ہم یہاں چند احادیث درج کرتے ہیں جن سے اس سورہ کا شان نزول اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اضطراب کا منظر سامنے آتا ہے:

۱۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا﴾ سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۲۔ ❁ شرائط صلح پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بے قراری:۔ زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ ایک سفر (حدیبیہ) میں تھے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ رات کا وقت تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کچھ پوچھا تو آپ ﷺ نے جواب نہ دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا تو بھی آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر (تیسری بار) پوچھا تب بھی آپ ﷺ نے جواب نہ دیا۔ آخر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے تئیں کہنے لگے: "تیری ماں تجھ پر روئے تو نے تین بار عاجزی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا لیکن آپ ﷺ نے ایک بار بھی جواب نہ دیا" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ پھر میں نے اپنے اونٹ کو ایڑ لگائی اور لوگوں سے آگے نکل گیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ اب میرے بارے میں قرآن نازل ہوگا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میں نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو مجھے ہی بلا رہا تھا۔ میں ڈر گیا کہ شاید میرے بارے میں قرآن اترا ہے۔ پھر میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "آج رات مجھ پر ایک سورت اتری ہے جو مجھے ان تمام چیزوں سے زیادہ پسند ہے جن تک سورج کی روشنی پہنچتی ہے" پھر آپ ﷺ نے یہ سورت پڑھی۔ (حوالہ ایضاً)

۳۔ سیدنا سہل بن حنیف کہتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود تھے۔ جب آپ نے مشرکین مکہ سے صلح کی۔ اگر ہم لڑنا مناسب سمجھتے تو لڑ سکتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے اور آپ ﷺ سے کہا: کیا ہم حق پر اور یہ (مشرک) باطل پر نہیں؟ کیا ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے مقتول دوزخ میں نہ ہوں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "کیوں نہیں" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: تو پھر ہم اپنے دین کو کیوں ذلیل کریں؟ اور ایسے ہی مدینہ کو چلے جائیں۔ جب تک کہ اللہ ہمارے

اور ان کے درمیان فیصلہ نہ کر دے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: خطاب کے بیٹے! رسول میں ہوں (تم نہیں) اللہ مجھے کبھی ضائع نہ کرے گا" چنانچہ سیدنا عمرؓ غصے کی حالت میں لوٹ گئے۔ مگر قرار نہ آیا تو سیدنا ابو بکرؓ کے پاس آ کر کہنے لگے۔ "کیا ہم حق پر اور یہ مشرک باطل پر نہیں؟" سیدنا ابو بکرؓ نے فرمایا: خطاب کے بیٹے! اللہ کے رسول ﷺ وہ ہیں (تم نہیں) اور اللہ انہیں کبھی ضائع نہیں کرے گا" اس وقت سورۃ فتح نازل ہوئی۔ (حوالہ ایضاً)

۴۔ سیدنا عبداللہ بن مغفلؓ کہتے ہیں کہ جس دن مکہ فتح ہوا اس وقت آپ ﷺ یہ سورت دہرا دہرا کر خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ (حوالہ ایضاً)

❁ **صلح حدیبیہ کی توہین آمیز شرائط سے خیر کے پہلو کیسے پیدا ہوئے اور ابو جندل کی حالت زار اور فریاد:** صلح حدیبیہ کی انہی توہین آمیز شرائط سے اللہ تعالیٰ نے خیر کے بہت سے پہلو پیدا کر دیئے۔ مکہ میں رکھے جانے والے مسلمانوں نے جب مکہ میں تبلیغ شروع کر دی اور بعض لوگ اسلام بھی لے آئے تو یہی بات قریش مکہ کے لئے سوہان روح بن گئی، اور مسلمانوں کے ہاں مدینہ سے واپس کئے جانے والے مسلمانوں نے تجارتی شاہراہ پر اپنی الگ بستی بسا کر قریش کے تجارتی قافلوں کا ناک میں دم کر دیا۔ ان میں ایک ابو جندلؓ تھے۔ قریش مکہ کے تیسرے اور آخری سفیر سہیل بن عمرو کے بیٹے تھے اور مسلمان ہو چکے تھے جب شرائط صلح طے پا رہی تھیں لیکن تاہنوز ضبط تحریر میں نہ آئی تھیں اس وقت یہ اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر حدیبیہ میں مسلمانوں کے پاس پہنچ گئے اور انہیں اپنے زخم دکھا دکھا کر التجا کی کہ اب انہیں کفار کے حوالہ نہ کیا جائے۔ مسلمان ابو جندلؓ کو پناہ دینے کے حق میں تھے کیونکہ شرائط تاحال ضبط تحریر میں نہ آئی تھیں مگر ابو جندل کا باپ سہیل اس بات پر اڑ گیا کہ اگر ابو جندل کو واپس نہ کیا گیا تو صلح نہیں ہو سکتی آخر رسول اللہ ﷺ نے ابو جندلؓ کو صبر کی تلقین فرمائی اور اسے واپس کر دیا۔ اسی طرح سیدنا ابو بصیر اسلام لا کر مدینہ پہنچے تو کفار نے دو آدمی مدینہ بھیج دیئے کہ وہ انہیں واپس مکہ لائیں۔ آپ ﷺ نے ابو بصیر کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ ابو بصیرؓ نے راہ میں موقع پا کر ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا فرار ہو کر مدینہ آگیا اور رسول اللہ ﷺ کو یہ ماجرا سنایا اتنے میں پیچھے پیچھے ابو بصیر بھی مدینہ آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ نے مجھے ان کے ہمراہ بھیج کر اپنا ذمہ پورا کر دیا۔ اب تو اللہ نے مجھے ان سے نجات دی" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنگ کی آگ نہ بھڑکاؤ" سیدنا ابو بصیر کو جب معلوم ہوا کہ آپ انہیں مدینہ نہیں رہنے دیں گے تو وہاں سے چل کر سمندر کے کنارے پر آ کر مقیم ہو گئے۔ بعد ازاں ابو جندل بھی یہاں پہنچ گئے اور دوسرے نو مسلم بھی مدینہ کے بجائے ادھر کا رخ کرنے لگے۔ ان لوگوں نے قریش کو اس قدر تنگ کیا کہ انہوں نے مجبور ہو کر اس شرط کو کالعدم کر دیا اور اجازت دے دی کہ جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ کفار نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ابو بصیر کو ان کاموں سے منع کریں اور جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ابو بصیر کو لوٹ مار کرنے سے منع فرما دیا۔ (کتاب الشروط نیز کتاب المغازی وغیرہ)

[۲] ذَنْبٌ ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کا انجام برا ہو (مفردات القرآن) اور بمعنی ہر وہ کام جس کے نتیجہ میں مذمت ہو (فقہ اللغۃ) اور اس لفظ کا اطلاق اس قدر عام ہے کہ چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے لے کر بڑے بڑے گناہوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑا گناہ قتل ناحق ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ سیدنا موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے فرماتے ہیں:

يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝ هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ

اور آپ کو سیدھی راہ پر چلائے (۲) اور آپ کو زبردست [۳] نصرت عطا کرے (۳) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں اطمینان ڈال [۴] دیا تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ مزید اطمینان کا اضافہ کر لیں اور آسمانوں اور زمین کے سب لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (۴)

﴿وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنبٌ فَأَخَافُ أَن يَقْتُلُونِ﴾ (۲۶: ۱۴) اور میرے اوپر ان کا ایک گناہ (خون ناحق) ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے مار ہی نہ ڈالیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ﴾ (۹: ۴۳) اللہ آپ کو معاف فرمائے آپ نے ان منافقوں کو کیوں (جہاد سے رخصت کی) اجازت دی؟۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ معافی کسی گناہ یا غلطی کے کام پر ہی ہوتی ہے۔ اور اس آیت میں ذنب سے مراد تدبیری امور میں بعض اجتہادی غلطیاں ہیں جو بشریت کا خاصہ ہیں۔ اور اگلے پچھلے گناہ معاف کر دینے کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ آپ دیدہ دانستہ کوئی گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس آیت کی آپ کو جو خوشی ہوئی اور اس کا آپ نے جو تاثر قبول کیا وہ مندرجہ ذیل احادیث میں ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب آپ ﷺ حدیبیہ سے واپس مدینہ جا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر ایک آیت ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ﴾ ایسی اتری ہے جو مجھے زمین کی ساری دولت سے پیاری ہے۔ صحابہ کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ مبارک ہو، مبارک ہو! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے تو وضاحت فرما دی مگر ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ .... فَوْزًا عَظِيمًا﴾ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

۲۔ ❁ صلح حدیبیہ کے بعد آپ کی عبادت میں اضافہ:۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب صحابہ کو کوئی حکم دیتے تو ایسے کاموں کا دیتے جنہیں وہ (بآسانی) کر سکتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرتے، ہم آپ جیسے نہیں۔ آپ ﷺ کے تو اللہ نے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اس بات پر آپ ﷺ غصہ میں آ جاتے اور غصہ کے آثار آپ ﷺ کے چہرہ پر نمودار ہو جاتے اور فرماتے: (سن لو) تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اسے جاننے والا میں ہوں" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب قول النبی انا اعلمکم باللّٰہ)

۳۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ: آپ ﷺ رات کو (تہجد کی نماز میں) اتنا زیادہ قیام فرماتے کہ آپ کے پاؤں ترخ جاتے (اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں سوج جاتے) سیدہ عائشہ نے پوچھا: "یا رسول اللہ ﷺ! آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ آپ ﷺ کے تو اللہ تعالیٰ نے سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں؟" آپ ﷺ نے جواب دیا: "کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟" پھر جب آپ ﷺ کا جسم (آخر عمر میں) فربہ ہو گیا تو آپ ﷺ یہ نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے۔ جب رکوع کا وقت آتا تو کھڑے ہو کر کچھ قرأت فرماتے۔ پھر رکوع کرتے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۳] ❁ صلح حدیبیہ میں اللہ کے چار احسانات:۔ اس فتح مبین کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو چار چیزیں عطا فرمائیں۔ (۱) سابقہ

اور آئندہ لغزشوں کی معافی، (۲) اتمام نعمت، اتمام نعمت سے مراد یہ ہے کہ آئندہ اب مسلمانوں پر ہنگامی فضا مسلط نہ رہ سکے گی اور وہ اپنی جگہ ہر طرح کے خوف اور بیرونی مداخلت سے محفوظ و مامون رہ کر پوری طرح اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی قوانین و احکام کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکیں گے اور اعلائے کلمۃ اللہ کا فریضہ بجالا سکیں گے، (۳) اس مقام پر آپ کو سیدھا راستہ دکھانے کا مطلب آپ کو فتح و کامرانی کی راہ دکھانا ہے۔ یعنی اس فتح مبین کے نتیجہ میں اللہ نے آپ ﷺ کے لئے وہ راہ ہموار کر دی جس سے تمام اسلام دشمن طاقتیں مغلوب ہوتی جائیں اور (۴) ﴿نَصْرًا عَزِيزًا﴾ سے مراد ایسی مدد ہے جو بظاہر دشمن کو اپنی فتح نظر آ رہی ہے مگر حقیقت میں وہی اس کی جڑ کاٹ دینے والی اور مغلوب کرنے والی ہے۔

❁ حدیبیہ میں پانی کی قلت اور آپ کے معجزات:۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کچھ اور بھی احسان فرمائے۔ اسلامی لشکر یہاں بیس دن سے بھی زیادہ قیام پذیر رہا۔ اس دوران پانی کی شدید قلت واقع ہو گئی۔ چنانچہ سیدنا جابرؓ فرماتے ہیں کہ لوگ سخت پیاسے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک چھاگل تھی۔ آپ ﷺ نے اس میں سے وضو کیا۔ لوگ آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے انہیں پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ ہمارے پاس نہ وضو کے لئے پانی ہے اور نہ پینے کے لئے۔ بس یہی پانی ہے جو آپ ﷺ کی چھاگل میں ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس چھاگل میں رکھ دیا۔ آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی چشموں کی طرح بہنے لگا۔ چنانچہ ہم سب لوگوں نے پانی پیا اور وضو بھی کیا سالم (راوی) نے جابر سے پوچھا: اس دن تم کتنے آدمی تھے؟ جابر نے کہا کہ اگر لاکھ بھی ہوتے تو بھی وہ پانی ہمیں کفایت کر جاتا ہم تو صرف پندرہ سو آدمی تھے۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ الحدیبیۃ)

دوسرا واقعہ سیدنا براءؓ بن عازب بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ چودہ سو یا زیادہ آدمی تھے۔ ایک کنوئیں پر اترے اور اس کا سارا پانی کھینچ ڈالا۔ پھر آپ ﷺ کے پاس آکر عرض کیا کہ پانی نہیں رہا۔ اب کیا کریں۔ آپ ﷺ کنوئیں پر تشریف لا کر اس کی منڈیر پر بیٹھے اور فرمایا اس کے پانی کا ایک ڈول لاؤ۔ آپ ﷺ نے اپنا لب اس میں ڈال دیا اور اللہ سے دعا کی۔ پھر فرمایا: ساعت بھر اس سے پانی نہ نکالنا۔ اس کے بعد اس کنوئیں کے پانی سے آدمیوں نے اپنے آپ کو اور سب جانوروں کو سیراب کر لیا۔ پھر وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ الحدیبیۃ)

❁ بارش کو سیاروں سے منسوب کرنے والا کافر ہے:۔ اس کے بعد اللہ کی رحمت سے بارش ہو گئی اور مسلمانوں نے پانی ذخیرہ بھی کر لیا۔ چنانچہ زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی اور رات کو بارش ہو چکی تھی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم جانتے ہو کہ تمہارا پروردگار اللہ عزوجل کیا فرماتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج صبح میرے کچھ بندے مومن ہوئے اور کچھ کافر۔ جس نے یہ کہا کہ یہ بارش اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوئی۔ وہ میرا مومن ہے اور ستاروں کا منکر اور جس نے کہا کہ یہ بارش فلاں ستارے کے فلاں نچھتر میں داخل ہونے سے ہوئی اس نے میرے ساتھ کفر کیا اور ستاروں کا مومن ہے۔ (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب یستقبل الامام الناس اذا سلم)

[۴] ❁ صلح حدیبیہ میں مسلمانوں کے جذبات کی دو انتہائیں:۔ حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں میں دو متضاد کیفیتیں پیدا ہوئیں اور دونوں ہی اپنی انتہا کو پہنچیں اور دونوں ہی اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نتیجہ تھیں۔ پہلے خون پر

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٤﴾ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٥﴾ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ

تاکہ مومن مردوں[۵] اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان سے ان کی برائیاں دور کر دے۔ اور یہ اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے۔(۵) اور منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں[۶] کو

بیعت لی گئی جس سے مسلمانوں میں جنگ کے لئے اس قدر اشتعال پیدا ہو گیا کہ وہ کافروں کے مقابلہ میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمان دراصل صلح کے حق میں ہی نہ تھے چہ جائیکہ نہایت توہین آمیز شرائط پر صلح کے لئے آمادہ ہوں۔ ان باتوں پر سیدنا ابو جندل رضی اللہ عنہ کا واقعہ مزید اشتعال دلانے والا تھا جس سے سب مسلمانوں کے دل بھر آئے تھے اور اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اسی وقت کافروں کی تکا بوٹی کر دیں۔ اور اس وقت انہیں یہ قدرت بھی حاصل تھی۔ مگر جب انہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھنڈا کیا۔ تو یکدم ان کے جذبات ٹھنڈے ہو گئے۔ ہر مسلمان جب دوسرے سے یہ پوچھتا کہ آج ایسی توہین آمیز شرائط پر صلح کیوں کی جا رہی ہے تو ہر ایک یہی جواب دے دیتا اللہ ورسولہ اعلم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت کفار کے حق میں سب سے زیادہ جوشیلی تھی۔ انہوں نے کچھ اضطراب کا مظاہرہ ضرور کیا جیسا کہ مذکور دو احادیث سے واضح ہے۔ مگر وہ بھی نافرمانی کی حد کو نہ پہنچا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا عمر بھر افسوس بھی رہا۔ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سکون نازل کیا گیا وہ اللہ کی طرف سے تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ حالات کچھ اور رخ اختیار کر جاتے۔ اگر کافروں کو کچلنا ہی مقصود ہوتا تو اللہ کے پاس مدد کے اور بھی کئی طریقے اور اسباب موجود تھے۔ البتہ ان دونوں انتہاؤں میں مسلمانوں کی آزمائش ہو گئی کہ وہ کس حد تک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔ پھر جب وہ اس آزمائش میں پورے اترے تو یہی بات ان کے ایمان میں مزید اضافہ کا سبب بن گئی اور اللہ نے اپنے رسول پر بھی احسان فرمایا اور مسلمانوں پر بھی۔

[۵] ❁ جذبات میں سکون اللہ کی طرف سے:۔ اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں آیت نمبر ۲ کے تحت درج شدہ حدیث ملاحظہ فرمالیجئے۔ یعنی حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں نے جو کمال صبر اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چون وچرا اطاعت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا مسلمانوں کو بھی بہت اجر ملے گا۔ ان مسلمان عورتوں کو بھی جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں اس غزوہ میں حصہ لیا تھا۔ کیونکہ مجاہدین کو بہ طیب خاطر روانہ کرنے، بعد میں گھر کے انتظام والصرام کی ذمہ داری میں عورتوں کا جتنا حصہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بالخصوص ان حالات میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک کثیر تعداد کو ساتھ لے جا رہے ہوں اور مدینہ کے ارد گرد دشمن ہی دشمن موجود ہوں۔

[۶] ❁ منافقوں کا گمان کہ اب مسلمان کبھی واپس نہ آسکیں گے:۔ غزوہ حدیبیہ میں کوئی منافق شریک نہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اس غزوہ میں اموال غنیمت کا کوئی قصہ نہ تھا۔ اور مسلمان محض رضائے الٰہی کے لئے عمرہ کرنے جا رہے تھے تو کافروں نے مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور حالات کشیدہ ہوتے گئے تو یہ خبریں مدینہ میں پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ منافقوں نے

وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

عذاب دے جو اللہ کے بارے میں بُرا گمان رکھتے ہیں۔ بری گردش انہی پر پڑ گئی اور ان پر اللہ کا غضب ہوا، اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لئے جہنم تیار کی۔ جو بہت برا ٹھکانا ہے۔(۶)

آسمانوں اور زمین کے تمام لشکر[۷] اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہر چیز پر غالب اور حکمت والا ہے۔(۷)

خوب بغلیں بجانا شروع کر دیں کہ پہلے تو قریش مکہ یہاں اپنے وطن سے بہت دور آ کر لڑائی کرتے تھے لیکن اب مسلمان خود ان کے گھر پہنچ گئے ہیں۔ اب یہ وہاں سے بچ کر کبھی نہ آ سکیں گے۔ اس صلح سے اور مسلمانوں کے بخیر و عافیت واپس مدینہ پہنچ جانے سے منافقوں کی دل کی جلن میں مزید اضافہ ہو گیا اور ان کے در پردہ کئی منصوبوں پر پانی پھر گیا یہی ان کے لئے کافی سزا تھی۔ دوسری طرف مشرکین مکہ اس بات پر بغلیں بجا رہے تھے کہ وہ مسلمانوں سے اپنی من مانی شرائط ان تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ بعد میں یہی شرائط ان کی جڑ کاٹ دینے والی ثابت ہوئیں۔ سب سے توہین آمیز شرط یہ تھی کہ اگر مکہ سے کوئی مسلمان اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کر دیں گے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ آ جائے تو قریش مکہ اسے مسلمانوں کو واپس نہیں کریں گے۔ اس شرط کا جو نتیجہ نکلا اس کا حال ہم ابتدا میں لکھ چکے ہیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ قبائل عرب میں سے جو کوئی فریقین میں سے کسی کا حلیف بننا چاہے بن سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے اور بنو بکر قریش مکہ کے۔ بنو خزاعہ اور بنو بکر میں جھگڑا ہو گیا تو قریش مکہ نے صلح نامہ حدیبیہ کے علی الرغم بدعہدی کر کے اپنے حلیف بنو بکر کی مدد کی اور بنو خزاعہ پر زیادتی کی۔ چنانچہ مشرکین مکہ کی یہی بدعہدی فتح مکہ، ان پر وبال اور ان کے زوال کا سبب بن گئی۔ تیسری شرط یہ تھی کہ فریقین دس سال تک جنگ نہیں کریں گے۔ اس شرط کا حشر یہ ہوا کہ جب بنو خزاعہ نے جا کر مدینہ میں آپ ﷺ سے فریاد کی اور قریش مکہ کی زیادتی اور بدعہدی کا ذکر کیا تو اس معاہدہ کو برقرار رکھنے کے لئے خود ابو سفیان کو مدینہ جا کر منتیں کرنا پڑیں۔ پھر بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ اور چوتھی شرط یہ تھی کہ مسلمان اگلے سال آ کر عمرہ کریں گے اور تین دن کے لئے مشرکین مکہ اس شہر کو خالی کر دیں گے۔ اس شرط پر ٹھیک طور پر عمل درآمد ہوا۔ اور یہ مسلمانوں کی انتہائی دیانتداری اور شرافت تھی کہ وہ اپنے عہد کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمرہ کر کے تین دن کے بعد واپس چلے گئے۔ مسلمانوں کے بجائے کوئی اور ہوتا تو جس طرح شہر خالی پڑا تھا فوراً اس پر قبضہ کر لیتا۔ اور یہ خطرہ مشرکین مکہ کو بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور مشرکوں کی آرزوؤں اور تدبیروں کو نہ صرف ناکام بنایا بلکہ ان کی تدبیریں انہی پر الٹ پڑیں۔ بعد میں انہیں جو عذاب دنیا میں دیکھنے پڑے یا آخرت میں ان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ مستزاد ہیں۔

[۷] یہ لشکر فرشتے ہوں یا ہوائیں ہوں غرضیکہ جتنے بھی باطنی اسباب ہیں۔ سب اللہ کے قبضہ میں ہیں وہ ان سے یہ کام بھی لے سکتا ہے کہ میدان جنگ میں ان سے مسلمانوں کی مدد کرے اور کافروں کو پٹوا دے اور یہ کام بھی لے سکتا ہے کہ بدکردار لوگوں کے مکر و فریب کی چالوں کو انہی پر الٹ دے اور حالات ہی ایسے پیدا کر دے کہ وہ خود ہی اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس

عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ
وَتُوَقِّرُوْهُ ۝ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ

(اے نبی!) ہم نے آپ کو شہادت دینے والا، بشارت[۸] دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔(۸) تاکہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو[۹] اور اس کی تعظیم کرو اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو۔(۹) بلاشبہ جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کی بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں[۱۰] پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

جائیں۔ اور یہ سب کچھ اس کی اپنی حکمت اور صوابدید پر منحصر ہے۔

[۸] اس آیت کی تشریح کے لئے سورہ احزاب کی آیت نمبر ۴۵ کے حواشی ملاحظہ فرمالیجئے۔

[۹] اس آیت میں ﴿تُسَبِّحُوْهُ﴾ میں "ہ" کی ضمیر کا مرجع تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے۔ رہیں ﴿تُعَزِّرُوْهُ﴾ اور ﴿تُوَقِّرُوْهُ﴾ میں "ہ" کی ضمیریں تو ان کا مرجع بھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہونا چاہئے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ وہ بالکل ساتھ ساتھ ہیں اور پہلی دو ضمیروں کا مرجع رسول اللہ ﷺ کی طرف ہونے کے لئے کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کو شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ کے دین کی بھرپور مدد کرو۔ اور اللہ کے احکام اور اس کی حرمت والی چیزوں کا پورا ادب اور تعظیم کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح و تحمید بیان کرو۔ تاہم بعض علماء نے ﴿تُعَزِّرُوْهُ﴾ اور ﴿وَتُوَقِّرُوْهُ﴾ میں ضمائر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کی ذات کو قرار دیا ہے اس صورت میں بھی کوئی اشکال نہیں کیونکہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں آپ کی غیر مشروط اطاعت' ہر حال میں مدد اور آپ کا ادب و احترام کا حکم صراحت سے مذکور ہے۔

[۱۰] ❁ بیعت رضوان خون پر بیعت تھی:۔ یہ بیعت اس شرط پر لی جا رہی تھی کہ اگر شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر درست ہو تو مسلمان ان کا قصاص لینے کے لئے جانیں لڑا دیں گے اور جب تک یہ مقصد پورا نہ ہو جائے ان میں کوئی زندہ واپس نہ جائے گا۔ اس کی بیعت کی صورت یہ تھی کہ بیعت کرنے والا نیچے ہاتھ رکھتا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ اس کے ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھ کر عہد لیتے تھے۔

❁ سیدنا عثمان کی بیعت کی صورت:۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر چونکہ یقینی نہ تھی بس افواہ ہی تھی اور ان کے زندہ سلامت ہونے کا امکان موجود تھا۔ لہٰذا آپ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی خود ہی بیعت کی۔ اپنا ہی ایک ہاتھ نیچے رکھا اور دوسرا اوپر رکھ کر بیعت مکمل کی۔ گویا آپ ﷺ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر وہ زندہ ہیں تو یقیناً ایسی بیعت سے کبھی پیچھے نہیں رہ سکتے۔

❁ یہ بیعت دراصل اللہ ہی سے عہد تھا:۔ نیز اللہ تعالیٰ نے بیعت کرنے والوں سے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہارے ہاتھ کے اوپر دوسرا رسول ﷺ کی شخصیت کا ہاتھ ہے جس سے تم عہد کر رہے ہو۔ بلکہ یہ اللہ کے نائب رسول کا ہاتھ ہے۔ جو اس وقت اپنی ذات کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے تم سے بیعت لے رہا ہے۔

اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا
عَظِيْمًا ۝ سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ

ع ۹/۱

اب جو شخص اس عہد کو توڑے تو اسے توڑنے کا وبال اسی پر ہوگا اور جو شخص اس عہد کو پورا کرے جو اس نے اللہ سے کیا تھا تو عنقریب اللہ اسے بڑا اجر عطا کرے گا۔(۱۰) دیہاتیوں میں سے [۱۱] جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ اب آکر آپ سے کہیں گے کہ ہمیں ہمارے اموال اور گھر والوں کی فکر نے مشغول رکھا تھا؛ لہٰذا ہمارے لئے [۱۲] بخشش کی دعا فرمائیے۔

❁ بیعت کی مختلف صورتیں:۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی بار بیعت لی ہے۔ سب سے پہلی بیعت بیعت عقبہ تھی جس میں اہل مدینہ نے یہ اقرار کیا تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ ان کے ہاں تشریف لائیں تو وہ ہر تنگی ترشی میں ان کی مدد کریں گے اور ان کی جان کی حفاظت کریں گے۔ یہاں جہاد یا خون پر بیعت کا ذکر ہے اور بعض مقامات پر بھلائی کے کاموں کے کرنے اور برے کاموں سے اجتناب کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے اور ایسی بیعت آپ مردوں سے بھی لیتے تھے اور عورتوں سے بھی۔

❁ امیر کی سمع واطاعت کی بیعت لازم ہے خواہ یہ بالواسطہ ہو:۔ یہاں ایک عام سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بیعت ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے ضروری صرف وہ بیعت ہے جو امیر المومنین سے سمع وطاعت کے اصول پر کی جاتی ہے اور یہ بالواسطہ بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس سے مقصود صرف مسلمانوں کی جمعیت اور سیاسی قوت کو مضبوط بنانا اور مشترکہ طور پر اللہ کے دین کو سر بلند کرنا اور رکھنا ہوتا ہے۔

❁ پیروں فقیروں کی بیعت ؟:۔ رہی وہ بیعت جو پیر و مشائخ نے لازمی بنا رکھی ہے۔ تو یہ ہرگز واجب نہیں البتہ مشروع ضرور ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ پیر یا شیخ خود پوری طرح شریعت کا پابند ہو۔ اور اگر پیر صاحب خود ہی شریعت کے پابند نہ ہوں تو ان کی بیعت جائز نہ ہوگی بلکہ عذاب کا باعث بن جائے گی۔

[۱۱] ❁ منافق کن وجوہ کی بنا پر صلح حدیبیہ کے سفر میں ساتھ نہیں گئے تھے:۔ جب آپ ﷺ نے عمرہ کا ارادہ کیا تو مدینہ اور آس پاس کی بستیوں میں اس کا باقاعدہ اعلان کرایا گیا تھا کہ جو شخص عمرہ کرنے کے لئے آپ کے ہمراہ جانا چاہتا ہو وہ مدینہ پہنچ جائے۔ مگر آس پاس کی بستیوں کے کچھ قبائل مثلاً غفار، مزنیہ، جہینہ، اسلم اور اشجع کے لوگوں نے آپ کے ہمراہ جانے سے گریز کیا یہ لوگ دراصل منافق تھے اور اپنے خیال میں کسی بھلے وقت کے منتظر رہنے والوں میں سے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ قریش مکہ تو مکہ سے یہاں آکر مسلمانوں کے بہت سے افراد کو میدان احد میں قتل کر گئے تھے اب یہ مختصر سی جمعیت جو خود اپنے جانی دشمنوں کے گھر پہنچ رہی ہے وہ لوگ بھلا انہیں زندہ واپس آنے دیں گے۔ اسی خیال سے انہوں نے اس غزوہ سے عدم شمولیت میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔

[۱۲] جب آپ حدیبیہ سے واپس مدینہ تشریف لا رہے تھے تو اس وقت یہ سورہ نازل ہوئی اور اللہ نے آپ کو منافقوں کے خبث باطن اور آئندہ کردار سے بھی مطلع کر دیا کہ یہ لوگ طرح طرح کے بہانے اور عذر پیش کریں گے کہ ہم فلاں مجبوری کی وجہ سے آپ کے ساتھ نہ جا سکے۔ لہٰذا آپ اللہ سے ہمارے لئے دعا فرمائیے کہ وہ ہمارا یہ قصور معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۱ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ښ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝۱۲ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝۱۳ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

وہ اپنی زبانوں سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی۔ آپ ان سے کہئے: کون ہے جو تمہارے حق میں اللہ کے سامنے کچھ بھی اختیار رکھتا ہو اگر وہ نقصان پہنچانا[۱۳] چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ بلکہ جو تم (کہہ اور) کر رہے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔(۱۱) بلکہ تم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ رسول اور مومن کبھی اپنے گھروں کو واپس نہ آ سکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں[۱۴] کو بہت اچھا لگا اور تم بہت بُرا گمان سوچ رہے تھے۔ اور تم ہو ہی ہلاک ہو جانے والے لوگ(۱۲) اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے تو ایسے کافروں کے لئے[۱۵] ہم نے بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔(۱۳) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے

کہ ان کا آپ کو استغفار کے لئے کہنا بھی ایک فریب ہے اور وہ آپ کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ انہیں آپ کے ساتھ نہ جانے کا واقعی بہت افسوس ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ اپنی اس حرکت کو اپنا قصور سمجھتے ہیں، نہ انہیں کچھ افسوس ہے اور نہ ہی وہ اپنے لئے دعائے استغفار کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کا زبانی جمع خرچ ہے جس سے وہ آپ کو مطمئن رکھنا چاہتے ہیں۔

[۱۳] یعنی اے منافقو! تم نے اس غزوہ سے عدم شمولیت میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے گھروں میں موت سے دوچار کر دے یا اور کوئی مصیبت تم پر ڈال دے تو اس سے تمہیں کوئی بچا سکتا ہے یا تم خود اسے روک سکتے تھے؟ یا مثلاً تم اس سفر پر رسول ﷺ کے ساتھ چلے جاتے اور اللہ تمہارے اہل و عیال کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہے یا اس سفر میں بھی فائدہ پہنچا دے تو کیا اسے کوئی روک سکتا ہے؟

[۱۴] منافقوں کا گمان کہ مسلمان بچ کر نہ لوٹ سکیں گے:۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ نہ تمہارا اللہ پر اعتماد ہے اور نہ اس کے وعدوں پر۔ تمہارا بس یہ گمان تھا کہ یہ مٹھی بھر لوگ بچ کر واپس نہ آ سکیں گے۔ اور تمہارا یہ گمان ہی نہ تھا تمہاری آرزو بھی یہی تھی۔ تمہیں اس بات پر مطلق شرم نہ آئی کہ تم اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کے معاملہ میں کس قدر بدباطنی سے ایسی سوچ سوچ رہے تھے۔ پھر دوسرا جرم یہ کر رہے ہو کہ طرح طرح کے جھوٹے بہانے بنا کر اور اللہ کے رسول سے استغفار کی التجا کر کے اپنی بدباطنی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ خبث باطن اور جھوٹ آخر تمہیں تباہ کر کے رہے گا۔

[۱۵] اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بدظنی رکھے یا مسلمان ہونے کے باوجود اس کی ہمدردیاں اسلام دشمن گروہ کے ساتھ ہوں وہ ایماندار نہیں رہتا بلکہ غیر مومن ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اسی آیت کا اگلا حصہ یہ وضاحت کر رہا ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے اور اسے آخرت میں کافروں جیسا ہی عذاب ہوگا۔ اگرچہ اس دنیا میں

الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۱۴﴾ سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ
إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ
لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا

جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے اور وہ[۱۶] معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے(۱۴) جب تم غنیمتیں حاصل کرنے کے لئے جانے لگو گے تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے فوراً کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ[۱۷] چلنے دو۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کو بدل[۱۸] دیں۔ آپ ان سے کہئے: تم ہرگز ہمارے ساتھ[۱۹] نہ جاؤ گے (کیونکہ) اللہ پہلے ہی ایسی بات فرما چکا ہے۔ پھر وہ کہیں گے (یہ بات نہیں) "بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو"

ایمانداروں میں ہی ملا جلا رہے۔

[۱۶] یعنی وہ جسے چاہے فائدہ پہنچا سکتا ہے خواہ حالات اس کے برعکس نظر آ رہے ہوں۔ اسی طرح وہ جسے چاہے ذلیل و رسوا کر سکتا ہے اس لئے یہ کائنات ساری کی ساری اس کی مملوک ہے اور ظاہری اور باطنی اسباب اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ جن میں وہ ہر طرح سے تصرف کر سکتا ہے۔ ہاں اگر تم اپنی کرتوتوں اور بدباطنی سے باز آ جاؤ تو وہ تمہیں معاف بھی کر دے گا۔ کیونکہ حقیقتاً وہ اپنے بندوں پر مہربانی کا سلوک کرنے سے ہی خوش ہوتا ہے۔

[۱۷] ❁ منافقوں کی غزوہ خیبر میں شمولیت کی خواہش کیوں تھی؟ فتح خیبر کا واقعہ غزوہ حدیبیہ کے تین ماہ بعد محرم ۷ھ بعد میں پیش آیا۔ جلاوطن شدہ یہود یہیں اکٹھے ہو کر مسلمانوں کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ بنو نضیر بھی مدینہ سے جلاوطن ہو کر یہیں مقیم ہو گئے تھے۔ انہی کے سردار حیی بن اخطب نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کو ورغلا کر جنگ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف عہد شکنی پر مجبور کر دیا تھا۔ اور وہ اتحادی کافروں سے مل گئے تھے۔ حدیبیہ کی صلح کے بعد ان لوگوں کی سرکوبی ضروری تھی۔ یہ سفر نسبتاً آسان بھی تھا اور یہاں سے اموالِ غنیمت کی بھی بہت توقع تھی۔ غزوہ حدیبیہ میں پیچھے رہ جانے والے منافقوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے تین ماہ پہلے ہی بتا دیا کہ جب تم اس سفر پر جانے لگو گے تو پھر یہ لوگ تمہارے ساتھ جانے کے لئے فوراً تیار ہو جائیں گے کیونکہ وہاں جان و مال کے ضیاع کا خطرہ کم اور بہت زیادہ اموال غنیمت مل جانے کی توقع ہو گی۔

[۱۸] اللہ کا حکم یا فیصلہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں مخلص ہیں۔ اللہ انہیں فتح و نصرت سے ہمکنار کرے اور مالی فائدے بھی پہنچائے۔ مگر یہ منافق یہ چاہتے ہیں کہ جان و مال کے ضیاع کا خطرہ ہو تو یہ بہانے بنا کر اپنی جانیں اور مال بچا لیں اور مخلص مسلمان ہی ایسے مشکل اوقات میں آگے بڑھیں اور جب جان و مال کا کوئی خوف نہ ہو اور مال ملنے کی امید ہو تو یہ بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ ان کی اس آرزو سے اللہ کے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

[۱۹] ❁ غزوہ خیبر میں صرف ان مسلمانوں کو ساتھ لیا گیا جو بیعت رضوان میں شامل تھے:۔ لہٰذا جب خیبر پر چڑھائی کا وقت آئے اور یہ مسلمانوں کے ہمراہ جانے کی آرزو کریں تو آپ ﷺ انہیں دو ٹوک لفظوں میں بتا دیجئے کہ ہم تمہیں اپنے ہمراہ نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ اللہ ہمیں اس بات سے منع کر چکا ہے۔ چنانچہ عملاً بھی کچھ ہوا "آپ صرف انہی صحابہ کرام کو غزوہ خیبر میں اپنے

لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ

(یہ بات بھی نہیں) مگر یہ لوگ[۲۰] حقیقت کو کم ہی سمجھتے ہیں(۱۵) آپ پیچھے رہ جانے والے بدویوں سے کہئے کہ: عنقریب تمہیں ایک سخت جنگجو قوم سے (مقابلہ کے لئے) بلایا جائے گا۔ تمہیں ان سے لڑنا ہوگا[۲۱] یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم حکم مانو گے تو اللہ تمہیں اچھا اجر عطا کرے گا اور اگر تم نے منہ پھیر لیا جیسے پہلے پھیر لیا تھا

ساتھ لے گئے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر آپ کے ہاتھ پر خون پر بیعت کی تھی۔

[۲۰] منافقوں کا جواب بھی ناانصافی پر مبنی ہے: یعنی جب تم بہانہ ساز منافقوں سے یہ کہو گے کہ تم غزوہ خیبر کے مجاہدین میں شامل نہیں ہو سکتے تو وہ فوراً تم لوگوں پر مزید یہ الزام لگا دیں گے۔ تم یہ چاہتے ہی نہیں کہ ہمیں بھی اموالِ غنیمت سے کچھ حصہ مل جائے اور تم ہمارا حسد کرتے ہو کہ کہیں ہم لوگ بھی آسودہ حال نہ بن جائیں۔ یعنی اس وقت تک بھی ان کا خیال اپنے قصور کی طرف نہیں جائے گا کہ جب ہم کوئی جانی و مالی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تو ہمیں آسانی سے ہاتھ آنے والے مال غنیمت میں کیسے حصہ دار بنایا جا سکتا ہے۔ اس وقت بھی مسلمانوں کو ہی موردِ الزام ٹھہرائیں گے۔ یہ ان کے خبث باطن کی ایک اور دلیل ہے۔

[۲۱] جنگجو قوم کونسی تھی؟ ثقیف، ہوازن اور بنو حنیفہ۔ ﴿يُسْلِمُوْنَ﴾ کے دو مطلب ہیں ایک وہ جو ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ جنگ کرنے کے بغیر ہی آپ کی اطاعت قبول کر لیں گے اور جزیہ ادا کریں گے نیز اسلام کی راہ میں مزاحمت کرنا چھوڑ دیں گے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ گویا حسد کا طعنہ دینے والے منافقوں کو سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ جب تک تم اپنے اموال اور اپنی جانوں کی قربانی سے یہ ثابت نہ کر دو کہ تم اسلام اور مسلمانوں کے حق میں مخلص ہو تو اموالِ غنیمت میں حصہ دار کیسے بن سکتے ہو؟ اب اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ آئندہ بھی کئی مواقع پر جنگجو قوموں سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ اس وقت تمہیں جہاد میں باقاعدہ شمولیت کی دعوت دی جائے گی اور تمہارے ایمان کی آزمائش کی جائے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے جنگ کرنا پڑتی ہے یا وہ لڑے بھڑے بغیر ہی مطیع فرمان بن جاتے ہیں۔ بہر حال تمہارے روانہ ہونے سے ہی تمہارا امتحان ہو جائے گا۔ پھر اگر تو تم اپنے دعوے میں سچے اور اپنے ایمان میں مخلص ہوئے تو تم ایسی جنگجو قوم سے لڑنے اور سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیار ہو جاؤ گے تو تمہیں اموال غنیمت میں سے بھی حصہ ملے گا اور اللہ سے بھی بڑا اچھا بدلہ ملے گا۔ لیکن اگر تم نے پھر وہی کام کیا جو غزوہ حدیبیہ کے موقع پر کیا تھا اور حیلے بہانے تراشنے لگے تو پھر تمہاری اور بھی زیادہ ذلت اور رسوائی ہوگی اور آخرت میں بھی دردناک سزا ملے گی۔ واضح رہے کہ اس آیت میں جنگجو قوم سے مراد جنگ حنین میں حصہ لینے والے قبیلے ثقیف اور ہوازن بھی ہو سکتے ہیں اور مسیلمہ کذاب کی جنگ یمامہ میں حصہ لینے والے بنو حنیفہ بھی۔ علاوہ ازیں خلافت ابو بکرؓ و عمرؓ کے دور میں بھی کئی معرکے پیش آتے رہے۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں کی مرضی کے علی الرغم رسول اللہ ﷺ نے بظاہر توہین آمیز شرائط پر صلح کیلئے اصرار فرمایا تھا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تھے ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا تھا کہ جنگ کا خطرہ سر پر سوار نہ ہو اور

جب بھی جنگ کا موقعہ آتا تو قریش، یہود، منافقین اور مشرک قبائل سب مسلمانوں کے خلاف اتحاد قائم کر لیتے تھے۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ کم از کم قریش مکہ سے صلح کر کے دوسرے دشمنوں کی سرکوبی کی جائے۔ جنگ احزاب میں بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب بھی قتل کر دیا گیا۔ جو خیبر کے یہود کا سردار تھا تو یہودی اور بھی تیخ پا ہو گئے تھے اور مدینہ پر پرزور حملہ کر کے ان کا استیصال کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ اور یہ خبریں دم بدم مدینہ بھی پہنچ رہی تھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے خود ان پر لشکر کشی کا ارادہ کر لیا۔ اس لشکر کا بیشتر حصہ وہی مسلمان تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ یا بیعت رضوان میں حصہ لیا تھا۔

❁ خیبر پر حملہ کا آغاز:۔ خیبر میں یہودیوں کے جو مشہور قلعے تھے جن میں بیس ہزار آزمودہ کار سپاہی موجود تھے۔ اسلامی لشکر رات کے وقت خیبر کے پہلے قلعہ ناعم پر پہنچ گیا۔ اس وقت قلعہ والے اسلامی لشکر کی یورش سے بالکل بے خبر محو خواب تھے۔ شب خون مار کر قلعہ کو فتح کرنے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ لیکن آپ ﷺ شب خون مارنے کے خلاف تھے۔ اور مسلمانوں کو بھی شب خون مارنے کی ممانعت کر دی تھی۔ لہٰذا آپ نے لشکر کو صبح ہونے تک توقف کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آپ جب کسی قوم پر جہاد کرتے تو ان پر صبح تک حملہ نہ کرتے۔ صبح اگر ان لوگوں میں اذان کی آواز سنتے تو حملہ نہ کرتے اور اگر آذان کی آواز نہ آتی تب حملہ کرتے تھے۔ جب صبح ہوئی تو یہودی پھاوڑے ٹوکریاں لے کر نکلے۔ کیونکہ وہ زراعت پیشہ تھے۔ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو چیخ اٹھے اور کہنے لگے: اللہ کی قسم! یہ تو محمد ﷺ ہیں جو لشکر سمیت آن پہنچے۔ آپ ﷺ نے انہیں دیکھ کر نعرہ لگایا۔ اللہ اکبر خربت خیبر (اللہ اکبر! خیبر کی شامت آگئی) پھر فرمایا: ہم جب بھی کسی قوم کے آنگن میں اترے تو جن لوگوں کو ڈرایا گیا ان کی صبح منحوس ہی ہوتی ہے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام و النبوۃ ......)

چنانچہ یہ یہودی خوف زدہ ہو کر شہر کی طرف بھاگے اور قلعہ ناعم میں جا پناہ لی۔ ناعم میں یہود کا صرف سامان رسد وغیرہ تھا کوئی بڑی فوجی قوت نہ تھی۔ لہٰذا مسلمانوں نے اسے آسانی سے فتح کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے چھوٹے قلعے بھی آسانی کے ساتھ تسخیر ہو گئے۔ لیکن سب سے مضبوط اور سب سے اہم سلام بن ابی الحقیق کا قلعہ قموص تھا جس میں یہود کا سردار اور مشہور جری پہلوان مرحب بھی موجود تھا۔ قموص پر ہر روز حملے ہوتے رہے لیکن یہ سر ہونے میں نہ آتا تھا۔ اسی طرح بیس دن گزر گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ خیبر فتح کرا دے گا۔ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ اس سے محبت رکھتے ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہے۔

❁ آپ کا سیدنا علی کو جھنڈا عطا کرنا:۔ لوگ رات بھر اسی سوچ میں رہے کہ دیکھئے کل کس کو جھنڈا ملتا ہے۔ صبح سب لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے پوچھا علی رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب کہاں ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ ان کی تو آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی کو اسے بلانے کے لئے بھیج دو۔ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ آئے تو آپ ﷺ نے اپنا تھوک ان کی آنکھوں پر لگایا اور دعا فرمائی۔ وہ ایسے اچھے ہو گئے جیسے انہیں کچھ تکلیف ہی نہ تھی۔ آپ ﷺ نے جھنڈا ان کے حوالے کیا۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ کیا میں ان سے اس وقت تک لڑتا رہوں جب تک وہ ہماری طرح (مسلمان) نہ ہو جائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ آرام سے جاؤ جب ان کے مقام پر پہنچ جاؤ تو انہیں اسلام کی دعوت دو اور ان پر

اللہ کا جو فرض ہے وہ انہیں بتاؤ۔ اللہ کی قسم اگر تیرے ذریعہ اللہ ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو وہ تیرے حق میں سرخ اونٹوں سے بہتر ہے" (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب علی ابن ابی طالب)

اور ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کبھی کسی منصب یا عہدے کی آرزو پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن اس رات میرے دل میں بھی یہ خواہش مچل رہی تھی کہ کاش صبح میرا نام پکارا جائے۔ (مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضائل علی ابن ابی طالب)

❁ سیدنا علیؓ اور مرحب کا مقابلہ:۔ چنانچہ سیدنا علیؓ فوج لے کر قلعہ پر حملہ آور ہوئے تو آپ کے مقابلہ کے لئے یہودی سالار مرحب مقابلہ کو نکلا اور میدان میں اتر کر تین مصرعوں کا شعر پڑھا:

قد علمتْ خیبرُ انی مرحب ...... شاكِ السّلاحِ بَطَلٌ مجرّبٌ ...... اِذَا الحُروبُ اَقبَلَتْ تَلَهَّبُ

"سارا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں۔ ہتھیار بند ہوں اور اس وقت آزمودہ کار پہلوان ثابت ہوتا ہوں۔ جب لڑائیاں شعلے اڑانے لگتی ہیں"

اس کے جواب میں سیدنا علیؓ نے بھی تین مصرعے کا شعر پڑھا:

انا الذی سمّتْنِی اُمّی حیدرَۃ ...... کَلَیْثِ غاباتٍ کریہِ المَنظَرَۃ ...... اُوفیهم بِالصّاعِ کَیلَ السَّنْدَرَۃ

"میں وہ ہوں جس کا میری ماں نے شیر نام رکھا تھا۔ میں جنگلوں کے شیر کی طرح جس کو دیکھوں سب ڈر جاتے ہیں۔ اور میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا کرتا ہوں"

پھر سیدنا علیؓ نے مرحب کے سر پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی جس سے اس کا کام تمام ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے سیدنا علیؓ کے ہاتھ پر فتح دی۔ (مسلم۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب غزوۃ ذی قرد و خیبر)

مرحب کے بعد اس کا بھائی یاسر میدان میں اترا تو سیدنا زبیرؓ نے اسے ڈھیر کر دیا۔ اس پر یہودیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ اس معرکہ خیبر میں ترانوے یہودی کام آئے اور بیس مجاہدین شہید ہوئے۔

❁ یہودیوں کی جان بخشی کی شرائط:۔ اس شکست فاش کے بعد یہودیوں نے آپؐ سے جان بخشی کی درخواست کی جسے آپؐ نے اس شرط پر منظور کیا کہ یہود اپنی تمام جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ یعنی ہتھیار، نقدی اور مویشی نیز زمین اور باغات وغیرہ سب کچھ مسلمانوں کے حوالہ کر دیں گے اور اگر انہوں نے جائیداد کا اتا پتا بتانے میں پس و پیش کیا تو یہ معاہدہ ختم اور مسلمانوں کو انہیں قتل کر دینے یا جلاوطن کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

اس معاہدہ کی رو سے آپ ﷺ نے یہود بنو نضیر سے اس کے مال و دولت کی بابت دریافت فرمایا۔ جو وہ مدینہ سے لے کر نکلے تھے تو حیی بن اخطب کے داماد کنانہ بن ربیع نے اس کے بتانے میں پس و پیش کیا۔ لیکن ایک دوسرے یہودی کی نشاندہی پر مطلوبہ مال جنگل میں مدفون مل گیا۔ اس عہد شکنی کی بنا پر کنانہ بن ربیع کو تہ تیغ کر دیا گیا اور اس کے خاندان کی عورتیں اور بچے غلام بنا لئے گئے۔ حیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ اسیر ہو کر آپ ﷺ کے سامنے حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کی عزت کو ملحوظ خاطر رکھ کر نیز دشمنوں پر اپنے اخلاق کا اثر ڈالنے کے لئے اسے آزاد کر دیا اور دوسری مہربانی یہ فرمائی کہ اسے اپنے عقد میں لے لیا۔ چنانچہ یہود پر اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔

❁ نصف پیداوار کی شرط پر یہود سے مصالحت:۔ اب یہود نے دوسری درخواست یہ کی کہ ان کی زمینیں اور باغات انہیں کے پاس رہنے

دیئے جائیں اس شرط پر کہ وہ ساری پیداوار کا نصف مسلمانوں کو ادا کر دیا کریں گے۔ آپ نے کمال مہربانی سے ان کی یہ درخواست بھی منظور فرمالی۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر وہ مسلمانوں سے بدعہدی یا کوئی اور شرارت کریں گے تو یہ معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جب فصل تیار ہو چکتی تو آپ عبداللہ بن رواحہ کو بھیجتے جو پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے پھر یہود کو اختیار دے دیتے کہ جو نسا حصہ تم چاہو لے لو۔ یہودیوں پر اس فیاضانہ عدل کا یہ اثر ہوا کہ وہ کہتے تھے کہ زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں۔

۞ زہریلی بکری سے آپ کو ختم کرنے کی سازش:۔ آپ ﷺ کے اس فیاضانہ سلوک کے باوجود یہود کا خبث باطن ختم نہ ہوا۔ خیبر میں قیام کے دوران سلام بن مشکم یہودی کی بیوی زینب بنت حارث نے آپ کی دعوت کی درخواست کی جسے آپ ﷺ نے قبول فرمالیا۔ یہ دراصل سب یہود کی ملی بھگت سے ایک سازش تیار کی گئی تھی کہ آپ کو کھانے میں زہر ملا کر ہلاک کر دیا جائے۔ چنانچہ زینب نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ آپ کونسا گوشت پسند فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا دستی کا۔ آپ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ دعوت پر آئے۔ لیکن پہلا لقمہ ابھی حلق سے اترا ہی تھا کہ آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے۔ آپ کھانے سے رک گئے لیکن ایک صحابی بشیر بن براء دو چار لقمے کھا چکے تھے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس موقعہ پر اگر کوئی اور فاتح ہوتا تو سب یہودیوں کو تہ تیغ کرا دیتا۔ آپ ﷺ نے زینب سے پوچھا تو اس نے اعتراف جرم کر لیا اور بتایا کہ اس سازش میں سب یہود ملوث ہیں۔ آپ ﷺ نے یہود کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے بھی اعتراف کر لیا۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو کہنے لگے کہ اس لئے کیا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو زہر آپ پر اثر نہیں کرے گا اور جھوٹے ہیں تو آپ سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ مجسمہ رحمت تھے۔ لہٰذا آپ نے ان سب کا یہ قصور بھی معاف کر دیا۔ فقط بشیر بن براء کے قصاص میں زینب بنت حارث کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری۔ کتاب الجهاد۔ باب اذا غدر المشركون بالمسلمين)

۞ فتح خیبر کے اثرات:۔ خیبر کے معاملات سے فارغ ہو کر صفر ۷ھ آپ نے فدک کی طرف توجہ فرمائی۔ کیونکہ یہ لوگ بھی جنگ پر تلے بیٹھے تھے۔ یہاں صرف ایک دن جنگ ہوئی دوسرے دن صبح ہی مجاہدین اسلام نے ان پر فتح پالی اور ان سے اہل خیبر کی شرائط پر مصالحت کر لی۔ تیماء کے یہود کو ان فتوحات کی خبر ملی تو انہوں نے خود ہی جزیہ کی شرط پر صلح کر لی۔ خیبر وغیرہ کی فتح سے یہود کا دم خم بالکل ختم ہو گیا۔ جب قریش مکہ کو یہ خبر ملی تو انہیں سخت صدمہ ہوا کیونکہ ان کا ایک مضبوط بازو کٹ گیا اور اب وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تنہا رہ گئے۔

۞ خیبر کے اموال غنائم اور اموال فئے: غزوہ خیبر میں کچھ لڑائی کے ذریعہ اموال غنیمت حاصل ہوئے اور کچھ بے لڑے بھڑے بھی حاصل ہو گئے اور مال کثیر اور باغات مسلمانوں کے ہاتھ لگے حتیٰ کہ مسلمانوں کی معاشی حالت بہت بہتر ہو گئی اور مہاجرین نے انصار کو وہ باغات وغیرہ واپس کر دیئے جو سلسلہ مواخات کے نتیجہ میں مہاجرین نے بطور شراکت انصار سے لے رکھے تھے اس غزوہ خیبر میں انہیں مجاہدین کو شریک کیا گیا جو غزوہ حدیبیہ میں آپ کے ہمراہ تھے اور خون پر بیعت کی تھی۔ انہیں میں یہ اموال غنیمت تقسیم کیے گئے۔

۞ ان اموال میں حبشہ کے مہاجرین کا حصہ: البتہ ان اموال میں حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے والے مہاجرین کو شریک کر لیا گیا تھا جو عین اموال غنیمت کی تقسیم کے موقعہ پر پہنچے تھے۔ بعض علماء نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ آپ ﷺ نے مہاجرین حبشہ کو جو مال دیا تھا وہ مجاہدین کے حصہ سے نہیں بلکہ اپنے حصہ خمس سے دیا تھا۔ جس کی تقسیم کلیتاً آپ ﷺ کی صوابدید پر منحصر تھی۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦﴾ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَمَن يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا

تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا۔(۱۶) کوئی اندھا یا لنگڑا یا بیمار[۲۲] اگر جہاد میں شامل نہ ہو تو اس پر کوئی تنگی نہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان لے، اللہ اسے ایسے باغوں[۲۳] میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور جو سرتابی کرے اللہ اسے دردناک عذاب دے گا۔(۱۷)

سیدنا ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ ہم نے یمن میں سنا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے چلے گئے۔ تو میں اور میرے دو چھوٹے بھائی ابوبردہ اور ابورہم بھی مدینہ کو ہجرت کی غرض سے نکلے۔ ہماری قوم کے کل باون یا ترپن آدمی تھے جو کشتی پر سوار ہوئے۔ وہ کشتی حبش کی طرف چلی گئی جہاں کا بادشاہ نجاشی تھا۔ وہاں ہم کو جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھی ملے۔ جعفر نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو یہاں بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ یہیں ٹھہرو۔ تو تم بھی ہمارے ساتھ ٹھہرو۔ ہم کچھ عرصہ وہاں رہے۔ پھر سب لوگ مل کر مدینہ آئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے خیبر فتح کیا تھا۔ آپ نے اموال غنائم میں سے ہمارا حصہ لگایا یا کہا کہ اس سے ہمیں عطا کیا۔ لیکن ہمارے سوا صرف اسے ہی آپ نے دیا جو فتح خیبر میں حاضر تھا، کسی غیر حاضر کو کچھ نہیں دیا۔ سو ہم کشتی والوں کے جو جعفر اور ان کے اصحاب کے ساتھ تھے۔ آپ نے ان کا حصہ لگایا۔ بعض لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم سے پہلے ہجرت کر چکے تھے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں سیدنا عمرؓ اور سیدہ اسماء بنت عمیس میں تکرار بھی ہوئی۔ سیدنا عمرؓ کہتے تھے کہ ہم تم سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے ہیں لہٰذا ہم رسول اللہ ﷺ کی طرف زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اسماء بنت عمیس کو اس بات پر غصہ آ گیا کہ تم تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے وہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے اور ہم دیار غیر میں تھے اور ہجرت بھی دو دفعہ کی ہے اور کہنے لگیں میں ضرور یہ بات رسول اللہ ﷺ سے پوچھوں گی۔ چنانچہ اسماء نے آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تم سے زیادہ حق نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کی ایک ہجرت ہے اور تمہاری دو بار ہجرت ہے۔ اسماء کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اس بات سے کشتی والوں کو انتہائی خوشی ہوئی۔ اور وہ مجھے بار بار اس حدیث کو دہرانے کو کہتے تھے۔ (مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضائل جعفر و اسماء بنت عمیس و اهل سفینتهم...... ملخصا)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشہ سے آنے والے مہاجرین کو یہ حصہ دو ہجرتوں کی وجہ سے ملا تھا۔

[۲۲] جہاد فرض عین نہیں:۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ منافق تو محض حیلے بہانے کرتے ہیں۔ اصل معذور لوگ جنہیں جہاد سے رخصت ہے وہ ہیں جو جسمانی طور پر تندرست نہ ہوں۔ مثلاً اندھے، لنگڑے، اپاہج، بیمار، نابالغ، بچے اور ضعیف و ناتواں بوڑھے بزرگ مجنون اور فاتر العقل قسم کے لوگ۔ علاوہ ازیں کچھ اور عذر بھی شریعت کی نگاہ میں مقبول ہیں۔ مثلاً غلام یا ایسا تندرست جو تنگدستی کی وجہ سے سامان جنگ بھی مہیا نہ کر سکتا ہو۔ یا مثلاً ایسا شخص جس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بوڑھا ہو اور وہ اپنے بیٹے کی خدمت کا محتاج ہو۔ واضح رہے کہ اگر والدین مسلمان ہوں تو کوئی شخص ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر والدین کافر ہوں تو پھر ان سے اجازت کی ضرورت نہیں۔

[۲۳] اگرچہ یہ آیت اور اس کا حکم اللہ اور اس کے رسول کے سب فرمانبرداروں کو شامل ہے۔ تاہم ربط مضمون کے لحاظ

اٰیۃ ۱۸ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ

بیشک اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت [۲۴] کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اسے معلوم ہو گیا

سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ معذور لوگ بھی اگر ہمت کر کے کسی طرح جہاد میں شرکت کر سکیں تو ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے۔ اور جو شخص امام وقت کے اعلان شمولیت اور کسی شرعی عذر کے نہ ہونے کے باوجود جہاد میں حصہ نہیں لیتا اسے اللہ تعالیٰ سخت سزا دے گا۔

[۲۴] ❁ صحابہ کرام پر طعن کرنے والے؟ اس آیت کا آغاز ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ﴾ سے ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس بیعت کا نام بیعت رضوان پڑ گیا یعنی ایسی مخلصانہ اور سرفروشانہ بیعت جس پر اللہ نے ان لوگوں کو اپنی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ اور بعض احادیث میں صراحت سے یہ مذکور ہے کہ اس بیعت میں حصہ لینے والے سب جنتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان میں بھی شک کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بلاشبہ یہ لوگ بیعت رضوان کے وقت تو اسلام کے وفادار اور اس کے لئے مخلص تھے مگر بعد میں بے وفا ثابت ہوئے۔ گویا ان لوگوں نے پہلا الزام تو ان عظیم المرتبت صحابہ کرام پر لگایا تھا۔ دوسرا اللہ تعالیٰ پر لگایا جسے اپنی رضامندی کا سرٹیفکیٹ دیتے وقت اتنا بھی پتا نہ چل سکا کہ جن لوگوں کو میں یہ سند دے رہا ہوں وہ تو بعد میں بے وفا نکلیں گے۔ گویا یہ نظریہ ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم غیب پر بھی زبردست چوٹ ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہئے۔

❁ درخت جس کے نیچے بیعت کی گئی تھی:۔ جس درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے بیعت لی تھی اس کے متعلق دو طرح کی روایات ملتی ہیں۔ طبری کی روایت کے مطابق مسلمان اس درخت کی زیارت کو جانے لگے۔ وہ وہاں جا کر نمازیں اور نوافل وغیرہ ادا کرتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اسے اپنے دورِ خلافت میں کٹوا دیا۔ اس کے مقابلہ میں صحیح اور معتبر روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگلے ہی سال خود بیعتِ رضوان میں شامل ہونے والے بعض صحابہ وہاں گئے تو وہ خود بھی اس درخت کو پہچان نہ سکے جس کے نیچے بیعت لی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں درجِ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حدیبیہ کے دن ہم ایک ہزار چار سو آدمی تھے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

طارق بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں حج کی نیت سے روانہ ہوا۔ راستے میں کچھ لوگوں کو نماز ادا کرتے دیکھا تو پوچھا کہ "یہ مسجد کیسی ہے؟" کہنے لگے: یہاں وہ درخت تھا جس کے نیچے آپ ﷺ نے صحابہ سے بیعتِ رضوان لی تھی۔ یہ سن کر میں سعید بن مسیب کے پاس آیا۔ تو انہوں نے کہا کہ میرے والد (مسیب بن حزن رضی اللہ عنہ) ان لوگوں سے تھے جنہوں نے درخت کے تلے بیعت کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ "جب میں دوسرے سال وہاں گیا تو اس درخت کو پہچان نہ سکا" سعید کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اصحاب تو اس درخت کو پہچان نہ سکے۔ اور تم لوگ ان سے زیادہ علم رکھتے ہو۔ (کہ اسے پہچان کر وہاں مسجد بنا ڈالی) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوۃ الحدیبیۃ)

السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ﴿١٨﴾ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٩﴾
وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَ

لہٰذا اس نے ان پر اطمینان[۲۵] نازل فرمایا اور انہیں جلد ہی فتح دے[۲۶] دی۔(۱۸) اور بہت سے اموال غنیمت بھی جو وہ حاصل کریں گے اور اللہ بڑا غالب ہے، حکمت والا[۲۷] ہے۔(۱۹) اس نے تم سے (اور بھی) بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا[۲۸] ہے جنہیں تم حاصل کرو گے۔ یہ (فتح خیبر) تو تمہیں جلدی ہی دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے۔ تاکہ یہ ایمان[۲۹] لانے والوں کے لئے ایک نشانی[۳۰] بن جائے

[۲۵] ❁ اس دن جنگ کو روک کر اللہ کا احسان تھا۔ یعنی بیعت کرنے والوں کی نسبت یہ معلوم ہو گیا کہ ان میں اسلام کی خاطر کس قدر جان نثاری اور سرفروشی کا جذبہ موجود ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اس بات پر جما دیا کہ نتائج خواہ کیسے برآمد ہوں ہمیں ضرور جنگ لڑنا چاہیے۔ بظاہر جو نتیجہ نظر آ رہا تھا وہ تو یہی تھا ایک طرف صرف چودہ سو نہتے اور پردیسی مسلمان تھے۔ دوسری طرف ان کا طاقتور جانی دشمن تھا جو ساز و سامان کے لحاظ سے، تعداد کے لحاظ سے، رسد کے لحاظ سے غرضیکہ ہر لحاظ سے ان سے بڑھ کر تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے گھر پر تھا اور اس کے حریف مسلمان اس کے گھر آ گئے تھے۔ اس صورت حال میں اللہ کا مسلمانوں کے دلوں کو جنگ پر جما دینا اور اسے اطمینان مہیا کر دینا واقعی اللہ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگ کی طرف اس قدر پیش رفت کے بعد اللہ نے کافروں سے بہرحال صلح کر لینے کی خاطر ان کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر مطمئن کر دیا۔

[۲۶] قریبی فتح سے مراد فتح خیبر ہے جو صلح نامہ حدیبیہ کے صرف تین ماہ بعد وقوع پذیر ہوئی تھی۔

[۲۷] یعنی حدیبیہ کے مقام پر جنگ نہ ہونے میں اور بہرحال صلح ہو جانے میں اللہ کی بے شمار حکمتیں تھیں لہٰذا اس نے وہی کام ہونے دیا جو اسے منظور تھا۔ رہا بیعت کرنے والوں کی جانثاری کا صلہ تو وہ غنائم خیبر کی صورت میں انہیں مل جائے گا۔ اور اللہ کے ہاں ان کے لئے جو صلہ ہے وہ تو بہت زیادہ ہے۔

[۲۸] اس سے مراد فتح مکہ، حنین کے اموال غنائم ہیں۔ بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد وہ کثیر مقدار میں اموال غنیمت بھی جو پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کو حاصل ہوتے رہے۔

[۲۹] ❁ حدیبیہ کے مقام پر جنگ نہ ہونے کی حکمتیں:۔ اللہ تعالیٰ یہ بات بطور احسان مسلمانوں سے فرما رہے ہیں اور اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ تمہاری پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی کہ کفر کے سب سے بڑے مرکز میں تم دشمن کی تاب لا سکتے۔ لہٰذا اللہ نے جنگ کی صورت پیدا ہی نہ ہونے دی۔ اور یہ بھی ایک طرح سے اللہ کی مدد تھی۔ دوسرے یہ کہ تم مدینہ کا مرکز چھوڑ کر بہت دور نکل آئے تھے۔ جنگ کی صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ تمہارے دوسرے دشمن تمہاری غیر حاضری میں مدینہ پر چڑھ آتے۔ اللہ نے انہیں بھی تم سے روک دیا۔

[۳۰] یہاں آیت سے مراد معجزہ ہے۔ یعنی صلح حدیبیہ جسے بظاہر مسلمان اپنی شکست اور توہین سمجھ رہے تھے وہ درحقیقت ان کی معجزانہ فتح تھی جس کی کفار تو درکنار، مسلمانوں کو بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ جوں جوں اس کے نتائج سامنے آتے گئے مسلمانوں کو

لِتَكُونَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ

اور وہ تمہیں سیدھی[۳۱] راہ کی طرف چلائے رکھے۔(۲۰) اور ایک اور (فتح بھی دے گا) جس پر تم ابھی قادر[۳۲] نہیں ہوئے اور اللہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے(۲۱) اگر کافر لوگ تم سے جنگ کرتے تو یقیناً پیٹھ پھیر[۳۳] جاتے۔

یقین ہوتا چلا گیا کہ دراصل یہ صلح اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔

[۳۱] یہ سیدھی راہ ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ اگر وہ کٹ مرنے کو کہیں تو اس کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر وہ اپنے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور دب جانے کو کہیں تو اس وقت دب جاؤ۔ جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کرو۔ یہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے فلاں وقت کون سا اقدام بہتر ہے۔

[۳۲] صلح حدیبیہ کیسے فتح مکہ کا پیش خیمہ بنی؟ اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ جس کا پیش خیمہ یہ صلح حدیبیہ ہی بن گئی تھی۔ اور اللہ کو ٹھیک معلوم تھا کہ یہ صلح کس طرح فتح مکہ کا پیش خیمہ بننے والی ہے۔ صلح نامہ کی دوسری شرط کی رو سے بنو خزاعہ مسلمانوں کے اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے تھے۔ صلح کے ڈیڑھ سال بعد بنو خزاعہ اور بنو بکر کی آپس میں لڑائی ہو گئی جس میں قریش نے کھلم کھلا بنو بکر کی مدد کی اور جب بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی تو انہیں وہاں بھی نہ چھوڑا۔ بعد ازاں بنو خزاعہ کے چالیس شتر سوار فریاد کے لئے مدینہ پہنچے۔ آپ کو قریش کی اس بدعہدی پر سخت صدمہ ہوا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے قریش کے لئے تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک تسلیم کر لی جائے۔

(۱) بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

(۳) اعلان کیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ختم ہو گیا۔

قاصد نے جب یہ شرائط قریش کے سامنے پیش کیں تو ان کا نوجوان طبقہ بھڑک اٹھا۔ ان میں سے ایک شخص فرط بن عمر نے قریش کی طرف سے اعلان کر دیا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔ قاصد واپس چلا گیا تو ان لوگوں کا جوش ٹھنڈا ہو کر ہوش و حواس درست ہوئے اور انہیں سخت فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ ابو سفیان کو تجدید معاہدہ کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی۔ لیکن آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے علی الترتیب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حتیٰ کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تک سے سفارش کی درخواست کی۔ لیکن جب سب نے جواب دے دیا تو اس نے خود ہی مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر یکطرفہ اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔

قریش کی یہ بدعہدی، پھر اس کے بعد صرف تیسری شرط منظور کرنے کا جواب دراصل اعلان جنگ کے مترادف تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کی مہم کا آغاز کر دیا اور جب ابو سفیان وہاں پہنچا تو اس وقت تجدید معاہدہ کا وقت گزر چکا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ اسے کسی قسم کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے۔

[۳۳] یعنی اگر کافر میدان حدیبیہ میں مسلمانوں سے بھڑ جاتے تو بھی اللہ اس بات پر قادر تھا کہ کافروں کو مار بھگاتا اور مسلمانوں

لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ

پھر وہ کوئی حامی اور مددگار بھی نہ پاتے۔(٢٢) یہی اللہ کی سنت ہے جو پہلے لوگوں میں جاری رہی ہے اور آپ اللہ کی سنت میں کبھی کوئی تبدیلی نہ پائیں گے(٢٣) وہی تو ہے جس نے وادی مکہ میں تم سے ان کے ہاتھ روک[٣٤] دیئے اور ان سے تمہارے جبکہ اس سے پہلے اللہ تمہیں ان پر غالب کر چکا تھا

کو فتح عطا کر دیتا۔ مگر جنگ ہونے کے بجائے صلح ہو جانے میں دوسری کئی مصلحتیں کار فرما تھیں۔ جن کی وجہ سے اللہ نے جنگ نہ ہونے دی۔

[٣٤] صلح حدیبیہ کی مزید تفصیلات کے لئے درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے:

١۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: صبح کی نماز کے قریب آپ ﷺ اور صحابہ تنعیم کے پہاڑ سے اترے۔ کافر لوگ یہ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کو مار ڈالیں مگر سب کے سب پکڑے گئے۔ پھر آپ ﷺ نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

٢۔ ❁ حدیبیہ کے مقام پر آپ کا معجزہ اور پانی کی مشکل کا حل:۔ مسور بن مخرمہ اور مروان دونوں روایت کرتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ مکہ سے نکلے۔ ابھی راہ میں ہی تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: خالد بن ولید دو سو سواروں کا ہراول دستہ لئے غمیم تک آ چکا ہے۔ لہٰذا تم داہنی طرف کا رستہ لو" خالد کو مسلمانوں کی آمد کی اس وقت خبر ہوئی جب اس نے سواروں کی گرد اڑتی دیکھی تو وہ قریش کو ڈرانے کے لئے دوڑا۔ جب آپ اس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے مکہ کو اترتے ہیں تو آپ کی اونٹنی قصواء اڑ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: قصواء کو اسی اللہ نے روکا ہے جس نے اصحاب الفیل کو روکا تھا۔ اور اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر اہل مکہ مجھ سے کوئی ایسی بات چاہیں جس میں اللہ کے حرم کی تعظیم ہو تو میں اسے مان لوں گا۔ چنانچہ آپ وہاں سے مڑ کر گئے اور حدیبیہ کے پرلے کنارے پر ڈیرے ڈال دیئے۔ وہاں ایک گڑھا تھا جس میں پانی بہت کم تھا۔ لوگوں نے آپ سے پیاس کا شکوہ کیا آپ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر صحابہ سے کہا کہ اسے گڑھے میں گاڑ دو تیر گاڑتے ہی پانی جوش مارنے لگا۔ پھر آپ ﷺ کی وہاں سے واپسی تک کسی کو پانی کی کمی کی شکایت نہیں ہوئی۔

❁ صلح کی تفصیل:۔ اس دوران بدیل بن ورقاء خزاعی اپنے کئی آدمیوں سمیت وہاں پہنچا۔ وہ تہامہ والوں میں سے آپ کا خیر خواہ اور محرم راز تھا۔ وہ کہنے لگا کہ "کعب بن لوئی اور عامر بن لوئی نے حدیبیہ پہنچ کر زیادہ پانی والے چشموں پر ڈیرہ ڈال دیا ہے اور وہ آپ سے لڑنا اور آپ ﷺ کو مکہ جانے سے روکنا چاہتے ہیں" آپ نے فرمایا: "ہم لڑنے نہیں آئے صرف عمرہ کی نیت سے آئے ہیں۔ قریش بھی لڑتے لڑتے تھک چکے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو میں ایک مقررہ مدت تک ان سے صلح کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ وہ دوسروں کے معاملہ میں دخل نہ دیں۔ اگر دوسرے لوگ مجھ پر غالب آ جائیں تو ان کی مراد بر آئی۔ اور اگر میں غالب ہوا پھر اگر وہ چاہیں تو اسلام لے آئیں ورنہ اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ان سے دین کے معاملہ میں لڑوں گا۔ یہاں تک میری جان چلی جائے اور اللہ ضرور اپنے دین کو پورا کر کے رہے گا۔ بدیل نے کہا: "میں

آپ ﷺ کا یہ پیغام قریش کو پہنچا دیتا ہوں"

❁ **بدیل بن ورقاء کا آپ ﷺ کا پیغام پہنچانا اور اس کا جواب:۔** چنانچہ بدیل قریش کے پاس آئے اور کہنے لگے: "محمد (ﷺ) نے ایک بات کہی ہے" اتنی بات کہنے پر ہی کچھ جلد باز بیوقوف کہنے لگے۔ ہمیں کوئی بات سننے کی ضرورت نہیں۔ مگر جو عقل والے تھے وہ کہنے لگے کہ بتاؤ تو سہی وہ کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ بدیل نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو انہوں نے آپ ﷺ سے سنا تھا۔

❁ **قریش کے پہلے سفیر عروہ بن مسعود کی رپورٹ:۔** یہ سن کر عروہ بن مسعود ثقفی قریش سے کہنے لگے۔ اگر مجھ پر اعتماد کرتے ہو تو محمد ﷺ کے پاس جانے دو۔ قریش نے کہا۔ اچھا جاؤ۔ عروہ آیا تو آپ ﷺ نے اس سے بھی وہی بات کہی جو بدیل کو کہی تھی۔ عروہ کہنے لگا: "محمد ﷺ اگر تم نے اپنی قوم کو تباہ کر دیا تو یہ اچھی بات نہ ہوگی اور قریش غالب آگئے تو تمہارے یہ ساتھی تمہیں چھوڑ کر چلتے بنیں گے" اس بات پر ابوبکر رضی اللہ عنہ غصہ میں آگئے اور عروہ کو کہا: "جا جا کر لات کی شرمگاہ چوس۔ کیا ہم آپ ﷺ کو چھوڑ جائیں گے؟ عروہ نے پوچھا: یہ کون ہے؟" لوگوں نے کہا: "ابوبکر رضی اللہ عنہ"! عروہ نے کہا" اگر تمہارا مجھ پر احسان نہ ہوتا تو میں تمہیں اس کا جواب دیتا" پھر عروہ باتیں کرتا تو آپ ﷺ کی داڑھی تھام لیتا اور مغیرہ بن شعبہ تلوار کے دستے سے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیتے۔ پھر وہ آپ ﷺ کے صحابہ کو بغور ملاحظہ کرنے لگا۔ پھر اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر کہنے لگا "میں بادشاہوں کے پاس کئی بار جا چکا ہوں۔ روم، ایران اور حبش کے بادشاہوں کے ہاں گیا۔ اللہ کی قسم! میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کے لوگ اس کی ایسی تعظیم کرتے ہوں جیسے محمد ﷺ کی تعظیم ان کے اصحاب کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے تھوکا تو کوئی اپنے ہاتھ میں لیتا اور اپنے منہ اور بدن پر مل لیتا ہے۔ وہ کوئی حکم دیتا ہے تو لپک کر اس کا حکم بجا لاتے ہیں۔ وہ وضو کریں تو وضو کا پانی حاصل کرنے کے لئے قریب ہوتے تھے کہ لڑ مریں گے وہ بات کریں تو اپنی آواز پست کر لیتے ہیں اور از راہ ادب انہیں نظر بھر کر دیکھتے بھی نہیں۔ لہٰذا محمد ﷺ نے جو بات کی ہے وہ تمہارے فائدے کی ہے۔ اس کو مان لو"

❁ **دوسرے سفیر کی رپورٹ:۔** اب بنی کنانہ کا ایک شخص بولا "مجھے ان کے پاس جانے دو" لوگوں نے کہا: "اچھا جاؤ" جب وہ آپ ﷺ کے قریب پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اب جو شخص آ رہا ہے۔ یہ بیت اللہ کی قربانی کی عظمت کرنے والوں سے ہے۔ لہٰذا قربانی کے جانور اس کے آگے کر دو" چنانچہ وہ جانور اس کے سامنے لائے گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے لبیک پکارتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ کہہ اٹھا "سبحان اللہ ایسے لوگوں کو کعبے سے روکنا مناسب نہیں" وہ واپس چلا گیا اور جا کر کہا: "میں نے اونٹوں کے گلے میں ہار اور ان کے کوہان چرے خود دیکھے ہیں۔ میں تو انہیں بیت اللہ سے روکنا درست نہیں سمجھتا"

❁ **تیسرا سفیر سہیل بن عمرو، اس کے اعتراضات اور صلح کی شرائط:۔** اس کے بعد قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو (سفیر بن کر) آیا۔ اسے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: "اب تمہارا کام سہل ہو گیا" سہیل کہنے لگا اچھا لایئے، ہمارے اور تمہارے درمیان ایک صلح نامہ لکھا جائے۔ آپؐ نے منشی (سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: "لکھو بسم الله الرحمن الرحيم" سہیل کہنے لگا عرب کے دستور کے موافق "باسمك اللّٰهم" لکھوایئے۔ آپ ﷺ نے کاتب سے فرمایا: اچھا "باسمك اللّٰهم" ہی لکھ دو۔ پھر آپ ﷺ نے لکھوایا: "محمدؐ اللہ کے رسول......" اس پر سہیل نے فوراً اعتراض کر دیا اور کہا "محمد بن عبد اللہ لکھوایا جائے"

آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا محمد بن عبداللہ ہی لکھ دو۔ اور لکھو محمد بن عبداللہ نے اس شرط پر صلح کی کہ تم لوگ انہیں بیت اللہ جانے دو گے ہم وہاں طواف کریں گے" سہیل نے کہا: "اگر ہم ابھی تمہیں جانے دیں تو سارے عرب میں چرچا ہو جائے گا کہ ہم دب گئے۔ لہٰذا تم آئندہ سال آؤ۔ (دوسری شرط) سہیل نے یہ لکھوائی۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص خواہ وہ مسلمان ہو گیا ہو تمہارے پاس (مدینہ) چلا جائے تو تم اس کو ہمارے پاس لوٹا دو گے" صحابہ کہنے لگے: "سبحان اللہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مسلمان ہو کر آئے اور اسے مشرکوں کے حوالے کر دیا جائے؟"

❁ __ابو جندل کا قصہ:۔__ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں سہیل بن عمرو کا اپنا بیٹا ابو جندل (جو مسلمان ہو چکا تھا) پابہ زنجیر مکہ سے فرار ہو کر مسلمانوں کے پاس جا پہنچا۔ سہیل کہنے لگا محمد ﷺ! یہ پہلا شخص ہے جو شرط کے موافق واپس کرنا چاہئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی تو صلح نامہ پورا لکھا بھی نہیں گیا" سہیل کہنے لگا اچھا تو پھر میں صلح ہی نہیں کرتا" آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا خاص ابو جندل کی پروانگی دے دو" سہیل کہنے لگا: "میں کبھی نہ دوں گا" آخر ابو جندل کہنے لگے: میں مسلمان ہو کر آیا ہوں اور کافروں کے حوالہ کیا جا رہا ہوں۔ دیکھو مجھ پر کیا کیا سختیاں ہوئی ہیں"

❁ __سیدنا عمرؓ کی دینی غیرت:۔__ "سیدنا عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ صورت حال دیکھ کر میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا آپ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا، کیوں نہیں" میں نے کہا، کیا ہم حق پر اور دشمن ناحق پر نہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "کیوں نہیں" میں نے کہا: "تو پھر ہم اپنے دین کو ذلیل کیوں کریں" آپ ﷺ نے فرمایا: "میں اللہ کا رسول اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا وہ میری مدد کرے گا" میں نے کہا: آپ ﷺ نے تو کہا تھا کہ ہم کعبہ کے پاس پہنچ کر طواف کریں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: مگر میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ اسی سال ہو گا" اس کے بعد میں نے ابو بکرؓ کے پاس جا کر وہی سوال کئے جو آپ ﷺ سے کئے تھے اور انہوں نے بھی بالکل وہی جواب دیئے جو آپ ﷺ نے دیئے تھے۔ اس موقع پر مجھ سے جو بے ادبی کی گفتگو ہوئی اس گناہ کو دور کرنے کے لئے میں نے کئی نیک عمل کئے"

❁ __صحابہ پر مایوسی کا عالم اور قربانی کرنے سے گریز:__ "جب صلح نامہ پورا ہو گیا تو آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: اٹھو اور اونٹوں کو نحر کرو اور سر منڈاؤ" آپ ﷺ نے یہ کلمات تین بار کہے مگر صحابہ (اتنے افسردہ دل تھے کہ کسی نے اس پر عمل نہ کیا) یہ صورت حال دیکھ کر آپ ﷺ نے ام سلمہ کے پاس جا کر ساری صورت حال بیان کی تو انہوں نے کہا: "یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کسی سے کچھ نہ کہئے۔ بلکہ اپنے اونٹ نحر کیجئے اور حجامت بنوا لیجئے" چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا تو آپ ﷺ کو دیکھ کر سب صحابہ نے بھی اپنے اونٹ نحر کئے اور ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے"

❁ __ابو بصیر اور ابو جندل کا قصہ__ "آپ واپس مدینہ پہنچ گئے تو مکہ سے ایک شخص ابو بصیر مسلمان ہو کر آپ ﷺ کے پاس آ گیا۔ قریش نے اسے واپس لانے کے لئے دو آدمی مدینہ بھیجے اور کہا کہ "معاہدہ کی رو سے ابو بصیر کو واپس کیجئے" آپ ﷺ نے ابو بصیر کو ان کے حوالے کر دیا۔ ابو بصیر نے راستہ میں ایک شخص کو تو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ نکلا اور بھاگ کر مدینہ آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا: "اللہ کی قسم! میرا ساتھی مارا گیا اور میں بھی نہ بچوں گا" اتنے میں ابو بصیر بھی وہاں پہنچ گئے اور کہا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے اپنا عہد پورا کرتے ہوئے مجھے واپس کر دیا تھا۔ اب اللہ نے مجھے اس سے نجات دلائی ہے" آپ ﷺ نے فرمایا: تیری ماں کی خرابی ہو اگر کوئی تیرا ساتھ دے تو تو لڑائی کو بھڑکانا چاہتا ہے" یہ سن کر ابو بصیر

عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ
الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ
تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا

اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔(۲۴) یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمہیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں[۳۵] کو ان کی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکے رکھا۔ اور اگر (مکہ میں) کچھ مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جنہیں تم نہیں جانتے تھے (اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ جنگ کی صورت میں) تم انہیں پامال کر دو گے[۳۶]، پھر (ان کی وجہ سے) تمہیں نادانستہ کوئی پشیمانی لاحق ہو گی (تو تمہیں لڑنے سے نہ روکا جاتا اور روکا اس لئے گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں[۳۷] داخل کرے۔

سمجھ گیا کہ آپ ﷺ پھر اسے لوٹا دیں گے چنانچہ وہ سیدھا نکل کر سمندر کے کنارے پہنچا اور ابو جندل بن سہیل بھی مکہ سے بھاگ کر ابو بصیر کے ساتھ آملا۔ اب قریش کا جو آدمی مسلمان ہو کر مکہ سے نکلتا وہ ابو بصیر کے پاس چلا جاتا یہاں تک ان کی ایک جماعت بن گئی اور قریش کا جو قافلہ شام کو جاتا اسے روک لیتے اور لوٹ مار کرتے۔ آخر قریش نے تنگ آکر آپ ﷺ کو اللہ اور رشتہ ناطہ کی قسمیں دے کر کہلا بھیجا کہ آپ ﷺ ابو بصیر کو اپنے ہاں بلا لیں اور آئندہ جو مسلمان آپ کے پاس آئے وہ ہمیں واپس نہ کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ابو بصیر کو اپنے پاس بلا لیا" (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجهاد والمصالحة......)

[۳۵] یہ کل ستر اونٹ تھے جو صحابہ اپنے ہمراہ لائے تھے۔ جب قریش اس بات پر اڑ گئے کہ کسی قیمت پر مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے تو معاہدہ صلح کے بعد انہیں وہیں حدیبیہ کے مقام پر ذبح کر دیا گیا۔

[۳۶] ❁ حدیبیہ میں جنگ نہ لڑنے کا ایک بہت اہم پہلو:۔ مکہ میں کچھ ایسے مسلمان موجود تھے جو قریش مکہ کے مظالم کی وجہ سے اپنا اسلام چھپائے رکھتے تھے۔ اور ان کے پاس ایسے ذرائع بھی موجود نہ تھے کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ چلے جاتے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بھی فی الواقع معذور تھے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میری ماں ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ جنگ کی صورت میں ایسے معذور مسلمانوں کو بھی مجبوراً کافروں کی صفوں میں شامل ہونا پڑتا اور حملہ کی صورت میں انہیں یقیناً نقصان پہنچ سکتا تھا جس کی تمہیں خبر تک نہ ہوتی۔ پھر خبر لگ جانے پر تمہیں الگ افسوس ہوتا کہ کافر الگ انہیں طعنے دینے لگتے کہ تمہارے مسلمان بھائیوں نے تمہارا ابھی خیال تک نہ کیا۔

[۳۷] ❁ صلح حدیبیہ کا اہل عرب پر تاثر:۔ جنگ روکنے اور بہرحال صلح کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ قبائل عرب میں یہ تاثر عام پھیل گیا کہ مسلمان ایک امن پسند قوم ہیں۔ اسی بات سے متاثر ہو کر صلح حدیبیہ کے بعد بے شمار لوگ علیٰ وجہ البصیرت اسلام کو حق سمجھ کر اسلام لے آئے۔ ان میں دو نامور شخصیتیں بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ایک سیدنا خالد رضی اللہ عنہ بن ولید سیف اللہ اور دوسرے سیدنا عمرو بن عاص جنہوں نے بعد میں مصر کو فتح کیا۔

لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ
حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ
التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ ع ۱۱

اگر مومن ان سے الگ ہو گئے ہوتے تو ان (اہل مکہ) [۳۸] میں سے جو کافر تھے انہیں ہم دردناک سزا دیتے۔(۲۵) جب کفار مکہ نے (صلح حدیبیہ کے موقعہ پر) اپنے دلوں میں زمانہ جاہلیت کی عصبیت [۳۹] کی ٹھان لی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اطمینان نازل فرمایا اور انہیں تقویٰ کی بات کا پابند رکھا اور وہی اس کے زیادہ حقدار [۴۰] اور اس کے اہل تھے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔(۲۶) بلاشبہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب [۴۱]

[۳۸] البتہ اگر مکہ میں معذور مسلمان موجود نہ ہوتے یا انہیں الگ کر لینے کی کوئی صورت نکل آتی تو پھر یقیناً صلح کے بجائے جنگ ہی بہتر تھی۔ اس صورت میں ہم کافروں کو تمہارے ہاتھوں بری طرح پٹوا دیتے۔

[۳۹] ❁ **قریش کی جاہلانہ حمیت:۔** قریش کی اس عصبیت کے بھی دو پہلو تھے ایک یہ کہ جن مسلمانوں نے جنگ بدر میں ہمارے عزیز و اقارب کو مار ڈالا ہے، ہم انہیں مکہ میں اپنے ہاں داخل ہونے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں اور دوسرا پہلو یہ تھا کہ اگر ہم نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہو جانے دیا تو عرب بھر میں یہ بات مشہور ہو جائے گی کہ قریش مکہ مسلمانوں سے دب گئے ہیں۔ یہ تھی جاہلی حمیت جس کی بیچ میں انہوں نے ایک ایسے دستور کی خلاف ورزی کر ڈالی جو ان میں معروف تھا اور وہ یہ تھا کہ کسی بھی حج، عمرہ اور طواف کرنے والے کو ان کاموں سے روکا نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں وہ حرمت والے مہینہ میں بھی لڑائی کرنے پر آمادہ تھے۔

[۴۰] وہ تقویٰ کی بات یہ تھی کہ مسلمان تنگی ترشی، جوش، غضب، غرضیکہ ہر طرح کے حالات میں اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا پابند بنائے رکھیں گے۔ یہ اللہ کی خاص مہربانی تھی کہ اس نے اپنے رسول ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کے مشتعل جذبات کو سکون بخش کر انہیں صلح کے سمجھوتہ پر مائل کر دیا۔

[۴۱] ❁ **عمرہ کے خواب کی حقیقت:۔** کافر یا منافقین تو در کنار خود بعض مسلمانوں کو بھی اس بات میں تردد تھا کہ نبی کا خواب تو وحی ہوتا ہے۔ پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ ہمیں عمرہ سے روک دیا گیا ہے۔ اور خود رسول اللہ ﷺ اس شرط کو منظور فرما رہے ہیں۔ اس کا ایک جواب تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عمر ؓ کو دے دیا تھا کہ: میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ عمرہ اسی سال ہو گا" (یعنی خواب میں وقت کی تعیین نہیں کی گئی تھی) اور دوسرا جواب خود اللہ تعالیٰ نے دے دیا کہ پیغمبر کا خواب فی الواقع سچا تھا اور ہم نے ہی دکھایا تھا وہ ضرور پورا ہو گا۔ تم یقیناً امن و امان کے ساتھ حرم میں داخل ہو کر عمرہ ادا کرو گے۔ تم سر منڈاؤ گے اور بال کترواؤ گے۔ یہاں پہلے سر منڈانے کا ذکر فرمایا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر منڈانا، بال کتروانے سے افضل ہے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ سے اگلے سال مسلمانوں نے عمرہ قضا ادا کیا اور یہ سب باتیں پوری ہوئیں۔

❁ **ایفائے عہد کی مثال:۔** از روئے معاہدہ حدیبیہ طے یہ ہوا تھا کہ مسلمان اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں اور تین دن کے اندر اندر

رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِيْٓ

دکھایا تھا جو ایک حقیقت تھا کہ تم ان شاء اللہ مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے اور اس وقت تم سر منڈاؤ گے اور بال کترواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے[۴۲] تم نہیں جانتے تھے لہٰذا اس فتح[۴۳] سے پہلے اس نے ایک قریبی فتح (خیبر) تمہیں عطا فرما دی۔(۲۷) وہی تو ہے جس

عمرہ کر کے واپس اپنے وطن چلے جائیں۔ اور جب مسلمان آگئے تو قریش مکہ یہ برداشت نہ کر سکے کہ مسلمان ان کی نظروں کے سامنے بلا تکلف کعبہ میں داخل ہو کر عمرہ کے ارکان آزادی سے بجا لا سکیں۔ لہٰذا انہوں نے صرف حرم کعبہ کو خالی کرنے کے بجائے اس شہر کو ہی خالی کر دیا اور خود آس پاس پہاڑیوں پر تین دن کے لئے جا مقیم ہوئے۔ اس دوران اگر مسلمان چاہتے تو بڑی آسانی سے مکہ پر قبضہ کر سکتے تھے۔ مگر مسلمان ایفائے عہد میں اس قسم کی موقع شناسی کو بدترین جرم تصور کرتے تھے۔ لہٰذا کسی کو بھی ایسا خیال تک نہ آیا اور تین دن کی طے شدہ مدت کے بعد مسلمان عمرہ کر کے واپس چلے گئے۔

● عمرہ قضا کو کس لحاظ سے عمرہ قضا کہا جاتا ہے؟:۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیبیہ میں چونکہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس عمرہ کی قضا لازم تھی۔ جو انہوں نے اگلے سال ادا کی۔ اور مغالطہ غالباً لفظ قضا سے ہوا۔ حالانکہ یہاں قضا اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ عمرہ جس کے متعلق معاہدہ حدیبیہ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ مسلمان اس سال نہیں بلکہ اگلے سال آ کر کریں گے جس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اگلے سال کوئی ایسا اعلان نہیں فرمایا کہ جو لوگ پچھلے سال عمرہ سے روک دیئے گئے تھے وہ عمرہ کے لئے تیار ہو جائیں اور مسلمان بھی جو حدیبیہ میں حاضر ہوئے تھے اس معاملہ میں آزاد تھے۔ جو آ سکتے تھے وہ آ گئے اور جو نہ آ سکے وہ نہیں آئے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث میں بھی اس کی وضاحت موجود ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ قضا اس پر لازم ہے جو عورت سے صحبت کر کے حج توڑے، اور جسے کوئی عذر لاحق ہو جائے، دشمن روک دے یا اور کچھ بیماری وغیرہ کا عذر ہو تو وہ اپنا احرام کھول دے اور قضا نہ دے۔ اور اگر اس کے ساتھ قربانی ہو اور اسے حرم میں نہ بھیج سکے تو وہیں ذبح کر دے اور اگر حرم تک بھیج سکتا ہے تو جب تک قربانی وہاں نہ پہنچ جائے، وہ احرام نہیں کھول سکتا اور امام مالک وغیرہ نے کہا کہ جب وہ رک جائے تو جہاں کہیں چاہے وہیں قربانی ذبح کر دے اور سر منڈا لے اور اس پر قضا لازم نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ میں قربانیاں ذبح کیں اور سر منڈائے اس سے پہلے کہ وہ طواف کریں اور قربانی بیت اللہ کو پہنچے۔ پھر کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے ان میں سے کسی کو قضا کا حکم دیا ہو یا دہرانے کو کہا ہو۔ اور حدیبیہ حرم کی حد سے باہر ہے۔" (بخاری۔ کتاب المناسک۔ ابواب المحصر۔ باب من قال لیس علی المحصر بدل......)

[۴۲] یعنی یہ کہ یہ عمرہ اگلے سال ہو گا۔ اس سال نہیں ہو گا۔

[۴۳] یعنی یہ فتح خیبر تمہاری حدیبیہ کے مقام پر پیش آنے والی پریشانیوں پر صبر و برداشت اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے صلہ کے طور پر تمہیں دی جا رہی ہے۔

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا

نے ہدایت اور دین حق دے کر اپنا رسول بھیجا تاکہ اسے باقی سب ادیان پر غالب[۴۴] کر دے۔ اور (اس حقیقت پر) اللہ کی گواہی کافی ہے۔(۲۸) محمد[۴۵] (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں[۴۶] پر تو سخت (مگر) آپس[۴۷] میں رحم دل ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود کرتے ہوئے اور اللہ کے فضل اور اس کی

[۴۴] اس آیت کی تشریح کے لئے سورہ توبہ کی آیت نمبر ۳۳ کا حاشیہ نمبر ۳۲ ملاحظہ فرمایئے۔

[۴۵] ❁ تحریر صلح پر اعتراضات:۔ جب صلح نامہ حدیبیہ لکھا جا رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے یوں لکھوانا شروع کیا: "محمد اللہ کے رسول کی جانب سے" تو اس پر کفار کے سفیر سہیل بن عمرو نے یہ اعتراض جڑ دیا کہ یہی بات تو سارے تنازعہ کی بنیاد ہے۔ ہم محمد (ﷺ) کو رسول اللہ (ﷺ) تسلیم کر لیں تو باقی جھگڑا ہی کیا رہ جاتا ہے؟ اس کے بجائے، محمد بن عبداللہ لکھو۔ اور آپ چونکہ ہر صورت صلح کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ ﷺ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھنے کو کہا۔ اس آیت میں ان کافروں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ ہی نے آپ ﷺ کو رسول ﷺ بنا کر اور ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے۔ اگر تم تسلیم نہیں کرتے تو نہ کرو۔ کسی وقت تمہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس رسول ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اور یہ کام ہو کر رہے گا۔ لہٰذا اس کے اللہ کا رسول ہونے پر اللہ کی گواہی ہی کافی ہے۔

[۴۶] ❁ صحابہ کے خصائل 'کافروں کے سامنے شان و شوکت کا مظاہرہ درست ہے:۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان کافروں سے تند مزاجی اور سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔ یا انہیں پیش آنا چاہئے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ کافروں سے کسی صورت دب کر نہیں رہتے، اصول دین کے معاملہ میں نہ وہ ان سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں، نہ بک سکتے ہیں، نہ نرم رویہ اختیار کرتے ہیں نہ ان کی دھمکیوں اور سازشوں سے مرعوب ہوتے ہیں بلکہ اس کے بجائے خود انہیں مرعوب رکھتے ہیں اور دور نبوی میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

❁ جنگ احد میں ابودجانہ کا کردار:۔ جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ ؓ سے پوچھا: آج میری تلوار کا حق کون ادا کرے گا؟ سیدنا ابودجانہ جو پہلوان تھے آگے بڑھ کر کہنے لگے: "میں کروں گا" چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں اپنی تلوار دے دی۔ انہوں نے ایک سرخ پٹی اپنے سر پر باندھ رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ تلوار لے کر بڑی شان اور فخر کے ساتھ کافروں کی طرف بڑھے اور بہت سے کافروں کو موت کے گھاٹ اتارتے جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کو یہ چال ہرگز پسند نہیں، مگر آج ابودجانہ کی یہ چال اللہ کو بہت پسند ہے" جب آپ خود چودہ سو صحابہ کے ہمراہ عمرۃ قضا کے لئے آئے۔ تو صحابہ کو طواف میں رمل کا حکم دیا۔ کیونکہ کافروں میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ مدینہ کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور بنا دیا ہے۔ اس لئے آپ نے طواف میں نوجوانوں کی طرح اکڑ کر آدمی دوڑ کی چال یعنی رمل کا حکم دیا۔ نیز آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر اپنی فوجی قوت اور شان و شوکت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ جس سے کفار مکہ اس قدر مرعوب ہوئے کہ مقابلہ کی ہمت ہی نہ کر سکے۔

[۴۷] ❁ صحابہ کی دوسری صفت:۔ صحابہ کرام ؓ کی اللہ تعالیٰ نے دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ آپس میں رحم دل اور نرم

مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ع

رضامندی کی تلاش کرتے ہوئے دیکھو گے (کثرت) سجدہ کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر [۴۸] امتیازی نشان موجود ہیں۔

ان کی یہی صفت تورات میں بیان ہوئی ہے اور یہی انجیل میں ہے جیسے ایک کھیتی ہو جس نے اپنی کونپل نکالی پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوئی اور اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی (اس وقت وہ) کسانوں کو خوش کرتی ہے۔ تاکہ کافروں کو ان کی وجہ سے [۴۹] غصہ دلائے۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ (۲۹)

گوشہ رکھتے ہیں۔ ان کی آپس میں ہمدردی اور غمگساری، تواضع اور خاطر ومدارت سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آپس میں حقیقی بھائی ہیں۔ بھلا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی مہربانی سے آپس میں بھائی بنا دیا ہو ان کی اخوت اور ایثار و مروت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ وہی قتل وغارت اور لوٹ مار کے رسیا لوگ جب اسلام لائے تو اسلام نے ان کی ایسی اخلاقی تربیت کی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں جہاں گرم ہونے کی ضرورت ہوتی فوراً گرم ہو جاتے اور جہاں نرم ہونے کی ضرورت ہوتی نرم پڑ جاتے تھے۔ ان کی باہمی محبت اور ایثار کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ یہاں یہ بحث چھیڑنا ممکن نہیں۔

[۴۸] ❁ تیسری صفت شب بیداری اور عبادت گزاری:۔ اس سے مراد یہ گٹہ کا نشان نہیں جو بعض نمازیوں کی پیشانیوں پر پڑ جاتا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ان کے چہرے کو دیکھ کر ایک عام انسان بھی یہ سمجھ جاتا ہے کہ کس قدر اللہ سے ڈرنے والے کریم النفس اور راست باز انسان ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو عبداللہ بن سلام نے جو اس وقت یہود کے بہت بڑے عالم تھے، آپ کا چہرہ دیکھ کر یہ کہہ دیا تھا کہ ''ایسا چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ چہرہ دراصل انسان کا آئینہ ہوتا ہے اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اکثر عقل مند اور جہاں دیدہ لوگ کسی کا چہرہ دیکھ کر ہی یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ فلاں آدمی کس قبیل کا آدمی ہو سکتا ہے۔ صحابہ ؓ کے چہروں کو دیکھ کر ہی یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ لوگ شب بیدار، عبادت گزار اور اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہیں اور تورات اور انجیل میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی جو صفات مذکور ہیں، وہ بھی ایسی ہی ہیں۔

[۴۹] ❁ چوتھی صفت ناگوار حالات میں اسلام کے پودے کو پروان چڑھانے والی جماعت:۔ یعنی مسلمان پہلے صرف ایک تھا اور وہ تھی رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس جو اپنی نبوت پر سب سے پہلے خود ایمان لائے۔ پھر ایک سے دو ہوئے، دو سے تین، تین سے سات۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اسلام کا پودا زمین سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل آنے کے بعد اس پر باد مخالف کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ جو آہستہ آہستہ مظالم کی تیز آندھیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ مگر یہ پودا مخالف ہواؤں کے باوجود اپنی جگہ پر برقرار رہا۔

پھلتا پھولتا اور بڑھتا رہا۔ مخالف ہوائیں جتنی تند و تیز ہوتیں اتنا ہی یہ پودا مضبوط جڑیں پکڑتا اور بلند ہوتا گیا حتیٰ کہ فتح مکہ کے دن یہ پودا ایک مضبوط اور تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ جوں جوں یہ پودا بڑھ رہا تھا۔ مخالف قوتیں اسے دیکھ کر جل بھن جاتی تھیں۔ مگر اس پودے کو لگانے والے، اس کی آبیاری اور نگہداشت کرنے والے اسے دیکھ کر اتنا ہی خوش ہو جاتے تھے اور پھولے نہ سماتے تھے اور جب یہ مضبوط درخت بن کر اپنی جڑوں پر استوار ہو گیا۔ اس وقت مخالف طاقتوں کو پوری طرح معلوم ہو گیا کہ اب وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ بلکہ اس کے سایہ تلے پناہ لینے کے بغیر اور کوئی چارہ باقی نہیں رہ گیا۔ اس درخت کی آبیاری اور نگہداشت کرنے والی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ مقدس جماعت تھی جو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے پھر عمر بھر دل و جان سے اس کی اطاعت کرتے اور اس کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ایسے لوگوں کا اللہ کے ہاں اجر بھی بہت زیادہ ہے جو ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو معاف کر کے انہیں جنت کے بلند درجات عطا فرمائے گا۔ اس آیت سے بعض علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے جلنے والا اور ان کے متعلق بغض اور کینہ رکھنے والا شخص کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

۱۸ آیاتھا   سورۃ الحجرات مدنیۃ   رکوعھا ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ①

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ

کلمات ۳۵۰   آیات ۱۸   (۴۹) سورۃ الحجرات مدنی ہے (۱۰۶)   رکوع ۲   حروف ۱۵۷۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش قدمی[1] نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔(۱) اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند[2] نہ کرو اور نہ ہی اس کے سامنے اس طرح اونچی آواز سے بولو جیسے تم ایک دوسرے سے بولتے ہو۔

[1] ❁ آپ ﷺ کا ادب و احترام:۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو بلکہ ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ اگر ابھی تک اللہ اور اس کے رسول نے کسی امر کا فیصلہ نہیں کیا تو اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔ اور اگر فیصلہ کر دیا ہے تو اسی کی اطاعت کرو۔ اس کے علاوہ دوسری راہیں نہ سوچو۔

❁ اجتہاد صرف اس وقت جائز ہے جب نص نہ ہو:۔ اس آیت سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جب کسی بات کے متعلق کتاب و سنت میں کوئی حکم مل جائے تو اس کے بعد اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اجتہاد صرف انہی امور میں ہو سکتا ہے کہ جب کتاب و سنت میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو۔

[2] یعنی جب تم نبی ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہو تو ان کا ادب و احترام ملحوظ رکھو۔ اس آیت کا شان نزول درج ذیل حدیث میں ملاحظہ فرمائیے:

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آوازیں بلند کرنے کی بنا پر دو نیک ترین آدمی تباہ ہونے کو تھے یعنی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جبکہ بنی تمیم کا ایک وفد (۹ ھ) میں آپ ﷺ کے پاس آیا (اور آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ان کا کوئی سردار مقرر فرما دیں) ان دونوں میں سے ایک نے اقرع بن حابس کی (سرداری) کا مشورہ دیا جو بنی مجاشع (بنو تمیم کی ایک شاخ) میں سے تھا اور دوسرے نے کسی دوسرے (قعقاع بن معبد) کے متعلق مشورہ دیا۔ نافع بن عمر کہتے ہیں کہ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ اس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ: ''آپ تو مجھ سے اختلاف ہی کرنا چاہتے ہیں'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ سے اختلاف نہیں کرنا چاہتا'' (بلکہ یہ مصلحت کا تقاضا ہے) اس معاملہ میں دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں کہ جب سے یہ آیت نازل ہوئی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اتنی آہستہ بات کرتے کہ آپ ﷺ کو ان سے پوچھنے کی ضرورت پیش آتی۔ لیکن انہوں نے یہ بات اپنے نانا (سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے متعلق نقل نہیں کی۔

بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ

ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال[۳] برباد ہو جائیں اور تمہیں اس کی خبر بھی نہ ہو(۲) جو لوگ اللہ کے رسول کے حضور اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ[۴] لیا ہے۔ ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔(۳) (اے نبی ﷺ!) جو لوگ آپ کو

(بخاری۔ کتاب التفسیر)

یہ ادب اگرچہ نبی ﷺ کی مجلس کے لئے سکھایا گیا اور اس کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا وہ لوگ تھے جو آپ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور یہ ادب اس لئے سکھایا گیا تھا کہ لوگ آپ ﷺ کو ایک عام اور معمولی آدمی نہ سمجھیں بلکہ وہ یہ سمجھیں کہ وہ اللہ کے رسول کی مجلس میں بیٹھے ہیں۔ تاہم اس حکم کا اطلاق ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے۔ جہاں آپ ﷺ کا ذکر ہو رہا ہو، یا آپ ﷺ کا کوئی حکم سنایا جائے یا آپ ﷺ کی احادیث بیان کی جائیں۔

[۳] ❁ آواز مقابلتاً پست ہونی چاہئے:۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر نبی سے بات کرنا ہو تو بھی نبی کی آواز سے تمہاری آواز بلند نہ ہونا چاہئے۔ نیز مسجد نبوی میں کوئی بات عام آواز سے زیادہ اونچی آواز سے نہ کی جائے۔ اس بے ادبی کی تمہیں یہ سزا مل سکتی ہے کہ تمہارے نیک اعمال برباد کر دیئے جائیں۔ اس آیت کا جو اثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہوا وہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ثابت بن قیس (بن شماس) کو (کئی روز تک اپنی صحبت میں) نہ دیکھا۔ ایک شخص (سعد بن معاذ) کہنے لگے: یارسول اللہ ﷺ! میں اس کا حال معلوم کر کے آپ کو بتاؤں گا" چنانچہ وہ گئے تو ثابت رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر سر جھکائے دیکھا اور پوچھا: "کیا صورت حال ہے؟" ثابت رضی اللہ عنہ کہنے لگے: برا حال ہے میری تو آواز ہی نبی ﷺ سے بلند ہوتی تھی میرے تو اعمال اکارت گئے اور اہل دوزخ سے ہوا" سعد رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور بتایا کہ وہ "تو یہ کچھ بتاتا ہے" موسیٰ بن انس کہتے ہیں۔ پھر ایسا ہوا کہ سعد رضی اللہ عنہ بن معاذ ایک بڑی بشارت لے کر دوسری بار ثابت بن قیس کے ہاں گئے۔ آپ ﷺ نے خود سعد رضی اللہ عنہ کو ثابت کے ہاں بھیجا اور کہا کہ اسے کہہ دو کہ: تم اہل دوزخ سے نہیں بلکہ اہل جنت سے ہو"

(بخاری۔ کتاب التفسیر)

یہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ خطیب انصار تھے۔ جب مسیلمہ کذاب مدینہ میں آپ ﷺ سے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کے تحت سمجھوتہ کرنے کی غرض سے آیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے انہی ثابت بن قیس کو اس سے گفتگو کے لئے مامور فرمایا تھا۔ ان کی آواز قدرتی طور پر بھاری اور بلند تھی۔ اس لئے آپ اس حکم سے ڈر گئے۔ آپ ﷺ نے انہیں اس لئے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا کہ وہ بے ادبی یا عدم احترام کی وجہ سے آواز بلند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ قدرتی طور پر ہی ان کی آواز بلند تھی۔

[۴] اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نبی کا ادب و احترام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پہلے تقویٰ کی بنا پر اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا امتحان دے چکے ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ نبی کا ادب و احترام کرنا ہی اس بات کا

يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ
خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا

حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔(۴) اگر یہ لوگ صبر کرتے تا آنکہ آپ[۵] ان کی طرف نکلتے تو یہ ان کے حق میں بہتر تھا۔ اور اللہ تعالیٰ معاف[۶] کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔(۵) اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تم نادانستہ کسی قوم[۷] کا نقصان کر بیٹھو

واضح ثبوت ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں تقویٰ موجود ہے اور ان کے اس عمل سے اللہ ان کے تقویٰ کو مزید بڑھاتا چلا جائے گا۔ اس آیت اور مذکور بالا احادیث سے صحابہ کی کمال فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

[۵] ❁ گھر سے بلانے میں ادب کے تقاضے ' نبی سے انداز گفتگو شائستہ ہونا چاہئے:۔ بنو تمیم کے کچھ لوگ عین دوپہر کے وقت آپ ﷺ کے ہاں آئے جب آپ ﷺ آرام فرما رہے تھے۔ اور زور سے چلانے لگے: یا محمد (ﷺ!) باہر ہمارے پاس آیئے۔ ہماری بڑی اچھی شہرت ہے اور ہماری برائی بڑی ہے"۔ ان کے پکارنے کے انداز سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بدو' غیر مہذب اور اجڈ قسم کے جنگلی لوگ تھے۔ جنہیں نہ گھر سے بلانے کا سلیقہ آتا تھا اور نہ گفتگو کرنے کا وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہی بہت کچھ سمجھتے تھے۔ غالباً یہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور اپنے قبیلے کے لئے ایک سردار کی تقرری کی درخواست لے کر آئے تھے۔ جیسا کہ اسی سورہ کے حاشیہ نمبر ۲ میں درج شدہ حدیث سے واضح ہوتا ہے۔ پھر یہ بات صرف انہی لوگوں پر ہی موقوف نہ تھی۔ اکثر بدو لوگ اسی بھونڈے انداز میں آپ کو گھر سے بلاتے اور گفتگو کرتے تھے اور آپ اپنی طبعی شرم و حیا کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ ایسے ناشائستہ، ان گھڑ اور بے وقوف قسم کے انسانوں کو اس آیت کے ذریعہ تنبیہ کی گئی ہے کہ جب وہ رسول سے مخاطب ہوں تو اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ جس سے وہ بات کرنا چاہتے ہیں وہ ایک عام آدمی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور اس کا نمائندہ ہے۔ جس کی شان دنیا کے افسروں اور بادشاہوں سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ اگر تم اس کی شان میں بے ادبی یا گستاخی کرو تو تمہیں اپنے ایمان ہی کی خیر منانی پڑے۔ لہٰذا تم لوگوں کے لئے رسول ﷺ کو گھر سے بلانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حجرہ کے باہر کھڑے ہو کر اندر اطلاع بھجواؤ یا مہذب طریقے سے آواز دو۔ پھر کچھ انتظار کرو۔ ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہوں۔ پھر جب وہ باہر آئیں تو جو کہنا ہو مہذب طریقہ سے بات کرو۔

[۶] یعنی اگر تم آئندہ ان آداب کو ملحوظ رکھو گے تو اللہ تمہاری سابقہ خطائیں معاف فرما دے گا۔

[۷] ❁ خبر کی تحقیق کی ضرورت اس صورت میں ہے جب خبر دینے والے کا کردار پوری طرح معلوم نہ ہو:۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنی مصطلق جب مسلمان ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو ان سے زکوٰۃ لینے کے لئے بھیجا۔ ولید بن عقبہ کے قبیلہ اور بنی مصطلق میں پہلے سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جب ولید بن عقبہ ان کے ہاں گئے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور واپس آ کر آپ سے کہہ دیا کہ وہ زکوٰۃ دینے سے انکاری ہیں۔ بلکہ وہ تو مجھے بھی قتل کر دینا چاہتے تھے۔ بعض لوگوں نے یہ رائے دی کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے ان پر چڑھائی کرنا چاہئے مگر آپ ﷺ اس معاملہ میں متامل تھے۔ اسی دوران بنی مصطلق کا سردار

بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِنْ

پھر تمہیں اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔(۶) اور خوب جان لو کہ تم میں اللہ کے رسول[۸] موجود ہیں۔ اگر اکثر معاملات میں وہ تمہاری باتیں مان لیا کریں تو تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ لیکن اللہ نے تمہیں ایمان کی محبت دی اور اس محبت کو تمہارے دلوں میں سجا دیا۔ اور کفر، عناد اور نافرمانی سے نفرت پیدا کر دی[۹]۔ ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔(۷) (اور یہ) اللہ کا فضل اور اس کا احسان ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔(۸)

حارث بن ضرار (ام المومنین سیدہ جویریہؓ کا والد) اتفاق سے آپ ﷺ کے ہاں آئے۔ تو انہوں نے بتایا کہ ولید بن عقبہؓ تو ہمارے ہاں گئے ہی نہیں تو ان کے قتل کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ ہم مسلمان ہیں اور زکوٰۃ دینے کو تیار ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ہمیں یہ روایت درست تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ کیونکہ آیت میں فاسق کا لفظ آیا ہے تو کیا ولید بن عقبہ فاسق (جس کا اگر نرم سے نرم زبان میں بھی ترجمہ کیا جائے تو ناقابل اعتماد آدمی ہی ہو سکتا ہے) تھے؟ اور اگر ایسی ہی بات تھی تو آپ انہیں زکوٰۃ کا محصل بنا کر کیسے بھیج سکتے تھے؟ لہٰذا اگر اس آیت اور اس واقعہ میں نسبت قائم نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ نیز اس واقعہ کے بغیر بھی اس آیت کا مفہوم صاف سمجھ میں آ رہا ہے۔ کیونکہ اکثر تنازعات اور لڑائی جھگڑوں کی ابتدا جھوٹی خبروں اور بے بنیاد افواہوں سے ہوتی ہے۔ اور جو لوگ جھوٹی خبریں دیں، یا ان کی بلا تحقیق تشہیر کریں وہ فاسق ہیں۔ سچے مومن ایسے کام نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جس شخص کی ذات پر اس کے سچا اور راست باز ہونے کا پورا اعتماد ہو اس کی خبر کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ ناواقف ہوں اور ان پر اعتماد کرنے کے ذرائع موجود نہ ہوں۔ ان کی خبر کو تحقیق کے بغیر تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو بعض دفعہ انسان ایسے فتنوں میں پڑ جاتا ہے۔ جن پر بعد میں پچھتانا بھی پڑتا ہے۔ اور نقصان بھی بہت ہو جاتا ہے اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔

[۸] ❁ اپنی خواہش کو حق کے پیچھے چلانے کی ادا سیکھو۔ یعنی تم لوگوں کے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ ایسی خبریں تم ان تک پہنچا دو اور خود رائے زنی نہ کرنے لگ جاؤ۔ بلکہ ان کے پیچھے پیچھے چلو جو وہ کہیں اسے تسلیم کرو۔ اگر وہ تمہارا مشورہ قبول نہیں کرتے تو اس کا برا نہ مانو۔ اگر وہ تم سب کے مشورے اور آراء قبول کرنے لگیں تو تمہاری بھی آراء آپس میں مختلف اور متضاد ہوتی ہیں۔ اس صورت میں تو تم پر اور کئی مصیبتیں پڑ جائیں گی۔ لہٰذا حق کو اپنی خواہشات کے پیچھے نہ چلاؤ۔ بلکہ اپنی خواہشات اور آراء کو حق کے تابع کر دینے کی ادا سیکھو۔

[۹] تم پر یہ اللہ کی خاص مہربانی ہے کہ تمہیں کفر اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کے کاموں سے نفرت ہو چکی ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان اور رسول ﷺ کی اطاعت میں تم راحت اور خوشی محسوس کرتے ہو۔ لہٰذا معاشرتی آداب کے

طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا
الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں[۱۰] تو ان کے درمیان صلح[۱۱] کرا دو۔ پھر اگر ان میں سے کوئی فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو[۱۲]۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان انصاف سے صلح کرا دو اور انصاف کیا کرو۔ کیونکہ اللہ انصاف

سلسلہ میں ان ہدایات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا کرو جو تمہیں اب دی جا رہی ہیں۔ اسی صورت میں تم ہدایت یافتہ ہو سکتے ہو۔

[۱۰] آپس میں لڑائی کرنا مومنوں کا کام نہیں:۔ اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑنا مومنوں کا کام نہیں۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

(۱) سیدنا ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے: "جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر لڑ پڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں" میں نے پوچھا: "یہ تو رہا قاتل مگر مقتول کا کیا قصور؟" فرمایا: "وہ بھی تو اپنے ساتھی کے قتل پر حریص تھا" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب وان طائفتان ...... مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب اذا توجه المسلمان بسیفهما)

(۲) احنف بن قیس کہتے ہیں کہ میں اس شخص کی مدد کرنے چلا۔ (راستہ میں) مجھے ابوبکرہؓ ملے اور پوچھا: "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا: "اس شخص کی مدد کرنے" ابوبکرہؓ کہنے لگے: "واپس چلے جاؤ۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر لڑ پڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں" میں نے پوچھا: "یارسول اللہ ﷺ یہ تو ہوا قاتل مگر مقتول کا کیا قصور؟" فرمایا: وہ بھی تو اپنے ساتھی کے قتل پر حریص تھا" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب المعاصی من امر الجاهلیة) (مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب اذا توجه المسلمان بسیفهما)

[۱۱] طائفہ کا لغوی مفہوم:۔ یعنی ان پیش بندیوں کے باوجود اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں لڑ پڑیں تو پوری کوشش کرو کہ ان کا اختلاف رفع ہو جائے اور ان میں صلح ہو جائے۔ واضح رہے کہ یہاں طائفہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور طائفہ عموماً چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مفسرین کے خیال کے مطابق اس لفظ کا اطلاق ایک فرد پر بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر دو مسلمانوں میں لڑائی ہو۔ تب بھی یہی حکم ہے اور یہ تو واضح ہے کہ صلح کرنے والا کوئی غیر جانبدار ہی ہو سکتا ہے۔ خواہ یہ ایک آدمی ہو یا کوئی جماعت ہو۔ پھر صلح کرانے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فریقین پر اثر انداز ہو سکتا ہو۔

[۱۲] مسلمانوں میں صلح کرنا اور عدل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:۔ یعنی اگر کوئی شخص اکیلا فریقین پر اثر انداز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ تو باہم مل کر بھی تمہیں یہ کام کرنا چاہئے' بیٹھ نہ رہنا چاہئے سب سے پہلے حالات اور اختلاف کا جائزہ لو اور دیکھو کہ کونسا فریق حق پر ہے اور کونسا زیادتی کر رہا ہے۔ اب یہ تو واضح ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے کبھی نہیں بجتی۔ زیادتی کرنے والے کے پاس بھی کچھ تھوڑا بہت حق موجود ہوتا ہے اور جو حق پر ہے اس سے بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لہٰذا پہلے یہ تشخیص کرنا ہوگی کہ زیادہ حق کس طرف ہے اور زیادتی کا مرتکب کون ہے؟

پھر صلح کرانے والی جماعت کو زیادہ حق والے کا ساتھ دینا ہوگا اور اس طرح فریقین پر صلح کے لئے دباؤ ڈالنا ہوگا۔ اور زیادتی کرنے والے پر اتنا دباؤ ڈالنا ہوگا کہ وہ اپنی زیادتی کا اعتراف کرے اور اس سے رجوع کر کے حق بات تسلیم کرے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے تو پھر یہ نہ کرنا چاہئے کہ حق والے فریق میں یک طرفہ فیصلہ دے کر زیادتی کرنے والے فریق کو پوری طرح دبانے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے اور زیادتی کرنے والے کے پاس بھی کچھ تھوڑا بہت حق تھا تو فیصلہ کے وقت ان باتوں کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔ کیونکہ یہی بات اقرب الی الحق اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

❁ شاس بن قیس یہودی کا اوس و خزرج کو لڑانا:۔ واضح رہے کہ بسا اوقات دونوں ہی فریق حق پر ہوتے ہیں اور ان کی لڑائی کا سبب کوئی بیرونی دشمن یا بیرونی مداخلت ہوتی ہے۔ عہد نبوی میں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب جنگ بدر میں مسلمانوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی تو یہود مدینہ کو اس بات سے سخت صدمہ پہنچا۔ ایک بڈھے یہودی شاس بن قیس نے اس مصیبت کا یہ حل سوچا کہ اوس و خزرج میں از سر نو جنگ بپا کر دی جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک نوجوان یہودی کو تیار کیا کہ انصار کی مجالس میں جا کر جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ دے اور اس سلسلہ میں اوس و خزرج کی طرف سے جو اشعار کہے گئے تھے انہیں پڑھ پڑھ کر سنائے اور جاہلی عصبیت کو ہوا دے۔ جب اس یہودی نے یہ اشعار پڑھے تو فوراً اوس اور خزرج کے جاہلی دور کے معاندانہ جذبات بھڑک اٹھے تو تو، میں میں شروع ہو گئی اور نوبت بایں جا رسید کہ ایک فریق دوسرے سے کہنے لگا اگر تم چاہو تو ہم پھر اس جنگ کو جوان کر کے نمٹا دیں۔ پھر ہتھیار کی آوازیں آنے لگیں اور قریب تھا کہ ایک خوفناک جنگ چھڑ جاتی۔

❁ آپ کا ان میں صلح کرانا:۔ رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی گئی تو آپ چند مہاجرین کو ساتھ لے کر فوراً موقعہ پر پہنچ گئے اور فرمایا: مسلمانو! میری موجودگی میں جاہلیت کی یہ پکار! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کی طرف ہدایت دی اور تمہارے دلوں کو جوڑ دیا۔ پھر اب یہ کیا ماجرا ہے؟ اس وقت ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ کس طرح شیطانی چال میں پھنس چکے تھے۔ ان کی آنکھیں کھل گئیں پھر اوس و خزرج کے لوگ آپس میں گلے ملنے اور رونے لگے۔

❁ غزوہ بنی مصطلق میں عبداللہ بن ابی کا انصار و مہاجرین کو لڑانا:۔ اس کی دوسری مثال وہ فتنہ ہے جو غزوہ بنی مصطلق سے واپسی سفر کے درمیان عبداللہ بن ابی منافق نے مہاجرین اور انصار کے درمیان کھڑا کر کے ان کو باہم لڑ مرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل سورۂ منافقون میں آئے گی۔ اس موقعہ پر بھی رسول اللہ ﷺ نے فوراً موقع پر پہنچ کر معاملہ رفع دفع کرا کر صلح کرا دی تھی۔

❁ اگر صلح نہ کرا سکے تو غیر جانبدار رہے:۔ اور اس آیت کا سب سے بڑا مصداق سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر معاویہ کے درمیان جنگیں تھیں۔ اور ان جنگوں کا باعث ایک باغی فرقہ تھا۔ چونکہ یہ دونوں فریق سیاسی لحاظ سے بڑے طاقتور تھے۔ لہٰذا کوئی ایسی جماعت پیدا نہ ہو سکی جو ان میں صلح کرا سکتی۔ اس لئے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے بھی تھے جو ان جنگوں میں غیر جانبدار رہنا ہی غنیمت سمجھتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا دوسری حدیث سے سیدنا ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ انہی جنگوں کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اور ان جنگوں میں بہت سے صحابہ غیر جانبدار رہے اور لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔

الْمُقْسِطِيْنَ ۝۹ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۰ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ
يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ

کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(۹) مومن تو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح[۱۳] کرا دیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔(۱۰) اے ایمان والو! (تمہارا) کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق[۱۴] نہ اڑائے۔ ہو سکتا ہے[۱۵] کہ وہ مذاق اڑانے والوں سے بہتر ہوں۔ نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور ایک دوسرے پر طعنہ زنی[۱۶] نہ کرو۔ اور نہ ہی ایک دوسرے کے برے نام[۱۷] رکھو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا[۱۸] بہت بری بات ہے

[۱۳] لڑائی کی روک تھام:۔ یعنی جب تم صلح کرانے لگو تو اس بات کو ملحوظ رکھو کہ تم دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا رہے ہو۔ لہٰذا پورے عدل و انصاف کو ملحوظ رکھ کر اور اللہ سے ڈرتے ہوئے یہ کام اس طرح سرانجام دو کہ نہ کسی فریق کی حق تلفی ہو اور نہ ہی کسی پر زیادتی ہو۔ اگر تم ان کے درمیان عدل و انصاف سے صلح کرا دو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر مہربانی فرمائے گا۔ اور یہ مہربانی انفرادی طور پر صلح کرانے والی جماعت پر بھی ہو سکتی ہے۔ اور اجتماعی طور پر بھی یعنی اللہ تمہاری جماعت کو اس کا شیرازہ بکھرنے سے بچائے گا اس کی ساکھ بحال اور قوت برقرار رہے گی۔

یہ آیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کر دیتی ہے۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہو دوسرے سب مسلمان اسے اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ ایسا رشتہ اخوت اور کسی دین یا مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

[۱۴] مذاق اڑانے سے پرہیز:۔ اس آیت میں ایسے معاشرتی آداب سکھائے جا رہے ہیں جو عموماً لڑائی جھگڑے کا سبب بنتے ہیں۔ مذاق اڑانے کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک مذہبی یا نظریاتی اختلاف کا ہونا دوسرے مخاطب کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھنا۔ خواہ کوئی بھی صورت ہو مذاق اڑانے سے چونکہ لڑائی جھگڑے کا امکان ہے۔ لہٰذا لڑائی جھگڑے کے ان ابتدائی لوازمات سے بھی روک دیا گیا۔

[۱۵] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مرد، مردوں کا مذاق نہ اڑائیں اور نہ عورتیں عورتوں کا، یہ نہیں فرمایا مرد عورت کا مذاق نہ اڑائے یا عورت کسی مرد کا مذاق نہ اڑائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مخلوط سوسائٹی یا آزادانہ اختلاط مرد و زن کا تصور ہی مفقود ہے۔

[۱۶] طنز اور طعنہ سے اجتناب:۔ لَمز بمعنی کسی شخص کے کسی فعل یا حرکت میں عیب جوئی کرنا۔ جیسے پھبتیاں کسنا، کسی کی نقلیں اتارنا، اشارے کرنا، یا زیر لب کسی کو نشانہ ملامت بنانا یا طنزیہ بات اور چوٹیں کرنا سب کچھ اس لفظ کے معنی میں داخل ہے۔ اس قسم کی حرکتیں چونکہ معاشرتی تعلقات کو بگاڑ دیتی ہیں۔ لہٰذا ان کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

[۱۷] لقب کا مفہوم اور قسمیں:۔ لقب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو پسند ہوتے ہیں اور ان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ

الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿١١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ

اور جو لوگ ان باتوں سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔ (۱۱) اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے پرہیز[۱۹] کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

انسان خود اپنے لئے کوئی پسندیدہ سا لقب اختیار کر لیتا ہے اور دوسری صورت یہ کہ کوئی دوسرا ایسا لقب رکھ دیتا ہے۔ جیسے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا لقب صدیق یا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا لقب فاروق تھا۔ دوسرے وہ جو مذموم ہوتے ہیں اور ایسے لقب عموماً حریف یا فریق مخالف یا دشمن رکھ دیتے ہیں اور یہ صرف اس کی تحقیر یا اس کو چڑانے کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے القاب سے پکارنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ بطور گالی یا تمسخر کسی کو فاسق یا یہودی کہا جائے یا اس کے ایسے جرم سے منسوب کیا جائے جسے وہ چھوڑ چکا ہو جیسے کسی کو ایمان لانے اور توبہ کر لینے کے بعد زانی، چور یا ڈاکو وغیرہ کہا جائے۔ ایسی سب باتیں فتنہ فساد اور لڑائی کا موجب بن جاتی ہیں۔ اسی لئے ان سے منع کر دیا گیا ہے اور ایسے کام کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: "جو شخص کسی مسلمان کو فاسق یا کافر کہے اور در حقیقت وہ کافر یا فاسق نہ ہو تو خود کہنے والا شخص فاسق یا کافر ہو جائے گا" (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب ما ینھی من السباب و اللعن)

❁ برے نام رکھنے یا بلانے کی ممانعت:۔ اور بعض دفعہ کسی شخص کا ایسا لقب رکھ دیا جاتا ہے جس میں نہ اس کی تحقیر ہوتی ہے اور نہ وہ خود اسے برا سمجھتا ہے بلکہ وہ محض تعارف کے طور پر ہوتا ہے۔ جیسے دور نبوی میں ایک صحابی کا اس کے لمبے ہاتھوں کے وجہ سے نام ہی ذوالیدین پڑ گیا تھا۔ ایسے ہی عبداللہ طویل یا نابینا حکیم وغیرہ کہنے میں کچھ حرج نہیں۔ (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب مایجوز من ذکر الناس......)

[۱۸] یعنی مندرجہ بالا سب کام فسق کے کام ہیں۔ کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ وہ ایمان لانے کے بعد بھی ایسے کام کرتا رہے۔ اور اگر کوئی ایسی باتوں میں نامور اور مشہور بھی ہو جائے تو یہ تو بہت ہی بری بات ہے۔

[۱۹] ❁ سوئے ظن سے پرہیز:۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ گمان کرنے سے بچو بلکہ یوں فرمایا کہ زیادہ گمان کرنے سے بچو۔ کیونکہ گمان تو ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور اگر ظن و گمان کو عادت بنا لیا جائے تو یہ بہت بری بات ہے کیونکہ اکثر ظن بدظنی پر مشتمل ہوتے ہیں اور کسی سے سوئے ظن رکھنا بذات خود گناہ کبیرہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر شخص سے حسن ظنی رکھی جائے تاآنکہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جو حسن ظن کو بدظنی میں تبدیل کر دے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی برا خیال پیدا ہو جائے تو جب تک زبان سے اس کا اظہار نہ کرے وہ قابل مواخذہ نہیں ہے۔ اس آیت میں دراصل اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جس شخص سے ان کا کوئی اختلاف یا جھگڑا ہو اس کی اچھی باتوں میں سے بھی کوئی برا پہلو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی معاملہ میں چار پہلو حسن ظنی کے ہوں اور ایک پہلو بدظنی پر محمول کیا جا سکتا ہو تو ان کی نظر ہمیشہ بدظنی کے پہلو کی طرف اٹھے گی۔ ایسے لوگ عموماً عام لوگوں کے متعلق حسن ظن کے بجائے کوئی بری بات ہی سوچنے کے عادی ہوتے ہیں۔

بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا

اور کسی کی عیب [۲۰] جوئی نہ کرو، نہ ہی تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت [۲۱] کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ تم تو خود اس کام کو ناپسند کرتے ہو

[۲۰] ❁ کسی کی ٹوہ لگانے سے پرہیز:۔ تجسس کا تعلق عموماً ایسے افعال سے ہوتا ہے جو یا تو کبھی سرزد ہی نہ ہوئے ہوں اور یا ظاہر نہ ہوئے ہوں۔ مثلاً کسی کی ٹوہ لگائے رکھنا یا کسی کے گھر میں جھانکنا، چوری چھپے کسی کی باتیں سننا، کسی کے خطوط دیکھنا یا درمیان میں ٹیلی فون کی گفتگو سننا وغیرہ۔ سب اسی ذیل میں آتے ہیں۔ جبکہ ایسے کاموں کا مقصد کوئی ایسی بات معلوم کرنا ہو جس سے اسے بدنام اور بے عزت کیا جاسکے۔ ایسی جاسوسی سے ممانعت کا حکم صرف اشخاص کے لئے ہی نہیں اسلامی حکومت کے لئے بھی ہے۔ اسلامی حکومت کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں کی برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر منظر عام پر لائے اور پھر انہیں سزا دے۔ بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جو برائیاں ظاہر ہو جائیں، طاقت کے ذریعہ ان کا استیصال کرے۔ البتہ وہ کسی مجرم کی تحقیق کے سلسلہ میں ایسے کام کر سکتی ہے۔ اور جو برائیاں ظاہر نہ ہوں بلکہ مخفی یا گھروں کے اندر ہوں تو ان کا علاج جاسوسی نہیں بلکہ ان کی اصلاح تعلیم، وعظ و تلقین، عوام کی اجتماعی تربیت اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا کرنے سے کی جائے گی۔

[۲۱] ❁ غیبت سے اجتناب:۔ غیبت کی تعریف جو رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو" صحابہ نے عرض کیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو پھر؟ آپ نے فرمایا: "اگر اس میں وہ بات پائی جائے تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ بات موجود نہ ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا" (مسلم۔ کتاب البر والصلة والادب. باب تحريم الغيبة) اور یہ تو واضح بات ہے کہ بہتان غیبت سے بھی بڑا جرم ہے اور غیبت خواہ کسی زندہ انسان کی، اس کی پیٹھ پیچھے کی جائے یا کسی فوت شدہ انسان کی، جرم کی نوعیت کے لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں۔

غیبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا۔ کیونکہ غیبت کرنے والا اس کی عزت پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جیسے اسے کاٹ کاٹ کر کھا رہا ہو اور مردہ اس لئے فرمایا کہ جس کی غیبت کی جارہی ہے وہ پاس موجود نہیں ہوتا۔

❁ غیبت کی حرمت سے استثناء کی صورتیں:۔ البتہ بعض اہم ضرورتوں کے پیش نظر شریعت نے چند صورتوں کو اس حرمت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ مثلاً:۔

ا۔ مظلوم حاکم کے سامنے ظالم کی غیبت بیان کر کے ظلم کی فریاد کر سکتا ہے۔ اور اس کی بنیاد سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۴۸ ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر عدالت کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔ مظلوم کو عام لوگوں کے سامنے بلاضرورت اور تحقیر کی خاطر بھی ظالم کی غیبت کرنا یا اپنے ظلم کی داستان بیان کرنا جائز نہیں۔ پھر جس طرح ایک مظلوم عدالت کے سامنے ظالم کی غیبت بیان کر سکتا ہے۔ اسی طرح استفتاء کی صورت میں مفتی کے سامنے بھی بیان کر سکتا ہے۔

۲۔ کسی شخص کے شر سے بچنے کے لئے اپنے مومن بھائی کو اس کے عیب و ثواب سے مطلع کر دینا تاکہ وہ اس کے شر یا اپنے نقصان سے بچ سکے۔ مثلاً کوئی شخص رشتہ کرنا چاہتا ہو، یا کسی سے کاروباری اشتراک کرنا چاہتا ہو یا کسی کے ہمسایہ میں مکان خریدنا چاہتا ہو یا اسے قرضہ دینا یا امانت سونپنا چاہتا ہو اور وہ اپنے کسی دوسرے بھائی سے مشورہ لے۔ تو مشورہ دینے والے کو نہایت

فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ
شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ

اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ ہر وقت توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے۔ (۱۲) اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے اس لئے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (ورنہ) اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل عزت وہی ہے جو تم میں سے زیادہ[۲۲] پرہیز گار ہو۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔ (۱۳) بدویوں نے کہا:

دیانتداری سے متعلقہ شخص کے عیب و ثواب بیان کر دینے چاہئیں تاکہ وہ کسی دھوکہ میں نہ رہے اور اس کی بنیاد یہ حدیث ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ میں نے انصار کی ایک عورت سے عقد کیا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "تم نے اس کو دیکھا بھی ہے؟" اس نے کہا، نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جا اور اسے دیکھ لے اس لئے کہ انصار کی عورتوں کی آنکھوں میں کچھ (عیب) ہوتا ہے" (مسلم۔ کتاب النکاح۔ باب ندب من اراد نکاح امراۃ)

۳۔ محدثین کا قانون جرح و تعدیل۔ جس پر تمام ذخیرہ حدیث کی جانچ پرکھ کا انحصار ہے اور جس کے ذریعہ عامۃ المسلمین کو عام گمراہی سے بچانا مقصود ہے۔ اس صورت میں راویوں کے عیب و ثواب بیان کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بالاتفاق واجب ہے۔ اور اس کی بنیاد بھی وہی حدیث ہے جو اوپر بیان ہوئی نیز اس سورۃ کی آیت نمبر ۶ بھی۔ یعنی فاسق کی خبر کی تحقیق ضروری ہے۔

۴۔ ایسے لوگوں کے خلاف علی الاعلان آواز بلند کرنا اور ان کی برائیوں پر تنقید کرنا جو فسق و فجور پھیلا رہے ہیں یا بدعات اور گمراہیوں کی اشاعت کر رہے ہوں۔ یا خلق خدا کو بے دینی اور ظلم و جور کے فتنوں میں مبتلا کر رہے ہوں۔

[۲۲] ❁ اقوام کی لڑائی جھگڑوں کی بنیاد اور ان کا سدباب:۔ موجودہ دور میں قوم، وطن، نسل، رنگ اور زبان یہ پانچ خدا یا معبود بنا لئے گئے ہیں۔ انہی میں سے کسی کو بنیاد قرار دے کر پوری انسانیت کو کئی گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جو آپس میں ہر وقت متحارب اور ایک دوسرے سے لڑتے مرتے رہتے ہیں۔ کسی کو قومیت پر ناز ہے کہ وہ مثلاً جرمن یا انگریز قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی سفید رنگ کی نسل ہونے پر فخر کرتا ہے۔ کوئی سید اور فاروقی یا صدیقی ہونے پر ناز کرتا ہے۔ گویا ان چیزوں کو تفاخر و تنافر کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ سب انسان ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ یہ آیت ایسے معبودوں یا بالفاظ دیگر فتنہ و فساد اور لامتناہی جنگوں کی بنیاد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔

❁ برتری کی بنیاد صرف تقویٰ ہے:۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو تمہارے قبیلے اور قومیں اس لئے بنائے تھے کہ تم ایک دوسرے سے الگ الگ پہچانے جا سکو، مثلاً دو شخصوں کا نام زید ہے اور دونوں کے باپ کا نام بکر ہے۔ تو الگ الگ قبیلہ یا برادری سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان میں امتیاز ہو جائے، لیکن تم نے یہ کیا ظلم ڈھایا کہ ان چیزوں کو تفاخر و تنافر کا ذریعہ بنا لیا۔ کوئی نسل کی بنیاد پر شریف اور اعلیٰ درجہ کا انسان بن بیٹھا اور دوسروں کو حقیر، کمینہ اور ذلیل سمجھنے لگا تو کوئی قوم اور وطن یا رنگ اور زبان کی بنیاد پر بڑا بن بیٹھا ہے۔ ان سب چیزوں کے بجائے اللہ تعالیٰ نے عزو شرف کا معیار تقویٰ قرار دیا۔ یعنی جتنا کوئی شخص گناہوں سے بچنے والا اور اللہ سے ڈرنے والا ہو گا۔ اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک معزز و محترم ہو گا۔ اسی مضمون کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں، جو نہایت اہم دستوری دفعات پر مشتمل تھا، یوں بیان فرمایا کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر، کسی

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ

"ہم ایمان لے آئے[۲۳] ہیں" آپ ان سے کہئے: "تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے اور ابھی تک ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال[۲۴] سے کچھ بھی کمی نہیں کرے گا۔ اللہ یقیناً بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۱۴)

(حقیقی) مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے[۲۵]

عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔ کیونکہ تم سبھی آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔

[۲۳] ❁ بدوی منافق قبائل کا اسلام کیسا تھا؟ یہ بدوی وہی لوگ تھے جو قبیلہ غفار، مزینہ، جہینہ، اسلم اور اشجع سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے نفاق کی وجہ سے غزوہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے۔ تھے اور جب آپ ﷺ اس غزوہ سے واپس آئے تو حیلے بہانے تراش کر اپنے لئے استغفار کی التجا کر رہے تھے۔ ان کا ذکر سورہ احزاب کی آیت نمبر ۱۱ تا ۱۶ میں گزر چکا ہے۔ یہ لوگ کلمہ شہادتین پڑھ کر مسلمان تو ہوگئے تھے اور ارکان اسلام بھی بجالاتے تھے۔ مگر ایمان ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا۔ انہیں آسان اور میٹھا میٹھا اسلام تو گوارا تھا لیکن وہ اس کے لئے کوئی مالی یا جانی قربانی پیش کرنے یا مشکلات برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔

❁ اسلام اور ایمان میں فرق:۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور چیز ہے اور اسلام اور چیز ہے۔ حدیث جبریل سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ جب جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ "ایمان یہ ہے کہ تو اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں اور رسولوں کا یقین رکھے اور اس بات کا بھی کہ مر کر دوبارہ زندہ ہونا ہے" اور جب جبریل نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تو صرف اللہ کی عبادت کرے اور اس کا شریک نہ بنائے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب سؤال جبریل النبی ﷺ......)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کا تعلق دل کے افعال سے ہے اور اسلام کا ظاہری اعمال سے۔ یہ ان میں فرق کا پہلو ہے اور مماثلت کا پہلو یہ ہے کہ اگر ارکان اسلام کو باقاعدہ اور خلوص نیت سے ادا کیا جائے تو اس سے ایمان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ایمان میں اضافہ سے ظاہری اعمال میں حسن پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ایمان اور اسلام ایک دوسرے کے مؤید اور لازم و ملزوم بن جاتے ہیں۔ منافقوں میں کمی یہ ہوتی ہے کہ ان کے اعمال میں نہ خلوص ہوتا ہے اور نہ حسن عمل لہٰذا ان کا ایمان شہادتین کے اقرار سے آگے بڑھتا ہی نہیں یعنی ایمان یا یقین ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوتا۔ اسی بات کو اللہ نے ایمان نہ لانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

[۲۴] یعنی اب بھی اگر تم اپنا رویہ درست کر لو اور دل وجان سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے لگو تو اللہ تمہارے سابقہ اعمال کا اجر تمہیں دے دے گا۔ اس میں کچھ کمی نہ کرے گا۔ اور تمہاری سابقہ خطائیں بھی معاف فرما دے گا۔

[۲۵] اس آیت میں مومنوں اور منافقوں کا تقابل پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ حقیقی مومن اللہ، اس کے وعدوں اور اس کے رسول پر

لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾
قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ
هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع ۲ / ۱۴

اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی سچے (مسلمان) ہیں۔(۱۵) آپ ان (بدویوں) سے کہئے: کیا تم اللہ کو اپنی دینداری جتلاتے [۲۶] ہو حالانکہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔(۱۶) وہ آپ پر یہ احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے۔ آپ ان سے کہئے: "اپنے اسلام لانے کا مجھے احسان نہ جتلاؤ۔ بلکہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے کہ تمہیں ایمان کی ہدایت دے [۲۷] دی۔ اگر (فی الواقع) تم (اپنی بات میں) سچے ہو۔(۱۷) اللہ آسمانوں اور زمین کی سب پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔(۱۸)

پوری طرح یقین رکھتے ہیں۔ وہ مفاد پرست نہیں ہوتے لہٰذا جو کچھ اللہ اور اس کا رسول کہے فوراً اس کی اطاعت کرتے اور بوقت ضرورت جان و مال کی قربانیاں بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اور منافقوں کی طرح حیلوں بہانوں سے فرار کی راہ اختیار نہیں کرتے۔ ایسے ہی لوگ راستباز ہوتے ہیں۔

[۲۶] ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہا یہ تھا کہ ہم اسلام لے آئے اور ان کا یہ اسلام لانا چڑھتے سورج کو سلام کرنے کے مترادف تھا۔ وہ اسلام لا کر اپنے جان و مال کی حفاظت اور اموال غنائم سے اپنا حصہ طلب کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جیسا تم اسلام لا رہے ہو۔ اللہ کو اس کا ٹھیک پتا ہے اور جن اغراض کے تحت لا رہے ہو وہ بھی معلوم ہے۔

[۲۷] ❁ بدوی قبائل کن اغراض کے تحت اسلام لائے تھے؟ ایسے بدو دراصل اسلام لا کر احسان یہ جتلاتے تھے کہ ہم از خود ہی مطیع بن کر اور اسلام لا کر آپ کے پاس حاضر ہو گئے ہیں اور آپ کو ہمارے خلاف لشکر کشی نہیں کرنا پڑی۔ اور اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اب ہماری طرف توجہ فرمائیے اور اموال غنائم میں سے ہمیں بھی کچھ مال دیجئے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا کہ انہیں کہہ دیجئے۔ کہ اگر اسلام لائے ہو تو اپنی ہی ذاتی اغراض کے لئے لائے ہو، ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہوتا جو دوسرے کافروں کا ہو رہا ہے۔ اس اسلام لانے کا مجھ پر کیا احسان دھرتے ہو؟ بلکہ یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں اسلام لانے کی توفیق دی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے تمہارے جان و مال محفوظ ہو گئے اور پٹائی نہیں ہوئی۔ یہ تم کیا الٹی گنگا بہا رہے ہو؟ اور دیکھو اگر تم فی الواقع سچے ایماندار ہوتے تو تمہیں یہ بات کہتے بھی شرم آنی چاہئے تھی۔ جیسے ایک بادشاہ اگر کسی کو ملازم رکھ لے تو یہ بادشاہ کا ملازم پر احسان تو ضرور ہوتا ہے مگر ملازم اسے کسی صورت یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہاری خدمت کر کے تم پر احسان کر رہا ہوں۔

٤٥ آیاتها سُورَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۞ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۞
ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۞ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ

کلمات ۳۷۶ آیات ۴۵ (۵۰) سورۃ ق مکی ہے (۳۴) رکوع ۳ حروف ۱۵۲۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ق۔ قسم ہے اس قرآن کی جو بڑی شان[۱] والا ہے۔(۱) بلکہ[۲] یہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ انہی میں سے ایک ڈرانے[۳] والا ان کے پاس آیا ہے۔ چنانچہ کافروں نے کہا کہ: یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔(۲) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی بن جائیں گے (تو پھر دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟) یہ واپسی[۴] تو (عقل سے) بعید ہے۔(۳) ہم جانتے ہیں کہ زمین ان (کے مردہ اجسام) میں سے کیا کچھ کم کرتی[۵] ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ

[۱] ❁ قرآن کی شان:۔ شان والا اس لحاظ سے ہے کہ دنیا میں کوئی کتاب اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتی، نہ مضامین کے لحاظ سے، نہ اسرار و رموز کے لحاظ سے اور نہ کثیر الاشاعت ہونے کے لحاظ سے۔ پھر اس کی شان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں جتنا بھی غور کیا جائے، نئے سے نئے اسرار کھلتے جاتے ہیں اور ہر انسان خواہ وہ علمی لحاظ سے کس درجہ کا آدمی ہو اس سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ نہ اس سے مبتدی بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی علامۂ دہر۔

[۲] ایسے شان والے قرآن کی جس بات یا جن باتوں پر قسم کھائی جا رہی ہے وہ عبارت یہاں محذوف ہے۔ اور اسے مخاطبین یعنی کفارِ مکہ کے فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کفارِ مکہ کا سارا جھگڑا دو باتوں پر تھا۔ ایک وہ آپ ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ دوسرے آخرت کے منکر تھے۔ اور قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ قرآن کے دلائل اور اس کی داخلی شہادتیں اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دونوں باتیں درست ہیں۔

[۳] ❁ کفار کا پہلا اعتراض رسول انہیں میں سے کیوں ہے؟ دور نبوی ﷺ سے پہلے صرف عرب ہی نہیں ساری دنیا میں فتنہ و فساد پھیلا ہوا تھا۔ اب تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان حالات میں انسانوں کی ہدایت کے لئے کوئی نبی یا ڈرانے والا نہ بھیجتا۔ جبکہ یہ لوگ اس بات پر متعجب ہیں کہ اللہ نے ڈرانے والا کیوں بھیج دیا؟ دوسرا تعجب انہیں اس بات پر ہے کہ ڈرانے والا اگر آیا ہے تو کوئی غیر انسان یا فرشتہ کیوں نہیں آیا؟۔ اور تیسرا تعجب انہیں اس بات پر تھا کہ اگر ڈرانے والا انسان ہی آنا تھا تو انہی کے قبیلہ اور قوم میں سے اور عربی زبان جاننے والا کیوں آیا ہے کوئی چینی یا جاپانی یا انگریز کیوں نہیں آیا؟ حالانکہ تعجب تو ایسی غیر معقول باتوں پر آنا چاہئے۔ جو کفارِ مکہ کر رہے ہیں۔

[۴] ❁ بعث بعد الموت:۔ یہ کفارِ مکہ کا دوسرا اعتراض یا انکار ہے جو بعث بعد الموت سے تعلق رکھتا ہے کہ جب انسان مر کر مٹی میں مل جائے گا اور مٹی ہی بن جائے گا تو اس کے دوبارہ جی اٹھنے کا معاملہ عقل سے بھی بعید ہے، قیاس کے بھی اور عادت کے بھی خلاف ہے۔ لہٰذا ہم اسے تسلیم نہیں کر سکتے۔

[۵] ❁ دوسرے اعتراض کا جواب:۔ حالانکہ ان کا یہ اعتراض محض ان کی کم عقلی اور عدم معرفتِ الٰہی کی بنا پر ہے۔ وہ اللہ کے علم

حَفِيظٌ ﴿٤﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ ﴿٥﴾ أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ﴿٦﴾ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ

محفوظ ہے(۴) بلکہ جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ چنانچہ یہ لوگ ایک الجھی ہوئی بات[۶] میں پڑ گئے(۵) کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کس طرح اسے بنایا[۷] اور آراستہ کیا اور اس میں کوئی شگاف (بھی) نہیں(۶) اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا[۸] اور اس میں مضبوط پہاڑ[۹] رکھ دیئے اور اس میں

اور اس کی قدرت کی وسعت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کی ہر چیز مٹی میں نہیں چلی جاتی بلکہ ان کی روح اللہ کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ دوسری چیز یہ کہ ان کے جسم کے ذرات اگر مٹی میں مل بھی جائیں تو بھی وہ سب ذرات اللہ کے علم میں ہوتے ہیں۔ اور وہ جب چاہے ان ذرات کو اکٹھا کر کے پھر سے انسان کی شکل دے کر اور اس میں اس کی روح ڈال کر پھر سے زندہ کر سکتا ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ ان کے ذرات کا اللہ کو علم ہی نہیں بلکہ اس کے پاس ہر چیز پہلے سے لکھی ہوئی بھی موجود اور محفوظ ہے۔ پھر جو چیز علم میں بھی ہو اور ضبط تحریر میں بھی آ چکی ہو، اس کے یقینی ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟

[۶] پہلے اعتراض کے متعلق کفار کی بدحواسی:۔ آپ ﷺ کی رسالت سے انکار اور قرآن کے منزل من اللہ نہ ہونے کی حد تک تو سب کفار مکہ متفق تھے۔ مگر اب انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ پیغمبر اسلام اور قرآن کو کہیں تو کیا کہیں؟ کیونکہ نہ پیغمبر اسلام کوئی عام آدمی تھے اور نہ قرآن کوئی معمولی اور عام کتاب تھی اور یہ باتیں سب کفار کو نظر آ رہی تھیں۔ کبھی تو وہ کہتے کہ یہ نبی شاعر ہے اور یہ کتاب شاعری ہے، کبھی کہتے یہ نبی کاہن ہے اور یہ کتاب کہانت ہے، کبھی کہتے یہ نبی جادوگر ہے اور یہ کتاب جادو ہے، کبھی یہ کہتے کہ یہ قرآن تو پرانی کہانیاں ہی ہیں جنہیں یہ نبی خود ہی تالیف کر کے ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ یہ متضاد اور مختلف باتیں خود اس کا ثبوت ہیں کہ یہ لوگ اپنے موقف میں بالکل الجھ کر رہ گئے ہیں۔

[۷] اثبات توحید اور بعث بعد الموت کے دلائل:۔ اس آیت سے توحید کے دلائل اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے بیان کا آغاز ہوتا ہے۔ آسمان سے مراد وہ نیلگوں چھت ہے جو ہر انسان کو برہنہ آنکھ سے دیکھنے پر کروی شکل میں اپنے سر پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور سورج، چاند اور خوبصورت اور ننھے منے تارے اسی میں چمکتے دمکتے اور نگینوں کی طرح سجائے ہوئے نظر آتے ہیں اور کسی طاقتور دوربین کی مدد سے اوپر آسمان کی طرف نظر ڈالی جائے تو انسان حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا پڑتا ہے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آسکتی کہ اس کائنات کا آغاز کہاں سے ہو رہا ہے اور اس کی انتہا کہاں تک ہے اور جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز پورے نظم و ضبط کے ساتھ اپنی مقررہ منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ جس میں کہیں کوئی وقفہ، کوئی خلاء، کوئی شگاف وغیرہ نظر نہیں آتا اور اس سے دلیل اس بات پر لائی گئی ہے کہ جو ذات اتنے بڑے عظیم الجثہ کروں کو اور اس پوری کائنات کو اتنے نظم و ضبط کے ساتھ چلا رہی ہے وہ بھلا اس بات پر بھی قادر نہیں کہ وہ تمہارے زمین میں ملے ہوئے جسم کے ذرات کو اکٹھا کر کے تمہارا جسم بنا دے۔ پھر اس میں تمہاری روح ڈال کر تمہیں دوبارہ زندہ کھڑا کر دے؟

[۸] زمین کی تخلیق اور فوائد:۔ یہ دوسری دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتنا وسیع بنا دیا اور پھیلا دیا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے جانوروں اور انسانوں کے لئے مسکن اور مستقر کا کام دے سکے اور وہ اتنی پیداوار اگا سکے جس سے تمام جانداروں اور انسانوں کو تا قیامت رزق مہیا ہوتا رہے۔ نیز ان جانوروں اور انسانوں کے مرنے کے بعد ان کے مدفن کا کام بھی دے سکے۔

[۹] پہاڑوں کی تخلیق اور فوائد:۔ اس آیت اور کئی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیدائش الگ چیز ہے اور پہاڑوں

كُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِيۡجٍ ۝۷ تَبۡصِرَةً وَّذِكۡرٰى لِكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ ۝۸ وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنۢۡبَتۡنَا بِهٖ
جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الۡحَصِيۡدِ ۝۹ وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ ۝۱۰ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ ۙ وَاَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا ؕ

ہر طرح کی پر بہار[۱۰] چیزیں اگائیں (۷) (ان چیزوں میں) ہر رجوع کرنے والے بندے کے لئے بصیرت اور سبق (حاصل کرنے کا سامان) ہے (۸) اور ہم نے آسمان سے برکت والا[۱۱] پانی نازل کیا جس سے ہم نے باغ اگائے اور اناج بھی جو کاٹا جاتا ہے (۹) اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن پر تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں۔ (۱۰) یہ بندوں[۱۲] کیلئے رزق ہے اور اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین زندہ کر دیتے ہیں

کی پیدائش الگ چیز ہے۔ پہاڑ زمین کے ساتھ ہی نہیں بلکہ بعد میں پیدا کیے گئے اور پہاڑوں کی پیدائش کا سب سے بڑا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ زمین جب پیدا کی گئی تو اپنی تیز رفتار کی وجہ سے ہلتی، ہچکولے کھاتی اور ڈولتی تھی۔ اور یہ اس قابل نہ تھی کہ اس پر انسان یا جانور زندہ رہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے ایسے ایسے مقامات پر پہاڑوں کا سلسلہ بنایا اور اس توازن و تناسب کے ساتھ بنایا جس سے زمین کا ادھر ادھر جھکنا اور ہچکولے کھانا موقوف ہو گیا اور وہ جانداروں کی رہائش اور مستقر کے قابل بن گئی۔ یہ تو پہاڑوں کا بنیادی فائدہ ہے اس کے علاوہ پہاڑوں کے ضمنی فائدے بھی قرآن میں جابجا مذکور ہیں۔ یہ بات بھی اللہ کی قدرتِ کاملہ پر دلالت کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت تو کافر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس قدرت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ انسان کو دوبارہ پیدا کر سکے؟ فیا للعجب!

[۱۰] ❁ آب و ہوا ایک جیسی' نباتات مختلف:۔ یعنی قطعہ زمین ایک ہی ہوتا ہے۔ پانی بھی ایک جیسا، آب و ہوا اور موسم بھی ایک ہی لیکن کہیں پودے اگ رہے ہیں جن میں سے کسی کا پھل میٹھا، کسی کا کڑوا اور کسی کا کسیلا ہوتا ہے۔ کہیں غلے اور فصلیں اگ رہی ہیں۔ کہیں درخت اگ رہے ہیں۔ جن میں بعض پھل دار ہیں اور بعض خار دار۔ اور کہیں رنگ برنگ کے خوشنما اور خوشبودار پھول اگ رہے ہیں۔ جب یہ چیزیں اپنے جوبن پر آتی ہیں تو عجب منظر اور عجب بہار پیش کرتی ہیں۔ کیا یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی حیران کن قدرت کاملہ کا ثبوت پیش نہیں کرتیں؟ تو پھر کیا اللہ تعالیٰ میں اتنی قدرت بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ زمین سے تمہارے بکھرے ہوئے ذرات کو اکٹھا کر کے تمہیں دوبارہ زندہ کر دے۔

[۱۱] ❁ بارش سے نباتات کی روئیدگی اور بعث بعد الموت:۔ جس زمین پر بارش ہوئی وہ بذات خود مٹی اور مردہ ہے اور جو پانی برسا وہ بھی بے جان تھا۔ تاہم برکت والا اس لحاظ سے تھا کہ اس نے زمین میں مل کر زمین کو مردہ سے زندہ بنا دیا اور وہ اس قابل ہو گئی کہ وہ زندہ چیزیں اگائے۔ اس میں جو فصلیں اور غلے پیدا ہوئے وہ بھی زندہ تھے کیونکہ وہ بڑھتے اور پھلتے پھولتے تھے اور یہی زندگی کی علامت ہے۔ پھر کئی طرح کے درخت اور باغات اور بالخصوص کھجوروں کے اونچے اونچے بلند و بالا درخت پیدا کیے ان میں زندگی موجود تھی۔ پھر اس فصل اور ان باغات سے غلے اور میوے اور پھل حاصل ہوئے۔ اور یہ چیزیں بے جان تھیں۔ گویا اللہ نے مردہ چیز سے زندہ چیز کو اور زندہ چیز سے مردہ کو پھر پیدا کر دکھایا اور یہ عمل ہر وقت اور ہر آن جاری رہتا ہے۔

[۱۲] قدرتِ کاملہ کے اس مظاہرہ سے ایک تو مرنے کے بعد کی زندگی کی دلیل ملتی ہے۔ دوسرے ان فصلوں کے غلہ اور ان درختوں کے پھلوں سے جو رزق حاصل ہوتا ہے وہ تمام انسانوں اور جانداروں کی زندگی کی بقا کا سبب بنتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی

كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿١١﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ﴿١٢﴾ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ
لُوْطٍ ﴿١٣﴾ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿١٤﴾ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ

(تمہارا زمین سے دوبارہ) نکلنا بھی اسی طرح[13] ہو گا۔(۱۱) ان لوگوں سے پہلے قوم نوح، کنوئیں والے اور ثمود نے جھٹلایا(۱۲) اور عاد اور فرعون اور قوم لوط نے بھی(۱۳) اور بن کے رہنے والوں اور تبع[14] کی قوم نے بھی۔ ہر ایک نے رسولوں[15] کو جھٹلایا تو ان پر میرا وعدہ عذاب[16] پورا ہو کر رہا(۱۴) کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے تھک گئے ہیں؟

قدرت کی دوسری دلیل ہے کہ کس طرح وہ اپنی تمام مخلوقات کے لئے فراہمی رزق کا انتظام فرما رہا ہے۔

[13] ❁ نباتات کی روئیدگی سے بعث بعد الموت پر دلیل:۔ عرب کے اور بالخصوص مکہ اور اس کے اردگرد کے پہاڑ سخت خشک قسم کے پہاڑ ہیں جہاں کوئی ہریاول نظر نہیں آتی۔ شدید گرمی پڑتی ہے اور وہاں کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کئی کئی سال بارش نہیں ہوتی۔ لیکن جب بارش ہوتی ہے تو وہاں بھی کچھ نہ کچھ سبزہ اگ آتا ہے۔ گھاس اگ آتی ہے اور حشرات الارض بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہاں پچھلے سال کی گھاس کی جڑیں کچھ نہ کچھ باقی رہ گئی ہوں گی یا کوئی نہ کوئی زمینی کیڑا ہی کسی پناہ گاہ میں پناہ لے کر بچ گیا ہو گا اور بارش میں اس کی نسل پھلنے پھولنے لگی ہو گی یا کسی درخت کا بیج ہی زمین میں پڑا ہو گا اور اس میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہو گی اور بارش ہونے پر وہ اگ آیا ہو گا۔ لیکن ایسے علاقے جو سخت گرم اور پتھریلے ہیں۔ وہاں تو کسی بیج یا زمینی کیڑے کے اگلی بارش کے موسم تک زندہ رہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایسے علاقوں میں حشرات الارض یا نباتات کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نباتات اور حشرات الارض کے بیج کے بغیر بھی یہ چیزیں زمین سے برآمد کر سکتا ہے۔ تو یقیناً ہزارہا برس کے مرے ہوئے اور زمین میں ملے ہوئے انسانوں کو بھی زندہ کر کے زمین سے نکال سکتا ہے۔

[14] ان سب اقوام کے قصے پہلے سورۂ اعراف، یونس، ہود، حجر، فرقان اور دخان میں گزر چکے ہیں اور حواشی میں تفصیلات آ چکی ہیں۔ وہاں ملاحظہ کر لئے جائیں۔

[15] اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان اقوام میں سے ہر قوم نے اپنے اپنے رسول کو جھٹلایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر قوم نے سارے رسولوں کو جھٹلایا اس لئے کہ وہ نفس رسالت کے ہی منکر تھے۔ یعنی ان کے خیال کے مطابق کوئی انسان رسول بن کر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے رسول کو جھٹلانے کو تمام رسولوں کی تکذیب کے مترادف قرار دیا گیا ہو۔ کیونکہ سب رسولوں کی بنیادی تعلیم ایک جیسی ہے۔ اور رسولوں کو جھٹلانے سے مراد رسول کی تعلیم کو جھٹلانا ہے۔

[16] ❁ آخرت کی منکر اقوام کا انجام:۔ تمام رسولوں کی بنیادی تعلیم کا ایک اہم جز عقیدۂ آخرت پر ایمان رہا ہے۔ اور جن اقوام کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہ سب عقیدۂ آخرت یا مر کر دوبارہ جی اٹھنے اور اللہ کے حضور پیش ہونے اور اپنے جواب ہی کے عقیدہ کی منکر تھیں۔ عقیدۂ آخرت سے انکار کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افراد اور اقوام دونوں کی زندگی کو فتنہ و فساد کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے انسانوں کو اپنے محاسبہ کا کچھ خوف نہیں رہتا۔ پھر رسول آ کر انہیں ان کے برے انجام سے متنبہ کرتے ہیں تو وہ اس قدر سرکش اور گناہوں پر دلیر ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہاں سے راہ راست پر واپس آنا کسی صورت گوارا نہیں کرتے۔ الٹا رسولوں کی تکذیب اور انہیں دکھ دینا شروع کر دیتے ہیں اور سرکشی اور معصیت میں آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ انہیں ان کے

الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٥﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿١٦﴾ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ﴿١٧﴾

بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ لوگ از سر نو پیدائش کے متعلق شک[۱۷] میں پڑے ہوئے ہیں (۱۵) ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ اس کے دل میں وسوسہ گزرتا[۱۸] ہے، ہم تو اسے بھی جانتے ہیں اور اس کے گلے کی رگ سے بھی زیادہ اسکے قریب[۱۹] ہیں۔ (۱۶) جبکہ دو (فرشتے) ضبطِ تحریر میں لانے والے اسکے دائیں اور بائیں بیٹھے سب کچھ ریکارڈ[۲۰] کرتے جاتے ہیں (۱۷)

کرتوتوں کی پاداش میں دھر لیا جاتا ہے اور صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان تک ختم کر دیا جاتا ہے۔

[۱۷] اللہ تعالیٰ کو کسی انسان یا کسی جاندار مخلوق کی مثل قرار دینا ہی بنیادی غلطی ہے جس سے کئی طرح کی گمراہیوں کی راہیں کھلتی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی اتنی بڑی کائنات پیدا کرنے کے بعد تھک چکا ہے۔ لہٰذا وہ آئندہ دوسری بار کیسے اس کائنات کو پیدا کرے گا۔ اس کا ایک جواب تو قرآن میں مختلف مقامات پر یہ دیا گیا ہے کہ تمہارے نزدیک بھی ایک چیز کو دوسری بار بنانا پہلی بار سے آسان تر ہوتا ہے تو پھر اللہ کے لئے دوسری بار پیدا کرنا کیسے مشکل ہو گا؟ اور یہاں یہ جواب دیا گیا ہے کہ اصل بات یہ نہیں۔ وہ ہمیں تھکا ماندہ اور عاجز نہیں سمجھتے بلکہ ان کی عقل یہ بات قبول نہیں کرتی کہ انہیں دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں مشکوک ہی رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں دونوں احتمال موجود رہتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کی نفسانی خواہش یہی تقاضا کرتی ہے کہ محاسبہ نہ ہونا چاہیے لہٰذا وہ اس پر جم جاتے ہیں۔

[۱۸] ❁ شیطان کا انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑنا:۔ چونکہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اس لئے اس کی فطرت کو سب سے زیادہ جاننے والا ہمارے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے ہم تو اس کے دل کے خیال اور اس میں پیدا ہونے والے برے خیالوں یا وساوس تک کو بھی جانتے ہیں۔ ویسے یہ وساوس کیونکر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ درج ذیل حدیث میں ملاحظہ فرمائیے: "ام المومنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ مسجد نبوی میں آپ ﷺ سے ملنے آئی جبکہ آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے جب میں واپس آنے لگی تو آپ ﷺ میرے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ (تاکہ مجھے گھر تک پہنچا آئیں) جب ہم ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے دروازہ کے قریب پہنچے تو دو انصاری مرد (اسید بن حضیر اور عمار بن بشر) ملے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور آگے نکل گئے۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: "ذرا ٹھہر جاؤ، (یہ عورت میری بیوی ہے)" انہوں نے کہا: سبحان اللہ! یا رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کا یہ وضاحت فرمانا ان پر شاق گزرا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "شیطان خون کی طرح آدمی کے بدن کی ہر رگ میں پہنچتا ہے۔ میں ڈرا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے" (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب بیوت ازواج النبی ﷺ)

[۱۹] ❁ اللہ کا رگ جان سے زیادہ نزدیک ہونا:۔ اللہ تعالیٰ کی یہ قربت اس کے علم اور اس کی قدرت کے لحاظ سے ہے نہ کہ اس کی ذات کے لحاظ سے کیونکہ اس کی ذات تو ساری کائنات سے اوپر عرش پر ہے اور انسان کی جان یا نفس یا روح کا مسکن انسان کا دل ہے۔ تو جب اللہ اپنے علم کے لحاظ سے انسان کے دل اور اس میں پیدا ہونے والے خیالات تک کو جانتا ہے تو رگ جان یا رگ گردن، جو گلے کے سامنے کی طرف ہوتی ہے وہ تو دل سے کافی دور ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوا۔

[۲۰] ❁ کراماً کاتبین کا ریکارڈ رکھنا:۔ ان میں سے ایک نیکی اور بھلائی کے اقوال و افعال ریکارڈ کر رہا ہے اور دوسرا جو بائیں طرف

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ۝ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ۝ لَقَدْ

وہ کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا مگر اس کے پاس ایک مستعد نگران[۲۱] موجود ہوتا ہے۔(۱۸) اور یہ حقیقت کھولنے کے لئے موت کی بے ہوشی[۲۲] آپہنچی، یہی وہ بات ہے جس سے تو (اے انسان[۲۳]) گریز کرتا رہا(۱۹) اور (پھر جب) صور پھونکا[۲۴] جائے گا (تو اس سے کہا جائے گا) یہی وعدہ عذاب کا دن ہے۔(۲۰) اس دن ہر شخص اس حال میں آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا[۲۵] اور ایک گواہی دینے والا (فرشتہ) ہوگا(۲۱) بلاشبہ

ہے وہ بدی کو ریکارڈ کر رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ فرشتے قلم اور دوات لے کر ہر بات کو قلمبند کر رہے ہوں۔ بلکہ اس کے اور بھی کئی طریقے ممکن ہیں۔ آج کا انسان ویڈیو کیسٹ تیار کر چکا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کے اقوال و افعال حرکات و سکنات، تصویر، لب و لہجہ غرض ہر چیز ایسی ریکارڈ ہوتی ہے کہ اصل اور نقل میں ذرہ بھر فرق نہیں رہتا اور اللہ کے فرشتوں کے وسائل تو انسان کے وسائل سے بہت زیادہ ہیں۔ عین ممکن ہے کہ انسان کے اپنے بدن پر، اس کے اعضاء پر، قرب و جوار کے مقامات پر اور فضا کے ذرات پر انسان کا ریکارڈ ضبط ہو رہا ہو۔ جسے ویڈیو کیسٹ کی طرح کسی بھی وقت پیش کیا جا سکتا اور متعلقہ انسان کو دکھایا جا سکتا ہو۔ پہلی آیت میں یہ مذکور تھا کہ تمہاری تمام حرکات و سکنات حتیٰ کہ تمہارے دلوں کے راز تک اللہ جانتا ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سب چیزیں شہادت کے لئے ریکارڈ کی جا رہی ہیں۔

[۲۱] یعنی انسان کا کوئی قول، کوئی فعل، کوئی حرکت، کوئی اشارہ ایسا نہیں ہوتا جسے ریکارڈ میں لانے والا فرشتہ ہر وقت اس کے پاس موجود نہ رہتا ہو۔

[۲۲] ❁ موت پر سب حقائق کا انکشاف:۔ اس کے دو مطلب ہیں یعنی موت، اس کی بے ہوشیاں اور سختیاں تو وہ ان سب حقیقتوں کو ساتھ ہی لے آئیں جن کی انبیائے کرام علیہم السلام اطلاع دیتے رہے۔ موت کے ساتھ ہی اسے معلوم ہو جائے گا کہ جس محاسبہ اور برے انجام سے وہ ڈرایا کرتے تھے اس کا آغاز ہو گیا ہے۔ موت کا فرشتہ، دیکھتے ہی اس پر سب پیش آنے والی حقیقتیں ظاہر ہونے لگیں گی۔

[۲۳] حاد بمعنی سیدھے راستے سے پہلو تہی کرنا، کنی کترانا، سمت بدل لینا اور دور بھاگنا ہے۔ سید ھا راستہ پیغمبروں نے یہ بتایا تھا کہ تمہیں مر کر دوبارہ جی اٹھنا ہے اور تمہارا محاسبہ ہونے والا ہے۔ تو اس بارے میں مشکوک ضرور تھا۔ تیرے نزدیک دونوں احتمال موجود تھے۔ لیکن تیرا نفس یہی چاہتا تھا کہ تیرا محاسبہ نہ ہونا چاہئے لہٰذا تو طرح طرح کے اعتراض کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا تھا اور سیدھے راستہ سے بہر حال بچنا چاہتا تھا۔

[۲۴] ❁ نفخۂ صور ثانی:۔ اس سے مراد وہ نفخۂ صور ہے۔ جب سب مردہ انسان اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے کئے جائیں گے یعنی قیامت کے دن جب سب انسانوں کی اللہ کے حضور پیشی ہوگی اور فیصلہ کے دن مجرموں کو عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

[۲۵] اس سے مراد غالباً وہی دو فرشتے ہیں جو اس کا ریکارڈ ثبت کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اسے پیچھے سے ہانک کر اللہ کے سامنے پیش کر دے گا اور کہے گا کہ مجرم حاضر ہے۔ دوسرا اس کا پوری زندگی کا ریکارڈ سامنے لا حاضر کرے گا۔ یعنی مجرم بھی حاضر

كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴿۲۵﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ

تو اس دن سے غافل رہا سو آج ہم نے تیری آنکھوں سے پردہ [۲٦] اٹھا دیا ہے اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے (۲۲) اور اس کا ساتھی (فرشتہ) کہے گا۔ یہ (اس کا اعمال نامہ) میرے پاس تیار موجود [۲۷] ہے۔ (۲۳)

(سائق اور شہید دونوں فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) ہر سرکش [۲۸] کافر کو جہنم میں پھینک دو (۲۴) جو مال میں بخل کرنے والا [۲۹]، حد سے بڑھنے والا [۳۰] اور شک میں پڑا ہوا تھا [۳۱] (۲۵) جس نے اللہ کے علاوہ کوئی اور الٰہ [۳۲]

اور گواہی بھی حاضر۔

[۲٦] یعنی دنیا کی دلفریبیوں میں مست اور مگن رہا۔ محاسبہ کے دن کا تیرے سامنے ذکر ہوتا تو فوراً اس کا انکار کر دیتا اور اس پر غور کرنا تو درکنار ایسی بات سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ آج ہم نے تیری آنکھوں کے سامنے سے غیب کے پردے اٹھا دیئے ہیں اور آج تمہیں وہ سب باتیں ٹھیک نظر آ رہی ہیں جن سے تو جان بوجھ کر غافل بنا رہا۔

[۲۷] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو ترجمہ سے واضح ہے کہ گواہ فرشتہ مجرم کو پیش کر کے کہے گا کہ مجرم بھی حاضر ہے اور گواہی بھی حاضر ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہانکنے والا فرشتہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر کہے گا کہ جو مجرم میری سپردگی میں تھا۔ پیشی کے لئے حاضر ہے۔

[۲۸] یعنی وہ خود ہی کفر کے جرم کا مرتکب نہ تھا۔ بلکہ رسولوں کی تعلیم سے عناد بھی رکھتا تھا۔ اور اسلام کی راہ روکنے کے لئے معاندانہ سرگرمیوں میں بھی مصروف رہتا تھا۔

[۲۹] خیر کے معنی مال و دولت بھی ہے اور بھلائی بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتا تھا نہ اللہ کے حقوق ادا کرتا تھا اور نہ اس کے بندوں کے۔ بس ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال جمع کرنے میں ہی مصروف رہتا تھا۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہ صرف خود ہی بھلائی کے کاموں سے رکا رہتا تھا بلکہ دوسروں کو بھی روکتا رہتا تھا۔ اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ دنیا میں بھلائی کہیں پھیلنے نہ پائے۔

[۳۰] یعنی اپنی ذاتی اغراض اور خواہشات کی خاطر تمام اخلاقی اور قانونی حدود کو توڑنے والا تھا۔ لوگوں کے حقوق پر دست درازیاں کرتا، جائز و ناجائز طریقوں سے مال سمیٹتا اور اچھے کام کرنے والوں کو ستاتا تھا۔

[۳۱] شک کا لفظ یقین اور ایمان کے مقابلہ میں آیا ہے۔ یعنی جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان سب باتوں میں شک میں پڑا ہوا تھا۔ پھر اس شک کے جراثیم دوسروں میں بھی پھیلا رہا تھا۔ جس شخص سے اسے سابقہ پڑتا اس کے دل میں کوئی نہ کوئی شک اور وسوسہ ڈال دیتا تھا۔

[۳۲] یہ الٰہ انسان کا اپنا نفس اور خواہشات نفس بھی ہو سکتی ہیں۔ اور جن برائیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے ان میں اکثر ایسی ہیں جو خواہش نفس کے پیچھے لگنے والوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر برائی ایسی ہے جو انسان کو جہنم کا مستحق بنا دیتی ہے۔ بالخصوص یہ آخری برائی تو ایسی ہے جس کے متعلق صراحت سے مذکور ہے کہ اللہ دوسرے گناہ تو جسے چاہے بخش دے گا مگر مشرک کے لئے

اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ
بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ

بھی بنا رکھا تھا۔ لہٰذا اسے سخت عذاب میں پھینک دو۔(۲۶) اور اس کا ساتھی [۳۳] عرض کرے گا "ہمارے پروردگار! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا تھا بلکہ یہ خود دور تک گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔(۲۷) (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) میرے ہاں جھگڑا مت کرو۔ میں تمہیں پہلے ہی اس وعید کی خبر دے چکا تھا۔(۲۸) میرے ہاں بات بدلی نہیں جا سکتی [۳۴] اور میں اپنے بندوں کے لئے ظالم بھی نہیں۔(۲۹)

کبھی مغفرت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسے جہنم سے کبھی نجات حاصل ہو گی۔

[۳۳] اس ساتھی سے مراد غالباً اس کا وہ شیطان ساتھی ہے جو دنیا میں اس کے ساتھ رہتا تھا یا اس پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ وہ بارگاہ الٰہی میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے عرض کرے گا کہ مجھ میں ایسی کوئی طاقت نہ تھی کہ میں اسے تیری اور تیرے رسول کی اطاعت سے سرکش بنا سکتا۔ ہوا صرف یہ تھا کہ میں نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا تو یہ پہلے ہی مجرم ضمیر تھا۔ اس نے فوراً میری آواز پر لبیک کہی۔ میرا وسوسہ گویا اس کے اپنے دل کی آواز تھی۔ لہٰذا وہ گمراہی کے کاموں میں خود ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

[۳۴] ❁ قیامت کے دن مطیع اور مطاع کا جھگڑا:۔ یعنی مجرم اور اس کا شیطان ساتھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اپنے جرم کو کم سے کم ثابت کرنے کے لئے جھگڑا کریں گے۔ مجرم یہ کہے گا کہ میری گمراہی کا اصل باعث تو یہ میرا شیطان ساتھی تھا۔ اور شیطان کہے گا کہ میرا اس پر بھلا کون سا زور چلتا تھا۔ یہ خود سیدھی راہ سے متنفر اور مجرم ضمیر تھا۔ میں نے تو فقط اس کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا جسے ماننے کے لئے یہ پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب میرے یہاں جھگڑے اور تکرار کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ میں اپنا فیصلہ تمہیں سنا چکا ہوں کہ جیسے بہکنے والا مجرم اور جہنمی ہے ویسے ہی بہکانے والا بھی مجرم اور جہنمی ہے۔ اور یہ میرا ایسا فیصلہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور چونکہ میں اپنے اس فیصلہ سے تمہیں پہلے ہی متنبہ کر چکا ہوں۔ لہٰذا میری بات نہ مان کر تم نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا۔

[۳۵] ❁ قیامت کو جہنم کا کلام کرنا:۔ جہنم اگر زبانِ حال کی بجائے زبانِ قال سے بھی اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب دے تو اس میں بھی حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اللہ جس چیز کو چاہے قوت گویائی عطا کر سکتا ہے۔ جہنم کے اس جواب سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہنم اس قدر بڑی اور وسیع ہو گی کہ تمام مستحقین جہنم کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد بھی اس میں جگہ بچ رہے گی خواہ یہ دوزخی انسانوں سے تعلق رکھتے ہوں یا جنوں اور شیطانوں سے۔ اور یہی بات درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتی ہے:

"سیدنا انس ؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "دوزخی دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو دوزخ یہی کہتی رہے گی کہ کچھ اور بھی ہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ اپنا قدم اس پر رکھ دے گا اس وقت وہ کہے گی، بس بس (میں بھر گئی") (بخاری۔ کتاب التفسیر)

لِّلْعَبِيدِ ﴿٢٩﴾ يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ ﴿٣٠﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿٣١﴾ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿٣٢﴾ مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿٣٣﴾

اس دن ہم جہنم سے پوچھیں گے: "کیا[۳۵] تو بھر گئی؟" تو وہ کہے گی: "کیا کچھ اور بھی ہے؟" (۳۰) اور جنت کو پرہیزگاروں کے قریب کر دیا[۳۶] جائے گا وہ کچھ دور نہ ہوگی (۳۱) یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ یہ ہر رجوع[۳۷] کرنیوالے اور نگہداشت[۳۸] کرنیوالے کیلئے ہے۔ (۳۲) جو رحمٰن سے بن دیکھے[۳۹] ڈرتا رہا اور رجوع کرنیوالا دل[۴۰] لے کر حاضر ہوا (۳۳)

"اور دوسرے یہ کہ جہنم اس دن اس قدر غیظ و غضب میں بھڑک رہی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے اس سوال پر وہ جواب دے گی کہ جتنے مجھ میں داخل ہونے کے مستحق ہیں سب کو لے آؤ میں آج کسی کو چھوڑوں گی نہیں"

[۳۶] جنت اور دوزخ کا باہمی مکالمہ:۔ جن پرہیزگاروں کے حق میں جنت کا فیصلہ ہو جائے گا وہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے جنت کو زینت اور گوناگوں نعمتوں سے آراستہ و پیراستہ دیکھ لیں گے اور اس کی خوشگوار خوشبوئیں محسوس کرنے لگیں گے اگر فاصلہ زیادہ بھی ہوگا تو اسے سمٹا کر جنت کو ان کے قریب کر دیا جائے گا۔ جنت میں کیسے لوگ داخل ہوں گے اور دوزخ میں کیسے؟ یہ مندرجہ ذیل حدیث میں ملاحظہ فرمائیے:

"سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جنت اور دوزخ آپس میں تکرار کرنے لگیں۔ دوزخ نے کہا کہ مجھ میں وہ لوگ آئیں گے جو متکبر اور جابر ہیں اور جنت کہے گی کہ مجھ میں تو کمزور اور ناتواں قسم کے لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: "تو میری رحمت ہے، میں تیری وجہ سے اپنے جن بندوں پر چاہوں گا رحمت کروں گا" اور دوزخ سے فرمایا: "تو میرا عذاب ہے، میں تیری وجہ سے اپنے جن بندوں کو چاہوں گا عذاب دوں گا" اور ان میں سے ہر ایک کو بھر دیا جائے گا۔ دوزخ تو کسی طرح نہیں بھرے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں اس پر رکھ دے گا۔ تب وہ کہے گی کہ بس بس، اور بھر کر سمٹ جائے گی اور اللہ تعالیٰ اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرے گا۔ رہی جنت تو اسے پر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور خلقت پیدا کر دے گا" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۳۷] یعنی ایسا شخص جس کا معمول ہی یہ بن گیا ہو کہ اپنے ہر قسم کے حالات میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرے اور اللہ کی رضا کے مطابق ہی عمل کرے۔

[۳۸] اس میں ہر قسم کی حفاظت اور محافظت شامل ہے۔ یعنی اپنے عہد و پیمان کی محافظت کرنے والا خواہ یہ عہد اللہ سے ہو یا لوگوں سے۔ نیز اپنی نمازوں کی نگہداشت کرنے والا ہو۔ حدود اللہ کا دھیان رکھنے والا ہو۔

[۳۹] اگرچہ اس کی صفت رحمٰن ہے پھر بھی اس کی عظمت و جلال کی وجہ سے وہ اس سے ڈرتا رہا۔ اس خیال سے کہ شاید اس کا عمل اللہ کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل کرتا ہے یا نہیں۔

[۴۰] منیب۔ اناب کے معنی گناہ کے کاموں سے لوٹنا یا باز آنا۔ گناہ کا اعتراف اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا۔ یعنی اس کا دل ہی ایسا

ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝۳۴ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝۳۵ وَكَمْ اَهْلَكْنَا
قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ۝۳۶ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى
لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝۳۷ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ

اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہ دن حیات ابدی کا دن ہے (۳۴) وہاں جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں ملے گا اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی (ان کے لئے) موجود [۴۱] ہے۔ (۳۵)

اور ہم ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے زیادہ طاقتور تھیں۔ (جب عذاب آیا تو) انہوں نے ملک کا کونہ کونہ [۴۲] چھان مارا کہ انہیں کہیں پناہ کی جگہ مل سکے۔ (۳۶)

اس (تاریخ) میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جو دل رکھتا ہو یا حضور قلب کے ساتھ متوجہ ہو کر بات [۴۳] سنے (۳۷) ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا

تھا جسے گناہ کے کاموں سے نفرت تھی اور اگر اتفاق سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرتا تھا۔

[۴۱] جنت کی سب سے بڑی نعمت 'اللہ کی رضامندی۔ یعنی وہ کچھ تو ملے گا ہی جس کی وہ خواہش کریں گے علاوہ ازیں کچھ ایسی نعمتیں بھی انہیں ملیں گی جو ان کے تصور میں بھی نہ ہوں گی۔ چنانچہ سیدنا ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا "اے اہل جنت!" وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار! ہم حاضر اور تیری خدمت کے لئے مستعد ہیں۔ بھلائی تیرے ہی دونوں ہاتھوں میں ہے" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "اب تم خوش ہو؟" وہ جواب دیں گے: پروردگار! ہم کیوں خوش نہ ہوں گے۔ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمادیا ہے جو اپنی مخلوق میں سے اور کسی کو عطا نہیں فرمایا" اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں تمہیں ایسی نعمت عطا نہ کروں جو ان سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے؟" جنتی پوچھیں گے: پروردگار! ان نعمتوں سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں تم پر اپنی رضامندی اتارتا ہوں۔ اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا" (بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب کلام الرب مع اهل الجنة)

[۴۲] اس کا ایک مطلب تو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ قومیں اتنی طاقتور اور جنگجو تھیں کہ انہوں نے اپنے ملک پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ارد گرد کے بھی کئی ملکوں کو تاخت و تاراج کیا تھا۔ پھر جب ہمارا عذاب آیا تو انہیں کہیں بھی پناہ کی جگہ نہ مل سکی۔

[۴۳] یعنی ہدایت اور نصیحت کے حصول کے لئے دو باتوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے یا تو وہ خود ذاتی عقل اور سمجھ رکھتا ہو کہ اقوام سابقہ کے حالات سن کر ان سے کوئی صحیح نتیجہ اخذ کر سکے یا اگر کوئی دوسرا اسے سمجھائے تو پوری توجہ سے سننے کے لئے تیار ہو۔ اور جس شخص میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں اس کا کسی واقعہ سے سبق حاصل کرنا محال ہے۔

سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ
الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ

اور ہمیں تھکاوٹ[۴۴] محسوس تک نہ ہوئی (۳۸) پس (اے نبی!) جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر[۴۵] کیجیے اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب اور غروب سے پہلے تسبیح کیجیے۔ (۳۹) اور رات[۴۶] کو اور سجدے کے بعد بھی اس کی تسبیح[۴۷] کیجیے۔ (۴۰) اور توجہ سے سنیے۔ جس دن پکارنے والا[۴۸] قریب ہی

[۴۴] ❁ یہود و نصاریٰ کا اللہ تعالیٰ پر الزام 'ساتویں دن آرام کیا':۔ یہ یہود و نصاریٰ کا اللہ تعالیٰ پر من گھڑت الزام ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ اور بائبل میں اب بھی کتاب پیدائش (۲:۲) میں ایسی عبارت موجود ہے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے ہی جیسا سمجھ لیا کہ جیسے ہم کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی تھک گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی یا کسی اور چیز کی مثل قرار دینا ہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔ اس آیت میں ان کے اسی الزام کی تردید کی گئی ہے۔

[۴۵] جب کوئی مسلمان اپنے اعداء کی شماتت، تمسخر، تضحیک، ایذا رسانیوں سے تنگ آ جائے یا کسی اور وجہ سے مشکلات میں گھر جائے تو اسے صبر و برداشت سے کام لینا چاہئے اور اپنے پروردگار سے لو لگانا چاہئے اسی کو اپنا سہارا سمجھنا چاہئے۔ اسی کی تسبیح و تہلیل اور یاد میں مشغول رہنا چاہئے اس سے اس کی ذہنی کوفت بہت حد تک دور اور ہلکی ہو جائے گی یہی وہ نسخہ کیمیا ہے جس کی نبی اکرم ﷺ کو تلقین کی جا رہی ہے اور سب مسلمانوں کو بھی متعدد مقامات پر ایسی ہی تلقین کی گئی ہے۔

[۴۶] ❁ پانچ نمازوں کے اوقات:۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے پروردگار کی حمد سے مراد فرض نمازیں ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

❁ جنت میں دیدار الٰہی:۔ "سیدنا جریر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بجلی کہتے ہیں کہ ایک رات ہم آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ نے چاند کو دیکھا جو چودھویں رات کا تھا۔ عنقریب تم (جنت میں) اپنے پروردگار کو یوں بے تکلف دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور تمہیں کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ پھر اگر تم ایسا کر سکو کہ تم سے طلوع آفتاب سے پہلے کی نماز (فجر) اور غروب آفتاب سے پہلے کی نماز (عصر) قضا نہ ہونے پائے تو ایسا ضرور کرو۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہی آیت پڑھی۔ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ......﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

"اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ نمازوں کی فرضیت سے پہلے تین ہی نمازیں تھیں۔ فجر کی نماز، عصر کی نماز اور تہجد کی نماز اور بعض علماء اس آیت سے پانچوں نمازیں ثابت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک طلوع آفتاب سے پہلے سے مراد فجر کی نماز ہے اور غروب آفتاب سے پہلے سے مراد ظہر اور عصر کی نمازیں اور رات کی نمازوں سے مراد مغرب اور عشا کی نمازیں ہیں"۔

[۴۷] ❁ نمازوں کے بعد نوافل اور ذکر و اذکار:۔ اس کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ ہر نماز کے بعد کچھ سنت اور نوافل ادا کیے جائیں۔ واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو نماز بطور نفل ادا کی وہی ہمارے لئے سنت ہے اور ہمارے ہاں جو رکعات بطور نوافل ادا کی جاتی ہیں وہ ان نوافل سے زائد ہیں جو آپ ﷺ نے ادا کیے اور جسے ہم سنت نماز کہتے ہیں۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد کچھ ذکر اذکار اور تسبیح و تہلیل بھی کیا کیجئے۔ جیسا کہ مجاہد کہتے ہیں کہ ابن عباس نے مجھے حکم دیا کہ ہر (فرض) نماز کے بعد تسبیح پڑھا کروں۔ آپ ﷺ نے کہا ﴿أَدْبَارَ السُّجُوْدِ......﴾ کا یہی مطلب ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر) ایسے

مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٤١﴾ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ﴿٤٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿٤٤﴾ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ

سے پکارے گا(۴۱) (اور) اس دن سب لوگ اس زور دار آواز کو ٹھیک ٹھیک[۴۹] سن لیں گے۔ یہی (زمین سے دوبارہ) نکلنے کا دن ہو گا۔(۴۲) بلاشبہ ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہو گا۔(۴۳) جس دن زمین ان پر سے پھٹ[۵۰] جائے گی اور وہ جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوں گے۔ یہ اس طرح جمع کرنا ہمارے لیے بہت آسان[۵۱] ہے۔(۴۴) جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں ہم اسے خوب جانتے[۵۲] ہیں۔

بہت سے اذکار صحیح احادیث سے ثابت ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف ایک اہم ذکر درج کیا جاتا ہے جس کی بہت فضیلت آئی ہے:

"سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ کچھ محتاج لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے: "مالدار لوگ بلند درجات لے گئے اور ہمارا چین لوٹ لیا۔ ہماری طرح وہ بھی نمازیں ادا کرتے اور روزے رکھ لیتے ہیں۔ پھر ان کے پاس پیسہ ہم سے زائد چیز ہے جس سے وہ حج، عمرہ، جہاد اور صدقہ و خیرات بھی کر لیتے ہیں جو ہم محتاج ہونے کی وجہ سے نہیں کر سکتے" آپ ﷺ نے فرمایا: "میں تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں جو تم کرو تو آگے بڑھنے والوں کو پکڑ لو اور تم کو کوئی نہ پا سکے جو تمہارے پیچھے ہے اور تم اپنے زمانہ والوں میں سے سب اچھے بن جاؤ الا یہ کہ وہ بھی یہ کام کرنے لگیں۔ تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کہہ لیا کرو" اور بعض روایات کے مطابق سبحان اللہ ۳۳ بار، الحمد للہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار کہنا چاہئے (تاکہ سو (۱۰۰) پورا ہو جائے")(بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ باب الذکر بعد الصلوۃ) اور بعض روایات میں ہے کہ جب مالدار لوگ بھی یہ ذکر پڑھنے لگے تو محتاج لوگ پھر آپ ﷺ کے پاس آکر کہنے لگے کہ یہ ذکر تو مالدار لوگ بھی کرنے لگے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اللہ کا فضل ہے، جتنا جسے چاہے دے دے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ایسے ذکر کا کچھ فائدہ نہ ہو گا کہ زبان تو چل رہی ہو اور دل اور باتوں میں مشغول ہو۔"

[۴۸] یہ نفخہ صور ثانی کا وقت ہو گا اور پکارنے والا فرشتہ یہ بات کہے گا کہ "اے مرے ہوئے لوگو! سب اپنی اپنی قبروں سے اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر نکل آؤ اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے لئے پیش ہو جاؤ" قبروں میں پڑا ہوا ہر شخص یوں محسوس کرے گا کہ کہیں قریب سے ہی یہ آواز آ رہی ہے۔ موجودہ سائنسی ایجادات نے اس چیز کو بہت قریب الفہم بنا دیا ہے۔

[۴۹] بالحق کے دو مطلب ہیں ایک تو ترجمہ سے واضح ہے کہ فرشتہ کی اس ندا کو ہر شخص پوری طرح سمجھ رہا ہو گا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس زوردار آواز سے ہی ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ دنیا میں پیغمبر کہتے رہے، اور جنہیں وہ جھٹلاتے رہے تھے وہ ایک ٹھوس اور اٹل حقیقت تھے جو اب ظہور میں آنے لگے ہیں۔

[۵۰] جس طرح زمین پھٹ جاتی ہے اور پودے کی کونپل زمین کو چیر کر اور پھاڑ کر زمین سے باہر نکل آتی ہے۔ اسی طرح اس دن زمین پھٹ جائے گی اور پودوں کی طرح انسان زمین سے اگتے اور باہر نکلتے چلے آئیں گے۔ ان کی فوراً نشوونما ہوتی چلی جائے گی پھر وہ اضطراراً اللہ کے دربار کی طرف دوڑ پڑیں گے جس میں ان کی اپنی مرضی کو کچھ دخل نہ ہو گا۔

[۵۱] ❁ نباتات اور انسان کی پیدائش میں مماثلت کے پہلو:۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار مقامات پر نباتات کے زمین سے نکلنے اور

ع ۳ ۱۷

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝

آپ ان پر جبر [۵۳] تو کر نہیں سکتے لہٰذا اس قرآن کے ذریعہ ہر اس شخص کو نصیحت کیجئے جو میرے وعدہ عذاب سے ڈرتا ہے۔(۴۵)

مردہ انسانوں کے زمین سے نکلنے کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور جہاں تک میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ نباتات کے اگنے کی نسبت انسان کا زمین سے اگ آنا یا نکل آنا زیادہ آسان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نباتات کا اگنا ہر وقت ہمارے مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ لہٰذا ہم اس میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے اور مردوں کا اگنا چونکہ ہمارے مشاہدہ میں نہیں آیا لہٰذا کافر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ گویا دونوں مقامات پر اصل کمی غور و فکر کی ہے۔ اب میں اس بات کو ایک مثال سے سمجھاؤں گا۔ فرض کیجئے ایک باغ میں یا ایک ہی قطعہ زمین میں چند میٹھے پھلوں مثلاً انار، آم، سیب کے درخت یا انگور کی بیلیں ہیں اور اسی قطعہ زمین میں چند کڑوے درخت یا بیلیں مثلاً نیم کا درخت یا کریلے کی بیل یا تھوہر کا پودا ہے۔ اب بارش اور مناسب آب و ہوا ملنے پر ہر درخت اور پودا اپنے بیج سے تعلق رکھنے والے اجزاء ہی زمین سے کھینچے گا اور زمین ویسے ہی اجزاء اسے مہیا کرے گی دوسرے نہیں۔ مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ انار کے درخت میں انگور کے اجزاء اور شیرینی مل جائے یا انار کے درخت میں کریلے کی کڑواہٹ کا بھی کوئی جز شامل ہو جائے۔ نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ انگور کی بیل میں کچھ تھوڑے سے کریلے کے اجزاء اور کرواہٹ بھی شامل ہو جائے۔ یہی صورت انسان کی دوبارہ پیدائش یا زمین سے اگ آنے یا نکل آنے کی ہے۔ اس کا اصل بیج یعنی روح تو اللہ کے پاس پہلے ہی موجود ہے۔ اور مادی بیج بھی زمین میں محفوظ رہتا ہے اسے زمین کھا نہیں سکتی اور وہ عجب الذنب کا حصہ وہ ہے جو انسان کا مادی بیج ہے اور یہ بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اب ہر انسان کا بیج زمین سے وہی اجزاء اپنی طرف کھینچے گا اور زمین اسے وہی اجزاء مہیا کرے گی جو اس کے بیج سے تعلق رکھتے ہیں زید کے جسم کے اجزاء بکر کے جسم میں داخل نہیں ہو سکتے اور نہ بکر کے اجزاء عمر کے جسم میں جا سکتے ہیں۔ اور انسانوں کا زمین سے اگنا نباتات سے بھی آسان اس لحاظ سے ہے کہ نباتات کی تقریباً پندرہ لاکھ انواع آج تک دریافت ہو چکی ہیں لیکن قیامت کو صرف دو انواع جن اور انسان زمین سے اگیں گی۔ الا یہ کہ کوئی اور چیز بھی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہو۔

[۵۲] اس جملہ میں آپ ﷺ کے لئے تسلی بھی ہے اور کفار مکہ کے لئے وعید اور دھمکی بھی۔

[۵۳] یعنی آپ ﷺ کی یہ ذمہ داری نہیں کہ زور اور زبردستی سے کسی کو ایمان لانے پر مجبور کر دیں۔ آپ ﷺ کا کام اتنا ہی ہے کہ لوگوں کو یہ قرآن سنا سنا کر نصیحت کیا کیجئے پھر جس کے دل میں ذرا بھی اللہ کا خوف ہو گا وہ تو یقیناً اس نصیحت کو قبول کرلے گا اور جو لوگ قرآن سننا بھی گوارا نہ کریں تو ان کا معاملہ اللہ کے سپرد اور آپ ﷺ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

۶۰ آیاتھا سورۃ الذّٰریٰت مکیۃ رکوعھا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝١ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝٢ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝٣ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝٤ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ

کلمات ۳۶۰ آیات ۶۰ (۵۱) سورۃ الذاریات مکی ہے (۶۷) رکوع ۳ حروف ۱۵۵۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ان ہواؤں کی قسم جو گرد و غبار [۱] اڑائے پھرتی ہیں (۱) پھر ان کی جو (بادلوں کا) بوجھ اٹھانے والی ہیں۔(۲) پھر ان [۲] کی جو آہستہ آہستہ چلتی ہیں (۳) پھر ان کی جو امر (بارش) کو تقسیم کرنے والی ہیں۔(۴) کہ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا [۳] ہے وہ سچا ہے۔(۵)

[۱] ❁ بارش سے تعلق رکھنے والی ہوائیں اور ان کی قسم:۔ ان ابتدائی چار آیات میں مختلف قسم کی ہواؤں کا ذکر ہے جو بارش کے نظام پر دلالت کرتی ہیں۔ پہلے کچھ گرد و غبار اڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر آسمان کے کسی کونے سے لاکھوں اور کروڑوں ٹن پانی کا بوجھ اٹھانے والی گھٹائیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ پھر ٹھنڈی اور نرم ہوائیں چلتی ہیں جو بارش کی خوشخبری لاتی اور دلوں کو راحت و سرور بخشتی ہیں۔ پھر یہی ہوائیں بادلوں کو ان علاقوں کی طرف لے جاتی ہیں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کو بارش برسانا منظور ہوتا ہے اور جس قدر بارش برسانا منظور ہوتا ہے بعض مفسرین نے ﴿فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا﴾ سے مراد کشتیاں لی ہیں جو دھیرے دھیرے چلتی ہیں اور بعض نے سیارے جو سبک رفتاری سے محو گردش رہتے ہیں۔ اسی طرح ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا﴾ سے بعض مفسرین نے وہ فرشتے مراد لیے ہیں جو رزق کی تقسیم پر مامور ہیں۔ ان کے نزدیک جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان کی ترتیب نیچے سے اوپر کو ہے۔ یعنی گرد و غبار اڑانے والی ہوائیں تو سطح زمین پر چلتی ہیں۔ بادل اٹھانے والی ہوائیں سطح زمین سے کافی بلندی پر ہوتی ہیں۔ ستارے زمین سے بہت دور اور بلندی پر ہیں۔ اور فرشتے ان سے بھی زیادہ بلندی پر ہیں۔ ان دونوں تفسیروں میں اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو ہی ترجیح دی ہے۔

[۲] ❁ آخرت دراصل انسان کے امتحان کے نتیجہ کا دن ہے جس پر جزا و سزا مرتب ہوگی:۔ زمین پر بارش کے نظام پر ہی زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کے رزق اور زندگی کا انحصار ہے اسی وجہ سے اس پورے نظام کو بطور شہادت پیش کر کے یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ جو تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ وعدہ سے مراد آخرت کا وعدہ بھی ہو سکتا ہے۔ جنت کا بھی، دوزخ کا بھی اور عذاب کا وعدہ بھی خواہ یہ دنیا کا عذاب ہو یا آخرت کا، اور بارش کا یہ نظام آخرت کے وعدہ پر دلیل اس لحاظ سے ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور بالخصوص یہ بارش کا نظام چل رہا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو عبث ہو اور کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ کرتی ہو۔ پھر اللہ نے انسان کو جو عقل اور تمیز دی ہے اور اسے کائنات کی بے شمار چیزوں پر تصرف بخشا ہے۔ اگر اس نے دنیا میں فائدہ اٹھا کر اور بعد میں مر کر مٹی میں ہی مل جانا ہے تو اس کی پیدائش اور اس کو اتنے انعامات عطا کرنے کا نتیجہ کیا نکلا؟ پھر جب کائنات کی کوئی بھی چیز بے کار پیدا نہیں کی گئی تو کیا انسان کو ہی بے کار پیدا کیا گیا ہے جو اشرف المخلوقات ہے؟ انسان کی پیدائش کا مفید نتیجہ جو اللہ کی مشیئت میں ہے اسی کا نام آخرت ہے اور یہ نتیجہ لازماً نکل کے رہے گا۔ لوگوں سے ان کے اعمال کی باز پرس ضرور ہوگی اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ مل کے رہے گا۔

[۳] ❁ حُبُک کا لغوی معنی:۔ حبك (الثوب) بمعنی کپڑا بننا اور حباك بمعنی جولاہا اور حبك حابك الثوب بمعنی جولاہے کا

لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸ يُّؤْفَكُ عَنْهُ
مَنْ اُفِكَ ۝۹ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝۱۱ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۲ يَوْمَ هُمْ
عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝۱۳ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۴ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ

اور انصاف (کا دن) ضرور واقع ہو گا۔(۶) راستوں[۳] والے آسمان کی قسم(۷)، تم (آخرت کے بارے میں) مختلف قسم کی باتیں کرتے ہو(۸) اس سے وہی برگشتہ ہوتا[۴] ہے جس کے لئے برگشتہ ہونا مقدر ہو چکا(۹) وہم و قیاس کرنے والوں[۵] کا ستیاناس ہو۔(۱۰) جو بے ہوشی میں پڑے غافل بنے ہوئے ہیں۔(۱۱) پوچھتے ہیں[۶] جزا و سزا کا دن کب ہو گا؟(۱۲) جس دن یہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے(۱۳) (اور کہا جائے گا) اپنی شرارت[۷] کا مزہ چکھو یہی وہ عذاب[۸] ہے جس کیلئے تم جلدی مچاتے تھے۔(۱۴) بلاشبہ پرہیزگار (اس دن) باغوں اور چشموں میں ہوں گے(۱۵)

کپڑے کو کاریگری سے بننا۔ عمدہ بننا ہے (المنجد) اور کپڑا بنتے وقت ایک دھاگا طول کی طرف جاتا ہے اور دوسرا عرض کی طرف۔ پھر حبك کا معنی راستہ بھی ہے۔ (مفردات القرآن۔ منجد) اور اس کی جمع حُبُك ہے۔ گویا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس آسمان کی قسم جس کے طول و عرض دونوں اطراف میں بے شمار راہیں ہیں جو ایک دوسرے کو کراس کرتی اور چوک بناتی چلی جاتی ہیں۔ اسی لحاظ سے اس کا ترجمہ بعض مترجمین نے جال دار یا جالی دار آسمان بھی کیا ہے۔ یعنی اس آسمان کی قسم جو سیاروں اور فرشتوں کی لا تعداد گزرگاہوں اور راستوں کی وجہ سے جالی دار بن گیا ہے۔

[۴] ❁ آسمان کے نظم و نسق سے معاد پر دلیل:۔ یعنی ایسے جال دار راستوں والے آسمان کی قسم کہ تم لوگ جو قیامت اور آخرت کے بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہو تو بہت سے لوگ اس قیامت اور آخرت پر ایمان لے آئیں گے اور اس عقیدہ سے انکار صرف وہی شخص کرے گا جس نے خیر و سعادت کی تمام راہیں اپنے آپ پر بند کر دی ہوں۔ ایسا ہی شخص ان باتوں کو تسلیم کرنے سے باز رہ سکتا ہے۔ ورنہ اگر وہ آسمان کے نظم و نسق میں ہی غور کرے تو اسے یقین ہو جائے کہ اس مسئلہ میں جھگڑنا محض حماقت ہے۔

[۵] ❁ آخرت سے انکار بلادلیل ہے اور محض وہم و قیاس ہے:۔ یعنی جو لوگ عقیدہ آخرت کے منکر ہیں ان کے پاس کوئی علمی بنیاد نہیں۔ آخرت کا علم نہ انسان کو مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ محسوسات اور ادراکات سے۔ اس کے متعلق علمی بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کے ہونے اور نہ ہونے کے یعنی دونوں طرح کے امکانات موجود ہیں۔ آخرت کے قائم ہونے کے متعلق تو بہت سے دلائل بھی موجود ہیں۔ سب پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی یہی تعلیم رہی ہے پھر کائنات کا نظام بھی اس پر قوی دلیل ہے تو کیوں نہ اس احتمال کو تسلیم کیا جائے جس کی تائید میں بے شمار دلائل مل جاتے ہیں۔ اور اس کے نہ ہونے کے لیے اگر کوئی دلیل موجود نہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ محض ان کا وہم و گمان ہے۔

[۶] یعنی دنیا کی دلچسپیوں اور اس کے دھندوں میں مست اور سرشار ہیں اور آخرت سے بالکل بے فکر اور بے نیاز بنے ہوئے ہیں اور از راہ تمسخر یہ سوال کرتے ہیں کہ اجی حضرت جس قیامت سے ہمیں ڈراتے ہو وہ کب آ رہی ہے؟

[۷] ❁ فتنہ کا لغوی مفہوم:۔ فَتَنَ کے لغوی معنی سونا یا چاندی کو کٹھالی میں ڈال کر تپانا، گلانا اور کھوٹ معلوم کرنا ہے۔ سابقہ

وَعُيُونٍ ﴿١٥﴾ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴿١٦﴾ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ
مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿١٨﴾ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿١٩﴾ وَفِي

جو کچھ ان کا پروردگار انہیں دے گا وہ لے [۹] رہے ہوں گے۔ وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے (۱۶) رات کو کم ہی سویا [۱۰] کرتے تھے۔ (۱۷) اور سحری کے وقت مغفرت [۱۱] مانگا کرتے تھے۔ (۱۸) اور ان کے اموال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں [۱۲] (دونوں) کا حق ہے (۱۹)

آیت میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور فتنۃ کا لفظ دراصل آزمائش کے معنی میں آتا ہے جس میں سختی بھی پائی جائے اور اکثر برے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی آزمائش، دکھ، رنج، رسوائی، شرارت، عبرت، عذاب، مرض ہے اور فتّان بمعنی شرانگیز انسان اور شیطان ہے (منجد) اس لحاظ سے اس لفظ کا ایک وہی مطلب ہے جو ترجمہ سے واضح ہے اور دوسرا معنی عذاب لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنی شرارتوں کا بدلہ یا عذاب چکھو۔

[۸] عذاب کے لئے جلدی مچانا اپنے آپ سے دشمنی ہے:۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بتانے سے انسان کو پوری سمجھ آ ہی نہیں سکتی۔ مثلاً جس شخص نے آم نہ کھایا ہوا سے اس کا مزہ پوری طرح ذہن نشین نہیں کرایا جاسکتا۔ ہاں اسے آم کھلا کر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہے آم اور یہ ہے اس کا مزا۔ ان کافروں پر کوئی اللہ کا عذاب نہیں آیا تھا اور اگر آ بھی جاتا تو ہلاک ہونے والوں کو بعد میں کیا بتایا جاسکتا ہے۔ آخرت میں چونکہ موت نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس دن ان کو عذاب دے کر بتایا جائے گا کہ یہ ہے اللہ کا عذاب۔ اب اس کا مزا چکھ لو۔ یہی وہ عذاب ہے جس کے لیے تم جلدی مچاتے اور مذاق اڑاتے تھے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے اسی وقت تمہیں یہ مزا نہ چکھا دیا اور مہلت دیتا رہا مگر تم تو خود اپنے دشمن تھے جو جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔

[۹] یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جو بھی نعمتیں عطا فرمائے گا بخوشی انہیں قبول کرتے جائیں گے اور یہ ان کے ان نیک اعمال کا بدلہ ہوگا جو وہ دنیا میں بجالاتے رہے۔ ان اعمال کا ذکر آئندہ آیات میں آرہا ہے۔

[۱۰] محسنین کی صفات:۔ رات کو جاگنا یعنی وہ رات کا اکثر حصہ جاگ کر اللہ کی عبادت اور ذکر کیا کرتے تھے۔ اور سورہ مزمل میں اس کی تشریح یوں ہے کہ اگر راتیں اور دن برابر ہوں تو رات کا آدھا حصہ۔ راتیں چھوٹی ہوں تو آدھی رات سے کچھ زیادہ اور لمبی ہوں تو آدھی رات سے کچھ کم۔ اور بعض علماء نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ رات کے پہلے حصہ میں یا درمیانی حصہ میں یا آخری حصہ میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ اور مکی دور میں یہی صورت ہوتی تھی۔ بعد میں سورہ بنی اسرائیل میں تہجد کی تعیین ہوگئی۔

هجع کے لغوی معنی :۔ هجع کے معنی دراصل غفلت کی نیند سونا یا گھوڑے بیچ کر سونا یا دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر سونا۔ اور تہجد (ہجود) کے معنی رات کو سونا بھی اور جاگنا بھی۔ کبھی سونا کبھی جاگنا۔ (لغت اضداد) اور بظاہر اس آیت سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات کا تھوڑا ہی حصہ سوتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی یاد سے غافل اور گھوڑے بیچ کر نہیں سوتے۔ بلکہ سوتے جاگتے انہیں اللہ کی یاد رہتی ہے۔

[۱۱] استغفار کرنا: اس آیت میں وقت کی بھی تعیین ہوگئی۔ یعنی وہ رات کو اللہ کی عبادت میں مشغول رہ کر اپنے اس نیک کام پر پھول نہیں جاتے۔ بلکہ پھر بھی اللہ سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان فطری طور پر خطا کار ہے۔ اس سے نادانستہ بھی کئی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور اللہ غفور رحیم ہے اور اس سے ہر حال میں بخشش طلب کرتے رہنا چاہیے۔

[۱۲] مال میں سائل اور محروم کا حق:۔ اس سے مراد محض اموال زکوٰۃ نہیں، کیونکہ زکوٰۃ تو اس وقت فرض بھی نہ ہوئی تھی۔ نیز

الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٢١﴾ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾

اور یقین کرنے والوں کیلئے زمین میں) بہت سی نشانیاں[۱۳] ہیں(۲۰) اور خود تمہارے اپنے اندر[۱۴] بھی، پھر کیا تم غور سے نہیں دیکھتے؟(۲۱) اور آسمان[۱۵] میں تمہارا رزق ہے اور وہ کچھ بھی جس کا تم سے وعدہ[۱۶] کیا جاتا ہے(۲۲)

ترمذی میں واضح طور پر یہ صراحت موجود ہے۔ کہ ان في المال حقاً سوى الزكوٰة کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہوتا ہے اور اس حق میں مانگنے والے بھی شامل ہیں اور نہ مانگنے والے بھی۔ یعنی نیک لوگ خود ان لوگوں کی تلاش میں ہوتے ہیں جو محتاج ہوں۔ بیوہ عورتیں ہوں، مریض یا معذور ہوں اور کما نہ سکتے ہوں یا عیالدار ہوں مگر مانگنے سے ہچکچاتے ہوں۔ اور ان کو جو کچھ دیتے ہیں وہ ان کا حق سمجھ کر انہیں ادا کرتے ہیں۔ صدقہ و خیرات کے طور پر نہیں دیتے کہ ان سے کسی شکریہ یا بدلہ کے طالب ہوں یا بعد میں انہیں احسان جتلاتے پھریں۔ یعنی جس طرح قرض ادا کرنا ایک حق اور ضروری امر ہے۔ اور قرضہ ادا کرکے کوئی احسان نہیں جتلاتا کہ میں نے تمہارا قرضہ ادا کر دیا۔ اسی طرح مالدار لوگوں کے اموال میں سائل اور محروم کا حق ہوتا ہے۔ اگر وہ ادا نہ کرے گا تو اس کے اپنے سر پر بوجھ رہے گا۔

[۱۳] زمین میں مختلف قسم کی قدرت کی نشانیاں:۔ اس سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو کائنات میں ہر سو بکھری ہوئی ہیں اور قرآن میں بار بار ان میں غور و فکر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ گردش لیل و نہار، یہ موسموں کی تبدیلی اور ان میں تدریج کا دستور، یہ بارش کا پورا انتظام۔ اس سے مردہ زمین کا زندہ ہونا۔ مختلف قسم کی نباتات، غلے اور پھل اگانا اور اسی پیداوار سے ساری مخلوق کے رزق کی فراہمی، زمین کے اندر مدفون خزانے، سمندروں اور پہاڑوں بلکہ کائنات کی اکثر چیزوں اور چوپایوں پر انسان بے بنیان کا تصرف اور حکمرانی۔ غرض ایسی نشانیاں ان گنت اور لاتعداد ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک کے طور پر جو چیز پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں انسان کے فائدے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اور ان سب میں ایک ایسا نظم و نسق پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ انسان کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ اگر ان میں ایسا مربوط نظم و نسق نہ پایا جاتا تو ایک ایک چیز انسان کو فنا کرنے کے لیے کافی تھی۔ یہی بات اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ ان سب کا خالق صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی ہے اور دوسرے اس بات پر کہ کائنات کے اس مربوط نظم و نسق کا کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد ہونا چاہئے اور وہ نتیجہ آخرت ہے۔

[۱۴] انسان کے اپنے وجود میں نشانیاں:۔ انسان کا اپنا وجود اور اس کے اندر کی مشینری کائنات اصغر ہے اور اس میں جو نشانیاں ہیں وہ کائنات اکبر کی نشانیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ انسان کا معدہ ایک چکی کی طرح دن رات کام میں لگا رہتا ہے۔ جو غذا کو پیس کر ایک ملغوبہ تیار کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ جب یہ فارغ ہو جائے تو اور غذا طلب کرتا ہے جسے ہم بھوک کہتے ہیں اس ملغوبہ کی تیاری میں اگر پانی کی کمی ہو تو ہمیں پیاس لگ جاتی ہے اور ہم کھانے پینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے اندر چھلنی بھی ہے جس سے چھن کر یہ ملغوبہ جگر میں چلا جاتا ہے جہاں اچھالنے والی، دفع کرنے والی، صاف کرنے والی، کھینچنے والی مشینیں اور قوتیں کام کر رہی ہیں۔ یہیں دوسری اخلاط بنتی ہیں۔ فالتو پانی کو گردے پیشاب کے راستے سے خارج کر دیتے ہیں۔ قوت دافعہ فالتو مواد یا فضلہ کو خارج کرنے کا کام کرتی ہے۔ اور جس طرح انسان کھانے پینے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی طرح رفع حاجت پر بھی مجبور ہو جاتا ہے اور اگر رو کے تو بیمار پڑ جاتا ہے۔ پھر انسان کے جسم میں اتنی باریک نالیاں ہیں جن کا سوراخ خوردبین کے بغیر نظر

فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ

پس آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم! یہ بات ایسے ہی ایک حقیقت ہے جیسے تمہارا بولنا[۱۷] ایک حقیقت ہے۔(۲۳) (اے نبی ﷺ!) کیا آپ کے پاس[۱۸] ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات[۱۹] بھی پہنچی؟(۲۴)

ہی نہیں آسکتا۔ انھیں کے ذریعے انسان کے جسم کے حصے کو خون پہنچتا ہے۔ اس سلسلہ میں انسان کا دل پمپ کا کام کرتا ہے جو ایک منٹ بھی ٹھہر جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کا سانس لینا بھی ایک الگ پورا نظام ہے۔ سب سے نیادہ باریک آنکھ کے طبقے اور جھلیاں ہیں جو ایسی لطافت کے ساتھ بنائی گئی ہیں کہ اگر ذرا سا بھی فتور آجائے تو بینائی جواب دے جاتی ہے۔ انسان کا جسم ابتدا سے ہی حکیموں اور ڈاکٹروں کی تحقیق کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مگر اس کے بیشتر اسرار آج تک پردہ راز میں ہی ہیں۔ ان جسم کی نشانیوں میں بھی غور کرنے سے وہی دو نتائج حاصل ہوتے ہیں جو کائنات کے نظام میں غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں اور جن کا سابقہ حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

[۱۵] انسان بلکہ سب جاندار مخلوق کے رزق کا ذریعہ بارش ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ آسمان سے مراد بادل بھی ہو سکتا ہے اور نفس آسمان بھی۔ کیونکہ ہر علاقے میں جتنی بارش ہونا مقدر ہو اس کا حکم آسمان سے نازل ہوتا ہے اور ہر ایک کو اس کے مقدر کی روزی مل کے رہتی ہے کسی کے روکنے سے رک نہیں سکتی اور اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے مقدر میں ہے اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔

[۱۶] رزق انسان کو زندہ رہنے اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے لیکن وہ دنیا میں کتنا عرصہ کام کرے گا اور کب اور کہاں مرے گا۔ یہ فیصلہ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔ نیز یہاں وعدہ سے مراد وعدہ قیامت، حشر و نشر، محاسبہ و باز پرس، جزا و سزا اور جنت و دوزخ بھی ہے۔ جن کے رونما ہونے کا وعدہ تمام آسمانی کتابوں میں دیا گیا ہے۔ قیامت اور اس سے متعلقہ امور کے سب فیصلے عالم بالا ہی میں ہوتے ہیں۔

[۱۷] یعنی جس طرح تمہیں اپنے بولنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا ویسے ہی اس کلام میں بھی کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ قیامت ضرور قائم ہو گی۔ آخرت آ کے رہے گی۔ تمہارے اعمال کا ضرور محاسبہ کیا جائے گا۔ پھر تمہیں قرار واقعی سزا بھی دی جائے گی۔

[۱۸] سیدنا ابراہیم کے ہاں فرشتوں کا سیدنا اسحق کی خوشخبری دینے کا ذکر پہلے سورہ ہود کی آیت ۶۹ تا ۷۶، سورہ حجر آیت ۵۱ تا ۶۰ اور سورہ عنکبوت کی آیت نمبر ۳۱، ۳۲ میں گزر چکا ہے وہ حواشی بھی دیکھ لیے جائیں۔

[۱۹] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ہاں فرشتوں کی آمد۔ یہ معزز مہمان فرشتے تھے اور بعض مفسرین کے نزدیک یہ تین فرشتے تھے۔ سیدنا جبرائیل، سیدنا میکائیل اور سیدنا اسرافیل جو انسانی شکلوں میں آئے تھے۔

[۲۰] اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے فرشتوں سے کہا ہو کہ آپ غالباً اس علاقہ میں نئے نئے تشریف لائے ہیں۔ پہلے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی اور دوسرا یہ کہ آپ نے اپنے دل میں ایسا کہا ہو یا ضیافت کے وقت اندر جاتے

الْمُكْرَمِينَ ﴿٢٤﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ ﴿٢٥﴾ فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ
سَمِينٍ ﴿٢٦﴾ فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿٢٧﴾ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ
عَلِيمٍ ﴿٢٨﴾ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ﴿٢٩﴾ قَالُوا كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ ۖ
إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿٣٠﴾

جب وہ ابراہیم کے پاس آئے اور کہا آپ کو سلام ہے تو انہوں نے سلام کا جواب دیا (اور خیال کیا) کچھ اجنبی[۲۰] سے لوگ ہیں (۲۵) پھر وہ چپکے[۲۱] سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور ایک موٹا تازہ (بھنا ہوا) بچھڑا لے آئے (۲۶) اور اسے ان کے سامنے پیش کیا اور پوچھا: تم کھاتے کیوں نہیں؟ (۲۷) پھر اپنے دل میں ان سے خوف[۲۲] محسوس کیا۔ وہ کہنے لگے: "ڈرو نہیں" پھر انہوں نے ابراہیم کو ایک صاحب علم لڑکے کی بشارت دی۔ (۲۸) پھر اس کی بیوی بھی چلاتی ہوئی آگے بڑھی اس نے اپنا منہ پیٹا اور کہنے لگی: ایک تو بڑھیا[۲۳] اور دوسرے بانجھ؟ (۲۹) وہ کہنے لگے: "تمہارے پروردگار نے یوں ہی فرمایا[۲۴] ہے۔ وہ بلاشبہ بڑا حکمت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۳۰)

ہوئے گھر والوں سے کہا ہو۔

[۲۱] یعنی فرشتوں سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ کھانا کھائیں گے؟ کیونکہ مہمان عموماً اس کے جواب میں یہی کہہ دیتے ہیں کہ تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چپکے سے اندر آگئے اور ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کر کے اسے گھی میں تل کر یا بھون کر مہمانوں کی ضیافت کے لیے لے آئے۔

[۲۲] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عرب میں قبائلی دستور یہ تھا کہ اگر مہمان کھانا نہ کھائے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ کسی بری نیت سے آیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عین ممکن ہے کہ مہمانوں کے کھانا نہ کھانے سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہو گیا ہو کہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔ اس صورت سے ڈرنے کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے غیر معمولی حالات کے سوا انسانی شکل میں نہیں آیا کرتے لہٰذا آپ کو خوف لاحق ہوا کہ غالباً کوئی خوفناک معاملہ درپیش ہے۔

[۲۳] ❁ سیدنا ابراہیم کو اسحاق کی خوشخبری:۔ جب فرشتوں نے سیدنا اسحٰق کی خوشخبری دی تو ان کا خوف جاتا رہا۔ البتہ ان کی بیوی آگے بڑھی اور تعجب سے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے کہا یہ کیسے ہو گا؟ میں تو بانجھ ہوں، جوانی میں بھی اولاد نہ ہوئی اور اب تو بوڑھی بھی ہو چکی ہوں۔ اب یہ کیسے ہو گی؟

[۲۴] فرشتوں نے کہا ہم یہ نہیں جانتے کہ کیسے ہو گا؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ چونکہ تیرے پروردگار نے ایسا کہا ہے لہٰذا ایسا ضرور ہو گا اور وہ اپنے کام کی حکمتوں کو خود ہی خوب جانتا ہے کہ وہ سیدنا ابراہیم پر کیسی کیسی نوازشات کرنا چاہتا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ
مُّجْرِمِينَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ﴿۳۴﴾ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ

ابراہیم نے ان (فرشتوں) سے پوچھا: اے فرستادگان الٰہی! تمہارا کیا مقصد[۲۵] ہے؟(۳۱) وہ کہنے لگے ہم ایک مجرم قوم[۲۶] کی طرف بھیجے گئے ہیں۔(۳۲) تاکہ ان پر مٹی کے پتھر[۲۷] برسائیں(۳۳) جو حد سے بڑھنے والوں[۲۸] (کی ہلاکت) کیلئے آپ کے پروردگار کے ہاں سے نشان زدہ[۲۹] ہیں(۳۴) پھر وہاں جتنے مومن تھے ہم نے انہیں نکال لیا(۳۵) چنانچہ ہم نے وہاں ایک گھر کے سوا کوئی مسلمانوں[۳۰] کا گھر نہ پایا(۳۶) اور وہاں ان لوگوں کیلئے ایک نشانی[۳۱] چھوڑ دی

[۲۵] ❁ خَطْب کا لغوی مفہوم:۔ خَطْب بمعنی حال، معاملہ، مقصد خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اور یہ لفظ عام طور پر کسی ناپسندیدہ معاملہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ فرشتے ہیں اور فرشتے انسانی شکل میں غیر معمولی حالات میں ہی آیا کرتے ہیں۔ بیٹے کی بشارت سے ان کا اندیشہ تو دور ہو گیا تاہم ابھی اصل حیرت کا معاملہ باقی تھا۔ لہٰذا آپ نے فرشتوں سے پوچھا کہ آپ کس مہم پر تشریف لائے ہیں اور کیا مقصد ہے؟

[۲۶] ❁ ذکر قوم لوط:۔ یہ مجرم قوم، قوم لوط تھی جس کے تعارف کے لیے مجرم قوم ہی کہہ دینا کافی ہے۔ کیونکہ وہ مجسم مجرم تھی۔ اللہ کے ساتھ شرک کرتی تھی۔ لواطت کی بانی اور موجد تھی۔ مسافروں سے لواطت کر کے ان کا مال اسباب چھین کر اپنی بستی سے چلتا کر دیتی تھی۔ آخرت کی اور رسولوں کی منکر تھی اور اپنے نبی کو اپنی بستی سے نکال دینے کی دھمکیاں دیتی تھی۔ غرضیکہ وہ ہر طرح کے کفر و شرک اور فسق و فجور میں مبتلا قوم تھی۔

[۲۷] یعنی ایسے نوکیلے اور چبھ جانے والے کنکر جو ابھی پوری طرح پتھر نہ بنے ہوں اور ان کا کچھ حصہ مٹی سے پتھر بن رہا ہو۔

[۲۸] یہ لوگ طبعی حدود بھی پھاند گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تو جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے عورت کو پیدا کیا تھا۔ مگر انہوں نے عورت کو چھوڑ کر مردوں سے ہی یہ خواہش پوری کرنا شروع کر دی تھی۔ علاوہ ازیں سب اخلاقی اور قانونی حدود بھی پھاند گئے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا مجرم قوم کے طور پر تعارف کرایا گیا۔

[۲۹] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ پتھر صرف مجرم قوم کے افراد ہی کو ہلاک کریں گے۔ اگر کسی دوسرے کو لگ بھی جائیں تو اسے ہلاک نہیں کریں گے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر پتھر پر نشان کر دیا گیا تھا کہ وہ فلاں شخص کو ہلاک کرے گا۔

[۳۰] ❁ قوم لوط میں مسلمانوں کا صرف ایک گھرانہ تھا:۔ یہ سیدنا لوط علیہ السلام کا گھرانہ تھا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کل تیرہ افراد تھے جو اس تباہ کن عذاب سے بچے تھے۔ ان کی بیوی بھی تباہ ہو جانے والوں میں شامل تھی۔ ممکن ہے آپ پر ایمان لانے والوں نے بھی آپ کے ہی گھر میں پناہ لے رکھی ہو۔ واضح رہے کہ سیدنا لوط علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمان ہی کے لقب سے نوازا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک دین حق صرف اسلام ہی ہے اور سب نبیوں پر ایمان لانے والے مسلمان ہی ہوتے تھے۔ اور ابتداءً مسلمان ہی کہلاتے تھے۔ بعد میں ہر نبی کی امت نے اپنے لیے علیحدہ علیحدہ نام رکھ لیے تھے۔ پھر وہ انہیں ناموں سے متعارف ہونے لگے۔

[۳۱] ❁ لوگوں کے لئے نشانی بحیرہ مردار:۔ وہ نشانی یہ تھی کہ جب فرشتوں نے اس پورے خطہ زمین کو اٹھا کر اور بلندی پر لے

الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۳۷﴾ وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ﴿۳۹﴾ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ

جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔(۳۷) اور موسیٰ (کے واقعہ میں بھی) ایک نشانی (ہم نے چھوڑی ہے) جب ہم نے اسے صریح[۳۲] معجزہ دے کر فرعون کی طرف بھیجا(۳۸) تو اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر سرتابی[۳۳] کی اور کہنے لگا کہ: ''یہ ساحر یا دیوانہ ہے۔''(۳۹) پھر ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑ لیا اور سمندر میں پھینک دیا اور وہ تھا ہی قابل ملامت[۳۴](۴۰) اور عاد کے قصہ میں بھی (ایک نشانی چھوڑی ہے) جبکہ ہم نے ان پر تباہ کن[۳۵] آندھی چھوڑ دی (۴۱)

جا کر پھر اس کو الٹا کر زمین پر دے مارا تو یہ پورا خطہ زمین کے اندر دھنس گیا اور سطح سمندر سے چار سو کلو میٹر نیچے چلا گیا اور اس کے اوپر کالا پانی چڑھ آیا۔ جو ایک سمندر کی شکل اختیار کر گیا۔ پانی کے اس ذخیرہ کو بحر میت یا بحیرۂ مردار یا غرقاب لوطی کہا جاتا ہے۔ اس بحیرۂ مردار (Dead Sea) کا جنوبی علاقہ آج بھی عظیم الشان تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔

[۳۲] یعنی ایسے معجزات جن سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ اور یہ معجزے عصائے موسیٰ اور ید بیضا تھے۔

[۳۳] ❁ فرعون سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر یا دیوانہ کیوں کہتا تھا؟ یعنی اپنی حکومت سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اور ملازموں کو ساتھ ملا کر مشترکہ طور پر موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی مخالفت اور اللہ کے حکم سے سرتابی کی پھر اپنے تمام ذرائع ابلاغ کو کام میں لا کر ملک بھر میں مشہور کر دیا کہ موسیٰ یا تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ وہ جادوگر اس لیے کہتا تھا کہ اپنی قوم کو وہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزے بس جادو کے کرشمے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں اور دیوانہ اس لیے کہتا تھا کہ آپ نے فرعون جیسے جابر اور قاہر فرمانروا سے کھلے الفاظ میں یہ مطالبہ کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ہمراہ روانہ کر دو۔ وہ کبر و نخوت کا پتلا یہ سمجھتا تھا کہ اگر موسیٰ جیسا کمتر آدمی جو ہمارا قتل کا مفرور مجرم بھی ہے، مجھ سے ایسا مطالبہ کرے تو یہ اس کی دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے؟

[۳۴] یعنی جب یہ ظالم و جابر حکمران اپنے لشکروں سمیت غرق ہو گیا تو کسی نے ان کی تباہی پر آنسو نہ بہائے۔ ہر کوئی انہیں ملامت کرتا اور برے لفظوں سے یاد کرتا تھا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس ملعون سے جان چھوٹی۔

[۳۵] ❁ قوم عاد پر تباہ کن ہوا:۔ ﴿الرِّيحَ الْعَقِيمَ﴾ لفظی معنی بانجھ ہوا۔ یعنی ایسی ہوا جو ہر طرح کی خیر و برکت سے خالی ہو۔ اور اس میں سراسر نقصان ہی نقصان ہو۔ بعض ہوائیں راحت پہنچانے والی، بعض خوشبو سے دماغ کو معطر کر دینے والی، بعض بارش کی خوشخبری لانے والی، بعض بادل اٹھانے والی اور بعض نر درختوں کا تخم اٹھانے والی ہوتی ہیں۔ ان سب میں کوئی نہ کوئی خیر و برکت کا پہلو ہوتا ہے مگر جو ہوا قوم عاد پر چھوڑی گئی وہ ہر طرح کی خیر و برکت سے خالی اور بانجھ تھی۔

الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا
حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ
قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

وہ جس چیز پر بھی گزرتی اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح چکنا چور[۳۶] کر دیتی (۴۲) اور ثمود میں (بھی ایک نشانی چھوڑی ہے) جب ان سے کہا گیا کہ ایک خاص وقت[۳۷] تک مزے اڑالو (۴۳)

مگر (اس تنبیہ کے باوجود) انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی تو ان کے دیکھتے دیکھتے ہی انہیں[۳۸] بجلی کے عذاب نے آلیا (۴۴) پھر نہ تو ان میں کھڑا ہونے کی سکت رہ گئی اور نہ ہی[۳۹] وہ اپنا بچاؤ کر سکے (۴۵) اور اس سے پہلے ہم نے قوم نوح (کو ہلاک کیا تھا) بلاشبہ وہ نافرمان[۴۰] لوگ تھے۔ (۴۶)

[۳۶] یہ بانجھ ہوا باد صرصر تھی اولوں کی طرح ٹھنڈی یخ اور آندھی سے بھی زیادہ تیز۔ جو بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ یہ طوفانی ہوا ان پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن چلی۔ ان کے مکانوں کے اندر داخل ہو کر ہر چیز کو فنا کر رہی تھی۔ اس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر پہلے بھی گزر چکا ہے اور بعد میں بھی آئے گا۔

[۳۷] ❁ ذکر قوم ثمود:۔ قوم ثمود کی طرف صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے قوم کو اللہ کا پیغام پہنچایا لیکن وہ مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اس وقت صالح علیہ السلام نے کہا کہ اگر تم اس دعوت کو قبول نہ کرو گے تو تم پر عذاب الٰہی آکے رہے گا۔ اس عذاب سے پیشتر ہی تم دنیا کے مال و متاع سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ یا ممکن ہے یہاں حین سے مراد عذاب کے وقت کے بجائے ان کی موت کا وقت ہو۔

[۳۸] ❁ گرنے والی بجلی کا عذاب:۔ صاعقة آسمان سے گرنے والی بجلی کو کہتے ہیں اور وہ جس چیز پر گرتی ہے اسے جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قوم ثمود کا قصہ بھی پہلے بہت سے مقامات پر گزر چکا ہے۔ ان پر جو عذاب نازل ہوا اس کے لیے کہیں صیحة (زبردست چیخ، کڑک، دھماکہ) کا لفظ آیا ہے اور کہیں رجفة (زلزلہ) کا۔ گویا ان پر زمین سے عذاب آیا تھا اور آسمان سے بھی اور ہر مقام پر کسی ایک پہلو کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

[۳۹] ❁ انتصر کے دو مفہوم:۔ یعنی عذاب سے دہشت کا یہ عالم تھا کہ جو بیٹھا تھا اس کو اٹھ کر کھڑا ہونے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ کہیں جا کر عذاب سے پناہ لینا تو دور کی بات ہے۔ انتصار کا لفظ دو معنوں میں آتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی حملہ کرے تو اس سے اپنا بچاؤ کرنا اور دوسرا یہ کہ جو حملہ کرے اس سے بدلہ لے لینا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ یہ قوم بڑے مضبوط جسم والی بڑے ڈیل ڈول والی، اپنی طاقت اور قوت پر فخر و ناز کرنے والی تھی اور ڈینگیں مارنے والی تھی۔ پھر جب ان پر ہمارا عذاب نازل ہوا تو یہ بدلہ تو نہ لے سکی۔

[۴۰] ❁ ذکر قوم نوح:۔ سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ صرف ایک آیت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

وَالسَّمَاۗءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ وَمِنْ كُلِّ
شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اور آسمان کو ہم نے اپنے دستِ (قدرت) سے بنایا اور ہم اسے وسیع کرتے[۴۱] جا رہے ہیں (۴۷) اور زمین کو ہم نے بچھا دیا اور ہم بڑے اچھے بچھانے والے[۴۲] ہیں۔ (۴۸) اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے[۴۳] پیدا کر دیئے شاید تم (ان سے) سبق حاصل کرو (۴۹) پس اللہ کی طرف دوڑ کر آؤ۔ میں تمہارے لئے اس کی طرف سے واضح طور پر ڈرانے والا ہوں (۵۰)

اس میں اس قوم کے جرم اور اس کی سزا دونوں کا ذکر آیا ہے۔ سابقہ آیات میں چند تاریخی شواہد پیش کر کے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ مکافاتِ عمل کا قانون اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔

❁ سب قوموں کے ایک جیسے جرم اور انجام سے سبق:۔ جس قوم نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی اور اکڑ دکھائی اس کا انجام یہی ہوا کہ وہ تباہ و برباد ہو کے رہی۔ اور یہ عذاب محض ان کی گرفتاری کے حکم کا درجہ رکھتا تھا تاکہ وہ مزید جرائم نہ کر سکیں اور دوسرے لوگ ان کے مظالم سے بچ جائیں۔ رہی ان کے جرائم کی اصل سزا تو وہ قیامت کے دن مقدمہ، شہادتوں اور ثبوت جرم کے بعد دی جائے گی۔ اور یہ تاریخی واقعات، ان کا سبب اور ان کا نتیجہ سب کچھ کفار کو سنائے جا رہے ہیں تاکہ وہ خود ہی سمجھ جائیں کہ اگر وہ لوگ بھی حق کی مخالفت سے باز نہ آئے تو ان کا بھی ایسا ہی انجام ہو سکتا ہے۔

[۴۱] ❁ کائنات کی وسعت:۔ کائنات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن میں آج تک تخلیق اور توسیع کا عمل جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے۔ اس کی نسل بڑھ رہی ہے۔ تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہی کائنات کا شاہکار ہے۔ پھر زمین کی پیداوار بھی اللہ تعالیٰ اسی نسبت سے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ اس آیت میں بالخصوص آسمان کا ذکر ہے۔ آسمان کی پیدائش کا بھی یہی حال ہے یہاں آسمان سے مراد پہلا آسمان یا کوئی خاص آسمان نہیں بلکہ یہاں سماء سے مراد فضائے بسیط ہے جب کہ اس آیت ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ﴾ (۲۹:۲) میں بھی سماء سے مراد فضائے بسیط ہے۔ جس میں لاتعداد مجمع النجوم اور کہکشائیں ہیئت دانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر ان کے علم کو ہر آن چیلنج کر رہی ہیں۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ہیئت دان جوں جوں پہلے سے زیادہ طاقتور اور جدید قسم کی دوربینیں ایجاد کر رہے ہیں توں توں اس بات کا بھی انکشاف ہو رہا ہے کہ کائنات میں ہر آن مزید وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ سیاروں کے درمیانی فاصلے بھی بڑھ رہے ہیں اور نئے نئے اجرام بھی مشاہدہ میں آ رہے ہیں۔

[۴۲] ❁ زمین گہوارہ کیسے ہے؟ یعنی سطح زمین کو ہموار بنا دیا تاکہ لوگ اور دوسرے جانور آسانی سے اس پر چل پھر سکیں۔ پھر سطح زمین پر ایک زرخیز چھلکا چڑھا دیا جس میں روئیدگی کی قوت رکھ دی تاکہ زمین پر رہنے والوں کو غذا مہیا ہو سکے۔ زمین کو سورج سے اتنی دور رکھا کہ زمین پر بسنے والے جاندار اس کی گرمی سے جل کر تباہ نہ ہو جائیں۔ اور نہ ہی اتنا زیادہ دور کر دیا کہ وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں۔ نیز انسان کی جملہ ضروریات خورد و نوش، لباس، مسکن اور مدفن سب چیزوں کو زمین سے وابستہ کر دیا۔ اس طرح انسان اس قابل ہو گیا کہ کائنات کی اکثر چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی منزلیں طے کر سکے اور قیامت تک اس زمین پر آباد رہ سکے۔

[۴۳] ❁ ہر چیز کے جوڑے اور زوج کے مختلف مفہوم:۔ زوج کا لفظ عربی میں تین معنوں میں آتا ہے۔ (۱) متضاد اشیاء جیسے

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ نہ بناؤ [۴۴] میں اس کی طرف سے تمہیں صاف صاف ڈرا رہا ہوں۔(۵۱) اسی طرح ان (کفار مکہ) سے پہلے جو رسول بھی آیا اسے لوگوں نے یہی کہا کہ وہ جادوگر ہے یا دیوانہ [۴۵] ہے۔(۵۲) کیا یہ اس بات کی وصیت کرتے چلے آئے ہیں؟ بلکہ [۴۶] یہ ہیں ہی سرکش لوگ (۵۳) پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان کی پروانہ کیجئے۔ آپ پر کوئی الزام نہیں۔(۵۴)

دن اور رات، دھوپ اور سایہ، روشنی اور تاریکی، سیاہی اور سفیدی، خوشی اور رنج، خوشحالی اور تنگدستی وغیرہ۔ (۲) ہم شکل اشیاء کے لیے جیسے پاؤں کے دونوں جوتے ایک دوسرے کا زوج ہیں۔ اسی طرح ہر دور کے مشرک ایک دوسرے کا زوج ہیں۔ ایک ہی نوعیت کے مجرم ایک دوسرے کا زوج ہیں۔ (۳) نر و مادہ کے لیے مثلاً خاوند بیوی کا زوج ہے، بیوی خاوند کی زوج ہے۔ ہر نر مادہ کا زوج ہے اور ہر مادہ نر کا زوج ہے۔ اور اس آیت میں غالباً اسی قسم کے زوج مراد ہیں۔ جانداروں میں ایک دوسرے کا زوج تو سب کے مشاہدہ میں آچکا ہے۔ نباتات میں بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔ بار بردار ہوائیں نر درختوں کا تخم مادہ درختوں پر ڈال دیتی ہیں تو تب ہی ان میں پھل لگتا اور پکتا ہے اور جدید تحقیق کے مطابق یہ سلسلہ جمادات میں بھی پایا جاتا ہے۔ بجلی کا مثبت اور منفی ہونا یا ایک حقیر سے ذرہ میں الیکٹرون اور پروٹون کا مثبت اور منفی ہونا انسان کے علم میں آچکا ہے۔ مقناطیس میں بھی مثبت اور منفی سرے ہوتے ہیں۔ اور جمادات تو کیا ہر چیز ذرات ہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس نر و مادہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ چلایا کہ ان دونوں کے ملاپ سے ایک تیسری چیز وجود میں آتی ہے جس میں بعض دفعہ تو اصل نر اور مادہ کے کچھ کچھ خواص موجود ہوتے ہیں اور بعض دفعہ یہ تیسری چیز ایسی چیز پیدا ہوتی ہے جس کے خواص پہلی دونوں چیزوں سے بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اور اسی چیز کا نام کیمیا یا کیمسٹری ہے۔ انسان کا علم جس حد تک پہنچ چکا ہے وہ بہرحال محدود ہے۔ جبکہ وحی الٰہی پورا علم ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں اور ان میں غور کرنے سے انسان کو اللہ کی قدرت کاملہ سے متعلق بہت سبق ملتے اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

[۴۴] انہی مذکورہ اشیاء کا ذکر کر کے انسان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ یہ سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد تمہیں چاہیے کہ فوراً ان اشیاء کے خالق کی طرف رجوع کرو۔ اور صرف اسی کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ تخلیق، ملکیت اور تصرف سب کچھ اسی کا ہے۔ دوسرا کوئی اس میں حصہ دار نہیں۔

[۴۵] ❁ ہر نبی کو ساحر اور دیوانہ کہا جاتا رہا ہے:۔ یعنی یہ ساحر اور دیوانہ کا جو لقب کفار مکہ کی طرف سے آپ کو دیا گیا ہے۔ تو آپ اس لقب میں منفرد نہیں بلکہ پہلی قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو انہی القاب سے نوازا تھا۔ کفار رسولوں کو ساحر تو اس لحاظ سے کہتے تھے کہ بعض کفار کے مطالبہ پر اور بعض دفعہ مطالبہ کے بغیر ان پیغمبروں سے ایسے واقعات کا ظہور یا صدور ہوتا تھا جو خرق عادت ہوتے تھے۔ جنہیں معجزات بھی کہا جاتا ہے اور مجنوں اس لحاظ سے کہتے تھے کہ پیغمبر جو دعوت پیش کرتا ہے وہ ساری قوم کے مزاج اور اعتقاد کے خلاف ہوتی تھی اور رسول یہ دعوت پیش کر کے ساری قوم کی مخالفت مول لے لیتا تھا۔ اور یہی بات ان لوگوں کی نگاہ میں دیوانگی تھی۔

[۴۶] ❁ سب کافروں میں قدر مشترک:۔ ان کے اس کردار کے تسلسل سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم اپنے بعد میں

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝۵۵ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝۵۶ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ

اور نصیحت کرتے رہیے۔ کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں[۴۷] کو فائدہ دیتی ہے۔(۵۵) اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا[۴۸] ہے کہ وہ میری عبادت کریں(۵۶) میں ان سے رزق نہیں چاہتا

آنے والی قوم کو یہ وصیت کر کے مرتی رہی کہ اگر تمہارے پاس کوئی رسول آئے تو تم بھی اسے ساحر اور مجنون ہی کہنا۔ بات یوں نہیں کہ ان قوموں کے درمیان کافی بُعد زمانی یا مکانی پایا جاتا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ایسے سب کافروں میں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہیں اور وہ ہیں آبائی دین سے محبت 'عصبیت' ہٹ دھرمی، اکڑ اور شریعت کی پابندیوں سے آزادی کی خواہش۔ جو انہیں اس بات پر مجبور کر دیتی ہیں کہ پیغمبروں کو ان القاب یا ان جیسے ملتے جلتے القابات سے پکار کر ان کا مذاق اڑائیں۔ اس سے ایک اور اہم بات کا پتہ چلتا ہے کہ نیکی اور بدی، عدل اور ظلم سے متعلق جو محرکات نفس انسان میں بالطبع پائے جاتے ہیں وہ ہر دور میں ایک جیسے رہے ہیں، تبدیلی صرف واقعات میں ہوئی ہے۔ مثلاً جو رقابت سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو سیدنا یوسف علیہ السلام سے تھی وہ آج بھی بھائیوں میں ویسے ہی پائی جاتی ہے اگرچہ حالات اور واقعات مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر دور کے کافروں کا اپنے انبیاء سے مذاق و تمسخر اور القابات ایک ہی جیسے رہے ہیں۔ اگرچہ ان کے حالات و واقعات مختلف قسم کے تھے۔

[۴۷] ❁ سعید روحوں کا نصیحت کا انتظار:۔ یعنی پیغمبر یا داعی حق کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ کا پیغام مسلسل پہنچاتے رہیں۔ خواہ ان کے سامنے مخالف یا ناقدر شناس ہی بیٹھے ہوں۔ اس لیے کہ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے لاکھوں کروڑوں افراد میں وہ سعید روحیں کہاں ہیں جو اس دعوت کو ماننے کے لئے تیار بیٹھی ہیں اور فقط دعوت کے پہنچنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ یہی لوگ اس کی اصل دولت اور سرمایہ ہیں۔ انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے۔ ایسے ہی لوگ اس کا دست راست بنتے اور اس کے ساتھ مصائب جھیلنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

[۴۸] ❁ عبادت کا وسیع مفہوم:۔ ساری کائنات میں جن اور انسان ہی تکالیف شرعیہ کی مکلف مخلوق ہے۔ ان کو میں نے دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس لیے کہ میں ہی ان کا خالق ہوں۔ اب اگر یہ مجھے اپنا خالق تسلیم کرنے کے باوجود بندگی دوسروں کی کرنے لگیں تو ان کی حماقت کی کوئی حد ہے؟ اور دوسرے جب وہ خالق ہی نہیں تو انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بندگی کے مستحق یا معبود بن بیٹھیں۔ واضح رہے کہ عبادت کا مفہوم محض ارکان اسلام کی بجا آوری نہیں ہے جیسا کہ عوام میں مشہور ہو چکا ہے۔ بلکہ غلام ہر وقت اپنے مالک کا غلام ہے۔ اگر مالک نے کچھ کاموں پر اس کی ڈیوٹی لگا دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مالک اسے کوئی دوسرا کام کرنے کو کہہ نہیں سکتا۔ یا ملازم ڈیوٹی کے طے شدہ کام کے علاوہ دوسرے کام سے انکار کا حق رکھتا ہے۔ لہٰذا بندہ ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کا بندہ ہے اور اسے ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کی اطاعت اور عبادت میں مصروف رہنا چاہیے۔

مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾

ع ۳

نہ ہی یہ چاہتا[۴۹] ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔(۵۷)

اللہ تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا ہے اور زبردست[۵۰] ہے۔(۵۸) سو ان ظالموں (کے گناہوں) کا ڈول[۵۱] بھی ایسے ہی بھر چکا ہے جسے ان جیسے دوسرے لوگوں کا بھر گیا تھا۔ لہٰذا یہ مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کریں۔(۵۹) کفر کرنے والوں کے لئے اس دن تباہی ہو گی[۵۲] جس دن سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے۔(۶۰)

[۴۹] اہل عرب غلاموں کی کمائی کھاتے تھے اور اللہ اپنے بندوں کو کھلاتا ہے:۔ دور نبوی کے عرب معاشرہ میں غلام رکھنے کا رواج تھا اور مالک ان سے اپنی خدمت ہی نہیں لیتے تھے بلکہ انہیں کمائی کے لیے بھیجتے اور ان کی کمائی کھاتے تھے۔ گویا غلام ہی ان کا سرمایہ تھے۔ جس کے پاس جتنے زیادہ غلام ہوتے اتنا ہی وہ زیادہ مالدار سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں اس کی مثال فیکٹری سے دی جا سکتی ہے۔ ایک فیکٹری میں اگر دس ملازم ہیں اور دوسری میں سو ہیں تو سو ملازموں کی فیکٹری کا مالک یقیناً زیادہ سرمایہ دار اور مالدار سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمام انسان اور جن میرے بندے اور غلام ہیں۔ لیکن میں ان کی کمائی نہیں کھاتا نہ ہی مجھے اس کی حاجت ہے، بلکہ رزق تو میں خود سب کو دے رہا ہوں میں لے کیسے سکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ایک اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے جو یہ ہے کہ معبود حقیقی کی شان یہ ہے کہ وہ رزق دیتا ہے لیتا نہیں۔ جبکہ دوسرے معبود اپنے عبادت گزاروں سے رزق اور پیسے لیتے ہیں۔ اگر عبادت گزار اور مرید حضرات اپنے نذرانے اور نیازیں دینا بند کر دیں تو ان کی خدائی ایک دن بھی نہ چل سکے۔ یہی دلیل ان کے باطل ہونے کے لیے کافی ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اگر دوسروں کو عبادت سے منع کیا ہے تو اپنی عبادت کا کیوں حکم دیا ہے؟ کیا اسے اس کی احتیاج ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے کوئی احتیاج نہیں کیونکہ وہ بے نیاز ہے۔ کسی کے عبادت کرنے یا نہ کرنے سے نہ اس کا کچھ بگڑتا ہے اور نہ سنورتا ہے۔ بلکہ اللہ کی عبادت کرنے اور خالق و مالک کا حق پہچاننے میں ان کا اپنا ہی بھلا ہے جیسا کہ بے شمار آیات و احادیث سے واضح ہے۔

[۵۰] ❁ متین کا لغوی مفہوم:۔ متین: متن کے معنی کسی چیز کا اپنی ذات میں مضبوط ہونا اور اس میں صلابت کا پھیل جانا اور حبل متین بمعنی مضبوط رسی، اور اللہ تعالیٰ کے متین ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ مضبوط اور غیر متزلزل ہے جسے کوئی ہستی یا کوئی قوت اس کے مقام یا اس کے ارادہ سے ہلا نہیں سکتی۔

[۵۱] کنوئیں وغیرہ سے پانی نکالنے والا ڈول یا ٹنی اگر خالی ہو تو اسے دلو کہتے ہیں اور اگر بھرا ہوا ہو تو اسے ذنوب کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دعوت حق کی مخالفت کے لحاظ سے یہ مکہ کے ظالم لوگ بھی اسی پستی تک پہنچ چکے ہیں۔ اور ان کی بقا کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے جیسے ان جیسے اور ان سے پہلے کے ظالموں کا ہوا تھا۔ اور اب ان پر اللہ کا عذاب آنے والا ہے (اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی تھی) لہٰذا انہیں جلدی مچانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب ان کے گناہوں سے بھرا ہوا ڈول ڈوب کے ہی رہے گا۔

[۵۲] یہ وعدہ کا دن قیامت کا دن بھی ہو سکتا ہے، ان کی موت کا بھی اور بدر کا دن بھی، جو دن بھی ہو ان کی تباہی بہر حال یقینی ہے۔ پھر معلوم نہیں یہ کس خوشی میں جلدی مچا رہے ہیں؟

۴۹ اٰیاتھا ۔۔۔ سُوْرَۃُ الطُّوْرِ مَکِّیَّۃٌ ۔۔۔ رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَالطُّوْرِ ۝۱ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝۲ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝۳ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝۴ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝۵ وَالْبَحْرِ

کلمات ۳۱۹ ۔۔۔ آیت ۴۹ ۔۔۔ (۵۱) سورۃ الطور مکی ہے (۷۶) ۔۔۔ رکوع ۲ ۔۔۔ حروف ۱۳۳۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کوہ[۱] طور کی قسم(۱) اور اس کتاب کی(۲) جو کھلے ہوئے صفحات[۲] میں لکھی ہوئی ہے۔(۳) اور بیت المعمور[۳] کی قسم(۴) اور اونچی [۴] چھت کی(۵) اور جوش مارتے[۵] ہوئے سمندر کی(۶)

[۱] ❁ کوہ طور کے مختلف نام اور محل وقوع:۔ طور کو طور سیناء اور طور سینین بھی کہا گیا ہے۔ سیناء اور سینین دونوں ایک ہی پہاڑ کے نام ہیں۔ جس کی سطح سمندر سے بلندی ۷۳۶۰ فٹ ہے اور مدین سے مصر یا مصر سے مدین جاتے ہوئے (شام کے ملک میں) راستے میں پڑتا ہے۔ اسی مقام پر موسیٰ علیہ السلام کو دو دفعہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اسی پہاڑ کی ایک چوٹی کا نام طور ہے اور اسی پہاڑ کے دامن میں واقع وادی کا نام طویٰ ہے جسے قرآن میں وادی مقدس اور بقعۃ المبارکۃ بھی کہا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے تو اسی راستے سے گزرے تھے۔ کوہ طور کو اسی نسبت سے طور سینین کہا جاتا ہے۔

[۲] ❁ رق کا لغوی مفہوم:۔ رَقّ بمعنی پتلا اور نرم ہونا اور رق ہر وہ چیز ہے جو پتلی اور نرم ہو۔ مثلاً درختوں کے پتے جھلی، پتلا چمڑہ اور کاغذ وغیرہ (مفردات) اور کتب سماویہ عموماً جھلی اور پتلے چمڑے پر لکھے جاتی تھیں۔ تاکہ امتداد زمانہ کا ساتھ دے سکیں اور خراب نہ ہوں۔ اور نشر کے معنی کھولنا بھی ہے اور پھیلانا بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب ہو گا وہ کتاب جس کے صفحات کھلے ہوئے ہیں، کہتے ہیں نَشَرْتُ الْكِتَابَ ثُمَّ طَوَيْتُهُ میں نے کتاب کھولی پھر بند کر دی اور اس سے مراد کوئی بھی آسمانی کتاب ہو سکتی ہے بلکہ لوح محفوظ بھی اور ربط مضمون یا طور کے ذکر کے لحاظ سے تورات کی تختیاں بھی۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس سے مراد اہل کتاب کی کتابوں کا وہ مجموعہ ہے جو دورِ نبوی میں بھی دستیاب تھا، نایاب نہیں تھا اور لوگوں میں معروف و مشہور تھا۔

[۳] ❁ بیت المعمور کونسا گھر ہے؟ یعنی ہر وقت آباد رہنے والا گھر۔ اس سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ جو ہر وقت حج و عمرہ اور طواف اور عبادت کرنے والوں سے بھرا رہتا ہے اور کبھی خالی نہیں ہوتا۔ نیز اس سے مراد ساتویں آسمان پر فرشتوں کی وہ عبادت گاہ بھی ہے جو خانہ کعبہ کے عین سیدھ میں واقع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو شبِ معراج میں جب آسمانوں کی سیر کرائی گئی تو آپ ﷺ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اسی گھر کی دیوار سے ٹیک لگائے دیکھا تھا۔

[۴] اس سے مراد وہ نیلگوں آسمان ہے جو ہمیں اپنے سروں پر قبہ کی طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے نیز اس سے پورے کا پورا عالم بالا بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

[۵] مسجور۔ سجر میں کسی چیز کے بھرے ہوئے ہونے اور اس میں مخالطت یا تلاطم کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ (مقائیس اللغۃ و ماس

الْمَسْجُوْرِ ۝۶ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝۹ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝۱۰

کہ آپ کے پروردگار کا عذاب واقع[۶] ہو کے رہے گا۔(۷) اسے کوئی روکنے والا نہیں (۸) جس دن آسمان تیزی سے لرزنے[۷] لگے گا(۹) اور پہاڑ تیزی سے اڑتے[۸] پھریں گے (۱۰)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس سمندر کی قسم جو لبالب بھرا ہوا بھی ہے اور اس کے تلاطم میں اتنا جوش ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابل رہا ہو۔

[۶] ❁ **پانچ قسموں کی تفصیل:۔** مذکورہ بالا پانچ چیزوں کی قسم کھاتے ہوئے یا انہیں بطور شہادت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت اور اس کا عذاب واقع ہو کے رہے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ پانچوں چیزیں کسی اہم مفید اور قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر اسی قدرت کاملہ سے انسان کو یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فی الواقع قیامت بپا کرنے پر قادر ہے۔(۱) طور وہ مقام ہے جہاں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی اور اسی رات اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون جیسے جابر بادشاہ کی غلامی سے آزاد کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ آزادی انہیں نصیب ہوئی اور ان کا دشمن غرق ہوا۔ (۲) تمام کتب سماویہ جو اہل کتاب کے ہاں موجود تھیں سب میں صراحت کے ساتھ آخرت کے یقینی ہونے کا ذکر موجود تھا (۳) کعبہ کی رونق اور آبادی، کعبہ کی ابرہہ یا اصحاب الفیل سے حفاظت، کعبہ کی تولیت کی بنا پر قریش مکہ کا عرب بھر میں عزت و احترام اور سیاسی برتری سب چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کی پشت پر کوئی زبردست قوت موجود ہے (۴) اسی اونچی چھت کو دوسرے مقام پر محفوظ چھت بھی کہا گیا ہے یعنی فضائے بسیط میں لاتعداد شہاب ہر وقت ٹوٹتے اور گرتے رہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ایسا انتظام کر دیا ہے کہ زمین پر گرنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں اور انسان ایسی بلاؤں سے محفوظ رہتے ہیں، (۵) اس بھرے ہوئے سمندر کو اللہ نے کس طرح روک اور باندھ رکھا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ سمندر کا سارا پانی زمین میں جذب ہو جاتا پھر نہ بخارات بنتے نہ بارش ہوتی اور نہ پیداوار۔ اس طرح تمام جاندار مخلوق کو کھانا تو در کنار پانی بھی پینے کو نہ ملتا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اس بات سے بھی روک رکھا ہے کہ وہ جوش میں آکر روئے زمین پر پھیل جائے اور سطح زمین کو غرقاب کر دے۔ ان سب چیزوں کو شہادت کے طور پر پیش کر کے فرمایا کہ وہ عذاب واقع ہو کر رہے گا۔

[۷] ❁ **مور کا لغوی مفہوم:۔** تمور۔ مار میں بنیادی تصور حرکت اور تیز رفتاری ہے اَلنَّاقَةُ تَمُوْرُ فِیْ سَیْرِھَا بمعنی اونٹنی کا تیز رفتاری کی وجہ سے غبار اڑاتے چلے جانا (مفردات) اور مور بمعنی غبار بن کر ہوا میں اڑنا (فقہ اللغۃ) اور مَارَ الشَّیْءُ بمعنی کسی چیز کا تیز رفتاری کی وجہ سے آگے پیچھے ہلنا، لرزنا اور توازن کھو دینا (منجد) گویا اس دن آسمان کے انجر پنجر ہل جائیں گے وہ کانپنے، لرزنے، ہچکولے کھانے، ڈگمگانے اور بالآخر ذرات کی شکل میں تبدیل ہو کر اڑنے لگے گا۔

[۸] یعنی وہ پہاڑ جو زمین کی ڈگمگاہٹ اور ہچکولوں کو بند کرنے کے لیے زمین پر پھیلائے گئے تھے ان کی زمین میں اپنی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور وہ خود تیزی سے اڑتے پھریں گے اور ایسا معلوم ہو گا جیسے وہ دھنکی ہوئی روئی کے گالے ہیں جو اڑ رہے ہیں۔ اس طرح زمین و آسمان کا سارا انتظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ
النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ
سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿۱۷﴾
فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْۗـــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

اس دن جھٹلانے والوں کے لئے تباہی[۹] ہے(۱۱) جو کج بحثیوں میں پڑے کھیل رہے ہیں(۱۲) جس دن انہیں دھکے مار مار[۱۰] کر آتش دوزخ کی طرف چلایا جائے گا(۱۳) (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ جہنم جسے تم جھٹلایا کرتے تھے(۱۴) اب بتاؤ کیا یہ جادو[۱۱] ہے یا تمہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا؟(۱۵) اس میں داخل ہو جاؤ، اب تم صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لئے یکساں ہے تمہیں تو ویسا[۱۲] ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم کام کرتے رہے۔(۱۶) (البتہ) پرہیزگار[۱۳] باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے(۱۷) جو کچھ انہیں انکا پروردگار عطا کرے گا اس سے لطف اندوز ہوں گے اور ان کا پروردگار انہیں دوزخ کے عذاب[۱۴] سے بچالے گا(۱۸) (انہیں کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ پیو یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جو تم کرتے رہے۔(۱۹)

[9] ایسا ہوگا وہ دن جس کے لیے کفار جلدی مچا رہے ہیں جو آتے ہی کافروں کی تباہی لائے گا، ان کافروں کی جو آج دنیا کی دلفریبیوں میں مست ہو کر اس دن کا مذاق اڑاتے اور مذاق اڑا کر خوش ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس دن سے پہلے ایمانداروں کو دنیا سے اٹھا لیا جائے گا۔ اور یہ دن صرف کافروں پر ہی واقع ہوگا جیسا کہ صحیح حدیث میں مذکور ہے کہ "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ النَّاسِ" یعنی قیامت بدترین لوگوں پر قائم ہوگی۔

[10] دعّ بمعنی دھکے مار کر نکال دینا۔ سختی سے رفع کرنا (فقہ اللغۃ) یعنی کافر جہنم کی طرف جانے کو تیار نہ ہوں گے تو انہیں دھکے مار مار کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔

[11] یعنی دنیا میں جب تمہیں تمہارے برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ تم مر کر زندہ کیے جاؤ گے پھر تمہاری باز پرس اور محاسبہ ہوگا پھر تمہیں تمہارے برے اعمال کی سزا ملے گی تو تم کہہ دیتے تھے کہ یہ تو بس جادوگری ہے۔ اب بتاؤ کیا یہ جادو ہے یا حقیقت؟ یا جیسے تمہیں دنیا میں کوئی حقیقت نظر نہ آتی تھی آج بھی یہ بات نظر نہیں آرہی کہ یہ تمہارے ہی اعمال کا بدلہ ہے۔

[12] تم نے دنیا میں یہ طے کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو ہم کبھی اس دعوت حق کو قبول نہیں کریں گے اور پھر اپنی اس ہٹ دھرمی پر ڈٹ گئے تھے۔ اسی طرح تمہارے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی تم چیخو چلاؤ یا صبر کر کے عذاب برداشت کرتے جاؤ۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

[13] یعنی جو لوگ اللہ کے فرمانبردار بن کے رہے تاکہ اس کے عذاب سے بچ جائیں۔ ان کو صرف عذاب سے بچایا ہی نہیں جائے گا بلکہ پربہار باغات میں داخل کیا جائے گا۔

[14] ❁ جنت میں داخلہ محض اللہ کی مہربانی سے ہوگا۔ جنت میں پرہیزگاروں کے داخلہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان، کہ انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالیا جائے گا، سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اللہ تعالیٰ کی الگ نعمت ہے۔ اور دوزخ کے عذاب سے بچا لینا الگ نعمت ہے۔ اور بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح طور پر فرمایا کہ دوزخ کے عذاب سے بچ جانا ہی بہت

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۲﴾ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾

وہ قطار در قطار تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے اور ہم انہیں بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے بیاہ دیں گے (۲۰) اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان لانے میں ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے اپنے عملوں سے کچھ بھی کم[۱۵] نہ کریں گے ہر شخص اپنے ہی عملوں کے عوض گروی[۱۶] ہے۔ (۲۱)

اور ہم انہیں پھل اور گوشت جو[۱۷] وہ چاہیں گے دیتے چلے جائیں گے (۲۲) وہاں وہ لپک لپک[۱۸] کر ایک دوسرے سے جام شراب لیں گے جس میں نہ بیہودہ گوئی[۱۹] ہوگی اور نہ کوئی گناہ کا کام (۲۳)

بڑی کامیابی ہے۔ گویا کامیابی کا اصل معیار دوزخ کے عذاب سے بچنا ہے۔ رہا جنت میں داخلہ تو یہ محض اللہ کے فضل اور مہربانی سے ہوگا۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا" صحابہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ کے اعمال بھی؟" آپ نے فرمایا: "میرے اعمال بھی مجھ کو جنت میں نہیں لے جائیں گے الا یہ کہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی مجھے ڈھانپ لے" (بخاری، کتاب المرضیٰ۔ باب تمنی المریض الموت)

[۱۵] کم درجہ والی اولاد کو والدین سے ملا دینا:۔ یعنی والدین نیک اور پرہیزگار تھے۔ اولاد نے اپنے والدین کی پیروی کی کوشش تو کی مگر نیکی اور پرہیزگاری میں اس درجہ تک نہ پہنچے جو والدین کا درجہ تھا تو اللہ تعالیٰ اولاد پر یہ مہربانی فرمائیں گے کہ ان کو بھی ان کے والدین کے درجہ تک پہنچا کر جنت میں ان کے والدین کے ساتھ ملا دیں گے تاکہ والدین اور اولاد جیسے دنیا میں اکٹھے رہے تھے جنت میں بھی اکٹھے رہ سکیں اور والدین اور اولاد دونوں کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔ اس سلسلہ میں یہ نہ ہوگا کہ کچھ والدین کا کچھ درجہ کم کر دیا اور کچھ اولاد کا کچھ بڑھا دیا اور دونوں کو ایک درمیانی درجہ کے مقام میں جنت میں ملا دیا بلکہ اولاد کا درجہ ہی بڑھایا جائے گا والدین کا کم نہیں کیا جائے گا۔

[۱۶] ہر شخص کے اللہ کے ہاں گروی ہونے کا مفہوم:۔ یعنی ہر شخص پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتیں قرض ہیں اور اس کے بدلے انسان کا نفس اللہ تعالیٰ کے پاس بطور رہن یا مرہونہ چیز ہے۔ قرض کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ انسان اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ اس کے احکام کی تعمیل کرے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کرے۔ جس شخص نے یہ قرض ادا کر دیا اس کا نفس عذاب جہنم سے آزاد ہو گیا۔ وہ کامیاب ہو گیا اور بچ نکلا اور جس نے یہ قرض ادا نہ کیا اس کا نفس پہلے ہی اللہ کے پاس رہن رکھا ہوا ہے۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جنت محض اللہ کے فضل سے ملے گی۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کی نیکی دوسرے کے نفس کو نہ رہا کرا سکے گی اور نہ عذاب جہنم سے بچا سکے گی۔

[۱۷] صرف پھل اور گوشت ہی نہیں بلکہ جنت کی تمام نعمتیں ختم نہ ہونے والی اور لازوال ہوں گی۔

[۱۸] اہل جنت جام شراب کے لیے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی اس لیے نہیں کریں گے کہ انہیں شراب کے ذخیرہ میں کمی واقع ہو جانے کا خطرہ ہوگا بلکہ محض خوش طبعی کے طور پر وہ یہ شغل لگائیں گے۔

[۱۹] جنت میں شراب کے دور:۔ دنیا کی شراب میں کئی قباحتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً اس کا مزہ تلخ ہوتا ہے اور بو ناخوشگوار، اس کا نشہ

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴿٢٤﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ
يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ
ع ۱ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾ فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ
بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ﴿٢٩﴾ أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ ﴿٣٠﴾ قُلْ تَرَبَّصُوا

وہاں ان کی خدمت پر مامور[۲۰] لڑکے چکر لگاتے رہیں گے اور وہ خود ایسے خوبصورت ہوں گے جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی (۲۴) وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر (گزشتہ حالات) پوچھیں گے (۲۵) کہیں گے[۲۱]: اس سے پہلے ہم اپنے گھر والوں میں ڈرتے ڈرتے رہا کرتے تھے۔(۲۶) سو (آج) اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہمیں لو کے عذاب سے بچا لیا۔(۲۷) ہم اس سے پہلے (دنیا میں) اسی کو پکارا[۲۲] کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑا احسان کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔(۲۸) پس آپ نصیحت کرتے رہیے۔ اپنے رب کے فضل سے آپ کاہن یا مجنون[۲۳] نہیں (۲۹) ہیں یا وہ کہتے ہیں کہ: یہ شاعر ہے جس کے متعلق ہم گردش ایام کے منتظر ہیں۔(۳۰)

سر کو چڑھ جاتا ہے جس سے سر چکرانے لگتا ہے اور بعض دفعہ درد بھی کرنے لگتا ہے۔ اس کا نشہ عقل پر چھا کر اس میں فتور پیدا کر دیتا ہے۔ پھر اسی نشہ کی حالت میں انسان بعض دفعہ بکواس بکنے لگتا ہے بعض دفعہ کسی کی بے عزتی کر بیٹھتا ہے یا کوئی اور گناہ کا کام کر بیٹھتا ہے اور اس کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ عارضی طور پر کچھ سرور حاصل ہوتا ہے اور دوران اس کے غم غلط ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ بھی دراصل فتور عقل کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ جنت کی شراب میں اس کا فائدہ یعنی لذت و سرور تو ضرور حاصل ہو گا مگر وہ ہر طرح کے نقصانات سے پاک ہو گی۔

[۲۰] ❁ نوخیز لڑکے:۔ یہ نوخیز لڑکے بے ریش ہوں گے اور ہمیشہ نوخیز ہی رہیں گے۔ ان کی خوبصورتی، صفائی اور پاکیزگی کا یہ عالم ہو گا جیسے موتی ابھی اپنی صدف میں ہی محفوظ ہوں یا کسی جواہرات والی ڈبیہ میں چھپا دیے گئے ہوں تاکہ ان پر گرد و غبار کا کوئی ذرہ نہ پڑ جائے۔ بالفاظ دیگر وہ اتنے خوبصورت اور صاف ستھرے ہوں گے کہ ہاتھ لگنے سے بھی میلے معلوم ہوں گے۔

[۲۱] یعنی دنیا میں بیتے ہوئے ایام کی یاد تازہ کرنا چاہیں گے اور کہیں گے ہمیں تو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ہم سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جس کی پاداش میں اللہ کے حضور ہماری جواب طلبی اور گرفت ہو جائے۔ اور گھر والوں کا ذکر اس لیے کریں گے کہ انسان دنیا میں بہت سے گناہ کے کام محض اہل و عیال کی خاطر کرتا ہے۔ مال و دولت کی ہوس کی وجہ سے اسے مال کمانے میں حرام و حلال کی تمیز نہیں رہتی۔

[۲۲] یعنی ہم دنیا میں اللہ سے ڈرتے بھی رہتے تھے اور ساتھ ہی اللہ سے دعائیں بھی مانگا کرتے تھے کہ اے پروردگار! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائے رکھنا۔ سو اللہ نے ہماری دعا کو شرف قبولیت بخشا اور ہمیں اس عذاب سے بچا لیا اور یہ جنت اور اس کی نعمتیں جو عطا فرمائی ہیں تو یہ اس کا خاص احسان اور اس کی مہربانی ہے کہ ہمیں ہمارے اعمال اور دعاؤں سے بڑھ کر ثواب عطا کیا۔

[۲۳] ❁ کفار کا آپ کو کاہن دیوانہ اور شاعر کے القابات سے نوازنا:۔ یہاں سے پھر کفار مکہ کے آپ پر تبصروں اور القابات کی

فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ ﴿٣١﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿٣٢﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ

آپ انہیں کہیے: تم بھی انتظار کرو[٢٤]، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں (٣١) کیا ان کی عقلیں ہی انہیں ایسی باتیں کرنے کا حکم دیتی[٢٥] ہیں یا پھر یہ لوگ ہیں ہی سرکش۔ (٣٢) یا (پھر) یہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے خود

طرف رخ مڑ گیا ہے۔ ان آیات میں اگرچہ روئے سخن آپ ﷺ کی طرف ہے مگر حقیقت میں یہ خطاب کفار مکہ کی طرف ہے۔ یعنی اگر آپ ﷺ کے یہ دشمن بغض و عناد کی بنا پر آپ ﷺ کو کاہن یا مجنوں کہتے ہیں تو ان کی اس بکواس سے آپ ﷺ کاہن یا مجنوں بن نہیں جائیں گے۔ انہیں ایسی بکواس کرتے رہنے دیجئے اور آپ اپنے کام میں معروف رہیے اور لوگوں کو قرآن سنا سنا کر نصیحت کرتے جائیے۔

[٢٤] وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح شاعر لوگ وقتی طور پر اپنے سامعین کو متاثر کر لیتے ہیں لیکن ان کا کوئی قابل ذکر کارنامہ باقی نہیں رہتا۔ ان کے مرنے کے ساتھ ہی ان کی شخصیت بھی دنیا سے ختم ہو جاتی ہے۔ اسی صورت حال کی توقع وہ آپ ﷺ سے بھی رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کی موت کے منتظر بیٹھے ہیں کہ کب آپ کو موت آلیتی ہے اور ان کی اس مصیبت سے جان چھوٹتی ہے۔ آپ ان سے کہیے کہ تم میرے متعلق گردش ایام کا انتظار کرو اور میں اس انتظار میں ہوں کہ تمہیں تمہاری ان کرتوتوں کی سزا کب اور کس طرح ملتی ہے؟

[٢٥] ❁ قریش مکہ کا حقیقتِ حال سے پوری طرح واقف ہونا:۔ آپ کی زندگی بھر کی پاکیزہ سیرت اور کردار ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ لہٰذا وہ جو کچھ الزامات آپ ﷺ پر لگا رہے ہیں خود ان کی عقلیں ان چیزوں کو تسلیم کرنے سے ابا کرتی ہیں۔ چنانچہ سرداران قریش اپنی نجی محفلوں میں متعدد بار اس بات کا اعتراف کر چکے تھے کہ آپ ﷺ نہ شاعر ہیں نہ کاہن ہیں، نہ جادوگر ہیں اور نہ دیوانہ ہیں۔ وہ دل سے یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ آپ واقعی اللہ کے رسول اور قرآن واقعی اللہ کا کلام ہے لیکن اگر وہ اس بات کا اعتراف کر لیتے تو خود مرتے تھے۔ ان کی سرداریاں ختم ہوتی تھیں اور انہیں رسول کا تابع فرمان بن کر رہنا پڑتا تھا اور یہ باتیں انہیں کسی قیمت پر گوارا نہ تھیں۔ لہٰذا خوئے بدرا بہانہ بسیار، کے مصداق آپ ﷺ پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کرتے اور ایسے غیر معقول القابات سے پکارتے تھے۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ انہوں نے کبھی کسی شاعر، کسی کاہن، کسی جادوگر یا کسی مجنوں کی اس طرح مخالفت نہیں کی۔ جس طرح آپ کی کر رہے ہیں؟ نہ کسی شاعر، کسی کاہن، کسی جادوگر یا مجنوں کا کلام سننے پر ایسی پابندی لگائی ہے جس طرح کی پابندی یہ قرآن سنانے، سننے اور بلند آواز سے پڑھنے پر لگا رہے ہیں؟ انہیں کسی شاعر، کسی کاہن، کسی جادوگر یا کسی مجنوں سے ایسا خطرہ کیوں لاحق نہیں ہوتا جیسا آپ ﷺ سے انہیں لاحق ہے؟ یہ سب باتیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ وہ دل سے یہ جان چکے ہیں کہ آپ واقعی اللہ کے رسول اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔ ان کی عقلیں صحیح حکم لگاتی ہیں لیکن ان کی سرکش طبیعتیں انہیں راہِ حق کی طرف آنے میں مزاحم ہو رہی ہیں۔

تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ
اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ

ہی بناڈالا[۲۶] ہے۔ (بات یہ نہیں) بلکہ یہ ایمان لائیں گے ہی نہیں (۳۳) اگر وہ (ان باتوں میں) سچے ہیں تو پھر اسی جیسا[۲۷] کوئی کلام بنالائیں (۳۴) یا کیا وہ بغیر کسی چیز کے خود ہی[۲۸] پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود (اپنے) خالق[۲۹] ہیں۔ (۳۵) یا آسمانوں اور زمین کو انہوں نے پیدا کیا[۳۰] ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ (اللہ کی قدرتوں پر) یقین ہی نہیں رکھتے (۳۶) کیا ان کے پاس آپ کے پروردگار کی رحمت کے خزانے ہیں؟ یا یہ ان (خزانوں)

[۲۶] ❁ قرآن سے متعلق قریش کے آپ پر الزامات:۔ ان کے منجملہ الزامات سے ایک یہ بھی تھا کہ قرآن اس نے خود تصنیف کر ڈالا ہے اور پھر اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اور کبھی یہ کہہ دیتے کہ قرآن کسی عجمی عالم سے سیکھ کر ہمیں سنا دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ انہیں یہ الزام لگاتے وقت اتنی بھی شرم نہ آئی کہ جس شخص نے زندگی بھر کسی سے جھوٹ نہ بولا ہو۔ کسی پر الزام نہ لگایا ہو، کسی سے فریب نہ کیا ہو، کیا وہ اللہ پر ایسا الزام لگا سکتا ہے؟ پھر انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کا کلام تو ہم نبوت سے پہلے بھی سنتے رہے ہیں اور نبوت کے بعد وہ صرف اللہ کا کلام ہی نہیں سناتا اور بھی بہت سی باتیں کرتا ہے۔ تو کیا اس کے کلام میں اور اللہ کے کلام میں انہیں کچھ بھی فرق محسوس نہیں ہوتا، اصل معاملہ یہ ہے کہ ان کی عقلیں تو ٹھیک کام کرتی ہیں مگر ان کی نیتوں میں فتور ہے جس کی وجہ سے انہوں نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ کسی قیمت پر ایمان نہیں لائیں گے۔

[۲۷] اس کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۹ کا حاشیہ

[۲۸] ❁ دہریت و نیچریت کا رد: یعنی اتفاقات کے نتیجہ میں پیدا ہو گئے ہیں جیسا کہ دہری اور نیچری حضرات کا خیال ہے اور ان کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں؟ یہ خیال اس لیے باطل ہے کہ یہ ایک ایسے بدیہی امر کے خلاف ہے جس کی دلیل یا ثبوت کی ضرورت کوئی بھی نہیں سمجھتا اور وہ بدیہی امر یہ ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ضرور ہوتا ہے از خود نہیں بن جاتی۔

[۲۹] یعنی وہ خود ہی اپنے خالق ہیں۔ سابقہ آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ان کی پیدائش میں ان کا اپنا کچھ عمل دخل نہیں تھا۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اپنے ہی عمل دخل اور ارادہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہ خیال بھی ایک بدیہی امر کے خلاف ہے جو یہ ہے کہ کوئی چیز بیک وقت خالق اور مخلوق نہیں ہو سکتی" یعنی خود ہی بننے والی ہو اور خود ہی بنانے والی ہو، پھر جب یہ دونوں باتیں نہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کو بنانے والا یا پیدا کرنے والا کوئی اور ہے۔ اور بنانے والے کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جیسے وہ چاہے بنائے اور جس مقصد کے لیے چاہے بنائے۔ بنی ہوئی چیز اپنے بنانے والے کے ہاتھوں بے بس ہوتی ہے وہ اس کے سامنے اکڑ نہیں سکتی، پھر لوگ کیسے اپنے خالق کے حکم سے سرتابی کے مجاز ہو گئے؟

[۳۰] یعنی اگر اس کائنات کے خالق یہ ہیں تو پھر اس میں ان کا تصرف بھی چلنا چاہیے۔ اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کے بھی مجاز ہو سکتے تھے۔ لیکن جب خود انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ کائنات کا خالق اللہ ہے تو پھر یہ اس کے آگے کیوں اکڑنے لگے ہیں؟ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہ لوگ زبانی تو اعتراف کر لیتے ہیں کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہے۔ لیکن اس اعتراف کے تقاضوں کو اس لیے پورا

الْمُصَيْطِرُونَ ﴿٣٧﴾ أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۖ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ أَمْ لَهُ
الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ﴿٣٩﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ﴿٤٠﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ

پر حکم چلانے والے[۳۱] ہیں؟(۳۷) کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر وہ (عالم بالا کی) باتیں سن آتے ہیں؟ (اگر ایسی بات ہو) تو ان میں سے کوئی سننے والا[۳۲] صریح سند کے ساتھ وہ بات پیش کرے(۳۸) کیا اس (اللہ) کے لئے تو بیٹیاں[۳۳] ہیں اور تمہارے لیے بیٹے؟(۳۹) یا آپ ان سے کوئی صلہ مانگتے ہیں جس کے تاوان[۳۴] سے یہ دبے جارہے ہیں؟(۴۰) یا ان کے پاس غیب کا علم[۳۵] ہے جسے وہ لکھتے جاتے ہیں؟(۴۱)

نہیں کرتے کہ اپنے اس اعتراف پر خود بھی پورا یقین نہیں رکھتے۔

[۳۱] یہ کافروں کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ نے کسی بشر کو رسول بنانا تھا تو کیا اسے یہی شخص اس کام کے لیے پسند آیا تھا۔ مکہ اور طائف کے سردار مر گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کیا اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک یہ ہیں؟ یا اللہ نے اپنے خزانوں کی تقسیم کا اختیار ان کو دے رکھا ہے کہ جونسی نعمت جسے چاہیں دے دیں؟

[۳۲] یعنی عالم بالا سے کوئی ایسی بات سن آئے ہیں کہ مکہ میں جو نبی پیدا ہوا ہے اسے ہم نے تو نہیں بھیجا تھا۔ اس نے از خود ہی کچھ کلام تالیف کر کے لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ یہ کلام مجھ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے؟ اگر کوئی ایسی بات ہے تو اس کا ثبوت پیش کریں۔ پھر جب رسالت کی تردید کے لیے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تو وہ اس قدر ہٹ دھرمی اور سختی سے اس کا انکار کیسے کر رہے ہیں؟

[۳۳] پھر جب انہیں عالم بالا تک رسائی بھی حاصل نہیں تو پھر انہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ اللہ کو نظام کائنات چلانے کے لیے اولاد کی ضرورت ہے؟ پھر ان بدبختوں نے اللہ کے لیے اولاد بنا ڈالی اور وہ بھی بیٹے نہیں بلکہ بیٹیاں جنہیں یہ خود سخت ناپسند کرتے ہیں۔

[۳۴] آپ ﷺ کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ آپ ﷺ ان سے معاوضہ اور نذریں نیازیں طلب کرتے۔ جیسے عموماً مذہب کے ٹھیکیدار حضرات اپنے معتقدین اور مریدوں سے وصول کرتے اور اپنی دوکانیں خوب چمکا لیتے ہیں۔ یہاں یہ معاملہ بھی نہیں کہ آپ ﷺ ان سے نذرانے طلب کریں اور وہ اسے بوجھ سمجھ کر آپ ﷺ سے پرے ہٹ جائیں۔ حالانکہ آپ ﷺ کا معاملہ مذہبی ٹھیکیداروں کے بالکل برعکس تھا۔ آپ ﷺ نے اپنا ذاتی سرمایا دین کے کاموں میں صرف کر ڈالا تھا۔ دین کی تبلیغ کی وجہ سے آپ کا کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ پھر آپ اس تبلیغ کے کام کا کسی صورت میں معاوضہ بھی نہیں لیتے تھے۔ بلکہ بالکل بے لوث اور بے غرض ہو کر انسانیت کی خدمت کر رہے تھے۔

[۳۵] جس کی بنا پر انہیں یقین ہو چکا ہے کہ آپ اپنے دعوائے رسالت میں جھوٹے ہیں اور اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔

يَكْتُبُونَ ﴿٤١﴾ أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ
سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٤٣﴾ وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿٤٤﴾
فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ﴿٤٥﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا
وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٦﴾ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٧﴾

یا یہ کوئی چال چلنا[۳۶] چاہتے ہیں؟ حالانکہ یہ کافر خود ہی اس چال میں پھنسنے والے ہیں(۴۲) کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی اور الٰہ ہے؟ اللہ ان سب باتوں سے پاک ہے جن میں یہ اس کا شریک بناتے ہیں(۴۳) اگر یہ لوگ آسمان سے کوئی گرتا ہوا ٹکڑا بھی دیکھ لیں تو کہہ دیں گے کہ یہ تہ بہ تہ بادل[۳۷] ہے۔(۴۴) لہٰذا انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجئے تا آنکہ اپنے اس دن کو جا ملیں جس میں یہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں[۳۸] گے(۴۵) جس دن ان کی کوئی چال ان کے کسی کام نہ آئے گی نہ ہی انہیں کہیں سے مدد مل سکے گی۔(۴۶) بلاشبہ ظالموں کے لئے اس اخروی عذاب[۳۹] کے علاوہ (دنیا میں بھی) عذاب ہے۔ لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔(۴۷)

[۳۶] اگر یہ سب باتیں نہیں تو لامحالہ یہ ان کی فریب کارانہ چالیں ہیں کہ آپ پر طرح طرح کے الزامات لگا کر لوگوں کو آپ ﷺ سے بدظن کر دیں اور آپ کی ہمت توڑ دیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عنقریب یہ اپنی چالبازیوں، شاطرانہ چالوں اور سازشوں کے جال میں خود پھنس جائیں گے۔ واضح رہے کہ کافروں کے حق میں یہ پیشین گوئی کی زندگی کے اس دور میں کی گئی جب بیچارے مسلمان کافروں کے ظلم و جور کی چکی میں بری طرح پس رہے تھے اور کسی کو یہ خیال تک بھی نہ آسکتا تھا کہ یہ سارا معاملہ الٹ بھی سکتا ہے۔

[۳۷] کافروں کی ہٹ دھرمی کی انتہا:۔ بعض دفعہ مسلمانوں کو حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ خیال آجاتا تھا کہ کافر جس حسی معجزہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسا معجزہ دکھا دے تو ممکن ہے یہ لوگ ایمان لے آئیں جس سے اسلام کی قوت میں اضافہ ہو جائے اور مسلمانوں پر مصائب کم ہو جائیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ کبھی ایمان نہ لائیں گے کیونکہ یہ اس قدر ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوئے ہیں کہ اگر ان کے مطالبہ کے مطابق آسمان سے کوئی ٹکڑا گرا بھی دیا جائے تو پھر بھی یہ اس کی طبعی توجیہیں تلاش کرنے لگیں گے اور کہہ دیں گے کہ آسمان کا ٹکڑا کب ہے؟ یہ تو بادل کا ٹکڑا ہے جو تہ بہ تہ ہو کر موٹا غلیظ اور بوجھل ہونے کی وجہ سے زمین پر گر پڑا ہے۔

[۳۸] اس سے مراد نفخہ صور اول ہے۔ یعنی ان لوگوں یا ان جیسے ہٹ دھرم لوگوں کی بدبختی کا یہ عالم ہے کہ اگر انہیں قیامت تک زندگی مل جائے تو بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ انہیں ان باتوں کا یقین تب ہی آئے گا جب عذاب خود ان پر واقع ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ ایسے لوگوں کے پیچھے نہ پڑیں۔ بس اپنا کام کرتے جائیے۔

[۳۹] دنیا میں جو جو چھوٹے موٹے عذاب آتے ہیں وہ لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے آتے ہیں کہ ان کے اوپر کوئی بالاتر ہستی موجود ہے۔ لہٰذا وہ سنبھل جائیں۔ مگر لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو ایسے عذاب کو نہ عذاب سمجھتی ہے نہ تنبیہ بلکہ وہ اس عذاب کا

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ﴿٤٨﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ ع ۲
فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ﴿٤٩﴾

(اے نبی ﷺ) آپ اپنے پروردگار کا حکم آنے[۴۰] تک صبر کیجئے۔ بلاشبہ آپ ہماری آنکھوں[۴۱] کے سامنے ہیں اور جب آپ اٹھا کریں تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ[۴۲] اس کی تسبیح کیجئے۔(۴۸) اور رات کو بھی اس کی تسبیح کیجئے اور ستاروں کے غروب[۴۳] ہونے کے بعد بھی۔(۴۹)

کوئی طبعی سبب اور اپنے کفر پر جمے رہنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

[۴۰] اس کا ایک مطلب تو ترجمہ سے واضح ہے کہ ان ناسازگار حالات سے نجات کے لیے جب تک اللہ کا حکم آ نہیں جاتا۔ آپ صبر کیجئے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ پروردگار کے جو احکام اب تک آپ ﷺ کو مل چکے ہیں ان کی تعمیل اور بجاآوری میں صبر و استقامت سے ڈٹے رہیے۔

[۴۱] ہم آپ ﷺ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے اور جب ہماری حکمت کا تقاضا ہوا آپ ﷺ کو نجات کی راہ بتادیں گے اور ان کافروں کی تمام سازشوں اور تدبیروں کو ناکام بنادیں گے۔

[۴۲] اس جملہ کے کئی مطلب ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ جب آپ نیند سے بیدار ہوں تو اللہ کی حمد و تسبیح بیان کی جائے۔ دوسرا یہ کہ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوں تو حمد و تسبیح بیان کیجئے۔ تیسرا یہ کہ جب آپ ﷺ تبلیغ اور خطاب کے لیے کھڑے ہوں تو اس کا افتتاح حمد و تسبیح سے کیا کیجئے اور چوتھا یہ کہ جب آپ ﷺ کسی مجلس سے اٹھنے لگیں تو اس وقت اللہ کی حمد و تسبیح بیان کیجئے اور ایسے تمام مواقع پر رسول اللہ ﷺ حمد و تسبیح بیان فرمایا کرتے تھے۔

[۴۳] رات سے مراد مغرب، عشا اور تہجد کی نمازیں بھی ہو سکتی ہیں اور ان کے علاوہ ذکر الٰہی بھی۔ اور ستاروں کے غروب ہونے سے سپیدہ صبح کے ظہور کا وقت ہے۔ جب سب ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگتی ہے پھر غائب ہو جاتے ہیں اور اس سے مراد نماز فجر ہے۔

۶۲ آیاتہا سورۃ النجم مکیۃ رکوعہا ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝۲ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴

کلمات ۳۶۵ آیات ۶۲ (۵۳) سورۃ النجم مکی ہے (۲۳) رکوع ۳ حروف ۱۴۵۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ستارے[۱] کی قسم جب وہ ڈوبنے لگے۔(۱) تمہارے رفیق[۲] نہ تو راہ بھولے اور نہ بے راہ چلے(۲) وہ اپنی خواہش نفس سے کچھ بھی نہیں کہتے(۳) جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے[۳](۴)

[۱] بعض علماء نے ﴿اَلنَّجْم﴾ سے مراد زہرہ لیا ہے بعض نے ثریا اور بعض نے اس سے مراد ستاروں کی جنس لی ہے۔ یعنی اس وقت کی قسم جب ستارے غائب ہو جاتے ہیں اور دن کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ یا ان ستاروں کی قسم جو اپنی مقررہ راہ ہی پر چلتے رہتے ہیں کبھی ادھر ادھر نہیں ہٹتے۔

[۲] روئے سخن کفار مکہ کی طرف ہے اور رفیق سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کی سیرت و کردار سے کفار مکہ بچپن سے واقف تھے۔ انہیں قسم دے کر بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے یہ رفیق تاریکی میں نہیں بلکہ دن کی روشنی میں ٹھیک صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں نہ وہ راستہ بھولے ہیں کہ ادھر ادھر پھرتے رہیں اور نہ ہی راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

[۳] رسول اللہ ﷺ کے اقوال کی شرعی حیثیت اور منکرین حدیث:۔ ان آیات کے اولین مخاطب تو کفارِ مکہ ہیں۔ مگر یہ آیتیں چونکہ آپ کے اقوال کو وحی اور واجب الاتباع قرار دیتی ہیں لہٰذا منکرینِ حدیث ان کو متقید بھی کرتے ہیں اور ان کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے یوں کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ اپنے گھر جا کر اپنی کسی زوجہ سے یہ کہتے کہ "میرا جوتا لاؤ" تو کیا یہ بھی وحی ہوتی تھی؟ اور اکثر منکرین اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی طرف جو کچھ وحی کی جاتی رہی وہ سب قرآن میں آ گئی ہے۔ اسی پر کفار کو اعتراض اور اسی پر آپ ﷺ سے ان کا تکرار اور جھگڑا رہتا تھا۔ اور آپ کی قرآن کے علاوہ دوسری باتیں جو بحیثیت انسان کے ہیں وہ قابل اتباع نہیں ہیں" اس طرح یہ حضرات چونکہ تمام ذخیرہ حدیث کو اور آپ ﷺ کی سنت کو دین سے خارج اور ناقابل اتباع بلکہ واضح الفاظ میں بے کار ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس پر ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔ ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کی زندگی کے اقوال کو صرف دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حالانکہ آپ ﷺ اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے کتاب اللہ کے معلم، مفسر اور شارح بھی تھے اور آپ ﷺ نے قرآن کو جو تعلیم، تفسیر اور تشریح فرمائی وہ بھی دین ہی سے متعلق تھی۔ اس طرح آپ ﷺ کے اقوال دو کے بجائے تین حصوں میں تقسیم ہوئے۔ پھر آپ ﷺ صرف بولتے ہی نہ تھے، کچھ کرتے بھی تھے اور آپ ﷺ کے افعال بھی اسی طرح واجب الاتباع تھے جیسے اقوال۔ اس طرح تین کے بجائے اور بھی زیادہ حصے ہو گئے۔ مختصراً آپ ﷺ کی زندگی کے درجِ ذیل پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے گا کہ دین میں سنت کی کیا ضرورت اور کیا مقام ہے:

۱۔ تشریعی امور: قرآن میں نماز کا حکم تو تقریباً سات سو بار آیا ہے مگر اس کی تفصیل کہیں بھی نہیں کہ اسے کیسے ادا کیا جائے۔ کتنی نمازیں ہوں۔ ان کے صحیح اوقات کیا ہیں۔ ہر نماز میں رکعات کی تعداد کتنی ہے اور اس کی ترکیب کیا ہے؟ اسی طرح حج کیسے ادا کیا جائے، زکوٰۃ کتنی وصول کی جائے؟ قضایا کا فیصلہ کیونکر کیا جائے۔ ہر قضیہ کے لیے شہادتوں کا نصاب اور طریق کار کیا ہے۔ یا نکاح میں عورت کی رضامندی کا حق اور اس کی اہمیت، خلع کا حق، صلح و جنگ کے قواعد کی تفصیلات وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام امور ایسے ہیں کہ انسان سنت یا آپ کے اقوال و افعال سے بے نیاز ہو کر انہیں بجا لا ہی نہیں سکتا۔ گویا قرآن کو ماننے اور جاننے کا واحد ذریعہ آپ ﷺ کی سنت ہے۔ پھر یہ تمام مندرجہ امور ایسے ہیں جن میں آپ ﷺ نے صحابہ سے کبھی مشورہ نہیں کیا حالانکہ آپ ﷺ کو مشورہ کا تاکیدی حکم تھا کیونکہ یہ امور انسانی بصیرت سے تعلق نہیں رکھتے۔ عام انسان تو کیا ایک نبی بھی ایسے امور کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ ایسے تمام امور آپ ﷺ کو بذریعہ وحی بتائے اور سکھائے جاتے تھے خواہ یہ وحی بذریعہ القاء ہو یا جبرئیل کے بصورت انسان سامنے آکر بتانے کی شکل میں ہو۔ گویا ایسے تمام امور بھی بذریعہ وحی طے پاتے تھے جسے عرف عام میں وحی خفی کہا جاتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایسی تمام تفصیلات قرآن میں مذکور نہیں۔

۲۔ تدبیری امور: ایسے امور میں آپ کو صحابہ سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ مثلاً جنگ کے لیے کون سا مقام مناسب رہے گا، قیدیوں سے کیا سلوک کیا جائے؟ نظام حکومت کو کیسے چلایا جائے گویا ایسے امور ہیں جن کا تعلق انسانی بصیرت سے بھی ہے اور تجربہ سے بھی۔ ایسے امور میں وحی کی ضرورت نہیں ہوتی الا یہ کہ مشورہ کے بعد فیصلہ میں کوئی غلطی رہ جائے۔ ایسی صورت میں اس فیصلہ کی اصلاح بذریعہ وحی کر دی جاتی تھی۔ جیسے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق مشورہ کے بعد فیصلہ کے متعلق وحی قرآن میں نازل ہوئی۔

۳۔ اجتہادی امور: سے مراد ایسے دینی امور ہیں جن میں کسی پیش آمدہ مسئلہ کا حل سابقہ وحی کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔ گو یہ معاملہ ہر ماہر علوم دین کی ذاتی بصیرت سے یکساں تعلق رکھتا ہے تاہم آپ اس کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ کے پاس آکر مسئلہ پوچھا کہ میرے باپ پر حج فرض تھا اور مر گیا ہے۔ کیا میں اب اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "بھلا دیکھو! اگر اس کے ذمہ قرض ہوتا تو تم اسے ادا نہ کرتیں؟" اس عورت نے کہا: "ضرور کرتی" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تو پھر اللہ اس ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے" آپ ﷺ کے ایسے اجتہادات اور استنباطات کی فہرست بھی طویل ہے تاہم اس سلسلہ میں بھی جب کبھی کوئی لغزش ہوئی تو اس کی بذریعہ وحی جلی یا خفی اصلاح کر دی گئی۔

اس کی مثال وہ حدیث ہے جسے سیدنا ابو ہریرہؓ نے یوں روایت کیا کہ ایک آدمی نے پوچھا: یا رسول اللہ! بتائیے اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں۔ درآنحالیکہ میں صبر کرنے والا، ثواب کی نیت رکھنے والا، آگے بڑھنے والا، پیٹھ نہ پھیرنے والا ہوں۔ تو کیا اللہ میرے سب گناہ معاف کر دے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" وہ شخص چلا گیا تو آپ ﷺ نے اسے پھر آواز دے کر بلایا اور فرمایا "مگر قرضہ معاف نہ ہوگا۔ جبریل نے ابھی مجھے اس طرح بتایا ہے۔" (مسلم، کتاب الامارۃ، باب ما وعدہ اللہ تعالٰی للمجاهد فی الجنة)

یعنی سائل کے سوال پر رسول اللہ ﷺ نے تو جنت کی بشارت دے دی۔ کیونکہ شہادت ایسا افضل عمل ہے کہ خون کا پہلا قطرہ

عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ

یہ انہیں زبردست قوتوں والے (جبریل) نے سکھائی ہے (۵) جو بڑا زور آور ہے وہ سامنے آ کھڑا ہوا (۶) جبکہ وہ بالائی افق پر تھا (۷) پھر وہ نزدیک ہوا پھر اور آگے بڑھا[۴] (۸) پھر دو کمانوں کا یا

کرتے ہی شہید جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی وقت وحی بھیج کر اس میں ترمیم فرما دی۔

۴۔ **طبعی امور:** جس میں انسان کی روزمرہ کی بول چال، خوراک، پوشاک اور دوسرے معاملات آ جاتے ہیں اور ان امور کا تعلق تمام لوگوں سے یکساں ہے۔ ایسے امور میں انسان اور ایسے ہی آپ ﷺ بھی نسبتاً وحی سے آزاد تھے۔ لیکن وہ کون سا پہلو ہے جس میں وحی نے ایسے معاملات پر پابندی نہ لگائی ہو۔ مثلاً انسان اس بات میں تو آزاد ہے کہ وہ چاہے تو گوشت کھائے چاہے تو سبزی کھائے اور چاہے تو دال کھائے لیکن وہ صرف حلال اور پاکیزہ چیزیں ہی کھا سکتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی ہدایت ہے کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھے، اپنے دائیں ہاتھ سے کھائے، اپنے آگے سے کھائے، برتن کو صاف کرے اور بعد میں دعا پڑھے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس کے انتخاب کی حد تک تو آزاد ہے لیکن لباس کا ساتر ہونا اور ستر ڈھانکنا ضروری ہے اور عورتوں کے لیے پردہ بھی۔ عورت مردوں جیسا لباس نہ پہنے، نہ مرد عورتوں جیسا لباس پہنیں۔ وہ اپنے اہل خانہ سے گفتگو میں آزاد ہے لیکن اپنی بیوی سے حسن سلوک اور حسن معاشرت کا وہ پابند ہے وہ اپنا کاروبار اختیار کرنے میں آزاد ہے لیکن حرام کاروبار نہیں کر سکتا نہ جائز کاروبار میں ناجائز طریقوں سے مال کما سکتا ہے۔ ماپ تول میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ کسی دوسرے سے فریب سے مال نہیں بٹور سکتا۔ نہ ہی سود اور اس کے مختلف طریقوں سے مال اکٹھا کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر وہ کون سا پہلو ہے جس میں وہ وحی سے بے نیاز ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ تشریعی امور کا انحصار کلیتاً وحی پر ہے اور قرآن میں احکام چونکہ مجملاً مذکور ہوئے ہیں اور ان کا تعلق انسانی بصیرت سے بھی نہیں لہٰذا یہ احکام سنت کے بغیر انجام پا ہی نہیں سکتے۔ باقی تینوں قسم کے امور میں انسان نسبتاً آزاد ہے مگر ان تینوں پہلوؤں پر بھی وحی نے پابندیاں لگائی ہیں اور ہدایات بھی دی ہیں جن میں اکثر کا ذکر قرآن میں نہیں تو پھر آخر سنت نبوی سے انکار کیسے ممکن ہے اور کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ﴾ کا تعلق صرف قرآن ہی سے ہے؟ اور اس نظریہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص سنت کا منکر ہو وہ قرآن کا بھی منکر ہوتا ہے۔

[۴] آپ ﷺ کا سیدنا جبرئیل کو پہلی بار اصل شکل میں دیکھنا۔ ان آیات میں سیدنا جبرئیل علیہ السلام کا ذکر ہے جو بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ قوی قوۃ کی جمع ہے اور ذو مرۃ کا لفظ بڑے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی زور آور، طاقتور، صاحب حکمت اور خوش شکل بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں سیدنا جبرئیل علیہ السلام کو دو بار اپنی اصل شکل میں دیکھا تھا۔ ان آیات میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب آپ ﷺ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سیدنا جبرئیل مشرقی افق پر نمودار ہوئے۔ پھر آپ ﷺ کو ایسے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ انہیں سے پر ہو گیا ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

سیدنا جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ وحی بند رہنے کا تذکرہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایک بار میں نے (رستہ میں) چلتے چلتے آسمان سے ایک آواز سنی۔ نگاہ اٹھائی تو آسمان کی طرف اسی فرشتے کو دیکھا جو حرا میں

قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ﴿٩﴾ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ﴿١٠﴾ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ﴿١١﴾ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ

اس سے کم فاصلہ رہ گیا[۵] (۹) پھر اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو کرنا[۶] تھی۔ (۱۰) جو کچھ اس نے آنکھ[۷] سے دیکھا تھا دل نے اسے جھوٹ نہیں سمجھا۔ (۱۱) اب کیا تم اس بات میں جھگڑا کرتے ہو جو اس نے آنکھوں[۸] سے دیکھا ہے۔ (۱۲)

میرے پاس آیا تھا۔ وہ زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر (معلق) تھا۔ میں اتنا ڈر گیا کہ ڈر کے مارے زمین پر گر گیا۔ پھر میں اپنے گھر آیا اور گھر والوں سے کہا: "مجھے کمبل اڑھادو، کمبل اڑھادو" چنانچہ انہوں نے مجھے کمبل اڑھادیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ سے ﴿فَاهْجُرْ﴾ تک۔ اس کے بعد وحی گرم ہو گئی، برابر لگاتار آنے لگی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر، تفسیر سورہ مدثر)

کفار مکہ رسول اللہ ﷺ پر الزام لگاتے تھے کہ کوئی عجمی شخص اسے قرآن کی باتیں سکھا جاتا ہے۔ پھر یہ ہم کو سنا کر کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عجمی شخص نہیں بلکہ اسے کئی قوتوں اور خوبیوں کا مالک فرشتہ یہ قرآن سکھاتا ہے۔

[۵] قَابَ (الارض) بمعنی زمین کو گول کھودنا اور قاب بمعنی مقدار، اندازہ، کمان کے کونہ سے قبضہ تک کا فاصلہ۔ محاورہ ہے ھو علی قاب قوسین بمعنی وہ نہایت قریب ہے (منجد) اور مجاہد کہتے ہیں قاب قوسین کی عبارت میں قلب ہوا ہے یعنی اصل لفظ قابی قوس ہے یعنی کمان کے دو کنارے (بخاری۔ کتاب التفسیر) پہلے معنی کے لحاظ سے یہ فاصلہ کمان کی تانت کا نصف اور دوسرے معنی کے لحاظ سے کمان کی تانت کے برابر فاصلہ ہے اور آیت مذکورہ میں ﴿اَوْ اَدْنٰى﴾ سے معلوم ہوا کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ اور جبرئیل کا درمیانی فاصلہ کمان کے دونوں کناروں سے بہر حال کم تھا۔ زیادہ نہیں تھا۔

[۶] آپ ﷺ کے سیدنا جبرئیل کو اپنی اصلی شکل میں دیکھنے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى﴾ سے یہ مراد ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جبرئیل کو (ان کی اصلی شکل میں) دیکھا ان کے چھ سو بازو (پر) تھے۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

اور یہ وحی غالباً سورہ مدثر کی وہی آیات ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ یہ وحی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر جبرئیل کے واسطہ سے کی تھی۔

[۷] جو کچھ آنکھ نے دیکھا وہ یہ تھا کہ اس نے جبریل کو اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔ دن کی روشنی میں دیکھا، تاریکی میں نہیں دیکھا، نیز آپ ﷺ نے عالم بیداری میں دیکھا، نیند یا نیم خوابی یا اونگھ کی حالت میں نہیں دیکھا۔ لہٰذا دل نے پورے وثوق سے اس بات کی تائید کردی کہ واقعی آپ ﷺ نے اس جبریل فرشتہ کو ہی دیکھا تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتا ہے اور اس مسئلہ میں کوئی شک و شبہ نہ رہا تھا۔

[۸] اس کے مخاطب قریش مکہ ہیں اور انہیں کہا یہ جارہا ہے کہ تم اپنے رفیق (محمد ﷺ) کو خود سچا اور راست باز انسان تسلیم کرتے ہو۔ اور وہ اپنے ذاتی اور عینی مشاہدہ کی بنا پر تم سے ایک بات کہتا ہے جو اسے دن کی روشنی میں اور عالم بیداری میں پیش آئی۔ پھر تم اس کی بات کا انکار کرتے۔ اور اس سے جھگڑا کرتے ہو تو آخر تمہارے پاس اس کو جھٹلانے اور اس پر جھگڑا کرنے

کے لیے کیا دلیل ہے؟ واضح رہے کہ اس بارے میں صحابہ میں بھی اختلاف تھا کہ آیا آپ ﷺ نے اس وقت جبریل کو دیکھا تھا یا اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا تو اس کے متعلق صحابہ کی اکثریت کا یہ قول ہے کہ آپ ﷺ نے جبریل کو دیکھا تھا۔ لے دے کے ایک سیدنا ابن عباس ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا مگر وہ بھی اس بات کی پابندی لگاتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو ان ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ دل یا دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے۔

۱۔ ❁ کیا رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل کو دیکھا تھا یا اللہ کو؟ مسروق کہتے ہیں کہ میں نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: "امی! کیا محمد ﷺ نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا؟" انہوں نے جواب دیا: "تیری اس بات پر تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ تین باتیں کیا تو سمجھ نہیں سکا جو شخص تجھ سے وہ بیان کرے وہ جھوٹا ہے۔ جو شخص تجھ سے یہ کہے کہ محمد ﷺ نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا اس نے جھوٹ بولا پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی۔ ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ﴾ اور جو شخص تجھ سے یہ کہے کہ آپ ﷺ کل کو ہونے والی بات جانتے تھے اس نے بھی جھوٹ بولا۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی۔ ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ اور جو شخص تجھ سے یہ کہے کہ نبی ﷺ نے وحی سے کچھ چھپا رکھا وہ بھی جھوٹا ہے۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی ﴿ يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ بلکہ آپ ﷺ نے جبریل کو ان کی اصلی صورت میں دو بار دیکھا تھا۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

۲۔ شعبی کہتے ہیں کہ عرفات میں کعب رضی اللہ عنہ کی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی اور ان سے کوئی بات پوچھی۔ پھر کعب نے اتنے زور سے اللہ اکبر کہا کہ پہاڑ گونج اٹھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: "ہم بنو ہاشم ہیں (یعنی ہم پر اتنا غصہ نہ کیجئے) کعب رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنے دیدار اور کلام کو محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام میں تقسیم کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دو بار کلام کیا اور محمد ﷺ نے دو بار اللہ کو دیکھا" مسروق کہتے ہیں کہ پھر میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جا کر پوچھا کہ "کیا محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟" انہوں نے جواب دیا کہ "تم نے ایسی بات کہی جس سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے" میں نے کہا: "ذرا سوچ لیجئے" پھر میں نے یہ آیت پڑھی۔ ﴿ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مجھے کہنے لگیں: تیری عقل کہاں گئی وہ تو جبریل تھے جو شخص تجھے یہ بتائے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا یا کچھ حصہ چھپایا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا یا وہ پانچ باتیں جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ .... ﴾ (۳۴:۳۱) میں بتائیں۔ اس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا۔ بلکہ آپ ﷺ نے جبریل کو اس کی اصل صورت میں دو مرتبہ دیکھا۔ ایک دفعہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور ایک دفعہ (مکہ کے محلہ) جیاد میں، اس کے چھ سو پر تھے اور اس نے آسمان کے کناروں کو ڈھانپ لیا تھا۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی ﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴾ اور کہا کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنے دل (کی آنکھ) سے دیکھا تھا۔ (حوالہ ایضاً)

۳۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا: "کیا آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟" تو آپ ﷺ نے جواب دیا: "وہ تو نور ہے میں اسے کہاں سے دیکھ سکتا ہوں" (حوالہ ایضاً)

مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾

اور ایک مرتبہ اور بھی اُس نے اس (جبریل) کو (۱۳) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا (۱۴) جس کے پاس ہی جنت الماویٰ [۹] ہے (۱۵) جبکہ اس سدرہ پر چھا رہا تھا جو (نور) چھا رہا تھا (۱۶) نہ (اس کی) نظر چندھیائی [۱۰] اور نہ آگے نکل گئی (۱۷) بلا شبہ اس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں [۱۱] دیکھیں (۱۸)

اور میرے خیال کے مطابق سیدنا ابن عباس کی اس پابندی کے بعد وجہ اختلاف از خود ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن میں جس بات کی صراحت ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں ان ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اور عالم آخرت میں اہل جنت کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا صراحت کے ساتھ احادیث صحیحہ میں مذکور ہے۔

[۹] سدرۃ المنتہیٰ کا محل وقوع اور اہمیت:۔ ﴿سِدْرَةٌ﴾ بمعنی بیری کا درخت جس پر بیر کا پھل لگتا ہے۔ اور منتہیٰ بمعنی انتہائی سرحد۔ یعنی انتہائی سرحد پر واقع بیری کا درخت جو ساتویں آسمان پر واقع ہے۔ جہاں عالم سفلی کے معلومات ختم ہو جاتے ہیں اور عالم علوی کے افاضات بھی وہیں سے نیچے نازل ہوتے ہیں۔ فرشتے بھی اس مقام سے آگے نہیں جا سکتے۔ اسی مقام پر معراج کی رات رسول اللہ ﷺ نے سیدنا جبریل کو اپنی اصلی شکل میں دیکھا تھا (م۔ق) اور بمعنی عرش الٰہی کی داہنی جانب بیری کا درخت جو ملائکہ وغیرہ کی پہنچ کی آخری حد ہے (منجد) نیز وہ مقام جہاں رسول اللہ ﷺ کو فیوضاتِ الٰہیہ اور بھاری انعامات سے نوازا گیا تھا۔ (مفردات) اسی آیت سے بعض علماء نے استنباط کیا ہے کہ متقین کو آخرت میں جو جنت ملے گی وہ آسمانوں پر ہے۔

[۱۰] بیری کے اس درخت پر اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات پڑ کر انتہائی خوشنما منظر پیش کر رہے تھے جس سے آنکھیں چکا چوند ہوتی جاتی تھیں لیکن اتنے انوار و تجلیات کے باوجود جب آپ ﷺ نے جبریل کو دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھیں چندھیائیں اور نہ ہی نگاہ ایک طرف ہٹ کر۔ یعنی اس نظارہ کے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ادھر ادھر چلی گئی۔ بلکہ آپ ﷺ نے ٹھیک طرح سے جبریل کو دیکھا تھا اور اللہ تعالیٰ کو جو کچھ دکھانا منظور تھا، وہی کچھ آپ ﷺ نے دیکھا تھا۔ اسی پر آپ ﷺ کی نظریں جمی رہیں ادھر ادھر نہیں گئیں۔

[۱۱] جبرئیل علیہ السلام بھی اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں:۔ اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا تھا بلکہ اس کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی کو دیکھا تھا۔ کیونکہ اگر آپ ﷺ نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہوتا تو یہ اتنی اہم اور فضیلت والی بات تھی کہ اس کا ذکر صراحت کے ساتھ ہونا ضروری تھا کیونکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھی لَنْ تَرَانِیْ کا جواب ملا تھا۔ یہ بڑی بڑی نشانیاں کیا تھیں؟ اس کی تفصیل اللہ ہی جانتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ﴿مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ دکھائی تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایسے مواقع پر انبیاء کی آنکھوں سے غیب کے کچھ پردے ہٹا دیئے جاتے ہیں جیسے آپ کو جنت اور دوزخ کے بعض مناظر دکھا دیئے گئے تھے۔

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا
قِسْمَةٌ ضِيزٰى ﴿٢٢﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ
سُلْطٰنٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾

کیا بھلا تم نے لات و عزیٰ (دیویوں) پر بھی غور کیا؟(۱۹) اور ایک تیسری منات[۱۲] پر بھی؟(۲۰) کیا تمہارے لئے تو لڑکے ہوں اور اس کے لئے لڑکیاں؟(۲۱) یہ تو بڑی بھونڈی تقسیم[۱۳] ہے(۲۲) یہ تو بس ایسے نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء واجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ یہ لوگ محض ظن کی پیروی کر رہے ہیں یا پھر اس چیز کی جو ان کے دل چاہتے ہوں[۱۴]۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے[۱۵] ہدایت پہنچ چکی ہے۔(۲۳)

واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] مشرکین مکہ کی کئی دیویاں لات' عزیٰ اور منات:۔ اب ایسے لامحدود عظمت و جلال والے پروردگار کے مقابلہ میں ذرا ان دیویوں کا ذکر بھی سن لو جن کی اہل عرب پوجا کرتے ہیں۔ لات (الہ کا مؤنث) کا استھان یا آستانہ طائف میں تھا اور بنی ثقیف اس کے معتقد تھے۔ عزیٰ (عزیز سے مونث) بمعنی عزت والی یا عزت عطا کرنے والی۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان یا آستانہ مکہ اور طائف کے درمیان وادی نخلہ میں حراض کے مقام پر واقع تھا۔ منات کا استھان یا آستانہ مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے قدید کے مقام پر واقع تھا۔ بنو خزاعہ، اوس اور خزرج اس کے معتقد تھے۔ اس کا باقاعدہ حج اور طواف کیا جاتا۔ زمانہ حج میں جب حجاج طواف بیت اللہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے منات کی زیارت کے لیے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اس دوسرے "حج" کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔

[۱۳] گویا مشرکین عرب دوہرا ظلم ڈھاتے تھے۔ ایک تو اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے اور انہیں اللہ کا شریک سمجھتے تھے۔ دوسرے شریک بھی ایسے جنہیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے جبکہ اپنے لیے وہ بیٹیوں کو قطعاً پسند نہ کرتے۔ بلکہ انہیں زندہ درگور کر دیتے تھے۔

[۱۴] یعنی تمہارے یہ پتھر کے بت بس پتھر ہی ہیں۔ نہ یہ خدا یا دیوتا یا دیویاں ہیں۔ نہ ہی انہیں کچھ تصرف اور اختیار حاصل ہے۔ تم نے اپنے طور پر ایک عقیدہ بنا لیا۔ پھر اس پر جم گئے اور تمہارے وہم و قیاس کے علاوہ ان کی خدائی کی کوئی بنیاد نہیں۔ اللہ نے اپنی کسی کتاب میں ان کو اپنا یا اپنے اختیارات میں شریک قرار نہیں دیا اور تمہارے اس وہم و قیاس کی اصل وجہ ہی یہی کچھ ہے کہ تمہارا دل یہی چاہتا ہے جو پیکر محسوس کی شکل میں تمہارے سامنے ہوں اور تم ان پر نذریں نیازیں چڑھا کر یہ یقین کر لو کہ تمہارے سارے کام انہیں نذروں نیازوں اور انہیں دیوی دیوتاؤں کے طفیل سیدھے ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اللہ کے ہاں یہ تمہاری سفارش بھی کرنے والی ہیں۔ تمہیں ایسا معبود گوارا نہیں جو تم پر حلال و حرام کی پابندیاں لگائے اور تمہیں اپنے اوامر و نواہی کے شکنجے میں کس کر تمہارا امتحان بھی کرے۔

[۱۵] یعنی ہمارے رسول ﷺ نے آکر تمہیں واضح الفاظ میں سیدھا راستہ بتا دیا ہے کہ اس کائنات میں تمہاری عبادت کا اصل حقدار کون ہو سکتا ہے اور اس کے عقلی اور نقلی دلائل کیا ہیں؟۔

ع

أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ﴿٢٤﴾ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ﴿٢٥﴾ وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ
شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ﴿٢٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ
الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ

انسان جیسی بھی آرزو کرے کیا وہ اسے [16] مل جاتی ہے؟ (۲۴) آخرت اور دنیا کا پورا اختیار تو اللہ ہی کو ہے (۲۵) آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کچھ [17] بھی کام نہ آئے گی الا یہ کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے اس فرشتے کو اس کا اذن دے اور وہ سفارش اسے پسند بھی ہو (۲۶) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے [18] وہ فرشتوں کو عورتوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (۲۷) اس کا انہیں کچھ بھی علم نہیں، وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن' حق کے مقابلہ میں

[16] ❁ مشرکین مکہ کی آرزو معبود ایسا ہو جو کسی قسم کی بھی پابندیاں نہ لگائے:۔ یعنی تمہاری آرزو یہ ہے کہ تمہارے معبود ایسے ہونے چاہئیں جو تم پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائیں تو کیا تمہاری یہ آرزو پوری کی جا سکتی ہے؟ یا کیا تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ جسے چاہو اپنا معبود بنالو؟ یا اگر تم نے اپنے معبودوں سے سفارش کی توقع وابستہ کر رکھی ہے تو کیا تمہارے خیال میں یہ پوری کر دی جائے گی؟ جبکہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کلی اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں؟

[17] ❁ سفارش کا ضابطہ:۔ تمہارے ان معبودوں کی تو حیثیت ہی کچھ نہیں اگر آسمان کے سارے فرشتے مل کر بھی تمہاری سفارش کریں تو وہ تمہارے کسی کام نہ آسکے گی۔ وجہ یہ ہے کہ سفارش اسی کے حق میں مقبول ہو سکے گی جس کے حق میں اللہ چاہے گا اور اللہ مشرکوں کے حق میں فیصلہ کر چکا ہے کہ انہیں کبھی نہیں بخشے گا تو وہ تمہارے حق میں سفارش کیسے کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں سفارش تو وہ کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفارش کرنے کی اجازت ہو گی خواہ یہ انسان ہوں یا فرشتے۔ تمہارے ان پتھر کے معبودوں کی سفارش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جنہیں تم فرشتے اور اللہ کی بیٹیاں قرار دے رہے ہو۔ لہٰذا تمہاری یہ آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

[18] ❁ اپنی دیویوں سے متعلق مشرکین مکہ کے عقائد:۔ فرشتے اللہ کی ایسی مخلوق ہے جو اللہ کے حکم سے سرتابی کرنے کا اختیار ہی نہیں رکھتے۔ ان کی اطاعت اضطراری اور اجباری ہے اختیاری نہیں۔ پھر وہ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن ان مشرکوں نے ان فرشتوں کو خدائی اختیارات سونپ کر ان کی پوجا شروع کر دی۔ دوسرا ستم یہ ڈھایا کہ انہیں اللہ کی اولاد قرار دے دیا اور تیسرا یہ کہ فرشتوں کو مونث سمجھ لیا اور ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جو ہماری حاجت روائی اور مشکل کشائی کر سکتی ہیں اور اگر قیامت فی الواقع ہوئی تھی ہماری سفارش کر کے ہمیں بچالیں گی۔ پھر انہوں نے ان کے خیالی پتھر کے مجسمے تراش کر انہی کی پوجا شروع کر دی۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کا آخرت پر یقین نہیں۔ اور اس دنیا کی زندگی میں ایک کافر و مشرک اور ایک موحد میں کوئی مابہ الامتیاز فرق نہیں ہوتا۔ بیمار مشرک بھی ہوتے ہیں اور موحد بھی۔ خوشحال مشرک بھی ہوتے ہیں اور موحد بھی۔ مصائب و مشکلات مشرکوں پر بھی پڑتی ہیں اور موحدین پر بھی۔ بلکہ موحدین کی دنیا

الْحَقِّ شَيْئًا ﴿٢٨﴾ فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٢٩﴾ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ ﴿٣٠﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ﴿٣١﴾

ع

کچھ بھی کام نہیں آتا۔(۲۸) لہٰذا جو شخص ہماری یاد سے [۱۹] منہ موڑتا ہے آپ اس کی پروانہ کیجئے، ایسا شخص دنیا کی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا(۲۹) ان کے علم کی پرواز بس یہیں تک [۲۰] ہے۔ بلاشبہ آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ گم کئے ہوئے ہے اور کون ٹھیک راہ پر چل رہا ہے۔(۳۰) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے (جس کا تقاضا یہ ہے) کہ وہ برائی کرنے والوں [۲۱] کو ان کے اعمال کا بدلہ دے اور جن لوگوں نے اچھے عمل کئے انہیں اچھا بدلہ دے۔(۳۱)

کی زندگی کافر اور مشرکوں کی زندگی سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے کیونکہ انہیں حلال و حرام کی اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کی بھی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے مشرکوں کے نزدیک یہ کوئی بڑا اہم اور سنجیدہ مسئلہ نہیں کہ آدمی کسی کو معبود مانے یا نہ مانے یا جتنے اور جس قسم کے چاہے معبود بنالے۔ اس کے نزدیک حق و باطل کا فیصلہ بس اسی دنیا میں ہوتا ہے اور اس دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج لازماً یہ فیصلہ نہیں دیتے کہ موحد حق پر ہیں اور مشرک باطل پر۔ لہٰذا یہ بات مشرکوں کی خواہش اور مرضی پر ہی منحصر ہوتی ہے کہ جس چیز کو چاہے معبود بنالیں اور جتنے چاہیں بناڈالیں اور جب چاہیں ایک کو چھوڑ کر دوسری چیز کو اپنا معبود بناڈالیں۔ اور جو کچھ یہ کرتے ہیں محض اپنے وہم اور قیاس سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شرک و کفر اور توحید کے نتائج کے لیے عالم آخرت بنایا ہے، عالم دنیا نہیں۔ اور یہی عالم آخرت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر اللہ اس دنیا میں ہی موحد اور مشرک کے درمیان واضح اور قطعی نتائج دکھادیتا تو اس طرح دنیا میں کسی کا امتحان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ البتہ جو لوگ آخرت پر پورا پورا ایمان رکھتے ہیں وہ شرک کر ہی نہیں سکتے۔

[۱۹] ذکر سے مراد قرآن کریم بھی ہو سکتا ہے اور معبودان باطل کے مقابلہ میں خالص اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے دعوت حق اور وعظ و نصیحت بھی یعنی جو شخص میرا ذکر سننا گوارا ہی نہیں کرتا آپ ﷺ اسے سمجھانے پر اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ ایسے لوگوں کا منتہائے مقصود صرف دنیوی مفادات ہی ہوتے ہیں جبکہ یہ تعلیم اخروی فلاح کی طرف بلاتی ہے۔ جس پر نہ ان کا ایمان ہے اور نہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ آپ ﷺ کی باتوں کی طرف کیوں توجہ دیں گے؟۔

[۲۰] ❁ مشرکین مکہ کا مبلغ علم کیا تھا؟ یعنی وہ اپنے دنیا کے مفادات سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان کا تمام تر علم اسی مقصد میں صرف ہوتا ہے کہ دنیا میں وہ زیادہ مال و دولت کیسے کما سکتے ہیں۔ پھر بھی اگر وہ سمجھیں کہ وہی راہ حق پر ہیں تو یہ فیصلہ نہ ان کے اختیار میں ہے اور نہ ان کی صواب دید پر منحصر ہے بلکہ یہ فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے کیونکہ کائنات کی ہر چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اور وہی اپنی مخلوق کے حالات کو سب سے بہتر جان سکتا ہے لہٰذا آپ کو ان سے بحث و تکرار میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، نہ ہی انہیں راہ راست پر لاکر چھوڑنا آپ کی ذمہ داری ہے۔

[۲۱] اس آیت میں واضح طور پر آخرت، اس کی اہمیت اور اس کی حکمت بیان کی گئی ہے یعنی دنیا میں مشرک و موحد، نیک اور بد،

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝۳۲ ع ۶

جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں الا یہ کہ چھوٹے گناہ[۲۲] (ان سے سرزد ہو جائیں) بلاشبہ آپ کے پروردگار کی مغفرت بہت وسیع[۲۳] ہے۔ وہ تمہاری اس حالت کو بھی خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس حالت کو بھی جب تم اپنی ماؤں کے بطنوں میں[۲۴] جنین تھے لہٰذا تم اپنے پاک ہونے کا دعویٰ نہ کرو۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ کون پرہیز گار ہے۔(۳۲)

متقی اور ظالم کے اعمال کا نتیجہ کبھی اتنا واضح طور پر نہیں نکلا کرتا جس سے انسان بھلائی کی راہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ دنیا صرف دارالعمل ہے دارالجزا اخروی زندگی ہے۔ وہاں برے اور بھلے مشرک اور موحد کا فرق اتنا واضح ہوگا جس کو ہر شخص دیکھ بھی لے گا اور عذاب و ثواب اس پر واقع ہوگا۔

[۲۲] اس فقرہ کی تشریح و تفسیر کے لیے سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۱ کا حاشیہ ۵۱، ۵۳ ملاحظہ فرمایئے۔

[۲۳] یعنی یہ اس کی مغفرت کی وسعت ہی کا نتیجہ ہے کہ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو وہ ان گناہوں سے متعلق تمہارے خیالات، ابتدائی اقدامات تمہاری لغزشیں اور آلودگیاں سب کچھ معاف فرما دے گا۔ حالانکہ ان کی تعداد بڑے گناہوں کی نسبت سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

[۲۴] ❁ اپنے منہ میاں مٹھو بننا کیوں غلط ہے؟۔ یعنی کسی بھی شخص کو اپنے تقویٰ اور نیک اعمال پر ناز اور فخر نہیں کرنا چاہئے اور اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور بزرگ نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اسے ابتداءً اپنی پیدائش پر نظر رکھنی چاہئے کہ وہ کن کن حالتوں سے گزر کر اس مقام تک آیا ہے اور کیا وہ حالتیں اس قابل ہیں کہ ان پر فخر کیا جاسکے۔ مٹی کے بعد اس کی پیدائش پانی کے ایک غلیظ اور حقیر قطرہ سے ہوئی پھر وہ ایک مدت اپنی ماں کے پیٹ کی غلاظتوں میں پرورش پاتا رہا۔ اور اب اگر وہ ایمان لے آیا ہے یا کچھ نیک عمل بجا لا چکا ہے تو اسے اپنے منہ میاں مٹھو بننا کیونکر زیب دیتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی معلوم نہیں اور نہ ہی یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں کس قسم کے اعمال کر کے مرنے والا ہے کیونکہ زیادہ تر اعتبار تو انہی اعمال کا ہو سکتا ہے جو اس نے اپنی آخری زندگی میں انجام دیے ہوں اور اس کے ایسے ہی اعمال پر اس کی اخروی جزا و سزا یا فلاح کا انحصار ہوگا جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے:

۱۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اور آپ سچے تھے اور آپ ﷺ سے جو وعدہ کیا گیا وہ بھی سچا تھا "تم میں سے ہر ایک کا مادہ (نطفہ) اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس روز جمع کیا جاتا ہے۔ پھر چالیس دن تک وہ خون کی پھٹکی رہتا ہے۔ پھر چالیس دن تک گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے اور اسے چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کے اعمال کیسے ہوں گے؟ رزق کتنا ہوگا؟ عمر کتنی ہوگی؟ اور آیا وہ نیک بخت ہوگا یا بد بخت؟ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ پھر (دنیا میں آنے کے بعد) تم میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے جو زندگی بھر نیک کام کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ بہشت اس سے ایک ہاتھ کے فاصلہ پر رہ جاتی ہے۔ پھر تقدیر کا لکھا اس پر غالب آتا ہے تو وہ کوئی دوزخیوں کا سا کام کر بیٹھتا ہے اور کوئی بندہ زندگی بھر برے کام

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝۳۳ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝۳۴ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝۳۵ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ

بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے روگردانی کی (۳۳) اور تھوڑا سا دیا[۲۵] پھر رک گیا۔ (۳۴) کیا اس کے پاس علم غیب ہے کہ وہ (سب کچھ) دیکھ[۲۶] رہا ہو۔ (۳۵) کیا اسے ان باتوں کی خبر نہیں پہنچی

کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ دوزخ اس سے ایک ہاتھ کے فاصلہ پر رہ جاتی ہے پھر تقدیر کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ بہشتیوں کا سا کام کرتا ہے "(اور وہ بہشت میں چلا جاتا ہے۔) (بخاری، کتاب بدء الخلق۔ باب ذکر الملائکۃ)

۲۔ سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم جنگ خیبر میں موجود تھے۔ جب آپ ﷺ نے اپنے ایک ساتھی (قزمان) کے حق میں فرمایا جو اسلام کا دعویٰ کرتا تھا (لیکن حقیقتاً منافق تھا) کہ یہ شخص دوزخی ہے" یہ شخص خوب جم کر لڑا اور زخمی ہوا حتیٰ کہ بعض لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک سے متعلق شک پیدا ہونے لگا۔ پھر لوگوں نے اسے اس حال میں دیکھا کہ جب اسے زخموں سے زیادہ تکلیف ہوئی تو اس نے اپنی ترکش میں ہاتھ ڈال کر ایک تیر نکالا اور اس سے اپنی گردن کو زخمی کر کے خودکشی کر لی۔ یہ صورت حال دیکھ کر کئی صحابہ کرام آپ کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ اللہ نے آپ ﷺ کی بات سچی کی۔ اس شخص نے خودکشی سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔ آپ ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا: "اٹھو اور لوگوں میں منادی کر دے کہ "بہشت میں وہی جائے گا جو مومن ہوگا اور اللہ کی قدرت یہ ہے کہ وہ بدکار آدمی سے بھی اپنے دین کی مدد کرا دیتا ہے۔ (بخاری، کتاب المغازی۔ باب غزوۃ خیبر)

[۲۵] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو آیات ولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئیں۔ ابوجہل سے پہلے ولید بن مغیرہ ہی سرداران قریش کا رئیس تھا اور اس کے سمجھ دار ہونے میں کچھ شک نہیں تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے کافی حد تک متاثر ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ ایمان لے آئے۔ اس کے ایک مشرک دوست کو جب اس صورت حال کا پتہ چلا تو اسے کہنے لگا جس آخرت سے تم ڈرتے ہو اس کا میں ذمہ لیتا ہوں کہ اگر تمہیں عذاب ہوا تو تمہاری سزائیں اپنے سر لے لوں گا بشرطیکہ تم مجھے اتنا اتنا مال دے دو۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ اس کے چکمے میں آ گیا۔ اس کی بات کو قبول کرتے ہوئے طے شدہ مال کی ایک قسط اسے ادا بھی کر دی لیکن بعد میں اس نے کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر مزید مال دینے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

[۲۶] اس سے مراد ولید بن مغیرہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کا مشرک ساتھی بھی۔ آخرت کے متعلق ان دونوں کا علم نہایت ناقص اور ظن و قیاس پر مبنی تھا۔ لیکن دونوں نے معاہدہ اس انداز سے کر لیا جیسا وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور آخرت کے احوال سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔ ولید بن مغیرہ کا علم تو اس لحاظ سے ناقص تھا کہ اس نے یہ سمجھا کہ جیسے دنیا میں مال وغیرہ دے کر کسی مصیبت سے انسان بچ سکتا ہے اور مال لینے والا دینے والے کی مصیبت اپنے سر مول لے لیتا ہے ویسے آخرت کا معاملہ بھی ہوگا اور اس کا مشرک ساتھی اس کی بلا اپنے سر لے لے گا اور مشرک ساتھی نے اس بنا پر وعدہ کیا تھا کہ وہ آخرت کا قطعی طور پر منکر تھا اسے اگر یقین تھا تو صرف اس بات کا تھا کہ ہونا ہوانا تو کچھ ہے نہیں جو مال ملتا ہے اسے کیوں چھوڑیں۔ یا ممکن ہے وہ بھی آخرت کے بارے میں مشکوک ہو اور جزا و سزا کے معاملہ میں ایسا ہی گمان رکھتا ہو جیسے ولید بن مغیرہ کا تھا۔

بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّیْسَ

جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں۔(۳۶) اور ابراہیم (کے صحیفوں میں بھی) جس نے (حق اطاعت و رسالت کو) پورا کیا[۲۷](۳۷) کہ "کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا(۳۸) اور یہ کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس[۲۸] نے کوشش کی(۳۹)

[۲۷] سیدنا ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحائف کی تعلیم:۔ یعنی اگر آخرت اور اس کی جزا و سزا کے متعلق یقین نہیں یا صحیح علم نہیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر بھی ایمان لانے کو تیار نہیں۔ تو اہل کتاب سے تو ملتے ہی رہتے ہیں اور انہیں پڑھے لکھے اور عالم بھی سمجھتے ہیں۔ ان سے کیا انہیں اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں آخرت کی جزا و سزا کے مطابق کیا ضابطہ نازل فرمایا تھا۔ واضح رہے کہ تورات کے نزول سے پیشتر سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر بھی صحائف ہی نازل ہوتے رہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر بھی کوئی جامع کتاب نہیں بلکہ صحیفے ہی نازل ہوئے تھے۔ سیدنا ابراہیم اور سیدنا موسیٰ علیہما السلام پر نازل ہونے والے صحائف کا ذکر سورہ اعلیٰ کے آخر میں بھی آیا ہے تاہم یہ صحیفے آج کسی زبان میں بھی متداول نہیں ہیں۔ ان کے متعلق قرآن سے ہی کچھ تھوڑی سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے مضامین قرآن میں آگئے ہیں۔

[۲۸] قانون جزا و سزا کی دفعات:۔ ان صحیفوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جزا و سزا کا قانون پوری طرح بتادیا تھا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے پوچھا کہ کیا تمہیں اس قانون کی خبر نہیں پہنچی۔ اور اس قانون کی دفعات یہ تھیں جو ان دو آیات میں مذکور ہیں (۱) جزا و سزا کا قانون ناقابل انتقال ہے۔ نہ تو یہ ممکن ہے زید بکر کے گناہ اپنے ذمہ لے لے اور اس طرح بکر چھوٹ جائے جیسا کہ مشرکوں نے معاہدہ کیا تھا۔ بلکہ ہر ایک کو اپنے اپنے جرائم کی سزا بھگتنا ہوگی اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود زید کی سزا بکر کو دے ڈالے اور زید بچ جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ظلم کی کوئی شکل ممکن نہیں اور (۲) ہر شخص کو اپنے کیے کی جزا و سزا ضرور ملے گی اور اتنی ہی ملے گی جتنا اس نے خود عمل کیا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ تاہم کتاب و سنت سے یہ بھی ثابت ہے کہ انسان کے سارے اعمال کا تعلق اس کی زندگی تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ کچھ اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اثرات انسان کی زندگی کے بعد بھی باقی رہتے ہیں اور ان کی سزا یا جزا اسے بعد میں ملتی رہتی ہے۔ اور اس کے اعمال نامہ میں اس کا اجر و ثواب لکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے۔

۱۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل موقوف ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے ایک صدقہ جاریہ کا دوسرے علم کا جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور تیسرے نیک بخت اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔ (مسلم، کتاب الوصیۃ، باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاته)

۲۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو آدمی ظلم سے ناحق مارا جاتا ہے اس کے گناہ کا ایک حصہ سیدنا آدم کے بیٹے (پہلے قاتل، قابیل) پر ڈالا جاتا ہے اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: "اس کے خون کے گناہ کا ایک حصہ۔ کیونکہ روئے زمین پر ناحق خون کی رسم اس نے قائم کی" (بخاری، کتاب الاعتصام، باب اثم من دعا الی...... سن سنة سیئة)

۳۔ منذر بن جریر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے اسلام میں کوئی نیک طریق ڈالی اس کے لیے اپنے عمل کا بھی

ثواب ہے اور جو لوگ اس کے بعد عمل کریں ان کا بھی ثواب ہے بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا ثواب کچھ کم ہو اور جس نے اسلام میں کوئی بری طرح ڈالی اس پر اس کے اپنے عمل کا بھی بار ہے اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کریں بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا بوجھ کچھ کم ہو" (مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقۃ)

۴۔ ❁ جن اعمال کا بدلہ موت کے بعد ملتا رہتا ہے:۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میت پر اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے اور رونے پیٹنے سے عذاب ہوتا ہے۔ اور امام بخاری نے عنوان باب میں یہ صراحت کر دی کہ "جب نوحہ کرنا میت کے خاندان کی رسم ہو" (بخاری، کتاب الجنائز۔ باب قول النبی یعذب المیت ببعض بکاء اھلہ علیہ اذا کان النوح من سنتہ) یعنی جب نوحہ کرنا میت کے خاندان کی رسم ہو اور اس نے اس سے منع نہ کیا ہو تو وہ عذاب کا مستحق ہو گیا۔

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان کے کچھ اچھے یا برے عمل ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اثرات اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتے ہیں اور ان کا اسے ثواب یا عذاب ملتا رہتا ہے۔ اب درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے:

۵۔ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے دوران قبیلہ خثعم کی ایک عورت آپ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: "اللہ نے اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے تو ایسے وقت جب کہ میرا باپ بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ وہ اونٹنی پر جم کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" (بخاری کتاب المناسک، باب وجوب الحج)

۶۔ سیدنا عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی: میری ماں نے حج کرنے کی منت مانی تھی لیکن وہ حج کرنے سے پہلے مر گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: "ہاں کر سکتی ہو۔ بھلا دیکھو اگر تمہاری ماں پر قرضہ ہوتا تو تم اسے ادا نہ کرتی اور اللہ تو ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے۔ (بخاری، کتاب المناسک ابواب العمرۃ باب الحج و النذور عن المیت)

۷۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کے پاس آکر عرض کیا کہ میری ماں ناگہاں مر گئی اور میں سمجھتا ہوں اگر وہ بات کر سکتی تو ضرور صدقہ دیتی۔ اب اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے ثواب ملے گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" اور دوسری روایت میں ہے کہ اس شخص نے یہ پوچھا تھا کہ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو مجھے ثواب ملے گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" (مسلم، کتاب الوصیۃ، باب وصول ثواب الصدقات الی المیت)

۸ ❁ ایصالِ ثواب کا مسئلہ:۔ سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ "میرا باپ مر گیا اور مال چھوڑ گیا اور اس نے وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ دوں تو اس کے گناہ بخشے جائیں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" (مسلم، کتاب الوصیۃ، باب وصول ثواب الصدقات الی المیت)

مذکورہ بالا چار احادیث میں ایسے اعمال کا ذکر ہے جن سے میت کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کے لواحقین نے سر انجام دیے ہیں۔ انہی احادیث سے مشہور و معروف مسئلہ ایصالِ ثواب مستنبط کیا جاتا ہے جیسا کہ امام مسلم کے عنوان باب سے بھی واضح ہوتا ہے۔

ان احادیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ یہ چاروں احادیث مال و دولت سے تعلق رکھتی ہیں:

۲۔ جن معاملات کا تعلق فرض یا واجب سے ہو ان کو ادا کرنا میت کے لواحقین پر واجب ہے مثلاً میت کے قرض کی ادائیگی، حج اس پر فرض ہو اور وہ نہ کر سکا ہو تو اس کی ادائیگی، اگر کوئی منت مانی ہو تو اس کی ادائیگی اور روزوں کے یا دوسرے کفارے وغیرہ اور وہ دوسرے کے کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اور اگر ان معاملات کا تعلق محض نفلی صدقات سے ہو تو میت کی طرف سے صدقہ کرنا مستحب ہے واجب نہیں اور اس کا ثواب میت کو پہنچ جاتا ہے جیسے میت کو ثواب پہنچانے کے لیے اس کی طرف سے صدقہ و خیرات کرنا وغیرہ۔

۴۔ ایسے نفلی صدقات کا ثواب میت کو بھی پہنچتا ہے اور صدقہ کرنے والے کو بھی یعنی دونوں کو ملتا ہے۔

۞ بدعت کی تعریف:۔ واضح رہے کہ علماء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ ایصال ثواب صرف مالی اور واجب عبادت میں ہی ہو سکتا ہے۔ بدنی اور نفلی عبادات میں نہیں۔ کیونکہ نیابت صرف مالی معاملات میں ہی ہو سکتی ہے بدنی میں نہیں۔ وہ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ مثلاً "الف" نے "ب" کا کچھ قرضہ دینا ہے اور "الف" کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص مثلاً "ج" "ب" کو "الف" کا قرض ادا کر دیتا ہے تو اس کا قرض ادا ہو گیا لیکن اگر "الف" کو مثلاً بھوک لگی ہے تو اس کی یہ بھوک تب ہی دور ہو سکتی ہے جب وہ خود کھانا کھائے کسی دوسرے کے کھانا کھانے سے "الف" کی بھوک کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ایصال ثواب کا تعلق بھی انہی معاملات سے ہو سکتا ہے جن میں نیابت ہو سکتی ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک روزوں کی قضا بھی دی جا سکتی ہے اور کفارہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ بھی حج کی طرح مالی عبادت بھی ہے اور بدنی بھی۔ البتہ نمازوں کی نہ قضا دی جا سکتی ہے نہ ہی ان کا کوئی کفارہ ہے۔ اور یہ ہے بھی خالص بدنی عبادت، رہا ایصال ثواب کا مسئلہ تو اس کا تعلق مالی عبادت یعنی صدقہ اور قربانی وغیرہ تک محدود ہے۔ نمازوں یا نفلی روزوں یا نفلی حج و عمرہ سے ایصال ثواب کا تصور درست نہیں۔ اسی طرح قرآن خوانی کی رسم یا رسم قل یا تیجہ یا پانچواں یا دسواں یا چالیسواں یہ سب رسوم باطل اور بدعت ہیں۔ ان کے جواز میں عموماً یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ یہ سب بھلائی کے کام ہیں۔ ان میں یا قرآن خوانی ہوتی ہے یا میت کی طرف سے کچھ صدقہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کا بھی ثواب میت کو پہنچنا چاہیے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بدعت کے سارے کام ہی بھلائی کے کام سمجھ کر شروع کیے جاتے ہیں۔ آج تک کسی نے کوئی کام برا سمجھ کر بدعت نہیں نکالی۔ دیکھنا صرف یہ چاہیے کہ دور نبوی یا دور صحابہ میں وہ کام ہوا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ کیا اس دور میں یہ کام کرنے میں کوئی رکاوٹ موجود تھی؟ پھر جب اس دور میں کوئی رکاوٹ بھی موجود نہ ہو اور اس کے باوجود صحابہ نے وہ کام نہ کیا ہو اس کو اگر کار ثواب یا دین کا حصہ بنا لیا جائے تو وہ یقیناً بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی اور اس کا انجام جہنم ہے۔

۞ بدعت کی اقسام:۔ پھر بعض لوگوں نے تو اس بدعت کی بھی وہی پانچ قسمیں بنا ڈالی ہیں جو تکالیف شرعیہ کی ہیں۔ یعنی کچھ بدعتیں واجب ہیں، کچھ مستحب، کچھ مباح کچھ مکروہ اور کچھ حرام اور بعض لوگوں نے صرف دو قسمیں بنائی ہیں۔ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے بدعت کی کوئی تقسیم بیان نہیں فرمائی اور علی الاطلاق فرمایا کہ ہر طرح کی بدعت گمراہی ہے۔ یہ حضرات بدعت حسنہ یا واجب بدعت کی مثال یہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کو جمع نہیں کیا تھا بعد میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جمع کیا اور بدعت مستحب کی مثال تراویح کی نماز باجماعت ہے۔ جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شروع کرائی تھی اور تراویح کی جماعت دیکھ کر فرمایا تھا کہ نعم البدعة هذه تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو کام دور صحابہ میں اجماع سے طے پا گیا اس پر بدعت کا اطلاق ہوتا ہی نہیں اور اس کی تفصیل یہ ہے قرآن کو جمع کرنا گمراہی کو روکنے کے لیے کیا گیا تھا جیسے کہ صحیح

لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ وَ اَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾ ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ﴿۴۱﴾ وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۴۲﴾ وَ اَنَّہٗ ہُوَ اَضۡحَکَ وَ اَبۡکٰی ﴿۴۳﴾ وَ اَنَّہٗ ہُوَ اَمَاتَ وَ اَحۡیَا ﴿۴۴﴾ وَ اَنَّہٗ خَلَقَ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ

اور یہ کہ اس کی کوشش، جلد [۲۹] ہی دیکھی جائے گی (۴۰) پھر اسے اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا (۴۱) اور یہ کہ سب کو آپ کے پروردگار ہی کے پاس [۳۰] پہنچنا ہے۔ (۴۲) اور یہ کہ وہی ہنساتا اور رلاتا [۳۱] ہے (۴۳) اور یہ کہ وہی مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ (۴۴) اور یہ کہ اسی نے نر [۳۲] اور مادہ دونوں قسمیں پیدا کیں (۴۵)

احادیث سے ثابت ہے اور ایسی ضرورت کو اصطلاح کہتے ہیں بدعت حسنہ یا بدعت واجبہ کا نام نہیں دیا جا سکتا اور تراویح کی جماعت کی اصل دور نبوی میں ثابت ہے۔ نماز تراویح بھی اور اس کی جماعت بھی آپ نے تین دن کرائی تھی۔ اور سیدنا عمرؓ نے اسے بدعت کا نام دیا تو یہ لغوی معنی کے لحاظ سے تھا شرعی اصطلاح کے لحاظ سے نہ تھا۔ بدعت کی شرعی تعریف یہ ہے۔ ”مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ“ (مسلم، کتاب الاقضیہ۔ باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور) (یعنی جس کسی نے ہمارے اس دین کے کام میں کوئی نئی بات نکالی جس کی اصل اس میں موجود نہ تھی وہ مردود ہے) آپ ﷺ نے اس ارشاد مبارک میں اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو بھی شریک کیا۔ لہٰذا بدعت کا اطلاق اس کام پر ہو گا جس کا وجود دور صحابہ میں نہ ملتا ہو اور اس کام کے کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو اور اسے دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے۔

بعض اہل بدعت یہ مغالطہ بھی دیتے ہیں کہ دور نبوی یا دور صحابہ میں مسجدوں میں نہ کلاک لگائے جاتے تھے نہ قالین یا میٹ نہ بلب یا ٹیوبیں اور نہ ہی صفیں بچھائی جاتی تھیں اور یہ کام دین کا اور ثواب کا کام سمجھ کر کیے جاتے ہیں تو کیا یہ بدعت ہوں گے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کا تعلق ایجادات سے ہے شریعت سے نہیں اور یہ چیزیں اس دور میں موجود ہی نہ تھیں۔ اور بدعت کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز اس دور میں ہو سکتی ہو مگر اس کے باوجود آپ نے یا صحابہ نے نہ کی ہو وہ بدعت ہے۔

[۲۹] ﴿ معذور لوگوں کے متعلق اشتراکی نظریہ:۔ یعنی جو کام اس نے خود دنیوی زندگی میں سرانجام دیے اور جن کاموں کے اثرات چھوڑے سب اس کی سعی میں داخل ہیں اور ان سب کو اعمال کی ترازو میں رکھ کر دیکھا جائے گا۔

بعض کمیونسٹ ذہن کے لوگ ﴿وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ اس مادی دنیا پر منطبق کر کے اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ بوڑھے اور معذور قسم کے لوگ جو کوئی محنت کر ہی نہیں سکتے ان کو مار کر ختم کر دینا چاہیے تاکہ وہ معاشرہ پر معاشی بوجھ نہ بنیں۔ جب وہ کما ہی نہیں سکتے تو انہیں کچھ ملنا بھی نہیں چاہیے۔ ظاہر ہے یہ مطلب سیاق و سباق سے قطع نظر کر کے لیا گیا ہے۔ نیز یہ نظریہ اسلام کے نظام صدقات و زکوٰۃ کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام ایسے معذور اور نادار لوگوں کی بھرپور امداد کر کے انہیں زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ لہٰذا اشتراکیوں کا یہ نظریہ اسلامی نکتہ نگاہ سے باطل، لغو اور فساد فی الارض کے مترادف ہے۔

[۳۰] یعنی ہر شخص کو ... اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور ہر شخص کے اچھے اور برے اعمال کا منتہیٰ بھی وہی ذات ہے۔ لہٰذا وہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بھی اور اثرات کا بھی پورا پورا بدلہ دے دے گا۔

[۳۱] یعنی ہر شخص کا رنج و راحت، مسرت اور غم وغیرہ دونوں طرح کے ظاہری اور باطنی اسباب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ ہر شخص کی قسمت کو اتفاقاً بھی اور تدریجاً بھی بدل دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

[۳۲] یعنی میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کا مادہ منویہ تو ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ مگر کبھی ان کے ملاپ سے اللہ بیٹا بنا دیتا ہے اور

الْأُنْثَىٰ ﴿٤٥﴾ مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ﴿٤٦﴾ وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٤٧﴾ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ ﴿٤٨﴾ وَأَنَّهُ
هُوَ رَبُّ الشِّعْرَىٰ ﴿٤٩﴾ وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ ﴿٥٠﴾ وَثَمُودَ فَمَا أَبْقَىٰ ﴿٥١﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ

نطفہ سے جبکہ وہ (رحم میں) ٹپکایا جاتا ہے۔(۴۶) اور یہ کہ دوسری بار زندہ کرنا اس کے ذمہ ہے۔(۴۷) اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا اور مفلس[۳۳] کرتا ہے۔(۴۸) اور یہ کہ وہی شعریٰ[۳۴] کا مالک ہے۔(۴۹) اور یہ کہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا۔(۵۰) اور ثمود کو بھی حتیٰ کہ کوئی باقی نہ چھوڑا(۵۱) اور اس سے پہلے قوم نوح کو (بھی ہلاک کیا) کیونکہ وہ لوگ بھی بہت ظالم اور سرکش[۳۵] تھے۔(۵۲)

کبھی بیٹی۔ یعنی حمل قرار پانے کے بعد رحم مادر میں جنین کی ساخت جسمانی میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا جس سے کوئی جنین نر بن جائے اور کوئی مادہ۔ یہ اللہ ہی کی قدرت ہے۔ اور جو ذات رُحم مادر میں ایسی تبدیلی لا سکتی ہے وہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اور تمہارا دوبارہ پیدا کرنا اس کے ذمہ ہے اور یہی پہلی بار کی پیدائش کا نتیجہ ہے کیونکہ اس کا کوئی کام بلا مقصد اور بے نتیجہ نہیں ہوا کرتا۔

[۳۳] اقنٰی کا لغوی مفہوم:۔ اقنی بمعنی غنی کرنا اور راضی کرنا (مفردات) یعنی اتنا مال و دولت دینا کہ اس کی احتیاج پوری کرنے کے علاوہ وہ خوش بھی ہو جائے اور بعض اہل لغت کے نزدیک اقنٰی اغنیٰ کی ضد ہے بمعنی مفلس بنا دینا۔ گویا اقنی لغت اضداد سے ہے۔ ان آیات میں چونکہ متقابل چیز کا ذکر ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہاں دوسرا معنی ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فلہٰذا ترجمہ میں یہی دوسرا معنی اختیار کیا گیا ہے۔

[۳۴] شعریٰ ستارہ اور اس کے پجاری:۔ مشرکین عرب تین مشہور دیویوں لات، منات اور عزیٰ کے علاوہ آسمان کے دیوتاؤں میں سے شعریٰ سیارہ کی بھی پرستش کرتے تھے۔ یہ سیارہ سورج سے ۲۳ گنا زیادہ روشن ہے اور اس کا زمین سے فاصلہ ۸ نوری سال سے بھی زیادہ ہے۔ (واضح رہے کہ سورج ہم سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے اور اس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ۸ منٹ میں ہم تک پہنچتی ہے۔ گویا ہماری زمین اور سورج کا فاصلہ ۸ نوری منٹ ہے۔ اسی سے ۸ نوری سال کا حساب لگا لیجئے) لہٰذا یہ سورج سے بہت چھوٹا اور کم روشن نظر آتا ہے۔ اہل مصر اس کی پرستش کرتے تھے کہ اسی سیارہ کے طلوع کے زمانہ میں نیل کا فیضان شروع ہوتا تھا۔ اور اہل مصر یہ سمجھتے تھے کہ اسی سیارہ کے طلوع ہونے کا فیضان ہے۔ اہل عرب میں سے خصوصاً قریش اور خزاعہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ باطلہ کی تردید کی اور فرمایا تمہاری قسمتوں کا مالک شعریٰ نہیں بلکہ وہ اللہ ہے جو شعریٰ کا بھی مالک ہے۔

[۳۵] عاد اولیٰ جن کی طرف سیدنا ہود مبعوث ہوئے اور عاد ثانیہ یا قوم ثمود جن کی طرف سیدنا صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اور قوم فرعون یہ سب لوگ آخرت کے منکر، اکڑ باز اپنے رسولوں کو ایذائیں اور دکھ پہنچانے والے اللہ کے باغی اور شرارتیں کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تباہ کر ڈالا۔

كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾
هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾
اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اسی نے الٹائی ہوئی بستی کو دے پٹکا (۵۳) پھر اس پر (تباہی) چھا گئی جس نے اس بستی کو پوری طرح [۳۶] ڈھانپ لیا۔(۵۴) پس تو (اے انسان!) اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں [۳۷] میں شک کرے [۳۸] گا؟ (۵۵) یہ (نبی) بھی پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا [۳۹] ہے۔(۵۶) آنے والی (گھڑی) قریب [۴۰] آ پہنچی ہے (۵۷) اللہ کے سوا کوئی اسے ہٹانے والا نہیں [۴۱] (۵۸) کیا تم اس بات [۴۲] سے تعجب کرتے ہو؟ (۵۹) اور تم ہنستے ہو (مگر) روتے نہیں۔(۶۰) تم کھیل کود میں پڑ کر اس سے غافل ہو چکے ہو (۶۱)

[۳۶] سیدنا لوط علیہ السلام کا مرکزِ تبلیغ سدوم اور اس کے ارد گرد کی بستیاں جنہیں زمین میں دھنسا دیا گیا اور ان کے اوپر سیاہ رنگ کا متعفن پانی چھا گیا جسے بحیرہ مردار (Dead Sea) یا بحرِ میت یا بحرِ لوطی کہتے ہیں۔

[۳۷] ❁ ظالم قوموں کی تباہی بھی بنی نوع انسان کے لئے نعمت ہے:۔ اللہ کی بنی نوع انسان پر سب بڑی نعمت یہ ہے کہ وہ ظالم اور سرکش قوموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے۔ تاکہ باقی لوگوں کو ان کے ظلم و ستم سے نجات ملے اور وہ بھی دنیا میں چین سے زندگی بسر کر سکیں۔ گویا سب ظالم قوموں کی تباہی بھی اللہ کی نعمتیں تھیں اور انسانیت پر احسانات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کا ذکر ایک دوسرے مقام پر بڑے واشگاف الفاظ میں یوں بیان فرمایا: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۲۵۱:۲)

[۳۸] تَتَمَارٰى کے معنی شک کرنا بھی ہے اور جھگڑا کرنا بھی۔ یعنی تاریخ سے اتنی مثالیں پیش کرنے کے بعد بھی تجھے اس بات میں کچھ شک رہ جاتا ہے کہ جس قوم نے بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے اکڑ دکھائی اسے آخر تباہی سے دوچار ہونا پڑا؟ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جیسے وہ لوگ اپنے نبیوں سے جھگڑا کرتے رہے کیا تو بھی انہیں باتوں میں جھگڑا کرے گا۔

[۳۹] یعنی کوئی نئی بات نہیں کہتا۔ تمہیں اپنے برے انجام سے بچ جانے کی طرف بلاتا ہے۔ سابقہ تمام انبیاء بھی اپنی قوموں کو یہی کچھ کہتے رہے ہیں۔

[۴۰] ازفۃ قیامت کا ہی صفاتی نام ہے اور ازف میں وقت کی تنگی کا مفہوم پایا جاتا ہے یعنی یہ نہ سمجھو کہ قیامت یا موت کی گھڑی ابھی بہت دور ہے اور سوچنے سمجھنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ انسان کو تو ایک پل کی بھی خبر نہیں اور جس کو موت آ گئی بس اس کی قیامت تو اسی وقت قائم ہو گئی۔

[۴۱] یعنی جب قیامت یا موت آ گئی تو نہ تم اسے روک سکو گے اور نہ تمہارے معبود۔ اللہ اسے روک تو سکتا ہے مگر وہی تو لانے والا ہے ہٹائے گا کیوں؟

[۴۲] یعنی تم تعجب تو ایسے کرتے ہو جیسے دوبارہ مر کر جی اٹھنے کی بات آج پہلی بار سنی ہے۔ حالانکہ تمام انبیاء یہی بات کہتے آئے

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾

پس اللہ کے آگے سجدہ[۴۳] کرو اور اسی کی بندگی بجالاؤ۔(۶۲)

ہیں۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ تم اپنے انجام سے ڈر جاتے اور اللہ کے خوف سے رونے لگتے۔ مگر تم اس کے برعکس ان باتوں کا مذاق اڑاتے ہو اور انجام سے غافل رہ کر کھیل کود میں وقت گزار رہے ہو۔

[۴۳] مسلمانوں کے ساتھ کافروں کا بھی سجدہ ریز ہونا:۔ یہ سورت ابتدائی کی سورتوں سے ہے اور یہ پہلی سورت ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی نیز یہی وہ پہلی سورت ہے جسے آپ ﷺ نے مجمع عام میں اور بعض روایات کے مطابق حرم میں کافروں اور مسلمانوں کے مشترکہ مجمع میں سنایا۔ قرآن کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ جب آپ ﷺ نے ﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا﴾ پڑھا تو مسلمانوں کے ساتھ کافر بھی بے اختیار سجدہ ریز ہو گئے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جو سجدہ والی سورت نازل ہوئی وہ سورۃ النجم تھی۔ آپ ﷺ نے اس سورۃ میں سجدہ کیا اور آپ کے پیچھے جتنے لوگ بیٹھے تھے (خواہ مسلمان تھے یا مشرک) سب نے سجدہ کیا بجز ایک شخص امیہ بن خلف کے، اس نے مٹھی بھر مٹی لی (منہ سے قریب کی) پھر اس پر سجدہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بعد یہ شخص کفر کی حالت میں (بدر کے دن) مارا گیا۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

اسی موقعہ سے متعلق مشہور ہے کہ جب آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھیں ﴿اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى﴾ تو شیطان نے آپ کی آواز جیسی آواز میں آگے یہ الفاظ پڑھ دیئے۔ (تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْجٰى) (یہ تینوں بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت متوقع ہے) اور بعض کے نزدیک یہ واقعہ یوں ہوا کہ جب قریشیوں نے بھی مسلمان کے ساتھ مل کر سجدہ کر لیا تو بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم سے یہ کیا حماقت سرزد ہو گئی تب انہوں نے یہ الفاظ اپنی طرف سے گھڑے اور کہہ دیا کہ ہم نے محمد (ﷺ) کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے اور سمجھے کہ اب وہ بھی ہمارے دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کے ساتھ مل کر سجدہ کیا تھا۔ یہ واقعہ جو کچھ بھی تھا یہ خبر یا افواہ اتنی مشہور ہوئی کہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں نے، جنہوں نے رجب ۵ نبوی میں ہجرت کی تھی۔ جب ایسی صلح یا سمجھوتے کی خبر سنی تو شوال ۵ نبوی میں مکہ واپس آ گئے۔ مگر مکہ آکر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو سب کچھ ایک افسانہ تھا۔ چنانچہ وہ دوبارہ ہجرت کر کے حبشہ کی طرف واپس چلے گئے۔

۵۵ آیاتھا سُورَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا

کلمات ۳۴۸ آیات ۵۵ (۵۴) سورۃ القمر مکی ہے (۳۷) رکوع ۳ حروف ۱۴۸۲

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

(قیامت کی) گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ [۱] گیا۔(۱) یہ کافر خواہ کوئی معجزہ دیکھ لیں تو اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ "یہ تو جادو ہے [۲] جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔"(۲) انہوں نے اسے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشات ہی

[۱] ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ منیٰ میں تشریف فرماتے کفار مکہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ سے کسی نشانی کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: آسمان کی طرف دیکھو، اچانک چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

۱۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر رہا اور دوسرا نیچے آگیا۔ آپ ﷺ نے (ان لوگوں سے جو اس وقت موجود تھے) فرمایا: "دیکھو گواہ رہنا" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۲۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں چاند پھٹا تھا۔ (حوالہ ایضاً)

۳۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مکہ کے کافروں نے آپ سے کہا کہ کوئی نشانی دکھاؤ۔ تو آپ ﷺ نے انہیں چاند کا پھٹنا دکھایا۔ (حوالہ ایضاً)

آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت اور انشقاق قمر کا باہمی تعلق یہ ہے کہ انشقاق قمر قرب قیامت کی ایک نشانی ہے جو واقع ہو چکی لہٰذا اسے بس اب قریب ہی سمجھو۔ جب کفار نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ یا تو چاند پر جادو کر دیا گیا ہے یا ہماری نظروں پر جو ہمیں ایسا نظر آنے لگا ہے۔ اس حیرانی میں ایک شخص نے کہا کہ اگر ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھ لو۔ چنانچہ آس پاس کے لوگوں نے اس کی تصدیق کر دی مگر یہ کافر اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔

اس آیت پر منکرین معجزات کئی طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ پہلا اعتراض معنی کی تاویل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں صیغہ ماضی کا معنی استقبال میں لیا جائے گا اور معنی یہ ہو گا کہ "جب قیامت قریب آجائے گی اور چاند پھٹ جائے گا" جیسا کہ ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ اور اس جیسی دوسری آیات کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تاویل اور دلیل اس لیے غلط ہے کہ جہاں قیامت کے حوادث کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً آسمان پھٹ جائے گا۔ ستارے بے نور ہو جائیں گے اور جھڑنے لگیں گے۔ زمین پر سخت زلزلے آئیں گے۔ پہاڑ اڑتے پھریں گے وغیرہ کا ذکر ہے وہاں ان باتوں کو کفار کے سحر کہنے کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی قرآن میں ایسی آیات کے ساتھ سحر کا ذکر آیا ہے۔ کافروں کا چاند کے پھٹنے کو جادو کہنا اور اس پر کفار کی تکرار ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ ایک حسی معجزہ تھا جو وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ فی الواقع ظہور میں آچکا ہے تو لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو اس کا علم ہونا چاہئے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ رات کا ہے دن کا نہیں جب کہ اکثر لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر اس وقت آدھی دنیا میں تو ویسے سورج نکلا ہوا تھا۔ جہاں یہ واقعہ نظر نہ آسکتا تھا اور باقی آدھی دنیا میں سے بھی صرف ان مقامات پر نظر آسکتا تھا جو منیٰ کے مشرق میں واقع تھے۔ پھر اس واقعہ کا کوئی اعلان بھی نہیں ہوا تھا جیسے آج کل جنتریوں اور اخباروں سے معلوم ہو جاتا ہے یا رصدگاہوں کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے لہٰذا لوگ کوئی اس بات کے منتظر بھی نہیں بیٹھے تھے کہ چاند پھٹے تو ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ چاند گرہن کئی گھنٹوں تک لگا رہتا ہے۔ لوگوں کو پہلے خبر بھی دی جاچکی ہوتی ہے لیکن لوگوں کی اکثریت چاند گرہن لگنے سے غافل ہوتی ہے اور یہ انشقاق قمر تو صرف ایک لمحہ کے لیے واقع ہوا تھا۔ اسے کون دیکھتا؟ اور آس پاس کے لوگوں نے شہادت دے ہی دی تھی۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ایسے اہم واقعہ کا تاریخ میں بھی ذکر ہونا چاہئے تھا۔ اس اعتراض کے کئی جواب ہیں۔ پہلا یہ کہ سب سے زیادہ مستند تاریخ حدیث کی کتابوں سے ہی دستیاب ہو سکتی ہے اور ان میں یہ واقعہ موجود ہے۔ دوسرا یہ کہ اس دور میں جیسی اور جتنی توجہ تاریخ نویسی پر دی جاتی تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ تیسرا یہ کہ جب دنیا کے لوگوں کی اکثریت اور ایسے ہی تاریخ نویسوں نے اسے دیکھا ہی نہ تو وہ لکھیں کیا؟ اور چوتھا یہ کہ تاریخ بھی اس واقعہ کے اندراج سے یکسر خالی نہیں۔ تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے کہ مالی بار کے مہاراجہ نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بالآخر یہ واقعہ اس کے اسلام لانے کا سبب بنا تھا۔

❁ چاند کے پھٹنے پر اعتراضات اور ان کے جواب:۔ چوتھا اعتراض یہ ہے کہ ہیئت دانوں اور منجمین نے بھی اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چاند پھٹنے سے اس کی رفتار میں فرق آتا، یا وہ اپنا مدار بدل لیتا یا مدار سے ہٹ کر چلنے لگتا تو یہ باتیں اس قابل تھیں کہ ہیئت دان ان کا ذکر کرتے۔ لیکن جب ان میں سے کوئی چیز بھی واقع نہ ہوئی تو وہ کیا ذکر کریں؟

اور پانچواں اعتراض یہ ہے کہ یہ واقعہ خرق عادت ہے اور ان کا دراصل سب سے اہم یہی اعتراض ہے جو انہیں تسلیم کرنے سے روکتا ہے اور وہ ادھر ادھر ہاتھ مارتے اور مختلف قسم کے اعتراض اور شکوک پیدا کرتے ہیں اور حقیقتاً ان کا یہ انکار اللہ کی قدرتِ کاملہ کا انکار ہے۔ بہر حال یہ بات بھی آج بعید از عقل نہیں رہی۔ ہر سیارے کے پیٹ میں آتشیں مادے یا پگھلتی اور کھولتی ہوئی دھاتیں موجود ہیں جن کا درجہ حرارت ہزار ہا درجہ سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔ یہ مہیب لاوے ان عظیم الجثہ کروں کو کسی وقت بھی دولخت کر سکتے ہیں۔ پھر ان کے مرکز کی مقناطیسی قوت جسے آج کی زبان میں قوت ثقل کہتے ہیں اور ان جدا شدہ ٹکڑوں کو ملا کر جوڑ بھی دیتی ہے اور ایسا عمل فضائے بسیط میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ کہکشائیں اسی طرح وجود میں آئی ہیں اور آج بھی یہ عمل بند نہیں بلکہ بدستور جاری ہے۔ علاوہ ازیں شہاب ثاقب کسی سیارے کے اس طرح سے جدا شدہ ٹکڑے کا نام ہے۔ جو کبھی علیحدہ ہو کر پھر جڑ جاتا ہے۔ کبھی فضا میں ہی گر کر گم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھار زمین پر بھی آگرتا ہے۔ فضائے بسیط میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر انسان کو اس کا صحیح طور پر علم ہو جائے تو وہ ان انشقاق قمر کے واقعہ پر کبھی تعجب نہ کرے۔ انسان کو کیا معلوم کہ اللہ کی قدرتوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور وہ کس قدر حکمتِ بالغہ سے اس نظام کائنات کو چلا رہا ہے۔

[۲] یعنی پہلے انبیاء بھی ایسے جادو کے کرشمے دکھاتے رہے ان کا جادو بھی چل بسا اور وہ خود بھی چل بسے۔ اسی طرح یہ نبی اور اس کے کرشمے بھی عنقریب ختم ہو جائیں گے۔

أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُسْتَقِرٌّ ﴿٣﴾ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ﴿٤﴾ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا
تُغْنِ النُّذُرُ ﴿٥﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُكُرٍ ﴿٦﴾ خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ وقف لازم
الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُنْتَشِرٌ ﴿٧﴾ مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ ۖ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿٨﴾ كَذَّبَتْ

کی پیروی[۳] کی جبکہ ہر کام کا ایک وقت مقرر[۴] ہے۔(۳) ان لوگوں کو (پہلی قوموں کی) خبریں مل چکی ہیں جن میں کافی تنبیہ ہے۔(۴) (ان میں) دانائی کی باتیں ہیں جو اتمام حجت کو کافی ہیں لیکن یہ تنبیہات ان کے کسی کام[۵] نہ آئیں۔(۵) لہٰذا آپ ان کی پروا[۶] نہ کیجئے۔ جس دن پکارنے والا ایک ناگوار[۷] چیز کی طرف پکارے گا۔(۶) تو یہ لوگ سہمی سہمی نگاہوں سے اپنی قبروں[۸] سے یوں نکل آئیں گے جیسے بکھری ہوئی ٹڈیاں ہوں۔(۷) وہ پکارنے والے کی طرف دوڑے جارہے ہوں گے۔ (اس دن) کافر کہیں گے کہ یہ دن تو بڑا کٹھن[۹] ہے(۸)

[۳] یعنی نبیوں اور ان کے معجزات سے انکار کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ نبی کی لائی ہوئی شریعت کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

[۴] یعنی ہر عمل کا کوئی نہ کوئی انجام یا نتیجہ ضرور نکلتا ہے اور اس وقت تمہارے اور اللہ کے رسول کے درمیان جو کشمکش جاری ہے۔ اس کا بھی نتیجہ نکل کے رہے گا اور ایسا وقت لازماً آنے والا ہے جب تم پر واضح ہو جائے گا کہ یہ نبی حق پر تھا اور جس بات پر تم اڑے ہوئے تھے وہ غلط تھی۔

[۵] یعنی قرآن میں اقوام سابقہ کی سرگزشت کو اس لیے بار بار دہرایا گیا ہے کہ لوگ ان اقوام کے انجام اور عذاب سے عبرت حاصل کریں اور ان واقعات کا ذکر ان کے لیے تازیانہ کا کام دے۔ (جسے شرعی اصطلاح میں تذکیر بایام اللہ کہا جاتا ہے) ان واقعات میں لوگوں کے عبرت اور سبق حاصل کرنے کے لیے مواد تو بہت موجود ہے لیکن اگر کوئی شخص ادھر توجہ ہی نہ کرے تو یہ تنبیہات اس کے کس کام آسکتی ہیں؟۔

[۶] یعنی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور ایسے ضدی انسانوں کی ہدایت کے لالچ میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ یہ لوگ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک عذاب کو دیکھ نہ لیں۔

[۷] نکر کا ایک معنی ناگوار ہے جو ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے اور اس کا دوسرا معنی انجانی اور اجنبی چیز ہے یعنی جب وہ حساب کتاب کے لیے بلائے جائیں گے تو یہ بات ان کے لیے بالکل انوکھی ہو گی جس کا انہیں خواب و خیال تک نہ تھا کہ اس طرح انہیں زندہ کر کے حساب کتاب کے لیے پیش ہونا پڑے گا۔

[۸] قبروں سے مراد صرف وہ قبریں نہیں جہاں انہیں دفن کیا گیا تھا۔ ان قبروں کے تو نام و نشان تک باقی نہ رہ جائیں گے۔ بلکہ یہاں قبروں سے مراد وہ مقام ہیں۔ جہاں کسی انسان کے جسم کے ذرات خاک میں ملے ہوئے ہوں گے۔ اور قبروں سے نکلنے کے بعد ان کی نگاہیں سہمی ہونے کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں ایک قیامت کے ہولناک مناظر دوسرے ان کی دنیا کی زندگی کی کرتوتیں۔ اسی سہمی ہوئی حالت میں وہ ٹڈی دل کی طرح اس طرف دوڑنا شروع کر دیں گے جدھر سے انہیں پکارا جارہا ہو گا۔

[۹] قیامت کی ہولناکیوں اور دہشت ناک مناظر دیکھ کر انہیں یہی فکر لاحق ہو گی کہ دیکھئے آج ان پر کیا گزرتی ہے۔

قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ﴿۹﴾ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾
فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾
وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ

ان سے پہلے قوم نوح جھٹلا چکی ہے۔ انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلا دیا اور کہنے لگے، "یہ دیوانہ ہے" اور اسے جھڑک[۱۰] دیا گیا (۹) چنانچہ انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ: "میں مغلوب[۱۱] ہو چکا، اب تو ان سے بدلہ لے" (۱۰) تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے۔ (۱۱) اور زمین کو پھاڑ کر ہم نے کئی چشمے بہا دیئے۔ (نیچے اور اوپر کا) پانی ایک ایسے کام[۱۲] کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔ (۱۲) اور نوح کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں[۱۳] والی (کشتی) پر سوار کر دیا۔ (۱۳) جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی[۱۴]۔ یہ بدلہ اس شخص کی خاطر دیا گیا جس کا انکار[۱۵] کیا گیا تھا۔ (۱۴) اور اس کشتی کو ہم نے ایک نشانی[۱۶] بنا کر چھوڑ دیا۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ (۱۵)

[۱۰] سیدنا نوح اور ان کی قوم کا ذکر:۔ وہ دیوانہ تو اس لیے کہتے تھے کہ آپ قوم کی اکثریت کے آبائی عقائد کے خلاف صرف تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ اٹھ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کا اور آپ کے چند ساتھیوں کا اس ساری قوم کے خلاف ہونا ہی ان کے نزدیک دیوانگی تھا۔ وہ لوگ کبھی آپ کو سنگسار کرنے کی دھمکی دیتے کبھی قتل کی اور کبھی صرف اس بات پر ڈانٹ پلا دیتے تھے کہ تم اس کام سے باز کیوں نہیں آتے؟

[۱۱] سینکڑوں برس اپنی قوم پر مغز کھپانے اور ان کی طرف سے ایذائیں اور جھڑکیاں برداشت کرنے کے بعد آپ نے اس وقت دعا کی کہ جب کسی شخص کے مزید ایمان لانے سے آپ قطعاً مایوس ہو گئے تھے۔ اور دعا یہ کی تھی کہ ہم پر جو ظلم و ستم یہ لوگ ڈھا چکے ہیں ہماری مدد فرما کر ان سے بدلہ لے۔

[۱۲] طوفان نوح کا منظر:۔ اوپر آسمان سے موسلا دھار، متواتر اور لگاتار بارش ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان نے اپنے دہانے کھول دیئے ہیں۔ نیچے زمین سے پہلے تنور سے پانی نکلنا شروع ہوا۔ پھر بے شمار چشمے پھوٹ پڑے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری زمین چشمے ہی چشمے بن گئی ہے۔ جدھر دیکھو پانی کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ یہ عمل کئی روز تک جاری رہا اور پانی کی سطح اس قدر بلند ہو گئی کہ چھوٹے موٹے پہاڑ تک پانی میں ڈوب گئے اور پانی اس سطح تک پہنچ گیا جتنا اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا تھا۔

[۱۳] کشتی نوح اور قوم کا تمسخر:۔ طوفان سے پیشتر نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق لکڑی کے تختوں اور لوہے کے کیلوں کی مدد سے ایک بہت بڑی کشتی تیار کی تھی جسے دیکھ کر آپ کی قوم یوں مذاق اڑاتی تھی کہ ہم تو پینے کے پانی کو ترس رہے ہیں تم اس جہاز کو چلاؤ گے کہاں؟ یہاں نہ تو نزدیک کوئی دریا ہے اور نہ سمندر ہے؟

[۱۴] طوفان میں کشتی کا منظر:۔ جوں جوں پانی کی سطح بلند ہوتی جاتی تھی یہ کشتی خود بخود اوپر اٹھتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ پہاڑ تک پانی میں غرق ہو گئے۔ اس وقت سیدنا نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ ہم نے کس طرف کشتی کا رخ موڑنا ہے اور ہماری منزل کون سی ہے وہ بھی اللہ کے سہارے اس کشتی میں جانیں محفوظ کیے بیٹھے تھے اس کے علاوہ انہیں کچھ علم نہ تھا اور نیچے پانی کا سمندر بن گیا تھا۔ اللہ ہی اس کشتی کی حفاظت اور نگرانی فرما رہا تھا اور اس کے حکم سے یہ کشتی اپنا رخ بدلتی تھی۔

[۱۵] اس سے مراد نوح علیہ السلام ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو ترجمہ سے واضح ہے اور اگر کفر کا معنی کفران نعمت یا قدر ناشناسی لیا

مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ كَذَّبَتْ عَادٌ
فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ

پھر (دیکھ لو) میرا عذاب کیسا تھا اور میری تنبیہات کیسی تھیں؟ (۱۶) ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان [۱۷] بنادیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ (۱۷) قوم عاد نے (بھی) جھٹلایا تھا۔ پھر (دیکھ لو) میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا۔ (۱۸) ہم نے ایک منحوس [۱۸] دن میں ان پر سناٹے کی آندھی چھوڑ دی جو مسلسل چلتی رہی (۱۹) وہ لوگوں کو

جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نوح علیہ السلام کی ذات ان کے درمیان اللہ کی ایک نعمت تھی جن کی وجہ سے عذاب رکا ہوا تھا اور نبی کی ناقدر شناسی کی وجہ سے ہی ان پر یہ عذاب آیا تھا۔

[۱۶] کشتی نوح نشانی کے طور پر:۔ یہ کشتی بالآخر جودی پہاڑ پر ٹک گئی۔ آسمان سے بارش بند ہو گئی۔ نیچے سے زمین نے پانی جذب کیا۔ کچھ ہواؤں اور سورج نے پانی خشک کیا۔ چنانچہ چالیس دن بعد کشتی پر سوار لوگ اس قابل ہوگئے کہ کشتی سے اتر آئیں۔ مگر کشتی وہیں رہ گئی۔ اس سے جو کام لیا جانا منظور تھا وہ لیا جا چکا تھا۔ یہ مدت ہائے دراز تک وہیں پڑی رہی اور آنے والی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنی رہی۔

[۱۷] قرآن کی خوبیاں اور آسان زبان:۔ یہ اللہ کا بڑا فضل اور احسان ہے کہ اس نے اپنے کلام کو آسان اور سہل بنادیا ہے۔ اس میں دی گئی مثالیں تشبیہات مناظر قدرت، دلائل اور انداز بیان سادہ اور عام فہم ہیں اس لیے کہ اس کے اولین مخاطب امی لوگ تھے۔ لکھے پڑھے عالم فاضل لوگ نہیں تھے۔ یہ کسی فلسفے یا منطق کی کتاب بھی نہیں جس کی عبارت پیچیدہ اور مغلق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتادیا کہ ہم نے اس کتاب میں کوئی پیچیدگی نہیں رکھی۔ (۱۱:۸) نیز اس میں محض خیالی فلسفے نہیں بلکہ ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن سے انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہوتا ہے اور ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے اور ہدایت حاصل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں شعر نہ ہونے کے باوجود اس میں موزونیت اور تاثیر شعر سے زیادہ ہے اسی وجہ سے اس کو حفظ کرنا آسان ہے اور ہر چھوٹا بڑا عربی عجمی اسے تھوڑی سی محنت سے حفظ کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے حافظ ہر دور میں لاکھوں کی تعداد میں رہے ہیں۔ پھر اس کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ اس کے اولین مخاطب تو امی ہیں۔ لیکن خطاب کرنے والی وہ ہستی ہے جو سب سے بڑھ کر علیم و حکیم ہے جس سے اس میں دوگونہ خوبیاں پیدا ہو گئیں ایک یہ کہ مبتدی اور منتہی دونوں اس کلام سے ایک جیسے مستفید ہوتے ہیں اور اپنی اپنی علمی سطح کے مطابق اس سے استفادہ اور ہدایت حاصل کر سکتے ہیں اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے آسان انداز بیان اختیار کرنے کے باوجود اس کلام میں لاتعداد اسرار اور حکمتیں پوشیدہ ہیں جو بار بار پڑھنے اور غور کرنے سے منکشف ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود لا تنقضی عجائبہ کہہ کر ان باتوں کی طرف اشارہ فرمادیا: یعنی قرآن ایسی کتاب ہے جس کے عجائب ختم ہونے میں آہی نہیں سکتے۔

[۱۸] کیا کوئی دن بذات خود نحس یا سعد ہوتا ہے؟:۔ کہتے ہیں کہ یہ دن ماہ شوال کا آخری بدھ تھا جس سے بعض ضعیف الاعتقاد لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہر مہینہ کا آخری بدھ منحوس دن ہوتا ہے پھر بعض ضعیف اور موضوع روایات کی بناپر اس عقیدہ پر کئی

كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ﴿٢٣﴾ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَّفِي ع ۲
ضَلَالٍ وَّسُعُرٍ ﴿٢٤﴾ ءَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ﴿٢٥﴾ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَّنِ

یوں اکھاڑ اکھاڑ کر پھینک رہی[۱۹] تھی جیسے جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجوروں کے درخت کے تنے ہوں (۲۰) پھر (دیکھ لو) میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا رہا؟ (۲۱) ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان بنادیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت ماننے والا؟ (۲۲) قوم ثمود نے (بھی) ڈرانے والوں کو جھٹلایا تھا۔ (۲۳) وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنے ہی میں سے ایک اکیلے آدمی کی پیروی کرنے لگیں؟ تب تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ گئے (۲۴) کیا ہم میں سے یہی شخص رہ گیا تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں بلکہ وہ کذاب[۲۰] اور ڈینگیں مارنے والا ہے۔ (۲۵) یہ لوگ کل ہی

حاشیے چڑھائے گئے کہ اس دن سفر نہ کرنا چاہئے۔ کاروبار نہ کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی سب باتیں خرافات ہیں اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اس مقام پر ﴿فِىْ يَوْمِ نَحْسٍ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ سورہ حٰم السجدہ کی آیت نمبر ۱۶ میں ﴿فِىْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾ کے الفاظ مذکور ہیں۔ اور سورہ الحاقہ میں یہ صراحت ہے کہ یہ عذاب ان پر مسلسل آٹھ دن اور سات راتیں رہا تھا۔ یعنی بدھ سے عذاب شروع ہوا اور اگلے بدھ تک رہا۔ اس لحاظ سے ہفتہ کے سب ایام ہی نحس ہوئے اور سعد ایک بھی نہ رہا۔ اور اس بات کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔

۲۔ ایک ہی دن ایک قوم کے حق میں منحوس ہوتا ہے اور وہی دن دوسری قوم کے حق میں سعد ہوتا ہے۔ مثلاً یہی دن سیدنا ہود علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کے حق میں سعد تھا۔ جنہیں اللہ نے اس مصیبت سے بچالیا تھا مثلاً دس محرم کا دن فرعون اور آل فرعون کے لیے منحوس تھا مگر یہ دن سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے لیے سعد اور انتہائی خوشی کا دن تھا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی دن ایسا پیدا نہیں کیا جو سب کے لیے نحس ہو یا سعد ہو۔ یہ نجومی اور سیاروں کے انسانی زندگی پر اثرات تسلیم کرنے والوں کی تقسیم ہے کہ فلاں دن نحس ہے اور فلاں سعد۔ شریعت ایسی تقسیم کو شرک قرار دیتی ہے۔

[۱۹] ❁ <u>قوم عاد اور اس کا انجام:</u۔ یہ عذاب انتہائی تیز رفتار آندھی کی شکل میں تھا اور یہ ہوا نہایت ٹھنڈی تھی جو ان کے گھروں میں گھس جاتی تھی۔ درختوں کو بھی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہی تھی اور قوم کے قد و قامت، ڈیل ڈول اور مضبوط اور طاقتور جسم والے لوگوں کو بھی پاؤں سے اکھاڑ کر زمین پر پٹخ دیتی تھی۔ جس سے ان کی گردنیں ٹوٹ جاتی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی کھجوروں کے جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت ہی ہیں۔

[۲۰] ❁ <u>قوم ثمود کے سیدنا صالح کو جھٹلانے کی تین وجوہ:</u>۔ یعنی قوم ثمود نے تین وجوہ کی بنا پر سیدنا صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا ایک یہ کہ وہ ہم ہی جیسا ایک انسان ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کوئی مافوق

الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴿٢٦﴾ إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۖ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ فَكَيْفَ كَانَ

جان[۲۱] لیں گے کہ کذاب اور ڈینگیں مارنے والا کون تھا؟(۲۶) (اے صالح!) ہم اونٹنی کو ان کے لئے آزمائش بنا کر بھیج رہے ہیں۔ تم صبر کے ساتھ ان (کے انجام) کا انتظار کرو(۲۷) اور انہیں آگاہ کر دو کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا۔ ہر ایک اپنی باری[۲۲] پر (پانی پر) آئے گا۔(۲۸) آخر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو پکارا[۲۳] جو اس کے (مارنے کے) درپے ہوا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔(۲۹) پھر (دیکھ لو) میرا عذاب اور میرا

الفطرت بات اس میں ہم نہیں دیکھتے۔ دوسری یہ کہ وہ اکیلا ہے اس کے ساتھ نہ کوئی جتھا ہے نہ فوج نہ یار و مددگار اور نہ جاہ و حشم، پھر آخر ہم کس بنا پر اس کی اطاعت کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہم اس کی اطاعت کرنے لگیں تو ہم جیسا احمق اور پاگل کون ہوگا۔ اور تیسری وجہ یہ کہ اگر اللہ کو اپنا کوئی رسول بنانا ہی تھا تو کیا اسے یہی شخص پسند آیا تھا؟ جس کے پاس نہ مال و دولت ہے اور نہ جاہ و حشم، پھر آخر.... ہم کس بنا پر اس کی اطاعت کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہم اس کی اطاعت کرنے لگیں تو ہم جیسا احمق اور پاگل کون ہوگا۔ بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اللہ کی طرف سے رسالت کا محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ اور حقیقتاً یہ کوئی بڑا آدمی یا لیڈر بننا چاہتا ہے۔ اور یہ بالکل اسی قسم کے اعتراضات تھے جو قریش مکہ رسول اللہ ﷺ پر کر رہے تھے۔

[۲۱] کل سے مراد ان پر عذاب کا دن بھی ہو سکتا ہے اور قیامت کا دن بھی اور بہت جلد بھی یعنی یہ حقیقت جلد ہی واضح ہو جائے گی کہ اصل میں جھوٹا اور بڑیں مارنے والا کون تھا۔ صالح علیہ السلام یا انہیں جھٹلانے والے؟

[۲۲] ناقۃ اللہ کی صفات اور قوم کی آزمائش:۔ یہ دیو ہیکل اونٹنی قوم ثمود کے مطالبہ پر انہیں بطور معجزہ دی گئی تھی۔ اسی لیے اسے ناقۃ اللہ یا اللہ کی اونٹنی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ جہاں بھی جاتی تھی دوسرے جانور ڈر کے مارے بھاگ جاتے تھے۔ لہٰذا اس اونٹنی کا احترام اس قوم کے لیے ایک آزمائش بن گیا تھا۔ بالآخر وحی الٰہی کے مطابق یہ طے ہوا کہ ایک دن بستی کے کنوئیں سے یہ اونٹنی پانی پئے گی اور دوسرے دن قوم کے دوسرے جانور، ساتھ ہی قوم کو آگاہ کر دیا گیا اگر تم اس فیصلہ میں ردوبدل کرو گے یا اس اونٹنی کو کوئی دکھ پہنچاؤ گے تو پھر تمہاری خیر نہیں۔

[۲۳] قوم کا ناقۃ اللہ کو زخمی کر دینا:۔ اس اونٹنی کا احترام قوم کے لیے وبال جان بن گیا کیونکہ ان کے اپنے جانوروں کو ایک دن چھوڑ کر کھانے کو چارہ اور پینے کو پانی ملتا تھا۔ مگر وہ اسے ہاتھ لگانے سے ڈرتے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ صالح علیہ السلام اگرچہ اکیلے ہیں اور صرف چند کمزور سے آدمی ان کے ساتھ ہیں تاہم کوئی غیبی طاقت ان کی پشت پر موجود ہے لیکن وہ زیادہ دیر صبر نہ کر سکے اور اندر ہی اندر اس اونٹنی کو مار دینے کے مشورے ہوتے رہے۔ بالآخر ایک بدکار عورت نے اپنے آشنا کو اس بات پر آمادہ کر ہی لیا کہ وہ اس اونٹنی کو ہلاک کر دے۔ یہ قوم کا ایک کڑیل مضبوط نوجوان مگر اخلاقی لحاظ سے سب سے زیادہ بدکردار اور بدبخت انسان تھا۔ اس نے اونٹنی کے پاؤں کی رگوں کو کاٹ ڈالا۔ اونٹنی نے ایک چیخ ماری اور دوڑ کر اسی پہاڑ میں غائب ہو گئی جس سے نکلی تھی۔

عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾ وَلَقَدْ
يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا
إِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ
بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ أَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ

ڈرانا کیسا تھا۔(۳۰) ہم نے ان پر ایک ہی گرج دار آواز بھیجی تو وہ یوں ہو گئے جیسے کسی باڑ لگانے والے کی سوکھی[۲۴] اور ٹوٹی ہوئی باڑ ہو(۳۱) ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟(۳۲) قوم لوط نے بھی ڈرانے والوں کو جھٹلایا(۳۳) تو ہم نے ان پر پتھر برسائے مگر لوط کے گھر والوں کو ہم نے سحری کے وقت بچا کر نکال[۲۵] دیا۔(۳۴)

یہ ہماری طرف سے احسان تھا (اور) ہم شکر کرنے والے کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں(۳۵) (لوط نے) انہیں ہماری گرفت سے یقیناً ڈرایا تھا مگر وہ اس تنبیہ[۲۶] کو مشکوک سمجھ کر باتیں بناتے رہے(۳۶) اور ان سے ان کے مہمانوں کا مطالبہ کرنے لگے تو ہم نے ان کی آنکھوں کو بے نور[۲۷] بنا دیا (اور کہا) اب میرے عذاب اور میری تنبیہ کا مزا چکھو(۳۷)

[۲۴] ❁ چیخ کا عذاب:۔ یہ لوگ چیخ یا گرج دار آواز سے ہلاک کیے گئے۔ فرشتے نے ایک چیخ ماری جس سے ان کے کلیجے پھٹ گئے۔ اور مر کر ایک دوسرے پر گرنے لگے اور اس طرح ایک دوسرے سے روندے جانے لگے جیسے کسی کھیت کے گرد لگی ہوئی باڑ چند روز میں پامال ہو کر چورا چورا بن جاتی ہے۔ یہی ان لوگوں کا حال ہوا۔

[۲۵] ❁ قوم لوط پر عذاب:۔ سیدنا لوط علیہ السلام کو پہلے مطلع کر دیا گیا تھا کہ صبح کے وقت تمہاری قوم پر خوفناک عذاب آنے والا ہے۔ لہٰذا راتوں رات ہی تم اپنے پیروکاروں کو ساتھ لے کر اس بستی سے نکل جاؤ تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ پیچھے ہی رہے گی اور سزا پانے والوں میں شامل ہو گی۔ اور جب تم نکلو تو خود سب سے پیچھے رہنا۔ اور تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۔ ایسا نہ ہو کہ "کسی کے دل میں یہ خیال آ جائے کہ دیکھوں تو سہی کہ اس قوم پر کیسا عذاب آتا ہے۔ ورنہ وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آ جائے گا۔

[۲۶] ❁ سیدنا لوط کو قوم کی دھمکیاں:۔ سیدنا لوط علیہ السلام نے قوم کو ڈرایا تو تھا مگر یہ بد بخت قوم بھلا ان کی نصیحت کو بلکہ خود ان کو بھی کیا سمجھتی تھی۔ وہ الٹا لوط علیہ السلام کو دھمکیاں دینے لگی۔ اگر تم اتنے ہی پاکباز ہو تو ہماری اس گندی بستی سے نکل جاؤ۔ ورنہ ہم خود تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ نیز انہوں نے سیدنا لوط علیہ السلام پر یہ پابندی بھی لگا رکھی تھی کہ باہر سے آنے والے مسافروں اور مہمانوں کو اپنے ہاں پناہ نہ دیا کرو۔ ورنہ اس کے نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔ اور جو بات لوط علیہ السلام انہیں سمجھانا چاہتے تھے اور انہیں ان کے انجام سے مطلع کر کے انہیں اللہ کے حضور جوابدہی سے ڈرانا چاہتے تھے اس کو بھلا یہ لاتوں کے بھوت کب ماننے والے تھے بس الٹی سیدھی باتیں بنا کر جھگڑے کی راہ پیدا کر لیتے تھے۔

[۲۷] ❁ عذاب کی نوعیت:۔ ان پر عذاب ڈھانے کے لیے تین فرشتے نہایت خوبصورت نوجوان بے ریش لڑکوں کی شکل میں

نُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ
اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ

اور صبح سویرے ہی انہیں ایک نہ ٹلنے والے[۲۸] عذاب نے آگھیرا (۳۸) تو (ہم نے کہا) اب میرے عذاب اور میری تنبیہ کا مزا چکھو (۳۹) اور ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنادیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت ماننے والا؟ (۴۰) آل فرعون کے ہاں بھی ڈرانے والے آئے تھے۔ (۴۱) انہوں نے ہماری سب نشانیوں کو جھٹلا دیا تو ہم نے انہیں کسی زبردست اور صاحب[۲۹] قدرت کی گرفت کی طرح پکڑ لیا۔ (۴۲) (اے اہل مکہ!) کیا تمہارے کافر ان لوگوں سے بہتر ہیں یا تمہارے لئے آسمانی کتابوں میں نجات لکھ[۳۰] دی گئی ہے؟ (۴۳) کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک

آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر سیدنا لوط علیہ السلام سخت پریشان ہوگئے اور ڈر گئے کہ اس بدکار قوم سے ان مہمانوں کی آبرو کو کیسے بچا سکیں۔ اتنے میں بیوی صاحبہ نے آس پاس کے مشٹنڈوں کو مخبری کر دی کہ بہت اچھا مال گھر میں آیا ہے۔ وہ لوگ اوپر سے ہی آپ کے گھر میں گھس آئے۔ سیدنا لوط علیہ السلام نے ان بدبختوں کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنے برے ارادہ سے باز آجائیں کہ مجھے مہمانوں کے سامنے رسوا نہ کریں۔ جب فرشتوں نے یہ صورت حال دیکھی تو سیدنا لوط علیہ السلام کو علیحدہ لے جاکر صورت حال بتا دی کہ تمہیں ڈرنے اور منت سماجت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جو اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ پھر جب یہ اوباش اپنی خواہش جنسی پوری کرنے کے لیے ان لڑکوں کی طرف بڑھے تو ان میں سے ایک فرشتے نے ان کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیا۔ جس سے ان کی بینائی جاتی رہی اور وہ چیخیں مار کر واپس دوڑنے لگے اور نظر نہ آنے کی وجہ سے دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ یہ ان پر پہلا اور ہلکا عذاب تھا۔

[۲۸] پھر دوسرے دن صبح کے وقت ان پر جو بڑا عذاب آیا اس کی تفصیل پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے۔ پہلے اس پورے خطہ زمین کو جبریل علیہ السلام نے اپنے پروں پر اٹھایا اور بلندی پر لے جاکر پھر الٹا کر زمین پر دے مارا۔ جس سے یہ خطہ زمین میں دھنس گیا۔ اوپر سے پتھروں کی بارش ہوئی۔ پھر اس دھنسے ہوئے خطہ زمین پر سمندر کا پانی چڑھ آیا جو متعفن اور بدبودار ہو گیا۔ اس طرح اس قوم کے نام و نشان کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا۔

[۲۹] ❁ فرعون کی خدائی اور فرعونیوں کا حشر:۔ فرعون بھی اپنے ملک میں خدا بنا بیٹھا تھا۔ سیدنا موسیٰ اور سیدنا ہارون علیہما السلام اس کے پاس ایسے واضح معجزات لے کر آئے تھے جن سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ واقعی اللہ کے پیغمبر ہیں۔ مگر وہ اپنی فرمانروائی اور خدائی سے دستبردار ہونے کو قطعاً تیار نہ تھا لہٰذا پیغمبروں کو جھٹلا دیا اور ان پر ایمان لانے کی بجائے ظلم و ستم ڈھانے لگا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دینے کے منصوبے سوچنے لگا۔ اس وقت ہم نے اسے ایسی سزا دی جس سے بچ نکلنے کے لیے اس کے پاس کوئی راہ نہ تھی۔ ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو عین سمندر کے درمیان لاکر سمندر کے پانی کو روانی کا حکم دیا۔ اس طرح اسے اس کے لشکروں سمیت سمندر میں غرق کر دیا۔ اس وقت نہ اس کی خدائی کام آئی اور نہ اس کے لشکر۔

[۳۰] اے مکہ کے کافرو! اب تم بتاؤ کیا تم ان لوگوں سے زیادہ طاقتور ہو یا شان و شوکت رکھتے ہو؟ پھر اگر وہ لوگ ہمارے عذاب

جَمِيۡعٌ مُّنۡتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَيُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوۡعِدُهُمۡ وَالسَّاعَةُ اَدۡهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾ اِنَّ

انتقام لے لینے والی جماعت ہیں۔(۴۴) ان کی یہ جماعت جلد ہی شکست کھا جائے گی اور پیٹھ دکھا کر [۳۱] بھاگ کھڑے ہوں گے۔(۴۵) بلکہ ان سے (نمٹنے کا اصل) وعدہ تو قیامت ہے اور قیامت بڑی دہشت ناک [۳۲] اور تلخ تر ہے۔(۴۶)

سے نہیں بچ سکے تو تم کیسے بچ جاؤ گے؟ یا ہم نے کسی آسمانی کتاب میں یا صحیفہ میں تمہارے حق میں یہ لکھ دیا ہے کہ تم دنیا میں جو چاہو کرتے پھرو ہم تم سے تعرض نہیں کریں گے۔ نہ ہی تمہیں کوئی سزا دیں گے اگر کوئی ایسی بات ہے تو دکھا دو۔

[۳۱] ہجرت حبشہ:۔ قیاس یہ ہے کہ یہ سورت سورۂ نجم سے ڈیڑھ دو سال بعد نازل ہوئی۔ نزولی ترتیب کے لحاظ سے سورہ نجم کا نمبر ۲۳ ہے اور اس کا نمبر ۳۷ ہے۔ اور سورہ نجم رجب ۵ نبوی اور شوال ۵ نبوی کے درمیانی عرصہ میں نازل ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ ۷ نبوی میں نازل ہوئی ہوگی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ کافروں کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر ۸۳ مسلمان مرد اور عورتیں حبشہ کی طرف چلے گئے تھے۔ باقی شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تھے۔ ان کا معاشرتی بائیکاٹ بھی کر دیا گیا تھا اور معاشی بھی۔ باہر سے ان محصورین تک سخت پابندی بھی لگا دی گئی تھی اور مسلمان بھوک اور افلاس کا شکار ہو رہے تھے۔ بعض دفعہ درختوں کے پتے کھانے تک نوبت آجاتی اور یہ سب ظلم و ستم ڈھانے والے بھی سرداران قریش تھے جنہیں اپنی جمعیت پر ناز تھا کہ اسلام لانے کے جرم کا مسلمانوں سے پوری طرح انتقام لے سکتے ہیں۔ اس سورہ کی آیت نمبر ۴۴ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت نمبر ۴۵ میں ایسی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ جس کا اس دور میں تصور بھی ناممکن نظر آتا تھا۔ لیکن اللہ کی تدبیر کے مقابلہ میں دوسروں کی تدبیریں کیسے کارگر ہو سکتی ہیں۔ اس سورہ کے نزول کے سات ہی سال بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ پیشینگوئی جو ناممکن نظر آرہی تھی جنگ بدر میں ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آگئی۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے بھی واضح ہے۔

یہ پیش گوئی اس وقت کی گئی جب مسلمان شعب ابی طالب میں محصور تھے اور بدر کے دن پوری ہوئی:۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن آپ ﷺ ایک خیمہ میں مقیم تھے۔ آپ ﷺ نے یوں دعا فرمائی: یا اللہ! میں تجھے تیرے عہد اور وعدہ کی قسم دیتا ہوں، یا اللہ! اگر تو چاہے تو (ان تھوڑے سے مسلمانوں کو ہلاک کر دے) تو پھر آج کے بعد کوئی تیری پرستش کرنے والا نہ رہے گا"۔ پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا: یارسول اللہ ﷺ اب بس کیجئے، آپ نے اپنے پروردگار سے التجا کرنے میں حد کر دی۔ آپ ﷺ اس دن زرہ پہنے ہوئے چل پھر رہے تھے۔ آپ خیمہ سے باہر نکلے تو یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ ﴿سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَيُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ﴾ (بخاری، کتاب التفسیر)

اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتقام لینے والے خود اللہ کے انتقام کا شکار ہو گئے۔ ستر بڑے بڑے کافر موت کے گھاٹ اترے اور اتنے ہی بھاگتے بھاگتے گرفتار ہو گئے۔

[۳۲] مسلمانوں سے انتقام لینے والی جماعت کو یہ سزا تو دنیا میں ملی اور اصل سزا تو قیامت کو ملنے والی ہے جو اس سزا سے دہشت ناک بھی زیادہ ہوگی اور دردناک بھی زیادہ ہوگی۔

الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿٤٧﴾ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿٤٨﴾ اِنَّا كُلَّ
شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ﴿٥٠﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ

بلاشبہ مجرم لوگ گمراہی اور دیوانگی[۴۳] میں پڑے ہیں(۴۷) جس دن یہ دوزخ میں اپنے منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) اب چکھو جہنم کی لپیٹ کا مزا(۴۸) بلاشبہ ہم نے ہر چیز[۴۴] کو ایک مقدار سے پیدا کیا ہے(۴۹) اور ہمارا حکم بس ایک ہی دفعہ کہنے پر اتنی جلدی ظہور پذیر[۴۵] ہو جاتا ہے جیسے آنکھ کی جھپک(۵۰) اور تمہارے جیسی تو بہت سی قوموں[۴۶]

[۴۳] ❁ سعر کا لغوی مفہوم۔ سُعُر۔ سعر بمعنی آگ کا بھڑکنا اور شعلے نکلنا۔ پھر یہ لفظ مجازاً اشتعال دلانے اور مشتعل ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور سعر سے مراد ایسی دیوانگی ہے کہ کسی بات پر انسان فوراً مشتعل ہو کر غلط کام کرنے لگے اور اس کی عقل صحیح کام نہ کرے۔ یعنی ان مجرموں کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ ہدایت کی کسی بات پر غور کرنے سے پہلے ہی تیخ پا ہو جاتے ہیں۔

[۴۴] ❁ اللہ کا ہر چیز کو اندازے سے پیدا کرنا۔ یہ آیت اتنا وسیع مفہوم رکھتی ہے جس کی تشریح غالباً انسان سے ناممکن ہے۔ کیونکہ اس میں ایک تو ہر شے کا ذکر آ گیا۔ دوسرے قدر یا مقدار یا اندازے کا۔ پھر اس اندازے کے بھی کئی پہلو ہیں۔ تو انسان بیچارہ اس کی کیا تشریح کر سکتا ہے۔ سمجھانے کی خاطر محض ایک دو مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان کے قد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اندازہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں اس کا قد چھ فٹ ہو۔ اب اس میں چند انچوں کی کمی بیشی تو ہو سکتی ہے۔ مگر کوئی انسان دگنی خوراک کھا کر چھ فٹ کے بجائے بارہ فٹ کا نہیں ہو سکتا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے اس اندازے کے مطابق بنایا ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق اس پر بسیرا کر سکے۔ ہر طرح کی مخلوق کی جائے پیدائش، مستقر، مسکن اور مدفن یہی زمین ہو اور ان امور خصوصاً رزق کے لیے کافی ثابت ہو۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دن ہی سے روئے زمین پر اتنا پانی پیدا کر دیا پھر اس سے آبی بخارات، بادلوں اور بارشوں کا سلسلہ چلا دیا جو قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق کے لیے کافی ثابت ہو۔ چوتھا پہلو یہ ہے کہ ہر طرح کی مخلوق کو زندہ رہنے کے لیے گرمی کی جس مقدار کی ضرورت ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورج پیدا کیا اور اس کو اتنے فاصلہ پر رکھا جو زندگی کی بقا کے لیے مناسب ہو۔ اب اگر سورج میں گرمی زیادہ ہو جائے یا فاصلہ کم ہو جائے تو سب جاندار گرمی سے مر جائیں اور اگر سورج میں گرمی کم ہو جائے یا فاصلہ زیادہ ہو جائے تو سب جاندار سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں۔ اور پانچواں پہلو یہ ہے کہ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ وہ اس سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً پانی سو درجہ سنٹی گریڈ پر کھولتا ہے۔ جب پانی کو اتنی حرارت ملے گی تب ہی کھولے گا پہلے نہیں۔ غرضیکہ اس آیت کے اتنے زیادہ پہلو ہیں جن کا شمار بھی ممکن نہیں۔ تشریح تو دور کی بات ہے۔

[۴۵] یعنی جس طرح جنین کی رحم مادر میں پرورش پانے کی مدت اللہ کے ہاں مقرر ہے، اگرچہ اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے تاہم ہر ایک جنین کی مدت الگ الگ اللہ کے ہاں مقرر ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی موت کی مدت بھی مقرر ہے اور قیامت کے قائم ہونے کی بھی۔ اگرچہ اللہ کے سوا کوئی بھی انہیں جان نہیں سکتا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب وہ مدت پوری ہو چکتی ہے تو اللہ کے حکم کے مطابق وہ فوراً ظہور پذیر ہو جاتی ہے اور اس میں ایک لمحہ کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ قیامت کا بھی یہی حال ہے

مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

رکوع ۳ ۱۰

کو ہم ہلاک کر چکے ہیں پھر کیا ہے کوئی نصیحت ماننے والا؟ (۵۱) اور جو کچھ بھی انہوں نے کیا ہے سب اعمال ناموں میں درج ہے۔ (۵۲) اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی[۳۷] ہوئی موجود ہے۔ (۵۳) بلاشبہ پرہیزگار لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے (۵۴) قادر مطلق بادشاہ کے پاس عزت[۳۸] کے مقام میں (ہوں گے) (۵۵)

جب اللہ کا حکم ہو گا پلک جھپکنے سے بھی پہلے وہ واقع ہو جائے گی۔

[۳۶] اشیاع کا لغوی مفہوم:۔ اشیاع شیعہ کی جمع ہے اور شیعہ کے معنی پارٹی، وحزب، سیاسی فرقہ ہے یعنی وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے اور وہ اس کے ارد گرد پھیلے رہتے ہیں۔ یعنی کسی شخص کے پیروکار اور مددگار۔ ایسی پارٹی یا دھڑے کی بنیاد عموماً عقیدہ کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور شیعہ کی جمع شیعا بھی آتی ہے اور وہ انہی معنوں میں آتی ہے اور اشیاع بھی آتی ہے اور اس سے مراد ایک ہی جیسی عادات واطوار رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ پہلے گزر چکے ہوں یا موجود ہوں۔ ہم جنس لوگ۔ اس آیت میں یہ لفظ انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

[۳۷] اس سے مراد فرشتوں کے تیار کردہ ہر انسان کے اعمال نامے ہیں جن میں ہر انسان کے اقوال وافعال، حرکات وسکنات، لب ولہجہ اور طرز بیان سب کچھ ساتھ ساتھ ہی ثبت ہو رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس میں درج ہونے سے رہ جائے۔

[۳۸] یعنی اللہ ذوالجلال اور قادر مطلق کے ہاں جن پرہیزگاروں کی مجلس ہو گی وہ سب کے سب سچے اور راست باز لوگ ہوں گے۔ انہیں اپنی سچائی کی بدولت اور اللہ اور اس کے رسول کے سچے وعدوں کے مطابق یہ مقام حاصل ہو گا۔

۷۸ آیاتها سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ رکوعها ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵

کلمات ۳۵۱ آیات ۷۸ (۵۵) سورۃ الرحمٰن مدنی ہے (۹۷) رکوع ۳ حروف ۱۶۸۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

بڑا مہربان ہے (۱) (جس نے) یہ قرآن سکھایا[۱] (۲) انسان کو پیدا[۲] کیا (۳) (پھر) اسے اظہار مطلب[۳] سکھایا (۴) سورج اور چاند ایک مقررہ حساب سے چل[۴] رہے ہیں۔(۵)

[۱] یعنی یہ اللہ کی رحمت اور مہربانی ہی کا نتیجہ ہے کہ اس نے آپ ﷺ کو قرآن جیسی عظیم الشان اور بلند پایہ کتاب سکھا دی جو پوری نوع انسانی کی ہدایت کا ذریعہ ہے اور اسی کی ہدایت پر عمل کرنے سے انسان کی دنیا بھی سنور سکتی ہے اور آخرت بھی۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو قرآن سکھایا ہے کسی اور نے نہیں سکھایا جیسا کہ کفار مکہ کا قرآن کے متعلق ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اسے کوئی عجمی سکھاتا ہے۔ پھر یہ شخص اسے اللہ کی طرف منسوب کر کے ہمیں سنا دیتا ہے۔

[۲] ❁ ہر مالک کا اپنے مملوک کو بتانا ضروری ہے کہ وہ اس سے کتنا کام لینا چاہتا ہے لہذا قرآن اتارا گیا:۔ اللہ ہی نے انسان کو پیدا کیا تو انسان کی ہدایت بھی اللہ کے ذمہ تھی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن نازل فرما کر اس ذمہ داری کو پورا کر دیا۔ قرآن کا اتارنا اس کی رحمت کا بھی تقاضا تھا اور اس کی خالقیت کا بھی۔ پھر وہ خالق ہونے کے ساتھ ساتھ مالک بھی ہے اور ہر چیز بشمول انسان اس کی مملوک ہے۔ اور ہر مالک کا اپنے مملوک کو یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ اس سے وہ کیا کام لینا چاہتا ہے اور کس مقصد کے لیے اسے بنایا گیا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کو بھی انسانوں کو یہ بتانا ضروری تھا کہ ان کا مقصد حیات کیا ہے؟ اور یہ ضرورت قرآن اتار کر پوری کر دی گئی۔

[۳] اللہ تعالیٰ کا انسان پر مزید احسان یہ ہے کہ اسے قوت گویائی عطا کی جس سے وہ اپنے مافی الضمیر کا پوری طرح اظہار کر سکتا ہے۔ پھر اس قوت گویائی یا قوت بیان کا انحصار اور بہت سی قوتوں پر ہے مثلاً بینائی، سماعت، عقل و فہم، قوت تمیز اور ارادہ و اختیار۔ ان میں سے ہر ایک قوت ایک عظیم نعمت ہے اور اظہار بیان کے لیے یہ سب قوتیں یا ان میں سے اکثر ناگزیر ہیں۔

[۴] ❁ چاند اور سورج میں نظم کی بنا پر انسانوں کو پہنچنے والے فائدے:۔ سورج اور چاند کا ایک مقررہ رفتار کے مطابق چلنا۔ پھر اس میں ایک لحظہ کی بھی تاخیر نہ ہونا انسان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ سورج سے دن رات ادل بدل کر آتے رہتے ہیں اور موسموں میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نمازوں کے اوقات کا تعلق بھی سورج سے ہے۔ فصلوں کے پکنے کا انحصار بھی سورج سے ہے۔ چاند سے ہمیں رات کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ ہم مہینوں اور سالوں کا حساب رکھ سکتے ہیں اور یہی حقیقی اور فطری تقویم ہے۔ اسی لیے رمضان کے روزے، حج، عیدیں اور دوسری قابل شمار مدتوں مثلاً مدت حمل، مدت رضاعت و عدت وغیرہ کا

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ﴿٦﴾ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴿٧﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ﴿٨﴾ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿٩﴾ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ

اور جڑی[۵] بوٹیاں اور درخت اسے سجدہ کر رہے ہیں(۶) اس نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو[۶] بنا دی۔(۷) تاکہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو۔(۸) اور وزن کو انصاف سے تولو اور ترازو میں ڈنڈی[۷] نہ مارو(۹) اور زمین کو اس نے ساری مخلوق[۸] کے لئے بنایا۔(۱۰) جس میں (ہر طرح کے) پھل ہیں اور کھجور[۹] کے درخت بھی جن کے

تعلق چاند سے ہوتا ہے۔ پھر سورج اور زمین کے درمیان ایسا مناسب فاصلہ رکھا گیا ہے۔ کہ اس میں کمی بیشی سے اس زمین پر انسان اور دوسرے سب جانداروں کی زندگی ہی ناممکن ہے۔ اور سب فائدے اسی صورت میں حاصل ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان عظیم الجثہ کروں کو ایسے طبعی قوانین میں جکڑ رکھا ہے جس سے وہ ادھر ادھر ہو ہی نہیں سکتے اور اپنے مقرر مداروں پر مقررہ رفتار سے ہمہ وقت محو گردش رہتے ہیں۔

[۵] نجم کے معنی ستارا بھی ہے اور بے تنا درخت بھی جس میں جھاڑ جھنکار، جڑی بوٹیاں، بیلیں اور بے تنہ پودے سب شامل ہیں اور یہاں یہ دوسرا معنی ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور سجدہ ریز ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے جو طبعی قوانین ان کے لیے مقرر کر دیئے ہیں ان سے سرتابی نہیں کرتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فی الواقع اللہ کو سجدہ کر رہے ہوں۔ لیکن انسان اس کیفیت اور ماہیت کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ نیز انسان ان سے جو بھی فائدہ اٹھانا چاہے وہ اس میں رکاوٹ نہیں بنتے۔

[۶] ❁ میزان کا مفہوم:۔ اس آیت میں میزان سے اکثر مفسرین نے میزان عدل مراد لی ہے۔ جس کے سہارے یہ زمین و آسمان قائم ہیں جیسا کہ احادیث میں بھی مذکور ہے۔ اس صورت میں ان کے عدل سے مراد وہ توازن و تناسب ہے۔ جو ہر سیارے میں قوت جاذبہ یعنی کشش ثقل اور مرکز گریز قوت کے درمیان رکھ دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ہر سیارے کا درمیانی فاصلہ، ان کی رفتار اور ان میں باہمی تعلق بھی شامل ہے اور یہ اتنا لطیف اور خفیف تعلق ہے جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے اور اس توازن و تناسب کو میزان کے لفظ سے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کو سمجھانے کے لیے اس لفظ کے مفہوم کے قریب تر کوئی لفظ نہ تھا۔

[۷] یعنی اللہ نے نظام کائنات میں جس طرح عدل و انصاف سے کام لیا ہے تم اپنے باہمی لین دین میں اسے ملحوظ رکھو۔ اور اس کام کے لیے ہم نے میزان بنا دی ہے۔ میزان کا معنی وزن کرنے کا آلہ بھی اور مقدار وزن بھی۔ علاوہ ازیں جس طرح میزان میں کمی بیشی کرنا گناہ کبیرہ ہے اسی طرح ماپ کے پیمانوں میں بھی کمی بیشی کرنا ویسا ہی جرم ہے۔ اور اس کمی بیشی کی وجہ صرف دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔

[۸] ❁ انام کا لغوی مفہوم:۔ انام سے مراد ہر وہ جاندار مخلوق ہے جو روئے زمین پر پائی جاتی ہے۔ خواہ وہ چرند ہوں، یا پرند، مویشی ہوں یا درندے، انسان ہوں یا جن، اور انام سے مراد انسان اور جن لینا اس لحاظ سے زیادہ مناسب ہے کہ آگے انہیں دو انواع کا ذکر آ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کا رزق ہم نے زمین سے ہی وابستہ کر دیا ہے۔ یہی ان کی جائے پیدائش، یہی ان کا مسکن اور یہی ان کا مدفن ہے۔

❁ اشتراکی نظریہ کا رد:۔ اس آیت سے اشتراکیت پسند حضرات نے اپنا نظریہ کشید کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ زمین حکومت کو

ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

خوشوں پر غلاف ہوتے ہیں(۱۱) اور اناج بھوسی والا اور خوشبودار [۱۰] پھول بھی (۱۲) پس (اے جن وانس) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں [۱۱] کو جھٹلاؤ گے؟ (۱۳) اس نے انسان کو ٹھیکری [۱۲] کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا۔ (۱۴) اور جنوں کو آگ کے شعلہ [۱۳] سے پیدا کیا۔ (۱۵) پھر تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو

اپنی تحویل میں لے لینی چاہیے۔ پھر وہ تمام افراد کو رزق مہیا کرے۔ اس کے نظریے کے ابطال کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انام کے معنی صرف انسان نہیں بلکہ سب جاندار مخلوق ہے۔ پھر اس پر کئی اعتراض بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا زمین کی تمام پیداوار تقسیم ہوگی یا مصنوعات؟ اور کیا ہر فرد ریاست میں برابر تقسیم ممکن بھی ہے۔ یا نہیں؟ اور آج تو ان لوگوں کا نظریہ عملاً بھی باطل قرار پا چکا ہے۔

[۹] پھلوں کے ساتھ کھجور کا الگ بھی ذکر فرمایا ہے اس لیے کہ کھجور میں دوسرے پھلوں کی نسبت زیادہ غذائی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اور کھجور اور پانی دو چیزیں مل کر مکمل غذا بن جاتی ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بعض دفعہ ہمارے گھر میں دو دو ماہ تک چولہا نہیں جلتا تھا اور ہمارا گزارا صرف دو کالی چیزوں (کھجور اور مٹکے کا پانی) پر ہوتا تھا (بخاری۔ کتاب الھبة و فضلھا)

[۱۰] یعنی اناج یا دانے تو انسان کی خوراک بنتے ہیں اور بھوسی جانوروں کی۔ ان کے علاوہ ایسی چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں جو کھانے کے کام نہیں آتیں تاہم ان کی خوشبو وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

[۱۱] ❁ آلاء کا لغوی مفہوم:۔ آلاء (إلی کی جمع بمعنی نعمت بھی اور قدرت یا نشان عظمت بھی) اور آلاء سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو انسان کی ضرورت مہیا کرتی ہیں اور پے در پے آتی رہتی ہیں اور اسے زندگی بسر کرنے کے لیے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ (فقه اللغة) اور یہ لفظ بالعموم جمع ہی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی نعمت ایک تو ہے نہیں لہٰذا ہمیشہ آلاء آتا ہے۔ اور یہ آیت اس سورۃ میں اکتیس مرتبہ دہرائی گئی ہے۔ کہیں آلاء کا لفظ عظیم الشان نعمتوں کے معنوں میں اور کہیں قدرت کی نشانیوں کے معنوں میں اور کہیں بیک وقت دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ نے ایک دفعہ صحابہ سے فرمایا کہ تم سے تو جن ہی اچھے ہوئے کہ جب میں ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ پڑھتا تو وہ اس کے جواب میں یوں کہتے ہیں (لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ) (اے ہمارے پروردگار! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے۔ سب حمد و ثنا تیرے ہی لیے ہے) لہٰذا جب کوئی شخص یہ آیت پڑھے تو اس کا یہی جواب دینا چاہیے۔ علاوہ ازیں اس آیت اور اس کے بعد کی آیات میں دونوں طرح کی مکلف مخلوق یعنی جنوں اور انسانوں کو مشترکہ طور پر خطاب کیا گیا ہے۔

[۱۲] ❁ سیدنا آدم کے پتلے کی تخلیق کے مراحل:۔ یہ سیدنا آدم کے پتلے کی تخلیق کا ساتواں اور آخری مرحلہ ہے اور ان سات مراحل کی ترتیب یوں ہے۔ (۱) تراب بمعنی خشک مٹی سے، (المومن:۶۷) (۱) ارض بمعنی عام مٹی یا زمین، (نوح:۱۷) (۳) طین

تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ
يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾

جھٹلاؤ گے؟(۱۶) وہ دونوں مشرقوں کا بھی مالک ہے اور دونوں مغربوں[۱۴] کا بھی۔(۱۷) پھر تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے(۱۸) اس نے دو دریا رواں کیے جو باہم ملتے ہیں(۱۹) (پھر بھی) ان کے درمیان ایک پردہ[۱۵] ہے، وہ اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے(۲۰) پھر تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے(۲۱) ان دونوں دریاؤں سے موتی اور مرجان[۱۶] نکلتے ہیں(۲۲)

بمعنی گیلی مٹی یا گارا، (الانعام:۲) (۴) طِيْنٍ لَّازِبٍ بمعنی لیسدار اور چپکدار مٹی، (الصافات:۱۱) (۵) حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ بمعنی بدبودار کیچڑ۔ (الحجر:۲۶) (۶) صَلْصَالٍ ٹھیکرا یا حرارت سے پکائی ہوئی مٹی، (ایضاً) (۷) صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ بمعنی ٹن سے بجنے والی ٹھیکری، (الرحمٰن:۱۴)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح سے پھونکا تو یہ بشر بن گیا۔ اس کو مسجود ملائک بنایا گیا۔ پھر اسی سے اس کا زوج پیدا کیا گیا (۴:۱) پھر اس کے بعد حقیر پانی کے ست سے اس کی نسل چلائی گئی جس کے لیے دوسرے مقامات پر نطفہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

[۱۳] ❁ جنوں کی تخلیق اور نسل:۔ مَارِجٍ بمعنی شعلہ کا اوپر کا گرم ترین حصہ جو دھوئیں سے یکسر پاک ہوتا ہے۔ (فقہ اللغۃ) یعنی آگ کی لپٹ۔ جس سے مٹی کو کئی مراحل سے گزار کر اسے لطیف سے لطیف تر بنا کر اس سے انسان بنایا گیا۔ اسی طرح جنوں کو بھی لکڑی اور کوئلے سے پیدا ہونے والی عام آگ سے نہیں بلکہ اس گرم تر لطیف تر حصہ سے بنایا گیا۔ انسانوں سے پہلے یہی آتشیں مخلوق زمین پر آباد تھی۔ ان میں بھی نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ انسان کی تخلیق کے بعد نبوت کا سلسلہ انسانوں میں منتقل ہو گیا۔ کیونکہ اشرف المخلوقات انسان ہے نہ کہ جن۔ جو نبی انسانوں کی طرف مبعوث ہوتا وہی جنوں کے لیے بھی ہوتا تھا۔ نبی آخر الزمان ﷺ جیسے ہمارے نبی ہیں ویسے ہی جنوں کے لیے بھی ہیں۔ جنوں میں کافر، مشرک، مومن، نیک اور بدغرض انسانوں کی طرح ہر طبقہ کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان کی بھی اولاد ہوتی ہے اور توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہے۔

[۱۴] یہاں دو مشرقوں اور دو مغربوں کا ذکر فرمایا اس لیے کہ اس سورہ میں مسلسل دو دو چیزوں کا ذکر چل رہا ہے جبکہ سورہ معارج کی آیت نمبر ۴۰ میں فرمایا کہ وہ بہت سے مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے۔ دو مشرقوں سے مراد ایک تو وہ مقام ہے جب سورج موسم گرما کے سب سے بڑے دن طلوع ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہ مقام ہے جہاں سے سورج، موسم کے سب سے چھوٹے دن طلوع ہوتا ہے۔ اور ان دونوں مقاموں کے درمیان سب مشرق ہی مشرق ہیں۔ ہر روز طلوع آفتاب کے مقام کا ایک نیا زاویہ ہوتا ہے اور یہی حال مغربوں کا ہے۔ اسی تبدیلی سے موسم پیدا ہوتے ہیں اور مختلف موسموں میں مختلف فصلیں اور پھل پیدا ہوتے ہیں اور ان مشرقوں اور مغربوں کے پیچھے ایک بڑا حیرت انگیز اور پیچیدہ نظام قائم ہے جس کی بنا پر یہ تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور ان کا ذکر پہلے کئی مقامات پر کیا جا چکا ہے۔

[۱۵] اس کی تشریح کے لیے سورہ فرقان کی آیت نمبر ۵۳ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

[۱۶] ❁ مرجان برزخی مخلوق:۔ مرجان دراصل جمادات اور نباتات کے درمیان برزخی پیدائش ہے جس طرح سب موتی

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٢٣﴾ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿٢٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ ﴿٢٥﴾ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ ﴿٢٨﴾ يَسْأَلُهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿٢٩﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٠﴾

پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے (۲۳) اور سمندر میں جو جہاز پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں یہ سب اسی[۱۷] کے ہیں (۲۴) پس تم اپنے پروردگار کے کون کون سے احسانات کو جھٹلاؤ گے (۲۵) اس زمین پر موجود ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ (۲۶) فقط آپ کے رب کی ذات ہی[۱۸] باقی رہ جائے گی جو عظمت والی اور نوازنے والی ہے (۲۷) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے (۲۸) آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق بھی موجود ہے سب اسی سے[۱۹] (اپنی حاجات) مانگتے ہیں۔ وہ ہر روز ایک نئی شان میں ہے (۲۹) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (۳۰)

پتھروں ہی کی قسم ہوتے ہیں۔ مرجان بھی پتھر ہی کی قسم ہے لیکن یہ نباتات کی طرح بڑھتا ہے جمادات کی طرح جامد نہیں۔ مرجان کا ایک چھوٹا سا پودا ہوتا ہے جس کی شاخیں بھی ہوتی ہیں۔ موتی اور مرجان عموماً کھاری پانی کی پیداوار ہیں۔ مگر اسی کھاری پانی کے نیچے اللہ کی قدرت سے میٹھے پانی کے چشمے بھی ابل رہے ہوتے ہیں۔ یا ساتھ ساتھ دریا رواں ہوتے ہیں۔ اسی لیے منهما کا لفظ ارشاد فرمایا یعنی یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے حیرت انگیز تخلیقی کارناموں کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔

[۱۷] یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی عقل عطا فرمائی کہ اس نے بڑے بڑے اونچے اونچے جہاز تیار کر لیے جو مہیب سمندر کی تلاطم خیز موجوں کو چیرتے چلے جاتے ہیں لہٰذا انسان کے اس فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنی طرف کی ہے کہ یہ جہاز دراصل انسان کی ملکیت نہیں ہماری ہی ملکیت ہیں۔

[۱۸] ہر چیز فنا ہونے والی ہے استثناء صرف اللہ کے لئے ہے:۔ یعنی جو چیز بھی مخلوق ہے وہ حادث ہے اور قدیم صرف اللہ کی ذات ہے جو چیز بنی ہے خواہ وہ بے جان ہو ایک نہ ایک دن ضرور اپنا کام چھوڑ دے گی۔ خراب ہو جائے گی، برباد اور فنا ہو گی اور جو جاندار ہے وہ بھی ضرور موت سے دوچار ہو گی۔ صرف اللہ کی ذات اور صفات قدیم اور ازلی ابدی ہیں۔ لہٰذا ان کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔ اللہ کی صفات سے مراد مثلاً کلام اللہ یا قرآن یا لوح محفوظ اور اعمالنامے وغیرہ ہیں۔ رہے فرشتے بالخصوص حاملان عرش تو ان کے متعلق اللہ ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ قرآن میں کئی مقامات پر فرشتے اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ جیسے جبریل نے سیدہ مریم کے سامنے آکر کہا تھا ﴿لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾ (۱۹:۲۲) حالانکہ لڑکا یا اولاد عطا کرنا اللہ کی صفت اور اسی کا کام ہے فرشتوں کا نہیں۔

[۱۹] اللہ تعالیٰ کے نت نئے کام:۔ بے نیاز فقط اللہ کی ذات ہے باقی تمام مخلوق اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے اللہ کی محتاج ہے۔ کوئی اس سے کھانے کو مانگ رہا ہے کوئی پینے کو، کوئی تندرستی کے لیے دعا کرتا ہے اور کوئی اولاد کے لیے۔ کوئی گناہوں سے مغفرت اور ترقی درجات کے لیے اور وہ سب مخلوق کی فریاد سنتا اور ان کی فریاد رسی کر رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر آن یہ کام کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں ہر وقت نئی سے نئی مخلوق کو وجود میں لا رہا ہے جس طرح انسانوں کی پیدائش بڑھ رہی ہے اسی طرح ہر

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ

اے دونوں جماعتو![۲۰] ہم عنقریب تمہارے لیے[۲۱] فارغ ہوں گے (۳۱) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (۳۲) اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل (کر بھاگ) سکتے ہو[۲۲] تو بھاگ دیکھو! تم انتہائی[۲۳] زور کے بغیر نکل نہیں سکو گے۔ (۳۳)

ذی حیات کی نسل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر وہ کائنات میں نئے سے نئے سیارے اور کہکشائیں بھی وجود میں لا رہا ہے۔ غرض ہر روز اس کی ایک نئی آن اور نئی شان ہوتی ہے۔

[۲۰] ثَقَلٰنِ: ثقل بمعنی بوجھ، وزن، گرانباری اور ثقیل اور ثقال بمعنی بوجھل اور وزنی چیز اور ثقلان بمعنی زمین پر آباد جاندار مخلوق میں سے دو بھاری اور کثیر التعداد جماعتیں۔ دو بڑی انواع جن اور انسان جو مکلف ہیں۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کی اکثریت چونکہ مجرم، اللہ کی نافرمان اور اللہ کی زمین پر بوجھ ہی بنی رہی ہے اس لیے ان جماعتوں کو ثَقَلٰنِ کہا گیا ہے۔

[۲۱] ❁ اللہ تعالیٰ کا لوگوں سے حساب لینا بھی نعمت ہے:۔ یعنی تمہارا حساب لینے کے لیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت ہم اتنے مشغول ہیں کہ تمہارا حساب کتاب لینے کی ہمیں فرصت نہیں۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ابھی تمہارے حساب کتاب کا وقت نہیں آیا۔ تاہم وہ وقت بھی قریب آ رہا ہے جب اس کائنات کا دوسرا دور شروع ہوگا اور وہ دور بھی بس آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے کسی شخص نے اپنا نظام الاوقات یا ٹائم ٹیبل پہلے سے بنا رکھا ہو اور وہ کہہ دے کہ ابھی فلاں کام کے لیے ہمارے پاس فراغت نہیں اس کی باری ایک گھنٹہ بعد آنے والی ہے اور ان جماعتوں سے حساب لینا پھر انہیں اس کے موافق جزا و سزا دینا بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت اور اس کے عدل کا تقاضا ہے۔

[۲۲] ❁ نفذ کا لغوی مفہوم:۔ نفذ بمعنی آر پار نکل جانا۔ جیسے لوہے کی سلاخ کے ایک سرے کو آگ پر گرم کیا جائے تو تھوڑی دیر بعد حرارت دوسرے سرے تک از خود جا پہنچتی ہے۔ اور نفاذ بمعنی قوت سے کسی چیز کا اجراء ہونا، جیسے کہتے ہیں کہ اس ملک میں کل سے فلاں فلاں قانون نافذ ہو چکا ہے اور بمعنی چیز کا بسرعت داخل ہونا اور آر پار ہو جانا۔ جیسے برقی رو آر پار نکل جاتی ہے۔

[۲۳] سُلْطٰنٍ بمعنی غلبہ اور شدید قوت بھی اور اتھارٹی لیٹر یا پروانۂ راہداری بھی۔ اب اگر اس آیت کا اطلاق اس مادی دنیا پر کیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کے کناروں تک پہنچنے کے لیے انتہائی قوت کی ضرورت ہے، جیسے انسان چاند پر، جو زمین کا سب سے قریبی سیارچہ ہے، پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے اور اس کے لیے انتہائی قوت اور بل بوتے کی ضرورت ہے۔ اور اتنا بل بوتا تم میں کبھی نہیں آ سکتا کہ تم ﴿اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کو پھاند سکو۔ اور اگر تم چاہو تو زور لگا کے دیکھ سکتے ہو۔ اور اگر اس آیت کا ربط سابقہ آیت یعنی حساب کتاب سے ملایا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ حساب کتاب اور اللہ کی گرفت سے تم میں سے

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٤﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿٣٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٦﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٨﴾
فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَاۗنٌّ ﴿٣٩﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٠﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ

پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے (۳۴) تم پر آگ کے شعلے اور سخت گرم دھواں[۲۴] چھوڑ دیا جائے گا، پھر تم اپنا بچاؤ نہ کر سکو گے[۲۵] (۳۵) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں[۲۶] کو جھٹلاؤ گے (۳۶) جس وقت آسمان پھٹ[۲۷] جائے گا تو تلچھٹ کی طرح سرخ ہو جائے گا (۳۷) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے (۳۸) اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کی بابت[۲۸] نہ پوچھا جائے گا (کہ آیا اس نے یہ گناہ کیا تھا یا نہیں؟) (۳۹) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۰) مجرم اپنے چہرے کے

کوئی شخص بھی ادھر ادھر بھاگ کر بچ نہیں سکتا الا یہ کہ کسی کو جنت کا پروانہ مل جائے۔ اس صورت میں اسے بھاگنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

[۲۴] شواظ بمعنی خالص آگ کا شعلہ جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو اور اگر آمیزش ہو تو اسے نحاس کہتے ہیں۔ مگر اس کی بھی صورت یہ ہونی چاہئے کہ آگ زیادہ اور دھواں کم ہو۔ ایسی آگ کی رنگت تانبے جیسی ہو جاتی ہے اور نحاس تانبے کو بھی کہتے ہیں۔

[۲۵] انتصار کے معنی کسی ظلم و زیادتی کا بدلہ لینا بھی۔ اور کسی زیادتی سے اپنا دفاع کرنا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حساب کتاب یا اللہ کی گرفت سے بھاگ کھڑا ہونے کی کوشش کرے گا تو وہ اس میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اس پر آگ کے اور دھواں ملی آگ کے شعلے چھوڑے جائیں گے اور مجبوراً اسے اس جگہ کھڑا رہنا پڑے گا جہاں کھڑا رہنے کے لیے اسے حکم ہو گا اور وہ ایسا مجبور اور بے بس ہو گا کہ وہ نہ اپنا بچاؤ کر سکے گا نہ فرشتوں سے بدلہ لے سکے گا۔

[۲۶] یہاں آلاء کا لفظ نعمتوں کے معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے، یعنی مجرموں کو دنیا اور آخرت میں سزا دینا بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس طرح جہاں عام لوگ ظالموں کے ظلم سے نجات پاتے ہیں وہاں نیک لوگوں کی حوصلہ افزائی اور قدر شناسی بھی ہوتی ہے۔

[۲۷] پہلے وردۃ کا لفظ استعمال فرمایا۔ ورد بمعنی گلاب کا پھول اور وَرْدَۃ بمعنی گلابی رنگ دھان بمعنی تیل کی سرخی مائل تلچھٹ یعنی جس دن آسمان پھٹے گا اس دن تمام سیاروں کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور جو شخص آسمان کی طرف نظر دوڑائے گا اسے یوں معلوم ہو گا کہ عالم بالا میں ہر طرف ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔

[۲۸] قیامت کے دن مختلف مواقع پر مجرموں سے مختلف قسم کا سلوک ہو گا۔ ایک موقع پر ان سے ٹھیک طرح باز پرس ہو گی جیسے فرمایا: ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (۱۵:۹۲) اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب مجرم اپنے گناہوں سے مکر جائیں گے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ مجرموں سے نہیں پوچھے گا۔ بلکہ ان کی زبانوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں اور جلدوں کو بولنے

بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ
بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ وَلِمَنْ خَافَ
مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِيْهِمَا

نشانوں[۲۹] سے پہچان لئے جائیں گے تو ان کی پیشانی کے بالوں اور قدموں کو پکڑ لیا جائے (۴۱) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۲) (اور انہیں کہا جائے گا) یہ وہ دوزخ ہے جسے مجرم جھٹلاتے تھے۔ (۴۳) اس جہنم[۳۰] اور کھولتے ہوئی پانی کے درمیان وہ چکر لگائیں گے (۴۴) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۵)

اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا۔ اس کے لئے دو باغ[۳۱] ہوں گے (۴۶) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۷) وہ دونوں باغ لمبی لمبی اور بڑی بڑی شاخوں[۳۲] والے ہوں گے (۴۸) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (۴۹) ان دونوں میں[۳۳]

کا حکم دے گا۔ وہ ان اثرات کو بیان کریں گے جو اس جرم کے دوران ان پر مرتب ہوئے تھے۔ اس طرح ان کے خلاف شہادت قائم ہو جائے گی۔

[۲۹] ان کی خوف زدہ آنکھیں، گھبرائے ہوئے اور اترے ہوئے چہرے، دبی ہوئی آوازیں اور انہیں چھوٹتے ہوئے پسینے اس بات کی پہچان کے لیے کافی ہوں گے کہ یہ مجرم ہیں خواہ وہ جن ہوں یا انسان۔ ہر شخص ان کے چہرے پر مایوسی کے آثار اور چھائی ہوئی مردنی سے انہیں شناخت کر لے گا فرشتے ان کی پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑ کر انہیں گھسیٹتے ہوئے جہنم میں جا پھینکیں گے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے ان کی پیشانی اور قدموں کو اس طرح ملا دیں گے کہ ان کی ہڈی پسلی چور چور ہو جائے گی۔

[۳۰] شدت حرارت کی وجہ سے اہل دوزخ کو بار بار پیاس لگے گی اور وہ گرم پانی کے چشموں کی طرف دوڑیں گے جو گرمی کی وجہ سے کھول رہے ہیں۔ انہیں کھولتا پانی پلا کر واپس لایا جائے گا۔ تو پھر جلدی ہی انہیں پیاس پھر ستانے لگے گی۔ پھر وہ انہیں چشموں کی طرف دوڑیں گے اور یہ عمل لگاتار جاری رہے گا۔

[۳۱] اس سورہ کی اکثر آیات میں دو دو چیزوں کا ذکر آ رہا ہے لہٰذا یہاں بھی دو باغات کا ذکر فرمایا: حالانکہ ہر جنتی کو کئی باغات ملیں گے۔ جیسا کہ بعض دوسری آیات سے واضح ہے۔ پھر تمام اہل جنت کے سارے باغوں کے مجموعہ کا نام بھی الجنۃ ہے۔ یعنی باغات کا مخصوص مقام۔ بہشت۔

[۳۲] افنان۔ فن کی جمع ہے یعنی بہت بڑا اور لمبا ٹہنا یعنی ان دو باغوں کے جتنے درخت ہوں گے ان سب کے دو بڑے بڑے ٹہنے ہوں گے۔ پھر ان ٹہنوں کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں نکلیں گی۔ اس آیت میں اللہ کی اس قدرت کا اظہار ہے کہ ان باغوں کے درختوں کی نشوونما میں ایک دوسرے سے پوری طرح یکسانیت اور ہم آہنگی ہو گی۔

[۳۳] ایک چشمے کا نام تسنیم ہو گا اور دوسرے کا سلسبیل، اور یہ دونوں چشمے ہمیشہ جاری رہیں گے، کبھی خشک نہ ہوں گے۔

عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰي فُرُشٍۢ بَطَاۗىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ۭ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَاۗنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾

دو چشمے جاری ہوں گے (۵۰) پس تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۵۱) ان دونوں میں ہر پھل کی دو قسمیں[۳۴] ہوں گی۔(۵۲) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۵۳) جنتی لوگ ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے ہوں گے جن کے استر موٹے ریشم کے ہوں گے اور ان دونوں باغوں[۳۵] کے پکے ہوئے پھل لٹک رہے ہوں گے (۵۴) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟ (۵۵) ان باغوں میں نگاہ نیچے رکھنے والی[۳۶] عورتیں ہوں گی جنہیں اس سے پہلے کسی انسان یا جن نے چھوا تک نہ ہوگا (۵۶) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۵۷)

[۳۴] اس کے کئی مطلب لیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ ایک باغ کے پھلوں کا رنگ، ذائقہ اور خوشبو دوسرے باغ کے پھلوں سے بالکل جداگانہ ہوگی اور دوسرا یہ کہ شکل و صورت اور رنگ و بو ایک جیسا ہونے کے باوجود ان کے ذائقے الگ الگ ہوں گے اور تیسرا یہ کہ ایک باغ کے پھلوں سے تو اہل جنت متعارف ہوں گے اور دوسرے باغ کے پھل ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے ہوں گے۔

[۳۵] ان آیات میں اہل جنت پر اللہ کے انعامات کا ذکر ہے یعنی جن بچھونوں پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھا کریں گے ان کا استر تو موٹے ریشم کا ہوگا اور آبرہ تو بہرحال اس سے بھی بہتر ہی کوئی کپڑا ہوگا جس کا وجود غالباً اس دنیا میں نہیں پایا جاتا۔ یہ بچھونے انہیں باغوں میں ہوں گے جو ان کی اپنی ذاتی قیام گاہیں ہوں گی اور ان باغوں کے پھل اتنے جھکے ہوئے ہوں گے کہ جب چاہیں اور جونسا پھل چاہیں اسی وقت ہاتھ سے پکڑ کر توڑ کر کھا سکیں۔

[۳۶] ان جنت کی عورتوں کی اولین اور اہم صفت یہ ہوگی کہ وہ شرمیلی اور حیادار ہوں گی اپنے شوہروں کے سوا کسی دوسرے کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں گی۔ انتہائی خوبصورت ہونے کے باوجود دنیا کی عورتوں کی طرح اپنے چاہنے والوں سے آنکھیں ہی آنکھوں میں اشارے کرنے والے نہیں ہوں گی۔ اور ان کی دوسری صفت یہ ہوگی کہ وہ باکرہ یا کنواری ہوں گی۔ اہل جنت کو حوروں کے علاوہ جو عورتیں ملیں گی وہ وہی ہوں گی جو اس دنیا میں ان کی بیویاں تھیں۔ اگر وہ اس دنیا میں صاحب اولاد تھیں یا بوڑھی ہو چکی تھیں۔ تب بھی انہیں نوخیز اور کنواری بنا کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنوں میں بھی توالد و تناسل کا سلسلہ موجود ہے۔ اور مومن جن جو جنت میں داخل ہوں گے ان کو بھی نوخیز اور کنواری بنا کر ہی ان کی دنیا کی بیویاں عطا کی جائیں گی۔

كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۝٥٨ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝٥٩ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۝٦٠
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝٦١ وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَانِ ۝٦٢ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝٦٣
مُدْهَامَّتَانِ ۝٦٤ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝٦٥ فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ۝٦٦ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا

وہ ایسے ہوں گی جیسے ہیرے[۳۷] اور مرجان (۵۸) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۵۹) کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے ؟(۶۰) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں[۳۸] کو جھٹلاؤ گے ؟(۶۱) اور ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ[۳۹] اور بھی ہوں گے (۶۲) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۶۳)

یہ دونوں گہرے سبز[۴۰] ہوں گے (۶۴) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۶۵) ان دونوں میں دو چشمے ہوں گے (فوارہ کی طرح) ابلتے[۴۱] ہوئے (۶۶) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (۶۷)

[۳۷] یہ ان عورتوں کی تیسری صفت ہے جو کئی صفات کا مجموعہ ہے مثلاً وہ اتنی خوبصورت اور دلکش ہوں گی جیسے یاقوت اور مرجان یا وہ اتنی آب و تاب والی اور صاف شفاف ہوں گی جیسے یاقوت اور مرجان یا وہ اتنی صاف ستھری ہوں گی کہ ہاتھ لگانے سے بھی میلی ہو رہی ہوں گی۔

[۳۸] پہلے احسان سے مراد اہل جنت کے وہ نیک اعمال ہیں جو وہ دنیا میں سر انجام دیتے رہے۔ اور دوسرے احسان سے مراد جنت کی وہ نعمتیں ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ سوالیہ فقرہ کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ نہیں بدلہ احسان کا مگر احسان۔ یعنی احسان کا بدلہ احسان ہی ہو سکتا ہے۔

[۳۹] اس کی بھی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اہل جنت بھی دو طرح کے ہوں گے۔ ایک السابقون یا مقربین، دوسرے اصحاب الیمین یعنی عام اہل جنت جیسا کہ سورہ واقعہ میں یہ تفصیل موجود ہے۔ مقربین کو جو دو باغ ملیں گے وہ ان باغوں سے اعلیٰ قسم کے ہوں گے جو عام اہل جنت کو ملیں گے اور دوسری صورت یہ کہ ہر جنتی کو دو باغ تو اعلیٰ قسم کے ملیں گے اور دو اس سے کم درجہ کے۔

[۴۰] مُدْهَامَّتَانِ: دَهَمٌ بمعنی کسی چیز کا تاریکی میں ڈھک جانا۔ کہتے ہیں دَهَمَتِ النَّارُ الْقِدْرَ یعنی آگ نے ہنڈیا کو سیاہ کر دیا۔ اس آیت میں مفہوم یہ ہے کہ ان دونوں باغوں کے درختوں کے پتے اتنے گہرے سبز ہوں گے جیسے سیاہ ہو رہے ہوں۔

[۴۱] نَضَخَ کا معنی پانی کا چشمہ سے زور سے پھوٹنا۔ مگر نَضَخَ میں جوش مارنے کی وجہ کثرت آب اور دباؤ ہوتی ہے نہ کہ حرارت اور نضاخ موسلا دھار بارش کو بھی کہتے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ چشموں کے سوراخ تنگ اور پانی کی کثرت روانی کی تیزی کی وجہ سے وہ چشمے جوش مار رہے ہوں گے۔

تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٧﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿٦٨﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٩﴾ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾
فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ
اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَاۗنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰي رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾

ان دونوں میں پھل [۴۲]، کھجوریں اور انار ہوں گے (۶۸) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۶۹) ان دونوں میں خوب سیرت [۴۳] اور خوبصورت عورتیں ہوں گی (۷۰) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (۷۱) وہ خوبصورت آنکھوں والی اور خیموں میں رکی رہنے [۴۴] والی ہوں گی (۷۲) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ؟(۷۳) انہیں اس سے پہلے کسی انسان [۴۵] یا جن نے چھوا تک نہ ہوگا (۷۴) پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (۷۵) جنتی لوگ سبز اور نفیس و نادر [۴۶] قالینوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔(۷۶)

[۴۲] فَکِہَ بمعنی خوش طبعی، خوش مزاجی اور ہنسنے ہنسانے والا ہونا اور فکہ کے معنی کسی کو میوہ کھلانا بھی اور اپنے شیریں کلام سے کسی کو خوش کرنا اور فواکہ سے مراد ایسے پھل ہیں جن کے کھانے کا اصل مقصد لذت و سرور اور لطف حاصل کرنا ہو نہ کہ غذائیت حاصل کرنا۔ پھر اس کے بعد کھجور کا ذکر فرمایا جو پانی کے ساتھ مل کر مکمل غذا بن جاتا ہے۔ پھر اگر پانی کے بجائے کھجور کے ساتھ انار کا پانی مل جائے تو سب مقصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ کھانے کا بھی، پینے کا بھی اور لطف و سرور بھی۔

[۴۳] یہ اہل جنت کی دنیا میں بیویوں کے علاوہ دوسری قسم کی عورتیں ہوں گی یعنی جنت کی حوریں انتہائی پاکیزہ کردار والی اور بہت خوب صورت جن کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔

[۴۴] اس آیت میں دراصل سابقہ آیت کی کچھ تفصیل ہے۔ خوب صورتی میں آنکھوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ آنکھ کی پتلی جتنی زیادہ سیاہ اور سفیدی جتنی زیادہ سفید ہو آنکھ اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے تو یہ ان کی صورت کی خوبی ہوئی اور سیرت کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خیموں سے باہر نکلیں گی ہی نہیں۔ اور خیموں سے مراد اہل ثروت کے وہ خیمے ہیں جو وہ سیر و تفریح کی غرض سے سفر میں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

[۴۵] اہل جنت کو ملنے والی حوروں کی تیسری صفت یعنی وہ باکرہ یا کنواری ہوں گی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو پرہیزگار جن جنت میں داخل ہوں گے ان کو بھی حوریں ملیں گی۔ واضح رہے کہ طمث کے معنی حیض کا خون بھی ہے۔ اور طمث کا معنی عورت کا حیض والا ہونا بھی اور مرد کا عورت کے پردہ بکارت کو زائل کرنا بھی۔ گویا یہ لفظ مجامعت کے معنوں میں پہلی بار کی مجامعت سے مخصوص ہے۔

[۴۶] ❁ عبقری کا مفہوم:۔ عَبْقَرِيٌّ عرب کے دور جاہلیت کے افسانوں میں جنوں کے دارالسلطنت کا نام عبقر تھا جہاں صرف جن اور پریاں ہی رہتے تھے جسے ہم اردو میں پرستان بھی کہتے ہیں یعنی پریوں کے رہنے کی جگہ۔ پھر لفظ عبقری کا اطلاق ہر نفیس اور نادر چیز پر ہونے لگا تو یا وہ پرستان کی چیز ہے جس کا مقابلہ دنیا کی عام چیزیں نہیں کر سکتیں۔ پھر اس لفظ کا اطلاق ایسے آدمی

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ ع ۳ ۱۳

پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟(۷۷) آپ کا پروردگار جو بڑی بزرگی اور عزت والا[۴۷] ہے اس کا نام بھی بڑا بابرکت والا ہے۔(۷۸)

پر بھی ہونے لگا جو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہو۔ اسی لیے اہل عرب کو جنت کے سروسامان کی غیر معمولی نفاست اور خوبی کا تصور دلانے کے لیے یہاں عبقری کا لفظ آیا ہے۔

[۴۷] پروردگار کا ذاتی نام اللہ ہے اور رحمٰن ذاتی بھی ہے اور صفاتی بھی۔ باقی اللہ کے سب نام صفاتی ہیں۔ ان میں سے ذوالجلال والاکرام بڑا بابرکت صفاتی نام ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی بڑی بزرگی اور عزت والا ہے اور دوسروں کو عزت عطا کرنے والا اور ان پر لطف و احسان کرنے والا ہے۔ جیسا کہ اہل جنت پر اس کے لطف و احسان کا ذکر ان آیات میں آیا ہے، پھر جب اس کا نام ہی بڑا بابرکت ہے تو اس کی ذات مقدس کس قدر بابرکت ہوگی اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز سے سلام پھیرنے کے بعد پہلے اللہ اکبر پھر تین بار استغفر اللہ کہتے۔ پھر اس کے بعد یہ ذکر فرماتے: ﴿اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوۃ، باب استحباب الذکر بعد الصلوۃ و بیان صفتہ)

۹۶ آیاتھا — سُورَةُ الوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ — رکوعھا ۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿٢﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿٣﴾ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ﴿٤﴾
وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنبَثًّا ﴿٦﴾ وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ﴿٧﴾ فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا

کلمات ۳۸۳ آیات ۹۶ (۵۶) سورۃ الواقعہ مکی ہے (۴۶) رکوع ۳ حروف ۱۷۶۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جب واقع ہونے والی (قیامت) واقع ہو گی (۱) تو اس کے وقوع کو کوئی جھٹلانے والا[۱] نہ ہو گا (۲) پست[۲] کرنے والی، بلند کرنے والی ہو گی (۳) جب زمین یکبارگی ہلائی جائے گی (۴) اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ[۳] کر دیئے جائیں گے (۵) جیسے وہ پراگندہ غبار ہیں (۶) اس وقت تم تین گروہ[۴] بن جاؤ گے (۷) (ایک تو) دائیں ہاتھ والے ہوں گے، ان دائیں ہاتھ والوں[۵]

[۱] اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی قیامت کے واقع ہونے کو روک نہیں سکتا۔ اور اس کے واقع ہونے کو غیر واقع نہیں بنا سکتا۔

[۲] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب قیامت قائم ہو گی تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ ستارے جھڑ جائیں گے۔ پہاڑ اڑنے لگیں گے اور اس عالم کی تمام اشیاء زیر و زبر ہو جائیں گی۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ متکبر، سرکش اور ظالم لوگوں کے سرنگوں کر دے گی اور وہ ذلیل اور رسوا ہو جائیں گے۔ جس بلند مقام پر اپنے آپ کو وہ سمجھے بیٹھے تھے وہاں سے نیچے پٹخ دیئے جائیں گے اور جو لوگ متواضع، منکسر المزاج اور پاکیزہ سیرت کے مالک ہوں گے جنہیں متکبرین دنیا میں حقیر اور رذیل مخلوق سمجھتے تھے انہیں ہی سربلندی عطا ہو گی اور وہ بلند درجات کے مالک اور اونچے مقام پر فائز ہوں گے۔

[۳] یعنی زمین پر زلزلہ کسی مقامی سطح پر نہیں آئے گا۔ بلکہ ساری کی ساری زمین ہی لرزنے کپکپانے اور ہچکولے کھانے لگے گی۔ پہاڑوں کی گرفت زمین پر سے ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اور ایک پتھر دوسرے پر گر کر ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ پھر تیز ہوا ان پہاڑوں کے ذرات کو پراگندہ کر کے اڑاتی پھرے گی۔ سوچ لو کیا اس وقت تمہارا زمین پر زندہ رہنا ممکن رہ جائے گا؟

[۴] سابقہ آیات میں قیامت کے برپا ہونے یا نفخہ صور اول کا منظر پیش کیا گیا ہے اور اس آیت میں نفخہ صور ثانی یا مردوں کے قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے اور میدان محشر میں اکٹھا ہو جانے کے مابعد کا۔ اس وقت تمام لوگ تین گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک اہل دوزخ، دوسرے اہل جنت۔ اہل جنت کی پھر دو قسمیں ہوں گی۔ ایک مقربین کا گروہ، دوسرا عام صالحین کا۔ اس طرح کل تین قسم کے گروہ بن جائیں گے۔ جیسا کہ آگے ان کی تفصیل آ رہی ہے۔

[۵] یمین بمعنی دایاں ہاتھ بھی اور دائیں جانب بھی۔ اس لحاظ سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ جن لوگوں کو ان کا اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور قیامت کے دن انہیں اللہ تعالیٰ کے دائیں جانب جگہ ملے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں آسمانوں کی سیر کرائی گئی تو آپ نے پہلے آسمان پر سیدنا آدم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ جب اپنی

أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿٨﴾ وَأَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ مَآ أَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ﴿٩﴾ وَالسّٰبِقُونَ السّٰبِقُونَ ﴿١٠﴾ أُولٰٓئِكَ
الْمُقَرَّبُونَ ﴿١١﴾ فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ ﴿١٢﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ﴿١٤﴾ عَلٰى

کے کیا ہی کہنے (۸) اور (دوسرے) بائیں ہاتھ [۶] والے ہوں گے، بائیں ہاتھ والوں کا کیا کہنا (۹) اور (تیسرے) سبقت کرنے والے تو بہرحال سبقت کرنے والے ہیں (۱۰) یہی لوگ مقرب [۷] ہیں (۱۱) جو نعمتوں والے باغوں میں ہوں گے (۱۲) پہلوں میں سے بہت ہوں گے (۱۳) اور پچھلوں میں [۸] سے کم (۱۴)

دائیں طرف دیکھتے ہیں تو ہنس دیتے ہیں اور بائیں طرف دیکھتے ہیں تو رو دیتے ہیں۔ سیدنا جبریل نے آپ کو بتایا کہ سیدنا آدم کی دائیں جانب وہ لوگ تھے جو جنت میں داخل ہونے والے ہیں اور بائیں طرف وہ لوگ تھے جو جہنم میں داخل ہوں گے۔ اس سے بھی اصحاب الیمین سے مراد اہل جنت ہوئے۔ اور اگر یمین کو یمن سے مشتق سمجھا جائے جو برکت اور خوش بختی کے معنوں میں آتا ہے تو اس سے مراد خوش بخت اور خیر و برکت والے اصحاب ہیں اور مطلب دونوں معنوں کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔

[۶] شمال بمعنی بایاں ہاتھ بھی، بائیں جانب بھی اور بدبخت بھی۔ یعنی وہ لوگ جنہیں ان کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں ملے گا انہیں اللہ کی بائیں جانب کھڑا کیا جائے گا۔ اور یہ بدبخت اہل دوزخ ہوں گے۔ جیسا کہ حدیث مذکورہ بالا سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

[۷] یعنی پیغمبروں پر ایمان لانے میں، ان کے ساتھ حق و باطل کے معرکہ میں، مصائب کے برداشت کرنے میں اور ہر خیر اور بھلائی کے کام میں دوسروں سے سبقت کرنے والے اور آگے نکل جانے والوں کا درجہ عام مومنین صالحین سے بہرحال زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہی لوگ اللہ کے مقربین میں سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سب سے آگے یہی لوگ ہوں گے پھر ان کے بعد دائیں جانب صالحین مومنین اور بائیں جانب کافر و مشرک، سرکش اور خودسر یعنی اہل دوزخ ہوں گے۔

[۸] ❁ سابقون اوّلون سے مراد؟ ان دو آیات میں اولین اور آخرین کی تعیین میں اختلاف کی بنا پر ان آیات کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اولین سے مراد سابقہ امتوں کے لوگ لیے جائیں اور آخرین سے مراد اس امت کے۔ اس لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ سابقہ انبیاء پر ایمان لانے والوں، حق کے معرکہ میں دوسروں سے آگے نکل جانے والوں اور خیر و بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والوں کی تعداد اس امت کے سابقین کی تعداد سے بہت زیادہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اولین اور آخرین سے مراد ہماری ہی امتِ مسلمہ کے لوگ ہوں۔ اس لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اولین یعنی صحابہ کرام تابعین، تبع تابعین۔ میں سے سابقین کی تعداد آخرین سے بہت زیادہ ہوگی۔ تیسرے یہ کہ اولین اور آخرین سے مراد ہر نبی کی امت کے اولین اور آخرین لیے جائیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک اصل بن جائے گا۔ یعنی ہر نبی کی امت کے اولین میں سے سابقین کی تعداد آخرین میں سابقین کی تعداد سے زیادہ ہوا کرتی ہے۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾
بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا
يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ

مرصع[۹] تختوں پر (۱۵) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوں گے (۱۶) ہمیشہ نوجوان رہنے والے خدمتگار لڑکے ان کے پاس پھرتے رہیں گے (۱۷) نتھری شراب کے جام وساغر اور آبخوروں کے ساتھ (۱۸) اس شراب سے نہ تو انہیں سر درد ہوگا اور نہ عقل[۱۰] میں فتور آئے گا (۱۹) انہیں وہ پھل (کھانے کو) ملیں گے جو وہ پسند کریں گے (۲۰) نیز پرندوں[۱۱] کا گوشت جونسا وہ چاہیں گے (۲۱) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی (۲۲) جیسے چھپا[۱۲] کر رکھے ہوئے موتی (۲۳) یہ ان اعمال کا بدلہ ہوگا جو وہ کرتے رہے (۲۴) وہاں وہ نہ تو کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ ہی[۱۳] کوئی گناہ کی بات (۲۵) وہ بس (ایک دوسرے کو) سلام، سلام[۱۴] ہی کہا کریں گے۔ (۲۶) اور دائیں ہاتھ والے،

[۹] مَوْضُوْنَةٍ۔ وَضَنٌ کے اصل معنی زرہ بافی کے ہیں اور استعارۃً کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ بُننے پر بولا جاتا ہے اور مَوْضُوْنٌ یا مَوْضُوْنَةٌ یعنی باریک بنی ہوئی یا سونے کے تاروں سے بنی ہوئی چیز۔

[۱۰] ❁ شراب کے نقصانات اور فائدے:۔ دنیا کی شراب میں خرابیاں یہ ہوتی ہے کہ اس کا مزہ تلخ محسوس ہوتا ہے۔ بو ناگوار ہوتی ہے، پینے سے سر چکرانے لگتا ہے اور بعض دفعہ سر درد بھی شروع ہو جاتا ہے۔ عقل میں فتور آ جاتا ہے اور شراب پینے والا اول فول بکنے لگتا ہے اور بعض دفعہ ناشائستہ حرکات اور گناہ کے کام بھی کر بیٹھتا ہے اور ان سب قباحتوں کے عوض اسے فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے اسے سرور حاصل ہوتا ہے اور غم غلط ہو جاتا ہے۔ جنت کی شراب میں یہ فائدہ تو بدرجہ اتم موجود ہوگا لیکن قباحت کی سب باتوں سے یکسر پاک ہوگی۔

[۱۱] پرندوں کا گوشت لذت، غذائیت اور قوت تینوں اعتبار سے چوپایوں کے گوشت سے اعلیٰ اور عمدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا بالخصوص پرندوں کے گوشت کا ذکر کیا گیا۔

[۱۲] تاکہ گرد و غبار سے ان کی آب و تاب ماند نہ پڑ جائے۔ جنت کی حوریں بھی اپنے حسن و دلکشی اور آب و تاب کے لحاظ سے قیمتی موتیوں سے کسی صورت کم نہ ہوں گی لہٰذا ان کی حفاظت بھی ایسے ہی کی جائے گی جیسے زر و جواہر اور موتیوں کی۔

[۱۳] یعنی وہاں نہ کوئی دوسرے کی غیبت کرے گا، نہ چغلی کھائے گا، نہ بہتان لگائے گا، نہ جھوٹ بولے گا نہ مکر و فریب اور ہیرا پھیری کی باتیں کرے گا، نہ گالی گلوچ ہوگا اور نہ طنز اور ایک دوسرے کو تمسخر اور تضحیک گویا کوئی شخص ایسی بات نہ کرے گا جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچ سکتی ہو اور نہ اہل جنت وہاں بے ہودہ اور بے کار باتیں کریں گے جس کا نتیجہ کچھ نہ ہو۔

[۱۴] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اہل جنت بھی ایک دوسرے کو سلام کہا کریں گے۔ فرشتے بھی ان کے حق میں سلامتی کی دعا

الْيَمِينِ ﴿۲۷﴾ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ﴿۲۸﴾ وَطَلْحٍ مَّنضُودٍ ﴿۲۹﴾ وَظِلٍّ مَّمْدُودٍ ﴿۳۰﴾ وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ ﴿۳۱﴾ وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ﴿۳۲﴾
لَّا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ﴿۳۴﴾ إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ﴿۳۶﴾

کیا (خوش نصیب) ہیں دائیں ہاتھ والے (۲۷) جو بے خار [۱۵] بیریوں، (۲۸) ایک دوسرے پر تہ بہ تہ چڑھے ہوئے کیلوں، (۲۹) دور تک پھیلی [۱۶] ہوئی چھاؤں، (۳۰) پانی کی آبشاروں [۱۷] (۳۱) اور بافراط پھلوں میں ہوں گے (۳۲) جو نہ کبھی ختم ہوں گے اور نہ روکے [۱۸] جائیں گے (۳۳) اور اونچی نشست گاہوں پر بیٹھے ہوں گے (۳۴) ہم ان کی بیویوں (حوروں) کو عجیب انداز سے ازسرنو پیدا کریں گے (۳۵) انہیں باکرہ [۱۹] بنائیں گے (۳۶)

کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر سلامتی نازل ہوگی اور سلام بھیجا جائے گا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جنتی آپس میں جو بات بھی کریں گے وہ ایک دوسرے کی خیر خواہی اور سلامتی پر مشتمل ہوگی۔ اس کی گفتگو بامعنی، نتیجہ خیز اور معلوماتی ہوگی۔ بڑے پاکیزہ موضوع ان کے زیر بحث آتے رہا کریں گے۔ ان کی مجالس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح و تہلیل بکثرت ہوا کرے گی اور ان کی ہر گفتگو کسی نہ کسی بھلائی اور ایک دوسرے کی سلامتی کا پہلو لیے ہوئے ہوگی۔

[۱۵] مَخْضُوْدٍ۔ خَضَدَ (الشجر) کسی خاردار درخت کے کانٹے توڑ کر یا کاٹ کر اسے بے خار بنا دینا۔ صاف کر دینا۔ کہتے ہیں کہ بیری کے درخت کے کانٹے جتنے کم ہوں اتنا ہی اس کا پھل اچھا اور مزے دار ہوتا ہے اور جنت کی بیریاں بالکل بے خار ہوں گی۔ یعنی ان بیریوں کا پھل دنیا کی بیریوں جیسا نہیں بلکہ بہت لذیذ ہوگا۔

[۱۶] اس کی تفسیر کے لیے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں ایک اتنا بڑا درخت (طوبیٰ) ہے جس کے سایہ میں اگر سوار سو برس تک چلتا رہے تب بھی اس کا سایہ ختم نہ ہو۔ تم چاہو تو آیت پڑھ لو ﴿وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ نیز کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی صفة الجنة)

[۱۷] مسکوب۔ سکب کے معنی (پانی وغیرہ کا) گرنا اور بہانا ہے۔ السکب لگاتار بارش کو یا موٹے موٹے قطروں والی بارش کو کہتے ہیں جس کا پانی بہہ نکلے اور الأسکوب بمعنی لگاتار جھڑی۔ گویا سکب میں پانی وغیرہ کے گرنے یا بہنے کے ساتھ تسلسل اور دوام کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ اور ﴿مَاءٍ مَّسْكُوْبٍ﴾ کا معنی مسلسل گرنے والی آبشار اور اس کا بہتا ہوا پانی ہوگا۔

[۱۸] یعنی نہ تو جنت کے پھلوں کی سپلائی کسی وقت بند ہوگی جس طرح دنیا میں پھل اپنے موسم میں ہی مل سکتے ہیں۔ آگے پیچھے نہیں ملتے۔ اور نہ ہی ان کو حاصل کرنے، توڑنے یا کھانے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیش آئے گی۔

[۱۹] اَنْشَاْنٰهُنَّ میں هُنَّ کا مرجع ان کی دنیا میں ساتھ دینے والی بیویاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور جنت میں ملنے والی حوریں بھی۔ ان دونوں قسم کی عورتوں کو اللہ تعالیٰ نوجوان اور نوخیز بنا دیں گے اور وہ کنواری بھی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ خوبصورت اور جوان ہی رہیں گی جن کی باتوں اور طرز ادا پر بے ساختہ پیار آ جائے گا۔

شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے حق میں جنت کی دعا فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہ ہوگی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: اسے بتاؤ کہ

ع ١٤

عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٩﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ
مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿٤٢﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿٤٣﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿٤٤﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ
مُتْرَفِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿٤٦﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا

جو اپنے شوہروں [٢٠] سے محبت کرنے والی اور ان کے ہم عمر [٢١] ہوں گی (٣٧) یہ کچھ ہوگا داہنے ہاتھ والوں کے لئے (٣٨) جو پہلوں میں سے بھی بہت سے ہوں گے (٣٩) اور پچھلوں میں [٢٢] سے بھی بہت سے (٤٠)

اور بائیں ہاتھ والے جو ہوں گے تو ان (کی بدبختی) کا کیا کہنا (٤١) وہ تپتی ہوئی لو اور کھولتے پانی میں (٤٢) اور سیاہ دھوئیں [٢٣] کے سائے میں ہوں گے (٤٣) جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ آرام دہ (٤٤) بلاشبہ اس (انجام) سے پہلے یہ عیش کیا کرتے تھے (٤٥) اور گناہ عظیم پر اڑے [٢٤] ہوئے تھے (٤٦) اور کہتے تھے، جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں

وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں داخل نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم انہیں خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے۔

[٢٠] عربا اترابا کا لغوی مفہوم:۔ عُرُبًا۔ عُرُوْبٌ کی جمع ہے اور عروب کے معنی ہیں اپنے خاوند سے محبت کرنے والی عورت اور بمعنی بہت ہنسنے ہنسانے والی اور خوش ذوق اور ناز و ادا سے اپنے خاوند کو لبھانے والی عورت۔

[٢١] اَتْرَابٌ۔ تُرَابٌ بمعنی مٹی اور تَارَبَ ایک ساتھ مٹی میں کھیلنا۔ ہم عمر ہونا۔ دوست ہونا۔ اور ترب بمعنی ہم عصر، ہم عمر ساتھی اور ترب کی مونث تربۃ ہے اور ترب اور تربہ دونوں کی جمع اتراب آتی ہے۔ لیکن اتراب کا لفظ عموماً عورتوں کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ گویا اتراب سے مراد ایسی دوست اور ہم عمر عورتیں ہیں جن کے مزاج میں بھی پوری ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ یہ عورتیں آپس میں بھی ہم عمر ہوں گی اور نوجوان ہی رہیں گی اور اپنے خاوندوں سے بھی عمر کا تناسب برابر قائم رہے گا۔

[٢٢] یعنی مقربین تو اولین میں زیادہ ہوں گے اور آخرین میں کم جبکہ اصحاب الیمین اولین میں سے بھی بہت ہوں گے اور آخرین میں سے بھی۔ چنانچہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ تم لوگ سارے اہل جنت کا چوتھائی حصہ ہوگے (اور تین چوتھائی میں باقی سب امتوں کے لوگ شامل ہوں گے) یہ سن کر ہم نے اللہ اکبر کہا (اللہ کا شکر یہ ادا کیا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں تم تہائی حصہ ہوگے۔ ہم نے پھر تکبیر کہی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ تم آدھا حصہ ہوگے۔ ہم نے پھر تکبیر کہی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورہ حج۔ وتری الناس سکرٰی)

[٢٣] یَحْمُوْمٍ۔ حَمَّ کے بنیادی معنوں میں سے ایک معنی سیاہ ہونا بھی ہے اور حُمَّۃٌ بمعنی کوئلہ، راکھ اور آگ میں جلی ہوئی ہر شے اور یحموم ایسے دھوئیں کو کہتے ہیں جو گرم بھی ہو، سیاہ بھی اور غلیظ بھی۔ یعنی دوزخ کی آگ سے جو سیاہ دھواں اٹھے گا وہ اس کے سایہ میں پناہ لینے جائیں گے۔ وہ دنیا کی زندگی میں خوشحالی کا وقت گزار چکے تھے اور تکبر میں آ کر اللہ اور اس کے رسول سے ضد باندھ رکھی تھی۔ آج انہیں ایسے گرم دھوئیں کی تپش میں بھون کر انتہائی ذلیل و خوار کیا جائے گا۔

[٢٤] حنث عظیم کا مفہوم:۔ حنث سے مراد ایسا گناہ ہے جس کا تعلق عہد و پیمان یا قسم توڑنے سے ہو۔ اور ایسے گناہ سب

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ
يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّاۗلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِــُٔوْنَ
مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ
يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ

گے تو کیا پھر اٹھائے جائیں گے؟ (۴۷) اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی؟" (۴۸) آپ ان سے کہیے کہ: بلاشبہ پہلے اور پچھلے بھی (۴۹) سب کے سب ایک معلوم دن کو اکٹھے کیے جائیں گے جس کا وقت مقرر ہے (۵۰)

پھر تم اے جھٹلانے والے گمراہو! (۵۱) تمہیں تھوہر[۲۵] کا درخت کھانا ہوگا (۵۲) اسی سے تم اپنے پیٹ بھرو گے (۵۳) پھر (اوپر سے) کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا (۵۴) جسے تم پیاس کی بیماری والے اونٹ[۲۶] کی طرح پیو گے (۵۵) جزا و سزا کے دن یہی تمہاری مہمانی ہوگی (۵۶) بلاشبہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے تو پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ (۵۷) بھلا دیکھو! جو (منی) تم ٹپکاتے ہو (۵۸) تو اس بچہ کو تم پیدا کرتے ہو[۲۷] یا اسے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ (۵۹)

کے سب کبیرہ یا عظیم ہی ہوتے ہیں۔ ان میں سرفہرست کفر و شرک ہے اور یہ عہد ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کی خلاف ورزی ہے۔ دوسری عہد شکنی انبیاء کی تکذیب ہے کیونکہ سب انبیاء اپنی اولاد اور اپنی امت کو یہ وصیت کرتے رہے کہ اگر میرے بعد کوئی رسول آئے جو سابقہ کتب سماویہ اور انبیاء کی اور ان کی تعلیم کی تصدیق کرتا ہو تو تمہیں اس پر ایمان لانا ہوگا۔ تیسرا گناہ عظیم آخرت سے انکار ہے جس کے متعلق کفار مکہ پختہ قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ جو مر گیا اللہ اسے کبھی زندہ کر کے اٹھائے گا نہیں۔ (۱۶:۳۸)

[۲۵] زَقُّوْم بمعنی تھوہر کا درخت جس کے پتے چوڑے، موٹے، بڑے بڑے اور خاردار ہوتے ہیں۔ ذائقہ میں نہایت کڑوا اور اس کا لعاب زہریلا ہوتا ہے۔ بدن کے کسی حصہ سے لگ جائے تو پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں۔ مزید تشریح کے لیے دیکھیے سورہ صافات کی آیت نمبر ۶۴ کا حاشیہ۔

[۲۶] ھیم۔ ھَیَامٌ بمعنی شدید قسم کی پیاس اور ھام بمعنی سخت پیاسا ہونا۔ اور ھیام اونٹ کی اس بیماری کو بھی کہتے ہیں جس میں اونٹ سخت پیاسا رہتا ہے۔ وہ پانی پیتا جاتا ہے لیکن پیاس بجھنے میں نہیں آتی۔ جیسے انسانوں کو استسقاء کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور ھیم ایسے اونٹ کو کہتے ہیں جسے نہ بجھنے والی پیاس کی بیماری لگی ہو۔ گویا اہل دوزخ کو تھوہر بطور خوراک کھانے کے بعد کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا۔ وہ اس کھولتے ہوئے پانی کو پیتے جائیں گے مگر ان کی پیاس ختم نہ ہوگی۔

[۲۷] رحم مادر میں انسانی تخلیق کا نقطہ آغاز:۔ پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ انسان کا نطفہ بذات خود کیا چیز ہے؟ وہ کن چیزوں سے بنتا ہے؟ جن چیزوں سے نطفہ بنتا ہے وہ زندہ تھیں یا مردہ؟ اور اس نطفہ کے بننے میں یا بنانے میں تمہارا بھی کچھ عمل دخل یا اختیار تھا؟ پھر اس نطفہ کو رحم مادر میں ٹپکانے کی حد تک تو اختیار انسان کو ہے۔ اس کے بعد پھر اس کا اختیار کلی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ نطفہ کا ایک قطرہ لاکھوں جراثیم یا کیڑوں پر مشتمل ہوتا ہے جو صرف طاقتور خوردبین سے نظر آ سکتے ہیں۔ اسی طرح رحم مادر

الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ
نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا

ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر [۲۸] کر دیا ہے اور ہم اس بات سے عاجز نہیں ہیں (۶۰)
کہ تمہاری صورتیں بدل ڈالیں اور تمہیں ایسی صورت میں [۲۹] پیدا کریں جو تم نہیں جانتے (۶۱) اپنی پہلی پیدائش
کو تو تم خوب جانتے ہو، پھر تم کیوں سبق حاصل نہیں کرتے (۶۲) بھلا دیکھو! جو بیج تم بوتے ہو (۶۳)

میں نسوانی بیضہ کا وجود بھی خوردبین کے بغیر نظر نہیں آسکتا۔ نطفہ کا ایک جرثومہ جب نسوانی بیضہ میں داخل ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خلیہ (CELL) بن جاتا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا نقطہ آغاز ہے اور اسی کا نام استقرار حمل ہے۔ نطفہ ٹپکانے کی حد تک تو مرد کو اختیار ہے۔ مگر یہ طاقت نہ مرد میں ہے نہ عورت میں اور نہ دنیا کی کسی اور طاقت میں کہ وہ نطفہ سے حمل کا استقرار کرا دے۔ پھر اس نقطہ آغاز سے ماں کے پیٹ میں بچے کی درجہ بدرجہ پرورش۔ ہر بچے کی الگ الگ صورت گری۔ ہر بچے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک امتیازی انسان بن کر اٹھے۔ کیا یہ ایک خالق کے سوا کسی اور کا کام ہو سکتا ہے؟ یا اس میں ذرہ برابر بھی کسی دوسرے کا کوئی دخل ہے؟ پھر یہ فیصلہ کرنا بھی اللہ کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ خوش شکل ہو یا بدشکل، اس کے نقوش تیکھے ہوں یا بھدے؟ طاقتور اور قد کاٹھ والا ہو یا کمزور، نحیف اور تھوڑے وزن والا، تندرست ہو یا اندھا، بہرا، لنگڑا، ذہین ہو یا کند ذہن۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو خالصتاً اللہ تعالیٰ خالق کائنات کے اختیار میں ہیں۔ کیا ان سب باتوں کو سمجھ لینے کے بعد بھی انسان یہ تصدیق نہیں کر سکتا کہ اسے پیدا کرنے والا اللہ رب العالمین ہی ہو سکتا ہے۔ اور جو مردہ غذاؤں سے ہر روز لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں انسان اور دوسرے جاندار پیدا کر رہا ہے وہ مردہ انسانوں کے بے جان ذرات سے پھر انہیں دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتا؟

[۲۸] انسان جو نطفہ رحم مادر میں ٹپکاتا ہے۔ اس کا ایک ایک قطرہ لاکھوں خوردبینی جراثیم پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک جرثومہ نسوانی بیضہ سے مل کر حمل کے استقرار کا سبب بنتا ہے باقی سب متحرک جرثومے رحم مادر سے خارج ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ استقرار حمل کے بعد بسا اوقات عورت کو خون جاری ہو جاتا ہے اور حمل ضائع ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ اسقاط ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ بچہ پیٹ میں ہی مر جاتا ہے اور کبھی پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے اور جو زندہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے سر پر بھی موت کی تلوار لٹکتی رہتی ہے معلوم نہیں کہ کس وقت رگ جان کو کاٹ ڈالے۔ کوئی بچپن میں ہی مر جاتا ہے کوئی جوانی میں اور کوئی بڑھاپے میں، اور کوئی سالہا سال بڑھاپے میں بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتا ہے۔ گویا موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اور اس کا وقت بھی پہلے سے طے شدہ ہے۔ نہ اس لمحہ سے پہلے آسکتی ہے اور نہ اس کے وقت میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہ موت کو ٹال سکتی ہے نہ اس کا وقت بدل سکتی ہے۔ اب بتاؤ تمہاری زندگی اور تمہاری موت کے بارے میں اللہ کے سوا تمہارا اپنا یا کسی دوسرے کا کچھ اختیار ہے؟ پھر بھی تمہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ اللہ رب العالمین جو چاہے کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔

[۲۹] ❁ دوسری تخلیق زمین کے پیٹ میں اور اس کے لئے طبعی قوانین بالکل جداگانہ ہوں گے:۔ یعنی تمہارے طریقہ تخلیق کو ہی یکسر بدل ڈالے اور وہ اس بات پر بھی قادر ہے۔ پہلے تمہاری تخلیق ماں کے پیٹ میں ہوئی تھی۔ دوبارہ تمہاری تخلیق زمین

تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿٦٥﴾
اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ
مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ اَفَرَءَيْتُمُ

تو اس سے کھیتی تم اگاتے ہو[۳۰] یا اگانے والے ہم ہیں (۶۴) اگر ہم چاہیں تو اسے بھس بنا دیں پھر تم باتیں بناتے[۳۱] رہ جاؤ (۶۵) کہ ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی (۶۶) بلکہ ہمارے نصیب ہی پھوٹ گئے (۶۷) بھلا دیکھو! جو پانی تم پیتے ہو (۶۸) کیا اسے بادل سے تم نے اتارا یا اتارنے والے ہم ہیں؟ (۶۹) اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری[۳۲] بنا دیں، پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ (۷۰)

کے پیٹ میں ہو۔ ماں کے پیٹ میں تمہارے تخلیقی مراحل اور قسم کے تھے۔ زمین کے پیٹ میں تمہارے تخلیقی مراحل ان مراحل سے بالکل جداگانہ ہوں؟ پہلے تم بچے کی صورت میں پیدا ہوئے تھے اور دوبارہ تم اس حالت میں پیدا ہو جس حالت میں مرے تھے۔ اور اسی قد و قامت کے ساتھ پیدا ہو، پھر رحم مادر کی تخلیق کے بعد جو طبعی قوانین تمہارے لیے مقرر تھے۔ دوسری بار کی پیدائش کے لیے طبعی قوانین بھی جداگانہ ہوں۔ اس دنیا میں موت تمہارے لیے مقدر تھی اور موت سے فرار ممکن نہ تھا۔ آخرت میں زندگی مقدر ہو اور موت کبھی نہ آئے۔ اس دنیا میں تمہاری آنکھوں کے سامنے غیب کے پردے حائل تھے۔ اُس دنیا میں سب حقائق واشگاف نظر آنے لگیں۔ حتیٰ کہ انسان اللہ کے دیدار سے بھی مشرف ہو سکے۔ اگر تم اپنی پہلی تخلیق کا بہ نظر غائر مطالعہ کر لو گے تو تمہیں دوسری تخلیق میں کوئی بات ناممکن نظر نہیں آئے گی۔

[۳۰] ❁ زمین کے پیٹ میں بیج کے تخلیقی مراحل:۔ یعنی تمہارا کام صرف زمین میں بیج ڈالنا ہے پھر اس کے بعد زمین کی تاریکیوں میں اس بیج پر جو تخلیقی مراحل آتے ہیں یا جو تغیرات واقع ہوتے ہیں ان کا نہ تمہیں علم ہے اور نہ ان میں کچھ تمہارا عمل دخل ہے۔ دانہ سے نازک سی کونپل کیسے بنتی ہے؟ پھر اس نازک سی کونپل میں اتنا زور کہاں سے آتا ہے کہ وہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے بیج بے جان اور مردہ تھا۔ اس سے جاندار نباتات پیدا ہو گئی جو پھلتی پھولتی اور بڑھتی ہے اور تمہارے لیے رزق کا سامان مہیا کرتی ہے اب دیکھئے لاکھوں کی تعداد میں مردہ بیج زمین کے پیٹ میں دفن کیے جاتے ہیں۔ پھر اسی زمین کے قبرستان سے وہی مردہ بیج نئی زندگی اور نئی آن بان سے تمہارے سامنے پیدا ہو رہے ہیں پھر بھی تمہیں اس بات میں شک ہے کہ تم زمین میں دفن ہونے کے بعد دوبارہ پیدا کیے اور زمین سے نکالے نہیں جا سکتے؟

[۳۱] ❁ بیج پر ممکنہ آفات:۔ اس کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً جس زمین میں بیج ڈالا گیا اس میں اللہ شور پیدا کر دے اور نسل کمزور اور زرد پیدا ہو اور پوری طرح بار آور نہ ہو یا فصل اگنے کے بعد اسے کیڑا لگ جائے یا کسی ارضی یا سماوی آفت مثلاً کہر، شدید بارش وغیرہ سے فصل کی نشوونما رک جائے اور لہلہاتے کھیت زرد پڑ جائیں۔ تو کیا تم میں سے کسی کو یہ اختیار ہے کہ فصل کو ان مصیبتوں سے بچا سکے؟ اور اگر تم خود بھی اللہ تعالیٰ کی ہی مہربانی سے پیدا ہو گئے اور اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی سے تمہیں کھانے کو ملتا ہے تو پھر اس کے سامنے تمہاری اکڑ اور سرتابی کا مطلب؟ اس صورت میں تم باتیں ہی بناتے رہ جاتے ہو کہ ہمارا تو بیج بھی ضائع ہو گیا اور محنت بھی ضائع ہوئی اور آئندہ کھانے کو بھی کچھ نہ ملا تو ہم تو مارے گئے۔ یہ بات تمہیں پھر بھی نصیب نہیں ہوتی کہ تم اللہ کی طرف رجوع کرو اور اسے اللہ کی طرف سے ایک تنبیہ سمجھو۔

[۳۲] ❁ آبی بخارات تو کھاری پانی کے ہوں اور بارش کا پانی خوشگوار:۔ یہ ایک اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ سطح سمندر

النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً
وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ

بھلا دیکھو! جو آگ تم جلاتے[۳۳] ہو(۷۱) تو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا تھا یا اسے پیدا کرنے والے ہم ہیں ؟(۷۲) ہم نے اس درخت کو یاد دہانی کا ذریعہ اور مسافروں[۳۴] کے فائدہ کی چیز بنا دیا ہے(۷۳) لہٰذا اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جو بڑا عظمت والا ہے (۷۴) میں ستاروں[۳۵] کے محل وقوع کی قسم کھاتا ہوں(۷۵)

سے سورج کی حرارت کی وجہ سے آبی بخارات اٹھتے ہیں۔ یہی بخارات بعد میں بادلوں کی شکل اختیار کر کے بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ سمندر کا پانی جس سے بخارات اٹھتے ہیں سخت کھاری اور چھاتی جلانے والا ہوتا ہے۔ مگر جو بارش برستی ہے اس میں کھاری پن نام کو نہیں ہوتا۔ حالانکہ جن جڑی بوٹیوں یا دواؤں کا ہم اسی طرح عرق کشید کرتے ہیں۔ ان میں ذائقہ بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ اور بو بھی۔ مثلاً سونف یا اجوائن یا گاؤزبان یا گلاب کے عرق میں ان اشیاء کا ذائقہ بھی منتقل ہو جاتا ہے اور بو بھی۔ لیکن سمندر کا کھاری پن آبی بخارات میں منتقل نہیں ہوتا اور یہ اللہ کی خاص رحمت ہے ورنہ اس زمین کا کوئی جاندار ایسا پانی پی کر زندہ ہی نہ رہ سکتا تھا۔ نہ ہی ایسے پانی سے پیداوار اگ سکتی ہے جو پانی کے بعد جانداروں کی زندگی کا دوسرا بڑا سہارا ہے۔

[۳۳] ﴿ درختوں کا سب سے بڑا فائدہ آگ کا حصول:۔ تیسری نعمت اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی کہ تم آگ جلاتے ہو۔ آگ جلانا اور اس سے استفادہ کرنا صرف انسان کا کام ہے۔ دوسری کوئی جاندار مخلوق یہ کام نہیں کر سکتی۔ جانور نباتات وغیرہ اسی حال میں کھاتے ہیں جس حال میں یہ زمین سے نکلتی یا دستیاب ہوتی ہے جبکہ انسان تمام سبزیاں، غلے اور گوشت وغیرہ آگ پر پکا کر کھاتے ہیں۔ پھر آگ سے ہی انسان نے کئی قسم کی دھاتیں ڈھال کر اپنے استعمال میں لانا شروع کیں۔ پھر مشینریاں اور کلیں بنائیں۔ اگرچہ آج کل آگ تیل، پٹرول اور گیس وغیرہ سے بھی حاصل کی جا رہی ہے۔ مگر آج سے صرف دو صدی پیشتر تک آگ حاصل کرنے کا ذریعہ صرف درخت اور ایندھن تھا۔ بعض درخت ایسے ہیں جن کو ایک دوسرے پر رگڑنے سے آگ حاصل ہو جاتی ہے اور بعض درختوں کا تیل ایندھن کا کام دیتا ہے اور ہر قسم کے درخت اور پودے، گھاس وغیرہ خشک ہو کر آگ حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ درختوں سے ہی کوئلہ اور پھر معدنی یا پتھری کوئلہ بھی بنتا ہے۔ گویا آج کے دور میں بھی آگ کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ یہ درخت وغیرہ ہی ہیں۔ اور درختوں کو پیدا کرنے اور نشوونما دینے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ جس میں دوسرے کسی کام کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اگر انسان سمجھے تو درختوں کی پیدائش بھی فی الحقیقت اس پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔

[۳۴] ﴿ مقوین کا لغوی مفہوم:۔ مُقْوِيْنٌ۔ القوی بمعنی بھوک اور بَاتَ الْقَوٰى بمعنی بھوکا رہ کر رات گزاری اور القاویۃ بمعنی کم بارش کا سال اور تقاوی بمعنی بارش کی قلت یا افراط جس سے فصل تباہ ہو جائے اور قحط نمودار ہو جائے۔ اور تقاوی قرضے وہ ہوتے ہیں جو ایسے قحط کے سال میں حکومت زمینداروں کو بالاقساط ادائیگی کی شرط پر دیتی ہے اور تقاوی بمعنی بھوکے رات بسر کرنا اور قوت لایموت بمعنی خوراک کی اتنی کم مقدار جس سے انسان بس زندہ رہ سکے اور مقوین بمعنی قوت کی احتیاج میں سفر کرتے پھرتے لوگ۔ خانہ بدوش لوگ جو رزق کی تلاش میں ادھر ادھر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ درختوں کی لکڑیوں سے عارضی مکان بھی کھڑے کر سکتے ہیں۔ ایندھن بیچ کر اپنی دوسری ضروریات بھی پوری کر سکتے ہیں۔

[۳۵] مَوَاقِعُ النُّجُوْمِ کا معنی ستاروں کے گرنے کی جگہ بھی ہو سکتا ہے۔ فضائے بسیط میں بے شمار سیارے ایسے ہیں جو ہر وقت

لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ﴿٧٦﴾ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴿٧٧﴾ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾
تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨٠﴾ أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ ﴿٨٢﴾

اور اگر تم سمجھو تو یقیناً یہ ایک بہت بڑی قسم ہے (۷۶) کہ یہ قرآن بلاشبہ بلند [۳۶] پایہ کتاب ہے (۷۷) جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے (۷۸) جسے پاک لوگوں کے سوا کوئی نہیں چھو [۳۷] سکتا (۷۹) یہ پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوا ہے (۸۰) پھر کیا اس کلام سے [۳۸] تم مداہنت کر رہے ہو (۸۱) اور اس میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا کہ اسے جھٹلاتے [۳۹] رہو (۸۲)

ٹوٹتے اور گرتے رہتے ہیں اور اس کا دوسرا معنی ستاروں کے ڈوبنے کی جگہ بھی اور وقت بھی۔ یعنی افق مغرب جہاں ہمیں ستارے ڈوبتے نظر آتے ہیں یا صبح کی روشنی کے نمودار ہونے کا وقت، جب ستارے غائب ہو جاتے ہیں۔ جو معنی بھی لیے جائیں اس سے مراد ستاروں کی گردش اور اپنے اپنے مدارات میں سفر کرنے کا وہ پیچیدہ اور حیران کن مربوط اور منظم نظام ہے جس میں غور و فکر کرنے سے انسان اس قادر مطلق ہستی کی حکمت اور وسعت علم تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کائنات پر کنٹرول کر رہی ہے۔

[۳۶] اتنی بڑی قسم اللہ تعالیٰ نے اس بات پر اٹھائی کہ اس کتاب کے مضامین و مطالب نہایت بلند پایہ ہیں۔ یہ نہ کسی ساحر کی ساحری ہے، نہ کسی کاہن کی کہانت اور نہ کسی شاعر کے تخیلات ہیں بلکہ یہ بلند پایہ بزرگ و برتر ہستی کی طرف سے نازل شدہ بلند پایہ کتاب ہے جو اس نے تمام بنی نوع انسان کی ہدایت اور فلاح و بہبود کے لیے نازل فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کی بنا پر اس کے سب مضامین لوح محفوظ میں پہلے ہی مندرج ہیں۔

[۳۷] ❁ مطہرون سے مراد کون؟ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پاکیزہ لوگوں سے مراد فرشتے ہیں۔ یعنی یہ کتاب قرآن کریم لوح محفوظ میں ثبت ہے اور وہاں سے پاکیزہ فرشتے ہی اسے لا کر رسول اللہ ﷺ تک پہنچاتے ہیں۔ کسی شیطان کی وہاں تک دسترس نہیں ہو سکتی جو اسے لا کر کسی کاہن کے دل پر نازل کر دے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے مضامین و مطالب تک رسائی صرف ان لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کے خیالات پاکیزہ ہوں۔ کفر و شرک کے تعصبات سے پاک ہوں۔ عقل صحیح اور قلب سلیم رکھتے ہوں۔ جن لوگوں کے خیالات ہی گندے ہوں۔ قرآن کے بلند پایہ مضامین و مطالب تک ان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کو صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں یا چھونا چاہئے۔ مشرک اور ناپاک لوگوں کو ہاتھ نہ لگانا چاہئے۔ اسی آیت سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ بے وضو لوگوں کو قرآن کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے۔ لیکن راجح تر بات یہی ہے کہ بے وضو بھی قرآن کو چھو سکتا اور اس سے تلاوت کر سکتا ہے۔ صرف جنبی اور حیض و نفاس والی عورت قرآن کو چھو نہیں سکتے۔ جب تک پاک نہ ہوں۔ البتہ حیض و نفاس والی عورت زبانی قرآن پڑھ بھی سکتی ہے اور پڑھا بھی سکتی ہے۔

[۳۸] مُدْهِنُونَ۔ دُهْنٌ بمعنی روغن، تیل، چکنائی اور اَدْهَنَ بمعنی کسی چیز کو تیل لگا کر نرم کرنا مداہنت کے کئی معنی ہیں۔ مثلاً کسی بات میں لچک پیدا کر لینا۔ ڈھیلا پڑنا۔ منافقت کا رویہ اختیار کرنا۔ کسی چیز کو اپنی سنجیدہ توجہ کے قابل ہی نہ سمجھنا۔ یعنی اے کفار مکہ! قرآن جیسی بلند پایہ کتاب کے بارے میں تمہارا رویہ یہ ہے کہ تم اسے کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے۔

[۳۹] اس آیت کے بھی کئی مطالب ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح روزانہ کھانا کھانا تمہارا معمول ہے اسی طرح قرآن کو

فَلَوْلَآ إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ﴿٨٣﴾ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ﴿٨٤﴾ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا
تُبْصِرُونَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَآ إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُونَهَآ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٨٧﴾ فَأَمَّآ إِن كَانَ
مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ﴿٨٩﴾ وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنْ أَصْحَٰبِ الْيَمِينِ ﴿٩٠﴾

پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب جان ہنسلی کو پہنچ جاتی ہے (۸۳) اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو (۸۴) اور ہم اس وقت تم سے بھی زیادہ اس جان کے نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے (۸۵) پھر اگر تم کسی کے محکوم [۴۰] نہیں (۸۶) اور اگر تم (اپنی بات میں) سچے ہو [۴۱] تو اس جان کو لوٹا کیوں نہیں لیتے؟ (۸۷) ہاں اگر وہ مرنے والا مقربین سے ہو (۸۸) تو اس کے لئے راحت، عمدہ رزق اور نعمتوں والی جنت ہوگی (۸۹) اور اگر وہ دائیں ہاتھ والوں سے ہوگا (۹۰)

جھٹلانا بھی تم نے روزمرہ کا معمول بنا رکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے اس کی کوئی اور توجیہ تلاش کر کے اللہ کی اس نعمت کو بھی جھٹلا دینا تمہارا معمول بن گیا ہے۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے رزق کا شکر یوں ادا کرتے ہو کہ اللہ کو جھٹلاتے ہو اور کہتے ہو کہ مینہ ہم پر فلاں نچھتر اور فلاں ستارے کے سبب سے برسا ہے۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر) اور یہ قرآن بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی بارش اور بہت بڑی نعمت ہے اور تم اس نعمت کی شکرگزاری یوں کرتے ہو کہ اسے جھٹلا دیتے ہو۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ قرآن کو مان لینے سے تمہارا رزق بند ہو جائے گا۔ کعبہ کی سرپرستی اور تولیت چھن جائے گی۔ نذریں نیازیں بند ہو جائیں گی اور کعبہ کی وجہ سے عرب بھر میں جو تمہارا عزت و وقار بنا ہوا ہے سب ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا تم اپنے رزق اور عز و جاہ کا ثبات اسی بات میں دیکھتے ہو کہ تم قرآن کو جھٹلاتے رہو۔

[۴۰] ❁ موت کا منظر اور انسان کی بے بسی:۔ غَيْرَ مَدِينِينَ۔ دین کا ایک معنی قانون جزا و سزا بھی ہے اور اس قانون کے مطابق اچھے اور برے اعمال کی جزا اور سزا دینا بھی۔ ان چند آیات میں مرنے والے اور اس کے عزیز و اقارب سب کی انتہائی بے بسی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرف مرنے والا ہے جسے اپنی جان بچانا سب باتوں سے زیادہ عزیز ہے۔ پھر اس کے ساتھ اس کے عزیز و اقارب ہیں جنہوں نے اس کے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور چاہتے ہیں کہ اس کی جان بچ جائے۔ دوسری طرف اللہ یا اس کے فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی روح قبض کرنے آتے ہیں۔ پھر دیکھ لو غالب کون رہتا ہے اور مغلوب کون؟ اللہ تعالیٰ کا ان منکرین آخرت سے سوال یہ ہے کہ آخرت کی چوکھٹ یا نقطہ آغاز موت ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو کسی بالائی قانون کی گرفت سے آزاد سمجھتے ہو تو میت کی جان کو لوٹا کیوں نہیں لیتے پھر جب تم ہمارے فرشتوں سے پہلے قدم پر ہی مات کھا گئے تو آگے کیسے بچ سکو گے؟

[۴۱] سورت کے آخر میں یاددہانی کے طور پر انہیں تین گروہوں کا اجمالاً انجام ذکر کیا جا رہا ہے جن کا بیان ابتدا میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ یعنی مُقَرَّبِيْنَ، أَصْحَابُ الْيَمِيْنِ اور أَصْحَابُ الشِّمَالِ۔

فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩١﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٩٣﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾

تو اے دائیں ہاتھ والے لوگوں میں شامل ہونے والے! تجھ پر [۴۲] سلامتی ہو (۹۱) اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں سے ہوگا (۹۲) تو کھولتا پانی اس کی مہمانی ہوگی (۹۳) اور وہ دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا (۹۴) یہ سب کچھ یقیناً حق [۴۳] ہے (۹۵) لہٰذا آپ اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرتے رہیے [۴۴] جو بڑی عظمت والا ہے۔ (۹۶)

[۴۲] اس آیت کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ اگر مخاطب دائیں ہاتھ والا سمجھا جائے تو اس کا مطلب وہی ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے اور اگر مخاطب عام لوگ ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ اصحاب الیمین کی طرف سے تم لوگ مطمئن رہو اور خاطر جمع رکھو۔ وہ یقیناً محفوظ و مامون رہیں گے۔

[۴۳] یعنی جس طرح موت ایک اٹل حقیقت ہے اور تم اس حقیقت کو غیر حقیقت بنانے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح مُقَرَّبِیْنَ، اَصْحَابُ الْیَمِیْنِ اور اَصْحَابُ الشِّمَالِ۔ کا بتایا ہوا انجام بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اگر تم اسے جھٹلاتے بھی ہو تو اس طرح نہ وہ ٹل سکتی ہے نہ بدل سکتی ہے۔ لہٰذا خواہ مخواہ شبہات پیدا کر کے اپنے آپ کو دھوکا نہ دو۔ بلکہ آنے والے وقت کی تیاری کرو۔

[۴۴] ۞ تسبیح و تحمید کی فضیلت اور فوائد۔ تسبیح و تحمید میں مشغول رہنا ہی آخرت کی سب سے بڑی تیاری ہے۔ اس نیک مشغلہ سے جھٹلانے والوں کی دل آزار بیہودگی سے بھی یکسوئی رہتی ہے اور ان کے باطل خیالات کا رد بھی ہوتا ہے اور سیدنا عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھو یعنی ﴿سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ﴾ پڑھا کرو اور جب سبح اسم ربك الاعلى نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا اسے اپنے سجدے میں رکھو یعنی ﴿سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى﴾ کہا کرو۔ (مسند احمد، ابوداؤد) گویا آپ ﷺ نے نماز کا جو طریقہ مقرر فرمایا اس کے چھوٹے چھوٹے اجزاء بھی قرآن کریم کے اشاروں سے ماخوذ ہیں۔ تسبیح و تحمید کی فضیلت میں وہ حدیث نہایت جامع ہے جو امام بخاری نے اپنی کتاب کے آخر میں درج فرمائی ہے جو یہ ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ زبان سے ادائگی کے لحاظ سے ہلکے پھلکے مگر میزان اعمال میں بہت وزنی ہیں اور وہ ہیں ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ﴾ (بخاری۔ کتاب التوحید باب قوله تعالى وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ)

٢٩ آياتها سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ رکوعها ٤

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ② هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③

کلمات ٥٨٦ آیات ٢٩ (٥٧) سورۃ الحدید مدنی ہے (٩٤) رکوع ٤ حروف ٢٤٧٦

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق ہے، اللہ کی تسبیح کر رہی[1] ہے اور وہ غالب ہے، حکمت والا[2] ہے (١) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا[3] ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (٢) وہی اول ہے اور آخر ہے اور ظاہر[4] ہے اور پوشیدہ ہے اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے (٣)

[1] ہر چیز کی تسبیح کا مفہوم:۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح زبان حال سے بھی ہو سکتی ہے اور قال سے بھی۔ زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح یہ ہے کہ کائنات کی ایک ایک چیز خواہ وہ جمادات سے تعلق رکھتی ہو یا نباتات سے یا حیوانات سے اپنی تخلیق اور طریق کار سے واضح طور پر یہ ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ اس کا خالق ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے اور اس نے جو چیز بھی پیدا کی اور بنائی کمال حکمت سے بنائی اور جس مقصد کے لیے بنائی گئی وہ اپنا مقصد پورا کر رہی ہے اور جو تسبیح یہ چیزیں زبان قال سے کر رہی ہیں وہ ہم سمجھ نہیں سکتے۔ (١٧:٤٤)

[2] چونکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا اس پر پورا پورا تصرف اور اختیار بھی رکھتا ہے اور ہر چیز کو جس مقصد کے لیے اس نے بنایا ہے اس سے وہ کام لے رہا ہے۔ اس قدر بے پناہ اور ہمہ گیر قوت اور غلبہ کے باوجود اس نے کبھی اس قوت کا غلط استعمال نہیں کیا بلکہ جو چیز بھی بنائی اس میں کئی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں۔ خواہ وہ انسان کے علم میں آچکی ہوں یا نہ آئی ہوں اور وہ ہمیشہ اپنی تخلیق کا مقصد پورا کرتی اور مثبت نتائج پیدا کرتی ہے اور یہی بات اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت پر دلیل ہے۔

[3] موت سے زندگی اور زندگی سے موت دینا اس کا ہر وقت کا کرشمہ ہے اور یہ طریقہ کار صرف حیوانات میں ہی نہیں نباتات میں بھی ہر آن جاری و ساری ہے جیسا کہ پہلے بہت سے مقامات پر اس کی تشریح گزر چکی ہے۔

[4] یعنی جب کائنات کی کوئی چیز موجود نہ تھی اس وقت بھی اللہ موجود تھا اور جب کائنات کی کوئی چیز باقی نہ رہے گی سب فنا ہو جائیں گی اس وقت بھی وہ موجود رہے گا اور وہ ظاہر اس لحاظ سے ہے کہ ہر چیز کا وجود اور ظہور اس کے وجود سے ہے۔ کائنات اکبر کے نظام میں غور کریں یا کائنات اصغر یا انسان کے جسم کے نظام میں غور کریں تو اس کی قدرت اور اس کے وجود پر بہت سے دلائل مل جاتے ہیں۔ کائنات کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اپنے خالق پر رہنمائی نہ کرتی ہو۔ اور وہ باطن اس لحاظ سے ہے کہ حواس خمسہ سے اس کا ادراک تو درکنار ہم عقل سے اس کی ذات یا صفات کے متعلق کوئی صحیح تصور بھی قائم نہیں کر سکتے۔ اس مادی دنیا میں ہمارے سامنے اس قدر غیب کے پردے حائل ہیں کہ ہم ان آنکھوں سے اسے کبھی نہیں دیکھ سکتے۔

[5] ﴿اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ کی تشریح کے لیے دیکھئے سورہ اعراف کی آیت نمبر ٥٤ کا حاشیہ نمبر ٥٤ اور زمین و آسمان کی چھ

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ

اسی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر[۵] قائم ہوا۔ جو چیز زمین میں داخل ہوتی، اسے بھی جانتا ہے اور جو نکلتی ہے اسے بھی (اسی طرح) جو چیز آسمان سے اترتی ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا[۶] ہے اسے بھی۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو[۷] کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے(۴) آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کی ہے اور سب معاملات اسی کی طرف لوٹائے[۸] جاتے ہیں(۵) وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں

دن میں پیدائش کے لیے دیکھئے سورہ ہود کی آیت ۷ کا حاشیہ نمبر ۱۱

[۶] زمین میں داخل ہونے والی اشیاء میں سب سے اہم بارش کا پانی اور ہر قسم کی نباتات، غلوں اور درختوں کے بیج ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک ایک دانہ اور ایک ایک بیج کے متعلق واقف ہے کہ وہ کہاں ڈالا گیا اور اسے کتنے عرصے کے بعد زمین سے باہر نکالنا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ان مردہ اجسام کو بھی جانتا ہے جو زمین میں دفن کیے جاتے ہیں اور زمین سے نکلنے والی اشیاء میں سے بھی سب سے اہم اشیاء غلے اور میوہ دار درخت ہیں۔ جن پر تمام جاندار مخلوق کی زندگی کی بقا کا انحصار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت کتنی روزی کھانے والی مخلوق روئے زمین پر بس رہی ہے اور اس کے لیے کس کس قسم کا اور کتنی مقدار میں رزق درکار ہے۔ علاوہ ازیں زمین سے نکلنے والی اشیاء میں مختلف معدنیات، مدفون خزانے، تیل اور پٹرول وغیرہ کے چشمے، پانی کے چشمے اور بہنے والی گیسیں سب چیزیں شامل ہیں۔ زمین پر اترنے والی اشیاء میں بارش، ملائکہ اور وحی الٰہی ہیں نیز شیاطین بھی جو اپنے ساتھیوں پر اترتے ہیں اور چڑھنے والی اشیاء میں آبی بخارات، ملائکہ، مردوں کی ارواح اور لوگوں کے اعمال شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام روئے زمین پر جس جس قسم کے بھی حوادث واقع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے معمولی سے معمولی حالات تک سے واقف ہے۔

[۷] اللہ کی معیت کیسے؟ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ ہمہ گیر نگرانی صرف روئے زمین سے متعلق نہیں۔ بلکہ تم میں سے ہر فرد کے ساتھ وہ ہمہ وقت موجود ہوتا ہے اور تمہاری تمام حرکات و سکنات اور اقوال و افعال اس کے علم میں ہوتی ہیں۔ تم نہ خود اللہ سے چھپ سکتے ہو اور نہ ہی اپنے افعال اور حرکات و سکنات کو اس سے چھپا سکتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ معیت اس کی ذات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کی قدرت اور اس کے علم کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

[۸] یعنی کائنات کی ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی ہے۔ ہر چیز سے وہ جو کام چاہتا ہے لے رہا ہے۔ اور جب چاہے گا اس نظام کو درہم برہم کر کے ایک دوسرا عالم قائم کر دے گا۔ تم اس کی قلمرو سے بھاگ کر نہ اب کہیں جا سکتے ہو نہ آخرت کے دن کہیں جا سکو گے اور تمہارے اعمال کا ریکارڈ پہلے ہی اس کے پاس موجود ہے۔ اور ہر معاملہ کا اور ہر کام کا انجام بھی اسی کی طرف ہے اور فیصلہ بھی وہیں سے صادر ہو گا۔

النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٦﴾ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ
مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۗ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿٧﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ هُوَ الَّذِيْ

داخل کرتا ہے اور وہ دلوں کے راز تک جانتا ہے(۶) اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ[۹] اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن میں اس نے تمہیں جانشین[۱۰] بنایا ہے، تو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور خرچ کیا ان کیلئے بہت بڑا اجر ہے(۷) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ[۱۱] اور وہ (اللہ) تم سے اقرار بھی لے[۱۲] چکا ہے اگر تم واقعی ایمان لانے والے ہو(۸) وہی

[۹] ترتیب نزولی اور اس مضمون سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورت جنگِ احزاب کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس وقت تک قریش مکہ ہی مسلمانوں پر چڑھ چڑھ کر آتے رہے اور حملہ آور ہوتے رہے۔ جنگِ احزاب کے خاتمہ اور کافروں کے فرار کے بعد رسول اللہ ﷺ نے گویا فرما دیا تھا کہ آج کے بعد کفار ہم پر حملہ آور نہ ہوں گے تاہم ابھی مسلمانوں کا غلبہ بہت دور کی بات تھی۔ ایسے مذبذب حالات میں بھی کچھ مسلمان اور مہاجرین ایسے تھے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں پر پختہ یقین رکھتے تھے اور تنگ دستی کے باوجود اس حق و باطل کے معرکہ میں جو کچھ بھی انہیں میسر آتا بے دریغ خرچ کر رہے تھے۔ لیکن کئی نو مسلم ایسے بھی تھے جو گومگو کی حالت میں تھے۔ نہ حق و باطل کے اس معرکہ میں مخلص بن کر کوشش کرتے تھے اور نہ ہی جہاد کی خاطر اپنے اموال خرچ کرنے کو تیار تھے۔ ان آیات میں ایسے ہی لوگوں کو خطاب کیا جا رہا ہے۔ جو اسلام لانے کے باوجود اسلام کے لیے جانی یا مالی یا بدنی قربانیاں پیش کرنے کو تیار نہ تھے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ خلوص نیت کے ساتھ ایمان لا کر اللہ کے رسول کا ساتھ دو اور ان کے کیے ہوئے وعدوں کو یقینی سمجھو۔

[۱۰] یعنی جن اموال سے اللہ کی راہ میں یا جہاد کی خاطر خرچ کرنے سے تم گریز کر رہے ہو ان اموال کے تم حقیقی مالک نہیں ہو۔ ان کا حقیقی مالک تو اللہ ہے۔ تمہاری حیثیت صرف ایک نائب اور امین کی ہے۔ یہ اموال موت کے وقت تو یقیناً تمہاری ملکیت سے نکل جائیں گے اور اس سے پہلے بھی نکل سکتے ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ پہلے بھی اموال اور لوگوں کے قبضے میں تھے آج تم ان کے جانشین ہونے کی بنا پر ان پر قابض ہو۔ لہٰذا ان اموال کو اپنی ملکیت نہ سمجھ بیٹھو اور اللہ کی ہدایات اور رضا کے مطابق اسے خرچ کر دو۔ ایسا خرچ کیا ہوا مال ہی تمہارے لیے بہت بڑے اجر کا سبب بنے گا۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ جتنا مال تم خرچ کرو گے اتنا یا اس سے زیادہ مال اور دے دے گا۔

[۱۱] یہاں ایمان لانے سے مراد اللہ اور اس کے رسول کے ان وعدوں کو یقینی اور سچا سمجھنا ہے جو اسلام کے غلبہ سے متعلق انہوں نے مسلمانوں سے کر رکھے ہیں۔ یہ وعدے بھی کہ جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بہت زیادہ تمہیں غنائم وغیرہ کی صورت میں لوٹا دے گا اور یہ وعدے بھی کہ اللہ آخرت میں تمہیں ایسے صدقات کا بہت زیادہ اجر دے گا۔

[۱۲] اس اقرار سے مراد عہد ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ بھی ہو سکتا ہے جس کی رو سے ہر شخص نے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اللہ کا فرمانبردار بن

يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ
لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا
يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا

تو ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات[۱۳] نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے اور اللہ تو یقیناً تم پر بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے۔(۹)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث[۱۴] اللہ ہی کے لئے ہے۔ جن لوگوں نے فتح (مکہ) کے پہلے خرچ[۱۵] اور جہاد کیا وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے بعد خرچ اور جہاد کیا۔ یہی لوگ درجہ میں زیادہ ہیں۔

کر زندگی گزارے گا اور اسلام لانا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں داخل ہونا بذاتِ خود اس بات کا پختہ اقرار ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا فرمانبردار بن کر رہے گا۔

[۱۳] آیاتِ بینات سے مراد قرآن کی آیات بھی ہو سکتی ہیں اور صداقت کے نشانات بھی۔ یعنی کیسے کیسے نازک مرحلوں پر اللہ تعالیٰ نے غیبی اسباب و وسائل سے اپنے رسول ﷺ کی مدد فرمائی جن سے واضح طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ اس رسول ﷺ کی پشت پر کوئی مافوق الفطرت زبردست طاقت موجود ہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تمہیں جہالت اور کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکال کر علم و عرفان کی روشنی میں لے آئے۔ اگر تم سمجھو تو تم پر اللہ کی بہت بڑی مہربانی اور احسان ہے۔

[۱۴] اللہ کی میراث ہونے کے مختلف پہلو:۔ یعنی جو مال اس وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد تمہارے وارثوں کی طرف منتقل ہو جائے گا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ حتیٰ کہ یہ سب کچھ اللہ کی میراث میں چلا جائے گا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب تم دنیا میں آئے تھے تو خالی ہاتھ آئے تھے اور جب یہاں سے رخصت ہو گے تو بھی خالی ہاتھ ہی جاؤ گے تو پھر یہ تمہاری ملکیت کیسے ہوئی؟ تم اس سے صرف عارضی طور پر انتفاع کر سکتے ہو۔ اور اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ جیسے آج تمہارے پاس یہ مال آ گیا ہے۔ ویسے ہی تمہاری زندگی میں تم سے نکل بھی سکتا ہے۔ یہ مال و دولت تو ڈھلتی چھاؤں ہے۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ لہٰذا جب تک یہ مال تمہاری تحویل میں ہے اسے حقیقی مالک کی مرضی کے مطابق خرچ کر کے اس سے حقیقی فوائد کیوں نہیں حاصل کرتے؟

[۱۵] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ دو آیات فتح مکہ کے بعد اور بقول بعض غزوہ تبوک کے وقت نازل ہوئیں جو مضمون کی مناسبت کے لحاظ سے یہاں رکھی گئیں۔ اور فتح سے مراد بعض علماء نے صلح حدیبیہ لی ہے کیونکہ اللہ نے اسے بھی فتح مبین قرار دیا ہے۔ لیکن اکثریت کے نزدیک اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد ہی اسلام کو واضح طور پر کفر پر غلبہ حاصل ہوا تھا۔ تمام عرب قبائل مکہ کے معرکہ پر دیر سے نظریں جمائے بیٹھے تھے کہ اس معرکہ میں قریش مکہ غالب آتے ہیں یا مسلمان؟ اور جو فریق غالب

مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰ مَنْ ذَا الَّذِيْ ع ۱۷
يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

تاہم اللہ نے ہر ایک سے اچھا وعدہ کیا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے
(۱۰) کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض[۱٦] جسے وہ اس کے لئے دوگنا بڑھا دے اور اسے عمدہ
اجر[۱۷] عطا کرے۔ (۱۱) اس دن آپ دیکھیں گے کہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کا نور

آئے وہ اس کا ساتھ دینے کو منتظر بیٹھے تھے اس فیصلہ کن معرکہ میں جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا تو عرب قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اب تو یہ واضح بات ہے کہ جن مسلمانوں نے فتح مکہ سے قبل مالی قربانیاں پیش کی تھیں اس کی بنیاد صرف ان کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں پر غیر متزلزل ایمان ہی ہو سکتا ہے ورنہ حالات ان کے حق میں کچھ حوصلہ افزا نہ تھے۔ بلکہ بعض اوقات انتہائی حوصلہ شکن ہوتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں جن لوگوں نے فتح مکہ کے بعد مالی قربانیاں دیں ان کے لیے حالات حوصلہ افزا اور امید افزا ہوتے تھے کیونکہ وہ ایک غالب گروہ کا ساتھ دے رہے تھے۔ پھر انہیں غنائم کی صورت میں خرچ کردہ مال سے بہت زیادہ مال واپس مل جانے کی توقع ہوتی تھی اور اکثر اوقات ان کی توقع پوری بھی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا ان دونوں کا اجر یکساں نہیں ہو سکتا۔ تاہم فتح مکہ کے بعد خرچ کرنے والوں کو بھی اللہ اچھا ہی اجر عطا فرمائے گا۔ اور جس نیت سے کسی نے خرچ کیا ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ لہٰذا جس قدر خلوص نیت اور ایمان کی پختگی کے ساتھ کوئی شخص خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ اسی نسبت سے اس کا اجر بڑھاتا جائے گا۔

[۱٦] ❁ قرض حسنہ کے سلسلہ میں دس ہدایات:۔ قرض حسنہ سے مراد ہر وہ مال ہے جو محض اللہ کی رضا کے لیے اس کی ہدایات و احکام کے مطابق خرچ کیا جائے۔ خواہ وہ فرضی صدقہ یا زکوۃ ہو یا واجبی صدقات ہوں یا نفلی ہوں اور خواہ وہ فی سبیل اللہ جہاد میں خرچ کیا جائے یا کسی محتاج کی احتیاج کو دور کرنے کے لیے اسے دیا جائے۔ قرض حسنہ کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل دس امور کا لحاظ رکھنا اسے افضل صدقہ بنا دیں گے۔

(۱) حلال کمائی سے خرچ کیا جائے کیونکہ حرام کمائی سے صدقہ قبول نہیں، (۲) صدقہ میں ناقص مال نہ دے، (۳) اس وقت صدقہ کرے جبکہ خود بھی اسے احتیاج ہو، (۴) اپنی احتیاج پر دوسرے کی احتیاج کو مقدم رکھے، (۵) صدقہ چھپا کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ (٦) صدقہ دینے کے بعد احسان نہ جتلائے اور نہ ہی کسی دوسری صورت میں اس کا معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ باتیں صدقہ کو برباد کر دیتی ہیں، (۷) صدقہ میں نمود و نمائش یعنی ریا کا شائبہ تک نہ ہو۔ یہ بات بھی صدقہ کو برباد کر دیتی ہے، (۸) اپنے دیئے ہوئے صدقہ کو حقیر جانے۔ صدقہ دے کر اس کا نفس اس نیکی پر پھول نہ جائے، (۹) اگر صدقہ میں اپنا بہترین اور پسندیدہ مال دے تو یہ اس کے اپنے حق میں بہت بہتر ہے۔ (۱۰) محتاج کو صدقہ دینے کے بعد یہ نہ سمجھے کہ میں نے اس پر احسان کیا ہے بلکہ یہ سمجھے کہ میرے مال میں اس کا یہ حق تھا اور میں نے اس کا حق ادا کیا ہے اور مستحق کو حق دے کر اپنے سر سے بوجھ ہلکا کیا ہے۔

[۱۷] ❁ قرضہ حسنہ کے دو فائدے:۔ قرضہ حسنہ دینے والوں سے اللہ تعالیٰ نے دو وعدے فرمائے ایک یہ کہ اللہ اسے کئی گنا

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا

ان کے سامنے [۱۸] اور دائیں جانب [۱۹] دوڑ رہا ہوگا (اور انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں ایسے باغوں کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ تم اس میں ہمیشہ رہو گے، یہی بڑی کامیابی ہے (۱۲) اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمانداروں سے کہیں گے: "ہماری طرف دیکھو [۲۰] تاکہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی

زیادہ کر کے واپس کرے گا۔ دنیا میں بھی ایسے خرچ کیے ہوئے مال کی واپسی کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ (۳۹:۳۴) اور آخرت میں تو سات سو گنا یا اس سے بڑھ کر بھی اضافہ ہو سکتا ہے یعنی قرضہ حسنہ کی مندرجہ بالا شرائط کو جتنا زیادہ ملحوظ رکھا جائے گا۔ اسی تناسب سے اس کے اجر میں اضافہ ہوگا۔ اور دوسرا وعدہ یہ کہ انہیں عمدہ اجر عطا کرے گا۔ یہ فقرہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہی عطا کردہ مال میں سے انسان اس مال کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کے کہنے کے مطابق خرچ کر دے تو انسان کو بدلہ ملنے کا حق کہاں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ ایسے قرض حسنہ دینے والوں کو بہت عمدہ اجر عطا فرمائے گا۔ واضح رہے کہ اللہ کا بندے کو اصل سے دوگنا یا زیادہ دینے کا معاملہ کوئی سود بیاج کا معاملہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ معاملہ آقا اور اس کے غلام کے درمیان ہے۔ اور غلام کی خدمات کا مالک جتنا بھی صلہ دے دے، برابر برابر دے دوگنا دے، دس بیس گنا دے وہ سود بیاج نہیں کہلا سکتا۔ البتہ یہ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ آقا اپنے غلام کی خدمات کا کس قدر قدر شناس اور کریم النفس ہے۔

[۱۸] ❁ <u>نورِ ایمانی کا انحصار ایمان کی کمی بیشی پر:</u> اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس وقت پیش آئے گا جب میدان محشر میں فیصلہ کے بعد مومن مردوں اور عورتوں کو جنت کا پروانہ راہداری مل جائے گا۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ جنت کو جو راستہ جاتا ہے وہ جہنم سے ہو کر جاتا ہے اور ہر جنتی کو لازماً جہنم پر وارد ہونا ہوگا۔ (۷۱:۱۹) اور پل صراط سے گزرنا ہوگا اور اس راستہ میں سخت تاریکی ہوگی۔ وہاں مومنوں کے اعمال صالحہ کا نور ہی کام آئے گا۔ جس قدر کسی کا ایمان پختہ اور نیک اعمال زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کا نور یا روشنی بھی زیادہ ہوگی۔ بعض روایات میں ہے کہ کچھ مومنوں کی روشنی اتنی دور تک پہنچے گی جیسے مدینہ اور عدن کا درمیانی فاصلہ ہے۔ بعض کا نور مدینہ سے صنعاء تک کے فاصلہ تک پہنچ رہا ہوگا اور بعض ایسے بھی ہوں گے جن کی روشنی ان کے اپنے قدموں سے آگے نہیں بڑھے گی اس روشنی کی کمی بیشی کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس شخص کی کوششوں سے اسلام جتنی دور تک پھیلا ہوگا اور لوگوں کو ہدایت حاصل ہوئی ہوگی اس نسبت سے اس کے نور میں کمی بیشی ہوگی۔

[۱۹] نیک اعمال اور دائیں جانب کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اہل جنت کو اعمال نامہ بھی دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ایک شخص اندھیرے میں روشنی کا کوئی آلہ مثلاً لالٹین، لیمپ یا ٹارچ عموماً اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر چلتا ہے۔ اس کی روشنی سامنے اور دائیں ہاتھ تو خوب پڑتی ہے۔ مگر بائیں ہاتھ یا پیچھے بھی روشنی پڑتی تو ہے مگر بہت کم۔ یہی صورت حال اس دن ہوگی اور آگے جو روشنی پڑے گی اس کا تعلق دل سے ہے جس قدر کسی کا دل ایمان کی پختگی اور اس کے نور سے منور ہوگا اتنی ہی زیادہ اس کے آگے روشنی ہوگی اور دائیں طرف کی روشنی کا تعلق اس کے اعمال صالحہ سے ہوگا۔

[۲۰] ❁ <u>میدانِ محشر میں منافقوں کی مسلمانوں کے ساتھ رہنے اور ساتھ جانے کی التجا اور سوال وجواب:</u> منافق بھی چونکہ دنیا

نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝۱۳ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۱۴

حاصل کر سکیں" انہیں کہا جائے گا: پیچھے چلے [۲۱] جاؤ اور نور تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ [۲۲] ہوگا اس دروازے کے اندر تو رحمت ہوگی اور باہر عذاب ہوگا۔(۱۳)

منافق مومنوں کو پکار کر کہیں گے: "کیا ہم (دنیا میں) تمہارے ساتھ [۲۳] نہ تھے؟" (مومن) کہیں گے، کیوں نہیں، لیکن تم نے تو خود اپنے آپ کو فتنہ [۲۴] میں ڈالا۔ اور (موقع کی) انتظار کرتے رہے اور شک [۲۵] میں پڑے رہے اور جھوٹی آرزوئیں تمہیں دھوکہ میں ڈالے رہیں تا آنکہ اللہ کا حکم آپہنچا [۲۶] اور (اس وقت تک) بڑا دھوکہ باز (شیطان) اللہ کے بارے میں تمہیں دھوکا ہی دیتا رہا(۱۴)

میں ایماندار لوگوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے۔ وہاں بھی وہ یہ کوشش کریں گے کہ وہ بھی ایمانداروں کے ساتھ رہیں اور اس دن انہیں ایمان اور اعمال صالحہ کا فائدہ خوب معلوم ہو چکا ہوگا۔ لیکن ان کا اپنا نور تو کچھ ہوگا نہیں۔ اس لیے وہ مومنوں سے درخواست کریں گے کہ ذرا ہمارا بھی انتظار کرلو تاکہ تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھا کر ہم بھی کچھ آگے بڑھ سکیں اور تمہارے ساتھ چل سکیں۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذرا مڑ کر ہماری طرف دیکھو کہ تمہارے ہمارے طرف دیکھنے سے تمہاری روشنی ہمارا راستہ بھی منور کردے اور ہم اس روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر تمہارے ساتھ شامل ہوسکیں۔

[۲۱] اس فقرے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ یہ روشنی ہمیں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی بدولت حاصل ہوئی ہے اور ایمان اور اعمال صالحہ کمانے کا اصل مقام دنیا ہے جو تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ اب اگر تم روشنی چاہتے ہو تو یہ تمہیں دنیا سے ہی مل سکتی ہے۔ اگر تم واپس دنیا میں جاسکتے ہو تو جاؤ اور وہاں یہ روشنی تلاش کرو اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایمانداروں کو ایمان اور اعمالِ صالحہ کی روشنی عملاً اس وقت عطا کی جائے جب انہیں تاریکی میں آگے بڑھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ واپس اس مقام پر چلے جاؤ جہاں یہ نور تقسیم ہوا تھا اور وہاں جاکر اپنے لیے روشنی کی تلاش کرو۔

[۲۲] مومنوں اور منافقوں کے درمیان گفتگو کا یہ سلسلہ جاری ہوگا کہ ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی جائے گی جو جنت اور جہنم کے درمیان حد فاصل کا کام دے گی۔ مومنوں کی سمت جنت کی خوشبوؤں کی لپٹیں آنے لگیں گی اور منافقوں کی سمت جہنم کے اثرات پڑنے شروع ہوجائیں گے۔

[۲۳] اس دیوار میں ایک دروازہ ہوگا اب یہاں سے منافق مومنوں کو پکار پکار کر کہیں گے کہ دنیا میں تو ہم نے تمہارا ساتھ دیا تھا۔ اور آج تم لوگ ہمیں یہاں چھوڑ کر اکیلے ہی جنت کی طرف جارہے ہو۔ تمہیں ہم سے ایسی بے وفائی تو نہ کرنی چاہیے تھی۔

[۲۴] مومن اس بات کا یہ جواب دیں گے کہ تم جھوٹ بکتے ہو جو یہ کہتے ہو کہ ہم نے تمہارا ساتھ دیا تھا۔ اس کے بجائے اصل بات یہ تھی کہ تم لوگ موقع پرست اور مفاد پرست تھے اور اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ مومنوں اور کافروں میں سے جس کا پلڑا بھاری رہے اس کے ساتھ مل کر اپنے دنیوی مفاد حاصل کریں۔

[۲۵] یعنی تمہارا نہ اللہ پر ایمان پختہ تھا نہ اس کے رسول پر نہ اللہ اور اس کے رسول کے وعدوں پر اور نہ آخرت پر۔ جب تم دیکھتے

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾
اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ

لہٰذا آج نہ تم سے فدیہ[۲۷] قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا۔ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے، وہی تمہاری خبر گیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے (۱۵) جو لوگ ایمان لائے ہیں کیا ان کیلئے ایسا وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر سے اور جو حق نازل ہوا ہے، اس سے ان کے دل پسیج[۲۸] جائیں؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں

تھے کہ حالات مسلمانوں کے حق میں ناساز گار ہیں اور کافروں کی کثرت تعداد، معاش اور سامان جنگ کی طرف دیکھتے تھے تو تمہارا ایمان متزلزل ہو جاتا تھا۔ تمہارا اللہ اور اس کے رسول کے وعدوں پر اعتماد اٹھ جاتا تھا۔ پھر تم یہ بھی سوچنے لگتے تھے کہ شاید یہ آخرت اور اپنے اعمال کی جزا و سزا والا معاملہ بھی یقینی ہے یا نہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ایسی روش اختیار کی جائے کہ کسی فریق سے ملنا ہمارے لیے مشکل نہ ہو۔ لہٰذا تم صرف ظاہری طور پر ہمارے ساتھ لگے رہے۔ لیکن تمہاری ساری ہمدردیاں اور دلچسپیاں کافروں کے ساتھ رہیں۔

[۲۶] اللہ کے حکم سے مراد اسلام کا مکمل غلبہ بھی ہو سکتا ہے اور موت بھی۔ یعنی جہاں تک تمہارا بس چلتا رہا تم نے اپنے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ تم یہ سمجھتے رہے کہ ہمارا مسلمانوں کو اندھیرے میں رکھ کر اور انہیں دھوکا دے کر اپنے مفادات حاصل کر لینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ تم خود شیطان کے ہتھے چڑھے ہوئے تھے اور مرتے دم تک اس نے تمہیں اسی دھوکہ میں جتلا رکھا کہ اب کوئی دن میں مسلمان تباہ ہوتے ہیں اور اسلام مٹ جاتا ہے۔

[۲۷] جو اللہ کو سرپرست نہ بنائے اس کی سرپرست جہنم ہے:۔ یہ غالباً مومنوں کی منافقوں سے گفتگو کا آخری حصہ ہے کہ جس مال و متاع کی خاطر دنیا میں تم نے منافقت کا رویہ اختیار کیا تھا۔ آج اگر وہ مال و متاع تمہیں مل بھی جائے تو وہ تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ وہ مال و دولت سارے کا سارا دے کر بھی تم عذاب جہنم سے بچ نہیں سکتے۔ نہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ ضمناً اس آیت سے دو اور باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ بدترین انجام کے لحاظ سے منافق اور کافر میں کوئی فرق نہیں۔ منافق بھی حقیقتاً کافر ہی ہوتے ہیں۔ اور دوسری یہ کہ جو شخص اللہ کو سرپرست نہ بنائے جہنم از خود اس کی سرپرست بن جاتی ہے۔

[۲۸] پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس سورہ کا زمانہ نزول غالباً جنگ احزاب سے بعد اور صلح حدیبیہ سے پہلے کا ہے۔ اس وقت تک اسلام کے غلبہ کے کئی آثار لوگوں کے سامنے آ چکے تھے۔ جنگ بدر میں کافر شکست فاش سے دوچار ہو چکے تھے۔ جنگ احد میں بھی بالآخر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا تھا اور جنگ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے غیبی اسباب سے مسلمانوں کی مدد فرما کر کافروں کو فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان واقعات سے عام لوگ اور غیر جانبدار قبائل یہ تاثر لے رہے تھے کہ اسلام اور کفر دونوں برابر کی چوٹ ہیں اور سب اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیے اب اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ایسے حالات میں منافقوں کو اس آیت سے یہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اسلام کی نصرت و تائید میں اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے بعد تمہیں یہ یقین نہیں آ رہا کہ جو وحی اور دعوت

أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ ﴿۱۶﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۷﴾ إِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَ

جنہیں اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے [۲۹] اور (آج) ان میں سے اکثر فاسق ہیں (۱۶)

اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہی زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندگی بخشتا [۳۰] ہے۔ ہم نے تمہارے لئے آیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ شاید کہ تم کچھ سمجھ سکو (۱۷) مردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقہ کرنے والے ہیں

اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی ہے وہ برحق اور درست ہے۔ نیز یہ کہ کافروں کا اور ان کے ساتھ ہی منافقوں کا جو انجام عنقریب سامنے آنے والا ہے کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اس سے مسلمانوں کے دل دہل جائیں اور اللہ کے ذکر اور اس کے ڈر سے ان کے دل نرم پڑ جائیں۔

[۲۹] قرآن کی وہ آیت جس نے فضیل بن عیاض کی زندگی کا رخ بدل دیا:۔ ہوتا یہ ہے کہ جب تک نبی اپنی امت میں موجود رہتا ہے۔ ایمانداروں کے دل نبی کی صحبت اور اللہ کے ذکر اور اس سے تقویٰ کی وجہ سے نرم پڑ جاتے ہیں اور ان لوگوں کے دل اور طبیعتیں نیکی میں سبقت کی طرف مائل رہتی ہیں لیکن جب نبی اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی طبیعتیں اللہ کی یاد سے غافل رہنے لگتی ہیں۔ ان میں تقویٰ کی بجائے فسق اور اللہ کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کے جراثیم جنم لینے لگتے ہیں۔ یہود اور نصاریٰ دونوں پر یہ کیفیت گزر چکی تھی۔ اس آیت میں بالعموم مسلمانوں کو اور بالخصوص منافقوں کو یہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اللہ کی یاد سے غافل رہنا ایسی بیماری ہے جس سے دل سخت ہو جاتے ہیں اور ان میں فسق و فجور داخل ہونے لگتے ہیں لہٰذا تم پر لازم ہے کہ اللہ کو ہر دم یاد رکھو اسی سے تم میں تقویٰ پیدا ہو گا اور تمہارے دل نرم رہ سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دور تابعین میں فضیل بن عیاض ایک ڈاکو تھے۔ ایک دفعہ وہ اپنے اسی شغل یعنی ڈاکہ زنی اور لوٹ مار میں مشغول تھے کہ کسی نے بلند آواز سے یہی آیت ﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ پڑھ دی۔ اس آیت اور اس کے شیریں انداز بیان کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ لرز گئے اسی وقت توبہ کی اور اپنا ڈاکہ زنی کا پیشہ ترک کر کے اللہ کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔ پھر تقویٰ اختیار کر کے وہ مقام حاصل کیا کہ اس دور کے صالحین میں ان کا نام سرفہرست آتا ہے۔

[۳۰] مومن اور منافق پر وحی کے اثر کا تقابل:۔ زمین پر بارش ہو تو وہ گلزار بن جاتی ہے اور کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں۔ مگر بنجر زمین اس بارش کا بھی الٹا اثر لیتی ہے۔ وہاں شور پیدا ہو جاتا ہے یا خاردار جھاڑیاں اور فضول قسم کی نباتات اگ آتی ہے۔ یہی حال منافقوں کا ہے۔ انسان کا دل زمین ہے اور وحی الٰہی باران رحمت۔ اس سے سلیم الطبع لوگوں کے ایمان کی کھیتیاں تو لہلہانے لگتی ہیں مگر منافقوں کے دلوں میں یہی آیات الٰہی مزید شکوک و شبہات کا باعث بن جاتی ہیں اور وہ اپنی ناپاک سازشوں میں پہلے سے

أَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١٨﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ
الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١٩﴾ اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ ع ۱۸

اور جن لوگوں نے اللہ کو قرضِ حسنہ [۳۱] دیا، وہ ان کے لئے دگنا کر دیا جائے گا اور ان کے لئے عمدہ اجر ہوگا (۱۸) اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے پروردگار کے ہاں صدیق [۳۲] اور شہید [۳۳] ہیں انہیں (اپنے اپنے اعمال کے مطابق) اجر بھی ملے گا اور روشنی [۳۴] بھی۔ اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلا دیا تو ایسے ہی لوگ اہل دوزخ ہیں۔ (۱۹)

خوب جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا، زینت و آرائش، تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

زیادہ سرگرم ہو جاتے ہیں۔

[۳۱] اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب میں تاکید مزید کے طور پر اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۱ کے مضمون کو دہرایا گیا ہے۔ تشریح آیت مذکورہ کے تحت دیکھی جائے۔

[۳۲] ❁ صدیق کے دو مفہوم:۔ یعنی جو لوگ سچے دل اور خلوص نیت سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صدیق بن جاتے ہیں اور اللہ کے ہاں صدیق ہی شمار ہوتے ہیں۔ صدیق کے معنی و مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ اور اس کا رسول ﷺ کہتا ہے بلا تامل اس کی تصدیق کر دیتے ہیں دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے قول اور وعدوں کے پابند اور اپنے اعمال و افعال میں راست رو اور راست باز ہوتے ہیں۔ جھوٹ، ہیرا پھیری، مکر و فریب، جانبداری، بدعہدی اور ایسی ہی دوسری چیزوں سے انہیں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

[۳۳] ❁ صدیق کی گواہی کے دو مفہوم:۔ ایسے ہی صدیق لوگ قیامت کے دن دوسرے لوگوں پر گواہ بنیں گے۔ پھر اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اپنے قول اور عمل سے نمونہ بن کر سب لوگوں پر واضح کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول پر صحیح طور پر ایمان لانے کے یہ اثرات انسان پر مرتب ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ قیامت کے دن اللہ کے دربار میں یہ گواہی دیں گے کہ ہم نے فلاں فلاں شخص کو دعوت حق دی تھی اور اس کے رد عمل کے طور پر انہوں نے ایسے ایسے جواب دیے تھے اور ہمارے خلاف فلاں فلاں مظالم ڈھائے تھے۔ بعض مفسرین اس آیت میں واو عاطفہ قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک یہ دو الگ الگ اور مستقل جملے ہیں۔ پہلا جملہ صِدِّيقُوْنَ پر ختم ہو جاتا ہے اور وَالشُّهَدَاءُ سے دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ شہداء سے مراد راہ حق میں شہید ہو جانے والے لیتے ہیں۔ میرے خیال میں پہلا مفہوم ربط مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

[۳۴] نور سے مراد وہی اعمال صالحہ کی روشنی ہے جس کی تشریح اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۲ کے تحت کر دی گئی ہے۔

وَالْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ
عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿٢٠﴾ سَابِقُوا إِلَىٰ
مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ

جیسے بارش ہوئی تو اس کی نباتات نے کاشتکاروں کو خوش کر دیا پھر وہ جوبن پر آتی ہے پھر تو اسے زرد پڑی ہوئی دیکھتا ہے۔ پھر (آخر کار) وہ بھس بن جاتی ہے۔ جبکہ آخرت میں (ایسی غفلت کی زندگی کا بدلہ) سخت عذاب[۳۵] ہے۔ اور (ایمان والوں کے لئے) اللہ کی بخشش اور اس کی رضا ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے (۲۰) تم اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کو حاصل کرنے کیلئے ایک دوسرے سے آگے نکل جاؤ جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کے برابر[۳۶] ہے۔ وہ ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

[۳۵] انسانی اور نباتاتی زندگی کا تقابل:۔ اس آیت میں انسان کی دنیاوی زندگی کا نباتات کی زندگی سے تقابل پیش کیا گیا ہے اور بعض مفسرین نے اس زندگی کو چار مراحل میں تقسیم کر کے ان دونوں قسم کی زندگی کا تقابل بتایا ہے۔ مثلاً یہ کہ انسان اپنا بچپن کھیل کود میں گزار دیتا ہے۔ پھر جب اس پر جوانی آتی ہے تو اس کا محبوب مشغلہ اپنے آپ کو بن سنور کر پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ اگر وہ مرد ہے تو وہ عورتوں کی توجہ کا مرکز بنے اور عورت ہے تو مردوں کے لیے دلکشی کا باعث ہو۔ پھر جب اس عمر سے گزرتا ہے تو اس کو "ہچو ما دیگرے نیست" قسم کی چیز بننے کی خواہش لاحق ہوتی ہے اور آخری عمر میں اس کی ہوس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کی خوش حالی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی اولاد کے لیے جان کھپانا شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ اسے موت آلیتی ہے۔ نباتات کا بھی یہی حال ہے۔ پیدا ہوتی ہے اپنے کسانوں یا مالکوں کو خوش کرتی ہے اور ان کی کئی توقعات اس سے وابستہ ہوتی ہیں۔ پھر اس پر جوانی کا دور آتا ہے تو ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس پر بڑھاپا آجاتا ہے اور وہ زرد پڑنے لگتی ہے۔ اور انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ جانوروں کی خوراک بنتا ہے باقی پاؤں تلے روندا جاتا ہے اور اس مثال سے سمجھانا یہ مقصود ہے کہ جیسے نباتات کی بہار بھی عارضی چیز ہے اور خزاں بھی۔ اسی طرح انسان کی زندگی کی خوشحالیاں بھی عارضی چیزیں ہیں اور تنگدستی اور مصائب بھی۔ اس کے مقابلہ میں جنت کی بہار اور اس کی تمام تر نعمتیں بھی دائمی اور مستقل ہیں اور اس کی خزاں یعنی جہنم اور اس کا عذاب مصیبتیں بھی دائمی اور مستقل ہیں۔ لہٰذا انسان کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ عارضی اور ناپائیدار چیزوں کے حصول کے بجائے دائمی اور مستقل چیزوں کو اپنا مطمح نظر بنائے اور انہیں کے لیے تمام تر تگ و دو کرے۔ اور جو شخص دنیا کی دلکشیوں میں کھو گیا اور اس کی بہار پر مست ہو گیا وہ بہت بڑے دھوکے میں پڑ گیا۔ اصل دانشمندی یہ ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی کو محض کھیل کود سمجھنے کی بجائے اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی سمجھے اور اپنی عاقبت کو سنوارنے کی کوشش کرے۔

[۳۶] جنت کی وسعت:۔ یہاں یہ فرمایا کہ جنت کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کے برابر ہے اور سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۳ میں فرمایا کہ جنت کا عرض تمام آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہے۔ حالانکہ ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک بھی لاکھوں میل کا فاصلہ ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں جنت کا رقبہ بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ محاورتاً استعمال ہوئے ہیں اور اس سے مقصود صرف جنت کی وسعت کا تصور دلانا ہے۔ جو یہ ہے کہ زمین و آسمان کو تو تم دیکھ ہی رہے ہو جنت ان سب آسمانوں اور زمین سے

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَ

یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا[۳۷] ہے۔(۲۱) کوئی بھی مصیبت جو زمین میں آتی ہے یا خود تمہارے نفوس کو پہنچتی ہے، وہ ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہی ایک کتاب[۳۸] میں لکھی ہوئی ہے (اور) یہ بات بلاشبہ اللہ کے لئے آسان[۳۹] کام ہے۔(۲۲) یہ اس لئے کہ جو کچھ تمہیں نہ مل سکے اس پر تم غم نہ کیا کرو اور جو کچھ اللہ تمہیں دے دے

بھی بہت بڑی ہوگی۔ لہٰذا تم دنیا کے بجائے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو تمہارے گناہ اور لغزشیں بھی اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا اور اتنی وسیع و عریض جنت بھی عطا فرمائے گا۔ رہی یہ بات ہے کہ جس جنت کی وسعت یہاں بیان ہو رہی ہے یہ سب اہل جنت کا حق ہوگا یا ہر جنتی کو اتنی وسیع و عریض جنت ملے گی؟ تو استقصاء سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر جنتی کی ایک مخصوص رہائش گاہ ہوگی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کی رات کو جنت میں سیدنا عمرؓ کا محل دیکھا تھا۔ البتہ سیر و تفریح کے لحاظ سے ہر جنتی اتنی وسیع و عریض جنت میں جہاں چاہے گا جا سکے گا۔ اور اس آمد و رفت میں اسے کوئی مشکل حائل نہ ہوگی نہ ہی اسے گاڑیوں یا جہازوں کی ضرورت پیش آئے گی۔

[۳۷] جنت صرف اللہ کی مہربانی سے ملے گی:۔ یہ مضمون پہلے بھی متعدد مقامات پر گزر چکا ہے کہ جنت کسی شخص کو اس کے اعمال کے بدلہ کے طور پر نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل و کرم سے ملے گی۔ اعمال صالحہ کا بدلہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے دوزخ کے عذاب سے بچا لیا جائے اور یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کسی شخص کو اس کا عمل بہشت میں نہیں لے جا سکتا؟" صحابہ کرام نے عرض کیا "یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا آپ کے اعمال بھی آپ کو بہشت میں نہیں لے جا سکیں گے۔ فرمایا: "ہاں میرے اعمال بھی مجھے بہشت میں نہیں لے جا سکیں گے الا یہ کہ اللہ اپنے فضل اور اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے" (بخاری۔ کتاب المرضیٰ۔ باب تمنی المریض الموت)

[۳۸] جن حالات میں یہ سورت نازل ہوئی وہ مخلص مسلمانوں کے لیے بڑے صبر آزما تھے۔ چار قسم کے دشمن مسلمانوں کی نوزائیدہ ریاست کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلے بیٹھے تھے ایک قریش مکہ، دوسرے مدینہ کے اردگرد کے مشرک قبائل۔ تیسرے یہود مدینہ اور چوتھے منافقین جو ہر دشمن اسلام قوت سے اندرونی ساز باز رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے مار آستین بنے ہوئے تھے ان حالات میں جو ذہنی اور ظاہری پریشانیاں مسلمانوں کو لاحق ہو سکتی تھیں۔ ان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ہم تمہاری ان مشکلات و مصائب سے بے خبر ہیں۔ بلکہ زمین میں جو بھی حادثہ پیش آتا ہے یا تمہیں کسی قسم کی تکلیف پہنچتی ہے اسے ہم اس کے وقوع سے پہلے سے ہی جانتے ہیں کیونکہ نوشتہ تقدیر میں یہ سب کچھ لکھا ہوا موجود ہے۔ اور تمہیں ایسے حالات سے گزارنا اس لیے ضروری تھا کہ مومنوں اور منافقوں کا امتیاز کھل کر سامنے آجائے۔ عنقریب اسلام کو غلبہ حاصل ہونے والا ہے۔ اور تمہاری امت کو تمام دنیا کی قیادت کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا منافقوں کو چھانٹ کر الگ کر دینا ضروری تھا کہ وہ بھی اپنے آپ کو اس قیادت کے حقدار اور حصہ دار نہ سمجھ بیٹھیں اور ان کی صحیح قدر و قیمت انہیں خود بھی اور دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے۔

[۳۹] اس آیت کی تشریح کے لیے سورہ اعراف کی آیت نمبر ۳۴ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

لَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ﴿٢٣﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٤﴾ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ

اس پر[٤٠] اترایا نہ کرو اور اللہ کسی بھی خود پسند اور فخر کرنے والے کو[٤١] پسند نہیں کرتا۔(٢٣) جو خود بھی بخل کرتے اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو منہ موڑے تو اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اور وہ اپنی ذات میں محمود ہے۔(٢٤)

بلاشبہ ہم نے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور لوہا (بھی)[٤٢] نازل کیا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے اور بھی فائدے ہیں

[٤٠] ❁ **مسئلہ تقدیر کی مصلحت:۔** تقدیر کے اس مسئلے سے تمہیں اس لیے مطلع کرنا ضروری ہے کہ تمہیں جو بھی دکھ پہنچتا ہے وہ اللہ کے علم میں ہوتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ لہٰذا ایسے حالات میں تمہیں صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے اور اگر نقصان ہو جائے تو اس کا غم نہ کرنا چاہئے۔ اور جب کوئی بھلائی پہنچے تو بھی تمہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تمہاری اپنی حسن تدبیر یا تمہارے فعل کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اللہ نے اسے تمہارے لئے مقدر کر رکھا تھا۔ لہٰذا تمہیں اس پر اترانے، پھولنے یا شیخیاں بگھارنے کے بجائے اللہ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ واضح رہے کہ بعض لوگ اپنی غلطیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے تقدیر کا بہانہ بناتے اور اس کا مفہوم اس مصلحت کے بالکل برعکس بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ اور اپنے آپ کو تقدیر کے سامنے مجبور محض ظاہر کر کے بہانہ جوئی سے کام لیتے ہیں۔ ان کی اس بہانہ جوئی کا جواب پہلے کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔

[٤١] ❁ **مال کے فتنہ ہونے کے مختلف پہلو:۔** کسی دنیادار انسان کو مال و دولت مل جائے تو مال کی کثرت اس میں دو خاصیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ ایک یہ کہ اسے دولت کا نشہ چڑھ جاتا ہے اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہتا اور وہ اپنے آپ کو کوئی بلند تر چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور دوسری یہ کہ مال جوں جوں زیادہ ہوتا ہے تو مزید مال جمع کرنے کی ہوس اس میں اور بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ ننانوے کے چکر میں پڑ جاتا ہے اور بالخصوص اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کی جان نکل جاتی ہے۔ ہاں نام و نمود کی بات ہو تو ایسے لوگ خرچ بھی کرتے ہیں اور شیخیاں بھی بگھارتے ہیں اور اپنے اس عمل کو خوب تر سمجھتے اور دوسروں کو یہی کچھ سکھاتے اور کرنے کو کہتے ہیں۔ منافقوں میں جو لوگ مالدار تھے وہ انہیں دونوں امراض میں مبتلا تھے۔ مال کے نشہ میں مست اور جہاد کے لیے خرچ کرنے کو اپنے مال کا ضیاع تصور کرتے تھے۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اگر تم ان باتوں سے باز نہ آئے تو اس کا نقصان تمہیں کو ہو گا تمہارے مال خرچ کرنے سے اللہ کو تو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ تمہارے بخل کرنے سے اس کا کچھ نقصان ہو جاتا ہے۔ البتہ تمہاری بہتری اسی بات میں ہے کہ تم ایسی باتوں سے باز آ جاؤ۔

[٤٢] ❁ **فتنہ و فساد کی روک تھام، دین کے غلبہ اور نظام عدل کے قیام کیلئے تین چیزوں کی ضرورت قوانین الٰہیہ میزان اور قوت نافذہ:۔**

ع ۱۹

لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا
نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور اس لئے بھی کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ اسے دیکھے بغیر کون اس کی [۴۳] اور اس کے رسول کی مدد کرتا ہے اور اللہ بڑا طاقتور ہے اور زبردست ہے۔(۲۵)

ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کو (رسول بنا کر) بھیجا۔ اور نبوت اور کتاب انہی دونوں کی اولاد میں رکھ دی۔ پھر ان میں کچھ تو راہِ راست پر رہے اور اکثر لوگ نافرمان [۴۴] ہی تھے(۲۶)

دنیا میں فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے تین باتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس آیت میں بیان کر دی گئی ہیں۔ واضح نشانوں سے مراد ایسے دلائل ہیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی یہ رسول برحق اور اس پر نازل شدہ کتاب واقعی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے اور واضح نشانات بھی اسی کتاب میں مذکور و موجود ہیں۔ یعنی اس کتاب میں پرامن زندگی، فتنہ و فساد کی روک تھام اور اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے قوانین بیان کیے ہیں۔ میزان سے مراد ماپ تول کے پیمانے بھی ہیں۔ تاکہ لوگوں کو ان کے حقوق پورے پورے ادا کیے جائیں اور نظام عدل کو قائم کرنے کے تقاضے اور ہدایات بھی جو کتاب و سنت میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ اور لوہا سے مراد ڈنڈا یا طاقت اور قوت نافذہ بھی ہے جو عدالتوں کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ جو لوگ لاتوں کے بھوت ہوں وہ باتوں سے کبھی نہیں مانتے اور جنگی یا سیاسی قوت اور سامان جنگ بھی جو بالعموم لوہے سے ہی تیار کیا جاتا ہے جیسے توپ و تفنگ، تیر، تلوار، میزائل، بندوقیں، رائفلیں، اور کلاشنکوفیں وغیرہ۔ تاکہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے جو اسلام کے نفاذ کی راہ میں حائل ہوں۔ ربطِ مضمون کے لحاظ سے لوہا سے مراد اسلحہ اور جنگی قوت لینا ہی زیادہ مناسب ہے۔ یہ تینوں چیزیں ہر رسول کو عطا کی گئیں جو کہ نظامِ عدل کے قیام اور اللہ کے دین کے نفاذ اور فتنہ و فساد کے قلع قمع کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

[۴۳] لوہا اگرچہ زمین کے اندر کانوں سے نکلتا ہے۔ تاہم اسے نازل کرنے سے تعبیر کیا جیسا کہ میزان کو نازل کرنے سے تعبیر کیا۔ اس سے مراد ان چیزوں کو پیدا کرنا اور وجود میں لانا اور اجمالاً تمام اشیاء ہی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں۔ اور لوہے یا جنگی قوت کے استعمال کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس سے فتنہ و فساد کو روکا جاسکتا ہے۔ اور ضمنی فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں چیزوں کے حصول اور استعمال سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون اللہ کے دین کے نفاذ کی خاطر پیش قدمی کرتا ہے اور کون اس سے پہلو تہی کرتا ہے۔ ورنہ اللہ تو اتنا طاقتور اور غالب ہے کہ وہ اور بھی کئی طریقوں سے اپنا دین نافذ کر سکتا ہے۔ مگر جہاد سے اصل مقصود تو لوگوں کا امتحان ہے۔

[۴۴] نبوت کا ضابطہ:۔ نبوت کا ضابطہ یہ ہے کہ انسان کی پیدائش سے پیشتر یہ جنوں میں جاری تھی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ لہٰذا آدم کی پیدائش پر یہ انسانوں میں منتقل ہو گئی اور پہلے نبی خود سیدنا آدم تھے۔ بعد میں یہ سلسلہ صرف نوح کی اولاد میں محدود کر دیا گیا۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد انہی کی اولاد سے مختص ہو گیا۔ بعد میں جتنے بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے سب سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہی کی اولاد سے تھے۔ تمام انبیاء اپنی اولاد اور اپنی امت کو کفر و شرک اور افتراق و انتشار سے بچنے کی

ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَ اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ ۙ۬ وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِیَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ

پھر ان دونوں کے بعد ہم نے لگاتار کئی رسول بھیجے۔ اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور اسے انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے عیسیٰ کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے نرم دلی اور رحم ڈال [۴۵] دیا۔ اور ترکِ دنیا [۴۶] جو انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی [۴۷]، ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔ مگر اللہ کی رضا حاصل کرنے [۴۸] کی خاطر

تاکید کرتے رہے مگر تھوڑے ہی لوگ ایسے تھے جنہوں نے انبیاء کی وصیت اور نصیحت کو قبول کیا۔ ورنہ لوگوں کی اکثریت کفرو شرک میں ہی مبتلا ہو گئی اور امت واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیے۔

[۴۵] رأفۃ کا لغوی مفہوم:۔ رأفۃ کا معنی ہے کسی کو تکلیف میں دیکھ کر دل پسیج جانا، دل بھر آنا۔ رقیق القلب ہونا، رقت طاری ہو جانا اور رحمت کے معنی اس تکلیف کو دور کرنے میں مدد کرنا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام چونکہ خود رقیق القلب اور نرم دل تھے۔ ساری عمر نرم برتاؤ اور ایک دوسرے سے پیار و محبت سے رہنے کا سبق دیتے رہے لہٰذا آپ کی امت یعنی نصاریٰ میں بھی دو صفات سرایت کر گئی تھیں۔

[۴۶] رھبانیت کا مفہوم:۔ رَهْبَانِیَّةً. راھب ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں اضطراب اور احتیاط بھی شامل ہو۔ (ضد رغب) اور یہ خوف وقتی اور عارضی قسم کا نہ ہو بلکہ طویل اور مسلسل ہو۔ اور رھبانیت یا رہبانیت بمعنی مسلک خوف زدگی۔ یعنی کسی طویل اور مسلسل بے چینی رکھنے والے خوف کی وجہ سے لذات دنیا کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لینا۔ آبادی سے باہر کسی جنگل وغیرہ میں کٹیا یا جھونپڑی ڈال کر عبادتِ الٰہی یا گیان دھیان میں معروف ہو جانا۔ اور راہب بمعنی گوشہ نشین، درویش، بھکشو، جمع رہبان۔ اب سوال یہ ہے کہ ان نصاریٰ نے کس بات کے خوف سے ڈر کر یہ مسلک اختیار کیا تھا؟ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ بے دین بادشاہوں سے ڈر کر ان لوگوں نے اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ راہ نکالی تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جب عقیدہ تثلیث سرکاری مذہب بن گیا اور اس عقیدہ کو تسلیم نہ کرنے والوں پر سختیاں ہونے لگیں تو یہ لوگ چونکہ موحد تھے اس لیے انہوں نے یہ راستہ اختیار کر لیا تاکہ لوگوں کے مظالم سے بچ سکیں۔ ممکن ہے یہ باتیں بھی کسی حد تک درست ہوں تاہم اس رہبانیت کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ اس لیے اگر مفسرین کے ان اقوال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو رہبانیت کا وجود صرف نصاریٰ تک ہی محدود رہنا چاہیے تھا۔ حالانکہ یہ مسلک نصاریٰ کے علاوہ یہود، مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں وغیرہ سب میں پایا جاتا ہے اور اسے ایک آفاقی مذہب سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں میں یہ مذہب دین طریقت کے نام سے موسوم ہے۔

[۴۷] رھبانیت ایک بدعت ہے:۔ اس جملہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ نصاریٰ نے یہ ایک بدعت ایجاد کر لی تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا مسلک اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور دوسری یہ کہ چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی بنیادی تعلیم ایک ہی جیسی رہی ہے۔ لہٰذا رہبانیت کی کسی دین میں بھی گنجائش نہیں۔ اور یہ بدعت ہی شمار ہو گی۔ ضمناً اس سے بدعت کی تعریف بھی معلوم ہو گئی۔ یعنی بدعت ہر وہ کام ہے جسے دینی اور ثواب کا کام سمجھ کر دین میں شامل کر لیا جائے جبکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہ ہو۔

[۴۸] بدعت ہمیشہ نیکی کا کام سمجھ کر شروع کی جاتی ہے:۔ اس جملہ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ ہم نے ان پر ایسے کام فرض

اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

انہوں نے ایسا کر تو لیا مگر اسے نباہ نہ سکے جیسا کہ اسے نباہنے [۴۹] کا حق تھا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے ہم نے ان کا اجر انہیں دے دیا مگر ان میں سے زیادہ تر نافرمان [۵۰] ہی تھے۔(۲۷)

کیے تھے جن سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو اور یہ کام ایسا نہ تھا جو انہوں نے شروع کر دیا اور دوسرا یہ کہ انہوں نے یہ مسلک بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ہی ایجاد کر لیا تھا۔ واضح رہے کہ جتنے بھی بدعی کام شروع کیے جاتے رہے ہیں وہ ہمیشہ نیک آرزوؤں اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر ہی شروع کئے جاتے رہے ہیں اور یہی شیطان کا فریب ہوتا ہے جسے اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

[۴۹] ❁ دین طریقت اور چہار ترک:۔ جس مسلک کے اختیار کرنے والوں نے اپنے لیے جو ضابطے مقرر کیے تھے اور جو پابندیاں اپنے آپ پر لگائی تھیں انہیں وہ خود بھی نبھا نہ سکے۔ کیونکہ وہ پابندیاں انسان کی فطرت کے خلاف تھیں۔ ان پابندیوں کو وہ مختصر الفاظ میں چہار ترک (چار قسم کی چیزوں کو چھوڑ دینا) کا نام دیتے ہیں۔ (۱) ترکِ دنیا یعنی دنیا کی تمام تر لذات کو چھوڑ دینا، (۲) ترک عقبیٰ یعنی آخرت کی جزا و سزا سے بے نیاز ہو جانا، (۳) ترک اکل و نوم۔ یعنی کھانا، پینا چھوڑ دینا یا کم سے کم کھانا اسی طرح نیند یا آرام کرنا بھی چھوڑ دینا، اور (۴) ترک خواہش نفس۔ یعنی جو کچھ انسان کا جی چاہے اس کے برعکس کام کرنا۔

❁ مختلف طریقوں سے جسم کی تعذیب:۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ روحانیت کے راستے میں حائل سنگ گراں ہمارا مادی جسم ہے۔ لہٰذا اس جسم کو مضمحل اور کمزور بنانے کے لیے طرح طرح کے عذاب دیے جانے لگے۔ کم سے کم کھانا پینا جس سے صرف روح اور جسم کا تعلق باقی رہ سکے۔ کم سے کم سونا۔ دنیوی لذات جن سے فائدہ اٹھانے کا اللہ تعالیٰ نے انہیں حق دیا تھا، اس سے کنارہ کشی کرنا، شدید سردی میں ننگے بدن باہر رات گزارنا، کہیں شدید گرمی میں کسی ایک ہی جگہ کھڑے رہنا، چپ کا روزہ رکھنا، کیچڑ میں پڑے رہنا اور اس طرح کی کئی دوسری صورتیں انہوں نے ایجاد کر لی تھی۔ گویا اپنی جان سے دشمنی ان کا پہلا اصول تھا۔ لہٰذا جسم کی تعذیب اور ان کے تقاضوں کی تکذیب کے ذریعہ وہ اپنے جسم کو تحلیل کرنے میں مصروف ہو گئے۔

❁ اقرباء سے پرہیز:۔ ان کا دوسرا اقدام دنیا والوں سے قطع تعلق تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ان کے رشتہ دار اور دوسرے معاشرتی تعلقات رکھنے والے دوست احباب بھی اس راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ دنیوی علائق میں سے ان کو سب سے زیادہ دشمنی عورت سے تھی۔ تاریخ میں ہمیں ایسے دلدوز واقعات بھی ملتے ہیں کہ کوئی ماں ماری ماں اپنے ایسے ہی بیٹوں کو جنگل میں دیکھنے گئی لیکن ان راہبوں نے اپنی ماں سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ انہیں صرف ایک نظر دیکھنے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے ترستی اور التجائیں کرتی رہی لیکن ان سنگ دل راہبوں نے اس کی التجا کو ذرہ بھر وقعت نہ دی اور اسے ناکام واپس آنا پڑا۔

❁ واقعہ جریج:۔ ایسے ہی ایک راہب ابن جریج کا واقعہ بخاری اور مسلم میں مذکور ہے۔ ابن جریج نے جنگل میں کٹیا بنا رکھی تھی۔ ماتا ماری ماں اسے ملنے آئی اور اسے پکارا۔ وہ عبادت میں مصروف تھا۔ ماں کی آواز سن کر اور اسے پہچان کر بھی وہ اپنی عبادت میں مصروف رہا اور ماں کی پکار کو کوئی اہمیت نہ دی۔ دوسرے دن پھر اس کی ماں آئی۔ پھر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ تیسرے دن پھر ایسا

ہی واقعہ ہوا تو ماں کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے منہ سے اپنے اس درویش بیٹے کے حق میں بے اختیار یہ بددعا نکل گئی کہ الٰہی جب تک میرا یہ بیٹا کسی فاحشہ عورت کا منہ نہ دیکھ لے اسے موت نہ آئے۔ دکھیاری ماں کے منہ سے نکلی ہوئی بددعا بھلا رائیگاں کب جاسکتی تھی؟ ابن جریج اپنی عبادت اور خدا ترسی میں اتنا مشہور تھا کہ بنی اسرائیل کے اکثر لوگ اس سے حسد کرنے لگے تھے اور چاہتے تھے کہ ابن جریج پر کوئی ایسا الزام لگے جس سے اس کا یہ بلند مقام چھن جائے۔ اور اسی مقصد سے خفیہ مشورے بھی ہونے لگے۔ ایک بدنام زمانہ فاحشہ عورت نے، جو حسن و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی، اس خدمت کو سرانجام دینے کا ذمہ لیا اور اسی غرض سے اپنے آپ کو ابن جریج پر پیش کر دیا۔ جسے ابن جریج نے رد کر دیا۔ اس پر یہ اپنے حسن و جمال پر ناز کرنے والی عورت سیخ پا ہو گئی اور اس بے اعتنائی اور ہتک کا انتقام لینے پر اتر آئی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک چرواہے پر پیش کیا جس سے اسے حمل ہو گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ حمل ابن جریج راہب سے ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگ دوڑے آئے اور بلا تامل ابن جریج کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور اس کی کٹیا کو منہدم کر دیا ابن جریج نے وجہ پوچھی تو لوگوں نے سارا ماجرا بتا دیا ابن جریج کہنے لگے۔ تھوڑی دیر ٹھہرو۔ لوگ رک گئے تو اس نے وضو کیا اور عبادت میں مشغول ہوا اور اللہ سے بصد گریہ وزاری اپنی بریت کی دعا کی۔ ماں کی بددعا تو قبول ہو ہی چکی تھی۔ اب اللہ نے اس پر رحم فرما کر اس کی بھی دعا قبول فرمالی۔ پھر جب وہ لوگوں کے پاس آیا تو وہ فاحشہ عورت بمعہ بچہ وہاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ ابن جریج نے اس بچہ کے پیٹ میں کچوکا دے کر پوچھا کہ بتا تیرا باپ کون ہے؟ بچہ قدرت الٰہی سے بول اٹھا: "فلاں چرواہا" تب جا کر لوگوں نے ابن جریج کا پیچھا چھوڑا۔ ان میں سے بعض اس سے معافی مانگنے لگے اور کہنے لگے: اگر کہو تو تمہیں سونے کی کٹیا بنادیں۔ لیکن ابن جریج نے کہا: بس مجھے ویسی ہی مٹی کی کٹیا بنادو (مسلم۔ کتاب البر والصلة، باب تقدیم بر الوالدین)

۞ ماں کی گود میں کلام کرنے والے بچے:۔ اس طویل حدیث میں ان تین بچوں کا ذکر ہے جنہوں نے ماں کی گود میں کلام کیا۔ ایک سیدنا عیسیٰ علیہ السلام، دوسرے یہی ابن جریج سے منسوب بچہ اور اسی طرح ایک تیسرے بچے کا ذکر ہے۔ امام مسلم نے اس حدیث کو "والدین سے حسن سلوک" کے باب میں ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ شرعی احکام کے مقابلہ میں ایسی رہبانیت گناہ کبیرہ ہے حدیث میں اس مذکورہ واقعہ سے اس دور کے طریق رہبانیت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

۞ نکاح سے پرہیز:۔ بیوی کا معاملہ اس سے بھی زیادہ نازک تھا کیونکہ نکاح اور اولاد سے انسان پر بہت سی معاشی اور معاشرتی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ متاہل زندگی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ گو اللہ نے انہیں ایسی رہبانیت کا حکم نہیں دیا تھا، تاہم انہیں اس کے جواز کے کچھ اشارے ضرور مل گئے۔ مثلاً سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ۳۳ سالہ زندگی تبلیغ کے سلسلہ میں گھوم پھر کر ہی گزار دی اور نکاح نہیں کیا۔

۞ عورتوں کا کنوارا رہنا اور بدکاری کو فروغ:۔ پھر عیسائیوں میں نکاح ثانی کی بھی گنجائش نہ تھی۔ پھر جس طرح ان راہبوں نے یہ مسلک اختیار کیا تھا کئی عورتوں نے بھی یہ سلسلہ اختیار کر لیا تھا اور ان کی الگ خانقاہیں قائم ہو گئیں اور انہوں نے ساری عمر کنواری رہنے کا عہد کر رکھا تھا مگر چونکہ یہ سب کام شریعت الٰہی کے خلاف اور فطرت کے خلاف تھے لہٰذا جلد ہی ایسی خانقاہیں بدکاری کے اڈوں میں تبدیل ہو گئیں۔ کئی حرامی بچے پیدا ہوتے ہی مار دیے جاتے اور جو بچ جاتے انہیں کسی گرجا کی نذر کر دیا جاتا

تھا رہبانیت کی خرابی کا یہ صرف ایک پہلو ہے اور جو خرابیاں اس مسلک سے عام معاشرہ میں پیدا ہوئیں وہ یہ ہیں۔
۱۔ معاشرہ میں جو خداترس لوگ تھے وہ اپنی اس غلط روش کی بنا پر معاشرتی ذمہ داریوں اور دوسرے انسانی تعلقات سے ایک طرف ہو گئے جس سے اخلاق و تمدن، سیاست اور اجتماعیت کی جڑیں تک ہل گئیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت عیار اور ناخداترس لوگوں نے سنبھال لی۔ دنیا میں "فساد فی الارض" کا دور دورہ ہو گیا اور اللہ کے بھیجے ہوئے پیغام ہدایت اور ضابطہ حیات کی انہی بزرگان دین کے ہاتھوں بیخ کنی ہوئی۔
رہبانیت کے معاشرہ پر ناخوشگوار اثرات:۔ ۲۔ راہبوں کی اس روش کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ دین اور دنیا دو الگ چیزیں ہیں۔ دین یا مذہب تو محض پوجا پاٹ اور گیان دھیان کا نام ہے اور مذہب کا تعلق بس اسی حد تک ہے۔ رہا دنیا کا کاروبار تو اس میں ہر شخص آزاد ہے۔ معاشرتی تعلقات یا ضابطہ اخلاق کی اگر کچھ اہمیت ہوتی تو یہ خدا رسیدہ لوگ اس سے کیوں منہ موڑ لیتے۔ پھر چونکہ ان راہبوں کی روش شریعت الٰہیہ کے برعکس تھی لہٰذا نتیجتاً مذہب کا شیرازہ پارہ پارہ ہو گیا۔
۳۔ اللہ کے حضور عبادت، عاجزی، تذلل اور زہد و تقویٰ صفات محمودہ ہیں لیکن ان راہبوں نے ان صفات میں اس قدر غلو کیا اور انکار ذات اور خود شکنی اتنے جوش سے کی کہ خودنگری اور خودشناسی جو قومی زندگی کے لیے روح رواں ہے ایک جرم سمجھا جانے لگا۔ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے تو اسے اشرف المخلوقات بنا کر باقی کائنات اس کے لیے مسخر کر دی تھی مگر وہ خود اس قدر بے اعتماد، افسردہ اور شکستہ دل ہو گیا کہ حیوانات بلکہ جمادات کو اپنے آپ پر ترجیح دینے لگا۔
۴۔ چوتھا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ میں باقی لوگ جن میں دینداری اور تقویٰ کے کچھ بھی اثرات پائے جاتے تھے، انہوں نے بھی ان راہبوں اور پیروں فقیروں کے آستانوں کا رخ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے لیے مخصوص عبادت گاہیں اور مسجدیں تو آہستہ آہستہ ویران ہونے لگیں اور خانقاہوں، مزاروں اور آستانوں کی رونق بڑھنے لگی۔
انہی گوناگوں مفاسد کے پیش نظر شریعت نے رہبانیت کو مذموم قرار دیا ہے اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیے:۔
۱۔ سیدنا انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اپنی جانوں پر سختی مت کرو کیونکہ ایک قوم نے اپنی جانوں پر سختی کی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر سختی کی (یعنی ان کا ایجاد کردہ معیار ہی ان کی جانچ کے لیے مقرر کر دیا) اس قوم کا بقایا گرجوں اور خانقاہوں میں ہے پھر آپ ﷺ نے یہی آیت پڑھی۔ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب الحسد)
شرعی لحاظ سے رہبانیت مذموم ہے:۔ ۲۔ سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "بلاشبہ دین آسان ہے کوئی شخص دین میں (اپنے آپ پر) سختی نہ کرے کہ وہ عمل اسے عاجز کر دے۔ اس پر عمل ٹھیک طرح بجالاؤ اور میانہ روی اختیار کرو اور خوش ہو جاؤ اور صبح و شام اور آخری رات کے کچھ حصہ میں اللہ سے مدد طلب کرتے رہو" (مشکوۃ، کتاب الصلوۃ۔ باب القصد فی العمل)
۳۔ سیدنا عبداللہ بن عمروؓ کے باپ نے ان کی بڑے شوق اور چاؤ سے شادی کی۔ لیکن انہوں نے اپنی بیوی سے کوئی دلچسپی نہ رکھی۔ رات عبادت میں گزار دیتے اور دن روزہ رکھ کر۔ ان کے اس رویہ سے ان کی بیوی بھی ملول تھی اور باپ بھی۔ آخر باپ

نے رسول اللہ ﷺ کو اس صورت حال سے مطلع کیا۔ عبداللہ بن عمرو خود بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے بلا کر فرمایا: ”مجھے خبر پہنچی ہے کہ تو روزے رکھے جاتا ہے اور افطار نہیں کرتا اور نماز پڑھے جاتا ہے ایسا کر کہ روزہ بھی رکھ اور افطار بھی کر، قیام بھی کر اور سو بھی۔ کیونکہ تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے، تیری جان کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی اور بال بچوں کا بھی تجھ پر حق ہے“ میں نے عرض کیا: ”مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اچھا پھر داؤد جیسا روزہ رکھ“ میں نے پوچھا: ”وہ کیا ہے؟ فرمایا: وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑ دیتے تھے اور دشمن کے مقابلہ میں بھاگتے نہیں تھے“ پھر آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا: ”جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اس نے روزہ نہیں رکھا“ (بخاری، کتاب الصوم، باب حق الاهل فی الصوم) یہ حدیث بخاری میں مختلف مقامات پر کئی طرح سے مذکور ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ ”تیرے بدن اور تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے“ (باب حق الضیف) کے الفاظ زیادہ ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن عمرو کو دائمی روزہ رکھنے سے منع فرمایا تو انہوں نے کہا، مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے، تو پہلے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا تم مہینہ میں تین روزے رکھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ دس گنا اجر دے گا تو یہ تمہارے پورے مہینہ کے روزے ہو جائیں گے“ سیدنا عبداللہ نے کہا کہ مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے“ تب آپ نے فرمایا: اچھا ایک دن روزہ رکھو اور دوسرے دن چھوڑ دو۔ بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو دائمی روزہ رکھے اس کا کوئی روزہ نہیں“

❁ رہبانیت سے متعلق چند احادیث اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا (۱) کہ مسلسل روزے رکھنا انسان کو اتنا نحیف بنا دیتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے قابل نہیں رہتا، (۲) اس حدیث سے رہبانیت یا تصوف کے کئی نظریات پر زد پڑتی ہے، ایک نفس کشی یا بدن کو نحیف و نزار بنانے پر اور دوسرے صوفیاء کے اس نظریہ پر کہ نفس سے جہاد، جہاد فی سبیل اللہ سے افضل ہے، (۳) ہر وہ عمل جو سنت کے خلاف ہو خواہ کتنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہو، مردود ہے۔

۳۔ سیدنا انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں کہ تین آدمی آپ ﷺ کی بیویوں کے گھر آئے (سیدنا علی، عبداللہ بن عمرو اور عثمان بن مظعون ؓ) اور آپ ﷺ کی عبادت کے بارے میں پوچھا۔ جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے گویا (آپ ﷺ کی اتنی عبادت کو) کم سمجھا اور کہنے لگے، ”کہاں ہم اور کہاں اللہ کے رسول ﷺ جن کے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف کئے جا چکے ہیں (یعنی ہمیں ان سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے) پھر ایک نے کہا: ”میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ نہ چھوڑوں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ اتنے میں آپ تشریف لے آئے، اور آپ ﷺ نے انہیں واپس بلا کر پوچھا کہ کیا تم لوگوں نے یہ اور یہ باتیں کی ہیں؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیزگار ہوں۔ اس کے باوجود میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو کوئی میری سنت کو ناپسند کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں“ (بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح)

اس حدیث میں مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔ (۱) مجرد زندگی گزارنا، معاشرتی زندگی سے گریز تاکہ یکسوئی سے عبادت کی جا سکے، بدن کو فاقوں مار کر تزکیہ نفس کرنا اور عبادت میں خواہ کیسی ہی افضل نہ ہو، سنت نبویؐ سے آگے بڑھنا۔ یہ سب باتیں سنت مطہرہ کے خلاف ہیں۔ اگر صرف یہی چیزیں رہبانیت سے نکال دی جائیں تو رہبانیت کی عمارت از خود زمین بوس ہو جاتی

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَءَامِنُوا۟ بِرَسُولِهِۦ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِۦ وَيَجْعَل لَّكُمْ
نُورًا تَمْشُونَ بِهِۦ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٨﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ ٱلْكِتَٰبِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ
شَىْءٍ مِّن فَضْلِ ٱللَّهِ ۙ وَأَنَّ ٱلْفَضْلَ بِيَدِ ٱللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ تمہیں اپنی رحمت سے دگنا اجر عطا کرے [۵۱] گا اور ایسا نور [۵۲] بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے اور تمہیں معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔(۲۸) تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھ [۵۳] بیٹھیں کہ مسلمان اللہ کے فضل کا کچھ بھی حصہ حاصل نہیں کر سکتے۔ حالانکہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔(۲۹)

ہے۔(۲) آپؐ نے سنت کی آخری حد سے مطلع فرمادیا۔ اب جو شخص زہد، تقویٰ اور عبادت کے میدان میں آپ کی مقررہ حدود سے آگے نکلے گا تو وہ بدعت، ضلالت اور کفر ہی ہوگا اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بدعت ہمیشہ نیک ارادوں اور ثواب کی نیت سے ہی شروع کی جاتی ہے۔(۳) سنت کا تارک گنہگار ہوتا ہے لیکن سنت سے زیادہ عمل کرنے والا جو شریعت کی حدود کو کم سمجھ کر اس میں اضافہ کر رہا ہے۔ وہ بدعتی، گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے۔ بعد میں جو لوگ اس بدعت پر عمل پیرا ہوں گے حصہ رسدی اس کا گناہ بدعت جاری کرنے والے کو بھی پہنچتا رہے گا۔

[۵۰] ان رہبانیت اختیار کرنے والوں میں سے بہت سے لوگ گناہ کی آلودگیوں میں ملوث ہو گئے۔ تھوڑے ہی تھے جو خالصتاً اللہ کی عبادت میں مشغول رہے ان کو ان کے نیک عمل کا اجر مل جائے گا۔

[۵۱] دوہرا اجر صرف ایمان والے اہل کتاب کے لئے ہی مختص نہیں: کتاب و سنت میں صراحت سے مذکور ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں گے۔ انہیں دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اجر اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور دوسرا نبی آخر الزمانؐ پر ایمان لانے کا۔ اب اہل کتاب میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے۔ وہ دوسرے مسلمانوں پر فخر کرنے لگے کہ ہمارے لئے دو اجر ہیں اور تمہارے لئے صرف ایک جس سے عام مسلمانوں میں کچھ احساس کمتری پیدا ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمانبردار بن جاؤ گے تو تمہیں بھی دوہرا اجر ملے گا۔ اللہ کے ہاں اجر کی کوئی کمی نہیں۔

[۵۲] نور سے مراد ایک تو وحی الٰہی اور علم شریعت کی روشنی ہے۔ ایماندار اسی روشنی میں اپنا طرز زندگی متعین کرتے اور اعمال صالحہ بجالاتے ہیں اور دوسرے وہ نور مراد ہے جو اعمال صالحہ کی بدولت مومنوں کو قیامت کے دن حاصل ہوگا جس کا ذکر اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۲ میں گزر چکا ہے۔

[۵۳] ﴿لِئَلَّا﴾ کا لفظ یہاں لکی لا کا معنی دے رہا ہے۔ یعنی ایمان لانے والے اہل کتاب یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ دوہرا اجر فقط انہیں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اللہ بڑا صاحب فضل ہے وہ چاہے تو دوسرے مسلمانوں کو بھی دوہرا اجر دے سکتا ہے اور وہ صاحب اختیار بھی ہے وہ اپنا فضل تقسیم کرنے میں کسی دوسرے کی خواہش کا پابند نہیں۔

۲۲ آیاتها سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ رکوعها ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ

کلمات ۴۷۹ آیات ۲۲ (۵۸) سورۃ المجادلہ مدنی ہے (۱۰۵) رکوع ۳ حروف ۲۱۰۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اللہ نے یقیناً اس عورت کی بات سن لی[1] ہے جو اپنے خاوند کے بارے میں (اے نبی) آپ سے جھگڑ رہی ہے اور اللہ کے حضور شکایت کر رہی ہے۔ اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے۔

[1] ظہار کے احکام کا پس منظر:۔ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب میاں بیوی میں لڑائی ہو جاتی تو خاوند غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو یوں کہہ دیتا کہ (أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي) یعنی تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ تو اسے دائمی طلاق سمجھا جاتا تھا۔ یہ صرف معمولی طلاق ہی نہ تھی بلکہ شدید قسم کی طلاق سمجھی جاتی تھی۔ جس کے بعد ان دونوں میاں بیوی کے مل بیٹھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہتی تھی۔ اس بے ہودہ رسم کے متعلق پہلے سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۴ میں مسلمانوں کو یہ تو بتایا جا چکا تھا کہ کسی کے ظہار کرنے یعنی اپنی بیوی کو ماں کی پیٹھ کی طرح کہہ دینے سے وہ اس کی ماں نہیں بن جاتی اور نہ ہی اللہ نے کوئی ایسا قانون بنایا ہے۔ مگر اس شرعی حکم کی کچھ تفصیل نہیں دی گئی تھی۔ اب یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک انصاری اوس بن صامت اور اس کی بیوی خولہ بنت ثعلبہ میں لڑائی جھگڑا ہوا تو اوس بن صامت نے غصہ میں آ کر یہی ظہار کے الفاظ کہہ دیئے۔ جس کا فریقین میں معروف مفہوم ابدی طلاق تھا۔ بعد میں زوجین کو سخت ندامت بھی ہوئی اور چونکہ اولاد بھی تھی لہٰذا اس اولاد کے مستقبل نے کئی خطرات سامنے لا کھڑے کئے۔ خولہ بنت ثعلبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور اس کا حکم پوچھا۔ لیکن چونکہ تاحال ظہار کا کوئی واضح حکم نازل نہ ہوا تھا اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تو اس پر حرام ہو گئی۔ اس پر خولہ آپ ﷺ سے کہنے لگی: یا رسول اللہ ﷺ! میرے خاوند نے طلاق کا لفظ تو نہیں بولا تھا۔ میں نے جوانی تو اس کے ہاں گزار دی۔ اب بڑھاپا کس کے پاس گزاروں گی۔ نیز میری اوس سے اولاد بھی ہے۔ اگر میں اس سے دستبردار ہو جاؤں تو اولاد بے توجہی کی نذر ہو جائے گی اور اگر اپنے پاس رکھوں تو ان کے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ ساتھ ہی ساتھ روتی بھی جاتی تھی اور یہ کہتی بھی جاتی تھی کہ مجھے کوئی بہتر صورت بتائیے۔ اور یہ بھی کہ اللہ میرے حق میں کوئی بہتر فیصلہ نازل فرمائے۔ اللہ نے اس کی فریاد سن لی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی یہ ابتدائی آیات نازل فرمائیں۔ یہ اسی خستہ حالی میں واپس جا رہی تھی کہ آپ ﷺ نے اسے واپس بلا کر یہ آیات سنا دیں۔ جن میں صرف اسی کے مسئلہ کا حل موجود نہ تھا۔ بلکہ اس عورت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لیے اس بد رسم کو مٹا کر تمام بنی نوع انسان پر رحمت فرما دی۔ چنانچہ صحابہ کرام کے دل میں اس عورت کی بہت قدر و منزلت ہو گئی۔ ایک دفعہ سیدنا عمرؓ اپنے دور خلافت میں کہیں جا رہے تھے کہ خولہ مذکورہ نے راستہ ہی میں آپ کو بلایا اور کچھ بات کہنے لگی۔ سیدنا

يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ① الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنكُم مِّن نِّسَائِهِم مَّا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ ۖ إِنْ
أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ②
وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا ۚ
ذَٰلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ③ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِن

بلا شبہ اللہ سب کچھ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے (۱) تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، وہ ان کی (فی الواقع) مائیں نہیں [۲] بن جاتیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا تھا اور جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ ایک ناپسندیدہ اور جھوٹی بات ہے۔ اور اللہ یقیناً معاف کرنے والا بخشنے والا ہے (۲) اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کرنا چاہیں تو میاں بیوی کے مل بیٹھنے سے پیشتر اسے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا تمہیں اسی بات کی نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۳) پھر اگر وہ غلام نہ پائے [۳] تو ایک دوسرے کو چھونے سے پہلے وہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے

عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر بڑی توجہ سے سننے لگے۔ کسی نے پوچھا کیا بات ہے آپ اس بڑھیا کی بات بڑی توجہ سے سن کر اسے اتنی اہمیت دے رہے ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ وہ عورت ہے جس کی بات اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سن لی تھی۔ عمر کی کیا مجال ہے کہ اس کی بات کی طرف توجہ نہ دے۔

[۲] ❁ ظہار سے نہ طلاق واقع ہوتی ہے اور نہ بیوی ماں بن سکتی ہے:۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف منہ سے کہنے پر بیوی ماں نہیں بن جاتی بلکہ بیوی ہی رہتی ہے۔ اس لیے کہ مائیں تو صرف وہ ہیں جنہوں نے تمہیں جنا ہے۔ اب جو تم انہیں ماں کہہ کر واقعی ماں سمجھ بیٹھتے ہو تو یہ ایک خلاف واقعہ، خلاف حقیقت اور جھوٹی بات ہے۔ جس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ اللہ نے تم پر بہت رحم فرما کر اس رسم کو ختم کر دیا ہے۔ اور آئندہ جو شخص ایسی باتوں سے باز رہے گا تو اس کے سابقہ گناہوں کو معاف بھی کر دینے والا ہے۔

[۳] ❁ ظہار کرنا گناہ کبیرہ ہے:۔ آیت نمبر ۳ اور ۴ میں ظہار کا کفارہ یا ایسے معاملات کا حل شرعی بتایا جا رہا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ظہار سے اگرچہ طلاق واقع نہیں ہو جاتی تاہم یہ ایک گناہ کبیرہ ہے۔ پھر کفارہ کے طور پر اس گناہ کی تین سزائیں بتا دیں۔ کہ ان میں سے جو سزا کسی کے حالات کے مطابق ہو وہ اسے دی جائے۔ ان کی ترتیب یہ ہے۔

❁ ظہار کا کفارہ:۔ (۱) ایک غلام آزاد کرنا، (۲) مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا یا (۳) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ ان آیات میں درج ذیل امور قابل ذکر ہیں۔

❁ ظہار سے متعلق احکام:۔ ۱۔ لڑائی جھگڑا زوجین کے درمیان ہوتا ہے لیکن ظہار کے لفظ خاوند بولتا ہے۔ اس لیے سزا صرف خاوند کے لئے ہے۔ بیوی کے لیے کوئی کفارہ یا سزا نہیں۔

۲۔ ان تمام سزاؤں کی نوعیت عبادات کی ہے۔ غلام آزاد کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا یہ مالی نفلی عبادتیں ہیں۔ اور روزے رکھنا بدنی عبادت، گویا کفارہ بھی عبادات کی شکل میں تجویز ہوا ہے۔ تاکہ انسان کے نفس میں پاکیزگی اور تقویٰ پیدا ہو۔ کفارہ میں حدی جرائم کی طرح کوئی بدنی سزا نہیں ہوتی۔

۳۔ یہ کفارہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے قول سے رجوع کرنا چاہے اور زوجین مل بیٹھنا چاہیں اور مرد رجوع نہ کرنا چاہے تو پھر سیدھی طرح طلاق دے دے۔ جو شرعی ہدایات کے مطابق ہو۔ ظہار تو بالکل بے ہودہ اور ہیرا پھیری کی بات ہے۔ اس سے توبہ کرے اور طلاق دے دے۔

۴۔ آج کل غلامی کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا آج اگر کوئی ظہار کرے تو کفارہ کی دوسری یا تیسری صورت سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہوگا۔

۵۔ یہ اختیار ظہار کرنے والے کے حالات کے مطابق ہوگا۔ مثلاً ایک امیر شخص نے ظہار کیا تو اس کے لیے دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کی سزا تجویز کی جائے گی۔ کیونکہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس کے لیے کوئی سزا نہیں۔ اسی طرح غریب کے لیے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا مشکل ہے۔ اور روزے رکھنے میں وہ کوئی سزا محسوس نہیں کرے گا۔

۶۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اگر کسی عذر شرعی مثلاً مرض یا ضروری سفر وغیرہ کی بنا پر روزوں کے تسلسل میں انقطاع واقع ہو جائے تو وہ انقطاع شمار نہ ہوگا۔ انقطاع اسی وقت شمار ہوگا جب وہ دیدہ دانستہ بغیر کسی عذر شرعی کے روزہ چھوڑ دے۔

۷۔ مسکینوں کو کھانا کھلانے سے مراد دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلانا یا اس کا ہم قیمت غلہ ہے۔ جو غلہ کی صورت میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی نقد قیمت کی صورت میں بھی۔

بعض علماء کے نزدیک ایک ہی مسکین کو ساٹھ دنوں کا غلہ یا اس کی قیمت ادا کرنے سے بھی کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس معاملہ میں شریعت نے کفارہ ادا کرنے والے کی سہولت کو ملحوظ رکھا ہے۔

۸۔ صحبت سے پہلے کفارہ کی ادائیگی لازمی ہے۔ ادائیگی سے قبل بیوی مرد پر حلال نہ ہوگی۔

۞ کفارہ دینے والے کے حالات ملحوظ رکھنا ضروری ہے:۔ اب خولہ بنت ثعلبہ کا قصہ یہ ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ نے اسے پڑھ کر سنائیں اور فرمایا کہ اپنے خاوند سے کہو کہ ایک غلام آزاد کرے۔ خولہ نے جواب دیا: یا رسول اللہ ﷺ وہ تو نادار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا: اس سے کہو: دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے۔ خولہ نے کہا: وہ تو بوڑھا ناتوان ہے۔ اسے یہ طاقت بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔ خولہ کہنے لگی۔ اسے تو اتنا بھی مقدور نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں ایک عرق (ایک پیمانہ) کھجوریں دے کر اس کی مدد کروں گا۔ اس پر خولہ نے کہا۔ میں بھی ایک وسق کھجور دے کر اس کی مدد کروں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بہت بہتر ہے۔ جا اپنے چچا کے بیٹے کے ساتھ سلوک کر۔ چنانچہ خولہ نے ایسا ہی کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تیسری صورت میں، نادار کفارہ دینے والے کی صدقہ وغیرہ کی صورت میں مدد بھی کی جا سکتی ہے اور کرنا چاہیے۔

قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ

اور جو اس بات کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ (حکم) اس لئے ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ضابطے ہیں اور انکار کرنے والوں [۴] کے لئے دردناک عذاب ہے (۴) بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت [۵] کرتے ہیں وہ اسی طرح ذلیل [۶] کیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل کیے جا چکے ہیں۔ اور ہم نے واضح احکام نازل کر دیئے ہیں اور انکار کرنے والوں کے لئے رسوا کن عذاب ہے (۵) جس دن اللہ ان سب کو زندہ کرکے اٹھائے گا تو انہیں بتا دے گا

[۴] ظہار کی آیات کن کن چیزوں پر ثبوت فراہم کرتی ہیں؟۔ یعنی اللہ کی حدود یا ضابطے یہ ہیں کہ ظہار سے طلاق واقع نہیں ہوتی، دوسرا یہ کہ ظہار کرنا کوئی ایسی معمولی بات نہیں جس پر کچھ بھی مواخذہ نہ ہو۔ بلکہ فی الواقع یہ ایک گناہ کا کام ہے۔ تیسرا یہ کہ اس گناہ کا ازالہ صرف کفارہ ادا کرنے سے ہو سکتا ہے۔ اور انکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کفارہ ادا کیے بغیر ہی اپنی بیوی سے صحبت شروع کر دے یا اللہ تعالیٰ کی اس وضاحت کے باوجود بھی اپنی بیوی سے صحبت کرنا حرام ہی سمجھتا رہے۔

واضح رہے کہ ان آیات سے مندرجہ ذیل باتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے (۱) اللہ تعالیٰ کے وجود پر اور اس کے بندوں کے حالات سے ہر وقت مطلع ہونے پر، (۲) رسول اللہ ﷺ کے اللہ کا رسول ہونے پر، (۳) قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے پر اور (۴) اس بات پر کہ تمام تر احکام الٰہی بندوں کے مصالح پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس قانون نے جہاں ایک طرف جاہلیت کے دستور کے مطابق جدائی سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو دور کر دیا، وہاں اس رواج کو ایسا بے لگام بھی نہیں چھوڑا کہ جو چاہے ظہار کرتا پھرے اور اس پر کوئی پابندی نہ ہو۔ بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرکے ہر حال میں بندوں کے مصالح کو ملحوظ رکھا۔

[۵] حاد کا لغوی مفہوم :۔ ﴿يُحَآدُّوْنَ﴾۔ حد النظر بمعنی تیز نظر سے گھورنا اور حادّ سے مراد ایسی مخالفت اور دشمنی ہے جس سے انسان غضب ناک ہو کر مقابلہ اور انتقام پر تل آئے۔ مخالفت کی ابتدائی شکل تو یہ ہے کہ انسان اللہ کا حکم تسلیم نہ کرے۔ دوسرا اقدام یہ ہے کہ انسان اللہ کے احکام کا مذاق اڑانا شروع کر دے اور تیسرا اقدام یہ ہے کہ اللہ کے قانون یا سزا یا تعزیر کے بجائے کوئی دوسری سزا یا تعزیر مقرر کر لے اور اللہ کے احکام کو نظر انداز کر دے۔ یا اس کی مخالفت میں آ کر شرعی احکام کو مصلحت پر مبنی ہونے کے بجائے اسے معاشرہ کے لیے نقصان دہ یا غیر مہذب ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ یہ سب صورتیں حادّ کے ضمن میں آتی ہیں۔

[۶] کَبَتَ کے معنی کسی کو غصہ کی حالت میں ذلیل و رسوا کرنا اور دھکے مار کر باہر نکال دینا اور ہلاک کرنا سب معنوں میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو قومیں اللہ کے احکام کی مخالفت پر اتر آئی تھیں۔ اللہ نے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا تھا۔ اور اگر اب تم وہی کام کرو گے تو تمہارا بھی ویسا ہی انجام ہوگا۔ دنیا میں تو ذلیل و رسوا ہو گے اور آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ بھی ذلیل و رسوا کرنے

بِمَا عَمِلُوْا اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿٦﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ
ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٧﴾

کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ اللہ نے اس کا پورا ریکارڈ رکھا ہے جبکہ وہ خود اسے بھول[۷] گئے اور اللہ ہر ایک چیز پر حاضر وناظر ہے(۶)

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں موجود ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں مشورہ ہو تو چوتھا وہ (اللہ) نہ ہو یا پانچ آدمیوں میں مشورہ ہو تو ان کا چھٹا وہ نہ ہو۔ (مشورہ کرنے والے) اس سے کم ہوں یا زیادہ، وہ یقیناً ان کے ساتھ[۸] ہوتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ پھر وہ قیامت کے دن انہیں بتا (بھی) دے گا جو کچھ وہ کرتے رہے۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔(۷)

والا ہوگا۔

[۷] دنیا میں انسان بے شمار ایسے گناہ کے کام کرتا ہے جنہیں وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لہٰذا وہ اسے یاد ہی نہیں رہتے۔ لیکن اللہ اور اس کے فرشتے ہر انسان کا ایسا مکمل ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ جس میں انسان کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کرتوت بھی درج ہونے سے رہ نہیں سکتی۔ قیامت کے دن اس کا یہی کچا چٹھا اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ تب اسے اپنی وہ سب کرتوتیں یاد آنے لگیں گی۔ جو اس کے دل ودماغ سے یکسر فراموش ہو چکی تھیں۔

[۸] ❁ مشورہ اور مشیروں کی تعداد اور جمہوریت پسند۔ اس آیت سے دراصل سمجھانا یہ مقصود ہے کہ انسان کسی وقت اور کسی حال میں بھی اللہ سے چھپ نہیں سکتا۔ اور اگر وہ کوئی بات کرے تو وہ اسے بھی سن رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کو گناہ کے کاموں اور گناہ کی باتوں سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہیے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین اور پانچ یعنی طاق اعداد کا ذکر کیا ہے۔ دو اور چار وغیرہ جفت اعداد کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ مشورہ طاق لوگوں سے لینا چاہیے۔ ایک سے تو مشورہ کیا یا لیا نہیں جا سکتا اور دو مشورہ کرنے والوں میں اگر اختلاف ہو جائے تو کچھ فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ اور اگر تین ہوں اور دو کی رائے ایک طرف ہو تو ان کی رائے ایک سے زیادہ معتبر ہوگی اور اس سے آگے انہوں نے کثرت رائے کے مطابق فیصلہ کے اصول کو درست ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ یہ دلیل کئی لحاظ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ نَجْوٰی کا معنی کانا پھوسی، سرگوشی اور راز کی باتیں ایک دوسرے کو کہنا یا بتانا ہوتا ہے۔ اور یہ لفظ اکثر برے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ الا یہ کہ کوئی قرینہ موجود ہو اور یہ کانا پھوسی دو آدمیوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ تین میں بھی اور چار میں بھی۔ دوسرے یہ کہ آیت کے الفاظ ﴿وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ﴾ ان لوگوں کی اس دلیل کو باطل کر دیتے ہیں۔ تین سے ادنیٰ دو ہے اور اکثر چار۔ پانچ سے ادنیٰ چار ہے اور اکثر چھ۔ علیٰ ہذا القیاس تیسرے یہ کہ صرف طاق اعداد کا ذکر اہل عرب کے رواج اور حسن کلام سے تعلق رکھتا ہے اس کا مشیروں کی تعداد سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اصحاب کہف کی تعداد کا ذکر فرمایا تو وہاں بھی تین، پانچ یا سات کا ہی ذکر فرمایا۔ حالانکہ

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ
مَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا
اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٨﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا

کیا آپ نے ان لوگوں [۹] کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشی کرنے سے روکا گیا تھا پھر وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے انہیں روکا گیا تھا۔ یہ لوگ چھپ چھپ کر گناہ، سرکشی اور رسول کی نافرمانی سے متعلق باتیں کرتے ہیں اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے طریقے سے سلام کہتے ہیں جس طرح اللہ نے آپ کو سلام نہیں کہا۔ اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ "جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر اللہ ہمیں سزا کیوں نہیں دیتا" ایسے لوگوں کو جہنم کافی ہے۔ جس میں یہ داخل ہوں گے۔ سو ان کا انجام کیسا برا ہے۔(۸) اے ایمان والو! جب تم سرگوشی کرو

وہاں کوئی ایسا معاملہ نہیں جو مشورہ سے تعلق رکھتا ہو۔

[۹] منافقوں کی سرگوشیاں:۔ ان لوگوں سے مراد مدینہ کے منافق ہیں۔ جو اپنے بعض معاملات کی خاطر مسلمان تو ہو گئے تھے۔ مگر ان کی سب ہمدردیاں کافروں کے ساتھ تھیں چاہے وہ یہود مدینہ ہوں یا قریش مکہ ہوں یا دوسرے عرب قبائل ہوں جو مشرک اور اسلام کے دشمن تھے۔ ان کی کئی قسم کی حرکات قابل گرفت تھیں جن سے مسلمانوں کو سخت کوفت ہوتی تھی۔ ایک یہ کہ وہ اسلام دشمن طاقتوں سے خفیہ روابط رکھتے تھے اور مسلمانوں کی نقل و حرکت یا ارادوں سے انہیں باخبر رکھتے تھے۔ دوسرے مسلمانوں کے خلاف اور اسلام کی قوت کو کمزور کرنے کے لیے آپس میں خفیہ مجلسیں کرتے تھے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ جہاں چند مسلمانوں کو دیکھا تو آپس میں کھسر پھسر اور کانا پھوسی ان کے سامنے ہی شروع کر دی۔ اور اس کا مقصد محض مسلمانوں کو ذہنی کوفت پہنچانا ہوتا تھا۔ اور تیسرا کام وہ یہ کرتے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو کسی مشورہ یا کام کے لیے بلاتے اور ایسی مجالس میں مسلمان کہلانے کے ناطے سے منافقوں کو بھی با دل ناخواستہ آنا پڑتا تھا۔ اس وقت وہ آپ کو زیر لب وہی سلام کہتے جو انہوں نے یہودیوں سے سیکھا تھا یعنی السلام علیك کے بجائے السام علیك کہا کرتے (یعنی تم پر موت آئے) جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

یہود اور منافقین کا آپ کو السام علیک کہنا:۔ "سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب یہودی تمہیں سلام کہتے ہیں تو سلام کے بجائے سام (یعنی موت) کہتے ہیں۔ تو ان کے جواب میں تم فقط و علیك کہہ دیا کرو ("اور تم پر بھی") (بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف یرد علی اهل الذمة السلام) سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ چند یہودی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا السام علیك۔ میں سمجھ گئی اور کہا علیکم السام و اللعنة (یعنی تم پر موت بھی آئے اور لعنت بھی) آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! ذرا ٹھہرو اللہ ہر کام میں نرمی کو پسند فرماتا ہے" میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ آپ نے سنا نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے سن کر ہی انہیں وعلیکم کہا تھا۔ (بخاری۔ کتاب الاستیذان۔ باب ایضاً)

پھر دل میں یہ بھی سوچتے یا آپس میں تبادلہ خیالات کرتے کہ اگر یہ واقعی اللہ کا رسول ہوتا تو اس کے حق میں ہماری اس بددعا کی

تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا

تو گناہ، سرکشی اور رسول کی نافرمانی سے متعلق سرگوشی نہ کیا کرو، بلکہ سرگوشی کرو تو نیکی[۱۰] اور تقویٰ کے متعلق کیا کرو۔ اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کے ہاں تم اکٹھے کئے جاؤ گے۔ (۹) بلاشبہ سرگوشی کرنا شیطان کا کام ہے تاکہ ان لوگوں کو غمزدہ بنادے جو ایمان لائے ہیں، حالانکہ اللہ کے اذن کے بغیر وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

پاداش میں ہم پر تباہی آچکی ہوتی۔ مگر چونکہ ہماری بددعا کے باوجود ہمارا آج تک کچھ بھی نہیں بگڑا تو ہم یہ کیسے سمجھیں کہ یہ واقعی سچا رسول ہے۔ اللہ نے منافقوں کی ان سب کارروائیوں سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا اور ان کی مذمت بھی بیان فرمائی۔ لیکن تباہی نازل نہیں کی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبری اور اضطراری ایمان کے لیے پیدا نہیں کیا۔ البتہ انہیں مرنے کے بعد ان کے برے انجام سے مطلع فرمایا۔

[۱۰] ❁ سرگوشی کی تین صورتیں اور ان کے احکام:۔ اس آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے جن میں منافقین بھی شامل ہیں۔ سرگوشی، کانا پھوسی اور کھسر پھسر سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور ان کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سرگوشی، بدنیتی، برے ارادوں یا کسی ناپاک سازش پر محمول ہو۔ جیسے منافق لوگ مسلمانوں کے خلاف سرگوشیاں کیا کرتے تھے۔ یہ شیطان کی انگیخت ہوتی ہے جیسا کہ اگلی آیت میں صراحت سے مذکور ہے۔ اور یہ بالاتفاق حرام ہے۔ دوسرے یہ کہ سرگوشی بھلائی اور نیکی پر محمول ہو مثلاً دو لڑنے والوں کے درمیان سمجھوتہ کے لیے سرگوشی کی جائے یا جیسے سیدنا یوسف علیہ السلام نے جب اپنے بھائی بن یمین کو اپنے ہاں روک لیا تھا تو باقی بھائیوں نے لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر بات چیت کی تھی۔ ایسی سرگوشی جائز ہی نہیں مستحسن ہے۔ بلکہ بعض اوقات واجب بھی ہو سکتی ہے۔ تیسرے ایسی سرگوشی جس کا تعلق صرف دو سرگوشی کرنے والوں سے ہی ہو دوسرے لوگوں سے نہ ہو۔ جیسے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے پیشتر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کی تھی۔ جس سے ایک بار تو وہ رونے لگیں اور دوسری دفعہ ہنس دیں۔ (بخاری۔ کتاب الاستیذان۔ باب من ناجی بین الناس......) ایسی سرگوشی جائز ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ سرگوشی کرنے کے بعد کچھ آداب ہیں جو درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتے ہیں۔

"سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب کہیں تم صرف تین آدمی ہوں تو دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر کانا پھوسی نہ کریں۔ اس سے اس کو رنج ہوگا۔ البتہ اگر اور بھی آدمی موجود ہوں تو پھر کوئی مضائقہ نہیں" (بخاری۔ کتاب الاستیذان۔ باب اذا کانوا اکثر من ثلثۃ ......) اور ان آداب کا اصل مدعا یہ ہے کہ کسی شخص کو رنج نہ پہنچے یا وہ کسی بدظنی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ یعنی:

۱۔ اگر صرف تین آدمی ہیں۔ تو دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر سرگوشی نہ کریں۔ ہاں اگر تیسرے سے اجازت لے لیں تو پھر وہ سرگوشی کر سکتے ہیں۔ اس طرح اس کی بدظنی کا امکان ختم ہو جائے گا۔

۲۔ اگر آدمی تین سے زیادہ ہوں تو دو آدمی کانا پھوسی کر سکتے ہیں۔ مگر ایسا نہ ہو کہ آدمی چار ہوں اور تین آدمی ایک کو چھوڑ کر کانا پھوسی میں مشغول ہو جائیں۔ وقس علی ھذا

بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور ایمان والوں کو تو اللہ پر ہی [۱۱] بھروسہ کرنا چاہیے۔(۱۰) اے ایمان والو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجلسوں [۱۲] میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھو اللہ تمہیں کشادگی [۱۳] بخشے گا۔ اور جب کہا جائے کہ اٹھ [۱۴] (کر چلے) جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں

۳۔ اگر آدمی زیادہ ہوں اور دو آدمی کانا پھوسی کرنے لگیں تو ان میں سے کوئی شخص مجلس میں بیٹھے ہوئے کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہ کرے اور نہ اسے دیکھے۔ جس سے مشار الیہ کے دل میں خواہ مخواہ بدظنی پیدا ہو جائے۔

❁ سرگوشی سے منافقوں کا مقصد:۔ غرض بدظنی پیدا کرنے اور رنج پہنچانے والی جتنی بھی صورتیں ممکن ہیں اس آیت کی رو سے سب حرام ہیں اور منافقوں کا تو کام ہی یہ ہوتا تھا کہ جہاں کہیں مسلمانوں کے ساتھ اکٹھ ہوتا تو ناپاک قسم کی کھسر پھسر شروع کر دیتے تھے۔ مثلاً جہاد پر روانگی کے وقت یہ کھسر پھسر شروع کر دیتے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جہاد پر روانگی والے ان مسلمانوں میں کوئی بھی بچ کر واپس نہ آئے گا۔ معلوم نہیں یہ لوگ کون سے سنہرے خواب دیکھ رہے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

[۱۱] منافقوں کی ان سرگوشیوں سے غرض ہی یہ ہوتی تھی کہ مسلمان رنجیدہ اور دلگیر ہوں اور گھبرا جائیں۔ اور یہ کام ان سے شیطان کرا رہا تھا۔ مگر مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ شیطان ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا اور نہ ہی اس کے یہ چیلے کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ نفع و نقصان تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے لہٰذا انہیں صرف اللہ پر اعتماد رکھنا چاہیے اور منافقوں کی ان ناپاک سرگوشیوں کی پروا تک نہ کرنی چاہیے۔ یہ اعتماد ان کے دل میں ایسی قوت پیدا کر دے گا کہ بہت سے فضول خطروں اور خیالی اندیشوں سے نجات مل جائے گی۔ انہیں چاہیے کہ منافقوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ غلط کار لوگوں کے مقابلے میں آپے سے باہر نہ ہوں اور اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیں۔

[۱۲] ❁ آدابِ مجلس:۔ کسی مجلس یا اجتماع میں دو یا چند آدمیوں کا الگ ہو کر کانا پھوسی کرنا بھی آداب مجلس کے خلاف ہے۔ اسی نسبت سے اس آیت میں چند مزید آداب مجلس کا خیال رکھنے کا مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص دوسرے کو اٹھا کر وہاں خود نہ بیٹھے۔ نیز فرمایا کہ (جب جگہ تنگ ہو تو) کھل کر نہ بیٹھو اور آنے والوں کو جگہ دو۔ (بخاری۔ کتاب الاستیذان۔ باب اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس)

۲۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو جمعہ کے دن اس کی جگہ سے اٹھا کر خود وہاں نہ بیٹھے بلکہ یوں کہے کہ پھیل جاؤ" (مسلم۔ کتاب السلام۔ باب من اتی مجلسا فوجد فرجۃ فیجلس......)

۳۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص جب (کسی ضرورت کے لیے) اپنی جگہ سے اٹھے پھر واپس آئے تو وہ اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے" (مسلم۔ کتاب السلام۔ باب اذا قام من مجلسہ ثم عاد الیہ فھو احق بہ)

[۱۳] یعنی اللہ تمہاری دلی کی تنگیوں اور مادی تنگیوں کو دور کر دے گا اور اپنی رحمت کے دروازے کشادہ کر دے گا۔

[۱۴] اس آیت، مذکورہ بالا احادیث اور بعض دیگر نصوص سے جو آداب مجلس مسلمانوں کو سکھائے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ
الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

اور جنہیں علم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند[۱۵] کرے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے(۱۱) اے ایمان والو! جب تم رسول اللہ سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے (مساکین کو) صدقہ کیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ[۱۶] تر بات ہے۔ ہاں اگر تم صدقہ دینے کے لئے کچھ نہ پاؤ تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔(۱۲)

۱۔ مجلس میں پہنچ کر اہل مجلس کو سلام کہا جائے۔

۲۔ پھر جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ دوسروں کو تنگ نہ کرنا چاہیے۔ نہ اس بات میں اپنی ہتک محسوس کرنا چاہیے۔

۳۔ اہل مجلس جب دیکھیں کہ جگہ تنگ ہو رہی ہے اور نئے آنے والوں کو جگہ نہیں مل رہی تو انہیں مجلس کا حلقہ وسیع کر لینا چاہیے یا اگر جمعہ وغیرہ کا اجتماع ہو تو سکڑ کر اور سمٹ کر بیٹھ جانا چاہیے۔ تاکہ آنے والوں کے لیے جگہ بن جائے۔

۴۔ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مجلس میں رسول اللہ ﷺ کے قریب ہو کر بیٹھے یا جیسے خطبہ جمعہ میں اکثر لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ امام کے قریب ہو کر بیٹھیں۔ تو ایسی صورت میں کسی کے لئے، خواہ وہ عزت اور مرتبہ میں بڑا ہو، یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے۔

۵۔ حفظ مراتب کا بھی ایک مقام ہے۔ اگر کوئی چھوٹا کسی بڑے کو آتے دیکھ کر ازراہ تواضع اور آنے والے کا احترام کرتے ہوئے اپنی جگہ اس کے لیے چھوڑ کر خود پیچھے ہٹ جائے تو یہ چیز چھوٹے کی عزت اور درجات کی بلندی کا سبب بن جائے گی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔

۶۔ اگر کوئی شخص مثلاً خطبہ جمعہ میں وضو ٹوٹ جانے یا کسی اور وجہ سے اپنی جگہ سے اٹھ جاتا ہے اور وضو کر کے واپس آتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ پر قبضہ نہ جمالے۔ بلکہ پہلا شخص ہی اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے۔

۷۔ اگر میر مجلس، مجلس کو برخاست کرنے اور چلے جانے کا حکم دے یا کسی ایک شخص کو کسی مصلحت کی بنا پر چلے جانے کو کہے تو اسے اس حکم میں نہ عار محسوس کرنی چاہیے اور نہ اسے اس کی تعمیل میں اپنی توہین یا ہتک محسوس کرنا چاہیے۔

۸۔ اگر کھانا کھانے کی مجلس ہو تو کھانے سے فراغت کے بعد باتوں میں مشغول ہو کر میزبان کو پریشان اور تنگ نہ کرنا چاہیے بلکہ فراغت کے بعد جلد اجازت لے کر رخصت ہو جانا چاہیے۔

[۱۵] ❁ مجالس میں نظم وضبط:۔ یہ نہ سمجھو کہ مجلس میں دوسروں کو جگہ دینے کی خاطر اگر تم میر مجلس سے کچھ دور جا بیٹھے تو تمہارا درجہ گر گیا یا اگر تمہیں اٹھ کر چلے جانے کے لیے کہا گیا تو اس میں تمہاری توہین ہو گئی۔ رفع درجات کا اصل مقصد ایمان اور علم ہے نہ یہ کہ کون میر مجلس کے قریب بیٹھا ہے اور کون اس سے دور ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ احکام یا آداب مجلس صرف دور نبوی کی مجالس سے ہی مختص نہیں بلکہ آج بھی ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ نظم وضبط قائم رہے اور ہر ایک کو درجہ بدرجہ استفادہ کا موقع ملے۔ اسلام ابتری کے بجائے انتہائی نظم اور شائستگی سکھاتا ہے۔ پھر جب عام مجالس کے متعلق نظم وضبط کے ایسے احکام ہیں تو میدان جہاد اور صفوف جنگ میں تو اس سے بڑھ کر نظم وضبط اور امیر کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔

[۱۶] ❁ آپ سے سرگوشی کرنے پر صدقہ کی عارضی پابندی اور اس کے فوائد:۔ بعض منافقوں کی یہ عادت تھی کہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ

عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ع

کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے صدقے ادا کرو[۱۷]۔ پھر جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے بھی تمہیں (اس سے) معاف کر دیا تو اب نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔(۱۳)

محض اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور بڑائی جتانے کی خاطر آپ سے سرگوشی شروع کر دیتے اور بے کار باتوں میں آپ کا اتنا وقت ضائع کر دیتے تھے جس سے دوسروں کو آپ ﷺ سے استفادہ کا وقت نہ ملتا تھا۔ یا کسی وقت آپ خلوت چاہتے تو آپ کو ایسا موقع میسر نہ آتا تھا۔ پھر منافقوں کی دیکھا دیکھی کچھ مسلمان بھی ایسا کرنے لگے تھے اور آپ ہر ایک کی بات سننے کو تیار ہو جاتے اور مروت اور اخلاق کی وجہ سے کسی کو منع نہ فرماتے اس سے کئی قسم کے نقصان ہو رہے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے خود ایسی آزادی پر پابندی لگا دی اور فرمایا کہ جو شخص آپ سے سرگوشی کرنا چاہے وہ کچھ نہ کچھ پہلے صدقہ کرے۔ تب اسے سرگوشی کی اجازت ہو گی اور اس حکم میں بہت سے فائدے تھے۔ مثلاً محتاجوں کی خدمت، صدقہ کرنے والے کے نفس کا تزکیہ، کسی کو بدظنی پیدا نہ ہونا، مخلص اور منافق کی تمیز اور سرگوشی کرنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس حکم میں استثناء صرف یہ تھا کہ اگر فی الواقع کوئی شخص انتہائی نادار ہو اور اسے سرگوشی کی ضرورت بھی حقیقی ہو تو وہ صدقہ دیئے بغیر آپ سے سرگوشی کر سکتا ہے اس حکم سے منافقوں نے اپنے طبعی بخل کی وجہ سے یہ عادت چھوڑ دی۔ اور مسلمان بھی سمجھ گئے کہ زیادہ سرگوشی کرنا اللہ کو پسند نہیں اور اس کے کیا کچھ نقصانات ہیں۔

[۱۷] ❁ آپ سے سرگوشی کی عام اجازت کے نقصانات:۔ اس حکم سے بہت جلد وہ مقاصد حاصل ہو گئے۔ جن کی بنا پر یہ حکم دیا گیا تھا۔ یہ حکم اس وقت نازل ہوا جب عرب بھر کے کفار مسلمانوں کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔ اگر کوئی شخص آپ سے سرگوشی کرتا۔ تو فوراً منافق یہ مشہور کر دیتے کہ یہ شخص فلاں قبیلے کے مدینہ پر حملہ کی تیاریوں کی خبر لایا تھا۔ پھر ایسی افواہیں بہت جلد مدینہ میں گشت کرنے لگتیں اور ایک ہراس سا پھیل جاتا۔ اس کا دوسرا نقصان یہ تھا کہ خواہ مخواہ بدظنی کے احتمال پیدا ہو جاتے تھے اور تیسرا اور سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ لوگ معمولی اور بے کار قسم کی باتوں میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کرتے رہتے تھے۔ سرگوشیاں کرنے والے اکثر چوہدری ٹائپ کے مالدار منافق ہی ہوا کرتے تھے۔ صدقہ کے حکم کے بعد منافقین تو بخل کی وجہ سے رک گئے اور مسلمان ویسے ہی سنبھل گئے۔ یہ حکم زیادہ سے زیادہ دس دن تک بحال رہا اور اس پر صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک بار عمل کیا۔

❁ صدقہ کی پابندی کا خاتمہ:۔ جب مندرجہ بالا مقاصد حاصل ہو گئے تو اللہ نے اس حکم کو منسوخ فرما دیا۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا پورا پورا خیال رکھیں اور اللہ اور اس کے رسول کی سچے دل سے اطاعت بجا لائیں اور ایسا کوئی کام نہ کریں جو ان کی منشا کے خلاف ہو۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِم مَّا هُم مِّنكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ
يَعْلَمُونَ ﴿١٤﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً
فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٦﴾ لَّن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ
شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے ایسے لوگوں سے دوستی لگائی جن پر[۱۸] اللہ کا غضب ہوا۔ نہ تو وہ تم میں سے ہیں اور نہ ہی ان میں سے۔ اور وہ دیدہ دانستہ جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے[۱۹] ہیں(۱۴) اللہ نے ان کیلئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بلاشبہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں بہت برا ہے(۱۵) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے جس کی آڑ میں وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے[۲۰] روکتے ہیں۔ لہذا ان کے لئے رسوا کن عذاب ہوگا۔(۱۶) اللہ کے سامنے نہ ان کے مال کچھ کام آئیں گے اور نہ اولاد۔ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔(۱۷) جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو اس کے سامنے بھی ایسے ہی قسمیں[۲۱] کھائیں گے جیسے

[۱۸] منافقوں کی یہود سے ملی بھگت:۔ "ان لوگوں سے" سے مراد مدینہ کے منافق ہیں اور مغضوب علیہ قوم سے مراد مدینہ کے یہودی ہیں۔ منافقوں کی اصل دوستی اور ہمدردی یہودیوں سے تھی۔ کیونکہ اندر سے منافق بھی مسلمانوں کے ایسے ہی دشمن تھے جیسے یہودی۔ اسی اسلام دشمنی کی مشترک قدر نے ان دونوں کو دوستی کے رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ ان دونوں میں بدتر حالت منافقوں کی تھی جن کے زبانی دعویٰ ایمان پر مسلمانوں کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ چونکہ یہ لوگ اسلام کے دعویٰ کی وجہ سے مسلمانوں سے کئی قسم کے مفادات حاصل کر رہے تھے۔ لہذا مسلمانوں میں انہیں اپنا اعتماد بحال رکھنے کے لیے جھوٹی قسمیں بھی کھانا پڑتی تھیں۔ مگر ان کی کرتوتیں چونکہ ان کے دعویٰ اور قسموں کی تکذیب کر دیتی تھیں۔ اس لیے ان پر نہ مسلمان اعتماد کرتے تھے اور نہ یہودی۔ ان کی حالت دھوبی کے کتے جیسی ہو گئی تھی جو نہ گھر کا شمار ہوتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔

[۱۹] یہودیوں کے سامنے یہ قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم دل و جان سے تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے دکھ درد میں شریک ہیں اور مسلمانوں کو تو ہم نے محض الو بنا رکھا ہے۔ اور مسلمانوں کے سامنے وہ یہ قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہیں اور ان کے اطاعت گزار اور فرمانبردار ہیں۔

[۲۰] یعنی ایک طرف تو منافق مسلمانوں کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کی قسمیں کھا کر ان کی گرفت سے محفوظ رہتے ہیں اور ان کے جان اور مال محفوظ ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ اسلام، اہل اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ہر طرح کے شکوک و شبہات اور وسوسے لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھ کر اسلام قبول کرنے سے باز رہیں کہ جب گھر کے بھیدی ایسی خبریں دے رہے ہیں تو ضرور دال میں کچھ کالا ہوگا۔

[۲۱] منافقوں کی قسمیں کھانے کی پختہ عادت:۔ قسمیں اٹھانے کی عادت صرف اس شخص کی ہوتی ہے جو ہر وقت جھوٹ بولتا ہو اور لوگوں میں اپنا اعتماد کھو چکا ہو۔ سچے اور راست باز انسان کو کبھی قسم اٹھانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ لوگ اس کی بات پر ویسے ہی اعتماد کر لیتے ہیں اور ان منافقوں کی یہ حالت اور قسمیں کھانے کی عادت اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ مرنے کے

يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٨﴾ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ﴿٢٠﴾ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ

تمہارے سامنے کھاتے ہیں اور یہ سمجھیں گے کہ (اس طرح) ان کا کچھ کام بن جائے گا۔ سن لو! یہی جھوٹے لوگ ہیں(۱۸) شیطان ان پر مسلط[۲۲] ہو گیا ہے جس نے انہیں اللہ کا ذکر بھلا دیا ہے۔ یہی لوگ شیطان کی پارٹی[۲۳] ہے۔ سن لو! شیطان کی پارٹی کے لوگ ہی خسارہ[۲۴] اٹھانے والے ہیں۔(۱۹) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یقیناً یہی لوگ ذلیل ترین ہیں(۲۰) اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب[۲۵] رہیں گے۔

بعد اللہ کے حضور پیش ہو کر بھی قسمیں کھانا شروع کر دیں گے اور یہ بھی نہ سوچیں گے کہ جب مسلمانوں کو بھی ان کی قسموں پر اعتماد نہ تھا تو اللہ کیسے اعتماد کر لے گا جو دلوں کے راز تک جانتا ہے۔

[۲۲] ❁ **استحوذ کا لغوی مفہوم:۔** اِسْتَحْوَذَ۔ حَاذَ بمعنی سختی کے ساتھ ہانکنا اور حَاذَ الدَّابَّۃَ بمعنی جانور کو تیزی سے چلانا اور اِسْتَحْوَذَ کے معنی کسی پر مسلط ہو کر اسے سختی سے ہانکنا ہے۔ کہتے ہیں استحوذ العیر علی الاتان یعنی گدھے کا گدھی کی پشت پر چڑھ کر اسے دونوں جانب سے دبا لینا ہے (مفردات) یعنی شیطان نے ان منافقوں پر مسلط ہو کر انہیں کچھ اس طرح سے جکڑ رکھا ہے کہ انہیں اللہ کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں آتا اور وہ اسی کے آلہ کار بن کر رہ گئے ہیں۔

[۲۳] ❁ **اسلامی نقطہ نظر سے سیاسی پارٹیاں صرف دو ہو سکتی ہے ایک حزب اللہ دوسری حزب الشیطان:۔** حِزْبٌ بمعنی پارٹی، گروہ جتھا، جن کے خیالات میں ہم آہنگی تیز سختی اور شدت پائی جائے۔ گویا حزب کا لفظ سیاسی پارٹی، فوج اور لشکر کے معنوں میں آ سکتا ہے۔ جس کا مقصد مملکت میں عمل دخل حاصل کرنا ہو۔ غزوۂ احزاب میں ایسی ہی پارٹیاں اسلام کے خلاف متحد ہو گئی تھیں۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ منافق شیطان کی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرعی نقطہ نگاہ سے صرف دو ہی سیاسی پارٹیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک اللہ کے فرمانبرداروں کی پارٹی جسے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حزب اللہ کے نام سے موسوم فرمایا۔ اور دوسرے شیطان کی پارٹی جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے۔ اسلام دشمن جتنی بھی طاقتیں ہیں۔ وہ سب حزب الشیطان یعنی شیطان کی پارٹی میں شامل ہیں اور اسی پارٹی کے افراد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً جنگ احزاب میں مشرکینِ مکہ، یہود مدینہ، منافقین اور عرب کے دیگر مشرک قبائل سب شامل تھے۔ ان میں سے ایک ایک گروہ بھی شیطان کی پارٹی ہے اور سب مل کر بھی شیطان کی بڑی پارٹی بن جاتی ہے۔

[۲۴] جنگِ احزاب میں شامل تمام پارٹیوں میں قدر مشترک صرف اسلام دشمنی اور اللہ کے رسول کی مخالفت تھی۔ اگرچہ ان سب کی سرگرمیاں اور طریق کار الگ الگ نوعیت کے تھے۔ یہ لوگ چونکہ حق اور اللہ کی پارٹی کے مقابلہ میں سامنے آئے تھے تو ضروری تھا کہ اللہ بھی اپنی پارٹی کی مدد اور حمایت کرتا۔ چنانچہ اللہ نے اس انداز سے اپنی پارٹی کی مدد فرمائی کہ شیطان کی پارٹی ہر لحاظ سے خسارہ میں رہی ان کا مال بھی ضائع ہوا۔ محنت مشقت سفر بھی اور بالآخر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور فرار کے سوا انہیں اپنی عافیت کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ یہ تو انجام دنیا میں ہوا اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ خسارہ اور برے انجام سے دوچار ہوں گے۔ واضح رہے کہ دنیا میں شیطان کی پارٹی کا یہ انجام فقط غزوۂ احزاب یا دوسرے غزوات تک ہی مختص نہیں بلکہ حق کے مقابلہ پر آنے والی ہر پارٹی کا یہی حشر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ مقابلہ میں لوگ صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔

[۲۵] ❁ **اہلِ حق کا غلبہ کن کن معنوں میں ہوتا ہے؟:۔** غالب رہنے سے مراد صرف سیاسی غلبہ نہیں بلکہ یہ صرف اس غلبہ کا ایک

عَزِيزٌ ﴿٢١﴾ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا
آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ

بلاشبہ اللہ بڑا زور آور اور غالب ہے۔(۲۱) جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ کبھی انہیں ایسا نہ پائیں گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی لگائیں جو اللہ اور اس کے رسول کی[۲۶] مخالفت کرتے ہوں، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی یا کنبہ والے ہوں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں[۲۷] اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح[۲۸] کے ذریعہ انہیں قوت بخشی ہے۔

پہلو ہے اور یہ بھی بسا اوقات اللہ کی پارٹی کو حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ اور جو یقینی غلبہ ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی پارٹی کا اخلاقی تفوق بہرحال ایک مسلمہ امر ہے۔ راست بازی اور مکر و فریب سے اجتناب اس پارٹی کے زریں اصول ہیں۔ جنہیں ہر قسم کے لوگ دل سے پسند کرتے ہیں۔ دوسرا پہلو نظریات کا استقلال اور غلبہ ہے۔ باطل نظریات ہر دور میں نئے نئے بنتے بگڑتے اور آپ ہی اپنی موت مرتے رہتے ہیں۔ جبکہ اللہ کی پارٹی کے نظریات و عقائد سیدنا آدم سے لے کر آج تک بدستور قائم اور برقرار رہے ہیں اور آئندہ بھی تا قیامت برقرار رہیں گے۔

[۲۶] کافروں سے دوستی رکھنا بھی کفر ہے:۔ یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ اور اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے محبت دو متضاد باتیں ہیں جو ایک دل میں کبھی جمع نہیں ہو سکتیں جیسے دن اور رات یا روشنی اور تاریکی ایک ہی وقت میں جمع نہیں ہو سکتے۔ لیکن منافقوں کی فریب کاری یہ ہے کہ وہ دونوں کام بیک وقت کر رہے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک ہی بات درست ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے دوستی رکھ ہی نہیں سکتے۔ اور اگر دوستی رکھتے ہیں تو کبھی ایماندار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ دشمن کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے۔ پھر اللہ کے دشمنوں سے ایک ایماندار کیسے دوستی رکھ سکتا ہے؟

[۲۷] جنگ کے دوران کافر اقرباء سے مسلمانوں کا سلوک:۔ یہ آیت ان صحابہ کی شان میں نازل ہوئی جنہوں نے اللہ کے اس ارشاد پر عمل کر کے دنیا کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کیا تھا۔ غزوۂ احد میں سیدنا مصعب بن عمیرؓ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو اور سیدنا علیؓ، سیدنا حمزہ اور عبیدہ بن الحارث نے علی الترتیب عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا۔ ایک دفعہ سیدنا ابو بکرؓ کے بیٹے عبدالرحمن اپنے باپ سے کہنے لگے کہ ابا جان! آپ جنگ میں عین میری تلوار کی زد میں تھے مگر میں نے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ سیدنا ابو بکرؓ نے جواب دیا: بیٹا اگر تم میری تلوار کی زد میں آ جاتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا۔ غزوۂ احد کے قیدیوں کے متعلق مشورہ ہوا تو سیدنا عمرؓ نے یہ مشورہ دیا کہ ہر آدمی اپنے قریبی رشتہ دار کو قتل کر کے موت کے گھاٹ اتار دے۔ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی پر عبداللہ بن ابی منافق نے آپ ﷺ کی شان میں ناجائز کلمات کہے تو ان کے بیٹے جن کا نام بھی عبداللہ ہی تھا اور سچے مومن تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے۔ اگر آپ حکم فرمائیں تو میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں لا رکھوں۔ لیکن آپ نے اپنی طبعی رحم دلی کی بنا پر عبداللہؓ کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ غرضیکہ سچے ایمانداروں کی تو شان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں کسی قریبی سے قریبی رشتہ دار حتیٰ کہ اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے۔

[۲۸] یعنی ایسے لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے روح پھونک کر ان کی قوت ایمانی کو کئی گنا زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ نیز روح سے

مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۲۲ۧ

ع ۳

اللہ انہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی[۲۹] ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوئے یہی اللہ کی پارٹی ہے۔ سن لو! اللہ کی پارٹی کے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔(۲۲)

مراد روح القدس یا جبریل علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں جو صرف جنگ کے دوران ہی نازل ہو کر مسلمانوں کی قوت ایمانی کو نہیں بڑھاتے بلکہ کوئی بھی اہم معاملہ ہو تو مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تائید حاصل ہو جاتی ہے۔ کفار نے رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی تو سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس ہجو کا جواب دیا۔ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: مشرکوں کی ہجو کر' جبریل علیہ السلام تیرے ساتھ ہیں۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب مرجع النبی من الاحزاب.....) اور مسلم کے الفاظ یہ ہیں: "یا اللہ! حسان کی روح القدس سے مدد فرما" (مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضائل حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ)

[۲۹] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد قرآن میں بعض دیگر مقامات پر بھی مذکور ہے۔ جس سے ان کی انتہائی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ ان کے ایمان میں شک کرتے ہیں یا انکار کرتے ہیں۔ انہیں اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔

۲۴ آیاتها سورۃ الحشر مدنیۃ رکوعها ۳

بسم الله الرحمن الرحيم

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ

کلمات ۴۵۵ آیات ۲۴ (۵۹) سورۃ الحشر مدنی ہے (۱۰۱) رکوع ۳ حروف ۲۰۱۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آسمانوں اور زمین میں موجود تمام مخلوق اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور وہی غالب ہے، حکمت والا ہے(۱) وہی تو ہے جس نے پہلے ہی حملے میں اہل کتاب کافروں[۱] کو

[۱] مدینہ کے تینوں یہودی قبائل کا تعارف:۔ ان آیات میں غزوہ بنو نضیر کا مجملاً ذکر آیا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جس وقت آپ مدینہ تشریف لائے اس وقت یہود کے تین قبائل مدینہ میں آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع مدینہ کے اندر آباد تھے۔ زرگری یا سنار کا کام کرتے تھے۔ قبیلہ خزرج کے حلیف تھے۔ اور نسبتاً زیادہ مالدار تھے۔ اور بنو نضیر اور بنو قریظہ انصار کے قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اوس و خزرج کو ہمیشہ برسرپیکار رکھتے اور اس طرح پورے مدینہ پر اپنا سیاسی تفوق برقرار رکھتے تھے اور چونکہ یہ سب قبائل مالدار اور سود خور بھی تھے لہذا معاشی لحاظ سے بھی انہیں کافی اہمیت حاصل تھی۔ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو پہلے مسلمانوں کے داخلی مسائل حل فرمائے۔ سب سے پہلا مسئلہ مسجد نبوی کی تعمیر کا تھا اور دوسرا مہاجرین کو آباد کرنا اور معاش کا مسئلہ جسے آپ نے مواخات کے ذریعہ حل فرمایا۔ تیسرا مسئلہ مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض کی تعیین کا تھا۔ ان مسائل سے فراغت کے بعد یہود کے ساتھ جو مسلمانوں کے سب قریبی ہمسائے تھے' معاہدہ کی باری آئی تاکہ مدینہ میں امن و امان کی فضا کو برقرار رکھا جاسکے۔ یہ معاہدہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا اور اس کی دفعات یہ تھیں:

میثاق مدینہ کی دفعات:۔ ۱۔ یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ہی امت ہوں گے۔ یہود اپنے دین پر عمل پیرا ہوں گے اور مسلمان اپنے دین پر' کوئی ایک دوسرے سے مزاحم نہ ہوگا۔

۲۔ اس معاہدہ کے شرکاء کے باہمی تعلقات خیر خواہی اور فائدہ رسانی کی بنیاد پر ہوں گے نہ کہ گناہ پر۔

۳۔ اگر کوئی بیرونی طاقت مدینہ پر حملہ آور ہو تو سب مل کر اس کا دفاع کریں گے۔

۴۔ جب تک جنگ برپا رہے گی یہود بھی مسلمانوں کے ساتھ خرچ برداشت کریں گے اور ہر فریق اپنے اپنے اطراف کا دفاع کرے گا۔

۵۔ قریش اور ان کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

۶۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی۔ یہ معاہدہ کسی ظالم یا مجرم کے لیے آڑ نہیں بنے گا۔

۷۔ کوئی آدمی اپنے حلیف کی وجہ سے مجرم نہ ٹھہرے گا۔

۸۔ اس معاہدے کے سارے شرکاء پر مدینہ میں ہنگامہ آرائی اور کشت و خون حرام ہو گا۔
۹۔ اس معاہدہ کے فریقوں میں اگر کوئی جھگڑا ہو جائے تو اس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کریں گے۔

یہی معاہدہ مدینہ میں ایک آزاد اسلامی ریاست کی بنیاد ثابت ہوا جس کی رو سے مدینہ اور اس کے اطراف ایک وفاقی حکومت بن گئے۔ جس کا سربراہ رسول اللہ ﷺ کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہاں ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود تو اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن تھے انہوں نے آپ ﷺ کی بالادستی کو کیوں اور کیسے تسلیم کر لیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ کی اکثر آبادی یہود کی مکاریوں اور چیرہ دستیوں سے سخت نالاں تھی۔ مگر انہیں کوئی ایسا باثر آدمی نظر نہیں آ رہا تھا جو ان کی باہمی عداوتوں کو ختم کر کے شیر و شکر کر دے۔ آپ ﷺ کی ذات میں مدینہ والوں کو اپنی منزل مقصود نظر آئی لہٰذا وہ اسلام لا کر رسول اللہ ﷺ سے مل گئے اور یہود ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے ثانوی سطح پر آ گئے۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ یہود خود تین قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے بیک وقت اس معاہدہ کو قبول نہیں کیا بلکہ یکے بعد دیگرے جوں جوں حالات کے سامنے مجبور ہوتے گئے یہ معاہدہ تسلیم کرتے گئے۔ اس معاہدہ میں چونکہ ہر شخص کو مذہبی آزادی اور ہر ایک کے بنیادی حقوق کو انصاف کے ساتھ تسلیم کیا گیا تھا لہٰذا یہود کے لیے یہ معاہدہ تسلیم کر لینے کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہ رہا تھا۔

❁ <u>یہودی قبائل سے امن کے معاہدے:</u۔ مگر یہودی قبائل نے اس معاہدہ کو دل سے کبھی تسلیم نہ کیا۔ ہر وقت مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ اور خباثتیں کرتے رہتے تھے۔ منافقوں اور یہودیوں کی آپس میں مسلمانوں کے خلاف سازباز رہتی تھی۔ جب جنگ بدر میں اللہ نے مسلمانوں کو شاندار فتح عطا کی تو یہ دونوں فریق جل بھن گئے۔ یہود میں سے بنو قینقاع شرارتوں میں پیش پیش تھے۔ جنگ بدر کے بعد آپ نے ان کو بازار قینقاع میں جمع کیا اور فرمایا کہ "شرارتیں چھوڑ دو اور اس سے پیشتر کہ تمہیں ویسی ہی مار پڑے جیسی قریش کو پڑ چکی ہے۔ اسلام قبول کر لو" اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ محمد ﷺ! تمہارا سابقہ قریش کے اناڑی لوگوں سے پڑا اور تم نے میدان مار لیا۔ لہٰذا کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا ہم سے سابقہ پڑا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ یہودیوں کا یہ جواب دراصل اعلان جنگ کے مترادف تھا پھر بھی آپ ﷺ نے صبر ہی کیا۔

❁ <u>بنو قینقاع کی شرارت 'بلوہ اور محاصرہ:</u>۔ مگر چند ہی دن بعد ایک سنار یہودی نے ایک مسلمان عورت سے چھیڑ چھاڑ کی اور اسے ننگا کر دیا۔ عورت نے چیخ و پکار کی تو ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا پھر یہودیوں نے اس مسلمان پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ اب مقتول مسلمان کے گھر والوں نے یہود کے خلاف مسلمانوں سے فریاد کی۔ نتیجتاً مسلمانوں اور بنو قینقاع میں بلوہ ہو گیا۔

❁ <u>بنو قینقاع کی جلاوطنی:</u>۔ یہ صورت حال دیکھ کر آپ ﷺ نے شوال ۲ ہجری میں ایک لشکر تیار کیا اور بنو قینقاع کے ہاں جا پہنچے۔ شیخیاں بگھارنے والے یہود کو سامنے آ کر لڑنے کی جرأت ہی نہ ہوئی اور فوراً قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ اور وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیئے کہ ہمارے جان و مال اور اولاد کے متعلق جو فیصلہ رسول اللہ ﷺ فرمائیں گے وہ ہمیں منظور ہو گا۔ آپ نے انہیں قید کرنے کا حکم دیا۔ بعد میں منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی، جو اندر سے یہود کا بڑا ہمدرد اور حلیف تھا، کی پرزور سفارش کی وجہ سے آپ ﷺ نے ان پر رحم کیا۔ انہیں صرف جلاوطن کیا گیا۔ یہ قبیلہ شام کی طرف چلا گیا یہ کل سات سو اشخاص تھے جن میں سے تین سو زرہ پوش تھے۔ یہ قبیلہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ مدینہ کے اندر آباد تھا۔ سب سے پہلے اسے جلاوطن کیا گیا۔ ان کی جلاوطنی کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔

اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ

ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تمہیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ وہ (اپنے گھروں سے) نکل جائیں گے[۲] اور وہ یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ (کی گرفت) سے بچالیں[۳] گے۔

❁ آپ کا بنونضیر سے دیت میں حصہ کا مطالبہ کرنا:۔ بنوقینقاع کے اخراج کے بعد یہودی کچھ عرصہ کے لیے دبک گئے تھے۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا اس سے انہیں ازحد مسرت ہوئی پھر واقعہ رجیع اور بئر معونہ نے یہود کو سرکشی کی حد تک دلیر بنادیا۔ انہی دنوں ایک واقعہ پیش آیا۔ سیدنا عمرو بن امیہ ضمری نے جو بئر معونہ کے حادثہ میں بچ نکلے تھے، دوران سفر بنوکلاب کے دو آدمیوں کو دشمن سمجھ کر قتل کر دیا۔ حالانکہ وہ معاہد لوگ تھے۔ آپ ﷺ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اب ہمیں لازماً ان دونوں کی دیت ادا کرنا پڑے گی۔ ابتدائی معاہدہ کی رو سے یہود بھی اس دیت کی رقم کی ادائیگی میں برابر کے حصہ دار تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ چند صحابہ کے ہمراہ بنونضیر کے ہاں گئے اور مصارف کا مطالبہ کیا۔

❁ آپ کے قتل کی یہودی سازش:۔ یہود نے رقم اکٹھی کرنے کے بہانے آپ کو ایک علیحدہ مکان میں بٹھایا پھر علیحدہ ہو کر آپ ﷺ کو ایک گھناؤنی سازش کے ذریعہ مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت آپ ﷺ ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ یہود میں سے ایک شخص نے کہا: کون ہے جو چھت پر چڑھ کر اوپر سے چکی کا پاٹ گرا کر محمد (ﷺ) کو کچل دے۔ ایک بدبخت یہودی عمرو بن حجاش بولا "میں یہ کام کروں گا" یہود کے ایک عالم سلام بن مشکم نے کہا: ایسا نہ کرو۔ واللہ اسے وحی کے ذریعہ تمہارے ارادہ کا علم ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں معاہدہ کی رو سے بھی ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن شریر یہودیوں نے سلام بن مشکم کی بات کو چنداں اہمیت نہ دی اور اپنی اس ناپاک سازش کی تکمیل پر اور زیادہ مصر ہو گئے۔"

❁ آپ کو اس سازش کا وحی سے علم ہونا:۔ عین اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی یہود کے اس ارادہ کی خبر دے دی۔ آپ تیزی سے اٹھے اور مدینہ کی طرف چل دیئے۔ بعد میں صحابہ کرام اٹھے اور رسول اللہ ﷺ سے جا ملے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صحیح صورت حال سے مطلع کر دیا۔ یہود کی یہی غداری بنونضیر کی تباہی کا سبب بن گئی۔ جس کا ذکر ان آیات میں کیا جا رہا ہے۔

[۲] ❁ یہود کی جلاوطنی کا حکم:۔ "واپس مدینہ پہنچتے ہی رسول اللہ ﷺ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی زبانی بنونضیر کو پیغام بھیج دیا کہ "اب تم ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا دس دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جاؤ۔ جو سامان تم اپنے ساتھ لے جاسکو تمہیں اس کی اجازت ہے۔ دس دن کے بعد جو شخص یہاں نظر آیا اسے قتل کر دیا جائے گا۔" یہ بدعہد اور شرارتی قوم اس قدر بزدل نکلی کہ آپ کے اس پیغام سے دہشت زدہ ہو گئی اور اپنے گھربار چھوڑ کر وہاں سے نکل جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ حالانکہ مسلمانوں کو یہ خیال تک نہ تھا کہ یہ مسلح اور جنگجو کہلانے والی قوم صرف ایک پیغام پر ہی ہتھیار ڈال دے گی اور جلاوطنی پر آمادہ ہو جائے گی۔

[۳] ❁ عبداللہ بن ابی کی شہ پر ڈٹ جانا:۔ جب یہود جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تو ان کے ہمراز اور ہمدرد عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے انہیں پیغام بھیجا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں اپنی جگہ پر برقرار رہو اور ڈٹ جاؤ۔ میرے پاس دو ہزار

اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ

مگر اللہ نے ایسے رخ سے انہیں آلیا جس کا انہیں خواب و خیال بھی نہ تھا۔ اور ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ خود ہی اپنے گھروں کو برباد کرنے لگے اور مسلمانوں کے ہاتھوں بھی کروانے لگے۔ پس اے اہل بصیرت! عبرت حاصل کرو۔(۲) اور اگر اللہ نے ان کے حق میں جلا وطنی نہ لکھی ہوتی

مسلح آدمی ہیں۔ جو آپ کے قلعوں میں داخل ہو کر تمہاری حفاظت میں اپنی جانیں دے دیں گے۔ علاوہ ازیں بنو قریظہ اور بنو غطفان بھی تمہارے حلیف ہیں۔ وہ بھی تمہاری مدد کریں گے۔ اور اگر تمہیں نکالا بھی گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے۔ رئیس المنافقین کے اس جانفزا پیغام سے یہود کی جان میں جان آگئی۔ ان کے موقعہ شناس سردار حیی بن اخطب کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیج دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے تم سے جو بن پڑتا ہے کر لو۔ اگرچہ مسلمان ان دنوں سخت زخم خوردہ تھے۔ جنگ احد میں ستر مردان کار شہید ہو چکے تھے۔ پھر واقعہ رجیع اور بئر معونہ کے صدمے بھی برداشت کرنا پڑے۔ یہودیوں کے قتل کی سازش اور عبداللہ بن ابی کی ان سے پوری طرح گٹھ جوڑ، گھر کے اندر اور باہر ہر طرف دشمن ہی دشمن حالات چنداں سازگار نہ تھے۔ مگر اب یہودیوں کا چیلنج قبول کرنے کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

❁ **بنونضیر کا محاصرہ:۔** اللہ کا نام لے کر نکل کھڑے ہوئے اور جا کر بنونضیر کا محاصرہ کر لیا۔ اس بدعہد اور بزدل قوم کو سامنے آکر لڑنے کی جرأت نہ ہوئی اور انہوں نے اپنا بچاؤ اسی بات میں سمجھا کہ اپنے مضبوط قلعوں میں بند ہو جائیں۔ بنونضیر کی مدد کو کوئی بھی نہ پہنچا۔

❁ **عبداللہ بن ابی کی وعدہ خلافی:۔** نہ رئیس المنافقین نہ اس کے دو ہزار جنگجو، نہ بنو قریظہ اور نہ بنو غطفان۔ صرف بنونضیر اکیلے ہی مسلمانوں سے نمٹنے کے لیے رہ گئے۔ رئیس المنافقین کی اس بدعہدی نے یہودیوں کے حوصلے پست کر دیئے۔ ان کی اپنی افرادی قوت، اسلحہ کی فراوانی، سامان رسد کی بہتات اور اطراف سے امداد اور ہمدردی کے وعدے 'غرض ان کے سب سہارے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

❁ **یہود کا ہتھیار ڈالنا اور جلاوطنی:۔** اب ان کے حواس ٹھکانے آنے لگے۔ اللہ نے مسلمانوں کا رعب کچھ اس طرح ان کے دلوں میں ڈال دیا کہ قلعوں سے باہر نکلنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ چنانچہ محاصرہ کو ابھی دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیج دیا کہ ہم آپ کی شرط کے مطابق مدینہ سے جلاوطن ہونے کو تیار ہیں۔ آپ نے ان کی بات منظور فرما کر محاصرہ اٹھا لیا۔ یہ قوم اپنے مکانوں کی چھتیں اکھاڑ اکھاڑ کر ان کی لکڑیاں اپنے اونٹوں پر لادنے لگی۔ وہ خود ہی اپنے گھروں کو مسمار کر رہے تھے اور مسلمان بھی اپنی ضرورت کے مطابق ان کے گھروں کو مسمار کر رہے تھے۔ ان کے سردار حیی بن اخطب اور سلام بن ابی الحقیق نے مدینہ سے نکل کر خیبر کا رخ کیا اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔

لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ﴿٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۖ وَمَنْ
يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٤﴾ مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا
فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ﴿٥﴾ وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ

تو انہیں دنیا میں ہی سخت سزا دے دیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ (۴) یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرے تو اللہ (انہیں) سزا دینے میں بہت سخت ہے (۵) تم نے کھجور کے جو بھی درخت کاٹے یا انہیں اپنی جڑوں پر قائم رہنے دیا تو یہ سب کچھ اللہ [۴] ہی کا حکم تھا اور یہ اس لیے ہوا کہ اللہ فاسقوں [۵] کو رسوا کرے۔ (۵) اور ان (یہودیوں کے اموال) سے جو کچھ اللہ نے ان سے اپنے رسول کو مفت میں دلا دیا جس کے لیے

[۴] ❁ **محاصرہ کے وقت مسلمانوں کا درخت کاٹنا اور مخالفین کا شور و غوغا:** مدینہ کے گرد بنو نضیر کا ایک نہایت خوبصورت باغ تھا۔ جسے بویرہ کہتے تھے اس میں بہت سے کھجوروں کے درخت تھے۔ جب مسلمانوں نے بنو نضیر کا محاصرہ کرنا چاہا تو یہ درخت کام میں آڑے آ رہے تھے۔ چنانچہ جو جو درخت رکاوٹ بن سکتے تھے مسلمانوں نے ان کو کاٹ کر اور جہاں زیادہ گنجان تھے وہاں انہیں آگ لگا کر محاصرہ کرنے کے لیے اپنی راہ صاف کر لی۔ جب آگ کے شعلوں نے اس باغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ شعر پڑھا۔

وَهَانَ عَلٰى سَرَاةِ بَنِي لُؤَيٍّ ...... حَرِيْقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيْرٌ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب حدیث بنی نضیر)

یعنی بنی لوی (قریش) کے سردار یہ بات معمولی سمجھ کر برداشت کر رہے تھے کہ بویرہ کا باغ پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ کر جل رہا ہے۔ جب راستہ صاف کرنے کی خاطر مسلمانوں نے یہ درخت کاٹے تو اس پر مخالفین نے ایک شور بپا کر دیا کہ دیکھو مسلمان درختوں کو کاٹ کر فساد فی الارض کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ اصلاح فی الارض کے دعویدار بنے پھرتے ہیں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم نے جو بھی کھجوروں کا درخت کاٹا یا اسے اپنی جڑوں پر برقرار رہنے دیا تو یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو جنگ کے موقعوں پر درخت کاٹنے سے منع کیا تھا اور اسے فساد فی الارض قرار دیا تھا۔ مگر بنو نضیر کی مسلسل بدعہدیوں کی وجہ سے ان کا استیصال ضروری ہو گیا۔ لہٰذا اس خاص موقعہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی تھی۔ اور چونکہ اس اجازت کا ذکر قرآن میں کہیں مذکور نہیں جس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی۔ جسے عموماً وحی خفی یا وحی غیر متلو کہا جاتا ہے اور دوسرا مسئلہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے جو تخریبی کاروائی جنگی ضروریات کے لیے ناگزیر ہو وہ فساد فی الارض کی تعریف میں نہیں آتی۔

[۵] ❁ **بنو نضیر کا اخراج:** بنو قینقاع کی جلاوطنی کے بعد بنو نضیر بھی مدینہ سے جلاوطن اور رسوا کر کے نکال دیئے گئے۔ رہے بنو قریظہ، تو ان کا جو حشر ہوا اس کی تفصیل سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۲۶ کے حاشیہ میں گزر چکی ہے۔ نیز درج ذیل حدیث میں بھی اجمالاً ان کا ذکر آ گیا ہے۔

وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ

عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ

نہ تم نے گھوڑے دوڑائے[۶] تھے اور نہ اونٹ (اس میں تمہارا کوئی حق نہیں) بلکہ اللہ ہی اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۶) اللہ ان دیہات والوں سے جو (مال) بھی اپنے رسول کو مفت[۷] میں دلا دے وہ مال اللہ، رسول، قرابت والوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے

"سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ بنو نضیر اور بنو قریظہ نے جنگ کی تو آپ ﷺ نے بنو نضیر کو تو جلاوطن کیا اور بنو قریظہ کو وہیں رہنے دیا اور ان پر احسان کیا تاآنکہ بنو قریظہ نے جنگ کی (جنگ احزاب کے بعد) تو آپ ﷺ نے ان کے مردوں کو قتل کر دیا اور ان کی عورتوں، بچوں اور اموال کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ ماسوائے ان لوگوں کے جو پہلے ہی آ کر آپ ﷺ سے مل گئے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں امن دیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے تمام یہود کو جلاوطن کیا۔ ان میں عبداللہ بن سلام کے قبیلہ بنو قینقاع کے یہود بھی شامل تھے اور بنو حارثہ بھی۔ غرض مدینہ کے سب یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔" (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب حدیث بنی نضیر۔ مسلم۔ کتاب الجہاد۔ باب اجلاء الیہود من الحجاز)

[۶] ❁ اموال فے میں مجاہدین کا حصہ کچھ نہیں:۔ اموال غنیمت میں سے پانچواں حصہ خالصتاً رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہوتا تھا جسے آپ اپنی ذات، اپنے گھر والوں رشتہ داروں اور دوسروں میں اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کرتے تھے۔ لیکن جو اموال جنگ کیے بغیر ہی دستیاب ہو جائیں جنہیں اموال فے کہا جاتا ہے، وہ سارے کے سارے رسول اللہ ﷺ کی تحویل میں دیے جاتے تھے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

"سیدنا عمرؓ کہتے ہیں کہ بنی نضیر کے مال ان اموال میں سے تھے جو اللہ نے لڑائی کے بغیر اپنے پیغمبر کو دلا دیے۔ مسلمانوں نے ان پر گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تھے۔ اس قسم کے مال خاص رسول اللہ ﷺ کے گنے جاتے تھے۔ ایسے اموال سے آپ اپنے گھر والوں کا سال بھر کا خرچ نکال لیتے تھے اور باقی مال جہاد کے سامان کی تیاری اور گھوڑوں (وغیرہ) میں خرچ کرتے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

واضح رہے کہ اس آیت میں افاء کا لفظ آیا ہے۔ فَاءَ (مادہ فیئ) کا لغوی معنی بہتری یا اچھی حالت کی طرف لوٹنا یا واپس آنا ہے۔ اور افاء کے معنی لوٹا دینا ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ کے باغی اور نافرمان اپنے اموال کے حقدار نہیں ہوتے اور اللہ نے یہ اموال اپنے نافرمانوں سے چھین کر اپنے فرمانبرداروں کو پلٹا دیے ہیں۔

[۷] ❁ اموال فے بیت المال کی ملکیت ہوتے ہیں:۔ سابقہ آیت میں حکم صرف بنو نضیر کی متروکہ جائیداد سے متعلق تھا۔ اس آیت میں ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو اموال بھی جنگی کارروائیوں کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں وہ بیت المال کی ملکیت متصور ہوں گے۔ اس میں مجاہدین کو کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ یہ ان کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس اجتماعی قوت کا نتیجہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ اس کی امت اور اس کے قائم کردہ نظام کو عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ اموال، اموال غنیمت سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان اموال پر مسلمانوں کے امیر کا تصرف حاکمانہ ہوتا ہے۔ اور اموال فے کا اطلاق منقولہ اور غیر

السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ

تاکہ وہ (مال) تمہارے دولت مندوں ہی کے درمیان[۸] گردش نہ کرتا رہے۔ اور جو کچھ تمہیں رسول دے وہ لے لو اور جس سے روکے[۹] اس سے رک جاؤ۔

منقولہ دونوں قسم کے اموال پر ہوگا۔ اموال فے میں وہ جزیہ و خراج کی آمدنی بھی شامل ہے۔ جو ایک اسلامی ریاست کو غیر مسلموں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اموال فے کے مصارف کی مدات بھی بیان فرما دیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعد آپ کے قرابتداروں پر خرچ کرنے کی مد باقی ہے یا ختم ہو گئی؟ اس میں اختلاف ہے بعض علماء کہتے ہیں کہ چونکہ بنو ہاشم اور بنو مطلب پر اموال زکوٰۃ حرام ہیں اس لیے ایسے اموال سے ان کے محتاجوں کی خدمت کی جائے گی۔

[۸] اسلام کے معاشی نظام کے چند سنہری اصول:۔ اس مختصر سے جملہ میں اسلام کے معاشی نظام کو یوں بیان کیا گیا ہے جیسے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہو۔ ربط مضمون کے لحاظ سے تو اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اموال فے کو مجاہدین پر تقسیم نہ کیا جائے۔ جن میں سے اکثر پہلے ہی غنی ہو چکے ہیں محتاج اور مسکین نہیں رہے۔ اور دولت انہی میں تقسیم نہ کر دی جائے بلکہ نادار لوگوں تک پہنچائی جائے تاہم اس میں ایک عام اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں دولت کا بہاؤ امیروں سے غریبوں کی طرف ہونا چاہیے نہ کہ غریبوں سے امیروں کی طرف۔ غریبوں سے امیروں کی طرف دولت کے بہاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے۔ جس کی تمام تر شکلوں کو مکمل طور پر حرام کر دیا گیا ہے۔ اور زکوٰۃ یعنی فرضی صدقہ، واجبی صدقات اور نفلی صدقات جن کا قرآن میں جگہ جگہ حکم اور ان کی ترغیب دی گئی ہے ان سب کا مقصد یہ ہے کہ دولت کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہو۔ سرمایہ داری اور ارتکاز دولت پر اسلام کا قانون میراث کاری ضرب لگاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے پاس کروڑوں اور اربوں کی مالیت بھی ہو تو وہ چند ہی نسلوں میں منتشر ہو کر سینکڑوں افراد میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہاں چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ دولت اگر چند سرمایہ داروں کے پاس جمع ہو جائے تو اس سے طبقاتی تقسیم بڑھتی جاتی ہے امیر دن بدن امیر تر اور غریب دن بدن غریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آپس میں ان طبقوں میں منافرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے جو اور بڑے بڑے فتنوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دولت جس قدر تیزی سے گردش کرے گی اسی قدر قومی معیشت میں خوشحالی واقع ہوگی۔ تیسرے یہ کہ دولت کی گردش کی رفتار صرف اس وقت تیز ہوتی ہے جبکہ غریبوں کی امداد کر کے ان میں قوت خرید پیدا کی جائے اور اگر دولت امیروں کے پاس جمع ہوتی رہے تو گردش کی رفتار حیرت انگیز حد تک کم ہو جاتی ہے۔ ان امور کی تشریح ان حواشی میں بہت مشکل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مضمون اسلامی معیشت اور سود مطبوعہ سہ ماہی مجلہ "منہاج اسلامی معیشت نمبر" جنوری، اپریل ۱۹۹۲ء

[۹] رسول اللہ ﷺ کا فرمان یقینی شرعی حجت اور واجب الاتباع ہے:۔ یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو قابل حجت تسلیم کرنے پر قطعی دلیل مہیا کرتا ہے۔ لیکن مشہور منکر حدیث حافظ اسلم صاحب جیراجپوری نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ جملہ تو اموال فے کی تقسیم کے بارے میں ہے۔ حدیث کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہاں آتیٰ کا لفظ جو نہی کے بالمقابل استعمال ہوا ہے لوگوں نے غلط فہمی سے اسے امر یا قال کے معنی میں سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان

معنوں میں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ہر جگہ اس کے معنی اعطاء یعنی دینے کے ہی ہیں۔ لہٰذا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔(مقام حدیث ص ۱۲۶)

اب دیکھیے کہ اٰتیٰ بمعنی اِعْطَاءٌ کی ضد منع ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال نہیں فرمایا۔ اور نہی کی ضد امر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نہی کے مقابلہ میں امر کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔ گویا حافظ صاحب صرف اپنے نظریہ کی تائید کے لیے قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت پر اعتراض فرما رہے ہیں کہ نہی کے معنی "نہ دینا" کبھی نہیں ہوتا۔ پھر اگر قرآن کریم میں فی الواقع اٰتٰکُمْ کے مقابلہ نَھٰکُمْ کا لفظ ہی استعمال ہوتا تو بھی اسے اس خاص واقعہ یعنی مال فے کی تقسیم سے متعلق ہی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک عام اصول ہے کہ کسی خاص واقعہ میں کوئی حکم آجائے تو یہ حکم عام ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ نے اٰتٰکُمْ کے مقابلہ میں نَھٰکُمْ کا لفظ استعمال کر کے اس شائبہ کو بالکل ہی ختم کر دیا ہے کہ اس حکم کا تعلق اس خاص واقعہ یا اسی جیسے بعد میں آنے والے دوسرے واقعات سے ہو سکتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اٰتٰکُمْ کے مقابلہ میں نَھٰکُمْ کا لفظ لا کر ایک طرف تو اس پیش آمدہ مسئلہ کا حل پیش کر دیا اور دوسری طرف اس حکم میں ایسی عمومیت پیدا کر دی جس سے صرف وہی لوگ لذت آشنا ہو سکتے ہیں جو عربی زبان کا کچھ ذوق رکھتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اصل میں غلط فہمی کا شکار کون ہے تو اس کے لیے پہلے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

❁ **منکرین حدیث کا ایک اعتراض اور اس کا جواب' عبداللہ بن مسعود کی وضاحت:۔** "سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ ﷺ نے گودنے والی، گدوانے والی، خوبصورتی کے لیے چہرے کے بال اکھاڑنے والی اور دانتوں کو جدا کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے جو اللہ کی خلقت کو بدلتی ہیں۔ یہ حدیث بنی اسد کی ایک عورت کو پہنچی جس کی کنیت ام یعقوب تھی۔ وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر کہنے لگی: "مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے ایسی ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے" انہوں نے کہا: "میں تو اس پر ضرور لعنت کروں گا جس پر نبی اکرم ﷺ نے لعنت کی ہے اور اللہ کی کتاب میں اس پر لعنت آئی ہے" اس عورت نے کہا: "میں نے تو سارا قرآن، جو دو تختیوں کے درمیان ہے، پڑھ ڈالا ہے، اس میں تو کہیں ان عورتوں پر لعنت نہیں آئی" آپ نے کہا: "اگر تو نے (اچھی طرح) قرآن پڑھا ہوتا تو ضرور یہ مسئلہ پا لیتی۔ کیا تو نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا کہ پیغمبر جس بات کا تمہیں حکم دے اس پر عمل کرو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز رہو؟" اس عورت نے کہا: "ہاں! یہ آیت تو قرآن میں موجود ہے" سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ بس آپ ﷺ نے ان باتوں سے منع کیا ہے" وہ کہنے لگی؟ تمہاری بیوی بھی تو یہ کام کرتی ہے" انہوں نے کہا: "جا کر دیکھو تو" جب وہ گئی تو وہاں کوئی بات نہ پائی۔ سیدنا عبداللہ کہنے لگے: اگر میری بیوی ایسے کام کرتی تو بھلا وہ میرے ساتھ رہ سکتی تھی؟" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اب سوال یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم تھے یا حافظ صاحب؟ پھر ام یعقوب نے جو اگر صحابیہ نہیں تو تابعیہ تو ضرور ہوگی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ استدلال سن کر یہ نہیں کہا کہ یہ حکم تو مال فے کی تقسیم سے متعلق ہے اور اٰتی کے معنی اِعطاء ہوتا ہے بلکہ اس نے "میں سمجھ گئی" کا اقرار کر کے صحابہ کرام کے سمجھے ہوئے مفہوم کی تائید کر دی۔ صحابہ میں یہ فہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منتقل ہوا۔ پھر صحابہ سے تابعین میں، ان سے تبع تابعین میں پھر محدثین میں، آخر وہ کون سا دور ہے جس میں اس مفہوم کو درست نہ سمجھا گیا ہو۔ جسے حافظ صاحب لوگوں کی غلط فہمی قرار

فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ

اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ یقیناً سخت سزا دینے والا ہے (۷) (نیز فے کا یہ مال) ان محتاج مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں [۱۰]، اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ راستباز ہیں۔ (۸)

اور (ان لوگوں کے لیے بھی) جو ان (کے آنے) سے پہلے ایمان لا چکے تھے اور یہاں (دار الہجرت میں) مقیم تھے۔ جو بھی ہجرت کر کے ان کے پاس آئے وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں (مال فے) سے دیا[۱۱] جائے

دے رہے ہیں۔ اور وہ مفہوم یہ ہے کہ سنت رسول ﷺ بھی شریعت کا حصہ ہے نیز یہ کہ صحابہ کرام ایسے احکام کو کتاب اللہ میں ہی شمار کرتے تھے۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ: عنقریب تم میں ایک پیٹ بھرا شخص اپنے پلنگ پر تکیہ لگائے میری حدیثیں سن کر یہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان قرآن (کافی) ہے اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھو۔ یاد رکھو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کے مثل اور بھی (ترمذی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ مسند احمد۔ بیہقی دارمی بحوالہ مشکوٰۃ) واضح رہے آپ کی سنت پر عمل پیرا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن کے احکام بھی کسی صورت بجا نہیں لائے جا سکتے۔ لہٰذا جو شخص سنت یا حدیث کی حجیت کا قائل نہ ہو وہ حقیقتاً قرآن کا بھی منکر ہو تا ہے۔ بلکہ اسے بننا پڑتا ہے۔

[۱۰] ❁ اموال فے میں محتاجوں اور مہاجرین کا حصہ:۔ مال فے کی تقسیم میں پہلے محتاجوں کا عمومی ذکر فرمایا۔ اس کے بعد بالخصوص ان مہاجر محتاجوں کا ذکر فرمایا۔ جنہوں نے محض اسلام اور اللہ کی رضا کی خاطر اپنا گھر بار مال و دولت اور جائیدادیں سب کچھ چھوڑ کر مدینہ آ گئے۔ جبکہ یہاں ان کی آبادکاری اور معاش کے مسئلہ کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے ایمان کا دعویٰ کیا تو عملی طور پر اسے سچ کر دکھایا۔ اور ہر وقت ہی اللہ کے دین کی مدد کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ایسے محتاج عام محتاجوں کی نسبت اموال فے کے زیادہ حقدار ہیں۔

[۱۱] ❁ انصار کا مہاجرین کے لیے ایثار اور فے میں ان کا حصہ:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کمال فضیلت بیان فرمائی جو مسلمانوں کے ہجرت کر کے مدینہ آنے سے پیشتر بیعت عقبہ کی رو سے ایمان لا چکے تھے اور انہوں نے مہاجر مسلمانوں کو آتے ہی اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔ اور مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلہ میں وہ مثال قائم کی جس کی مثال پیش کرنے سے پوری دنیا کی تاریخ قاصر ہے۔ ان اولین انصار نے مہاجرین کو اپنی جائیداد، گھر بار اور نخلستانوں میں شریک کر لیا۔ چنانچہ سیدنا ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ اس وقت انصار مدینہ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: ہم میں اور ہمارے مہاجر بھائیوں میں کھجور کے درخت تقسیم کر دیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہیں ہو سکتا (جائیداد تمہاری ہی رہے گی) تب انصار مہاجرین سے کہنے لگے۔ اچھا ایسا کرو۔ درختوں کی

خدمت تم کرو۔ ہم پیداوار میں تمہیں شریک بنا لیتے ہیں۔ تب مہاجر کہنے لگے بہت خوب! ہم نے سنا اور مان لیا۔ (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب الشروط فی المعاملۃ) اس سے انکا ایثار یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہاجرین تو کھیتی باڑی نہیں جانتے۔ تو انصار نے اس معاملہ میں بھی اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کی۔ تاہم نصف پیداوار انہیں دینا قبول کر لیا۔ اور اب جب بنو نضیر کے اموال فے تقسیم کرنے کی باری آئی تو انصار نے از خود یہ کہہ دیا کہ یہ اموال مہاجرین میں تقسیم کر دیجئے۔ اور ہمارے پہلے نخلستان ہی ہمارے پاس رہنے دیجئے۔ (یعنی اب ان میں مہاجرین شریک نہ ہوں گے) بلکہ اگر آپ ﷺ مناسب سمجھیں تو ہم ان میں سے بھی دینے کو تیار ہیں۔ یہ تھا وہ ایثار جس کی بنا پر ان کا درجہ بہت بلند ہو گیا تھا۔ اور اللہ نے بطور خاص ان انصار کی تعریف فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے بطور حق یہ ارشاد فرمایا کہ ایسے ایثار کرنے والے انصار کا بھی اموال فئے میں خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ لیکن وہ از راہ ایثار اپنے اس حق سے اپنے مہاجر بھائیوں کے حق میں دستبردار ہو گئے اس ایثار نے مہاجرین کے دل میں جو مقام حاصل کیا تھا وہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے (مرتے وقت) وصیت کی کہ میرے بعد جو خلیفہ ہو وہ مہاجرین کا حق پہچانے اور انصار کا بھی حق پہچانے۔ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی ہجرت سے پہلے مدینہ میں جگہ پکڑی اور ایمان کو سنبھالا۔ خلیفہ کو لازم ہے کہ ان میں سے جو نیک ہوں اس کی قدر کرے اور برے کی برائی سے درگزر کرے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اور مہاجرین کی آمد پر جس قدر خوشی انصار کو ہوتی تھی وہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتی ہے:

❁ <u>مہاجرین کی آمد پر انصار کی خوشی</u>:۔ "سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (مدینہ میں) آپ ﷺ کے اصحاب میں سے سب سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ام مکتوم ہمارے پاس آئے۔ وہ دونوں ہمیں قرآن پڑھاتے رہے۔ پھر عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، بلال رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آئے پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بیس آدمی اپنے ساتھ لیے ہوئے آئے۔ پھر ان کے بعد آپ ﷺ تشریف لائے۔ مدینہ والے اتنے خوش کبھی بھی نہ ہوئے تھے جتنے خوش آپ کی تشریف آوری سے ہوئے۔ بچے بچیاں تک یوں کہہ رہے تھے۔ دیکھو! یہ اللہ کے رسول ﷺ تشریف لائے ہیں۔ میں آپ کی آمد سے پہلے ہی سورۃ اعلیٰ اور اس جیسی کئی سورتیں پڑھ چکا تھا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ الاعلیٰ)

انہیں دنوں ایک انفرادی واقعہ بھی پیش آیا: جس میں ایک انصاری نے کمال ایثار کا ثبوت دیا تھا۔ محدثین اس واقعہ کو بھی اس آیت کی تفسیر میں لائے ہیں۔ اور وہ حدیث یوں ہے:

❁ <u>انصار کے ایثار کا ایک منفرد قصہ</u>:۔ "سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص (ابو ہریرہ) آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ! "میں بہت بھوکا ہوں" آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کے ہاں سے پتہ کرایا لیکن وہاں کچھ نہ نکلا۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کو کہا: "کوئی ہے جو اس رات اس شخص کی مہمانی کرے۔ اللہ اس پر رحم کرے" ایک انصاری (ابو طلحہ) نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اس کی مہمانی کروں گا اور اس شخص (ابو ہریرہ) کو اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی (ام سلیم) سے کہا: "یہ شخص رسول اللہ ﷺ کا (بھیجا ہوا) مہمان ہے لہذا جو چیز بھی موجود ہو اسے کھلاؤ" وہ کہنے لگی: اللہ کی قسم! میرے پاس تو بمشکل بچوں کا کھانا ہے" ابو طلحہ نے کہا: اچھا یوں کرو۔ بچے جب کھانا مانگنے لگیں تو انہیں سلا دو۔ اور جب ہم دونوں (میں اور مہمان) کھانا کھانے لگیں تو چراغ گل کر دینا۔ اس طرح ہم دونوں آج رات کچھ نہیں کھائیں گے "(اور مہمان کھا لے گا) چنانچہ ام سلیم نے ایسا ہی کیا۔ صبح جب ابو طلحہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں مرد (ابو طلحہ) اور فلاں عورت (ام سلیم) پر اللہ

فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ۚ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ

وہ اپنے دلوں میں اس کی کوئی حاجت نہیں پاتے اور ان (مہاجرین) کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود فاقہ سے ہوں اور جو شخص اپنے نفس کی حرص [۱۲] سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔(۹)

اور (ان لوگوں کے لیے بھی) جو ان کے بعد [۱۳] آئیں گے اور کہیں گے: "اے ہمارے پروردگار! ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے لیے ہمارے دلوں میں کدورت [۱۴] نہ رہنے دے۔ اے ہمارے پروردگار! تو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔(۱۰)

عزوجل بہت خوش ہوا اور اسے ہنسی آگئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۱۲] لفظ شح کے لغوی معنی۔ شح میں دو باتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک مال و دولت جمع کرنے میں حریص ہونا، دوسرے مال و دولت خرچ کرنے میں انتہائی بخیل ہونا اور جس شخص میں یہ دونوں قباحتیں جمع ہو جائیں اسے شحیح اور شحاح کہتے ہیں۔ اب ایسے شخص میں تنگ نظری، تنگ ظرفی، سنگدلی، بے مروتی وغیرہ جیسی صفات پیدا ہو سکتی ہیں اور ان کا ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ اگرچہ مال و دولت سے محبت ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن اس طرح دولت کے پیچھے اندھے ہو جانا اور دولت کا پجاری بن جانا انتہائی قبیح خصلت ہے۔ جس سے اللہ ہی بچا سکتا ہے۔ اسلام اس بد خصلت کے علاج کے لیے انفاق فی سبیل اللہ، صدقات اور ایثار کی راہ دکھاتا ہے جس سے سماحت، وسعت نظر، ہمدردی، مروت اور اخوت کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ گویا شح سے نجات پا جانا ہی بہت بڑی کامیابی ہے اور جنت میں لے جانے کا سبب بنتی ہے۔

[۱۳] اموال فے میں بعد میں آنے والے مسلمانوں کا حصہ۔ یعنی اموال فے کے حقداروں میں جن لوگوں کا اللہ نے بطور خاص ذکر فرمایا۔ ان میں پہلے محتاج مہاجرین کا بھی کا ذکر کیا۔ پھر ایثار کرنے والے مہاجرین کا، اور تیسرے نمبر پر بعد میں آنے والوں کا۔ کیونکہ اموال فے میں جائیداد غیر منقولہ، زمینیں اور ان کے علاوہ وہ جزیہ و خراج کی رقوم بھی شامل ہیں جو سرکاری سطح پر وصول کی جاتی ہیں۔ چنانچہ جب دور فاروقی میں مسلمانوں نے عراق اور شام کو فتح کر لیا اور ان زمینوں پر قبضہ ہو گیا تو امرائے فوج نے اصرار کیا کہ مفتوحات انہیں بطور جاگیر عنایت کیے جائیں اور باشندوں کو ان کی غلامی میں دیا جائے۔ سیدنا عمرؓ نے سیدنا سعد بن ابی وقاص کو وہاں کی مردم شماری کے لیے بھیجا۔ کل باشندوں اور اہل فوج کی تعداد کا موازنہ کیا تو ایک ایک فوجی کے حصے میں تین تین آدمی آتے تھے۔ یہ دیکھ کر سیدنا عمرؓ کی رائے یہ قائم ہو گئی کہ زمین قومی تحویل میں لے لی جائے اور ان کے مالکوں کو بطور کاشتکار وہیں رہنے دیا جائے اور انہیں غلام نہ بنایا جائے۔ اکابر صحابہ میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف اہل فوج کے ہم زبان تھے۔ اموال غنیمت کے علاوہ زمینوں اور قیدیوں کی تقسیم پر بھی مصر تھے اور سیدنا بلالؓ نے تو اس قدر جرح کی کہ سیدنا

عمرؓ نے زچ ہو کر فرمایا: اللهم اكفني بلالا (اے اللہ! میری طرف سے بلال کو خود سنبھال) سیدنا عمرؓ یہ استدلال پیش کرتے تھے کہ اگر مفتوحہ علاقے فوج میں تقسیم کر دیئے جائیں تو آئندہ افواج کی تیاری، بیرونی حملوں کی مدافعت، ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے مصارف کہاں سے آئیں گے اور یہ مصلحت بھی آپ کے پیش نظر تھی کہ اگر زمین افواج میں تقسیم کر دی گئی تو وہ جہاد کی طرف سے غافل اور جاگیرداری میں مشغول ہو جائیں گے۔ لہٰذا اموال غنیمت تو فوج میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ اور زمین بیت المال کی ملکیت قرار دی جانی چاہیے کیونکہ اتنی کثیر مقدار میں اموال اور زمین اس کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ لگنے کی توقع کم ہی نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے فرمایا "اگر مجھے پچھلے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو میں جو بستی فتح کرتا اسے فتح کرنے والوں میں بانٹ دیتا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے خیبر کو بانٹ دیا تھا" (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب الغنيمة لمن شهد الوقعة)

سیدنا عمر کا عراق کی زمینوں کو قومی تحویل میں لینا: جہاں تک اسلامی مملکت کے استحکام اور جملہ مسلمانوں کی خیر خواہی کا تعلق تھا، سیدنا عمرؓ کو اپنی رائے کی اصابت کا مکمل یقین تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی ایسی نص قطعی پیش نہ کر سکتے تھے جس سے وہ مجاہدین، سیدنا عبدالرحمنؓ بن عوف اور سیدنا بلالؓ کو قائل کر سکیں۔ چونکہ دلائل دونوں طرف موجود تھے۔ لہٰذا سیدنا عمرؓ نے فیصلہ کے لیے دس افراد پر مشتمل مجلس مشاورت طلب کی۔ اس مجلس میں پانچ قدماء مہاجرین اور پانچ انصار (اوس و خزرج) شریک ہوئے۔ سیدنا عثمانؓ اور سیدنا طلحہؓ نے سیدنا عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔ کئی دن بحث چلتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ سیدنا عمرؓ اس سلسلہ میں خاصے پریشان رہتے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے سیدنا عمرؓ کو یہی الفاظ ﴿وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ سجھا دیئے جو اس بحث کو طے کرنے کے لیے نص قطعی کا درجہ رکھتے تھے اور یہ ایسی دلیل تھی جس کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ سیدنا عمرؓ نے ایک اجتماع عام بلا کر اس میں اسی جملہ کے حوالہ سے پرزور تقریر فرمائی جس پر سب لوگوں نے یک زبان ہو کر اعتراف کیا کہ آپ کی رائے درست ہے۔ یہاں یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ یہ الفاظ تو مدتوں پہلے نازل ہو چکے تھے۔ جنہیں سیدنا عمرؓ سمیت سب صحابہ سینکڑوں مرتبہ پڑھ چکے تھے۔ لیکن ان کے اطلاق (Implication) کا معاملہ ابھی تک سامنے آیا ہی نہ تھا۔ اور جب معاملہ سامنے آگیا تو اللہ تعالیٰ نے آیات الٰہی میں غور کرنے پر سیدنا عمرؓ کو ان الفاظ کا مفہوم اور اس کی وسعت بھی سجھا دی۔ قرآن کا یہی وہ اعجاز ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کتاب کے عجائب لامتناہی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

اس واقعہ سے ضمناً درج ذیل امور پر بھی روشنی پڑتی ہے:۔

نزاع کے وقت امیر کے اختیارات کی تعیین: ۱۔ امیر فیصلہ کرتے وقت کثرت رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ فیصلہ کی اصل بنیاد اس کا بنیادی اطمینان یا انشراح صدر ہے۔ کیونکہ اس معاملہ میں اکثریت کی رائے سیدنا عمرؓ کی رائے کے خلاف تھی۔

۲۔ امیر اپنی مرضی یا رائے عوام پر ٹھونسنے کا حق نہیں رکھتا۔ بلکہ انہیں شرعی دلیل سے قائل کرنا اور انہیں اپنے اعتماد میں لینا ضروری ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام کا نظام حکومت استبدادی نہیں بلکہ شورائی ہے اور مشورہ میں مقصود دلیل کی تلاش ہے۔ خواہ وہ ایک آدمی سے مل جائے۔ یہاں کثرت رائے فیصلہ کی بنیاد نہیں ہوتی۔

۳۔ آخری فیصلہ کا اختیار میر مجلس کو ہوتا ہے۔

رَّحِيمٌ ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ ع ۲

لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ

يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝١١ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ

لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ۝١٢ لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے منافقت کی۔ وہ اپنے اہل کتاب کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ: "اگر تم جلاوطن کیے گئے تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ اور تمہارے بارے میں کبھی کسی کی بات نہ مانیں گے۔ اور اگر تم سے جنگ ہوئی[۱۵] تو یقیناً تمہاری مدد کریں گے" اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ سراسر[۱۶] جھوٹے ہیں(۱۱) اگر وہ (یہودی) نکالے گئے تو یہ (منافق) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔ اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو (منافق) ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو پشت دکھا کر بھاگ نکلیں گے۔ پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔(۱۲) ان کے دلوں میں اللہ کے خوف سے زیادہ تمہاری دہشت[۱۷] ہے۔

[۱۴] صحابہ کرام سے دشمنی رکھنے والوں کو تنبیہ:۔ اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ صحابہ کرام سے خواہ وہ مہاجرین ہوں یا انصار۔ بغض عداوت، کینہ یا بیر رکھے اسے سب سے پہلے اپنے ایمان کی سلامتی کی دعا کرنا چاہئے۔ پھر یہ دعا کرنا چاہئے کہ یا اللہ ہمارا یہ گناہ معاف فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کو معاف فرما جو ایمان لانے میں ہم سے سبقت لے چکے ہیں اور اگر ہمارے دلوں میں ان کے متعلق کچھ کینہ رہ گیا ہے تو اسے بھی نکال دے۔ سچا مسلمان وہی ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس پاکباز جماعت سے محبت رکھے اور انہیں اپنا قائد تسلیم کرے اور امام مالکؒ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص صحابہ سے بغض رکھے اور ان کی بدگوئی کرے، مال فے میں اس کے لیے کچھ حصہ نہیں۔

[۱۵] اس سے مراد عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کی طرف سے بنو نضیر کے نام وہ پیغام ہے۔ جس نے یہود کو مزید سرکش بنا دیا تھا۔ اور یہی لوگ منافقوں کے حقیقتاً بھائی تھے۔ اور جس کی تفصیل پہلے اسی سورہ کی آیت نمبر ۲ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔ اس پیغام کا آخری حصہ یہ تھا کہ یہ ہمارا اٹل اور قطعی فیصلہ ہے۔ کہ ہم ضرور تمہاری مدد کو پہنچیں گے۔ تمہارے معاملہ میں ہم اس کے خلاف کسی مسلمان کی بات نہیں مانیں گے نہ اس کی کچھ پروا سمجھیں گے۔

[۱۶] یعنی جو پیغام انہوں نے یہودیوں کو بھیجا ہے۔ وہ بھی سراسر جھوٹ ہے۔ جس سے وہ یہودیوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسا رہے ہیں کہ وہ دلیر ہو کر جنگ لڑیں تو ہمارا کام از خود ہی بن جائے گا اور مسلمانوں سے نجات مل جائے گی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ منافق نہ لڑائی میں ان کا ساتھ دینے کی نیت رکھتے ہیں اور نہ جلاوطنی میں۔ اور اگر وہ لڑائی میں حصہ لیں بھی تو دم دبا کر بھاگ نکلیں گے۔ کیونکہ مکار اور دغاباز لوگ ہمیشہ بزدل اور بھگوڑے ہوا کرتے ہیں۔

[۱۷] یعنی منافقوں کا بنو نضیر سے اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اللہ سے ڈر گئے ہیں۔ یا انہیں اپنے

بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿١٣﴾ لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ ۚ بَأْسُهُم بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾ كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ۖ ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٥﴾

یہ اس لیے کہ وہ سمجھ بوجھ نہیں[18] رکھتے۔(۱۳) یہ اکٹھے ہو کر تم (مسلمانوں) سے جنگ نہیں کریں گے الا یہ کہ قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر (جنگ کریں) ان کی آپس میں شدید مخالفت[19] ہے۔ آپ انہیں متحد سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ[20] بے عقل ہیں(۱۴) ان کا حال ان لوگوں کا سا ہے جو ان سے تھوڑی مدت[21] پہلے اپنے کیے کا مزا چکھ چکے ہیں، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے(۱۵)

دعویٰ اسلام کا کچھ پاس ہونے لگا ہے۔ یا انہیں یہ خطرہ ہے کہ قیامت کے دن انہیں کافروں کی حمایت کے جرم کی پاداش میں سزا ملے گی۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمہارے جیسے سچے مسلمانوں کے آپس میں باہمی اتفاق اور اللہ کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے سے وہ کچھ اس طرح مرعوب ہو چکے ہیں کہ انہیں یہ یقین ہو چکا ہے کہ اگر وہ یہودیوں کی حمایت میں لڑنے کو نکلے تو یہودیوں کے ساتھ یہ خود بھی پس جائیں گے۔

[18] اصل سوجھ بوجھ یہ ہے کہ صرف اللہ سے ڈرا جائے اللہ کے مقابلے میں اور کسی سے نہ ڈرا جائے۔ مگر یہ لوگ بس ایک اللہ سے نہیں ڈرتے۔ باقی سب طرح کے خطرات ان کے سروں پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا جس طرف انہیں اپنے بچاؤ کی صورت نظر آتی ہے۔ اپنے تمام وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر ادھر ہی اپنا رخ موڑ لیتے ہیں۔

[19] یہود اور منافقین میں جرأت کا فقدان:۔ اس آیت کے مخاطب یہود بھی ہیں اور منافقین بھی۔ دونوں ایک جیسے مکار، دغا باز، وعدے کے جھوٹے اور مفاد پرست ہیں۔ ایسے لوگ بزدل ہوتے ہیں کبھی کھلے میدان میں لڑنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہاں ایسی جگہ بیٹھ کر لڑ سکتے ہیں جہاں ان کی جان کو کچھ خطرہ نہ ہو۔ مورچوں میں یا قلعہ بند ہو کر تو یہ تیر و تفنگ کا کھیل کھیل سکتے ہیں مگر سامنے آ کر دست بدست جنگ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ بھلا جسے ہر وقت اپنی جان بچانے کا دھڑکا لگا رہتا ہو تو وہ مقابلہ کیا کر سکتا ہے؟ کیا یہود کیا منافق اور کیا ان کی ذیلی شاخیں۔

ان کے اتحاد کی بنیاد محض اسلام دشمنی ہے:۔ ان سب کے اتحاد کی بنیاد صرف اسلام دشمنی ہے۔ رہے ان کے اندرونی اختلافات اور باہمی عداوتیں تو وہ شدید ہیں۔ لہٰذا ان کا یہ عارضی اور غیر مستقل اتحاد بھی سخت ناپائیدار ہے۔ جو دوران جنگ عین اتحاد کے موقع پر بھی پارہ پارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ جنگ احزاب کے آخر میں قریشیوں اور یہودیوں کا یہ اختلاف ہی ان کی شکست کا ایک اہم سبب بن گیا تھا۔

[20] یعنی انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ اتحاد بھی صرف وہ کام آتا ہے جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور خیالات و نظریات میں ہم آہنگی ہو۔ جب تک وہ اس بات کو نہ سمجھیں گے عارضی طور پر اتحاد کر لینے کے باوجود بھی حق کے مقابلہ میں مار ہی کھاتے رہیں گے۔

[21] تھوڑی مدت پہلے یہود کے قبیلہ بنو قینقاع کو جس قدر ذلت و خواری سے نکالا گیا وہ یہ یہود بنی نضیر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ۧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ع ۲

ان (منافقوں) کی مثال شیطان جیسی ہے کہ وہ انسان [۲۲] سے کہتا ہے کہ کفر کر۔ پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری الذمہ ہوں میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ (۱۶) پھر ان دونوں کا انجام [۲۳] یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔ (۱۷)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر ایک کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل [۲۴] کیلئے کیا سامان کیا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

ہیں اور اس کی تفصیل پہلے اسی سورہ کی آیت ۲ کے حواشی میں گزر چکی ہے اور کافر تھوڑی مدت پہلے جنگ بدر میں اپنی کرتوتوں کی سزا پا چکے ہیں۔ یہ تو انہیں دنیا میں سزا ملی اور آخرت میں دردناک عذاب تو جوں کا توں باقی ہے۔

[۲۲] ❁ شیطان کا طریقہ واردات:۔ شیطان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ انسان کو کئی طرح کے سبز باغ دکھا کر اسے اپنے دام تزویر میں پھنسا لیتا ہے۔ پھر جب انسان شیطانی جال میں پھنس کر اس کا آلہ کار اور ایجنٹ بن جاتا ہے تو شیطان نیا شکار تلاش کرنے لگتا ہے۔ اور پہلے کی طرف سے مطمئن اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ شیطان قیامت کے دن اپنے پیروکاروں کے سامنے ایسی ہی تقریر کر کے خود صاف طور پر بری الذمہ ہونے کی کوشش کرے گا۔ اور اس کی عملی شکل میدان بدر میں پیش آئی۔ جب شیطان میدان بدر میں بنو کنانہ کے رئیس سراقہ بن مالک کی شکل دھار کر نمودار ہوا اور کافروں کو اکسانے اور فتح کی یقین دہانی کرانے لگا۔ پھر جب اس نے اس میدان میں فرشتوں کو مسلمانوں کی مدد کے لیے اترتے دیکھا تو چپکے سے وہاں سے کھسکنے لگا۔ اور اس کی تفصیل سورۂ انفال کی آیت نمبر ۴۸ کے تحت گزر چکی ہے۔

❁ جنگ بدر میں شیطان کی آمد اور فرار:۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ منافقوں نے بھی یہود بنو نضیر سے شیطان کا سا ہاتھ کھیلا۔ انہیں جھوٹے وعدے اور امداد کی جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ پھر جب بنو نضیر نے منافقوں کے ان وعدوں اور انگیخت پر سرکشی اختیار کی اور ان کا محاصرہ ہو گیا تو منافق بڑے اطمینان سے اپنے وعدوں سے دامن جھاڑ کر ان کا تماشہ دیکھتے رہے۔

[۲۳] یعنی گمراہ ہونے والے کو خود عقل و ہوش سے کام لینا چاہئے اور گمراہ کرنے والے سے بچنا چاہیے۔ پھر جب وہ گمراہ ہو گیا تو دونوں ایک جیسے ہو گئے اور ایک دوسرے کے ساتھی بن گئے۔ لہٰذا دونوں کو ایک جیسی سزا ملے گی۔ دونوں ہی ہمیشہ کے لیے دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

[۲۴] ❁ ہر شخص کو آخرت کا دھیان رکھنا چاہئے:۔ کل سے مراد قیامت کا دن یا اخروی زندگی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اس کی دنیا کی پوری زندگی "آج" ہے۔ دنیا دار العمل ہے جس کا پھل اسے عقبیٰ میں یا آخرت میں ملے گا، جو کچھ بوئے گا، وہی کچھ کاٹے گا اور جتنا بوئے گا اتنا ہی کاٹے گا۔ ان اصولوں کے تحت ہر انسان کو خود اپنا محتسب بنایا گیا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اعمال پر خود نظر رکھے۔ اسے سیدھے اور غلط راستے، نیکی اور بدی، اچھے اور برے کی تمیز بھی عطا کر دی گئی ہے اور پوری وضاحت کے ساتھ سب کچھ بتا بھی دیا گیا ہے۔ اب یہ اس کا اپنا کام ہے کہ وہ خود دیکھتا رہے کہ وہ کون سی راہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس راہ

إِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ
أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِيٓ أَصْحٰبُ النَّارِ وَأَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ
هُمُ الْفَآئِزُونَ ﴿۲۰﴾ لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهٗ خٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا

جو کچھ تم کرتے ہو اللہ یقیناً اس سے پوری طرح باخبر ہے۔(۱۸) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول [۲۵] گئے تو اللہ نے انہیں ایسا بھلایا کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔ یہی لوگ فاسق ہیں(۱۹) اہل دوزخ اور اہل جنت کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اہل جنت ہی (اصل میں) کامیاب ہیں(۲۰) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے [۲۶] دبا جا رہا ہے

پر وہ گامزن ہے۔ وہ اسے جہنم کی طرف لے جا رہی ہو؟ اور سورہ قیامہ میں فرمایا کہ انسان کو اتنی سمجھ دے دی گئی ہے کہ وہ اپنے اعمال کا خود ہی محاسبہ کر سکے۔ اگر وہ اپنے حق میں مصالحت اور بہانہ تراشیاں چھوڑ دے تو وہ اپنے اعمال کا وزن کر سکتا ہے۔ اور اسے ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے' اس لیے کہ اگر وہ ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہے گا تو سیدھے راستے سے چوکے گا نہیں۔ اور نہ ہی اللہ کی نافرمانی کے کام کرے گا۔ دوسری بات جو اسے ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے یہ ہے کہ اس کا مال و دولت، اس کی تندرستی، اس کی استعداد اور اس کی سرگرمیاں آیا دنیا کے حصول تک ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہیں یا وہ آخرت کے لیے کچھ سامان مہیا کر رہا ہے۔ یہ احتساب خود اسے ایسی باتوں پر آمادہ کر دے گا جو آخرت میں اس کے لیے سود مند ہوں۔

[۲۵] ❁ اللہ کو بھولنے کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کو بھول جانے یا بھلائے رکھنے کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ کی معرفت سے ہی انسان کو اپنی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ جو انسان اس بات پر غور نہیں کرتا کہ اس کائنات میں اللہ کی کیا حقیقت ہے اور اس کی اپنی کیا حیثیت ہے۔ وہ ہمیشہ غلط راستوں پر پڑ کر اپنی عاقبت برباد کر لیتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اس کائنات کا بھی اور خود اس کا بھی خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی سب چیزوں کا خالق، مالک اور پروردگار ہے اور انسان اس کی مخلوق، مملوک اور محتاج ہے۔ لہٰذا انسان کی ہر طرح کی عبادتوں اور نیاز مندیوں کا وہی مستحق ہے۔ وہی اس کا حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ باقی سب چیزیں بھی اسی طرح اللہ کی مخلوق، مملوک اور محتاج ہیں۔ اس لحاظ سے وہ انسان کے برابر ہوئیں۔ لیکن چونکہ وہ اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے اس لحاظ سے وہ باقی تمام مخلوق سے برتر ہوا۔ اب اگر ایک برتر مخلوق اپنے جیسی یا اپنے سے بھی کم تر مخلوق کی عبادت کرے یا اسکی حاکمیت کو تسلیم کرے یا اس کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھے تو گویا اس نے انسانیت کے مرتبہ کی تذلیل اور توہین کی۔ یہی خالق و مخلوق کے درمیان باہمی رشتہ ہے۔ اس کو ملحوظ رکھے گا تو کبھی اللہ کا نافرمان نہیں ہو گا۔ اور اس رشتہ کو فراموش کر دے گا تو اس کی زندگی غلط راستوں پر پڑ کر فسق و فجور میں گزرے گی۔ اور وہ اپنے اخروی انجام سے بھی بے خبر اور غافل ہی رہے گا۔ لہٰذا صحیح راستے پر ثابت قدم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہر وقت اپنا پروردگار یاد رہے اس سے غافل ہوتے ہی وہ اپنے آپ اور اپنے انجام کو بھول کر فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے گا۔

[۲۶] ❁ قرآن کی عظمت اور انسان کی غفلت۔ یعنی اگر پہاڑوں جیسی عظیم الجثہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ وہ سمجھ، اختیار اور عقل و شعور عطا

مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾ هُوَ اللّٰهُ
الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ

اور پھٹا پڑتا ہے۔ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ غور و فکر کریں۔(۲۱) وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ غائب[۲۷] اور حاضر ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ وہ نہایت مہربان[۲۸] اور رحیم ہے۔(۲۲) وہ اللہ ہی[۲۹] ہے

کر دیا، جو انسان کو عطا کی گئی ہے پھر انہیں یہ بتایا جاتا کہ تمہیں اللہ کا فرمانبردار بن کر رہنا ہوگا اور پھر تمہارے اعمال کی تم سے باز پرس بھی ہوگی تو وہ بھی اس تصور سے کانپ اٹھتے لیکن انسان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اس بار امانت کو اٹھا لینے کے بعد بھی اس پر نہ خوف طاری ہوتا ہے اور نہ ہی اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اگر اس نے اپنی زندگی غفلت اور خدا فراموشی میں گزار دی تو آخرت میں اپنے پروردگار کے سامنے کیا جواب دے گا اور اس کی گرفت سے کیسے بچ سکے گا۔ بلکہ وہ قرآن سن کر اور تمام حقائق پر مطلع ہونے کے بعد بھی ایسے غیر متاثر رہتا ہے جیسے کوئی بے جان اور بے شعور پتھر ہو۔ جسے ان بے جان چیزوں کے علاوہ کوئی انسانی قوتیں دی ہی نہیں گئیں۔

[۲۷] ۞ غیب اور شہادت سے کیا مراد ہے؟ شہادت سے مراد وہ تمام اشیاء، واقعات اور علوم ہیں جو انسان کے علم میں آ چکے ہیں یا جنہیں وہ مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل کر چکا ہے اور غیب سے مراد وہ تمام اشیاء واقعات اور علوم ہیں جن تک تا حال انسان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ خواہ یہ اشیاء عالم اکبر یا کائنات سے متعلق ہوں یا عالم اصغر یا انسان کے جسم کی اندرونی کائنات سے متعلق ہوں۔ اور اللہ کے لیے سرے سے کوئی چیز غائب ہے ہی نہیں۔ اس کے لیے سب کچھ شہادت ہی شہادت ہے۔ اور قرآن میں جہاں یہ غیب اور شہادت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں تو صرف انسان کو سمجھانے کی غرض سے استعمال ہوئے ہیں۔ اور اللہ کے لیے کوئی چیز غائب اس لیے نہیں ہوتی کہ ہر چیز کو اور ہر واقعہ اور حادثہ کو وجود میں لانے والا تو وہ خود ہے۔ لہٰذا اس سے کوئی چیز مخفی یا غائب کیسے رہ سکتی ہے؟

[۲۸] ۞ رحمٰن اور رحیم میں فرق:۔ وہ رحمٰن اور رحیم اس لحاظ سے ہے کہ ہر چیز کے وجود، اس کی زندگی اور زندگی کے بقا کے لیے جو جو اشیاء، ضروری اور لازمی تھیں وہ اس نے اس کی پیدائش سے پہلے ہی مہیا فرما دی ہیں اور یہ اس کی کمال مہربانی ہے۔ کائنات میں کوئی دوسرا اس غیر محدود رحمت کا حامل نہیں ہے۔ دوسرے جانداروں میں اگر رحم کی صفت پائی بھی جاتی ہے۔ تو ایک تو وہ جزوی اور محدود ہوتی ہے دوسری یہ کہ وہ اس کی ذاتی صفت نہیں ہوتی۔ بلکہ اللہ ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے اور اسے اس لیے عطا کی گئی ہے کہ وہ دوسری مخلوق کی پرورش اور خوشحالی کا ذریعہ بنے۔ جیسے والدین اپنی اولاد کے حق میں رحیم ہوتے ہیں، اور یہ چیز بذات خود اس کی رحمت بے پایاں کی دلیل ہے۔ واضح رہے کہ رحمٰن صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور اس میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اور اس کا تعلق ان رحمتوں اور انعامات سے ہے جو زندگی اور اس کی بقاء کے لیے ضروری ہیں مثلاً انسان کی پیدائش سے پہلے سورج، چاند، ہوا، بارش اور زمین میں قوت روئیدگی کا انتظام کرنا۔ یا حمل قرار پاتے ہی ماں کے پستانوں کی مشینری کا متحرک ہونا، خون کو دودھ میں تبدیل کرنے کا عمل اور بچہ کی پیدائش پر ماں کے پستانوں میں دودھ اتر آنا اور بچے کو دودھ کی طرف لپکنے اور دودھ چوسنے کا طریقہ سکھانا۔ جبکہ رحیم اللہ کے علاوہ دوسری مخلوق بھی ہو سکتی ہے۔

[۲۹] آیت نمبر ۲۲ سے ۲۴ تک تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی جامع صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ تاکہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی پوری

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ

جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ بادشاہ[۳۰] ہے، پاک ذات[۳۱]، سراسر سلامتی[۳۲] والا، امن دینے[۳۳] والا، نگہبان[۳۴]، ہر چیز پر غالب[۳۵]، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا[۳۶] اور کبریائی والا[۳۷] ہے۔

معرفت حاصل ہو اور وہ خود فراموشی یا غفلت سے بچا رہے۔ چند نام تو آیت ۲۲ میں گزر چکے ہیں۔ مزید جو بیان ہوئے وہ یہ ہیں:

[۳۰] الملك یعنی علی الاطلاق بادشاہ، کسی مخصوص علاقے، ملک یا پوری زمین کا ہی نہیں، بلکہ پوری کائنات کا بادشاہ، اور بادشاہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنی مملکت میں جو قانون چاہے رائج کرے اور اس کو نافذ کرے اور اس کی رعایا یا مملوک اس قانون کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پوری کائنات میں قانونی حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہی مقتدر اعلیٰ (Sovereign) ہے۔ اسی کی حاکمیت اور اسی کا قانون سب سے بالاتر ہے۔

[۳۱] القُدُّوْس۔ قَدُسَ کے معنی پاک وصاف ہونا ہے اور قدوس سے مراد وہ ذات ہے جو اضداد اور انداد (جمع ند بمعنی شریک) سے پاک ہو۔ (مقائیس اللغة) اور صاحب منجد کے نزدیک وہ ذات جو ہر بری بات اور نقص سے پاک ہو اور بابرکت بھی ہو۔

[۳۲] السَّلاَمُ۔ سلم یعنی بے گزند اور درست۔ صحیح وسالم اور بمعنی ظاہری اور باطنی آفات سے پاک اور محفوظ رہنا اور سلم ایسی چیز جو اپنی ذات میں درست بھی ہو اور اس پر کسی دوسرے کا کوئی حق نہ ہو۔ اور السلام کے معنی سراسر سلامتی ہی سلامتی۔ اس میں از خود مبالغہ پیدا ہو جاتا ہے جیسے کسی حسین کو یہ کہہ دیا جائے کہ وہ سراپا حسن ہے۔ سلام کا ایک مطلب تو مندرجہ معنی سے واضح ہے اور دوسرا مطلب یہ کہ وہ دوسروں کو بھی سلامتی عطا کرنے والا ہے۔

[۳۳] المؤمن۔ اَمِنَ بمعنی خوف وخطر سے محفوظ ہونا اور مؤمن کے معنی دوسروں کو امان دینے والا۔ امن عطا کرنے والا۔ یعنی ایسا قانون دینے والا جس سے فساد فی الارض کے بجائے امن وامان قائم ہو نیز مخلوق اللہ کی طرف سے کسی قسم کی حق تلفی، زیادتی یا ظلم کے خوف سے مکمل طور پر امن میں رہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کے معنی مصدق کے ہیں۔ یعنی اپنی اور اپنے رسولوں کی قولاً اور فعلاً تصدیق کرنے والا یا مومنوں کے ایمان پر مہر تصدیق ثبت کرنے والا ہے۔

[۳۴] ❁ اسمائے حسنیٰ کی لغوی تشریح:۔ المُهَيْمِنُ کہتے ہیں هَيْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰى فِرَاخِهٖ یعنی پرندے نے اپنے پر اپنے بچے پر بچھا دیے۔ جیسے مرغی خطرہ کے وقت اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ لہٰذا مھیمن وہ ذات ہے جو (۱) کسی کو خوف سے امن دے، (۲) ہر وقت نگہبانی رکھے اور (۳) کسی کا کوئی حق ضائع نہ ہونے دے (منتہی الارب)

[۳۵] العزیز بمعنی بالادست (ضد ذلیل بمعنی زیردست) جیسے دیہات میں ایک طبقہ کمین لوگوں کا ہوتا ہے جو زیردست ہوتا ہے اور دوسرا زمینداروں کا جو بالادست ہوتا ہے۔ اور العزیز سے مراد وہ بالادست ہستی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی سر نہ اٹھا سکتا ہو۔ جس کی مزاحمت کرنا کسی کے بس میں نہ ہو۔ جس کے آگے سب بے بس' بے زور اور کمزور ہوں۔

[۳۶] الجَبَّارُ۔ جبر میں دو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں۔ (۱) زبردستی کرنا (۲) اصلاح۔ یعنی زبردستی اور دباؤ سے کسی چیز کی اصلاح کر دینا۔ اور جَبَرَ العظم بمعنی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو درست کرنا۔ نیز کبھی یہ لفظ محض زبردستی کرنے کے معنوں میں بھی آ جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جبار اس لحاظ سے ہے، کائنات کے نظام کو بزور درست رکھنے والا ہے اور اپنے ارادوں کو جو سراسر حکمت پر مبنی ہوتے ہیں پوری قوت سے نافذ کرنے والا ہے۔

[۳۷] المُتَكَبِّرُ کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص فی الحقیقت بڑا نہ ہو مگر بڑا بننے کی کوشش کرے۔ خواہ وہ کوئی جن ہو یا

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾

اللہ ان باتوں سے پاک[۳۸] ہے جو یہ لوگ اس کا شریک بناتے ہیں (۲۳) وہ اللہ ہی ہے جو پیدا[۳۹] کرنے والا ہے۔ سب کا موجد[۴۰] اور صورتیں عطا کرنے والا[۴۱] ہے۔ اس کے سب نام اچھے[۴۲] ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو مخلوقات ہیں سب اسی کی تسبیح کر رہی ہیں اور وہ زبردست ہیں، حکمت والا ہے۔ (۲۴)

انسان اور یہ صفت انتہائی مذموم ہے۔ دوسرا وہ جو فی الحقیقت بڑا ہو اور بڑا ہی ہو کر رہے۔ اور یہ صفت صرف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔ اور اس کے حق میں یہ ایک خوبی ہے جو دوسری کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔ کائنات کی باقی تمام چیزیں خواہ جاندار ہوں یا بے جان اس کے مقابلہ میں چھوٹی یا حقیر ہیں۔

[۳۸] یعنی جو لوگ اللہ کی ذات یا صفات میں دوسروں کو بھی شریک بنا لیتے ہیں وہ اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ کیونکہ اللہ ایسی تمام باتوں سے پاک ہے۔ اس کے اختیارات و تصرفات میں کسی کو ذرہ بھر بھی دخل نہیں۔

[۳۹] اَلْخَالِقُ۔ خلق کا لفظ تین معنوں میں آتا ہے۔ (۱) کسی چیز کو بنانے کے لیے اس کا اندازہ لگانا یا خاکہ تیار کرنا۔ گویا تخلیق کا کام ذہنی بھی ہو سکتا ہے اور اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ (۲) کبھی یہ لفظ ابداع کے معنوں میں بھی آ جاتا ہے۔ یعنی پہلی بار بنانا اور کسی نمونہ کے یا کسی تقلید کے بغیر بنانا۔ انوکھی چیز بنانا قرآن کریم میں جیسے اللہ تعالیٰ کے لیے ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ ہے ویسے ہی ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ بھی آتا ہے۔ اس صورت میں اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف نہیں ہو سکتی۔ (۳) اور خلق کا عام مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز سے دوسری چیز بنائی جائے۔ پہلے مادہ موجود ہو تو اس سے کوئی دوسری چیز بنائی جائے۔ اس صورت میں بھی اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف ہو سکتی ہے۔ اور اس لحاظ سے اللہ خالق ہی نہیں بلکہ احسن الخالقین ہے۔

[۴۰] اَلْبَارِئُ۔ برأ بمعنی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا، جامۂ خلقت پہنانا، کسی چیز کا مادہ بھی وجود میں لانا پھر اس سے تخلیق کرنا یا بغیر مادہ کے تخلیق کرنا اور یہ صفت صرف اللہ کی ہے۔ دوسرا کوئی باری نہیں ہو سکتا۔

[۴۱] اَلْمُصَوِّرُ بمعنی صورت بنانے والا۔ تصویر بنانے والا۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ رحم مادر میں نطفہ اور مضغہ پر نقش و نگار بناتا ہے کسی کے نقوش تیکھے، کسی کے بھدے، کسی کی آنکھیں موٹی، کسی کی چھوٹی، کسی کا قد چھوٹا کسی کا بڑا۔ دوسرا پہلو یہ کہ ہر جاندار کی شکل و صورت الگ الگ ہے۔ انسان کی صورت الگ ہے، گھوڑے کی الگ، شیر کی الگ، بکری کی الگ، وغیرہ وغیرہ، تیسرا پہلو نباتات اور مختلف قسم کے پھولوں کی شکل و صورت ہے۔ غرضیکہ ہر چیز کو اللہ نے ایک صورت عطا فرمائی اور وہ بڑی اچھی صورت بنانے والا ہے۔

[۴۲] اللہ کے ماسوائے اللہ تعالیٰ کے باقی سب نام صفاتی ہیں۔ اور چونکہ اللہ کی سب صفات بہترین ہیں۔ لہٰذا اس کے سب نام بھی اچھے ہیں۔ جو اعلیٰ درجہ کی خوبیوں اور کمالات پر دلالت کرتے ہیں۔ عیب اور نقص والی کوئی صفت اس میں ہے ہی نہیں۔ احادیث صحیحہ کے مطابق ان ناموں کی تعداد ننانوے ہے۔ ان کو حفظ کرنا اور صبح و شام ان کو پڑھنا باعث خیر و برکت ہے۔

۱۳ آیاتها سُوْرَۃُ الْمُمْتَحِنَۃِ مَدَنِيَّۃٌ رکوعها ۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاۗءَكُمْ

کلمات ۳۷۰ آیات ۱۳ (۶۰) سورۃ الممتحنہ مدنی ہے (۹۱) رکوع ۲ حروف ۱۵۹۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کی طرف محبت کی طرح ڈالتے ہو۔ حالانکہ جو حق تمہارے پاس[1] آیا ہے وہ اس کا انکار کر چکے ہیں۔

[1] غزوہ مکہ کا فوری سبب۔ معاہدہ حدیبیہ، جسے اللہ نے فتح مبین قرار دیا ہے، کی دوسری شرط کے مطابق بنو خزاعہ مسلمانوں کے اور بنو بکر قریش کے حلیف بن چکے تھے۔ اس صلح کے ڈیڑھ سال بعد بنو خزاعہ اور بنو بکر کی آپس میں لڑائی ہو گئی تو قریش مکہ نے معاہدہ کے برخلاف کھلم کھلا بنو بکر کی بھرپور مدد کی اور جب بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی تو انہیں وہاں بھی نہ چھوڑا۔ اس واقعہ کے بعد بنو خزاعہ کے چالیس شتر سوار فریاد کے لیے مدینہ پہنچے۔ آپ ﷺ کو قریش کی اس بدعہدی پر سخت افسوس اور صدمہ ہوا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے قریش کے لیے مندرجہ ذیل تین شرطیں پیش کیں:

۱۔ بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے، (۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں، (۳) اعلان کیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ختم ہو گیا۔

قاصد نے جب یہ شرائط قریش کے سامنے پیش کیں تو ان کا نوجوان طبقہ بھڑک اٹھا اور ان میں سے ایک جوشیلے نوجوان قرط بن عمر نے قریش کی طرف سے اعلان کر دیا کہ "صرف تیسری شرط منظور ہے" جب قاصد واپس چلا گیا تو ان لوگوں کا جوش ٹھنڈا ہو کر ہوش و حواس درست ہوئے اور سخت فکر دامنگیر ہو گئی۔ چنانچہ ابو سفیان کو تجدید معاہدہ کے لیے مدینہ بھیجا گیا۔ اس نے آپ ﷺ سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی مگر آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے علی الترتیب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حتیٰ کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تک سے سفارش کے لیے التجا کی لیکن سب نے یہی جواب دیا کہ ہم اس معاملہ میں دخل نہیں دے سکتے۔ لاچار اس نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر یکطرفہ ہی اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔

غزوہ مکہ کی مہم میں رازداری۔ قریش کی بدعہدی ہی حقیقتاً اعلان جنگ کے مترادف تھی۔ پھر ان کے صرف تیسری شرط منظور کرنے سے مزید تاخیر کی گنجائش بھی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے نہایت رازداری سے مکہ پر چڑھائی کی مہم کا آغاز کیا۔ حلیف قبائل کو جو پیغامات بھیجے گئے ان میں بھی یہ رازداری ملحوظ رکھی گئی تھی اور جس وقت ابو سفیان مدینہ پہنچا اس وقت آپ اس مہم کا آغاز فرما چکے تھے۔ لہٰذا اب تجدید معاہدہ کا وقت گزر چکا تھا۔ اسی لیے آپ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جس قدر رازداری سے آپ نے اس موقع پر کام لیا۔ پہلے کبھی نہ لیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مکہ حرم تھا اور وہاں لڑائی کرنا مکہ کے

احترام کے خلاف تھا۔ آپ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ کفار مکہ کو خبر تک نہ ہو اور آپ ایک عظیم لشکر لے کر وہاں پہنچ جائیں۔ جس سے کفار مرعوب ہو کر مقابلہ کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔ گویا آپ ﷺ اس رازداری سے دو فائدے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک یہ کہ مکہ فتح ہو جائے دوسرا یہ کہ وہاں کشت و خون بھی نہ ہو۔

۞ **حاطب بن ابی بلتعہ کا کفار مکہ کو خط بھیجنا اور راز فاش ہونے کا خطرہ:۔** انہی دنوں ایک نہایت سچے مسلمان حاطب ابن ابی بلتعہ سے ایک فاش غلطی ہو گئی۔ ان کے بال بچے مکہ میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قریش مکہ کو اس راز سے مطلع کر کے ان پر ایک احسان کر دیں تاکہ وہ اس دوران اس احسان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے بال بچوں کو گزند نہ پہنچائیں۔ مکہ سے سارہ نامی ایک عورت مدینہ آئی ہوئی تھی۔ حاطب رضی اللہ عنہ نے اس عورت کی خدمات حاصل کیں۔ ایک خط لکھ کر اس کے حوالہ کیا جو سرداران قریش کے نام تھا۔ اور اسے یہ تاکید کی کہ نہایت راز سے یہ خط کسی قریشی سردار کے حوالے کر دے اور اس عورت کی اس خدمت کے عوض اسے دس دینار بھی دے دیئے۔ اس طرح اس عورت کی حیثیت سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے قاصد کی بن گئی تھی۔ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کا یہ خط چونکہ بنے بنائے سارے کھیل پر پانی پھیر دینے کے مترادف تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی مدینہ سے روانگی کے فوراً بعد آپ کو بذریعہ وحی اس معاملہ سے مطلع فرما دیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اقدام کیا وہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

۞ **آپ کا خط واپس لانے کے لئے وفد بھیجنا:۔** "سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے، زبیر رضی اللہ عنہ اور مقداد رضی اللہ عنہ تین آدمیوں کو (ایک مہم پر) روانہ کیا۔ فرمایا (مکہ کے رستہ پر) روضہ خاخ (ایک مقام کا نام) تک جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک عورت (سارہ) ملے گی جو اونٹ پر سوار ہو گی۔ اس کے پاس ایک خط ہے وہ لے آؤ۔ چنانچہ ہم تینوں گھوڑے دوڑاتے روضہ خاخ پہنچ گئے تو فی الواقع وہاں ایک شتر سوار عورت ملی۔ ہم نے اسے کہا: "جو تمہارے پاس خط ہے وہ نکال دو" وہ کہنے لگی: "میرے پاس تو کوئی خط نہیں" ہم نے کہا: "نکال دو تو خیر ورنہ ہم تمہارے کپڑے اتار دیں گے" چنانچہ اس نے اپنے جوڑے میں سے وہ خط نکال کر ہمیں دے دیا اور ہم وہ خط آپ ﷺ کے پاس لے آئے۔ اس خط کا مضمون یہ تھا: "حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے چند مشرکین مکہ کے نام۔ اور اس میں انہیں نبی اکرم ﷺ کے معاملہ (مکہ پر چڑھائی) کی خبر دی گئی تھی۔

۞ **حاطب بن ابی بلتعہ سے باز پرس:۔** نبی اکرم ﷺ نے حاطب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: حاطب رضی اللہ عنہ! یہ کیا بات ہے؟ (تم نے جنگی راز کیوں فاش کر دیا؟) حاطب نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! میرے معاملہ میں جلدی نہ کیجئے۔ (اور میری بات سن لیجئے) میں ایک ایسا آدمی ہوں جو اصل قریشی نہیں۔ آپ کے ساتھ جو دوسرے مہاجر ہیں (وہ اصل قریشی ہیں) ان کے رشتہ دار قریش کے کافروں میں موجود ہیں جن کی وجہ سے ان کے گھربار اور مال واسباب محفوظ رہتے ہیں۔ میں نے یہ چاہا کہ میرا ان سے کوئی نسبی رشتہ تو ہے نہیں میں ان پر کچھ احسان کر کے اپنا حق قائم کروں تاکہ وہ میرے رشتہ داروں کی حمایت کریں۔

۞ **آپ کا سیدنا حاطب کی معذرت قبول کرنا:۔** میں نے یہ کام کفر یا اپنے دین سے پھر جانے کی بنا پر نہیں کیا" یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے (مسلمانوں سے) کہا: "حاطب نے تم سے سچ سچ بات کہہ دی" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "یارسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں" آپ ﷺ نے فرمایا: "دیکھو! یہ جنگ بدر میں شریک تھا اور تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ نے اہل بدر پر (عرش معلی سے) جھانکا پھر فرمایا: "(ماسوائے شرک کے) تم جو بھی عمل کرو میں نے تمہیں بخش دیا" عمرو بن دینار

مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ ۙ أَن تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِن كُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي ۚ تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنتُمْ ۚ وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ

وہ رسول کو اور خود تمہیں بھی اس بنا پر جلاوطن[۲] کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اب اگر تم (برائے فتح مکہ) میری راہ میں جہاد اور میری رضاجوئی کی خاطر نکلے ہو تو خفیہ[۳] طور پر انہیں دوستی کا نامہ و پیام بھیجتے ہو؟ حالانکہ جو کچھ تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو میں اسے خوب جانتا[۴] ہوں۔ اور تم سے جو بھی ایسا کام کرے وہ سیدھی راہ[۵] سے بھٹک گیا(۱)

کہتے ہیں کہ یہ آیت اسی باب میں نازل ہوئی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۲] یعنی کفار مکہ کا تم سے یہ سلوک تھا کہ انہوں نے تمہاری زندگی اس قدر اجیرن بنا رکھی تھی کہ تم ترک وطن پر مجبور ہو گئے تھے اور تمہارا ان سے یہ سلوک ہو کہ تم ان کے لیے جنگی راز تک فاش کر ڈالتے ہو۔ تاکہ وہ اپنی ٹھیک ٹھاک مدافعت کا انتظام کر سکیں۔ اور اس معاملہ میں تم مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کو بھی نظرانداز کر رہے ہو؟ علاوہ ازیں ان لوگوں نے تمہیں ہجرت پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ تم نے ان کا کچھ بھی نہ بگاڑا تھا۔ ان کی نظروں میں اگر تمہارا کچھ جرم تھا تو صرف یہ کہ تم اللہ پر ایمان لے آئے تھے؟

[۳] اب اگر تم محض میری رضا کی خاطر اس مہم میں شریک ہو رہے ہو تو کیا یہ کام تم نے میری رضا کے مطابق کیا ہے یا اس کے خلاف؟ اللہ تعالیٰ کے اس عتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمرؓ کو جو سیدنا حاطبؓ پر غصہ آیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے سیدنا حاطب کو قتل کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ تو وہ بھی بہت حد تک حق بجانب تھے کیونکہ سیدنا عمرؓ جنگی اسرار و رموز اور ان کے نتائج سے پوری طرح واقف تھے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حاطب کو اس لیے معاف فرما دیا کہ ان کی نیت میں کوئی فتور نہ تھا۔ نیز سیدنا حاطبؓ ایسے راز کے فاش کر دینے کے نتائج سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اپنی نرمی طبع کی بنا پر خیر کے پہلو کو ترجیح دیتے ہوئے سیدنا حاطبؓ کو معاف فرما دیا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ اللہ نے مسلمانوں کو سیدنا حاطبؓ کے اس فعل کے برے نتائج سے بچا لیا تھا۔

[۴] ﷺ ان آیات سے کن کن چیزوں پر ثبوت مہیا ہوتا ہے؟:۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر تم نے نہایت رازداری سے کوئی خط قریش مکہ کو بھیجا ہے تو اللہ کو بھی اس کا علم نہ ہو گا؟ اور تمہاری اتنی فاش غلطی کو بھی وہ چھپا ہی رہنے دے گا؟ یہ آیات بھی منجملہ ان آیات کے ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی ہستی، آپ ﷺ کے اللہ کا رسول ﷺ ہونے، قرآن کے منزل من اللہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کے صریح ثبوت مہیا ہوتے ہیں۔

[۵] ﷺ اگر کوئی مسلمان دانستہ راز فاش کر دے تو وہ قابل گردن زدنی ہے:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی سچا مسلمان غلطی سے یا نتائج سے اپنی نافہمی کی بنا پر کوئی جنگی راز فاش کر دے تو وہ کافر نہیں ہو جاتا۔ مسلمان ہی رہتا ہے۔ البتہ اس کا یہ جرم قابل مواخذہ ضرور ہے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان دانستہ طور پر اور جان بوجھ کر ایسا کام کرے تو وہ منافق بھی ہے کافر بھی ہو جاتا ہے

سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١﴾ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ
وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٢﴾ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ﴿٣﴾ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰۗؤُا مِنْكُمْ

اگر وہ تمہیں پالیں تو تمہارے دشمن بن جائیں اور بُرے ارادوں سے تم پر دست درازی اور زبان درازی[۶] کریں۔ اور یہ چاہیں کہ تم (پھر) کافر بن جاؤ(۲) قیامت کے دن نہ تمہارے رشتے ناطے کچھ فائدہ دیں گے اور نہ تمہاری اولاد۔ وہ تمہارے درمیان[۷] جدائی ڈال دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے(۳) تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ[۸] ہے۔ جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ: "ہم تم سے قطعی بیزار ہیں

اور گردن زدنی بھی اس کا یہ جرم معاف نہیں کیا جا سکتا۔

[۶] اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس خوش فہمی کی بنا پر سیدنا حاطبؓ نے یہ کام کیا تھا۔ وہ توقع بھی عبث اور لاحاصل تھی۔ ان کافروں کے دلوں میں تمہارے لیے اس قدر بغض و عناد ہے کہ وہ تمہیں زندہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ کسر صرف اتنی ہے کہ ان کا بس نہیں چل رہا۔ اور اگر کسی وقت تم پر ان کا بس چل جائے تو پھر وہ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کر چکے ہیں۔ ان کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لیے صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ تم بھی انہی کی طرح پھر سے کافر بن جاؤ اور ان کی جمعیت میں شامل ہو جاؤ۔ بتاؤ کیا تم یہ پسند کرو گے؟

[۷] تم نے یہ کام صرف اس لیے کیا کہ مکہ میں تمہارے بال بچے کافروں کی ایذا رسانی سے محفوظ رہیں۔ تم نے اپنے بال بچوں کے مفاد کو اسلام کے اجتماعی مفاد کے مقابلہ میں ترجیح دی۔ حالانکہ قیامت کے دن تمہارے یہ بال بچے تمہارے کسی کام نہ آ سکیں گے۔ بال بچوں کی خاطر جس خطرناک غلطی کا تم نے ارتکاب کیا ہے۔ اگر اللہ تمہیں اس کی پاداش میں پکڑے تو کیا یہ بال بچے تمہیں اللہ سے بچا سکیں گے؟

[۸] سیدنا ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا اپنی قوم کو دو ٹوک جواب تمہارے لئے نمونہ ہے:۔ تم سے پہلے تمہارے لیے ایک اچھی مثال موجود ہے اور وہ تمہارے لیے قابل تقلید ہے۔ جس طرح تم اللہ کے رسول پر ایمان لائے ہو، اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر بھی کچھ لوگ ایمان لائے تھے۔ جوں جوں وہ ایمان لا کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ملتے گئے۔ اپنی قوم اور اپنے گھر والوں سے بیزار ہوتے گئے اور انہوں نے واضح طور پر اپنی قوم اور اپنے تعلق داروں سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب کوئی تعلق نہیں رہا، نہ رشتہ داری کا نہ دوستی کا۔ بلکہ اس کے بجائے ہم تمہارے دشمن ہیں۔ اور ہماری یہ دشمنی تم سے اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک تم شرک سے دستبردار ہو کر اللہ اکیلے پر ایمان نہ لے آؤ۔ عبادت کرو تو صرف اسی کی کرو۔ دعا کرو تو اسی سے کرو۔ اپنی حاجت روائیوں اور مشکل کشائیوں کے لیے اسی کو پکارو اور اپنے بتوں سے کچھ توقع نہ رکھو۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں نے تو برملا یہ کہہ دیا تھا اور تم لوگ مشرکوں کو خفیہ خط لکھ کر ان سے دوستی گانٹھتے ہو؟

وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا

بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا

عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ④ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا

اور ان سے بھی جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو۔ ہم تمہارے (دین کے) منکر ہیں۔ اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمنی اور بیر پیدا ہو چکا تاآنکہ تم اللہ اکیلے پر ایمان لے آؤ" مگر ابراہیم[۹] کا اپنے باپ سے یہ کہنا: (اس سے مستثنیٰ ہے) کہ میں تیرے لئے (اللہ سے) معافی کی درخواست کروں گا حالانکہ میں تیرے لیے اللہ کے سامنے کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا"[۱۰] "اے ہمارے پروردگار! ہم نے تجھی پر بھروسہ کیا اور تیری طرف ہی رجوع[۱۱] کیا اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔ (۴) اے ہمارے پروردگار! ہمیں کافروں (کے مظالم) کا تختہ مشق[۱۲] نہ بنانا۔

[۹] باپ کے حق میں دعائے مغفرت پھر رجوع:۔ آپ لوگوں کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سب باتیں قابل تقلید ہیں مگر یہ بات قابل تقلید نہیں جو انہوں نے اپنے مشرک باپ کے حق میں اللہ سے مغفرت کی دعا کی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ جب باپ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا تو اس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا۔ (۱۹: ۴۷) اسی وعدہ کو پورا کرنے کی غرض سے آپ نے دوبار اپنے باپ کے حق میں دعائے مغفرت کی بھی تھی۔ پہلی بار کی دعا کا ذکر سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر ۴۱ میں ہے اور دوسری بار کی دعا کا ذکر سورۂ الشعراء کی آیت نمبر ۸۶ میں ہے۔ پھر جب آپ کو پوری طرح معلوم ہو گیا کہ باپ شرک سے دستبردار ہونے کو قطعاً تیار نہیں۔ اور شرک کی معافی کی اللہ کے ہاں کوئی صورت نہیں تو آپ نے اپنے اس قول اور وعدہ سے رجوع کر لیا اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کرنا چھوڑ دی۔ ضمناً اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

انبیاء کا آخری عمل قابل تقلید ہوتا ہے:۔ ایک یہ کہ انبیاء کا کوئی عمل جو ان کی زندگی میں مختلف رہا ہو، قابل تقلید وہ صورت ہوتی ہے جو ان کی آخری زندگی میں ہو۔ اور پہلی صورت سے انہوں نے خود رجوع کر لیا ہو یا بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی گئی ہو اور شریعت میں اس کی ممانعت وارد ہو چکی ہو۔

مشرک کے لئے دعائے مغفرت بھی جائز نہیں:۔ اور دوسری یہ کہ اہل ایمان کا مشرکوں سے اتنا تعلق بھی نہ ہونا چاہئے کہ وہ ان کے حق میں دعائے مغفرت ہی کر دیں۔ خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

[۱۰] یعنی میں تیرے لیے صرف دعائے مغفرت ہی کر سکتا ہوں۔ آگے اللہ تمہیں بخشے یا نہ بخشے یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں۔

[۱۱] یہ ہے وہ دعا اور عمل جس پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھی عمل پیرا ہوئے تھے۔ اور اس کی تمہیں تقلید کرنا چاہیے۔

[۱۲] یہاں فتنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ فتنہ کے معنی آزمائش، دکھ، رنج، رسوائی، دیوانگی، عبرت، عذاب، مرض سب کچھ آسکتا ہے اور یہ لفظ عموماً برے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس جملہ یا دعا کے کئی مطلب

رَبَّنَآ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ
الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶ ع عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ

اور اے ہمارے رب! ہمیں معاف فرما دے۔ بیشک تو ہی زبردست ہے، حکمت والا ہے" (۵) انہیں لوگوں میں تمہارے لئے ایک اچھا نمونہ [۱۳] ہے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہو اور جو کوئی سرتابی [۱۴] کرے تو بلاشبہ اللہ بے نیاز اور اپنی ذات [۱۵] میں محمود ہے۔ (۶)

کچھ بعید نہیں کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے [۱۶] جن سے تم عداوت رکھتے ہو۔

ہو سکتے ہیں۔ ایک تو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر خدانخواستہ کافر ہم پر غالب آ گئے تو ہمیں ہمارے دین پر قائم نہ رہنے دیں گے۔ اور پھر سے کفر و شرک میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائیں گے۔ نیز وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم ہی سچے دین پر ہیں۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایسے اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی توفیق دے کہ کافر لوگ ہماری طرف انگشت نمائی نہ کر سکیں اور طعنے نہ دے سکیں۔

[۱۳] سیدنا ابراہیم کے ساتھیوں کے تین اوصاف:۔ یعنی سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے یہاں اللہ تعالیٰ نے تین اوصاف بیان فرمائے۔ ایک یہ کہ انہوں نے مشرکوں سے مکمل طور پر قطع تعلق کر لیا تھا اور یہ قطع تعلق دائمی تھا، تا آنکہ مشرک شرک سے باز آ جائے۔ دوسرے وہ صرف اللہ پر توکل رکھتے تھے، تیسرے وہ اپنے حق میں اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کی توفیق کی دعائیں بھی کرتے رہتے تھے اور بجا بھی لاتے ہیں۔ یہ صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر تم لوگ فی الواقع اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے اور اس سے جزائے اعمال کی امید رکھتے ہو تو تمہیں بھی ان جیسے کام کرنے چاہئیں۔

[۱۴] تَوَلّٰی کا ایک معنی تو وہی ہے تو ترجمہ میں مذکور ہے۔ اس کا دوسرا معنی دوست بنانا، دوستی گانٹھنا ہے۔ یعنی جو شخص سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے قابل تقلید نمونہ کے باوجود اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور توقع رکھنے کے باوجود مشرکوں سے دوستی گانٹھتا ہے تو اللہ کو اس کے ایسے ایمان کی کوئی پروا نہیں۔ کیونکہ وہ تو بے نیاز ہے۔ اور یہ مطلب اصل مضمون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

[۱۵] یہ صورت نہیں کہ اگر کوئی اللہ کی حمد و ثنا بیان کرے تو تب ہی وہ محمود ہے۔ وہ کسی کے حمد و ثنا بیان کرنے کا محتاج نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ اس کی حمد و ثنا بیان کرنے سے حمد کرنے والے کو ہی فائدہ پہنچتا ہے۔ اللہ کا اس سے کچھ نہیں سنورتا اور حمد و ثنا نہ کرنے سے اس کا بگڑتا بھی کچھ نہیں۔

[۱۶] فتح مکہ سے پیشتر کفارِ مکہ کے ایمان لانے کی خوشخبری:۔ اس آیت میں مسلمانوں کو فتح مکہ سے پہلے ہی فتح مکہ کی خوشخبری دے دی گئی ہے۔ اور ابتداء میں عسیٰ کا لفظ محض شاہانہ اندازِ بیان کی رعایت سے آیا ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی ملازم کو کہے کہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں ترقی دے دی جائے۔ تو اس کا مطلب ایک یقینی خبر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف فتح مکہ کی خبر ہی نہیں دی۔ بلکہ یہ بھی بتلا دیا کہ مکہ کے کافر جو آج تمہارے سخت دشمن ہیں۔ اسلام قبول کر لیں گے اور تم لوگ پھر آپس میں

مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۷ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۸ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ

اور اللہ بڑی قدرتوں والا ہے، اور وہ بہت بخشنے والا[۱۷] بے رحم کرنے والا ہے(۷) اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جو نہ تم سے دین کے بارے میں لڑے[۱۸] اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، اس بات سے کہ تم ان سے بھلائی کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو۔ اللہ تو یقیناً انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے(۸) اللہ تو تمہیں صرف ان لوگوں سے منع کرتا ہے جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی، اس بات سے کہ تم انہیں دوست بناؤ۔

شیر و شکر بن جاؤ گے۔

[۱۷] یعنی اللہ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ حالات کا رخ اس طرح موڑ دے کہ مکہ بھی فتح ہو جائے۔ کشت و خون بھی نہ ہو اور کافروں کی اکثریت بھی مسلمان ہو کر تمہارے ساتھ مل جائے۔ رہی وہ غلطی جو اس سلسلہ میں تم نے کی ہے۔ تو اللہ اس غلطی کو بھی اور اسی طرح تمہاری دوسری غلطیوں اور لغزشوں کو بھی از راہ کرم معاف کر دینے والا ہے۔

[۱۸] ❁ لڑنے کا حکم صرف ان کافروں سے ہے جو دکھ پہنچاتے اور معاندانہ سرگرمیوں میں مشغول ہوں۔ عام کافروں سے نہیں، محض کفر لڑائی کا سبب نہیں بن سکتا: اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے کافروں کو دو گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ ایک وہ جو معاند تھے۔ مسلمانوں کو ایذائیں پہنچاتے، اسلام کی راہ روکتے اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں سرگرم تھے۔ دوسرے مسالم جو کافر تو تھے مگر روادار تھے۔ غیر جانبدار بن کر رہے۔ مسلمانوں کو نہ کوئی دکھ پہنچایا نہ ان کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لیا۔ اور یہ دونوں قسم کے لوگ مکہ میں بھی رہتے تھے اور ارد گرد بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے لیے الگ الگ احکام بیان فرمائے۔ پہلی قسم کے لوگوں سے سلوک کا بیان ابتدائے سورہ سے چلا آ رہا ہے۔ رہے دوسری قسم کے بے ضرر قسم کے کافر تو ان کے ساتھ رواداری کا حکم فرمایا۔ یعنی ان سے تم کو بھی عداوت نہ رکھنی چاہیے۔ اور رشتہ داری کے حقوق کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور ان سے بہتر سلوک کرنا چاہیے۔ کیونکہ انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ ان دونوں سے سلوک میں فرق رکھا جائے۔ اس سے دو اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک یہ کہ مسلمانوں کی عداوت کی بنیاد محض کفر نہیں بلکہ اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیاں ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے دوران جنگ بچوں، بوڑھوں، عورتوں، عبادت گزار اور درویش قسم کے لوگوں اور جنگ میں شریک نہ ہونے والے کافروں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اسلام ایک حق پسند، انصاف پسند اور امن پسند دین ہے۔ جو صرف ان لوگوں سے تعرض کرتا ہے۔ جو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں یا اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ

اور جو انہیں دوست بنائے تو ایسے لوگ ظالم [۱۹] ہیں۔(۹) اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں [۲۰] ہجرت کر کے آئیں تو ان کی جانچ پڑتال [۲۱] کر لیا کرو۔

[19] معاند قسم کے کافر ہی اسلام، پیغمبر اسلام، اہل اسلام اور اللہ کے دشمن ہیں۔ اور ایسے لوگوں سے دوستی دراصل اسلام اور اہل اسلام سے دشمنی کے مترادف ہے۔ لہٰذا اس قسم کے کافروں کو دوست بنانا یا ان سے راز و نیاز کی باتیں کہنا یا بتانا بڑے ظلم کی بات ہے۔

[۲۰] ہجرت کرنے والوں کی تین قسمیں:۔ آیت نمبر دس اور گیارہ میں ایک نہایت اہم معاشرتی مسئلہ کا حل پیش کیا گیا ہے جو آغاز ہجرت سے ہی کئی طرح کی الجھنوں کا باعث بنا ہوا تھا۔ مکہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو خود تو مسلمان ہو چکے تھے مگر ان کی بیویاں کافر تھیں یا بیویاں مسلمان ہو چکی تھیں تو شوہر کافر تھے۔ ہجرت کرنے سے یہ مسئلہ مزید سنگین بن گیا تھا۔ ہجرت کرنے والوں کی تین قسمیں تھیں۔

(۱) میاں بیوی دونوں مسلمان اور ہجرت کر کے مدینہ آگئے:۔ ایک وہ جو دونوں میاں بیوی مسلمان ہوں اور دونوں نے ہجرت کی ہو۔ جیسے سیدنا عثمان اور ان کی اہلیہ یعنی رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی۔ ایسے لوگوں کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اور عموماً ایسے جوڑے آگے پیچھے یا ایک ساتھ مدینہ پہنچ ہی جاتے تھے۔

(۲) میاں مسلمان مدینہ میں بیوی کافر مکہ میں:۔ دوسرے وہ جو خاوند مسلمان تھے مگر بیوی یا بیویاں کافر جیسے سیدنا عمرؓ خود تو ہجرت کر کے مدینہ آگئے لیکن ان کی دو کافر بیویاں مکہ ہی میں رہ گئیں۔

(۳) بیوی مسلمان مدینہ میں میاں کافر مکہ میں:۔ تیسرے وہ جو بیوی مسلمان ہو چکی ہو اور خاوند کافر مکہ میں رہ جائے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی بڑی صاحبزادی سیدہ زینب تو مدینہ میں پہنچ گئیں مگر ان کا کافر خاوند عمرو بن عاص مکہ میں ہی رہ گیا۔ مردوں کے لیے یہ مسئلہ اس لحاظ سے زیادہ سنگین نہ تھا کہ وہ دوسرا نکاح کر سکتے تھے اور کر لیتے تھے۔ مگر عورتوں کے لیے اتنی مدت تک رشتہ ازدواج میں منسلک رہنا بڑا سنگین مسئلہ تھا۔ پھر جب صلح حدیبیہ ہوئی تو اس کا ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو مسلمان مکہ سے مدینہ آئے گا۔ مسلمان اسے واپس مکہ کافروں کے ہاں لوٹانے کے پابند ہوں گے۔ اور اس شرط کے تحت مسلمانوں نے کافروں کے مطالبہ پر کچھ لوگ لوٹا بھی دیے۔ اسی دوران جب ام کلثوم بنت عقبہ ہجرت کر کے مدینہ آگئیں تو کافروں نے ان کی واپسی کا بھی مطالبہ کر دیا۔ لیکن آپ ﷺ نے کافروں کے اس مطالبہ کو درست تسلیم نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ شرط کافروں کے تیسرے اور آخری سفیر سہیل بن عمرو نے ان الفاظ میں لکھوائی تھی (علی ان لا یاتیك منا رجل فان كان علی دینك الا رددته الینا) (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجهاد والمصالحة اهل الحرب) ترجمہ: (اور یہ کہ اگر ہم میں سے کوئی مرد، خواہ وہ تمہارے دین پر ہی کیوں نہ ہو، تمہارے پاس آئے تو تمہیں اسے ہمارے طرف واپس کرنا ہوگا) چنانچہ آپ ﷺ نے صاف کہہ دیا کہ اس شرط کے الفاظ کی رو سے عورتیں از خود مستثنیٰ ہیں۔ اس وقت جا کر قریشیوں کی یہ غلط فہمی دور ہوئی۔ ورنہ وہ یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ ہم عورتیں بھی واپس لا سکتے ہیں۔ ان آیات میں ایسی ہی مہاجر عورتوں کے ازدواجی مسائل کا حل بتایا گیا ہے۔

[۲۱] ہجرت کر کے آنے والی عورتوں کے امتحان:۔ یعنی ان ہجرت کرنے والی عورتوں کے ایمان یا دلوں کا حال تو اللہ ہی بہتر

فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ

اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ پھر اگر تمہیں یہ معلوم ہو کہ وہ (فی الواقع) مومن ہیں تو انہیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو۔ ایسی عورتیں ان (کافروں) کیلئے حلال نہیں اور نہ ہی وہ ان عورتوں[۲۲] کیلئے حلال ہیں۔ اور کافروں نے جو کچھ (ایسی مومن عورتوں پر) خرچ کیا ہوا نہیں دے دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کچھ گناہ نہیں جبکہ تم انہیں ان کے حق مہر ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو[۲۳]۔ اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہے وہ ان (کافروں) سے مانگ لو۔ اور جو مہر کافروں نے اپنی (مسلمان) بیویوں کو دیئے تھے وہ ان (مسلمانوں) سے مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے

جانتا ہے لیکن تم ظاہری طور پر ان کا امتحان لے لیا کرو کہ آیا وہ واقعی مسلمان ہیں اور محض اسلام کی خاطر وطن چھوڑ کر آئی ہیں؟ کوئی دنیوی یا نفسانی غرض تو اس ہجرت کا سبب نہیں تھی؟ یا کہیں خاوندوں سے لڑ کر یا خانگی جھگڑوں سے بیزار ہو کر یا محض سیر د سیاحت یا کسی دوسری غرض سے تو یہاں نہیں آئیں؟ اس حکم کے مخاطب چونکہ مومن ہیں، نبی ﷺ نہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس غرض کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا تھا اور وہی مدینہ پہنچنے والی عورتوں کا امتحان لیتے تھے۔

[۲۲] ایسی عورتوں کے متعلق جو امتحان میں کامیاب ثابت ہوں پہلا حکم یہ ہوا کہ انہیں کسی صورت کافروں کی طرف واپس نہیں کیا جائے گا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس حکم کے بعد وہ اپنے کافر خاوندوں کے لیے حلال نہیں رہیں۔ اس سے دو مسئلے مستنبط کیے گئے ہیں ایک یہ کہ اختلاف دین سے نکاح از خود ختم ہو جاتا ہے۔ کافر اور مومنہ عورت کا یا مومن مرد اور کافر عورت کا رشتہ نکاح از خود ٹوٹ جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اختلاف دارین سے بھی نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً ایک زوج دار الاسلام میں ہو اور دوسرا دار الحرب میں تو نکاح از خود ختم ہو جائے گا کیونکہ ان کے درمیان یہ رشتہ قائم رکھنا محال ہے۔ اس حکم کے بعد تمام مہاجر عورتوں کو نکاح کرنے کی اجازت مل گئی۔

[۲۳] کافر عورتوں کے نکاح کی تنسیخ اور حق مہر کی ادائیگی کے طریقے:۔ اب رہا حق مہر کا مسئلہ، جو مسلمان عورتیں ہجرت کر کے مدینہ آگئی تھیں ان کے متعلق یہ حکم ہوا کہ جو مسلمان ان سے نکاح کرے۔ وہ اس عورت کا سابقہ حق مہر اس کافر کو بھی ادا کرے گا۔ جس کے نکاح میں وہ پہلے تھی۔ اور اس نئے نکاح میں جو حق مہر طے ہو وہ بھی ادا کرے گا اور مسلمانوں کی جو عورتیں کافر تھیں اور کافروں کے پاس مکہ میں ہی رہ گئی تھیں ان کے متعلق یہ حکم ہوا کہ جن کافروں کے قبضہ میں یا نکاح میں وہ ہیں۔ وہ مسلمانوں کو یا اس خاص مسلمان کو حق مہر ادا کر دیں یا لوٹا دیں جس کے نکاح میں وہ پہلے تھی۔ اور مسلمانوں کو اس رقم کا کافروں سے مطالبہ کرنا چاہیے۔ یعنی اس سلسلہ میں کافر مسلمانوں سے اور مسلمان کافروں سے اپنی سابقہ بیویوں کے حق مہر کی رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور یہ حکم اس لیے نازل ہوا کہ ان دنوں معاہدہ حدیبیہ کی رو سے صلح تھی۔ کافروں اور مسلمانوں میں ایسے لین دین کا معاملہ یا تبادلہ ہو سکتا تھا۔

يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝١٠ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝١١ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاۗءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓي اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـــًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا

جو تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے، دانا ہے۔(۱۰) اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے تمہیں (کفار سے) کچھ نہ ملے۔ پھر تم نے کفار کا تعاقب[۲۴] (کر کے مال غنیمت حاصل) کیا۔ تو اس مال میں سے ان مسلمانوں کو ان کی کافر بیویوں کے حق مہر کے برابر مال دے دو جو انہوں نے خرچ کیا تھا۔ اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔(۱۱) اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ان امور پر بیعت[۲۵] کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں گی، نہ چوری کریں گی، نہ زنا کریں گی،

[۲۴] اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ فریقین کے حق میں نہایت منصفانہ اور حکیمانہ تھا۔ جو مسلمانوں کے لیے تو بہر حال واجب الاطاعت تھا لیکن کافروں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ان کافر عورتوں کا سابقہ حق مہر ان مسلمانوں کو دینے کے لیے تیار نہ ہوئے جن کے نکاح میں وہ پہلے تھیں۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے دو طریقے بتائے۔ جن سے مسلمانوں کو اس رقم کی ادائیگی ہو سکتی تھی جو انہوں نے اپنی کافر بیویوں کو دی تھی اور یہ دونوں طریقے لفظ عَاقَبْتُمْ سے ماخوذ ہیں۔ اس لفظ کا ایک مفہوم تو ترجمہ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ ایسے مسلمانوں کو ان کا حق اموال غنائم سے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو بیت المال سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اور عَاقَبْتُمْ کے معنی "جب تمہاری باری آئے یا" تمہارا داؤ لگے" بھی کیے گئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جمع تفریق کے ذریعہ حساب برابر کر لو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مثلاً "الف" اور "ب" دو مسلمان ہیں۔ جنہوں نے کافروں کی مدینہ پہنچ جانے والی مومن عورتوں سے نکاح کرنا ہے اور ان کا سابقہ حق مہر جو کافروں سے طے ہوا تھا، دو دو سو درہم ہے۔ دوسری طرف "ج" اور "د" دو کافر ہیں جو مکہ میں مسلمانوں کی کافر بیویوں پر قابض ہیں اور ان کا سابقہ حق مہر مثلاً ڈیڑھ ڈیڑھ سو درہم تھا۔ اب مسلمانوں نے کافروں کو ادا تو چار سو درہم کرنا ہے اور کافروں سے لینا تین سو درہم ہے۔ تو مسلمان کافروں کو اب صرف ایک سو درہم دے کر حساب بیباق کر دیں گے۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو مسلمانوں کو دینے کے بجائے کچھ لینا آتا ہو اور کافر دینے کو تیار نہ ہوں یا پورے کا پورا ہی نہ دے رہے ہوں تو اس کی صورت وہی ہو گی جو پہلے مذکور ہو چکی۔ یعنی انہیں اس وقت ادائیگی ہو گی جب کافروں سے مال غنیمت ہاتھ لگ جائے یا پھر یہ رقم بیت المال سے بھی ادا کی جا سکتی ہے۔

[۲۵] ﴿ عورتوں کی بیعت کن باتوں پر:۔ یعنی امتحان کے بعد ان مہاجر عورتوں کو نیز عام مسلمان عورتوں کو بیعت کا حکم ہوا۔ اور یہ بیعت صرف رسول اللہ ﷺ لیں گے۔ کیونکہ اس آیت کے مخاطب آپ ﷺ ہی ہیں۔ اور جن گناہوں سے اجتناب پر بیعت لی جائے گی وہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔ ان میں سب سے بڑا گناہ تو شرک ہے جو بالخصوص اللہ کے حق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے سب گناہ حدی جرائم ہیں۔ اور حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پانچ گناہوں میں سے شرک کے علاوہ باقی چار گناہ ایسے ہیں جن پر حد لگتی ہے۔ یہ تو وہ گناہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کئی ایسے گناہ کے کاموں سے اجتناب پر بیعت لیتے تھے جن کا ذکر احادیث میں مذکور ہے۔ اور یہ سب ایسے جرائم ہیں جن کا عرب میں عام رواج تھا۔

يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا

نہ اپنی اولاد کو قتل[۲۶] کریں گی، اپنے ہاتھ اور پاؤں کے آگے[۲۷] کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی نیک امر میں آپ کی نافرمانی[۲۸] نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت کر لیجئے[۲۹] اور ان کیلئے اللہ سے معافی مانگئے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے(۱۲) اے ایمان والو! ایسے

[۲۶] جیسا کہ جاہلیت میں رواج تھا کہ رسمی ننگ و عار کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ یا فقر و فاقہ کے خوف کی وجہ سے لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں کو بھی مار ڈالتے تھے۔ نیز اس میں اسقاط حمل بھی شامل ہے۔ خواہ یہ جائز حمل کا اسقاط ہو یا ناجائز حمل کا۔

[۲۷] ❁ بہتان کی قسمیں:۔ اس بہتان کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ ایک تو معروف و مشہور ہے یعنی کوئی عورت دوسری عورت پر کسی غیر مرد سے آشنائی کا الزام لگا دے جسے عموماً تہمت کہا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ خود زانیہ ہو، بچہ تو کسی دوسرے کا جنے اور شوہر کو یہ یقین دلائے کہ یہ تیرا ہی ہے۔ تیسری یہ کہ کسی دوسری عورت کی اولاد لے کر مکر و فریب سے اپنی طرف منسوب کر لے۔

[۲۸] بیعت کا سلسلہ چونکہ نبی ﷺ کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ امت کا امیر اور دوسرے بزرگ حضرات بھی بیعت لے سکتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اطاعت کے ساتھ معروف کی شرط بھی لگا دی۔ حالانکہ آپ ﷺ سے یہ ناممکن تھا کہ آپ کسی غیر معروف یا معصیت کے کام پر بیعت لیں اس سلسلہ میں آپ نے ایک واضح قانون ان الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ لا طاعة في معصية انما الطاعة في المعروف) (متفق علیہ) یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا کام ہو تو کسی کی بھی اطاعت ضروری نہیں۔ اطاعت صرف بھلائی کے کاموں میں ہوتی ہے۔ اس آیت سے دوسری بات جو مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی ہر بات واجب الاتباع ہے خواہ اس کا ذکر قرآن میں موجود ہو یا نہ ہو۔

[۲۹] ❁ عورتوں سے بیعت کا طریقہ:۔ آپ جب مردوں سے بیعت لیتے تو بیعت کرنے والا ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد کرتا تھا۔ لیکن عورتوں کے لیے یہ طریقہ نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ کبھی تو آپ ﷺ عورتوں سے عہد لے کر کہہ دیتے کہ بس تمہاری بیعت ہو گئی۔ اور کبھی ایک چادر کا ایک سرا آپ پکڑتے دوسرا بیعت کرنے والی عورت پکڑ کر عہد کرتی اور کبھی آپ پانی کے کسی پیالہ وغیرہ میں ہاتھ ڈالتے۔ پھر بیعت کرنے والی عورت دوسرے سرے سے ڈال دیتی اور جن باتوں پر آپ عورتوں سے یا مردوں سے بیعت لیتے رہے اس کی تفصیل کے لیے درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

❁ بیعت سے متعلق چند احادیث:۔ ۱۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آپ ﷺ کے پاس آتیں۔ آپ ﷺ اس آیت کے مطابق ان کا امتحان لیتے۔ پھر جو عورت ان شرطوں کو قبول کرتی۔ آپ ﷺ زبان سے ہی فرما دیتے کہ میں نے تجھ سے بیعت کی۔ اللہ کی قسم! بیعت لیتے وقت آپ کے ہاتھ نے کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

❁ ۲۔ میت پر نوحہ کی ممانعت:۔ سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نے آپ ﷺ سے بھی بیعت کی تو آپ ﷺ نے یہی آیت سنائی۔ پھر ہم کو مردے پر نوحہ کرنے سے منع فرمایا تو ایک عورت (یہ خود ام عطیہ ہی تھی) نے اپنا ہاتھ روک رکھا اور کہنے لگی: فلاں عورت نے نوحہ کرنے میں میری مدد کی تھی میں اس کا بدلہ اتار لوں۔ یہ سن کر آپ خاموش رہے۔ وہ چلی گئی۔ پھر

تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾

لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ کا غضب[۳۰] ہوا، وہ تو آخرت سے ایسے ہی مایوس ہیں جیسے کافر اہل قبور[۳۱] سے مایوس ہیں۔(۱۳)

(توبہ کر کے) واپس آئی تو آپ ﷺ نے اس سے بیعت لے لی۔ (حوالہ ایضاً)

۳۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عید کی نماز نبی اکرم ﷺ، ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سب کے ساتھ پڑھی۔ آپ خطبہ سے پہلے نماز پڑھاتے پھر اس کے بعد خطبہ سناتے تھے۔ خطبہ کے بعد آپ منبر سے اترے گویا میں آپ کو دیکھ رہا ہوں جبکہ آپ ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو بٹھا رہے تھے۔ پھر ان کی صفیں چیرتے ہوئے آگے بڑھے عورتوں کے پاس آئے۔ بلال رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے سامنے یہ (بیعت والی) پوری آیت پڑھی۔ اس سے فراغت کے بعد عورتوں سے پوچھا: "کیا ان شرطوں پر قائم ہوتی ہو؟" ایک عورت کے سوا کسی نے کوئی جواب نہ دیا (شرما گئیں) اس عورت (اسما بنت یزید) نے کہا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ اس کے بعد آپ نے ان سے کہا کہ وہ صدقہ کریں۔ بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا کپڑا بچھا دیا۔ اور وہ چھلے اور انگوٹھیاں بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔ (حوالہ ایضاً)

۴۔ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (لیلۃ العقبہ) میں ہم سے فرمایا: تم مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرتے ہو۔ (أَنْ لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَسْرِقُوْا) پھر جو ان شرطوں کو پورا کرے اس کا ثواب اللہ پر ہے اور جو کوئی کام کر بیٹھے پھر اس پر حد لگ جائے تو وہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر کوئی گناہ کر بیٹھے اور اللہ اس کا گناہ چھپا دے تو پھر قیامت کے دن اللہ اگر چاہے تو اسے سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے۔ (حوالہ ایضاً)

بیعت کرنے کے بعد آپ ﷺ کو ارشاد ہوا کہ آپ ان بیعت کرنے والیوں کے حق میں دعائے مغفرت بھی کیا کریں۔ کہ ان امور میں ان سے جو کوتاہیاں پہلے ہو چکی ہیں۔ یا آئندہ اس عہد کی تعمیل میں کچھ تقصیر رہ جائے تو اللہ انہیں معاف فرما دے۔

[۳۰] سورہ کے آخر میں ایک دفعہ پھر تاکید مزید کے طور پر اسی بات کو دہرایا گیا ہے کہ معاند قسم کے کافر کبھی تمہارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ان سے دوستی کی پینگیں مت بڑھاؤ۔ نہ ہی ان پر اعتماد کرو۔ جن پر اللہ ناراض ہے۔ اللہ کے دوستوں کو ان سے ناراض ہی رہنا چاہئے۔

[۳۱] اصحاب قبور سے کافروں کی مایوسی کی مختلف توجیہات:۔ اس جملہ کے دو مختلف مطلب صحابہ سے منقول ہیں۔ ایک یہ کہ کافروں کا نہ آخرت پر ایمان ہے، نہ ہی قبروں سے مردوں کے دوبارہ جی اٹھنے پر۔ وہ آخرت میں جزا و سزائے اعمال کی ویسے ہی توقع نہیں رکھتے جیسے مردوں کے قبروں سے جی اٹھنے کی توقع نہیں رکھتے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو کافر قبروں میں پہنچ چکے ہیں، حقیقت حال ان کے سامنے کھل کر آ چکی ہے اور آخرت میں اللہ کی رحمت اور مہربانی سے ایسے ہی مایوس ہو چکے ہیں۔ جیسے کہ یہ کافر آخرت کے قیام سے ہی مایوس ہیں۔ یہ دونوں مطلب درست ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بعض لوگوں نے، جو قبروں میں پڑے ہوئے اولیاء اللہ کے تصرفات کے قائل ہیں، ایک تیسرا مطلب بھی کشید کر لیا ہے جو یہ ہے کہ اہل قبور کے تصرفات سے جو لوگ مایوس ہیں اور اس بات کا یقین نہیں رکھتے وہ کافر ہیں۔ گویا اہل قبور کے تصرفات کو تسلیم نہ کرنا کافروں کا کام ہے۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)

۱۴ آیاتھا سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ

کلمات ۲۲۳ آیات ۱۴ (۶۱) سورۃ الصف مدنی ہے (۱۰۹) رکوع ۲ حروف ۹۹۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آسمانوں اور زمین میں جو مخلوقات ہے اللہ کی تسبیح [۱] کر رہی ہے اور وہ غالب ہے، دانا ہے (۱) اے ایمان والو! ایسی [۲] بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ (۲) اللہ کے ہاں یہ سخت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں (۳) اللہ یقیناً ان لوگوں کو پسند [۳] کرتا ہے

[۱] یہ اس سورہ کے افتتاحی کلمات ہیں جن کی تشریح پہلے بہت سے مقامات پر گزر چکی ہے۔

[۲] قول و فعل کا تضاد بہت بری خصلت ہے:۔ دوسری اور تیسری آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ انسان دوسروں کو ایسی باتوں کی نصیحت کرے جن پر وہ خود عمل نہ کرتا ہو۔ مثلاً دوسروں کو اور بالخصوص اپنی اولاد کو یہ نصیحت کرے کہ سچ بولنا بہت اچھی عادت ہے لہٰذا ہمیشہ سچ بولا کرو۔ لیکن خود ان سے ایسی باتیں کہے جن سے اس کا جھوٹ واضح ہو جائے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایسی لاف زنی مت کرو یا ایسی شیخیاں مت بگھارو جن پر تم عمل پیرا ہو ہی نہیں سکتے۔ انسان کے قول اور فعل کا تضاد بہت بری خصلت ہے۔ جس سے انسان لوگوں کی نظروں میں گر جاتا ہے اور اللہ تو ایسی بات کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ زبان سے ایک بات کہہ دینا آسان ہے لیکن اس کو نباہنا آسان نہیں ہوتا لہٰذا جو بات کرو سوچ سمجھ کر کرو۔

[۳] جہاد کے سلسلہ میں تین ہدایات:۔ یہ ارشاد الٰہی تو ایک عام حکم کا درجہ رکھتا ہے کہ قول و فعل کا تضاد اللہ کے ہاں سخت ناپسندیدہ چیز ہے اور اس کا خصوصی پہلو یہ ہے کہ مکی زندگی کے دوران جبکہ مسلمانوں کو صرف صبر اور برداشت کا حکم تھا کئی مسلمان یہ آرزو کرتے تھے کہ انہیں کافروں سے لڑائی کی اجازت ملنی چاہیے اور اگر ہمیں یہ اجازت مل جائے تو ہم کافروں کو تہس نہس کر دیں۔ مگر جب اجازت مل گئی تو بعض لوگ یوں کہنے لگے کہ پروردگار! ہم پر قتال کو فرض کرنے کی اتنی بھی کیا جلدی پڑی تھی (۴:۷۷) اور کچھ لوگوں کے تو یہ حکم سن کر رنگ ہی اڑ گئے۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ بس ابھی موت آئی کہ آئی (۴۷:۲۰) قول و فعل میں اس قدر تضاد اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اور جو بات اللہ کو پسند ہے وہ یہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ جہاد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تین شرطیں بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ یہ جہاد محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ہو، کوئی دوسری غرض اس سے وابستہ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ دشمن کے سامنے اس طرح صف بندی کی جائے کہ اس میں کوئی رخنہ باقی نہ رہنے پائے۔ تیسرے یہ کہ تمہارے پائے ثبات میں کسی طرح کی لغزش یا تزلزل نہ آنے پائے۔ اور اپنی جگہ پر اس قدر

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں جیسے کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔(۴)

اور (وہ بات یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: "اے میری قوم! تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے[۴] ہو حالانکہ تم جان چکے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں۔

پھر جب انہوں نے کجروی[۵] اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو کبھی

جم کر مضبوطی سے کھڑے ہو کہ یوں معلوم ہو، جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے۔

[۴] بنی اسرائیل کا اپنے نبی سیدنا موسیٰ کو تکلیفیں پہنچانا:۔ تمام انبیاء کو اپنے مخالفین اور دشمنوں سے دکھ اور مصائب پہنچتے ہی رہے ہیں اور اس سے بھی زیادہ قابل افسوس بات یہ ہوتی ہے کہ اپنے ہی لوگ دکھ پہنچانے لگیں۔ اس سلسلہ میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جس قدر پریشان کیا اور دکھ پہنچایا تھا۔ شاید ہی کسی دوسری قوم نے پہنچایا ہو۔ حالانکہ انہیں خوب معلوم تھا بلکہ یقین تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ کے حکم کے مطابق ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو طرح طرح کی کٹ حجتیاں اور سوال کر کر کے آپ کو پریشان کر دیا۔ فرعون سے نجات پا کر آگے روانہ ہوئے ہی تھے کہ ایک قوم کو بت پوجتے دیکھ کر کہنے لگے: موسیٰ! ہمیں بھی اس طرح کا ایک بت بنا دو۔ جس کی ہم پوجا کیا کریں۔ میدان تیہ میں ان کو بلا مشقت من و سلویٰ مل رہا تھا تو کہنے لگے: موسیٰ! ہم تو یہ غذا کھا کر تنگ آ گئے ہیں اور جی بھر گیا ہے۔ لہٰذا اب سبزیاں اور دالیں کھانا چاہتے ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام طور پر تورات لینے گئے تو بعد میں ایک بچھڑا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی اور کہنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام تو بھول کر طور پر چلے گئے۔ ہمارا اور اس کا معبود تو یہ ہے وہ وہاں کیا لینے چلے گئے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کتاب تورات لے کر آئے تو کہنے لگے۔ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ یہ واقعی اللہ کی طرف سے ہی نازل شدہ کتاب ہے۔ ہم تو جب تک واضح طور پر اللہ کو دیکھ نہ لیں یہ کتاب ماننے کو تیار نہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ارض شام میں جہاد کرنے کو کہا تو کہنے لگے موسیٰ! وہاں تو بڑے طاقتور لوگ رہتے ہیں ہم ان سے کیسے لڑ سکتے ہیں۔ اگر جہاد اتنا ہی ضروری ہے تو تم اور تمہارا رب دونوں جا کر ان سے جہاد کرو۔ ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ اپنی قوم کی ایسی ہی باتوں سے تنگ آ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تھی۔ "پروردگار! میرا اختیار تو صرف اپنی ذات پر اور اپنے بھائی پر ہے لہٰذا اس نافرمان قوم سے ہمارا ساتھ چھڑا دے" (۵:۲۵) انبیاء اپنی دشمن قوم کے لیے تو ایسی دعا مانگتے ہی رہے ہیں۔ مگر کسی نبی نے غالباً اپنی قوم کے حق میں ایسی دعا کبھی نہیں مانگی۔

[۵] اپنے نبی کی شان میں گستاخیاں کرتے کرتے اور دکھ پہنچاتے پہنچاتے ان کی فطرت ہی کچھ ایسی ٹیڑھی بن چکی تھی کہ کسی حکم کو بھی وہ سچے ایمانداروں کی طرح تسلیم کر لینے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اس میں مین میخ نکال کر اس کا کچھ الٹا ہی مطلب نکال لیتے تھے۔ پھر جب انہوں نے کجروی کی راہ اختیار کی تو اللہ نے بھی انہیں اسی راہ پر ڈال دیا۔ کیونکہ اللہ کا یہ دستور نہیں کہ وہ ٹیڑھی راہ

الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ
یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا

ہدایت نہیں دیتا۔ اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا۔ اے بنی اسرائیل! میں یقیناً تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں اور اس تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے نازل[٦] ہوئی۔ اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد[٧] ہو گا۔ پھر جب وہ رسول واضح دلائل[٨] لے کر ان کے پاس آ گیا

اختیار کرنے والوں کو زبردستی سیدھی راہ پر ڈال دے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے اس دنیا میں انسان کی آزمائش کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے۔

[٦] ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ ابن مریم اپنے سے پہلے کی نازل شدہ کتاب کی تصدیق کرنے والے تھے وہ شریعت موسوی یعنی تورات کی تعلیم کے ہی پیرو تھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا وجود تورات کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ میں ان چیزوں کا مصداق بن کر آیا ہوں جن کی خبر میرے متعلق تورات میں دی گئی تھی۔

[٧] ❁ تورات اور انجیل دونوں کے صرف تراجم ہی ملتے ہیں۔ اصل نسخے کہیں بھی موجود نہیں:۔ احمد کے دو معنی ہیں ایک اپنے پروردگار کی بہت زیادہ حمد بیان کرنے والا۔ دوسرے وہ جس کی بندوں میں سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو۔ اور یہ دونوں صفات آپ ﷺ کی ذات اقدس میں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا ہے کہ میرے کئی نام ہیں۔ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں۔ میں ماحی ہوں، اللہ میری وجہ سے کفر کو مٹائے گا، میں حاشر ہوں۔ یعنی لوگ میری پیروی پر حشر کیے جائیں گے اور میں عاقب (تمام پیغمبروں کے بعد آنے والا) بھی ہوں۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ الصف) رہی یہ بات کہ آیا یہ نام موجودہ بائبل میں موجود ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تورات اور انجیل دونوں میں تحریف ہونے کے باوجود آپ کی ایسی واضح صفات اب بھی مذکور ہیں۔ جن کو دیکھ کر آپ کو پہچانا جا سکتا تھا۔ یہود مدینہ نبی آخر الزمان ﷺ کے منتظر تھے۔ اور ان میں سے بعض منصف مزاج لوگ انہی مذکورہ صفات کی بنا پر ایمان بھی لے آئے تھے۔

❁ انجیل سیدنا عیسیٰ کے بہت بعد تالیف ہوئی:۔ رہی موجودہ انجیل تو یہ منزل من اللہ کتاب تو ہے نہیں۔ مختلف لوگوں کے تالیف کردہ نسخے ہیں۔ جو آپ کی زندگی کے بڑی مدت بعد تالیف کیے گئے۔ آج کل جو چار اناجیل بائبل ہمیں ملتی ہیں۔ ان کے مؤلفین میں سے کوئی بھی سیدنا عیسیٰ کا صحابی یا حواری نہ تھا۔ البتہ انجیل برناباس کے مولف کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ کا صحابی ہے۔ لیکن اس انجیل کی اشاعت اور طباعت پر کلیسا کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ انجیل برناباس توحید باری تعالیٰ کو واضح طور پر بیان کرتی تھی۔ جبکہ چوتھی صدی مسیح میں عیسائیوں میں عقیدہ تثلیث سرکاری طور پر رائج ہو چکا تھا۔ لہٰذا کلیسا نے اس انجیل پر پابندی لگا دینے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس انجیل کے شاذ و نادر نسخے آج بھی مختلف لائبریوں میں مل جاتے ہیں۔

❁ تحریف کے باوجود ان کتابوں میں آپ ﷺ کی ایسی علامات موجود ہیں جن کی بنا پر عبداللہ بن سلام اور نجاشی نے تصدیق کی:۔ تحریف کے علاوہ دوسری مشکل یہ ہے کہ تورات ہو یا انجیل کوئی بھی الہامی کتاب اپنی اصلی زبان میں محفوظ نہیں ہے۔ صرف

سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

تو کہنے لگے: "یہ تو صریح جادو ہے"(۶) اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ اللہ پر جھوٹے بہتان [۹] باندھے جبکہ اسے اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو۔ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔(۷)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔ خواہ کافروں کو کتنا ہی [۱۰] ناگوار ہو۔(۸)

مختلف زبانوں میں ترجمے ہی ملتے ہیں۔ ان کی اصلی زبان سریانی تھی۔ اور تراجم یونانی، لاطینی، انگریزی اور اردو وغیرہ میں ہیں۔ لہٰذا پوری تحقیق کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود جب نجاشی شاہ حبشہ نے مہاجرین حبشہ کو اپنے دربار میں بلایا اور سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے آپ ﷺ کی تعلیمات سنیں تو اس نے کہا: "مرحبا تم کو اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت سیدنا عیسیٰ بن مریم نے دی تھی" (مسند احمد بروایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک بھی انجیل میں آپ کی ایسی واضح علامات موجود تھیں جن کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں ذرہ بھر تامل نہ ہوا۔

[۸] جَاءَهُمْ میں جاءَ کی ضمیر کے مرجع عیسیٰ علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں اور احمد بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس آئے جو اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ مٹی کے پرندے بنا کر ان میں پھونک مارتے تو وہ اڑنے لگتے تھے یا کوڑھی اور پھلبہری والے پر ہاتھ پھیرتے تو وہ تندرست ہو جاتا تھا تو ایسی باتیں دیکھ کر بنی اسرائیل نے ان معجزات کو صریح جادو کہہ دیا۔ اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور بتائی ہوئی صفات کے مطابق جب آپ مبعوث ہوگئے تو انہیں بنی اسرائیل نے آپ ﷺ کی تعلیمات کو فریب کاری اور شعبدہ بازی پر محمول کیا۔ اور ایمان نہ لانے کی خاطر طرح طرح کے الزام عائد کرنے لگے۔

[۹] نصاریٰ نے اللہ پر کیا کیا بہتان باندھے؟ اس سے مراد عیسائیوں کے وہ مختلف قسم کے بہتان ہیں جو انہوں نے اللہ پر لگا رکھے تھے۔ کبھی کہتے کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کا بیٹا ہے۔ کبھی کہتے کہ یہ تین خداؤں میں کا تیسرا ہے اور کبھی کہتے کہ عیسیٰ ہی اللہ ہے۔ اور اللہ عیسیٰ کے جسم میں حلول کر آیا ہے۔ ان کے علاوہ ان کی بہتان بازیاں یہ تھیں کہ اناجیل کی عبارتوں میں خود ہی اپنی حسب پسند اضافے بھی کر لیتے تھے اور جو چیزیں موجود تھیں ان کی تاویل یا انکار بھی کر دیتے تھے۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر ظلم یہ کیا کہ جب نبی آخر الزمان نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی تو اپنے اختراع کردہ بہتانوں کو حقیقی بنیاد بنا کر بنائے فاسد علی الفاسد کے مصداق اس نبی کو جھٹلا دیا۔ جو لوگ اللہ پر افترا کرنے میں بھی اتنے جری اور دلیر ہو گئے ہوں انہیں ہدایت کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟ اللہ کا یہ دستور نہیں کہ ایسے ظالموں کو زبردستی راہ ہدایت پر لے آئے۔

[۱۰] اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے دشمن اقوام کے منصوبے۔ اس آیت کی مخاطب ساری ہی دشمن اسلام قومیں ہیں۔ خواہ

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۟۹ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۟۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۟۱۱ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ یُدْخِلْكُمْ

وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اسے سب دینوں[۱۱] پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں[۱۲] کو کتنا ہی ناگوار ہو۔(۹)

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت[۱۳] بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے؟(۱۰) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کرو۔ اگر تم جان لو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے(۱۱) وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں داخل کرے گا

وہ عیسائی ہوں یا یہودی یا مشرکین ہوں یا منافقین۔ فتح مکہ سے پہلے تک یہ سب طاقتیں یہی سمجھ رہی تھیں کہ اسلام بس ایک ٹمٹماتا چراغ ہے۔ جو ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بجھ سکتا ہے اور بجھ جائے گا۔ بلکہ فتح مکہ کے بعد یہ تاثر پوری طرح زائل نہ ہوا۔ فتح مکہ کے بعد قبیلہ ثقیف اور ہوازن نے اسی ارادہ سے جنگ کی کہ اسلام کو ملیامیٹ کر دیں۔ پھر اس کے بعد ایک عامر نامی عیسائی راہب نے منافقین مدینہ سے ساز باز کی اور قیصر روم کو مسلمانوں پر چڑھا لانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں غزوہ تبوک بپا ہوا۔ روایات کے مطابق اس موقع پر عیسائیوں کے دو لاکھ افراد پر مشتمل لشکر کا آنا متوقع تھا۔ لیکن اللہ نے انہیں میدان مقابلہ میں آنے کی توفیق ہی نہ دی۔ سب اسلام دشمن طاقتیں آغاز اسلام سے لے کر جلتی بھنتی اور کڑھتی ہی رہیں اور انجام کار ہوا یہ کہ اسلام کی روشنی سارے عرب پھر اس کے بعد ساری دنیا میں پھیل گئی۔ واضح رہے کہ یہ آیات اس دور میں نازل ہوئیں جبکہ اسلام کا مستقبل بالکل مبہم تھا اور بعض غیر جانبدار قسم کے قبائل اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

[۱۱] اس آیت کی تشریح کے لیے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۳ پر حاشیہ نمبر ۳۳ ملاحظہ فرمائیے۔

[۱۲] مشرکوں کو خالص توحید ناگوار گزرتی ہے:۔ یعنی مشرک تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی بندگیاں بھی چلاتے رہیں۔ بڑے خدا کے ساتھ چھوٹے خداؤں یا اس کے اپنے پیاروں کو کائنات کے تصرف میں، حاجت روائیوں اور مشکل کشائیوں میں شامل اور شریک کرتے رہیں۔ اللہ کے دین میں دوسرے دینوں کی اور غیر اسلامی فلسفوں اور نظریات کی آمیزش کرتے رہیں۔ مگر اللہ کو ایسی شراکت اور ایسے سمجھوتے قطعاً منظور نہیں۔ وہ ہر قسم کے شرک سے پاک سچے اور ستھرے دین کو ہر دین پر غالب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اسے پورا کر کے رہے گا اگر مشرکوں کو یہ بات ناگوار ہے تو وہ اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا دیکھیں۔

[۱۳] یعنی تمام دنیا میں اسلام کا نور پھیلانے والی اور دین اسلام کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنے والی اللہ کی ذات ہے تاہم اللہ تعالیٰ

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﭫ وَاُخْرٰى
تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﭬ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا
قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ

جن کے تلے نہریں بہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہنے والے باغوں میں پاکیزہ گھر عطا کرے گا۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔(۱۲) اور ایک دوسری چیز (بھی عطا کرے گا) جسے تم پسند کرتے ہو اور وہ ہے اللہ کی مدد اور جلد ہی (حاصل ہونے والی) فتح[۱۴]۔ آپ مومنوں کی اس کی بشارت[۱۵] دے دیجئے (۱۳) اے ایمان والو! اللہ (کے دین) کے مددگار[۱۶] بن جاؤ۔ جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ: "اللہ کی طرف (بلانے میں) کون میرا مددگار ہے؟" تو حواریوں نے جواب دیا۔ ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں۔ پھر بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا

نے اس کا ذریعہ اہل ایمان کو بنایا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو وہ ارادہ کر چکا ہے وہ پورا کر کے رہے گا اور یہ کام تمہارے ہاتھوں ہو گا۔ تم سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ کے وعدوں پر مکمل اعتماد کرو اللہ کے رسول کی پوری طرح اطاعت کرو۔ پھر اپنا مال، اپنا وقت، اپنی قابلیت حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے میں لڑا دو۔ اور یہ تمہارے لیے ایسی پُر منفعت تجارت اور نفع کا سودا ہے جس میں کبھی خسارے کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ اس کے عوض آخرت میں تمہیں دو فائدے یقینی طور پر حاصل ہوں گے ایک یہ کہ تمہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا اور دوزخ کے عذاب سے بچ جانا بھی بذاتِ خود بڑی کامیابی ہے۔ دوسرا یہ کہ تمہارے گناہ اور خطائیں معاف کر کے نعمتوں والے باغات میں داخل کرے گا۔ جہاں تم ہمیشہ کے لیے جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہو گے اور یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔ (اسی سے ملتا جلتا مضمون پہلے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کے تحت حاشیہ نمبر ۱۲۳ میں گزر چکا ہے۔ وہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے)

[۱۴] اللہ تعالیٰ نے پہلے اخروی نعمتوں کا ذکر فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل اور پائیدار نعمتیں وہی ہیں ان کے علاوہ ایک اور تیسری نعمت جو اس دنیا سے متعلق ہے۔ اس کا بعد میں ذکر فرمایا۔ اور یہ پسندیدہ اس لحاظ سے ہے کہ انسان طبعاً نقد چیز کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اور وہ نعمت ہے اللہ کی مدد سے مکہ کی فتح جو عنقریب حاصل ہو گی۔ گویا اللہ سے ایمانداروں کا یہ سودا ہر لحاظ سے منفعت بخش اور بار آور ہے۔ دنیا میں فتح حاصل ہوتی ہے اور اموالِ غنیمت وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ عزت حاصل ہوتی ہے اسلام کی فتح سے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور آخرت میں جو فائدے حاصل ہوں گے وہ ان سب سے بڑھ کر ہیں۔

[۱۵] یعنی اس مدد اور قریبی فتح کی بشارت بذات خود ایک مستقل انعام ہے۔

[۱۶] بعض مفسرین کے نزدیک یہ دھوبی تھے۔ گو تعداد میں کم تھے مگر انتہائی مخلص ایماندار تھے۔ انجیل کی تعلیم کی اشاعت میں ان لوگوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ (مزید تشریح کے لیے دیکھئے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۵۲ اور سورۃ المائدہ کی آیت

طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾

ع ۲ / ۱۰

اور دوسرے گروہ نے انکار کر دیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد کی کہ تو وہی [۱۷] غالب رہے۔(۱۴)

(نمبر ۱۱۱،۱۱۲ کے حواشی)

[۱۷] سیدنا عیسیٰ کا انکار کرنے والے تو یہود ہیں۔ اور ان پر ایمان لانے والے عیسائی ہیں جو سیدنا عیسیٰ کے بعد آپس میں دست و گریبان رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس بحث و مناظرہ اور خانہ جنگیوں میں ایمان لانے والوں کو یہودیوں پر غالب کیا پھر ان نصاریٰ میں شرک کی عام گمراہی پھیل گئی۔ ان میں سے جو بچے کھچے افراد توحید پر قائم رہ گئے تھے انہیں اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کے ذریعہ غلبہ عنایت فرمایا۔ حجت و برہان کے لحاظ سے بھی وہی غالب رہے اور سیاسی طور پر بھی انہیں ہی غلبہ حاصل ہوا۔

۱۱ آیاتها سورۃ الجمعۃ مدنیۃ رکوعها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝1 هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝2

کلمات ۱۷۶ آیات ۱۱ (۶۲) سورۃ الجمعۃ مدنی ہے (۱۱۰) رکوع ۲ حروف ۷۸۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آسمانوں اور زمین میں موجود تمام [۱] مخلوق اللہ کی تسبیح کرتی [۱] ہے۔ جو بادشاہ ہے، مقدس [۲] ہے، زبردست ہے، دانا ہے (۱)
وہی تو ہے جس نے ان پڑھ [۳] لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے ان کی زندگی سنوارتا اور انہیں کتاب و حکمت [۴] کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح [۵] گمراہی میں پڑے تھے (۲)

[۱] یہ تسبیح زبان قال سے بھی ہوتی ہے مگر ہم اسے سمجھ نہیں سکتے اور زبان حال سے بھی۔ یعنی کائنات کی ایک ایک چیز اس بات پر شاہد ہے کہ اس کا بنانے والا ہر طرح کے عیوب و نقائص سے پاک ہے۔

[۲] ان صفات کی تشریح کے لیے سورۂ حشر کی آیت نمبر ۲۳ ملاحظہ فرمایئے۔

[۳] ۞ یہود اُمّی کا لفظ حقارت اور طنز کے طور پر بولتے تھے:۔ لفظ اُمّی کی تشریح سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۵ (حاشیہ ۱۵۴) کے تحت گزر چکی ہے۔ لیکن اس سورہ میں آگے چونکہ یہود کو خطاب ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہاں وہی مفہوم مراد ہو گا جو یہودی اس لفظ سے لیا کرتے تھے۔ یہودی خود تو اپنے آپ کو بہت پڑھے لکھے اور عالم فاضل سمجھتے تھے اور اپنے سوا سب غیر یہودیوں کو حقیر سمجھ کر اُمّی کہتے تھے۔ یعنی ان کے سوا سب لوگ ان پڑھ اور بدھو ہیں اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ نبی آخر الزمان ہم جیسے عالم فاضل لوگوں میں سے ہو گا۔ گویا انہوں نے اس بات میں اپنی توہین سمجھی کہ وہ ایک ان پڑھ یا غیر یہود قوم میں مبعوث ہونے والے نبی پر ایمان لائیں۔

[۴] اس نبی اُمّی یا نبی آخر الزمان کی چار ذمہ داریاں تھیں۔ ان ذمہ داریوں کی تفصیل پہلے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۹ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔ وہ ملاحظہ کر لی جائے۔

[۵] ۞ دور جاہلیت میں عرب معاشرہ کی حالت:۔ کَانُوْا سے مراد یہود قوم بھی ہو سکتی ہے۔ مشرکین عرب بھی اور پورا عرب معاشرہ بھی۔ قوم یہود جن اخلاقی بیماریوں میں مبتلا تھی اور ان میں جس قدر اخلاقی انحطاط رونما ہو چکا تھا اس کی داستان بڑی طویل ہے اور قرآن میں جابجا مذکور ہے۔ رہا عرب معاشرہ جس میں یہود بھی شامل تھے۔ ایسی نہ ختم ہونے والی قبائلی لڑائیوں میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جس سے گھروں کے گھر برباد ہو گئے تھے۔ لیکن اس بیماری کا کوئی علاج انہیں نظر نہیں آتا تھا۔ شرک عام تھا ہر قبیلے کے الگ الگ بت بھی ہوتے تھے اور کچھ بڑے بت مشترکہ بھی ہوتے تھے۔ لوٹ مار' قتل و غارت' فحاشی' زناکاری اور شراب نوشی یہ

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو

اور انہی کے کچھ دوسرے لوگوں (کی طرف بھی بھیجا) جو ابھی ان سے [۶] نہیں ملے اور وہ زبردست [۷] ہے حکمت والا ہے (۳) یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا [۸] ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے (۴)

سب باتیں ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ سودی لین دین کا بھی رواج تھا تاہم اس کام میں یہودی قوم سب سے پیش پیش تھی۔ اور اس بات کے باوجود کہ سود ان کی شریعت میں حرام تھا۔ انہوں نے غیر یہود سے سود وصول کر لینا صرف جائز ہی نہیں بنا رکھا تھا۔ بلکہ اسے ایک مستحسن فعل سمجھتے تھے۔ انہی بیماریوں کی وجہ سے اہل عرب کی زندگی انتہائی تلخ صورت اختیار کر چکی تھی۔

[۶] آپ تمام لوگوں کے لئے تاقیام قیامت رسول ہیں:۔ نبی آخر الزمان صرف ان امی اہل عرب ہی کی طرف مبعوث نہیں کیے گئے تھے بلکہ بعد میں قیامت تک آنے والے لوگوں کے بھی نبی ہیں گویا آپ کی نبوت اور رسالت صرف اہل عرب کے لیے اور صرف اس دور کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ اس دور کے اور بعد میں تاقیامت آنے والے سب انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل حدیث بھی ملاحظہ فرمایئے۔

سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ: جب سورۂ جمعہ نازل ہوئی تو ہم آپ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ ﴿وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے تین بار یہی سوال کیا۔ اس وقت ہم لوگوں میں سلمان فارسیؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ان پر اپنا ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ: "اگر ایمان ثریا پر بھی ہوتا تو ان لوگوں (فارس والوں) سے کئی لوگ وہاں تک پہنچ جاتے" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اہلِ فارس کی خدمتِ اسلام:۔ آپ ﷺ نے پہلے دو بار اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ اس سے مراد کوئی خاص لوگ نہیں تھے۔ بلکہ اس سے مراد عامۃ الناس تھے۔ پھر جب سیدنا ابوہریرہؓ نے تیسری بار بھی یہی سوال کیا تو آپ ﷺ نے اہل فارس کا نام لیا کہ یہ لوگ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر دین اسلام کی خدمت کریں گے۔ چنانچہ عملاً ہوا بھی ایسا ہی، صحابہ کرامؓ کے دور کے بعد اسلام کی نشر و اشاعت کا جتنا کام اہلِ فارس نے سر انجام دیا۔ دوسروں کے حصہ میں یہ سعادت نہ آسکی۔ بڑے بڑے محدثین اور فقہاء کی اکثریت اسی علاقہ سے تعلق رکھتی ہے۔

[۷] اللہ تعالیٰ کے زبردست اور حکمت والا ہونے کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنا رسول بھیج کر بائیس تئیس سال کی مختصر مدت میں عرب بھر کی کایا پلٹ کے رکھ دی۔ شرک کی جڑ کٹ گئی۔ اور خالصتاً اللہ کے پرستار پیدا ہو گئے۔ پہلے سب ایک دوسرے کے دشمن تھے اب بھائی بھائی بن کر شیر و شکر ہو گئے۔ پہلے بہت سے گناہوں اور اخلاقی امراض میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اب اخلاق فاضلہ کے بلند مقام پر فائز ہو گئے۔

[۸] یہود اگر جلتے ہیں تو جلتے رہیں۔ وہ کوئی اللہ کے فضل کے ٹھیکیدار نہیں ہیں کہ رسول اگر آنا تھا تو انہی کی قوم میں سے آنا چاہیے تھا۔ اور یہ فضل بھی کیا کم ہے کہ تاقیامت تمام روئے زمین کی قیادت پیغمبر اسلام اور آپ کی امت کے سپرد کر دی گئی۔

الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ
الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ
اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا

جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا پھر انہوں نے یہ بار نہ اٹھایا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اٹھائے[۹] ہوئے ہو۔ (اس سے بھی) بری مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا[۱۰] اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔(۵)

آپ ان سے کہیے: ''اے لوگو! جو یہودی بنے ہوئے ہو، اگر تمہارا یہ سمجھتے ہو کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے دوست ہو[۱۱] تو اگر تم اس بات میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو(۶) اور یہ لوگ کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے۔

[۹] ❁ پڑھے لکھے یہود کا اخلاقی انحطاط:۔ اس آیت اور اس سے آگے کی آیات میں براہ راست یہود کو خطاب کیا گیا ہے۔ جو اپنے آپ کو بڑا عالم فاضل سمجھتے تھے۔ انہوں نے تورات کی کئی شرحیں بھی لکھ رکھی تھیں۔ جنہیں تلمود کہتے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور بہت سے تورات کے عالم بھی تھے۔ عرب بھر میں ان کے علم و فضل کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ دوسرے سب لوگوں کو اُمّی، ان پڑھ، بدھو کہتے تھے اور انہیں حقیر سمجھتے تھے لیکن ان کی عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ وہ بے عمل بھی تھے اور بد عمل بھی۔ دنیا کے لالچ میں پھنس کر اللہ کو بھول چکے تھے۔ اللہ کے صرف ان احکام پر عمل کرتے تھے جو ان کی طبیعت اور مزاج کے موافق ہوں۔

❁ عالم بے عمل کی گدھے سے تشبیہ:۔ حرام خوری اور علی الاعلان جھوٹ بولنا۔ بد عہدی۔ دغا بازی۔ کتاب اللہ میں اپنی مرضی کے موافق تحریف کر لینا۔ سود کھانا اور غیر یہود کے مال کو ناجائز طور پر حاصل کر کے اسے اپنے لیے حلال و طیب سمجھنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ اسی لیے اللہ نے ان کی مثال ایسے گدھے سے دی ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر علم و حکمت کے خزانے لادے ہیں یا پتھر ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ نے ان لوگوں کو گدھا قرار دیا جو علم و فضل کے دعویدار تھے۔ اس سے از خود یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ جو عالم بے عمل یا بد عمل ہو وہ عالم نہیں بلکہ گدھا ہوتا ہے۔ جو مفت میں اپنی پیٹھ پر کتابوں کا اور علم کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔

[۱۰] یہاں اللہ کی آیات سے مراد وہ بشارتیں اور نبی آخر الزمان کی صفات ہیں جو تورات میں موجود تھیں اور اس نبی آخر الزمان کو جھٹلا دینا ہی گویا اللہ کی آیات کو جھٹلا دینے کے مترادف تھا۔

[۱۱] ان سب قباحتوں کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد ہیں لہٰذا ہم ہی تمام دنیا میں اس کے چہیتے اور پیارے ہیں۔ مرنے کے بعد صرف ہم ہی جنت میں جائیں گے۔ باقی سب لوگ دوزخ میں جائیں گے۔ نیز یہ کہ مرتے ہی ہم سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نظریہ کو مردود قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو پھر تو تمہیں جلد از جلد مرنے کی آرزو کرنا چاہیے تاکہ اس دنیا کے جھنجھٹوں اور جنجالوں سے تمہیں نجات مل جائے۔

قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ

تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ

لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے[۱۲] جو یہ کر چکے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے(۷) آپ ان سے کہیے: جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو تمہیں آ کے رہے[۱۳] گی پھر تم اس کے ہاں لوٹائے جاؤ گے جو غائب اور حاضر کا جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے؟(۸)

اے ایمان والو! جمعہ کے دن جب نماز کے لیے اذان دی جائے تو ذکر الٰہی کی طرف[۱۴] دوڑ کر آؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اگر تم جانو تو یہی بات تمہارے لیے بہتر ہے۔(۹)

[۱۲] یہودی موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے؟ مگر حقیقت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ اس آیت کے نزول کے بعد محض اپنے دعوے کو سچا قرار دینے کی خاطر انہوں نے جھوٹ موٹ یا زبانی طور پر موت کی آرزو نہیں کی۔ اس لیے کہ انہیں اپنی بداطواریوں کا پوری طرح علم ہے اور انہیں دل سے یہ یقین ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی جنت کی بجائے سیدھے جہنم رسید ہوں گے۔ لہٰذا نہ صرف یہ کہ مرنے کی آرزو نہیں کرتے بلکہ زیادہ سے زیادہ مدت زندہ رہنے پر انتہائی حریص واقع ہوئے ہیں۔

[۱۳] یہود کا دنیا کی ذلت کی زندگی سے پیار اور سب یہودی قبائل کا لڑنے کی بجائے قلعہ بند ہونا:۔ ان کی دنیا کی زندگی سے محبت اور موت سے فرار کا یہ حال ہے کہ ذلیل سے ذلیل تر زندگی کو بھی موت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی زندگی کی حرص نے انہیں مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور سامان رسد کی فراوانی کے باوجود ایک بزدل قوم بنا دیا تھا۔ شیخیاں بگھارنے میں بڑے ہوشیار اور تیز طرار، مگر مقابلے میں انتہائی ڈرپوک، اسی وجہ سے یہودیوں کے تینوں قبیلوں میں سے کسی نے بھی مسلمانوں سے میدان میں آکر جنگ نہیں کی۔ بنو قینقاع بھی قلعہ بند ہوئے۔ بنو نضیر بھی اور بنو قریظہ بھی۔ کیونکہ یہود موت سے ڈرتے تھے جبکہ مسلمان موت سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس موت سے تم بہر صورت بچنا چاہتے ہو وہ تو تمہیں آ کے رہے گی۔ اور تمہیں اللہ کے حضور پیش بھی ہونا ہی پڑے گا۔ پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم اللہ کے چہیتے اور لاڈلے تھے یا اس کی لعنت اور اس کے غصہ میں گرفتار تھے۔

[۱۴] سنت کے واجب الاتباع ہونے پر دلیل:۔ انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول سے پیشتر اذان اور جمعہ دونوں چیزوں سے خوب متعارف تھے۔ انہیں ہدایت صرف یہ دی جا رہی ہے کہ جب جمعہ کے لیے اذان ہو جائے تو خرید و فروخت اور دوسرے دنیوی مشاغل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوراً جمعہ کا خطبہ سننے اور نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں پہنچ جاؤ۔ حالانکہ قرآن میں نہ کہیں اذان کے کلمات کا ذکر ہے اور نہ نماز جمعہ کی ترکیب کا۔ یہ باتیں رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی ہیں۔ جن کی قرآن سے توثیق کر دی گئی ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ جس طرح قرآن کے احکام واجب الاتباع ہیں اسی

طرح رسول اللہ ﷺ کے احکام بھی واجب الاتباع ہیں اور جو شخص صرف قرآن کو واجب الاتباع سمجھتا ہے وہ دراصل قرآن کا بھی منکر ہے۔ اذان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کے کلمات اور مسائل و فضائل کیا ہیں؟ اس کے لیے درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے:۔

❁ اذان سے متعلق احادیث اور مسائل:۔ ۱۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ مسلمان جب مدینہ آئے تو نماز کے لیے یوں ہی جمع ہو جایا کرتے۔ ایک وقت ٹھہرا لیتے نماز کے لیے اذان نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن انہوں نے اس بارے میں گفتگو کی تو بعض کہنے لگے نصاریٰ کی طرح ایک گھڑیال بنالو اور بعض کہنے لگے یہود کی طرح ایک بگل بنالو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک آدمی کیوں نہیں مقرر کر لیتے جو نماز کے لیے ندا کر دیا کرے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے (اسی رائے کو پسند کرتے ہوئے) بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: بلال رضی اللہ عنہ اٹھو اور نماز کے لیے اذان کہو۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب بدء الاذان)

۲۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا گیا کہ اذان کے الفاظ دو دو بار اور تکبیر کے الفاظ ایک ایک بار کہیں۔ بجز قد قامت الصلوٰۃ کے۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب الاذان مثنیٰ مثنیٰ)

۳۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کرتے۔ آپ صبح ہونے تک ہمیں چڑھائی کرنے سے روکے رکھتے۔ پھر اگر وہاں (صبح کی) اذان سن لیتے تو ان پر حملہ نہ کرتے اور اگر اذان کی آواز نہ آتی تو پھر حملہ کرتے" (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب ما یُحقن بالاذان من الدماء)

۴۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تم اذان سنو تو جو کچھ مؤذن کہے وہی کچھ تم بھی کہتے جاؤ" (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب مایقول اذاسمع المنادی) البتہ جب وہ حی علی الصلوۃ کہے تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔

۵۔ جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اذان سننے کے بعد جو شخص یہ دعا کرے: "اللھم ربَّ ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلوۃ القائمۃ آتِ محمدن الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہُ مقاما محمودن الذی وعدتہ" قیامت کے دن میری شفاعت کا مستحق ہوگا۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب الدعاء عندالنداء)

۶۔ عبداللہ بن حارث بصری کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس نے ہم کو (جمعہ کا) خطبہ سنایا۔ اس دن کیچڑ تھا۔ جب مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہنے کو تھا تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ یوں پکارے الصلوٰۃ فی الرحال (اپنے اپنے ٹھکانوں پر ہی نماز پڑھ لو) یہ سن کو لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ابن عباس نے کہا: یہ کام تو اس ہستی نے کیا جو مجھ سے بہتر تھے اور اس میں شک نہیں کہ جمعہ واجب ہے۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب الکلام فی الاذان)

۷۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بلال رضی اللہ عنہ تو رات رہے سے (سحری کی) اذان دیتا ہے اور جب تک ام مکتوم کا بیٹا اذان نہ دے۔ تم لوگ کھاتے پیتے رہو" اور ام مکتوم کے بیٹے (عبداللہ) اندھے تھے۔ وہ اس وقت تک اذان نہ دیتے جب تک لوگ یہ نہ کہتے کہ صبح ہو گئی، صبح ہو گئی۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب اذان الاعمٰی......)

۸۔ ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دیتے دیکھا اور میں بھی (ان کی طرح اذان میں) ادھر ادھر منہ پھیرنے لگا۔ (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب ھل یتتبع المؤذن فاہ)

نماز جمعہ سے متعلق احادیث اور مسائل:۔ آپ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو نماز جمعہ کا آغاز کر دیا گیا تھا۔اب جمعہ کے متعلق درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے دن ہر جوان پر غسل واجب ہے اور مسواک کرنا اور اگر میسر ہو تو خوشبو بھی لگانا۔(بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب الطیب للجمعة)

۲۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی تم میں سے جمعہ کی نماز کے لیے آئے تو غسل کرے۔(بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب فضل الغسل یوم الجمعة)

ان دو احادیث سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ جمعہ فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں۔ نہ یہ بچوں پر فرض ہے نہ بوڑھوں پر، نہ عورتوں پر نہ مسافروں یا مریضوں پر نیز بارش کے دن کسی پر بھی فرض نہیں جیسا کہ اذان سے متعلق حدیث نمبر ۶ سے بھی واضح ہوتا ہے۔

۲۔ جمعہ کے دن غسل کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر جمعہ واجب ہے وہ غسل کر کے نماز کے لیے جائے جیسا کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے واضح ہے۔ تاہم بعض علماء نے یہاں رسول اللہ ﷺ کے حکم کو وجوب کے لیے نہیں استحباب کے معنوں میں لیا ہے اور ان کی دلیل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ لوگ دور دور سے اور بلند مقامات سے آتے۔ انہوں نے اون کی عبائیں پہنی ہوتیں اور گرد و غبار اور پسینہ کی وجہ سے ان سے بو آتی تھی۔ تو آپ ﷺ نے انہیں نہا کر آنے کا حکم دیا تھا۔(مسلم۔ کتاب الجمعہ) اور جب ایسی صورت نہ ہو تو نہا کر آنا واجب نہیں۔ البتہ مستحب ضرور ہے۔

۳۔ مسواک کرنا اور خوشبو لگانا سنت اور مستحب ہے واجب نہیں۔

۴۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ جمعہ کی نماز اس وقت پڑھتے جب سورج ڈھل جاتا۔(بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب وقت الجمعة......)

۵۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جمعہ کی اذان ہوتے ہی خرید و فروخت حرام ہو جاتی ہے اور عطاء بن ابی رباح نے کہا کہ ہر پیشہ (اور شغل) حرام ہو جاتا ہے۔(بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب المشی الی الجمعة)

۶۔ سیدنا سائب بن یزید کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعہ کے دن ایک ہی اذان ہوا کرتی۔ جب امام منبر پر بیٹھ جاتا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب مدینہ کی آبادی بہت بڑھ گئی تو انہوں نے زوراء (مدینہ کے بازار میں ایک مقام کا نام) پر تیسری اذان (یعنی اقامت سمیت) بڑھائی۔(بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب الاذان یوم الجمعة)

۷۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ (جمعہ کے دن) دو خطبے پڑھتے اور ان کے درمیان بیٹھتے۔(بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب القعدة بین الخطبتین یوم الجمعة)

۸۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جمعہ کے دن اس وقت آیا جب آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: تو نے (تحیۃ المسجد کی) نماز پڑھی؟ اس نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھ دو رکعتیں (ہلکی پھلکی) پڑھ لے۔

(بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب من جاء والامام یخطب صلّی رکعتین خفیفتین)

۹۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ جمعہ کے بعد مسجد میں کچھ نہ پڑھتے۔ جب اپنے گھر لوٹ کر آتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ (بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب الصلوۃ بعد الجمعۃ و قبلھا)

۱۰۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تو اپنے ساتھی سے جمعہ کے دن یوں کہے: "چپ رہ" اور امام خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغو حرکت کی۔ (بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب الانصات یوم الجمعۃ......) ۔

۱۱۔ سیدنا ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ جو ہوا وہ عبدالقیس کی مسجد میں ہوا جو بحرین میں جواثیٰ (جگہ کا نام) میں تھی۔ (بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب الجمعۃ فی القریٰ والمدن) اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ ہر گاؤں میں ادا کرنا چاہیے۔ شہر ہونا کوئی شرط نہیں۔

۱۲۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جمعہ کے دن فرشتے جامع مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آنے والوں کے باری باری نام لکھتے ہیں۔ جو پہلے آتا ہے اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو اونٹ کی قربانی کرے پھر دوسرے کی جیسے گائے کی قربانی کرے پھر تیسرے کی جو مینڈھا، پھر چوتھے کی جو مرغی، پھر پانچویں کی جو انڈا قربانی دے۔ پھر جب امام (خطبہ کے لئے) نکلتا ہے تو فرشتے اپنے دفتر لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے لگ جاتے ہیں۔ (بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب الاستماع الی الخطبۃ)

۱۳۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ: "جن دنوں میں سورج طلوع ہوتا ہے ان میں سے سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی جمعہ کے دن سیدنا آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اسی دن جنت میں داخل کیے گئے اور اسی دن نکالے گئے۔ اور قیامت بھی اسی دن قائم ہوگی" (مسلم۔ کتاب الجمعہ)

❁ **خلاف سنت امور:**۔ اب ہم چند ایسی خلاف سنت باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو آج کل ہم اپنے معاشرہ میں اور بالخصوص ہمارے علماء میں پائی جاتی ہیں:

۱۔ ان میں پہلی چیز جمعہ کے وقت میں تاخیر ہے۔ چنانچہ ایاس بن سلمہ بن اکوع اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ہم جمعہ کی نماز آپ ﷺ کے ساتھ ادا کر کے واپس لوٹتے تھے تو ہم دیواروں کا سایہ نہ پاتے تھے جس کی آڑ میں آئیں۔ اور جابر بن عبداللہؓ کی حدیث کے مطابق زوال آفتاب شروع ہوتے ہی آپ ﷺ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کر لیا کرتے تھے۔ (مسلم۔ کتاب الجمعہ)

❁ **نماز جمعہ کی ادائیگی میں تاخیر:**۔ ان دونوں احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ جمعہ کا خطبہ زوال آفتاب تک دے کر فارغ ہو جایا کرتے تھے مگر ہمارے ہاں یہ رواج بڑھ چکا ہے کہ جمعہ کا خطبہ بھی زوال آفتاب سے کافی دیر بعد شروع ہوتا ہے اور بعض مساجد کا تو یہ حال ہے کہ ان کے جمعہ ختم ہونے تک عصر کا اول وقت آجاتا ہے۔

❁ **سنتوں کے لئے وقفہ:**۔ ۲۔ بعض مساجد بالخصوص احناف کی مساجد میں پہلے خطبہ کے بعد نماز جمعہ کی سنتوں کے لیے وقفہ دیا جاتا ہے۔ یہ بات واضح طور پر سنت کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ نے ایسے دیر سے آنے والے کو خطبہ کے دوران ہی دو ہلکی رکعات ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا خطبہ کے بعد سنتوں کے لیے وقفہ دینے کا کوئی جواز نہیں۔

خطبہ کو لمبا اور نماز کو مختصر کرنا:۔ ۳۔ تیسری خلاف سنت بات خطبہ کو لمبا کرنا اور نماز کو مختصر کرنا ہے۔ چنانچہ واصل بن حیان کہتے ہیں کہ ابووائل نے کہا کہ ہمیں عمار رضی اللہ عنہ نے نہایت جامع اور بلیغ خطبہ دیا۔ پھر جب وہ منبر سے اترے تو ہم نے کہا: اے ابوالیقظان! اگر آپ ذرا اس خطبہ کو لمبا کرتے تو بہت بہتر ہوتا۔ تب عمار نے کہا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ آدمی کا نماز کو لمبا کرنا اور خطبہ کو مختصر کرنا اس کے سمجھدار ہونے کی نشانی ہے۔ سو تم نماز کو لمبا کیا کرو اور خطبہ کو چھوٹا۔ اور بعض بیان تو جادو ہوتا ہے" (یعنی جامع اور مختصر بیان جادو کا سا اثر رکھتا ہے) (مسلم۔ کتاب الجمعہ) اور جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز بھی درمیانہ تھی اور خطبہ بھی درمیانہ (مسلم۔ کتاب الجمعہ)

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمعہ کی نماز کتنی لمبی ہوتی تھی تو اس کے متعلق ابن ابی رافع کہتے ہیں کہ مروان نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں خلیفہ مقرر کیا اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی نماز پڑھائی تو آپ نے پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری میں المنافقون پڑھی۔ پھر میں ان سے ملا اور کہا کہ آپ نے وہی سورتیں پڑھیں جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں پڑھتے تھے۔ اس پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کے دن یہی سورتیں پڑھتے سنا ہے" (یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تقلید میں نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں، میں نے یہ سورتیں پڑھی ہیں) (مسلم۔ کتاب الجمعہ) اور سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدوں اور جمعہ میں سبح اسم ربك الاعلیٰ اور هل اتاك حديث الغاشية پڑھا کرتے تھے اور جب جمعہ اور عید دونوں ایک دن میں ہوتیں تب بھی انہیں دونوں سورتوں کو دونوں نمازوں میں پڑھتے تھے" (مسلم۔ کتاب الجمعہ)

یہ تو آپ کی درمیانہ درجہ کی نماز کا حال تھا اور آپ کے خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی خطبہ بیس منٹ سے زیادہ لمبا کبھی نہیں ہوا۔ گویا سنت طریقہ یہ ہے کہ خطبہ پر زیادہ سے زیادہ بیس منٹ اور دو رکعت نماز پر کم از کم دس منٹ صرف ہوں۔ اب اس کے مقابلہ میں موجودہ صورت حال پر غور فرمائیے اہلحدیثوں کی مساجد میں، جو ہر ہر بات میں کتاب و سنت کے متبع ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، کوئی ہی مسجد ایسی ہوگی جہاں خطبہ کا وقت نصف گھنٹہ ہو۔ ورنہ پون گھنٹہ بلکہ اکثر مساجد میں ایک گھنٹہ خطبہ کے لیے وقت مقرر کیا جاتا ہے اور احناف اور بالخصوص بریلوی علماء تو ڈیڑھ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی زیادہ وقت خطبہ میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہ بات صریحاً خلاف سنت ہے۔ علماء حضرات اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمیں عربی کے علاوہ مقامی زبان یا اردو میں بھی اس کی تشریح کرنا پڑتی ہے اگر اس کا لحاظ رکھا جائے تو بھی آدھ گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ پون گھنٹہ بہت کافی ہے۔ کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ مختصر وقت میں بھی بہت سی کام کی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ پھر جب خطیب حضرات خطبہ میں کافی دیر لگا دیتے ہیں تو اس کی کسر جمعہ میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھنے سے نکالتے ہیں۔ حتیٰ کہ میں نے خود ایک ایسے ہی خطیب کو نماز جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۃ الفیل اور دوسری میں سورۃ القریش پڑھتے سنا ہے۔ گویا خطبہ اور نماز دونوں ہی خلاف سنت ہوگئے۔ خطبہ انتہائی لمبا اور نماز انتہائی مختصر۔

اب اس تطویل خطبہ کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگ آتے ہی اس وقت ہیں جب نماز جمعہ کا وقت قریب ہو۔ پھر خطیب حضرات ان دیر سے آنے والوں کو وہ حدیث سنانے لگتے ہیں کہ جو شخص خطبہ جمعہ سننے کے لیے خطبہ شروع ہونے سے پیشتر سب

سے پہلے آئے اس کو ایک اونٹ کی قربانی کا ثواب ملتا ہے اور دوسرے نمبر پر آنے والے کو.......... الحدیث۔ گویا انہیں اپنے خلاف سنت کام کا تو احساس تک نہیں ہوگا۔ اور اس کے نتیجہ میں دیر سے پہنچنے والوں کو حدیث سنا کر کوسنے لگتے ہیں۔

اس تطویل خطبہ کی وجہ جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ خطیب حضرات کی اصل آرزو یہ ہوتی ہے کہ ان کی تقریر کو زیادہ سے زیادہ لوگ سنیں اور اسے سراہا اور پسند کیا جائے۔ لہٰذا وہ مزید لوگوں کی انتظار میں دیر کرتے جاتے ہیں۔ اور جمعہ پڑھنے والوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی مولوی خطبہ میں بہت دیر لگائے گا۔ لہٰذا نماز سے ذرا پہلے چلے جائیں گے۔ اس دوہرے عمل سے خطبہ تو خوب لمبا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی کسر نماز سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انداز خطاب اور موضوع خطاب:۔ ۴۔ چوتھی خلاف سنت بات انداز خطاب اور موضوع خطاب ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب خطبہ پڑھتے تو آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور آواز بلند ہو جاتی اور غصہ زیادہ ہو جاتا۔ گویا وہ ایک ایسے لشکر سے ڈرانے والے تھے جو بس صبح و شام ہی تم پر پہنچنے والا ہے اور فرماتے کہ میں اس وقت بھیجا گیا ہوں کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں پھر آپ اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو ملا دیتے۔ پھر آپ ﷺ اللہ کی حمد کے بعد فرماتے کہ ہر بات سے بہتر اللہ کی کتاب ہے اور ہر طریقہ سے بہتر محمد ﷺ کا طریق ہے اور نئے نئے کام نکالنا سب سے برا کام ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ پھر فرماتے میں ہر مومن کا اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ خیر خواہ ہوں۔ جو شخص مال چھوڑ جائے وہ تو اس کے گھر والوں کا ہے اور جو قرض یا چھوٹے بچے چھوڑ جائے تو اس قرض کی ادائگی یا بچوں کی پرورش میرے ذمہ ہے" (مسلم۔ کتاب الجمعہ) نیز ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارا اور رسول اللہ ﷺ کا تنور ایک ہی تھا۔ دو برس یا ایک برس اور کچھ ماہ تک (یعنی اتنی مدت ہم ان کی ہمسائیگی میں رہے) اس دوران میں نے رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان سے سورہ ق سیکھی تھی۔ آپ اس کو ہر جمعہ میں منبر پر پڑھتے تھے جب لوگوں کو خطبہ سناتے" (مسلم۔ کتاب الجمعہ)

ان دو احادیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ آپ کا خطاب یا تقریر جوشیلی ہوتی تھی۔ راگ اور سُر تال والی نہیں ہوتی تھی جبکہ آج کل خطیب حضرات اپنی پوری کوشش سے راگ اور سُر والا لہجہ سیکھتے ہیں۔ وہ قرآنی آیات کے علاوہ اپنی باتوں کو بھی اس طرح سریلی آواز میں پیش کرتے ہیں سامعین جھومتے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کے نعرے لگانے لگیں۔ اور جتنے زیادہ ایسے نعرے لگیں اتنے ہی خطیب حضرات اسے اپنی تقریر کی پذیرائی سمجھ کر پھولے نہیں سماتے۔ اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تقریر کے دوران ایسے نعرے لگتے رہیں۔

۲۔ خطاب کے دوران آپ کا موضوع ایک نہیں بلکہ متفرق ہوتے تھے۔ گویا آپ کا انداز خطاب تقریر کا نہیں بلکہ وعظ و نصیحت کا ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کتاب اللہ اور سنت رسول سے تمسک کی تاکید فرماتے اور بدعات سے اجتناب کا حکم دیتے اور اس کے انجام سے ڈراتے تھے اور سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان فرماتے تھے اور یہی خطبہ مسنونہ کے موضوع ہیں۔

خطبہ جمعہ کا موضوع دراصل "ذکر اللہ" ہے جیسے اس سورہ میں فرمایا: ﴿فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ اور ذکر اللہ سے مراد سارا قرآن ہے۔ تاہم حدیث نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خطبہ میں سورہ ق پڑھنا زیادہ پسند فرماتے تھے۔ آپ سورہ ق کو مدنظر

دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بعث الموت پر دلائل پیش کیے ہیں۔ آخرت کا انکار کرنے والی چند اقوام کا مختصراً انجام بتایا ہے۔ اور انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کے اعمال کا ریکارڈ ساتھ ساتھ تیار کیا جا رہا ہے اور اس کے مطابق اس کا مؤاخذہ ہونے والا ہے۔ پھر کچھ جنت اور دوزخ کا ذکر ہے اور سورت کے آخر میں خلاصہ کے طور پر فرمایا کہ: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ﴾ اور حدیث نمبر ۸ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ کا اصل موضوع لوگوں کو ان کے اخروی انجام سے ڈرانا ہوتا تھا اور یہ بات آپ بڑے جوش و خروش سے بتایا کرتے تھے۔

اب دیکھئے ہمارے ہاں خطبات جمعہ میں وعظ و نصیحت اور انذار و تبشیر کا بیان تقریباً مفقود ہے۔ ہمارے ہاں عمومی رواج ایک موضوع پر تقریر کرنے کا ہے یہ بھی اس صورت میں تو درست ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے کتاب و سنت سے ہی اور اس کی حدود میں رہ کر بیان کیا جائے۔ مگر ہمارے ہاں تو خطبہ مسنونہ اور قرآن کی ایک آدھ آیت محض برکت کے لیے پڑھ لی جاتی ہے جسے عامۃ الناس سمجھتے ہی نہیں بعد میں اولیاء اللہ کی حکایات، ان کے تصرفات اور ان کی کرامات اس انداز سے بیان کی جاتی ہیں کہ اگر وہ خدا نہیں تو کم از کم اس سے کم درجہ کے بھی نہیں ہوتے مثلاً مولانا روم کا یہ شعر آپ نے خطبات جمعہ میں اکثر سنا ہوگا۔

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ ...... تیر جستہ باز گردانند زراہ

یعنی اولیاء کو اللہ کی طرف سے اس قدر قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ چھوڑے ہوئے تیر کو راستہ سے ہی واپس لا سکتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ مشرکین مکہ بھی اپنے بتوں کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کو جو تصرفات حاصل ہیں وہ اللہ کے عطا کردہ ہیں۔ (مسلم۔ کتاب الحج۔ تلبیۃ المشرکین) پھر ان کی محیر العقول اور مہیب قسم کی کرامات بیان کی جاتی ہیں جن پر عوام کی طرف سے سبحان اللہ کے نعرے لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کسی کو زیادہ جوش آ جائے تو اجتماعی نعرے شروع ہو جاتے ہیں۔ پہلے نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت اور پھر نعرہ حیدری۔ اب سوال یہ ہے کہ صدر اول میں مساجد میں ایسے نعرے بازی ہوتی تھی؟ اور کیا یہ خالص بدعت نہیں؟

ہمارے پسندیدہ موضوع:۔ ہمارے خطیب حضرات کا دوسرا پسندیدہ موضوع اپنے اختلافی عقائد کی نشر و اشاعت اور ان کو فروغ بخشنا ہے۔ پھر ان عقائد کو سنجیدہ طریق پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ فریق مخالف کو طنز و مزاح، تضحیک اور طعن و ملامت کا ہدف بنا کر فرقہ وارانہ فسادات کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ اور خطیب مخالف فریق پر جتنا زیادہ کیچڑ اچھالنا اور انہیں طعن و ملامت کرنا جانتا ہو اتنا ہی وہ اپنے لوگوں میں ہر دلعزیز اور کامیاب خطیب متصور ہوتا ہے۔ جس خطیب کو یہ فن آ گیا۔ بس اس کے وارے نیارے ہو گئے اسے جلسوں جلوسوں میں مدعو کیا جاتا اور گرانقدر نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ عوام کا ذوق بھی کچھ ایسا بن جاتا ہے کہ وہ اپنے خطیب کو پسند کرتے ہیں۔ جو ایک تو گیت کے انداز میں سریلی آواز سے تقریر کر سکتا ہو دوسرے طعن و تشنیع میں اتنا فن کار ہو کہ فریق مخالف کے بخیے ادھیڑ کے رکھ دے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا کہ ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ مگر یہ بات نہ ہمارے خطیب حضرات کو اچھی لگتی ہے اور نہ ہمارے عوام کو۔ کیا یہی چیز اللہ کا ذکر ہے جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ﴿فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ علاوہ ازیں فرقہ بازی اور بدعات کے فروغ میں لاؤڈ سپیکر نہایت کارگر ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ جب لاؤڈ سپیکر کی ایجاد معرض وجود میں آئی تو اس وقت علماء نے کہا تھا کہ اس میں سے شیطان بولتا ہے لہٰذا اس کے استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا مگر آج یہ صورت

حال ہے کہ جو نئی مسجد تعمیر ہوتی ہے اس کی چھت پڑنے سے پیشتر ہی لاؤڈ سپیکر کا اہتمام ضروری سمجھا جاتا ہے اور ہر فریق اس کا فائدہ یہی بتاتا ہے کہ اس سے کتاب و سنت کا پیغام لوگوں کے گھروں تک پہنچایا جائے گا۔ مگر عملاً اس سے دوسرے فریق پر سنگ باری مقصود ہوتی ہے۔ اگر مخالف فریق کے لاؤڈ سپیکر کے ہارن دو ہوں تو یہ فریق چار ہارن لگوائے گا۔ اور اس کے چار ہارن ہو تو یہ چھ لگوائے گا۔ حالانکہ مسجد میں جمع ہونے والے لوگوں کے لیے سرے سے لاؤڈ سپیکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پھر ہمارے خطیب اور علماء حضرات کا بھی مزاج کچھ ایسا بن چکا ہے کہ وہ لاؤڈ سپیکر کے بغیر تقریر کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر مشاہدہ میں آیا ہے کہ صرف گنتی کے چند نمازی سامنے بیٹھے ہیں اور خطیب صاحب لاؤڈ سپیکر کھول کر درس یا خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں لاؤڈ سپیکر کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی مگر اس بات کا کیا علاج کہ مولانا لاؤڈ سپیکر کے بغیر درس یا خطبہ ارشاد فرمانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس کا فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کی یہ آواز لوگوں کے گھروں تک پہنچ رہی ہے۔ اور عملاً یہ ہوتا ہے کہ جب ہر طرف سے اور ہر مسجد سے لوگوں کے گھروں تک یہ آوازیں پہنچنا شروع ہو جاتی ہیں۔ تو لوگ ایسے شور و غل اور سمع خراشی سے بیزار اور متنفر ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ تو محض اسی وجہ سے کسی مسجد کے قرب وجوار میں مکان بنانا پسند نہیں کرتے۔ پھر معاشرہ میں کچھ لوگ مریض بھی ہوتے ہیں جنہیں اس قسم کے شور و غل سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

❁ لاؤڈ سپیکر کے نقصانات:۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ لاؤڈ سپیکر بدعات اور بدعی عقائد و اعمال کے فروغ کے لیے ایک نہایت کامیاب ہتھیار ہے۔ مثلاً اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کی بدعت کو لاؤڈ سپیکر ہی کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا ہے۔ اگر لاؤڈ سپیکر کو قانوناً بند کر دیا جائے تو یہ بدعت تھوڑی ہی مدت بعد از خود دم توڑ دے گی۔ کیونکہ اس کی اصل بنیاد ہے ہی نہیں جس پر یہ قائم رہ سکے۔ یہی حال دوسری بدعات کا ہے اور یہ بات بھی مشاہدہ میں آچکی ہے کہ جہاں فرقہ وارانہ تقریروں کی وجہ سے فسادات ہو رہے ہوں وہاں حکومت لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر پابندی لگا دیتی ہے۔ تو اس کے نتائج نہایت مفید برآمد ہوتے ہیں۔ اور وہاں فرقہ وارانہ فضا ماند پڑ جاتی ہے۔ گویا آج کے دور میں بدعات اور بدعی عقائد کا سب سے بڑا سہارا یہی لاؤڈ سپیکر ہے۔ اور ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ علماء نے لاؤڈ سپیکر سے متعلق ابتداءً جو رائے قائم کی تھی کہ: "اس میں شیطان بولتا ہے" وہ بہت حد تک درست تھی۔ رہے وہ عقائد و اعمال جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں تو ان کے لیے لاؤڈ سپیکر کی قطعاً ضرورت نہیں۔ وہ اس کے بغیر بھی ہر دور میں زندہ و ثابت رہ سکتے ہیں کیونکہ وہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں۔

❁ جمعہ کی غرض و غایت:۔ اب ذرا موضوع خطاب سے متعلقہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث کا آخری حصہ سامنے لایئے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ: "میں ہر مومن کا اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ خیر خواہ ہوں" جس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی ایک اہم غرض مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کی باہمی صلاح و فلاح ہے نہ کہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا، سنگ باری کرنا اور فرقہ وارانہ فسادات کو پھیلا کر عوام الناس کو سرے سے اسلام ہی سے متنفر بنا دینا۔ اس کے بعد فرمایا کہ: "جو شخص مال چھوڑ جائے وہ تو اس کے وارثوں کا ہے اور جو قرض یا چھوٹے بچے چھوڑ جائے تو اس قرض کی ادائیگی یا بچوں کی پرورش میرے ذمہ ہے" اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن مسلمانوں کے اس اجتماع کی ایک اہم غرض ان کی معاشی حالات کا جائزہ لینا اور محتاج اور ناتواں افراد کی کفالت اور مقروضوں کے قرض کی ادائیگی کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ گویا جمعہ فرض تو اس غرض کے لیے کیا گیا تھا کہ مسلمان

وَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا إِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ ع ۲ ۱۲

پھر جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ[۱۵] اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو شاید کہ تم فلاح پاؤ۔ اور جب انہوں نے کوئی سودا بکتا یا کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو ادھر بھاگ گئے اور آپ کو (اکیلا) کھڑا چھوڑ دیا[۱۶]۔ آپ ان سے کہیے کہ: "جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ ہی سب سے بہتر روزی رساں ہے" (۱۱)

زیادہ سے زیادہ تعداد میں اکٹھے ہو کر اللہ کا ذکر سنیں اس کی حمد و ثنا بیان کریں۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی اور باہمی اصلاح و فلاح کے امور پر غور کریں۔ اپنے معاشی حالات کا جائزہ لیں۔ محتاج اور یتیموں، بیواؤں اور ناداروں کی کفالت کا اہتمام کریں تاکہ ان میں محبت، مروت، ہمدردی، ایثار اور اخوت جیسے بلند پایہ اخلاق فروغ پائیں۔ لیکن ہمارے سامنے جمعہ کی ادائیگی کے اغراض ان سے یکسر مختلف ہوتے ہیں جنہیں ہم غیر شعوری طور پر اور عادتاً بجالاتے ہیں۔

[۱۵] یہ اجازت ہے حکم نہیں یعنی اگر تم نماز جمعہ کے بعد مسجد میں ہی بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتے رہو تو بھی اچھا ہے، جانا چاہو تو بھی اجازت ہے۔ اور اگر جمعہ کی نماز کے بعد کاروبار یا کام کاج کرنا چاہو تو بھی مکمل اجازت ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ جو بھی کام کاج کرو دل میں ہر وقت اللہ کی یاد ضرور رہنی چاہیے اور اگر ہو سکے تو زبانی بھی اللہ کا ذکر کرو۔ یہ یاد تمہیں معاصی میں پڑنے سے روکے گی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن بھی سارا دن ہمیں کام کاج سے چھٹی منانے کی ضرورت نہیں۔ ضروری یہ ہے کہ جمعہ کے دن جس پر جمعہ واجب ہے وہ بروقت غسل کرے، مسواک کرے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، تیل اور خوشبو لگائے پھر خطبہ جمعہ شروع ہونے سے پہلے پہلے بلکہ خطبہ کی اذان سے پہلے مسجد پہنچ جائے۔ اور خطبہ بڑے غور سے سنے ہاں اگر ہفتہ میں ایک دن کاروبار سے چھٹی کرنا ہی ہے تو مسلمانوں کو جمعہ کے دن ہی کرنا چاہیے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ہم سب امتوں کے بعد دنیا میں آئے لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ہم سے پہلے اللہ کی کتاب ملی۔ ان کے لیے بھی جمعہ کا دن ہی (عبادت کے لئے) مقرر ہوا تھا لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور ہم کو اللہ نے اسی دن کی ہدایت فرمائی۔ پھر سب لوگ ہمارے پیچھے ہو گئے۔ یہود کا دن کل (ہفتہ کا دن) ہے اور نصاریٰ کا پرسوں (اتوار) کا دن" (بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب فرض الجمعة)

[۱۶] مدنی دور کی ابتدائی زندگی معاشی لحاظ سے بھی مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کن تھی۔ مہاجرین کی آبادکاری کے علاوہ کفار مکہ نے بھی اہل مدینہ کی معاشی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے غلہ کمیاب بھی تھا اور گرانی بھی بہت تھی۔ انہی ایام میں

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کہ ایک غلہ کا تجارتی قافلہ مدینہ آن پہنچا اور انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع کے طور پر طبلے بجانا شروع کر دیئے۔ یہ خبر مژدہ جانفزا سے کم نہ تھی۔ چنانچہ خطبہ سننے والے مسلمان بھی، محض اس خیال سے کہ اگر دیر سے گئے تو سارا غلہ بک ہی نہ جائے، خطبہ چھوڑ کر ادھر چلے گئے اور آپ کے پاس صرف بارہ آدمیوں کے سوا کوئی نہ رہا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری۔ کتاب الجمعہ۔ باب اذا نفر الناس عن الامام......) جس میں مسلمانوں پر میٹھی زبان میں عتاب نازل ہوا کہ یہ قافلہ والے کوئی تمہارے رازق تو نہ تھے۔ رزق کے اسباب مہیا کرنے والا تو اللہ ہے۔ لہٰذا آئندہ تمہیں ایسی باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کو خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہیے اور یہی آپ ﷺ کا معمول تھا۔

اس سلسلہ میں دو احادیث ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی اکرم ﷺ خطبہ کھڑے ہو کر دیتے۔ پھر بیٹھ جاتے۔ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔ جو تمہیں یہ بتائے کہ آپ ﷺ نے خطبہ بیٹھ کر دیا اس نے جھوٹ بولا۔ (مسلم)

۲۔ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے اور عبدالرحمٰن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہے تھے۔ کعب نے فرمایا۔ اس خبیث کو دیکھو۔ یہ بیٹھ کر خطبہ دیتا ہے اور قرآن مجید میں (اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَاۗىِٕمًا) جب انہوں نے خرید و فروخت یا کھیل کے مشغلہ کو دیکھا تو اس طرف بھاگ نکلے اور تمہیں کھڑا ہوا چھوڑ گئے۔ (مسلم)

۱۱ آیاتہا سُوْرَۃُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ رکوعہا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ① اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ②
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ③ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۭ وَاِنْ

کلمات ۱۸۳ آیات ۱۱ (۶۳) سورۃ المنافقون مدنی ہے (۱۰۴) رکوع ۲ حروف ۸۲۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں" اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں اور اللہ یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق سراسر[۱] جھوٹے ہیں (۱) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال[۲] بنا رکھا ہے اور (اس طرح) اللہ کی راہ[۳] سے روکتے ہیں بہت برا کام ہے جو یہ کر رہے ہیں (۲) یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے پھر کفر کیا[۴] تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اب یہ کچھ نہیں سمجھتے (۳) اگر آپ ان کا قد و قامت[۵] دیکھیں تو آپ کو بہت پسند آئے

[۱] یعنی منافق بھی یہ شہادت دیتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ نے بھی یہی شہادت دی کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے باوجود اللہ یہ بھی شہادت دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ کیونکہ یہ شہادت وہ دل کے یقین سے نہیں بلکہ محض فریب کاری کی غرض سے زبانی طور پر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے اعمال ان کے اس زبانی دعویٰ کی تائید نہیں کرتے تھے۔ اور قول و فعل میں دیدہ دانستہ تضاد منافقت کی دلیل ہے۔ ایمان کی نہیں۔

[۲] یعنی قسموں سے وہ کام لیتے ہیں وہ جو ڈھال سے لیا جاتا ہے۔ وہ قسموں کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنے ایمان کا یقین دلا کر اپنا جان و مال محفوظ کر لیتے تھے۔ نیز جب ان کی کوئی ناشائستہ حرکت یا سازش پکڑی جاتی ہے۔ تو جھوٹی قسمیں کھا کر مسلمانوں کی گرفت سے بچ جاتے ہیں۔ کیونکہ اسلام کا قانون یہ ہے کہ وہ صرف ظاہری افعال پر ہی گرفت کرتا ہے۔

[۳] صَدَّ کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے خود تو ان منافقوں کا اسلام سے رکنا واضح ہے جو لوگ اسلام لانا چاہیں ان کے دلوں میں کئی طرح کے شکوک و شبہات پیدا کر کے ان کے اسلام لانے میں سدِ راہ بن جاتے ہیں اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب یہ پہلے سے اسلام میں داخل ہونے والے لوگ بھی مطمئن نہیں تو ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

[۴] یعنی اسلام تو لے آئے اور ایمان کا دعویٰ بھی کیا۔ مگر دل سے یہ کافر کے کافر ہی رہے۔ ان کی ہمدردیاں اور سرگوشیاں اور رازداریاں سب کافروں سے ہی وابستہ رہیں اور یہ عادت ان میں اس قدر پختہ ہو گئی کہ اب مسلمانوں کی کوئی بھلائی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ لہٰذا اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی کیونکہ اللہ کسی کو جبراً اور کان پکڑ کر راہِ ہدایت کی طرف نہیں لایا کرتا۔ اور وہ بے وقوف ایسے ہیں کہ انہیں یہ سمجھ بھی نہیں آ رہی کہ جو کام وہ کر رہے ہیں وہ ان کے لیے مفید رہیں گے یا الٹا انہیں پکڑوا دیں گے اور ان کی ذلت و رسوائی کا باعث بن جائیں گے۔

[۵] ﷺ منافقوں کی عادات اور خصائل:۔ منافقوں کا رئیس عبداللہ بن ابی بن سلول معاشی لحاظ سے بھی رئیس تھا دیکھنے میں بڑا

يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٤﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ

اور اگر ان کی بات سنیں تو بس سنتے ہی رہ جائیں۔ گویا وہ دیواروں[۶] کے ساتھ لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں۔ (بزدل ایسے کہ) ہر زور کی آواز کو سمجھتے ہیں کہ ان پر[۷] (کوئی بلا) آئی یہی لوگ دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہیے[۸]۔ انہیں اللہ غارت کرے، کہاں سے بہکائے جاتے ہیں۔(۴)

اور جب انہیں کہا جائے کہ: ''آؤ (تاکہ) اللہ کے رسول تمہارے لیے مغفرت طلب کریں'' تو سر جھٹک دیتے ہیں اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ از راہ[۹] تکبر آنے سے رک جاتے ہیں(۵)

خوبصورت اور لمبے قدو قامت والا جوان تھا۔ جنگ بدر کے قیدیوں میں آپ ﷺ کے چچا سیدنا عباس ننگے تھے تو اسی کی قمیص ان کو پوری آسکتی تھی۔ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی سے مانگی تو اس نے دے دی تھی۔ اسی بات کا معاوضہ آپ ﷺ نے اس وقت دیا تھا جب عبداللہ بن ابی مرا تھا۔ اور اس کے بیٹے عبداللہ نے جو سچا مسلمان تھا آپ ﷺ سے یہ التجا کی تھی کہ آپ ﷺ اگر اپنی قمیص دے دیں تو میں یہ اپنے باپ کو پہناؤں اور آپ ﷺ نے دے دی تھی۔ لسان بھی تھا۔ باتیں کرنے کا اور باتوں سے خوش اور مطمئن کرنے کا اسے ڈھنگ آتا تھا۔ باتیں کرتا تو جی چاہتا تھا کہ اس کی باتیں سنتے ہی رہیں۔ اس کے کچھ خاص مصاحب بھی ایسی ہی صفات کے مالک تھے۔

[۶] یہ لوگ جب آپ کی مجلس میں آتے تو کسی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ دراصل وہ یہ کام اپنی برتری اور شان بے نیازی جتلانے کے لیے کرتے تھے۔ اور اللہ نے ان کو لکڑیوں سے تشبیہ اس لحاظ سے دی کہ لکڑیوں میں سننے، سوچنے سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ لوگ بس دکھاوے کی خاطر آ تو جاتے ہیں۔ مگر نہ آپ ﷺ کی باتوں کو دھیان سے سنتے ہیں اور کچھ سن بھی پائیں تو اسے سمجھنے اور سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اور جیسے آئے تھے ویسے ہی دامن جھاڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ہدایت کی کوئی بات قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

[۷] بزدل اور ڈرپوک ایسے ہیں کہ ادھر کوئی کھٹکا ادھر ان کا دل دہل گیا۔ ایک عادی مجرم کی طرح انہیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ہمارا فلاں راز فاش تو نہیں ہو چلا یا فلاں حرکت پر گرفت تو نہیں ہونے لگی۔

[۸] کیونکہ یہ لوگ گھر کے بھیدی اور آستین کے سانپ ہیں۔ تمہاری سب باتیں دشمنوں تک پہنچاتے اور ہر کام سے انہیں باخبر رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تمہارے ظاہری دشمنوں یعنی یہود کفار مکہ اور مشرکین سب سے زیادہ خطرناک ہیں۔ لہٰذا ان سے سخت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

[۹] ویسے تو سب منافقوں کا یہی حال تھا۔ مگر ان کا سردار عبداللہ بن ابی اس بات میں بھی ان کا سردار تھا۔ جب بھی ان کی کوئی سازش یا ناشائستہ حرکت یا راز کی بات پکڑی جاتی تو مسلمان ان سے کہتے کہ: چلو، چل کر رسول اللہ ﷺ سے معافی مانگ لو۔ وہ آپ کو خود بھی معاف کر دیں گے اور اللہ سے بھی تمہاری مغفرت کی دعا کریں گے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر عبداللہ بن ابی نے مسلمانوں کو یہ جواب دیا کہ تم نے مجھے ایمان لانے کو کہا تو میں ایمان لے آیا۔ تم نے نمازیں ادا کرنے کو کہا تو وہ بھی میں نے ادا

يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۶ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰي مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى
يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۷ يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَآ

آپ ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں یا نہ کریں ان کے حق میں برابر ہے (کیونکہ) اللہ انہیں کبھی معاف[۱۰] نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو قطعاً ہدایت[۱۱] نہیں دیتا(۶) یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھیوں[۱۲] پر خرچ نہ کرو تاآنکہ وہ تتر بتر ہو جائیں۔ حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے تو اللہ کے پاس ہیں مگر منافق لوگ سمجھتے نہیں۔(۷) کہتے ہیں: اگر ہم مدینہ واپس گئے تو

کیں۔ تم نے مال کی زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا تو وہ بھی میں نے ادا کی۔ اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں محمد ﷺ کو سجدہ کروں؟" اس کا کبر و نخوت سے بھرا ہوا یہ جواب سن کر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا ہوگا؟ یا مسلمانوں نے اسے آگے کچھ کہا ہوگا؟ اس کی اسی متکبرانہ کیفیت کا نقشہ اللہ نے اس آیت میں کھینچا ہے۔

[۱۰] اس کی تشریح کے لیے سورۂ توبہ کی آیات نمبر ۸۰ اور ۸۴ کے حواشی دیکھ لیے جائیں جو اس موقعہ پر نازل ہوئی تھیں۔ جب عبداللہ بن ابی کی وفات واقع ہوئی تھی۔

[۱۱] اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ ایک یہ کہ دعائے مغفرت بھی صرف ان لوگوں کے لئے ہی قبول اور مفید ہو سکتی ہے جو خود بھی ہدایت کے راستے پر چلنا چاہتے ہوں یا چل رہے ہوں، خواہ دعائے مغفرت کرنے والے خود اللہ کے رسول ﷺ ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسری یہ کہ جو لوگ اللہ کی نافرمانی کی روش اختیار کیے ہوئے ہوں انہیں اللہ زبردستی ہدایت کی راہ پر نہیں لایا کرتا۔

[۱۲] ❁ ہجرت سے پہلے مدینہ میں عبداللہ بن ابی کی حیثیت:۔ آیت نمبر ۷ اور ۸ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ان کا تاریخی پس منظر سمجھنا ضروری ہے جو یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو ان کی آمد سے پہلے مدینہ کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے پر تیار ہو چکے تھے اور اس کے لیے سنہری تاج بھی تیار کرا لیا گیا تھا۔ وہ خود قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتا تھا۔ اوس اور خزرج اپنی باہمی جنگوں سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے اور غالباً عبداللہ بن ابی ہی وہ پہلا شخص تھا جس کی سربراہی کو دونوں قبائل نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس کی رسم تاجپوشی ادا ہونے ہی والی تھی کہ آپ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور جب تمام لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوگئے تو عبداللہ بن ابی کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور جو لوگ عبداللہ بن ابی کی بادشاہت کے دوران بڑے بڑے مناصب کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ عبداللہ بن ابی کے اور ان کے اسلام لانے کے بعد بھی وہ لوگ اس کے دمساز و ہمراز رہے۔ یہ لوگ بظاہر اسلام تو لے آئے مگر بادشاہت اور مناصب کے چھن جانے کی وجہ سے عداوت کی چنگاری ان کے دلوں میں برقرار رہی۔

❁ عبداللہ بن ابی کے اسلام لانے کی وجوہ:۔ عبداللہ بن ابی کے ان حالات میں اسلام لانے کی مجبوریاں تین تھیں ایک یہ کہ بدر

کی فتح نے عرب بھر میں مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی تھی۔ عبداللہ بن ابی بھی ایسے موقع شناس لوگوں میں سے تھا۔ جو چڑھتے سورج کو سلام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مدینہ میں اگرچہ یہود و مشرکین بھی آباد تھے مگر بااثر مسلمان ہی تھے تیسرے یہ کہ عبداللہ بن ابی کا اپنا بیٹا، اس کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، مسلمان ہو چکا تھا اور وہ سچا مسلمان تھا۔

اسلام لانے کے باوجود ان لوگوں کے دلوں میں عداوت کی چنگاری انہیں ہر موقع پر اسلام کے خلاف مشتعل کرتی رہی۔ جنگ بدر سے پیشتر مشرکین مکہ نے عبداللہ بن ابی کو ہی اپنا ساتھی سمجھ کر یہ پیغام بھیجا تھا کہ ''تم لوگوں نے ہمارے صاحب کو پناہ دے رکھی ہے۔ واللہ! یا تو تم اس سے لڑائی کرو اور اسے نکال باہر کرو، ورنہ ہم پوری جمعیت کے ساتھ تم لوگوں پر حملہ کر کے مردوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کی حرمت پامال کر ڈالیں گے'' (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب خبر النضیر) یہ خط دراصل عبداللہ بن ابی کے دل کی آواز تھا۔ اس خط سے اسے بڑا سہارا مل گیا اور اس نے اپنے رفقاء کو اپنے پاس اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ آپ ﷺ کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپ اس کے ہاں خود تشریف لائے اور فرمایا کیا تم اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے خود ہی لڑو گے؟ عبداللہ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اس کے اپنے بہت سے قریبی رشتہ دار مسلمان ہیں لہٰذا اس کی کامیابی ناممکن ہے لہٰذا وہ لہو کے گھونٹ پی کے رہ گیا اور اس کے ساتھی بھی بکھر گئے۔

جنگ بدر کے دوران یہود اور عبداللہ بن ابی کی پارٹی نے مسلمانوں کی شکست کی غلط سلط خبریں پھیلا کر مدینہ کی فضا کو خاصا سنسنی خیز بنا دیا تھا۔ پھر جب مسلمانوں کی شاندار فتح کی خبر آ گئی۔ تو ان لوگوں کے قلب و جگر چھلنی ہو گئے۔ جنگ احد میں عین وقت پر جس طرح عبداللہ بن ابی نے غداری کی اس کا حال پہلے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۲۱ کے حواشی میں گزر چکا ہے۔

❁ <u>اسلام لانے کے بعد عبداللہ بن ابی کا مسلمانوں سے منافقانہ رویہ:۔</u> جب یہود بنو قینقاع کو قید کر لیا گیا۔ تو عبداللہ بن ابی نے پرزور سفارش کر کے انہیں آزادی دلائی اور وہ جلاوطن کیے گئے۔ جنگ بنو نضیر میں اس نے جس طرح یہودیوں کے حوصلے بڑھائے اس کا حال سورۂ حشر میں گزر چکا ہے اور جنگ احزاب میں منافقوں نے جس عدم تعاون کا مظاہرہ کیا اور جس طرح مسلمانوں کو ہی طعنے دینے شروع کیے تھے اس کا حال سورۂ احزاب میں گزر چکا ہے۔ گویا عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتے اور اپنی منافقانہ سرگرمیاں دکھاتے تھے جن سے اسلام و مسلمانوں کو زک پہنچے۔ مسلمان مدینہ سے نکل جائیں یا ان کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے تاکہ عبداللہ بن ابی کو اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت پھر سے نصیب ہو جائے۔

❁ <u>غزوہ بنی مصطلق میں مہاجرین و انصار میں لڑائی اور عبداللہ بن ابی کا انصار کو بھڑکانا:۔</u> غزوہ بنی مصطلق جنگی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ تاہم اس غزوہ میں دو واقعات ایسے پیش آئے۔ جنہوں نے اس غزوہ کو مشہور بنا دیا ہے۔ اور یہ دونوں واقعات منافقوں اور بالخصوص عبداللہ بن ابی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں واقعات نہیں بلکہ فتنے تھے۔ جنہیں برپا کرنے والا بھی عبداللہ تھا۔ ایک تو واقعہ افک ہے۔ جو واپسی کے دوران پیش آیا تھا اور اس کا تفصیلی ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے۔ دوسرا واقعہ اسی مقام پر ہوا جہاں مسلمانوں نے اس مشرک قبیلے کو شکست دی تھی۔ اور شکست دینے کے بعد چند دن آرام کے لیے رک گئے تھے۔ وہاں ایک کنوئیں پر پانی لینے کے سلسلہ میں سیدنا عمرؓ کے خادم جہجاہ بن قیس اور ایک انصاری کے درمیان کچھ تو تو، میں میں ہونے لگی۔ یہ واقعہ بخاری میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ ہم ایک لڑائی پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک مہاجر (جہجاہ بن قیس) نے ایک انصاری

اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا

(وہاں کا) عزیز تر آدمی، ذلیل تر آدمی کو نکال باہر [۱۳] کرے گا حالانکہ تمام تر عزت تو اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے لیکن منافق یہ بات جانتے نہیں۔(۸)

(سنان بن وبرہ جہنی) کو ایک لات جمائی (جو اس کے سرین پر لگی) انصاری نے فریاد کی: اے انصار! دوڑو۔ اور مہاجر نے فریاد کی: اے مہاجرین دوڑو۔ جب آپ ﷺ نے یہ آوازیں سنیں تو وہاں پہنچ کر فرمایا: "یہ کیا دور جاہلیت کی سی باتیں کرنے لگے ہو؟" وہ کہنے لگے: "یارسول اللہ! ایک مہاجر نے ایک انصاری کے لات ماری تھی" آپ ﷺ نے فرمایا: ایسی باتیں چھوڑ دو۔ یہ گندی باتیں ہیں" (بخاری۔ کتاب بدء الخلق۔ باب ماینھی من دعوۃ الجاھلیۃ۔ مسلم۔ کتاب البر والصلۃ۔ باب نصر الاخ ظالما او مظلوما) جب عبداللہ بن ابی نے یہ بات سنی تو (انصار سے) کہنے لگا: یہ سب کچھ تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ اللہ کی قسم! جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو عزت والا سردار ذلت والے کو وہاں سے باہر نکال دے گا" جب یہ خبر نبی اکرم ﷺ کو پہنچی تو سیدنا عمرؓ کھڑے ہو کر کہنے لگے: یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس منافق کی گردن اڑانے کی اجازت دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ایسا نہ کرو۔ لوگ کہیں گے کہ محمد ﷺ اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرنے لگے ہیں" مہاجر لوگ جب ہجرت کر کے مدینہ آئے اس وقت تھوڑے سے تھے اور انصار بہت تھے۔ مگر بعد میں مہاجرین بھی بہت ہو گئے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

❁ عبداللہ بن ابی کی بکواس اور بعد میں قسم اٹھا کر انکار کرنا: سیدنا زید بن ارقم فرماتے ہیں کہ میں نے ایک لڑائی (غزوہ تبوک) میں عبداللہ بن ابی کو یہ کہتے سنا: اے انصار! پیغمبر ﷺ کے پاس جو لوگ (مہاجرین) ہیں ان کو خرچ کے لیے کچھ نہ دو۔ وہ خود ہی پیغمبر کو چھوڑ کر تتر بتر ہو جائیں گے۔ اور اگر ہم اس لڑائی سے لوٹ کر مدینہ پہنچے تو عزت والا (یعنی وہ خود) ذلت والے (یعنی پیغمبر) کو نکال باہر کرے گا۔ میں نے عبداللہ بن ابی کی یہ گفتگو اپنے چچا (سعد بن عبادہ) یا سیدنا عمرؓ سے بیان کی اور انہوں نے آپ ﷺ کو یہ بات بتا دی۔ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں کو بلوایا تو وہ قسمیں کھانے لگے کہ ہم نے ایسا نہیں کہا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے جھوٹا سمجھا اور اسے سچا سمجھا۔ مجھے اس بات کا اتنا دکھ ہوا جتنا کبھی کسی اور بات سے نہ ہوا تھا۔ میں گھر میں بیٹھ رہا۔ مجھے میرے چچا نے کہا: ارے تو نے یہ کیا کیا۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے تجھے جھوٹا سمجھا اور تجھ سے ناراض ہوئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ...... تا آخر۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مجھے بلا بھیجا۔ سورۂ منافقون پڑھ کر سنائی اور فرمایا: "زید! تجھے اللہ نے سچا کیا" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اس موقعہ پر عبداللہ بن ابی نے انصار کو خوب اشتعال دلایا۔ کہنے لگا کہ: یہ مہاجر لوگ ہمارے علاقہ میں آکر ہمارے ہی حریف بن گئے ہیں۔ ان پر تو یہ مثال صادق آتی ہے کہ کتے کو پال کر موٹا تازہ کرو تاکہ وہ تمہیں ہی پھاڑ کھائے۔ بخدا مدینہ واپس جا کر ہم میں کا معزز ترین آدمی (یعنی عبداللہ بن ابی) وہاں کے ذلیل ترین آدمی (یعنی پیغمبر اسلام ﷺ) کو نکال باہر کرے گا۔" پھر کہنے لگا کہ یہ مصیبت تمہاری اپنی ہی پیدا کردہ ہے۔ تم نے انہیں اپنے شہر میں اتارا، اپنے اموال بانٹ دیئے اور یہ دلیر ہو گئے۔ اب بھی اس کا یہی علاج ہے کہ ان لوگوں کو دینا بند کر دو۔ یہ خود ہی یہاں سے چلتے بنیں گے۔

[۱۳] ❁ عبداللہ بن ابی کو جھوٹ بولنے کی کیا سزا ملی؟ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے جرائم سے انکار کرنے کی سزا اس منافق کو ایک تو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس کے نفاق اور کذب کا بھانڈا پھوڑ دیا اور اسے رسوا کیا۔ اور دوسری سزا یہ ملی کہ خود اس کا بیٹا عبداللہ

ع ۲/۱۴

يَعْلَمُونَ ﴿٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩﴾ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ
لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠﴾ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا

اے ایمان والو! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد [۱۴] تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو لوگ ایسا کریں وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں (۹) اور جو کچھ ہم نے تمہیں رزق دیا ہے۔ اس میں سے وہ وقت آنے سے پہلے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کو موت آئے تو کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی مدت اور کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ کر لیتا [۱۵] اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا (۱۰) حالانکہ جب کسی کی موت آجائے

جو سچا مومن تھا۔ مدینہ کے دروازہ پر تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے باپ کی راہ روک کر کہنے لگا کہ جب تک رسول اللہ ﷺ اجازت نہ دیں تم مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ معزز ترین تو اللہ کا رسول ﷺ ہے اور ذلیل ترین تم ہو۔ کچھ دیر بعد رسول اللہ ﷺ وہاں پہنچے جہاں بیٹا باپ کا راستہ روکے کھڑا تھا، آپ نے از راہ کرم عبداللہ بن ابی کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ تب جا کر بیٹے نے باپ کا راستہ چھوڑا۔ اس وقت اس منافق کو یہ بات معلوم ہوئی جسے وہ نہیں جانتا تھا کہ تمام تر عزت تو اللہ کے رسول ﷺ اور مومنوں کے لیے ہے اور ان کے مقابلہ میں وہی ذلیل ترین آدمی ہے۔

جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن ابی کے قتل کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اس کے قتل کی اجازت نہ دی اور اس کی وجہ محض شماتت اعداء تھی۔ ورنہ اس کے جرائم اس قابل تھے کہ اسے قتل کر کے اس مجسم فتنہ سے زمین کو پاک کر دیا جاتا اور صحابہ میں ایسی چہ میگوئیاں ہونے بھی لگیں تو عبداللہ بن ابی کے بیٹے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ میرے باپ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو مجھے حکم فرمایئے میں اس کا سر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اگر اسے کسی اور نے قتل کیا تو مبادا میری رگ حمیت بھڑک اٹھے" (ابن ہشام، ۲: ۲۹۰ تا ۲۹۲)

[۱۴] مال اور اولاد کا نام اس لیے لیا گیا کہ ہر انسان کی زیادہ تر دلچسپی انہیں سے ہوتی ہے ورنہ اس میں ہر وہ کاروبار یا شغل شامل کیا جا سکتا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے۔ اور اللہ کی یاد سے غفلت کا نتیجہ فسق و فجور کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ کسب حلال کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور انسان زندگی کے ہر میدان میں بے راہرو ہو جاتا ہے۔

[۱۵] افضل ترین صدقہ وہ ہے جو اپنی ضروریات کے علی الرغم کیا جائے:۔ بخل یا شح اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ جو ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل دراصل نفاق کی علامت ہے ایمان کی نہیں۔ بخیل آدمی ساری عمر پیسہ جوڑنے میں گزار دیتا ہے۔ کسی وقت بھی مال کی محبت اس کے دل سے جدا نہیں ہوتی بلکہ بڑھاپے میں اور زیادہ بڑھنے لگتی ہے۔ پھر جب موت سر پر کھڑی ہوتی ہے اور اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اب مجھے یہ مال و دولت چھوڑ چھاڑ کر خالی ہاتھ جانا پڑیگا اس وقت البتہ اس کا جی چاہتا ہے کہ صدقہ کر کے اپنے مال سے جتنا زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے اٹھا لوں۔ اس وقت بھی اس کا اصل مقصد کسی محتاج کی احتیاج دور کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ "بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی" کے مصداق وہ جبراً جدا ہونے والے مال سے صدقہ کر کے ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے۔

إِذَا جَاۤءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾ ع ۲

تو پھر اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح[۱۴] باخبر ہے۔(۱۱)

حالانکہ اس وقت صدقہ کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اجر کے لحاظ سے کون سا صدقہ بڑا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "جو تو تندرستی کی حالت میں کرے، حرص رکھتا ہو، فقر سے ڈرتا ہو اور دولت کی امید رکھتا ہو لہٰذا صدقہ کرنے میں جلدی کر۔ ایسا نہ ہو کہ جان لبوں پر آجائے تو کہنے لگے کہ اتنا مال فلاں کو دے دو۔ اور اتنا فلاں کو۔ حالانکہ اس وقت یہ مال اس کا نہیں بلکہ اس کے وارثوں کا ہوتا ہے" (مسلم۔ کتاب الزکوۃ۔ باب ان افضل الصدقۃ......) ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال صالحہ میں صدقات کو خصوصی اہمیت ہے۔

[۱۴] یعنی اللہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ اگر بالفرض تمہیں کچھ مہلت بھی دے دی جائے تو تم پھر بھی بخل ہی کرو گے۔ صدقہ نہیں کرو گے کیونکہ جو عادتیں زندگی بھر پختہ ہوتی رہتی ہیں، تھوڑی سی مہلت ملنے پر بدل نہیں جاتیں۔

۱۸ آیاتھا سورۃ التغابن مدنیۃ رکوعھا ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ② خَلَقَ

کلمات ۲۴۷ آیات ۱۸ (۶۴) سورۃ[۱] التغابن مدنی ہے (۱۰۸) رکوع ۲ حروف ۱۱۲۲

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آسمانوں اور زمین میں جو بھی مخلوق موجود ہے اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ اسی کی بادشاہی[۲] ہے اور اسی کے لیے تمام تر تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (۱) وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کوئی کافر ہے[۳] اور کوئی مومن، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب[۴] دیکھتا ہے (۲)

[۱] اس بات میں مفسرین میں خاصا اختلاف ہے۔ اکثر اسے مدنی سورت قرار دیتے ہیں۔ اور بعض مکی کہتے ہیں۔ اس سورہ کے ابتدائی مضامین مکی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتے ہیں۔ اس اختلاف میں بہتر صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ آیت نمبر ۱۴ سے ۱۸ تک کی پانچ آخری آیات تو مدنی ہیں اور ابتدائی ۱۳ آیات مکی ہیں۔

[۲] یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا تو پھر اس سے بے تعلق نہیں ہو گیا۔ جیسا کہ قدیم فلاسفہ کا نظریہ تھا۔ بلکہ ہر آن اس پر حکومت بھی کر رہا ہے۔ اور جس چیز کی تخلیق سے جو مقصد درکار تھا اسے اس کام پر لگا دیا ہے اور اس سے مطلوبہ مقصد حاصل کرنے کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

[۳] اس آیت کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پیدا تو تمہیں اللہ نے کیا ہے پھر کوئی تو یہ بات تسلیم کر لیتا ہے کہ واقعی ہمارا خالق اللہ ہے اور کوئی یہ بات بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سرے سے اللہ کی ہستی کا انکار کر دیتا ہے کہ ہم تو زمانہ کی گردش کے تحت پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اللہ نے انسان کو فطرت سلیمہ پر پیدا کیا تھا۔ کہ وہ بھی اللہ کی باقی تمام مخلوق کی طرح اس کا مطیع و منقاد بن کر رہے۔ لیکن کچھ لوگ تو اس فطرت سلیمہ پر قائم رہتے ہیں اور کچھ ماحول سے متاثر ہو کر کفر کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں اور اس مطلب کی توثیق اس ارشاد نبوی سے ہو جاتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ: (انسان کا) ہر بچہ فطرت (سلیمہ) پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی (وغیرہ) بنا دیتے ہیں" (بخاری۔ کتاب القدر۔ باب جف القلم علیٰ علم اللہ......) اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو قوت ارادہ و اختیار اور عقل و تمیز دے کر پیدا کیا تھا۔ اب جو شخص ان اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا غلط استعمال کرتا ہے۔ وہ کفر کی راہ پر جا پڑتا ہے اور جو صحیح استعمال کرتا ہے۔ وہی مومن ہوتا ہے۔

[۴] صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ اس کی تمہیں جزا یا سزا بھی دے گا۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اگر کسی مومن نے کوئی نیک کام کیا تھا تو اس

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا

اس نے آسمانوں اور زمین کو حقیقی مصلحت سے پیدا[۵] کیا اور تمہاری صورتیں[۶] بنائیں تو بہت عمدہ[۷] بنائیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا[۸] ہے (۳) وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر[۹] کرتے ہو۔ اور اللہ تو دلوں کے راز تک جاننے والا ہے۔ (۴) کیا تمہیں ان لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی

میں خلوص نیت کا کتنا حصہ تھا۔ اسی کے مطابق وہ اس کی جزا میں کمی یا اضافہ بھی کرے گا۔

[۵] وہ حقیقی مصلحت یہ تھی کہ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی تمام چیزیں پیدا کر دیں جو انسان کی زندگی اور زندگی کی بقا کے لئے ضروری تھیں۔ تمام اشیاء کو انسان کا خادم بنا دیا اور وہ تمام چیزیں انسان ہی کی خدمت پر مامور ہیں۔

[۶] ❁ انسان میں دوسری مخلوق سے کیا کیا صفات زائد ہیں؟: یعنی انسان کو سیدھا کھڑا ہو کر دو پاؤں پر چلنے والی مخلوق بنایا۔ اسے بولنے 'ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے اور جواب دینے کی قوتیں عطا فرمائیں۔ پھر اس کو یہ عقل و شعور بھی بخشا کہ وہ تمام مخلوق سے اپنے حسب ضرورت کام لے سکے، انہیں اپنا مطیع و منقاد بنا سکے اور ان پر حکومت کر سکے۔ اور یہ صفات انسان کے علاوہ اور کسی مخلوق کو عطا نہیں کی گئیں۔ اس کے اعضاء کی ساخت بھی ایسی بنائی کہ ایک ایک عضو سے وہ کئی کئی کام لے سکتا ہے۔ اور اپنی عقل اور اعضاء سے کام لے کر ایک طرف تو کائنات کی تسخیر کیے چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف نت نئی ایجادات کو وجود میں لاتا رہتا ہے۔

[۷] یعنی انسان کا ڈیزائن بھی عمدہ بنایا پھر اس کی صورت بھی بہت خوب بنائی۔ یہ نہیں کیا کہ کسی انسان کی ایک آنکھ بڑی ہو اور دوسری چھوٹی یا ایک آنکھ کالی ہو دوسری نیلی یا ایک نتھنا بڑا ہو اور دوسرا چھوٹا یا ایک ہاتھ لمبا ہو اور دوسرا چھوٹا۔ جس سے انسان بدصورت ہی نہیں بلکہ خوفناک اور ڈراؤنا بھی معلوم ہونے لگے۔ پھر اتنی ہمہ گیر یکسانیت کے باوجود ہر ایک کی شکل اور نقش و نگار الگ الگ بنائے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی ناک یا اس کی آنکھیں پیچھے گردن پر یا پیٹھ کو لگا دیتا تو اندازہ کر لیجئے کہ انسان کتنی بدصورت مخلوق ہوتا۔

[۸] اللہ کا اس کائنات کو بنانا۔ اس کا مربوط انتظام کرنا۔ اس کے بعد انسان جیسی اشرف المخلوقات اور احسن تقویم والی مخلوق کو پیدا کرنا پھر اس میں لگاتار زندگی اور موت کا سلسلہ جاری کرنا۔ یہ سب کام تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ پھر کیا مرنے کے بعد اسے تمہیں اپنے پاس حاضر کر لینا ہی مشکل بن جائے گا؟

[۹] یعنی جو باتیں تم دل میں چھپاتے یا چھپائے رکھتے ہو وہ انہیں بھی جانتا ہے اور جو کچھ زبان سے کہہ دیتے ہو اسے بھی۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو اعمال تم لوگوں سے چھپ چھپا کر کرتے ہو۔ اللہ انہیں جانتا ہے اور جو لوگوں کے سامنے کرتے ہو انہیں بھی۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو کام تم نے کیا ہے وہ کس نیت اور کس ارادہ سے کیا ہے پھر اسی کے مطابق تمہیں بدلہ دیا جائے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی عدل صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں صرف ظاہری اعمال اور ان کی ظاہری صورت پر ہی انحصار کیا جا سکتا ہے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ
رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوا وَّاسْتَغْنَى اللَّهُ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٦﴾

جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا پھر انہوں نے اپنے کام کا مزا چکھ[۱۰] لیا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
(۵) یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل[۱۱] لے کر آئے تو وہ کہنے لگے: کیا آدمی ہماری رہنمائی[۱۲] کریں گے "چنانچہ انہوں نے انکار کر دیا اور منہ موڑ لیا اور اللہ بھی ان سے بے پروا[۱۳] ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں محمود (۶)

[۱۰] "ان لوگوں" سے مراد وہ سابقہ اقوام ہیں جن پر اللہ کی نافرمانیوں کی وجہ سے عذاب آیا تھا۔ اور یہ سزا نہ تو ان کی اصل سزا تھی اور نہ پوری سزا تھی۔ یہ عذاب تو انہیں محض اس لئے چکھایا گیا تھا کہ آئندہ جرائم سے باز آجائیں اور مظلوم ان کے مظالم سے نجات پا جائیں۔ اس لحاظ سے دنیا کا یہ عذاب محض ایک مجرم کی گرفتاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ رہی اصل اور پوری سزا تو وہ انہیں آخرت میں ملے گی۔

[۱۱] یعنی ایسے دلائل جن سے یہ یقین حاصل ہو سکتا تھا کہ یہ رسول فی الواقع اللہ کے فرستادہ ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی تعلیمات کے لئے وہ جو دلائل پیش کرتے تھے وہ نہایت معقول اور واضح ہوتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا ابہام یا پیچیدگی نہیں ہوتی تھی۔ اور حق و باطل کی پوری پوری وضاحت ہو جاتی تھی۔

[۱۲] انہیں اپنے رسول پر بنیادی اعتراض یہ ہوتا تھا کہ یہ تو ہم جیسا ہی ایک بشر ہے اسے ہم اپنا رہنما کیسے مان لیں؟ کوئی فرشتہ ہماری رہنمائی کے لئے نازل ہوتا تب بھی کوئی بات تھی۔ گویا ان کے نزدیک بشریت اور رسالت میں منافات تھی۔ اسی بنا پر انہوں نے رسولوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کفر کا راستہ اختیار کر لیا۔ کافروں کے اس اعتراض کا جواب قرآن میں بے شمار جگہ پر دیا گیا ہے کہ انسانوں کے لئے ہدایت کی صرف یہی صورت ہے کہ رسول بشر ہو اور بشر بھی وہ ہو جو ان کی قوم سے ہو اور انہی کی زبان میں بات کرتا ہو۔ اس کے علی الرغم ہمیں تو ان دوستوں کی داد دینا پڑتی ہے جو اسی آیت کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ رسول کو بشر کہنے والا کافر ہے۔ کیونکہ کافر ہی رسولوں کو بشر کہتے تھے۔ اور رسولوں کو بشر کہنا کافروں کا شیوہ ہے۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا:

زمن بر صوفی و ملا سلامے ...... کہ پیغام خدا گفتند مارا ...... ولے تاویل شان در حیرت انداخت ...... خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

ترجمہ: (میری طرف سے صوفی اور ملا پر سلام ہو کہ انہوں نے ہمیں اللہ کا پیغام پہنچایا۔ لیکن ان کی تاویل نے اللہ کو جبرئیل کو اور اللہ کے رسول سب کو حیرت میں ڈال دیا (کہ ہم نے کہا کیا تھا اور ان لوگوں نے اس سے کیا مطلب نکال لیا)

ہر رسول بشر ہوتا ہے۔ مزید برآں یہی نہیں کہ کافر ہی رسولوں کو بشر کہتے تھے۔ بلکہ اللہ نے بھی رسولوں کو بشر ہی کہا ہے اور رسول خود بھی اپنے آپ کو بشر ہی کہتے تھے خواہ مخاطب کافر ہوں یا مسلمان ہوں۔ (تشریح کیلئے دیکھئے سورۃ کہف کی آیت نمبر ۱۱۰ کا حاشیہ)

[۱۳] یعنی اللہ نے تو انہیں کی بھلائی اور رہنمائی کے لئے رسول بھیجے تھے اب اگر یہ گڑھے میں ہی گرنا چاہتے ہیں تو گرا کریں۔ اللہ کو ان کی کیا پروا ہے اگر یہ اللہ اور اس کے رسول کو نہیں مانتے تو اس سے اللہ کی حکومت اس سے چھن تو نہیں جائے گی نہ اس میں کچھ

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۸ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ

(آخرت کا) انکار کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ قطعاً اٹھائے نہیں[۱۴] جائیں گے۔ آپ ان سے کہئے: کیوں نہیں۔ میرے پروردگار کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر جو کچھ تم کرتے رہے اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا اور یہ بات اللہ کیلئے آسان ہے (۷) لہٰذا اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس نور (قرآن) پر بھی جو ہم نے نازل[۱۶] کیا ہے۔ اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۸) وہ اجتماع کے دن تم سب کو اکٹھا کرے گا اور یہی ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہار جیت[۱۷] کا دن ہوگا۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے

کی واقع ہوگی۔

[۱۴] معاد کے انکار پر کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی:۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ یقینی طور پر کہہ سکیں کہ دوبارہ زندگی نہیں ہوسکتی۔ انسان کے پاس ایسا ذریعہ علم نہ کبھی آج سے پہلے تھا نہ آج ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوسکے گا۔ پھر اس دعویٰ کو اس زور شور سے پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان زیادہ سے زیادہ یہی کچھ کہہ سکتا ہے کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے اور نہ اٹھنے کے دونوں احتمال موجود ہیں۔ لیکن وہ جی اٹھنے کی تردید میں کوئی دلیل پیش نہیں کرسکتا۔

[۱۵] تمہارے اس دعویٰ کے مقابلہ میں، میں اللہ کی طرف سے وحی کے علم کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ تم لوگ میری صداقت کے معترف رہے ہو اور میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں ضرور زندہ کیا جائے گا اور اس لئے زندہ کیا جائے گا کہ آج جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا تم سے مؤاخذہ کیا جائے۔ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دی جائے اور مظلوم کی دادرسی کی جائے۔ کائنات کا یہ نظام ہی اس بات پر شہادت دے رہا ہے کہ یہ کوئی اندھیر نگری نہیں ہے۔ کہ تم جو کچھ چاہو کرتے رہو، کر کے مر جاؤ اور تمہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

[۱۶] یعنی قرآن ایسی کتاب ہے جس کی روشنی میں تم اقوام سابقہ کے حالات سے باخبر ہوتے ہو جن کو ٹھیک طور پر معلوم کرنے کا تمہارے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر وہ تمہارے موجودہ حالات میں تمہاری پوری رہنمائی کرتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے تمہیں ایسی ہدایات دیتا ہے، جس سے تم فتنہ و فساد اور بدامنی کی پریشان کن زندگی سے بچ کر امن و امان کی اور اطمینان کی زندگی گزار سکو، پھر وہ تمہیں تمہارے مرنے کے بعد کے حالات سے بھی پوری طرح خبردار کر رہا ہے۔ حالانکہ ان باتوں پر اطلاع پانے کے لئے کوئی ذریعہ علم نہ تھا اور نہ ہی عقل انسانی کی ایسے حالات معلوم کرنے تک رسائی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس روشنی کی قدر کرو اور اسے غنیمت سمجھو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پوری طرح فرمانبردار بن جاؤ۔

[۱۷] تغابن کی لغوی تشریح اور مفہوم:۔ تغابن۔ غبن معروف لفظ ہے بمعنی چوری چھپے کسی دوسرے کا حق مار لینا، اور تغابن بمعنی چوری چھپے ایک دوسرے کے حقوق، خواہ ان کا تعلق مال و دولت سے ہو یا دوسرے حقوق سے 'مارنے کی کوشش کرنا۔ لیکن دنیا میں جو تغابن ہوتا ہے اور ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ یہ حقیقی نہیں بلکہ اس کے نتائج اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ مثلاً زید نے بکر کا

وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ
اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ

اور نیک عمل کرے اللہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی وہ ابدالآباد تک اس میں رہیں گے یہی بڑی کامیابی ہے (۹) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو یہی لوگ اہل دوزخ ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ (۱۰) جو مصیبت بھی آتی ہے وہ اللہ کے اذن سے ہی آتی ہے اور جو شخص [۱۸] اللہ پر ایمان لائے تو اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا [۱۹] ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (۱۱)

حق غصب کیا تو یہاں دنیا میں اس کی ظاہری صورت یہ ہے کہ زید فائدہ میں رہا اور بکر خسارے میں رہا۔ لیکن قیامت کے دن جب زید سے بکر کا غبن کیا ہوا حق زید کو واپس دلایا جائے گا تو بکر فائدے میں رہے گا اور زید خسارے میں رہے گا۔ گویا آخرت میں فائدے اور خسارے کے نتائج دنیا کے نتائج کے برعکس ہوں گے۔ اس لحاظ سے زید ہار گیا اور بکر جیت گیا۔ اس مطلب کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ ؓ سے پوچھا: جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا! مفلس وہ ہے جس کے پاس کوئی روپیہ پیسہ نہ ہو" آپ ﷺ نے فرمایا: حقیقتاً مفلس وہ ہے کہ قیامت کے دن بہت سی نیکیاں لے کر آئے گا تو اس سے حق وصول کرنے والے اللہ کے دربار میں اپنے اپنے حق کا مطالبہ کرنے لگیں گے تو اس کی نیکیاں حقداروں کو دے دی جائیں گی حتیٰ کہ اس کے پاس کوئی نیکی نہ رہے گی۔ (مسلم۔ کتاب البر والصلة والادب۔ باب تحریم الظلم) اب انفرادیت سے آگے اجتماعیت کی طرف آیئے۔ ایک فریق وہ ہے جس نے مسلمانوں پر مظالم ڈھا کر ان کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ اور وہ سمجھتا یہ ہے کہ ہم ہی غالب اور کامیاب ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور قابلیتیں، وقت اور مال و دولت اس کام پر لگا رکھے ہیں کہ اسلام کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ان ظالموں کے مظالم کی چکی میں پس رہا ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہی لوگ مغلوب و مقہور ہیں۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب قیامت کو ان سب لوگوں کے اعمال کے نتائج سامنے آئیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ کون خسارے میں رہا اور کون فائدے میں اور کون ہارا اور کون جیتا؟

[۱۸] اس آیت میں ان دنیادار لوگوں کے اس نظریہ کی تردید کی گئی ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان حق پر ہوتے تو اس قدر مصائب میں کیوں گھرے ہوتے اور مسلمانوں کو یہ تسلی دی جا رہی ہے کہ کوئی مصیبت کسی کے لانے سے نہیں آتی۔ بلکہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے اور اسی کے اذن سے آتی ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں ہوتی ہیں۔ مصیبتوں کے ذریعہ آزمائش سے مقصود تمہارے ایمان کا امتحان ہوتا ہے۔ تاکہ منافقین کھل کر سامنے آ جائیں۔ اور تم ان سے محتاط رہنے لگو۔ ان کے علاوہ کئی حکمتیں قرآن میں جابجا مذکور ہیں۔

مصائب کی تین قسمیں:۔ واضح رہے کہ مصائب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں کے اپنے اعمال کے نتیجہ یا شامت اعمال کے طور پر آتے ہیں۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ دوسرے

شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١١﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿١٢﴾ اللَّهُ لَا
إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٣﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٤﴾ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ

اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم سرتابی کرو تو ہمارے رسول کے ذمہ تو صاف طور پر پہنچا دینا ہی ہے۔(۱۲) اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ[۲۰] کرنا چاہیے(۱۳) اے ایمان والو! تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض[۲۱] تمہارے دشمن ہیں لہٰذا ان سے ہشیار رہو۔ اور اگر تم معاف کرو[۲۲] اور درگزر کرو اور انہیں بخش دو تو اللہ یقیناً بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے(۱۴) بلاشبہ تمہارے مال

وہ مصائب جن میں سے ایمانداروں کو آزمائش اور تربیت کیلئے گزارا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ تیسرے وہ جن کا تعلق مندرجہ بالا دونوں اقسام سے نہیں ہوتا اور وہ محض اتفاقی قسم کے حوادث ہوتے ہیں۔ ایسے مصائب مومنوں کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بموجب ارشاد نبوی کسی مسلمان کو کوئی کانٹا بھی چبھے تو وہ اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ بن جاتا ہے بشرطیکہ مسلمان اس مصیبت پر صبر کرے۔

[۱۹] یعنی جو شخص ان مصائب میں ثابت قدم رہے تو اس کا اللہ پر ایمان مزید بڑھ جاتا ہے اور اسی نسبت سے اسے اللہ مزید ہدایت بخشتا ہے اور یاد رکھو کہ اللہ کو تمہارے ان مصائب کا پورا پورا علم ہے۔ وہ اپنے بندوں کو خواہ مخواہ مصائب میں مبتلا نہیں کرتا۔ بلکہ کسی عظیم مقصد کے لئے تمہیں تیار کرنا چاہتا ہے۔

[۲۰] ❁ توکل اللہ پر ہی کیوں؟ اس کائنات میں تصرفات کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور پورے کا پورا اختیار اسی کو ہے۔ دوسرا کوئی اس اختیار میں اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ صرف اس اللہ پر بھروسہ کیا جائے جس کے قبضۂ قدرت میں جملہ اختیارات ہیں۔ ہر طرح کے ظاہری اور باطنی اسباب پر اسی کا کنٹرول ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس صفت پر دل سے یقین رکھتا ہے اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ اس کا در چھوڑ کر کسی دوسرے کے دروازے پر جائے۔

[۲۱] ❁ بیوی اور اولاد کس صورت میں انسان کی دشمن ہوتی ہے۔ یعنی ساری بیویاں یا ساری اولاد تمہاری دشمن نہیں بلکہ بعض بیویاں اور بعض اولاد تمہاری دشمن ہے۔ اور یہی وہ رشتے ہیں جو انسان کے بہت قریبی اور اسے بہت عزیز ہوتے ہیں۔ یہ اگر اللہ کے فرمانبردار ہوں گے تو تمہارے دوست اور نافرمان ہوں گے تو تمہارے دشمن ہیں۔ گویا ان سے بھی تمہاری محبت اور دوستی کی اصل بنیاد اللہ کی فرمانبرداری ہونی چاہئے۔ انہیں کی وجہ سے لوگ کسب حرام اور دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے بعض مسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کی جرأت نہیں کر رہے تھے۔ انہیں کی ہمدردیاں اگر کفار کے ساتھ ہوں تو تمہارے لئے کئی طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سبب بھی بن سکتے ہیں اور تمہاری عاقبت بھی خراب کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے معاملہ میں تمہیں بالخصوص محتاط رہنا چاہئے۔

[۲۲] یعنی اگر تم ان میں کچھ غلط رجحانات دیکھو تو ایسا نہ کرو کہ ان پر اندھا دھند سختی شروع کر دو۔ بیویوں کو طلاق دے دو یا بچوں کو گھر سے نکال دو۔ بلکہ ایسا کرو گے تو معاشرتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ایسے حالات میں بہتر صورت یہ ہے کہ ان کی اصلاح کی کوشش کرو اور درگزر سے کام لو۔ اور نرمی اور حسن سلوک سے کام لے کر انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرو۔ یہ طریق کار

وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۱۵ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَ
اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۶ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۷ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸

اور تمہاری اولاد ایک آزمائش[۲۳] ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے ہاں بڑا اجر ہے۔(۱۵) لہٰذا جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے[۲۴] رہو اور سنو اور اطاعت کرو اور (اپنے مال) خرچ کرو۔ یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے اور جو شخص اپنے نفس[۲۵] کی حرص سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔(۱۶)
اگر تم اللہ کو قرض حسن[۲۶] دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہیں معاف فرما دے گا اور اللہ بڑا قدردان[۲۷] اور بردبار ہے(۱۷) وہ غائب اور حاضر ہر چیز کو جاننے والا ہے، وہ زبردست ہے اور دانا ہے۔(۱۸)

اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی ازراہ کرم لوگوں کی خطائیں معاف کرتا رہتا ہے۔

[۲۳] مال اور اولاد ہر انسان کی آزمائش ہے:۔ یہاں آزمائش کے لئے فتنة کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فتنة میں عام طور پر ایسی چیزوں سے آزمائش ہوتی ہے جن سے انسان محبت کرتا ہے اور ان سے اس کا دلی لگاؤ ہوتا ہے اور یہ آزمائش اس طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے کہ دوسرے تو کیا بسا اوقات خود مفتون کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی آزمائش میں پڑ چکا ہے۔ یہاں بتایا یہ گیا ہے کہ بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں۔ لیکن مال اور اولاد ایسی چیزیں ہیں جو ساری کی ساری اور سب انسانوں کے لئے آزمائش کا سبب بن جاتی ہیں۔ اور ان چیزوں سے اللہ آزمائش اس طرح کرتا ہے کہ کون ان فانی اور زائل ہونے والی چیزوں میں پھنس کر آخرت کی دائمی نعمتوں کو فراموش کر دیتا ہے اور کون انہی چیزوں کو اپنے لئے آخرت میں ذخیرہ کا ذریعہ بناتا ہے اور وہاں کے اجر عظیم کو دنیا کی دلفریبیوں پر ترجیح دیتا ہے۔

[۲۴] مؤاخذہ صرف اس حد تک ہو گا جہاں تک انسان کا اختیار ہے:۔ اس جملہ سے معلوم ہوا کہ انسان گناہوں سے اجتناب اور اوامر کی تکمیل میں اسی حد تک مکلف ہے جس قدر اس کی استطاعت ہے اسی مضمون کو سورہ بقرہ میں یوں بیان فرمایا۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲۸۶:۲) "یعنی جس مقام پر انسان مجبور ہو جائے وہاں اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ مواخذہ صرف اس صورت میں ہے کہ جہاں انسان استطاعت رکھنے کے باوجود اللہ کی اطاعت نہ کرے۔ رہی یہ بات کہ انسان اپنے متعلق کوئی غلط اندازہ قائم کر لے۔ مثلاً وہ یہ فرض کر لے کہ فلاں کام میری استطاعت سے باہر ہے۔ حالانکہ وہ اسکی استطاعت میں ہو۔ تو ایسی بات پر اس کا ضرور مواخذہ ہو گا۔ کیونکہ اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔

[۲۵] اس کی تشریح کے لیے دیکھئے سورۂ حشر کی آیت نمبر ۹ کا حاشیہ۔

[۲۶] تشریح کے لئے سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱۱ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

[۲۷] قدردانی کی بات یہ ہے کہ اس کے دیئے ہوئے مال میں سے ہی کچھ مال اس کی راہ میں خرچ کرنے پر بھی ثواب عطا فرماتا ہے اور تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ ثواب دیتا ہے اور اس کا تحمل یہ ہے کہ نافرمانی کرنے پر فوراً سزا نہیں دے ڈالتا۔ پھر بہت سے مجرموں کو معاف بھی کر دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کی سزا میں تخفیف بھی کر دیتا ہے۔

۱۲ آیاتہا سورۃ الطلاق مدنیۃ رکوعہا ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا

کلمات ۲۹۸ آیات ۱۲ (۶۵) سورۃ الطلاق مدنی ہے (۹۹) رکوع ۲ حروف ۱۲۳۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت [1] کے لیے طلاق دیا کرو اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا پروردگار ہے۔

[1] عورتوں کی عدت کی کمی بیشی کی مختلف صورتیں:۔ طلاق اور عدت کے بہت سے احکام سورۂ بقرہ میں گزر چکے ہیں۔ اور کچھ سورۂ احزاب میں بھی مذکور ہیں۔ اور ان کی تکمیل سورۂ طلاق میں مذکور احکام سے ہوئی۔ لہٰذا سابقہ احکام پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ چونکہ طلاق کی صورت میں عورتوں کی حالت مختلف اور ان کی عدت بھی مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا پہلے عدت کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ بیوہ غیر حاملہ کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔(۲:۲۳۹)

۲۔ بیوہ حاملہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔(۶۵:۴) جیسا کہ درج ذیل حدیث سے ظاہر ہے:

ابو سلمہ کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا۔ اس وقت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ شخص کہنے لگا "ایک عورت کے ہاں اس کا خاوند مرنے کے چالیس دن بعد بچہ پیدا ہوا؟ اس کی عدت کے بارے میں آپ کیا فتویٰ دیتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ لمبی عدت (چار ماہ دس دن) پوری کرے" ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: پھر اس آیت کا کیا مطلب ہوا کہ: "حاملہ عورتوں کی عدت ان کے وضع حمل تک ہے" اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "میں تو اپنے بھتیجے ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہوں" آخر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کریب کو ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس یہ مسئلہ پوچھنے کے لئے بھیجا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "سبیعہ اسلمیہ کا خاوند (سعد بن خولہ) اس وقت فوت ہوا جبکہ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ خاوند کے چالیس دن بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اسے نکاح کے پیغام آنے لگے۔ اور آپ ﷺ نے اسے نکاح کی اجازت دے دی۔ ان پیغام دینے والوں میں سے ایک ابو السنابل بھی تھا" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۳۔ غیر مدخولہ عورت خواہ وہ بیوہ ہو یا مطلقہ اس کی کوئی عدت نہیں۔(۳۳:۴۹)

۴۔ بے حیض عورت، اسے خواہ ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو یعنی نابالغہ ہو یا بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے آنا بند ہو چکا ہو، کی عدت تین ماہ قمری ہے۔(۶۵:۴) یعنی اس سورت کی آیت نمبر ۴

۵۔ مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔(۶۵:۴)یعنی اسی سورہ کی آیت نمبر ۴

۶۔ حیض والی غیر حاملہ کی عدت تین قروء ہے(۲:۲۲۸) قرء کا معنی حیض بھی ہے اور حالت طہر بھی۔احناف اس سے تین حیض مراد لیتے ہیں جبکہ شافعی اور مالکی تین طہر مراد لیتے ہیں۔اس فرق کو درج ذیل مثال سے سمجھئے۔

طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ہو تو اسے طہر کے شروع میں ہی بغیر مقاربت کے طلاق دے دی جائے اور پوری عدت گزر جانے دی جائے عدت کے بعد عورت بائن ہو جائے گی۔اب فرض کیجئے ایک عورت ہندہ نامی کو ہر قمری مہینہ کے ابتدائی تین دن ماہواری آتی ہے۔اس کے خاوند نے اسے حیض سے فراغت کے بعد ۴ محرم کو طلاق دے دی۔اب احناف کے نزدیک اس کی عدت تین حیض پورے یعنی ۳ ربیع الثانی کی شام کو جب وہ حیض سے غسل کرے گی۔اس کی عدت ختم ہو جائے گی۔ جبکہ شوافع اور موالک کے نزدیک تیسرا حیض شروع ہونے تک اس کے تین طہر پورے ہو چکے ہوں گے یعنی یکم ربیع الثانی کی صبح کو حیض شروع ہونے پر اس کی عدت ختم ہو جائے گی یعنی تین دن کا فرق پڑ جائے گا۔

❁ عدت کی اہمیت:۔ اس کے بعد اب ارشاد ربانی کی طرف آیئے۔ فرمایا: "عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے لیے طلاق دو" جس سے معلوم ہوا کہ عدت کا ٹھیک ٹھیک شمار نہایت اہم چیز ہے۔ لہٰذا اس کی طرف پوری پوری توجہ دیا کرو۔اس کی اہمیت کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ عدت کا مقصد تحفظ نسب اور وراثت کے تنازعات کو ختم کرتا ہے۔عدت کے اندر اندر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ حاملہ ہے یا نہیں۔ اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل تک ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ جس عورت کو صحبت سے پہلے ہی طلاق دے دی جائے اس پر کوئی عدت نہیں (۳۳:۴۹) کیونکہ اس صورت میں نہ نسب کے اختلاط کا کوئی امکان ہے اور نہ وراثت کے تنازعہ کا۔

۲۔ عدت کے دوران مطلقہ عورت اپنے خاوند کی بیوی ہی رہتی ہے۔ اور اس دوران خاوند کے حقوق کی نگہداشت کو ملحوظ رکھا گیا ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ﴾ (۳۳:۴۹) یعنی خاوند کے ہاں عدت گزارنا مطلقہ عورت کی ذمہ داری ہے اور مرد کا یہ حق ہے کہ عورت اسی کے ہاں عدت گزارے اس دوران مرد اس سے صحبت کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اور وہ عورت کی رضامندی کے بغیر بھی اپنا یہ حق استعمال کر سکتا ہے۔

۳۔ عدت کے دوران کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس عورت سے نکاح تو دور کی بات ہے منگنی کے لیے پیغام تک بھی دے سکے۔ اور اگر خاوند نے عورت کو اس حالت میں طلاق دی کہ وہ گھر پر موجود ہی نہ تھی یا اپنے میکے گئی ہوئی تھی یا اسے اس کے میکے پیغام بھیج دیا گیا تھا اور عورت عدت کے دوران نکاح کر لے تو وہ نکاح باطل ہو گا۔

تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ‌ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ‌ ؕ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ

(زمانۂ عدت میں) انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں[۲] الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں[۳]۔ یہ اللہ کی حدیں[۴] ہیں۔ اور جو شخص حدودِ الٰہی سے تجاوز کرے

[۲] عدت کا عرصہ خاوند کے ہاں گزارنے کا حکم اور مصلحت۔ خاوند کے گھر کے علاوہ کسی دوسری جگہ عدت گزارنا غیر شرعی اور گناہ کا کام ہے۔ ہمارے ہاں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی میں لڑائی ہوئی تو بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی یا خود میاں نے اسے میکے روانہ کر دیا۔ بعد میں کسی وقت یک وقت تین طلاق لکھ کر بھیج دیں۔ یا خاوند بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیتا ہے یا بیوی خود ہی اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ ان سب صورتوں میں عورت کی عدت اس کے میکے میں ہی گزرتی ہے۔ یہ سب باتیں خلاف شرع اور گناہ کے کام ہیں۔ کیونکہ اللہ کا یہ حکم ہے کہ عورت عدت اپنے طلاق دینے والے خاوند کے ہاں گزارے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عدت کے دوران سکنیٰ اور نفقہ کی ذمہ داری مرد کے سر پر ڈال دی ہے۔ اور بیوہ کے اخراجات کی ذمہ داری میت کے لواحقین پر جو ترکہ کے وراث ہوں گے۔ اور اس حکم میں کئی مصلحتیں ہیں۔ سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ جس مرد اور عورت کے درمیان رشتہ ازدواج قائم ہو چکا ہے۔ اسے زوجین کو اپنی اپنی امکانی حد تک نبھانا ہی چاہئے۔ طلاق کی اجازت صرف ناگزیر حالات کی بنا پر دی گئی ہے۔ جبکہ حالات کنٹرول سے باہر ہو جائیں۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔ "ان ابغض الحلال الی اللہ الطلاق" (ابوداؤد۔ کتاب الطلاق) یعنی طلاق جائز اور حلال تو ہے مگر یہ اللہ کے ہاں سخت ناگوار چیز ہے۔ اب عورت اگر اپنے خاوند کے گھر میں رہے گی تو ان کے ملاپ، صلح صفائی، رضامندی اور رجوع کی کئی صورتیں پیش آسکتی ہیں۔ جو عدت باہر گزارنے کی حالت میں ناممکن ہو جاتی ہیں۔

[۳] صریح برائی کے مختلف پہلو:۔ یعنی صریح برائی کی مرتکب ہوں تو انہیں گھر سے نکال دینے کی اجازت ہے۔ صریح برائی سے مراد زنا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن میں زنا کے لئے یہ الفاظ متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ اور نشوز بھی یعنی عورت کا ہر بات میں ضد اور کھینچا تانی کا رویہ اختیار کرنا اور مرد کی رائے کی بہرحال مخالفت پر آمادہ رہنا یا بدزبانی کرنا اور کرتے رہنا یعنی ایسے حالات پیدا کر دینے سے مصالحت کے بجائے مزید بگاڑ اور تناؤ کی فضا بن جائے۔ اور یہ بدزبانی یا کھینچا تانی مرد سے بھی ہو سکتی ہے اور اس کے قریبی رشتہ داروں مثلاً اس کے والدین وغیرہ سے بھی اور اس سے چوتھی مراد بذات خود ایسی عورتوں کا گھر سے نکل جانا بھی ہے۔ یعنی عدت کے دوران عورتوں کے از خود مرد کے گھر سے نکل جانے کو ہی ﴿فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ قرار دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں بھی انہیں واپس گھر لے جانے کی ضرورت نہیں۔

[۴] اللہ کی حدوں کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے پہلے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی (آمنہ بنت غفار) کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ کو اس بات پر غصہ آ گیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "ابن عمر کو حکم دو کہ رجوع کر لے اور اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھے تا آنکہ وہ پاک ہو۔ پھر اسے حیض آئے۔ پھر وہ اس سے پاک ہو۔ پھر اگر طلاق ہی دینا چاہے تو دے دے لیکن طہر کی حالت میں دے اور اس دوران صحبت نہ کرے۔ یہ ہے وہ عدت جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور ﴿طَلِّقُوۡهُنَّ

لیعدتہن﴾ سے یہی مراد ہے۔(بخاری۔ کتاب التفسیر)

﴿ طلاق دینے کا صحیح اور مسنون طریقہ:۔اس حدیث میں طلاق دینے کا اور عدت کو ٹھیک طور پر شمار کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ حالت حیض میں طلاق دینا اتنا گناہ کا کام اور اللہ کی حد یا قانون کی خلاف ورزی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ کو غصہ آگیا۔ کیونکہ حیض کی حالت میں طلاق دینے سے تین قروء کا شمار درست طور پر نہیں ہو سکتا خواہ قرء کو حیض کے معنی میں لیا جائے یا طہر کے معنی میں۔ طہر کے معنی میں لیا جائے تو طلاق کے بعد حیض کے بقایا ایام عدت سے زائد شمار ہو جاتے ہیں اور اگر حیض کے معنی میں لیا جائے تو سوال پیدا ہو گا کہ آیا اس حیض کو جس میں طلاق دی گئی ہے، شمار کیا جائے یا چھوڑ دیا جائے؟ جو صورت بھی اختیار کی جائے وہ اللہ کے قانون کی خلاف ورزی ہی ہو گی۔

۲۔ آپ ﷺ کے الفاظ "اسے حکم دو کہ رجوع کرلے" سے معلوم ہوا کہ اگرچہ حیض کی حالت میں طلاق دینا خلاف سنت اور گناہ کا کام ہے۔ تاہم قانونی لحاظ سے وہ ایک طلاق شمار ہو جائے گی ورنہ رجوع کرنے کا کچھ مطلب ہی نہیں نکلتا۔ اسی بات پر قیاس کرتے ہوئے فقہاء کہتے ہیں کہ اگرچہ ایک ہی مجلس میں تین طلاق دینا خلاف سنت اور حرام ہے تاہم تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ قیاس کی حد تک تو ان کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس نص کی موجودگی میں کہ دور نبوی ﷺ، دور صدیقی رضی اللہ عنہ اور دور فاروقی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سال تک ایک ہی مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی۔(مسلم۔ کتاب الطلاق۔ باب طلاق الثلاث) اس قیاس کی چنداں وقعت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ نص کی موجودگی میں قیاس کرنا ناجائز ہے۔

۳۔ طلاق طہر کی حالت میں دینا چاہیے جس میں صحبت نہ کی گئی ہو، اور بہتر صورت یہی ہے طہر کے ابتدا میں طلاق دی جائے۔ البتہ غیر مدخولہ عورت کو طہر اور حیض دونوں صورتوں میں طلاق دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس سے نہ نسب کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور نہ وراثت کے۔ اسی طرح بے حیض عورت یا حاملہ عورت کو مباشرت کے بعد بھی طلاق دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان صورتوں میں عدت کا کوئی مقصد مجروح یا مشکوک نہیں ہوتا۔

۴۔ طلاق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس طہر میں مرد طلاق دینا چاہے اس میں صحبت نہ کرے۔ پھر ایک ہی بار کی طلاق کو کافی سمجھے اور پوری عدت گزر جانے دے۔ اس طرح عورت پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ عدت کے آخری وقت تک مرد کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور دوسرا یہ کہ طلاق واقع ہو جانے کے بعد بھی اگر فریقین رضامند ہوں تو تجدید نکاح کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

﴿ طلاق کی تین قسمیں:۔ احناف کے ہاں طلاق کی تین اقسام ہیں۔ (۱) احسن، (۲) حسن، (۳) بدعی (ہدایہ اولین۔ کتاب الطلاق۔ باب طلاق السنۃ) احسن تو یہی صورت ہے جو مندرجہ بالا حدیث میں مذکور ہے۔ اسے طلاق السنۃ بھی کہتے ہیں اور صحابہ کرام اسی طریق کو پسند فرماتے تھے اور طلاق حسن یہ ہے کہ ہر طہر میں مقاربت کیے بغیر ایک طلاق دے۔ یعنی ایک طہر میں

حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ۝۱ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ

تو اس نے اپنے اوپر خود ظلم[۵] کیا۔ (اے مخاطب) تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد (موافقت کی) کوئی نئی صورت پیدا[۶] کر دے۔(۱) پھر جب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں

پہلی، دوسرے طہر میں دوسری، اور تیسرے طہر میں تیسری۔ اس صورت میں تیسری طلاق دیتے ہی مرد کا حق رجوع ختم ہو جاتا ہے۔ جبکہ عدت ابھی باقی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں فریقین تجدید نکاح بھی نہیں کر سکتے۔ تا آنکہ عورت کسی دوسرے سے غیر مشروط نکاح کرے۔ پھر وہ نیا خاوند اپنی رضامندی سے کسی وقت اسے طلاق دے دے یا مر جائے تو بعد میں عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریقہ طلاق کو عموماً شرعی طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میری معلومات کی حد تک یہ طریقہ کسی مرفوع حدیث سے ثابت نہیں۔ اس کا ماخذ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ رائے ہے جو مسند احمد ج ا ص ۲۶۵ پر حدیث رکانہ کے آخر میں بایں الفاظ مذکور ہے۔ فکان ابن عباس یری انما الطلاق عندکل طھر یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ تین طلاقیں ایک ساتھ نہیں بلکہ ہر طہر میں الگ الگ ہونی چاہئیں۔ اور امام شافعی اس طرح کی طلاق کو بھی خلاف سنت کہتے ہیں۔

❁ بدعی طلاق کی صورتیں:۔ اور بدعی طلاق یہ ہے کہ کوئی شخص (۱) بیک وقت تین طلاق دے دے، (۲) ایک طہر میں ہی الگ الگ موقعہ پر تین طلاقیں دے دے، (۳) حالت حیض میں طلاق دے اور (۴) ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس سے صحبت کی ہو۔ ان میں جو فعل بھی کرے گا، گنہگار ہو گا۔ واضح رہے کہ بدعی طریقہ طلاق کو سب فقہاء حرام سمجھتے ہیں۔

[۵] ❁ غیر شرعی طلاق کے نقصانات:۔ یعنی جو شخص بھی ان قوانین کی پابندی نہیں کرے گا اس کا کچھ نہ کچھ نقصان اسے دنیا میں پہنچ کے رہے گا۔ صحیح طور پر سنت کے مطابق طلاق نہ دینے سے عدت کی گنتی میں اختلاف بھی پیدا ہو گا۔ اور مشکل بھی پھر نسب اور وراثت کے مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوں گے، حق رجوع کی عدت یا اس کا کچھ حصہ ساقط ہو جائے گا اور تجدید نکاح کی بھی بغیر تحلیل کے کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ اس آیت سے بھی بعض علماء نے یہ دلیل لی ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینے سے تین ہی واقع ہو جاتی ہیں۔ ورنہ اگر اسے ایک ہی رجعی طلاق شمار کیا جائے اور اس کا حق رجوع باقی رہنے دیا جائے تو اس کو کیا نقصان پہنچا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دلیل بھی بہرحال ایک قیاس ہے۔ اور نص کے مقابلہ میں قیاس کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔

❁ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ کبیرہ اور حرام ہے:۔ رہی اس کے نقصان کی بات تو کیا یہ تھوڑا نقصان ہے کہ وہ ایک حرام کام اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس بات پر سب فقہاء کا اتفاق ہے اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شخص نے بیک وقت تین طلاقیں دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر غصہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میری موجودگی میں کتاب اللہ سے اس طرح کا تلاعب اور مذاق؟ یہاں تک کہ ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! "میں اسے قتل نہ کر دوں" (نسائی۔ کتاب الطلاق۔ باب الطلاق الثلاث المجموعة ومافيه من التغليظ) علاوہ ازیں یہ انداز فکر ہی درست نہیں کہ جسے کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر دنیا میں کوئی سزا نہ ملے یا اس کا کوئی نقصان نہ ہو وہ اپنے نفس پر کچھ ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ اصل نقصان تو آخرت کا نقصان ہے۔

[۶] نئی صورت سے مراد مصالحت، رضامندی اور رجوع کی وہ راہیں ہیں جو طلاق کے بعد فریقین کو ہوش میں آنے اور طلاق کے

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ

تو پھر انہیں یا تو بھلے طریقے سے[۷] (اپنے نکاح میں) روکے رکھو یا پھر بھلے طریقے سے انہیں چھوڑ دو اور اپنے میں سے دو صاحب عدل[۸] گواہ بنا لو۔ اور (اے گواہو!) اللہ کے لئے شہادت ٹھیک[۹] ادا کرو۔

نقصانات پر غور کرنے کے بعد درست نظر آنے لگتی ہیں۔

[۷] دور جاہلیت میں طلاق کے سلسلہ میں عورتوں کی حالت زار:۔ یعنی تمہارے ہی گھر میں تمہاری مطلقہ بیوی کی عدت ختم ہونے کو آئے، تو تمہارے سامنے دو راستے ہیں ایک یہ کہ بہر حال تم انہیں چھوڑنا ہی چاہتے ہو ایسی صورت میں ان کے سب حقوق انہیں ادا کرو اور علاوہ ازیں ان سے فیاضانہ سلوک کرتے ہوئے کچھ مزید بھی اپنی استطاعت کے مطابق دے دو۔ جاتے جاتے اس پر کوئی الزام تراشی نہ کرو نہ اسے کسی طرح کا دکھ پہنچاؤ۔ بلکہ اپنی زندگی کے ساتھی کو شکر رنجیوں کے باوجود بھلے مانسوں اور شریفوں کی طرح رخصت کرو۔ اور اگر تم انہیں اپنے گھر میں ہی آباد رکھنا چاہتے ہو تو رجوع کر لو۔ اور اس معاملہ میں تمہاری نیت بخیر اور اس عورت کو فی الواقع آباد رکھنے کی ہونی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی بیوی کو مزید سزائیں دینے کی خاطر اس سے رجوع کر کے اپنے ہاں روکے رکھو۔ یہ حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر ان بے پناہ مظالم کا خاتمہ کر دیا جو دور جاہلیت میں ان پر ڈھائے جاتے تھے۔ عورتوں کی اس دردناک کیفیت کو امام ترمذی نے یوں بیان فرمایا:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرد جتنی بھی طلاقیں چاہتا اپنی بیویوں کو دیئے جاتا اور عدت کے اندر پھر رجوع کر لیتا۔ اگرچہ وہ مرد سو بار یا اس سے بھی زیادہ طلاقیں دیتا جائے۔ یہاں تک کہ ایک (انصاری) مرد نے اپنی بیوی سے کہا: اللہ کی قسم! میں نہ تو تجھے طلاق دوں گا کہ تو مجھ سے جدا ہو سکے اور نہ ہی میں بساؤں گا۔ اس عورت نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگا: "میں تجھے طلاق دوں گا اور جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہو گی تو رجوع کر لوں گا" یہ سن کر وہ عورت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی اور اپنا یہ دکھڑا سنایا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا خاموش رہیں تا آنکہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو یہ ماجرا سنایا تو آپ بھی خاموش رہے تا آنکہ قرآن (کی یہ آیت) نازل ہوئی۔ "طلاق صرف دو بار ہے پھر یا تو ان عورتوں کو بھلے مانسوں کی طرح اپنے پاس رکھو یا پھر اچھی طرح سے رخصت کر دو"

(ترمذی۔ ابواب الطلاق واللعان۔باب بلا عنوان)

[۸] رجوع وطلاق پر گواہ بنانے کا فائدہ:۔ یعنی اگر رجوع کر کے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے تو بھی دو معتبر گواہ بنا لے تاکہ بعد میں زوجین متہم نہ ہوں۔ اور اگر رخصت کرتا ہے تو بھی گواہ بنا لو۔ واضح رہے کہ یہ گواہی رجوع اور طلاق کے لیے شرط نہیں کہ اگر گواہ نہ بنائے جائیں تو رجوع اور طلاق غیر موثر ہوتے ہیں اور واقع نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ حکم اس احتیاط کے لیے دیا گیا ہے کہ بعد میں کوئی فریق کسی واقعہ کا انکار نہ کر دے اور نزاع پیدا ہونے کی صورت میں بآسانی فیصلہ ہو سکے اور شکوک و شبہات کا دروازہ بھی بند ہو جائے۔

[۹] یعنی اگر رخصتی یا رجوع کے بعد فریقین میں کسی بات میں نزاع پیدا ہو جائے تو گواہ جانبداری سے ہرگز کام نہ لیں نہ گول مول بات کریں نہ ہیرا پھیری سے کام لیں بلکہ صاف اور سیدھی سچی گواہی دیں۔

ذٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۥ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝

یہی بات ہے جس کی اس شخص کو نصیحت [۱۰] کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کی کوئی راہ پیدا [۱۱] کر دے گا۔(۲)

اور اسے ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں اسے وہم و گمان [۱۲] بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا [۱۳] ہے۔ بلاشبہ اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر [۱۴] کر رکھا ہے۔(۳)

[۱۰] **طلاق سے متعلق اخلاقی ہدایات:۔** یعنی یہ ہدایات تمہاری ہی خیر خواہی کے لئے ہیں اور بطور پند و نصیحت ہیں۔ ان کی حیثیت قانونی نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنی عورت کو حالت حیض میں یا اس طہر میں جس میں اس نے صحبت کی ہو طلاق دے دے گا تو اگرچہ اس نے خلاف سنت اور گناہ کا کام کیا تاہم طلاق واقع ہو جائے گی اسی طرح اگر اس نے ستانے کی خاطر ہی رجوع کیا ہو تو یہ بھی رجوع قانوناً تسلیم کیا جائے گا۔ یا عورت کو رخصت کرتے وقت حسن سلوک کے بجائے دھکے مار کر نکال دیا ہو تب بھی طلاق کے واقع ہونے میں کوئی شک نہ رہے گا۔ یہ ہدایات تو اس شخص کے لئے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا اور اللہ سے ڈرتا ہو۔ وہ ان پر اس لئے عمل کرے گا کہ یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ ان احکام کی نافرمانی کرنے پر آخرت میں اس سے باز پرس بھی ہو گی اور گرفت بھی۔

[۱۱] گھریلو مسائل اور بالخصوص میاں بیوی کے تعلقات بعض دفعہ ایسی پیچیدہ صورت اختیار کر جاتے ہیں کہ انسان انہیں جس قدر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اور زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں اور الجھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایسے پریشان کن حالات میں انسان کا طرز عمل یہ ہونا چاہئے کہ جو کام بھی کرے اللہ سے ڈر کر کرے۔ اگر واضح احکام موجود ہیں تو ان پر عمل کرے اور اگر واضح احکام نہیں ملتے تو بھی اللہ کے ڈر کو ہی مشعل راہ بنائے اور اللہ کی منشا معلوم کرنے کی کوشش کرنے کے بعد اس پر عمل کرے اور انجام اللہ کے سپرد کر دے۔ آگے ان پیچیدہ حالات سے نکالنا اور ان سے نجات دینا اللہ کا کام ہے۔ وہ خود کوئی راہ اسے سجھا دے گا یا نئی راہ پیدا کر دے گا۔

[۱۲] اس مقام پر رزق کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ انسان دوران عدت مطلقہ عورت پر خرچ کرنے اور اس کو بھلے طریقے سے رخصت کرنے میں بخل سے کام نہ لے بلکہ اس سے جتنا بہتر سلوک کر سکتا ہے، کرے۔ نیز بعض دفعہ صورت حال یہ ہوتی ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں ٹھنی رہتی ہے۔ مگر عورت صاحب جائیداد ہوتی ہے یا اچھا کما سکتی ہے۔ تو خاوند اس کو چھوڑنے پر ہی آمادہ نہیں ہوتا۔ مگر اس سے اچھا سلوک کرنے میں بھی ناکام ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ عورت کو اپنے ہاں لٹکائے رکھتا ہے۔ ایسی سب صورتوں میں اللہ سے ڈرتے ہوئے وہی کام کرنا چاہئے جو اللہ کا حکم ہو۔ تنگدستی سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اس سے ڈر کر اسی کے حکم کے مطابق چلے گا تو اس کی تنگدستی کو دور کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ وہ اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچانے کا انتظام فرما دے گا جو پہلے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

[۱۳] اس لیے کہ ہر قسم کے ظاہری اور باطنی اسباب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ جبکہ انسان کی نظر صرف چند ظاہری اسباب

وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ④ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ

اور تمہاری عورتوں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر تمہیں کچھ شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور ان کی بھی جنہیں[۱۵] ابھی حیض شروع ہی نہ ہوا ہو۔ اور حمل والی عورتوں کی عدت[۱۶] ان کے وضع حمل تک ہے۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرے[۱۷] تو اللہ اس کیلئے اس کے کام میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ (۴) یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔

تک محدود ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اللہ سے ڈرنے والے کے لیے پریشانیوں سے نجات کی راہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اور تنگدستی کو دور کرنے کے لیے نئے اسباب بھی پیدا کر سکتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ کی قدرت اسباب کی پابند نہیں۔ بلکہ اسباب بھی اس کی مشیت کے تابع ہیں۔ وہ ظاہری اسباب سے ایسے نتائج حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے جو انسانی عقل کے برعکس ہوں۔ جیسے اللہ کی مشیت نہ ہو تو مجرب دوائی بھی الٹا اثر دکھا دیتی ہے۔ یا ایک معتر دوائی سے بعض دفعہ انسان صحت یاب ہو جاتا ہے۔

[۱۴] یعنی اگر کسی الجھنوں میں گرفتار شخص کو اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرنے پر نجات کی راہ نہیں مل سکی یا کسی شخص نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنی مطلقہ بیوی سے فیاضانہ سلوک کیا مگر اس کی تنگدستی فوراً دور نہیں ہوئی تو اس سے اسے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ اس کے ہاں ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر ہے اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

[۱۵] ❁ نکاح نابالغاں:۔ یعنی جو عورتیں اتنی بوڑھی ہو چکی ہوں کہ انہیں حیض آنا بند ہو چکا ہو یا وہ نابالغ لڑکیاں جنہیں ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو۔ اور بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ انہیں عمر کی نسبت سے بڑی دیر کے بعد حیض آتا ہے اور ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر حیض نہ آئے۔ ایسی سب عورتوں کی عدت تین ماہ ہے اور یہ اس دن سے شروع ہو جائے گا جس دن سے اسے طلاق دی گئی اور تین ماہ قمری شمار ہوں گے، شمسی نہیں۔ ضمناً اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ نابالغ بچیوں کی شادی بھی جائز ہے اور ان سے صحبت کرنا بھی جائز ہے۔ اسی طرح جن بڑی عورتوں کو بھی حیض نہ آیا ہو یا اتنی بوڑھی ہو چکی ہوں کہ ان کا حیض بند ہو چکا ہو ان سے بھی صحبت کرنا جائز ہے۔

اس آیت میں ﴿اِنِ ارْتَبْتُمْ﴾ کے الفاظ بڑے ذو معنی ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اگر تمہیں ایسی عورتوں کی عدت معلوم کرنے میں تشویش ہو اور تم ان کی عدت معلوم کرنا چاہتے ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی عدت تین ماہ ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بے حیض عورت کے ہاں عموماً اولاد پیدا نہیں ہوتی۔ تاہم ایسی عورتوں کے ہاں اولاد کا پیدا ہو جانا اللہ کی قدرت سے کچھ بعید بھی نہیں۔ اور اس کی مثالیں بھی اس دنیا میں پائی جاتی ہیں اگرچہ ایسی مثالیں شاذ ہیں۔ تاہم ناممکن اور مفقود بھی نہیں۔ اسی لئے ایسی عورتوں کی عدت مقرر کر دی گئی۔

[۱۶] عورت مطلقہ ہو یا بیوہ ہو یعنی اس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت وضع حمل تک ہو گی۔ جیسا کہ اسی سورہ کی پہلی آیت کے حاشیہ نمبر ۱ میں اس کی وضاحت پیش کی جا چکی ہے۔

[۱۷] اس سورت میں بار بار اللہ سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی گئی ہے وجہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کے مسائل بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک انسان ہر وقت اللہ سے ڈرتا نہ رہے وہ اپنی بیوی کے معاملہ میں بے راہرو ہو جاتا ہے اور اسی لیے کتاب و سنت میں اپنی بیویوں سے حسن سلوک کی بار بار تاکید آئی ہے۔

اِلَیۡکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یُکَفِّرۡ عَنۡہُ سَیِّاٰتِہٖ وَ یُعۡظِمۡ لَہٗۤ اَجۡرًا ﴿۵﴾ اَسۡکِنُوۡہُنَّ مِنۡ حَیۡثُ سَکَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِکُمۡ وَ لَا تُضَآرُّوۡہُنَّ لِتُضَیِّقُوۡا عَلَیۡہِنَّ ؕ وَ اِنۡ کُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَیۡہِنَّ حَتّٰی یَضَعۡنَ حَمۡلَہُنَّ ۚ فَاِنۡ

اور جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ اس کی برائیاں دور کر دیتا ہے اور اسے بڑا اجر دیتا ہے۔(۵)

مطلقہ عورتوں کو (ان کے زمانہ عدت میں) وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو[۱۸]، جیسی جگہ تمہیں میسر ہو، اور انہیں تنگ کرنے کیلئے ایذا[۱۹] نہ دو۔ اور اگر وہ حمل والی ہوں تو وضع حمل تک ان پر خرچ[۲۰] کرتے رہو۔

[۱۸] عدت کے دوران رہائش اور نان ونفقہ خاوند کے ذمہ ہے:۔ مطلقہ عورت کی عدت کے دوران اس کی رہائش اور اس کی خوراک و پوشاک کا سارا خرچ طلاق دینے والے مرد کے ذمہ ہے۔ اس قطعی اصل سے استثناء کی ایک مثال دور نبوی ﷺ میں ملتی ہے۔ وہ قصہ یہ تھا کہ فاطمہ بنت قیس کے خاوند عمرو بن حفص نے جب اپنی بیوی کو تیسری طلاق دی تو اس وقت وہ خود شام کے علاقے میں تھے۔ فاطمہ بنت قیس آپ ﷺ کے پاس آئی اور انہیں یہ معاملہ بتایا تو آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی عدت ام شریک کے گھر میں گزارے، پھر فرمایا: یہ عورت (ام شریک) ایسی ہے جس کے ہاں میرے صحابہ اکثر آتے جاتے ہیں لہٰذا تم ابن ام مکتوم کے ہاں عدت گزارو۔ کیونکہ وہ اندھا آدمی ہے تو اس کے ہاں کپڑے تک اتار سکتی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ تو اپنے چچا ابن ام مکتوم کے ہاں چلی جا۔ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "فاطمہ بنت قیس اللہ سے نہیں ڈرتی جو کہتی ہے کہ جس عورت پر طلاق بائن پڑے اس کے لئے نہ رہائش ہے اور نہ نفقہ (خوراک و پوشاک) (بخاری۔ کتاب الطلاق۔ باب قصة فاطمة بنت قيس)

فاطمہ بنت قیس کا استثنائی قصہ:۔ فاطمہ بنت قیس کا قصہ تقریباً سب کتب احادیث میں مذکور ہے۔ لیکن ان کی عدت گزارنے اور نفقہ کا قصہ بالکل اضطراری نوعیت کا تھا۔ یہ ایک درشت مزاج اور زبان دراز خاتون تھیں جب طلاق مغلظہ واقع ہوئی اس وقت ان کا خاوند شام میں تھا۔ تیسری طلاق کے بعد چونکہ خاوند کا حق رجوع ختم ہو جاتا ہے اور وہ اس کی بیوی نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ مسئلہ بذات خود مختلف فیہ ہے۔ کہ طلاق مغلظہ کے بعد سکنیٰ اور نفقہ واجب بھی ہے یا نہیں۔ تاہم جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ پوری عدت کے دوران سکنیٰ اور نان و نفقہ واجب ہے۔ فاطمہ بنت قیس کا گھر جنگل میں تھا جہاں آس پاس مکانات نہیں تھے لہٰذا وہاں مال اور ناموس دونوں باتوں کا خطرہ تھا علاوہ ازیں اس کے خاوند نے جو کچھ سَرَاحًا جَمِیْلاً کے طور پر بھیجا تھا اسے فاطمہ بنت قیس نے حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا۔ یہ تھے وہ خصوصی حالات جن کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ کے حق میں یہ فیصلہ دیا تھا اور یہ انہی کے لئے خاص تھا۔ اسی لئے سیدنا عمرؓ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے صحابہ فاطمہ کے اس قول کو کہ: "طلاق بائن والی عورت کے لئے سکنیٰ اور نفقہ نہیں ہے" کا انکار کرتے اور اس کے ذاتی واقعہ کو رسول اللہ ﷺ کی خصوصی اجازت سمجھتے تھے جو کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں۔

[۱۹] یعنی واجبی خرچ نہ دے کر یا دوسرے طریقوں سے اس طرح تنگ نہ کر ڈالو کہ وہ از خود نکلنے اور تمہارا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں اور تم یہ سمجھنے لگو کہ جب وہ خود ہی چلی گئی ہے تو تم پر اس کا کچھ الزام نہیں۔

[۲۰] بیوہ کا نان و نفقہ واجب نہیں:۔ حاملہ خواہ مطلقہ ہو یا بیوہ اس کی عدت تا وضع حمل ہے۔ خواہ یہ چند دن بعد ہی وضع حمل ہو یا

أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ﴿٦﴾ لِيُنفِقْ
ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ

پھر اگر وہ تمہارے لیے (نومولود) کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو۔ اور باہمی مشورہ سے بھلے طریقے سے (اجرت کا معاملہ) طے کر لو۔ اور اگر تم نے (اجرت طے کرنے میں) ایک دوسرے[۲۱] کو تنگ کیا تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی۔(۶) خوشحال آدمی کو چاہیے کہ اپنی حیثیت کے مطابق نفقہ دے اور جسے رزق کم دیا گیا ہے وہ اسی کے مطابق خرچ دے گا جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی کو اسی کے مطابق تکلیف دیتا ہے

چھ سات ماہ تک لمبی ہو جائے۔ اس دوران اگر مطلقہ ہے تو اس کے سکنیٰ اور نفقہ کا ذمہ دار اس کا خاوند ہو گا۔ اور اگر بیوہ ہے تو اس کا سکنیٰ تو مرد کے لواحقین کے ذمہ ہو گا اور وہ عدت اپنے خاوند کے گھر میں گزارے گی۔ لیکن نفقہ کی حقدار نہ رہے گی کیونکہ اب وہ وراثت کی حقدار بن گئی ہے وہ اپنے حصہ میں سے اپنی ذات پر خرچ کرے گی۔ یہ نہیں ہو گا کہ پہلے خاوند کے مشترکہ ورثہ سے اس کا نفقہ بھی اسے دیا جائے اور پھر وراثت کا حصہ بھی۔

[۲۱] ❁ طلاق کے بعد بچہ کو دودھ پلانے سے متعلقہ مسائل:۔ اس آیت اور اگلی آیت سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱۔ عورت اپنے دودھ کی خود مالک ہے اور وہ طلاق دینے والے خاوند سے بھی اسی طرح اجرت لے سکتی ہے جس طرح دوسروں سے۔

۲۔ قانونی طور پر بچہ باپ کا ہوتا ہے، ماں کا نہیں ہو گا۔ اگر بچہ ماں کا ہو تو اجرت لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ اگر ماں بھی وہی اجرت مانگے جو دوسری عورتیں مانگتی ہیں تو ماں دودھ پلانے کی زیادہ حقدار ہے۔

۴۔ اگر ماں کسی بیماری یا کمزوری کی وجہ سے دودھ پلانے سے انکار کر دے یا اجرت اتنی زیادہ مانگے جو اس کے خاوند کی استطاعت یا معروف رواج سے زیادہ ہو تو باپ کسی دوسری عورت سے بھی دودھ پلوانے کی خدمت لے سکتا ہے۔

۵۔ طلاق کے بعد اگر فریقین میں شکر رنجی باقی رہ گئی ہو تب بھی بچہ کی تربیت کے سلسلہ میں ماں اور باپ کو بچہ کی اور ایک دوسرے کی بھلائی ہی سوچنا چاہیے۔ باپ محض ماں کو ستانے، تنگ کرنے اور اس کی نظروں سے بچہ غائب رکھنے کی خاطر کسی دوسری عورت سے دودھ نہ پلائے یا ماں کو اس کا بہت کم معاوضہ دے یا سرے سے کچھ دینے پر آمادہ ہی نہ ہو۔ اور نہ ہی ماں اتنا خرچ طلب کرے یا ایسے حالات پیدا کر دے کہ باپ کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے۔

۶۔ ہمارے ہاں یہ دستور بن چکا ہے کہ مطلقہ عورت اور طلاق دینے والا مرد بعد میں تا زیست نہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں اور نہ کلام کریں اور اسے غیرت کا مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ بلکہ بسا اوقات مرد اور عورت کے خاندان میں بغض اور عداوت چل جاتی ہے۔ شرعاً ان باتوں کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں بالخصوص ﴿وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ﴾ کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ نیز جب سیدنا زید بن حارثہ نے سیدہ زینب کو طلاق دے دی تو اس کے بعد نبی ﷺ نے سیدہ زینب کو اپنے لیے نکاح کا پیغام سیدنا زید کی زبانی ہی بھیجا تھا۔

ع ۱۷

اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴿۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۹﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ

جو اس نے اسے دیا ہے۔ اللہ جلد ہی تنگی کے بعد آسانی[۲۲] کر دے گا۔(۷)

کتنی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے[۲۳] ان کا بڑا سخت محاسبہ کیا اور انہیں بری طرح سزا دی۔(۸) چنانچہ انہوں نے اپنے کیے کا وبال چکھ لیا اور ان کے کام کا انجام خسارہ ہی تھا۔(۹) اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ پس تم اللہ سے ڈرتے رہو، اے عقل والو! جو ایمان لا چکے ہو۔ بلاشبہ اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل[۲۴] کیا ہے(۱۰) ایک ایسا رسول[۲۵] جو تمہیں اللہ کی واضح آیات پڑھ کر سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں، اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف[۲۶] لائے۔

[۲۲] اس آیت میں دوبارہ اس سلسلہ میں فیاضی سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے کہ ہر باپ اپنی مقدور کے مطابق ماں کو دودھ پلانے کی اجرت ادا کرے۔ خواہ وہ مالدار ہے یا تنگدست اور اگر تنگدست ہے تو بھی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ دینے میں بخل سے کام نہ لے۔ اگر وہ بخل سے کام نہ لے گا تو اللہ اس کی تنگی کو دور فرما دے گا۔ اور اس کے لیے رزق کی راہیں کھول دے گا۔

[۲۳] عائلی زندگی سے متعلق احکام بیان کرنے اور ہر ہر مقام پر اللہ سے ڈرتے رہنے کی تاکید کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا جنہوں نے اللہ کے احکام کے مقابلہ میں اکڑ دکھائی اور سرتابی کی راہ اختیار کی تھی۔ ان کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ اللہ کے احکام کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ تو ہم نے انہیں ان کی کرتوتوں کی ٹھیک ٹھیک سزا دے ڈالی۔ ان کا سختی سے مواخذہ کیا اور کسی کو بھی معاف نہیں کیا اور انہیں ایسی آفت میں پھنسایا جس سے وہ نکل نہ سکے۔

[۲۴] ❁ ذکر کے مختلف مفہوم:۔ آیت نمبر ۱۰ میں ذکر سے مراد قرآن کریم ہے اور یہ لفظ ان معنوں میں قرآن کریم میں متعدد بار استعمال ہوا۔ مثلاً ارشاد باری ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (۹:۱۵) "یعنی ہم ہی نے یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" واضح رہے کہ ذکر کا لغوی معنی یاد دہانی اور نصیحت ہے۔ یعنی یہ قرآن انسان کو عہد الست کی بھی یاد دہانی کراتا ہے۔ اور سابقہ رسولوں کی تعلیمات کی بھی۔ اور ذکر کو اگر اس کے وسیع معنوں میں لیا جائے تو اس سے مراد وہ تمام وحی ہے جو آپ پر نازل ہوئی۔ اور جو قرآن کی ہی تفسیر و تعبیر پیش کرتی ہے۔ یعنی اللہ نے صرف قرآن کے الفاظ کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی بلکہ اس کی صحیح تفسیر و تعبیر کی حفاظت کی بھی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ جس سے ہر باطل پرست کے نظریہ کو پرکھا جا سکتا ہے۔

[۲۵] یعنی صرف قرآن ہی نازل نہیں کیا بلکہ ایک رسول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی مبعوث فرمایا جو اس کی واضح آیات پڑھ کر بھی سناتا ہے پھر اس کے احکام و ارشادات پر عمل کرنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہے۔

[۲۶] ❁ شرعی عائلی قوانین کی خوبیاں:۔ تاریکیوں سے مراد جہالت کی تاریکیاں ہیں۔ اور یہ تاریکیاں ایک نہیں بلکہ لاتعداد ہوتی

بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿١١﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ
٢ ع ١٨ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿١٢﴾

اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ایسے شخص کے لئے بہت اچھا رزق رکھا ہے۔(۱۱) اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے انہی کے مانند[۲۷]۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا[۲۸] ہے۔ تاکہ تم جان لو کہ اللہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے، اور یہ کہ اللہ نے علم سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔(۱۲)

ہیں۔ انسان اپنے مسائل کے حل کے لیے جتنے بھی قوانین بناتا ہے وہ ناقص ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کی محدود عقلی فکر معاشرہ کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اسی لیے ان قوانین میں آئے دن ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں روشنی سے مراد علم وحی کی روشنی ہے۔ جو ایک ہی رہی ہے اور ناقابل ترمیم و تنسیخ اور انسان کی دست برد سے پاک ہوتی ہے۔ اس مقام پر اس ارشاد کی پوری اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب ہم قدیم و جدید دنیا کے عائلی قوانین پر غور کرتے ہیں اس تقابلی مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بار بار کی تبدیلیوں اور نت نئی قانون سازیوں کے باوجود معاشرے کے لئے آج تک کسی قوم کو ایسا معقول' فطری اور مفید قانون میسر نہیں آسکا ہے جیسا کہ اس کتاب اور اس کے لانے والے رسول نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہم کو دیا تھا۔

[۲۷] ﴿ سات زمینوں کے مختلف مفہوم:۔ اس جملہ کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ لغوی مفہوم یہ ہے کہ سماء اور ارض دونوں اسمائے نسبیہ سے ہیں۔ سماء یعنی بلندی ہے اور ارض بمعنی پستی۔ اس لحاظ سے ہم ہر بلندی کے مقابلہ میں پستی کو ارض کہہ سکتے ہیں اور ہر پستی کے مقابلہ میں بلندی کو سماء کہہ سکتے ہیں۔ گویا ہماری زمین پہلے آسمان کے مقابلہ ارض ہے۔ اور پہلا آسمان دوسرے آسمان کے مقابلہ میں ارض ہے۔ علی ہذا القیاس چھٹا آسمان ساتویں آسمان کے مقابلہ میں ارض ہے۔ اس طرح سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی سات بن جاتی ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس سے ہماری زمین کے ہی سات طبقات یا سات پرت مراد ہوں۔ جنہیں طبقات الارض کہا جاتا ہے۔ اور ان میں سے ہر طبقہ ارض ہے یا اپنے سے اوپر والے طبقہ کے مقابلہ میں ارض ہے اور اس مفہوم کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "جو شخص کسی دوسرے کی تھوڑی سی بھی زمین ناحق لے لے تو وہ قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنستا چلا جائے گا" (بخاری۔ کتاب المظالم۔ باب اثم من ظلم شیئا من الارض) اور تیسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ہماری ہی زمین جیسی ہی چھ اور زمینیں اس کائنات میں موجود ہوں اور وہاں کسی جاندار مخلوق کی آبادی بھی ہو۔ انسان آج تک کائنات کی وسعت کا اندازہ نہیں کر سکا اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جس قدر جدید اور طاقتور قسم کی دوربینیں ایجاد کر رہا ہے اور رصدگاہیں تیار کر رہا ہے۔ اسے کائنات کے نئے سے نئے گوشے نظر آنے لگے ہیں اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ کائنات میں ہر آن وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿وَالسَّمَاۗءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾ (۵۱:۴۷) یعنی ہم نے آسمان (یہاں آسمان سے مراد فضائے بسیط ہے) کو اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور ہم اس میں ہر آن توسیع کر رہے ہیں اور اس مفہوم کی تائید میں چند احادیث مل جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ ضعیف قسم کی ہیں۔

[۲۸] یعنی عالم کے انتظام و تدبیر کے لئے اللہ کے احکام تکوینیہ اور شرعیہ ان آسمانوں اور زمینوں میں نازل ہوتے رہتے ہیں۔

۱۲ آیاتھا ۔۔۔ سُوْرَةُ التَّحْرِیْمِ مَدَنِیَّةٌ ۔۔۔ رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ①

کلمات ۲۵۳ آیات ۱۲ (۶۶) سورۃ التحریم مدنی ہے (۱۰۷) رکوع ۲ حروف ۱۱۲۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کیلئے حلال کیا ہے۔ اسے آپ کیوں حرام کرتے ہیں؟ (کیا) آپ اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے[۱] ہیں اور اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔(۱)

[۱] آپ کا شہد نہ پینے پر قسم کھانا اور رازداری کی تلقین کرنا:۔ رسول اللہ ﷺ کا روزمرہ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ نماز عصر کے بعد اپنے سب گھروں میں اپنی بیویوں کے ہاں چکر لگایا کرتے تھے۔ تاکہ گھریلو حالات سے پوری طرح باخبر رہیں اور خیر و عافیت کی صورت معلوم ہوتی رہے۔ ایک دفعہ جب آپ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے آپ ﷺ کو شہد کا شربت پلایا۔ اس طرح آپ کو وہاں کچھ دیر لگ گئی۔ دوسرے دن بھی آپ ﷺ کو سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے شربت پلایا اور چونکہ آپ ﷺ کو شہد اور اس کا شربت بہت پسند تھا۔ لہٰذا یہ بھی ایک طرح سے روزمرہ کا معمول بن گیا کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں آپ کو کچھ دیر لگ جاتی تھی۔ یہ بات دوسری بیویوں اور بالخصوص سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو ناگوار گزری۔ کیونکہ آپ ﷺ کی بیویوں میں سے ہر ایک یہی چاہتی تھی کہ وہی زیادہ تر آپ کی توجہات کا مرکز بنے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی اس عادت' یعنی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں شہد کا شربت پینے کی عادت کو چھڑانے کی یہ ترکیب سوچی۔ کہ آپ ﷺ سے کہا جائے کہ آپ ﷺ کے منہ سے تو مغافیر (ایک قسم کا گوند جس کی بو ناگوار ہوتی ہے) کی بو آتی ہے پھر جب ایک بیوی نے بھی یہی بات کہی اور دوسری نے بھی ایسی بات کہی تو آپ کو وہم ہونے لگا کہ شاید ایسی بدبو واقعی آ رہی ہو اور آپ ﷺ کو بدبودار چیزوں سے سخت نفرت بھی تھی۔ اور ان بیویوں کی دلجوئی بھی مقصود تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے قسم کھالی کہ میں آئندہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں سے شہد نہیں پیا کروں گا۔ امام بخاری نے مختصراً اس واقعہ کو یوں روایت کیا ہے:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: "رسول اللہ ﷺ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ہاں ٹھہرے رہتے اور شہد پیا کرتے تھے۔ میں اور حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپس میں طے کیا کہ ہم سے جس کے پاس آپ ﷺ تشریف لائیں، وہ یوں کہے: "کیا آپ ﷺ نے مغافیر کھایا ہے۔ مجھے تو آپ سے مغافیر کی بو آ رہی ہے" (پھر ایسا ہی کیا) آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں! بلکہ میں نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ہاں سے شہد پیا ہے۔ اب میں قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ کبھی شہد نہ پیوں گا۔ اور تم یہ بات کسی کو مت بتانا" (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ تحریم)

حلال و حرام کا اختیار صرف اللہ کو ہے:۔ ضمناً اس آیت سے کئی اہم امور پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۲ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ

اللہ نے تمہارے لیے (ناجائز) قسموں کو کھول دینا واجب [۲] قرار دیا ہے۔ اللہ ہی تمہارا سرپرست ہے اور وہ سب کچھ [۳] جاننے والا' حکمت والا ہے۔(۲) جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے ایک راز کی بات کہی۔

۱۔ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ کسی نبی حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ اختیار نہ تھا کہ اپنی مرضی سے کسی چیز کو حلال یا حرام یا کسی حلال چیز کو حرام یا کسی حرام چیز کو حلال قرار دے دیں۔

۲۔ ❁ رسول کی حیثیت عام لوگوں سے علیحدہ ہوتی ہے:۔ کسی انسان کا کسی مصلحت کی خاطر کسی حلال چیز کو اپنے لئے حرام قرار دے لینا، یا اسے کچھ عرصہ کے لئے ترک کر دینا یا اسے چھوڑنے کی قسم کھا لینا بذات خود کوئی بڑا جرم نہیں ہے۔ جیسے بعض لوگوں کو بڑا گوشت نقصان پہنچاتا ہے تو اسے کھانا چھوڑ دیں یا نہ کھانے کی قسم اٹھا لیں تو یہ جرم نہ ہوگا۔ مگر رسول اللہ ﷺ کا معاملہ ذاتی نوعیت کا حامل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی اصل اور بنیادی حیثیت رسول ﷺ کی ہوتی ہے جس کا ہر کام امت کے لیے نمونہ اور واجب الاتباع ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ کے اس فعل پر اللہ کی طرف سے گرفت ہوئی کہ مبادا آپ ﷺ کی امت بھی شہد کو حرام یا کم از کم مکروہ ہی نہ سمجھنے لگے۔ بالفاظ دیگر نبی کا جو کام اللہ کی رضا اور منشا کے مطابق نہ ہو، خواہ وہ ترک اولیٰ قسم کا ہی ہو، اس کی فوراً بذریعہ وحی جلی اصلاح کر دی جاتی ہے۔

۳۔ وحی خفی کی اقسام:۔ جس طرح سنت کی تین اقسام ہیں۔ قولی، وہ جو آپ ﷺ کے قول سے معلوم ہو یا ثابت ہو، فعلی، وہ جو آپ ﷺ کے فعل سے معلوم ہو یا ثابت ہو اور تحریری سنت وہ ہوتی ہے کہ کوئی فعل آپ ﷺ کے سامنے واقع ہو اور آپ ﷺ نے اس پر گرفت نہ فرمائی ہو یا سکوت اختیار فرمایا ہو اور ایسی سنت بھی قابل حجت ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی خفی (قرآن کے علاوہ دوسری قسم کی وحی) کی بھی تین اقسام ہیں۔ قولی وحی وہ اقوال ہیں جو جبرئیل ؑ کے ذریعہ آپ پر نازل ہوئے جیسے ادعیہ مسنونہ اور تشہد وغیرہ۔ فعلی وحی وہ کام ہے جس کے کرنے کا طریق آپ ﷺ کو جبرئیل ؑ نے سکھایا ہو مثلاً نماز ادا کرنے کا طریقہ اور تقریری وحی وہ ہے جبکہ آپ ﷺ کے کسی اجتہاد، قول یا فعل پر اللہ نے از راہ صواب سکوت اختیار فرمایا ہو۔ اور آپ ﷺ کی زندگی کے بہت سے اقوال و افعال ایسے ہی ہیں۔ اور اگر آپ کے کسی قول یا فعل میں کوئی بات اللہ کی منشا کے خلاف ہو تو اس پر فوراً تنبیہ کر کے اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔

❁ عصمت انبیاء کا مفہوم:۔ کسی بڑے سے بڑے برگزیدہ انسان حتی کہ انبیاء سے بھی غلطی کا صدور ممکن ہے فرق صرف یہ ہے کہ انبیاء کی غلطی کی فوراً بذریعہ وحی اصلاح کر دی جاتی ہے جس سے ان کی زندگی بالکل بے داغ (جسے ہم اصطلاحی زبان میں عصمت انبیاء کہتے ہیں) ایک قابل تقلید نمونہ اور امت کے لیے واجب الاتباع بن جاتی ہے اور یہ مقام انبیاء کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوتا۔

[۲] قسم کے کفارہ کا تفصیلی ذکر سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۸۹ کے تحت گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ قسم کا کفارہ ادا کر کے اس عہد اور قسم کو توڑ دیں جو آپ نے ایک حلال چیز کو اپنے آپ پر حرام کر لینے سے متعلق کیا ہے۔

[۳] یعنی اللہ تمہارے تمام معاملات کا نگران اور محافظ ہے اس نے جو چیزیں حلال کی ہیں وہ بھی اپنے علم و حکمت کی بنا پر کی ہیں۔ اور جو حرام کی ہیں وہ بھی علم و حکمت کی بنا پر ہی حرام کی ہیں۔ تمہارا کام بس یہ ہے کہ تمہیں کسی حکم کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ

إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ
عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ﴿٣﴾ إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ
فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ

اس بیوی نے وہ بات (آگے) بتادی اور یہ معاملہ اللہ تعالیٰ نے نبی پر ظاہر[۴] کر دیا اب نبی نے (اس بیوی کو) کچھ بات تو جتلا دی[۵] اور کچھ نہ جتلائی۔ پھر جب نبی نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو وہ پوچھنے لگی کہ: "آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟" تو نبی نے کہا: مجھے اس نے خبر دی جو ہر بات کو جانتا اور اس سے پوری طرح باخبر ہے (۳) اگر تم دونوں (بیویاں) اللہ کے حضور توبہ کرتی ہو (تو بہتر ہے کیونکہ) تمہارے دل راہ راست سے ہٹ گئے ہیں اور اگر تم (اس معاملہ میں) نبی کے خلاف ایک دوسرے[۶] کی پشت پناہی کرو گی تو اللہ' جبریل اور صالح مومن

آپ کا ساتھی ہے۔۔۔ آئے۔ اس کے احکام کی اطاعت کرتے جاؤ۔

[۴] افشائے راز کی آپ ﷺ کو بذریعہ وحی خبر ملنا: نبی ﷺ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے بات کی کہ میں آئندہ زینب رضی اللہ عنہا کے گھر سے کبھی شہد نہ پیوں گا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ آگے میری بات کسی کو نہ بتانا۔ آپ ﷺ کا یہ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر میری بات سیدہ زینب رضی اللہ عنہا تک پہنچ گئی تو ان کا دل رنجیدہ ہوگا۔ لیکن سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس رازداری کے عہد کو پورا نہ کیا۔ انہوں نے یہ بات سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو تو نہ بتائی البتہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتادی اور راز کی بات جب ایک سے دوسرے تک چلی جائے تو آگے بھی پھیلتی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے نبی کو اس راز کے فاش ہونے کی اطلاع دے دی۔

[۵] سیدہ حفصہ سے آپ کا مکالمہ: اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے صرف یہی راز کی بات نہیں کی تھی بلکہ اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی کی تھی۔ جب آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہو گیا کہ یہ راز افشا ہو چکا ہے تو آپ ﷺ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے ان باتوں میں سے ایک بات کے متعلق کہا کہ کیا یہ بات تم نے افشا کر دی ہے؟ اور دوسری بات کا ذکر نہ کیا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دوسری بات یہ تھی کہ میرے بعد عائشہ رضی اللہ عنہا کا باپ خلیفہ ہوگا اور اس کے بعد تیرا باپ اور یہ بات آپ ﷺ راز میں رکھنا چاہتے تھے تاکہ بلاضرورت چرچا نہ ہو اور کچھ لوگ برا نہ مانیں۔ واللہ اعلم بالصواب

چونکہ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس افشائے راز میں بھی رازداری سے کام لیا تھا، اس لیے حیران ہو کر پوچھنے لگیں کہ آپ ﷺ کو کیسے پتہ چل گیا؟ آپ ﷺ کو کس نے بتایا؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: مجھے اسی ذات نے خبر دی ہے، جو تمام باتوں کو جانتا ہے اور ہر بات سے پوری طرح باخبر ہے۔

[۶] سیدہ عائشہ اور حفصہ کی خطا۔ ۱۔ نبی کے لیے حلال کو حرام بنانے پر ایکا ۲۔ افشائے راز: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہا سے پوچھا: امیر المومنین! یہ دو عورتیں کون کون تھیں، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ستانے کے لیے ایکا کیا تھا؟ ابھی میں نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ انہوں نے کہہ دیا: "وہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں" (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۂ تحریم) ان پر اللہ کی طرف سے جو گرفت ہوئی اور کہا گیا کہ تم راہ راست سے ہٹ چکی ہو تو اس کی

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ

(سب نبی کے) مددگار ہیں اور ان کے علاوہ فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں(۴) کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی تمہیں طلاق دے دے[۷] تو اس کا پروردگار اسے تم سے بہتر[۸] بیویاں بدل دے جو

وجوہ دو تھیں کہ انہوں نے آپس میں باہمی رقابت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کو ایک ایسی بات پر مجبور کر دیا جو ان کے شایان شان نہ تھی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب بھی نازل ہوا اور اس کا سبب یہی دونوں بنی تھیں اور دوسری یہ کہ انہوں نے نبی کی راز کی بات کو افشا کر کے غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ وہ کسی عام آدمی کی بیویاں نہ تھیں بلکہ اس ہستی کی بیویاں تھیں جسے اللہ تعالیٰ نے انتہائی اہم ذمہ داری کے منصب پر مامور فرمایا تھا اور جسے ہر وقت کفار و مشرکین اور منافقین کے ساتھ ایک مسلسل جہاد سے سابقہ درپیش تھا۔ آپ ﷺ کے ہاں بے شمار ایسی راز کی باتیں ممکن تھیں کہ اگر وقت سے پہلے افشا ہو جاتیں تو اس کار عظیم کے مقصد کو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا جو آپ ﷺ کے ذمہ ڈالا گیا تھا۔ اور اس غلطی پر انہیں ٹوکا اس لیے گیا تھا کہ ازواج مطہرات، بلکہ معاشرہ کے تمام ذمہ دار افراد کی بیویوں کو رازوں کی حفاظت کی تربیت دی جائے۔

[۷] سیدہ عائشہ اور حفصہ پر عتاب:۔ ان دونوں ازواج مطہرات کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اگر توبہ کر لو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اور نبی کو ستانا چھوڑ دو۔ زوجین کے خانگی معاملات بعض دفعہ ابتداءً بالکل معمولی سے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ذرا باگ ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو نہایت خطرناک اور تباہ کن صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ خصوصاً عورت اگر کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو تو اس کو طبعاً اپنے باپ، بھائی اور خاندان پر ناز ہوتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہا عورت کی اس فطرت کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں سیدنا عمر رضی اللہ عنہا اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور کہنے لگے: بیٹی! کیا بات ہے تو رسول اللہ ﷺ سے سوال و جواب کرتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ سارا دن غصہ میں رہتے ہیں۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: واللہ! ہم تو سوال و جواب کرتی رہتی ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: خوب سمجھ لے اور میں تجھے اللہ کی سزا اور اس کے رسول ﷺ کے غصے سے ڈراتا ہوں۔ بیٹی! تو اس عورت کی وجہ سے دھوکا مت کھانا جو اپنے حسن و جمال اور رسول اللہ ﷺ کی محبت پر نازاں ہے اور اس سے ان کی مراد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تھی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۂ تحریم) اسی لئے ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایسا کر کے اسی طرح کی کارروائیاں اور مظاہرے کرتی رہیں تو اس سے اللہ کے رسول ﷺ کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود، اس کے فرشتے جبرئیل علیہ السلام اور نیک بخت ایماندار سب درجہ بدرجہ اس کے مددگار ہیں اور ان کے سامنے تمہاری کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

[۸] آپ کی ازواج کا خرچ کے سلسلہ میں آپ کو پریشان کرنا:۔ پہلے دو بیویوں (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی بات چل رہی تھی، اس آیت میں سب بیویوں کو خطاب کر کے ان پر عتاب کیا جا رہا ہے۔ ایک حلال چیز کو حرام قرار دینے کے معاملہ میں تو واقعی صرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کا تعلق تھا۔ لیکن ایک اور معاملہ بھی تھا۔ جس کا سب بیویوں سے تعلق تھا۔ وہ یہ تھا کہ فتوحات خیبر اور اموال غنائم سے مسلمانوں کی معاشی حالت آسودہ ہو گئی۔ تو آپ ﷺ کی سب ازواج مطہرات نے آپ ﷺ سے گھر کا خرچ زیادہ لینے کا مطالبہ کر دیا۔ اور اگر وہ آپ ﷺ کی بیویاں نہ ہوتیں بلکہ عام عورتیں ہوتیں تو ایسے مطالبہ میں ان کا کچھ قصور بھی نہ تھا اور اگر آپ چاہتے تو انہیں اموال غنائم سے اپنے گھروں میں زیادہ دے بھی سکتے تھے اور اللہ نے آپ کو ایسا اختیار دے بھی رکھا تھا۔ مگر چونکہ آپ ﷺ کو طبعاً فقر پسند تھا۔ لہٰذا بیویوں کا

مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبۡکَارًا ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا

مسلمان، مومن، اطاعت گزار[۹]، توبہ کرنے والی، عبادت گزار اور روزہ دار[۱۰] ہوں، خواہ وہ شوہر[۱۱] دیدہ ہو یا کنواریاں ہوں(۵) اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے

یہ مطالبہ آپ پر گراں گزرا۔ پھر بیویوں نے بھی اس بات کو صرف مطالبہ کی حد تک نہ رکھا بلکہ ایکا کر کے آپ سے بحث اور جھگڑا بھی کیا کرتی تھیں۔ اور بسا اوقات ایسی باہمی شکر رنجی میں پورا پورا دن گزر جاتا تھا۔ اسی کیفیت کا حال معلوم ہونے پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی کے ہاں گئے۔ اور انہیں سمجھایا اور کہا دیکھو تم اللہ کے رسول ﷺ سے جھگڑنا چھوڑ دو۔ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر اپنے آپ کو گمان کر کے اس کی ریس نہ کرو اور نہ اس معاملہ میں دوسروں کا ساتھ دو۔ اور اگر کوئی چیز خرچہ وغیرہ مطلوب ہو تو اس کا مطالبہ مجھ سے کر لو۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گئے اور انہیں بھی یہی بات سمجھائی کیونکہ وہ بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رشتہ دار تھیں تو انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ٹکا سا جواب دیا اور کہنے لگیں تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملات میں دخل دینے والے؟ پھر جب عمر رضی اللہ عنہ نے یہی بات رسول اللہ ﷺ کو بتائی تو آپ مسکرا دیئے۔ انہیں ایام میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حالات کا جائزہ لے کر اس خیال کا اظہار کیا تھا جو درج ذیل حدیث میں مذکور ہے۔ اور یہی اس آیت کا شان نزول ہے:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بیویاں اکٹھی مل کر آپ ﷺ سے لڑنے جھگڑنے لگیں تو میں نے انہیں کہا: "کچھ بعید نہیں کہ پیغمبر تم سب کو طلاق دے دے اور اس کا رب تم سے بہتر بیویاں بدل دے" اس وقت (جیسا میں نے کہا تھا ویسے ہی) یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

لیکن اس کے باوجود بھی جب ازواج مطہرات اپنے مطالبہ سے دستبردار نہ ہوئیں تو یہ رسول اللہ ﷺ پر اس قدر شاق گزرا کہ آپ ایک ماہ کے لیے اپنی سب بیویوں سے الگ ہو گئے اور ایک بالاخانے میں جا کر مقیم ہو گئے۔ یہی واقعہ، واقعہ ایلاء کہلاتا ہے۔ جو سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۲۸ اور ۲۹ کے حواشی میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

[۹] قَانِتَاتٌ۔ قنوت ایسی اطاعت کو کہتے ہیں جو پورے خشوع و خضوع یکسر توجہ اور دل کی رضامندی سے بجا لائی جائے۔ اور یہ اطاعت اللہ کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے رسول کی بھی (۳۳:۳۱) اور عورتوں کے لیے اپنے خاوندوں کی بھی (۴:۳۴) اور اس آیت میں تینوں کی ہی اطاعت مراد ہے۔

[۱۰] ﴿ سائح اور صائم میں فرق:۔ سَائِحَاتٌ۔ ساح الماء بمعنی پانی کا آوارہ پھرنا اور ساحۃ بمعنی فراخ جگہ اور ساحۃ الدار بمعنی گھر کا آنگن اور ساح بمعنی سیر و سیاحت کرنا یا کرتے پھرنا خواہ اس کا مقصد تفریح ہو یا کوئی اور ہو اور ان معنوں میں بھی قرآن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ (۹:۲) اس لحاظ سے سائح کے معنی محض سیر و سفر کرنے والا ہے۔ لیکن بعد میں یہ لفظ ایسے درویشوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو چلتے پھرتے تھے۔ روزہ بھی رکھتے تھے اور جملہ حکمی پابندیوں کو بھی ملحوظ رکھتے تھے پھر یہ الفاظ ایسے روزہ داروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو کھانے پینے کی بندش کے علاوہ اپنے جوارح یعنی آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کو معاصی سے بچائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور صاحب منجد کے نزدیک ایسے روزہ دار کو کہتے ہیں جو زیادہ تر مسجد میں رہے۔ جبکہ صائم ہر روزہ دار کو کہہ سکتے ہیں۔

[۱۱] یعنی ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ کہیں اس زعم میں مبتلا نہ ہو جانا کہ آخر مرد کو بیویوں کی ضرورت تو ہوتی ہی

أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا

گھر والوں[۱۲] کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر[۱۳] ہیں۔ اس پر تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہیں۔ اللہ انہیں جو حکم دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے[۱۴] اور وہی کچھ کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔(۶) (اس دن اللہ کافروں سے فرمائے گا) اے کافرو! آج بہانے[۱۵] مت بناؤ۔

ہے اور ہم سے بہتر عورتیں کہاں ہیں اس لیے ہم اگر دباؤ ڈالیں گی تو سب باتیں منظور کرلی جائیں گی۔ یاد رکھو کہ اگر اللہ چاہے تو تم سے بہتر بیویاں اپنے نبی کو مہیا کردے اور تمہیں رخصت کردیا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ازواج مطہرات میں مذکورہ صفات موجود نہ تھیں۔ بلکہ یہ ہے کہ نبی کی بیویوں میں یہ صفات بدرجہ اتم ہونا چاہئیں اور ازواج مطہرات کا یہ مطالبہ صفت قانتات میں تقصیر ہونے کی وجہ سے تھا۔

[۱۲] یعنی مسلمانوں کو محض اپنی ذات کی اصلاح پر ہی اکتفا نہ کرلینا چاہیے بلکہ اہل و عیال پر بھی اتنی ہی توجہ دینا چاہیے اور اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی دین کی راہ پر چلانا چاہیے اور اس کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرنا چاہیے۔ ڈرا کر سمجھا کر، پیار سے، دھمکی سے، مار سے جس طرح بھی بن پڑے۔ انہیں اس راہ پر لانے کی کوشش کرے۔ اس کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص راعی (نگہبان) ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی (کہ اس نے ان کی اصلاح کیوں نہ کی تھی) امام بھی راعی ہے، اسے اپنی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے، اسے اپنی رعیت سے متعلق پوچھا جائے گا، عورت اپنے خاوند کے گھر کی راعی ہے، اسے اس کے متعلق پوچھا جائے گا (بخاری۔ کتاب الوصایا۔ باب قوله تعالى من بعد وصية.........) اس لحاظ سے ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کی بھی اصلاح کرے ورنہ اس سے باز پرس ہوگی۔

[۱۳] پتھر سے مراد وہ پتھروں کے بت بھی ہیں جن کی مشرک دنیا میں پوجا کرتے رہے ہیں۔ تاکہ مشرکوں کی حسرت و یاس میں مزید اضافہ ہو اور پتھری کوئلہ بھی جس میں آگ کی حرارت کی شدت عام کوئلہ سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے اور گندھک اور گندھک ملے دوسرے تمام جمادات اور پتھروں کی قسم کے شعلہ گیر مادے بھی۔ جو آگ کی حرارت میں شدت پیدا کردیتے ہیں۔

[۱۴] جہنم پر مقرر کردہ فرشتوں کی تین صفات مذکور ہوئیں ایک یہ کہ وہ سخت دل ہیں، انہیں کسی پر رحم نہیں آئے گا۔ دوسرے سخت گیر ہیں، جو عذاب دیں گے، پوری سختی اور قوت کے ساتھ دیں گے۔ تیسرے وہ دوزخیوں کی چیخ و پکار اور التجاؤں کا کوئی اثر قبول نہ کریں گے، بلکہ وہی کچھ کریں گے جو اللہ کی طرف سے انہیں حکم ملا ہوگا۔

[۱۵] یعنی آج نہ تمہاری بہانہ سازی کام آئے گی اور نہ کسی قسم کی معذرت قبول کی جائے گی۔ اس لئے کہ اللہ تو تمہارے دلوں کے خیالات تک سے واقف ہے۔ لہٰذا آج تمہارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جو کچھ تم کرتے رہے آج اس کی سزا بھگتو۔

ع ۱۹ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ
يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَهُ ۖ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ

تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے۔(۷)

اے ایمان والو! اللہ کے حضور خالص[۱۶] توبہ کرو کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیاں دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ اس دن اللہ اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا[۱۷] نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں جانب[۱۸] دوڑ رہا ہوگا (اور) وہ کہہ رہے ہوں گے: "اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے ہمارا نور[۱۹] پورا کر دے

[۱۶] توبہ کی شرائط: نَصُوحًا۔ نصح بمعنی کسی کی خیر خواہی کرنا خواہ یہ قول سے ہو یا فعل سے اور نَصُوحًا سے مراد ایسی سچی توبہ ہے جس سے اپنے نفس کی خیر خواہی مطلوب ہو۔ اور ایسی توبہ کی چند شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے کیے پر نادم ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے حضور مغفرت طلب کرے اور آئندہ وہ کام نہ کرنے کا عہد کرے۔ تیسرے یہ کہ یہ عہد محض زبانی یا ریاکاری کی بنا پر نہ ہو بلکہ آئندہ اس عہد کو حتی الامکان نباہنے کی کوشش کرے اور چوتھے یہ کہ اگر اس نے اس گناہ کے کام میں کسی شخص کا حق تلف کیا ہے تو اسے اس کی ادائیگی کرے یا اس سے معاف کرالے۔ اگر وہ حق مال سے تعلق رکھتا ہے تو اصل مظلوم مر چکا ہے تو اس کے وارثوں کو ادا کردے یا صدقہ کردے۔ اور اگر وہ حق تلفی قول سے تعلق رکھتی ہے جیسے غیبت یا چغلی وغیرہ تو اس کے حق میں دعائے مغفرت کرتا رہے۔ وغیر ذلک۔

[۱۷] رسوائی سے مراد عذاب جہنم سے بچالینا ہے۔ کیونکہ اس دن یہی سب سے بڑی رسوائی ہوگی۔ اس کے بجائے اللہ ایسے لوگوں کو فضل و شرف کے بلند مقامات پر سرفراز فرمائے گا۔

[۱۸] اس نور کی تفصیل پہلے سورۂ حدید کی آیت نمبر ۱۳ کے تحت گزر چکی ہے۔

[۱۹] قیامت کے دن منافقوں کی مومنوں سے التجا کہ ہمیں ساتھ لے چلو: یہ نور اہل ایمان کو اس وقت عطا کیا جائے گا جب میدان محشر میں لوگوں کے اعمال کا فیصلہ ہو چکا ہو گا اور انہیں جنت میں داخلہ کا ٹکٹ یا پروانہ مل چکا ہو گا۔ میدان محشر سے جنت کی راہ میں سخت تاریکی ہوگی، پھر پل صراط کو بھی عبور کرنا ہو گا۔ اہل ایمان اپنے اس عطا کردہ نور کی روشنی میں آگے بڑھتے جائیں گے۔ منافق بھی اس کے ساتھ چل پڑیں گے لیکن ان کا اپنا نور تو ہوگا نہیں یا اگر تھوڑا بہت ہوگا بھی تو بہت جلد بجھ جائیگا۔ انہیں دیکھ کر اہل ایمان کو یہ اندیشہ لاحق ہو گا کہ کہیں ان کا نور بھی راہ میں ہی نہ بجھ جائے۔ لہٰذا وہ اللہ سے دعا کریں گے کہ اے پروردگار! جنت میں پہنچنے تک ہمارا یہ نور برقرار اور بحال رکھنا۔ اور ہم سے جو گناہ یا تقصیرات سرزد ہوئی ہیں وہ معاف فرمادے۔

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۸﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۹﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۚ كَانَتَا تَحْتَ
عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا
النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ

اور ہمیں بخش دے یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے" (۸)

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ ان کی پناہ گاہ جہنم [۲۰] ہے جو بہت بُرا ٹھکانا ہے (۹) اللہ کافروں کیلئے نوح اور لوط کی بیویوں کو بطور مثال بیان کرتا ہے۔ وہ دونوں ہمارے بندوں میں سے صالح بندوں کے نکاح میں تھیں مگر انہوں نے اپنے شوہروں [۲۱] سے خیانت کی تو وہ اللہ کے مقابلہ میں اپنی بیویوں کے کچھ بھی کام نہ آسکے [۲۲]۔ اور ان سے کہہ دیا گیا کہ: جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی اس میں داخل ہو جاؤ۔ (۱۰) نیز اللہ

[۲۰] اس آیت کے پورے پورے الفاظ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۷۳، جیسے ہی ہیں۔ لہٰذا اس کی تشریح سورۂ توبہ کے حاشیہ نمبر ۸۸ کے تحت ملاحظہ کی جائے۔

[۲۱] یہ خیانت نہ مال کی خیانت تھی اور نہ عصمت کی کیونکہ حدیث میں یہ صراحت موجود ہے کہ کسی نبی کی کوئی بیوی کبھی بدکاری کی مرتکب نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ ایمان اور اس کے تقاضوں کی خیانت تھی۔ نبیوں کی راہ اور تھی اور ان بیویوں کی راہ دوسری تھی۔ سیدنا نوح کی بیوی بھی کافر تھی اور اپنے خاوند یعنی سیدنا نوح کو دیوانہ سمجھتی اور کہتی تھی۔ سیدنا لوط کی بیوی کی بھی ساری ہمدردیاں اپنے خاوند کے بجائے کافروں کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ وہ انہی کی قوم سے تھی۔ جب کوئی مہمان گھر میں آتا تو وہ اپنے ہمسایوں کو مخبری کر دیتی تھی۔

[۲۲] یعنی نہ تو ان عورتوں کو پیغمبروں کی بیوی ہونا یا پیغمبروں کی صحبت میں رہنا کچھ فائدہ دے سکا۔ اور نہ ہی پیغمبر انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔ سیدنا نوح کی بیوی بھی غرق ہونے والوں کے ساتھ ڈوب کر مر گئی اور سیدنا لوط کی بیوی بھی قوم کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوئی۔ یہ تو ان کا دنیا میں انجام ہوا۔ آخرت میں بھی یہ پیغمبر اپنی بیویوں کو اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر صحیح ایمان نہ ہو تو قریبی سے قریبی رشتے بھی نہ دنیا میں کام آسکتے ہیں اور نہ آخرت میں۔ نبوت زادگی یا سید زادگی کوئی ایسا شرف نہیں جس پر تکیہ یا ناز کیا جاسکے۔ اور یہ مرض اہل کتاب میں عام تھا اور مسلمانوں میں بھی موجود ہے۔

[۲۳] سیدہ مریم علیہا السلام اور سیدہ آسیہ زوجہ فرعون کی فضیلت:۔ یہ فرعون کی وہی بیوی آسیہ تھی جس نے فرعون کو کہا تھا کہ دیکھو یہ (سیدنا موسیٰ) کتنا پیارا بچہ ہے۔ کیوں نہ ہم اس کی تربیت کریں اور اسے اپنا بچہ بنالیں۔ پھر اس کی تربیت بھی کی تھی۔ وہ سیدنا موسیٰ پر ایمان لاچکی تھی۔ جب فرعون پر اس کے ایمان کا حال کھلا تو اسے طرح طرح کی ایذائیں پہنچانے لگا۔ پھر جب آسیہ اپنے ایمان پر قائم رہی تو اس نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ اسے مروا ڈالے۔ اس وقت اس نے پروردگار سے دعا کی کہ مجھے اب ان

لِى عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾

میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور ان ظالموں سے بھی نجات دے۔(۱۱)

اور مریم بنت عمران کی (بھی مثال پیش کرتا ہے) جس نے اپنی عصمت[۲۴] کی حفاظت کی تھی۔ پھر ہم نے اس کے اندر اپنی ایک روح[۲۵] پھونک دی اور اس نے اپنے پروردگار کے کلموں[۲۶] کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ عبادت میں ہمہ تن مصروف[۲۷] رہنے والوں سے تھی۔(۱۲)

ظالموں سے نجات عطا فرما۔ اور مجھے اپنے پاس بلا لے اور جنت میں میرے رہنے کو ایک گھر بنادے۔ اس کی یہ دعا قبول ہوگئی اور موت آنے سے پہلے ہی سکرات موت میں اللہ نے اسے جنت میں اس کا محل دکھادیا۔ اور سیدنا ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "مردوں میں تو بہت سے لوگ کامل گزرے ہیں مگر عورتوں میں مریم بنت عمران اور آسیہ فرعون کی بیوی کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی۔ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت دوسری عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت دوسرے کھانوں پر" (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا)

[۲۴] یعنی ان کا کوئی شوہر بھی نہیں تھا۔ گویا سیدہ مریم نے حلال اور حرام دونوں صورتوں سے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا اور پاکدامن رہیں۔

[۲۵] یعنی فرشتہ کے ذریعہ ایک روح پھونک دی۔ سیدنا جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے گریبان میں پھونک ماری جس کا نتیجہ استقرار حمل ہوا۔ اسی حمل سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ سورہ مریم کے دوسرے رکوع میں یہ قصہ بڑی تفصیل سے گزر چکا ہے۔

[۲۶] اس سے مراد وہ کلمات ہیں، جو فرشتوں نے سیدہ مریم سے کہے تھے۔ فرشتوں اور سیدہ مریم میں ہم کلامی کی یہ تفصیل پہلے سورۂ آل عمران کے پانچویں رکوع میں گزر چکی ہے۔ گویا اللہ نے انہیں جس کڑی آزمائش میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس کے آگے انہوں نے سرتسلیم خم کر دیا۔ اور اسی وجہ سے انہیں یہ عظیم مرتبہ ملا تھا۔ اور اللہ کی کتابوں سے مراد تورات بھی ہو سکتی ہے اور انجیل بھی اور سابقہ صحیفے بھی۔ گویا سیدہ مریم نے ان سب کتابوں کی تصدیق کی تھی۔

[۲۷] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ سیدہ مریم اللہ کی اطاعت و عبادت پورے خشوع و خضوع، کامل توجہ اور دل کی رضامندی کے ساتھ بجالاتی تھیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان کا سارا خاندان ہی ایسا تھا جس سے وہ تعلق رکھتی تھیں۔

سُورَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ ۳۰ آیاتها رکوعها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۨ ۙ ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ

کلمات ۳۳۵ آیات ۳۰ (۶۷) سورۃ الملک[1] مکی ہے (۷۷) رکوع ۲ حروف ۱۳۵۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

بابرکت[2] ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت[3] ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے(۱) جس نے موت[4]

[۱] سورہ الملک کی فضیلت:۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن میں ایک تیس آیتوں والی سورت ہے۔ اس سورت نے ایک آدمی کی شفاعت کی تاآنکہ اسے بخش دیا گیا اور وہ سورت ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ ہے۔ (ترمذی۔ ابواب فضائل القرآن۔ باب ماجاء فی سورۃ الملک)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت تک سوتے نہ تھے جب تک سورۃ الٓمّ تَنْزِيْلُ اور ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ پڑھ نہ لیتے۔ (ترمذی۔ ایضاً)

[۲] تبارک کا لغوی مفہوم:۔ تَبٰرَكَ برکت کے معنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کا ثابت ہونا ہے (مفردات) یعنی جو کام کیا جائے اس میں متوقع زیادہ سے زیادہ فائدہ ہونے کا نام برکت ہے۔ بشرطیکہ یہ کام خیر کا پہلو رکھتا ہو اور جس چیز میں یہ خیر کا پہلو بار آور ثابت ہو وہ مبارک ہے۔ اور تبٰرك کا لفظ اللہ تعالیٰ سے مختص ہے اور صرف ان خیر کے کاموں کے لیے آتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہیں۔ اس آیت میں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر ایک چیز کو جس بہتر مقصد کے لیے پیدا فرمایا تھا وہ چونکہ بدرجہ اتم وہ مقصد پورا کر رہی ہے لہٰذا اللہ کی ذات تبارك یعنی بابرکت ہوئی۔

[۳] الْمُلْكُ یعنی کائنات کی ہر چیز پر مکمل بادشاہت، حکومت اور اختیار۔ اور ایسی قدرت کہ کوئی چیز بھی اللہ کے حکم کے سامنے دم نہیں مار سکتی۔

[۴] موت ایک ایجابی چیز ہے جسے اللہ نے پہلے پیدا کیا تھا:۔ اللہ تعالیٰ نے موت کا نام زندگی سے پہلے لیا کہ اس نے موت کو بھی پیدا کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ موت محض ایک سلبی چیز نہیں بلکہ ایجابی چیز ہے۔ اور اس سے معتزلہ کے اس قول کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ زندگی نہ ہونے کا نام ہی موت ہے۔ جبکہ اصل حقیقت یہ ہے موت روح اور جسم کے انفصال کا نام ہے اور زندگی ان دونوں کے اتصال کا۔ دنیوی زندگی سے پہلے موت سے مراد وہ دور ہے جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد ان تمام روحوں کو بھی پیدا فرمایا جو ان کی پشت سے تاقیامت پیدا ہونے والی تھیں۔ عہد الست اسی دور سے متعلق ہے۔ (۷:۱۷۲) اور یہ دور روح کی پیدائش سے لے کر اس کے شکم مادر میں جنین کے جسم میں داخل ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔

الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ

اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے[۵] اور وہ ہر چیز پر غالب بھی ہے اور بخش دینے والا بھی (۲) اسی نے سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کیے[۶]۔

[۵] دنیا میں امتحان اور آخرت میں نتائج:۔ گویا اللہ نے کائنات کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے ہی انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کا سامان مہیا کر دیا جائے۔ پھر انسان کو پیدا کیا اور اس کی موت و حیات کا سلسلہ قائم کیا اسے قوت ارادہ و اختیار اور عقل و تمیز عطا کی کہ دیکھا جائے کہ کون کائنات کی دوسری اشیاء کی طرح اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ اگر سر تسلیم خم کرلے تو یہی اس کے لیے بہتر روش ہے اور اس کے اعمال اچھے ہوں گے اور انکار کی صورت میں اس کے اعمال بھی برے اور بدلہ بھی برا ملے گا۔ گویا یہ دنیا ہر انسان کے لیے دار الامتحان ہے اور اس امتحان کا وقت انسان کی موت تک ہے۔ موت سے لے کر بعث بعد الموت تک کا عرصہ امتحان کے نتائج کے انتظار کا عرصہ ہے۔ تاہم ہر ایک کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس امتحان میں فیل ہونے والا ہے یا پاس اور اسی کے مطابق اسے اس عرصہ میں کوفت یا راحت بھی پہنچتی رہتی ہے اور قیامت کو اس امتحان کے نتائج کا باقاعدہ اعلان ہوگا۔ نمبر نہایت انصاف کے ساتھ دیئے جائیں گے۔ پھر ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا بھی ملے گی۔

[۶] سات آسمان اور ان کی کیفیت:۔ موجودہ ہیئت دانوں کے نظریہ کے مطابق آسمان کوئی چیز نہیں۔ فقط حد نگاہ کا نام ہے اور یہ جو نیلگوں چھت ہمارے سروں پر سایہ کیے ہوئے اور جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ تو اس کی یہ رنگت محض فضا کا رنگ ہے جو ہمارے چاروں طرف محیط ہے۔ جبکہ کتاب و سنت سے ہمیں یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ آسمان ٹھوس حقیقت کا نام ہے۔ ان کی تعداد سات ہے اور ان میں دروازے بھی ہیں۔ پھر یہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے کے اوپر تیسرا علیٰ ہذا القیاس۔ یہ تہ بہ تہ بھی ہیں اور پوری مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ جیسے طبقات الارض یا پیاز کے چھلکے ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ ہوتے ہیں اور مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ طبقات الارض یا پیاز کے چھلکوں کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا جبکہ ہر آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان طول طویل فاصلہ بھی ہے۔ ایک آسمان تو وہ ہے جس پر ہم کھلی آنکھ سے بغیر دوربین کے ہر روز رات کو ستارے جگمگاتے دیکھتے ہیں۔ یہی آسمان ہم سے قریب ہے۔ یہ پہلا آسمان ہے اور اسے ہی قرآن میں دنیا کہا گیا ہے۔ اس کے آگے وہ آسمان ہے جس کے سیارے دوربین کی مدد سے ملاحظہ کیے جاتے ہیں۔ اور اس کے آگے پانچ آسمان ایسے ہیں جن تک دوربینوں کے ذریعہ سے بھی انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور ہیئت دانوں کے عجز کا یہ حال ہے جوں جوں وہ جدید قسم کی اور طاقتور دوربینیں ایجاد کر رہے ہیں تاکہ اس کائنات کی پنہائی اور وسعت کا کچھ اندازہ کر سکیں، کائنات اسی قدر مزید وسیع نظر آنے لگتی ہے۔ کائنات میں بھی وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اکثر سیاروں کے درمیانی فاصلے بھی بڑھ رہے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہیئت دان ورطہ حیرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ دراصل آسمانوں یا پوری کائنات کا احاطہ کرنا انسان کے بس کا روگ ہی نہیں۔ ان آسمانوں تک اگر موجودہ دنیا میں سے کسی کی رسائی ہوئی تو وہ فقط رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی قدرت کاملہ کی وجہ سے ہوئی تھی۔

طِبَاقًا ۖ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ﴿٣﴾ ثُمَّ ارْجِعِ
الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ﴿٤﴾ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا
بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ﴿٥﴾ وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا
بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٦﴾ إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ ﴿٧﴾

تم رحمٰن کی پیدا کردہ چیزوں میں کوئی بے ربطی[۷] نہ دیکھو گے۔ ذرا دوبارہ (آسمان کی طرف) دیکھو، کیا تمہیں اس میں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ (۳) پھر اسے بار بار دیکھو۔ تمہاری نگاہ تھک کر ناکام[۸] پلٹ آئے گی۔ (۴)

نیز ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے سجا دیا ہے اور ان چراغوں (ستاروں) کو شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ[۹] بنا دیا ہے اور ان کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے (۵) اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار[۱۰] کا انکار کیا، ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے (۶) جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے[۱۱] کی آواز سنیں گے اور وہ اچھل[۱۲] رہی ہو گی۔ (۷)

[۷] ❁ تفاوت کا لغوی معنی:۔ تفاوت۔ فات بمعنی کسی چیز کا انسان کی دسترس سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لئے دشوار ہو اور تفاوت بمعنی دو چیزوں کے اوصاف اس طرح مختلف ہونا کہ ان میں سے ہر ایک کا وصف دوسری چیز کے وصف کو فوت کر رہا ہو۔ یعنی دو چیزوں کا آپس میں بے ربط، بے جوڑ ہونا۔ آپس میں لگانہ کھانا اور ان میں عدم تناسب ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس کائنات میں جو چیز بھی پیدا کی ہے کسی کا مقصد دوسرے سے نہ ٹکراتا ہے اور نہ بے جوڑ اور بے ربط ہے۔

❁ کائنات کا مربوط اور منظم نظام:۔ بلکہ ہر چیز اپنے مقصد میں دوسری چیزوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ تعاون کر رہی ہے اور مربوط و منظم ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو اس کائنات کا نظام چل ہی نہ سکتا تھا۔ جاندار مخلوق کا اس زمین پر زندہ رہنا تو دور کی بات ہے۔ اسی ہم آہنگی اور عدم تفاوت سے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہی ہو سکتا ہے۔ پھر اس میں تصرف بھی صرف اسی اکیلے کا چل رہا ہے اور ایسی ذات کا علیم و حکیم ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔

[۸] یعنی انسان کو بار بار اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم اللہ کی ہستی، اس کے تصرف اور اس کے علیم و حکیم ہونے میں کچھ شک رکھتے ہو تو بتاؤ کہ اس کائنات کے نظام میں فلاں نقص باقی رہ گیا ہے۔ بار بار آسمانوں کی طرف نظر دوڑاؤ اور غور و فکر کر کے اس نظام میں کوئی عیب تلاش کرنے کی کوشش کرو تم دیکھ دیکھ کر اور غور و فکر کر کر کے عاجز رہ جاؤ گے مگر تمہیں ایسا کوئی عیب یا نقص نظر نہیں آئے گا۔

[۹] اس کی تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ حجر کی آیت نمبر ۱۷ پر حاشیہ نمبر ۹

[۱۰] یعنی جہنم کا عذاب ان شیطانوں کے لئے بھی ہے جو ملاء اعلیٰ کی باتیں چوری چھپے سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہاں پہنچنے سے پہلے شہاب ثاقب کی زد میں آ جاتے ہیں اور ان کافروں کے لئے بھی جو اللہ کی آیات سے اور ان کی تعمیل سے انکار کر دیتے ہیں۔

[۱۱] شَهِيقًا۔ زفیر اور شہیق گدھے کے ہینگنے کے وقت اس آواز کی ابتدائی اور آخری حالت کا نام ہے۔ زفر بمعنی لمبا سانس باہر

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ﴿٨﴾ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ
جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ﴿٩﴾ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا
نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١٠﴾ فَاعْتَرَفُوا بِذَنْبِهِمْ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١١﴾
إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١٢﴾ وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا

ایسا معلوم ہوگا کہ غصہ کی وجہ سے پھٹ پڑے گی۔ جب بھی اس میں کوئی گروہ پھینکا جائے گا تو دوزخ کے محافظ ان سے پوچھیں گے: "کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا؟ (۸) وہ کہیں گے: "کیوں نہیں، ڈرانے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا: "اللہ نے تو کچھ نہیں اتارا، تم ہی بڑی گمراہی میں پڑے [۱۳] ہوئے ہو" (۹) پھر کہیں گے: "کاش ہم (اس کی بات) سن لیتے یا سمجھتے تو ہم (آج) اہل دوزخ میں شامل نہ ہوتے" (۱۰) گویا وہ اپنے گناہ [۱۴] کا اعتراف کر لیں گے، لعنت ہو اہل دوزخ پر (۱۱) جو لوگ بن دیکھے اپنے پروردگار [۱۵] سے ڈرتے ہیں ان کیلئے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے (۱۲) اور تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے

نکالنا اور زفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی آواز جو آہستہ سے اونچی ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جب گدھا ہینگنے کے عمل کو ختم کرنے لگے تو وہ آواز جو اونچی آواز سے پست ہونا شروع ہوتی ہے اسے شَہِیْق کہتے ہیں۔ پھر یہ گدھے کی آواز قرآن کی تصریح کے مطابق سب سے زیادہ مکروہ اور کانوں کو ناگوار محسوس ہونے والی ہوتی ہے۔ ایسی ہی مکروہ آواز دوزخ کی پیدا ہو رہی ہو گی۔ پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی آواز جہنم کے جوش مارنے سے پیدا ہو گی۔ دوسرے یہ کہ دوزخ میں جو لوگ پہلے پڑے ہوں گے۔ وہ اس قسم کی مکروہ آوازیں نکالیں گے۔

[۱۲] ❁ تفور کا لغوی مفہوم:۔ تَفُوْرُ۔ فار الماء بمعنی پانی کا جوش مارنا اور ابلنا۔ اور اس جوش مارنے یا ابلنے کی وجہ حرارت کی شدت نہیں ہوتی بلکہ پانی کا دباؤ ہوتا ہے۔ نیچے سے پانی کا دباؤ زیادہ ہو اور سوراخ تنگ ہو تو پانی بڑے جوش سے اوپر کو اچھلتا ہے۔ لفظ فوارہ اسی سے مشتق ہے۔

[۱۳] یہ بڑی گمراہی کیا تھی؟ یہی بعث بعد الموت کا عقیدہ۔ کافر اسے ہی سب سے بڑی گمراہی سمجھتے تھے۔ کہ آج تک تو کوئی شخص مر کر واپس آیا نہیں۔ پھر ہم اس بات کو کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں؟

[۱۴] یہاں گناہ کا لفظ واحد استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ ان کی ساری کی ساری زندگی گناہوں سے لبریز تھی۔ اس لیے کہ اللہ کی آیات سے انکار اور جھٹلانا یہ ایک گناہ باقی سارے گناہوں کی جڑ ہے۔ باقی سب گناہ اسی ایک بڑے گناہ کی شاخیں ہیں۔

[۱۵] ❁ ایمان بالغیب کے علاوہ کوئی بنیاد انسان کو گناہوں سے باز رکھ سکتی ہے نہ اخلاق فاضلہ پیدا کر سکتی ہے:۔ اللہ سے بن دیکھے ڈرنا ہی وہ بنیاد ہے جس پر انسان کے اخلاق فاضلہ کی تعمیر اٹھتی ہے اور اخلاقی لحاظ سے اس کی زندگی سنورتی ہے۔ اس بنیاد کے علاوہ جتنی بھی بنیادیں ہیں وہ سب کمزور اور ناپائیدار ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ وہ خود کسی برائی کو برائی سمجھتا ہو۔ دوسری یہ کہ لوگ اس کام کو برا سمجھتے ہوں۔ تیسری یہ کہ اس کام کے معاشرہ کے دوسرے افراد پر برے اثرات پڑتے ہوں اور چوتھے یہ کہ وہ کام حکومت کے

بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ
لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ

وہ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے۔(۱۳) بھلا وہ نہ جانے گا جس نے (سب کو) پیدا کیا[۱۶] ہے؟ وہ تو باریک بین[۱۷] اور ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے (۱۴) وہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع[۱۸] کر رکھا ہے اس کی اطراف میں چلو پھرو اور اللہ کا رزق کھاؤ اور اسی کے پاس تمہیں[۱۹] زندہ ہو کر جانا ہے (۱۵) کیا تم اس سے نڈر ہو گئے جو

قانون کے مطابق قابل مواخذہ برائی ہو۔ ان میں سے کوئی بھی بنیاد ایسی نہیں جو ایک انسان کو شریف اور بااخلاق بنا سکتی ہو۔ نہ لوگ اسے ہر وقت دیکھ رہے ہوتے ہیں اور نہ حکومت۔ لہٰذا جب اس کے ذاتی مفاد کا مسئلہ ہو تو انسان لوگوں کی یا قانون کی گرفت سے بچنے کی ہزاروں راہیں تلاش کر لیتا ہے۔ انسان کو اگر کوئی چیز گناہوں سے باز رکھ سکتی ہے تو وہ یہی عقیدہ ہے کہ اللہ اسے ہر حال میں دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے دل کے خیالات تک سے واقف ہے۔ پھر وہ اس سے باز پرس کرنے اور سزا دینے کی پوری قدرت بھی رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی خود بخود سنورنے لگتی ہے۔ چھوٹے موٹے گناہ اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا پھر اس کے لئے ایسے لوگوں کو جنت بھی عطا فرمائے گا۔

[۱۶] یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص کسی چیز کو پیدا کرتا یا بناتا یا وجود میں لاتا ہے۔ جتنا وہ اس چیز سے واقف ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر وہ انسان کے افعال و اعمال حتیٰ کہ اس کے دل کے ارادوں سے ناواقف اور بے خبر کیسے رہ سکتا ہے۔ اس کا دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا اللہ کو یہ بھی علم نہیں کہ اس نے کون کون سی چیزیں پیدا کی ہیں؟

[۱۷] ❁ لطیف کا لغوی مفہوم:۔ لطیف۔ لطف کے معنی میں دو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں، (۱) رقت نظر اور (۲) نرمی۔ اور لطیف کے معنی میں کبھی صرف ایک ہی بات یعنی رقت نظر یا باریک بینی یا راز اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے آگاہی پائی جاتی ہے۔ اور کبھی دونوں باتیں پائی جاتی ہیں یعنی مخلوق کی چھوٹی چھوٹی تکالیف کا علم رکھنا اور پھر از راہ مہربانی ان کا ازالہ کرتے رہنا۔

[۱۸] ذَلُوْلٌ۔ ذل بمعنی کمزور اور زبردست ہونا اور ذلول بمعنی کسی چیز کا طوعاً اپنی سرکشی کو چھوڑ کر مطیع و منقاد ہو جانا ہے اور یہ لفظ انسان کا اپنی محنت سے کسی چیز کو اپنا تابع فرمان بنانے اور اس چیز کے تابع فرمان بن جانے کے پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم زمین میں محنت کر کے جیسے فائدے اس سے حاصل کرنا چاہتے ہو کر سکتے ہو۔ اس میں کھیتی باڑی کر سکتے ہو۔ اس سے معدنیات اور دوسرے زمین میں مدفون خزانے نکال سکتے ہو اس میں سفر کر کے تجارتی فوائد حاصل کر سکتے ہو۔

[۱۹] ❁ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل:۔ یعنی زمین سے تم جتنے فائدے اٹھا سکتے ہو اٹھاؤ۔ لیکن یہ بات تمہیں ہر وقت ملحوظ رکھنی چاہئے کہ تم مرنے کے بعد اللہ کے حضور پیش ہونے والے ہو لہٰذا زمین سے فائدے اٹھاتے ہوئے تمہیں دوسروں کی حق تلفی نہ کرنا چاہیے۔

فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ
أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿١٨﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ
إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ﴿١٩﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَٰنِ

آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے پھر وہ یکایک لرزنے لگے (١٦) یا اس سے نڈر ہو گئے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے پھر فوراً تمہیں معلوم ہو جائے کہ میرا ڈرانا کیسا ہوتا ہے۔ (١٧) ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں پھر (دیکھ لو) میری گرفت کیسی تھی؟ (١٨) کیا انہوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا کہ وہ کیسے اپنے پر کھولتے اور بند کر لیتے ہیں۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں ہے جو انہیں تھامے[٢١] رکھے۔ وہ یقیناً ہر چیز کو دیکھ رہا ہے (١٩) بھلا وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا؟

[٢٠] آسمان میں کون ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ذات۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے اس میں محنت کرو اور جو جو فائدے اس سے اٹھا سکتے ہو اٹھاؤ مگر اس ذات سے بے خوف نہ ہو جانا جو تمہاری اور ان سب اشیاء کی خالق و مالک ہے۔ اسے ہر دم یاد رکھنا۔ یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی جگہ زمین کھود رہے ہو یا کان کنی میں مصروف ہو تو اس میں دھنستے ہی چلے جاؤ۔ یا زمین میں زلزلہ آ جائے۔ زمین پھٹ جائے اور تم اس میں غرق ہو جاؤ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم پر ایسی سخت آندھی بھیج دے جس میں پتھر کنکر ہوں۔ اور وہ تمہارا استیاناس کر دیں۔ لہٰذا زمین سے اللہ کی نعمتیں حاصل کرو تو اس کا شکر بھی بجا لایا کرو اور اگر تم ناشکری کرو گے اور اکڑ دکھاؤ گے تو تمہارا بھی وہ انجام ہو سکتا ہے جس سے سابقہ قومیں دوچار ہوئی تھیں۔

[٢١] صٰفّٰت۔ صفّ یعنی صف بنانا، سیدھی قطار بنانا اور صفّ بمعنی ہر شے کی سیدھی قطار اور صفّ الطیر بمعنی پرندوں نے اپنی اڑان میں اپنے پروں کو قطار کی طرح سیدھا کر دیا۔ نیز اس کا معنی پرندوں کا اپنے پروں کو ہوا میں پھیلا دینا اور بالکل بے حرکت بنا دینا بھی ہے۔ جبکہ سب ایک ہی حالت میں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ پرندے ہوا میں اڑتے ہوئے کبھی اپنے پر پھیلا بھی دیتے ہیں اور کبھی سکیڑ بھی لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہوا سے وزنی اجسام ہیں لیکن پھر بھی زمین پر گر نہیں پڑتے۔ نہ ہی زمین کی کشش ثقل انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ہوا جو ایک کاغذ کا بھی بوجھ برداشت نہیں کرتی اور وہ بھی آہستہ آہستہ زمین پر آ گرتا ہے۔ تو پرندوں کے وزنی اجسام کو ہوا میں کون تھامے رکھتا ہے اور زمین پر گرنے نہیں دیتا۔ آخر ان کو ہوا میں تیرتے پھرنے کا یہ طریقہ کس نے سکھایا ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے پرندوں کے جسم کی ساخت ہی ایسی بنا دی ہے کہ وہ بے تکلف ہوا میں اڑ بھی سکتے ہیں اور ٹھہر بھی سکتے ہیں۔ پر کھول کر بھی اور پر بند کر کے بھی۔ پھر انسان نے یہی اصول دریافت کر کے ہوائی جہاز ایجاد کیا جس کی شکل تک پرندوں سے ملتی جلتی ہے۔ اور وہ اپنے پر کھول بھی لیتے ہیں اور بند بھی کر لیتے ہیں۔

إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ﴿٢٠﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي
عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾ أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٢﴾ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ

یہ کافر تو محض دھوکہ [۲۲] میں پڑے ہوئے ہیں (۲۰) یا اگر وہ (اللہ) تمہارا رزق روک لے تو کون ہے جو تمہیں رزق [۲۳] دے گا؟ بلکہ یہ لوگ سرکشی اور نفرت کی گہرائی تک [۲۴] چلے گئے ہیں۔(۲۱)

بھلا جو شخص اپنے منہ کے بل اوندھا ہو کر چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سیدھا کھڑا ہو کر راہ راست [۲۵] پر چل رہا ہو؟(۲۲) آپ ان سے کہیے کہ: "اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے کان، آنکھیں [۲۶] اور دل بنائے

[۲۲] کافر جو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمیں جہنم کے عذاب سے دوچار ہونا بھی پڑا تو ہم دوزخ کے فرشتوں سے نمٹ لیں گے۔ یہ باتیں وہ محض اس لیے کرتے ہیں کہ نہ انہیں مر کر جی اٹھنے کا یقین ہے اور نہ جہنم کے عذاب کا۔ وہ بڑے سخت دھوکے میں مبتلا ہو چکے ہیں اور موت سے پہلے ان کو لگا ہوا یہ دھوکا ان کے ذہن سے نکل نہیں سکتا۔

[۲۳] رزق حاصل ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ آسمان سے نازل ہونے والی بارش ہے۔ بارش پڑنے سے ہی زمین سے نباتات اگتی ہے جو تمام جاندار مخلوق کے رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس بارش کے جملہ اسباب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ طویل مدت تک بارش نہ برسائے تو اللہ کے علاوہ اور کون ہستی ہے جو بارش برسا سکے۔ اللہ کی قدرتوں کو سمجھنے کے لیے نشانیاں تو بہت ہیں مگر ان کافروں نے اگر نہ ماننے پر اور سرکشی کی راہ اختیار کرنے پر ہی کمر باندھ رکھی ہو تو یہ ان باتوں سے کیسے عبرت حاصل کر سکتے ہیں؟

[۲۴] لجّ بمعنی ضد سے جھگڑنا۔ دشمنی میں مداومت کرنا اور لُجّۃ بمعنی پانی کی گہرائی۔ پانی کا گہرا حصہ جہاں پانی سب سے زیادہ گہرا ہو۔ گویا اس لفظ کا معنی ضد کی وجہ سے کسی بات پر اڑ جانا بھی ہے اور کسی برے کام میں دور دراز تک چلے جانا بھی ہے۔

[۲۵] یعنی کوئی شخص کامیابی اور مقصد کے حصول کی راہ اسی صورت میں طے کر سکتا ہے جب وہ سیدھے راستے پر چلے اور سیدھا ہو کر چلے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص کسی ناہموار اور ٹیڑھے میڑھے راستہ پر چلنا شروع کر دے اور وہ بھی منہ کے بل یا چوپایوں کی طرح منہ ڈالے ہوئے تو اس کے منزل مقصود تک پہنچنے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ اس آیت میں یہ دراصل ایک موحد اور ایک مشرک کی مثال بیان کی گئی ہے۔ موحد کی راہ سیدھی اور صاف ہوتی ہے اور اس پر چلنے کے لئے اس کے پاس واضح ہدایات اور علم کی روشنی میں موجود ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مشرک کی ایک نہیں کئی راہیں ہوتی ہیں اور وہ سب راہیں تاریکی اور ضلالت کی ہی ہو سکتی ہیں۔ پھر اس کے پاس علم کی روشنی کے بجائے محض اوہام و قیاسات ہوتے ہیں۔ محشر میں بھی دونوں کی چال میں ایسا ہی فرق ہوگا۔

[۲۶] آنکھیں، کان اور دل ان میں سے ایک ایک نعمت ایسی ہے جو ہزار نعمتوں کے برابر ہے۔ ان میں سے کوئی بھی چھن

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿٢٣﴾ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَيَقُولُونَ
مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٥﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢٦﴾
فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سِيئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تَدَّعُونَ ﴿٢٧﴾

مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو(۲۳) آپ کہیے کہ: کہ وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا اور اسی کی طرف تم اکٹھے[٢٧] کیے جاؤ گے (۲۴) اور وہ کہتے ہیں کہ: "اگر تم سچے[٢٨] ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا" (۲۵) آپ ان سے کہیے کہ اس بات کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے[٢٩] اور میں تو بس ایک صریح ڈرانے والا ہوں (۲۶) پھر جب وہ اس (عذاب) کو نزدیک دیکھ لیں گے تو ان کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے[٣٠] اور انہیں کہا جائے گا کہ یہی وہ چیز ہے جو تم مانگا کرتے تھے (۲۷)

جائے تو تمہیں ان کی قدر و قیمت کا احساس ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں آنکھیں، کان اور دل محض اس لیے نہیں دیے تھے کہ تم ان سے اتنا ہی کام لو۔ جتنا جانور لیتے ہیں۔ بلکہ اس لیے دیے تھے کہ آنکھوں سے تم اللہ کی آیات کا مشاہدہ کرو، کانوں سے اللہ کی آیات و احکام سنو، پھر دل سے ان میں غور کرو۔ مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ ان نعمتوں پر شکر تو کیا کرتے، الٹا ان نعمتوں کو اللہ کی راہ کی مخالفت میں استعمال کر رہے ہیں۔

[٢٧] یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کر کے ایک جگہ سے تمام روئے زمین پر پھیلا دیا ہے۔ اگر اس میں یہ قدرت ہے تو وہ تمہیں ایک جگہ پر پھر سے اکٹھا بھی کر سکتا ہے۔ اور یہ کام وہ عالم آخرت میں کرے گا۔

[٢٨] کافر جب بھی یہ بات پوچھتے ہیں از راہ تمسخر اور مذاق ہی پوچھتے تھے۔ اور اس سوال سے ان کا اصل مقصد اللہ کی کتاب، اللہ کے رسول اور قیامت سب کی تکذیب ہوتی تھی۔

[٢٩] یعنی یہ مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کب آئے گی اور تمہیں اس کی کوئی معین تاریخ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ تم اپنے انجام سے ڈر جاؤ جو تمہیں قیامت کو پیش آنے والا ہے۔ اور تمہارے اطمینان کے لیے صرف اتنی ہی بات کافی ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے موت کا آنا یقینی ہے۔ لیکن اس کا معین وقت کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم ہر شخص کو یہ فکر ضرور لاحق ہوتی ہے کہ میں مرنے سے پیشتر فلاں فلاں کام کر جاؤں۔ قیامت کی بھی یہی صورت ہے۔

[٣٠] یعنی اس وقت تو تم قیامت اور بعث بعد الموت کا مذاق اڑاتے اور طنز کرتے ہو مگر جب اسے واقع ہوتے دیکھ لو گے تو تمہاری کیفیت وہی ہوگی جو ایک پھانسی کے مجرم کو تختہ دار دیکھنے سے طاری ہو جاتی ہے۔ چہرے کا حلیہ بگڑ جائے گا اور ہوائیاں اڑنے لگیں گی۔ اس وقت فرشتے تمہیں مخاطب کر کے کہیں گے یہ ہے قیامت کا دن جس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے کیا اب بھی تمہیں یقین آیا ہے یا نہیں؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾

ع ۲ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۗؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاۗءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾

آپ ان سے کہیے: "بھلا دیکھو، اگر اللہ خواہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم فرما دے، کافروں[۳۱] کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟(۲۸)

آپ ان سے کہیے: "وہ رحمٰن ہی ہے جس پر ہم ایمان لائے اور اسی پر ہم[۳۲] نے بھروسہ کیا ہے۔ اب تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں کون ہے؟(۲۹) آپ ان سے پوچھیے: "بھلا دیکھو! اگر تمہارا پانی گہرائیوں میں اتر جائے تو کون ہے جو تمہیں نتھرا[۳۳] پانی لا کر دے گا؟"(۳۰)

[۳۱] کفار مکہ اور دوسرے قبائل اس انتظار میں رہتے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں پر کوئی ایسی ناگہانی بلا نازل ہو، جس سے ان کا خاتمہ ہو جائے اور ہماری جان چھوٹے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کی اسی آرزو کا جواب دیا ہے۔ اور فرمایا کہ ان سے کہیے۔ کہ ہمارے حق میں دونوں صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ تمہاری خواہش کے مطابق ہم پر کوئی بلا نازل ہو جو ہمیں ہلاک کر دے۔ اور دوسری یہ کہ اللہ ہم پر رحم فرمائے اور کسی طرح کا ہمیں گزند نہ پہنچے۔ لیکن تم اپنی خیر مناؤ کہ آخرت میں تمہیں یقیناً دردناک عذاب پہنچنے والا ہے۔ اس وقت تمہیں کوئی اس عذاب سے بچا سکتا ہے؟ اور ہماری تو یہ صورت ہے کہ آخرت میں یقیناً ہمیں اللہ سے مغفرت اور جنت کی امید ہے۔

[۳۲] ہماری عاقبت بخیر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم رحمٰن پر صرف ایمان ہی نہیں لائے بلکہ اپنے تمام تر امور کا انجام اسی کے سپرد کر رکھا ہے اور اسی پر ہی ہمارا بھروسہ ہے پھر وہ آخر کیوں ہمیں اپنی نعمتوں سے سرفراز نہ کرے گا۔ اور تمہیں جلد ہی اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ گمراہی کے راستہ پر ہم پڑے ہوئے ہیں یا تم ہو۔ یہاں "جلد" سے مراد کافروں پر کوئی دنیوی عذاب بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی موت کا وقت بھی اور قیامت کا دن بھی۔

[۳۳] زیر زمین پانی کے ذخیرے:۔ آسمان سے جو بارش برستی ہے اس کا ایک حصہ تو ندی، نالوں اور دریاؤں سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ اور ایک حصہ زمین میں جذب ہو جاتا ہے پھر کئی مقامات ایسے ہیں جہاں بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور کئی مقامات پر بہت کم۔ علاوہ ازیں اگر زمین نرم ہو تو بہت زیادہ پانی چوس لیتی ہے اور اگر سخت یا پتھریلی ہو تو بہت کم پانی جذب کرتی ہے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین کے نیچے پانی کے ذخیرے بھی موجود ہیں اور نیچے ہی نیچے اس پانی کے دریا بھی بہہ رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر علاقہ زیادہ بارشوں والا ہو اور زمین نرم ہو تو زمین کھودنے سے بیس پچاس فٹ کی گہرائی پر پانی مل جاتا ہے اور اگر علاقہ کم بارش والا اور زمین پتھریلی ہو تو ممکن ہے سینکڑوں فٹ کی گہرائی پر پانی نہ مل سکے۔ پھر ان زمین دوز پانی کے ذخیروں کے خواص بھی الگ الگ ہوتے ہیں کہیں گدلا، کھاری اور لیسدار پانی برآمد ہوتا ہے اور کہیں ٹھنڈا اور میٹھا پانی۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں انسان بسا اوقات اپنی پانی پینے کی ضرورت اور کھیتوں کو آبپاشی کی ضرورت کو انہیں ذخیروں سے پورا کر لیتا ہے۔ نیز

پانی کی گہرائی کا انحصار بعض دفعہ زمین میں موجود پتھریلی زمین کے بڑے بڑے قطعوں پر بھی ہوتا ہے اور یہ سب عوامل جن کا اوپر ذکر ہوا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ فلاں علاقے کے لوگوں کے لیے پانی کی ضروریات کس قسم کی ہیں۔ اسی بات کو ملحوظ رکھ کر اللہ تعالیٰ ہر مقام پر پانی کی گہرائی کا اہتمام فرماتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کافروں اور ناشکروں کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پانی کے ان ذخیروں کو اتنی گہرائی تک لے جائے جہاں سے پانی نکالنا تمہاری دسترس سے باہر ہو یا ان ذخیروں کو کھاری اور لیسدار بنا دے تو بتاؤ کیا تم ایک دن بھی زندہ رہ سکتے ہو؟ اللہ کے سوا تمہارے پاس کوئی اور ہستی ہے جو تمہیں ٹھنڈا اور میٹھا پانی مہیا کر دے؟ واضح رہے کہ لغوی لحاظ سے غور یا غار کا معنی نشیبی زمین کی طرف نیچے اور غار بمعنی کھوہ، معروف لفظ ہے اور غور بمعنی نشیبی زمین بھی اور زیر زمین گہرائی بھی۔ گویا اس میں گہرائی کے ساتھ مکان کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ نیز معین کا ایک معنی تو اوپر مذکور ہوا اس کا دوسرا معنی پانی کا سطح زمین پر نرم رفتار سے بہنا ہے۔ یعنی سیلاب کی طرح تندی اور تیزی سے نہیں بلکہ نرمی اور سہولت سے جاری ہونے والا پانی۔ یعنی جب زمینی گہرائی سے پانی کنوؤں، نلکوں یا مشینوں سے نکالا جاتا ہے اور آبپاشی کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس پانی کی رفتار سیلاب کی طرح تند و تیز نہیں ہوتی بلکہ نرم اور دھیمی ہوتی ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص یہ آیت پڑھے تو اسے یوں کہنا چاہیے۔ اَللّٰهُ يَاْتِيْنَا بِهٖ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔

آیاتھا ۵۲ ۔ سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ ۔ رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝١ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝٢ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا

کلمات ۳۰۶ ۔ آیات ۵۲ (۶۸) سورۃ القلم مکی ہے (۲) رکوع ۲ ۔ حروف ۱۲۹۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ن [۱]۔ قسم ہے قلم کی اور اس کی جو [۲] (کاتبانِ وحی) لکھتے ہیں (۱) کہ آپ اللہ کے فضل [۳] سے دیوانہ نہیں (۲) اور یقیناً آپ کے لیے ایسا اجر [۴] ہے جو کبھی

[۱] بعض لوگوں کے نزدیک "ن" سے مراد دوات ہے اور اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ قلم اور دوات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

[۲] اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو وہی ہے جو درج ذیل حدیث میں مذکور ہے:

ولید بن عبادہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے کہا "لکھ" چنانچہ قلم نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو ابد تک ہونے والا تھا۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

اس حدیث کے مطابق لکھنے والی قلم خود ہی ہے۔ یا ممکن ہے کہ اس قلم سے لکھنے والے اللہ کے فرشتے ہوں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قلم اور ان فرشتوں کی قسم جو لوحِ محفوظ سے قرآن نقل کرتے ہیں۔ تیسرا مطلب یہ ہے جو نزول قرآن کے بعد ان صحابہ کرام کی قسم جو قرآن کی وحی کو قلم سے لکھتے ہیں اور چوتھا مطلب یہ ہے کہ ان مورخین کی قسم جو قلم کے ساتھ بڑے بڑے مصلحین کی داستانِ حیات تاریخ کے اوراق میں ثبت کرتے ہیں۔

[۳] ❁ قریش کا آپ کو دیوانہ کہنا کن وجوہ کی بنا پر غلط ہے؟ یہ سب صورتیں اس بات پر کھلی کھلی شہادت ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے فضل سے دیوانہ نہیں ہیں اور قریش مکہ جو آپ کو اس لقب سے پکارتے ہیں تو یہ جھوٹے ہیں اور بکواس کرتے ہیں۔ کیونکہ دیوانے کے سامنے اپنی زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں ہوتا۔ جبکہ آپ برملا اللہ کی راہ کی طرف بلاتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیوانے کے قول اور فعل میں کبھی مطابقت نہیں پائی جاتی۔ اس لئے کہ اسے اتنا ہوش نہیں ہوتا کہ وہ کہہ کیا چکا ہے اور کر کیا رہا ہے۔ تیسری یہ بات کہ دیوانہ ہمیشہ بے سروپا اور بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ جبکہ آپ کو یہ لوگ صادق اور امین ہونے کا سرٹیفکیٹ دے چکے ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے الزام کو درست سمجھا جائے۔ وہ تو محض بغض و عناد اور اپنی حسرت مٹانے کے لیے آپ کو دیوانہ کہہ دیتے ہیں۔

[۴] یعنی اگر یہ لوگ آپ کو دیوانہ کہتے ہیں تو اس سے آپ غمگین اور ملول نہ ہوں۔ اللہ اس کے عوض آپ کو اتنا اجر عطا فرمادے گا جو لامتناہی، غیر محدود اور غیر منقطع ہے اور اس کے تسلسل میں کبھی فرق نہ آئے گا۔ اس اجر سے مراد دنیا کی زندگی میں بھی ایسا اجر ہو سکتا ہے جو فی الواقع آپ کو عطا کر دیا گیا تھا اور اخروی اجر تو بہر حال یقینی ہے۔ غور فرمائیے کہ کسی دیوانے یا پاگل کا مستقبل بھی ایسا شاندار ہو سکتا ہے۔ پھر جس کا رتبہ اللہ کے ہاں اتنا بڑا ہوا سے چند احمقوں کے دیوانہ کہنے کی

غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

منقطع ہونے والا نہیں (۳) اور آپ یقیناً اخلاق کے بڑے بلند[۵] مرتبہ پر ہیں (۴) عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے (۵) کہ تم میں سے کون جنون[۶] میں مبتلا ہے (۶)

بلاشبہ آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ بھول گیا ہے اور کون راہ راست پر ہیں۔ (۷) لہٰذا آپ جھٹلانے والوں کی بات نہ مانئے (۸)

پروانہ کرنا چاہیے۔

[۵] ❁ آپ کا خلق عظیم:۔ آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی یہ تھی کہ آپ ﷺ طعن و تشنیع کرنے والوں، تمسخر اڑانے والوں، ایذا پہنچانے والوں حتیٰ کہ پتھر مارنے والوں کے حق میں دعائے خیر ہی کرتے رہے۔ پھر ایسے ہی لوگوں کی ہدایت پر آپ اتنے حریص واقع ہوئے تھے کہ اپنی جان تک اس کام میں ہلکان کر رہے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کی خاطر انتقام نہیں لیا۔ پھر جب مکہ فتح ہوا، تو آپ ﷺ کے سب جانی دشمن آپ ﷺ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں وہ بھی جنہوں نے آپ ﷺ کو گھربار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور آپ کی جان کی قیمت لگادی تھی، پھر کئی بار چڑھ کر مدینہ آتے رہے تاکہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیں۔ اور اس وقت آپ ان سے بدلہ لینے کی قدرت و قوت بھی رکھتے تھے۔ لیکن جب آپ ﷺ کے یہ دشمن آپ کو ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے لگے تو آپ نے ایک ہی جملہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ. اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ کہہ کر سب کو معاف فرما دیا۔ یعنی آج تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو'' یہ بلند اخلاقی تو آپ ﷺ کی دشمنوں کے ساتھ تھی۔ آپ کا عام اخلاق یہ تھا کہ ایک بڑھیا آپ ﷺ کی راہ روک کر آپ ﷺ کو اپنی بات سنا لیتی تھی اور آپ ﷺ برا نہ مانتے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ کے اخلاق کے بیشمار پہلو ہیں۔ جن سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔ یہاں ان کا ذکر نا ممکن ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ آپ ﷺ کا اخلاق کیا تھا؟ تو آپ نے نہایت مختصر اور جامع جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ سارا قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا۔

[۶] یعنی یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا نتیجہ جلد از جلد سامنے نہ آئے۔ ایک شخص جو حکم دیتا ہے وہ نیکی اور بھلائی پر مبنی ہوتا ہے پھر وہ خود سب سے پہلے اس حکم پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔ ہر برے کام سے اسے طبعاً نفرت ہے۔ وہ انتقام کی صورت میں بھی کوئی بری بات اپنانے کو تیار نہیں۔ فیاضی اور سماحت اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو لوگ ہیں انہیں طعن و تشنیع، ایذا رسانی اور انتقامی کارروائیوں کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں، جو بات وہ سوچتے ہیں بغض و عناد اور دوسروں کی جڑ کاٹ دینے کے لیے سوچتے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ جلد از جلد ان دونوں کا انجام ایک دوسرے کے سامنے نہ آجائے۔ اس وقت ہر ایک کو معلوم ہو جائے گا کہ دیوانگی اور پاگل پن کی حرکتیں کون کر رہا تھا؟

لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝٩ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝١٠ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝١١ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝١٢ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝١٣ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝١٤ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ

وہ تو چاہتے ہیں کہ اگر آپ نرم رویہ اختیار کریں تو وہ بھی نرم[۷] ہو جائیں(۹) اور ہر قسمیں کھانے والے ذلیل کی بات[۸] نہ مانئے(۱۰) جو طعنے دینے والا ہے اور چغلیاں[۹] کھاتا پھرتا ہے(۱۱) بھلائی سے ہر دم[۱۰] روکنے والا، حد سے بڑھنے والا گنہگار ہے(۱۲) بڑا اجڈ ہے اور ان باتوں کے علاوہ بد اصل[۱۱] بھی ہے(۱۳) اس بنا پر کہ وہ مالدار ہے[۱۲] اور بیٹوں والا ہے(۱۴) جب اس پر ہماری

[۷] ۞ کافروں کی حق و باطل میں سمجھوتہ کی کوشش:۔ کافروں کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ ﷺ ہمارے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دیں۔ آپ ﷺ معاذ اللہ ان کے بتوں کو کوئی گالیاں تو نہیں دیتے تھے بلکہ صرف یہ کہتے تھے کہ یہ بت نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ سنوار سکتے ہیں۔ ان کے تصرف و اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ پھر چونکہ مدتوں سے ان کافروں میں اعتقاد چلا آ رہا تھا۔ کہ ہمارے یہ معبود ہمارا بگاڑ بھی سکتے ہیں اور سنوار بھی سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ آپ ﷺ کی اس تعلیم کو اپنی بھی توہین سمجھتے تھے اپنے آباؤ اجداد کی بھی اور اپنے ان بتوں کی بھی۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ آپ ﷺ ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہیں۔ ان کی شان میں کوئی توہین یا گستاخی کی بات نہ کریں۔ ہم آپ کے معبود کے حق میں کوئی ایسی بات نہ کریں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حق و باطل میں کبھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر آپ بفرض محال ان کی کوئی بات تسلیم کر بھی لیں تو بھی ایسے سمجھوتہ اور ایسی مصالحت کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ جھوٹے لوگ ہیں۔ اپنی کسی بات پر قائم رہنے والے نہیں۔ ان کا اصل مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا ہے۔

[۸] ۞ زیادہ قسمیں کھانے والا انسان ذلیل ہوتا ہے:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمہ اصول بیان فرمایا کہ جو شخص بات بات پر قسمیں کھاتا ہے۔ یا اسے قسمیں اٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی کسی بات پر نہ خود اعتماد ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو اعتماد ہوتا ہے۔ وہ اپنی نظروں میں بھی ذلیل اور دوسروں کی نظروں میں بھی ذلیل ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کی بات ماننے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

[۹] آیت نمبر ۱۰ سے ۱۳ تک چار آیات میں کافروں کے ایک رئیس کی اخلاقی حالت کو رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں پیش کیا گیا ہے اور اس کا نام لینے کی ضرورت اس لئے پیش نہیں آئی کہ ان صفات والا کردار صرف ایک ہی تھا اور اس کی یہ صفات پڑھ کر ہر ایک کو معلوم ہو جاتا تھا کہ ان آیات کا روئے سخن کس طرف ہے اور یہ قرآن کی انتہائی حکمت کی دلیل ہے کہ کسی برے شخص کا نام لیے بغیر محض صفات سے ہی اس کی نشاندہی کر دی جائے اور ہر ایک کو معلوم ہو جائے کہ جس شخص میں یہ اور یہ صفات پائی جاتی ہوں وہ ایسے اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔

[۱۰] خیر کے معنی مال و دولت بھی ہے اور ہر بھلائی کا کام بھی۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوتا کہ وہ خود بھی کنجوس اور بخیل ہے اور دوسروں کو بھی ایسا ہی سبق دیتا ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر بھلائی کے کام سے خود بھی رکتا ہے دوسروں کو بھی روکتا رہتا ہے۔

[۱۱] زنیم کا معنی ایسا شخص ہے جس کا نسب مشکوک ہو وہ خود کو کسی دوسرے قبیلے سے ملا رہا ہو، اسی لحاظ سے اس لفظ کا معنی بدذات بھی کیا جاتا ہے۔ بدنام بھی اور ولد الزنا بھی۔ عام مفسرین کا خیال ہے کہ یہ شخص ولید بن مغیرہ تھا۔ جو ابو جہل سے پہلے قریش مکہ کا رئیس تھا اور اس کے نسب کا اٹھارہ سال بعد پتہ چلا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

[۱۲] یعنی ان تمام تر قباحتوں کے باوجود کیا صرف اس لئے اس کی بات مان لی جائے کہ وہ خاصا مالدار اور صاحب اولاد ہے۔ صاحب

اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ
اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ
نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾ وَّغَدَوْا
عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ
اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا

آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہہ دیتا ہے کہ: "یہ تو پہلے لوگوں کی داستانیں ہیں" (۱۵) جلد ہی ہم اس کی لمبوتری [۱۳] ناک پر داغ لگائیں گے (۱۶) ہم نے انہیں ایسے ہی آزمایا ہے جیسے [۱۴] باغ والوں کو آزمایا تھا۔ جب انہوں نے قسمیں کھائیں کہ وہ صبح دم ہی باغ کا پھل توڑ لیں گے (۱۷) اور وہ کوئی استثنا [۱۵] نہیں کر رہے تھے۔ (۱۸)

پھر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک آفت اس باغ پر پھر گئی جبکہ وہ ابھی سوئے ہوئے تھے (۱۹) اور باغ یوں ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی ہو (۲۰) وہ صبح دم ہی ایک دوسرے کو پکارنے لگے (۲۱) کہ اگر تمہیں پھل توڑنا ہے تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو (۲۲) پھر وہ چل کھڑے ہوئے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے (۲۳) کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس نہیں آئے گا (۲۴) اور وہ صبح سویرے ہی لپکتے ہوئے وہاں جا پہنچے جیسے وہ (پھل توڑنے کی) پوری قدرت رکھتے ہیں (۲۵) پھر جب انہوں نے باغ کی طرف دیکھا تو کہنے لگے: یقیناً ہم راہ بھول گئے ہیں (۲۶) (پھر غور سے دیکھا تو کہنے لگے) بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹ گئے ہیں (۲۷) ان کے منجھلے نے کہا: میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ (۲۸) وہ کہنے لگے: پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم ہی ظالم تھے (۲۹) پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں ملامت کرنے لگے۔ (۳۰) بولے: ہائے افسوس! ہم ہی سرکش ہو گئے تھے۔ (۳۱) کچھ بعید نہیں۔ ہمارا پروردگار ہمیں اس کے بدلے میں اس سے اچھا باغ عطا فرمائے۔

مال اور اولاد ہونا کوئی ایسی صفات نہیں کہ ایسے شخص کی اطاعت کی جائے۔

[۱۳] ممکن ہے کہ اس کی ناک بڑی اور لمبوتری ہو تاہم عمومی محاورہ یہ ہے کہ جو لوگ صاحب مال اور اولاد ہوں ان کی ناک بھی بڑی ہوتی ہے اور یہ لوگ اپنی ناک کی خاطر کئی ایسے جتن کرتے رہتے ہیں کہ ان کی ناک کو کوئی آنچ نہ پہنچے۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ ہم اس شخص کی اس بڑی ناک کو پوری طرح ذلیل کر کے چھوڑیں گے۔

[۱۴] یعنی ان قریش مکہ کو بھی اسی طرح آزمائش میں ڈال رکھا ہے جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔

[۱۵] ❁ باغ والوں کا قصہ:۔ یہ واقعہ آیت نمبر ۱۷ سے آیت نمبر ۳۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ جسے ہم تسلسل کے ساتھ اپنے الفاظ

مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا

ہم اپنے پروردگار کی طرف راغب ہوتے ہیں۔(۳۲) ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب[۱۹] تو اس سے بھی بڑا ہے، کاش! یہ لوگ جان لیتے(۳۳)

میں بیان کریں گے کسی شخص کا ایک باغ تھا جو بھرپور فصل دیتا تھا۔ اس شخص کا زندگی بھر یہ دستور رہا کہ جب بھی پھل کی فصل اٹھاتا تو اس کے تین حصے کرتا۔ ایک حصہ تو خود اپنے گھر کی ضروریات کے لیے رکھ لیتا۔ دوسرا حصہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور ہمسایوں میں تقسیم کر دیتا اور تیسرا حصہ فقراء و مساکین میں بانٹ دیتا۔ اس کی اس سخاوت کی وجہ سے اس کا باغ سب سے زیادہ فصل دیتا۔ کٹائی کے دن فقراء و مساکین موقع پر پہنچ جاتے اور اپنا اپنا حصہ وصول کر لیتے۔

جب یہ شخص انتقال کر گیا تو اس کے بیٹوں کو خیال آیا کہ ہمارا باپ تو ساری عمر اس باغ کی فصل کو ادھر ادھر تقسیم کر کے اپنی کمائی یوں ہی لٹاتا رہا اور زندگی بھر مفلس ہی رہا۔ اب کے یہ ریت ختم کر دینا چاہیے۔ باغ ہمارا ہے اور اس پر ہمارا ہی حق ہے چنانچہ انہوں نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ جب کٹائی کا موقع آئے تو راتوں رات ہی کر لی جائے۔ تاکہ نہ غریب مسکین آئیں، نہ ہمیں تنگ کریں اور نہ ہم برے بنیں۔ انہوں نے اس بات پر قسمیں کھائیں کہ ایسا ہی کریں گے اور انہیں اپنی اسکیم پر اس قدر وثوق تھا کہ انہوں نے ان شاء اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

جب کٹائی کا وقت آ گیا تو وہ راتوں رات، خوشی خوشی، اچھلتے کودتے اپنے باغ کی طرف روانہ ہوئے ادھر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ اسی رات سخت آندھی کا طوفان آیا۔ جس میں آگ تھی۔ آندھی کے ذریعہ وہ آگ باغ کے درختوں تک پہنچ گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں انہیں جلا کر راکھ کر گئی۔ آن کی آن میں سارا باغ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ جب یہ عقل مند بیٹے وہاں پہنچے تو وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ انہیں وہاں باغ نام کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ سوچنے لگے کہ ہم شاید رات کے اندھیرے میں کسی غلط جگہ پر پہنچ گئے۔ پھر جب کچھ حواس درست ہوئے تو حقیقت ان پر آشکار ہو گئی کہ ان کی نیت کا فتور آندھی کا عذاب بن کر ان کے باغ کو بھسم کر گیا ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ان کے منجھلے بھائی نے کہا کیا میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ اسے ہر وقت یاد رکھو اور اسی سے خیر مانگو۔ مگر ان بھائیوں میں سے کسی نے بھی منجھلے بھائی کی طرف توجہ نہ دی تو ناچار اسے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ اور وہ ملامت بھی اس طرح کرتے تھے کہ ایک دوسرے کو کہتا کہ تم ہی نے یہ ترغیب دی تھی دوسرا کہتا کہ یہ مشورہ تو تمہارا تھا مگر اب پچھتانے سے کچھ بن نہ سکتا تھا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

باپ کو اس کی سخاوت اور دوسروں سے ہمدردی کا یہ صلہ ملتا رہا کہ اسی کا باغ سب سے زیادہ پھل لاتا تھا اور جتنا کچھ وہ دوسروں پر خرچ کرتا۔ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ اسے مہیا فرماتا۔ مگر جب بیٹوں پر بخل اور حرص غالب آئی تو اس کا ثمرہ یوں ملا کہ نیت کے فتور نے مجسم طوفان کا روپ دھار کر سارا باغ ملیا میٹ کر دیا۔ اس وقت نہ زمین کی زرخیزی کام آئی، نہ ان کی کوئی تدبیر، اس واقعہ سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ دوسروں سے ہمدردی اور اچھے سلوک کی بنا پر اگر اللہ تعالیٰ نادیدنی وسائل کے ذریعہ رزق فراہم کر سکتا ہے تو نیت میں فتور آنے پر ایسے ہی نادیدنی وسائل سے دیئے ہوئے رزق کو چھین بھی سکتا ہے۔ آخر سب مل کر کہنے لگے کہ واقعی ہماری سب کی زیادتی تھی کہ ہم نے فقیروں اور محتاجوں کا حق مارنا چاہا اور حرص و طمع میں آ کر اصل بھی کھو بیٹھے۔ یہ جو کچھ خرابی آئی اس میں ہم ہی قصوروار ہیں۔ مگر اب بھی ہم اپنے پروردگار سے نا امید نہیں کیا عجیب ہے کہ وہ اپنی رحمت سے پہلے باغ سے بہتر باغ ہم کو عطا کر دے۔

[۱۹] یعنی یہ عذاب تو باغ والوں کو اس دنیا میں ملا۔ اور جو آخرت میں اس طرح کے بخل سے عذاب ہو گا وہ اس سے بہت بڑا ہو گا۔

يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٣٤﴾ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٥﴾
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٦﴾ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿٣٧﴾ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴿٣٨﴾ أَمْ لَكُمْ
أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ
زَعِيمٌ ﴿٤٠﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ﴿٤١﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ

پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں نعمتوں والی جنتیں ہیں (۳۴) کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں[۱۷] کا سا بنا دیں گے؟ (۳۵) تمہیں کیا ہو گیا ہے یہ تم کیسا حکم لگاتے ہو (۳۶) یا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم (یہ بات) پڑھتے[۱۸] ہو (۳۷) کہ تمہارے لئے آخرت میں وہی کچھ ہو گا جو تم پسند کرو گے (۳۸) یا ہمارے ذمہ تمہارے پاس حلفیہ عہد ہیں جو قیامت کے دن تک جا پہنچیں گے کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جو تم حکم لگاؤ گے (۳۹) آپ ان سے پوچھیے کہ اس بات کا ضامن کون ہے؟ (۴۰) یا ان کے کچھ شریک ہیں؟ پھر اگر وہ سچے ہیں تو اپنے شریکوں کو لائیں (۴۱) جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی

[۱۷] ❁ خوشحال لوگوں کی ایک عام غلط فہمی:۔ قریشی سردار یہ سمجھتے تھے کہ انہیں جو آسودگی اور خوشحالی حاصل ہے تو یہ ان کے مشرکانہ مذہب کی سچائی پر دلیل ہے۔ پھر یہ معاملہ اتنا ہی نہ تھا بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر موت کے بعد ہمیں اٹھایا بھی گیا اور دوسری زندگی حاصل ہوئی تو اللہ وہاں بھی ہم پر مہربانیاں کرے گا۔ جو پروردگار ہم پر آج مہربان ہے کیا وجہ ہے کہ وہ اس اخروی زندگی میں ہم پر مہربان نہ ہو۔ اس آیت میں ان کے اسی قول کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ کیسی خلاف عقل بات ہے کہ اللہ قیامت کے دن اپنے فرمانبرداروں اور اپنے باغیوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرے؟

[۱۸] ❁ غلط فہمی کی تین طرح سے تردید:۔ آیت نمبر ۳۷ تا ۴۱ میں تین مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ جو ان کے اس باطل نظریہ کی تردید میں نقلی دلائل کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ کیا کسی الہامی کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ آخرت میں بھی تمہیں آسودگی اور خوشحالی کی زندگی میسر ہو گی جیسا کہ تمہاری یہ خواہش ہے۔

۲۔ یا تم نے ہم سے کچھ ایسے حلف نامے لے رکھے ہیں کہ تمہیں قیامت کے دن وہی کچھ ملے گا جو تم چاہتے ہو اور اپنے حق میں ایسا ہی فیصلہ چاہتے ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو بتاؤ کہ ان حلف ناموں کو ہم سے پورا کرا کے دینے کے لیے تم سے کون ذمہ دار اور ضامن ہے؟

۳۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے کچھ معبود اللہ کے کارناموں میں اس کے شریک ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو شریکوں کی بھی کائنات میں شراکت اور امور کائنات میں ان کے تصرف کو ثابت کر کے دکھائیں۔ پھر جب ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر آخر یہ کس برتے پر آس لگائے بیٹھے ہیں کہ انہیں اخروی زندگی میں آسودگی اور خوشحالی میسر ہو گی۔

وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٤٢﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ فَذَرْنِي وَمَن يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٤﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٤٥﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا

اور انہیں سجدہ کرنے کو بلایا جائے گا تو یہ سجدہ[۱۹] نہ کر سکیں گے (۴۲) ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھا رہی ہو گی۔ وہ (دنیا میں) سجدہ کی طرف بلائے جاتے تھے اور اس وقت تو وہ صحیح سالم تھے (۴۳) لہٰذا جو شخص اس کلام کو جھٹلاتا ہے اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم انہیں بتدریج یوں[۲۰] تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی (۴۴) اور میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں۔ بلاشبہ میری تدبیر[۲۱] کا کوئی توڑ نہیں (۴۵) یا آپ ان سے کوئی صلہ مانگتے ہیں کہ

[۱۹] اللہ ﷻ کی پنڈلی کا ذکر:۔ آیت نمبر ۴۲ اور ۴۳ کی تفسیر کے لئے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن پروردگار اپنی پنڈلی کھولے گا تو ہر مومن مرد اور مومن عورت سجدہ میں گر پڑیں گے۔ صرف وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جو لوگوں کو دکھلانے یا سنانے کے لئے سجدہ کیا کرتے تھے۔ وہ سجدہ تو کرنا چاہیں گے لیکن ان کی پشت اکڑ کر ایک تختہ کی طرح ہو جائے گی" (بخاری۔ کتاب التفسیر)

بعض علماء نے ﴿يُكْشَفُ عَن سَاقٍ﴾ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ: "جس دن حقائق سے پردہ اٹھا دیا جائے گا" اگر یہ اہل عرب کا محاورہ ہو تب بھی ہم ارشاد نبوی ﷺ کے مقابلہ میں ایسے محاورہ کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی پنڈلی کیسی ہے کیا یہ انسانوں کی پنڈلی کی طرح ہے یا اس کی کوئی اور صورت ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ بات نہ جان سکتے ہیں اور نہ جاننے کے مکلف ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اگر اللہ نے اپنی پنڈلی کا ذکر کیا ہے تو ہم اتنی ہی بات مانتے ہیں، اس کے آگے کچھ نہیں۔

[۲۰] ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُم﴾ استدراج کے لغوی معنی میں دو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں۔ ایک تدریج، دوسرے آہستگی، یعنی یہ قریشی سردار جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی سمجھے بیٹھے ہیں کہ چونکہ وہ خوشحال اور آسودہ ہیں۔ لہٰذا ان کا پروردگار ان پر مہربان ہے۔ حالانکہ اللہ انہیں آہستہ آہستہ ہلاکت اور تباہی کی طرف لیے جا رہا ہے۔ اور جن چیزوں کو وہ اللہ کے انعامات سمجھ رہے ہیں وہ در اصل ان کی ہلاکت کا سامان ہے۔

[۲۱] کید کاد بمعنی کسی کام کو سرانجام دینے کے لئے خفیہ تدبیر کرنا۔ داؤ یا چال چلنا اور کَيْدُ سَاحِرٍ کے معنی جادوگر کے ہتھکنڈے۔ ایسی تدبیر کا مقصد اگر درست اور نیک ہو تو یہ جائز ہے اور اگر برا ہو تو یہ مذموم ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ کی وہ تدبیر کیا تھی جس کا ان کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ یہ تدبیر وہی استدراج ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں گزر چکا ہے یعنی ہم انہیں مہلت بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور نعمتیں بھی۔ جوں جوں وہ اللہ کی آیات کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ بجائے عذاب کے ہم ان پر نعمتیں برساتے جا رہے ہیں۔ اور انہیں یہ محسوس تک نہیں ہو رہا کہ وہ اپنی ہلاکت کے کون سے مقام تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کے گناہوں کا پیمانہ لبریز ہوتے ہی ہم انہیں دھر لیں گے۔

فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ

وہ تاوان (کے بوجھ) سے دبے[۲۲] جارہے ہیں (۴۶) یا ان کے پاس[۲۳] غیب ہے جسے وہ لکھ لیتے ہیں (۴۷) پس آپ اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیجئے اور مچھلی والے[۲۴] (یونس) کی طرح نہ ہونا جب انہوں نے پکارا اور وہ غم سے بھرے[۲۵] ہوئے تھے (۴۸) اگر انہیں ان کے پروردگار کا فضل سنبھالا نہ دیتا تو وہ تو برے حالوں ایک چٹیل میدان[۲۶] میں پھینک دیئے گئے تھے۔(۴۹)

[۲۲] آپ تو سب لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے اور اس کا پیغام پہنچاتے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں بے لوث اور بے غرض ہو کر کر رہے ہیں۔ اب اگر یہ قریشی سردار اس دعوت کو قبول کرتے ہیں تو کریں، نہیں کرتے تو نہ کریں، پھر اگر دوسرے لوگ اس دعوت کو قبول کرتے ہیں تو یہ کیوں سیخ پا ہو جاتے ہیں؟

[۲۳] یعنی انہوں نے غیب کے پردہ کو ہٹا کر دیکھ لیا ہے کہ یہ اللہ کا بھیجا ہوا رسول نہیں ہے۔ یا ان کی طرف اللہ کے ہاں سے وحی آتی ہے کہ جو کچھ ان کا دین ہے وہی درست اور برحق ہے۔ آخر ان کی اس شدید مخالفت کی کوئی تو معقول وجہ ہونی چاہئے۔

[۲۴] یعنی جس طرح سیدنا یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کی مخالفت سے تنگ آکر بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا۔ انہیں وحی الٰہی کا انتظار کیے بغیر خود ہی عذاب کی دھمکی دے دی تھی اور پھر وہاں سے چل دیئے تھے۔ آپ کو ایسا نہ کرنا چاہیے بلکہ قوم کی ایذاؤں، مذاق و تمسخر اور مخالفت کو صبر کے ساتھ برداشت کیجئے۔ اور اس وقت تک صبر کیجئے جب تک کہ آپ کو یہاں سے ہجرت کا حکم نہ مل جائے۔

[۲۵] ❁ سیدنا یونس کو کون کون سی پریشانیاں لاحق تھیں جن سے وہ گلے تک بھرے ہوئے تھے:۔ مَكْظُوْمٌ۔ کظم سانس کی نالی کو کہتے ہیں اور کظم السقاء بمعنی مشک کو پانی سے لبالب بھر کر اس کا منہ بند کر دینا۔ اور کظیم اور مکظوم اس شخص کو کہتے ہیں جو غم یا غصہ سے سانس کی نالی تک بھرا ہوا ہو مگر اس کا اظہار نہ کرے اور اسے دبا جائے۔

❁ مچھلی کے پیٹ میں وظیفہ:۔ اس آیت میں سیدنا یونس علیہ السلام کی وہ کیفیت بیان کی گئی ہے جب وہ مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے تھے۔ اس وقت آپ کئی قسم کے غموں کا مجموعہ بنے ہوئے تھے۔ مثلاً قوم کے ایمان نہ لانے کا غم۔ آپ کے بتائے ہوئے وعدہ عذاب پر عذاب نہ آنے کا غم، اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے آنے کا غم، پھر مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کا غم، ان تمام پریشانیوں اور غموں سے نجات کی واحد صورت آپ کو یہی نظر آئی کہ اللہ کی تسبیح و تہلیل کریں اور اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی طلب کریں۔ چنانچہ آپ جب تک مچھلی کے پیٹ میں رہے ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ پڑھتے رہے۔ تا آنکہ اللہ نے آپ کو اس مصیبت سے نجات دے دی۔

[۲۶] مچھلی نے آپ کو اپنی غذا نہیں بنایا۔ بلکہ بالکل صحیح و سالم بر لب ساحل ایک چٹیل میدان میں اگل دیا۔ یہ نتیجہ تھا آپ کی اس دعا کا جو وہ مچھلی کے پیٹ میں کرتے رہے۔ گویا آپ کی وہ دعا مستجاب ہو گئی اور آپ کو دوبارہ زندگی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے

وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ
بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿٥١﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿٥٢﴾

چنانچہ ان کے پروردگار نے انہیں برگزیدہ کیا[۲۷] اور صالحین میں شامل کر دیا(۵۰) اور کافر لوگ جب قرآن سنتے ہیں تو آپ کو ایسی نظروں سے[۲۸] دیکھتے ہیں کہ گویا آپ کے قدم ڈگمگا دیں گے اور کہتے ہیں کہ: "یہ تو ایک دیوانہ ہے" (۵۱) حالانکہ یہ (قرآن) تمام اہل عالم[۲۹] کے لیے نصیحت ہے۔(۵۲)

اسباب بھی مہیا فرما دیئے کہ چند ہی دنوں میں آپ کی کمزوری دور ہو گئی اور صحت بحال ہو گئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی مزید مہربانی اور اس کا فضل تھا۔

[۲۷] یعنی ان کی نبوت کو بھی بحال کر دیا گیا اور انہیں اسی قوم کی طرف دوبارہ بھیجا گیا جہاں سے وہ بھاگ کر چلے گئے تھے۔ آپ کا قصہ پہلے سورۂ یونس کی آیت نمبر ۹۸، سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۸۷، ۸۸ اور سورۂ صافات کی آیت نمبر ۱۴۳ کے تحت گزر چکا ہے۔ وہ حواشی ملاحظہ کر لیے جائیں۔

[۲۸] یعنی جب آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے ہیں تو وہ آپ کو یوں گھورنے لگتے ہیں اور آپ پر اپنی نظریں گاڑ کر ایسا مقناطیسی اثر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جس سے آپ مرعوب ہو کر یہ کام چھوڑ دیں۔ پھر بڑی حقارت کے ساتھ دوسروں کو بتاتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ آدمی ہے۔ وہ آپ ﷺ کو دیوانہ اس لیے کہتے تھے کہ آپ ﷺ ان کی عقل اور ان کے عقیدہ کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ پھر صرف آپ کی قوم نے ہی آپ کو مجنون نہیں کہا بلکہ ہر رسول کو دیوانہ کہا جاتا رہا ہے۔ اور یہ دراصل قوم کے اپنے رسولوں کے خلاف معاندانہ رویہ کے اظہار کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک نبی اور ایک مجنون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی کی دعوت گو معاشرہ کی عقل اور دستور کے خلاف ہوتی ہے۔ تاہم وہ ہمیشہ اپنی ذات پر قائم رہتا، اس پر عمل کر کے دکھاتا اور اپنی پاکیزہ سیرت و کردار سے اپنی بات پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ جبکہ مجنون ان تینوں باتوں سے عاری ہوتا ہے۔

[۲۹] یعنی جو قرآن تم انہیں پڑھ کر سنا رہے ہو نہ اس میں کوئی دیوانگی کی بات ہے اور نہ آپ میں ہے۔ بلکہ یہ کتاب تو تمام اہل عالم کی ہدایت کے لیے نازل کی جا رہی ہے۔ اس سے بنی نوع انسان کی کایا پلٹ اصلاح ہو گی۔ عنقریب یہ کتاب معاشرہ میں انقلاب بپا کر دے گی۔ اس وقت سب کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل دیوانے کون تھے؟

۵۲ آیاتھا سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃِ مَکِّیَّۃٌ رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَاۗقَّةُ ۝۱ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۳ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا

کلمات ۲۶۰ آیات ۵۲ (۶۹) سورۃ الحاقۃ مکی ہے (۷۸) رکوع ۲ حروف ۱۱۳۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

سچ مچ ہو کے رہنے والی (۱) وہ سچ مچ ہو کے رہنے والی کیا ہے؟ (۲) اور آپ کیا سمجھے کہ وہ سچ مچ ہونے والی[۱] کیا ہے (۳) قوم ثمود اور عاد نے کھڑ کھڑانے[۲] والی (قیامت) کو جھٹلایا[۳] تھا (۴) ثمود تو ایک ہیبت ناک (چیخ) سے ہلاک کیے گئے (۵) رہے عاد تو وہ سناٹے کی سخت آندھی[۵] سے ہلاک کیے گئے (۶) اللہ تعالیٰ نے اس جڑ کاٹنے والی آندھی

[۱] انداز کلام کو اس قدر موکد اس لیے بنایا گیا ہے کہ قرآن کے مخاطب قریشی لوگ قیامت کے کٹر منکر تھے۔ اور اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ آپ بھی بس اتنا ہی جان سکتے ہیں۔ کہ قیامت یقیناً آنے والی ہے۔ یہ نہیں جان سکتے کہ کب آئے گی یا اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔ چنانچہ اسی سورہ میں قیامت کی بعض کیفیات بیان کر دی گئی ہیں۔

[۲] قَارِعَةٌ: قَرَعَ بمعنی ایک چیز کو دوسری پر اس طرح مارنا کہ اس سے آواز پیدا ہو۔ اور قرع الباب بمعنی اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور قَارِعَةٌ کے معنی کھڑ کھڑانے والی، اور ابن الفارس کے نزدیک قَارِعَةٌ ہر وہ چیز ہے جو انسان پر شدت کے ساتھ نازل ہو۔ نیز قَارِعَةٌ قیامت کا صفاتی نام ہے۔ یعنی اس دن کائنات کی چیزیں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر کئی طرح کی آوازیں پیدا کریں گی۔

[۳] یعنی قیامت یا آخرت کا معاملہ اتنا ہی نہیں کہ کوئی مانتا ہے تو مان لے نہیں مانتا تو نہ مانے۔ قیامت آئے گی تو پتہ چل جائے گا کہ آتی ہے یا نہیں آتی۔ بلکہ اس کا فوری اثر اس دنیا میں ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کا تصور ہی ایسا موثر ذریعہ ہے کہ جو انسان کو، افراد کو اور اقوام کو اخلاقی پستیوں میں گرنے سے بچا سکتا ہے۔ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا' ان کے اخلاق بگڑ گئے وہ ظلم و جور میں مبتلا ہو گئیں۔ بالآخر اللہ کا عذاب آیا جس نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔

[۴] ❁ قوم ثمود پر کس قسم کا عذاب آیا تھا؟ ثمود کو کون سے عذاب سے ہلاک کیا گیا تھا؟ اس کے لیے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ آئے ہیں۔ سورۂ اعراف آیت ۷۸ میں اس کو الرَّجْفَةُ (زبردست زلزلہ) کہا گیا ہے۔ سورۂ ہود کی آیت نمبر ۶۷ میں الصَّيْحَةُ (زبردست دھماکہ یا ہیبت ناک چیخ) کا لفظ آیا ہے اور سورہ حم السجدہ کی آیت نمبر ۱۷ میں ﴿صَاعِقَةُ الْعَذَابِ﴾ (یعنی گرنے والی بجلی کا عذاب) کا لفظ آیا ہے اور یہاں الطَّاغِيَةُ کا لفظ آیا ہے۔ جس سے عذاب میں سخت سرکشی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف کیفیتوں کا بیان ہے۔ اور وہ عذاب یہ تھا کہ ارضی اور سماوی دونوں قسم کے عذاب قوم ثمود پر یک دم آ گئے تھے۔

[۵] عَاتِيَةٌ قوم عاد پر جو عقاب آیا وہ سخت آندھی کا عذاب تھا۔ ہوا نہایت سرد اور یخ بستہ تھی اور یہ ہوا اتنی سرکش تھی جس پر کسی مخلوق کا زور نہ چلتا تھا حتیٰ کہ فرشتے جو ہوا کے انتظام پر مامور ہیں ان کے ہاتھوں سے نکلی جاتی تھی۔

عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ
نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ
بِالْخَاطِئَةِ ۝۹ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ
حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ

کو ان پر متواتر سات راتیں اور آٹھ دن مسلط کیے رکھا۔ آپ (وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہاں لوگ یوں (چاروں شانے) چت گرے پڑے[۶] ہیں جیسے وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں (۷) کیا آپ ان میں سے کوئی بھی باقی بچا دیکھتے ہیں؟ (۸) اور فرعون[۷] اور جو لوگ اس سے پہلے تھے اور جو الٹائی ہوئی بستیوں میں رہتے تھے سب گناہ کے کام کرتے تھے۔ (۹)

ان سب نے اپنے پروردگار کے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے بھی انہیں بڑی سختی سے پکڑا (۱۰) جب پانی کا طوفان حد سے بڑھا تو ہم نے ہی تمہیں[۸] کشتی میں سوار کر دیا تھا (۱۱) تاکہ ہم اسے تمہارے لیے ایک یادگار[۹] بنا دیں اور یاد رکھنے[۱۰] والے کان اس کی یاد کو محفوظ رکھیں (۱۲) پھر جب صور میں ایک دفعہ

[۶] یہ لوگ بڑے مضبوط جسم والے، طاقتور اور طویل القامت تھے۔ جب ان کو ہود علیہ السلام نے اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو کہنے لگے: مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟) لیکن جب ہم نے ان پر ہوا کو چھوڑ دیا تو یہ لوگ اس کا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ تند و تیز ہوا نے ان کو یوں چاروں شانے چت گرا دیا کہ طویل القامت ہونے کی وجہ سے ان کے سر گرتے ہی تن سے جدا ہو جاتے تھے۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ کھجوروں کے بے جان اور کھوکھلے تنے پڑے ہوئے ہیں۔

[۷] قوم عاد نے تو یہ نعرہ لگایا تھا کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اور فرعون وہ تھا جس نے ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کا نعرہ لگایا تھا۔ فرعون اور آل فرعون کو اللہ نے سمندر میں ڈبو دیا تو اس وقت اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے خدائی کے دعوے میں کس حد تک سچا تھا اور آج کس قدر مجبور ہے۔ فرعون کی قوم کے علاوہ بھی کئی قوموں نے آخرت کے عقیدہ سے انکار کیا۔ پھر سرکشی کی راہ اختیار کی تو نتیجتاً انہیں بھی جاہ و برباد کر دیا گیا۔ ان سب قوموں میں سے کوئی ایک شخص بھی زندہ نہ بچا۔ سب کے سب ہلاک کر دیئے گئے۔ اور ان سب کا سب سے بڑا گناہ جو ان میں قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا تھا، یہ تھا کہ انہوں نے سرے سے رسولوں کو اور اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا تھا۔

[۸] اس آیت میں طوفان سے مراد طوفان نوح ہے۔ اور "تمہیں" سے مراد وہ تمام بنی نوع انسان ہیں۔ جو دنیا میں اس وقت آباد تھے اور یہ ان لوگوں کی ہی اولاد ہیں جنہیں طوفان نوح کے وقت کشتی میں سوار کر لیا گیا تھا۔

[۹] ❁ طوفان نوح اور کشتی:۔ یعنی طوفان کا یہ حال تھا کہ پانی کی اتنی کثیر مقدار جمع ہو گئی تھی کہ پہاڑ تک اس طوفان میں ڈوب گئے تھے۔ اتنے مہیب طوفان کے مقابلہ میں ایک کشتی کی بھلا حقیقت ہی کیا تھی جو اس طوفان کے تھپیڑوں کا مقابلہ کر سکتی۔ خصوصاً جب کہ اس میں سوار لوگوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان کی منزل مقصود کس سمت کو ہے؟ ظاہری اسباب پر انحصار کیا جائے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس کشتی کے بچنے کی کوئی صورت تھی اور نہ اس میں سوار انسانوں کی۔ یہ ہماری قدرت اور ہمارا احسان ہی تھا کہ اس کشتی کے ذریعہ ہم نے اپنے فرمانبرداروں کو بچا لیا اور لوگوں کو اپنی قدرت و حکمت کا ایسا کرشمہ دکھا دیا کہ رہتی دنیا تک لوگ اس واقعہ کو یاد رکھیں۔

[۱۰] یعنی وہ لوگ جو کوئی بات سن کر سنی ان سنی نہیں کر دیتے۔ بلکہ اس میں غور کرتے، اس سے عبرت حاصل کرتے، پھر اسے یاد

نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ
الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ
رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ فَاَمَّا

پھونک ماری جائے گی (۱۳) اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی [۱۱] چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا (۱۴) تو اس دن
ہونے والا واقعہ پیش [۱۲] آجائے گا (۱۵) اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی (۱۶) اور
فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور اس دن آٹھ فرشتے آپ کے پروردگار کے عرش کو اپنے اوپر [۱۳] اٹھائے
ہوئے ہوں گے (۱۷) اس دن تم (اللہ کے حضور) پیش کیے جاؤ گے (اور) تمہارا کوئی راز [۱۴] چھپا نہ رہ جائے گا (۱۸)

بھی رکھتے ہیں۔

[۱۱] آغازِ قیامت کے حوادث:۔ یہاں سے اب قیامت کی ان چند کیفیات کا ذکر شروع ہو رہا ہے، جن کا اس سورہ کی آیت نمبر ۳ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ یعنی قیامت کا آغاز نفخہ صور اول سے ہوگا۔ اس نفخہ کا فوری اثر یہ ہوگا کہ سب جاندار مخلوق پر موت طاری ہو جائے گی۔ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ زمین میں پھنسائے ہوئے لمبے چوڑے پہاڑوں کے سلسلے نفخۂ صور کی دہشت سے اس طرح ہو جائیں گے جیسے انہیں کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ بنا دیا گیا ہو۔

[۱۲] یہی قیامت کا دن ہوگا پھر اس کے اثرات زمین تک ہی محدود نہیں رہیں گے بلکہ آسمان بھی ایک بوسیدہ کپڑے کی طرح پھٹنا شروع ہو جائے گا اس میں کئی شگاف اور دراڑیں پڑ جائیں گی اور فرشتے جو آسمانوں کے درمیان تدبیر امور پر مامور ہیں سب آسمان کے کناروں کی طرف چلے جائیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آسمانوں کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

[۱۳] یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کی تعداد چار ہے۔ اس دن آٹھ فرشتے اس عرش کو اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ یہ عرش کتنا بڑا ہے اس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ زمین کو پہلا آسمان محیط ہے۔ دوسرا آسمان پہلے سے بڑا اور اس کو محیط ہے۔ علی ہذا القیاس ساتواں آسمان چھٹے کو محیط ہے۔ پھر اس کے اوپر آٹھواں آسمان ہے جسے کرسی بھی کہتے ہیں اور فلک افلاک بھی۔ پھر اس کے اوپر اللہ کا عرش ہے جسے محیط ہونے کے لحاظ سے نواں آسمان کہہ لیجئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اتنی بڑائی کے باوجود اللہ کا عرش اللہ سے بہر حال چھوٹا ہے اور اکبر اللہ ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ فرشتے اللہ کے عرش کو آج کیسے اٹھائے ہوئے ہیں اور اس دن ان کی تعداد دوگنی کیوں کر دی جائے گی؟ تو ان باتوں کے لئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف اتنی بات پر ایمان لاتے ہیں جو اللہ نے واضح طور پر خود بتلا دی ہے۔ نہ اس میں کچھ کمی کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اضافہ کی اور نہ کسی قسم کی تاویل کرنے کی۔ اور یہ سب کچھ نفخۂ صور ثانی کے بعد ہوگا۔ جب تمام لوگ اپنی قبروں سے زندہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور میدان محشر میں محاسبہ کے لئے جمع ہوں گے اس وقت اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائیں گے۔

[۱۴] یعنی وہ دن ہوگا جب تم اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اس پیشی میں تمہارے ارادہ کو کچھ دخل نہ ہوگا بلکہ اضطراراً تمہیں پیش کیا جائے گا اور تمہیں پیش ہونا پڑے گا۔ کوئی شخص اس دن پیشی سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ نہ ہی اللہ کے سامنے کوئی بات چھپانا

مَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ
حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَ
اشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ
فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿۲۶﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿۲۷﴾ مَآ

پھر جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: "یہ لو، میرا اعمال[۱۵] نامہ پڑھو (۱۹) مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنا حساب[۱۶] ملنے والا ہے۔ (۲۰)

پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا (۲۱) عالی مقام جنت میں (۲۲) جس کے پھلوں کے گچھے جھک رہے ہوں گے (۲۳) (انہیں کہا جائے گا) گزشتہ ایام میں جو عمل تم کر چکے ہو اس کے بدلے اب مزے سے کھاؤ پیو (۲۴) مگر جسے نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: "کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ جاتا (۲۵) اور مجھے یہ معلوم[۱۷] ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے؟ (۲۶) کاش! موت ہی فیصلہ چکا دیتی (۲۷)

ممکن ہوگی۔

[۱۵] دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عدالت میں اس کا شمار اللہ کے فرمانبرداروں اور صالحین میں سے ہوگا۔ اور اس بات کی طرف واضح اشارات موت سے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر جب اسے اس کے حساب کتاب کا رجسٹر دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا خود وہ دائیں ہاتھ سے وصول کرے گا تو اسے اس بات سے اتنی خوشی ہوگی کہ وہ پھولا نہ سمائے گا اور وہ دوسروں کو دعوت دے گا کہ ذرا میرا یہ اعمال نامہ تو دیکھو۔ مجھے اس امتحان میں کتنے اچھے نمبر ملے ہیں۔

[۱۶] ❁ <u>داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ ملنے والے کی خوشی کا منظر</u>:۔ چونکہ مجھے یہ یقین تھا کہ مجھ سے میرے اعمال کی باز پرس ہونے والی ہے۔ لہٰذا میں نے دنیا میں محتاط زندگی گزاری تھی۔ اور ہر ممکن کوشش کی تھی کہ مجھ سے اللہ کی کوئی نافرمانی نہ ہونے پائے۔ ایسے شخص کو فیصلہ کے بعد بلند و بالا باغات میں رہائش کے لیے جگہ ملے گی، کھانے کو لذیذ، مزیدار اور وافر اشیاء اور باغوں کے درختوں کے پھل ان کے سامنے جھک رہے ہوں گے۔ تاکہ انہیں اپنے حسب پسند پھل توڑنے کے لیے معمولی سی زحمت بھی گوارا نہ کرنی پڑے۔ یہ سب کچھ پیش کرنے کے بعد انہیں کہا جائے گا کہ خوب مزے اڑاؤ۔ جہاں سے جی چاہے کھاؤ اور جتنا جی چاہے بلا تکلف کھاؤ۔ دنیا میں تم نے اللہ کے احکام کی وجہ سے اپنے آپ پر کئی قسم کی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ آج اتنی ہی تمہیں آزادی دی جاتی ہے۔ یہ نعمتیں اور یہ آزادی تمہارے ان اعمال کی وجہ سے ہے کہ تم دنیا میں پابندیاں برداشت کرتے رہے۔

[۱۷] ❁ <u>بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملنے والے کی حسرت و یاس</u>:۔ جس طرح مومن کو مرنے کے ساتھ ہی ایسے واضح اشارات ملنے لگتے ہیں کہ اس کا انجام کیسا ہونے والا ہے اسی طرح اللہ کے منکروں کو بھی موت کے ساتھ ہی اپنا انجام معلوم ہونے لگتا

مَآ أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ﴿٢٨﴾ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ﴿٢٩﴾ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ﴿٣١﴾
ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ﴿٣٢﴾ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ
الْعَظِيمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿٣٤﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ﴿٣٥﴾ وَلَا

میرا مال (بھی) میرے کسی کام نہ آیا (۲۸) اور میری حکومت [۱۸] بھی برباد ہوگئی (۲۹) (حکم ہوگا) اسے پکڑ لو اور (گردن میں) طوق پہنا دو (۳۰) پھر اسے جہنم میں جھونک دو (۳۱) پھر اسے [۱۹] ایک ستر گز لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ (۳۲) یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا (۳۳) اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے [۲۰] کی ترغیب دیتا تھا (۳۴) لہٰذا آج اس کا کوئی غمخوار دوست نہ ہوگا" (۳۵)

ہے۔ جب اسے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ نہایت حسرت و یاس سے کہے گا کہ کاش مجھے میرے عملوں کی سزا اعمال نامہ دیے بغیر ہی دے دی جاتی۔ اور اس طرح سب لوگوں کے سامنے میری رسوائی نہ ہوتی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے یہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میرا نامہ اعمال اس قدر احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا جا رہا ہے کیا اچھا تھا کہ مرنے کے ساتھ ہی میرا سارا قصہ پاک ہو جاتا نہ دوبارہ زندگی ملتی نہ یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا۔ آج میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اپنا دنیا میں چھوڑا ہوا مال بطور فدیہ دے کر اپنی گلو خلاصی کرا سکوں۔

[۱۸] سلطانیۃ سلطان کا لفظ بادشاہی اور اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد وہ علاقہ ہے جو کسی شخص یا ادارہ یا سلطان کے زیر نگین ہو اور اس پر اس کا تسلط ہو۔ سلطان کا دوسرا معنی حجت، دلیل اور برہان ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جتنی دلیلیں آخرت کے انکار پر دیا کرتا تھا۔ آج ان میں سے کوئی دلیل بھی مجھے یاد نہیں آرہی۔

[۱۹] اس کافر کی اس قسم کی سوچ بچار اور اس کے متعلق الٰہی فیصلہ کے اعلان کے درمیان کتنی مدت ہوگی؟ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم یہ اعلان اس کے متعلق عدالت الٰہی سے باقاعدہ شہادتوں کی بنا پر کیے ہوئے فیصلہ کے بعد فرشتوں کو یہ حکم دیا جائے گا کہ اس بدبخت کو پکڑ لو اور اس کو طوق پہنا کر جہنم میں پھینک دو۔ پھر ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں اس کو پرو دو تاکہ جہنم کے عذاب کے درمیان یہ حرکت تک بھی نہ کر سکے۔

[۲۰] ❁ دو بنیادی گناہ ہیں جن سے باقی گناہ پھوٹتے ہیں:۔ اس کے اعمال نامہ یا فرد جرم میں دونوں بڑی قسموں کے جرائم پائے جاتے تھے۔ نہ وہ اللہ پر ایمان لایا اور نہ اس کے اوامر و نواہی کی پروا کی۔ واضح رہے کہ اگر کوئی شخص زبانی طور پر اللہ کی ہستی کا قائل تو ہو مگر آخرت پر اور اس کے سامنے باز پرس پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ تو اس کا زبانی اللہ کی ہستی کا اقرار کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ کفار مکہ اللہ کی ہستی کے قائل تھے مگر آخرت کے قائل نہ تھے تو اللہ نے انہیں کافر ہی قرار دیا ہے اور یہ جرم عذاب جہنم کے مستحق ہونے کے لئے کافی ہے۔ دوسری نوعیت کے جرائم وہ ہیں جن کا بظاہر حقوق العباد سے تعلق ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں بھی اللہ کے حقوق موجود ہوتے ہیں۔ ان کی عام قسم یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے سے ہمدردی کرے۔ تنگی ترشی میں ایک دوسرے کے کام آئے اور مالی مدد کرے اور یہ شخص اتنا بخیل واقع ہوا تھا کہ کسی کی مدد تو کیا کرتا دوسروں کو محتاجوں کی مدد کی تلقین یا انہیں کھانا کھلانے کی ترغیب بھی نہیں دیتا تھا۔

طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ﴿٣٦﴾ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿٣٧﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ﴿٣٨﴾
وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿٤٠﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا

اور زخموں کے دھوون کے سوا اسے کچھ کھانے کو بھی نہ ملے گا(٣٦) جسے گنہگاروں کے سوا[٢١] کوئی نہیں کھاتا(٣٧) پس میں ان چیزوں کی بھی قسم کھاتا ہوں جو تم دیکھتے ہو(٣٨) اور ان کی بھی جو تم نہیں[٢٢] دیکھتے(٣٩) کہ بلاشبہ یہ (قرآن) ایک معزز رسول[٢٣] کی زبان سے نکلا ہے(٤٠) یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ (مگر) تم کم ہی ایمان لاتے ہو(٤١)

[٢١] اس نے دنیا میں خود غرضی کا رویہ اختیار کیا، نہ کسی کی مدد کی، نہ ہمدردی کی، نہ ہی کبھی اسے ایسا خیال تک آیا تھا۔ لہٰذا آج اسے بھی غم خوار اور ہمدرد میسر نہ آئے گا۔ اور جب وہ بھوک سے بے تاب ہو جائے گا تو اسے اپنے جیسے دوزخیوں کے زخموں کا دھوون دیا جائے گا یہی اس کی خوراک ہوگی اور یہی اس کا مشروب ہوگا۔ اور یہ بات تو واضح ہے کہ زخموں کا دھوون نہ کوئی خوراک ہے اور نہ مشروب ہے۔ مگر ایسے مجرموں کو یہی کچھ کھانا پڑے گا۔ کوئی اور چیز انہیں مہیا نہیں کی جائے گی۔ پھر مجرموں کی بھی کئی اقسام ہیں کچھ دوزخی ایسے ہوں گے جنہیں کھانے کو تھوہر دیا جائے گا اور پینے کو کھولتا ہوا پانی۔

[٢٢] وہ چیزیں جو کافروں کو نظر آتی تھیں اور وہ جو نظر نہیں آتی تھیں وہ کیا ہیں؟ تم یہ دیکھ رہے ہو، تمہارا یہ صاحب (رسول اللہ ﷺ) ایک پاکیزہ سیرت انسان ہے۔ اور اس بات کے تم گواہ ہو کہ اس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ وہ ایک راست باز اور امین آدمی ہے۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ اس کا کوئی استاد بھی نہیں۔ پھر چالیس سال کی عمر میں یک لخت ایسا معجزہ نما کلام پیش کرنے لگا ہے جس نے تم سب کو چونکا دیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور اللہ نے ایک فرشتہ جبریل کے ذریعہ مجھ پر اتارا ہے اور میں اس کا رسول ہوں۔ تم نے انکار کیا تو اس نے تمہیں چیلنج کر دیا کہ اگر یہ اللہ کا کلام نہیں تو تم اس جیسا کلام بنا لاؤ اور اپنے سب ادیبوں اور شاعروں اور علماء کو اپنی مدد کے لیے بلا لو۔ مگر تم اس کا جواب دینے سے عاجز رہے پھر تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ جو کلام پیش کرتا ہے سب سے پہلے خود ان پر عمل پیرا ہوتا ہے پھر اس کے ساتھی بھی ان احکام کی تعمیل کرتے ہیں جن سے ان کے اخلاق سدھر رہے ہیں۔ تمہاری طعن و تشنیع کو، دشنام طرازیوں اور تمہاری ایذا رسانیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے ہیں اور تمہاری کارروائیوں کا زبان سے بھی جواب نہیں دیتے۔ یہ چیزیں تو وہ ہیں جو تم دیکھ رہے ہو اور جو نہیں دیکھ رہے وہ یہ ہیں کہ نہ تمہیں اللہ نظر آتا ہے نہ اس کے فرشتے جن کا تمام تر ظاہری اور باطنی اسباب پر کنٹرول ہے۔ اور نہ وہ فرشتہ جبریل جو قرآن لے کر تمہارے صاحب کے دل پر نازل ہوتا ہے۔ نہ تمہیں یہ نظر آ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے مسلمانوں کی کیسے امداد کر رہا ہے اور نہ تمہیں یہ نظر آ سکتا ہے کہ کون سے اسباب کے ذریعہ تمہاری جڑ کٹ جانے والی ہے؟

[٢٣] قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے جو جبریل کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں معزز رسول سے جبریل علیہ السلام بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے کہ بعینہ وہی الفاظ آپ ﷺ کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ معزز رسول سے آپ ﷺ کی ذات بھی مراد لی جا سکتی ہے۔

تُؤْمِنُونَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۴۲﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۴۳﴾
وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿۴۴﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿۴۶﴾

نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے (مگر) تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو (۴۲) یہ تو رب العالمین کی طرف [۲۴] سے نازل شدہ ہے (۴۳) اگر وہ رسول خود کوئی بات گھڑ کر ہمارے ذمہ لگا دیتا (۴۴) تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے (۴۵) پھر اس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے۔ (۴۶)

[۲۴] ❁ رسول اور شاعر کا فرق اور آپ کے شاعر نہ ہونے کی وجوہ:۔ یعنی جو باتیں تم دیکھتے ہو اور جو تم نہیں دیکھتے۔ میں ان سب کو اس بات پر شاہد بنا کر کہتا ہوں کہ یہ قرآن اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یا کسی دوسرے کا تصنیف کردہ نہیں ہے۔ جیسا کہ تم الزام دیتے رہتے ہو۔ اور جو چیزیں تم دیکھتے ہو کم از کم انہی کی بنا پر اگر تم تھوڑا سا غور کر لو تو تمہیں از خود معلوم ہو جائے کہ یہ قرآن نہ کسی شاعر کا قول ہو سکتا ہے اور نہ کسی کاہن کا۔ شاعر کے تخیل کی پرواز میں میدان زندگی کا ہر اچھا یا برا پہلو ہو سکتا ہے۔ ماحول کا تاثر اس کی طبیعت پر غالب رہتا ہے اور معاشرہ کی اکثریت چونکہ گمراہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا تخیل بھی انہی راستوں پر پرواز کرتا ہے۔ جبکہ قرآن صرف بھلائی ہی بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ شاعر کے افکار و نظریات میں اور بندش کلام میں عمر و عقل کی پختگی، تجربہ اور ممارست کی وجہ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن کلام اللہ ایسی تبدیلی اور قباحت سے یکسر پاک ہے اس نے جو بات پہلے دن پیش کی۔ پھر اس کے بعد جو کچھ پیش کیا۔ پہلے نظریہ کی تائید میں ہی پیش کیا۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت، الفاظ کی بندش، طرز بیان میں کبھی فرق نہیں آیا۔ علاوہ ازیں شاعر جو کچھ ڈینگیں مارتا ہے اور لاف زنی کر کے لوگوں کے جذبات میں وقتی طور پر ایک ہیجان سا پیدا کر دیتا ہے۔ مگر وہ اپنی اس لاف زنی پر نہ کبھی عمل پیرا ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ قرآن کو پیش کرنے والا رسول جو کچھ پیش کرتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ قرآن شاعری اور اس کی طرف دعوت دینے والا رسول شاعر ہے۔

❁ آپ کے کاہن نہ ہونے کی وجوہ:۔ یہ قرآن کسی کاہن کا کلام اس لئے بھی نہیں کہ کہانت کا ماخذ جنات اور خبیث روحیں ہیں جو ملاء اعلیٰ سے کوئی نہ کوئی بات سن لیتیں اور جھوٹ سچ ملا کر کاہنوں تک پہنچاتی ہیں۔ لہٰذا ان کی بتائی ہوئی غیب کی خبریں اکثر غلط ہوتی ہیں اور کبھی کبھار کوئی خبر صحیح بھی نکل آتی ہے۔ جبکہ قرآن کی خبروں کا ماخذ وحی الٰہی ہے جن کا جھوٹ ثابت ہونا ناممکنات سے ہے۔ ایسی بہت سی پیشگوئیاں قرآن میں مذکور ہیں۔ اور بہت سی احادیث میں بھی ہیں جن میں سے کئی باتیں اپنے وقت پر تمہاری آنکھوں کے سامنے پوری ہو رہی ہیں۔ کاہن اور نبی میں دوسرا فرق یہ ہے کہ کاہن صرف غیب کی خبریں دیتا ہے خواہ وہ سچی ہوں یا غلط، جبکہ قرآن اور رسول کی بعثت کا مقصد زندگی کے جملہ پہلوؤں میں انسان کی رہنمائی ہے۔ پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ کاہن کا کلام ہے۔ اگر تم خود ہی تھوڑا سا غور کر لو تو تمہیں از خود معلوم ہو جائے کہ قرآن نہ کسی شاعر کا کلام ہو سکتا ہے اور نہ کاہن کا۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ تم غور کرتے ہی نہیں۔ بس تمہیں صرف کچھ نہ کچھ الزام لگانے کی ہی پڑی رہتی ہے۔

فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ

مُكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾ ع ۲

تو تم میں سے کوئی بھی ہمیں اس کام سے روکنے[۲۵] والا نہ ہوتا(۴۷) یہ تو یقیناً پرہیزگاروں کیلئے ایک نصیحت ہے(۴۸) اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے[۲۶] کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں(۴۹) اور بلاشبہ یہ کافروں کیلئے باعث حسرت ہے(۵۰) اور یقیناً یہ بالکل[۲۷] حق ہے(۵۱) پس (اے نبی!) اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے جو بڑی عظمت والا ہے۔(۵۲)

[۲۵] قادیانیوں کا مرزا قادیانی کی نبوت پر استدلال اور اس کا جواب:۔ ذرا سوچو اگر کسی بادشاہ کا کوئی سفیر یا نائب بادشاہ کا پیغام پہنچانے کی بجائے اپنی طرف سے ہی پیغام دینا شروع کر دے اور یہ کہے کہ یہ بادشاہ کی طرف سے پیغام ہے تو بادشاہ اپنے ایسے غدار سفیر یا نائب سے کیا سلوک کرے گا۔ اسے جلاد کے حوالے کرنے کی بجائے یہ چاہے گا کہ خود اپنے ہاتھ سے اس کی گردن اڑا دے۔ پھر کیا اگر اللہ کا یہ رسول اپنی طرف سے باتیں بنا کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دے تو کیا اللہ اسے معاف کر دے گا؟ وہ تو اللہ کی نظروں میں سب سے بڑا مجرم ہوگا۔ جس نے اللہ کے کلام میں اپنا کلام شامل کر کے اس سارے کلام کو ہی مشکوک اور بے اعتبار بنا دیا۔

واضح رہے ان آیات سے نبوت کے جھوٹے مدعیوں نے دلیل پکڑی ہے کہ ہم سچے نبی ہیں اگر ہم جھوٹے ہوتے تو ہمیں فوراً ہلاک کر دیا جاتا۔ یہ استدلال انتہائی غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ وعید تو اس نبی کے لیے ہے جس کا نبی ہونا پہلے دلائل و براہین سے ثابت ہو چکا ہے۔ یہ وعید اس کے لیے نہیں جس کا نبی ہونا ہی ثابت نہ ہو۔ مثلاً حکومت کا ایک اعلیٰ افسر حکومت کے احکام کی بجائے اپنے احکام چلانے لگے تو حکومت اسے سخت سزا دے گی۔ لیکن اگر کوئی موچی یا سڑک کوٹنے والا یا جنگلی لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ میرے واسطہ سے تم کو گورنمنٹ کے یہ احکام دیئے جاتے ہیں۔ ایسے شخص کی باتوں پر کوئی بھی اعتبار نہیں کرے گا۔ نہ ہی حکومت ایسے لوگوں کی بکواس کو در خور اعتنا سمجھتی ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کر کے انہیں سزا دیا کرے۔ لوگوں نے تو نبوت کے بجائے خدائی کے بھی دعوے کیے۔ کئی لوگوں نے ان کی خدائی کو تسلیم بھی کیا۔ پھر بھی اللہ نے ایسے خداؤں کو فوراً کوئی سزا نہیں دی۔ اس لئے کہ یہ سراسر باطل ہے اور لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ بھی۔ کئی بہروپیے اپنے آپ کو اعلیٰ افسر ظاہر کرتے ہیں اور بعض لوگ ان سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں۔ مگر حکومت ایسے جعلی بہروپیوں کو کوئی سزا نہیں دیتی۔ علاوہ ازیں ان آیات میں آپ ﷺ کی نبوت پر استدلال ہے ہی نہیں بلکہ استدلال اس بات پر ہے کہ یہ قرآن کریم خالص اللہ کا کلام ہے۔ جس میں نبی کے کلام کی آمیزش بھی قطعاً ناقابل برداشت ہے۔ خواہ وہ کلام اللہ کی تفسیر ہی کیوں نہ ہو۔

[۲۶] یعنی جو لوگ غلط روی اور اس کے برے نتائج سے بچنا چاہتے ہیں وہ تو یقیناً اس قرآن سے نصیحت حاصل کریں گے۔ اور جن لوگوں کو اپنی اصلاح کی فکر ہی نہیں یا وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے وہ قرآن کو نہ اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور نہ اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ایک وقت آنے والا ہے جب وہ اپنے رویہ پر سخت نادم ہوں گے اور ان کا قرآن کو جھٹلانا ان کے لئے سخت حسرت و پشیمانی کا موجب ہوگا۔ لیکن اس وقت پچھتانے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

[۲۷] حق الیقین، یقین کا آخری درجہ جو بار بار کے تجربوں کے بعد حاصل ہو۔ جیسے ہر جاندار کو بالآخر موت سے دوچار ہونا پڑے گا یا کوئی جاندار کھانے پینے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یا آگ کا کام جلانا ہے اور ایسی بے شمار حقیقتیں ہیں جن کے یقینی ہونے میں ذرہ بھر شبہ نہیں ہوتا۔ قرآن بھی ایسی ہی ایک ٹھوس حقیقت ہے اس کے مضامین سراپا سچ ہیں جو عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہیں اور ہر طرح کے شک و شبہ سے بھی بالاتر ہیں۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ اس پر ایمان لا کر اس کے نازل کرنے والے کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہے جس نے انہیں یہ گرانقدر نعمت عطا فرمائی ہے۔

سُورَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ — ۴۴ آیاتھا — رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝۱ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝۲ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝۳
تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝۴ فَاصْبِرْ صَبْرًا

کلمات ۲۶۰ — آیات ۴۴ — (۷۰) سورۃ المعارج مکی ہے (۷۹) — رکوع ۲ — حروف ۹۷۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کسی طلب کرنے والے نے اس عذاب کا مطالبہ کیا جو واقع ہو کے رہے گا (۱) جسے کافروں سے کوئی ٹالنے[۱] والا نہیں (۲) (یہ عذاب) اللہ کی طرف سے (آئے گا) جو بلندیوں کا مالک[۲] ہے (۳) جس کی طرف روح اور فرشتے ایک دن[۳] میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے (۴) پس (اے نبی!) آپ صبر کیجئے،

[۱] کافر ایسا عذاب طلب کرتے ہی رہتے تھے۔ اللہ سے بھی اپنے حق میں ایسی دعا کیا کرتے تھے جیسا کہ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۳۲ میں مذکور ہے کہ کافر کہتے تھے کہ "اے اللہ! اگر یہ قرآن واقعی تیری طرف سے نازل ہوا ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا ہم پر عذاب بھیج دے۔ روایات میں ایسی بددعا کرنے والوں کے دو نام مذکور ہیں ایک ابو جہل بن ہشام اور دوسرا نضر بن حارث، اس بددعا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ تسلیم کرنے کو قطعاً تیار نہیں تھے۔ نہ ہی انہیں قرآن کی وعید کا کچھ اعتبار تھا۔ یہ تو ان لوگوں کا دنیوی عذاب سے متعلق مطالبہ تھا۔ اخروی عذاب کا مطالبہ کرنے والے تو بہت تھے جو از راہِ تمسخر و استہزاء آپ ﷺ سے کہا کرتے کہ جس عذاب سے دھمکاتے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے یا یوں کہتے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے رہتے ہو وہ آئے گا کب؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ وہ عذاب آئے گا بھی ضرور اور جب بھی آیا تو پھر تمہاری خیر نہیں، تمہیں کوئی اس سے بچا نہ سکے گا۔

[۲] ❁ معارج کی لغوی تشریح:۔ معارج (مَعْرَجٌ اور معراج کی جمع) عَرَجَ میں دو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں۔ جھکاؤ اور بلندی اور عَرَجَ فِي السُّلَّمِ بمعنی سیڑھی یا زینہ پر چڑھنا۔ سیڑھی پر چڑھنے کے لیے آگے کی طرف جھکنا بھی پڑتا ہے اور بلندی کی طرف چڑھنا عام چلنے کی نسبت دشوار بھی ہوتا ہے۔ نیز عرج کے معنی لنگڑا کر چلنا اور اَعْرَجَ بمعنی لنگڑا۔ کیونکہ لنگڑا کر چلنے میں بھی یہ دو باتیں پائی جاتی ہیں آگے کو جھکاؤ بھی اور بلندی پر چڑھنے جیسی دشواری بھی۔ اور معراج کے معنی بلندی پر چڑھنے کا ذریعہ بھی یعنی سیڑھی یا زینہ وغیرہ اور وہ بلند جگہ بھی جہاں پہنچنا مقصود ہو۔ رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوا تھا تو معراج سے مراد بلند مقام ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ آپ کو لے جانا چاہتا تھا۔ اور ﴿ذِي الْمَعَارِجِ﴾ کا معنی وہ بلند و بالا ذات جس کے سامنے سب بلندیاں ہیچ ہوں۔ بلند سے بلند مقامات کا مالک۔ گویا کافروں پر یہ ٹلنے والا عذاب ایسی بلند ذات کی طرف سے آئے گا۔

[۳] ❁ لفظ یوم کی مختلف مدتیں:۔ یوم یعنی دن۔ یعنی غروب آفتاب سے لے کر اگلے دن کے غروب آفتاب تک کا وقت۔

جَمِيْلًا ۝۵ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَاۤءُ كَالْمُهْلِ ۝۸

صبرِ جمیل [۴] (۵) یہ لوگ تو اسے بہت دور دیکھ [۵] رہے ہیں (۶) مگر ہم اسے قریب ہی دیکھتے ہیں (۷) جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح [۶] ہو جائے گا (۸)

لیل اور نہار کے وقت کا مجموعہ یا ۲۴ گھنٹے کی مدت۔ اور یوم کی یہ مدت ہم اہل زمین کے لئے ہے۔ چاند پر یہ یوم ہمارے حساب سے تقریباً ایک ماہ کا ہے۔ عطارد (Mercury) پر یہ دن ہمارے ۸۸ دنوں کے برابر ہے۔ قطب شمالی اور جنوبی پر تقریباً ایک سال کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا تو یہاں دن سے مراد مدت کا ایک طویل دور ہے جو ہمارے حساب سے لاکھوں سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں ایک مقام پر یوم کی مقدار ایک ہزار سال بتائی گئی ہے۔ (۲۲:۴۷) اس مقام پر مجرم قوموں پر دنیا میں عذاب آنے کا ذکر ہے۔ اور اس مقام پر یوم کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی گئی ہے۔ رہی یہ بات کہ جبریل امین یا دوسرے فرشتے یا نیک لوگوں کی ارواح اس بلندیوں کے مالک تک پچاس ہزار سال میں چڑھتے ہیں۔ تو یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کیونکہ یہ بات خالصتاً صفات الٰہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کون سی اسکیم یا منصوبہ کی تکمیل کے بعد فرشتے اور جبریل امین اس کی طرف اتنی مدت میں چڑھتے ہیں؟ اس کی جو بھی صورت پیش کریں گے وہ ناقص ہی ہو گی۔ اس کا ٹھیک مطلب اللہ ہی جانتا ہے۔ البتہ احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے دن کی مدت پچاس ہزار سال ہو گی۔ یہی وہ دن ہو گا جس میں کافروں کو یقیناً عذاب دیا جائے گا۔ یہ عذاب بلندیوں کے مالک کی طرف سے ہو گا اور کوئی طاقت کافروں کو اس عذاب سے بچا نہ سکے گی۔

[۴] ❁ صبرِ جمیل کا مفہوم اور فائدہ:۔ صبر جمیل یہ ہے کہ کسی کے طعن و تشنیع، مذاق و تمسخر اور ایذا رسانی کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیا جائے۔ خود تکلیف سہہ لی جائے مگر تکلیف پہنچانے والے کو زبان سے بھی برا بھلا نہ کہا جائے۔ نہ ہی دوسروں سے اس کی شکایت اور شکوہ کیا جائے اور یہ تجربہ شدہ بات ہے کہ صبرِ جمیل جس قدر تلخ اور ناگوار ہوتا ہے اس کا پھل اتنا ہی میٹھا ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مکی دور میں مسلمانوں کو اور آپ ﷺ کو صبر جمیل ہی کی تلقین کی جاتی رہی وجہ یہ تھی کہ اگر مسلمان اس دور میں محاذ آرائی پر اتر آتے، خواہ یہ صرف زبانی تلخ کلامی تک ہی محدود ہوتی تو اس سے اسلام کی دعوت کے مقصد کو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اسلام کی منزل مقصود یہ تھی کہ اللہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔ جو تیئس سال کے قلیل عرصہ میں حاصل ہو گئی اور اگر مسلمان اسی دور میں محاذ آرائی شروع کر دیتے تو نہ معلوم اس مقصد کے حصول میں کتنی لمبی مدت کی تاخیر واقع ہو جاتی۔

[۵] یعنی قیامت کو اور اس کے عذاب کو بعید از قیاس یا ناممکن سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ عنقریب واقع ہونے والا ہے۔

[۶] مُھل کے معنی پگھلا ہوا تانبا بھی اور تیل کی تلچھٹ بھی۔ اور ان دونوں چیزوں کی رنگت سرخی مائل ہوتی ہے۔ یعنی آج تو ہمیں آسمان نیلگوں نظر آتا ہے اس دن یہ اپنا رنگ بدلنا شروع کر دے گا حتیٰ کہ نیلگوں ہونے کی بجائے سرخی مائل ہو جائے گا۔

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝٩ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝١٠ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ
يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝١١ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝١٢ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي
تُؤْوِيهِ ۝١٣ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝١٤ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝١٥ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ۝١٦
تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۝١٧ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ۝١٨ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝١٩ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ

اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنکی[7] ہوئی رنگ رنگ کی روئی (9) اس دن کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ
پوچھے گا (10) حالانکہ وہ ایک دوسرے[8] کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم یہ چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے
لیے اپنے بیٹوں کو فدیہ کے طور پر دے دے (11) اور اپنی جورو کو اور اپنے بھائی کو (12) اور اپنے ان کنبہ والوں کو جو اسے پناہ دیا
کرتے تھے (13) اور جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کچھ[9] دے کر اپنے آپ کو بچا لے (14) ہرگز ایسا نہیں ہوگا وہ آگ
ہوگی (15) کھالوں[10] کو ادھیڑ دینے والی (16) وہ ہر اس شخص کو بلائے گی جس نے حق سے پیٹھ پھیری[11] اور سرتابی کی (17) اور
مال جمع کیا پھر سنبھال سنبھال کر رکھتا رہا (18) بلاشبہ انسان تھڑدلا[12] پیدا کیا گیا ہے (19) جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔۔

[7] پہاڑوں کے پتھر بھی کئی رنگوں کے ہوتے ہیں مثلاً سرخ، سفید، کالے، دھاری دار' اسی طرح اون کے عموماً یہی رنگ ہوتے ہیں۔ پہاڑ اس دن ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑنے لگیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ رنگ برنگی دھنکی ہوئی روئی کے گالے اڑ رہے ہیں۔

[8] دکھائے اس لیے جائیں گے کہ بھلا آج بھی وہ ایک دوسرے کو اپنی ہمدردیاں جتاتے ہیں یا نہیں؟ جیسا کہ دنیا میں جتایا کرتے تھے۔ مگر اس دن یہ دوست ایک دوسرے سے بات تک کرنے کے روادار نہ ہوں گے۔ ہر ایک کو اپنی ہی فکر دامنگیر ہوگی۔

[9] اس دنیا میں یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے کہ بسا اوقات باپ بیٹے پر، بیٹا باپ پر، خاوند بیوی پر، بیوی خاوند پر، ماں بیٹے پر، بیٹا ماں پر، دوست دوست پر فدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایسی مثالیں کم ہیں تاہم مل ضرور جاتی ہیں۔ مگر اس دن یہ حال ہوگا کہ مجرم یہ سوچے گا کہ ماں، باپ اور اولاد تو درکنار میری طرف سے ساری دنیا جہنم میں جاتی ہے تو جائے میری بلا سے بس ایک میں جہنم کے عذاب سے بچ جاؤں۔ لیکن اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔

[10] شویٰ بمعنی جسم کے اطراف۔ ہاتھ پاؤں اور وہ اعضاء جن پر زخم لگنے سے موت واقع نہ ہو۔ کہتے ہیں رَمَاہُ فَاَشْوَاہُ یعنی اس نے اسے تیر مارا تو اس کے اطراف پر لگا۔ یعنی کسی ایسے عضو پر نہیں لگا جس پر زخم لگنے سے موت واقع ہوتی۔ یعنی جہنم کی آگ ان کی کھالوں کو کھینچ لے گی۔ کھالیں گل جائیں گی جسم ننگے بے کھال ہو جائیں گے مگر یہ آگ مجرموں کی جان ختم نہیں کر سکے گی۔

[11] آیت نمبر ۱۷ اور نمبر ۱۸ میں انہیں دو بنیادی جرائم کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو انسان کو جہنم کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ اور ان جرائم کا ذکر سورۃ الحاقہ کی آیت نمبر ۳۳ اور ۳۴ کے حاشیہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو جہنم اپنے ہاں بلا لے گی۔ اور ایک روایت کے مطابق جہنم سے ایک گردن نکلے گی جو جہنم کے مستحق لوگوں کو یوں چن چن کر اٹھا لے گی جیسے کوئی پرندہ زمین سے پڑا ہوا دانہ اٹھا لیتا ہے۔

[12] ❁ ھلوعا کا لغوی مفہوم:۔ ھَلُوْعًا بمعنی بے قرار، بے ثبات، ایک حالت پر قائم نہ رہنے والا۔ حالات کی تبدیلی کا فوراً اثر قبول کر

جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآىِٕمُوْنَ ﴿٢٣﴾

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ

تو گھبرا اٹھتا ہے(۲۰) اور جب مال ملتا ہے تو بخیل[۱۳] بن جاتا ہے(۲۱) مگر نماز[۱۴] ادا کرنے والے(۲۲) جو ہمیشہ اپنی نماز پر قائم[۱۵] ہیں(۲۳)

اور جن کے اموال میں کا ایک مقرر حق[۱۶] ہے(۲۴) سائل اور (سوال سے بچنے کی بنا پر) محروم(۲۵) اور جو قیامت کے

لینے والا۔ یعنی انسان فطری طور پر ایسا ہی پیدا ہوا ہے۔ یہ کیفیت ایک عام دنیادار انسان یا انسانوں کی اکثریت کی ہے۔ اور جو لوگ ایمان لاکر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں ان کے دل کی یہ کیفیت نہیں رہتی ان کے دل میں صبر و سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

[۱۳] یعنی انسان کی عمومی سرشت یہی ہے کہ اسے جب کوئی تکلیف پہنچے۔ کوئی بیماری آ لگے یا معاشی تنگی میں مبتلا ہو تو صبر کے ساتھ وہ وقت گزارنے کے بجائے جزع و فزع شروع کر دیتا ہے۔ کبھی تقدیر کو کوسنے لگتا ہے اور کبھی اپنے نصیبوں کو اور جب اللہ اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے تو پھر بھی اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ بلکہ مال و دولت کو گلے سے ایسے لگا لیتا ہے جیسے خزانے پر سانپ بیٹھا ہو۔ پھر وہ ایسا ننانوے کے چکر میں پڑ جاتا ہے کہ کسی غریب محتاج کی مدد کرنا اور اس کی کسی ضرورت کو پورا کرنا تو درکنار، اپنے اہل و عیال بلکہ اپنی ذات پر خرچ کرنا گوارا نہیں کرتا۔ اس کی بس ایک ہی ہوس ہوتی ہے کہ اس کی دولت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے۔

[۱۴] یہ دونوں حالتیں، یعنی تنگ دستی میں صبر کے بجائے شکوہ و شکایت اور خوشحالی میں اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے بخل اور پیسہ سے والہانہ محبت ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو جہنم میں لے جانے والی ہیں۔ البتہ جن لوگوں میں اور بالخصوص جن ایمانداروں میں مندرجہ ذیل آٹھ صفات، جو آگے آیت نمبر ۲۲ سے ۳۴ تک مذکور ہیں، پائی جائیں وہ عذاب جہنم سے محفوظ رہیں گے۔ اور ان میں مذکورہ بالا قباحتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔

[۱۵] ❁ دائمون کے دو مفہوم:۔ سب سے پہلی اور اہم صفت یہ ہے کہ وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ بروقت ادا کرتے ہیں۔ باجماعت ادا کرتے ہیں۔ ٹھیک طرح سے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ اس آیت میں دَائِمُوْنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دوام کا ایک معنی تو ہیشگی ہے اور دَامَ الشَّیْئُ بمعنی کسی چیز کا عرصہ دراز تک بلا تغیر ایک ہی حالت میں رہنا، ترجمہ میں یہی معنی اختیار کیا گیا ہے اس کا دوسرا معنی سکون اور ٹھہراؤ ہے اور مَاءُ الدَّائِمِ بمعنی کھڑا پانی جس میں کچھ حرکت نہ ہو۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہو گا کہ وہ لوگ اپنی نماز کو نہایت سکون، ٹھہراؤ، اطمینان قلب اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ وہ نہ یہ کرتے ہیں کہ منافقوں کی طرح جلدی جلدی چند ٹھونگیں ماریں اور فٹافٹ نماز سے فارغ ہوئے۔ اور نہ یہ کرتے ہیں کہ بس ایک اللہ کی یاد کو دل و دماغ میں نہ لائیں باقی ادھر ادھر کی ساری باتیں نماز میں سوچتے رہیں۔

[۱۶] ❁ سوال کرنا صرف تین طرح کے لوگوں کو جائز ہے:۔ سائل سے مراد پیشہ ور گداگر نہیں۔ ایسی گداگری کا اسلام میں کوئی جواز نہیں سائل سے مراد وہ شخص ہے۔ جو فی الواقع مانگنے پر مجبور ہو۔ چنانچہ سیدنا قبیصہ بن مخارق کہتے ہیں کہ میں ایک شخص کا ضامن

بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٢٧﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ
مَاْمُوْنٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِيْنَ

دن کی تصدیق کرتے ہیں (٢٦) اور جو اپنے پروردگار کے عذاب[١٧] سے ڈرتے رہتے ہیں (٢٧) کیونکہ ان کے پروردگار کا عذاب بے خوف رکھنے والی چیز نہیں (٢٨) اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (٢٩) بجز اپنی بیویوں یا مملوکہ عورتوں کے، کہ ان کے بارے میں انہیں کوئی ملامت نہیں (٣٠) البتہ ان کے علاوہ جو کوئی اور راہ چاہیں تو ایسے ہی لوگ حد سے تجاوز[١٨] کرنے والے ہیں (٣١) اور جو اپنی امانتوں[١٩]

ہوں پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس بارے میں سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں ٹھہرو تاآنکہ ہمارے پاس صدقہ آئے پھر ہم تیرے لیے کچھ حکم کریں گے۔ پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا: "قبیصہ! تین شخصوں کے سوا کسی کو سوال کرنا جائز نہیں۔ ایک وہ جو ضامن ہو اور ضمانت اس پر پڑ جائے جس کا وہ اہل نہ ہو۔ وہ اپنی ضمانت کی حد تک مانگ سکتا ہے۔ پھر رک جائے دوسرے وہ جسے ایسی آفت پہنچے جو اس کا سارا مال تباہ کر دے۔ وہ اس حد تک مانگ سکتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے اور تیسرے وہ شخص جس کو فاقہ کی نوبت آگئی ہو اور اس کے قبیلہ کے تین معتبر شخص گواہی دیں کہ فلاں کو فاقہ پہنچا ہے۔ اسے سوال کرنا جائز ہے تاآنکہ اس کی محتاجی دور ہو جائے" پھر فرمایا: "اے قبیصہ ان تین قسم کے آدمیوں کے سوا کسی اور کو سوال کرنا حرام ہے اور ان کے سوا جو شخص سوال کر کے کھاتا ہے وہ حرام کھا رہا ہے۔ (مسلم۔ کتاب الزکوۃ۔ باب من تحل له المسئلة)

نیز سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ وہ دراصل آگ کے انگارے طلب کر رہا ہے اب وہ چاہے تو کم کرے یا زیادہ اکٹھے کر لے" (بخاری۔ کتاب الوصایا۔ باب تاویل قوله تعالى من بعد وصية توصون بها اودين) اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جو سوال کرنے کا مستحق ہونے کے باوجود سوال کرنے سے ہچکچاتا ہو۔ جسے ہماری زبان میں سفید پوش کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں محروم سے مراد وہ شخص بھی ہے جو روزگار کی تلاش میں ہو اور روزگار اسے میسر نہ آ رہا ہو یا جتنی روزی کما رہا ہے اس سے اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں یا روزی کمانے کے قابل ہی نہ ہو۔ جیسے بوڑھا، بیمار، اندھا، لنگڑا، اپاہج وغیرہ۔

[١٧] روز جزا و سزا کی تصدیق کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ پھر اسی تصدیق کے نتیجہ میں وہ ہر اس کام سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں جس پر اللہ کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ اور انہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ہماری کوتاہیاں ہماری نیکیوں سے بڑھ نہ جائیں۔ جو ہمیں اللہ کے عذاب کا مستحق بنا دیں۔

[١٨] آیت نمبر ٢٩، ٣٠ اور ٣١ کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون کی آیت نمبر ٥، ٦، ٧ کے حواشی اس کے علاوہ النور آیت نمبر ٣٠ اور الاحزاب آیت نمبر ٣٥ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

[١٩] اس آیت کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ مومنون کی آیت نمبر ٨ کا حاشیہ

هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ
عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ ع
مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ

اور اپنے عہد کا پاس رکھتے ہیں (۳۲) اور جو اپنی شہادتوں [۲۰] پر (راست بازی) سے قائم رہتے ہیں (۳۳) اور جو اپنی نمازوں کی محافظت [۲۱] کرتے ہیں (۳۴) یہی لوگ عزت واحترام کے ساتھ جنتوں میں رہیں گے (۳۵)

ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ آپ کی طرف دوڑے آرہے ہیں (۳۶) دائیں سے اور بائیں [۲۲] سے گروہ در گروہ (آرہے ہیں) (۳۷) کیا ان میں سے ہر ایک یہ طمع رکھتا ہے کہ…

[۲۰] شہادت کا مفہوم اہمیت اور شہادت پر قائم رہنے کی تاکید:۔ شہادت اس بیان کو کہتے ہیں جو ایک گواہ، خواہ وہ عینی گواہ ہو یا بعض حقائق کو علم کی حد تک جانتا ہو جسے قلبی شہادت کہتے ہیں، عدالت میں حاضر ہو کر قاضی کے سامنے دیتا ہے۔ اور قاضی اور عدالت سے مراد ہر وہ فرد یا ادارہ ہے جو فیصلہ کرنے کے بعد اپنے فیصلہ کو نافذ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو۔ عدالتوں کے ہاں یہ قوت نافذہ پولیس ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی فیصلہ کرنے والی پنچایت یا کونسل کو بھی عدالت کہہ سکتے ہیں اور کوئی گواہ کسی بے تعلق آدمی کے سامنے وہی بیان دے جو وہ عدالت میں دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو ایسے بیان دینے کو شہادت نہیں کہیں گے۔ چونکہ شریعت نے فیصلہ کا انحصار شہادتوں پر رکھا ہے۔ اور قاضی شہادتوں سے باہر ہو کر فیصلہ نہیں دے سکتا حتیٰ کہ فوجداری مقدمات میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر بھی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے ایک گواہ کی شہادت بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں بے شمار مقامات پر شہادت صاف صاف دینے اور اس پر قائم رہنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں شہادت الزور کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ شہادت کا کچھ حصہ چھپا جانا، یا عند الضرورت شہادت سے انکار کر دینا یا خاموش رہنا اور کچھ بھی بیان نہ دینا یا بیان کو گول مول کر جانا یا اس بیان کو اس طرح توڑ موڑ کر یا ہیر پھیر کر بیان کرنا جس سے مجرم بچ جائے یا کسی بھی فریق کی حق تلفی ہو رہی ہو یا جانبداری سے کام لے کر اس کے جرم سے زیادہ سزا دلوانے کی کوشش کی جائے یہ سب صورتیں حرام، گناہ کبیرہ اور شہادۃ الزور کے ضمن میں آتی ہیں۔ گویا ایمانداروں کی ایک نہایت اعلیٰ صفت یہ بھی ہے کہ وہ صاف سیدھی شہادت پر قائم رہتے ہیں۔

[۲۱] سورۂ مومنون کی ابتدا میں فلاح پانے والے ایمانداروں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ جو بہت حد تک انہی صفات سے ملتی جلتی ہیں جو یہاں بیان کی جارہی ہیں سورۂ مومنون میں ان صفات کی ابتدا بھی نماز سے ہوئی تھی اور انتہا بھی نماز پر ہی ہوئی۔ اور اس مقام پر بھی بعینہ وہی صورت ہے جس سے دین میں نماز کی اہمیت کا ٹھیک طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

[۲۲] جب رسول اللہ ﷺ لوگوں کو قرآن سنانے، وعظ و نصیحت کرنے اور احوال قیامت بیان کرنے کے لیے کھڑے ہوتے اور اس مقصد کے لیے آپ عموماً کعبہ اور اس کے آس پاس ہی کھڑے ہوتے تھے۔ کافر آپ ﷺ کی آواز سن کر چاروں طرف سے آپ ﷺ کی طرف دوڑے چلے آتے تھے۔ آکر کبھی شور مچانا شروع کر دیتے، کبھی تالیاں بجاتے، کبھی مذاق اڑاتے تھے اور ان کی

يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۝ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ
وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ فَذَرْهُمْ

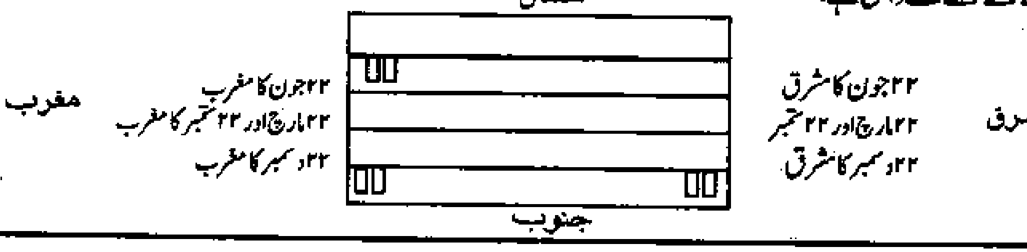
اسے نعمتوں[۲۳] والی جنت میں داخل کر دیا جائے گا؟(۳۸) ہر گز ایسا نہ ہوگا[۲۴]۔ ہم نے انہیں اس چیز سے پیدا کیا ہے جسے وہ خود بھی جانتے ہیں(۳۹) سو میں مشرقوں اور مغربوں[۲۵] کے مالک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم یقیناً اس بات پر قادر ہیں(۴۰) کہ ان کے بدلے ان سے بہتر[۲۶] مخلوق لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے(۴۱)

ان کرتوتوں سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اول تو کوئی شخص قرآن سننے ہی نہ پائے اور اگر کسی کے کان میں کچھ پڑ بھی جائے تو اس کا اثر قبول نہ کرے۔

[۲۳] بایں ہمہ ان کافروں کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر مسلمانوں کے کہنے کے مطابق دوسری زندگی اور جنت اور دوزخ ہوئی بھی تو ہم ان مسلمانوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ اپنے اسی نظریہ کو بھی وہ ان الفاظ میں ادا کرتے تھے کہ جو پروردگار آج ہم پر مہربان ہے۔ اگر دوسری زندگی ہوئی تو آخر کیا وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہم پر ناراض ہو وہ وہاں بھی ہم پر مہربان ہی رہے گا۔

[۲۴] یعنی ان کی کرتوتیں یہ ہیں کہ اللہ کے کلام کو جھٹلاتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔ انہیں تکلیفیں پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسلام کی راہ روکنے کی سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ اس پر امیدیں یہ لگائے بیٹھے ہیں کہ نعمتوں والی جنت بھی ہمارے لئے ہے۔ ان کی یہ توقع بالکل بے ہودہ اور باطل ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ جس خالق نے انہیں پانی کے حقیر و ذلیل قطرہ سے پیدا کر کے اس منزل پر پہنچایا ہے وہ انہیں ویسی ہی حقیر اور ذلیل حالت کی طرف لوٹا بھی سکتا ہے۔

[۲۵] مشرق عموماً سورج کے طلوع ہونے کی جگہ اور مغرب سورج کے غروب ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ سورۂ مزمل میں ایک مشرق اور ایک مغرب کا ذکر ہے۔ سورۂ الرحمٰن میں دو مشرقوں اور دو مغربوں کا ذکر ہے۔ اور اس مقام پر بہت سے مشرقوں اور مغربوں کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موسم سرما کے سب سے چھوٹے دن یعنی ۲۲ دسمبر کو سورج مشرق کی طرف سے نکلنے کے باوجود جنوب کی طرف بہت زیادہ مائل ہوتا ہے۔ اسی طرح اس دن سورج کا مغرب بھی جنوب کی طرف بہت زیادہ مائل ہوتا ہے۔ اسی طرح موسم گرما میں سب سے بڑے دن یعنی ۲۲ جون کو سورج مشرق کی سمت سے نکلنے کے باوجود شمال کی طرف بہت زیادہ مائل ہوتا ہے اسی طرح اس دن جب مغرب میں غروب ہوتا ہے تو شمال کی طرف بہت زیادہ مائل ہوتا ہے اور جب دن رات برابر ہونے کے دن یعنی ۲۲ مارچ اور ۲۲ ستمبر کو سورج عین مشرق سے طلوع ہو کر عین مغرب میں غروب ہو جاتا ہے جیسا کہ سامنے کے نقشے سے واضح ہے:



يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿٤٢﴾ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا
كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿٤٣﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٤٤﴾ ع ۲ ۸

لہٰذا انہیں اپنی بے ہودہ باتوں اور کھیل کو پڑا رہنے دیجئے تا آنکہ وہ دن دیکھ لیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (۴۲) جس دن وہ اپنی قبروں سے نکل کر اسی طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے بتوں[۲۷] (کے استھانوں) کی طرف دوڑ رہے ہوں (۴۳) ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہو گی۔ یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا (۴۴)

اس نقشہ میں مقام "الف" اور "ب" "مشرقین" ہیں اور مقام "ج" اور "د" "مغربین" ہیں۔ پھر ان مشرقین اور مغربین کے درمیان ۳۶۵ مشرق ہیں اور اتنے ہی مغرب کیونکہ سورج ہر روز ایک نئے زاویہ سے طلوع ہوتا ہے۔ یہ صورت تو صرف ایک سیارے سورج کی ہے۔ جبکہ بہت سے سیارے مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں جا ڈوبتے ہیں۔ اس طرح مشرقوں اور مغربوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

[۲۶] یعنی جو پروردگار اتنے زیادہ مشرقوں اور مغربوں کو وجود میں لا سکتا اور ان پر مکمل کنٹرول رکھ سکتا ہے کہ ان کے زاویوں میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آنے پائے وہ یہ نہیں کر سکتا کہ تم سے تمہاری یہ چھوٹی چھوٹی سرداریاں، جن پر تم اس قدر پھولے پھرتے ہو، تم سے چھین کر تمہیں ذلیل و رسوا کر کے پیچھے ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان متکبر قریشیوں کو پیچھے ہٹایا اور ان مسلمانوں کو آگے کر دیا جن کے ساتھ یہ بیٹھنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد معاملہ یکسر الٹ گیا۔ مسلمان فتح یاب اور حاکم اور یہ قریشی مقہور و مغلوب ہو گئے اور بعد میں ان کافروں میں سے عزت صرف اسے ملی جس نے اسلام کی آغوش میں پناہ لے لی۔

[۲۷] ❁ نصب کا لغوی مفہوم:۔ نُصُبٌ: نصب الشئ بمعنی کسی چیز کو سیدھے رخ کھڑا کر دینا اور زمین میں گاڑ دینا اور نصیب اس پتھر کو بھی کہتے ہیں جو بطور نشان راہ گاڑا جاتا ہے نیز نصیب پتھر یا لوہے کے اس مجسمے کو بھی کہتے ہیں جو کسی جگہ بغرض عبادت نصب کر دیا گیا ہو۔ یہ مجسمے عموماً نبیوں، ولیوں اور پیروں یا بادشاہوں کے ہوتے ہیں۔ اور ایسے مقامات جہاں یہ مجسمے نصب ہوں انہیں بھی نصیب یا تھان یا استھان یا آستانے کہا جاتا ہے اور نصیب کی جمع نصب یا انصاب آتی ہے۔ گویا نصب کے تین معنی ہوئے (۱) نشان راہ کے پتھر، (۲) نصب شدہ مجسمے، (۳) وہ مقام جہاں مجسمے یا بت نصب ہوں۔ اس آیت میں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ پہلا معنی اس لحاظ سے کہ ان کا یہ دوڑنا اللہ کے حکم کے تحت اور اضطراری امر ہو گا اور باقی دونوں معنی اس لحاظ سے کہ دنیا میں وہ ایسے بتوں کے مجسموں اور تھانوں کی طرف تیزی سے دوڑ کر جایا کرتے تھے۔ قیامت کے دن بھی وہ اسی طرح تیزی سے دوڑے جا رہے ہوں گے اور اللہ نے ان کے لئے وہی کیفیت بیان فرمائی جس کو وہ خوب جانتے اور اس دنیا میں اس کے عادی تھے۔

سُوْرَةُ نُوْحٍ مَكِّيَّةٌ — ۲۸ آیاتها — رکوعها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ

کلمات ۲۳۱ آیات ۲۸ (۷۱) سورۃ نوح مکی ہے (۷۱) رکوع ۲ حروف ۹۷۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ہم نے نوح کو اس کی قوم[۱] کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا کہ اپنی قوم کو (برے انجام سے) ڈراؤ۔ پیشتر اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے (۱) انہوں نے کہا: "اے میری قوم! بلاشبہ میں تمہارے لیے صاف طور پر ڈرانے والا ہوں (۲) کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس سے ڈرو اور میری اطاعت[۲] کرو (۳) وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا

[۱] سیدنا نوح علیہ السلام کا ذکر:۔ سیدنا نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن میں پہلے بہت سے مقامات پر گزر چکا ہے۔ یہ سورت پوری کی پوری آپ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس سورت میں آپ کی زندگی کے پورے واقعات مذکور نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا اکثر حصہ سیدنا نوح علیہ السلام کی اپنے پروردگار سے فریاد اور دعاؤں پر مشتمل ہے۔ آپ کی شبانہ روز کی تبلیغ اور پورے ساڑھے نو سو سال کی تبلیغ کے نتیجہ میں قوم نے آپ کی تبلیغ سے جیسا اثر قبول کیا، اسی کا شکوہ سیدنا نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے بیان فرماتے ہیں۔ آپ علیہ السلام کا مرکز تبلیغ عراق میں دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ تھا۔ سیدنا آدم علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام کے درمیان پانچ ہزار سال کا طویل عرصہ حائل ہے اور اس طویل درمیانی عرصہ میں صرف ایک ہی قابل ذکر نبی سیدنا ادریس علیہ السلام کا ذکر ہمیں قرآن میں ملتا ہے۔ لیکن وہ بھی صاحب شریعت نبی نہیں تھے۔ جب سیدنا نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے تو اس وقت ان کی قوم میں شرک کا مرض ایک وبا کی طرح پھیل چکا تھا۔ چنانچہ ان ابتدائی آیات میں ہی سیدنا نوح علیہ السلام کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ اپنی قوم کو شرک کے برے انجام سے وارننگ دے دیجئے اور اگر وہ باز نہ آئے تو یقیناً انہیں دردناک سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

[۲] نوح کی دعوت کے نکات:۔ جب کوئی نبی مبعوث کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اپنی نبوت پر ایمان لاتا ہے۔ بعد ازاں وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی نبوت کا اعلان کرتا ہے۔ اپنے اس تعارف کے بعد وہ لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتا ہے۔ نوح علیہ السلام نے بھی اپنی نبوت کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا۔ ﴿اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ پھر اس کے بعد تین باتیں ارشاد فرمائیں۔ (۱) صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اور بتوں کی عبادت چھوڑ دو، (۲) ڈرو تو صرف اللہ سے ڈرو، بتوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارا یہ کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کے احکام بجا لاؤ، (۳) اور اللہ کے احکام بجا لانے کی صورت یہ ہے کہ میری اطاعت کرو۔ اگر تم یہ تینوں کام سرانجام دو گے تو اللہ تمہارے سابقہ گناہ معاف فرما دے گا اور تمہیں تمہاری طبعی عمر تک زندہ رہنے دے گا تاکہ تم نیک اعمال بجا لا کر اخروی عذاب سے بچ جاؤ۔ اور اگر یہ باتیں نہ مانو گے تو پھر تمہاری طبعی موت سے پہلے ہی

ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ

تَعْلَمُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ۙ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاۗءِىْٓ اِلَّا

فِرَارًا ۝ وَاِنِّىْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا

اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دے گا اور جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجائے تو اس میں تاخیر نہ ہو گی۔ کاش تم یہ بات جان لو (۴) (نوح نے) عرض کیا: "اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دی۔ (۵) مگر میری دعوت[۳] سے ان کے فرار ہی میں اضافہ ہوا (۶) اور میں نے جب بھی انہیں بلایا تاکہ تو انہیں معاف[۴] کر دے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور اپنے کپڑوں سے اپنے منہ ڈھانپ لیے،

تم پر عذاب نازل کرے گا پھر اس وقت نہ تمہارا ایمان لانا کچھ فائدہ دے گا اور نہ ہی تمہیں کچھ مزید مہلت مل سکے گی۔ لہٰذا اس وقت جو تمہیں مہلت ملی ہوئی ہے اس میں اپنا نفع و نقصان خوب سوچ سمجھ لو اور سنبھل جاؤ۔

❁ قوم کے مختلف جوابات:۔ یہ تھی وہ دعوت جو سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی۔ اور اس قسم کی دعوت ہی حق و باطل کے درمیان محاذ آرائی کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ قوم کے چودھری سینہ تان کر سیدنا نوح علیہ السلام کی مخالفت پر اتر آئے۔ کبھی کہتے: ارے! ہم میں اور تم میں فرق کیا ہے؟ تم بھی ہمارے جیسے ہی محتاج انسان ہو، تمہیں بھی ویسے ہی کھانے پینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جیسے ہم کھاتے پیتے ہیں۔ پھر ہم تمہاری اطاعت آخر کیوں کریں؟ کبھی کہتے کہ یہ تم سارے جہان سے نرالی اور ان ہونی بات کہتے ہو کہ ہم اپنے بتوں کی عبادت چھوڑ دیں۔ ایسی دیوانگی کی باتیں چھوڑ دو۔ کبھی کہتے کہ اگر تم ہمارے معبودوں کی توہین سے باز نہ آئے تو وہ تمہیں ایسی بری مار ماریں گے کہ پھر اٹھ نہ سکو گے، اور کبھی کہتے کہ جس عذاب کی تم دھمکی دے رہے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے، اور کبھی کہتے: نوح علیہ السلام! یہ چند بدھو قسم کے لوگ تم نے اپنے ساتھ لگا لیے ہیں یہ تو ہمارے کمینے اور رذیل لوگ ہیں۔ ان کے بل بوتے پر تم ہم سے مطالبہ کرتے ہو کہ ہم بھی تمہاری اطاعت کریں؟ غرض سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان اس قسم کے مذاکرات آٹھ نو سو سالوں پر محیط ہیں جن کو اس مقام پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس طویل مدت کی تبلیغ کا جو نتیجہ سیدنا نوح علیہ السلام کی سمجھ میں آیا وہ ان الفاظ میں اپنے پروردگار کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

[۳] یعنی میں نے اپنی امکانی حد تک لوگوں کو تیرا پیغام پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حتیٰ کہ دن رات ایک کر دیا۔ مگر یہ قوم کچھ اس قدر ضدی واقع ہوئی ہے کہ ہر سیدھی بات کا الٹا ہی مطلب لیتی ہے۔ میں نے جتنی بھی کوشش کی کہ انہیں اپنے قریب لا سکوں اتنا ہی یہ مجھ سے دور رہنے اور بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔

[۴] یعنی اگر وہ اللہ پر ایمان لے آئیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے گا۔ لیکن ان بدبختوں نے میری بات سننا بھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور دوسرا کام وہ یہ کرتے ہیں کہ جہاں کہیں مجھے دیکھتے ہیں اپنا منہ ڈھانپ لیتے ہیں کہ میں انہیں دیکھ کر بلا نہ لوں یا پھر انہیں مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ وہ میری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے اور اپنے منہ پر کپڑا ڈال لیتے ہیں۔ یہ ہے ان کی ضد اور نفرت کی انتہا انہوں نے تو تیرے احکام کے سامنے اکڑ جانے میں حد کر دی۔

ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿٧﴾ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿٨﴾ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ
لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ﴿٩﴾ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُرْسِلِ
السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا ﴿١١﴾ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَ
يَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ﴿١٢﴾ مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿١٤﴾ أَلَمْ تَرَوْا

اپنی روش پر اڑ گئے اور تکبر کی انتہا کر دی(۷) پھر میں نے انہیں برملا دعوت دی(۸) پھر انہیں علانیہ بھی سمجھایا اور چپکے [۵] چپکے بھی(۹) اور کہا کہ اپنے پروردگار سے معافی مانگ لو، بلاشبہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔(۱۰) تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا(۱۱) اور تمہاری مال اور اولاد سے مدد کرے گا، تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور نہریں جاری کرے گا(۱۲) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے وقار کا خیال [۶] نہیں رکھتے۔(۱۳) حالانکہ اس نے تمہیں کئی حالتوں [۷] سے گزار کر پیدا کیا ہے(۱۴)

[۵] ❁ استغفار سے حاصل ہونے والے دنیوی فوائد: اور جہاں تک میرے سمجھانے کا تعلق ہے تو میں ان کی مجلسوں میں بھی جاتا ہوں اور ان کے گھروں میں بھی۔ ان سے نجی محفلیں بھی کرتا ہوں۔ انہیں برملا بھی سمجھاتا ہوں اور خیر خواہی کے لہجہ میں انفرادی ملاقاتوں میں انہیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس وقت جو تم پر قحط مسلط ہے، بارشیں نہیں ہو رہیں، اگر تم اللہ کی طرف رجوع کر لو۔ اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو تو تم پر سے یہ قحط دور ہو جائے گا۔ اللہ کی مہربانی سے خوب بارشیں ہوں گی۔ اور تمہارے اموال اور اولاد میں اللہ تعالیٰ خوب برکت عطا فرمائے گا" واضح رہے کہ استغفار کے دنیا میں حاصل ہونے والے ایسے فوائد کا ذکر قرآن میں اور بھی کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں فرمایا: اور اگر اہل کتاب تورات، انجیل اور جو کچھ ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا تھا، پر عمل پیرا رہتے تو ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی نکلتا (۵:۶۶) اور سورۂ اعراف میں فرمایا: "اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے" (۷:۹۶) ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ استغفار کا دنیا میں بھی یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس سے تنگدستی اور کئی دوسری پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حسن بصریؒ سے ایک شخص نے قحط کا شکوہ کیا، دوسرے نے تنگی کا اور تیسرے نے اولاد نہ ہونے کا تو آپ نے ان تینوں کو استغفار کا حکم دیا۔ کسی نے کہا کہ ان کے شکوے تو الگ الگ ہیں لیکن آپ ہر ایک کو استغفار کا ہی حکم دے رہے ہیں؟ اس کے جواب میں آپ نے یہی آیات (نمبر ۱۰ تا ۱۲) پڑھ کر اسے مطمئن کر دیا۔ بلکہ بعض علماء تو کہتے ہیں کہ ہر مقصد کے حصول کے لئے اللہ کے حضور استغفار کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک دفعہ سیدنا عمرؓ بارش کی دعا کرنے کیلئے باہر نکلے اور صرف استغفار پر اکتفا فرمایا۔ کسی نے عرض کیا: امیر المومنین! آپ نے بارش کے لئے دعا تو کی ہی نہیں؟ فرمایا: میں نے آسمان کے ان دروازوں کو کھٹکھٹایا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے پھر آپ نے سورۂ نوح کی یہی آیات لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔

[۶] یعنی جب تم اپنے چھوٹے چھوٹے چودھریوں اور سرداروں کے ہاں جاتے ہو تو بڑے اہتمام کے ساتھ جاتے ہو۔ اور وہاں جا کر بھی یہ خیال رکھتے ہو کہ خلاف ادب کوئی حرکت سرزد نہ ہو جائے لیکن اللہ کو تم نے ایسا ہی بے وقار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے

كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ
الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ
يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ ع ۱

کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمانوں[۸] کو اوپر تلے پیدا کیا(۱۵) اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ[۹] بنایا(۱۶) اور اللہ نے تمہیں زمین سے عجیب طرح اگایا(۱۷) پھر اسی زمین میں تمہیں واپس لے[۱۰] جائے گا اور (پھر دوبارہ) اسی سے نکال کھڑا کرے گا(۱۸) اور اللہ ہی نے تمہارے لیے زمین کو (فرش کی طرح) بچھا[۱۱] دیا(۱۹) تاکہ تم اس کے کھلے راستوں میں چل سکو"(۲۰)

خلاف بغاوت کرتے ہو۔ اس کی نافرمانیاں کرتے ہو اس کی خدائی میں دوسروں کو شریک بناتے ہو اور تمہیں ذرہ بھر شرم نہیں آتی۔ نہ ہی تمہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت ہمیں ان گناہوں کی سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

[۷] **اطوار کا معنی: آدم اور بنی آدم پر گزرنے والے اطوار:۔** اَطْوَارًا۔ طَوْر کسی چیز کی ایسی حالت کو کہتے ہیں جو اندازہ کے مطابق کچھ مدت بعد تدریجی تبدیلی چاہتی ہو۔ اور تَطَوُّر بمعنی ایک حالت سے دوسری یا اگلی حالت میں تبدیل ہونا۔ سوچا جائے تو انسان اطوار ہی کا مجموعہ اور مظہر ہے۔ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا۔ تو سات اطوار سے گزارا (۱) خشک مٹی، (۲) پھر اسے گیلی مٹی یا گارا بنایا گیا، (۳) پھر لیس دار یا چپک دار یا چیکنی مٹی بنایا گیا، (۴) پھر اس کا خمیر اٹھایا گیا حتیٰ کہ اس میں بدبو پیدا ہوگئی، (۵) پھر اسے خشک کیا گیا، (۶) پھر اسے حرارت سے پکایا گیا (۷) حتیٰ کہ وہ ٹن سے بجنے والی مٹی بن گئی۔ اس مٹی سے آدم کا پتلا بنایا گیا پھر اللہ نے اس میں روح پھونکی تو یہ صرف ایک جاندار مخلوق ہی نہیں بلکہ عقل و تمیز اور ارادہ و اختیار رکھنے والی مخلوق بن گیا۔ پھر آگے اس کی نسل نطفہ سے چلائی گئی۔ زمین سے پیدا ہونے والی بے جان اشیاء انسان کی غذا بنیں۔ انہیں غذاؤں سے نطفہ بنا۔ یہی نطفہ جب رحم مادر میں حمل کی صورت میں قرار پا گیا تو وضع حمل تک اس پر سات اطوار آئے۔ تاآنکہ وہ ایک جیتا جاگتا باشعور انسان بن کر رحم مادر سے باہر آگیا۔ پھر اس پر ہر نیا دن ایک نیا طَور ہے اور ان تمام اطوار پر ہمہ وقتی اور ہمہ گیر تصرف صرف اللہ کو حاصل ہے۔ ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود تم نے جو اللہ کو بے وقار سمجھ رکھا ہے تو یہ کس قدر ظلم کی بات ہے؟

[۸] اس کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ ملک کا حاشیہ نمبر ۶۔

[۹] یہ آسمانوں میں جگمگانے والے چاند اور سورج ہمارے لئے محض روشنی کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ انسان کی زندگی کا بہت حد تک انہی پر انحصار ہے۔ سورج کی وجہ سے ہماری زمین پر رات اور دن وجود میں آتے ہیں۔ موسموں میں تبدیلی آتی ہے۔ فصلیں پکتی ہیں، پھلوں میں رس پڑتا ہے اور انہی چیزوں سے انسان اور دوسری جاندار مخلوق کو غذا مہیا ہوتی ہے تم پر اللہ کے یہ کیا کم احسان ہیں پھر بھی تم اللہ کے ناقدر شناس اور نمک حرام بنتے ہو؟

[۱۰] چاند اور سورج کے بعد اب زمین کی طرف آؤ۔ تو زمین کا تمہاری موت و حیات سے گہرا تعلق ہے۔ زمین ہی سے تم پیدا ہوئے۔ ابتدائی خلقت کے لحاظ سے بھی اور توالد و تناسل۔ کے بعد بھی۔ پھر مرنے کے بعد بھی یہی زمین تمہارا مستقر بنتی ہے۔ زندگی میں تم زمین کی سطح پر رہتے تھے۔ مرنے کے بعد اسکے اندر چلے جاتے ہو اور دوبارہ زندگی ملنے پر پھر زمین کے اندر سے نکل کر باہر سطح زمین پر آجاؤ گے۔

[۱۱] پھر اس زمین میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ تم اس پر مکان بناؤ۔ باغات لگاؤ، چلو پھرو، لیٹو، بیٹھو، ہر طرف

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ وَمَكَرُوا
مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَ
يَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾ مِّمَّا خَطِيئَاتِهِمْ

نوح نے کہا: "اے میرے [۱۲] پروردگار! ان لوگوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کے پیچھے لگ گئے جن کے مال اور اولاد نے ان کے لیے خسارہ ہی بڑھایا (۲۱) ان لوگوں نے بڑے بڑے [۱۳] مکر و فریب کیے (۲۲) اور کہا کہ: اپنے خداؤں [۱۴] کو کبھی نہ چھوڑنا، نہ وڈ کو چھوڑنا، نہ سواع کو، نہ یغوث کو، نہ یعوق کو اور نہ نسر کو (۲۳) انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے تو اب تو بھی ان ظالموں کی گمراہی میں ہی اضافہ کر دے" (۲۴) (چنانچہ) وہ لوگ اپنے گناہوں کی پاداش میں

کشادہ راہیں ہیں۔ اگر ایک شخص کے پاس وسائل ہوں تو ساری دنیا کے گرد گھوم سکتا ہے۔

[۱۲] یہ تھے سیدنا نوح ؑ کی تبلیغ کے چند موٹے موٹے نکات یا توحید پر مبنی دلائل جو وہ مدت مدید تک اپنی قوم کو سمجھاتے رہے۔ لیکن جب قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے تو اللہ کی بارگاہ میں عرض کی کہ یا اللہ! یہ لوگ تو بس دنیا کے ہی پجاری ہیں۔ یہ صرف ان سرداروں کی ہی بات مانتے ہیں جنہیں تو نے کثرت سے مال اور اولاد دے رکھی ہے۔ میری بات سننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔

[۱۳] ان سرداروں نے اپنے پیروکاروں میں نوح علیہ السلام کی شخصیت کو ہمیشہ برے انداز میں ہی پیش کیا اور انہیں یہی باور کراتے رہے کہ یہ شخص تو محض اپنی بڑائی قائم کرنے کی خاطر یہ سارے پاپڑ بیل رہا ہے۔ اور وہ بات ہی ایسی انہونی کہتا ہے جو کم از کم ہماری عقل باور نہیں کر سکتی۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایک اکیلا خدا ہی کائنات کا سارا انتظام چلا رہا ہو۔ ہر ایک کی براہ راست فریاد سنتا ہو، پھر فریادرسی بھی کرتا ہو۔ ہر بادشاہ کو اپنا انتظام سلطنت چلانے کے لیے بے شمار امیروں، وزیروں، ماتحتوں اور کارندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور انہی کی وساطت سے بادشاہ تک فریاد پہنچائی جا سکتی ہے۔ پھر ہم اپنے معبودوں کا کیسے اس کے کہنے پر انکار کر دیں۔ اس کی بات میں کچھ بھی وزن ہوتا تو اہل عقل اور شریف لوگ اس کے ساتھی ہوتے۔ اس کے بجائے اس کے جو چند ساتھی ہیں بھی تو وہ بدھو اور ذلیل قسم کے لوگ ہیں۔ اور ان باتوں کا انہوں نے اس طرح اجتماعی طور پر پروپیگنڈا کیا اور پوری قوم اس پروپیگنڈے سے اس قدر متاثر ہو چکی تھی کہ جو کوئی مرنے لگتا تو اولاد کو بڑی تاکید سے یہ وصیت کر جاتا کہ اس بڈھے نوح ؑ کے جال میں نہ پھنس جانا۔ یہ تو دیوانہ ہے جو چاہتا ہے کہ ہم اپنے آبائی دین کو خیرباد کہہ دیں۔

[۱۴] ❁ نوح کی قوم کے بت عرب میں کیسے رائج ہو گئے:۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمایئے:

سیدنا ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ: جو بت نوح ؑ کی قوم میں پوجے جاتے تھے، وہی بعد میں عرب میں آ گئے، وڈ کلب قبیلے کا بت تھا جو دومۃ الجندل میں تھا۔ سواع ہذیل قبیلے کا بت تھا، یغوث پہلے مراد قبیلے کا بت تھا پھر بنی غطیف کا اور یہ سبا شہر کے پاس جوف میں تھا، یعوق ہمدان قبیلے کا تھا اور نسر حمیر قبیلے کا، جو ذی الکلاع (بادشاہ) کی اولاد تھے۔ یہ نوح ؑ کی قوم میں سے چند نیک لوگوں کے نام تھے۔ جب وہ مر گئے تو شیطان نے انہیں یہ پٹی پڑھائی کہ جہاں یہ لوگ بیٹھا کرتے تھے وہاں ان کے مجسمے بنا کر (یادگار

أُغۡرِقُواْ فَأُدۡخِلُواْ نَارٗا فَلَمۡ يَجِدُواْ لَهُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ أَنصَارٗا ٢٥ وَقَالَ نُوحٞ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَى ٱلۡأَرۡضِ مِنَ ٱلۡكَٰفِرِينَ دَيَّارًا ٢٦ إِنَّكَ إِن تَذَرۡهُمۡ يُضِلُّواْ عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوٓاْ إِلَّا فَاجِرٗا كَفَّارٗا ٢٧ رَّبِّ ٱغۡفِرۡ لِي وَلِوَٰلِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيۡتِيَ مُؤۡمِنٗا وَلِلۡمُؤۡمِنِينَ

ہی غرق کر دیے گئے اور جہنم میں داخل[۱۵] کر دیے گئے۔ پھر انہوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا(۲۵) اور نوح نے کہا: "اے میرے پروردگار! کافروں میں سے کوئی بھی اس زمین[۱۶] پر بسنے والا نہ چھوڑ(۲۶) اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے جو اولاد ہو گی وہ بھی بدکردار اور سخت کافر ہی ہو گی(۲۷) اے میرے پروردگار! مجھے، میرے والدین کو اور ہر شخص کو جو میرے گھر میں

کے طور پر) نصب کر دو اور ان کے وہی نام رکھو جو ان بزرگوں کے تھے۔ اس وقت ان کی عبادت نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن جب وہ لوگ گزر گئے تو بعد والوں کو یہ شعور نہ رہا اور وہ ان کی پرستش کرنے لگے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بتوں کے پجاری یا نوح علیہ السلام کی قوم کے سب مشرک تو طوفانِ نوح میں غرق کر دیے گئے تھے جو باقی بچے تھے وہ سب مومن اور موحد تھے پھر بعد میں انہی بتوں کی پوجا کیسے شروع ہو گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح شیطان نے بچے ہوئے موحدین کے آباء و اجداد کو چکمہ دے کر ان سے ان صالحین کی آہستہ آہستہ پرستش شروع کرا دی تھی۔ شیطان کی وہی چال بعد میں کامیاب رہی۔ موحدین نے اپنی اولاد کو طوفانِ نوح کا قصہ اور اس کی وجہ بیان کی۔ چند پشتیں گزرنے کے بعد انہی بتوں سے لوگوں میں عقیدت پیدا ہو گئی جن کی وجہ سے قومِ نوح پر عذاب آیا تھا۔

[۱۵] عذابِ قبر کا ثبوت:۔ طوفانِ نوح کا ذکر سورۂ اعراف کے حاشیہ ۶۸ اور سورۂ یونس کے حاشیہ ۸۳ کے تحت تفصیل سے گزر چکا ہے۔ جب یہ طوفان آیا تو اس قوم کے معبودان کے کسی کام نہ آ سکے بلکہ وہ بھی ان کے ساتھ غرق ہو گئے اور غرق ہونے کے ساتھ ہی انہیں جہنم میں داخل کر دیا گیا۔ یہ آیت بھی منجملہ ان آیات کے ہے جن سے برزخ یا عذابِ قبر کا ثبوت قرآن سے مہیا ہوتا ہے۔

[۱۶] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام نے یہ دعا قوم کے رویہ سے تنگ آ کر غصہ کی حالت میں اور بے صبری کی بنا پر کی ہو گی۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے آپ نے یہ دعا بے صبری کی بنا پر نہیں بلکہ ساری عمر یعنی ساڑھے نو سو سال کی تبلیغ کے بعد تجربہ کی بنا پر اور نہایت مایوسی کے عالم میں کی تھی۔ اور آپ کی دعا اللہ کی مشیت کے عین مطابق تھی۔ اگر آپ ایسی دعا نہ بھی کرتے تو بھی ان پر عذاب کا مقرر وقت آ چکا تھا اور اس کی دلیل سورۂ ہود کی آیت ۳۶ ہے جو اس طرح ہے: اور نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے لہٰذا اب ان کی کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو۔

وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝۲۸

مومن کی حیثیت [۱۷] سے داخل ہو اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرمادے اور ظالموں کے لیے اور زیادہ ہلاکت بڑھا۔(۲۸)

[۱۷] کافروں کے حق میں سیدنا نوح کی بددعا: سیدنا نوح علیہ السلام کی دعا کا پہلا حصہ تو کافروں کے متعلق تھا جن کے متعلق آپ نے اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہا تھا کہ ایسے بدکردار لوگ ہیں کہ ان کے نطفہ سے بھی بے حیا، بدکردار اللہ کے نافرمان اور ناشکرے ہی پیدا ہوں گے۔ وہ خود تو کیا ایمان لائیں گے، دوسروں کو بھی گمراہ ہی کرنے کی کوشش کریں گے۔

اپنے اور مومنوں کے حق میں دعائے خیر:۔ اسی دعا کا دوسرا حصہ جو اپنے لیے اور جملہ مومنین کے لیے ہے اس میں خاصی نرمی و لچک اور وسعت قلبی پائی جاتی ہے۔ یعنی سب سے پہلے تو آپ نے اپنے حق میں اپنی تقصیرات سے بخشش کی دعا فرمائی پھر اپنے والدین کے لیے پھر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لا کر آپ کے گھر یا مسجد یا کشتی میں داخل ہو جائیں۔ پھر ان مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی جو اس دعا کے بعد یا آپ کے بعد ایمان لائیں گے۔ اس دعا کے بعد پھر ایک بار تاکیداً فرمایا کہ اس ظالم قوم کی ہلاکت میں کوئی رو رعایت نہ کرنا۔

۲۸ آیاتها سورة الجن مکیة رکوعها ۲

بسم الله الرحمٰن الرحیم

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝١ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۖ وَ

کلمات ۲۸۷ آیات ۲۸ (۷۲) سورة الجن مکی ہے (۴۰) رکوع ۲ حروف ۱۱۲۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آپ کہہ دیجئے کہ: مجھے وحی[1] کی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے (اس قرآن کو) غور سے سنا پھر (جا کر اپنی قوم سے) کہا کہ: ہم نے بڑا عجیب قرآن سنا ہے۔(۱) جو بھلائی کی راہ بتاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور

[1] اس سلسلہ میں درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمایئے:

سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ اپنے چند اصحاب کے ساتھ عکاظ کے بازار جانے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ ان دنوں شیطانوں کو آسمان کی خبر ملنا بند ہو گئی تھی اور ان پر انگارے پھینکے جاتے تھے۔ وہ (زمین کی طرف) لوٹے اور (آپس میں) کہنے لگے۔ یہ کیا ہو گیا؟ ہمیں آسمان کی خبر ملنا بند ہو گئی اور ہم پر انگارے پھینکے جاتے ہیں۔ ضرور کوئی نئی بات واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں آسمان کی خبر ملنا بند ہوئی ہے۔ اب یوں کرو کہ ساری زمین کے مشرق و مغرب میں پھر کر دیکھو کہ وہ کیا نئی بات واقع ہوئی ہے۔ ان میں سے کچھ شیطان تہامہ (حجاز) کی طرف بھی آئے اور آپ ﷺ تک پہنچ گئے۔ اس وقت آپ ﷺ نخلہ میں تھے اور عکاظ کے بازار جانے کا قصد رکھتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے اصحاب کو نماز فجر پڑھا رہے تھے جب ان جنوں نے قرآن سنا تو ادھر کان لگا دیا پھر کہنے لگے: یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے آسمان کی خبر ہم پر بند کر دی گئی۔ پھر اس وقت وہ اپنی قوم کی طرف لوٹے اور انہیں کہنے لگے (يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا .... أَحَدًا) اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ سورت نازل فرمائی۔ ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ جنوں کی یہ گفتگو آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوئی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

❁ جنوں کا مختلف موقعوں پر قرآن سننا:۔ اس سے پیشتر سورۂ احقاف کی آیات ۲۹ تا ۳۲ میں بھی جنوں کے قرآن سننے کا ذکر گزر چکا ہے۔ لیکن قرآن کے ہی مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو الگ واقعات ہیں۔ سورۂ احقاف میں بیان شدہ واقعہ کے مطابق سننے والے جن مشرک نہیں تھے بلکہ وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر اور تورات پر ایمان رکھتے تھے پھر قرآن سننے کے بعد وہ جن قرآن پر اور آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے تھے۔ جبکہ اس سورت میں جن جنوں کا ذکر آیا ہے یہ مشرک تھے۔

جنوں کے متعلق جو حقائق قرآن میں جابجا مذکور ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ (۱) انسان کے علاوہ جن ہی ایسی مخلوق ہے جو شریعت کی مکلف ہے، (۲) جن ناری مخلوق ہے، جو تیز شعلہ یا آگ کی لپٹ سے پیدا کیے گئے ہیں جبکہ انسان خاکی مخلوق ہے، (۳) انسان کی پیدائش سے پہلے جن ہی اس زمین پر آباد تھے اور ان میں بھی نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن انسان کی تخلیق کے بعد نبوت کا

لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ﴿۲﴾ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ﴿۳﴾ وَّاَنَّهٗ
كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ﴿۴﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى

ہم (آئندہ) کبھی کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ ٹھہرائیں گے (۲) اور ہمارے پروردگار کی شان بڑی بلند ہے۔ اس [۲] نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا (۳) اور یہ کہ ہمارے نادان لوگ اللہ کے ذمے بہت سی جھوٹی [۳] باتیں لگاتے رہے ہیں (۴) اور یہ کہ ہم نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ انسان اور جن اللہ کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بول [۴] سکتے (۵)

سلسلہ سیدنا آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد میں منتقل ہو گیا۔ اب جو نبی انسانوں کے لئے مبعوث ہوتا ہے وہی جنوں کے لئے بھی ہوتا ہے۔

❁ جنوں کی صفات:۔ (۴) جن تو انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن انسان جنوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس سورہ میں بھی جن جنوں کا ذکر آیا ہے رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا نہیں تھا بلکہ بعد میں وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کو ان کے قرآن سننے اور متاثر ہو کر ایمان لانے کی خبر دی گئی، (۵) جن بھی انسانوں کی ہی علاقائی زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں یہی وجہ تھی کہ جن قرآن سننے کے ساتھ ہی فوراً اسے سمجھ گئے اور ایمان لے آئے، (۶) انسان کی طرح ان میں بھی بعض نیک ہوتے ہیں، بعض بدکردار اور نافرمان۔ نیز جس قسم کے عقائد، اچھے ہوں یا برے، انسانوں میں پائے جاتے ہیں جنوں میں بھی پائے جاتے ہیں، (۷) بدکردار جنوں کو شیطان کہا جاتا ہے اور قرآن میں یہ الفاظ ان معنوں میں مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، (۸) انسانوں کی طرح ان میں بھی توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہے۔

[۲] ❁ قرآن سننے والے جنوں کی اپنی قوم کو تبلیغ:۔ آیت نمبر ۲ اور ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر قرآن سننے والے جن مشرک تھے اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث سے بھی متاثر تھے۔ قرآن کا بیان سن کر انہیں معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات بیوی بیٹوں کی احتیاج سے پاک ہے۔ اور اس کے متعلق ایسا تصور رکھنا سخت گمراہ کن عقیدہ ہے۔ لہٰذا ہم ایسے عقیدہ و خیالات سے توبہ کر کے اللہ اکیلے پر ایمان لاتے ہیں۔

[۳] سَفِيْهُنَا میں سفیہ سے مراد ایک فرد بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں وہ ابلیس ہے۔ جس نے جن و انسان کو گمراہ کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور سفیہ سے مراد نادانوں کا گروہ بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹی باتوں سے مراد تمام شرکیہ عقائد ہیں۔ بالخصوص یہ کہ اللہ کی بیوی بھی ہے اور اولاد بھی یا یہ کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں یا یہ کہ کائنات میں کئی دیوی دیوتا اور اللہ کے پیارے ایسے ہیں جنہیں اللہ نے کائنات میں تصرف امور کے بعض اختیارات سونپ رکھے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

[۴] یعنی جنوں اور انسانوں کی عظیم اکثریت اگر یہ باتیں کہتی ہے کہ اللہ کی بیوی اور اولاد ہے یا فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں یا اللہ نے اپنے پیاروں کو بھی کئی قسم کے اختیارات تفویض کر رکھے ہیں تو وہ جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنی عظیم اکثریت جھوٹی بات پر کیسے اتفاق کر سکتی ہے۔ لہٰذا ہم نے بھی ان باتوں کو درست تسلیم کر لیا۔

اللّٰهِ كَذِبًا ۝٥ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝٦

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝٧ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ

حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝٨ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ

يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝٩ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ

اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں کے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے چنانچہ انہوں[۵] نے جنوں کے غرور کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا(۶) اور یہ کہ انسان بھی ایسا ہی خیال کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو کہ اللہ کبھی کسی کو دوبارہ[۶] نہ اٹھائے گا(۷) اور یہ کہ: ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے سخت پہرہ داروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا(۸) اور یہ کہ: ہم سننے کے لئے آسمان کے ٹھکانوں میں بیٹھا کرتے تھے مگر اب جو سننے کو کان لگائے تو وہ اپنے لیے ایک شہاب[۷] کو تاک لگائے ہوئے پاتا ہے(۹) اور یہ کہ: ہم یہ نہیں جان سکے کہ اہل زمین کے ساتھ کسی برے معاملہ کا ارادہ کیا گیا ہے

[۵] ❁ انسانوں کا جنوں سے پناہ مانگنا:۔ عہد جاہلیت میں اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ بن چکا تھا کہ ہر غیر آباد جگہ جنوں کا مسکن ہوتا ہے۔ اور ان میں بھی انسانوں کی طرح بعض جن دوسروں کے سردار اور بادشاہ ہوتے ہیں۔ جو وہاں حکومت کرتے ہیں اور اگر کسی انسان کا ایسے علاقہ میں گزر ہو اور اس جن کی پناہ مانگے بغیر اس جگہ میں رہائش پذیر ہو جائے جس کے قبضہ میں یہ غیر آباد جگہ ہے تو وہ حاکم جن ایسے انسان یا انسانوں کو علاقہ غیر میں داخل ہونے کی بنا پر سزا دینے اور تکلیف پہنچانے کا حق رکھتا ہے خواہ وہ خود ایسی سزا دے دے یا اپنے ماتحت جنوں سے دلوا دے چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ میں عرب جب کسی سنسان وادی میں رات گزارتے تو پکار کر کہتے کہ ہم اس وادی کے مالک جن کی پناہ مانگتے ہیں، گویا انسان کی اوہام پرستی کا یہ عالم تھی کہ اللہ نے تو اسے اشرف المخلوقات اور جنوں سے بھی افضل پیدا کیا تھا لیکن اس زمین کے خلیفہ انسان نے الٹا جنوں سے ڈرنا اور ان سے پناہ مانگنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوں کا دماغ اور زیادہ خراب ہو گیا اور وہ واقعی اپنے آپ کو انسان سے افضل سمجھنے لگے۔

[۶] یہ ذو معنی فقرہ ہے اس کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ میں مذکور ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ گویا جس طرح انسانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو رسالت اور آخرت دونوں کے منکر ہیں اسی طرح جنوں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ جب جنوں نے قرآن سن کر معلوم کیا کہ ان کے یہ دونوں عقیدے غلط تھے۔ چنانچہ ان عقائد سے دستبردار ہو کر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آئے۔

[۷] ❁ ایام جاہلیت میں کہانت کا کاروبار:۔ دور نبوی میں کہانت کا کاروبار خاصا چلتا تھا۔ اس کاروبار کی بنیاد یہ تھی کہ ان کاہنوں کا تعلق شیطانوں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کاہنوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں۔ فرمایا: ان کی باتیں محض لغو ہیں۔ صحابہ نے کہا: کبھی تو ان کی بات سچ بھی نکل آتی ہے۔ فرمایا: یہ وہ بات ہوتی ہے جو کاہن کو شیطان کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے اور شیطان یہ خبر ملاء اعلیٰ سے اڑا لیتا ہے، پھر کاہن اس خبر میں سو جھوٹ ملا لیتا ہے۔

رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿١٠﴾ وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ ۖ كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا ﴿١١﴾ وَأَنَّا
ظَنَنَّا أَنْ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُعْجِزَهُ هَرَبًا ﴿١٢﴾ وَأَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ آمَنَّا
بِهِ ۖ فَمَنْ يُؤْمِنْ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا ﴿١٣﴾ وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۖ

یا ان کا پروردگار انہیں راہ راست[۸] پر لانا چاہتا ہے۔(۱۰) اور یہ کہ ہم میں سے کچھ نیک لوگ ہیں اور کچھ اس سے کم درجہ کے ہیں۔ ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔(۱۱)

اور یہ کہ: ہمیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ ہم نہ تو اللہ کو زمین میں (چھپ کر) عاجز کر سکتے ہیں[۹] اور نہ ہی بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں(۱۲) اور یہ کہ: جب ہم نے ہدایت (کی بات) سن[۱۰] لی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو شخص بھی اپنے پروردگار پر ایمان لائے گا اسے نہ حق تلفی[۱۱] کا ڈر ہوگا اور نہ زبردستی کا(۱۳) اور یہ کہ: ہم میں سے کچھ تو مسلمان (فرمانبردار) ہیں اور کچھ بے انصاف لوگ ہیں

(بخاری۔ باب الكهانة)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آسمان کے پہرے سخت کر دیئے گئے۔ تاکہ کوئی شیطان آسمان کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے اور اس نظام کو سخت تر بنانے کی وجہ یہ تھی کہ وحی جو نبی آخر الزماں پر نازل ہونے والی اور ہو رہی ہے۔ اس کا کچھ بھی حصہ شیطان نہ سن پائے۔ اور اس سے ایک دوسرا مقصد از خود حاصل ہو گیا یعنی کاہنوں کو شیطانوں کے ذریعہ جو خبریں ملتی تھیں وہ بھی بند ہو گئیں۔ اسی کیفیت کو جن اپنی زبان میں بیان کر رہے ہیں۔

[۸] یعنی یہ تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ آسمان پر اس قدر ناکہ بندیوں کی غرض وغایت کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ لوگ اس قرآن پر ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کے انعامات واکرامات کے مستحق بنتے ہیں یا اس کا انکار کر کے اللہ کے عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ اب باقی نہیں رہ گیا۔

[۹] یعنی اب ہماری بھلائی اسی بات میں ہے کہ ہم بلاچون وچرا قرآن پر ایمان لے آئیں۔ اگر ہم نے قرآن کو نہ مانا تو اللہ کی سزا سے بچ نہیں سکتے نہ زمین میں کسی جگہ چھپ کر نہ ادھر ادھر بھاگ کر اور نہ ہوا میں اڑ کر۔

[۱۰] یعنی قرآن کو سن لینے کے بعد ہمارے لئے ممکن نہ رہا کہ ہم اپنے ساتھ غلط عقائد پر جمے رہیں۔ لہٰذا ہم نے اپنی قوم میں سب سے پہلے ایمان لانے میں سبقت کی ہے۔

[۱۱] یہ سب وہ اہم نکات ہیں جو جنوں نے رسول اللہ ﷺ سے قرآن سن کر اخذ کئے تھے۔ پھر ایمان لانے کے بعد اپنی قوم کے پاس جا کر انہیں بتائے تھے۔ انہی میں سے یہ نکتہ جزا وسزا کے قانون سے تعلق رکھتا ہے۔ حق تلفی سے مراد یہ ہے کہ جتنے اجر کا وہ مستحق ہو اسے اس سے کم دیا جائے اور زبردستی سے مراد یہ ہے کہ اسے نیکی کا کوئی اجر نہ دیا جائے۔ یا بلا قصور ہی کسی کو سزا دے ڈالی جائے۔ یا قصور تو کم ہو مگر سزا زیادہ دے ڈالی جائے۔ کسی ایمان لانے والے کے لیے اللہ کے ہاں ایسی کوئی صورت نہ ہوگی۔

فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾ وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا
عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ
يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّاَنَّهٗ لَمَّا

اور جو فرمانبردار بن گیا تو ایسے ہی لوگوں نے بھلائی کا راستہ اختیار [۱۲] کیا (۱۴) اور جو بے انصاف ہیں وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے" (۱۵)

اور اگر لوگ سیدھی راہ پر قائم رہتے تو ہم انہیں بافراط [۱۳] پانی سے سیراب کرتے (۱۶) تاکہ اس نعمت [۱۴] سے ان کی آزمائش کریں اور جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ موڑے گا تو وہ اسے سخت عذاب میں مبتلا [۱۵] کر دے گا (۱۷) اور یہ کہ مسجدیں [۱۶] اللہ کے لیے ہیں لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو (۱۸) اور جب اللہ کے

[۱۲] تَحَرَّوْا۔ اَحْرٰی بمعنی لائق تر اور تَحَرّی بمعنی زیادہ مناسب اور لائق تر چیز کو طلب کرنا۔ دو چیزوں میں سے زیادہ بہتر کو طلب کرنا۔ یعنی ایمان لانے والے جن اپنی قوم میں واپس آ کر انہیں سمجھا رہے ہیں کہ بلاشبہ ہم میں سے کچھ فرمانبردار ہیں اور کچھ نافرمان اور بے راہ رو بھی ہیں۔ اور حق بات یہی ہے کہ جو لوگ اسلام لے آئے انہوں نے عقلمندی کی۔ ہدایت کی راہ کو پسند کر لینا ہی ان کے بہتر انتخاب کی دلیل ہے۔ کیونکہ جو لوگ اس سیدھی راہ کے علاوہ کوئی اور راہیں اختیار کریں گے وہ گھاٹے میں ہی رہیں گے اور جہنم کا ایندھن بنیں گے" اس مقام پر جنوں کی وہ تقریر یا وعظ و نصیحت ختم ہو جاتی ہے جو انہوں نے ایمان لانے کے بعد واپس آ کر اپنے بھائی بندوں کو کی۔ چنانچہ بہت سے جن آپ ﷺ پر ایمان لے آئے پھر اس واقعہ کے بعد متعدد بار جن آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔

[۱۳] اللہ کی فرمانبرداری اور رزق کی فراوانی:۔ یعنی جن اور انسان اللہ کے فرمانبردار بن کر رہتے تو ہم ان پر بکثرت بارشیں برساتے اور رزق کی فراوانی کر دیتے۔ اور یہ وہی مضمون ہے جو پہلے سورۂ نوح کی آیت نمبر ۱۱، ۱۲ کے تحت گزر چکا ہے تفصیل کے لئے دیکھئے سورۂ نوح کا حاشیہ نمبر ۵

[۱۴] نعمتوں سے آزمائش کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آیا وہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اللہ کا شکر بجا لانے اور اس کی اطاعت میں مزید ترقی کرتے ہیں یا اللہ کو بالکل ہی بھول جاتے ہیں یا ناشکری کر کے اصل سرمایہ بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

[۱۵] یعنی اس کی زندگی میں اس کی پریشانیاں بڑھتی ہی جائیں گی کسی کل چین نصیب نہ ہوگا اور آخرت میں یہ حال ہوگا کہ ہر آن اس کے عذاب میں اضافہ ہی کیا جاتا رہے گا۔

[۱۶] یعنی ویسے تو کسی جگہ اور کسی حال میں بھی اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو پکارنا نہیں چاہیے مگر مساجد میں تو ایسا کام کرنے سے یہ شرک کا گناہ کئی گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ مسجدیں تو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور بعض علماء کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لیے تو ساری زمین ہی مسجد بنا دی گئی ہے۔ لہٰذا کسی جگہ بھی اللہ کے ساتھ دوسروں کو پکارنا جائز نہیں۔ اور بعض علماء کے نزدیک مساجد سے مراد وہ اعضاء ہیں جن پر سجدہ کیا جاتا ہے۔ یہ اعضاء تو اللہ کی عبادت اور بندگی کے لئے بنائے گئے

ع ۱۱

قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ
اَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ
وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ

بندے (رسول) اللہ کو پکارنے کے لیے (کعبہ میں) کھڑے ہوئے تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کو تیار[17] ہو گئے۔(۱۹)

آپ ان سے کہہ دیجئے کہ: میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک[18] نہیں کرتا(۲۰) کہیے کہ: میں تمہارے لیے نہ کسی نقصان[19] کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا(۲۱) آپ کہئے کہ: مجھے اللہ سے ہرگز کوئی بچا نہ سکے گا[20] اور نہ ہی میں اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پا سکوں گا(۲۲) میں تو صرف یہ کر سکتا ہوں کہ اللہ کا حکم اور اس کے پیغام (لوگوں تک) پہنچا دوں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا

ہیں۔ لہذا اللہ کے ساتھ دوسروں کو پکار کر ان کا غلط استعمال کرنا جائز نہیں۔

[17] ❁ کافروں کے قرآن سننے کی وجوہ۔ یعنی جب بھی آپ ﷺ لوگوں کو قرآن سنانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو مسلمان بھی آپ کی طرف دوڑے آتے ہیں اور کافر بھی۔ اگرچہ دونوں کے آنے اور ہجوم کرنے کا مقصد الگ الگ اور ایک دوسرے کے برعکس ہوتا ہے۔ مسلمان ہدایت کے طالب ہیں اس لیے وہ فوراً آپ ﷺ کی طرف چل پڑتے ہیں اور کافر یہ چاہتے ہیں کہ وہاں شور شرابا کر کے قرآن کی آواز لوگوں کے کانوں میں نہ پڑنے دیں یا اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر نظریں جما کر اور آپ ﷺ کو گھور گھار کر اتنا مرعوب کر دیں کہ آپ ﷺ قرآن سنانا بند کر دیں یا پھر اس لیے سننے آجاتے ہیں کہ کوئی ایسا نکتہ ہاتھ آجائے جس سے آپ ﷺ کو جھوٹا کیا جا سکے یا مذاق اڑایا جا سکے۔

[18] یعنی آپ ﷺ ان ہجوم کرنے والے کافروں سے کہیے کہ میں کوئی قابل اعتراض باتیں تو نہیں کہہ رہا میں تو صرف یہی کہتا ہوں کہ مشکل کے اوقات میں یا کسی حاجت کے موقع پر صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور صرف اسی کو پکارتا ہوں۔ اس لیے کہ میں صرف اسی کو اپنے نفع و نقصان کا مالک سمجھتا ہوں اس میں لڑنے جھگڑنے کی کیا بات ہے؟

[19] میرے اختیار میں صرف اتنی ہی بات ہے کہ اللہ کی طرف سے مجھ پر جو وحی آتی ہے وہ میں تم لوگوں تک پہنچا دوں۔ اگر اسے تسلیم کر لو گے تو اس میں یقیناً تمہارا فائدہ ہے۔ مگر یہ میرے اختیار میں نہیں کہ تم کو بھی راہ راست پر لے آؤں یا اگر نہ آؤ تو تمہیں کچھ نقصان پہنچا سکوں۔ ہر طرح کا فائدہ اور نقصان اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

[20] یعنی میرے تصرف اور اختیار کا تو یہ حال ہے کہ تم کو نفع یا نقصان پہنچانا تو دور کی بات ہے مجھے اپنے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں۔ فرض کرو جو ڈیوٹی اللہ نے میرے ذمہ لگا رکھی ہے میں اس میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں تو میں بھی اللہ کی گرفت میں آسکتا ہوں مجھ میں یہ سکت نہیں کہ اپنے آپ کو اللہ کی گرفت سے بچا سکوں یا کہیں بھاگ کر ہی اس کی گرفت سے بچاؤ حاصل کر سکوں۔

رَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴿۲۳﴾ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ
فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَضْعَفُ نَاصِرًا وَأَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ مَا تُوعَدُونَ
أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا ﴿۲۵﴾ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ﴿۲۶﴾ إِلَّا مَنِ
ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

تو اس کے لیے [۲۱] جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۲۳)

(یہ لوگ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے) تا آنکہ وہ (عذاب) دیکھ نہ لیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ پھر جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور اور گنتی [۲۲] میں کم ہیں (۲۴) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ: میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب) کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا اس کے لیے میرا پروردگار کوئی لمبی مدت مقرر [۲۳] کر دے۔ (۲۵)

وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو آگاہ نہیں کرتا (۲۶) سوائے ایسے رسول کے جسے وہ (کوئی غیب کی بات بتانا) پسند کرے۔ پھر وہ [۲۴] اس (وحی) کے آگے اور پیچھے محافظ لگا دیتا ہے (۲۷)

[۲۱] یاد رہے کہ ان آیات کے اصل مخاطب مشرکین مکہ ہیں۔ جو شرک سے کسی قیمت پر باز نہیں آتے تھے اور یہی ان کی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی تھی۔ ایسے مشرکوں کی سزا واقعی ابدی جہنم ہے۔ لیکن مسلمان جو کم از کم شرک سے پاک ہوں۔ ان سے اگر اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا کوئی کام سرزد ہو جائے تو ان کی سزا ابدی جہنم نہیں ہے۔ بلکہ اللہ انہیں مناسب سزا دینے کے بعد جہنم سے نکال لے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو معاف ہی فرما دے۔

[۲۲] یہ ہجوم کرنے والے مشرک آج تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان مسلمانوں کی بھلا حیثیت ہی کیا ہے۔ ہم ان پر ہجوم کر کے ہی انہیں مرعوب کر سکتے ہیں۔ لیکن عنقریب ایک وقت آنے والا ہے جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سے فریق کی تعداد تھوڑی ہے اور اس کے مددگار کم ہیں اور یہ وقت فتح مکہ کا دن بھی ہو سکتا ہے اور قیامت کا دن تو بہر حال یقینی ہے۔

[۲۳] اس آیت میں سوال دہرائے بغیر کفار کے ایک بار بار کے گھسے پٹے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے جو یہ کہ قیامت کے دن کی معین تاریخ کا مجھے کچھ علم نہیں اس لیے کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں نہ ہی میں نے کبھی اس بات کا دعویٰ کیا ہے۔ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی جانتا ہے کہ وہ جلد آئے گی یا بدیر؟ ہاں اتنی بات میں بھی جانتا ہوں کہ وہ آئے گی ضرور خواہ کب آئے۔

[۲۴] علم غیب سے متعلق اللہ کا دستور یہ ہے کہ وہ یہ علم کسی کو نہیں بتاتا کہ قیامت کب آئے گی۔ ہاں غیب کی کچھ باتیں کسی رسول کو بتا بھی دیتا ہے اور یہ باتیں وہ ہوتی ہیں جن کا بتانا دین کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ قیامت ضرور آئے گی۔ ایک وقت آئے گا جب سورج مغرب سے طلوع ہو گا۔ یا یہ کہ قیامت صرف بدترین لوگوں پر قائم ہو گی یا یہ کہ روز محشر میں اللہ کا لوگوں سے حساب لینا اور جنت اور دوزخ کے حالات۔ یہ سب چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں جو اللہ نے وحی کے ذریعہ رسول کو

ع ۲/۱۲

لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغام[۲۵] پہنچا دیئے ہیں اور جو کچھ ان رسولوں کو درپیش ہوتا ہے اس کا وہ احاطہ کیے ہوئے[۲۶] ہے اور ہر چیز کو گن کر اسے ریکارڈ رکھا ہوا ہے۔(۲۸)

بتا دیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے امت تک پہنچا دیں۔ اس کا بھی ضابطہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جبریل کے ذریعہ اپنی وحی بھیجتا ہے تو اس کے آگے پیچھے نگران اور محافظ بھی بھیجتا ہے تاکہ یہ وحی بحفاظت تمام و کمال اور بلا کسی آمیزش کے رسول تک پہنچ جائے۔

[۲۵] وحی الٰہی کی حفاظت کا اہتمام:۔ اس جملہ کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ رسول کو علم ہو جائے کہ فرشتوں نے اپنے پروردگار کے پیغام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہو جائے کہ فرشتوں نے رسول کو پیغامات پہنچا دیئے اور تیسرا یہ کہ اللہ کو علم ہو جائے کہ رسولوں نے اس کے پیغام ٹھیک ٹھیک لوگوں تک پہنچا دیئے۔ گویا ان پہرے داروں کی اس وقت تک ڈیوٹی ختم نہیں ہوتی جب تک کہ اللہ کے پیغامات فرشتوں کے ذریعہ رسولوں تک اور رسولوں کے ذریعہ عام لوگوں تک پہنچا نہیں دیئے جاتے۔

[۲۶] یعنی ان انتظامات کے علاوہ ان سب سے اوپر اللہ تعالیٰ کی اپنی نگرانی اور کنٹرول ہے۔ یعنی رسول پر بھی اور فرشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اسی طرح محیط ہے اگر وہ بال برابر بھی اس کی مرضی کے خلاف جنبش کریں تو فوراً گرفت میں آ جائیں۔ نہ فرشتوں کی یہ مجال ہے کہ وہ وحی الٰہی میں سے ایک لفظ تک کی کمی بیشی کر سکیں اور نہ رسولوں کی۔ کیونکہ اللہ جو وحی بھیجتا ہے اس کا ایک ایک لفظ گنتی میں آ چکا ہوتا ہے۔

۲۰ آیاتھا سُوْرَۃُ الْمُزَّمِّلِ مَکِّیَّۃٌ رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰۤاَیُّہَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَہٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَ رَتِّلِ

کلمات ۲۰۰ آیات ۲۰ (۷۳) سورۃ المزمل مکی[۱] ہے (۳) رکوع ۲ حروف ۸۶۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے (محمد ﷺ!) جو کپڑا اوڑھے[۲] ہوئے (سونے لگے) ہو(۱) رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ[۳] کر باقی رات (نماز میں) کھڑے رہا کیجئے(۲) رات کا نصف حصہ یا اس سے کچھ کم کرلیجئے(۳) یا اس سے زیادہ کیجئے اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر[۴]

[۱] اس سورت کے دو رکوع ہیں۔ پہلا رکوع بالاتفاق مکہ میں اور ابتدائی دور میں نازل ہوا تھا۔ جبکہ دوسرا رکوع مدنی دور میں نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں قتال فی سبیل اللہ کا بھی ذکر ہے اور فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ کا بھی اور یہ دونوں باتیں مدنی دور میں فرض ہوئی تھیں۔ مکی دور میں قتال فی سبیل اللہ کی تو اجازت ہی نہیں دی گئی تھی اسی طرح مکی دور میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم تو موجود تھا، لیکن زکوٰۃ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔

[۲] انداز خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں۔ جب آپ ﷺ رات کو سونے کے لیے بستر پر چادر اوڑھ کر لیٹ چکے تھے۔ اور اس لطیف انداز خطاب میں آپ ﷺ کو یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ اب پاؤں پھیلا کر اور بے فکر ہو کر سونے کے دن بیت چکے، اب آپ ﷺ کی ذمہ داریاں کچھ اور قسم کی ہیں۔

[۳] ❁ عظیم ذمہ داریوں کے لیے ریاضت شب بیداری:۔ ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے جس قسم کی ریاضت کی ضرورت ہے اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ رات کو سوتے رہنے کی بجائے رات کا زیادہ حصہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہا کیجیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بہت کم سویا کیجیے یا سویا ہی نہ کیجیے۔ بلکہ یہ ہے کہ عبادت میں گزارا ہوا وقت اگر آدھا بھی ہو تو وہ بھی بہرحال زیادہ ہے۔ پھر اس حصہ کی وضاحت بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادی۔ کہ رات کا جتنا حصہ آپ ﷺ کو عبادت میں گزارنا چاہیے وہ نصف رات ہونا چاہیے۔ یا نصف رات سے کچھ کم یا کچھ زیادہ۔ یعنی اگر دن رات برابر ہوں۔ تو آدھی رات جاگنا کافی ہے اگر راتیں چھوٹی اور دن بڑے ہوں تو آدھی رات سے زیادہ یا دو تہائی رات عبادت میں گزاریے اور اگر راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہوں تو آدھی رات سے کم یا تہائی رات تک عبادت کرنا بھی کافی ہوگا۔

[۴] ❁ ترتیل میں کون کون سی باتیں شامل ہیں:۔ رَتَلَ: رتل کسی چیز کی خوبی، آرائش اور بھلائی کو کہتے ہیں اور رتل کے معنی سہولت اور حسن تناسب کے ساتھ کسی کلمہ کو ادا کرنا ہے۔ نیز اس کا معنی خوش آوازی سے پڑھنا یا پڑھنے میں خوش الحانی اور حسن ادائیگی میں حروف کا لحاظ رکھنا اور ہر لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر اور الگ الگ کر کے پڑھنا ہے اور اس طرح پڑھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر لفظ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ انسان اس کے معانی پر غور کرسکتا ہے اور یہ معانی ساتھ کے ساتھ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ

کر پڑھا کیجیے(۴) بلاشبہ ہم آپ پر ایک بھاری کلام[۵] نازل کرنے والے ہیں(۵) رات کا اٹھنا[۶] یقیناً (نفس کو) بہت

چنانچہ ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کی عادت تھی۔ آپ ﷺ رات کو نماز پڑھتے پھر اس قدر سو جاتے جتنی دیر نماز پڑھی تھی۔ پھر اتنی دیر نماز پڑھتے جتنی دیر سوئے تھے پھر اس کے بعد اتنی دیر سو جاتے جتنی دیر نماز پڑھی تھی یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ پھر آپ ﷺ کی قراءت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ﷺ کی قراءت جدا جدا تھی حرف حرف کر کے۔ (ترمذی۔ ابواب فضائل القرآن۔ باب کیف کانت قراءۃ النبی ﷺ) نیز انہی سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قراءت کو الگ الگ کرتے تھے۔ آپ ﷺ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پڑھتے پھر ٹھہر جاتے پھر ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھتے پھر ٹھہر جاتے پھر ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھتے) (ترمذی۔ ابواب القراءات عن رسول اللہ ﷺ)

[۵] عظیم ذمہ داری کیا ہے:؟ بھاری کلام سے مراد وہ احکام ہیں جو معاشرہ میں انقلاب کے سلسلہ میں آپ ﷺ کو دیئے جانے والے تھے۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے خود ان احکام پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کے سامنے عملی نمونہ پیش کرنا تھا پھر اس دعوت کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنا اور ان کے مقابلہ میں اٹھنا تھا۔ مشرکانہ عقائد کے خلاف اور جاہلی تہذیب و تمدن کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ صدیوں سے ایک دوسرے کے دشمن معاشرہ میں محبت و موانست اور بھائی بندی کی فضا پیدا کرنا تھی۔ پھر انہی کو متحد کر کے پوری دنیائے کفر سے ٹکر لینا تھی اور اللہ کی مہربانی اور مدد کے ساتھ دین اسلام کو تمام ادیان باطلہ کے مقابلہ میں غالب کرنا تھا۔ یہ تھیں وہ عظیم ذمہ داریاں جن کی آپ کو ﴿سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ کے ذریعہ اطلاع دی گئی اور اسی فریضہ کی تربیت کے سلسلہ میں آپ ﷺ کو رات کا ایک حصہ اللہ کی عبادت میں گزارنے کا حکم دیا گیا۔

[۶] تہجد کا لغوی مفہوم:۔ پانچ نمازوں کی فرضیت تو معراج کو ہوئی تھی۔ اس سے پہلے آپ ﷺ بھی اور دوسرے صحابہ کرام بھی رات کی نماز ہی پڑھا کرتے تھے۔ نماز باجماعت کا بھی کوئی اہتمام یا حکم نہیں تھا۔ صحابہ کرام اپنے اپنے گھروں میں یہ نماز اپنے اپنے طور پر ادا کر لیا کرتے تھے۔ جب معراج میں پانچ وقت نمازیں فرض ہوئیں تو یہ نماز صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے فرض رہ گئی باقی مسلمانوں سے اس کی فرضیت ساقط کر دی گئی۔ البتہ اس کے ادا کرنے کی ترغیب ضرور دی گئی۔ اب اس نماز کی حیثیت عام مسلمانوں کے لیے سنت موکدہ کی ہے۔ اس کے اوقات بھی مختلف تھے۔ کئی مسلمان اسے رات کے ابتدائی حصہ میں ادا کر لیا کرتے تھے۔ بعض دوسرے پچھلے حصہ میں یہ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے قیام اللیل کی ایک صورت وہ تھی جو اوپر سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکور ہے۔ اور لغوی لحاظ سے لفظ تہجد یا ہجود کا یہی معنی ہے۔ یعنی رات بھر میں کئی بار سونا بھی اور جاگنا بھی۔ پھر جب پانچ نمازیں فرض ہو گئیں تو بھی یہ نماز آپ ﷺ کے لیے فرض ہی رہی اور اس کا وقت نصف شب سے لے کر طلوع فجر تک قرار پایا۔ یعنی اس عرصہ کے درمیان کسی بھی وقت یہ نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ ان آیات سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ سورۂ مزمل کے نزول سے پہلے قرآن کا اتنا حصہ نازل ہو چکا تھا جسے اس لمبی نماز میں ترتیل کے ساتھ پڑھا جا سکتا تھا۔

وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ۭ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ۭ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ
تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ۭ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ وَ
اصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ

زیر[۷] کرنے والا ہے اور قرآن پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں[۸] وقت ہے۔(۶)

دن کے وقت تو آپ کو لمبی چوڑی مصروفیات ہوتی ہیں۔(۷) (لہذا رات کو) اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کیا کیجیے اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اسی کی طرف متوجہ[۹] ہو جائیے۔(۸) وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں لہذا اسے ہی اپنا کارساز[۱۰] بنا لیجیے۔(۹) اور جو کچھ (کافر) کہتے ہیں اس پر صبر کیجیے اور شریفانہ طریقے سے ان[۱۱] سے الگ ہو جائیے۔(۱۰) اور جھٹلانے والے کھاتے پیتے[۱۲] لوگوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجیے

[۷] وَطْاً بمعنی روندنا، پامال کرنا، سب کس بل نکال دینا۔ یعنی رات کو جاگ کر اپنے نفس کو اللہ کی عبادت پر آمادہ کرنا نفس کی سرکشی کو دور کرنے اور اس کے کس بل نکالنے کے لیے بہت موثر علاج ہے۔ البتہ اس سے نفس کو کوفت بہت ہوتی ہے۔ اور (وَطْأً عَلَى الأمرِ) کا دوسرا معنی کسی کام کو اپنی مرضی کے موافق آسان بنا لینا بھی ہے۔ گویا شب بیداری اگرچہ نفس پر بہت گراں بار ہے تاہم یہ نفس کی اصلاح کے لیے اور جس کام کے لیے ہم آپ ﷺ کی تربیت کرنا چاہتے ہیں، نہایت مناسب اور مفید رہے گی۔

[۸] ﴿ اَقْوَمُ قِيْلًا ﴾ یعنی بات کو زیادہ درست بنانے والا۔ یعنی شب بیداری کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس وقت دل و دماغ تازہ ہوتے ہیں۔ شور و غل نہیں ہوتا۔ لہذا اس وقت جو قرآن پڑھا جائے گا۔ طبیعت پوری توجہ سے اس میں غور و فکر کرے گی۔ گویا قرآن کے مطالب سمجھنے اور اس سے اثر پذیری کے لیے یہ وقت موزوں ہے۔

[۹] ❁ تبتل کا لغوی مفہوم:۔ تَبَتَّلْ: کے معنی کسی شے کو کاٹ کر کسی شے سے جدا کرنا اور بتل اور تبتل کے معنی ہر قسم کے دھندوں اور جھمیلوں سے توجہ ہٹا کر اور فراغت پا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا اور خلوص نیت کے ساتھ عبادت الٰہی میں مشغول ہونا ہے۔ گویا یہ مقصد بھی دن کے کام کاج، ہنگاموں اور شور و شغب میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے بھی رات کو اٹھنا ہی مناسب وقت ہے۔

[۱۰] وکیل کا لفظ ہماری زبان میں بھی ٹھیک اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی زبان میں مستعمل ہے۔ ہم جب مقدمہ کی پیروی کے لئے کسی کو اپنا وکیل بنا لیتے ہیں تو سب ذمہ داری اس کے سپرد کر کے خود مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ اپنے پیارے پیغمبر سے فرما رہے ہیں کہ آپ ﷺ خود تو پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہو جائیے اور اپنے سب معاملات اپنے پروردگار کے سپرد کر دیجیے۔ آپ ﷺ کے باقی سب معاملات وہ درست کر دے گا۔

[۱۱] اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے قطع تعلق کر لیجیے۔ بلکہ یہ ہے کہ جہاں تک ان کے طعن و تشنیع، طنز و تمسخر اور تلخ کلامی کا تعلق ہے۔ تو ان کی یہ باتیں برداشت کیجیے اور انہیں کچھ جواب نہ دیجئے اور جہاں تک ان کی ہدایت اور خیر خواہی کا تعلق ہے تو ایسا کوئی موقع آپ کو فروگذاشت نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ ایسے موقع کی جستجو میں رہنا چاہئے اور ہر وقت ان کا بھلا ہی سوچنا چاہیے۔ اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دیتے رہنا چاہیے۔

[۱۲] ❁ مترفین کا کردار:۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کی دعوت کو جھٹلانے والے عموماً یہی کھاتے پیتے اور خوشحال لوگ ہی ہوا کرتے

وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ﴿١١﴾ إِنَّ لَدَيْنَآ أَنكَالًا وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ
الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ﴿١٤﴾ إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ
إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ﴿١٦﴾ فَكَيْفَ

اور تھوڑی مدت انہیں اسی حال میں رہنے دیجئے (۱۱) ہمارے پاس (ان لوگوں کے لیے) بیڑیاں [۱۳] بھی ہیں اور دوزخ بھی (۱۲) اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب بھی ہے۔ (۱۳) جس دن زمین اور پہاڑ لرزنے لگیں گے اور پہاڑ بھربھری ریت کے پھسلتے [۱۴] ہوئے تودے بن جائیں گے (۱۴)

بلاشبہ ہم نے تمہارے پاس [۱۵] ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ جیسے ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا (۱۵) پھر فرعون نے رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اسے بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا (۱۶) اب اگر تم نے

ہیں۔ انہیں ہی قرآن نے بعض دوسرے مقامات پر مترفین کے لفظ سے ذکر کیا ہے ان لوگوں کا چونکہ معاشرہ میں اپنا ایک حلقہ اثر اور مخصوص مقام ہوتا ہے اور نبی کی دعوت قبول کرنے سے انہیں یہ مقام چھن جانے کا خطرہ ہوتا ہے لہذا یہی لوگ انبیاء کی دعوت کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ ایسے لوگوں کی مخالفت کی پروانہ کیجئے۔ ان سے میں نمٹ لوں گا۔ مگر ابھی کچھ وقت انہیں مخالفت کرنے کا موقع دیا جائے گا جس میں کئی طرح کی مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔

[۱۳] یہ آسودہ حال لوگ جو آپ ﷺ کی عداوت اور مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ انہیں سزا دینے کے لئے ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ وزنی بیڑیاں بھی جن کے بوجھ کی وجہ سے ہل تک نہ سکیں گے۔ انہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینکا جائے گا کھانے کو تھوہر کا درخت ہوگا جو بھوک کی مجبوری کی وجہ سے کھانے کی کوشش کریں گے مگر اس سے گلے میں پھندا لگ جائے گا اور بڑی مشکل سے نیچے اترے گا۔ اس کے علاوہ دردناک سزا بھی ملے گی۔

[۱۴] یعنی آج تو پہاڑوں کی جڑیں زمین کے اندر دور نیچے تک مضبوط جمی ہوئی ہیں۔ مگر قیامت کے دن پہاڑوں کی یہ گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ زمین میں بھی بھونچال آئیں گے اور پہاڑ بھی لرزنے لگیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پہاڑوں کے پتھر ایک دوسرے کے اوپر ہی گر گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ریت کے ایسے نرم تودے بن جائیں گے کہ پاؤں ان کے اندر دھنسنے لگیں گے اور اگر تھوڑی سی ریت اٹھا کر ان کے اوپر رکھی جائے تو وہ سب پھسل پھسل کر نیچے آ رہے۔ واضح رہے کہ کَثِيْبًا میں "ک" حرف تشبیہ نہیں ہے بلکہ یہ کثیب کے مادہ "ک ث ب" میں شامل ہے اور کثیب بمعنی ریت کا لمبا چوڑا ٹیلہ ہے۔

[۱۵] اس سے پہلی آیات میں مخاطب رسول اللہ ﷺ تھے۔ اب خطاب کا رخ کفار مکہ کی طرف مڑ گیا ہے اور انہیں بتایا یہ جا رہا ہے کہ اس رسول کی مخالفت پر تم کمربستہ ہو گئے ہو۔ تو یہی رسول تمہاری ایک ایک حرکت کی قیامت کے دن تم پر گواہی دینے والا ہے۔ لہذا جو قدم اٹھاتا ہے سنبھل کر اٹھاؤ۔ اس سے پہلے ہم نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ فرعون تم سے بہت زیادہ طاقتور، جابر اور ایک وسیع خطہ زمین پر حکمران تھا۔ لیکن اس نے بھی اللہ اور اس کے رسول کی بات نہ مانی اور اکڑ گیا تو ہم نے اسے دریا میں ڈبو کر اس کا اور اس کی آل کا صفحۂ ہستی سے نام و نشان تک مٹا دیا تھا اور تم تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں

تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿١٧﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ
مَفْعُوْلًا ﴿١٨﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿١٩﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ
اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ ع ۱۳
وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا

(اس رسول کا) انکار کر دیا تو اس دن (کی سختی) سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا (۱۷) جس (کی سختی) سے آسمان پھٹ جائے گا[۱۶] یہ اللہ کا وعدہ ہے جو پورا ہو کے رہے گا (۱۸) یہ (قرآن) یقیناً ایک نصیحت ہے اب جو چاہے[۱۷] وہ اپنے پروردگار کی طرف (جانے والی) راہ اختیار کر لے (۱۹)

آپ کا پروردگار یقیناً جانتا ہے کہ آپ قریباً دو تہائی رات اور (کبھی) نصف رات اور (کبھی) ایک تہائی رات (نماز میں) کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ (کھڑا ہوتا ہے) اور رات، دن کو تو اللہ ہی کم و بیش کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم اوقات کا صحیح شمار نہ کر سکو گے لہٰذا اس نے تم پر مہربانی[۱۸] فرما دی۔ لہٰذا اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو۔ پڑھ لیا کرو۔

رکھئے۔ لہٰذا تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس رسول کی مخالفت سے باز آ جاؤ۔

[۱۶] اس دنیا میں بھی تم پر فرعون اور آل فرعون کی طرح اللہ کا عذاب آ کے رہے گا اگر بالفرض اس دنیا میں عذاب نہ بھی آئے تو اس دن کے عذاب سے تم کیونکر بچ سکتے ہو جس دن آسمان پھٹ جائے گا، یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ اس دن کی دہشت اور ہولناکی کا یہ عالم ہو گا کہ عذاب سے پہلے ہی بچے دہشت کے مارے بوڑھے نظر آنے لگیں گے، چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔ لوگ ان دہشت ناک مناظر سے پناہ کی کوئی جگہ تلاش کرنا چاہیں گے تو وہ بھی کہیں نہ مل سکے گی۔ اس کے بعد اس دن کا فروں کو یقینی طور پر جو عذاب ہونے والا ہے اس سے بچنے کی تمہارے پاس کوئی صورت ہے؟

[۱۷] لہٰذا تمہارے لیے بہترین طرز عمل یہی ہے کہ اس قرآن کی نصیحت پر عمل کرو۔ اور اللہ کی نافرمانی کے بجائے فرمانبرداری کا رویہ اپنا کر اس دن کے عذاب سے بچ جاؤ۔

[۱۸] سورۂ مزمل کی یہ آیت پورے رکوع پر مشتمل ہے۔ اس کا نزول ایک روایت کے مطابق ہجرت سے ۸ ماہ بعد، دوسری کے مطابق ایک سال بعد اور تیسری روایت کے مطابق دس سال بعد ہوا۔ ہمارے خیال میں یہ تیسری روایت ہی قابل ترجیح ہے کیونکہ اس رکوع میں قتال فی سبیل اللہ کا بھی ذکر ہے اور زکوٰۃ کا بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں مدنی زندگی میں فرض ہوئی تھیں۔ پہلے حکم کے مطابق آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی متابعت میں صحابہ کرام کو بھی کم از کم تہائی رات کا قیام ضروری تھا۔ لیکن اس زمانہ میں گھڑیاں تو موجود نہ تھیں لہٰذا آپ ﷺ اور اسی طرح صحابہ کرام بعض دفعہ رات کا اکثر حصہ قیام فرماتے محض اس احتیاط کی وجہ سے کہ کہیں وقت تہائی رات سے کم نہ ہو اور اس طرح بسا اوقات کھڑے کھڑے ان کے پاؤں متورم ہو جاتے تھے بعد میں اس

تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖؗ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا

اسے معلوم ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے، کچھ دوسرے اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، لہٰذا جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لیا[۱۹] کرو۔ اور نماز قائم[۲۰] کرو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو اور اللہ کو اچھا[۲۱] قرض دیتے رہو، اور جو بھی بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے

حکم کے ذریعہ سابقہ حکم میں کافی تخفیف فرما دی۔

[۱۹] اس آیت سے از خود معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حکم کے بعد قیام اللیل فرض نہیں رہا۔ نہ اس میں قرآن کی کوئی مقررہ مقدار پڑھنے کی قید ہے۔ البتہ آپ ﷺ پر نماز تہجد فرض تھی وہ بھی اس آیت کی رو سے نہیں بلکہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (۱۷:۷۹) کی رو سے تھی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کسب حلال کی خاطر سفر کرنے کو بھی ایک معقول عذر اور قتال فی سبیل اللہ کے برابر قرار دیا۔ جس سے کسب حلال کی انتہائی فضیلت معلوم ہوئی۔

[۲۰] ❁ نماز باجماعت میں لمبی قراءت سے پرہیز:۔ نماز باجماعت کے سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس میں قراءت زیادہ لمبی نہ کی جائے جیسا کہ درج حدیث سے واضح ہے:

سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ فرض نماز ادا کرتے۔ پھر جا کر اپنی قوم کو امامت کراتے، ایک دن انہوں نے عشاء کی نماز پڑھائی تو سورۂ بقرہ شروع کر دی۔ ایک شخص (پانی ڈھونے والا) نماز توڑ کر چلا گیا۔ معاذ اسے برا بھلا کہنے لگے: یہ بات نبی اکرم ﷺ تک پہنچی (اس شخص نے جا کر آپ ﷺ سے معاذ کی شکایت کی) تو آپ ﷺ نے سیدنا معاذ کو تین بار فتان یا فاتن (فتنہ ڈالنے والا) کہا پھر معاذ کو حکم دیا کہ "اوساط مفصل میں سے کوئی دو سورتیں پڑھایا کرے" اسی واقعہ کے ایک دوسرے راوی ابو مسعود کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو کبھی وعظ اور نصیحت میں اس دن سے زیادہ غصے میں نہیں دیکھا، فرمایا: تم میں سے کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو متنفر کر دیں۔ دیکھو! تم میں سے جو لوگوں کو نماز پڑھائے وہ ہلکی نماز پڑھائے۔ کیونکہ لوگوں میں کوئی ناتواں ہوتا ہے، کوئی بوڑھا اور کوئی کام کاج والا۔ ہاں جب اکیلا ہو تو جتنی چاہے لمبی کرے۔" (بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب اذا طوّل الامام..........) البتہ جب کوئی شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہو تو جتنی چاہے قراءت لمبی کر سکتا ہے۔

[۲۱] ❁ قرض حسن زکوٰۃ سے الگ چیز ہے:۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا الگ ذکر فرمایا اور قرضہ حسنہ کا الگ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے نفلی صدقات بھی ادا کرتے رہنا چاہیے۔ قرضہ حسنہ کی تفصیل اور اس کے احکام کے لیے دیکھئے سورۂ حدید کی آیت نمبر ۱۱ کا حاشیہ۔

لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰ۧ

ع ۲
۱۴

تو اسے اللہ کے ہاں اس حال میں موجود پاؤ گے کہ وہ (اصل عمل سے) بہتر[۲۲] اور اجر کے لحاظ سے بہت زیادہ ہوگی۔ اور اللہ سے معافی مانگتے[۲۳] رہو، اللہ یقیناً بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔(۲۰)

[۲۲] انسان کے کام آنے والا وہی مال ہے جو اس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کہتا ہے کہ یہ میرا مال ہے، یہ میرا مال ہے۔ حالانکہ اس کا مال وہی ہے جو اس نے کھا کر یا پہن کر استعمال کر لیا یا اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور جو مال وہ چھوڑ مرا تو اس کا مال نہیں ہے وہ تو وارثوں کا ہے۔ اس ارشاد مبارک میں آپ ﷺ نے کھانے اور پہنے ہوئے مال کو بھی اپنا مال قرار دیا .... ۔ اور شائد اس کے متعلق اللہ کے ہاں باز پرس بھی نہ ہو۔ مگر انسان کے کام صرف وہی مال آئے گا جسے اس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا یا حاجت مندوں کی احتیاج کو دور کیا، یہی وہ مال ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ اجر عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

[۲۳] استغفار سے صرف یہی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ از راہ کرم استغفار کرنے والے کے گناہ معاف فرما دیتا ہے بلکہ اس سے کئی طرح کے دنیوی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے سورہ نوح کا حاشیہ نمبر ۵۔

۵۶ آیاتها سُورَةُ المُدَّثِّر مَكِّيَّة رکوعها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

کلمات ۲۵۶ آیات ۵۶ (۷۴) سورۃ المدثر[1] مکی ہے (۴) رکوع ۲ حروف ۱۱۲۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

[1] وحی کی گرانباری:۔ آپ ﷺ پر سب سے پہلی جو وحی غار حرا میں نازل ہوئی وہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات تھیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ خالق کائنات ہے۔ اسی نے آپ کو بھی پیدا کیا ہے اور اسی نے یہ فرشتہ نازل کیا ہے۔ ان آیات میں آپ کو تبلیغ وغیرہ کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ صرف آپ ﷺ کو آپ ﷺ پر پڑنے والی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنا مقصود تھا۔ فرشتہ جبریل علیہ السلام کے ذریعہ نبی کے دل پر جو وحی نازل ہوتی ہے۔ نبی کے لئے سخت تکلیف دہ اور گرانبار ہوتی ہے۔ اس دوران پہلے گھنٹی کی سی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ پھر نبی کا اس عالم سے رشتہ کٹ کر عالم بالا سے جڑ جاتا ہے اور اس وحی کا اتنا بار ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو بعض اوقات سردیوں میں وحی کے وقت پسینہ آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر ران رکھے ہوئے تھے کہ وحی کا نزول شروع ہوا۔ سیدنا زید کہتے ہیں کہ میں نے اس کا اتنا بوجھ محسوس کیا کہ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ نیچے سے میری ران ٹوٹ جائے گی۔ اور ایک دفعہ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے۔ وحی نازل ہونا شروع ہوئی تو اس کے بوجھ اور دباؤ سے اونٹنی نیچے بیٹھ گئی تھی۔ چنانچہ پہلی دفعہ غار حرا میں جب وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اس تکلیف اور بوجھ سے مجھے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ خیر آپ ﷺ اسی حالت میں گھبرائے ہوئے گھر آئے تو سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بہت تسلی دی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ وحی کی تکلیف اور بوجھ کے باوجود اس دوران آپ ﷺ کو ایک عجیب طرح کی لذت بھی محسوس ہوئی تھی۔ اسی لذت کی وجہ سے آپ وحی کے منتظر بھی رہتے تھے۔ بعد ازاں ایک دن درج ذیل واقعہ پیش آیا:

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ وحی بند رہنے کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ فرمایا: "ایک دفعہ چلتے چلتے میں نے آسمان سے ایک آواز سنی تو آسمان کی طرف اسی فرشتے کو دیکھا جو حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اتنا ڈرا کہ ڈر کے مارے زمین پر گر پڑا۔ پھر اپنے گھر آیا تو گھر والوں سے کہا: "مجھے کمبل اڑھا دو۔ مجھے کمبل اڑھا دو" چنانچہ انہوں نے مجھے کمبل اڑھا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ......فَاهْجُرْ﴾ تک۔ ابوسلمہ نے کہا رجز سے بت مراد ہیں۔ اس کے بعد وحی گرم ہو گئی، برابر لگاتار آنے لگی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝۵ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝۸ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ

اے (محمد ﷺ!) جو کمبل اوڑھے سو رہے ہو(۱) اٹھیے اور (لوگوں کو برے انجام سے) ڈرایئے[۲] (۲) اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان[۳] کیجیے(۳) اور اپنے کپڑے پاک صاف[۴] رکھیے (۴) اور گندگی سے دور[۵] رہیے (۵) اور زیادہ حاصل کرنے کے لیے احسان[۶] نہ کیجیے (۶) اور اپنے پروردگار کی خاطر صبر کیجیے(۷) پس جب صور میں پھونک ماری جائے گی(۸) تو یہ دن بڑا کٹھن ہوگا(۹)

[۲] اس سورہ کی ابتدا میں ہی آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی ذمہ داری سے آگاہ کیا جارہا ہے۔ کہ اب سونے کا وقت نہیں بلکہ جو لوگ اللہ کو بھول کر خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں انہیں بتایئے کہ انہیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے پروردگار کے حضور پیش ہونا ہے۔ لہٰذا اپنے برے انجام سے بچنے کی خاطر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت بجالاؤ۔

[۳] ❁ پہلا سبق اللہ کی کبریائی:۔ یعنی دنیا میں جتنے لوگ بڑے بنے بیٹھے ہیں۔ ان سب کی بڑائیاں اللہ کی بڑائی کے سامنے ہیچ ہیں۔ نیز بڑے بڑے حکمران اور ان کی حکومتیں بھی اللہ تعالیٰ کی بڑائی کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ آپ ﷺ لوگوں کو اللہ کی کبریائی، بزرگی اور بڑائی سے پوری طرح روشناس کرا لیجیے۔ اور زبان سے بھی اللہ کی بڑائی بیان کرتے رہا کیجیے۔ اسی حکم کی وجہ سے اسلام میں تکبیر یا کلمہ اللہ اکبر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ہر اذان میں چھ بار یہ کلمہ دہرایا جاتا ہے۔ اور ہر نماز کا افتتاح بھی اسی تکبیر سے ہوتا ہے۔ پھر رکوع جاتے وقت، سجدہ کے وقت، سجدہ سے اٹھتے وقت غرض نماز کی ہر رکعت میں متعدد بار اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ پھر نماز کے بعد تکبیر و تہلیل کی بہت فضیلت آئی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ایک مسلمان کے سامنے ہر وقت اللہ کی کبریائی کا تصور موجود رہے۔

[۴] ❁ دوسرا سبق: جسم اور لباس کی صفائی اور راہبانہ تصور:۔ یعنی اپنے کپڑے میل کچیل سے بھی اور نجاست سے بھی پاک صاف رکھیے۔ اور صاف ستھرا لباس استعمال کیا کیجیے اور جسم کو پاک صاف رکھیے۔ کیونکہ روح کی پاکیزگی کے لیے جسم اور لباس کی صفائی بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس آیت میں ان راہبانہ تصورات کا پورا رد موجود ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان جتنا گندہ اور میلا کچیلا رہے اتنا ہی وہ اللہ کے ہاں محبوب اور مقدس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں جسم اور لباس کی صفائی کی جو اہمیت ہے اس ابتدائی حکم سے اس پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

[۵] ❁ باطنی صفائی:۔ رُجزٌ سے مراد ظاہری میل کچیل، گندگی اور نجاست بھی ہے۔ اور باطنی یعنی دل کی نجاست یا گندگی بھی۔ اس لفظ کا اطلاق ان تمام شیطانی وساوس پر ہوتا ہے جو دل میں موجود ہوں۔ خواہ یہ غیر اللہ کی عبادت سے متعلق ہوں یا برے خیالات سے۔ اور یہ باطنی صفائی ظاہری صفائی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

[۶] ❁ بے لوث خدمت اور اللہ کے لیے صبر:۔ کسی شخص کی بے لوث خدمت کرنا بڑا حوصلہ مندی کا کام ہے۔ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اگر وہ کسی پر کوئی دنیوی یا دینی بھلائی کرے تو کسی نہ کسی رنگ میں اس کو اس کا بدلہ ضرور ملنا چاہیے۔ بلکہ بسا اوقات انسان کی طبیعت یہ چاہتی ہے کہ کسی پر اس نے جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ اسے اس سے بڑھ کر ملنا چاہیے۔ یہ نظریہ خالصتاً خود غرضانہ اور

عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝

کافروں کے لیے آسان[۷] نہ ہوگا۔(۱۰) مجھے چھوڑ دیجیے اور اسے جسے میں نے اکیلا[۸] پیدا کیا(۱۱) اسے لمبا چوڑا مال عطا کیا(۱۲) اور ہر وقت موجود رہنے والے[۹] بیٹے دیئے۔(۱۳)

اور ہر طرح سے اس کے لیے (ریاست کی) راہ ہموار کی(۱۴) پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور[۱۰] بھی دوں(۱۵)

مادی نظریہ ہے۔ لہٰذا جس عظیم مقصد کے لیے آپ کو تیار کیا جا رہا تھا اور جس طرح آپ کو پوری بنی نوع انسان کی ہدایت کی خدمت سپرد کی جانے والی تھی اس کے لیے ابتدا میں ہی آپ کو یہ ہدایت کی گئی کہ کسی طرح کے فائدہ، لالچ، غرض اور معاوضہ کا طمع رکھے بغیر لوگوں پر دینی اور دنیوی دونوں طرح کی بھلائیاں کرتا ہوں گی اور اس راہ میں آپ ﷺ کو جتنے بھی مصائب پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے اللہ کی رضا کی خاطر برداشت کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان باتوں کا بہت زیادہ اجر عطا فرمائے گا۔

[۷] ❁ عقیدہ قیامت اور اس کا تصور:۔ اس آیت میں وضاحت یہ ہے کہ جس دن صور پھونکا جائے گا یعنی قیامت آجائے گی تو یہ دن کافروں کے لئے بڑا سخت ہوگا۔ جس کا واضح نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن مومنوں کے لیے سخت نہیں ہوگا اور مومنوں کا غالباً یہاں اس لیے ذکر نہیں کیا گیا کہ اس دن کے آنے سے پہلے ہی مومنوں کو دنیا سے اٹھا لیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں اس بات کی صراحت ہے کہ "لا تقوم الساعة إلا علىٰ شرار الخلق" یعنی قیامت صرف بدترین لوگوں پر قائم ہوگی۔ (مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب لاتزال طائفة من امتی)

[۸] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جب وہ پیدا ہوا تو بالکل خالی ہاتھ پیدا ہوا تھا۔ اس کے پاس کوئی مال و دولت، عزو جاہ یا لاؤ لشکر کچھ بھی نہ تھا۔ یہ تو اسے بعد میں اس دنیا میں ملا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس شخص کی مخالفت کی آپ مطلق پروا نہ کیجیے اور اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔

[۹] ❁ قصہ ولید بن مغیرہ:۔ ان آیات میں بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا تاہم جو صفات بیان کی گئی ہیں اس سے ہر ایک کو واضح طور پر معلوم ہو جاتا تھا کہ ان آیات کا روئے سخن کس طرف ہے؟ یہ شخص باتفاق مفسرین ولید بن مغیرہ تھا۔ حرب بن امیہ کی وفات کے بعد قریش کی سیادت اسی کے ہاتھ آئی تھی اور یہ ابو جہل مخزومی کا چچا تھا۔ بڑا صاحب مال تھا۔ دس یا بارہ جوان بیٹے اس کے پاس موجود رہتے تھے۔ جنہیں کسب معاش کی چنداں فکر نہیں تھی۔ اس کام کے لیے اس کے نوکر چاکر بہت تھے۔ بس ان بیٹوں کا کام یہی تھا کہ اپنے باپ کی مجلس میں حاضر رہ کر اس کی شان و شوکت بڑھائیں۔ انہیں بیٹوں میں سے ایک سیدنا خالد بن ولید بھی تھے۔ جس نے اسلام لا کر اسلام کی بیش بہا خدمات سر انجام دیں تھیں۔

[۱۰] اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت بھی کافی عطا کیا تھا، جوان بیٹے بھی اور ریاست بھی دی تھی۔ لیکن کبھی حرف شکر زبان سے نہ نکلا ہمیشہ اور زیادہ مال جمع کرنے کی حرص میں منہمک رہتا اور اگر رسول اللہ ﷺ اس کے سامنے جنت کی نعمتوں کا ذکر فرماتے

كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝۱۶ۭ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝۱۷ۭ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸ۙ فَقُتِلَ

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے(۱۶) میں عنقریب اسے ایک سخت چڑھائی[۱۰-الف] چڑھاؤں گا(۱۷) اس نے سوچا اور ایک بات بنانے کی کوشش کی(۱۸) اس پر اللہ کی مار اس نے کیسی[۱۱] بات بنائی(۱۹)

تو کہتا تھا کہ اگر یہ شخص اپنے بیان میں سچا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہاں کی نعمتیں بھی مجھے ضرور ملیں گی۔

[۱۰-الف] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میں اس کو اس کی زندگی میں سخت مشکلات سے دوچار کر دوں گا اور دوسرا مطلب اخروی عذاب سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ ابو سعید کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: صعود دوزخ میں ایک پہاڑ ہے جس پر دوزخی کو چڑھایا جائے گا۔ پھر اسے وہاں سے نیچے گرا لیا جائے گا اسے ہمیشہ یہی عذاب ہوتا رہے گا۔ (ترمذی ابواب التفسیر)

[۱۱] ❁ اسلام لانے میں اس کی سرداری رکاوٹ بن گئی:۔ ولید بن مغیرہ خود بڑا سمجھدار اور عربی کلام کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔ وہ خود قرآن سے کافی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ اب قریشی سرداروں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اگر ان کا رئیس مسلمان ہو گیا تو پھر تو ان کا کہیں بھی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ اس کو اپنے سابقہ دین پر برقرار رکھنے کا بیڑا ابو جہل نے اٹھایا۔ (ولید بن مغیرہ کے بعد قریش کی سیادت ابو جہل کے ہاتھ آ گئی تھی) جب ابو جہل نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ مسلمان ہو گیا تو اس کی سب عزت و جاہ خاک میں مل جائے گی اور اسے قریش کی سیادت سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ تو وہ اسلام لانے سے رک گیا۔ اب ایک اور اہم مسئلہ درپیش تھا کہ حج کا موسم قریب آ چکا تھا اور قریشی سرداروں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جو لوگ حج کے موقعہ پر باہر سے مکہ آتے ہیں انہیں اسلام کی دعوت سے کیونکر روکا جا سکتا ہے اور وہ پیغمبر اسلام کو کیا کہہ کر لوگوں کو ان سے متنفر کر سکتے ہیں؟

❁ ولید بن مغیرہ کے ہاں مشرکین مکہ کا مشورہ:۔ چنانچہ اس غرض کے لیے قریشی سردار ولید بن مغیرہ کے ہاں جمع ہوئے۔ ولید بن مغیرہ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اچھا تم لوگ اپنی اپنی تجاویز پیش کرو۔ ان میں سے ایک بول اٹھا: "ہم کہیں گے کہ یہ شخص کاہن ہے" ولید کہنے لگا واللہ! وہ کاہن نہیں، اس کے کلام میں نہ کاہنوں جیسی گنگناہٹ ہے، نہ قافیہ گوئی اور نہ تک بندی۔ پھر وہ کاہن کیسے ہو سکتا ہے؟" دوسرے نے کہا ہم کہیں گے: "وہ پاگل ہے" ولید نے کہا: واللہ! "وہ پاگل بھی نہیں، ہم نے پاگلوں کو دیکھا ہے۔ اس کے اندر نہ پاگلوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت ہے، نہ الٹی سیدھی حرکتیں ہیں اور نہ ان جیسی بہکی بہکی باتیں ہیں" تیسرے نے کہا: "ہم کہیں گے، وہ شاعر ہے" ولید کہنے لگا "وہ شاعر بھی نہیں، ہمیں رجز، ہجز، قریض مقبوض، مبسوط سارے ہی اصناف سخن معلوم ہیں۔ اس کی بات بہرحال شعر نہیں ہے۔" تب لوگوں نے کہا: ہم کہیں گے: "وہ جادوگر ہے" ولید نے کہا وہ جادوگر بھی نہیں۔ یہ شخص نہ ان کی طرح جھاڑ پھونک کرتا ہے اور نہ گرہ لگاتا ہے" آخر لوگوں نے جھنجھلا کر کہا: پھر تم ہی اپنی بے داغ رائے پیش کرو۔ ولید کہنے لگا۔ مجھے ذرا سوچ لینے دو۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں پر ایک فاخرانہ نگاہ ڈالی۔ پھر از راہ تکبر پیشانی کو سکیڑا جیسے قرآن سے اسے بہت کراہت اور انقباض ہے۔ اس کے ساتھی چلے گئے، وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے اپنی بے داغ رائے یہ پیش کی کہ تم لوگ باہر سے آنے والوں سے یوں کہہ سکتے ہو کہ یہ

كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ
وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾
سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ
لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۙ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ

پھر اس پر اللہ کی مار اس نے کیسی بات بنائی؟ (۲۰)

پھر اس نے (اپنے ساتھیوں کی طرف) دیکھا (۲۱) پھر اس نے پیشانی سکیڑی اور منہ بسورا (۲۲) پھر وہاں سے چلا گیا اور تکبر میں آگیا (۲۳) آخر کار یہ کہا: "یہ تو محض جادو ہے جو نقل در نقل چلا آرہا ہے (۲۴) یہ بس انسان ہی کا قول ہے (۲۵) جلد ہی میں اسے سقر میں جھونک دوں گا (۲۶) اور آپ کیا جانیں کہ سقر کیا ہے (۲۷) وہ نہ باقی رکھے گی [۱۲] نہ چھوڑے گی (۲۸) کھال کو جھلس دینے والی (۲۹) اس پر انیس [۱۳] (فرشتے) مقرر ہیں (۳۰) ہم نے دوزخ کے محافظ فرشتوں ہی کو بنایا ہے اور ان کی تعداد

شخص ایسا کلام پیش کرتا ہے جو ایسا جادو ہے جس سے بھائی بھائی سے، باپ بیٹے سے، شوہر بیوی سے جدا ہو جاتا ہے اور کنبے قبیلے میں پھوٹ پڑ جاتی ہے" چنانچہ اس تجویز پر متفق ہو کر سب لوگ رخصت ہو گئے۔ اس مکالمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولید بن مغیرہ پر قرآن کی حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ اب وہ جو کچھ پینترے بدل رہا تھا محض اپنے اقتدار اور جاہ کو محفوظ رکھنے کی خاطر کر رہا تھا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کی اسی ہٹ دھرمی اور کج فکری کا نقشہ پیش کیا ہے۔

[۱۲] یعنی جہنم کی آگ دوزخیوں کو مسلسل جلاتی بھی رہے گی لیکن اس عذاب سے کسی کی موت واقع نہ ہوگی۔ آگ سے ان کی کھالیں جل جائیں گی . . . . تو انہیں دوسری نئی کھالیں مہیا کر دی جائیں گی تاکہ وہ مسلسل اور دائمی عذاب میں جلارہ سکیں۔

[۱۳] ❁ فرشتوں کا طریق:۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ جہنم میں مجرموں کو عذاب دینے کے لئے انیس قسم کے فرائض ہیں جن میں سے ہر فرض کی انجام دہی ایک ایک فرشتہ کی سرکردگی میں ہوگی۔ فرشتوں کی قوت کا اندازہ لگانا ہمارے لئے بہت مشکل ہے۔ ایک فرشتہ وہ کام کر سکتا ہے جو لاکھوں آدمی بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ ایک فرشتہ اسی محدود دائرہ میں کام کر سکتا ہے جس میں کام کرنے پر وہ مامور ہے۔ مثلاً ملک الموت لاکھوں آدمیوں کی جان ایک آن میں نکال سکتا ہے مگر عورت کے پیٹ میں ایک بچہ کے اندر جان نہیں ڈال سکتا۔ اسی طرح سیدنا جبرئیل علیہ السلام چشم زدن میں آسمانوں سے وحی تو لا سکتے ہیں مگر بارش برسانا ان کا کام نہیں۔ جس طرح کان دیکھ نہیں سکتا اور آنکھ سن نہیں سکتی۔ بلکہ یہ اعضاء وہی کام کر سکتے ہیں جن کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں اسی طرح جس فرشتے کو اللہ نے جس قسم کا عذاب کرنے پر مامور کیا ہے وہ اسی قسم کا عذاب دے سکے گا۔

إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا
وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَ
الْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن
يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾

ع

کو کافروں کے لیے آزمائش[۱۴] بنا دیا ہے تاکہ اہل کتاب کو یقین آ جائے اور ایمانداروں کا ایمان[۱۵] زیادہ ہو۔ اور اہل کتاب اور ایماندار کسی شک میں نہ رہیں اور تاکہ دل کے مریض[۱۶] اور کافر یہ کہیں کہ: بھلا اللہ کا اس مثال سے کیا مطلب؟ اسی طرح اللہ جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور آپ کے پروردگار کے لشکروں[۱۷] کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ (دوزخ کا ذکر) صرف اس لیے ہے کہ لوگوں کو نصیحت ہو۔ (۳۱) (مگر یہ لوگ) ہرگز نصیحت قبول نہ کریں گے۔ چاند کی قسم (۳۲)

[۱۴] ❁ انیس فرشتوں پر کافروں کا استہزا:۔ دوزخ پر انیس فرشتوں کے تقرر کی بات سن کر مشرکین ٹھٹھا کرنے لگے کہ ہم تو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ پھر اگر ہمارے لیے جہنم کے عذاب کی بات درست ہوئی بھی تو یہ انیس ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ ہم دس دس مل کر بھی ایک فرشتے کا مقابلہ نہ کر سکیں گے؟ ان میں سے ایک پہلوان ٹائپ آدمی کہنے لگا کہ ان میں سے سترہ کو تو میں سنبھال لوں گا۔ باقی دو سے تم نپٹ لینا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ تمہاری سوچ بالکل غلط ہے وہ ارد غنے ہیں تو انیس مگر وہ آدمی نہیں بلکہ فرشتے ہیں اور تم کیا سمجھو کہ ایک فرشتہ کتنی قوت کا مالک ہوتا ہے؟

[۱۵] یعنی اہل کتاب اور مومن لوگ فرشتوں پر بن دیکھے ایمان لانے والے ہیں اور ان فرشتوں کی قوت اور قدرت کا بھی انہیں علم ہے۔ لہٰذا وہ کبھی ایسا استہزا نہیں کر سکتے بلکہ ایسی آیات سن کر ان کے دل دہل جاتے ہیں اور ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

[۱۶] اس آیت میں مرض سے مراد شک کی بیماری ہے۔ یعنی منافق اور کافر دونوں ہی ہدایت کی باتوں سے محروم رہتے ہیں۔ یعنی ایک ہی بات یا ایک ہی مثال سے بد بخت آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ سلیم الطبع آدمی اسی مثال سے ہدایت حاصل کر لیتا ہے۔ جس نے بہرحال نہ ماننے کا تہیہ کر رکھا ہو وہ ہر کام کی بات کو بھی ہنسی مذاق میں اڑا دیتا ہے اور جس کے دل میں اللہ کا خوف اور ہدایت کی طلب ہو اسی بات سے اس کے ایمان و یقین میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

[۱۷] ❁ اللہ کے لشکر:۔ فرشتے بھی اور فرشتوں کے علاوہ جتنی بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ اپنی ہر مخلوق سے لشکروں کا کام لے سکتا ہے۔ وہ ابابیلوں سے اصحاب الفیل کو پٹوا بھی سکتا ہے اور مروا بھی سکتا ہے۔ وہ ہواؤں کو حکم دے کر عاد جیسی قد آور، طاقتور اور سرکش قوم کا سر توڑ سکتا ہے۔ بلکہ جس قدر بھی باطنی اسباب ہیں وہ سب اللہ کے کنٹرول میں ہیں اور وہ اللہ کے لشکر ہیں جن سے وہ جس قسم کا کام لینا چاہے لے سکتا ہے۔ کافروں سے جہنم کے فرشتوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ان کے علاوہ دوسرے سب لوگوں کو بھی عبرت حاصل ہو۔

وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ
شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ
الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ
نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا

اور رات کی جب وہ جانے لگے (۳۳) اور صبح کی جب وہ روشن ہو جائے (۳۴) کہ دوزخ (بھی) بہت بڑی چیزوں میں سے ایک[18] ہے۔(۳۵) وہ انسانوں کے لیے موجب خوف ہے (۳۶) جو تم میں سے آگے بڑھنا[19] چاہے یا پیچھے رہنا چاہے (۳۷) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گروی پڑا ہوا ہے (۳۸) سوائے دائیں ہاتھ[20] والوں کے (۳۹) وہ جنتوں میں ہوں گے۔(۴۰) مجرموں سے پوچھتے ہوں گے (۴۱) ”تمہیں کیا چیز دوزخ[21] میں لے گئی؟“ (۴۲) وہ کہیں گے: ”ہم نماز ادا نہیں کیا کرتے تھے (۴۳) اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے۔(۴۴) اور بے ہودہ شکوک و شبہات پیدا کرنے والوں کیساتھ ہم بھی لگے رہتے تھے (۴۵)

[18] چاند کی شکلیں، ان کا گھٹنا بڑھنا، رات اور دن کا وجود اور ان کا باری باری آنا، رات کی تاریکی کے بعد سپیدہ سحر کا نمودار ہونا۔ اللہ کی یہ نشانیاں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ چیزیں چونکہ ہر روز انسان کے مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں اس لیے وہ ان میں غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور جب دوزخ کا ذکر آتا ہے تو وہ فوراً اس کا انکار کر دیتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس نے تاحال دوزخ دیکھی نہیں۔ ورنہ ان اشیاء کی قسم جنہیں انسان دیکھ رہا ہے۔ جہنم کا وجود نا ممکن نہیں ہے۔ اور وہ انسان کے لیے ڈر جانے کی چیز ہے۔ مذاق اڑانے کی نہیں۔

[19] حقیقت تو وہی کچھ ہے جو تمہیں بتا دی گئی ہے۔ اب یہ بات ہر شخص کی پسند اور ارادہ و اختیار پر منحصر ہے کہ ہدایت کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ یا گمراہی کی دلدلوں میں ہی پھنسا رہنا چاہتا ہے۔

[20] اصحاب الیمین یعنی دائیں جانب یا دائیں ہاتھ والے۔ یہ ان لوگوں کا لقب ہے جن کو جنت کا پروانہ ملنے والا ہوگا۔ اور اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ ان لوگوں کی پوری تفصیل پہلے سورۂ واقعہ میں گزر چکی ہے۔

[21] جنت اور دوزخ میں طویل مسافت کے باوجود جب اہل جنت اہل دوزخ میں سے اپنے کسی دنیا کے ساتھی کو دیکھنا چاہیں گے یا اس سے کلام کرنا چاہیں گے تو کر سکیں گے۔ کیونکہ اس دنیا میں لوگوں کو جو قوتیں سمع و بصر وغیرہ عطا کی جائیں گی۔ وہ اس دنیا میں عطا کردہ قوتوں سے بدرجہا زیادہ ہوں گی۔ مثلاً اس دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا لیکن آخرت میں مومن لوگ بلا تکلف اللہ تعالیٰ کا دیدار کر سکیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اس دنیا میں چاند کی طرف دیکھ سکتے ہیں اور ہمیں سرور بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل جنت جب چاہیں گے۔ جہنم میں اپنے دنیا کے ساتھیوں کی طرف جھانک بھی سکیں گے اور ان سے بلا تکلف گفتگو بھی کر سکیں گے۔ چنانچہ اہل جنت ان سے ایک اہم سوال کریں گے کہ: ”وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے تمہیں دوزخ میں جانا پڑا؟“

نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾ حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ
التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ
مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَنْ

اور روز جزا کو جھٹلایا[۲۲] کرتے تھے (۴۶) یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی (۴۷)

(اس وقت) سفارش کرنے والوں کی سفارش انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی (۴۸) پھر انہیں کیا ہو گیا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں (۴۹) جیسے[۲۳] وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں (۵۰) جو شیر (کے ڈر) سے بھاگ کھڑے ہوں۔ (۵۱) بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلی ہوئی کتاب[۲۴] دی جائے (۵۲) ہرگز نہیں بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ) آخرت سے[۲۵] نہیں ڈرتے (۵۳) ہرگز نہیں! یہ تو ایک نصیحت ہے (۵۴)

[۲۲] دوزخ میں لے جانے والے چار بڑے گناہ:۔ اہل جنت کے سوال کے جواب میں اہل دوزخ چار باتیں بتائیں گے جو انہیں دوزخ میں لے جانے کا باعث بنیں۔ پہلی یہ کہ ہم نماز ادا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ نماز کی باقاعدگی صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو اللہ پر بھی ایمان رکھتا ہو اور روز آخرت کے محاسبہ پر بھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص باقاعدہ نماز ادا کرتا ہے تم اس کے ایماندار ہونے کی گواہی دو۔ جس کا دوسرا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو شخص نماز ادا نہیں کرتا نہ اس کا اللہ پر ایمان ہوتا ہے نہ روز آخرت پر، دوسرا جرم وہ یہ بتائیں گے کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلایا کرتے تھے۔ پہلا جرم اللہ کے حق سے متعلق تھا۔ یہ دوسرا جرم بندوں کے حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلانے کے سلسلہ میں یہ ضروری نہیں کہ بھوکا مسلمان ہو۔ بلکہ کوئی بھی ہو کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اگر بھوکا ہے تو انسان ہونے کے ناطے سے یہ اس کا حق ہے کہ اسے کھانا کھلایا جائے۔ اگر ننگا ہے تو اسے کپڑا دیا جائے یا اگر بیمار ہے تو اس کا علاج کیا جائے۔ اور اگر وہ مسلمان ہے یا کوئی قرابتدار بھی ہے تو اس کا حق بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ تیسرا جرم وہ بتائیں گے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ یا اللہ کی آیات میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہتے تھے ہم بھی ان کے ساتھ مل جایا کرتے تھے اور یہ سب باتیں اس وجہ سے تھیں کہ ہمارا آخرت کے دن پر یقین نہیں تھا۔ گویا ہمارا اصل اور سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ ہمیں آخرت کے دن اللہ کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جواب دہی پر ایمان نہیں تھا اور ہم برملا اسے جھٹلا دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی وقت گزرتا رہا تا آنکہ ہمیں موت آ گئی۔ جس نے سب حقائق ہم پر منکشف کر دیے۔

[۲۳] آخرت میں تو سب حالات ان کے سامنے آ جائیں گے اور وہ اپنے جرائم کا اعتراف بھی کر لیں گے مگر آج ان کی یہ صورت حال ہے کہ اگر کوئی نصیحت کی بات کہی جائے تو اسے سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور وہاں سے یوں منہ موڑ کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ جیسے جنگلی گدھے کسی شیر کی دھاڑ سن کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

[۲۴] قریشی سرداروں کا مطالبہ کہ کھلی چٹھی ہمارے نام آئے:۔ ان قریشی سرداروں میں سے ہر ایک کی آرزو یہ ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے ایک کھلی چٹھی ان میں سے ہر ایک کے نام آئے۔ جس میں یہ مذکور ہو کہ تمہارے اس صاحب (یعنی

شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۗ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے (۵۵) اور یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کریں گے الا یہ کہ اللہ ہی ایسا[۲۶] چاہے، وہی اس بات کا اہل ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور وہی معاف کر دینے[۲۷] کا اہل ہے۔ (۵۶)

محمد ﷺ) کو میں نے ہی اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا تم اس پر ایمان لے آؤ۔ اس صورت میں ہی یہ ایمان لا سکتے ہیں۔

[۲۵] اگر ہم ایسے کھلے خط ان کے نام بھیج بھی دیں تو بھی یہ لوگ کبھی ایمان نہ لائیں گے اور اسے بھی جادو کا کرشمہ قرار دے دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ نہ ان کا آخرت پر ایمان ہے اور نہ یہ اپنے مواخذہ سے ڈرتے ہیں۔ کچھ سوچ سمجھ کر جواب تو وہی آدمی دیتا ہے جسے مواخذہ کا ڈر ہو۔ اور جو مواخذہ کا خطرہ ہی نہ سمجھتا ہو وہ جو چاہے بک دے۔ اس کا کیا بگڑتا ہے؟

[۲۶] مگر اللہ بھی صرف اسے ہدایت کی توفیق دیتا ہے جو خود بھی ہدایت کا طالب ہو۔ اور جو خود ہدایت سے کوسوں دور رہنا چاہتا ہو، اللہ ایسے لوگوں کو زبردستی ہدایت نہیں دیا کرتا۔

[۲۷] آیت کے اس جملہ کی بہترین تفسیر درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس بات کا اہل ہوں کہ لوگ مجھ سے ڈریں اور جو شخص مجھ سے ڈر گیا اور میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ بنایا تو مجھے لائق ہے کہ میں اسے بخش دوں۔" (ترمذی۔ ابواب التفسیر۔ سورۃ المدثر)

۴۰ آیاتہا سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ مَکِّیَّۃٌ رکوعہا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿۱﴾ وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿۲﴾ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَّجْمَعَ

کلمات ۱۶۴ آیات ۴۰ (۷۵) سورۃ القیامۃ مکی ہے (۳۱) رکوع ۲ حروف ۶۸۲

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا[۱] ہوں (۱) اور میں ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں[۲] (کہ قیامت آ کے رہے گی) (۲) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں اکٹھی نہ کر سکیں گے؟ (۳)

[۱] قسم کھانے سے مقصد بعض دفعہ تو اپنی بات کو مؤکد بنانا ہوتا ہے۔ اور بعض دفعہ قسم بطور شہادت یا شہادت کو مزید مؤکد بنانے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ اور ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جسے انسان بہرحال اپنی ذات سے بالاتر سمجھتا ہو۔ اور چونکہ انسان خود اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم انسانوں کو یہی حکم ہے کہ اگر قسم کھانے کی ضرورت پیش آئے تو صرف اللہ کی ذات کی یا اس کی صفات کی کھائی جائے۔ اس کے علاوہ غیر اللہ کی قسم کھانا شرک اور حرام ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس چیز کو اہم سمجھتے ہوئے قسم اٹھانا چاہے بطور شہادت اور دلیل پیش کر کے قسم اٹھا سکتا ہے۔ مثلاً یہی قیامت کا دن جسے بپا کرنا اللہ کے انتہائی مہتم بالشان کارناموں سے ایک کارنامہ ہو گا اور یہ ایسی چیز تھی جس کا کفار مکہ یکسر انکار کر رہے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کی یقین دہانی کی خاطر قیامت کے دن کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ وہ یقیناً واقع ہو کے رہے گی۔

[۲] ❁ نفس انسانی کی تین حالتیں:۔ نفس انسانی کی تین مختلف قسمیں یا حالتیں ہیں اور یہ سب قرآن کی مختلف آیات سے ثابت ہیں۔ نفس کی ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ عموماً بری باتوں کا ہی انسان کو حکم دیتا ہے۔ اس کا مطمح نظر صرف ذاتی مفادات کا حصول، اپنی بڑائی اور اپنی کبریائی کا اظہار ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ دوسروں کے حقوق و مفادات کی پروا کیے بغیر خواہشات پیدا کرتا اور ان کو پورا کرنے کے لیے انسان کو اکساتا رہتا ہے۔ نفس کی ایسی حالت کو نفس امارۃ کہا گیا ہے (۱۲: ۵۳) پھر جب اس نفس کی کسی حد تک اصلاح ہو جاتی ہے تو اسے کوئی برا کام کر لینے کے بعد ایک طرح کی ندامت اور خفت کا احساس ہونے لگتا ہے تو نفس کی اس حالت کو ہی اس آیت میں نفس لوامہ یا ملامت کرنے والا نفس کہا گیا ہے اور اسے ہی ہم آج کی زبان میں ضمیر کہتے ہیں۔ پھر جب نفس کی پوری طرح اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کا فرمانبردار بن جاتا ہے تو اسے برے کاموں سے نفرت اور چڑ سی ہو جاتی ہے۔ اور بھلائی کے کاموں میں ہی اس کا دل لگتا ہے۔ انہی میں وہ اپنی خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ ایسے نفس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۸۹: ۲۷) اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے نفس لوامہ کی قسم کھائی۔ کیونکہ انسان کے نفس میں برے اور بھلے کی پوری تمیز موجود ہے۔ پھر اسی تمیز کا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے۔ برے کام کا نتیجہ برا اور بھلے کام کا نتیجہ بھلا ہونا چاہیے۔ اور یہی قیامت اور آخرت کا اصل مقصد ہے۔ بالفاظ دیگر تمہارا نفس لوامہ بھی اس بات پر دلیل ہے کہ قیامت ضرور واقع ہونی چاہیے۔

عِظَامَهٗ ۝۳ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝۴ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵
يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝۶ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ

کیوں نہیں۔ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ (پھر سے) اس کی انگلیوں کے پور پور تک[۳] درست بنا دیں (۴) بلکہ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے علی الرغم[۴] بداعمالیاں کرتا رہے۔ (۵) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب[۵] ہوگا (۶) تو (اس کا جواب یہ ہے کہ) جب آنکھیں چندھیا[۶] جائیں گی (۷) اور چاند گہنا[۷] جائے گا (۸) اور سورج اور چاند ملا دیئے[۸] جائیں گے (۹)

[۳] یعنی انسان کی سوچ یہ ہے کہ ہم اس کے مرنے کے بعد اس کی گلی سڑی ہڈیوں کو کیونکر اکٹھا کر سکیں گے اور کیسے اسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی بڑی بڑی ہڈیاں تو دور کی بات ہے۔ ہم تو اس کی انگلیوں کے ایک ایک پور کو مکمل کر کے اسے اٹھا کھڑا کریں گے۔ پس اسے تھوڑا سا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ اپنی پہلی پیدائش پر جو رحم مادر میں ہوئی، غور کر لے تو بات اسے پوری طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔

[۴] اصل مسئلہ یہ نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اس بات پر قادر نہیں سمجھتا کہ وہ اسے دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم کر کے اپنی آزادانہ زندگی پر پابندیاں عائد نہیں کرنا چاہتا۔ اسے خوب معلوم ہے کہ اگر اس نے عقیدہ آخرت کو تسلیم کر لیا تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا اور نہایت پابند اور محتاط زندگی گزارنا پڑے گی۔ اس کا آسان حل اس نے یہ سوچا کہ قیامت کا ہی انکار کر دے۔ اور اس کی یہ کیفیت بالکل ویسی ہی ہے جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اپنے نفس کو اس فریب میں مبتلا کر لیتا ہے کہ بس اب خطرہ دور ہو گیا۔

[۵] یعنی انسان کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ حقیقت کو سمجھنے کے باوجود یہ سوال کیے جاتا ہے کہ وہ دن آخر آئے گا کب؟

[۶] یعنی جب نظام کائنات درہم برہم ہوگا تو کئی طرح کے دھماکے ہوں گے، گرج بھی پیدا ہوگی اور بجلی بھی جس سے انسان کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دہشت انگیز نظاروں کو دیکھ کر انسان کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

[۷] چاند آج کل بھی عارضی طور پر گہنا تا اور بے نور ہوتا رہتا ہے لیکن یہ محض چند ساعت کا کھیل ہوتا ہے۔ جب گردش کرتے کرتے سورج اور چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے تو یہ طبعی طور پر گہنا جاتا ہے لیکن قیامت کو چاند مستقل طور پر بے نور ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس وقت یہ موجودہ نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔

[۸] اس کی صحیح صورت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے تاہم معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب زمین لرزنے اور کپکپانے لگے گی تو اس کی کشش ثقل بھی ختم یا بے قاعدہ قسم کی بن جائے گی اور چاند پر سورج کی کشش ثقل اثر انداز ہو کر چاند کو اپنی طرف کھینچ لے گی اور وہ دونوں باہم ٹکرا جائیں گے۔

وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ
الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ
بَصِيرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ﴿۱۶﴾ إِنَّ عَلَيْنَا

اس دن انسان کہے گا کہاں بھاگ کر جاؤں؟(۱۰) ہرگز نہیں! اسے کوئی پناہ کی جگہ [۹] نہ ملے گی(۱۱) اس دن آپ کے پروردگار ہی کی طرف جا کر ٹھہرنا ہوگا(۱۲) اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا [۱۰] اور پیچھے کیا چھوڑا ہے(۱۳) بلکہ انسان اپنے آپ کو خود خوب دیکھنے والا ہے(۱۴) خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں [۱۱] پیش کرے۔(۱۵)

(اے نبی!) اس وحی کو جلدی جلدی یاد کر لینے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے(۱۶) اس وحی کو (آپ کے دل

[۹] یعنی آج تو انسان یہ پوچھتا ہے کہ قیامت آئے گی کب؟ لیکن جب قیامت فی الواقع آ جائے گی تو اس وقت اس سے بچ جانے کی اور بھاگ کھڑا ہونے کی صورت سوچے گا اور دوسروں سے پوچھے گا مگر اس میں اسے سخت ناکامی ہوگی۔ نہ کوئی فرار کا راستہ ملے گا اور نہ پناہ کی جگہ اور انسان اس بات پر مجبور ہوگا کہ سیدھا اپنے پروردگار کے حضور پیش ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

[۱۰] مرنے کے بعد اعمالنامہ میں درج ہونے والے اعمال:۔ اس دن ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس سے اسے از خود یہ معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں کون کون سے اچھے یا برے اعمال کما کر اپنے ساتھ لایا ہے اور کون کون سے اچھے یا برے اعمال دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ جن کا اچھا یا برا بدلہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے اعمال نامہ میں درج ہوتا رہا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "جس شخص نے اسلام میں کوئی نیک بات جاری کی اس کے لیے اس کے اپنے عمل کا بھی ثواب ہے اور جو لوگ اس کے بعد اس بات پر عمل کریں ان کا بھی ثواب ہے بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا ثواب کچھ کم ہو اور جس نے اسلام میں کوئی بری طرح ڈالی اس پر اس کے اپنے عمل کا بھی بار ہے اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے بعد عمل کریں بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا بار کچھ کم ہو" (مسلم۔ کتاب الزکوۃ۔ باب الحث علی الصدقۃ.........) نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل موقوف ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب اسے ملتا رہتا ہے ایک صدقہ جاریہ کا جیسے کوئی شخص کوئی چیز رفاہ عامہ کے لیے بنا جائے یا وقف کر جائے۔ دوسرے علم کا جیسے کوئی دینی مدرسہ قائم کر جائے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ تیسرے ایسی نیک اولاد چھوڑ جائے تو اس کے حق میں دعا کرتی رہے" (مسلم۔ کتاب الوصیۃ۔ باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ)

[۱۱] یعنی یہ تحریری اعمال نامہ تو انسان کے سامنے صرف اس لیے رکھا جائے گا کہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے اچھے یا برے کیے ہوئے اعمال کا پورا پتا ہوتا ہے۔ اور وہ جو حیلے بہانے تراشتا ہے تو محض اس لیے کہ انسان اپنا قصور ماننے کو قطعاً تیار نہیں ہوتا۔ یہ بیسیوں باتیں بنا سکتا ہے۔ حیلے بہانے بنا سکتا ہے۔ مگر اپنا قصور ماننے سے اس کی انا مجروح ہوتی ہے اور وہ اسے موت کے مترادف سمجھتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کا یہی حال ہے اور آخرت میں بھی بعض عادی مجرم

جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹ كَلَّا بَلْ

میں) جمع کرنا اور زبان سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ [۱۲] ہے۔(۱۷) پھر جب ہم پڑھوا چکیں تو پھر اسی طرح پڑھا کریں(۱۸) پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے(۱۹) ہرگز نہیں بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ)

ایسی باتیں بنانے کی کوشش کریں گے۔

[۱۲] آیت نمبر ۱۶ سے لے کر ۱۹ تک چار آیات درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہیں ان کی تفسیر کے لیے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب سیدنا جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ پر وحی لے کر آتے تو آپ زبان اور لب ہلاتے رہتے (کہ کہیں بھول نہ جائے) اس سے آپ ﷺ پر بہت سختی ہو جاتی جو دوسروں کو بھی معلوم ہو جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں یعنی وحی کا آپ ﷺ کے دل میں جما دینا (یاد کرا دینا) ہمارے ذمہ ہے اور اس کا پڑھا دینا بھی۔ تو جب ہم پڑھ چکیں تو آپ ﷺ بھی اسی طرح پڑھیں جیسے ہم نے پڑھا تھا اور جب تک وحی اترتی رہے۔ خاموش سنتے رہیں۔ پھر وحی کے الفاظ کو آپ ﷺ کی زبان پر رواں کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے بعد جب جبرئیل آتے آپ ﷺ خاموش رہتے اور جب چلے جاتے تو آپ ﷺ اسی طرح پڑھ کر سنا دیتے جس طرح اللہ نے آپ ﷺ کو سنایا ہوتا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر، نیز باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ)

❁ **قرآن کا بیان کیا چیز ہے؟** ان آیات سے کئی اہم امور پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ نے صرف قرآن ہی نازل نہیں فرمایا بلکہ قرآن کا بیان بھی نازل فرمایا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس طرح اللہ نے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ اس کے بیان کی حفاظت کی بھی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کا بیان ہے کیا چیز؟ تو واضح رہے کہ محض قرآن کے الفاظ کو دہرا دینے کا نام بیان نہیں بلکہ بیان میں ان قرآنی الفاظ کا مفہوم بتانا، اس کی شرح و تفسیر، اس کی حکمت عملی اور طریق بتانا سب کچھ شامل ہے۔ قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نازل کرنے والے یعنی اللہ تعالیٰ اور جس پر نازل ہوا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ دونوں کے نزدیک قرآن کے الفاظ کا مفہوم متعین ہو اور وہ ایک ہی ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ زید (متکلم) بکر (مخاطب) سے کہتا ہے کہ: "پانی لاؤ" تو بکر زید کے حکم کی تعمیل اسی صورت میں کر سکے گا کہ متکلم اور مخاطب دونوں کے ذہن میں "پانی" اور "لاؤ" دونوں الفاظ کا مفہوم متعین ہو اور وہ ایک ہی ہو۔ ورنہ بکر زید کے حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر رہے گا۔ مثلاً اگر زید کوئی ذومعنی لفظ بولے گا تو جب تک اس کی مزید وضاحت نہ کرے گا یا اگر زید کا مخاطب کوئی ایسا شخص ہو گا جو اردو سمجھتا ہی نہیں تو بکر زید کے حکم کی بجا آوری کی خواہش رکھنے کے باوجود اس پر عمل نہ کر سکے گا اور سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کے الفاظ ہی نازل نہیں فرمائے بلکہ ان الفاظ کا مفہوم (بیان) بھی مخاطب (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے ذہن میں القاء کر دیا۔ یہ بیان بھی امت کو بتلانا رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری تھی۔ (۱۶:۴۴) اب اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے فرمودہ بیان یعنی سنت رسول ﷺ سے آزاد ہو کر محض لغت کی رو سے قرآن کے الفاظ کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کو مندرجہ ذیل چار وجوہ کی بنا پر

ناکامی ہو گی:

❁ **سنت سے بے نیاز ہو کر قرآن پر عمل کرنے کی کوشش کرنے والوں کی ناکامی کی چار وجوہ:۔** اولاً: بعض الفاظ کا مفہوم متعین کرنا اس لیے مشکل ہوتا ہے کہ لغت میں ایک لفظ کے بہت سے معنی درج ہوتے ہیں۔ مثلاً لفظ صلوٰۃ کے معنی نماز، برکت، رحمت اور نماز، نماز جنازہ تو ایسے ہیں جن کی آیات سے بھی تائید ہوتی ہے۔ مگر نماز کی ادائیگی کرنے کے لیے، وضو، تیمم، مساجد، قبلہ رخ ہونا، رکوع، سجود وغیرہ کا ذکر بھی آیا۔ لہٰذا مندرجہ بالا معنی میں سے کوئی بھی اس کا صحیح مفہوم ادا نہیں کرتا۔ پھر لغت میں مصلی کے معنی وہ گھوڑا بھی ہے جو گھڑ دوڑ میں اول نمبر آنے والے گھوڑے کے پیچھے پیچھے دوسرے نمبر پر آیا ہو۔ علاوہ ازیں صلوٰۃ کے معنی ''کولھے ہلانا'' بھی ہے۔ چنانچہ بعض منچلوں نے صلوٰۃ کی ادائیگی سے ''پریڈ'' کرنا مفہوم لیا اور بعض دوسروں نے رقص و سرود کی مجالس منعقد کرنا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ سب مفہوم شریعت کی رو سے غلط ہیں۔ اور اس کی وجوہ وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں۔

ثانیاً: ہر زبان میں بعض الفاظ بطور اصطلاح مروج ہوتے ہیں جنہیں اہل زبان خوب جانتے ہیں۔ مثلاً لفظ ''اخبار'' کا لغوی معنی محض ''خبریں'' ہے مگر اس کا اصطلاحی مفہوم وہ پرچہ (Newspaper) جس میں خبروں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ درج ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ اصطلاحیں فنی اور تکنیکی ہوتی ہیں۔ جنہیں صرف اہل علم و فن ہی جانتے ہیں۔ لغت چونکہ ''زبان'' کے الفاظ کے معنی بیان کرتی ہے لہٰذا ایسی اصطلاحات کا مفہوم بیان کرنا اس کے دائرہ سے خارج ہوتا ہے اور ایسی اصطلاحات کے لئے الگ کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً خبر واحد، طول بلد، سرایت حرارت، کشش ثقل وغیرہ وغیرہ ایسی اصطلاحات ہیں جن کے مفہوم کو عام اہل زبان نہیں جانتے۔ قرآن چونکہ علوم شرعیہ کا منبع ہے لہٰذا اس میں بے شمار ایسی اصطلاحات مثلاً دین، الٰہ، عبادت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، معروف، منکر، حج، عمرہ، آخرت وغیرہ استعمال ہوئی ہیں۔ ایسی اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنا بھی اللہ اور اس کے رسول کا کام ہے۔ شرعی اصطلاحات کا جو مفہوم اللہ اور اس کے رسول نے بیان کیا ہو وہی قرآن کا بیان کہلاتا ہے اور یہی بیان امت کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

❁ **قرآن کے بیان کی حفاظت کے بغیر صرف قرآن کے الفاظ کی حفاظت بے معنی ہے:۔** ثالثاً محاورات مقامی طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جو یا تو اہل زبان سے سیکھنا پڑتے ہیں یا کسی محاورات کی کتاب سے دیکھنا ہوں گے۔ لکھنؤ میں ایک ڈاکٹر صاحب کو اس کا دوست ملنے گیا جو اس علاقہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ ڈاکٹر کے کلینک میں ایک مریض آیا اور کہنے لگا میں نے آج رات تین بار زمین دیکھی ہے۔ ڈاکٹر نے مریض کی شکایت سن کر دوا دے دی اور وہ چلا گیا بعد میں وہ دوست ڈاکٹر سے کہنے لگا، میں نہیں سمجھ سکا کہ مریض نے کیا تکلیف بیان کی تھی جس کی آپ نے دوا دی۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ زمین دیکھنا سے یہاں ''قے کرنا'' مراد لیا جاتا ہے اور میں نے اس مرض کی دوا دی تھی۔

❁ **سنت کا منکر قرآن کا بھی منکر ہے:۔** رابعاً: بعض دفعہ ایک لفظ کسی خاص معنی میں مشہور ہو جاتا ہے جبکہ لغوی لحاظ سے اس میں اختلاف کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اندریں صورت صرف عرف کا لحاظ رکھا جائے گا۔ مثلاً ابن عباسؓ سے مراد عبداللہ بن عباس ہی ہوں گے حالانکہ لغوی لحاظ سے ان کے دوسرے بیٹے فضیل کو بھی ابن عباس کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسجد اقصیٰ سے مراد صرف بیت المقدس ہی لیا جائے گا نہ کہ دور کی کوئی مسجد جیسا کہ منکرین معجزات واقعہ اسراء کی تاویل میں مسجد اقصیٰ سے مراد

تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳

تم لوگ جلد حاصل ہونے والی چیز (دنیا) کو چاہتے ہو(۲۰) اور آخرت کو چھوڑ دیتے[۱۳] ہو(۲۱) اس دن کئی چہرے تر و تازہ ہوں گے(۲۲) اپنے پروردگار کو دیکھتے ہوں[۱۴] گے(۲۳)

بیت المقدس نہیں لیتے بلکہ کوئی بھی دور کی مسجد مراد لے لیناان کے نزدیک درست ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے تین نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اللہ نے صرف قرآن کے الفاظ کی ہی حفاظت کا ذمہ نہیں لے رکھا بلکہ قرآن کے بیان کی حفاظت کی بھی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ کیونکہ اگر قرآن کے بیان کی حفاظت نہ کی جائے تو الفاظ کی حفاظت کوئی معنی نہیں رکھتی اور قرآن بچوں کا کھیل بن جاتا ہے۔

۲۔ واجب الاتباع ہونے کے لحاظ سے قرآن اور قرآن کے بیان یعنی سنت رسول ﷺ میں کوئی فرق نہیں اور

۳۔ قرآن کا بیان یا تشریح و تفسیر وہی قابل اعتماد ہو سکتی ہے جو خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہو۔

[۱۳] اس جملہ معترضہ کے بعد اب پھر اصل مضمون کا تسلسل شروع ہو رہا ہے۔ کافروں کے انکار آخرت کی ایک وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ وہ آخرت کا اقرار کر کے اپنے آپ پر پابندی لگا لینا گوارا نہیں کرتے۔ ان دو آیات میں آخرت کے انکار کی دوسری وجہ بیان کی گئی ہے کہ تم لوگ صرف نقد بہ نقد سودا کے گاہک ہو، تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ ایسا کام کرو جس کا عوض اسی دنیا میں مل جائے اور جن کاموں کا اجر آخرت میں ملنے کی توقع ہو ان کاموں کو تم نظرانداز کر دیتے ہو۔ عوضانہ ادھار بھی ہو اور تمہارے خیال کے مطابق غیر یقینی بھی ہو تو پھر تم آخرت کو دنیا پر کیونکر ترجیح دے سکتے ہو؟

[۱۴] ۞ دیدار الٰہی میں لذت و سرور:۔ بے شمار احادیث سے بھی ثابت ہے کہ ایمانداروں کو آخرت میں اللہ اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔ وہ اس کو اسی طرح بے تکلف دیکھ سکیں گے جس طرح چاند کی طرف دیکھتے ہیں۔ البتہ کافر اور فاجر لوگ اللہ کے دیدار سے محروم رکھے جائیں گے۔ (۸۳:۱۵)

۞ دیدار الٰہی سب سے بڑی نعمت ہے:۔ کتاب و سنت میں یہ بھی صراحت سے مذکور ہے کہ اللہ کا دیدار جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر اور بڑی نعمت ہوگا اور اس دیدار میں کچھ ایسا کیف و سرور حاصل ہوگا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اہل جنت کو اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا جنتی اور کسی نعمت کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔ بلکہ ٹکٹکی باندھے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف دیکھتے رہیں گے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کلام کیا تو اس کلام میں بھی اتنی لذت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام چاہتے تھے کہ یہ گفتگو کے لحات جس قدر ممکن ہو طویل سے طویل تر ہو سکیں۔ اور دیدار میں تو بہرحال سماعت سے بہت زیادہ لذت ہونا یقینی ہے۔

۞ عقل پرستوں کی تاویلات:۔ بعض عقل پرستوں نے دیدار الٰہی سے متعلقہ آیات کی بھی تاویل کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ صرف اس لیے کہ اس طرح اللہ کے لئے ایک مخصوص جہت متعین کرنا پڑتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات جہات اور مکان کی حدود سے ماوریٰ ہے۔ ہم ان دوستوں سے یہی عرض کریں گے کہ آپ کو کس نے اس بات کا پابند بنایا ہے کہ تمام آیات اور صفات الٰہی

وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ أَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾ كَلَّآ إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾
وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ

اور کئی چہرے اس دن پریشان ہوں گے (۲۴) اور سمجھتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ[15] ہوگا۔ (۲۵) ہرگز نہیں۔ جب (جان) ہنسلی تک پہنچ[16] جاتی ہے (۲۶) اور کہا جاتا ہے کہ کوئی دم جھاڑ کرنے والا[17] ہے؟ (۲۷)

اور مرنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی جدائی کا وقت ہے (۲۸) اور ایک پنڈلی دوسری[18] سے جڑ جاتی ہے (۲۹)

کو اپنی عقل کے مطابق کر کے چھوڑیں۔ جو بات آپ کے بس کا روگ نہیں۔ اس میں آپ کیوں مداخلت بے جا کرتے ہیں۔ راہ صواب یہی ہے کہ جو بات اللہ اور اس کے رسول نے کہی ہے اسے جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے۔ صفاتِ الٰہی میں عقل انسانی کی مداخلت سے گمراہی کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ رہی یہ بات کہ مومنوں کے چہرے کس وجہ سے تر و تازہ ہوں گے تو اس کی ایک معقول وجہ تو یہی دیدار الٰہی کی نعمت ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن کے تمام تر حالات ان کی توقعات کے مطابق واقع ہوں گے۔ اس پر وہ اتنے خوش ہوں گے کہ ان کے چہرے ہشاش بشاش نظر آئیں گے۔

[۱۵] اور یہی آخرت کے واقعات جن لوگوں کی توقعات کے برعکس نکلیں گے تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں گی اور انہیں یہ خوب معلوم ہو جائے گا کہ ان کی شامت آئی کہ آئی۔ اس تصور سے ہی وہ یوں شکستہ خاطر ہو جائیں گے جیسے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی گئی ہے۔

[۱۶] یعنی خوب سمجھ لو کہ قیامت کا دن کچھ دور نہیں بلکہ اس کا منہ تم اس دنیا میں ہی دیکھ لو گے۔ جب تم مرنے کے قریب ہوتے ہو اور تمہاری جان ہنسلی تک پہنچ جاتی ہے تو سمجھ لو کہ تمہارا سفر آخرت شروع ہو گیا۔

[۱۷] اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ ﴿مَنْ رَاقٍ﴾ کو فرشتوں کا کلام سمجھا جائے اور راق کو رقی بمعنی اوپر چڑھنے سے مشتق قرار دیا جائے اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فرشتے ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ اس شخص کی روح کو جنت کے فرشتے لے کر اوپر چڑھیں گے یا دوزخ کے؟ اور دوسرا مطلب یہ ہے راق کو رقیۃ بمعنی دم جھاڑ سے مشتق قرار دیا جائے۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ جب میت کے لواحقین اس کے علاج سے عاجز آ جاتے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کوئی دم جھاڑ کرنے والا ہے؟ اور یہ میت کے علاج یا اسے موت کے منہ سے بچانے کے لئے آخری حربہ کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ واضح رہے علاج کروانا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ اور دم جھاڑ کی اجازت ہے بشرطیکہ اس میں شرکیہ کلمات نہ ہوں۔ تاہم اللہ پر توکل کرنے والوں اور ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہنے والوں کا درجہ علاج کرانے والوں سے بہت بلند ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں جائیں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ اندر چلے گئے اور یہ نہیں بتایا کہ وہ ستر ہزار کون لوگ ہوں گے؟

❁ بلاحساب جنت میں جانے والے متوکلین:۔ اب صحابہ قیاس دوڑانے لگے اور کہنے لگے یہ ستر ہزار ہم لوگ ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کے پیغمبر کی پیروی کی یا ہماری اولاد ہوگی جو اسلام کے دین پر ہی پیدا ہوئی۔ کیونکہ ہم لوگ تو جاہلیت اور

کفر کے دور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ باہر نکلے اور فرمایا: یہ ستر ہزار وہ لوگ ہیں جو نہ منتر کرتے ہیں نہ بُرا شگون لیتے ہیں، نہ داغ لگواتے ہیں بلکہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں" یہ سن کر ایک صحابی عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

"یارسول اللہ ﷺ کیا میں ان لوگوں سے ہوں گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" پھر ایک اور صحابی (سعد بن عبادہ) کھڑے ہو کر کہنے لگے: "کیا میں بھی ان سے ہوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلے عکاشہ ان لوگوں میں ہو چکا" (بخاری۔ کتاب الطب والرضیٰ۔ باب من لم یرق)

دوا سے علاج کرانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ علاج حرام اشیاء سے نہ کیا جائے لیکن دم جھاڑ کرنا کوئی مستحسن فعل نہیں۔ البتہ بعض شرائط کے تحت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا ماموں بچھو کا منتر کیا کرتا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے منتروں سے منع کر دیا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یارسول اللہ ﷺ! آپؐ نے منتروں کو منع کر دیا اور میں بچھو کا منتر کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے جو کوئی اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکے اسے پہنچانا چاہیے" (مسلم۔ کتاب السلام۔ باب استحباب رقیۃ المریض)

۲۔ سیدنا عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جاہلیت کے زمانہ میں منتر کیا کرتے تھے۔ ہم نے کہا: یارسول اللہ ﷺ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے منتروں کو میرے سامنے پیش کرو۔ اگر اس میں شرک کا مضمون نہ ہو تو کچھ قباحت نہیں" (مسلم۔ ایضاً)

۳۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب کوئی گھر میں بیمار ہوتا تو آپ ﷺ اس پر معوذات (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھ کر پھونکتے۔ پھر جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو میں آپ ﷺ پر پھونکتی اور آپ ﷺ ہی کا ہاتھ آپ ﷺ پر پھیرتی۔ کیونکہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں میرے ہاتھ سے زیادہ برکت تھی۔ (مسلم۔ ایضاً)

۴۔ عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے شکوہ کیا کہ جب سے میں اسلام لایا ہوں میرے بدن میں کچھ درد سا رہتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھو اور تین بار بسم اللہ کہو پھر سات بار یہ کہو: اعوذ باللہ وقدرتہ من شرما اجد واحاذر (یعنی میں اللہ سے اس برائی سے پناہ مانگتا ہوں جسے میں پاتا ہوں اور جس سے ڈرتا ہوں) (مسلم۔ ایضاً)

۵۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی بیمار ہوتا تو آپ ﷺ اس پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرتے پھر فرماتے "اَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا" (اے لوگوں کے پروردگار! یہ بیماری دور کر دے۔ تو ہی شفا دینے والا ہے۔ شفا تیری ہی شفا ہے۔ ایسی شفا دے کہ بیماری بالکل نہ رہے) (مسلم۔ ایضاً)

۶۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب کسی مریض پر دم جھاڑ کرتے تو فرماتے "بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا يُشْفٰى سَقِيْمُنَا بِاِذْنِ رَبِّنَا" (یعنی اللہ کے نام سے ہماری زمین (مدینہ) کی مٹی ہم میں سے کسی کے تھوک سے ہمارے مالک کے حکم سے مریض کو تندرست کر دے گی) (بخاری۔ کتاب الطب۔ باب رقیۃ النبی ﷺ)

۷۔ ﷺ سورۃ فاتحہ سے بچھو کے کاٹے کا دم:۔ سیدنا ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے کئی اصحاب عرب کے ایک قبیلہ پر پہنچے۔ لیکن انہوں نے صحابہ کی ضیافت نہ کی۔ اسی دوران ان کے سردار کو بچھو نے کاٹا۔ وہ صحابہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: تمہارے پاس بچھو کے کاٹے کی کوئی دوا یا منتر ہے؟ انہوں نے کہا: ہے تو سہی لیکن چونکہ تم نے ہماری ضیافت نہیں کی لہٰذا ہم معاوضہ کے بغیر منتر نہیں کریں گے۔ آخر انہوں نے کچھ بکریاں (۳۰ بکریاں) دینا قبول کیں۔ تب ایک صحابی (خود ابو سعید خدری ؓ) نے سورہ فاتحہ پڑھنا شروع کی۔ وہ سورہ فاتحہ پڑھتے اور تھوک منہ میں اکٹھا کر کے زخم پر تھوک دیتے۔ وہ سردار اچھا ہو گیا۔ قبیلہ کے لوگ بکریاں لے کر آئے تو صحابہ کو تردد ہوا کہ جب تک آپ ﷺ سے پوچھ نہ لیا جائے ان بکریوں کو قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ چنانچہ جب صحابہ ؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ہنس دیے اور فرمایا: ارے تجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ منتر بھی ہے۔ بکریاں لے لو اور میرا حصہ بھی لگاؤ" (بخاری۔ کتاب الطب۔ باب الرقی بفاتحة الکتاب)

۸۔ تعویذ گنڈوں کی ممانعت:۔ ابو بشیر انصاری ؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں اپنے آرام کے ٹھکانے میں تھے۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص (زید بن حارثہ) کے ہاتھ یہ پیغام کہلا بھیجا کہ کسی اونٹ کی گردن میں تانت یا گنڈا ہو وہ کاٹ ڈالا جائے (بخاری۔ کتاب الجهاد۔ باب ماقیل فی الجرس و نحوه فی اعناق الابل)

۹۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک وفد بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے ان میں سے نو کی بیعت لی مگر ایک سے نہ لی۔ وجہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ اس نے تعویذ پہنا ہوا ہے پھر ہاتھ ڈال کر اس کا تعویذ کاٹ ڈالا اور بیعت لے لی اور فرمایا: "مَنْ عَلَّقَ تَمِيْمَةً فَقَدْ اَشْرَكَ" (مسند احمد ج ۴ ص ۷۵) مطبوعہ احیاء السنہ ان احادیث سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ دم جھاڑ کا مسنون طریقہ صرف یہ ہے کہ مریض پر قرآن کی آیات یا مسنون دعائیں پڑھ کر دم کر دیا جائے۔ البتہ اگر دم جھاڑ کے الفاظ کے معنی کی پوری طرح سمجھ آ جائے اور اس میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو ایسا دم کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

۲۔ اس کے علاوہ جتنی بھی صورتیں مروج ہیں مثلاً تعویذ لکھ کر پانی میں گھول کر پلانا، گلے میں لٹکانا یا ران یا کلائی پر باندھنا، کپڑے پہننا، موتی وغیرہ لٹکانا سب کے سب ناجائز اور خلاف سنت اور بدعت ہیں۔

۳۔ دم جھاڑ کو پیشہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کی پیشگی اجرت طے کرنا ممنوع ہے۔ البتہ بعد میں اگر کوئی اپنی خوشی سے ہدیہ دے دے تو اس کے لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

۴۔ سیدنا ابو سعید خدری ؓ نے جو ۳۰ بکریاں پیشگی طے کر کے لیں تو یہ ایک استثنائی واقعہ ہے اور اس کی وجہ حدیث میں مذکور ہے۔ ایک تو وہ کافر تھے۔ دوسرے انہوں نے اہل عرب کے معروف دستور کے خلاف مسلمانوں کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ بکریاں ان سے سزا کے طور پر لی گئی تھیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس بات کی اجازت تھی کہ اگر لوگ مہمان نوازی کا حق ادا نہ کریں تو ان سے جبراً بھی وصول کیا جا سکتا ہے۔ (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب اکرام الضیف وخدمته ایاه بنفسه)

[۱۸] یعنی سب سے پہلے پاؤں کی طرف سے جان نکلنا شروع ہوتی ہے۔ جب پنڈلیوں سے جان نکل چکتی ہے تو انسان میں یہ سکت نہیں رہتی کہ وہ ایک پنڈلی کو دوسری سے اٹھا کر الگ کر سکے۔ جب یہ کیفیت طاری ہو جائے تو سمجھ لو کہ سفر آخرت شروع ہو گیا

يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ
ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحْسَبُ
الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ
عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ

اس دن تیرے پروردگار کی طرف تیری روانگی ہوتی ہے۔(۳۰)

اس نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی(۳۱) بلکہ (وحی کو الٹا) جھٹلا دیا اور منہ موڑ لیا(۳۲) پھر اکڑتا ہوا اپنے اہل خانہ کی طرف چل دیا(۳۳) افسوس پر افسوس ہے تجھ پر(۳۴) پھر افسوس پر افسوس[19] ہے تجھ پر(۳۵) کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا[20] ہے کہ اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے گا(۳۶) کیا وہ منی کی ایک بوند نہ تھا جو ٹپکائی گئی تھی؟(۳۷) پھر وہ لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ نے اسے ٹھیک انسان بنا دیا(۳۸) پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں[21] بنا دیں(۳۹) کیا وہ

اور میت کا اپنے پروردگار سے ملاقات کا وقت آ گیا۔ بس یہی وقت ہے جس کے لئے کافر بار بار پوچھتے اور اس کی جلدی کا تقاضا کرتے ہیں۔ جس شخص کو موت آ گئی تو گویا پوری قیامت کے احوال اس پر منکشف ہونے لگ جاتے ہیں۔

[19] ابو جہل کا شیخی بگھارنا اور متکبرانہ چال:۔ آیت نمبر ۳۱ سے ۳۵ تک کافروں کے ایک اور سردار کا کردار بغیر نام لیے پیش کیا گیا ہے یہ کردار ابو جہل تھا۔ جب آپ ﷺ نے اسے یہ آیات پڑھ کر سنائیں تو بدبخت کہنے لگا: محمد (ﷺ!) مجھ کو کیا ڈراتے ہو، میرا نہ تم کچھ بگاڑ سکتے ہو اور نہ تمہارا پروردگار کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ بخدا اس وادی میں میری عزت سب سے زیادہ ہے اور میری محفل سب سے بڑی ہے۔ واضح رہے کہ ولید بن مغیرہ کے بعد یہی ابو جہل قریشیوں کا بڑا سردار اور سپہ سالار مقرر ہوا تھا۔ قرآن کی آیات سن کر انہیں جھٹلا دیا پھر متکبرانہ انداز سے منہ موڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ضمناً آیت ۳۱ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی آیات کو سچا سمجھنے کی سب سے پہلی اور اہم علامت نماز کی ادائیگی ہے۔

[20] یعنی اللہ نے انسان کو بے شمار ایسی قوتیں عطا فرمائی ہیں جو دوسرے جانداروں کو عطا نہیں کی گئیں۔ لہذا جو انسان یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح دوسرے جاندار پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں اور ان پر کسی طرح کی کچھ ذمہ داری نہیں اسی طرح انسان کا بھی حال ہے۔ اس کی یہ سوچ نہایت احمقانہ اور غیر دانشمندانہ ہے۔ اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز کرنے کی آخر اللہ میاں کو کیا ضرورت تھی؟ بلکہ اس سے اگلا سوال یہ ہے کہ اگر انسان کی زندگی بھی ویسی ہی غیر ذمہ دارانہ سمجھی جائے جیسے دوسرے جانداروں کی ہے تو انسان کو پیدا کرنے کی ہی کیا ضرورت تھی؟

[21] لڑکے اور لڑکیوں کی پیدائش میں تناسب اور دہریت کا رد:۔ بعض دہریے اور نیچری حضرات رحم مادر میں انسان کی تخلیق کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کارنامہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اسے ایک طبعی امر اور اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اتفاقات کا نتیجہ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی کے کسی دور میں صرف لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوتے جائیں اور لڑکیاں پیدا

رکوع ۲ ۱۸

بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؏ (۴۰)

اس بات پر قادر[۲۴] نہیں کہ پھر سے مُردوں کو زندہ کر دے؟(۴۰)

نہ ہوں اور اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دور میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی جائیں اور لڑکے پیدا نہ ہوں۔ اور اس طرح نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے؟ کیا یہ بھی اتفاقات کا ہی نتیجہ قرار دیا جائے گا کہ ہر دور میں لڑکے اور لڑکیاں اللہ تعالیٰ اس نسبت سے پیدا فرما رہا ہے کہ نسل انسانی میں انقطاع واقع نہیں ہوتا؟

[۲۴] یعنی رحم مادر میں نطفہ سے انسان کی تخلیق تک کے اطوار پھر ان کی زوجین میں مناسب تقسیم سے انسان بخوبی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ جو پروردگار اتنی قدرتوں کا مالک ہے وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ان دلائل کے بعد بھی جو انسان دوبارہ زندگی کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ انکار ہٹ دھرمی اور حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ نیز حدیث میں ہے کہ جب آپ یہ آیت تلاوت فرماتے تو بعد میں سبحانك اللهم بلى فرماتے۔

۳۱ آیاتھا سورۃ الدھر مکیۃ رکوعھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ① اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ
اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ② اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③

کلمات ۲۴۶ آیت ۳۱ (۷۶) سورۃ الدھر مدنی ہے (۹۸) رکوع ۲ حروف ۱۰۹۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کیا انسان پر لامتناہی زمانہ [۱] سے ایک وقت ایسا بھی آیا ہے جب کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟(۱) ہم نے انسان کو (مرد اور عورت کے) مخلوط نطفہ سے پیدا کیا جسے ہم [۲] الٹ پلٹ کرتے رہے پھر اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا [۳]۔(۲) ہم نے یقیناً اسے راہ دکھا دی [۴] اب خواہ وہ شکر گزار رہے یا ناشکرا بن جائے [۵](۳)

[۱] ❁ دہر کا لغوی مفہوم 'دہر اللہ کی ذات ہے':۔ دھر بمعنی زمانہ کائنات، مدت عالم، جب سے کائنات شروع ہوئی اس وقت سے لے کر اس کے اختتام تک کا وقت (مفردات) اور ابن الفارس کہتے ہیں کہ دھر میں غلبہ اور قہر کا مفہوم پایا جاتا ہے اور دہر کا یہ عالم اس لیے ہے کہ وہ ہر چیز پر اضطرارا گزرتا اور اس پر غالب آتا ہے۔ (مقائیس اللغۃ) اور دہر کا تعلق مشیت الٰہی سے ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "لا تسبوا الدھر فان الله ھو الدھر" یعنی دہر کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی دہر ہے۔ (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب لا تسبوا الدھر) اور دہری وہ شخص ہے جو کائنات کی تخلیق کا قائل نہیں بلکہ اسے ابدالاباد سے شمار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی صانع نہیں بس یہ آپ سے آپ اتفاقات کے نتیجہ میں وجود میں آگئی تھی۔ اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ انسان پر ایسا وقت بھی گزر چکا ہے جبکہ بنی نوع انسان کی ابھی تخلیق ہی نہ ہوئی تھی۔ اور اس کا نام و نشان تک صفحہ ہستی پر موجود نہ تھا۔ پھر کتنے ہی دور اور طور طے کرنے کے بعد یہ نطفہ کی شکل میں آیا۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب انسان نطفہ کی حالت میں تھا تو اس کی موجودہ شرافت و کرامت کے مقابلہ میں اس کی وہ حالت اس قابل ہی نہیں تھی کہ اسے زبان پر لایا جائے۔

[۲] یعنی باپ کا نطفہ الگ تھا، ماں کا الگ، ان دونوں نطفوں کے ملاپ سے ماں کے رحم میں حمل قرار پایا۔ پھر ہم نے اس مخلوط نطفہ کو ایک ہی حالت میں پڑا نہیں رہنے دیا۔ ورنہ وہ وہیں گل سڑ جاتا۔ بلکہ ہم اس کو الٹتے پلٹتے رہے اور رحم مادر میں اس نطفہ کو کئی اطوار سے گزار کر اسے ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیا۔

[۳] ❁ انسان کی دوسرے جانداروں پر کیا فضیلت ہے؟:۔ انسان کے علاوہ جتنی بھی جاندار مخلوق ہے۔ تقریباً سب ہی سنتے بھی ہیں اور دیکھتے بھی ہیں۔ لیکن سمیع اور بصیر نہیں ہیں۔ سمیع اور بصیر صرف انسان ہے۔ اور یہی چیزیں انسان کے لئے علم کے حصول کے سب سے بڑے ذرائع ہیں۔ انسان اشیاء کو دیکھ کر اور بعض آوازیں سن کر ان پر غور کرتا، ان میں قیاس اور استنباط کرتا پھر ان سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ جبکہ دوسرے جاندار دیکھنے اور سننے کے باوجود ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتے۔

[۴] ❁ انسان کی ہدایت کے لیے کون کون سے ذرائع اللہ نے بنائے ہیں؟:۔ راہ دکھانے کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرت سلیمہ پر پیدا کیا ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کا حق پہچانے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عہد الست سے تعبیر فرمایا ہے۔

۲۔ ہر انسان میں بُرے اور بھلے کی تمیز رکھ دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ جب انسان کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگتا ہے۔

۳۔ انسان جب مصائب میں گھر جاتا ہے تو غیر شعوری اور اضطراری طور پر اس کی نگاہیں اپنے خالق کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ فریاد کے لیے اسے پکارنے لگتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مشکلات میں اپنے خالق یا کسی ان دیکھی بالاتر قوت پر تکیہ کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

۴۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ہر سو بکھری ہوئی آیات پر غور کرنے سے بھی انسان کو ایک ایسی عظیم، مقتدر اور بالاتر ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جو اس کائنات کا نہایت مربوط نظم و نسق چلا رہی ہے اور انسان کو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ خود اس ہستی کے دائرہ اقتدار سے کسی صورت باہر نہیں نکل سکتا۔ لہٰذا اس کی اطاعت کے بغیر اس کے لیے کوئی دوسرا چارہ کار نہیں۔

۵۔ وہ کائنات میں یہ منظر بھی دیکھتا ہے کہ بعض ظالم زندگی بھر ظلم و جور کے طوفان اٹھانے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور انہیں کوئی سزا نہیں ملتی۔ اسی طرح بعض انسان ساری زندگی انسانیت کی خدمت میں گزار کر اور مصیبتیں سہہ سہہ کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور انہیں کوئی صلہ نہیں ملتا۔ حالانکہ یہ نظام کائنات انتہائی عدل اور توازن و تناسب پر قائم ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان کو یقیناً ایک دوسری زندگی بھی مہیا کی جانی چاہیے جس میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکیں اور

٦۔ ان سب ذرائع سے بڑھ کر اللہ نے انسان کی ہدایت کا یہ اہتمام فرمایا کہ انبیاء اور کتابیں ہر دور میں بھیج کر انسانوں پر اتمام حجت کر دی۔ ان سب باتوں کے بعد انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ اب وہ اپنے اختیار کا صحیح استعمال کر کے اس کا فرمانبردار اور شکر گزار بندہ بننا چاہتا ہے یا دنیا کی دلکشی میں مست ہو کر اللہ کو بھول جاتا یا اس کی سرکشی کی راہ اختیار کر کے نمک حرام بن جاتا ہے۔

[۵] ❁ یہ دنیا نہ دار الجزاء ہے نہ دار العیش بلکہ دار العمل ہے:۔ اس دنیا میں انسان کی تخلیق کا ٹھیک مقصد یہ ہے کہ یہ دنیا اس کے لیے دار الامتحان ہے۔ جہاں اس کی یہ آزمائش مقصود ہے کہ وہ اچھے یا برے کیسے اعمال بجا لاتا ہے؟ یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے کہ ہر ظالم کو یہاں فوراً سزا مل جائے یا نیک آدمی کو اس کی نیکی کا فوری طور پر بدلہ مل جائے۔ یہ دار العذاب بھی نہیں ہے۔

❁ رُہبان' اہل تناسخ اور اشتراکی نظریات کی تردید:۔ جیسا کہ اہل طریقت، رہبان اور درویش قسم کے لوگوں کا خیال ہے کہ جسم کو عذاب دے دے کر روح کی ترقی کی منزلیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ نیز یہ دنیا اہل تناسخ کے نظریہ کے مطابق دار الجزاء بھی نہیں ہے کہ انسان اگر اپنی پہلی جون (زندگی) میں گناہ کرتا رہا ہے تو اب اس کی روح کسی ناپاک جسم مثلاً کتے یا سور میں ڈال دی جائے گی یا اگر وہ پچھلی جون میں نیک اعمال بجا لاتا رہا ہے تو اس کی روح کسی مہاتما کے جسم میں ڈال دی جائے گی۔ نیز یہ دنیا دہریوں، آخرت کے منکروں اور دنیاداروں کے نظریہ کے مطابق دار العیش یا تفریح گاہ بھی نہیں ہے کہ انسان یہاں جیسے جی چاہے زندگی گزار کر چلتا بنے اور اس کے اعمال پر اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ نیز یہ دنیا جدلیاتی کشمکش کا میدان بھی نہیں ہے جیسا کہ ڈاروِن اور کارل مارکس کے پیروکار سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ دنیا انسان کے لیے دار الامتحان ہے۔ جہاں وہ جیسا

اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا ﴿۴﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴿۵﴾ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ﴿۶﴾ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ یَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ﴿۷﴾ وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا ﴿۸﴾

بلاشبہ ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں[۶]، طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔(۴)

نیک لوگ شراب کے ایسے جام پئیں گے جس میں کافور[۷] کی آمیزش ہوگی(۵) وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے(۶) یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی نذریں پوری کرتے[۸] ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر سو پھیلی[۹] ہوئی ہوگی(۷) اور خود کھانے کی محبت کے باوجود[۱۰] وہ مسکین، یتیم اور قیدی[۱۱] کو کھانا کھلا دیتے ہیں(۸)

بوئے گا آخرت میں ویسا ہی کاٹے گا۔

[۶] امتحان کا وقت ہر انسان کی موت تک ہے یا جو لوگ اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے ان کی اخروی زندگی انتہائی تلخ ہوگی اور یہ دنیا کی زندگی جس قدر آزادانہ اور عیش و آرام میں گزار کر مریں گے اسی نسبت سے انہیں عذاب بھی دیے جائیں گے۔ پابند زنجیر و سلاسل کر کے اور گلے میں طوق ڈال کر انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

[۷] ان کے مقابلہ میں اس دارالامتحان میں کامیاب ہونے والوں یا اللہ کے فرمانبرداروں اور نیک اعمال بجالانے والوں کو سب سے پہلی نعمت تو یہ ملے گی کہ ان کے پینے کو ٹھنڈا، میٹھا، سفید رنگ کا خوشبودار اور مفرح قلب مشروب ملے گا۔ اور یہ مشروب اس افراط سے مہیا کیا جائے گا کہ جہاں کوئی موجود ہوگا اس مشروب کی نالیاں وہیں تک پہنچا دی جائیں گی وہ خود بھی جب ایسی خواہش کریں گے تو اس مشروب کی نالیاں وہاں پہنچ جائیں گی اس مشروب کی رنگت، ٹھنڈک اور خوشبو ایسی ہوگی جیسے اس میں کافور ملا دیا گیا ہے۔

[۸] ❁ اہل جنت کی چند صفات:۔ اب ان کامیاب ہونے والے نیک لوگوں کی چند صفات بیان کی جارہی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں۔ نذر ایسے عہد کو کہا جاتا ہے جو انسان خود اپنے اوپر واجب قرار دے لیتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے واجب کردہ عہد کو پورا کرنے کا اس قدر خیال رکھتا ہے وہ اللہ کے عہد کو پورا کرنے کا بدرجہ اولیٰ خیال رکھے گا۔

[۹] مُسْتَطِیْرٌ (مادہ ط ی ر) بمعنی چار سو پھیلی ہوئی آفت۔ پوری کی پوری فضا کو متاثر کرنے والی تکلیف اور مصیبت۔ جب سورج بالکل زمین کے قریب لے آیا جائے گا اور حرارت اور گھبراہٹ کے مارے لوگوں کا برا حال ہوگا۔ اس دن کے شر سے وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو پہلے ہی اس دن کے شر سے ڈر کر اللہ کے فرمانبردار بن کر رہے ہوں گے۔

[۱۰] علی حبہ میں "ہ" کی ضمیر کا مرجع طعام بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت بھی یعنی وہ ایسے کام اللہ کی محبت کے جوش میں کرتے ہیں۔

[۱۱] ❁ جنگی قیدیوں سے بہتر سلوک اگرچہ وہ کافر ہوتے ہیں:۔ اسیر کا لفظ جنگی قیدی کے لیے مخصوص ہے۔ اور ظاہر ہے کہ

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ﴿٩﴾ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿١٠﴾ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿١١﴾ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَ

(اور انہیں کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کی خاطر کھلاتے ہیں ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے[۱۲] ہیں اور نہ شکریہ(۹) ہمیں اپنے پروردگار سے اس دن کا ڈر لگتا ہے جو چہروں کو کریہہ المنظر اور (دلوں کو) مضطر کرنے والا[۱۳] ہو گا(۱۰) چنانچہ اللہ ایسے لوگوں کو اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں[۱۴] تازگی اور سرور بخشے گا(۱۱) اور ان کے صبر کے بدلے انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا[۱۵] کرے گا۔(۱۲)

ایسے لوگ کافر ہی ہو سکتے ہیں۔ مسلمان نہیں ہو سکتے۔ان کے کافر ہونے کے باوجود انہیں کھانا کھلانا اور ان سے حسن سلوک بڑی نیکی کا کام ہے۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ جس شخص کے پاس کوئی قیدی رہے وہ اس سے اچھا سلوک کرے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ اس حکم کی تعمیل میں قیدیوں کو اپنے سے بہتر کھانا کھلاتے تھے اور مسلمان بھائیوں کا حق تو ان سے بھی زیادہ ہے۔

[۱۲] **محسن اور ممنون کے لئے الگ الگ احکام:۔** اسلام کی انتہائی اعلیٰ وارفع تعلیمات میں سے ایک یہ حکم ہے یعنی احسان کرنے والوں کو اسلام نے یہ تعلیم دی کہ وہ اس سے جس پر احسان کیا گیا ہے کسی طرح کے معاوضہ، بدلہ حتیٰ کہ شکریہ تک کی بھی توقع نہ رکھیں۔ اور جس پر احسان کیا جائے اس کو یہ تعلیم دی کہ وہ احسان کرنے والے کا ضرور شکریہ ادا کریں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ" (یعنی جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا کرنا نہیں جانتا وہ اللہ کا کیا شکر ادا کرے گا؟) حالانکہ حق اور عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اب احسان کرنے والے کو یہ سبق دیا کہ وہ احسان کے شکریہ تک کی بھی توقع نہ رکھے اور جس پر احسان ہوا اسے یہ سبق دیا کہ اول تو اس کا بدلہ ادا کرنے کی کوشش کرے ورنہ شکریہ ضرور ادا کرے۔ اس طرح معاشرہ میں ایسی فضا قائم کر دی جس سے معاشرہ کے محتاج واغنیاء کے درمیان محبت اور مؤانست کو فروغ حاصل ہو۔

[۱۳] یعنی احسان کرنے والے نیکی کرنے اور شکریہ تک کی توقع نہ رکھنے کے باوجود اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کے عمل میں کوئی تقصیر باقی نہ رہ جائے۔ اور اس دن ہم سے باز پرس نہ ہو جس کے نظارہ سے ہی سب کے چہرے بگڑ جائیں گے اور ہیبت اور دہشت طاری ہو جائے گی۔

[۱۴] یعنی اللہ ان کے اس نیک عمل کا بدلہ یہ دے گا کہ ان کے چہرے بگڑنے کے بجائے خوب ترو تازہ اور ہشاش بشاش ہوں گے اور دلوں میں گھبراہٹ واقع ہونے کے بجائے ان کو دل کا اطمینان اور سرور عطا فرمائے گا۔

[۱۵] دنیا میں ان لوگوں نے اللہ کی رضا کی خاطر بے شمار پابندیاں برداشت کی تھیں۔ اسلام کی راہ میں آنے والی مشکلات کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے تھے۔ اس مستقل صبر کے عوض آج انہیں جنت بھی عطا کی جائے گی اور فاخرانہ ریشمی لباس

حَرِيرًا ﴿١٢﴾ مُتَّكِـِٔينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَآئِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ﴿١٣﴾ وَدَانِيَةً
عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿١٤﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ
قَوَارِيرَا۠ ﴿١٥﴾ قَوَارِيرَا۟ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿١٦﴾ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿١٧﴾

وہ جنت میں تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ وہاں نہ دھوپ (کی حدت) دیکھیں گے اور نہ سردی[16] کی شدت(۱۳) (جنت کے درختوں کے) سائے ان پر جھکے ہوں گے اور ان کے خوشے مکمل طور[17] پر ان کے تابع فرمان بنا دیئے جائیں گے(۱۴) اور ان پر چاندی کے برتن اور شیشے کے ساغر پھرائے جائیں گے(۱۵) شیشے بھی ایسے جو چاندی[18] سے مرکب ہوں گے اور انہیں (منتظمین جنت نے) ایک خاص ترکیب[19] سے بنایا ہوگا(۱۶) وہاں انہیں شراب کے ایسے جام بھی پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش[20] ہوگی(۱۷)

بھی پہنائے جائیں گے اور وہ جنت میں پورے شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ تکیہ لگائے بیٹھا کریں گے۔

[16] شمس سے مراد دھوپ کی حرارت اور شدت ہے جو بدن کو ناگوار محسوس ہو۔ اور زمہریر سے مراد سخت سردی ہے اور ایسا طبقہ بھی جہاں کڑاکے کی سردی ہو۔ یعنی جنت کا موسم گرمی اور سردی کی ان دونوں انتہاؤں سے پاک اور معتدل قسم کا ہوگا۔ جیسے ہمارے ہاں موسم بہار ہوتا ہے۔

[17] جنت میں روشنی کس قسم کی اور کس چیز سے ہوگی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی سائے ہوں گے اور وہ سائے خوشگوار بھی ہوں گے اور درختوں کے پھلوں کے گچھے اہل جنت کے اتنے قریب کر دیئے جائیں کہ جب وہ چاہیں انہیں اپنے استعمال میں لا سکیں۔

[18] دنیا میں کئی قسم کے شیشے ایجاد ہو چکے ہیں۔ اور ایسی اشیاء بھی جو شیشے کے علاوہ ہونے کے باوجود شیشے کی طرح صاف شفاف بھی ہیں جیسے پلاسٹک کی اشیاء لیکن یہ چیزیں آتش گیر ہوتی ہیں جنت میں چاندی اور اس کے برتنوں کو شیشے کی طرح صاف شفاف بنا دیا جائے گا اور یہ صنعت دنیا میں آج تک ایجاد نہیں ہو سکی اور شاید آئندہ بھی نہ ہو سکے۔

[19] اس کا ایک مطلب تو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان چاندی کے شیشہ نما برتنوں کو اتنی مخصوص مقدار میں ہی بھرا جائے گا۔ جنتی پینے والے کی طلب ہوگی نہ انہیں اور مانگنے کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ ہی یہ صورت ہوگی کہ برتن میں کچھ مشروب بچ جائے۔

[20] پہلے کافور کی آمیزش والے مشروب کا ذکر کیا گیا جو اپنی تاثیر کے لحاظ سے ٹھنڈا اور مفرح ہوتا ہے۔ اب زنجبیل یا سونٹھ کی آمیزش والے مشروب کا ذکر کیا گیا۔ زنجبیل کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔ اہل عرب کے شوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک قدرتی چشمہ ہوگا جس کے مشروب میں سونٹھ کی خوشبو تو ہوگی مگر اس کی تلخی نہیں ہوگی۔

عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا
مَّنثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَّمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ
وَّإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَّحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾ إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ
جَزَاءً وَّكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ﴿٢٣﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ ع ١ / ١٩

یہ جنت میں ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے (١٨) اور ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی [٢١] رہیں گے۔ جب تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ وہ بکھرے [٢٢] ہوئے موتی ہیں (١٩) اور جدھر بھی تم دیکھو تو نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بہت بڑی سلطنت [٢٣] دیکھو گے۔ (٢٠) اس پر باریک ریشم اور گاڑھے ریشم کے لباس ہوں گے اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے [٢٤] جائیں گے اور ان کا پروردگار انہیں نہایت صاف ستھرے مشروب [٢٥] پلائے گا (٢١) (اور فرمائے گا) یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کوشش کی قدر [٢٦] کی گئی ہے۔ (٢٢)

(اے نبی!) ہم ہی نے یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے آپ [٢٧] پر نازل کیا ہے (٢٣) لہٰذا آپ اپنے پروردگار کے حکم

[٢١] ﴿وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾ کا ایک مطلب تو ترجمہ سے واضح ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکے اہل جنت کے پاس ہمیشہ موجود رہیں گے۔ کبھی غیر حاضر نہ ہوں گے۔

[٢٢] یعنی ان لڑکوں کا حسن و جمال، ان کی پاکیزگی اور نظافت، ان کی آب و تاب اور ان کے ہمہ وقت ادھر ادھر پھرنے سے یوں معلوم ہوگا کہ یہ خوبصورت موتی ہیں جو ادھر ادھر بکھیر دیئے گئے ہیں۔

[٢٣] یعنی ایک ادنیٰ درجہ کے جنتی کو بھی جو رہائش کے لیے جنت میں جگہ ملے گی وہ بھی یوں معلوم ہوگی جیسے کسی بڑے بادشاہ کی سلطنت ہے جس میں ہر طرف اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں موجود ہوں گی۔

[٢٤] سورۂ کہف کی آیت نمبر ٣١ میں مذکور ہے کہ اہل جنت کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور یہاں چاندی کے کنگنوں کا ذکر ہے۔ اور یہ بات اہل جنت کی مرضی پر منحصر ہوگی کہ جیسے کنگن وہ پہننا چاہیں انہیں پہنائے جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں قسم کے پہنائے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی سونے کے پہنائے جائیں اور کبھی چاندی کے۔ یا مردوں کو چاندی کے پہنائے جائیں اور عورتوں کو سونے کے۔

[٢٥] یہ کافور اور زنجبیل کے امتزاج والے مشروبات کے علاوہ ایک تیسرے مشروب کا ذکر ہے۔ جسے شراباً طہوراً کا نام دیا گیا ہے۔ طہور سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو خود بھی صاف ستھری ہو اور دوسری چیزوں کو بھی صاف ستھرا کرنے والی ہو۔ یعنی وہ مشروب ایک تو بذات خود انتہائی صاف شفاف ہوگا۔ دوسرے اہل جنت کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف ہر قسم کی رنجش اور کدورتیں دور کر دے گا۔

[٢٦] یعنی یہ نعمتیں عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا کہ دنیا میں میری خاطر جو تم نے مصیبتیں برداشت کیں اور میرے احکام کی پابندیوں کا خیال رکھا۔ تمہاری ان محنتوں کی آج پوری قدر کی جاتی ہے اور ان کا تمہیں بیش بہا بدلہ دیا جاتا ہے۔

[٢٧] کفار مکہ کا آپ ﷺ پر ایک یہ اعتراض بھی تھا کہ آپ ﷺ ساتھ کے ساتھ قرآن تصنیف کرتے رہتے ہیں۔ پھر ہمیں

رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۲۴ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۲۵ وَمِنَ الَّيْلِ
فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۲۶ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ

کے مطابق صبر کیجیے اور ان میں سے کسی گنہگار [۲۸] یا ناشکرے کی بات نہ مانیے۔(۲۴) اور صبح و شام اپنے پروردگار [۲۹] کا نام یاد کیجیے (۲۵) اور رات کو بھی اس کے حضور سجدہ کیجیے اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کیجیے (۲۶) یہ لوگ تو بس دنیا سے ہی محبت رکھتے ہیں اور ان کے آگے جو بھاری [۳۰] دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔(۲۷)

سنا دیتے ہیں۔ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہوتا تو ایک ہی بار نازل ہو جاتا۔ اس اعتراض کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تاکید اور تاکید مزید کے طور پر جمع متکلم کی تین ضمیریں استعمال فرمائیں ایک انا میں دوسرے نحن میں اور تیسرے نَزَّلْنَا میں۔ اتنی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ یہ قرآن رسول کا تصنیف کردہ نہیں بلکہ ہم ہی نے اسے نازل کیا ہے اور تدریجاً نازل کیا ہے جس میں کئی مصلحتیں ہیں۔ جن کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر گزر چکا ہے۔

[۲۸] کچھ کافر تو وہ تھے جو قرآن پر اور آپ ﷺ کی رسالت پر مختلف قسم کے اعتراضات جڑ رہے تھے اور کچھ وہ تھے جو آپ ﷺ کو لالچ دے کر مداہنت اور سمجھوتہ کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔ جس نے آپ ﷺ کو کہا تھا کہ آپ ﷺ مکہ کی ریاست چاہتے ہیں یا مال و دولت یا کسی حسین لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں آپ ﷺ کی ہر بات منظور ہوگی بشرطیکہ آپ ﷺ اس کام سے باز آ جائیں۔ جس کی وجہ سے قریبی رشتہ داروں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول کو سمجھایا کہ ان میں سے کسی کی بات کو بھی تسلیم نہ کیجیے۔ نہ ان سے بحث میں الجھیے۔ صبر کیجیے اور صبر کے ساتھ اپنا کام کرتے جائیے۔ اپنی منزل کھوٹی نہ کیجیے۔

[۲۹] ❁ نمازوں کے اوقات:۔ اس صبر اور برداشت کے لیے جو قوت درکار ہے۔ وہ آپ ﷺ کو اللہ کے ذکر اور اس پر توکل کرنے سے حاصل ہوگی۔ لہٰذا آپ ﷺ ہر وقت اللہ کو یاد کیا کیجیے۔

واضح رہے کہ اگرچہ پنج وقتہ نماز شب معراج میں فرض ہوئی تھی اور ہر نماز میں رکعات کی تعداد اور نماز کی دوسری جزئیات بتائی گئی تھیں۔ تاہم اس سے پہلے بھی نمازوں کے اوقات تقریباً وہی تھے مثلاً اس آیت میں ﴿بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ بکرہ سے مراد پہلے پہر یا صبح کی نماز ہے اور اصیلا زوال آفتاب سے غروب آفتاب کے وقت کو کہتے ہیں یہ ظہر اور عصر کی نمازیں ہوئیں۔ اور اس سے اگلی آیت میں رات سے مراد شام اور عشاء کی نمازیں ہیں۔ اور لَيْلًا طَوِيْلًا سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ جو آپ پر فرض تھی۔

[۳۰] یہ لوگ آخرت کے اس لیے منکر نہیں کہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، بلکہ اس لیے منکر ہیں کہ یہ صرف نقد کے گاہک ہیں۔ دنیا کی دلفریبیوں، دلکشیوں اور اس کے مال و دولت سے انہیں گہری محبت ہے۔ اور اسے اپنے پاس سمیٹ سمیٹ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ آخرت پر ایمان لانے کی صورت میں مال اکٹھا کرنے کی بجائے انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر اخروی زندگی پر ان کا کچھ یقین بھی نہیں۔ لہٰذا یہ اپنا فائدہ اسی میں دیکھتے ہیں کہ آخرت کا انکار کر دیں۔

يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ
هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾ ع۲

ہم نے ہی انہیں پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے اور جب ہم چاہیں ایسے ہی اور لوگ[۳۱] (ان کی جگہ) لے آئیں۔(۲۸) یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے[۳۲] اب جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کرے(۲۹) اور تم وہی کچھ چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہتا[۳۳] ہے۔ اللہ یقیناً سب کچھ جاننے والا ہے حکمت والا ہے(۳۰) وہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب[۳۴] تیار کر رکھا ہے۔(۳۱)

[۳۱] ہم نے رحم مادر سے ایک خوردبینی کیڑے کی نشوونما کر کے انہیں اس طرح پیدا کیا کہ ان کا بند بند اور پور پور درست کر کے انہیں ایک صاحب عقل و شعور انسان بنا کر پیدا کر دیا تھا تو ہم میں یہ بھی قدرت ہے کہ تمہیں پرے ہٹا کر دوسری مخلوق تمہاری جگہ لے آئیں جو تمہاری طرح نافرمان اور سرکش نہ ہو۔ اور یہ بھی قدرت ہے کہ تمہیں اس صفحہ ہستی سے مٹا کر دوبارہ تمہیں پیدا کر کے تمہارا پوری طرح محاسبہ کریں۔

[۳۲] یہ قرآن تمہیں تمہاری فطرت کی یاددہانی کرانے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اور تمہیں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اس کی نصیحت کو قبول کر لو اور چاہے تو رد کر دو۔ نہ قرآن تمہیں کسی بات پر مجبور بنانے کے لیے نازل کیا گیا ہے اور نہ حامل قرآن میں یہ قدرت ہے کہ تمہیں زبردستی راہ راست پر لے آئے۔

[۳۳] یعنی تمہارا ارادہ اور تمہارا چاہنا وہی ہوتا ہے جس کا اللہ کو پہلے ہی سے علم ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ علم انسان کو اس بات پر مجبور نہیں بناتا کہ وہ وہی کام کرے جو پہلے سے اللہ کے علم میں ہے اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۲۴ کا حاشیہ نمبر ۲۱

[۳۴] یعنی جو انسان اس دنیا میں اپنے اختیار کا صحیح استعمال کرے گا اور کائنات کی دوسری اشیاء کی طرح اپنے آپ کو اللہ کا تابع فرمان رکھے گا۔ اسے تو اللہ اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا اور جو اس اختیار کا غلط استعمال کرے گا اور اللہ کا سرکش اور نافرمان بن کر زندگی گزارے گا اسے مرنے کے ساتھ ہی دکھ دینے والے عذاب سے دوچار کر دے گا۔

۵۰ آیاتها سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝۱ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝۲ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴

فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝۵ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝۶ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝۸ وَ

کلمات ۱۸۱ آیات ۵۰ (۷۷) سورۃ المرسلات مکی ہے (۳۳) رکوع ۲ حروف ۸۴۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ان ہواؤں کی قسم جو دھیرے دھیرے چلتی ہیں (۱) پھر زور پکڑ کر جھکڑ بن جاتی ہیں (۲) اور (بادلوں کو) اٹھا کر پھیلا دیتی ہیں (۳) پھر انہیں پھاڑ [۱] کر جدا کرتی ہیں (۴) پھر (دلوں میں اللہ کی) یاد ڈالتی [۲] ہیں (۵) عذر کی صورت میں یا ڈرانے [۳] کی صورت میں (۶) کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا [۴] جاتا ہے وہ ضرور واقع ہو کے رہے گی (۷) جب ستارے بے نور ہو جائیں گے (۸)

[۱] ہواؤں کی اقسام اور صفات:۔ کرہ زمین کی سطح پر اللہ تعالیٰ نے ہوا کا ایک کرہ بنا دیا۔ جو ہر خشکی کے جاندار کے لیے پانی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ پانی کے بغیر تو انسان ایک آدھ دن زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر ہوا کے بغیر دو چار منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر جس طرح پانی کی بہت سی اقسام ہیں۔ کوئی پانی میٹھا ہوتا ہے، کوئی کھاری، کوئی نمکین، کوئی گدلا، کوئی صاف و شفاف، کوئی ہلکا پانی، کوئی بھاری اور کوئی متعفن اور بدبودار اسی طرح ہواؤں کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ بادِ نسیم اور بادِ صبا کا انسان کی طبیعت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ جبکہ بادِ صرصر اور بادِ سموم سخت نقصان دہ ہیں۔ کچھ ہوائیں مشرق سے مغرب کو چلتی ہیں اور کچھ مغرب سے مشرق کو پھر کچھ ہوائیں نرم رفتار سے دھیرے دھیرے چلتی ہیں۔ کبھی یک دم حبس ہو جاتا ہے، ہوا چلنے سے رک جاتی ہے تو انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے کبھی یہ ہوائیں آندھی اور جھکڑ کی صورت اختیار کر کے درختوں اور مکانات کو تہس نہس کر ڈالتی ہیں، کچھ ہوائیں خوشبو اڑا کر لاتی اور معطر ہوتی ہیں۔ اور کچھ ہوائیں بدبودار اور بیمار کر دینے والا ہوتی ہیں۔ غرض ہواؤں کا ایک الگ عالم ہے جن میں ان مختلف اقسام کی موجودگی کے باوجود ایک نظم و ضبط ہے۔ یہی ہوائیں گرمی، سردی اور موسم کی تبدیلی میں موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ کچھ ہوائیں بادلوں کو اکٹھا کرتی اور جوڑ دیتی ہیں اور کچھ دوسری جڑے ہوئے بادلوں کو یک دم پھاڑ دیتی ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے چار قسم کی ہواؤں کی قسم اٹھائی اور اپنی قدرت کاملہ کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

[۲] بعض مفسرین نے ﴿فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا﴾ سے بھی ہوائیں ہی مراد لی ہیں۔ کیونکہ آواز بھی ہوا کے ذریعہ ہی لوگوں کے کانوں تک پہنچتی ہے اگر ہوا نہ ہوتی تو وحی کی آواز نہ لوگوں کے کانوں میں پڑ سکتی تھی اور نہ ہی اس سے وہ کچھ نصیحت حاصل کر سکتے تھے اور بعض مفسرین نے اس سے مراد فرشتے لیے ہیں جو وحی کو پیغمبروں کے دلوں میں ڈالتے ہیں۔ یا دوسرے لوگوں کے دلوں میں القاء والہام کا سبب بنتے ہیں۔

[۳] ﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا﴾ کا تعلق صرف سابقہ آیت سے ہے۔ یعنی پیغمبر کے دل میں وحی یا لوگوں کے دل میں القاء والہام کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ان کے لیے اللہ کے ہاں اپنی گمراہی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے اور ان پر اتمام حجت ہو جائے اور دوسرا یہ کہ

وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۝٩ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝١٠ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ ۝١١ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ۝١٢

لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝١٣ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝١٤ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝١٥ أَلَمْ

اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا (۹) اور پہاڑ ریزہ ریزہ کرکے اڑا دیئے[۵] جائیں گے (۱۰) اور رسولوں (کی حاضری) کا وقت[۶] آپہنچے گا (۱۱) بھلا کس دن کے لیے (ان امور میں) تاخیر[۷] کی گئی؟ (۱۲) فیصلہ کے دن کے لیے[۸] (۱۳) اور آپ کیا جانیں کہ فیصلہ کا دن کیا ہے؟ (۱۴) اس دن جھٹلانے[۹] والوں کے لیے تباہی ہے (۱۵)

وقت یہ نہ کہہ سکیں کہ انہیں پہلے سے خبر نہ تھی اور دوسرا فائدہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ سے اسے دیکھے بغیر ڈر جاتے ہیں اور اپنے برے انجام سے ڈر کر اللہ کے اطاعت گزار بن جاتے ہیں۔

[۴] ان پانچ چیزوں کی قسم اٹھا کر اور انہیں بطور شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ جو پروردگار تمہاری انتہائی اہم ضرورت کی چیز سے ایسے کام لے سکتا ہے تو وہ تمہاری تباہی کا سبب بھی بن سکتے ہیں وہ تمہیں صرف ایک ہوا کے ذریعہ راحت سے بھی دوچار کر سکتا ہے اور رنج سے بھی۔ کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ جس جزا و سزا کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے اسے وجود میں لے آئے اور واقع کرکے دکھا دے۔

[۵] ان تین آیات میں قیامت کے واقع ہونے کے دن کی تین علامات بتائیں۔ ایک یہ کہ ستارے جو تمہیں آسمان پر چمک دمک کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا نور سلب کر لیا جائے گا۔ یہ دھندلا جائیں گے اور گدلے گدلے سے داغ نظر آئیں گے اور ایک دوسرے مقامات پر فرمایا کہ وہ جھڑ پڑیں گے ایسے جیسے کسی نے جھٹک کر پرے پھینک دیا ہو۔ دوسری علامت یہ ہے کہ یہ آسمان کی نیلگوں چھت جو تمہیں اپنے سروں پر نظر آ رہی ہے۔ اور اس کی ہمواری اور یکسانی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، اس نیلی چھت میں دراڑیں اور شگاف پڑ جائیں گے۔ ستاروں اور سیاروں کی باہمی کشش جس سے یہ کائناتی نظام قائم ہے ختم ہو جائے گی۔ یہ دو علامتیں تو آسمان پر ضرور ہوں گی اور تیسری علامت زمین پر یہ نظر آئے گی کہ پہاڑوں جیسی عظیم الجثہ اور سخت مخلوق کی جڑیں زمین میں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ ان کا ایک حصہ دوسرے پر گر گر کر پہاڑوں کے طویل سلسلے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے پھر اسی پر ہی معاملہ ختم نہ ہوگا بلکہ پہاڑوں کے ان ریزہ ریزہ شدہ ذرات کو ہوا اڑاتی پھرے گی۔

[۶] اس طرح موجودہ ارضی و سماوی نظام درہم برہم ہونے کے ساتھ ہی قیامت قائم ہو جائے گی۔ تمام مرے ہوئے لوگوں کو زندہ کرکے زمین سے نکال لایا جائے گا۔ اور سب سے پہلے رسولوں سے اپنی اپنی امت کے متعلق شہادت طلب کی جائے گی کہ جب تم نے لوگوں کو میرا پیغام پہنچایا تھا تو انہوں نے کیا ردعمل اختیار کیا تھا؟

[۷] کافر لوگ عذاب کے لیے اور قیامت کے لیے جلدی مچاتے ہی رہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبہ کی کچھ پروا نہ کرتے ہوئے اس دن کے وقوع میں اتنی تاخیر کر دی جتنی اس کے اپنے اندازے کے مطابق پہلے سے طے شدہ تھی۔ اور جب وہ طے شدہ وقت یا دن آپہنچا تو پھر اس میں مزید تاخیر ناممکن تھی۔

[۸] یہ تاخیر اس لیے کی جاتی رہی کہ جتنی مدت اللہ کے ہاں دارالامتحان کے لیے مقرر تھی وہ پوری ہو جائے۔ اور تمام لوگوں کے امتحان کا نتیجہ بولنے کا وقت آجائے۔ یوم الفصل کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تمام لوگوں کو ان کے امتحان کا نتیجہ اور فیصلہ سنا دیا جائے کہ کون جنت کا مستحق قرار پاتا ہے اور کون دوزخ کا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس دن اللہ کے فرمانبرداروں اور اللہ کے نافرمانوں کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی۔ کیونکہ وہ دونوں الگ الگ انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔

[۹] تباہی اس لیے کہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کے لیے یہ ایک ناگہانی آفت ہوگی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ

نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾
اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ

کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک[۱۰] نہیں کر ڈالا؟(۱۶) پھر انہیں کے پیچھے بعد والوں کو چلتا کریں گے(۱۷) ہم مجرموں سے ایسا ہی برتاؤ کیا کرتے ہیں(۱۸) اس دن جھٹلانے[۱۱] والوں کے لیے تباہی ہے(۱۹) کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟(۲۰) پھر اسے ایک محفوظ جگہ میں ٹھہرائے[۱۲] رکھا(۲۱) ایک معین وقت[۱۳] تک(۲۲) پھر ہم نے اندازہ[۱۴] مقرر کیا تو ہم کیا ہی اچھا اندازہ کرنے والے ہیں(۲۳) اس روز جھٹلانے والوں[۱۵] کے لیے تباہی ہے(۲۴)

قیامت فی الواقع آجائے گی اور جب آجائے گی تو انہیں اپنی ہلاکت کے سوا کوئی راہ دکھائی نہ دے گی۔

واضح رہے کہ اس سورت میں یہ آیت متعدد بار ذکر کی گئی ہے اور ہر مقام پر اس کی مناسبت کی وجہ الگ الگ ہے

[۱۰] یعنی ہمارا دستور یہ ہے کہ ہم اپنے نافرمانوں اور سرکشوں کو ایسا تباہ و برباد کر دیتے ہیں کہ ان قوموں کی تہذیب و تمدن کا نام و نشان تک صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ ہم نے پہلی قوموں سے بھی یہی سلوک کیا تھا اور بعد میں ایسی کرتوتیں کرنے والوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کریں گے۔

[۱۱] یعنی ہمارا یہ دستور اسی بات پر ختم نہیں ہو جاتا کہ آخرت کے منکروں کو تباہ و برباد کر کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ بلکہ اس کی حیثیت تو محض ایک مجرم کی گرفتاری کی ہے۔ کہ باقی لوگ ان کے مظالم سے نجات پائیں اور محفوظ رہیں۔ اصل تباہی تو ان کی قیامت کے دن ہو گی۔ جس دن انہیں ان کے جرائم کی قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

[۱۲] یعنی تین پردوں کے اندر نطفہ کو اس قدر محفوظ کر دیا اور اتنا سختی سے جما دیا کہ کسی شدید حادثہ سے دوچار ہوئے بغیر حمل کا اسقاط نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی خود حمل کو ساقط کرنا چاہے تو حاملہ یا ماں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

[۱۳] یہ معین وقت اگرچہ عموماً نو ماہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کمی و بیشی بھی ممکن ہے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ عورت اور مرد کے نطفہ میں کس قدر قوت یا کمزوری ہے۔ یا ان دونوں میں سے کسی ایک میں ہے تو اسی نسبت سے اس مدت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور بچہ کی نشوونما جب رحم مادر میں مکمل ہو جاتی ہے تو وضع حمل کا وقت آجاتا ہے۔

[۱۴] اندازہ یہ ہے کہ جب تک بچہ کی پوری قوتیں اور اس کے اعضاء مکمل نہیں ہو جاتے۔ بچہ رحم مادر میں ہی رہتا ہے اور جب ہر قسم کی نشوونما مکمل ہو جاتی ہے تو اس کے بعد ایک دن بھی بچہ رحم مادر میں نہیں رہ سکتا۔ ماں کو دردیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور اس وقت تک یہ دردیں ختم نہیں ہوتیں جب تک بچہ وضع ہو کر اس کے رحم سے باہر نہ نکل آئے۔

[۱۵] یعنی انسان کا نطفہ بے جان غذاؤں سے بنا تھا۔ اللہ نے اس کی نشوونما کی اس میں جان ڈالی اور اسے ایک جیتا جاگتا انسان بنا کھڑا کیا۔ اس کے باوجود جو لوگ موت کے بعد دوبارہ زندگی کے منکر ہیں ان کی عقلوں پر افسوس ہے اور ان کا انجام تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿٢٧﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٨﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنا دیا؟(۲۵) زندوں کو بھی[۱۶] اور مردوں کو بھی؟(۲۶) اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جما دیئے[۱۷] اور تمہیں میٹھا پانی پلایا(۲۷) اس دن جھٹلانے والوں[۱۸] کے لیے تباہی ہے۔(۲۸) چلو اسی (دوزخ) کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے(۲۹)

[۱۶] کفاتا کا لغوی مفہوم:۔ کِفَاتًا: کَفَتَ بمعنی کسی چیز کو جمع کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے لینا، سنبھال لینا، سمیٹ لینا اور کَفِیْت بمعنی توشہ دان جس میں خوراک اور سامان خوراک سنبھال کر رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور موت اور پھر دوبارہ زندگی زمین ہی سے وابستہ ہے۔ انسان زمین یا مٹی سے پیدا کیا گیا اور یہ بے جان چیز ہے۔ پھر انسان نے زمین سے پیدا ہونے والی بے جان اشیاء کھائیں جو اس کی زندگی کی بقاء کا ذریعہ بنیں۔ پھر انہی بے جان غذاؤں سے اس کا نطفہ بنا جس میں زندگی کے آثار تھے۔ پھر اسی نطفہ سے انسان کو بنایا گیا پھر مرنے کے بعد انسان مٹی میں چلا جاتا ہے۔ اور مرنے والے خواہ لاکھوں کی تعداد میں ہوں زمین ان کو اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے۔ گویا یہی زمین زندہ انسانوں کو بھی سنبھالے ہوئے ہے اور مُردوں کو بھی اپنے اندر سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ سنبھالے رکھتی ہے۔ پھر جب اللہ چاہے گا تو انہیں مردہ انسانوں کو نکال باہر کرے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کے اندر سے نباتات اگ کر باہر نکل آتی ہے۔

[۱۷] زمین سے انسان کا دائمی تعلق:۔ پھر اسی زمین میں بلند و بالا پہاڑ پیدا کر دیئے جو سمندروں سے اٹھنے والے آبی بخارات کو ٹھنڈا کر دینے اور بارش کے قطرے بن جانے میں مدد دیتے ہیں۔ اور ان آبی بخارات کا رخ بدل دیتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں پہاڑوں پر برف بھی جمتی ہے اور بارشیں بھی خوب ہوتی ہیں۔ یہی پانی کچھ تو ندی، نالوں، نہروں اور دریاؤں کی صورت میں بہتا ہے اور انسانوں اور کھیتیوں کو سیراب کرتا ہے اور اسی بارش کے پانی کا کثیر حصہ زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ تو سطح زمین کے نیچے خاصی گہرائی میں پانی کی نہریں اور دریا رواں ہو جاتے ہیں۔ پانی کے یہ محفوظ ذخیرے اس وقت کام آتے ہیں جب بارش برسنے میں دیر ہو جائے۔ تاکہ انسان مصنوعی آبپاشی کے ذریعہ اپنے کھیتوں کو اور اپنے آپ کو سیراب کر سکے۔ علاوہ ازیں پہاڑوں سے معدنیات نکل رہی ہیں۔ زمین سے کئی طرح کے سیال اور گیس کے خزانے برآمد ہو رہے ہیں۔ جوں جوں انسان کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے زمین بھی اپنے نت نئے خزانے اگل رہی ہے۔ گویا یہی زمین زندوں کی زندگی کی بقاء کے لیے بھی بہت کافی ہے اور دنیا جہاں کے مردوں کو سنبھالنے کے لیے بھی۔

[۱۸] اسی طرح یہی زمین یا اس کے متبادل کوئی اللہ کی نئی پیدا کردہ زمین اپنے اندر مدفون تمام امانتوں اور بالخصوص انسانی مُردوں کو اگل دے گی۔ پھر ان کو سنبھال کر بھی رکھے گی۔ آج جن لوگوں کو اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی اس دن ان کے لیے حسرت، ندامت اور تباہی ہی تباہی ہو گی۔

تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿٣٠﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾
اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾ هٰذَا
يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾
هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ

چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں[19] والا ہے(۳۰) نہ وہ ٹھنڈی چھاؤں ہوگی اور نہ تپش سے بچائے گی(۳۱) وہ (اتنے بڑے بڑے) شرارے پھینکے گی جیسے محل(۳۲) (جو اچھلتے ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوں گے) گویا وہ زرد[20] اونٹ ہیں(۳۳) اس دن جھٹلانے والوں[21] کے لیے تباہی ہے(۳۴) یہ دن ایسا ہوگا جس میں وہ کچھ بول نہ سکیں گے۔(۳۵) اور نہ انہیں یہ اجازت دی جائے گی کہ وہ[22] کوئی عذر پیش کریں(۳۶) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے(۳۷) یہی فیصلے کا دن ہے ہم نے تمہیں بھی اور پہلوں کو بھی جمع کر دیا ہے۔(۳۸) پھر اگر تمہارے پاس کوئی چال ہے تو میرے خلاف[23] چل دیکھو(۳۹) اس دن جھٹلانے والوں

[19] اس دن دوزخ سے گرم بخارات اٹھیں گے جو دوزخیوں کے اوپر سایہ کر دیں گے یہ نام کو سایہ ہوگا مگر شدید گرم جو ان کو سایہ، ٹھنڈک یا سکون پہنچانے کے بجائے اپنی حرارت کی وجہ سے ان میں مزید گھبراہٹ اور اضطراب پیدا کر دے گا۔ یہ سایہ اوپر اٹھ کر تین بڑی شاخوں میں منقسم ہو جائے گا اور ان کے آگے سے، پیچھے سے اور اوپر سے غرض ہر طرف سے انہیں گھیرے میں لے لے گا اس دن اللہ کے فرمانبردار بندے عرش کے سایہ تلے ہوں گے اور نافرمانوں کو اگر سایہ مہیا کیا بھی جائے گا تو وہ ان کے عذاب میں اضافہ ہی کرے گا۔

[20] جہنم سے اٹھنے والے چنگارے اور شرارے اتنے بڑے ہوں گے۔ جیسے بلند و بالا عمارتیں ہوں پھر جب وہ ٹوٹ کر اور بکھر کر نیچے جہنم کی طرف گریں گے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے زرد رنگ کے اونٹ اچھل کود رہے ہیں۔

[21] یہ ہولناک منظر دیکھ کر جھٹلانے والوں کو پوری طرح یقین ہو جائے گا کہ ہم ہی اس دوزخ کا ایندھن بننے والے ہیں۔ اور انہوں نے قیامت کے دن کا انکار کر کے جو حماقت کی تھی اس کا نتیجہ ہماری تباہی ہی تباہی ہے۔

[22] یہ وہ وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ ہو چکے گا۔ اور ظالم لوگوں کے اعضاء و جوارح ان کے خلاف شہادت دے کر انہیں جھوٹا قرار دے چکے ہوں گے۔ انصاف کے تمام تر تقاضوں کے مکمل ہونے کے بعد مجرموں کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنی بریت کے لیے مزید کچھ کہہ سکیں نہ ہی اس وقت عذر پیش کرنے کا کوئی موقع باقی رہ جائے گا۔

[23] یعنی دنیا میں تم لوگ میری راہ روکنے کے لیے ہزاروں قسم کی چالیں چلتے تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے۔ میرے پیروکاروں کو ایذائیں اور دکھ پہنچاتے تھے اور انہیں اس طرح گھور کر دیکھتے تھے جیسے انہیں کچا ہی چبا جاؤ گے۔ ان کی تحقیر کرتے، تمسخر اڑاتے اور ان کے زندہ رہنے کا حق بھی ان سے سلب کرتے تھے۔ آج

لِلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَ
اشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾

کے لیے تباہی ہے۔(۴۰) پرہیزگار[۲۴] (اس دن) سایوں اور چشموں میں ہوں گے (۴۱)
اور جو پھل وہ چاہیں گے انہیں ملیں گے (۴۲) مزے سے کھاؤ پیو، اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے رہے (۴۳)
بلاشبہ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں (۴۴) اس دن جھٹلانے والوں[۲۵] کے لیے تباہی ہے (۴۵) چند دن کھالو
اور مزے اڑالو[۲۶]۔ بلاشبہ تم مجرم ہو (۴۶) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے (۴۷)

بھی کوئی تدبیر میرے خلاف کر دیکھو۔ اس وقت تم سب کے سب اگلے اور پچھلے اس میدان میں جمع ہو۔ سب مل کر اپنی قوت کا مظاہرہ کر دیکھو یا کوئی سوچ سمجھ کر سازش ہی تیار کر لو اور دیکھو کہ تمہاری کوئی تدبیر آج کے دن کی تباہی سے تمہیں بچا سکتی ہے۔

[۲۴] یہاں متقین کا لفظ مکذبین کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ کی آیات کی اور قیامت کے دن کی تصدیق کرتے تھے۔ اللہ سے اور قیامت کے دن کی سختیوں سے ڈرتے تھے۔ اللہ کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی سے ڈر کر ممکن حد تک اللہ کی فرمانبرداری کرتے رہے تھے۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہوگا کہ وہ جنت کے ٹھنڈے اور پرسکون سایوں میں ہوں گے۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے وہاں وافر تعداد میں ہوں گے۔ کھانے کو اعلیٰ سے اعلیٰ اور حسب پسند پھل ملیں گے۔ وہ جتنا کچھ بھی کھاپی لیں گے اس سے انہیں کسی قسم کی کچھ تکلیف نہ ہوگی۔ اور ساتھ ہی انہیں یہ کہا جائے گا کہ یہ تمہارے ان اعمال کا بدلہ ہے جو تم دنیا میں بجالاتے رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد محض ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کے لیے ہوگا ورنہ حقیقت وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی کہ کوئی شخص بھی اپنے اعمال کی وجہ سے جنت نہیں جاسکتا بلکہ محض اللہ کے فضل اور اس کی مہربانی کی بنا پر جنت میں جائے گا۔

[۲۵] یعنی مجرموں اور آخرت کے منکروں کو ایک تو اپنے انجام سے گھبراہٹ اور پریشانی ہوگی۔ دوسرے وہ لوگ ان کے سامنے جنت میں جارہے ہوں گے جنہیں وہ حقیر سمجھتے تھے اور ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو کوئی بالاتر مخلوق قرار دیتے تھے۔ اس طرح ان کی تکلیف میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

[۲۶] یہ خطاب دنیا بھر کے کافروں اور آخرت کے منکروں کو ہے کہ ان کی موت تک ان کے پاس وقت ہے اس عرصہ میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر لیں مزے اڑالیں، مال و دولت جیسے بھی ہاتھ لگتا ہے سمیٹ لیں۔ اور اللہ کی آیات کے مقابلہ میں جتنی باتیں بنا سکتے ہیں انہیں کھلی چھٹی ہے۔ مرنے کے ساتھ ہی وہ اپنی ہلاکت اور تباہی کے گڑھے میں گرنے والے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور جب انہیں (اللہ کے آگے) جھکنے کو کہا جاتا تھا تو وہ[۲۷] نہیں جھکتے تھے (۴۸) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے (۴۹) پھر اس کلام (قرآن) کے بعد اور کونسا کلام ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں[۲۸] گے؟ (۵۰)

[۲۷] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب انہیں اللہ کی آیات اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو کہا جاتا تو وہ تسلیم کرنے کے بجائے اکڑ بیٹھتے تھے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب انہیں نماز کے لیے کہا جاتا تو انکار کر دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت قبیلہ بنو ثقیف کے حق میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں نماز ادا کرنے کا حکم دیا تو کہنے لگے کہ نماز میں تو جھکنا پڑتا ہے اور جھکنے میں ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اس دن تباہی ہی تباہی ہے۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اللہ کے حضور سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن کر نہ سکیں گے۔ ان کی پشتوں کے پٹھے اکڑ جائیں گے جیسا کہ سورۃ القلم کی آیت نمبر ۴۲ اور ۴۳ میں پہلے گزر چکا ہے۔

[۲۸] یعنی حق و باطل میں امتیاز کے لحاظ سے پند و نصیحت کے لحاظ سے، انسان کو نیک و بد سمجھانے کے لحاظ سے اور اسے اس اخروی انجام سے آگاہ کرنے کے لحاظ سے قرآن سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہو سکتی۔ پھر اگر یہ لوگ اس پر بھی ایمان لانے کو تیار نہیں تو کیا اس کے بعد کوئی اور کتاب آسمان سے اترنے والی ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اس آیت پر پہنچے تو یوں کہے: "امنا باللہ (مستدرک حاکم)

۴۰ آیاتها سُوْرَةُ النَّبَإِ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝٢ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝٦ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝٧ وَّ

کلمات ۱۷۴ آیت ۴۰ (۷۸) سورۃ النبأ مکی ہے (۸۰) رکوع ۲ حروف ۸۰۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کس چیز کے متعلق وہ آپس میں سوال[1] کرتے ہیں؟(۱) کیا بڑی خبر کے متعلق؟(۲) جس میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف[2] رکھتے ہیں(۳) ہرگز نہیں، جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا(۴) ہاں! یقیناً انہیں جلد ہی معلوم[3] ہو جائے گا(۵) کیا ہم نے زمین[4] کو ایک گہوارہ نہیں بنایا؟(۶) اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح[5] گاڑ دیا(۷)

[1] کفارِ مکہ کے نزدیک قیامت کا تصور اور نظریہ ایک عجوبہ چیز تھی۔ جب قرآن نے بہانگِ دہل یہ اعلان کیا کہ قیامت فی الواقع آنے والی ہے اور تمہیں تمہارے مٹی میں گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے تمہارے اعمال کی بازپرس کی جائے گی تو اس کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ مسلمانوں اور پیغمبر اسلام کے سامنے آپس میں ہی گفتگو کرتے کہ بھئی یہ قیامت کیا بلا ہے؟ ہم مٹی میں مل جانے کے بعد کیونکر زندہ ہو سکتے ہیں؟۔ آج تک تو کوئی مرا ہوا زندہ ہوا نہیں۔ پھر یہ کیسی انہونی بات ہے اور یہ آئے گی کب؟ یہی وہ سوالات تھے جو ان کی دلچسپی کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ وہ مسلمانوں سے بھی، نبی آخر الزمان ﷺ سے بھی اور آپس میں بھی ایسے سوالات کرتے رہتے تھے اور اس بات سے ان کا مقصد مسلمانوں کو چڑانا ہوتا تھا۔

[2] دورِ نبوی میں عقیدۂ آخرت کے متعلق کئی طرح کے اختلاف پائے جاتے تھے۔ کچھ لوگ تو دہریے تھے جو سرے سے اللہ کی ہستی کے ہی قائل نہ تھے۔ ان کے لیے عقیدۂ آخرت خارج از بحث تھا۔ مشرکین مکہ اللہ کی ہستی کے تو قائل تھے مگر آخرت کے منکر تھے۔ عیسائی آخرت کے تو قائل تھے مگر ان میں سے اکثریت کا عقیدہ یہ تھا کہ اخروی عذاب و ثواب صرف روح پر وارد ہو گا۔ بدن جو گل سڑ چکا ہے اسے دوبارہ زندہ کر کے نہیں اٹھایا جائے گا اور کچھ لوگ نظریہ لاادریت کے قائل تھے یعنی وہ شک و شبہ میں مبتلا تھے۔ ان کے خیال میں یہ دونوں صورتیں ممکنات سے تھیں یعنی یہ بھی ممکن ہے کہ قیامت قائم ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی انسان کا قصہ پاک ہو جائے۔ اور قیامت کا نظریہ محض ایک قیاسی اور وہمی نظریہ ہو۔ ان سب اختلافات کے باوجود یہ لوگ عملاً اور نتیجہ کے لحاظ سے آخرت کے منکر تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آخرت کے منکر ہونے کی وجہ سے کافر ہی قرار دیا ہے۔

[3] یعنی اسی دنیا میں ان کی موت کے وقت آخرت سے متعلق سب حقائق پوری طرح کھل کر ان کے سامنے آ جائیں گے۔

[4] ❁ کیا کائنات کے چودھری حضرت انسان کی زندگی کا کچھ مقصد نہ ہونا چاہیے:۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کائنات سے چند ایسے آثار و شواہد پیش فرمائے ہیں جن سے ہر انسان کو سابقہ پڑتا ہے اور وہ ان سے متمتع ہو رہا ہے۔ انسان کو بتانا یہ مقصود ہے

خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ﴿۸﴾ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾

اور تمہیں جوڑے [۶] جوڑے پیدا کیا (۸) تمہاری نیند کو سکون [۷] کا باعث بنایا (۹) اور رات کو پردہ پوش [۸] بنایا۔ (۱۰) اور دن کو معاش کا وقت [۹] بنایا (۱۱)

کہ کائنات میں یہ اشیاء کسی خاص مقصد کے لیے اور بڑی حکمت کے ساتھ پیدا کی گئی ہیں اور ان میں سے ہر چیز اپنے مقاصد کو پورا کر رہی ہے۔ اب رہا انسان جسے عقل و شعور اور ارادہ و اختیار دے کر اور اس کائنات میں چودھری بنا کر بھیجا گیا ہے کہ وہ ان تمام اشیاء سے حسب ضرورت فائدے اٹھائے تو کیا اس کی زندگی کا کچھ بھی مقصد نہ ہونا چاہیے؟ کیا عقل اسے باور کرتی ہے کہ انسان فائدے تو ہر طرح سے اٹھائے۔ دنیا میں جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ پھر جب مر جائے تو اس کا قصہ پاک ہو جائے اور اس سے کوئی مؤاخذہ کرنے والا نہ ہو؟ کیا کائنات کی باقی سب اشیاء کے علی الرغم انسان کو ہی ایسا بے کار پیدا کیا گیا ہے۔ کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو؟ انسان کی زندگی کا مقصد یہ آزمائش ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ قوتوں کا استعمال درست کرتا ہے یا غلط؟ اسے اس امتحان کے لیے اس کی موت تک کا وقت دیا گیا ہے۔

اللہ کی نشانیاں زمین کا گہوارہ ہونا:۔ اس دوران وہ پرچہ امتحان کو جس طرح چاہے حل کر سکتا ہے۔ موت کے وقت اسے اس کے امتحان کے نتیجہ سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ اور دوسری دنیا یعنی عالم آخرت میں اسے اس کے کیے ہوئے اعمال کی جزا و سزا بھی دی جائے گی۔ آگے ان چند آثار و شواہد کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ سرفہرست یہ ہے کہ زمین اس کے لیے گہوارہ بنا دی گئی ہے۔ جس میں ہم نے اس کی رہائش، اس کے چلنے پھرنے اور اس کے کھانے پینے اور نشو و نما کے جملہ انتظامات کر دیے ہیں۔

[۵] پہاڑوں کی تنصیب:۔ زمین جب پیدا کی گئی تو ابتداً لرزتی رہتی تھی، ڈولتی تھی، جھولتی تھی اور ادھر ادھر ہچکولے کھاتی تھی۔ ایسی صورت میں انسان کا اس پر زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ ہم نے اس کی پشت پر جا بجا پہاڑوں کے طویل سلسلے میخوں کی طرح گاڑ دیے اور انہیں اس تناسب سے جا بجا مقامات پر پیدا کیا جس سے زمین میں لرزش اور جھول بند ہو گئی اور وہ اس قابل بنا دی گئی کہ انسان اس پر اطمینان سے چل پھر سکے۔ اس پر مکانات وغیرہ تعمیر کر سکے اور سکون سے پوری زندگی بسر کر سکے۔

[۶] مرد و زن کی تخلیق:۔ بقائے نوع کے لیے ہم نے انسان کی دو بڑی انواع مرد اور عورت پیدا کیں۔ ان انواع میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے فطری کشش رکھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے راحت و سکون کا باعث بنتے ہیں۔ ان میں محبت اور مودت پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی لابدی ضرورت ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر ان کا زندگی گزارنا مشکل ہے۔ بقائے نوع انسانی کا مقصد کچھ کم اہم نہ تھا۔ ان دونوں میں کشش، سکون اور محبت پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کو بڑا پر لطف بنا دیا۔

[۷] نیند کی حقیقت اور مقصد:۔ نیند بھی اللہ تعالیٰ کے معجزہ نما عجائب میں سے ہے۔ نیند کیا چیز ہے؟ اس کی حقیقت آج تک انسان کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جب انسان کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن محض کام چھوڑ دینے سے تھکاوٹ دور نہیں ہوتی جب تک نیند نہ آئے۔ نیند ایک اضطراری امر ہے جو تھکے ہوئے انسان کو لیٹنے پر مجبور کر دیتی ہے پھر اس پر چھا جاتی ہے۔ کام کرتے کرتے انسان کے جسم سے جو خلیے جل کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ نیند کی حالت میں ان کی جگہ نئے خلیے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انسان کی نیند اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک تلافی مافات ہو نہ جائے۔ پھر جب انسان کے جسم کی تعمیر و مرمت پوری ہو جاتی ہے تو انسان کی نیند کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور وہ تر و تازہ دم ہو کر از خود جاگ اٹھتا ہے۔

[۸] آرام کے لیے رات:۔ رات دن کی نسبت ٹھنڈی بھی ہوتی ہے اور تاریک بھی اور یہ دونوں باتیں نیند کے لیے

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿١٢﴾ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿١٣﴾ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿١٤﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿١٥﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿١٦﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿١٧﴾

اور تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنا دیئے (۱۲) اور ایک بھڑکتا ہوا چراغ [۱۰] بنایا (۱۳) اور نچڑنے والے بادلوں سے لگاتار بارش برسائی (۱۴) تاکہ اس سے ہم اناج اور سبزی (۱۵) اور گھنے [۱۱] باغ اگائیں (۱۶) بیشک فیصلے کا دن ایک مقررہ وقت [۱۲] ہے (۱۷)

ضروری ہوتی ہیں۔ دن کو بھی جب کسی وقت انسان کو سونے کی حاجت محسوس ہوتی ہے تو وہ کوئی تاریک گوشہ تلاش کرتا ہے۔ آنکھوں پر کپڑا رکھ لیتا ہے اور بسا اوقات رات کو بھی اسی غرض سے کپڑا اوڑھ لیتا ہے کہ اسے گہری نیند کا لطف میسر ہو۔

[۹] ❁ کام کرنے کے لیے دن:۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ فطری ذرائع یہ ہیں کہ انسان دن کو کام کرے جبکہ اسے قدرتی روشنی آسانی سے میسر آتی ہے۔ اور رات کو آرام کرے اور نیند لے کیونکہ نیند کے لیے جس تاریکی کی ضرورت ہے وہ اسے رات کو آسانی سے قدرتی ذرائع سے مہیا ہو جاتی ہے اس کے برعکس اگر کوئی شخص رات کو کام کرتا ہے اور دن کو سویا کرے تو وہ نہ گہری نیند کا لطف حاصل کر سکتا ہے اور نہ اس کے پورے فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ بعد اس کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔

[۱۰] ❁ سورج کی دوری اور فوائد:۔ وَهَّاجًا: الوھج بمعنی سورج یا آگ کی بھڑک جس میں تپش بھی ہو اور چمک بھی۔ یعنی سورج ایک بھڑکتا ہوا گولا ہے جو انسانوں اور اہل زمین کو حرارت بھی مہیا کرتا ہے اور روشنی بھی۔ یہ سورج زمین سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر رکھا گیا ہے۔ اگر یہ فاصلہ اس سے کم رکھا جاتا تو انسان سورج کی تپش سے جل بھن کر مر جاتا اور اگر یہ فاصلہ زیادہ کر دیا جاتا تو انسان سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا۔ سورج کو زمین سے اتنے مناسب فاصلہ پر رکھنا اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

[۱۱] ❁ بارش کا نزول اور روئیدگی:۔ پھر اسی سورج کی حرارت سے سطح سمندر سے آبی بخارات اٹھتے ہیں جو کسی سرد طبقہ میں پہنچ کر پانی کے قطرے بن کر برسنے لگتے ہیں۔ یہی بارش زمین سے نباتات اور درختوں کی روئیدگی کا سبب بنتی ہے اور یہی نباتات روئے زمین پر بسنے والی تمام جاندار مخلوق کے رزق کا ذریعہ اور زندگی کی بقا کا سبب بنتی ہے۔

[۱۲] ان سب باتوں پر غور کرنے سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کوئی چیز بھی بے مقصد پیدا نہیں کی۔ پھر کیا انسان کو ہی اس نے اتنی معجز نما قوتیں عطا کر کے بے کار پیدا کر دیا ہوگا؟ وہ جو چاہے کرتا پھرے اور اس سے کوئی مؤاخذہ نہ ہو؟ یہ سب باتیں حیات بعد الممات پر قوی دلائل ہیں اور ایک وقت یقیناً آنے والا ہے جب اس کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور سب انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے ان سے محاسبہ کیا جائے گا یہ کام کب ہوگا؟ اللہ کے ہاں اس کے لیے بھی ایک ٹھیک وقت مقرر ہے۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ وَّسُيِّرَتِ
الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ
اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾

جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم فوج در فوج نکل[۱۳] آؤ گے (۱۸) اور آسمان کھولا جائے گا تو وہ دروازے[۱۴] ہی دروازے ہو جائے گا (۱۹) اور پہاڑ چلائے[۱۵] جائیں گے تو وہ چمکتی ریت بن جائیں گے (۲۰)

جہنم یقیناً ایک گھات ہے (۲۱) جو سرکشوں[۱۶] کا ٹھکانا ہے (۲۲) جس میں وہ مدتوں[۱۷] پڑے رہیں گے (۲۳) نہ وہ اس میں ٹھنڈک کا مزا چکھیں گے اور نہ کسی مشروب کا (۲۴) بس ان کے لیے گرم پانی اور بہتی پیپ ہی ہوگی۔ (۲۵) یہ بدلہ ہے (ان کے عملوں کے) موافق[۱۸] (۲۶)

[۱۳] یہ دراصل نفخہ صور ثانی کے وقت ہوگا کہ لوگ اپنے جرائم کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے اور اللہ کے حضور پیش ہو جائیں گے۔ فیصلہ کے دن کی مناسبت سے اس صورت حال کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے۔

[۱۴] آج ہمیں آسمان ایک نیلگوں اور صحیح و سالم چھت نظر آتی ہے جس میں کہیں کوئی رخنہ، دراڑ یا شگاف نظر نہیں آتا۔ لیکن جب قیامت کا پہلا صور پھونکا جائے گا تو اس آسمان میں اتنی دراڑیں یا شگاف پڑ جائیں گے کہ یوں معلوم ہوگا کہ سارا آسمان بس دروازے ہی دروازے بن گیا ہے۔ اس وقت یہ ایک محفوظ چھت نہیں رہے گا بے شمار ستارے آپس میں ٹکرا کر زمین پر گر پڑیں گے۔ کئی ٹوٹنے والے ستارے اور دوسری بلائیں بھی زمین کا رخ کر لیں گی۔

[۱۵] پہاڑوں کی زمین میں گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ ان کے مقامات میں تبدیلی واقع ہو جائے گی پھر ان کے پتھر ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بالآخر چمکتی ریت کے تودے بن جائیں گے جن پر ایک خاص زاویہ سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ گویا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ پھر ان کی یہ کیفیت بھی نہ رہے گی بلکہ ہوا ان ریت کے تودوں کو ادھر سے ادھر اڑاتی پھرے گی۔

[۱۶] مِرْصَاد بمعنی گھات یا تاک لگا کر بیٹھنے کی جگہ جہاں شکاری غافل شکار کو پھانسنے کے لیے بیٹھتا ہے۔ پھر جب شکار اس کی زد میں آ جاتا ہے تو یکدم اسے قابو کر لیتا ہے۔ آخرت کے منکر بھی جہنم کے غافل شکار ہیں جو انجام سے بے خبر اور لاپروا ہو کر زمین میں آزادانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے مرنے کی دیر ہے کہ جہنم فوراً انہیں اپنے قبضہ میں لے لے گی۔ وہ تو پہلے ہی اس انتظار میں ہے کہ اسے کب کوئی شکار مہیا ہوتا ہے؟

[۱۷] اَحْقَابًا۔ حُقْبَة کی جمع ہے اور حقبہ بمعنی اسی سال کا عرصہ یا اس سے زائد مدت، طویل اور غیر معینہ مدت (مفردات) اور اس کی جمع حقب بھی آتی ہے اور احقاب بھی یعنی اہل دوزخ پر جب ایک حقبہ گزر جائے گا تو دوسرا حقبہ شروع ہو جائے گا۔ پھر تیسرا گویا وہ لامتناہی مدت تک دوزخ میں ہی پڑے رہیں گے۔

[۱۸] یعنی انہیں اتنی ہی سزا دی جائے گی جس قدر اس کے برے اعمال تھے۔ اس سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی۔ اور ان کے جرائم کی بنیاد یہ بات تھی کہ انہیں اس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ان کا محاسبہ کیا جانے والا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے آیات کا

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ﴿٢٨﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ
كِتَابًا ﴿٢٩﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ﴿٣٢﴾

وہ حساب کی توامید ہی نہیں رکھتے تھے (٢٧) اور ہمہ وقت ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے (٢٨) اور ہم نے یہ ساری چیزیں ایک کتاب میں ریکارڈ کر رکھی تھیں (٢٩) (اور انہیں کہا جائے گا) اب مزا چکھو، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز [١٩] میں اضافہ نہ کریں گے (٣٠)

پرہیز گاروں کے لیے یقیناً کامیابی [٢٠] کا ایک مقام ہے (٣١) باغات [٢١] اور انگور (٣٢)

انکار کیا تھا اور پوری زندگی شتر بے مہار کی طرح آزادانہ گزار دی تھی۔

[١٩] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہل دوزخ کو جب دوزخ کے عذاب سہتے سہتے ایک طویل مدت گزر جائے گی تو پھر ان کی طبیعتیں ہی اس طرح کی ہو جائیں گی کہ وہ عذاب کو عذاب محسوس نہ کریں گے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اس آیت سے ان کے اس نظریہ کی تردید ہو گئی کیونکہ اہل دوزخ کو جو عذاب دیا جائے گا وہ ایک حالت پر نہ رہے گا کہ اہل دوزخ کی طبیعتیں اس کی عادی اور خوگر بن جائیں بلکہ اس عذاب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ نیز بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ طویل زمانہ گزرنے کے بعد جہنم پر بھی ایک وقت ایسا آئے گا جب اس کی آگ ماند پڑ جائے گی بلکہ بجھ جائے گی۔ خواہ اہل دوزخ اس میں ابھی موجود ہوں۔ اس آیت سے ان لوگوں کے نظریہ کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔

[٢٠] ❁ مفازا کا لغوی مفہوم:۔ مفازا: فاز بمعنی نجات حاصل کرنا اور مصیبتوں سے نجات حاصل کر کے خیر و عافیت کے ساتھ سلامتی کی جگہ پہنچنا ہے۔ اسی لیے فاز الرجل اور فَوَّز الرجل کے معنی مرنا اور ہلاک ہونا بھی آتا ہے اور اس میں تصور یہ ہے کہ انسان مر کر دنیا کی پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ گویا پرہیز گاروں کے لیے سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ انہیں قیامت کے دن کے مصائب و آلام اور دوزخ کے عذاب سے نجات مل جائے اور وہ ایسے محفوظ اور سلامتی والے مقام پر پہنچا دیے جائیں جہاں جہنم کے عذاب کی لو تک بھی نہ پہنچ سکے۔ رہا اس کے بعد جنت میں داخلہ اور جنت کی نعمتوں کا حصول تو وہ اللہ کے فضل اور مہربانی سے زائد انعام ہو گا۔ اور اس مضمون پر پہلے متعدد مقامات پر بحث گزر چکی ہے۔

[٢١] پرہیز گاروں کو نجات کے بعد زائد انعام جنت یا جنت کی نعمتوں کی صورت میں ملے گا ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان میں پہلی چیز تو حدائق ہیں اور حدائق حدیقہ کی جمع ہے اور حدیقہ ایسے باغ کو کہتے ہیں جس کے گرد حفاظت کی خاطر چار دیواری کی گئی ہو۔ ایسے باغات میں بالخصوص انگوروں کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ یہی ایک ایسا پھل ہے جو پورے کا پورا کھایا جا سکتا ہے نہ اس کا چھلکا اتارنا پڑتا ہے اور نہ اس میں گٹھلی یا بیج ہوتے ہیں اور اگر بیج ہوتے ہیں تو صرف بڑے سائز کے انگور میں جس سے منقی بنتا ہے۔ یہ بیج بھی اگر کوئی شخص کھا لے تو کچھ حرج نہیں۔ اور نرم اتنا کہ منہ میں ڈالتے ہی گھل جاتا ہے۔ شیریں بھی ہوتا ہے اور مزیدار بھی۔

وَّكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿٣٣﴾ وَّكَأْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذّٰبًا ﴿٣٥﴾ جَزَآءً مِّن رَّبِّكَ
عَطَآءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾
يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾

نوجوان[٢٢] اور ہم عمر عورتیں (٣٣) اور چھلکتے ہوئے جام (٣٤) وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ[٢٣] (٣٥) یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے بدلہ ہے جو اپنے اپنے اعمال کے حساب سے ملے گا۔ (٣٦)

جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب چیزوں کا مالک ہے۔ بڑا مہربان ہے (اس دن) اس سے کوئی بات تک[٢٤] نہ کر سکے گا (٣٧) جس دن جبرئیل اور باقی سب فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ رحمٰن سے وہی بات کر سکے گا جسے وہ خود اجازت دے اور جو درست[٢٥] بات کہے (٣٨)

[٢٢] کواعب کا لغوی مفہوم۔ کَوَاعِب۔ کعب بمعنی ٹخنہ، پھر جو کوئی ابھار ٹخنہ کی مانند ہو اس پر بھی کعب کا اطلاق ہوتا ہے۔ کعبت الجاریۃ بمعنی لڑکی کے پستان ابھر آئے اور بڑے ہوئے اور کعب بمعنی عورت کے ابھرے ہوئے پستان اور کاعب اور کاعبہ اس نوجوان عورت کو کہتے ہیں جس کے پستان ابھر آئے ہوں اور اس کی جمع کواعب آتی ہے۔ یعنی اہل جنت کو باغات اور انگوروں کے علاوہ نوخیز عورتیں بھی ملیں گی جو ہم عمر ہوں گی۔ ہم عمر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ آپس میں ہم عمر ہوں گی اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے جنت کے خاوندوں کی بھی ہم عمر ہوں گی۔ یعنی ان کے خاوندوں کو بھی جوان بنا کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

[٢٣] اگر کسی سے پوچھا جائے کہ آیا تم نے جھوٹ بولا تھا تو وہ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ گویا انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو کسی ضرورت کے تحت بولتا ہے۔ یہ ضرورت خواہ کسی فائدہ کا حصول ہو یا کسی مصیبت یا تکلیف سے بچنا مقصود ہو۔ انہیں دو باتوں کے لیے وہ جھوٹ بولتا، ایک دوسرے سے الجھتا، لڑائی جھگڑا کرتا اور بیہودہ باتیں کرتا ہے۔ لیکن جنت میں نہ تو کوئی تکلیف پہنچنے کا امکان ہوگا نہ کسی فائدہ کا حصول مطلوب ہوگا کیونکہ ہر طرح کی نعمتیں تو انہیں پہلے ہی سے میسر ہوں گی۔ لہٰذا جنت میں جھوٹ، چغلی، غیبت اور دوسری بیہودہ باتوں کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

[٢٤] یعنی اللہ تعالیٰ کی اہل جنت کو جود و عطا کا تو وہ حال ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے جلال، رعب اور دبدبے کا یہ حال ہوگا کہ جب تمام مخلوق قیامت کی ہولناکیوں سے گھبراہٹ میں مبتلا ہوگی تو کسی کو یہ ہمت نہیں پڑے گی کہ وہ مخلوق خدا پر اللہ تعالیٰ سے رحم کے لیے سفارش کر سکے اور ہر شخص نفسی نفسی پکار رہا ہوگا۔ حتیٰ کہ انبیاء بھی رب سلم وسلم پکار رہے ہوں گے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کے لیے قرعۂ فال رسول اللہ ﷺ کے نام پر پڑے گا اور آپ ﷺ اللہ کے حضور سب کے لیے سفارش کریں گے۔ اس مضمون کی طویل اور مفصل حدیث سورہ بقرہ کی آیت نمبر ٢٥٥ کے تحت گزر چکی ہے۔

[٢٥] وقال صوابا کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ سفارش کرنے والا ایسے شخص کے حق میں ہی سفارش کر سکے گا جس نے دنیا میں درست بات کہی ہوگی اور درست بات سے مراد کلمہ توحید یعنی لا الہ الا اللہ ہے۔ یعنی سفارش ایسے گنہگار کے حق میں تو کی جا سکے گی جو توحید پر قائم اور اللہ کا فرمانبردار رہا ہو۔ مگر کسی مشرک یا اللہ کے باغی کے حق میں سفارش نہ کی جا سکے گی اور دوسرے

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝

یہ وہ دن ہے جو ایک حقیقت ہے۔ اب جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف واپس جانے کی راہ اختیار[۲۶] کرے (۳۹) ہم نے تمہیں اس عذاب سے ڈرایا ہے جو قریب آ پہنچا ہے۔ اس دن آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور کافر کہے گا: کاش میں مٹی[۲۷] ہوتا۔ (۴۰)

مطلب کے لحاظ سے یہ دونوں صفات سفارش کرنے والے کی ہیں۔ یعنی سفارش وہی شخص کر سکے گا جسے اللہ کی طرف سے اجازت ملے گی اور سفارش کرتے وقت وہ درست بات ہی کرے گا جو اللہ کی رضا کے مطابق ہو گی یعنی اللہ تعالیٰ اس گنہگار کے جس جرم کے متعلق سفارش قبول کرنا چاہے گا، سفارش کرنے والا صرف وہی سفارش کرے گا۔

[۲۶] یعنی مرنے کے بعد اور قیامت کے دن جو جو حالات پیش آنے والے ہیں وہ کھول کر بیان کیے جا رہے ہیں ان کی رو سے دو راہیں انسان کے سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان جوابدہی کے تصور سے محتاط اور ذمہ دارانہ زندگی اختیار کرے۔ دوسری یہ کہ وہ آنے والے حالات سے آنکھیں بند کر کے دنیا کی زندگی ہی پر مست و شیدا رہے۔ اب انسان کو اختیار ہے کہ جونسی راہ وہ پسند کرتا ہے اختیار کرے۔

[۲۷] اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ میں پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد مٹی میں مل کر مٹی ہی بنا رہتا۔ مجھے دوبارہ زندگی نہ عطا کی جاتی اور نہ یہ سختی کا دن دیکھنا پڑتا۔ تیسرا مطلب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے ماخوذ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن جانور، چرند اور پرند سب کا حشر ہو گا حتیٰ کہ سینگ والی بکری کا بدلہ بے سینگ بکری سے لیا جائے گا جس نے دنیا میں اسے مارا ہو گا۔ (مسلم کتاب البر والصلہ - باب تحریم الظلم) پھر ان سے کہا جائے گا کہ اب تم خاک بن جاؤ۔ اس وقت کافر آرزو کرے گا کہ کاش میں بھی ان جانوروں کی طرح خاک بن جاتا۔

۴۶ آیاتہا سُوْرَۃُ النّٰزِعٰتِ مَکِّیَّۃٌ رکوعہا ۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ
اَمْرًا ﴿۵﴾ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ ۙ﴿۶﴾ تَتْبَعُہَا الرَّادِفَۃُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ۙ﴿۸﴾ اَبْصَارُہَا

کلمات ۱۸۱ آیات ۴۶ (۷۹) سورۃ النازعات مکی ہے (۸۱) رکوع ۲ حروف ۷۵۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

(جسم میں) غرق ہو کر (جان) کھینچ لینے والے (فرشتوں) کی قسم [۱] (۱) اور ان کی جو بند بند کھولنے والے [۲] ہیں (۲) اور ان کی جو (کائنات میں) تیزی سے تیرتے [۳] پھرتے ہیں (۳) پھر دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے [۴] والوں کی (۴) پھر ان کی جو کسی حکم کی تدبیر [۵] کرنے والے ہیں (۵) جس دن کانپنے والی [۶] (زمین) کانپنے لگے گی (۶) اور اس کے بعد زلزلے کا ایک اور [۷] جھٹکا آپڑے گا (۷) دل اس دن کانپ رہے ہوں گے (۸)

[۱] یعنی ان فرشتوں کی قسم جو موت کے وقت میت کے ایک ایک رگ و ریشہ میں ڈوب کر وہاں سے اس کی روح کو کھینچ لاتے ہیں۔ واضح رہے کہ نزع کا لغوی معنی کسی چیز کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنا ہے۔

[۲] ❁ نشط کا لغوی مفہوم:۔ نشط لغت اضداد سے ہے نشط الحبل بمعنی رسی کو گرہ لگائی۔ اور نَشَطَ الْعُقْدَۃَ بمعنی گرہ کو مضبوط کیا اور اَلنُّشُوْطُ بمعنی آسانی سے کھل جانے والی گرہ۔ گویا نشط کا معنی گرہ لگانا بھی ہے اور گرہ کھولنا بھی۔ یعنی اللہ نے جب انسان کو بنایا یا پیدا کیا تو ایک ایک جوڑ اور بند کو مضبوط کیا تھا۔ موت کے وقت فرشتے انہیں جوڑوں کے بند کھول کر انہیں ڈھیلا کر دیں گے۔

[۳] سَبَحَ بمعنی کسی چیز کا پانی یا ہوا میں تیرنا اور تیز رفتاری سے گزر جانا۔ اور سبّاح بمعنی ماہر تیراک۔ یعنی وہ فرشتہ جو روح کو نکال کر زمین سے آسمان کی طرف اس قدر سرعت و سہولت سے چلتے ہیں گویا بے روک ٹوک ہوا میں تیرتے جا رہے ہیں۔

[۴] پھر ان ارواح کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے جیسا حکم صادر ہوتا ہے اس کی بجا آوری کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

[۵] پھر ارواح کے متعلق فرشتوں کو جو حکم ملتا ہے خواہ وہ حکم ثواب کا ہو یا عذاب کا۔ اس پر فوراً عمل درآمد کی تدبیر کرتے ہیں۔ اور اگر الفاظ کی عمومیت کا لحاظ رکھا جائے تو ان سے مراد وہ تمام فرشتے ہیں جو تدبیر امور کائنات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔

[۶] مذکورہ بالا پانچ قسم کے فرشتوں اور ان کے کارناموں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ پر روز آخرت کے قیام پر حجت قائم فرمائی کہ جو فرشتے تمہاری رگ رگ سے روح نکال کر تمہیں موت سے دوچار کرتے ہیں اور تمہاری روح کو اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں وہ کسی وقت یہی روح تمہارے جسم میں داخل بھی کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ کفار مکہ فرشتوں کی ہستی اور ان کے

خَاشِعَةٌ ﴿٩﴾ يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿١٠﴾ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿١١﴾ قَالُوا تِلْكَ إِذًا
كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿١٢﴾ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ﴿١٣﴾ فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ ﴿١٤﴾ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ﴿١٥﴾

اور ان کی آنکھیں سہمی ہوئی ہوں گی (۹) وہ (کفار مکہ) کہتے ہیں: کیا ہم پہلی حالت میں [۸] لوٹائے جائیں گے؟ (۱۰)
جبکہ ہم بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے (۱۱) کہتے ہیں: یہ واپسی تو [۹] بڑے گھاٹے کی بات ہو گی (۱۲) وہ بس ایک گرج
دار آواز ہی ہو گی (۱۳) پھر وہ یکدم ایک میدان میں آموجود ہوں [۱۰] گے (۱۴) کیا آپ کو موسیٰ کی خبر پہنچی [۱۱] ہے؟ (۱۵)

کارناموں کے قائل تھے۔ ان کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ فلہٰذا انہیں بھی تدبیر امور کائنات میں اللہ کا شریک سمجھتے تھے۔ اگرچہ مختار کل اللہ ہی کو سمجھتے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے فرشتے نہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور نہ اللہ کے شریک، بلکہ وہ اللہ کی مخلوق اور اس کے فرمانبردار بندے ہیں اور وہ اللہ کے حکم سے سرتابی کر ہی نہیں سکتے۔ تدبیر امور میں ان کے لیے اپنے اختیار کو ذرہ بھر بھی عمل دخل نہیں۔

[۷] آیت نمبر ۶ اور نمبر ۷ کے دو مطلب بیان کیے گیے ہیں۔ ایک یہ کہ نفخۂ صور اول کے وقت زمین کانپنے لگے گی۔ پھر اسے لگاتار زلزلہ کے مزید جھٹکے پڑنے لگیں گے۔ دوسرا یہ کہ رادفۃ سے زلزلہ کے بجائے نفخۂ صور مراد لیا جائے۔ یعنی پہلے نفخۂ صور کے نتیجہ میں زمین کانپنے لگے گی پھر اس کے بعد جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو تمام مرے ہوئے لوگ زندہ ہو کر قبروں سے باہر نکل آئیں گے۔

[۸] ❁ حافرۃ کا لغوی معنی:۔ الحَافِرَۃ: حفر بمعنی گڑھا کھودنا اور حفرۃ بمعنی گڑھا بھی اور قبر بھی۔ اور حافرۃ بمعنی کھودی ہوئی زمین بھی اور ابتدائی حالت بھی اور رد فی الحافرۃ بطور محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی جہاں سے چلا تھا وہیں واپس جانے والا۔ بقول شاعر: پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا، یعنی کفار مکہ یہ کہتے تھے کہ ہم قبر کے گڑھے میں پہنچ کر کیا پھر الٹے پاؤں زندگی کی طرف واپس کیے جائیں گے؟ ہماری گلی سڑی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑ جائے، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

[۹] قرآن میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ جو لوگ قیامت پر یقین نہیں رکھتے وہ اس دن بڑے خسارے میں رہیں گے۔ کافر ایسی ہی آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے اگر واقعی ہمیں دوبارہ زندہ کیا گیا تو پھر تو ہم مارے گئے اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ہمیں دوبارہ زندہ کر کے اس دنیا میں بھیجا گیا تو ہماری زمین اور مکانوں کے تو کئی وارث بن چکے ہوں گے۔ ایک ایک جائداد کے کئی مدعی ہوں گے اور جھگڑے ہی پڑے رہیں گے اس لحاظ سے تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہو گا۔

[۱۰] یعنی جس کام کو یہ کافر خلاف عقل اور ناممکن العمل سمجھ رہے ہیں۔ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب دوسری مرتبہ صور پھونکا یا ڈانٹ پلائی جائے گی تو اس وقت سب اگلے پچھلے لوگ بلا توقف میدان حشر کی طرف اکٹھے ہونا شروع ہو جائیں گے۔

[۱۱] ❁ قصہ موسیٰؑ و فرعون:۔ قیامت کے ذکر میں فرعون کا ذکر آپ ﷺ کو تسلی دینے کے خاطر لایا گیا ہے۔ یعنی یہ مکہ کے کافر تو فرعون کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ مصر کے بہت سے علاقہ کا واحد حکمران انتہائی مغرور اور سرکش بادشاہ تھا۔ اس نے بھی جب ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ ان کی دعوت کو تسلیم کرنے کی بجائے اکڑ بیٹھا تو ہم نے اسے اور اس کی آل کو سمندر میں غرق کر دیا تھا۔ اور اب یہ کفار بھی اگر فرعون جیسا ہی کردار ادا کریں گے تو یہ اللہ کی گرفت سے کیونکر بچ سکیں گے؟

إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿١٧﴾ فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ ﴿١٨﴾ وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ ﴿١٩﴾ فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ﴿٢٠﴾ فَكَذَّبَ وَ

جب طویٰ کی مقدس وادی میں انہیں ان کے پروردگار [۱۲] نے پکارا تھا (۱۶) کہ فرعون کے پاس جاؤ [۱۳]، وہ سرکش ہو گیا ہے (۱۷) پھر اسے کہو: کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے؟ (۱۸) اور میں تجھے تیرے پروردگار کی راہ دکھاؤں [۱۴] اور تو ڈر جائے؟ (۱۹) چنانچہ موسیٰ [۱۵] نے اسے بہت بڑی نشانی دکھائی (۲۰)

[۱۲] ❁ نبوت سے سرفرازی:۔ یہ مقدس وادی، جس کا نام طویٰ ہے، کوہ طور کے دامن میں واقع ہے۔ مدین سے مصر یا مصر سے مدین جاتے ہوئے راستہ میں پڑتی ہے۔ اسی مقام پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا دو دفعہ شرف حاصل ہوا تھا۔ پہلی دفعہ جب وہ اپنے اہل و عیال سمیت مصر جا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیے کہ آپ اس وادی میں آگ دیکھ کر وہاں پہنچ گئے اسی مقام پر اور اسی موقع پر آپ کو منصب نبوت سے نوازا گیا تھا۔ اور دوسری دفعہ جب تورات لینے کی غرض سے وہاں گئے تھے۔

[۱۳] ❁ فرعون کے پاس جانے کا حکم:۔ نبوت عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر جو ذمہ داری لگائی وہ آپ کے لیے بڑی کڑی آزمائش تھی۔ آپ کے ہاتھ سے اتفاقاً ایک قبطی کی موت واقع ہو گئی تھی ایک خیر خواہ کی اطلاع پر کہ آپ کے قتل کے مشورے فرعونی پارلیمنٹ میں ہو رہے ہیں آپ عارضی طور پر مدین کی جانب چلے گئے اس وجہ سے فرعون کی حکومت آپ کو مجرم سمجھتی تھی۔ آپ کا نام ریکارڈ پر موجود تھا۔ علاوہ ازیں فرعون ایک انتہائی مغرور اور سرکش حکمران تھا جسے اس قسم کا پیغام پہنچانا بذات خود جان جوکھوں کا کام تھا۔ ان خطرات کا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے دوران اظہار بھی کیا تھا اور یہ ایک طویل قصہ ہے جس کا ذکر پہلے متعدد مقامات پر گزر چکا ہے۔ یہاں ایسی سب باتوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

[۱۴] ❁ فرعون کو اللہ کا پیغام پہنچانا:۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسی مقام پر ایک استدعا بھی کی تھی کہ میرے بھائی ہارون کو بھی نبوت عطا کر کے میرے ہمراہ روانہ کیا جائے تاکہ کم از کم میرا ایک ساتھی تو میرا مددگار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی یہ استدعا قبول فرمائی اور سیدنا ہارون کو نبی بنا کر آپ کے ہمراہ کر دیا مگر ساتھ ہی یہ تاکید کر دی کہ فرعون چونکہ متکبر اور بددماغ ہے لہٰذا اس سے جو بات کہنی ہو نہایت نرم لہجے میں کہنا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ وہ آپ کی بات سننے پر آمادہ ہو جائے ورنہ وہ جوش غضب میں بھڑک اٹھے گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت نرم اور دل نشین انداز میں اسے سمجھایا کہ کیا تمہارے لیے یہ ممکن ہے کہ تم اس تکبر اور سرکشی کے رویہ سے باز آ کر اللہ کے فرمانبردار بن جاؤ۔ اس طرح تمہاری یہ دنیا کی زندگی بھی سنور جائے گی اور آخرت بھی سنور جائے گی اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میری رسالت کو تسلیم کر لو۔ میں تمہیں تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ بتا دوں گا۔ اگر تمہیں اپنے پروردگار کی صحیح معرفت حاصل ہو گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ تم میں اللہ کی خشیت اور خوف پیدا ہو جائے گا اور جو کام بھی کرو گے اللہ سے ڈرتے ہوئے کرو گے اور یہ چیز تمہاری زندگی کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہو گا۔

[۱۵] ❁ فرعون کا معجزہ کا مطالبہ:۔ اس انتہائی نرم گفتگو کے باوجود اور بات کو سمجھ جانے کے باوجود فرعون اپنے اقتدار اور متکبرانہ روش

وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ
نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ربع

مگر اس نے اسے جھٹلا دیا اور بات نہ مانی (۲۱) پھر لوٹ گیا اور تدبیریں [۱۶] کرنے لگا (۲۲)
اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور پکارا (۲۳) کہنے لگا! ''میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب [۱۷] ہوں'' (۲۴)
چنانچہ اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا (۲۵) اس واقعہ میں سامانِ عبرت [۱۸] ہے اس شخص کے لیے جو (اللہ کی گرفت سے) ڈرتا ہے (۲۶) کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل کام ہے یا آسمان کو؟

سے دستبردار ہونے کے لیے قطعاً تیار نہ ہوا اور پوچھنے لگا کہ تم اپنے اس دعویٰ رسالت کی تائید میں اللہ کی طرف سے کوئی نشانی بھی پیش کر سکتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا اور بھرے دربار میں اپنا عصا جو زمین پر پھینکا تو وہ ایک اژدھا بن گیا جس سے فرعون اور سب درباری سخت مرعوب اور دہشت زدہ ہو گئے۔ بالآخر فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ وہ جلد از جلد اس اژدھا کو سنبھال لیں۔ چنانچہ آپ نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا تو وہ پھر سے وہی پہلے والا عصا بن گیا۔

[۱۶] ❁ **فرعون کی سرکشی:۔** فرعون اور درباریوں کو یہ معجزہ دیکھ کر یقین تو آ چکا تھا کہ موسیٰ (علیہ السلام) واقعی اللہ کا رسول ہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ یہ بات تسلیم کر لینے سے ان سب کو اپنے اپنے اقتدار اور مناصب سے دستبردار ہو کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا مطیع فرمان بننا پڑتا تھا اور یہ بات ان کے لیے موت تھی۔ لہٰذا انہوں نے عوام الناس کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ معجزہ نہیں بلکہ جادو کا کرشمہ ہے۔ اپنے اس جھوٹ کو سچا بنانے کے لیے انہوں نے یہ چال چلی کہ ملک بھر کے ماہر جادوگروں کا برسرِ عام موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کروا دیا جائے۔ فرعون نے جادوگروں کو لالچ بھی بہت دیا۔ مگر جب جادوگروں نے میدان مقابلہ میں ہار کر بھرے مجمع میں یہ اعلان کر دیا کہ یہ جادو کا کرشمہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزہ ہے اور ہم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے رب پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے فرعون اور اس کے درباریوں کی بھرے مجمع میں خوب رسوائی ہوئی۔

[۱۷] ❁ **فرعون کا رعایا میں پروپیگنڈا:۔** میدان مقابلہ میں مات کھانے کے بعد بہت سے لوگ درپردہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے لگے تو فرعون بہت سیخ پا ہو گیا۔ اس نے ایک دوسرا پینترا بدلا اور لوگوں سے کہنے لگا تم لوگ میرے مقابلہ میں اس شخص کی پیروی کرنے لگے ہو جو میرے مقابلہ میں ایک کمزور اور حقیر انسان ہے جبکہ میں تمہارا سب سے بڑا حکمران ہوں۔ تمہارے تمام وسائل معاش بھی میرے ہاتھ میں ہیں۔ فرعون نے اپنے آپ کو ان معنوں میں رب الاعلیٰ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خالق کائنات سمجھتا تھا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو کائنات کا خالق و مالک سمجھتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو لوگوں کا معبود بھی نہیں کہتا تھا بلکہ وہ تو خود سورج دیوتا کی پرستش کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ملک میں سب سے بڑا سیاسی اقتدار کا مالک اور حکمران سمجھتا تھا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ اس ملک میں سب سے بڑا سیاسی مقتدرِ اعلیٰ میں ہوں۔ میرے بغیر یہاں کسی دوسرے کا قانون یا حکم نہیں چل سکتا۔

[۱۸] یعنی جس طرح فرعون نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی۔ وہی کچھ تم کر رہے ہو۔ اس کا انجام دیکھ لو۔ اور اس واقعہ سے عبرت

بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ

ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَ الْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

جسے اس نے[19] بنایا(۲۷) اس کی چھت[20] کو بلند کیا پھر اس میں توازن قائم کیا(۲۸) اور اس کی رات کو تاریک[21] کر دیا اور دن کو دھوپ نکالی(۲۹) اور اس کے بعد زمین کو بچھا دیا[22](۳۰) جس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا(۳۱) اور پہاڑوں کو خوب جما دیا(۳۲) یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چوپایوں[23] کے لیے سامان زندگی ہے(۳۳)

حاصل کرو کہ تمہیں بھی کہیں ایسے ہی انجام سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

[19] مختصر طور پر قصہ فرعون بیان کرنے کے بعد اب پھر اصل مضمون یعنی عقیدۂ آخرت کی طرف رجوع کرتے ہوئے کافروں سے سوال کیا جا رہا ہے کہ کیا اس کائنات کو وجود میں لانا زیادہ مشکل کام ہے یا تمہیں پہلی بار یا دوسری بار پیدا کرنا؟ یہاں لفظ سماء استعمال ہوا ہے جس سے مراد آسمان بھی ہو سکتا ہے اور تمام عالم بالا بھی۔

[20] ❁ آسمانوں کی تخلیق اور انہیں ہموار کرنا:۔ سَمْكٌ :سَمَكَ بمعنی بلند کرنا، موٹا اور دبیز کرنا اور بمعنی چھت یا چھت کی موٹائی نیز ہر اونچی اور موٹی چیز کا قد و قامت، اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آسمان محض حد نگاہ کا نام نہیں جیسا کہ موجودہ ہیئت دانوں کا خیال ہے۔ بلکہ آسمان ایک ٹھوس اور موٹی یا دبیز چیز ہے جس میں دروازے بھی ہیں اور آسمان کی اونچائی زمین کے ہر مقام سے یکساں ہے۔ کیونکہ اس کی نچلی اور اوپر کی دونوں سطحوں کو ہموار بنا دیا گیا ہے۔

[21] ❁ لیل و نہار:۔ یعنی اس آسمان میں سورج پیدا کیا ہے۔ جب تک وہ اہل زمین کے سامنے رہتا ہے تو یہ ان کے لیے دھوپ کا وقت اور دن ہوتا ہے اور جب وہ غروب ہو جاتا ہے اور چھپا رہتا ہے تو یہ ان کے لیے رات کا وقت ہوتا ہے۔

[22] ❁ دَحٰی کا معنی اور زمین کا گول ہونا:۔ دحیٰ اور طحی دونوں ہم معنی بلکہ ایک ہی لفظ ہے۔ صرف مختلف علاقوں کے الگ الگ تلفظ کی وجہ سے یہ دو لفظ بن گئے ہیں۔ قرآن میں یہ دونوں الفاظ صرف ایک ایک بار ہی استعمال ہوئے ہیں اور ایک ہی معنی میں آئے ہیں۔ کہتے ہیں دحی المطر الحصٰی یعنی بارش کنکریوں کو دور دور تک بہا کر لے گئی۔ گویا ان دونوں الفاظ کا معنی دور دور تک بچھا دینا یا پھیلا دینا ہے نیز دحیٰ کے مفہوم میں گولائی کا تصور پایا جاتا ہے۔ دحوۃ شتر مرغ کے انڈہ کو کہتے ہیں۔ اس سے بعض لوگوں نے زمین کے گول ہونے پر استدلال کیا ہے۔

[23] پہاڑوں کے فوائد کا ذکر قرآن میں بہت سے مقامات پر مذکور ہوا ہے۔ یہاں سورج اور پہاڑوں کا ذکر اس مناسبت سے ہے کہ بارش کے نزول میں یہ دونوں چیزیں اسباب ہیں۔ سورج کی حرارت سے سطح سمندر کے آبی بخارات اٹھتے ہیں جو پہاڑوں سے ٹکرا کر اور ٹھنڈے ہو کر برسنے لگتے ہیں۔ اسی بارش سے نباتات اور چارہ اور غلے پیدا ہوتے ہیں۔ غلے انسانوں کی غذا کے کام آتے ہیں اور گھاس اور چارہ ہمارے مویشیوں کی غذا کا کام دیتا ہے۔

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ
لِمَن يَرَىٰ ﴿٣٦﴾ فَأَمَّا مَن طَغَىٰ ﴿٣٧﴾ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿٣٩﴾ وَأَمَّا
مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾ يَسْأَلُونَكَ

پھر جب وہ عظیم آفت [۲۴] آ جائے گی (۳۴) تو اس دن انسان یاد کرے گا جو کچھ اس نے [۲۵] کوشش کی ہو گی (۳۵) اور جہنم کو ہر دیکھنے والے کے سامنے لایا [۲۶] جائے گا (۳۶)

سو جس نے سرکشی کی (۳۷) اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی (۳۸) تو جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہو گا (۳۹) لیکن جو اپنے پروردگار کے حضور (جوابدہی کے لیے) کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اپنے آپ کو خواہش نفس سے روکے رکھا (۴۰) تو جنت [۲۷] ہی اس کا ٹھکانا ہو گا (۴۱)

[۲۴] الطامۃ: الطمّ بمعنی پانی سے بھرا ہوا اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور الطامۃ ایسی آفت جو دوسری تمام مصیبتوں پر حاوی ہو جائے۔ اور الکبریٰ کا لفظ اس بڑی آفت کو مزید نمایاں کرنے کے لیے تاکید کے طور پر آیا ہے اور اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

[۲۵] اس بڑی مصیبت کا اصل مقصد سب کو معلوم ہو گا کہ آج کا دن لوگوں کے حساب کتاب کا دن ہے۔ اور ہر انسان کو اپنا اعمال نامہ دیکھنے سے پہلے ہی وہ تمام کام یاد آنے لگیں گے جو اس نے اپنی دنیا کی زندگی میں سرانجام دیے تھے، خواہ وہ کام اچھے تھے یا برے تھے۔

[۲۶] بُرِّزَت: بَرَزَ بمعنی کسی چیز کا نکل کر کھلے میدان میں آ جانا۔ سامنے آنا۔ گم نامی اور پوشیدگی کے بعد ظاہر ہونا۔ اور برز کے معنی فضا اور کھلا میدان اور دعوت مبارزت بمعنی کسی شخص کا میدان جنگ میں آگے بڑھ کر دشمن کے کسی آدمی کو مقابلہ کے لیے للکارنا ہے اور برز بمعنی کسی چھپی ہوئی چیز کو نکال کر سامنے کھلے میدان میں لے آنا۔ یعنی اس دن جہنم کو سب لوگوں کے سامنے لے آیا جائے گا خواہ وہ نیک لوگ ہوں یا بدکردار۔ اسی مضمون کو ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا: ﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ (۱۹:۷۱) یعنی تم میں سے ہر شخص جہنم پر پہنچنے والا ہے۔

[۲۷] یعنی اس دن ساری مخلوق دو گروہوں میں بٹ جائے گی۔ ایک وہ جو آخرت کے منکر تھے انہیں اللہ کے سامنے پیش ہونے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کا نہ کوئی تصور تھا اور نہ خطرہ تھا۔ لہٰذا وہ دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ کر اس پر فریفتہ رہے اور آخرت سے بالکل بے فکر بنے رہے ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ وہ جب جہنم پر پہنچیں گے تو فوراً اس میں داخل کر دیے جائیں گے۔ دوسرے وہ جنہیں آخرت میں اپنے اعمال کی جوابدہی کا ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے اخروی مفاد کی خاطر ہر وقت اپنے نفس کی خواہشات کو دبائے رکھا اور اللہ سے ڈرتے ہوئے نہایت محتاط اور ذمہ دارانہ زندگی گزاری ہو گی۔ ایسے ہی لوگ جنت کے حق دار قرار پائیں گے اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کیا جائے گا۔

[۲۸] ان کافروں نے بھی عجیب مذاق بنا رکھا ہے کہ اکثر آپ سے یہی سوال پوچھتے رہتے ہیں کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ حالانکہ یہ بات آپ ﷺ کے احاطہ علم سے باہر ہے۔ یہ لوگ جتنا بھی اس سوال کے پیچھے پڑیں اور اس سلسلہ میں آپ ﷺ کو

عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ۝ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ۝ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ۝

یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی (۴۲) آپ کو اس کے ذکر (وقت بتانے) سے کیا واسطہ؟ (۴۳) اس کا علم تو آپ کے پروردگار پر ختم[۲۸] ہوتا ہے (۴۴) آپ تو صرف ایک ڈرانے والے ہیں، اس شخص کو جو اس سے ڈر جائے (۴۵) جب وہ اسے دیکھیں گے تو انہیں ایسا معلوم[۲۹] ہوگا کہ گویا وہ (دنیا میں) بس ایک پچھلا یا پہلا پہر ٹھہرے تھے۔ (۴۶)

پریشان کریں بالآخر اس کا یہی جواب سامنے آئے گا کہ اس بات کا علم صرف اللہ کو ہے اور اس بات کا جاننا عملی لحاظ سے کچھ مفید بھی نہیں۔ مثلاً ہر شخص کا یہ تصور ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے فلاں کام کر جانا چاہیے۔ حالانکہ اپنی موت کا علم اللہ کے سوا کسی کو بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا قیامت کے عقیدہ کا عملی پہلو یہی ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی میں جو دارالامتحان ہے ایسے کام کر جائے جو اس کے لیے مفید ثابت ہوں۔

[۲۹] گزشتہ واقعات کے متعلق انسان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ بیسیوں سال پہلے گزرے ہوئے واقعہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ کل کی بات ہے۔ یہ اس عالم دنیا کا حال ہے جس میں لیل و نہار کی گردش اسے نظر آتی ہے اور ماہ و سال کا وہ حساب لگا سکتا ہے لیکن عالم برزخ میں تو یہ دن رات بھی نہیں ہوں گے جیسے اصحاب کہف پر تین سو سال گزرنے کے بعد وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ وہ اس غار میں پورا دن سوئے رہے ہیں یا دن کا کچھ حصہ۔ بالکل یہی صورت حال قیامت کے دن لوگوں کو پیش آئے گی اور کافر قیامت کا دن دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ ان کی دنیا کی زندگی تو پورا ایک دن بھی نہ تھی۔ کاش یہ تھوڑی سی مدت ہم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہی گزار کر یہاں آتے۔

سُوْرَۃُ عَبَسَ مَکِّیَّۃٌ
٤٢ آیاتہا رکوعہا ١

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۝۱ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ۝۲ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی ۝۳ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ

کلمات ۱۳۳ آیات ۴۲ (۸۰) سورۃ عبس مکی ہے (۲۴) رکوع ۱ حروف ۵۵۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

وہ (پیغمبر) ترش رو[1] ہوئے اور بے رخی کی (۱) کہ ان کے پاس ایک اندھا[2] آیا (۲) اور آپ کو کیا معلوم شاید وہ سنور جاتا (۳) اور نصیحت قبول کرتا تو نصیحت

[1] ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چند قریشی سردار بیٹھے تھے اور آپ ﷺ انہیں اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ روایات میں ان کے نام عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ بن خلف اور ابی بن خلف ملتے ہیں۔ یہ لوگ بعد میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بدترین دشمن ثابت ہوئے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ جب قریشی سردار اسلام دشمنی کی حد تک نہیں پہنچے تھے۔ اسی دوران سیدنا عبداللہ بن ام مکتوم آپ کے پاس تشریف لائے۔ یہ عبداللہ بن ام مکتوم نابینا تھے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور ابتدائی اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے آتے ہی رسول اللہ ﷺ سے کسی آیت کا مطلب پوچھا۔ اور جو لوگ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھے تھے انہیں آپ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ رسول اللہ کو ناگوار محسوس ہوا۔ اور اس ناگواری کے اثرات آپ ﷺ کے چہرہ پر بھی نمودار ہوگئے۔ آپ ﷺ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور انہیں خاموش کرا دیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مطمئن تھے کہ وہ خالص مومن ہیں انہیں بعد میں سمجھا لیں گے سردست اگر ان سرداروں میں سے کوئی ایک بھی اسلام کے قریب آ گیا تو اس سے اسلام کو خاصی تقویت پہنچ سکتی ہے اسی وجہ سے آپ قریشی سرداروں سے ہی محو گفتگو رہے۔ اس وقت یہ سورت نازل ہوئی جسے امام ترمذی نے مختصراً یوں ذکر کیا ہے:

۞ عبداللہ بن ام مکتوم اور راہ ہدایت کی جستجو' طلب صادق:۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سورت کی ابتدائی آیات عبداللہ بن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوئیں۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور یہ کہتے رہے کہ یا رسول اللہ مجھے دین کی راہ بتائیے۔ اس وقت آپ کے پاس مشرکوں میں سے کوئی بڑا آدمی بیٹھا تھا۔ اور آپ ﷺ پہلے (یعنی عبداللہ) سے اعراض کرتے تھے اور دوسرے (مشرک) کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کیا میری بات میں کوئی برائی ہے اور آپ ﷺ کہتے تھے۔ نہیں۔ اس بارے میں یہ سورت نازل ہوئی۔ (ترمذی، ابواب التفسیر)

اس سورت کے انداز خطاب سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عتاب کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے حالانکہ اس عتاب کے بیشتر حصہ کا روئے سخن قریشی سرداروں کی طرف ہے۔ پھر آپ ﷺ پر جو کچھ عتاب نازل ہوا اس کا انداز بھی عجیب ہے۔ پہلی آیت میں صیغہ واحد مذکر غائب استعمال کیا گیا ہے۔ پھر تیسری آیت میں آپ ﷺ کو براہ راست مخاطب کیا گیا ہے جس سے ایک

الذِّكْرٰى ۝۴ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝۵ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝۶ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝۷ وَاَمَّا مَنْ
جَآءَكَ يَسْعٰى ۝۸ وَهُوَ يَخْشٰى ۝۹ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝۱۰ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲

اسے فائدہ دیتی[۳] (۴) مگر جو شخص بے پروائی کرتا ہے (۵) تو آپ (اس کی ہدایت کے لیے) اس کے پیچھے پڑے ہیں (۶) حالانکہ اگر وہ نہیں سنورتا تو آپ[۴] پر کوئی ذمہ داری نہیں (۷) مگر جو شخص کوشش کر کے آپ کے پاس آیا ہے (۸) اور وہ ڈرتا[۵] ہے (۹) تو آپ اس سے غفلت برتتے ہیں (۱۰) ایسا ہرگز نہیں چاہیے[۶]۔ یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے (۱۱) جو چاہے اسے یاد رکھے[۷] (۱۲)

تو کلام میں حسن پیدا ہو گیا اور دوسرے عتاب کے انداز کو انتہائی نرم کر دیا گیا ہے۔ اس عتاب میں آپ کے دعوت حق کی تبلیغ کے طریق کار پر تنقید کی گئی ہے کہ اصولاً اس دعوت کے لیے توجہ کا اولین مستحق وہ ہوتا ہے۔ جو خود بھی ہدایت کا طالب ہو۔ اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ سیدنا عبداللہ بن ام مکتوم سے بہت تعظیم و تکریم سے پیش آتے اور فرمایا کرتے "مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِيْ فِيْهِ رَبِّيْ" (خوش آمدید اس شخص کو جس کے بارے میں اللہ نے مجھ پر عتاب فرمایا) نیز آپ ﷺ نے مدنی زندگی میں کئی بار آپ کو مدینہ میں اپنا نائب اور حاکم بنایا جب آپ جہاد وغیرہ کے سلسلہ میں مدینہ سے باہر جاتے تھے۔ آپ نابینا ہونے کے باوجود جہاد میں عملاً حصہ لیا کرتے تھے۔ آپ دور فاروقی میں جنگ قادسیہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

[۲] یعنی پیغمبر نے ایک اندھے کے آنے پر چیں بجبیں ہو کر منہ پھیر لیا۔ حالانکہ آپ کو اندھے کی معذوری، شکستہ حالی اور طلب صادق کا زیادہ لحاظ رکھنا چاہیے تھا۔

[۳] یعنی یہ عین ممکن تھا کہ وہ نابینا آپ کی توجہ سے بہت زیادہ مستفید ہو جاتا کیونکہ وہ طلب صادق لے کر آیا تھا۔ پھر آپ کی نصیحت پر عمل کر کے وہ اپنے نفس کو پاکیزہ بنا لیتا۔

[۴] یعنی اس نابینا کو نظر انداز کر کے جن لوگوں سے ہدایت کا طمع رکھتے ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ آپ ﷺ کی بات بھی یوں سنتے ہیں جیسے آپ ﷺ پر بہت بڑا احسان کر رہے ہیں۔ اس بات کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے۔ ایسے لوگوں کو راہ راست پر لانا آپ ﷺ کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ آپ ان لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔

[۵] یعنی اندھا ہونے کے باوجود کوشش کر کے محض اسلام کی باتیں سمجھنے کے لیے آپ تک پہنچا ہے۔ اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا بھی نہیں تھا۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں کسی گڑھے میں نہ گر جائے یا کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑے۔ یا راہ میں اسلام دشمن لوگ اسے ستائیں تو وہ کیا کرے گا محض وہ طلب حق کی خاطر اور اللہ سے ڈرتے ہوئے آپ ﷺ تک پہنچا ہے تو آپ کو اس کی اس محنت اور طلب صادق کی قدر کرنا چاہیے تھی اور اس کی طرف پہلے متوجہ ہونا چاہیے تھا۔

[۶] یعنی قرآن کی عزت و وقعت کا انحصار ایسے مغرور اور سر پھروں کے ماننے پر نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ قرآن کی نصیحت پر عمل نہیں کرتے تو اپنا ہی نقصان کریں گے۔ قرآن کو ان کی کیا پروا ہو سکتی ہے اور نہ ہی آپ کو ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی ضرورت ہے۔

[۷] ذَكَرَهٗ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے اور یہ بھی کہ جو شخص چاہے قرآن کی نصیحت کی

فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ قُتِلَ
الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ

وہ قابلِ احترام صحیفوں میں درج ہے (۱۳) جو بلند مقام پر رکھے ہیں[۸] اور پاکیزہ ہیں (۱۴) ان کاتبوں[۹] کے ہاتھوں میں رہتے ہیں (۱۵) جو بڑے بزرگ اور نیکو کار ہیں (۱۶) لعنت ہو انسان[۱۰] پر وہ کیسا منکر حق[۱۱] ہے؟ (۱۷) اللہ نے اسے کس چیز سے پیدا کیا؟ (۱۸) نطفہ سے، اللہ نے اسے پیدا کیا پھر اس کی تقدیر مقرر[۱۲] کی (۱۹)

باتوں کا بار بار تذکرہ کرتا ہے اور یہ بھی کہ قرآن کو زبانی یاد کرلے۔ غرض قرآن کو پڑھنا، اس کی نصیحت پر عمل کرنا اور اسے زبانی یاد کرنا سب بڑے اجر و ثواب کے کام ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس کا حافظ ہے وہ (قیامت کے دن) لکھنے والے معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جو قرآن کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور پڑھنا اسے مشکل ہوتا ہے اس کے لیے دہرا اجر ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۸] یعنی قرآن کی عظمت شان کا یہ عالم ہے کہ اس کی آیات لوح محفوظ میں سات آسمانوں کے اوپر نہایت معزز، بلند مرتبہ اور صاف ستھرے صحیفوں میں مندرج ہیں اور زمین پر مخلص اور ایماندار لوگ اس کے اوراق کو نہایت عزت و احترام اور تقدیس و تطہیر کے ساتھ اونچی جگہ پر رکھتے ہیں۔

[۹] سَفَرَةٍ: سافر کی جمع ہے اور السفر اس کتاب کو کہتے ہیں جو حقائق کو بے نقاب کرتی ہو اور اسفار بمعنی تورات کی شرح و تفاسیر اور سافرہ شخص ہے جو ایسی تحریر کرتا یا لکھتا ہو اور اس لفظ کا اطلاق الہامی تحریر لکھنے والے فرشتوں اور انسانوں پر ہوتا ہے۔ نیز نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں پر بھی۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کو لکھنے والے نہایت معزز اور بزرگ فرشتے ہیں۔ اسی کے موافق وحی نازل ہوتی ہے اور یہاں بھی اوراق میں لکھنے اور جمع کرنے والے دنیا کے بزرگ ترین، پاکباز، نیکو کار اور فرشتہ سیرت انسان ہیں۔ جنہوں نے اس قرآن کو ہر قسم کی کمی بیشی یا تحریف و تبدیل سے پاک رکھا ہے۔ گویا قرآن جیسی عظیم الشان کتاب اس بات سے بدرجہا بلند ہے کہ اسے متکبر کافروں کے سامنے پیش کر کے ان سے یہ خواہش کی جائے کہ اسے شرف قبولیت عطا کرو کیونکہ قرآن ان کا محتاج نہیں وہ اس کے محتاج ہیں۔

[۱۰] اس آیت میں اگرچہ مخاطب تمام نوع انسان کو کیا گیا ہے۔ تاہم اس سے مراد انسانوں کی اکثریت یا قرآن کو جھٹلانے والے کافر ہیں۔ اور یہ قرآن کا مخصوص اور مہذبانہ انداز خطاب ہے۔ تاکہ منکرین حق ضد میں آکر مزید چڑ نہ جائیں بلکہ اصل حقائق پر غور و فکر کریں۔

[۱۱] اس کا ایک معنی تو وہی ہے جو ترجمہ سے واضح ہے یعنی وہ کس قدر زیادہ حق کا انکار کرنے والا واقع ہوا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس نے اسے کفر پر آمادہ کیا؟ آخر وہ کس بل بوتے پر اللہ کی آیات سے انکار کرتا اور اس کی ناشکری کرتا ہے؟

[۱۲] وہ اگر یہ سوچتا کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا۔ کس جگہ وہ پرورش پا کر نطفہ سے بچہ بنا پھر کس بے بسی کی حالت میں ماں کے پیٹ سے باہر نکلا تو اسے ہرگز یہ جرأت نہ ہوتی کہ وہ اپنے خالق کے منہ کو آئے اور اس کا کلام سن کر اس کا انکار کردے؟ پھر جب وہ ماں کے پیٹ میں نشو و نما پا رہا تھا تو اس کی تقدیر طے کردی گئی۔ اس کی عمر کتنی ہوگی؟ وہ کہاں مرے گا اور کہاں دفن ہوگا؟ وہ تنگدست

السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۝٢٠ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝٢١ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ ۝٢٢ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ ۝٢٣

پھر اس کیلئے راستہ آسان[۱۳] کردیا(۲۰) پھر اسے موت دی پھر اسے[۱۴] قبر میں رکھا(۲۱) پھر جب چاہے گا دوبارہ[۱۵] اٹھا کھڑا کرے گا(۲۲) ہرگز نہیں، جس بات کا اسے حکم دیا گیا تھا وہ فرض اس نے قطعاً پورا[۱۶] نہیں کیا(۲۳)

رہے گا یا خوشحال ہوگا۔ اسے ایمان میسر آئے گا یا نہیں؟ وہ کفر کی حالت میں مرے گا یا ایمان کی حالت میں۔ یہ سب تفصیلات تو رحم مادر میں ہی طے کر دی گئی تھیں اور اس مقررہ تقدیر کے آگے وہ بالکل بے بس ہے لیکن ان باتوں کے باوجود وہ اللہ کے مقابلہ میں اکڑتا اور کفر کرتا ہے۔

[۱۳] اس آیت کے کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ماں کے پیٹ سے باہر آنا اس کے لیے آسان بنادیا۔ جب رحم مادر میں بچے کی نشوونما پوری ہو چکتی ہے تو ماں اس کو اپنے پیٹ سے باہر نکالنے کے لیے بیقرار ہو جاتی ہے اور جب تک اسے جن نہ لے اسے قرار نہیں آتا۔ راستہ تنگ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ وضع حمل کے وقت اس راستہ میں اتنی لچک پیدا کر دیتا ہے کہ ماں کیلئے اس کا جننا آسان ہو جاتا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام ایسی قوتیں عطا کر دیں اور استعداد مہیا کر دی کہ وہ دنیا میں موجود وسائل واسباب سے کام لے کر اپنی زندگی گزار سکے اور تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خیر وشر کے دونوں راستے سجھا دیے۔ اس کی فطرت میں یہ تمیز رکھ دی۔ پھر انبیاء ورسل اور کتابوں کے ذریعے بھی سب کچھ سمجھا دیا اور اسے اختیار دے دیا کہ جونسی راہ وہ چاہے اختیار کر لے۔ پھر جو راہ بھی اختیار کرے اللہ تعالیٰ اسی راستے کو اس کیلئے آسان بنا دیتا ہے اور اس کی توفیق عطا فرماتا جاتا ہے۔

[۱۴] ❁ **انسان کو موت دینا اور قبر مہیا کرنا بھی اللہ کا احسان ہے:۔** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو موت دینا بھی اس کا احسان ہے اور اسے قبر مہیا کرنا بھی۔ موت کے احسان ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک بیمار بستر مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوتا ہے۔ تکلیف سے سخت بے تاب ہوتا ہے مگر اسے موت نہیں آتی۔ گھر والے اس کی مرض کی طوالت کی وجہ سے الگ پریشان ہوتے ہیں۔ بیماری پر بے بہا مصارف اٹھتے ہیں اور وہ کوئی دوسرا کام کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ اس وقت دل سے بھی دعا مانگتے ہیں کہ مرنے والے کو موت آجائے تاکہ اسے بھی تکلیف سے نجات حاصل ہو اور اس کے گھر والے بھی پریشانیوں سے نجات پا جائیں۔ نیز اگر انسان کو موت نہ آتی تو یہ زمین بنی نوع انسان کے لیے تنگ ہو جاتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا انسان کو قبر مہیا کرنا یا روئے زمین سے اس کے وجود کو غائب کر دینا بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ورنہ جہاں یہ بات میت کے لواحقین کے لیے ناقابل فراموش صدمہ ہوتا وہ مرنے کے بعد میت کے جسم میں ہونے والے تغیرات کو دیکھنا برداشت نہ کر سکتے۔ زندوں کے سامنے لاش کی بے حرمتی ان کے لیے مزید صدمہ جانکاہ بن جاتا۔ واضح رہے قبر سے مراد صرف زمینی گڑھا ہی نہیں بلکہ سمندر کی گہرائی، آگ کا الاؤ، درندوں کا پیٹ سب قبر کے حکم میں داخل ہیں۔

[۱۵] یعنی جس طرح انسان اپنے پیدا ہونے اور مرنے کے معاملہ میں بے بس تھا اسی طرح وہ دوبارہ پیدائش کے معاملہ میں بھی اللہ کے حکم کے سامنے بے بس ہوگا۔ اسے نہ پیدا ہونے کے وقت یہ پوچھا گیا تھا اگر تم پیدا ہونا چاہتے ہو تو تمہیں پیدا کر دیں ورنہ نہ کریں۔ اور نہ موت کے وقت پوچھا گیا تھا کہ اگر تم چاہو تو تمہیں موت دے دیں ورنہ زندہ رہنے دیں۔ اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے کے وقت بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ اللہ جب چاہے گا اسے زندہ کر کے کھڑا کر دے گا۔

[۱۶] اسے حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کا فرمانبردار بن کر رہے۔ یہ حکم اس کی فطرت میں بھی ودیعت کیا گیا تھا پھر اسے پیغمبروں اور

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾
فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے (۲۴) ہم نے ہی اوپر سے پانی برسایا (۲۵) پھر عجیب طرح سے زمین کو پھاڑا [۱۷] (۲۶) تو اس میں سے ہم نے اناج (بھی) اگایا (۲۷) اور انگور اور ترکاریاں (۲۸) اور زیتون اور کھجور (۲۹) اور گھنے باغات (۳۰) اور پھل اور چارہ (بھی) اگائے (۳۱)

کتابوں کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم دیا تھا۔ اگر وہ اپنے مندرجہ بالا حالات پر غور کرتا تو اس کے لیے اللہ کا فرمانبردار بن کر رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مگر اس نے ان تقاضوں کو مطلقاً پورا نہیں کیا۔ بعض مفسرین نے اس آیت کو ایک الگ مستقل آیت سمجھنے کے بجائے سابقہ آیت سے مربوط کیا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ جب چاہے گا زندہ کر کے اٹھائے گا لیکن ابھی ایسا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ابھی تک اس دنیا کی آبادی اور کائنات کی تکمیل سے متعلق اس کا جو طے شدہ حکم ہے وہ ابھی تک اس نے پورا نہیں کیا۔

[۱۷] بارش کا زمین پر اثر: یعنی انسان اگر اپنے کھانے کی چیزوں میں ہی غور کر لیتا تو اسے اپنے پروردگار کی ناشکری کی کبھی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ زمین میں سطح زمین سے تھوڑا سا نیچے بیج اتار دے۔ بس اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ خواہ انسان یہ کام زمین میں ہل چلا کر کرے یا کسی دوسرے ذریعہ سے کرے۔ زمین پر بارش برسانا اللہ کا کام ہے۔ یہی بارش کا پانی کبھی ندی نالوں، دریاؤں اور نہروں سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی چشموں اور کنووں سے۔ بہر حال وہ بارش ہی کا جمع شدہ پانی ہوتا ہے۔

زمین میں بالیدگی:۔ پانی اور زمین کی اوپر کی سطح جب مل جاتے ہیں تو ایسی مٹی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ بیج کو کھول دیتی ہے۔ اس مردہ اور بے جان بیج میں زندگی کی رمق پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کونپل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

بیج میں درخت کی خصوصیات:۔ پھر اس نرم و نازک کونپل میں، جو ہوا کے ایک معمولی سے جھونکے کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے بالیدگی کی اتنی قوت بھر دی ہے کہ وہ کونپل دو تین دن بعد اوپر سے ملی ہوئی زمین کو پھاڑ کر زمین کے اندر سے یوں باہر نکل آتی ہے جیسے بچہ ماں کے پیٹ سے باہر نکل آتا ہے۔ پھر یہی بیج آہستہ آہستہ مکمل پودا یا تناور درخت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ زمین میں بالیدگی کی استعداد نہ رکھتا یا بیج میں وہ تمام خصوصیات نہ رکھتا جو اس کے پودے یا درخت میں تھیں، یا بارش ہی نہ برساتا تو کیا انسان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی خوراک حاصل کر سکتا؟

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿٣٤﴾ وَاُمِّهٖ وَ
اَبِيْهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوْهٌ

یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان[۱۸] حیات ہے (۳۲)
پھر جب کانوں کو بہرا کر دینے والی[۱۹] آ پہنچے گی (۳۳) تو آدمی اس دن اپنے بھائی سے بھاگے گا (۳۴) اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (۳۵) اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے[۲۰] (بھی بھاگے گا) (۳۶)
اس دن ہر شخص کی ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا[۲۱] بنادے گی (۳۷)

[۱۸] ❁ ہر طرح کی نباتات اور پھل:۔ پھر ہم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ انسان کے لیے حیات بخش اشیاء اگا دیں بلکہ اس پر مزید احسان یہ کیا کہ ایسی اشیاء پیدا کیں جو حیات بخش ہونے کے ساتھ ساتھ خوشگوار لذیذ اور مزیدار بھی تھیں تاکہ انسان ایک ہی طرح کی خوراک سے اکتا نہ جائے۔ اس کے لیے طرح طرح کی سبزیاں اور ترکاریاں اگائیں۔ پھر ایسے پودے بھی اگائے جن سے انسان روغن حاصل کر سکے اور ایسے انواع واقسام کے پھل بھی جن کے کھانے سے اسے لذت وسرور بھی حاصل ہو۔ پھر اس کے لیے مویشی پیدا کیے جن سے وہ گوشت، دودھ اور کئی دوسرے فوائد حاصل کرتا ہے۔ پھر ہر پودے اور درخت سے حاصل ہونے والی غذا کا بہترین حصہ تو انسان کی خوراک بنا اور جو حصہ اس کے حساب سے ناکارہ تھا وہ اس کے مویشیوں کی خوراک کے کام آیا۔ اب دیکھیے غلوں اور درختوں کے پھلوں کے پکنے میں زمین، سمندر، سورج، ہوائیں، چاند کی چاندنی اور کئی دوسری اشیاء اپنا اپنا فریضہ ادا کرتی ہیں تو تب جا کر انسان کو کھانے کو خوراک ملتی ہے۔ اور یہ سب چیزیں اللہ کی پیدا کردہ اور اسی کے حکم کے مطابق اپنے اپنے فرائض بجا لا رہی ہیں۔ پھر بھی انسان ایسا ناشکرا واقع ہوا ہے کہ اپنے پروردگار کے منہ کو آنے لگتا ہے اور انسان اس روزی کے سلسلے میں اللہ کا اس قدر محتاج ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کچھ عرصہ کے لیے بارش برسانا ہی روک لے تو انسان اور اس کے علاوہ زمین پر بسنے والی تمام جاندار مخلوق کا عرصہ حیات تنگ ہو جائے۔

[۱۹] الصَّاخَّةُ، صخ ایسی آواز کو کہتے ہیں جو کانوں کو بہرہ کر دے۔ ایسی سخت اور کرخت آواز جس سے کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور الصاخہ سے مراد قیامت ہے اور یہ کیفیت پہلے نفخہ صور کے وقت ہوگی۔

[۲۰] ❁ انسان کا اپنے عزیز واقارب سے بھاگنا:۔ اس دن انسان کے اپنے عزیز واقارب سے بھاگنے کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر انسان سخت مصیبت میں مبتلا ہوگا وہ چاہے گا کہ اپنی امداد کے لیے اپنے عزیز واقارب کو پکارے لیکن وہ بھی اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں گے۔ انہیں یہ خطرہ ہوگا کہ ہم تو خود مصیبت میں پڑے ہیں کہیں یہ بھی ہمیں مدد کے لیے بلا نہ لے اس لیے ہر ایک دوسرے سے دور بھاگنے کی کوشش کرے گا اور دوسری وجہ بالخصوص مجرموں سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اپنے عزیز واقارب سے اس لیے دور بھاگیں گے کہ دنیا میں تو وہ گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار بنے ہوئے تھے۔ آج ایک مجرم دوسرے کو یہ الزام نہ دینے لگے کہ میری گمراہی کا سبب تو تم ہی بنے تھے۔ اس لیے ہر قریبی اپنے دوسرے قریبی سے دور دور ہی رہنے کی کوشش کرے گا۔

[۲۱] ❁ ننگے بدن حشر:۔ اس آیت کی بہترین تفسیر درج ذیل حدیث پیش کرتی ہے۔

يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا
قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

اس دن کچھ چہرے چمک دمک رہے ہوں گے (۳۸) ہنستے ہوئے خوش و خرم (۳۹) اور کچھ چہروں پر اس دن گرد پڑ رہی ہو گی (۴۰) (اور) سیاہی چھا رہی [۳۲] ہو گی (۴۱) یہ وہ لوگ ہوں گے جو کافر اور بدکردار ہیں۔ (۴۲)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگ میدانِ حشر میں ننگے سر، ننگے بدن اور بے ختنہ اکٹھے کیے جائیں گے۔ ایک عورت (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) نے پوچھا: کیا پھر وہ ایک دوسرے کے ستر نہ دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا: اے فلاں (عورت) اس دن ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہو گی جو اسے (دوسروں سے) غافل کر دے گی۔ (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

[۳۲] میدان محشر میں لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوں گے اور ان کی علامات ان کے چہروں سے نمایاں ہوں گی۔ اللہ کے فرمانبرداروں کے چہرے ہشاش بشاش کھلکھلاتے اور مسکراتے ہوئے ہوں گے۔ دل میں بھی مسرت کی لہر دوڑ رہی ہو گی اور کچھ لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔ رنگ فق اور چہرے بگڑے ہوئے اور بے رونق ہوں گے اور یہ اللہ کے نافرمان اور بدکردار لوگ ہوں گے۔ گویا لوگ گروہوں میں بٹنے سے پہلے ہی پہچانے جا سکیں گے کہ کون شخص کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۹ آیاتھا ۔۔۔ سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ ۔۔۔ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ۝۲ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝۵ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝۷ وَ

کلمات ۱۰۶ ۔۔۔ آیات ۲۹ ۔۔۔ (۸۱) سورۃ التکویر[۱] مکی ہے (۷) ۔۔۔ رکوع ۱ ۔۔۔ حروف ۴۳۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جب سورج لپیٹ[۲] لیا جائے گا(۱) اور ستارے بے نور[۳] ہو جائیں گے(۲) اور پہاڑ چلائے[۴] جائیں گے(۳) اور دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں[۵] اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی(۴) اور جنگلی جانور اکٹھے کر دیئے[۶] جائیں گے(۵) اور سمندر بھڑکائے[۷] جائیں گے(۶) اور جانیں جسموں سے ملا دی[۸] جائیں گی(۷)

[۱] سیدنا ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو یہ پسند ہو کہ وہ قیامت کو آنکھوں سے دیکھ لے تو اسے چاہیے کہ سورہ التکویر، الانفطار اور الانشقاق پڑھ لے۔ (ترمذی، ابواب التفسیر)

[۲] کوّر بمعنی کسی چیز کو عمامہ یا پگڑی کی طرح لپیٹنا اور اوپر تلے گھمانا۔ اور اس میں گولائی اور تجمع کے دونوں تصور موجود ہوتے ہیں یعنی کسی چیز کو گولائی میں لپیٹنا اور جماتے جانا۔ مطلب یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں، اس کی روشنی اور اس کی حرارت سب کچھ سمیٹ لیا جائے گا اور وہ بس ایک بے نور جسم رہ جائے گا۔

[۳] اِنْكَدَرَ: کدر بمعنی گدلا پن (ضد صفاء) اور انکدر کا معنی کسی چیز کا خود گدلا ہونا۔ رنگ میلا اور ہلکا پڑ جانا یا ماند پڑ جانا۔ یعنی ستاروں اور چاند کو جو روشنی حاصل ہے وہ انعکاس نور کے نتیجہ میں سورج یا ایسے کسی دوسرے ستارے سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر جب ان ستاروں کا باہمی ربط ختم ہو جائے گا تو ان میں چمک اور آب و تاب بھی نہ رہے گی۔

[۴] یعنی زمین کی کشش ثقل ختم ہو جائے گی تو پہاڑوں کی زمین میں جڑیں بھی ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ پہلے تو پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ بعد ازاں ان کی بھربھری ریت کو ہوا ادھر سے ادھر اڑاتی پھرے گی۔

[۵] اہل عرب کے نزدیک اونٹ ایک قیمتی متاع سمجھا جاتا تھا اور دس ماہ کی حاملہ اونٹنی تو ان کے ہاں نہایت عزیز متاع تھی اس لیے کہ وہ ایک دو ماہ بعد بچہ بھی جنے گی اور دودھ بھی دیا کرے گی۔ اس آیت میں بتایا یہ جا رہا ہے کہ قیامت کی دہشت اتنی زیادہ ہوگی کہ انسان کو اپنی قیمتی متاع سنبھالنے کا بھی ہوش نہ رہے گا۔

[۶] یہ بھی قیامت کی دہشت کا اثر ہوگا اور اس دہشت کا اثر جانوروں پر یہ ہوگا کہ مثلاً سانپ کو ڈسنے کا ہوش نہ رہے گا اور شیر کو پھاڑ کھانے کا۔ یہ سب وحشی جانور انسانوں کی آبادیوں اور شہروں کی طرف نکل آئیں گے اور اپنے بل اور کچھار وغیرہ چھوڑ دیں گے۔ ایسا منظر سیلاب کے دنوں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ لکڑیوں کے سیلاب کے پانی پر تیرتے ہوئے ایک گٹھے پر انسان بھی پناہ

وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ﴿۹﴾ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ﴿۪ۙ۱۰﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ﴿۪ۙ۱۱﴾

اور زندہ درگور لڑکی سے پوچھا[۹] جائے گا(۸) کہ وہ کس جرم میں ماری گئی تھی؟(۹) اور جب اعمال نامے کھولے[۱۰] جائیں گے(۱۰) اور آسمان کا پوست[۱۱] اتارا جائے گا(۱۱)

لیے بیٹھے ہیں اور سانپ بھی۔ سانپ انسانوں کو کچھ نہیں کہتے اور انسان سانپوں کو بس ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے۔ قیامت کے وقت بھی یہی حال ہوگا کہ کیا درندے کیا مویشی اور دوسرے جانور اور کیا انسان سب اپنے گھروں سے نکل کر میدانوں میں آاکٹھے ہوں گے اور اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے جو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جانوروں کے ایک دوسرے پر ظلم کا قصاص دلایا جائے گا حتیٰ کہ ایک سینگ والی بکری نے بے سینگ بکری کو مارا ہوگا تو اس کا بھی قصاص دلایا جائے۔ (مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والادب۔ باب تحریم الظلم) پھر قصاص کے بعد ان جانوروں کو خاک بنادیا جائے گا۔

[۷] ❁ قیامت کو سمندروں کا انجام:۔ سُجِّرَتْ: سجر میں کسی چیز کے بھرے ہوئے ہونے اور اس میں مخالطت یا تلاطم کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ البحر المسجور سے مراد وہ سمندر ہے جو بھرا ہوا بھی ہو اور جوش تلاطم سے ابل بھی رہا ہو۔ اور سجّر التنّور کے معنی تنور کو ایندھن سے بھر کر گرم کرنا تاکہ آگ پوری شدت سے بھڑک سکے اور سجور اس ایندھن کو کہتے ہیں جس سے تنور گرم کیا جائے۔ گویا ہر وہ چیز جو آگ میں شدت پیدا کرنے کے لیے تنور میں جھونک دی جائے وہ سجور ہے۔ اب دیکھیے کہ پانی دو گیسوں آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مجموعہ ہے۔ ہائیڈروجن خود آتش گیر گیس ہے جو آگ دکھانے سے ہی فوراً بھڑک اٹھتی ہے اور آکسیجن آگ کو بھڑکنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ یہی دو گیسیں جب کیمیائی طریقہ سے ملائی جاتی ہیں تو جو پانی حاصل ہوتا ہے وہ ان گیسوں سے بالکل برعکس خاصیت رکھتا ہے اور آگ کو فوراً بجھادیتا ہے۔ قیامت کے دن سمندروں کے پانی کو پھر سے انہی دو گیسوں میں تبدیل کردیا جائے گا۔ پھر ان میں آگ لگ جائے گی اور بالآخر وہ خشک ہو جائیں گے۔

[۸] زوج کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے اور اس لحاظ سے اس آیت کے مطلب بھی متعدد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ قیامت کے دن مردوں کے جسم کو ان کی قبروں سے اٹھا کر ان کے ارواح کو ان جسموں میں ملایا جائے گا اور یہی دوبارہ زندگی کا مفہوم ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جرائم کے لحاظ سے ان کے گروہ بنادیئے جائیں گے۔ مثلاً مشرکوں کا گروہ الگ ہوگا، منافقوں کا الگ، کافروں کا الگ، مومنوں کا الگ یا جیسے زانیوں کا الگ، قاتلوں کا الگ وغیرہ وغیرہ۔

[۹] ❁ زندہ درگور کرنے کی وجوہ اور اس رسم کا سدباب:۔ ایک قراءت میں سُئِلَتْ کے بجائے سَئَلَتْ بھی آیا ہے یعنی زندہ درگور کردہ لڑکی خود اپنے پروردگار سے فریاد کرے گی کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں زمین میں گاڑا گیا تھا؟ لیکن سُئِلَتْ کی قراءت سَئَلَتْ سے زیادہ ابلغ ہے جس کا مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ ایسے بے رحم اور سنگدل ظالموں کی طرف نہ دیکھنا پسند کرے گا اور نہ ان سے بات کرنا پسند کرے گا بلکہ ان کے بجائے مظلوم لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر اس سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا؟ اور یہ انداز خطاب اللہ تعالیٰ کا مجرموں پر انتہائی غضب ناک ہونے پر دلیل ہے۔ رہی یہ بات کہ اہل عرب اتنے

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ﴿١٢﴾ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ﴿١٣﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾ فَلَا أُقْسِمُ

اور دوزخ بھڑکائی جائے گی (۱۲) اور جنت قریب [۱۲] لے آئی جائے گی (۱۳) (اس وقت) ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا [۱۳] ہے (۱۴)

سنگدل کیوں واقع ہوئے تھے جو اپنی بیٹیوں کو اس قدر حقیر جنس تصور کرتے تھے کہ انہیں زندہ گاڑ دیتے تھے؟ تو اس کا بیان پہلے متعدد مقامات پر گزر چکا ہے۔ مختصراً اس کی تین وجوہ تھیں (۱) وہ تنگدست اور مفلس ہو جانے کے خطرہ سے اولاد کو مار ڈالتے تھے اور اس وجہ کے لحاظ سے لڑکوں اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ (۲) وہ کسی کو اپنا داماد بنانا اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ (۳) اور تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اہل عرب ہر وقت قبائلی جنگوں میں مشغول رہتے تھے اور ایسی جنگوں میں نرینہ اولاد تو ان کی جانشین یا مددگار بنتی تھی۔ مگر لڑکیوں کا معاملہ لڑکوں سے بالکل الگ تھا۔ وہ جس قبیلہ میں بیاہی جاتیں انہیں اسی کا ساتھ دینا پڑتا تھا اور لڑکی کے والدین کے قبیلہ کو اس کے آگے سرنگوں ہونا پڑتا تھا۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اہل عرب نے لڑکیوں کو وراثت سے محروم کر رکھا تھا۔ اسلام نے اس نظریہ کو ختم کرنے کے لیے دو طرفہ اقدام کیے۔ ایک تو قتل اولاد اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کو عام قتل سے بھی زیادہ شدید جرم قرار دیا اور لوگوں کے اس خیال کی پرزور تردید کی کہ وہ اپنی اولاد کو مار ڈالنے کا حق رکھتے ہیں۔ اور دوسرے لڑکیوں کی تربیت اور پرورش کو بہت بڑا نیک عمل قرار دے کر اس کی ترغیب دی۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص ان لڑکیوں کی پیدائش سے آزمائش میں ڈالا جائے۔ پھر وہ ان سے نیک سلوک کرے تو یہ لڑکیاں اس کے لیے جہنم کے عذاب سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔ (ترمذی۔ ابواب البر والصلۃ۔ باب ماجاء فی النفقات علی البنات)

[۱۰] نُشِرَتْ: نَشَرَ کے معنی کسی چیز کو کھولنا، کھول کر پھیلا دینا اور کوئی خبر مشہور کرنا ہے۔ اور اس کی ضد طَوٰی بمعنی لپیٹنا ہے۔ کہتے ہیں نَشَرْتُ الْكِتَابَ ثُمَّ طَوَيْتُهُ یعنی میں نے کتاب کھولی پھر بند کر دی۔ یعنی اس دن لوگوں کے اعمال نامے کھول کر ان کے ہاتھوں میں تھما دیے جائیں گے۔

[۱۱] کَشَطَ کا لغوی مفہوم:۔ کُشِطَتْ: کَشَطَ البعیر بمعنی اونٹ کی کھال اتارنا اور کشاط بمعنی اتری ہوئی کھال اور کشّاط بمعنی کھال اتارنے والا قصائی یا قصاب، اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آسمان محض ایک ٹھوس جسم ہی نہیں بلکہ اس کے جسم پر کھال کا پردہ بھی ہے اور جس طرح کھال اتارنے کے بعد جسم کے اندرونی اعضاء نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح آسمان کی کھال اتارنے کے بعد عالم بالا کی وہ چیزیں نظر آنے لگیں گی جو آج نظر نہیں آتیں۔

[۱۲] یہ وقت وہ ہوگا جب لوگوں کا حساب کتاب لیا جا رہا ہوگا اور اللہ کے فرمانبردار جہنم کو دیکھ کر یہ سمجھ لیں گے کہ اگر وہ اللہ کی فرمانبرداری نہ کرتے تو یہ بھڑکتی ہوئی جہنم ان کا ٹھکانا ہوتا۔ اس پر وہ اللہ کا مزید شکر بجا لائیں گے۔ جس نے دنیا میں انہیں راہ راست پر رکھا۔ اور مجرم لوگ جب جنت کی نعمتوں کو دیکھیں گے پھر یہ خیال کریں گے کہ ان کا اصلی ٹھکانا دوزخ ہے تو ان کی حسرت و یاس میں مزید اضافہ ہوگا۔

[۱۳] اس علم کے ذریعے دو ہوں گے۔ ایک تو ہر انسان اپنے اعمال کا ٹھیک ٹھیک محاسب ہوتا ہے بشرطیکہ وہ حیلے بہانوں یا اپنے

بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ

میں پیچھے ہٹ جانے والے ستاروں [۱۴] کی قسم کھاتا ہوں (۱۵) جو سیدھے چلتے چلتے غائب ہو جاتے ہیں (۱۶) اور رات کی جب اس کی تاریکی چھانے [۱۵] لگے (۱۷)

اور صبح کی جب وہ سانس [۱۶] لے (۱۸) کہ یہ (قرآن) ایک معزز رسول (فرشتے) کا قول [۱۷] ہے (۱۹)

نفس کی طرفداری سے کام نہ لے۔ دوسرے ہر شخص کے اعمال نامے بھی کھول کر انہیں دے دیے جائیں گے۔ ان دو چیزوں سے ہر انسان اللہ تعالیٰ کی عدالت سے فیصلہ سے پہلے ہی یہ سمجھ لے گا کہ آیا وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا یا جہنم کا؟

[۱۴] ❁ بطلیموسی نظریہ ہیئت اور خمسہ متحیرہ:۔ مندرجہ بالا آیات میں بارہ واقعات کا ذکر کیا گیا۔ ان میں سے پہلی چھ آیات یا چھ واقعات قیامت کی ابتدا یا نفخہ صور اول سے متعلق ہیں اور دوسرے چھ نفخہ صور ثانی یا میدان محشر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب اسی دنیا کے چند اہم امور کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔

بطلیموسی نظریہ ہیئت ۴۰۰ قبل مسیح سے لے کر سترہویں صدی تک یعنی دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ اتنا مقبول رہا کہ دنیا کے تمام مدارس اور یونیورسٹیوں میں اسی کی تعلیم دی جاتی رہی۔ اس نظریہ کے مطابق زمین کو ساکن اور سورج کو متحرک قرار دیا گیا۔ سات آسمان اور افلاک تسلیم کیے گئے اور ان پر سات سیارے۔ یعنی ہر فلک میں ایک سیارہ محو گردش ہے۔ اور اس نظریہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی ہندو پاکستان میں جنتریاں اسی نظریہ کے مطابق تیار کی جاتی ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق پہلے آسمان پر چاند، دوسرے پر زہرہ، تیسرے پر عطارد چوتھے پر سورج پانچویں پر مشتری، چھٹے پر مریخ اور ساتویں پر زحل گردش کرتے ہیں۔ چاند اور سورج کی گردش ہمیشہ سیدھی آگے کو رہتی ہے۔ جیسے فرمایا ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ﴾ (۱۴:۳۳) مگر باقی پانچ سیارے سیدھے آگے چلتے چلتے یکدم پیچھے ہٹنا شروع ہو جاتے ہیں یعنی الٹی چال چلنے لگتے ہیں۔ پھر آگے کو بڑھنے لگتے ہیں اور پھر کسی وقت غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ ان سیاروں کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔ ان دو آیات میں غالباً انہی سیاروں کی قسم کھائی گئی ہے۔

[۱۵] عَسْعَسَ بمعنی دھندلکا، خواہ یہ شام کا دھندلکا ہو جیسے سورج غروب ہونے کے بعد رات کا اندھیرا چھانے لگتا ہے اور خواہ یہ صبح کا دھندلکا ہو۔ یعنی رات کی تاریکی غائب اور صبح کی روشنی اس پر غالب ہونے لگے۔ اس لحاظ سے اس آیت کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ "اور رات کی جب جانے لگے"

[۱۶] یعنی جب طلوع آفتاب سے قبل اس کی روشنی پھیلنے لگے۔ بعض اس سے وقت مراد لیتے ہیں۔ جب موسم بہار میں نسیم سحر چلنے لگتی ہے۔

[۱۷] ❁ جبریل کی صفات:۔ ان تین چیزوں کی اللہ تعالیٰ نے دو باتوں پر قسم اٹھائی یا بطور شہادت یہ باتیں پیش کیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ قرآن نہ کسی کاہن کا قول ہے نہ شاعر کا، نہ آپ کا تالیف کردہ ہے بلکہ یہ معزز رسول کا قول ہے۔ یہ رسول جبریل ہے جو اللہ کا فرستادہ اور اس کا کلام پیش کر رہا ہے لیکن چونکہ جبریل کی زبان سے ہو رہا ہے اس لیے قول کی نسبت جبریل کی طرف کی گئی ہے۔ یہ جبریل بڑا زور آور اور طاقتور ہے۔ سورۃ النجم میں جبریل کے لیے ﴿شَدِيدُ الْقُوَىٰ﴾ اور ﴿ذُو مِرَّةٍ﴾

كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿٢١﴾ وَ مَا صَاحِبُكُمْ
بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ

جو بڑا طاقتور اور صاحب عرش کے ہاں بڑے رتبہ والا ہے (۲۰) وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے، با اعتماد ہے (۲۱) اور (اے کفار مکہ) تمہارا رفیق مجنون نہیں ہے (۲۲) اور اس نے اس[۱۸] (جبریل) کو روشن افق پر دیکھا ہے (۲۳) اور وہ غیب (کے اس علم کو لوگوں تک پہنچانے کے معاملہ) میں بخیل[۱۹] نہیں ہے (۲۴) اور نہ ہی یہ کسی شیطان مردود کا قول[۲۰] ہے (۲۵)

کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ فرشتہ اللہ کے ہاں بڑا مقرب ہے۔ وہ ایک افسر ہے جس کی سب فرشتے اطاعت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ امین بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے جو پیغام دے کر بھیجتا ہے وہ من و عن انسان رسول کے دل پر القاء کر دیتا ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا۔

[۱۸] ❁ **آپ کا جبرئیل کو پہلی بار دیکھنا:۔** اور دوسری چیز جس پر یہ تین قسمیں کھائی گئیں یہ ہے کہ اے کفار مکہ! تمہارے یہ ساتھی (یعنی محمد ﷺ) دیوانے نہیں ہیں بلکہ دیوانے تم ہو رہے ہو جو یہ اقرار کرنے کے بعد کہ ہمیں اپنے اس ساتھی کے بارے میں جھوٹ یا فریب کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اب اس کو حواس باختہ اور دیوانہ کہنے لگے ہو۔ اس نے رسول کریم یعنی جبرئیل امین کو اس وقت دیکھا تھا جب سپیدہ سحر کھل کر نمودار ہو چکا تھا اور ہر چیز صاف صاف نظر آنے لگی تھی۔ تاریکی کی بنا پر کسی شک و شبہ کا امکان باقی نہ رہا تھا۔ اس نے جبریل کو افق مبین، جسے سورہ نجم میں افق اعلیٰ کہا گیا ہے، پر دیکھا تھا۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے جبریل امین کو اس حال میں دیکھا تھا کہ پوری فضا میں ایک سبز فرش نظر آ رہا تھا اور اس نے آسمان کا کنارہ ڈھانپ لیا تھا اور آپ ﷺ نے جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ ان کے چھ سو پر تھے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر سورۃ النجم)

[۱۹] یعنی غیب کی خبریں جو اسے بذریعہ وحی معلوم ہوتی ہیں۔ خواہ زمانہ ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے یا مابعد الطبیعات سے، تمام لوگوں کو بلا کم و کاست بتاتا اور پہنچا دیتا ہے۔ وہ کاہنوں کی طرح نہ کسی سے نذرانے یا مٹھائی وصول کرتا ہے اور نہ ہی کسی طرح کے معاوضہ یا اجر کی تم لوگوں سے توقع رکھتا ہے۔ پیغمبر کی سیرت کو بھلا کاہنوں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

[۲۰] ❁ **کفار مکہ آپ کو کاہن کیوں کہتے تھے؟:۔** آپ ﷺ بھی چونکہ غیب کی خبریں دیتے تھے اس لیے کفار مکہ یہی سمجھتے تھے کہ آپ ﷺ کو بھی کوئی جن یا شیطان ایسی خبریں مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ بیمار ہو گئے اور دو تین راتیں نماز تہجد کے لیے اٹھ نہ سکے تو ابو لہب کی بیوی (عوراء بنت حرب۔ ابو سفیان کی بہن) آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی: محمد ﷺ میں سمجھتی ہوں تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ دو تین راتوں سے تیرے پاس نہیں آیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ والضحیٰ...... ماقلیٰ تک (بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ والضحیٰ) اور کافروں کو بتایا یہ جا رہا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ بھلا شیطان سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسان کو شرک، بت پرستی اور دہریت و الحاد سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت اور توحید کی تعلیم دے؟ اللہ

شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ
اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾ ع ۱

پھر تم کہاں جا رہے[۲۱] ہو؟(۲۶) یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے(۲۷) تم میں سے جو بھی سیدھی[۲۲] راہ چلنا چاہتا ہو(۲۸) اور تم چاہ نہیں سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ رب العالمین[۲۳] چاہتا ہو(۲۹)

کے حضور ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس دلائے؟ پاکیزہ زندگی، عدل اور تقویٰ اور اخلاق فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے؟

[۲۱] یعنی یہ قرآن لانے والا جبریل امین اور لوگوں تک پہنچانے والا رسول امین۔ ان دو امین ہستیوں کی وجہ سے اس قرآن سے جھوٹ، باطل کی آمیزش، رشک و شبہ، توہم اور دیوانگی کے سب امکانات ختم ہوئے۔ نیز کاہن یا شیطان کا کلام بھی نہیں ہو سکتا۔ تو ان باتوں کے بعد سوائے سچائی اور حق کے باقی کیا رہ جاتا ہے؟ پھر اس صاف اور روشن راستے کو چھوڑ کر اور کدھر بہکے جا رہے ہو؟

[۲۲] یعنی یہ قرآن ہے تو سب اہل عالم کے لیے نصیحت، مگر اس نصیحت سے فائدہ اسے ہی پہنچ سکتا ہے جو خود بھی سیدھی راہ پر چلنا چاہے بغض اور کجروی کی راہ اختیار نہ کرے۔

[۲۳] یعنی تمہارا ارادہ اور تمہارا چاہنا وہی ہوتا ہے جس کا اللہ کو پہلے سے ہی علم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ علم تمہیں اس بات پر مجبور نہیں کرتا ہے کہ تم وہی کام کرو جو پہلے سے اللہ کے علم میں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھئے، سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۲۴ کا حاشیہ ۲۱۔

۱۹ آیاتها سورۃ الانفطار مکیۃ رکوعها ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾

کلمات ۸۰ آیات ۱۹ (۸۲) سورۃ الانفطار[۱] مکی ہے (۸۲) رکوع ۱ حروف ۳۲۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جب آسمان پھٹ[۲] جائے گا(۱) اور ستارے بکھر کر گر[۳] پڑیں گے(۲) اور سمندر پھاڑ[۴] دیے جائیں گے(۳) اور قبریں زیر و زبر کر دی[۵] جائیں گی(۴)

[۱] یہاں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے مروی وہ حدیث مد نظر رکھنی چاہیے جس میں آپ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو یہ پسند ہے کہ قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ وہ التکویر، الانفطار اور الانشقاق پڑھ لے۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

[۲] اِنْفَطَرَتْ: فطر کے معنی کسی چیز کو لمبائی میں یوں پھاڑنا کہ اس میں شگاف پڑ جائے اور فطور شگاف کے معنی میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے انفطر کا معنی چر جانا بھی درست ہے اور پھٹ جانا بھی۔ جو صورت بھی ہو اس سے آسمان میں شگاف پڑ جائیں گے۔

[۳] ❁ انتثر کا لغوی مفہوم:۔ اِنْتَثَرَتْ: نثر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے جھڑ کر پراگندہ ہو جائے۔ اور انتثار ناک جھاڑنے کو کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح ناک کی رطوبت کے اجزا نہایت بے ترتیبی سے جھڑ کر زمین پر ادھر ادھر جا پڑتے ہیں بس یہی اس لفظ کا معنی ہے۔ نیز واضح رہے کہ یہ لفظ صرف غیر جاندار چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ستاروں کی آپس میں باہمی کشش ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ نہایت بے ترتیبی سے ادھر ادھر گر پڑیں گے۔

[۴] فُجِّرَتْ: فجر بمعنی کسی چیز کو وسیع پیمانے پر پھاڑنا اور فجر کو فجر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سارے افق پر نمودار ہوتی ہے اور فجر کے معنی پانی وغیرہ کو پھاڑ کر وسیع علاقے تک چلانا یا جاری کرنا۔ گویا سمندروں کو پھاڑ کر اس کے پانی کو دور دور علاقوں پر زمین میں بہا دیا جائے گا۔ پیچھے سورت التکویر میں سمندروں کے لیے سُجِّرَتْ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی ان میں تلاطم بپا ہو جائے گا اور پانی باہر دور دور تک پھیل جائے گا۔ پھر یہی پانی گیسوں میں تبدیل ہو کر جلنے لگے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال یہ مختلف اوقات کی مختلف حالتیں مذکور ہوئی ہیں۔

[۵] ❁ بعثر کا لغوی مفہوم:۔ بُعْثِرَتْ۔ بعثر دراصل دو لفظوں کا مرکب ہے۔ بعث اور عثر کا۔ بعث کا ایک معنی (زمین وغیرہ کا) کھودنا اور ڈھونڈنا باڑھونڈھ نکالنا بھی ہے۔ اور عثر کے معنی کسی دوسری چیز کے دوران کسی اور چیز کا خود بخود ظاہر ہو جانا، کھل جانا یا سامنے آجانا۔ مطلب یہ ہے کہ جب قبروں کو الٹ پلٹ کیا اور کھودا جائے گا تو مردے خود بخود زمین سے باہر نکل پڑیں گے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝۷ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۤءَ رَكَّبَكَ ۝۸ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝۹ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ

(اس دن) ہر شخص جان لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا اور پیچھے[6] کیا چھوڑا(۵)
اے انسان! تجھے اپنے رب کریم سے کس چیز نے دھوکے میں ڈالے[7] رکھا(۶) جس نے تجھے پیدا کیا، پھر درست کیا پھر متوازن بنایا(۷) (اور) جس صورت میں بھی اس نے چاہا تمہیں جوڑ جاڑ[8] کر تیار کر دیا(۸) ہرگز نہیں بلکہ تم تو روز جزا[9] کو جھٹلاتے ہو(۹)

[6] اس آیت کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ دنیا میں اس نے پہلی عمر میں کون کون سے کام کیے تھے۔ اور بعد میں کون کون سے اور اعمالناموں میں یہ سب باتیں ترتیب وار درج ہوں گی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان کے وہ کون کون سے کام تھے جو اس نے اپنی زندگی میں سرانجام دیے تھے۔ یہ ماقدمت ہے اور ایسے کون کون سے کام تھے جن کا ثواب یا عذاب اس کی موت کے بعد بھی اس کے اعمال نامہ میں درج ہوتا رہا۔ یہ ما اخرت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اسلام میں کسی نیک کام کی طرح ڈالی اس کے لیے اس کے اپنے عمل کا بھی ثواب ہے اور جو لوگ اس کے بعد اس پر عمل کریں ان کا بھی ثواب ہے بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا ثواب کچھ کم ہو اور جس نے اسلام میں کوئی بری طرح ڈالی۔ اس پر اس کے اپنے عمل کا بھی بار ہے اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے بعد عمل کریں بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا بار کچھ کم ہو۔ (مسلم، کتاب الزکوۃ باب الحث علی الصدقة......)

[7] یعنی تجھ پر مہربانیاں کرنے والے پروردگار کی مہربانیوں کا تقاضا یہ تھا کہ تو اس کا احسان مند ہوتا اور اس کا فرمانبردار بن کر رہتا مگر تو اس دھوکے میں پڑ گیا کہ تو جو کچھ بنا ہے از خود ہی بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی تیرے رب کا کرم ہے کہ تو جو کچھ چاہے کرتا رہتا ہے اور وہ فوری طور پر تم پر کوئی عذاب نازل نہیں کر دیتا۔ گویا تو نے اپنے رب کی مہربانیوں کو کمزوری پر محمول کیا اور اسی دھوکے میں پڑ گیا کہ تیرے رب کی مملکت میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ حالانکہ وہ صرف کریم ہی نہیں بلکہ وہ عادل بھی ہے اور قہار اور جبار بھی ہے وہ پکڑتا دیر سے ہے مگر اس کی گرفت اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔

[8] یعنی اس نے رحم مادر میں تجھے پیدا کیا تو یہ نہیں کیا کہ تمہاری ایک ٹانگ چھوٹی ہو اور دوسری بڑی۔ یا ناک کا ایک نتھنا لبوترا ہو اور دوسرا چپٹا ہو۔ بلکہ تیرے سب اعضاء متوازن بنائے۔ اسی ایک بات سے ان لوگوں کے نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ انسان از خود بنا ہے اور یہ سب فطرت کے اتفاقات کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اندھی فطرت یا اتفاقات میں اتنا شعور ہے کہ انسان کے اعضاء کی تخلیق میں اس قدر یکسانیت اور موزونیت کا لحاظ رکھ سکے؟ پھر اس نے اعضاء کی تخلیق کے بعد تم میں وہ قوتیں اور استعدادیں پیدا کیں جو تمہاری زندگی کے لیے ضروری تھیں۔ پھر ہر انسان کو الگ الگ شکل و صورت عطا کی اور وہ شکل دی اور نقش بنائے جو اللہ خود چاہتا تھا۔ اس طرح ظاہری اور باطنی قوتوں میں حسین امتزاج پیدا کرنے کے بعد تجھے ماں کے پیٹ سے باہر نکالا۔

[9] یعنی تمہارے اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں سے انکار کی وجہ یہ نہیں کہ تمہیں بات کی سمجھ نہیں آتی۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ تم جزاو

لَحٰفِظِيْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ
لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ
الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا
وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں(۱۰) جو معزز ہیں اعمال لکھنے والے(۱۱) وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے[۱۰] ہو(۱۲) یقیناً نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے(۱۳) اور بدکردار جہنم میں(۱۴) وہ قیامت کے دن اس میں داخل ہوں گے(۱۵) اور جہنم سے غائب[۱۱] نہ رہ سکیں گے(۱۶) اور آپ کیا جانیں کہ روزِ جزا[۱۲] کیا ہے؟(۱۷) پھر ہاں، آپ کیا جانیں کہ روزِ جزا کیا ہے؟(۱۸) جس دن کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ بھی نہ[۱۳] کر سکے گا اور اس دن حکم صرف اللہ کا چلے گا(۱۹)

سزا کے قانونِ الٰہی کے منکر ہو۔ تمہاری خواہش یہ ہے کہ تم جیسے بھی دنیا میں زندگی بسر کرتے رہو تم سے مرنے کے بعد کوئی محاسبہ نہ ہو اور یہ کس قدر ظلم اور بے انصافی کی بات ہے کہ تمہیں قوتیں اور تصرف و اختیار تو تمام مخلوق پر دیا جائے لیکن تم پر ذمہ داری کچھ بھی نہ ہو؟ یہ دھوکا تمہیں کیسے لگ جاتا ہے؟

[۱۰] ❁ اعمال لکھنے والے فرشتے:۔ حالانکہ ہم نے تم پر نگران چھوڑ رکھے ہیں جو ہر وقت تمہارے ساتھ لگے رہتے ہیں وہ تمہاری ایک ایک حرکت، ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کو ساتھ ساتھ ریکارڈ کرتے جا رہے ہیں اور تمہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ یہ لکھنے والے نہایت معزز فرشتے ہیں۔ لکھنے میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ تمہاری کسی حرکت کو ریکارڈ نہ کریں یا تم نے کوئی کام نہ کیا ہو اور وہ تمہارے اعمال میں درج کر دیں۔ پھر وہ تمہاری اس نیت سے بھی واقف ہیں جس کے تحت تم نے کوئی فعل سرانجام دیا تھا۔ لہٰذا ان کے اندراج میں کسی غلطی کا ہونا ناممکن ہے۔

[۱۱] یعنی نہ اس سے بھاگ کر کسی اور جگہ پناہ لے سکیں گے اور نہ جہنم میں داخل ہونے کے بعد وہاں سے نکل سکیں گے۔

[۱۲] یعنی آپ خواہ کتنا ہی سوچیں اور غور کریں اس ہولناک دن کی پوری کیفیت کبھی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ اس دن جتنے رشتے ناطے ہیں سب ختم ہو جائیں گے۔ ہر ایک کو بس اپنی ہی پڑی ہو گی۔ کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا۔ نہ ہی اللہ کے اذن کے بغیر کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔

[۱۳] دنیا میں کئی طرح کے لوگوں کا دوسروں پر حکم چلتا ہے۔ مثلاً بادشاہوں کا اپنی رعیت پر، افسروں کا اپنے ماتحتوں پر، ماں باپ کا اپنی اولاد پر، مالک کا اپنے نوکر یا غلام پر مگر اس دن یہ سب حکم ختم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہو گی۔ بلا شرکت غیرے صرف اسی اکیلے کا اس دن حکم چلے گا جسے سب تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔

سورۃ المطففین مکیۃ
۳۶ آیاتھا رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴿١﴾ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ﴿٢﴾ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ

کلمات ۱۷۲ آیات ۳۶ (۸۳) سورۃ المطففین مکی ہے (۸۶) رکوع ۱ حروف ۷۵۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ڈنڈی مارنے[۱] والوں کے لیے ہلاکت ہے (۱) ایسے لوگ جب خود ماپ کر لیتے ہیں تو پورا[۲] لیتے ہیں (۲) اور جب دوسروں کو ماپ کر یا تول[۳] کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں (۳)

[۱] تطفیف کا لغوی مفہوم:۔ مُطَفِّفِيْنَ۔ طفیف بمعنی معمولی اور حقیر چیز اور طفف بمعنی ماپ کا پیمانہ بھرتے وقت تھوڑا سا کم بھرنا یا پیمانہ ہی تھوڑا سا چھوٹا رکھنا تاکہ غلہ لینے والے کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اسے اس کا حق تھوڑا سا کم دیا جا رہا ہے۔ عرب میں زیادہ تر اشیاء کو ماپ کر دینے کا رواج تھا۔ تول کر دینے کا کم تھا۔ تاہم تھا ضرور۔ ہمارے ہاں زیادہ تر تول کر دینے کا رواج ہے۔ تول کر کم دینے کے لیے ہمارے ہاں ڈنڈی مارنے کا محاورہ عام ہے۔ اسی لیے اس کا ترجمہ ڈنڈی مارنے سے کیا گیا ہے پھر ڈنڈی مارنا اس لحاظ سے زیادہ بلیغ ہے کہ دیتے وقت ڈنڈی مار کر چیز کم دی جا سکتی ہے اور لیتے وقت ڈنڈی مار کر چیز تھوڑی سی زیادہ لی جا سکتی ہے۔ نیت کا بگاڑ ہونے کے لحاظ سے کسی کو حق سے کم دینا اور خود لیتے وقت حق سے زیادہ لینا دونوں ہی ایک جیسے جرم یعنی کبیرہ گناہ ہیں۔

[۲] ڈنڈی مارنے کی مختلف صورتیں:۔ ماپ کر اپنا حق پورا لینا کوئی جرم کی بات نہیں۔ یہ جرم صرف اس وقت بنتا ہے جب اپنا حق تو پورا لیا جائے اور دوسروں کو کم دیا جائے۔ پھر اس جرم میں کمی بیشی کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اپنا حق بھی کم لے اور دوسروں کو بھی کم دے۔ بالفاظ دیگر اس کا پیمانہ یا باٹ ہی چھوٹا ہو اسی سے وہ لاتا بھی ہو اور دیتا بھی ہو اور ڈنڈی بھی نہ مارتا ہو۔ اس صورت میں بھی یہ جرم ہے مگر جرم کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ دوسری یہ کہ آدمی لیتے وقت پورا یا زیادہ لے اور دیتے وقت کم دے۔ اس صورت میں جرم دگنا بلکہ تگنا ہو جاتا ہے۔ لین دین کی اصل بنیاد عدل ہے یعنی پورا پورا دو۔ اور قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر اس کی سخت تاکید آئی ہے کہ جب تولو تو سیدھی ڈنڈی سے تولو اور اور کسی کو اس کا حق کم نہ دو۔ پورا یا زیادہ لینا اور دوسروں کو کم دینا اتنا بڑا جرم ہے جس کی وجہ سے سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہوا تھا۔ اسلام نے مسلمانوں کو عدل سے بھی اگلے درجہ یعنی احسان یا ایثار کی ہدایت فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنا حق لیتے وقت تھوڑے سے کم پر اکتفا کر لے اور دیتے وقت تھوڑا سا زیادہ دے دے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ ﷺ مدینہ کی منڈی میں تشریف لے گئے۔ ایک تولا غلہ تول رہا تھا۔ آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ "زِن وارجح" (نسائی، کتاب البیوع) یعنی تول اور تھوڑا سا جھکتا تول۔ غور فرمائیے جس معاشرہ میں ایسا دستور رواج پا جائے اس میں کوئی لین دین کا تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے؟

جھکتا تولنے کی ہدایت:۔ اور جو شخص جھکتا تول کر دے رہا ہے اسے جب اس کا حق ملے گا تو وہ بھی جھکتا ہی ملے گا۔ اور اسے بھی کوئی کسر نہ رہے گی پھر ایسے معاشرہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکتوں کا جو نزول ہو گا اس کا اندازہ تجربہ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

[۳] یعنی دوسروں کو ان کا حق کم دینے یا خود اپنے حق سے زیادہ وصول کرنے کے جرم میں مبتلا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان

يُخْسِرُونَ ﴿٣﴾ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ﴿٤﴾ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥﴾ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ
الْعَالَمِينَ ﴿٦﴾ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ ﴿٧﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ ﴿٨﴾ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ﴿٩﴾ وَيْلٌ
يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٠﴾ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿١١﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ
أَثِيمٍ ﴿١٢﴾ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا

کیا وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں (۴) ایک بڑے دن [۴] کیلئے (۵) جب سب لوگ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہوں گے (۶) ہرگز نہیں [۵]۔ بدکردار لوگوں کے اعمال نامے قید خانے [۶] کے دفتر میں ہوں گے (۷) اور آپ کیا جانیں کہ وہ قید خانے کا دفتر کیا ہے (۸) ایک کتاب ہے، لکھی ہوئی (۹) اس دن جھٹلانے والوں کیلئے ہلاکت ہے (۱۰) جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں (۱۱) اور اسے ہر وہ شخص جھٹلاتا ہے جو حد [۷] سے بڑھنے والا گنہگار ہے (۱۲) اور جب اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ: یہ تو پہلے لوگوں کی داستانیں [۸] ہیں (۱۳) ہرگز یہ بات نہیں بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان [۹] کے

لوگوں کا نہ روز آخرت پر ایمان ہوتا ہے اور نہ اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی پر۔ اگر ان کا اس محاسبہ پر ایمان ہوتا تو کبھی ایسی بدنیتی اور مفاد پرستی کے کام نہ کرتے۔

[۴] وہ بڑا دن اس لحاظ سے ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام جن وانس کا اس دن حساب لیا جائے گا۔ اور علی رؤس الاشہاد ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

[۵] یعنی تمہارا یہ خیال باطل ہے کہ نہ قیامت آنی ہے اور نہ تمہارا محاسبہ ہونا ہے۔ بلکہ تمہارا محاسبہ ہو گا اور ضرور ہو گا۔

[۶] سجین۔ سجن بمعنی قید خانہ، جیل اور سجن بمعنی عدالت کا ثبوت جرم کے بعد بطور سزا کسی کو قید میں ڈال دینا۔ اور سجین سے مراد وہ مقام یا دفتر ہے جہاں بدکردار لوگوں کے اعمال نامے بھی محفوظ کر لیے جاتے ہیں اور ایسے لوگوں کی ارواح بھی تا قیام قیامت اسی مقام پر قید رکھی جاتی ہیں۔ بعض اسلاف کے نزدیک یہ مقام سات زمینوں کے نیچے ہے۔

[۷] یعنی روز جزا کا منکر صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے نہ اللہ کی قدرت کاملہ پر ایمان ہو نہ اس کی صفت عدل پر اور نہ اس کی حکمت پر، جو شخص اللہ کی ان صفات پر یقین رکھتا ہو وہ قیامت کے دن کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اور جب اسے روز جزا کا یقین نہیں رہتا تو پھر وہ ہر طرح کے گناہوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔

[۸] بالآخر اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ جب اسے اخروی عذاب و ثواب سے متعلق اللہ کی آیات سنائی جاتی ہیں تو کہہ دیتا ہے اجی چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ تو وہی پرانی باتیں ہیں جنہیں سن سن کر ہمارے کان بھی پک گئے ہیں۔

[۹] ❁ گناہ کرنے سے دل پر سیاہ نقطہ پڑتا ہے:۔ اصل بات یہ نہیں کہ ہماری آیات میں کوئی شک و شبہ ہے یا ان میں تاثیر کی قوت نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ گناہ کر کر کے ان کے دل مسخ اور زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ ان میں حق و باطل کو پرکھنے کی تمیز ہی باقی

كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝
ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا

برے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے (۱۴) ہرگز نہیں یقیناً ایسے لوگ اس دن اپنے پروردگار (کے دیدار) سے محروم [۱۰] رکھے جائیں گے (۱۵) پھر یقیناً وہ جہنم میں گرنے والے ہیں (۱۶) پھر (انہیں) کہا جائے گا: یہی وہ چیز ہے جسے تم جھٹلاتے [۱۱] تھے (۱۷) ہرگز نہیں۔ نیک لوگوں [۱۲] کا اعمال نامہ بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں [۱۳] ہے (۱۸) اور آپ کیا جانیں کہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر کیا ہے (۱۹)

نہیں رہ گئی۔ اس آیت کی تفسیر حدیث میں اس طرح ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ گناہ چھوڑ دے' استغفار کرے اور توبہ کرلے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ دوبارہ گناہ کرے تو نقطہ بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ دل پر چھا جاتا ہے۔ اور یہی وہ زنگ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

[۱۰] اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہونے کی نعمت صرف اہل جنت کو حاصل ہوگی اور لذت و سرور کے لحاظ سے یہ نعمت جنت کی دوسری تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہوگی اور جب اللہ اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا تو جنتی لوگ بس ادھر ہی دیکھتے رہ جائیں گے۔ جو لوگ روز آخرت کے منکر تھے انہیں یہ نعمت کبھی میسر نہ ہو سکے گی۔

[۱۱] یعنی جہنم میں داخل کرنے کے بعد ان سے سوال کیا جائے گا کہ بتاؤ یہ جہنم کا عذاب پرانے لوگوں کی داستان ہے یا ایک ٹھوس حقیقت؟ آج تو تمہارا یہ مغالطہ دور ہو ہی چکا ہوگا۔

[۱۲] ❁ **فاجر اور ابرار کا لغوی مفہوم:۔** یہاں فجار کے مقابلہ میں ابرار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فَجَرَ کے معنی کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنا اور فجر کو فجر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سارے آسمان پر نمودار ہو جاتی ہے۔ اور فاجر وہ شخص ہے جو وسیع پیمانے پر دین کی نافرمانی کرنے والا ہو اور ہر وقت گناہوں میں منہمک رہتا ہو اور گناہوں سے تائب نہ ہو۔ اس کے مقابلہ میں ابرار ہے۔ برّ کے معنی نیکی، نیکی کے کام اور بر کے معنی وسیع خشک قطعہ زمین ہے گویا بر کے لفظ میں نیکی کے علاوہ وسعت کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ اور بر دراصل نیکی کو نہیں بلکہ ہر دم نیکی پر مائل رہنے والی خصلت کو کہتے ہیں کہ جب کسی نیکی کا موقع آئے اسے فوراً سر انجام دے دیا جائے اور بارّ وہ شخص ہے جو ایسی خصلت رکھتا ہو اور اسی کی جمع ابرار ہے۔

[۱۳] یعنی جس طرح سجین بدکردار لوگوں کی ارواح کا قید خانہ اور ان کے اعمالناموں کے جمع ہونے کا دفتر ہے۔ اسی طرح علیین ابرار کی ارواح کا مستقر ہے اور ان کے اعمالنامے اسی مقام پر محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ بعض اسلاف کے قول کے مطابق یہ مقام ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ
مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا
يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾
وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾

وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی (۲۰) جس کے پاس مقرب (فرشتے) حاضر رہتے [۱۴] ہیں (۲۱) بلاشبہ نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے (۲۲) تختوں پر بیٹھے نظارے کریں گے (۲۳) آپ ان کے چہروں [۱۵] پر خوشحالی کی رونق معلوم کریں گے (۲۴) انہیں سربمہر خالص شراب پلائی جائے گی (۲۵) جس کی مہر کستوری [۱۶] کی ہوگی اور (نعمتوں کے) شائقین کو چاہیے کہ وہ اس بات میں رغبت کریں۔ (۲۶) اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی (۲۷) یہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ پئیں [۱۷] گے (۲۸) مجرم لوگ (دنیا میں) ایمانداروں پر ہنسا کرتے تھے (۲۹) اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھیں مار کر اشارے کرتے (۳۰) اور اپنے گھروں کو لوٹتے تو خوش گپیاں کرتے لوٹتے (۳۱)

[۱۴] یعنی علیین ایسا بلند مرتبہ مقام ہے کہ وہاں ہر وقت اللہ کے مقرب فرشتے موجود رہتے ہیں یا اللہ کے مقرب بندوں کی ارواح وہاں موجود رہتی ہیں۔ یا مقرب فرشتے وہاں ابرار کے اعمالناموں کو دیکھتے اور پڑھ کر خوش ہوتے ہیں اور قیامت کے دن ان کے حق میں گواہی دیں گے۔

[۱۵] یعنی جنت کی تمام نعمتوں سے مزے اڑائیں گے۔ شہنشاہوں کی طرح اونچی مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے پر رونق چہرے ہی یہ بتا رہے ہوں گے کہ وہ جنت کی نعمتوں میں بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں بڑی تیز ہوں گی۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے ہی دوسرے اہل جنت کے اعمال دیکھ لیا کریں گے۔ اسی طرح اگر انہیں دنیا کا کوئی ایسا ساتھی یاد آئے گا جو دوزخ میں پڑا ہوگا۔ وہ اس کے حالات سے باخبر ہونا چاہیں گے تو اس کا بھی نظارہ کر سکیں گے۔

[۱۶] ❁ جنت کی شراب کے خواص:۔ دنیا کی شراب بدبودار ہوتی ہے اور ذائقہ تلخ، پینے سے اس کی سڑانڈ فوراً دماغ تک جا پہنچتی ہے جس سے انسان کے حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جنت میں شراب کی یہ خاص قسم رحیق کی خوشبو ایسی ہوگی جیسے کستوری کی۔ اس کی مہر میں لاکھ یا مٹی یا موم کے بجائے کستوری لگائی گئی ہوگی اور اس میں دنیا کی شراب والی کوئی قباحت نہیں ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ناپاک شراب اس قابل نہیں کہ بھلے آدمی اس کی طرف رغبت کریں۔ ہاں یہ رحیق یقیناً ایسی نعمت ہے جس پر لوگوں کو ٹوٹ پڑنا چاہیے اور اس کے حصول کے لیے نیک اعمال میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

[۱۷] یعنی ابرار کے لیے تو ﴿رحیق مختوم﴾ ہوگی اور مقربین کے لیے بھی یہی شراب ہوگی لیکن اس میں تسنیم کی آمیزش بھی ہوگی۔ تسنیم جنت میں ایک چشمہ کا نام ہے شاید اس چشمہ کے پانی کی ملاوٹ سے وہ شراب مزید خوشگوار بن جاتی ہوگی۔

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿٣٢﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

اور جب ایمان والوں کو دیکھتے تو کہا کرتے کہ یقیناً یہی لوگ گمراہ[۱۸] ہیں(۳۲) حالانکہ وہ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے[۱۹] گئے تھے(۳۳) سو آج ایماندار کافروں پر ہنس رہے ہوں گے(۳۴) تختوں پر بیٹھے (ان کا حال) دیکھیں گے(۳۵) کافروں کو ان کی کرتوتوں کا ضرور بدلہ[۲۰] دیا جائے گا۔(۳۶)

[۱۸] ان چار آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کی چار حرکتوں کا ذکر فرمایا۔ اور یہ سب مسلمانوں کا تمسخر اڑانے اور ان پر پھبتیاں کسنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو گمراہ تو اس لحاظ سے کہتے تھے کہ مسلمان زہد و ریاضت میں اپنی جانیں کھپاتے اور دنیا کی لذتوں پر اخروی لذتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ کافر یہ کہتے تھے کہ کیا یہ کھلی گمراہی نہیں کہ سب گھربار اور عیش و آرام کو چھوڑ کر ایک شخص کے پیچھے لگ گئے ہیں اور اپنے آبائی دین کو ترک کر بیٹھے ہیں۔ محض اس خیال سے کہ آخرت میں انہیں جنت ملے گی۔ بھلا ان بے وقوفوں کو یہ کیسا فاسد خیال دامن گیر ہوا ہے کہ دنیا کی یقینی لذتوں کو چھوڑ کر آخرت کی تصوراتی لذتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ باتیں تھیں جنہیں دہرا دہرا کر وہ خود بھی خوش ہوتے رہتے تھے اور مسلمانوں کی طرف اشارے بھی کرتے اور ان کا مذاق بھی اڑاتے رہتے تھے۔

[۱۹] یعنی اللہ نے انہیں مسلمانوں پر نگران بنا کر تو نہیں بھیجا تھا کہ ان کی نظروں میں مسلمانوں میں جو جو غلطیاں پائی جاتی ہیں ان کی وہ نشاندہی کیا کریں۔ یعنی اے کفار مکہ! اگر مسلمان تمہارے خیال کے مطابق غلط رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں پھر بھی تمہیں تو کچھ نہیں کہتے۔ پھر کیا اللہ نے تمہیں ان پر فوجدار بنا کر تو نہیں بھیجا کہ اگر تمہیں نہیں ستاتے یا نہیں چھیڑتے تب بھی تمہیں یہ حق ہے کہ ان کو تنگ کرو۔ ان کا مذاق اڑاؤ اور ان پر پھبتیاں کسو۔

[۲۰] کفار مکہ مسلمانوں سے ایسی بدسلوکی اپنے دین کی حمایت میں ایک اچھا کام یعنی کار ثواب سمجھ کر کرتے تھے۔ قیامت کے دن ان کافروں کو ان کے اس کار ثواب کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا جب یہی خستہ حال مومن جنت میں اونچی مسندوں پر براجمان ہوں گے اور وہیں سے ان کافروں کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ ان کا مضحکہ اڑائیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ بتاؤ احمق دیوانے اور گمراہ تم تھے یا ہم؟

۲۵ اٰیٰتُھَا سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاقِ مَکِّیَّۃٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾ وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ؕ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا

کلمات ۱۰۸ آیات ۲۵ (۸۴) سورۃ الانشقاق مکی ہے (۸۳) رکوع ۱ حروف ۸۴۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جب آسمان پھٹ جائے گا(۱)اور وہ اپنے پروردگار کا حکم مان[۱] لے گا اور یہی اس کا حق ہے(۲)اور جب زمین پھیلا دی[۲] جائے گی(۳)اور جو کچھ اس میں[۳] ہے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی(۴)اور اپنے پروردگار کا حکم مان لے گی اور یہی اس کا حق ہے(۵)اے انسان تو تکلیف سہہ سہہ[۴] کر کشاں کشاں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے پھر تو اس سے ملنے والا ہے(۶)

[۱] اَذِنَ لَہٗ کے معنی کسی کے حکم یا بات پر کان لگانا یا توجہ سے سننا تاکہ فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ واضح رہے کہ جن و انس کے سوا کائنات کی جملہ اشیاء اللہ تعالیٰ کے حکم تکوینی کی تعمیل کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ انہیں یہ اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ حکم کی سرتابی کر سکیں بالفاظ دیگر ان اشیاء کی اطاعت اضطراری ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آسمان کو پھٹ جانے کا حکم دیا جائے گا تو وہ بلا چون و چرا پھٹ جائے گا۔

[۲] ❁ زمین کو کھینچ کر لمبا کرنے کا مفہوم:۔ مُدَّتْ۔ مَدَّ بمعنی کسی چیز کو لمبائی میں کھینچ کر پھیلانا اور اسے لمبا کر دینا۔ جیسے اللہ تعالیٰ سایوں کو یا بادلوں کو لمبا کرتا اور پھیلا دیتا ہے واضح رہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ زمین کو کھینچ کر چپٹی بنا دے گا۔ زمین کو اللہ نے پہلے ہی پھیلا دیا اور لمبا کر دیا ہے۔ اس دن صرف یہ ہوگا کہ سارے سمندر خشک کر کے زمین میں شامل کر دیے جائیں گے جس سے زمین کا رقبہ چار گنا ہو جائے گا پھر پہاڑوں کو زمین بوس کر دیا جائے گا اس کی اونچی اور نیچی سب جگہیں برابر کر دی جائیں گی۔ اس طرح اسی زمین کا رقبہ اتنا زیادہ ہو جائے گا کہ اسی زمین پر سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کے قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں اور قیامت تک جنوں کی تمام نسل کو یکجا اکٹھا کر دیا جائے گا۔ یہی زمین میدان محشر بن جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ میدان محشر کے لیے اللہ اس زمین کے علاوہ کوئی دوسری زمین پیدا کر دے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت ﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔

[۳] جتنے مردے اس میں مدفون ہیں یا مردوں کے ذرات اس میں مل جل گئے ہیں وہ سب نکال کر باہر کر دے گی اور سطح زمین پر لے آئے گی۔ اسی طرح اس میں جو معدنیات، تیل کے چشمے اور جلنے والی گیسوں کے خزانے موجود ہیں سب باہر اگل دے گی۔ اسی طرح لوگوں کے اعمال کی جو شہادتیں اس کے اندر موجود ہوں گی جنہیں موقعہ کی شہادت یا قرائن شہادت کہتے ہیں۔ وہ سب بھی پوری کی پوری باہر آ جائیں گی اور کوئی چیز اس میں چھپی ہوئی اور دبی ہوئی نہ رہ جائے گی۔

[۴] ❁ کَدْحًا کا لغوی مفہوم:۔ کَدْحًا۔ کَدَحَ بمعنی کام میں بہت محنت کرنا۔ تکلیفیں سہہ سہہ کر کام کرنا۔ بمشقت کوئی کام

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوْا فَمُلٰقِيْهِ ۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝

پھر جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا(۷) تو اس سے جلد ہی آسان سا حساب[۵] لیا جائے گا(۸) اور وہ خوش بہ خوش اپنے اہل خانہ[۶] کی طرف لوٹے گا(۹) رہا وہ شخص جس کا اعمال نامہ اس کی پشت کے پیچھے[۷] سے دیا جائے گا(۱۰) تو وہ ہلاکت کو پکارے گا(۱۱)

کرتے جانا اور اس کی صورت یہ ہوتی کہ انسان کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے جسے پورا کرنے کے وہ درپے ہو جاتا ہے اور وہ کام ابھی پورا بھی نہیں ہو چکا کہ کوئی اور خواہش یا خواہشیں انسان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ پہلی خواہش کی تکمیل کے بعد، بعد والی خواہش کی تکمیل کے لیے کمر ہمت باندھ لیتا ہے اور اسی طرح اس کی تمام زندگی بیت جاتی ہے۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ خواہش کرنے والا انسان ایک دنیادار ہے اور اس کی تمام تر خواہشات کا محور دنیوی مفادات کا حصول ہے۔ یا وہ ایک دیندار اور اللہ کا فرمانبردار انسان ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے اخروی مفادات کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ محنت مشقت کرنے اور تکلیفیں سہہ سہہ کر کام کرتے رہنے کے لحاظ سے دونوں کا طریقہ کار یکساں ہوتا ہے تا آنکہ اسے موت آلیتی ہے اور وہ خود بخود اللہ کے حضور پہنچ جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنی تگ و دو کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ یہ صرف دنیا کی زندگی تک ہی محدود ہے تو اس کی اس غلط سوچ سے حقیقت میں کچھ فرق نہیں پڑ جائے گا اور وہ اپنے پروردگار کے پاس پہنچ کر ہی دم لے گا۔

[۵] ❁ آسان حساب کیا ہے؟ آسان حساب یہ ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری نکلا اس سے اس کی برائیوں کے متعلق یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ تم نے فلاں برا کام کیوں کیا تھا؟ کیا تمہارے پاس اس کے لیے کوئی عذر ہے؟ بلکہ اس کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن جس شخص سے حساب لیا گیا وہ تباہ ہوا" میں نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ جس کو اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا اس سے جلد ہی آسان سا حساب لیا جائے گا" آپ ﷺ نے فرمایا: یہ محض پیشی ہوگی۔ انہیں ان کے اعمال بتا دیے جائیں گے اور جس کے حساب کی تحقیق شروع ہوگئی وہ تباہ ہوا۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر) نیز کتاب العلم۔ باب من سمع شیئا فلم یفہمہ......)

[۶] اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا اس سے پہلے اسی طرح کا آسان سا حساب لیا جا چکا ہوگا اور انہیں جنت کا پروانہ مل چکا ہوگا اور اگر اس کے اپنے اہل و عیال فی الواقع ایسے ہی لوگوں میں سے ہوں گے تو یہ اس کے لیے اور زیادہ خوشی کی بات ہوگی۔

[۷] سورۃ الحاقہ میں فرمایا کہ اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور یہاں یہ فرمایا کہ پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا۔ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور ان میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ بدبختوں کو یہ تو پہلے ہی معلوم ہوگا کہ انہیں ان کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں دیا جانے والا ہے اس لیے کہ انہیں اپنے کرتوتوں کا پورا علم ہوگا لہٰذا وہ اپنا بایاں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر لیں گے۔ تاکہ اعمال نامہ پکڑتے وقت کم از کم سامنے والے لوگوں کے سامنے ان کی رسوائی نہ ہو۔

ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾
بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ

اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے[۸] گا(۱۲) اپنے اہل خانہ میں[۹] بڑا خوش تھا(۱۳) اس نے سمجھ رکھا تھا کہ وہ قطعاً (میرے پاس) لوٹ[۱۰] کر نہ آئے گا(۱۴) کیوں نہیں آئے گا اس کا پروردگار تو اسے[۱۱] دیکھ رہا تھا(۱۵) پس میں شام کی سرخی کی قسم کھاتا ہوں(۱۶) اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ[۱۲] لیتی ہے۔(۱۷) اور چاند کی جب وہ ماہ کامل[۱۳] بن جاتا ہے(۱۸)

[۸] بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ پکڑنے کے بعد اسے اپنا سارا انجام نظر آنے لگے گا لہٰذا وہ موت کو پکارے گا اور مرنے کی کوشش کرے گا مگر اسے موت کہاں میسر ہو گی۔ انسان اس دنیا میں مرنے پر مجبور ہے اس دنیا میں جینے پر مجبور ہو گا۔ وہ انہی خیالوں میں پڑا ہو گا کہ جہنم اسے اپنے قبضے میں لے لے گی اور وہ اس میں از خود گر پڑے گا۔

[۹] یہ شخص اپنے گھر میں گھمنڈ کرتا اترا تا تھا۔ حرام اور حلال جو بھی طریقہ اسے بن پڑتا وہ دنیا کا مال اکٹھا کرتا تھا۔ خود بھی عیش کرتا تھا اور گھر والوں کو بھی عیش کراتا تھا۔ اس کی زندگی اللہ سے ڈرنے والوں سے بالکل مختلف تھی جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے گھر والوں کی محبت ہی کہیں ہمارے لیے فتنہ اور آزمائش کا سبب نہ بن جائے۔

[۱۰] ❁ حار کا لغوی مفہوم:۔ یَحُوْرَ: حار بمعنی گھوم پھر کر اسی جگہ واپس آ جانا جہاں سے چلا تھا۔ گویا اس لفظ کے معنی میں دو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں۔

(۱) گھومنا (۲) رجوع کہتے ہیں۔ حار الماء فی الغدیر یعنی پانی حوض میں گھومنے لگا اور محور اس ڈنڈے کو کہتے ہیں جس کے گرد چرخی گھومتی ہے۔ یعنی اسے یہ خیال تک نہیں تھا کہ دنیا کے ان مختلف اقسام کے دھندوں کے بعد بالآخر مجھے اپنے پروردگار کے پاس ہی پہنچنا ہے۔

[۱۱] یعنی اس کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک کے کارناموں پر اللہ کی نظر تھی کہ اس کی روح کہاں سے آئی، بدن کس کس چیز سے بنا، پھر پیدا ہو کر وہ کیسے اعمال بجا لاتا رہا۔ مرنے کے بعد اس کی روح کہاں ہے اور بدن کے اجزاء بکھر کر کہاں کہاں پہنچے۔ یہ سب باتیں اللہ کی نگاہ میں تھیں۔ اور یہ بات اللہ کی حکمت اور اس کے انصاف کے خلاف تھی کہ جیسے اعمال وہ کر رہا تھا ان کو نظر انداز کر دیتا اور اس سے کوئی مؤاخذہ نہ کرتا۔

[۱۲] ❁ وَسَقَ کا لغوی مفہوم:۔ سورج کے طلوع ہونے کے بعد سب انسان تلاش معاش کی خاطر اور دوسرے چرند پرند اپنی پیٹ پروری کی خاطر اپنے اپنے گھروں سے باہر چلے جاتے ہیں اور جب رات آتی ہے تو سب آرام کے لیے اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ آتے ہیں اور یہی وسق کا مفہوم ہے یعنی کسی چیز کا اپنے منتشر اجزاء کو اکٹھا کرنا اور سمیٹ لینا۔

[۱۳] اِتَّسَقَ کا بھی مادہ وَسَقَ ہی ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ اس چیز کے سب اجزاء مجتمع ہو گئے اور وہ مکمل ہو گئی یعنی چاند ہلال سے بڑھتا بڑھتا بدر کامل بن گیا۔

اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ

کہ تم ایک حالت سے اگلی حالت کو چڑھتے چلے[۱۴] جاؤ گے (۱۹) پھر انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں[۱۵] لاتے (۲۰) اور جب ان پر قرآن پڑھا جائے تو سجدہ[۱۶] نہیں کرتے (۲۱) بلکہ کافر لوگ تو (الٹا)[۱۷] جھٹلا دیتے ہیں (۲۲) اور اللہ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ وہ (دلوں میں) محفوظ[۱۸] رکھتے ہیں (۲۳) لہٰذا انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے (۲۴)

[۱۴] اس مقام پر تین باتوں کی قسم کھائی گئی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں حرکت ہی حرکت ہے، سکون اور ٹھہراؤ نہیں۔ پھر یہ حرکت بھی یکدم واقع نہیں ہو جاتی بلکہ اس میں تدریج کا اصول کام کر رہا ہے۔ سورج غروب ہوتا ہے تو یک دم تاریکی نہیں چھا جاتی بلکہ کچھ دیر تک اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ رات بھی بتدریج اپنے مکینوں کو اپنی اپنی قرار گاہ کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ چاند بھی مکمل ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ اس میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔ تاہم مکمل ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح تم بھی بتدریج منزل بہ منزل اپنی آخری منزل کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہو اور تمہیں وہاں جا کر دم لینا ہے۔ پہلے انسان نطفہ تھا۔ رحم مادر میں ہی اس کی سات حالتیں بدلیں۔ پھر بچپن، بچپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپا اور بڑھاپے سے موت۔ یہ ایسی منزلیں ہیں جنہیں طے کرنے میں انسان بالکل بے بس اور مجبور ہے۔ ان میں سے کوئی منزل حذف کرنا چاہے تو وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا۔ رہی یہ بات کہ انسان کی آخری منزل کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جنت یا دوزخ ہے۔ گویا انسان مرنے کے بعد بھی کئی منازل طے کرنے پر مجبور ہو گا۔ اسے عذاب و ثواب قبر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسے مرنے کے بعد دوبارہ جی کر اٹھنا ہو گا۔ اسے قیامت کی سختیاں سہنا ہوں گی۔ اسے اللہ کی عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔ دنیا میں بھی اللہ کا ایسا ہی قانون کارفرما ہے۔ آخرت میں بھی یہ سب واقعات پیش آ کے رہیں گے اور اس میں انسان کے اپنے ارادہ و اختیار کو کچھ دخل نہ ہو گا۔

[۱۵] یعنی کئی طرح کے تغیرات خود ان کی ذات پر وارد ہو رہے ہیں۔ اور کئی طرح کے تغیرات وہ کائنات میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں پھر بھی انہیں اس بات کا یقین نہیں آتا کہ اللہ کے سامنے بالکل مجبور و بے بس ہیں۔ وہ کچھ ہو گا جو اللہ چاہے گا۔ ان کے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انہیں بہرحال اللہ کے فیصلہ کے مطابق اللہ کے حضور پیش ہونا پڑے گا اور اس سے یقیناً محاسبہ کیا جائے گا۔

[۱۶] اس آیت کی تلاوت کے بعد سجدہ کرنا چاہیے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے۔

ابو رافع کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے عشاء کی نماز پڑھی۔ انہوں نے یہی سورت پڑھی اور (یسجدون) پر سجدہ کیا۔ میں نے کہا: یہ کیا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی۔ انہوں نے یہی سورت پڑھی تو سجدہ کیا اور میں تو ہمیشہ اس میں سجدہ کرتا رہوں گا۔ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے دوسری روایت یوں ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سورہ ﴿اذا السماء انشقت﴾ اور سورہ اقرا میں سجدہ کیا۔ (بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ باب سجود القرآن)

[۱۷] یعنی قرآن کو سن کر بھی ان کے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہیں ہوتا نہ مسلمانوں کی طرح اس کے آگے جھکتے یا سجدہ کرتے ہیں۔ بلکہ الٹا قرآن کو ہی جھٹلانے لگتے ہیں اور جو کچھ قرآن پیش کرتا ہے سب باتیں جھوٹی ہی سمجھتے ہیں۔

[۱۸] وعی کا لغوی مفہوم:۔ يُوْعُوْنَ۔ وعی کا معنی کسی چیز کو تھیلی میں رکھ کر اوپر سے اس کا منہ بند کر دینا ہے اس لحاظ سے

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿٢٥﴾ ع ۱

البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے اجر ہے جو کبھی منقطع[۱۹] نہ ہوگا۔(۲۵)

وعی کا معنی بخل کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ حفاظت کرنا بھی اور چھپا کر رکھنا بھی اور کسی چیز کو یاد رکھنا بھی۔ یہاں یہ لفظ تیسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی کافر لوگ جو بغض و عناد اور کینہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

[۱۹] مَنٌّ کا لغوی مفہوم:۔ مَمْنُوْن۔ منّ کا لفظ تین معنوں میں آتا ہے (۱) احسان کرنا (۲) احسان جتلانا (۳) کاٹنا اور کترنا۔ یعنی قطع و انقطاع۔ یہاں یہ لفظ تیسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس معنی میں لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ منّ میں انقطاع یک دم نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز کے آہستہ آہستہ کم ہو کر ختم ہو جانے اور اس طرح سلسلہ منقطع ہو جانے کے معنوں میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کو جو اجر ملے گا اس میں نہ کبھی کمی واقع ہوگی اور نہ ہی اس میں انقطاع واقع ہوگا۔

۲۲ آیاتہا — سُورَةُ البُرُوجِ مَکِّیَّةٌ — رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ؕ﴿۳﴾ قُتِلَ اَصْحٰبُ

کلمات ۱۰۹ آیات ۲۲ (۸۵) سورۃ البروج مکی ہے (۲۷) رکوع ۱ حروف ۴۷۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

برجوں والے آسمان [۱] کی قسم (۱) اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے (۲) اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز [۲] کی (۳) کہ خندقوں والے [۳] ہلاک ہو گئے (۴)

[۱] آسمان اور اسکے برج:۔ بطلیموسی نظریہ ہیئت کے مطابق فلک ہشتم کو بارہ برجوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو دراصل ستاروں کے جھرمٹ یا مجمع النجوم (Constalations) ہیں۔ جنہیں دیکھنے سے ایک مخصوص تصور یا شکل ذہن میں آجاتی ہے۔ ان برجوں کے ناموں سے ہی ان کی شکلوں کا کچھ نہ کچھ تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ ان کے نام درج ذیل شعر میں منظوم کیے گئے ہیں۔

حمل و ثور و جوزا، سرطان و اسد

سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی دلو و حوت

انہیں بروج کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجر کی آیت نمبر ۱۰ میں فرمایا: ''اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور اس آسمان کو دیکھنے والوں کے لیے سجا دیا'' اب اگر ایک عام قاری اس آیت میں بروج کے لفظ سے وہی بارہ برج مراد لیتا ہے جو اہل ہیئت نے فلک ہشتم پر بنا رکھے ہیں تو یہ اس کی مرضی ہے ورنہ آیت کا سیاق و سباق اس بات کی تائید نہیں کرتا کیونکہ ان برجوں میں سے اکثر برجوں کی اشکال کا زینت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بھلا سرطان، بچھو، ترازو اور ڈول کیا خوبصورتی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے یہاں بروج سے ستارے اور سیارے مراد لیے ہیں۔ جو رات کے وقت آسمان کو زینت بخشتے ہیں۔ لغوی لحاظ سے ہم ہر نمایاں طور پر ظاہر ہونے والی چیز کو برج کہہ سکتے ہیں۔

[۲] آیت نمبر ۲ میں ﴿والیوم الموعود﴾ سے مراد تو قیامت کا دن ہے مگر آیت نمبر ۳ میں شاہد اور مشہود کی تعبیر میں بہت اختلاف واقع ہوا ہے۔ کسی نے کہا کہ شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے جو ہر قریہ اور ہر شہر میں ہر جگہ حاضر ہوتا ہے۔ اور مشہود سے مراد عرفہ کا دن ہے۔ جب کہ دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں حاضر ہوتے ہیں کسی نے کہا شاہد سے مراد یوم النحر اور مشہود سے مراد یوم عرفہ ہے وغیرہ وغیرہ لیکن ربط مضمون کے لحاظ سے یہی تعبیر بہتر معلوم ہوتی ہے کہ مشہود سے مراد بھی قیامت کا دن ہو اور شاہد سے مراد قیامت کے دن اکٹھا کی جانے والی خلقت سے ہر فرد مراد ہو جو قیامت اور اس کی ہولناکیوں کو چشم خود ملاحظہ کر رہا ہو۔ اور چوتھا مفہوم یہ ہے کہ شاہد سے مراد انبیاء اور صلحاء لیے جائیں اور مشہود سے مراد ان کی قومیں جن پر وہ گواہی دے کر ان پر حجت قائم کریں گے۔

[۳] اُخدود۔ الخدّ والاخدود۔ اخدود کا لفظ صاحب منجد کے نزدیک واحد ہے جبکہ بعض دوسرے اسے خدّ کی جمع بتاتے

الْأُخْدُودِ ﴿٤﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ﴿٥﴾ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ﴿٦﴾ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ

جن میں آگ تھی بہت ایندھن والی(۵) جبکہ وہ اس کے کنارے پر بیٹھے تھے(۶) اور جو کچھ وہ ایمان والوں سے کر رہے تھے، اسے سامنے دیکھ رہے تھے[۳]۔(۷)

ہیں۔ بمعنی ایک لمبا اور گہرا گڑھا جو خود کھودا گیا ہو بمعنی خندق اور جمع کی صورت میں اس کا معنی خندقیں ہو گا۔

[۳] اصحاب الاخدود کا قصہ اور ذونواس یہودی بادشاہ:۔ اس ضمن میں درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:۔

صہیب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ :ایک بادشاہ کا ایک کاہن تھا جو اسے غیب کی خبریں دیا کرتا تھا۔ کاہن نے بادشاہ سے کہا کہ ایک ذہین و فطین لڑکا تجویز کر دجسے میں یہ علم سکھا دوں، مجھے خطرہ ہے کہ مر جاؤں تو یہ علم ہی نہ اٹھ جائے اور تم میں اس کا کوئی استاد نہ رہے۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا لڑکا تجویز کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ ہر روز اس کے پاس حاضر ہوا کرے۔ چنانچہ وہ لڑکا اس کاہن کے ہاں آنے جانے لگا۔ اس لڑکے کے راستہ میں ایک گرجا میں ایک راہب رہتا تھا۔ معمر راوی کہتا ہے کہ میرے خیال میں ان دنوں ایسے عبادت خانوں کے لوگ ہی مسلمان تھے۔ وہ لڑکا جب اس راہب کے پاس سے گزرتا تو اس سے دین کی باتیں پوچھتا تا آنکہ راہب نے اسے بتایا۔ میں تو صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ اب لڑکا راہب کے پاس زیادہ دیر رہنے لگا اور کاہن کے ہاں دیر سے پہنچتا۔ کاہن نے اس کے گھر والوں کو کہلا بھیجا کہ لڑکا میرے پاس کم ہی آتا ہے۔ لڑکے نے راہب کو یہ بات بتائی تو راہب نے اسے کہا۔ جب کاہن تم سے پوچھے کہ کہاں رہے تو کہہ دینا کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس تھا اور اگر گھر والے پوچھیں تو کہہ دینا کہ میں کاہن کے پاس تھا۔ کچھ وقت اسی طرح گزرا۔ پھر ایک دفعہ یوں ہوا کہ کسی جانور نے بہت سے لوگوں کی راہ روک دی۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ جانور شیر تھا۔ لڑکے نے ایک پتھر اٹھایا اور کہنے لگا۔ یااللہ! جو کچھ یہ راہب کہتا ہے اگر یہ سچ ہے تو میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو (اس پتھر سے) اس (جانور) کو ہلاک کر دے۔ پھر اس نے پتھر جو پھینکا تو جانور مر گیا۔ لوگ پوچھنے لگے۔ "اس جانور کو کس نے مارا ہے؟" کسی نے کہا، "اس لڑکے نے" اب لوگ گھبرائے اور کہنے لگے کہ اس لڑکے نے تو ایسا علم سیکھا ہے جو کوئی بھی نہیں جانتا" یہ بات ایک اندھے نے سنی تو لڑکے سے کہا: "اگر تو میری آنکھیں لوٹا دے تو میں تمہیں بہت مال و دولت دوں گا" لڑکے نے کہا: "مجھے مال و دولت کی ضرورت نہیں البتہ اگر تیری بینائی لوٹ آئے تو کیا تو اس ذات پر ایمان لائے گا جس نے بینائی کو لوٹایا؟" اندھا کہنے لگا "ہاں" چنانچہ لڑکے نے اللہ سے دعا کی تو اس کی بینائی لوٹ آئی۔ پھر اندھا بھی ایمان لے آیا۔ جب بادشاہ کو یہ خبر پہنچی تو اس نے سب کو بلایا اور کہا کہ میں تم کو الگ الگ طریقے سے مار ڈالوں گا چنانچہ راہب کو تو آرے سے چروا ڈالا اور اندھے کو کسی اور طرح سے مروا ڈالا۔ پھر اس لڑکے کے لیے حکم دیا کہ اسے فلاں پہاڑ پر لے جاؤ اور چوٹی پر جا کر اسے نیچے گرا دو۔ چنانچہ جب وہ اس چوٹی پر پہنچے جہاں سے لڑکے کو گرانا چاہتے تھے تو وہ خود گرنے لگے اور لڑکے کے سوا چوٹی پر کوئی نہ رہا۔ وہ لڑکا بادشاہ کے پاس آ گیا تو اب اس نے حکم دیا کہ اب اسے دریا میں لے جا کر (کشتی سے گرا کر) ڈبو دو۔ اب بھی اللہ نے ان لوگوں کو غرق کر دیا اور لڑکے کو بچا لیا۔ اب لڑکا بادشاہ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ :اگر تم مجھے مارنا ہی چاہتے ہو تو اس کی صرف یہی صورت ہے کہ مجھے سولی پر لٹکا کر تیر مارو اور تیر مارتے وقت یوں کہو۔ "اللہ کے نام سے جو اس لڑکے کا پروردگار ہے" چنانچہ اس نے ایسا ہی حکم دیا۔ پھر لڑکا سولی چڑھایا گیا پھر اس نے یہ کہہ کر تیر مارا۔ "اللہ کے نام سے جو اس لڑکے کا پروردگار ہے" چنانچہ

بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

اور انہیں مومنوں کی یہی بات بری[۵] لگتی تھی کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے جو ہر چیز پر غالب اور قابل ستائش ہے (۸) آسمانوں اور زمین پر حکومت اسی کی ہے اور اللہ ہر چیز پر شاہد ہے (۹) جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں پر ظلم و ستم ڈھایا پھر توبہ (بھی) نہ کی ان کیلئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے ایسا عذاب ہے جو جلا[۶] کے رکھ دے گا (۱۰) بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے

جب لڑکے کو تیر لگا تو اس نے اپنا ہاتھ اپنی کنپٹی پر رکھا اور مر گیا۔ اب لوگ کہنے لگے۔ "یہ لڑکا تو وہ علم جانتا تھا جو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ ہم اس لڑکے کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں" لوگوں نے بادشاہ سے کہا: "تم تو تین آدمیوں کی مخالفت سے گھبرا گئے تھے۔ اب یہ سارے لوگ تمہارے مخالف ہو گئے ہیں" پھر بادشاہ نے بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں اور اس میں لکڑیاں ڈال کر آگ لگا دی۔ پھر لوگوں کو اکٹھا کر کے کہنے لگا: "جو شخص اپنے (نئے) دین سے باز آتا ہے اسے تو ہم چھوڑ دیں گے اور جو نہ پھرے اسے ہم آگ میں ڈال دیں گے" پھر وہ مومنوں کو ان خندقوں میں ڈالنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہلاک ہوئے خندقوں والے۔ وہ آگ تھی بہت ایندھن والی تا آنکہ آپ نے عزیز الحمید تک پڑھا۔ پھر فرمایا اور وہ لڑکا جو تھا وہ دفن کیا گیا" راوی کہتا ہے کہ اس لڑکے کی نعش سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نکالی گئی اور وہ انگلی اپنی کنپٹی پر رکھے ہوئے تھا جیسے اس نے قتل کے وقت رکھی تھی۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

[۵] یمن میں حمیری خاندان کا ایک بادشاہ ذونواس بڑا متعصب یہودی تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ بادشاہ بنا اور متعصب یہودی ہونے کی بنا پر عیسائیوں کا سخت دشمن تھا۔ اس دور تک اگرچہ عیسائی مذہب میں بہت سے مشرکانہ عقائد راہ پا گئے تھے۔ تاہم بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو بالکل صحیح عیسائی مذہب پر قائم تھے۔ اور وہ مشرکانہ عقائد کے سخت مخالف اور توحید پرست تھے جس راہب کا مندرجہ بالا حدیث میں ذکر ہے وہ اسی قسم کے صحیح العقیدہ عیسائیوں سے تعلق رکھتا تھا اور ایسے سچے مسلمانوں کو ایذائیں پہنچانے اور خندق میں ڈالنے والے بھی ذونواس اور اس کے کرتا دھرتا درباری لوگ تھے جو عیسائیت کو ہر جائز و ناجائز حربہ سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایمان لانے والوں کے مکمل استیصال کے لیے انہوں نے یہ آگ میں جلا ڈالنے کا حربہ اختیار کیا تھا۔

[۶] اگرچہ احادیث میں ان اصحاب الاخدود کے انجام کے متعلق کچھ صراحت مذکور نہیں تاہم مفسرین لکھتے ہیں کہ یہی آگ ان آگ میں جلانے والوں کے کنٹرول سے باہر ہو گئی اور ان کے گھروں تک پہنچ کر ان کے گھروں کو خاکستر کر ڈالا اور یہ بھی ممکن ہے کہ (وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ) کا جملہ عذاب جہنم ہی کی صفت کے طور پر مذکور ہوا ہو۔ علاوہ ازیں یہ آیت صرف اصحاب الاخدود سے ہی تعلق نہیں رکھتی بلکہ عام ہے اور اس میں کفار مکہ کو انتباہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۝ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۝ بَلِ الَّذِيْنَ

اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں[۷] یہی بڑی کامیابی ہے (۱۱) آپ کے پروردگار کی گرفت[۸] یقیناً بڑی سخت ہے (۱۲) وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا (۱۳) اور وہ بڑا بخشنے والا ہے، محبت[۹] کرنے والا ہے (۱۴) عرش کا مالک[۱۰] ہے بڑی شان والا ہے (۱۵) جو کچھ چاہے اسے کر ڈالنے[۱۱] والا ہے (۱۶) کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر بھی پہنچی؟ (۱۷) (یعنی) فرعون اور ثمود[۱۲] (کے لشکروں کی) (۱۸)

مومن مردوں اور عورتوں کو صرف اس لیے ایذائیں پہنچاتے ہیں کہ وہ ایک اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ ان کا بھی یہی انجام ہوگا۔

[۷] ساتھ ہی مومن مردوں اور عورتوں کو تسلی دی گئی کہ وہ کفار کی ایذا رسانیوں سے گھبرائیں نہیں۔ ان سے پہلے بھی مومنوں پر بڑے بڑے مصائب ڈھائے جا چکے ہیں۔ ان مصائب کو برداشت کرنے کے عوض انہیں اللہ کے ہاں سے جو باغات اور نعمتیں ملنے والی ہیں۔ جن کے مقابلہ میں اس دنیا کی سب تکلیفیں اور مصیبتیں ہیچ ہیں۔

[۸] ایسے مجرموں کو یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ گرفت کرنے پر آتا ہے تو یہ گرفت اتنی شدید ہوتی ہے کہ ایسے مجرموں کا صفحۂ ہستی سے نام و نشان تک مٹا دیتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ گرفت آتی ضرور ہے خواہ جلد آئے یا بدیر۔ اور اگر کوئی شخص اس دنیا میں ایسی گرفت سے بچ بھی جائے تو آخرت میں کبھی بچ نہیں سکے گا۔

[۹] یعنی ایسے مجرموں میں سے بھی اگر کوئی شخص اپنے گناہوں سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دینے والا ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے بے حد محبت ہے۔ وہ کسی کو خواہ مخواہ جتلائے عذاب نہیں کرتا۔ وہ سزا صرف اس وقت دیتا ہے جب کوئی شخص بار بار سمجھانے کے باوجود اللہ سے سرکشی اور بغاوت سے باز نہیں آتا۔

[۱۰] عرش کا مالک ہونے سے مراد پوری کائنات کا مالک ہونا ہے اس لیے کہ اس کا عرش پوری کائنات کو محیط ہے اور مجید بمعنی شان و شوکت میں بڑا کہہ کر انسان کو اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسی ہستی کے مقابلہ میں گستاخانہ رویہ چھوڑ دے ورنہ اسے اس کا بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

[۱۱] یعنی پوری کائنات میں کسی کی بھی یہ طاقت نہیں کہ اللہ جس کام کا ارادہ کر لے اس میں وہ مانع یا مزاحم ہو سکے۔

[۱۲] فرعون کو بھی اپنی سلطنت، حکومت اور لاؤ لشکر پر بڑا گھمنڈ تھا اور قوم ثمود بھی اپنے آپ کو بہت طاقتور سمجھے بیٹھے تھے جنہوں نے اپنے مکانات تک پہاڑوں کے اندر بنا رکھے تھے بلکہ شہروں کے شہر پہاڑوں کے اندر آباد کر رکھے تھے۔ اور کہتے تھے کہ قوت میں ہم سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر جب ان لوگوں نے گھمنڈ میں آ کر اللہ کے مقابلے میں سرکشی کی راہ اختیار کی تو اللہ نے انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ﴿١٩﴾ وَاللَّهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ ﴿٢٠﴾ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ﴿٢١﴾ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴿٢٢﴾

بلکہ کافر تو جھٹلانے میں لگے [۱۳] ہوئے ہیں (۱۹) حالانکہ اللہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے (۲۰) بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے (۲۱) جو لوح محفوظ [۱۴] میں (درج ہے) (۲۲)

[۱۳] یعنی ان کفار مکہ کا شغل اور وطیرہ ہی یہ بن گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو آیات نازل ہوتی ہیں یہ انہیں جھٹلانے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ فرعون اور ثمود کے لشکر بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے اور یہ قریش مکہ تو قوت اور جمعیت کے لحاظ سے ان کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ پھر یہ بیچارے آخر کس کھیت کی مولی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور کسی وقت بھی انہیں برے انجام سے دوچار کر سکتا ہے۔

[۱۴] یہ لوگ جس قرآن کو جھٹلانے کے درپے ہو رہے ہیں وہ بڑی بلند شان والا ہے۔ جس کو جھٹلا دینا ان کے بس کا روگ نہیں۔ البتہ اپنی اس حرکت کی پاداش میں یہ خود تباہ ہو سکتے ہیں۔ قرآن کا لکھا ہوا اٹل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی لوح محفوظ میں ثبت کر رکھا ہے جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ہر طرح کی دستبرد سے، ردوبدل اور ترمیم و تنسیخ سے پاک ہے۔

آیاتہا ۱۷ سورۃ الطارق مکیۃ رکوعہا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝١ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝٢ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝٣ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ

کلمات ۶۱ آیات ۱۷ (۸۶) سورۃ الطارق مکی ہے (۳۶) رکوع ۱ حروف ۲۵۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے آسمان کی اور رات کو آنے والے کی(۱) اور آپ کیا جانیں کہ رات کو آنے والا[۱] کیا ہے ؟(۲) وہ ستارہ[۲] ہے چمکتا ہوا(۳) کہ کوئی جان ایسی نہیں جس پر ایک محافظ[۳] مقرر نہ ہو(۴)

[۱] الطارق: طریق کا معنی راستہ اور طارق بمعنی راستہ پر چلنے والا۔ مگر عرف عام میں طارق بالخصوص اس مسافر کو کہتے ہیں جو صرف رات کو آئے۔ اور ستارے کو طارق اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی صراحت فرما دی کہ یہاں طارق سے مراد عام ستارے بھی نہیں بلکہ شہاب ثاقب ہے۔

[۲] ❁ شہاب ثاقب کی حقیقت:۔ اس مقام پر ﴿النجم الثاقب﴾ کا لفظ آیا ہے۔ دوسرے مقام پر ﴿شہاب ثاقب﴾ اور تیسرے پر ﴿شہاب مبین﴾ کا اور مراد سب سے ایک ہی ہے۔ شہاب ایسے انگارہ کو کہتے ہیں جس میں چمک اور شعلہ دو چیزیں موجود ہوں خواہ یہ آگ کا انگارہ ہو یا آسمان یا فضا میں پایا جائے اور ثاقب میں تیزی سے آرپار ہو جانے اور آگ کی طرح کی سرخ روشنی کا تصور پایا جاتا ہے۔ جبکہ عام ستاروں کی روشنی چاند کی روشنی کی طرح سفید ہوتی ہے۔ گویا ﴿النجم الثاقب﴾ میں تین چیزیں جمع ہو گئیں۔ ایک وہ تیزی سے فضا میں سفر کر رہا ہو۔ دوسرے اس میں چمک موجود ہو اور تیسرے وہ چمک آگ کی طرح سرخی کا رنگ لیے ہوئے ہو۔ ہم اسے اپنی زبان میں ٹوٹنے والا تارہ کہتے ہیں علاوہ ازیں یہاں واحد کا صیغہ استعمال کر کے اس سے جنس مراد لی گئی ہے۔ اور ایسے ستارے سینکڑوں کی تعداد میں فضا میں ٹوٹتے اور پھر ہماری نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ نہ وہ دوسرے ستاروں سے ٹکرا کر نظام کائنات کو درہم برہم کرتے ہیں اور نہ زمین پر گر کر زمین پر قیامت برپا کیے رکھتے ہیں۔ البتہ مدتوں بعد کوئی ایسا ستارہ زمین پر گر کر زمین میں گہرے کھڈ ڈال بھی دیتا ہے لیکن یہ بھی ایک عذاب الٰہی کی شکل اور خرق عادت امر ہوتا ہے۔ ایسے ٹوٹنے والے ستاروں کے متعلق شرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب کوئی جن یا شیطان اوپر ملاء اعلیٰ کی باتیں سننے کے لیے جاتا ہے تو اس پر ایسا شعلہ دار ستارہ پھینک کر اسے وہاں سے مار بھگایا جاتا ہے۔

[۳] ❁ ہر جاندار کی حفاظت کرنے والی ہستی:۔ ان تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی قسم اٹھائی گئی ہے جو اہل زمین کو ﴿شہاب ثاقب﴾ جیسی بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے اور اس بات پر قسم اٹھائی گئی ہے کہ ہر انسان پر ایک نگہبان مقرر ہے جو اس کی ہر طرح سے حفاظت کرتا ہے۔ یہ نگہبان کون ہے؟ یہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ جس کے سنبھالنے سے ہر شے اپنی جگہ سنبھلی ہوئی ہے۔ اور جس نے ہر جاندار کو اس کی ضروریات بہم پہنچانے

لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝۶ يَخْرُجُ مِنۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝۷ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝۸ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝۹ فَمَا لَهُ

لہٰذا انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز[۴] سے پیدا کیا گیا ہے؟(۵) وہ اچھل کر نکلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے(۶) جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں[۵] کے درمیان سے نکلتا ہے(۷) یقیناً اللہ اسے لوٹانے (دوبارہ پیدا کرنے) پر قادر[۶] ہے۔(۸) جس دن اسرار کی جانچ[۷] پڑتال کی جائے گی(۹)

اور اس کی موت کے مقررہ وقت تک آفات ارضی و سماوی سے بچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ یہ حفاظت اکثر اوقات ایسے غیر شعوری طریقوں سے ہوتی ہے کہ انسان کو اس کا علم تک نہیں ہوتا اور جب کبھی علم ہو جاتا ہے تو انسان کی زبان سے بے ساختہ ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں کہ "اس موقعہ پر اللہ نے مجھے ہاتھ دے کر بچالیا ورنہ میرے بچے رہنے کی کوئی توقع نہ تھی" اور ایسے واقعات تقریباً ہر انسان کو اپنی زندگی میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ رعد میں فرمایا: کہ ہر انسان کے آگے پیچھے ہم نے فرشتے مقرر کر دیے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں (۱۳:۱۱) واضح رہے کہ حفاظت کی نسبت براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف ہو یا اس کے فرشتوں کی طرف اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

[۴] عالم بالا کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب انسان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ ذرا اپنی پیدائش پر بھی غور کر لے کہ ماں کے پیٹ میں کون اس کی پرورش کرتا رہا اور کس نے اس کے حمل کو رحم مادر میں جمائے رکھا اور اتنا سخت جمایا کہ بغیر کسی شدید حادثہ کے حمل ضائع نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر جب وہ ماں کے پیٹ سے باہر آیا تو اتنا زیادہ ناتواں اور کمزور تھا جتنا کمزور بچہ دوسری کسی جاندار مخلوق کا نہیں ہوتا۔ پھر دوسری تمام مخلوق سے بڑھ کر اس کی نشوونما کے انتظامات فرمائے۔ پھر پیدائش سے لے کر موت تک اس کی مسلسل نگرانی کرتا رہتا ہے۔ اسے بیماریوں سے، حادثات سے اور طرح طرح کی آفات سے بچاتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی اور زندگی کی بقا کے اتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جنہیں انسان شمار بھی نہیں کر سکتا بلکہ اسے ان کا شعور تک نہیں ہوتا۔ کجا وہ خود فراہم کرنے پر قادر ہو۔ تا آنکہ وہ اپنی اس مدت موت کو پہنچ جاتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی تدبیر اور اس کی نگرانی کے بغیر ہونا ممکن ہے؟۔

[۵] ❁ مادہ منویہ کہاں اور کیسے پیدا ہوتا ہے؟:۔ صُلب۔ صَلَبَ الْعَظْم بمعنی ہڈی سے مغز یا گودا نکالنا اور صلب بمعنی ریڑھ کی ہڈی کا گودا اور چونکہ یہ ہڈی انسان کی پشت کے درمیان ہوتی ہے۔ لہٰذا اس ریڑھ کی ہڈی کو اور پشت کو بھی صلب ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ اور ترائب۔ تریبة کی جمع ہے بمعنی سینہ کی ہڈیاں اور پسلیاں۔ اس آیت کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ نطفہ ان اعضاء سے نکلتا ہے جو صلب اور سینہ کی پسلیوں کے درمیان ہیں۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ مرد کا نطفہ تو صلب سے نکلتا ہے اور عورت کا سینہ کی پسلیوں سے۔ لیکن یہ خیال کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اطباء کا یہ خیال ہے کہ منی خواہ مرد کی ہو یا عورت کی، عمل انہضام کے چوتھے مرحلہ پر پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی تخلیق میں اعضائے رئیسہ یعنی دل، جگر اور دماغ کا خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ اور یہ انہضام چونکہ انسان کے دھڑ کے اندرونی حصے میں واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے صلب اور ترائب کے مابین سے ذکر کر دیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ انسان کا دماغ تو دھڑ میں نہیں ہوتا تو غالباً اسی نسبت سے یہاں صلب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ریڑھ کی ہڈیوں کے درمیان جو مغز یا گودا ہوتا ہے یہ دماغ ہی کا حصہ ہوتا ہے۔

[۶] اللہ تعالیٰ نے ایک شہادت عالم بالا سے پیش فرمائی، دوسری انسان کی تخلیق سے اور یہ دونوں اس بات پر

مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿١٠﴾ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿١١﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿١٢﴾ اِنَّهٗ

تو انسان کے پاس نہ کوئی اپنا زور ہوگا اور نہ ہی[8] کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا (۱۰) قسم ہے آسمان کی جو بار بار بارش برساتا[9] ہے (۱۱) اور زمین کی جو پھٹ[10] جاتی ہے (۱۲) کہ وہ (قرآن) حق کو باطل سے الگ کرنے والا ہے (۱۳)

قوی دلیل ہیں جو ہستی ایسے عظیم الشان کارنامے سرانجام دے رہی ہے وہ یقیناً انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے اور اگر انسان سوچے تو یہ کارنامے انسان کی دوبارہ زندگی سے زیادہ حیرت انگیز اور معجز نما ہیں۔ اب جو شخص ان کارناموں کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتا ہے وہ آخر یہ کیوں نہیں کہتا کہ دنیا میں انسان کے ہاتھوں بنائے ہوئے جتنے کارخانے چل رہے ہیں یہ بھی بس اتفاقی حادثات کے نتیجہ میں سامنے آگئے اور کام کرنے لگے ہیں یا دنیا میں جو شہر آباد ہیں، سڑکیں ہیں اور دریا اور نہریں رواں ہیں یہ بھی سب اتفاقات ہی کا نتیجہ ہیں۔ ایسے سرپھروں کو اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کا علاج صرف ڈنڈا ہے۔

[7] ❁ اسرار کی جانچ کے مختلف پہلو:۔ پوشیدہ اسرار سے مراد ہر انسان کے وہ اعمال بھی ہیں جن کا تعلق نیت اور ارادہ سے تھا اور وہ پورے نہ ہو سکے اور بس ایک راز ہی بن کر رہ گئے۔ نیز وہ اعمال بھی جو دنیا کے سامنے تو آئے مگر جس غرض کے تحت وہ سرانجام دیے گئے تھے اور جو اغراض اور خواہشات ان کی محرک بنی تھیں ان کا کسی کو علم نہ ہو سکا اور وہ اعمال بھی جن کو کرنے والا تو کر کے مر گیا مگر ان کے اثرات مدتوں نوع انسانی پر پڑتے رہے ایسے سب اسرار اس دن کھل کر سامنے آجائیں گے۔

[8] یعنی اس دن کسی انسان کو بھی اتنی قوت حاصل نہ ہوگی کہ وہ اس دن پیش آنے والے مصائب کی مدافعت کر سکے۔ نہ ہی کوئی اس کی مدد کرنے کو وہاں موجود ہوگا۔

[9] ذات الرجع رجوع کے معنی اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہے مگر مجازاً رجع کا لفظ بارش کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور آسمان کو ذات الرجع کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ سمندر سے آبی بخارات اٹھتے ہیں وہ جب آسمان کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں تو ان بلندیوں کی ٹھنڈک ان آبی بخارات کو پھر سے پانی میں تبدیل کر دیتی ہے اور بارش شروع ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بارش برسنے کا عمل فقط ایک بار ہی نہیں ہوتا بلکہ بار بار اور وقتاً فوقتاً ہوتا ہی رہتا ہے۔

[10] ذَاتُ الصَّدْعِ۔ صدع کے معنی کسی چیز کا اس طرح پھٹنا ہے کہ ٹکڑا جدا نہ ہو اور بقول امام راغب ٹھوس اجسام جیسے لوہا، شیشہ، زمین وغیرہ میں شگاف یا سوراخ ہو جاتا ہے اور زمین کو اس لیے ذات الصدع کہا گیا ہے کہ وہ پودوں اور درختوں کی نرم و نازک کونپلوں کو پھٹ کر زمین سے باہر نکلنے کا راستہ دے دیتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے پانی کے چشمے بھی پھوٹ نکلتے ہیں۔ حالانکہ زمین ٹھوس اور سخت چیز ہے اور پانی سیال اور زمین کے مقابلہ میں بہت نرم اور کمزور۔ اس کے باوجود زمین پھٹ کر پانی کو باہر نکلنے کا راستہ دے دیتی ہے۔

لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿١٣﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿١٤﴾ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾

وہ کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں[11] ہے(۱۴) یہ لوگ ایک تدبیر کر رہے ہیں(۱۵) اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں[12](۱۶) پس آپ تھوڑی دیر کے لیے ان کافروں کو ان کے حال[13] پر چھوڑ دیجیے۔(۱۷)

[۱۱] یعنی بارش کے بار بار نزول اور زمین سے نباتات کے اگنے کا پیہم عمل یہ ایک مربوط نظام ہے۔ کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت اور تمہارے مشاہدہ کی بات ہے۔ اسی طرح قرآن بھی جو حقائق پیش کر رہا ہے اور جسے دوٹوک فیصلے بتا رہا ہے وہ بھی ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں۔ یہ کوئی ہنسی مذاق کی باتیں نہیں ہیں بلکہ انہیں پورا ہو کے رہنا ہے۔

[۱۲] کفار یہ چاہتے ہیں کہ ایسی چالیں چلیں، ایسی سازشیں تیار کریں، ایسے کارنامے سرانجام دیں جس سے قرآن کی دعوت کو شکست دی جا سکے۔ وہ اپنی پھونکوں سے اسلام کی شمع کو گل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے برعکس اللہ بھی ان کے مقابلہ میں ایک چال چل رہا ہے کہ وہ اس روشنی کو مکمل کر کے رہے گا اور کافروں کی کسی چال کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ واضح رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کافروں کی چال یا خفیہ تدبیر کو لفظ کید سے تعبیر فرمایا پھر اس کے رد عمل کو اپنی طرف منسوب فرما کر اس کے لیے بھی کید کا لفظ استعمال فرمایا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو کسی چال یا خفیہ تدبیر کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب کا محاورہ ہے کہ وہ کسی بھی کام کے رد عمل کو اسی لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ اسے مشاکلہ کہتے ہیں اور اس کی وضاحت پہلے بھی کئی مقامات پر کی جا چکی ہے۔

[۱۳] یعنی آپ تھوڑی مدت مزید صبر سے کام لیجیے۔ کچھ زیادہ مدت نہ گزرنے پائے گی کہ ان لوگوں کی کرتوتوں کا انجام سب کے سامنے آ جائے گا۔

۱۹ آیاتھا سورۃ الاعلیٰ مکیۃ رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴿۱﴾ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ﴿۲﴾ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ﴿۳﴾ وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى ﴿۴﴾

کلمات ۷۲ آیات ۱۹ (۸۷) سورۃ الاعلیٰ مکی ہے (۸) رکوع ۱ حروف ۲۹۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح [۱] کیجیے جو سب سے برتر ہے (۱) جس نے پیدا کیا پھر اسے درست [۲] کیا (۲) اور جس نے اس کی تقدیر بنائی [۳] پھر راہ دکھائی [۴] (۳) اور جس نے چارہ پیدا کیا (۴)

[۱] سبحان کا لغوی مفہوم: سَبَّحَ: ابن الفارس کے نزدیک لفظ سَبَّحَ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) عبادت کی قسم، اور (۲) دوڑنے کی قسم، اور امام راغب کے نزدیک سبح کا معنی کسی چیز کا پانی، ہوا میں تیرنا یا تیزی سے گزر جانا اور سَبَّاح یعنی تیراک ہے اور سبحان سبح سے مصدر ہے جیسے غفر سے غُفْرَان۔ فضا میں لاکھوں کروڑوں سیارے نہایت تیزی سے گردش کر رہے ہیں جن میں نہ کبھی لرزش پیدا ہوتی ہے نہ جھول اور نہ تصادم یا ٹکراؤ۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان پر کنٹرول کرنے والی ہستی اپنی تقدیر و تدبیر اور انتظام میں نہایت محکم اور ہر قسم کی بے تدبیری، عیب یا نقص سے پاک ہستی ہی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی مدبر ہستی جو اپنی تدبیر محکم سے کائنات کا انتظام چلا رہی ہے وہ اس انتظام و انصرام میں بلا شرکت غیرے مختار کل ہو۔ کیونکہ کسی بھی دوسرے کا عمل دخل اس کائنات کے انتظام میں خلل انداز ہو کر اس میں گڑبڑ پیدا کر سکتا ہے لہٰذا سُبْحَانَ سے مراد وہ ہستی ہو سکتی ہے جو

۱۔ ہر طرح کے عیب و نقص سے پاک ہو۔

۲۔ وہ بلا شرکت غیرے مختار کل بھی ہو اور

۳۔ کائنات کی تمام اشیاء پر پورا پورا کنٹرول بھی رکھتی ہو۔

اور تسبیح کرنے سے مراد ایسی ہستی کو ان صفات کے ساتھ یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کو نماز کا حصہ بنا دیا اور فرمایا کہ اجعلوها في سجودكم (یعنی اس کو اپنے سجدوں میں رکھو) پھر ہدایت فرمائی کہ سجدہ کی حالت میں سبحان ربي الاعلىٰ کہا کرو۔ عقبہ بن عامر جہنی کہتے ہیں کہ آپ نے اس آیت کے مطابق سجدے میں (سبحان ربي الاعلىٰ) اور سورہ واقعہ کی آخری آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ کے مطابق رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ پڑھنے کا حکم دیا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، مسند احمد وغیرہ)

[۲] یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کی سب اشیاء کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اس چیز سے جو کام لینا مقصود تھا اس کے مطابق اس کی شکل و صورت بنائی اور شکل و صورت کو اس طرح ٹھیک ٹھاک اور درست کیا کہ اس کے لیے اس سے بہتر شکل و صورت ممکن ہی نہ تھی۔

فَجَعَلَهُ غُثَآءً اَحْوٰى ۝۵ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝۷

پھر اسے سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا[۵] (۵) ہم آپ کو پڑھا دیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں (۶) بجز اس کے جو[۶] اللہ چاہے، وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور پوشیدہ بھی (۷)

مثلاً ناک کا ایک کام یہ ہے کہ اس سے دماغ کے فضلات خارج ہوتے رہیں اور یہ مقصد ناک کو سر کے پیچھے بنانے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے تصور سے ہی انسان کو گھن آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ناک کو چہرہ پر سامنے بنایا تاکہ چہرے کی خوبصورتی میں اضافہ ہو، نیز انسان کی ناک بہتی ہی نہ رہے بلکہ انسان بوقت ضرورت اپنے ہاتھ سے جھاڑ سکے اور صاف کر سکے۔ یہی صورت حال ایک ایک عضو بلکہ کائنات کی ایک ایک چیز کے متعلق مشاہدہ کی جا سکتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف خالق ہی نہیں بلکہ انتہا درجہ کا حکیم اور مدبر بھی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعضاء کی تخلیق محض اتفاقات کا نتیجہ قطعاً نہیں ہے ورنہ مقاصد کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کے امتزاج کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

[۳] تقدیر بمعنی اندازہ کرنا۔ بنانے سے پہلے کسی چیز کا مکمل نقشہ، اس کی شکل و صورت، اس کے مقاصد اور غرض و غایت کے متعلق پوری سکیم تیار کرنا۔ پھر اس کے متعلق یہ طے کرنا کہ اس چیز کے لیے کس قسم کا مواد درکار ہے۔ کتنی مقدار میں درکار ہے۔ اس چیز میں کیا کیا خصوصیات درکار ہیں۔ تاکہ جس مقصد کے لیے وہ بنائی گئی ہے اسے بطریق احسن انجام دے سکے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق سے پیشتر اس کی تقدیر بنائی ہے۔ کائنات میں آج تک جو اشیاء وجود میں آچکی ہیں اور جو کچھ بعد میں پیدا ہوں گی سب کچھ اللہ کی اس تقدیر یا اندازے یا اسکیم کے مطابق ہو رہا ہے جو اس نے پہلے سے طے کر رکھا ہے۔

[۴] یعنی جس چیز کو جس مقصد کے لیے بنایا، اس چیز کی فطرت میں وہ کام کرنے کا طریقہ بھی ودیعت کر دیا۔ مثلاً ہر دودھ پلانے والے جاندار کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی وہ ماں کی چھاتیوں کی طرف لپکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس بچے کو دودھ چوسنے کا طریقہ فطرتاً سکھا دیا۔ اسی طرح کائنات کی ایک ایک چیز کو وہ راہ بتا دی جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ مثلاً اللہ نے دل کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ سارے جسم میں خون کو پہنچائے تو دل کی ساخت بھی ایسی ہی بنائی اور اسے یہ طریقہ بھی بتلا دیا کہ وہ کس طرح خون کو پمپ کرے گا۔ کسی جاندار کے ارادہ اور خواہش کے بغیر دل از خود ہی یہ کام کیے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر کیا کیا چیزیں ہیں اور وہ کیا کیا کام سر انجام دے رہی ہیں۔ انسان چونکہ دوسری تمام مخلوق سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کو دو قسم کی ہدایت دی گئی ہے۔ ایک اضطراری جو اس کی طبعی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ دوسرے جاندار سے مختلف نہیں اور دوسری ہدایت اختیاری ہے جو اس کے عقل و شعور اور اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی دوسری قسم کی ہدایت کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں۔

[۵] مرعٰی کا لغوی معنی چارہ ہے۔ یعنی جانوروں کی خوراک جو تازہ ہو یعنی گھاس وغیرہ تاہم اس کے وسیع معنوں میں تمام نباتات بھی شامل ہے۔ یعنی اللہ ہی ہے جو زمین پر بہار اور موسم بہار لاتا ہے۔ پھر موسم خزاں بھی لاتا ہے۔ اور اس تازہ نباتات کے فالتو اجزا خس و خاشاک بن کر پاؤں کے نیچے مسلے جاتے ہیں۔ لہٰذا تم لوگوں کو اس دنیا کی بہار پر ہی فریفتہ نہ ہو جانا چاہیے اس پر خزاں بھی آسکتی ہے۔

[۶] جب وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ ﷺ بہ تکلف وحی کے الفاظ یاد رکھنے پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور زبان سے ان الفاظ کی

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿۸﴾ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿۹﴾ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿۱۱﴾ الَّذِىْ

اور ہم آسان طریقہ[۷] پر چلنے کی سہولت دیں گے (۸) پس آپ نصیحت[۸] کیجیے اگر نصیحت نفع دے (۹) جو شخص (اللہ سے) ڈرتا ہے وہ تو نصیحت قبول کر لے گا (۱۰) اور جو بد بخت ہے وہ اس سے پرے ہی رہے گا (۱۱)

ادائیگی کی کوشش بھی کرتے تھے جس سے آپ کی توجہ بٹ جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ذمہ داری لی اور فرمایا کہ آپ صرف توجہ سے سنا کریں۔ بعد میں بعینہٖ وحی کے الفاظ کو آپ کی زبان سے ادا کروا دینا ہمارا کام ہے۔ نیز یہ وحی کے الفاظ آپ ﷺ کے دل میں محفوظ رہیں گے۔ آپ انہیں بھولیں گے نہیں۔ ہاں اگر اللہ چاہے تو آپ بھول بھی سکتے ہیں۔ اب اس کو بھولنے کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ ایک دفعہ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے اور قراءت کے دوران ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد سیدنا ابی بن کعب نے پوچھا: کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں میں بھول گیا تھا۔ (ابوداؤد، کتاب الصلوۃ۔ باب فی فتح علی الامام فی الصلوٰۃ)

اور دوسری صورت وہی ہے جس کا اس حدیث میں بھی ذکر موجود ہے۔ یعنی کوئی آیت ہی منسوخ کر دی جائے۔ یہاں بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو آیات اللہ نے نازل کر دیں پھر ان کو منسوخ کرنے اور بھلا دینے کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں بعض آیات اور احکام ایک مخصوص مدت کے لیے نازل ہوئے۔ بعد میں ان کا باقی رکھنا ضروری نہ رہا۔ جیسے سیدنا ابن عباس کی قراءت کے مطابق فما استمتعتم به منهن کے آگے الی اجل مسمّی کے الفاظ بھی موجود تھے۔ پھر جب متعہ کو مکمل طور پر حرام کر دیا گیا تو اس قرات کے یہ الفاظ بھی منسوخ کر دیے گئے۔ اور اس قسم کی منسوخی کے متعلق قرآن میں بے شمار آیات ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۶، سورہ رعد کی آیات نمبر ۳۹۔ ۴۰، سورہ النحل کی آیت نمبر ۱۰۱۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ کرنا اسی کی شان ہے۔ وہ نازل شدہ وحی میں سے اگر یہ مناسب سمجھے کہ اب اس آیت کی ضرورت نہیں رہی تو وہ اسے منسوخ بھی کر سکتا ہے اور اس منسوخی کی آسان شکل یہ تھی کہ جب آپ جبریل سے دور کرتے تو وہ آیت یا اس کے کچھ الفاظ آپ کو بھلا دیے جاتے تھے۔

[۷] اس آیت کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ کو بلاتکلیف سہولت کے ساتھ قرآن یاد رہے گا۔ دوسرا یہ کہ ہم آپ ﷺ کو آسان اور سہل شریعت پر چلائیں گے۔ تیسرا یہ کہ شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونا ہم آپ ﷺ کے لیے آسان بنا دیں گے۔ چوتھا یہ کہ اسلام کے راستہ سے ہم تمام رکاوٹوں کو دور کر دیں گے اور کامیابی کی راہ پر گامزن ہونا آپ کے لیے آسان بنا دیں گے۔ پانچواں یہ کہ آپ ﷺ کی ذمہ داری بس اتنی ہی ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیں۔ اس سے آگے کسی مشکل میں پڑنا یا بہ جبر لوگوں کو اسلام کی طرف لانا آپ کی ذمہ داری نہیں۔

[۸] یعنی جب آپ دیکھیں کہ آپ کی نصیحت سے لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے تو ایسے لوگوں کو بار بار وعظ و نصیحت کرتے رہیے۔ اور جو لوگ وعظ و نصیحت سے الٹا اثر لیں، مذاق اڑانے لگیں یا مخالفت پر اتر آئیں تو ایسے لوگوں کو وعظ و نصیحت سے اجتناب کیجیے۔ واضح رہے کہ دعوت و تبلیغ اور چیز ہے اور وعظ و نصیحت اور چیز۔ نبی کی ذمہ داری یہ ہے کہ اللہ کا پیغام سب لوگوں تک پہنچا دے خواہ وہ اسے قبول کریں یا برا مانیں۔ لیکن وعظ و نصیحت صرف ان کے لیے ہے جو وعظ و نصیحت سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار

يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ﴿١٢﴾ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴿١٣﴾ قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ﴿١٥﴾ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٧﴾ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٨﴾ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ﴿١٩﴾

اور بڑی آگ میں داخل ہوگا (۱۲) پھر اس میں [۹] نہ مرے گا نہ جیے گا (۱۳) فلاح پاگیا جس نے پاکیزگی اختیار کی [۱۰] (۱۴) اور اپنے پروردگار کا نام یاد کیا پھر نماز ادا کی (۱۵) بلکہ تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو (۱۶) حالانکہ آخرت بہتر [۱۱] اور باقی رہنے والی ہے (۱۷) یہی بات پہلے صحیفوں [۱۲] میں (کہی گئی تھی) (۱۸) (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں (۱۹)

ہوں، سب کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس کے لیے جس کے دل میں کچھ اللہ کا ڈر ہو اور جو ڈرتا ہی نہیں اس کے لیے وعظ و نصیحت کچھ معنی نہیں رکھتے۔

[۹] یعنی اخروی زندگی میں مر تو سکے گا نہیں اور جو زندگی ہوگی وہ عذاب کی وجہ سے موت سے بدتر ہوگی۔ ایسی زندگی پر وہ خود بھی موت کو ترجیح دیں گے مگر موت نام کی وہاں کوئی چیز نہ ہوگی۔

[۱۰] یعنی جس نے اپنے آپ کو کفر و شرک عقائد فاسدہ سے اور اخلاقِ رذیلہ سے پاک کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ یہاں بعض لوگوں نے تزکیٰ سے مراد زکوۃ اور بالخصوص صدقہ فطر اور ﴿وذکر اسم ربہ﴾ سے مراد تکبیرات عیدین اور فصلیٰ سے مراد نماز عید لی ہے۔ اور اگر اس آیت کو اس کے عام مفہوم میں لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یعنی جو شخص اپنے نفس کو پاکیزہ بنالے پھر اللہ کو زبان سے بھی یاد کرتا ہے اور دل میں بھی یاد رکھے۔ پھر اسی کی تائید کے طور پر باقاعدگی سے نمازیں ادا کرتا ہے تو سمجھ لو کہ اس کی زندگی سنور گئی اور کامیاب ہو گیا۔ یہاں کامیابی سے مراد اخروی کامیابی تو یقینی ہے اور اس دنیا میں اس کی کامیاب زندگی کا انحصار اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے کیونکہ دار الجزا آخرت ہے یہ دنیا نہیں۔

[۱۱] یعنی تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو پسند کرتے ہو حالانکہ آخرت دو وجہ سے دنیا سے بہتر ہے۔ ایک تو وہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور دوسرے وہاں کی نعمتیں نہ ختم ہونے والی اور لازوال ہیں جبکہ دنیا کی نعمتیں فانی ہیں۔

[۱۲] یعنی جو صحائف سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوئے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو تورات سے پہلے عطا ہوئے (جو کہ بعض اقوال کے مطابق دس دس تھے) ان میں یہ مضمون قد افلح سے خیر و ابقیٰ تک مذکور تھا۔ یہ مضمون نہ کبھی منسوخ ہوا اور نہ بدلا گیا۔

۲۶ آیاتھا سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴
تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝۶ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝۷

کلمات ۹۳ آیات ۲۶ (۸۸) سورۃ الغاشیہ مکی ہے (۶۸) رکوع ۱ حروف ۳۸۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کیا آپ کو چھا جانے[۱] والی (آفت) کی خبر پہنچی؟(۱) اس دن کچھ چہرے خوف زدہ[۲] ہوں گے(۲) سخت محنت[۳] کرنے والے، تھکے ماندے ہوں گے(۳) دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے(۴) انہیں کھولتے ہوئے پانی کے چشمہ سے پینے کو پانی دیا جائے گا(۵) خاردار سوکھی گھاس[۴] کے علاوہ ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا(۶) جو نہ موٹا کرے گا، نہ بھوک[۵] دور کرے گا(۷)

[۱] غَاشِيَةٌ: غَشِيَ بمعنی ایک چیز پر دوسری چیز کا چھا کر اسے ڈھانپ لینا اور غشی ایسی حالت کو کہتے ہیں جبکہ انسان کے ہوش و حواس زائل ہو جائیں اور غاشیہ بمعنی وہ چیز جس کی ہیبت ہر شخص پر چھا جائے گی۔ ہوش و حواس گم کر دینے والی اور اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

[۲] اس دن تمام مخلوق دو گروہوں میں بٹ جائے گی۔ ایک وہ جو اس دنیا میں اللہ کے فرمانبردار بن کر رہے۔ اور دوسرے وہ جو نافرمان اور باغی ہوں گے۔ نافرمان لوگوں کا پہلے ذکر فرمایا چونکہ ان لوگوں کو اپنی کرتوتوں کا علم ہوگا۔ لہٰذا اعمال نامے دیئے جانے اور حساب کتاب اور فیصلہ سے پہلے ہی ان کے چہرے اترے ہوئے اور خوفزدہ ہوں گے کیونکہ انہیں اپنا انجام نظر آ رہا ہوگا۔

[۳] بعض مفسرین نے اس آیت کو آخرت سے متعلق کیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایسے لوگوں کے گلوں میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی۔ اسی حال میں کبھی انہیں کسی بلندی پر چڑھنے کا حکم دیا جائے گا اور کبھی اترنے کا۔ اسی محنت و مشقت کی وجہ سے وہ تھک کر چور ہو جائیں گے۔ اور بعض نے اسے دنیا سے متعلق کیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ دنیا میں محنت اور ریاضت کر کے تھک چکے ہوں گے لیکن ان کے نیک اعمال بھی شرک یا کسی دوسری وجہ سے برباد ہو جائیں گے تو ایسے لوگ بھی اپنے انجام سے سخت خوفزدہ ہوں گے۔

[۴] ❁ دوزخیوں کی مختلف غذائیں: ضَرِيْعٌ ایک خاردار گھاس جس کا ذائقہ انتہائی تلخ اور بو ناگوار ہوتی ہے اور جب سوکھ جاتی ہے تو زہر بن جاتی ہے۔ عربی میں اسے شبرق بھی کہتے ہیں۔ اہل دوزخ کی یہی غذا ہوگی۔ واضح رہے کہ قرآن میں بعض مقامات پر اہل دوزخ کی خوراک تھوہر کا درخت ذکر ہوئی ہے اور بعض مقامات پر غسلین یعنی زخموں کا دھوون اور اس مقام پر

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾
فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿١٣﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّنَمَارِقُ
مَصْفُوْفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿١٦﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَى السَّمَاۗءِ

اور کچھ چہرے اس دن ہشاش بشاش ہوں گے (۸) اپنی کارکردگی پر خوش[6] ہوں گے (۹) اونچی جنت میں (۱۰) جہاں وہ کوئی لغویات[7] نہ سنیں گے (۱۱) اس میں ایک چشمہ جاری ہوگا (۱۲) اس میں اونچے رکھے ہوئے تخت ہوں گے (۱۳) اور ساغر (قرینے سے) رکھے ہوئے ہوں گے (۱۴) گاؤ تکیے قطار میں لگے ہوں گے (۱۵) اور مخملی فرش بچھے ہوں گے (۱۶)

کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں[8] دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا؟ (۱۷) اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیا گیا؟ (۱۸)

ضریع بتائی گئی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ مختلف قسم کے مجرموں کی خوراک مختلف ہو، دوسری وجہ اختلاف زمانہ ہے یعنی کسی دور میں ایک قسم کی خوراک دی جائے گی اور دوسرے دور میں دوسری قسم کی اور اس کی تیسری وجہ تنوع بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی کبھی ایک خوراک دی جائے اور کبھی دوسری اور کبھی تیسری۔

[۵] غذا کے تین فائدے:۔ یعنی کوئی چیز کھانے کے تین ہی سبب ہوتے ہیں۔ ایک لذت حاصل کرنے کے لیے کھایا جائے۔ دوسرے بھوک دور کرنے کے لیے اور تیسرے غذائیت اور جسم کی تقویت کے لیے۔ ضریع سے لذت کے بجائے اس سے نفرت ہوگی کیونکہ وہ خاردار، بدبودار، تلخ اور زہریلا ہوگا۔ باقی دو اغراض کی قرآن نے صراحت سے نفی کر دی۔ گویا اس کے کھانے سے تکلیف ہی بڑھے گی اور فائدہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔

[۶] اب دوسرے گروہ کا حال سنیے۔ ان لوگوں نے دنیا میں اسلام کی خاطر جو سختیاں برداشت کی تھیں آج وہ اپنے زندگی کے کارناموں پر بہت خوش ہوں گے۔ اس لیے کہ انہیں ان کا بہترین بدلہ ملنے کی توقع ہوگی۔ اسی لیے ان کے چہرے پررونق، امید افزا اور ہشاش بشاش ہوں گے۔

[۷] وہاں نہ کسی قسم کا غل غپاڑہ ہوگا نہ شور شرابا، نہ جھوٹ اور چغلی، نہ گالی گلوچ اور نہ بیہودہ مذاق۔ سب کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوں گے۔ کسی کا دوسرے سے کوئی تنازعہ نہ ہوگا سب محبت واخوت سے رہیں گے اور ایک دوسرے کے لیے سلامتی کی دعائیں کرتے رہیں گے اور یہ جنت کی ایسی نعمت ہوگی جسے اللہ تعالیٰ نے جنت کی بڑی بڑی نعمتوں میں شمار کیا ہے۔

[۸] اللہ تعالیٰ نے عرب کے بدو اور خانہ بدوشوں کو سب سے پہلے اونٹ کی طرف توجہ دلائی جو ان کے نزدیک ایک قیمتی متاع اور صحرائی سفر میں ان کا مستقل رفیق تھا جو دس دس دن پانی پینے کے بغیر گزارہ ہی نہیں کر سکتا بلکہ بے تکلف سفر بھی جاری رکھ سکتا ہے۔ خاردار جھاڑیاں اور خشک گھاس اور پتے کھا کر شکم پروری کر لیتا ہے۔ ریت میں اس کے پاؤں نہیں دھنستے اور بے تکلف سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ ریت کی وجہ سے تھک نہیں جاتا اور سب سے بڑھ کر یہ سب باربردار جانوروں سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے۔ گویا یہ جانور ان لوگوں کی روح رواں تھا۔ عظیم الجثہ اور عجیب الخلقت۔ مثل مشہور ہے۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ اور اہل

كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ فَذَكِّرْ إِنَّمَا
أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ
الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾

اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے نصب کیے گئے؟(۱۹) اور زمین کی طرف[9] کہ کیسے بچھائی گئی؟(۲۰) پس آپ نصیحت کرتے رہیے۔ آپ بس نصیحت کرنے والے ہی ہیں(۲۱) آپ ان پر محاسب[10] نہیں ہیں(۲۲) البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور کفر کرے گا(۲۳) تو اللہ اسے بہت بڑی سزا دے گا(۲۴) بلاشبہ انہیں ہماری طرف ہی واپس[11] آنا ہے(۲۵) پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے۔(۲۶)

عرب کی بالخصوص توجہ اس جانور کی طرف اس لیے دلائی گئی کہ انہیں صحرائی زندگی کے لیے اونٹ کے علاوہ کوئی دوسرا جانور کام ہی نہ دے سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حسب حال انہیں ایسا کار آمد جانور مہیا فرما دیا۔ اور اسی کی پیدائش میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔

[9] ❁ خانہ بدوشوں کی کل کائنات کیا تھی؟ اور اللہ کی نشانیاں:۔ ان خانہ بدوش بدوؤں کی زندگی کے مشاہدات کیا تھے؟ بس یہی کہ ادھر ادھر منتقل ہونے کے لیے اونٹ جو ان کی سواری اور بار برداری کا کام دیتا تھا۔ اوپر آسمان تھا، نیچے زمین اور ارد گرد پھیلے ہوئے طویل سلسلہ ہائے کوہ۔ یہی چیزیں ان کی کل کائنات تھی۔ ان میں ایک ایک چیز کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی گئی۔ آسمان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس میں لاکھوں اور کروڑوں سیارے محو گردش ہیں۔ زمین کی یہ کیفیت ہے کہ گول ہونے کے باوجود جتنا بھی اس پر سفر کرتے جاؤ ہموار ہی نظر آتی ہے۔ اور یہ بھی زمین کی وسعت کی دلیل ہے۔ پہاڑ زمین پر اس طرح گاڑ دیے گئے ہیں کہ خود تو اپنی جگہ سے ذرا بھر نہیں ہلتے البتہ زمین کے ہلنے اور ڈگمگانے کو ختم کر دیا ہے۔ ان لوگوں سے پوچھا یہ جا رہا ہے کہ کیا ان لوگوں نے کبھی یہ سوچا کہ اونٹ کیسے بن گئے؟ اتنا بڑا آسمان بنانے والا کون ہے؟ یہ پہاڑ زمین میں کیسے نصب ہو گئے۔ اور یہ زمین کیسے بچھ گئی۔ یہ ساری چیزیں اگر اللہ تعالیٰ بنا سکتا ہے تو آخر دوسرا عالم کیوں نہیں بنا سکتا اور قیامت کیوں قائم نہیں کر سکتا؟ کیا انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ ان ساری چیزوں کو اس لیے مان لے کہ انہیں وہ دیکھ رہا ہے اور قیامت اور جنت و دوزخ کا صرف اس بنا پر انکار کر دے کہ ان چیزوں کو اس نے دیکھا نہیں یا اس کے تجربہ میں نہیں آئیں؟ آخر اسے عقل و شعور کس بنا پر عطا کیا گیا ہے؟ کیا اس لیے کہ جو چیزیں اسے نظر نہیں آتیں بلا سوچے سمجھے ان کا انکار کر دے؟

[10] آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ اللہ کا پیغام سب کو پہنچا دیں۔ پھر جو لوگ آپ ﷺ کی باتوں پر کان دھریں انہیں نصیحت کرتے رہیں اور جو اللہ کی آیات کا مذاق اڑائیں ان کے پیچھے نہ پڑیں کیونکہ انہیں زبردستی راہ راست پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

[11] إیاب کی ضد ذهاب اور ذهاب و ایاب یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص لاہور سے اسلام آباد جاتا ہے تو وہ ذہاب ہے اور جب وہاں سے واپس لاہور آتا ہے تو یہ ایاب ہے۔ اور یہ لفظ صرف جانداروں کے لیے آتا ہے اور اس میں یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ اس میں واپس لوٹنے والے کے ارادہ کا بھی کچھ عمل دخل ہے۔ گویا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بہرحال ہمارے پاس واپس آنا پڑے گا۔ اس وقت ہم ان سے یقیناً حساب لے لیں گے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم انہیں حساب لیے بغیر نہ چھوڑیں۔

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ ۳۰ آیاتھا رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ

کلمات ۱۳۷ آیات ۳۰ (۸۹) سورۃ الفجر مکی ہے (۱۰) رکوع ۱ حروف ۵۸۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

فجر کی قسم[۱] (۱) اور دس راتوں[۲] کی (۲) اور جفت[۳] اور طاق کی (۳) اور رات کی جب وہ گزر[۴] جائے (۴) ان باتوں میں اہل عقل کے لیے ضرور ایک بھاری قسم[۵] ہے (۵)

[۱] فجر یا سپیدہ سحر کے نمودار ہونے کے وقت کی اہمیت یہ ہے کہ اس وقت غفلت سے سوئی ہوئی ساری دنیا کو بیداری کا پیغام ملتا ہے۔ رات کو انسان تھکن سے چور ہو کر سوتا ہے اور صبح جب بیدار ہوتا ہے تو یہ بالکل تازہ دم ہوتا ہے۔

[۲] دس راتوں سے مراد بعض مفسرین نے رمضان کا آخری عشرہ لیا ہے۔ جن میں لیلۃ القدر ہوتی ہے اور بعض مفسرین نے فجر سے عام فجر نہیں بلکہ یوم النحر یا عیدالاضحیٰ کی فجر مراد لی ہے اور دس راتوں سے مراد یکم ذی الحجہ سے دس ذی الحجہ تک کی راتیں ہیں اور یہ دونوں قسم کی دس دس راتیں بڑی فضیلت والی اور اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔

[۳] ❁ شفع اور وتر کا لغوی مفہوم:۔ شَفَعَ: لفظ شَفَع کا اطلاق ان اشیاء پر ہوتا ہے جن میں نر و مادہ کی تمیز نہیں اور شفع کے معنی ایک چیز کو اسی جیسی دوسری چیز سے ملا دینا اور اس طرح کرکے دو دو ملی ہوئی چیزوں کو شفع کہتے ہیں۔ اور جس کے ساتھ اس جیسی چیز نہ ہو اسے وتر کہتے ہیں۔ وتر کی بہترین مثال خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور نمازوں میں اس کی مثال نماز مغرب کے فرض ہیں اور عشاء کے آخر میں وتر کی نماز اور وتر کی نماز کو وتر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ جتنے بھی پڑھے جائیں۔ مثلاً ایک، تین، پانچ، سات، نو، گیارہ وہ وتر ہی رہیں گے۔ اور وتر حقیقتاً ایک ہی رکعت ہے اب اس کے ساتھ جتنے بھی جفت نفل پڑھے جائیں۔ ایک وتر سب کو وتر بنا دے گا۔ اور اعداد میں ہر وہ ہندسہ جو دو پر تقسیم ہو جائے وہ شفع یا جفت ہے۔ جیسے دو، چار، چھ، آٹھ وغیرہ اور جو دو پر پورا تقسیم نہ ہو وہ وتر یا طاق ہے۔ جیسے ایک، تین، پانچ، سات وغیرہ۔ مثلاً سات کے وتر ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چھ کے تو تین جوڑے جوڑے بن گئے اور ساتویں وتر نے مل کر سب کو وتر بنا دیا۔ کائنات میں اکثر اشیاء میں تو نر و مادہ کی تقسیم پائی جاتی ہے اور جن میں نہیں پائی جاتی ان میں بھی زوج ہوتا ہے۔ جیسے جوتی کا ایک پاؤں دوسرے پاؤں کا زوج ہے اور جب یہ دونوں اکٹھے ہو گئے تو یہ شفع یا جفت ہو گیا۔ اور بعض ایسی چیزیں ہیں جن کی مثل کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ یہی اشیاء وتر ہیں اور ایسی اشیاء کی موجودگی اور استقلال اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

[۴] یَسْرِ: سرٰی۔ یسری کا لفظ رات کو چلنے کے لیے مخصوص ہے، رات کو سفر کرنا اور ساریہ رات کو سفر کرنے والی چھوٹی سی جماعت کو کہتے ہیں۔ اور اسریٰ کے معنی کسی دوسرے کو رات کے وقت سیر کرانا، لے چلنا، سفر کرانا (۱:۱۷) اس لحاظ سے اس کا ایک معنی تو یہ ہوگا کہ اس رات کی قسم جب رسول اللہ ﷺ نے معراج کا سفر کیا اور دوسرا معنی یہ ہے کہ رات کی قسم جب وہ خود

حِجْرٍ ۝ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا؟(۶) اونچے ستونوں والے (عاد) ارم[۶] کے ساتھ (۷) جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ممالک[۷] میں پیدا نہیں کی گئی (۸) اور ثمود کے ساتھ (کیا سلوک کیا) جنہوں نے وادی[۸] میں چٹانیں تراشی تھیں (۹) اور میخوں والے[۹] فرعون کے ساتھ (۱۰)

جانے لگے یا رخصت ہونے لگے۔ اس لحاظ سے ان آیات میں ایک ہی وقت دو طرح کے انداز بیان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی رات کے رخصت ہونے کا وہی وقت ہوتا ہے جب پو پھوٹتی یا سپیدہ سحر نمودار ہوتا ہے۔

[۵] حجر بمعنی پتھر اور ہر ٹھوس اور سخت چیز جو آڑ کا کام دے سکے۔ اور عقل کو بھی حجر کہتے ہیں وہ اس لحاظ سے کہ وہ بھی ہر اس چیز کو جو نقصان دہ ہو روک دیتی ہے۔ اور ذی حجر یعنی صاحب عقل یا عقلمند۔ اور اس آیت کا دوسرا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے: کیا یہ (مذکور چار چیزیں) عقلمندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق نہیں؟ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی نکلتا ہے یعنی مذکورہ اشیاء اس نظام کائنات کے نہایت اہم اجزا اور اپنے اپنے مقام پر بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ پھر کیا وہ ہستی جو ایسا نظام کائنات چلا رہی ہے عالم آخرت کو وجود میں نہ لا سکے گی۔

[۶] ❁ ذکر قوم عاد:۔ ان شہادتوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قوم عاد کا ذکر کیا۔ قوم عاد کو عاد اولیٰ بھی کہا جاتا ہے اور عاد ارم بھی۔ عاد ارم وہ اس لحاظ سے ہیں کہ ارم بن سام بن نوح کی اولاد تھے اور ذات العماد کی کئی توجیہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود بہت بلند و بالا قد و قامت رکھتے تھے۔ دوسری یہ کہ بلند و بالا عمارتیں بنانے کا آغاز انہوں نے ہی کیا تھا۔ تیسری یہ کہ جب وہ سفر کرتے تھے تو اپنے خیمے نصب کرنے کے لیے بہت اونچی اور مضبوط لکڑیاں استعمال کرتے تھے جیسے وہ ستون ہیں۔

[۷] یعنی اتنی بلند قامت، زور آور اور مضبوط قوم روئے زمین پر اور کہیں موجود نہ تھی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں ساری دنیا میں انہیں کا ڈنکا بجتا تھا، کوئی دوسری قوم ان کی ٹکر کی موجود نہ تھی۔ یہ لوگ بھی آخرت کے منکر فلہٰذا بدکردار اور اللہ کے باغی تھے۔ ان پر سخت ٹھنڈی اور تیز آندھی کا عذاب آیا جس نے انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

[۸] ❁ ذکر قوم ثمود:۔ دوسری قوم ثمود تھی جسے عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ماہر سنگ تراش تھی۔ پہاڑوں کے اندر اپنے مکان تو کجا شہروں کے شہر پتھروں کو تراش تراش کر بنا رکھے تھے ان لوگوں کا مسکن وادی القریٰ تھا جو مدینہ اور تبوک کے راستہ پر پڑتا ہے۔ یہ بھی آخرت کے منکر فلہٰذا اللہ کے باغی تھے۔ اللہ نے انہیں زلزلے اور چیخ کے عذاب سے تباہ کر دیا۔ زلزلہ اتنا شدید تھا کہ ان کے پتھروں کے مکانوں میں دراڑیں اور شگاف پڑ گئے۔ پھر ان میں سے بہت سے مکان پہاڑ کے بوجھ کی وجہ سے کھنڈر بن گئے اور وہ خود زلزلہ اور چیخ کی تاب نہ لا کر مر گئے۔

[۹] ❁ فرعون اور قوم فرعون:۔ تیسری سرکش قوم فرعون اور اس کی قوم تھی۔ اور فرعون کو "میخوں والا" کہنے کی بھی کئی

طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡهَا الۡفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَیۡهِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾
اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَکۡرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَیَقُوۡلُ

جنہوں نے بہت سے شہروں میں سرکشی کی(۱۱) اور ان میں بہت فساد مچا دیا(۱۲) تو آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا[۱۰] برسا دیا(۱۳) بلاشبہ آپ کا پروردگار تو تاک[۱۱] میں ہوتا ہے(۱۴) مگر انسان کا یہ حال ہے کہ جب اس کا پروردگار اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو کہتا ہے کہ: میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی(۱۵)

توجیہات بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ میخوں والے سے مراد اس کی سلطنت کی مضبوطی ہے جیسے اس سلطنت کی جڑیں میخوں کی طرح زمین میں ٹھونک دی گئی ہوں۔ دوسری یہ کہ میخوں سے مراد اس کی افواج اور لاؤ لشکر ہیں جن کے بل بوتے پر وہ اللہ کا باغی اور مد مقابل بن بیٹھا تھا۔ تیسری یہ کہ جب اس کے لشکر نقل و حرکت کرتے تو خیموں کو نصب کرنے کے لیے بڑی بڑی میخیں استعمال کرتے تھے۔ اور چوتھی یہ کہ جب اس نے کسی کو سولی چڑھانا ہوتا تو اسے تختہ دار پر رسیوں سے کسنے کے بجائے اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونک دیا کرتا تھا اور یہ سب باتیں اس کی قوت، اس کی نخوت، غرور اور سنگدلی پر دلالت کرتی ہیں۔ فرعون اور اس کی قوم بھی آخرت کی منکر اور اللہ کی نافرمان تھی۔ ان لوگوں کو اللہ نے بحر قلزم میں غرق کر کے دنیا کو ان کے وجود سے پاک کر دیا۔

[۱۰] ان تینوں تاریخی واقعات میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ سب اقوام آخرت کی منکر تھیں۔ اور جو فرد یا قوم آخرت پر ایمان نہ رکھتی ہو۔ وہ اپنی زندگی بے باکانہ اور شتر بے مہار کی طرح گزارتی اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ ایک مخصوص حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو اس کے گناہوں کا ڈول بھر جاتا ہے اور عذاب الٰہی کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ ان واقعات سے استدلال یہ پیش کیا گیا ہے کہ آخرت کا عقیدہ محض تصوراتی نظریہ نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اور جس طرح انسان کسی ٹھوس حقیقت کے مقابلہ پر اتر آنے اور ٹکرانے سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ آخرت کے منکروں کا بھی یہی حال ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

[۱۱] تاک یا گھات ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی کی انتظار میں اس لیے چھپا بیٹھا ہوتا ہے کہ جب وہ چیز اس کی زد میں آئے تو اس کے جال میں پھنس جائے۔ گزرنے والا اپنے انجام سے غافل اور بے فکری سے جا رہا ہوتا ہے کہ اچانک شکار ہو جاتا ہے۔ یہی صورت حال اللہ کے مقابلہ میں ان ظالموں کی ہے جنہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ کوئی ہستی انہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ بڑی دیدہ دلیری سے گناہوں میں آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ وہ حد آ جاتی ہے جس سے آگے اللہ انہیں بڑھنے نہیں دینا چاہتا، اس وقت اچانک ان پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔ اور اگر کسی فرد یا قوم پر دنیا میں ایسا وقت نہ بھی آئے تو ہر شخص کی موت اس کا یقینی وقت ہے۔ جیسا کہ مجاہدؒ کہتے ہیں کہ لبالمرصاد کا معنی الیه المصیر یعنی سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

رَبِّيٓ أَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَأَمَّآ إِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيٓ أَهَانَنِ ﴿١٦﴾ كَلَّا
بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿١٨﴾ وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ
أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾ كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ

اور جب اسے آزمائش میں ڈال کر اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل [۱۲] کر دیا۔(۱۶) (یہ معیار) ہرگز (درست) نہیں بلکہ تم لوگ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے (۱۷) اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو (۱۸) اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو (۱۹) اور مال سے بہت [۱۳] زیادہ محبت کرتے ہو (۲۰) ہرگز نہیں [۱۴] جب زمین کوٹ کوٹ [۱۵] کر برابر کر دی جائے گی (۲۱) اور آپ کا پروردگار آئے [۱۶] گا اس حال میں

[۱۲] ❁ رزق کی کمی بیشی دونوں میں انسان کی آزمائش:۔ اللہ تعالیٰ انسان کی دونوں طرح سے آزمائش کرتا ہے۔ نعمتوں اور مال و دولت کی فراوانی سے بھی کہ آیا انسان اللہ کی نعمتوں کا شکر بجا لاتا ہے؟ اور رزق کی تنگی سے بھی کہ آیا انسان ایسے اوقات میں صبر سے کام لیتا ہے اور اللہ کی رضا پر راضی و مطمئن رہتا ہے؟ مگر مال و دولت کے معاملہ میں انسان کی قدریں ہی عجیب اور غلط قسم کی ہیں۔ جب اس پر انعامات کی بارش ہو رہی ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میں آزمائش میں پڑا ہوا ہوں بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ آج کل مجھ پر بڑا مہربان ہے اور جب تنگی کا دور آتا ہے۔ اس وقت بھی وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میری آزمائش کی جا رہی ہے بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے تو میری توہین کر ڈالی ہے۔ گویا اس کی نظروں میں عزت اور ذلت کا معیار صرف مال و دولت کی کمی بیشی ہے۔ مال و دولت زیادہ ہو تو ایسا آدمی معزز ہے اور اگر تنگ دست ہو تو وہ ذلیل ہے۔

[۱۳] یعنی کسی کی عزت و ذلت کو ماپنے والی تمہاری قدر ہی سراسر غلط ہے۔ عزت و ذلت کا اصل معیار پیسہ اور مال و دولت نہیں بلکہ اس کا اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار ہوتا ہے۔ مگر تمہارا یہ حال ہے کہ مال و دولت کو ہی اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو اور اسی پر مرتے ہو۔ یتیموں اور بیواؤں کی عزت کرنا تو درکنار ان کے پاس اگر کوئی چیز موجود ہو تو اسے بھی اڑا لینے کی کوشش کرتے ہو۔ تمہاری پیسہ سے محبت اور لالچ کا یہ حال ہے کہ کسی مسکین کی احتیاج دور کرنے کے لیے اسے کچھ دینا یا کھانا کھلانا تو درکنار دوسروں کو ترغیب بھی نہیں دیتے۔ میت کی وراثت سے بیوہ کو لڑکیوں کو اور بچوں سب کو محروم کر دیتے ہو۔ اور جس کا زور چلتا ہے وہی ساری میراث ہڑپ کر جاتا ہے تمہیں تو بس پیسہ ہی چاہیے اور اس کے حصول کے لیے ہر جائز اور ناجائز ذریعہ اختیار کرنے پر پہلے سے ہی تیار بیٹھے ہوتے ہو۔ تمہارے لچھن یہ ہوں تو اللہ کے نزدیک تمہاری عزت کیوں ہو؟۔

[۱۴] یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہاری ایسی کرتوتوں کی تم سے باز پرس نہ کی جائے اور ایسا وقت یقیناً آنے والا ہے۔

[۱۵] یعنی زمین پر متواتر زلزلوں اور ضربوں سے اس کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور سب نشیب و فراز برابر کر دیے جائیں گے اور زمین ایک چٹیل میدان بنا دی جائے گی۔

[۱۶] یہ آیت بھی عقل پرستوں کے لیے آزمائش ہے اور وہ طرح طرح سے اس کی تاویل کرتے ہیں۔ انہیں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے وہ آئے گا کہاں سے؟ حالانکہ آیت کے الفاظ اتنے واضح ہیں کہ ان میں تاویل کی کوئی گنجائش نظر

وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى

لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾

وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى

ع ۱ / ۱۴ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

کہ فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے (۲۲) اور جہنم اس دن سامنے لائی جائے گی، اس دن انسان نصیحت تو قبول کرے گا مگر اس وقت اسے [۱۷] نصیحت سے کیا حاصل ہوگا؟ (۲۳) کہے گا: کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا (۲۴) پھر اس دن اللہ اسے ایسا عذاب دے گا جیسا کوئی بھی نہیں دے سکتا (۲۵) اور جیسے وہ جکڑے [۱۸] گا کوئی بھی نہیں جکڑ سکتا (۲۶) اے اطمینان [۱۹] پانے والی روح (۲۷) اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی (۲۸) تو میرے (نیک) بندوں میں شامل [۲۰] ہو جا (۲۹) اور میری جنت میں داخل ہو جا (۳۰)

نہیں آتی۔ ہمارا کام صرف یہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ فرمائے اسے من و عن تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سات آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے۔ وہاں سے وہ کیسے آئے گا یہ جاننے کے ہم مکلف نہیں جیسے اس کی شان ہے ویسے ہی آئے گا۔ اور اس حال میں آئے گا کہ فرشتے صفیں باندھے قطار در قطار اس کے ساتھ ہوں گے۔ یہی وہ دن ہوگا جب تم لوگوں سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی۔

[۱۷] یعنی جب آخرت اور جنت و دوزخ کے منکرین جہنم کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیں گے تو کہیں گے کہ آج ہمیں جو بھی نصیحت کی جائے اور حکم دیا جائے ہم اسے ماننے کو تیار ہیں۔ مگر اس وقت چونکہ ان کی فرمانبرداری اختیاری نہیں اضطراری ہوگی۔ ان کا ایمان لانا بالغیب نہیں بلکہ بالشہادت ہوگا لہٰذا اس کی کچھ قدر و قیمت نہ ہوگی۔ کسی چیز کو دیکھ کر تو ہر کوئی یقین کر ہی لیتا ہے۔ اس دن ایسے لوگ بڑی حسرت سے کہیں گے کہ کاش ہم نے دنیا میں یہ نصیحت قبول کر لی ہوتی۔ اور آج کے دن کے لیے ہم نے بھی کچھ اچھے کام کیے ہوتے۔

[۱۸] ایسے لوگوں کو اس اس دن ایسی سخت مار پڑے گی اور سزا ملے گی جیسی کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا۔ فرشتے ان کے گلوں میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر جہنم میں پھینک دیں گے پھر اوپر سے جہنم کو بند کر دیا جائے گا۔ اس میں سانپ اور بچھوؤں کے ڈسنے کا عذاب الگ ہوگا اور فرشتوں کے مارنے اور ڈانٹنے کا الگ۔ پھر ذہنی عذاب یہ ہوگا کہ اس عذاب سے نجات کی انہیں کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔ علاوہ ازیں یہ عذاب وقتی اور عارضی نہیں بلکہ مستقل اور دائمی ہوگا۔ یہ فکران کے جسمانی عذاب کو کئی گنا زیادہ بنا دے گی۔

[۱۹] نفس مطمئنۃ کیا ہے؟ اس کی وضاحت کے لیے سورۃ القیامۃ کی آیت نمبر ۲ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیے۔

[۲۰] یہ بات اسے موت کے وقت بھی کہی جائے گی۔ میدانِ محشر میں قبروں سے اٹھنے اور میدان محشر کی طرف چلتے وقت بھی کہی جائے گی۔ اور عدالت الٰہی میں فیصلہ کے بعد بھی کہی جائے گی۔ گویا ہر مرحلے پر اسے یہ اطمینان دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندوں میں شامل ہے اور جنت کا مستحق ہے۔

۲۰ آیاتها سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ ركوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

لَآ أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَأَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ

کلمات ۸۲ آیات ۲۰ (۹۰) سورۃ البلد مکی ہے (۳۵) رکوع ۱ حروف ۳۴۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا[۱] ہوں (۱) اور آپ اس شہر کو حلال[۲] بنانے والے ہیں (۲) اور والد[۳] (آدم) اور اس کی اولاد کی قسم (۳) کہ ہم نے انسان کو سختی جھیلتے رہنے والا پیدا کیا ہے (۴)

[۱] مسلمانوں کے علاوہ کفار مکہ کے ہاں بھی مکہ کی اہمیت و عظمت مسلّم تھی۔ بلکہ کفار مکہ تو اس شہر کی برکت کی وجہ سے کئی طرح کے دنیوی، تجارتی اور سیاسی مفادات بھی حاصل کر رہے تھے۔ عرب بھر میں ان کی عزت و وقار اور دولت و شہرت کا سبب یہی شہر اور اس میں کعبہ کی موجودگی تھی۔

[۲] ❁ حلّ کا لغوی مفہوم:۔ حِلٌّ: حَلَّ کا بنیادی معنی "گرہ کھولنا" اور اس کی ضد عَقَدَ یعنی گرہ لگانا ہے۔ ارباب حل و عقد، اربابِ بست و کشاد مشہور الفاظ ہیں۔ اور سامان باندھنے اور کھولنے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مسافر سامان باندھ کر سفر پر جاتا ہے اور جہاں فروکش ہوتا ہے تو سامان کھول دیتا ہے۔ لہٰذا حل کا لفظ کسی جگہ اترنے، فروکش ہونے اور قیام پذیر ہونے کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ علاوہ ازیں حلال کا لفظ حرام کے مقابلہ میں بھی آجاتا ہے۔ حرام ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے سختی سے منع کیا جائے یعنی اس پر گرہ لگادی جائے اور حلال اس گرہ کے کھولنے کو کہتے ہیں۔ اور حِلٌّ، حَلَّ سے اسم فاعل ہے۔ اسی وجہ سے حل کے یہاں کئی معنی کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مکہ وہ شہر ہے جہاں آپ کسی وقت فاتحانہ حیثیت سے فروکش ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ اس شہر میں مسلمانوں پر اور آپ پر ہر طرح کے ظلم و ستم کو حلال سمجھ لیا گیا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ ایک وقت آنے والا ہے جبکہ آپ اس شہر میں فاتحانہ حیثیت میں داخل ہو کر اس کی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک قائم شدہ حرمت کو توڑ دیں گے اور حلال بنادیں گے گویہ کام صرف ایک ساعت کے لیے ہی ہوگا۔ ہمارے خیال میں یہی تیسرا مفہوم راجح ہے کیونکہ درج ذیل احادیث اسی مفہوم کی تائید کرتی ہیں:

❁ مکہ کی حرمت:۔ ۱۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال قبیلہ خزاعہ نے قبیلہ بنولیث کا ایک آدمی مار ڈالا۔ کیونکہ بنولیث نے خزاعہ کا ایک آدمی پہلے مارا تھا۔ جب آپ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور خطبہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کو روک کر مکہ سے قتل کو روک دیا۔ اور اب اللہ، اس کا رسول اور مسلمان (مکہ کے کافروں پر) غالب ہیں۔ سن رکھو! مکہ نہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال ہوا ہے نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا اور میرے لیے بھی دن کی ایک ساعت کے لیے حلال ہوا۔ سن رکھو! مکہ اس وقت بھی حرام ہے یہاں کے نہ کانٹے توڑے جائیں، نہ درخت کاٹے جائیں نہ یہاں سے کوئی گری پڑی چیز اٹھائی جائے۔ الا یہ کہ اٹھانے والا اسے مالک تک پہنچادینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر یہاں کوئی مارا جائے تو اس

كَبَدٍ ۝۴ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝۵ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ

کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ کوئی اس پر[۴] قطعاً قابو نہ پا سکے گا؟(۵) کہتا ہے: میں نے ڈھیروں[۵] مال اڑا دیا(۶) کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں[۶] دیکھا؟(۷)

کے وارث کو دو میں سے ایک بات کا اختیار ہے۔ یا تو دیت لے لے اور یا قصاص (قاتل اس کے حوالہ کر دیا جائے) اتنے میں اہل یمن کے ایک شخص (ابو شاہ) نے آکر عرض کی "یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے جو باتیں فرمائی ہیں۔ مجھے لکھ دیجیے" آپ ﷺ نے (صحابہ سے) کہا: "اسے لکھ دو" پھر ایک قریشی (سیدنا عباس رضی اللہ عنہ) نے عرض کی: "یارسول اللہ ﷺ! اذخر (گھاس کاٹنے) کی اجازت دے دیجیے۔ ہم اسے اپنے گھروں اور اپنی قبروں میں بچھاتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا اذخر (کاٹنے) کی اجازت ہے۔ (بخاری، کتاب العلم۔ باب کتابۃ العلم)

۲۔ ابو شریح نے عمرو بن سعید (جو یزید کی طرف سے حاکم مدینہ تھا) سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ سے دوسرے دن خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا: اللہ نے مکہ کو حرام کیا ہے لوگوں نے نہیں کیا تو جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے یہاں نہ خون بہانا درست ہے اور نہ کوئی درخت کاٹنا اور اگر کوئی شخص یہ دلیل لے کہ اللہ کے رسول یہاں لڑے تو تم اسے کہو: اللہ تعالیٰ نے تو اپنے رسول کو (فتح مکہ کے دن) خاص اجازت دی تھی جو تمہیں نہیں دی۔ اور مجھے بھی صرف دن کی ایک گھڑی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد اس کی وہی حرمت ہے جو کل تھی۔ اور جو شخص یہاں موجود ہے وہ اس کو یہ باتیں بتا دے جو یہاں موجود نہیں" لوگوں نے ابو شریح سے پوچھا: "تو پھر عمرو بن سعید نے اس کا کیا جواب دیا؟ ابو شریح کہنے لگے: عمرو نے یہ جواب دیا کہ: میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مکہ گنہگار کو پناہ نہیں دیتا اور نہ اس کو جو خون یا چوری کر کے بھاگے۔ (بخاری، کتاب العلم۔ باب لیبلغ العلم الشاھد الغائب)

اس آیت میں آپ ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے اور ایک بہت بڑی پیشین گوئی بھی ہے جو اس وقت کی گئی جب مسلمان کافروں کے ظلم و جور کی چکی میں پس رہے تھے اور اس وقت کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی۔ مگر اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ پیشین گوئی ۸ھ میں سو فیصد پوری ہوئی۔

[۳] ❁ فی کبد کا مفہوم:۔ تیسری قسم آدم اور تمام اولاد آدم یعنی تمام نوع انسان کی زندگی کو شاہد بنا کر اٹھائی گئی ہے۔ اور تینوں قسمیں اس بات پر اٹھائی گئیں کہ انسان کی تخلیق ہی اس انداز پر ہوئی ہے کہ وہ ساری عمر سختیاں جھیلتا رہے۔ دکھ اور رنج سہتا رہے۔ یہ رنج اور مصیبتیں خواہ قدرتی ہوں یا دوسروں نے اسے پہنچائی ہوں یا اپنی ہی وجہ سے اسے پہنچ رہی ہوں۔ کبد کا معنی جگر ہے جو مشہور عضو انسانی ہے۔ اور اس لفظ میں سختی اور قوت کا مفہوم پایا جاتا ہے اور فی کبد محاورۃً استعمال ہوتا ہے اور یہ انسانی فطرت کا اظہار کرتا ہے۔ انسان کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جسے پورا کرنے کے لیے کئی طرح کے رنج و الم سہتا ہے اور وہ ابھی پوری نہیں ہو پاتی کہ اتنے میں چند اور خواہشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب وہ انہیں پورا کرنے اور رنج و محن سہنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی تمام عمر بیت جاتی ہے۔ پھر قدرتی تکلیفیں اور دوسروں کے ہاتھوں پہنچنے والی تکلیفیں اور ان کی مدافعت کا سلسلہ مستزاد ہوتا ہے۔

[۴] انسان جن تکلیفوں میں زندگی گزارتا ہے ان میں بیشتر ایسی ہوتی ہیں جو اس کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی، اپنے نفس کی

أَحَدٌ ﴿٧﴾ أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾
وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ أَوْ

کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں؟(۸) اور ایک زبان اور دو ہونٹ[۷] بھی؟(۹) اور اسے دونوں راہیں نہیں دکھا[۸] دیں؟(۱۰) مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی[۹] سے گزرنے کی ہمت نہ کی(۱۱) اور آپ کیا جانیں کہ وہ دشوار گزار گھاٹی[۱۰] کیا ہے؟(۱۲) وہ ہے کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا(۱۳) یا فاقہ کے دنوں میں کھانا کھلانا(۱۴) کسی قرابت دار یتیم کو(۱۵)

خواہشات کی تکمیل کی وجہ سے ہوتی ہیں جن میں سے اکثر غلط اور ناجائز قسم کی ہوتی ہیں جنہیں وہ پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ وہ دوسروں پر کئی طرح کی زیادتیاں بھی کر جاتا ہے اور اس بات سے غافل اور بے نیاز ہوتا ہے کہ کوئی ہستی اسے دیکھ بھی رہی ہے اور اس پر گرفت بھی کر سکتی ہے۔

[۵] ایسی ہی ناجائز خواہشات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ محض نمود و نمائش اور تعلّی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتا ہے اور جتنا خرچ کرتا ہے اس سے کئی گنا بڑھا چڑھا کر بتاتا ہے کہ میں نے اتنا اور اتنا مال اپنے بیٹے کی شادی پر خرچ کیا تھا یا فلاں رسم کو پورا کرنے پر خرچ کیا تھا۔

[۶] یعنی اس نے یہ مال کن ذرائع سے کمایا تھا اور کیسے ناجائز ذرائع میں خرچ کر رہا ہے اور کیسی فاسد نیت سے خرچ کر رہا ہے۔

[۷] قرآن میں اکثر مقامات پر انسان کو متنبہ کرنے کے لیے اس کی آنکھوں اور اس کے کانوں یا بصارت اور سماعت کا ذکر آیا ہے۔ جبکہ یہاں آنکھوں کے ساتھ کانوں کے بجائے انسان کے اعضائے قوت گویائی کا ذکر کیا گیا ہے جن سے وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو جو آنکھیں، کان، کان یا زبان دی گئی ہے تو یہ گائے بھینسوں کی آنکھ، کان یا زبان جیسی نہیں ہے کہ وہ انہیں صرف اپنے دنیوی مفادات کے لیے استعمال میں لائے۔ بلکہ اسے جانوروں سے زائد قوت تمیز، عقل و شعور بھی دی گئی ہے تاکہ وہ انہیں اعضاء کو کام میں لا کر اپنے مالک حقیقی کو پہچانے۔

[۸] اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے انسان کے پیدا ہوتے ہی اس کی ماں کی چھاتیوں کی طرف رہنمائی کر دی تاکہ وہ نشوونما پا سکے۔ اعضائے انسانی کے ذکر کے لحاظ سے یہ مطلب بھی درست ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے بھلائی اور برائی کے دونوں راستے بتا دیے۔ اسی کا نام قوت تمیز اور عقل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر ان راہوں کی پوری وضاحت بھی کر دی۔

[۹] اس آیت میں دو الفاظ قابل وضاحت ہیں ایک اِقتحام دوسرا عقبة۔ قحم (فی الامر) بمعنی بلا سوچے کسی معاملہ میں داخل ہو جانا اور اِقْتَحَمَ (الامر) بمعنی اپنے آپ کو مشقت کے ساتھ کسی معاملہ میں پھنسا دینا یا کسی مشکل کام میں جا گھسنا اور عقبة بمعنی کسی پہاڑ یا گھاٹی پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ جو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہو اور اس لفظ سے صرف اوپر چڑھنے کا راستہ ہی مراد لیا جاتا ہے، نیچے اترنے کا نہیں۔

[۱۰] یہ گھاٹی دراصل اخلاقی بلندیاں ہیں اور ان پر چڑھنے کا راستہ دشوار گزار اس لحاظ سے ہے کہ ایسے راستے عموماً انسان کی

مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾

یا کسی خاکسار [۱۱] مسکین کو(۱۶) پھر (اس کے ساتھ یہ کہ) وہ ان لوگوں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کرنے کی اور ایک دوسرے پر رحم کرنے کی وصیت [۱۲] کی۔(۱۷)

خواہش کے خلاف اور طبیعت کے لئے ناگوار اور گراں بار ہوتے ہیں۔

[۱۱] دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے کے اوصاف:۔ اس گھاٹی پر چڑھنے کے چار کام یہاں بیان کیے گئے ہیں اور ان چاروں کا تعلق اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے ہے۔ جو انسان کو طبعاً ناگوار ہے۔ اوپر ایسے شخص کا ذکر آیا ہے جو اپنے نام و نمود اور شہرت اور شیخی بگھارنے کے لیے مال خرچ کرتا پھر لوگوں میں بڑا ہانکتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اتنا اور اتنا مال فلاں فلاں کاموں میں خرچ کر دیا ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر مال خرچ کرنا ہے تو اس کے بہترین مصرف یہ ہیں کہ مال خرچ کر کے کسی غلام کو آزادی دلا دی جائے۔ اس کی مکاتبت میں اس کی مدد کی جائے۔ قحط کے دنوں میں لوگوں کو غلہ مہیا کیا جائے یا انہیں کھانا کھلایا جائے۔ یتیموں کی پرورش کی جائے۔ اور اگر وہ یتیم قرابتدار بھی ہو تو وہ اور بھی زیادہ پرورش اور امداد کا مستحق ہے۔ یتیموں کے علاوہ دوسرے ضرورت مندوں کی ضروریات کو پورا کیا جائے جن کو رہنے کو کٹیا اور سونے کو بستر، پہننے کو لباس اور کھانے کو غذا بھی میسر نہیں۔ یہی وہ کام ہیں جو ایک انسان کو بلند مرتبہ تک پہنچانے والے ہیں۔ اور یہ سب کام ایسے ہیں جن کی کتاب و سنت میں جا بجا ترغیب دی گئی ہے اور ان کا بڑا ثواب بیان کیا گیا ہے۔

[۱۲] اصحاب الیمین کیلئے کونسی صفات ضروری ہیں:۔ اس آیت سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ انسان کتنے ہی اچھے اعمال بجا لائے جب تک ایماندار نہ ہو، اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو، اس کے اعمال آخرت میں کسی کام نہیں آئیں گے بلکہ برباد ہو جائیں گے۔ دوسری یہ کہ صرف ایمان لانا ہی کافی نہیں بلکہ باقی ایمانداروں کا ساتھ دینا بھی ضروری ہے تاکہ اسلام کو غالب کرنے اور غالب رکھنے کے راستہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کی اجتماعی طور پر مدافعت کی جائے۔ تیسری یہ کہ اسلام کی نظر میں اجتماعی زندگی ہی پسندیدہ ہے۔ تاکہ اسلامی معاشرے کے سب افراد ایک دوسرے کے دکھ درد اور رنج و راحت میں شریک ہو سکیں۔ اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط بنائے رکھتا ہے۔" پھر آپ نے اپنی انگلیوں کو قینچی کر لیا۔ (بخاری کتاب الادب باب تعاون المؤمنين بعضهم بعضاً)

۲۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: آپس میں بغض حسد نہ کرو۔ ترک ملاقات نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک ملاقات کرے۔" بخاری کتاب الادب باب ما ینھی عن التحاسد)

چوتھی یہ کہ مسلمان صرف خود ہی صبر نہیں کرتے بلکہ سب ایک دوسرے کو بھی صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اور صبر کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ ایک مسلمان کی پوری زندگی صبر ہی صبر ہے۔ اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی سے

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿١٩﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٢٠﴾ ع ۱۵

یہی لوگ[۱۳] صاحب سعادت ہیں(۱۸) اور جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہی بدبخت ہیں(۱۹) ان کے لیے آگ ہے جو ہر طرف[۱۴] سے بند کردی گئی ہوگی۔(۲۰)

برداشت کرنا بھی صبر ہے اور احکام شریعت پر ثابت قدم اور ان کا پابند رہنا بھی صبر ہے۔

پانچویں یہ کہ وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو ایک دوسرے پر رحم کرنے کی تاکید بھی کرتے رہتے ہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر (اللہ کی طرف سے) بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔ (بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس و البهائم) اور ایک دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں۔ "تم اس مخلوق پر رحم کرو جو زمین میں ہے تم پر وہ ذات رحم کرے گی جو آسمانوں میں ہے۔

۲۔ مسلمان ایک دوسرے پر رحم کرنے' دوستی رکھنے اور مہربانی برتنے میں ایک جسم کی طرح ہیں' جب ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سب اعضاء بے چین ہو جاتے ہیں' نیند نہیں آتی اور بخار چڑھ جاتا ہے۔ (حوالہ ایضاً)

۳۔ ایک دفعہ ایک آدمی سفر کر رہا تھا اسے سخت پیاس لگی۔ پھر ایک کنواں ملا تو اس میں اترا اور پانی پیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کے مارے کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ کتے کو پیاس کی وجہ سے ایسی ہی تکلیف ہوگی جیسے مجھے ہوتی ہے۔ وہ پھر کنویں میں اترا اور اپنے موزے میں پانی بھر کر اور اسے منہ میں تھام کر اوپر چڑھا پھر کتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے اس کے کام کی قدر کی اور اس کو بخش دیا" لوگوں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول! کیا ہمیں جانوروں پر رحم کرنے میں بھی ثواب ملے گا"؟ فرمایا ہر تازہ کلیجے والے پر ثواب ملے گا۔" (حوالہ ایضاً)

۴۔ آپ ایک دفعہ اپنے صحابہ کرام ؓ کو نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک اعرابی (گنوار) نماز میں ہی کہنے لگا: "اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کر اور ہمارے علاوہ اور کسی پر نہ کر" آپ نے جب نماز سے سلام پھیرا تو اس بدو سے فرمایا "ارے تم نے تو کشادہ کے آگے بند لگا دیا اور کشادہ سے آپ کی مراد اللہ کی رحمت تھی۔ (حوالہ ایضاً)

[۱۳] یعنی جن ایمان داروں میں مندرجہ بالا صفات پائی جائیں تو ایسے ہی لوگ وہ خوش نصیب ہیں جنہیں عرش عظیم کے دائیں طرف جگہ ملے گی۔ اور اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

[۱۴] اور جو لوگ اللہ کے، آخرت کے اور اللہ کی آیات کے منکر ہیں یہی لوگ اپنی شامت اعمال کے نتیجہ میں ماخوذ ہوں گے۔ انہیں اعمال نامہ بھی پیٹھ کے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا اور انہیں پابند زنجیر و سلاسل جہنم میں پھینک کر جہنم کے سب دروازے بند کر دیے جائیں گے۔

۱۵ آیاتہا سُورَۃُ الشَّمْسِ مَکِّیَّۃٌ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝۳ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝۴
وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ

کلمات ۵۶ آیات ۱۵ (۹۱) سورۃ الشمس مکی ہے (۲۶) رکوع ۱ حروف ۲۵۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

سورج کی اور اس کی دھوپ[۱] کی قسم (۱) اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے[۲] آئے (۲) اور دن کی جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں[۳] کر دے (۳) اور رات کی جبکہ وہ اسے ڈھانپ[۴] لے (۴) اور آسمان کی اور اس ذات کی[۵] جس نے اسے بنایا (۵) اور زمین کی اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا[۶] (۶) اور جان کی اور اس ذات کی جس[۷] نے اسے ٹھیک کر کے بنایا (۷) پھر اس کی بدکرداری اور اس کی

[۱] ضُحٰی کے معنی چاشت کا وقت بھی ہے جب سورج خاصا بلند ہو جاتا ہے اور اس وقت کی دھوپ بھی جبکہ روشنی کے علاوہ سورج کی گرمی بھی اہل زمین کو متاثر کرنا شروع کر دیتی ہے۔

[۲] تلیٰ بمعنی کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے پیچھے آنا اور بار بار آتے رہنا۔ یعنی مہینہ کے اکثر ایام ایسے ہوتے ہیں کہ سورج ڈوبنے کے بعد چاند نکل آتا ہے۔

[۳] یعنی جب دن کے وقت سورج پوری روشنی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور تمام اشیاء کو نمایاں کر دیتا ہے۔

[۴] یعنی جب رات کی تاریکی چھا جائے اور سورج کی روشنی کا نشان تک باقی نہ رہ جائے۔

[۵] اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ مَا کو مَن کے معنی میں لیا جائے اور اس کی مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا ترجمہ وہی ہوگا جو اوپر مذکور ہے۔ اور دوسرا یہ کہ مَا کو مَا کے معنی میں ہی سمجھا جائے اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔ اور آسمان کی قسم جیسا کہ اسے شان و عظمت والا بنایا ہے۔

[۶] یعنی زمین کو اس طرح پھیلا دیا کہ وہ مخلوق کی بود و باش کے قابل بن جائے۔ انہیں کھانے کو رزق بھی فراہم ہوتا رہے اور رہائش بھی۔ آیت نمبر ۵ کی طرح اس کے بھی دونوں مطلب ہو سکتے ہیں۔

[۷] ❁ انسان فطرتاً نیک اور موحد پیدا کیا گیا: یعنی نفس کو پیدا کرنے کے بعد اس میں وہ تمام ظاہری اور باطنی قوتیں رکھ دیں جن سے کام لے کر وہ ایسے سب کام سرانجام دے سکے جن کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ سَوّٰهَا کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ انسان پیدائشی طور پر نہ گنہگار پیدا ہوا ہے جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور اسی غرض سے انہوں نے کفارۂ مسیح کا عقیدہ اختراع کیا اور نہ ہی انسان شر پسند پیدا ہوا ہے جیسا کہ بعض گمراہ فرقوں کا خیال ہے۔ بلکہ انسان کی فطرت میں راستی اور سچائی ودیعت کی گئی ہے۔ جھوٹ بولنا وہ بعد میں سیکھتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کے جذبہ سے مل جل کر رہنا چاہتا ہے، دوسروں کی بدخواہی

تَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱ اِذِ انْۢبَعَثَ

پرہیزگاری اسے الہام[۸] کر دی (۸) کہ کامیاب وہ شخص ہوا جس نے نفس کو سنوار لیا (۹) اور وہ نامراد ہو گا جس نے اسے[۹] خاک آلود رکھا (۱۰) ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر[۱۰] (حق کو) جھٹلایا (۱۱) جبکہ ان کا سب سے[۱۱]

اور ایذا پہنچانا وہ بعد میں سیکھتا ہے۔ اس کی فطرت میں توحید ہے، شرک کرنا وہ بعد میں سیکھتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر) (مزید تفصیل کے لیے سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۱۳ پر حاشیہ نمبر ۲۸۱ ملاحظہ فرمائیے)

[۸] ❁ الہام اور وحی کا فرق:۔ فَاَلْهَمَهَا: الہام کے معنی وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے بغیر کسی واسطہ کے دل میں ڈال دی جائے اور بمعنی سمجھ اور بصیرت عطا فرمانا۔ توفیق دینا، الہام شیطان کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ نصوص شرعیہ کے خلاف ہو۔ وحی اور الہام میں بنیادی فرق یہ ہے کہ الہام کا اطلاق صرف ذوی العقول پر ہوتا ہے جبکہ وحی عام ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ الہام کا تعلق کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہے۔ جبکہ وحی میں بہت زیادہ وسعت ہوتی ہے۔

❁ الہام کی تین صورتیں:۔ الہام کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو وہ ہے جسے ہم فطری وحی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ایک پرندے کے چوزے کو پیدا ہوتے ہی ہوا میں اڑنا سکھا دیا ہے یا مچھلی کو پانی میں تیرنا یا شہد کی مکھی کو چھتہ جیسا حیرت انگیز گھر بنانا سکھا دیا یا انسان کے بچہ کو ماں کی چھاتیوں کی طرف لپکنا اور دودھ چوسنا سکھا دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ فطرت میں یہ باتیں نہ رکھتا تو پیدا ہونے والے نادان بچے کو ایسی باتیں سکھانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ الہام کی دوسری صورت کسی ایسی بات کا یکدم سوجھ جانا ہے جو انسان کی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سائنس کے جتنے اکتشافات اور ایجادات ہوئی ہیں۔ وہ انسانوں کی ذہنی کاوش کے نتیجہ میں نہیں بلکہ ایسے ہی الہام کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہیں۔ الہام کی تیسری صورت کا تعلق صرف اخلاقیات سے ہے اور یہی اس آیت میں مذکور ہے یعنی ہر انسان کی فطرت میں خیر و شر کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ پھر انسان کا ضمیر انسان کو ہر وقت متنبہ بھی کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات اسے برا کام کرنے پر سخت ندامت محسوس ہوتی ہے اور کسی سے بھلائی کر کے انسان خوش ہوتا ہے۔ یہ احساس و امتیاز ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصور سے خالی نہیں رہا ہے۔

[۹] آیت نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ جواب قسم ہے۔ یعنی ابتداء سورہ سے آیت نمبر ۸ تک جتنی باہم متضاد اشیاء کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ اس حقیقت پر کھائی گئی ہیں کہ جس نے اپنے نفس کو کفر و شرک سے، فاسد عقائد سے اور اخلاق رذیلہ سے پاک کر لیا۔ وہ کامیاب ہو گیا اور جس شخص نے اپنے ضمیر کی آواز کو جو اسے خیر و شر پر متنبہ کرتی رہتی ہے، خاک میں ملا دیا وہ نامراد ہو گیا۔ یعنی جس طرح سورج اور چاند ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دن اور رات مختلف اور متضاد ہیں۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فجور اور تقویٰ یا خیر اور شر ایک دوسرے کی ضد ہے۔ اسی طرح خیر و شر کی بنیاد پر اٹھنے والے اعمال کے نتائج بھی یقیناً ایک دوسرے سے متضاد اور مختلف ہونے چاہئیں۔ وہ ایک جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔ تقویٰ کی بنیاد پر کیے ہوئے اعمال کا نتیجہ اخروی فلاح و کامیابی ہے جبکہ فجور کی بنیاد پر کیے ہوئے اعمال کا نتیجہ اخروی ناکامی اور نامرادی ہے۔

[۱۰] اسی حقیقت کو ایک تاریخی نظیر سے سمجھایا گیا ہے اور اس نظیر کے لیے قوم ثمود کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کا مسکن

أَشْقٰىهَا ﴿١٢﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿١٥﴾

بڑا بدبخت بپھر اٹھا[۱۱] تو اللہ کے رسول نے انہیں کہا: اللہ کی اونٹنی[۱۲] اور اس کے پانی پینے کی باری (کے معاملہ میں بچو)[۱۳] لیکن انہوں نے رسول کو جھٹلایا[۱۳] اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں[۱۴] تو ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کی پاداش میں ایسی آفت نازل کی کہ انہیں زمین بوس کر کے برابر کر دیا[۱۴] اور وہ ایسی تباہی کے انجام[۱۵] سے ڈرتا نہیں۔[۱۵]

مکہ کے قریب تھا اور اہل مکہ میں ان کی داستانیں زبان زد عام تھیں۔ یعنی قوم ثمود نے بھی سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس حقیقت کی پروانہ کی اور اللہ کی آیات اور اس کے رسول کی تکذیب کی تھی۔

[۱۱] ❁ یہ قوم کا سب سے زیادہ بدبخت شخص کون تھا؟ اس کی وضاحت کے لیے درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیں۔
عبداللہ بن زمعہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں صالح پیغمبر کی اونٹنی اور اس شخص کا ذکر کیا جس نے اس اونٹنی کو زخمی کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو بدبخت اس کام کے لیے تیار ہوا وہ ایک جری، شریر اور مضبوط شخص (قدار بن سالف) تھا جو اپنی قوم میں ابوزمعہ کی طرح تھا (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۱۲] ❁ ذکر قوم ثمود۔ انہیں اللہ کے رسول یعنی صالح علیہ السلام نے پہلے ہی تاکید کر دی تھی کہ اللہ کی اس اونٹنی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا۔ اور اسے اللہ کی اونٹنی اس لیے کہا کہ یہ ان کا منہ مانگا معجزہ تھا اور قد آور اور عظیم الجثہ اونٹنی ایک پہاڑ کے اندر سے ان کے مطالبہ پر نمودار ہوئی تھی۔ چونکہ یہ اونٹنی ان لوگوں کے مویشیوں جتنا پانی اکیلی ہی پی جاتی تھی اور پانی کی وہاں قلت بھی تھی۔ لہٰذا صالح علیہ السلام نے باری مقرر کر دی تھی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی تھی کہ اس کے پانی پینے اور اور باری کے معاملہ میں کسی طرح کی گڑبڑ نہ کرنا ورنہ تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو گا اور یہ قصہ پہلے متعدد مقامات پر تفصیل سے گزر چکا ہے۔

[۱۳] یعنی ان لوگوں نے سیدنا صالح علیہ السلام کی تنبیہ کو چنداں اہمیت نہ دی اور اس تنبیہ کو جھوٹ ہی سمجھا۔

[۱۴] اونٹنی کو ہلاک کرنے والا صرف ایک شخص قدار بن سالف تھا جو خود بھی زانی اور ایک زانیہ عورت کا عاشق تھا۔ اسی زانیہ عورت کی انگیخت پر اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ پھر ساری قوم کے لوگوں سے خفیہ مشورے کر کے ان کو ہمنوا بنالیا تھا۔ اسی لیے اونٹنی کو ہلاک کرنے کی نسبت پوری قوم کی طرف کی گئی ہے اور عذاب بھی صرف اونٹنی کو ہلاک کرنے والے پر نہیں بلکہ ساری قوم پر آیا تھا۔

[۱۵] یعنی دنیادار بادشاہ جب کسی دوسری قوم یا ملک پر حملہ کرتے یا ان سے اپنا بدلہ لینا چاہتے ہیں تو اپنی اس کارروائی کے نتائج وعواقب پر نظر رکھتے ہیں کہ مثلاً اس حملہ کا ردعمل کیا ہو گا؟ کہیں ہماری اپنی ہی رعیت تو اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑی ہو گی؟ یا مخالف قوت ہمارے حملہ کے ردعمل کے طور پر کیا کچھ کارروائی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے غرض بیسیوں قسم کے خیالات ان کے ذہن میں آتے ہیں جن کا توڑ وہ پہلے سوچ لیتے ہیں لیکن اللہ جب کسی قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے تو اسے کسی بات کو سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

❁❁❁

۲۱ آیاتها سورۃ اللیل مکیۃ رکوعها ۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ﴿١﴾ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ﴿٢﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴿٣﴾ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴿٤﴾
فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَنْ

کلمات ۷۱ آیات ۲۱ (۹۲) سورۃ اللیل مکی ہے (۹) رکوع ۱ حروف ۳۰۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

رات کی قسم جب وہ چھا جائے (۱) اور دن کی جب وہ روشن ہو (۲) اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیے (۳) کہ تمہاری کوشش یقیناً مختلف قسم [۱] کی ہے (۴) پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور پرہیز گاری اختیار کی (۵) اور بھلی باتوں کی تصدیق کی [۲] (۶) تو ہم اسے آسان راہ پر چلنے کی سہولت دیں گے (۷)

[۱] سورۃ الشمس کی طرح اس سورت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے چند متضاد اشیاء مثلاً رات اور دن کی نر اور مادہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس طرح دن اور رات کی اور نر اور مادہ کی خصوصیات آپس میں متضاد اور مختلف ہیں۔ اسی طرح اے بنی نوع انسان! تم جو کچھ اس دنیا میں اعمال بجا لا رہے ہو وہ بھی ایک دوسرے سے متضاد اور مختلف ہیں۔ لہٰذا تمہاری اس سعی عمل کے نتائج مختلف ہیں اور ہونے چاہئیں۔ وہ یکساں کبھی نہیں ہو سکتے۔

[۲] یعنی لوگوں کے اعمال اور ان کے نتائج جو ایک دوسرے سے متضاد اور مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کے اعمال یہ ہیں کہ:

۱۔ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہا۔

۲۔ اس نے اپنی ساری زندگی اللہ سے ڈرتے ہوئے اور اس کی فرمانبرداری میں گزار دی اور

۳۔ ہر بھلی بات کی تصدیق کی۔ بھلی بات سے مراد ایمان بالغیب بھی ہے۔ اللہ کی آیات بھی ہیں۔ اللہ کی توحید بھی، رسول کی تصدیق بھی اور اخلاق فاضلہ کی بجا آوری بھی۔

گویا ان تین مختصر سے الفاظ میں پوری شریعت کا خلاصہ پیش فرما دیا کہ جو شخص یہ اور یہ کام کرے گا اللہ اس کے لیے احکام شریعت پر چلنا اور جنت میں داخلہ کا مستحق ہونا آسان بنا دیتا ہے۔ اسے نیکی کے کاموں کی توفیق دیتا ہے حتیٰ کہ بدی کی راہ پر چلنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسی راہ کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ البلد کی آیت نمبر ۱۱ میں گھاٹی کی دشوار گزار راہ قرار دیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ راہ چونکہ خواہشات نفسانی کے مخالف ہے۔ اس لیے ابتداءً یہ فی الواقع انسان کی طبیعت پر بوجھ اور دشوار گزار راستہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب عزم صمیم کے ساتھ اس راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے تو یہی راستہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسان بنا دیتا ہے بلکہ اسے یہی راہ آسان معلوم ہونے لگتی ہے جس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے لیے رزق حلال اور کسب حلال کے دروازے کھلتے جاتے ہیں اور حرام کی کمائی کا حصول اسے سخت ناگوار محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ ایک فریق کا حال ہے۔

بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ

اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا(۸) اور بھلائی کو جھٹلایا(۹) تو ہم اسے تنگی کی راہ پر چلنے کی سہولت دیں[۳] گے (۱۰) اور جب وہ (جہنم کے) گڑھے میں گرے گا تو اس[۴] کا مال

[۳] ایک نیک بخت اور ایک بدبخت کے اعمال اور نتائج کا تقابل:۔ دوسرے فریق کی صفات اور عادات پہلے فریق سے بالکل مختلف اور متضاد ہیں یعنی وہ اللہ کی راہ میں ہرگز مال خرچ کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور اگر خرچ کرتا ہے تو اپنی ہی ذات پر خرچ کرتا ہے یا ایسے کاموں میں خرچ کرتا ہے جن سے اس کی شہرت یا اس کی فیاضی کا چرچا ہو۔ اپنی زندگی ایسے بسر کرتا ہے جیسے اس کا خالق و مالک اس کے سر پر ہے ہی نہیں اور اگر زبانی اقرار کرتا بھی ہے تو اپنی عملی زندگی میں اس کے احکام سے بالکل بے نیاز رہتا ہے اور ہر بھلائی کی بات کو جھٹلا دیتا ہے (بھلائی کی وضاحت سابقہ حاشیہ میں کی جاچکی ہے) ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ جہنم کا راستہ آسان اور نیکی اور بھلائی کی راہیں بہت مشکل بنا دیتا ہے۔ ان کی زندگی گناہ اور حرام کاموں میں گزرتی ہے۔ وہ کسب حرام اور رزق حرام سے ایسے مانوس ہوتے ہیں کہ رزق حلال کی انہیں کوئی راہ نہ پسند آتی ہے اور نہ ان کے لیے آسان ہوتی ہے۔ اب اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾ کا معنی یہ ہے کہ اس کو یہ یقین نہیں کہ اللہ کی راہ میں جو خرچ کرے گا، اللہ اسے اس کا بدلہ دے گا۔

۲۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر صبح دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہتا ہے: "اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کے عوض اور مال دے" اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! "بخل کرنے والے کے مال کو تلف کردے" (بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى)

۳۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم بقیع میں ایک جنازے میں شریک تھے۔ اتنے میں آپ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ بیٹھ گئے تو ہم سب آپ ﷺ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی آپ ﷺ سر جھکا کر چھڑی سے زمین کرید رہے تھے۔ (جیسے کسی گہری سوچ میں ہیں) پھر فرمایا: تم میں سے جو شخص بھی پیدا ہوا ہے اس کا ٹھکانا لکھ دیا گیا ہے جنت میں یا دوزخ میں اور یہ بھی لکھا جاچکا ہے کہ وہ نیک بخت ہے یا بدبخت" اس پر ایک شخص بولا: یارسول اللہ ﷺ پھر ہم اپنی قسمت کے لکھے پر بھروسا کرتے ہوئے عمل کرنا چھوڑ نہ دیں؟ کیونکہ جو نیک بختوں میں لکھا گیا ہے وہ بالآخر نیک بختوں میں شامل ہوگا اور جو بدبخت لکھا گیا ہے وہ بالآخر بدبختوں میں شامل ہوگا" آپ ﷺ نے فرمایا (نہیں، بلکہ عمل کیے جاؤ) کیونکہ نیک بخت لکھے گئے ہیں انہیں نیک اعمال کی توفیق دی جاتی ہے اور جو بدبخت لکھے گئے ہیں انہیں ویسی ہی توفیق دی جاتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھیں (بخاری۔ کتاب التفسیر)

رہا کسی شخص کے انجام سے متعلق اللہ تعالیٰ کے پیشگی علم کا مسئلہ تو یہ بات پہلے بھی واضح کی جاچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ علم کسی شخص کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ وہی کام کرے جو اللہ نے اس کے متعلق فیصلہ کر رکھا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۰ کا حاشیہ دیکھیے۔

[۴] تردٰی۔ ردی بمعنی کسی چیز کو بلندی سے زمین پر دے مارنا یا زمین سے کسی گڑھے میں پھینک دینا تاکہ وہ ہلاک ہوجائے اور

إِذَا تَرَدّٰى ﴿١١﴾ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿١٢﴾ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولٰى ﴿١٣﴾ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿١٤﴾
لَا يَصْلٰهَا إِلَّا الْأَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ

اس کے کسی کام نہ آئے گا(۱۱) بلاشبہ راہ دکھانا ہمارے [۵] ذمہ ہے(۱۲) اور آخرت اور دنیا (دونوں کے) ہم ہی [۶] مالک ہیں(۱۳)

لہٰذا میں نے تمہیں بھڑکتی آگ سے ڈرا دیا ہے(۱۴) اس میں وہی گرے گا جو بڑا بدبخت ہو(۱۵) جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا [۷](۱۶) اور جو بڑا پرہیزگار ہوگا اسے اس سے [۸] دور رکھا جائے گا(۱۷) جس نے پاکیزہ ہونے [۹] کی خاطر اپنا مال دیا(۱۸)

تردیٰ کے معنی خود کنوئیں یا گڑھے میں گرنا اور ہلاکت کو پہنچنا ہے اور یہاں گڑھے سے مراد جہنم کا گڑھا ہے۔ یعنی یہ دوسری قسم کا آدمی جہنم کے گڑھے میں گر پڑے گا تو اس وقت اس کا مال جسے وہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا تھا کسی کام نہ آسکے گا کیونکہ وہ مال تو دنیا میں ہی رہ گیا ہوگا۔ وہاں کیسے کام آسکتا ہے؟

[۵] یعنی ہم نے خیر و شر کی تمیز کو انسان کی فطرت میں داخل کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کی پوری رہنمائی کرنا بھی ہمارے ذمے ہے اور یہ ذمہ داری ہم نے رسول بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے پوری کر دی ہے۔

[۶] یعنی آخرت کے مالک بھی ہم ہیں اور دنیا کے بھی۔ اب جو شخص ہم سے دنیا ہی طلب کرتا ہے اسے ہم دنیا ہی دیتے ہیں وہ بھی اتنی جتنی ہم چاہتے ہیں اور جو ہم سے آخرت کا طلبگار ہوتا ہے اسے آخرت تو ضرور دیتے ہیں اور دنیا بھی اتنی ضرور دے دیتے ہیں جتنی اس کے مقدر ہے۔

[۷] ❁ <u>جہنم میں گناہگار مسلمانوں کا داخلہ اور فرقہ مرجیہ کا رد:</u> اس آیت سے فرقہ مرجیہ نے استدلال کیا ہے کہ جہنم میں صرف کافر ہی داخل کیے جائیں گے گناہگار مومن داخل نہیں کیے جائیں گے۔ ان کا یہ نظریہ اس لیے غلط ہے کہ انہوں نے قرآن کی بے شمار دوسری آیات اور اسی طرح احادیث کو نظر انداز کر دیا ہے جن میں بصراحت مذکور ہے کہ مومن گنہگاروں کو بھی دوزخ میں داخل کیا جائے گا اور جب ان کے گناہوں کی سزا پوری ہو چکے گی تو انہیں دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور شفاعت کی نہایت ثقہ اور متواتر حدیثوں میں مذکور ہے کہ گنہگار مسلمانوں کا ایک گروہ دوزخ میں چلا جائے گا پھر رسول اللہ ﷺ کی سفارش سے دوزخ سے نکالا جائے گا۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ دوزخ کے اس خاص مقام میں جو اللہ نے تیار ہی کافروں اور مشرکوں کے لیے کیا ہے۔ اس میں اسی بدبخت کو داخل کیا جائے گا جس نے حق بات کو ٹھکرا دیا اور اس سے اعراض ہی کرتا رہا۔

[۸] یعنی جو لوگ اپنی ساری زندگی اللہ سے ڈرتے ہوئے گزارتے ہیں ان کو جہنم کی ہوا تک نہیں لگے گی۔ اس لیے کہ انہیں جہنم سے دور رکھ کر صاف بچا لیا جائے گا۔

[۹] یعنی جو مال اس نے خرچ کیا اس سے شہرت یا نمود و نمائش مقصود نہیں تھی بلکہ مقصود یہ تھا کہ اس کا دل بخل کے مرض سے پاک ہو جائے۔

يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾

اس پر کسی کا کوئی احسان نہ تھا جس کا وہ بدلہ چکاتا (۱۹) بلکہ اس نے تو محض اپنے رب برتر کی رضا کے لیے[۱۰] (مال خرچ کیا) (۲۰) اور جلد ہی[۱۱] وہ خوش ہو جائے گا (۲۱)

[۱۰] سیدنا ابوبکرؓ کی شان میں آیات اور ان کی فضیلت:۔ آیت نمبر ۱۸ اور آیت نمبر ۱۹ سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ان آیات کا روئے سخن کسی خاص شخص کی طرف ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت کے مطابق نام نہیں لیا۔ وہ ایسا شخص تھا جو ان لوگوں پر مال خرچ کرتا تھا جن کا اس خرچ کرنے والے شخص پر پہلے سے کوئی احسان نہ تھا جس کے بدلہ کے طور پر وہ ان پر مال خرچ کرتا بلکہ اس کا مقصود صرف یہ تھا کہ اس کا پروردگار اس سے راضی اور خوش ہو جائے۔ چنانچہ بہت سی روایات اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ آیات سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ آپ آزاد مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ کپڑے کے تاجر اور مال دار تھے۔ ان دنوں اگر کوئی غلام مسلمان ہو جاتا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ اس کے مالک اسے بری طرح پیٹتے اور دردناک ایذائیں دیتے تھے۔ ان غلاموں کی یہ کیفیت رسول اللہ ﷺ سے برداشت نہ ہوتی تو آپ سیدنا ابوبکرؓ کو اشارہ کرتے کہ اسے خرید کر آزاد کر دیں تو سیدنا ابوبکرؓ ان غلاموں کی منہ مانگی قیمت ادا کر کے انہیں خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔ اس طرح آپ نے سترہ غلاموں کو کافروں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلا کر انہیں آزاد کر دیا تھا۔ غرض آپ نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی خاطر کسی بھی مالی یا جانی قربانی سے کبھی دریغ نہ کیا اور سیدنا ابوبکرؓ کی ان خدمات کا رسول اللہ ﷺ نے برملا اعتراف فرمایا جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس بیماری میں آپ نے انتقال فرمایا، آپ ایک کپڑے سے اپنا سر باندھے ہوئے باہر نکلے پھر منبر پر بیٹھے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا: لوگوں میں سے کسی کا بھی مجھ پر جان اور مال کے لحاظ سے احسان ابوبکر بن ابی قحافہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور اگر میں کسی کو جانی دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا مگر اسلام کی دوستی ہی بہت اچھی ہے۔ دیکھو ابوبکر کی کھڑکی کے سوا مسجد میں جتنی کھڑکیاں کھلتی ہیں سب بند کر دو (بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ باب الخوخة والممرّ فی المسجد)

اور ان آیات سے سیدنا ابوبکرؓ کی کمال درجہ کی فضیلت ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے انہیں ﴿الاتقی﴾ (بہت بڑا پرہیزگار) کا لقب ملا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ تو جب سیدنا ابوبکرؓ اللہ کے نزدیک ﴿الاتقی﴾ ٹھہرے تو اکرم بھی یقیناً ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی مالی قربانیوں کو شرف قبولیت ہی نہیں بخشا بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کے سامنے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا پھر انہیں ﴿ولسوف یرضی﴾ کی بشارت بھی سنا دی۔

[۱۱] اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو گا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ اسے اتنا مال و دولت اور نعمتیں عطا فرمائے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

۱۱ آیاتھا سورۃ الضحیٰ مکیۃ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ﴿۴﴾

کلمات ۴۰ آیات ۱۱ (۹۳) سورۃ الضحیٰ مکی ہے (۱۱) رکوع ۱ حروف ۱۶۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

چاشت کے وقت کی قسم (۱) اور رات کی جب وہ سنسان [۱] ہو جائے (۲) کہ آپ کے پروردگار نے نہ تو آپ کو چھوڑا ہے اور نہ ناراض [۲] ہوا ہے (۳) اور آپ کے لیے [۳] آخری دور ابتدائی دور سے یقیناً بہتر ہے (۴)

[۱] ❁ سجی کا لغوی مفہوم:۔ ﴿سَجٰی﴾ یعنی رات کا سنسان اور خاموش ہونا، نیز اس لفظ میں دوسری چیزوں کو چھپا لینے کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ خواہ یہ تصور ظاہری طور پر ہو جیسے سَجَی الْمَیِّت بمعنی میت پر چادر ڈال کر اسے چھپا دینا یا معنوی طور پر ہو. جیسے سَجِّ معائب اخیك بمعنی اپنے بھائی کے عیبوں کو چھپاؤ. گویا اس لفظ میں پُر سکون ہونے اور چھپانے کے دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی رات کا اتنا حصہ گزر چکا ہو کہ سب لوگ سو چکے ہوں اور تاریکی بھی پوری طرح چھا چکی ہو۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے چاشت کے وقت کی قسم کھائی ہے۔ جب سورج بلند ہو چکا ہوتا ہے اور لوگ اپنے اپنے کام کاج میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور یہ وقت اس کے بالکل برعکس اور متضاد ہے۔ اور ان دونوں متضاد حالتوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ آپ ﷺ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ آپ ﷺ سے ناراض ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چاشت کا وقت تو اللہ کی رحمت کا وقت ہے اور گئی رات کا وقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا وقت ہے۔ اس لیے کہ دونوں اوقات کے اپنے اپنے فوائد ہیں۔ اگر ہمیشہ دن ہی رہتا تو یہ بھی لوگوں اور جانداروں کے لیے سخت اذیت کا باعث بن جاتا اور اگر ہمیشہ رات رہتی تو بھی یہی بات تھی۔ اسی طرح وحی کے آنے کے وقت کو اللہ کی رحمت کا وقت اور نہ آنے کے وقت کو اللہ کی ناراضگی کا وقت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ وحی کی حالت میں اگرچہ آپ ﷺ کو لذت و سرور حاصل ہوتا تھا لیکن یہ وقت آپ ﷺ کے لیے اتنا اعصاب شکن اور تکلیف دہ ہوتا تھا کہ سردیوں میں بھی آپ کو پسینہ چھوٹ جاتا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ وحی کے بعد آپ کو آرام کا وقفہ دیا جائے اور یہ وقفہ ابتداءً زیادہ تھا۔ پھر جب آپ ﷺ کی طبیعت آہستہ آہستہ اس بار وحی کو برداشت کرنے کے قابل ہوتی گئی تو یہ وقفہ بھی کم ہوتا گیا۔

[۲] اس سورت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی وحی آپ ﷺ پر غار حرا میں نازل ہوئی جو سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات تھیں۔ اس بار وحی کی کوفت کا تو یہ حال تھا کہ آپ ﷺ نے گھر آ کر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یہ واقعہ سنایا تو بتایا کہ "انی خشیت علی نفسی" کہ مجھے تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے اور لذت و سرور کا یہ حال تھا کہ آپ اس واقعہ کے بعد ہر وقت جبرائیل کی آمد کے منتظر رہتے تھے لیکن وحی کچھ عرصہ کے لیے بند ہو گئی یہ عرصہ کتنا تھا؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ چھ ماہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اسی وقفہ کو فترۃ الوحی کہتے ہیں۔ اس دوران آپ کو خود بھی

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ﴿٥﴾ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ﴿٦﴾ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ﴿٧﴾

اور آپ کا پروردگار آپ کو جلد ہی اتنا کچھ عطا کرے گا کہ آپ خوش[۴] ہو جائیں گے (۵) کیا اس نے آپ کو یتیم نہ پایا[۵] پھر ٹھکانا فراہم کیا (۶) اور راہ سے بھولا[۶] ہوا پایا تو راہ دکھا دی (۷)

بعض دفعہ یہ خیال آنے لگا کہ کہیں میرا پروردگار مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گیا؟ اور کافر تو بہرحال ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے جس سے وہ اپنے اندر کا ابال نکال سکیں جیسا کہ درج ذیل حدیث سے ظاہر ہے:

جندب بن سفیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج ناساز ہوا اور دو تین راتیں (نماز تہجد کے لیے) اٹھ نہ سکے۔ ایک عورت (عوراء بنت حرب، ابوسفیان کی بہن اور ابولہب کی بیوی) آپ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: محمد ﷺ! میں سمجھتی ہوں کہ تیرے شیطان نے تجھے چھوڑ دیا ہے میں نے دو تین راتوں سے اسے تیرے پاس نہیں دیکھا" اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۳] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک عظیم الشان خوشخبری دی اور اس وقت دی جبکہ اس کے پورا ہونے کے آثار دور دور تک کہیں نظر نہ آتے تھے۔ نیز اس میں آپ ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کفار مکہ کی ایذادہی اور ظلم و جور سے نہ گھبرائیں۔ کیونکہ آپ کی زندگی کا ہر آنے والا دور اپنے پہلے دور سے بہتر ہو گا۔ بالفاظ دیگر رفتہ رفتہ آپ کے عزوشرف میں لگاتار ترقی ہوتی رہے گی۔ پھر یہ وعدہ صرف دنیا کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ آخرت میں آپ کو جو بلند مقام عطا ہو گا وہ کائنات میں کسی دوسرے کو عطا نہیں ہو گا۔

[۴] ❁ آپ پر اللہ کے انعامات:۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ دیا تھا؟ اس بات کا احاطہ ہم نہیں کر سکتے بلکہ ہم تو یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ وہ کونسی عزوشرف کی بات تھی جو آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے عطا نہ کی ہو۔ آپ ﷺ کو صحابہ کرام کی ایسی جماعت عطا کی جن میں سے ایک ایک فرد آپ ﷺ پر اپنی جان تک فدا کرنے پر فخر محسوس کرتا تھا۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا غیر مشروط مطاع بنایا۔ ان کا معلم اور مزکی بنایا۔ اپنی کتاب کا مفسر بنایا۔ پورے عرب سے آپ ﷺ کی کوششوں سے کفر و شرک کا مکمل طور پر استیصال ہو گیا۔ پورے جزیرہ عرب میں اسلام کا غلبہ ہو گیا۔ آپ ۲۳ سال کے قلیل عرصہ میں ایک وحشی' اجڈ اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی قوم کو دنیا بھر کی تہذیب و تمدن کی علمبردار قوم بنا دیا۔ پھر آپ ﷺ کی زندگی کے بعد آپ کی یہ تحریک پوری دنیا پر چھا گئی۔ آپ ﷺ نے ایک قلیل عرصہ میں ایسا تمدنی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی انقلاب بپا کیا جس کی نظیر پوری دنیا کی تاریخ ڈھونڈھنے سے کہیں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ اللہ کی رحمت اور عطا تھی جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم آپ ﷺ کو اتنا کچھ عطا کریں گے کہ آپ ﷺ خوش ہو جائیں گے۔

[۵] ❁ یتیم ہونے پر آپ کو بہترین سرپرست ملتے رہے:۔ آپ کی پیدائش سے دو ماہ پیشتر ہی آپ ﷺ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپ ﷺ پیدا ہوئے تو آپ کی سرپرستی کا ذمہ آپ کے دادا عبدالمطلب نے لیا جو اپنی صلبی اولاد سے بڑھ کر آپ پر شفقت اور پیار کرتے تھے۔ ابھی چھ ہی سال کے تھے کہ والدہ ماجدہ بھی انتقال کر گئیں اور آپ دونوں طرف سے یتیم ہو گئے۔

آٹھ سال کے ہوئے تو آپ ﷺ کے مہربان دادا عبدالمطلب کی بھی وفات ہو گئی۔ اب آپ ﷺ کی سرپرستی کی ذمہ داری آپ ﷺ کے ایک چھوٹے چچا ابو طالب نے سنبھالی۔ جس نے آپ ﷺ کو اپنی اولاد سے بڑھ کر پیار دیا۔ پھر جب آپ ﷺ کو نبوت ملی اور آپ ﷺ کی برادری کے لوگ بھی آپ ﷺ کے دشمن ہو گئے تو ابو طالب نے اسلام نہ لانے کے باوجود ہر تنگی ترشی میں آپ ﷺ کا ساتھ دیا۔ برادری کی دشمنی اور عداوت کا سارا بار اپنے سر مول لیا اور ہر طرح کے خطرات سے بے نیاز ہو کر نبوت کے آغاز سے دس سال بعد تک آپ کی سرپرستی اور حفاظت کی ذمہ داری کو بڑے احسن طریقے سے نباہا۔ حتیٰ کہ شعب ابی طالب کے تین سال بھی آپ ﷺ کے ساتھ محصور رہے۔ ۱۰ نبوی میں یہ سہارا بھی ختم ہو گیا یعنی ابو طالب کی وفات ہو گئی۔ اس کے تھوڑی ہی مدت بعد اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ (اوس اور خزرج) کو اسلام کی نعمت عطا فرمائی چنانچہ آپ ﷺ بیعت عقبہ کے بعد مدینہ تشریف لے گئے۔ انصار مدینہ نے آپ ﷺ کی حفاظت کا جو ذمہ لیا تھا اسے جس جرأتمندانہ طریق سے انہوں نے پورا کیا وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ احسان جتایا ہے کہ آپ ﷺ کے یتیم ہونے کے باوجود آپ ﷺ کو سرپرست ایسے عطا کیے جاتے رہے جو اپنی جان سے بڑھ کر آپ ﷺ کو عزیز رکھتے تھے۔

[۶] آپ ﷺ بچپن ہی سے کفر و شرک سے بیزار تھے۔ جھوٹ، بددیانتی اور اخلاق رذیلہ سے آپ کو طبعاً نفرت تھی۔ آپ ﷺ اپنے مالک و خالق حقیقی کو ٹھیک طرح پہچانتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کو یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ گمراہی میں پڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے اس تاریک دور میں پانچ چھ آدمی آپ ﷺ کے ہم خیال اور ہمنوا تھے جن میں سرفہرست سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام آتا ہے۔ یہ لوگ بھی شرک اور دوسری معاشرتی برائیوں سے سخت متنفر تھے۔ اور آپ ﷺ اس معاملہ میں سب سے زیادہ متفکر رہتے تھے۔ آپ ﷺ تن تنہا پہاڑوں کی غاروں میں چلے جاتے۔ وہاں جا کر مالک حقیقی سے لو لگاتے اور سوچتے رہتے کہ وہ کون سا طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے مخلوق خدا کو کفر و شرک کی گمراہیوں سے بچایا جا سکتا ہے؟ چنانچہ آپ اسی غرض سے غار حرا میں مقیم تھے کہ آپ ﷺ پر پہلی بار جبریل امین کا نزول ہوا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس دیرینہ تڑپ کو پورا کرنے کی راہ ہموار کر دی جو ایک عرصہ سے آپ ﷺ کے سینہ میں موجزن تھی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان اور نعمت کا ذکر فرمایا ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت میں ضَالًّا کا لفظ استعمال ہوا اور ضَلَّ کا لفظ عربی زبان میں مندرجہ ذیل چھ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ضلّ کا مفہوم:۔ ۱۔ ضلّ کا بنیادی معنی راستہ کھو دینا یا گم کر دینا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی ایسے مقام تک جا پہنچا ہے جہاں آگے یا تو کئی راستے ہو جاتے ہیں یا کسی ایک راستہ کا بھی نشان گم ہو جاتا ہے اور وہ وہاں یہ سوچنے لگتا ہے کہ اب کیا کرے؟ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ جائے؟ یا اگر کوئی راستہ اختیار کرے تو کون سی راہ اختیار کرے؟ کسی شخص کے اس طرح راہ گم کر دینے کو لفظ ضلّ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس آیت میں ضالا کا یہی مفہوم ہے۔

آپ ضال کن معنوں میں تھے؟:۔ ۲۔ پھر کبھی انسان اسی حیرانگی کے عالم میں کسی غلط راستے پر بھی جا پڑتا ہے۔ اب اگر یہ غلط راستے پر پڑنا غیر ارادی طور پر اور سہواً ہو تو ضلّ کے معنی بھولنا ہوں گے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ﴾ (۲:۲۸۲) یعنی اگر ان دونوں عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

وَوَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰى ۝۸ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَاَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ

اور آپ کو مفلس پایا[۷] تو مالدار کر دیا(۸) لہٰذا کسی یتیم[۸] پر سختی نہ کیجیے(۹) اور نہ ہی کسی سائل[۹] کو جھڑکیے(۱۰)

۳۔ اور اگر غلط راستے پر پڑنا اور راہ راست سے ہٹ جانا ارادہ کے ساتھ یعنی عمداً ہو تو یہ گناہ ہے جیسے فرمایا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ (۱:۷) یعنی نہ تو ان لوگوں کی راہ دکھانا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کی۔ اور احادیث میں یہ صراحت ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے عدی بن حاتم کو فرمایا تھا کہ ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہود اور ﴿ضَآلِّيْنَ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں جو عقیدہ تثلیث کے موجد اور قائل تھے۔

۴۔ اور کبھی یہ لفظ کسی چیز کے اپنے وجود کو کھو کر دوسری چیز کے مل جانے کے معنوں میں آتا ہے جیسے کافر کہتے ہیں کہ ﴿ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ (۳۲:۱۰) یعنی جب ہم زمین میں مل کر زمین ہی بن جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہوں گے؟

۵۔ اور کبھی یہ لفظ ایسے کام کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو رہا ہو یعنی جس غرض کے لیے کوئی کام کیا جائے وہ پوری نہ ہو۔ جیسے فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾ (۱۸:۱۰۴) یعنی وہ لوگ جن کی سعی دنیا میں برباد ہو گئی اور وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔

۶۔ اور کبھی یہ لفظ کسی کی محبت میں فریفتہ ہونے پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا: ﴿تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ﴾ (۱۲:۹۵) یعنی اللہ کی قسم! تم تو یوسف کی اسی پرانی محبت میں (ابھی تک) جلا ہو۔

اس آیت میں پہلا اور چھٹا دونوں معنی استعمال ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں معنی آپ کی نبوت سے پہلی زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں اور ترجمہ میں پہلا معنی اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اس لفظ کا بنیادی معنی وہی ہے۔

[۷] **آپ کا بچپن:۔** آپ ﷺ کے والد ماجد نے میراث میں صرف ایک اونٹنی اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔ آپ کی رضاعت کا مسئلہ سامنے آیا تو سب دائیوں نے آپ کی رضاعت سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ آپ یتیم ہیں۔ والد موجود نہیں گھرانہ بھی اتنا مالدار نہیں تو یہاں سے کیا ملے گا۔ آخر یہ سعادت حلیمہ سعدیہ کے ہاتھ آئی اور انہوں نے آپ ﷺ کی رضاعت کو اس لیے قبول کر لیا کہ کسی امیر گھرانے کا بچہ انہیں ملا ہی نہیں تھا اور انہوں نے یہ سمجھ کر رضاعت قبول کی کہ کچھ ہونا بہرحال نہ ہونے سے بہتر ہے۔ آٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب فوت ہو گئے اور آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کی کفالت میں آ گئے۔ ابو طالب خود عیالدار اور مفلس تھے۔ اس دوران آپ ﷺ نے چند قیراط کی مزدوری پر مکہ والوں کی بکریاں بھی چرائی تھیں اور جو معاوضہ ملتا وہ ابو طالب کے حوالہ کر دیتے۔ ذرا بڑے ہوئے تو آپ ﷺ شام کے تجارتی سفروں میں حصہ لینے لگے۔ حسن معاملت کی بنا پر انہی ایام میں آپ ﷺ کی صداقت، امانت اور دیانت کا چرچا ہو گیا۔ اس پر مکہ کی ایک بیوہ اور مالدار خاتون نے آپ ﷺ کو مضاربت کی بنا پر اچھی خاصی رقم دے دی۔ واپس آئے تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام زید بن حارثہ نے، جو شریک سفر تھے آپ کی امانت، دیانت کی انتہائی تعریف کی۔ جس سے متاثر ہو کر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے خود نکاح کی پیش کش کی۔ یہ خاتون مالدار بھی تھیں، حسین بھی تھیں۔ لہٰذا معززین مکہ کی طرف سے ان کو کئی بار نکاح کے پیغام آئے

لیکن آپ سب کو رد کرتی رہیں مگر آپ ﷺ کو انہوں نے خود نکاح کا پیغام بھیج دیا جسے آپ ﷺ نے قبول کر لیا اور ۲۵ سال کی عمر میں آپ ﷺ کی ایک چالیس سالہ بیوہ خاتون سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی ہو گئی۔ نکاح کے بعد سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنا سارا مال و دولت اور غلام آپ ﷺ کی تحویل میں دے دیا۔ آپ ﷺ نے چند دنوں تو تجارت کی مگر جلدی ہی یہ سارا مال اللہ کی راہ میں محتاجوں، بیواؤں، بے روزگاروں اور ضرورتمندوں کو دے دیا کیونکہ آپ طبعاً امیری کی بجائے فقر کو پسند کرتے تھے اور یہی غنا کی سب سے بہترین قسم ہے کہ مالدار ہونے کے باوجود انسان فقر کو ترجیح دے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے اموال غنائم میں پانچواں حصہ مقرر کر دیا اور اموال فے سارے کے سارے آپ ﷺ کی تحویل میں دے دیے۔ مگر اتنے مال و دولت اور حکومت کے باوجود آپ سارا مال و دولت تقسیم کر دیتے تھے۔ بقدر کفاف اپنی گھریلو ضرورتوں کے لیے رکھ لیتے تھے اور ساری زندگی دولت پر فقر کو ترجیح دی۔ اس آیت میں آپ کی ابتدائی مفلسی اور اس کے بعد آپ کے اسی قسم کے غنا کا ذکر ہے۔

[۸] ❁ یتیم کی کفالت:۔ یعنی جس طرح ہم نے تمہاری یتیمی کے دوران ہر مرحلہ پر تمہارا خیال رکھا اسی طرح تم بھی یتیموں سے بہترین سلوک کرو۔ نہ انہیں دباؤ نہ ان پر سختی کرو، نہ انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دو بلکہ ان کی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھا کرو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دوسرے مسلمانوں کو بھی یتیموں کی کفالت اور ان سے حسن سلوک کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ: میں اور یتیم کا کفیل جنت میں اس طرح (اکٹھے) ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی شہادت کی اور وسطی انگلی کی طرف اشارہ کیا اور انہیں تھوڑا سا کھول دیا (بخاری، کتاب الادب۔ باب فضل من یعول یتیما)

[۹] ❁ سائل سے نرم برتاؤ:۔ سائل کا معنی کوئی چیز مانگنے والا بھی ہے اور کوئی بات پوچھنے والا بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ مطلب ہے کہ اگر تم سے کوئی چیز مانگنے والا آئے تو اسے کچھ نہ کچھ ضرور دے دو اور دینے کو کچھ نہ ہو تو نرمی سے معذرت کر دو۔ یعنی سائل کو جھڑک دینا جائز نہیں۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے۔

۱۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس جب کوئی سائل آتا یا کوئی شخص اپنی حاجت بیان کرتا تو آپ ﷺ صحابہ سے فرماتے کہ تم بھی سفارش کرو۔ تمہیں اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی زبان سے جو چاہے گا حکم دے گا۔ (بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ باب التحریض علی الصدقۃ والشفاعۃ فیھا)

۲۔ عبدالرحمن بن بجید اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ "بعض دفعہ کوئی سائل میرے دروازے پر آن کھڑا ہوتا ہے جسے میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا تو میں کیا کروں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر تم فقیر کو دینے کے لیے بکری کے ایک جلے ہوئے کھر کے سوا کچھ نہ پاؤ تو وہی اس کے ہاتھ میں رکھ دو" (ترمذی۔ ابواب الزکوۃ، باب ماجاء فی حق السائل)

۳۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں تمہیں ایسے آدمی کی خبر نہ دوں جو سب سے بدتر ہے؟" صحابہ نے عرض کیا: "ہاں بتایئے" فرمایا: "وہ شخص جس سے اللہ کے نام پر مانگا جائے اور وہ کچھ نہ دے" (نسائی۔ کتاب الزکوۃ، عمن یسئل باللہ عزوجل ولا یعطی بہ)

❁ عادی سائل کو جھڑکنے میں مضائقہ نہیں:۔ البتہ اگر مانگنے والا عادی سائل ہو اور چمٹ کر سوال کرنے والا ہو تو اسے

رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿١١﴾

اور آپ پر آپ کے پروردگار نے جو انعام کیا ہے اسے بیان [۱۰] کیا کیجیے۔(۱۱)

جھڑکنے میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ ایسے سائلوں کو بھی اس آیت کی رو سے کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے تھے۔ مگر یہ دینا آپ کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

۱۔ سیدنا معاویہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ سے چمٹ کر سوال نہ کیا کرو۔ جو شخص بھی تم میں سے مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو میں اسے کچھ نہ کچھ دے دیتا ہوں۔ حالانکہ میں اس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ اس طرح اس چیز میں برکت نہیں رہتی جو میں اسے دیتا ہوں۔ (مسلم، کتاب الزکوۃ باب النهى عن المسئلة)

۲۔ سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کا کچھ مال تقسیم فرمایا تو میں نے عرض کی۔ "یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی قسم اس کے مستحق تو اور لوگ تھے۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں نے دو باتوں میں سے مجھے کسی ایک بات پر مجبور کر دیا تو بے حیائی اور ڈھٹائی سے مجھ سے مانگیں یا میں ان کے آگے بخیل ٹھہروں اور میں بخل کرنے والا نہیں ہوں" (مسلم، کتاب الزکوۃ۔ باب اعطاء المؤلفة..........)

ایسی ہی احادیث سے علماء نے استنباط کیا ہے کہ غیر مستحق، عادی قسم کے اور چمٹ کر سوال کرنے والوں کو جھڑکنے میں کچھ حرج نہیں۔

اور اگر سائل کے معنی کوئی بات یا مسئلہ پوچھنے والا لیا جائے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سوال کرنے والا غیر مہذب، اجڈ قسم کا انسان ہو۔ ایسے شخص کو جھڑکنا نہیں چاہیے بلکہ لاعلمی کو جہالت پر محمول کرتے ہوئے مسئلہ بتا دینا اور پوری طرح سمجھا دینا چاہیے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ علم رکھنے والا خود اپنے علم کا زعم اور غرور رکھتا ہو اور اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھتا ہو اور اپنی اسی بدمزاجی پر عام لوگوں کو کوئی سوال کرنے یا مسئلہ پوچھنے پر جواب دینا پسند ہی نہ کرے اور انہیں جھڑک دے۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہے اور اس آیت میں اسی چیز سے منع کیا گیا ہے۔

[۱۰] تحدیث نعمت کا مطلب:۔ کچھ نعمتوں کا ذکر تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں کر دیا۔ ان کے علاوہ آپ ﷺ پر اللہ کے بے شمار احسانات تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے ذکر اور اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تہ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔ اور قطعاً یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھ میں کوئی خاص اہلیت اور قابلیت تھی جس کی وجہ سے مجھ پر اللہ نے یہ احسان کیے۔ بلکہ انہیں محض اللہ کے فضل و کرم پر محمول کیا جائے اور ان نعمتوں کا اسی جذبہ کے تحت دوسرے لوگوں کے سامنے بھی اقرار و اعتراف کیا جائے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ اس اقرار و اعتراف میں فخر و مباہات کا شائبہ تک نہ ہو۔

۸ آیاتها — سورۃ الانشراح مکیۃ — رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿١﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾ الَّذِيْٓ أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾ وَرَفَعْنَا

کلمات ۲۷ آیات ۸ (۹۴) سورۃ الم نشرح مکی ہے (۱۲) رکوع ۱ حروف ۱۰۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ نہیں کھول[1] دیا؟(۱) اور آپ سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا(۲) جو آپ کی کمر توڑ[2] رہا تھا(۳) اور آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند[3] کر دیا(۴)

[۱] شرح صدر کے دو مفہوم:۔ شرح صدر کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی بات، نظریہ، عقیدہ یا معاملہ کی انسان کو پوری طرح سمجھ آجائے۔ اس میں کوئی شک و شبہ یا ابہام باقی نہ رہے اور انسان کو جو کچھ سمجھ میں آئے اس پر اسے یقین اور اطمینان حاصل ہو جائے جیسے فرمایا: ﴿فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ (۶:۱۲۶) "یعنی جس شخص کو اللہ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے" یعنی اسے یہ یقین و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ اسلام کے پیش کردہ عقائد ہی درست ہیں۔ اور اس لفظ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ جس کام کو انسان ایک بہت بڑا مشکل کام سمجھ رہا ہو اور اس کام کو سرانجام دینا اسے گراں بار محسوس ہو رہا ہو اس کام کے کر گزرنے اور اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے اس کی طبیعت آمادہ ہو جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت دے کر حکم دیا کہ اب فرعون کے ہاں جا کر اسے میرا پیغام دو۔ تو اس وقت آپ نے دعا فرمائی۔ ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ﴾ (۲۰:۲۵۔۲۶) "یعنی اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دے اور میرے لیے میرا یہ (مشکل) کام آسان بنا دے"

اس آیت میں سوالیہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ جس سے اس کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے اسلام کی دعوت کا کام شروع کیا تو وہی قوم جو آپ کے گن گاتے تھکتی نہ تھی اور آپ ساری قوم کے محبوب فرد تھے، آپ کی دشمن بن گئی۔ یہ بات آپ ﷺ کے لیے تکلیف دہ بھی تھی اور حیران کن بھی تھی لیکن ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام اور اسلام لانے والے مسلمانوں کو اتنا عظیم حوصلہ عطا فرما دیا کہ وہ کفار مکہ کے مظالم سہنے کے باوجود ان کے آگے نہ جھکتے تھے اور نہ دبتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر حوصلہ آپ ﷺ کو عطا کیا گیا کیونکہ کفار کا اصل ہدف آپ ہی کی ذات مبارک تھی۔ آپ ﷺ کا، آپ کی رسالت کا، اللہ کی آیات کا اور آپ کے کلام کا مذاق و استہزاء کفار کا دلچسپ مشغلہ تھا اور آپ ﷺ کو جسمانی ایذاؤں کی انتہا اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ مکی دور میں کافروں نے آپ پر سات مرتبہ قاتلانہ حملے کیے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے سورہ مائدہ آیت ۶۷ کا حاشیہ) علاوہ ازیں جب بھی کسی مسلمان پر ظلم و ستم ہوتا تو اس دکھ میں بھی آپ برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ احسان یاد دلایا ہے کہ کیا تمہیں ہم نے ان مصائب کو برداشت کرنے کے لیے چٹان جیسا حوصلہ نہیں عطا فرما دیا؟ مزید تفصیل کے لیے میری کتاب محمد ﷺ...... پیکر صبر و ثبات" ملاحظہ کیجیے۔

[۲] وزر کے دو مفہوم:۔ وِزْر کا لفظ بھاری بوجھ کے لیے آتا ہے اور اس کی جمع اوزار ہے لیکن اس کا اکثر استعمال معنوی

بوجھ کے لیے ہوتا ہے بالخصوص بار گناہ اور کسی طرح کے بھی ذہنی بوجھ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں وزر سے مراد وہ ذہنی بوجھ ہے جو نبوت سے پہلے ہی آپ کو لاحق تھا۔ جب آپ اپنی قوم کو کفر و شرک کی گمراہیوں اور طرح طرح کی معاشرتی برائیوں میں مبتلا دیکھتے تھے تو آپ ﷺ پورے معاشرے کی اس حالت پر سخت دل گرفتہ رہتے تھے کہ کس طرح اس بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔ مگر اس کی کوئی صورت، کوئی طریقہ اور کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ بالآخر آپ پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی اور آپ ﷺ کو ٹھیک طرح سے معلوم ہو گیا کہ اس سارے بگاڑ کا علاج توحید، عقیدہ آخرت اور رسالت پر ایمان میں مضمر ہے۔ چنانچہ آپ کا سارا ذہنی بار ہلکا ہو گیا اور آپ ﷺ کو یقین حاصل ہو گیا کہ اس طرح نہ صرف اپنی قوم بلکہ ساری دنیا کو ان خرابیوں اور برائیوں سے نکالا جا سکتا ہے جن میں اس وقت عرب کے علاوہ باقی ساری دنیا بھی مبتلا تھی۔ علاوہ ازیں وزر کا دوسرا مفہوم رسالت کی ذمہ داریاں بھی ہو سکتا ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ (۷۳:۵) یہ بوجھ بھی ابتداءً نہایت گراں بار تھا جبکہ آغاز دعوت پر مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پہاڑ جیسا حوصلہ عطا کر کے اس کمر توڑ بوجھ کو آپ ﷺ کے ذہن سے اتار دیا اور آپ ﷺ ذمہ داریاں نباہنے کے لیے دل و جان سے مستعد ہو گئے۔

[۳] ❁ آپ کا ذکر بلند ہونے کے مختلف ذرائع' پہلا ذریعہ خود کفار مکہ تھے:۔ آپ ﷺ کے ذکر خیر کی بلندی کا آغاز ابتدائے نبوت ہی سے شروع ہو گیا تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ ہی سے لیا۔ مثل مشہور ہے۔ عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد (یعنی بعض دفعہ دشمن بھی ایسی شرارتیں کرنے لگتا ہے جس میں ہماری بھلائی ہوتی ہے) کفار مکہ نے اسلام کو زک پہنچانے اور آپ ﷺ کی دعوت کے سدباب کے طور پر جو ذریعے اختیار کیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ حج کے موقعہ پر تمام عرب قبائل حج کی غرض سے مکہ آتے تھے تو کفار نے آپس میں یہ طے کیا کہ ان وفود کو مل کر انہیں محمد ﷺ کی دعوت سے متنفر کیا جائے اور کہا جائے کہ کہیں فلاں شخص کے دام فریب میں نہ آ جانا۔ اس کے پاس ایسا جادو ہے جو بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے اور بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کافروں کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور آپ ﷺ کے خلاف مہم چلاتے اور آپ ﷺ کو بدنام کرتے تھے لیکن باہر سے آنے والے لوگ بھی آخر اتنے بدھو تو نہیں ہوتے تھے جو فوراً کافروں کی بات کا یقین کر لیتے۔ لہٰذا ان کی اس مخالفانہ مہم سے آپ ﷺ کو دو فائدے پہنچے۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ کا ذکر خیر عرب کے کونے کونے میں ہونے لگا۔ دوسرے لوگوں کے ذہنوں میں یہ جستجو پیدا ہوئی کہ جس شخص کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اس کی اصل حقیقت تو معلوم کرنی چاہیے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی ہجرت سے پیشتر عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں رہا تھا جس میں کوئی نہ کوئی مسلمان موجود نہ ہو اور وہاں آپ کا ذکر خیر نہ کیا جاتا ہو۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے جس طرح لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا اقرار ضروری تھا۔ اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اقرار بھی ضروری تھا۔ علاوہ ازیں مکہ میں تو آپ کے دشمن صرف قریش مکہ تھے مگر مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ کے مخالف گروہ ایک کے بجائے چار بن گئے۔ ایک قریش مکہ، دوسرے یہود مدینہ، تیسرے مدینہ اور عرب بھر کے مشرک قبائل اور چوتھے منافقین جو مدینہ کے علاوہ دوسری بستیوں میں بھی موجود تھے۔ اور ان کی ہمدردیاں ہر دشمن اسلام گروہ سے وابستہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے اسلام کی راہ روکنے کے لیے قریش مکہ کی روش اور اس سے ملتے جلتے طریقے اختیار کیے اور یہ سب لوگ آپ کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے۔ لیکن ان

لَكَ ذِكْرَكَ ﴿٤﴾ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٥﴾ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٦﴾ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿٧﴾

وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿٨﴾ ع ۱ ۱۹

بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی[۴] ہے(۵) بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے(۶) تو جب آپ فارغ ہوں تو (عبادت کی) مشقت میں لگ جائیں(۷) اور اپنے پروردگار کی طرف راغب[۵] ہوں(۸)

کے نتائج بھی ان کی توقعات کے برعکس برآمد ہوئے اور دس سال کے قلیل عرصہ میں سارا عرب مسلمان ہو کر دن میں کئی کئی بار لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کی صدائیں بلند کرنے لگا۔ اذان میں، اقامت (تکبیر تحریمہ) میں، درود میں آپ ﷺ کا ذکر خیر لازمی تھا۔ پھر آپ ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی تحریک عرب سے باہر نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ پھر یہ حالت ہو گئی کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف اوقات اذان و نماز کی وجہ سے غالباً دن میں ایک لحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جس میں آپ ﷺ کے ذکر کا آوازہ بلند نہ کیا جارہا ہو اور یہ سلسلہ تاقیامت بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ پیشینگوئی اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی تھی جب مکہ کے لوگوں کے علاوہ آپ کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ اور وہ بھی آپ کے دشمن اور آپ کی ہستی کو دنیا سے ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ قرآن کی یہ پیشینگوئی خود قرآن کی صداقت پر کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اس وقت کون یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ آپ ﷺ کا ذکر خیر اس شان کے ساتھ اور اتنے وسیع پیمانے پر ہو گا۔

[۴] ان دو آیات میں بہ تکرار آپ ﷺ کو یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ اگر اس وقت آپ مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں تو عنقریب مصائب کے یہ بادل چھٹ جائیں گے اور اتنی ہی آپ کو سہولتیں اور آسانیاں میسر آئیں گی۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ تنگی کے بعد آسانی ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بہت جلد یہ صورت حال بدل جانے والی ہے۔ اس طرح آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو تسلی بھی دے دی گئی کہ وہ یہ مشکل وقت حوصلہ اور صبر کے ساتھ برداشت کریں بس تھوڑی ہی دیر بعد کایا پلٹ جانے والی ہے۔

[۵] یعنی جب آپ کو تبلیغ کے کاموں سے گھریلو مشاغل سے اور اسلام لانے والوں کی تعلیم و تربیت سے فراغت حاصل ہو تو اپنے پروردگار سے لو لگائیے۔ اور یکسو ہو کر اس سلسلہ میں ریاضت کیجئے۔ کیونکہ مشکلات کے دوران اللہ کی عبادت اس کا ذکر اور اس پر توکل ہی انسان کو ایسا حوصلہ عطا کرتا ہے جس سے مصائب کو برداشت کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔

۸ آیاتھا سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ

کلمات ۳۴ آیت ۸ (۹۵) سورۃ التین مکی ہے (۳۴) رکوع ۱ حروف ۱۶۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

قسم ہے انجیر[۱] کی اور زیتون[۲] کی (۱) اور طور سینا[۳] کی (۲) اور اس پُر امن شہر[۴] (مکہ) کی (۳) کہ ہم نے انسان کو

[۱] تین بمعنی انجیر کا درخت بھی اور اس کا پھل بھی اور اس کا واحد تینۃ ہے۔ بمعنی انجیر کا ایک دانہ۔ یہ ایک خوش ذائقہ معروف پھل ہے جس میں غذائیت بہت ہوتی ہے اور بہت سی بیماریوں کا علاج بھی ہے۔ اور تیانۃ بمعنی انجیر فروش اور متانۃ انجیر کے باغ کو کہتے ہیں یا ایسی جگہ کو جہاں انجیر کے درخت بکثرت پائے جائیں۔

[۲] زیتون ایک درخت ہے جس سے زیتون کا تیل نکالا جاتا ہے اور اس کے پھل کو زیتونۃ کہتے ہیں اور تیل کو زیت پھر زیت کا اطلاق ہر قسم کے تیل پر ہونے لگا، خواہ وہ کسی چیز سے نکالا جائے اور زیات بمعنی تیلی، تیل نکالنے والا یا بیچنے والا۔ لیکن اس آیت میں انجیر یا اس کے درخت اور زیتون کے درخت کی قسم نہیں کھائی گئی بلکہ اس سرزمین کی قسم کھائی گئی ہے جس میں یہ درخت بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ علاقہ شام و فلسطین کا علاقہ ہے۔ اہل عرب کا جس طرح یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی چیز کا جزو اشرف بول کر اس سے مراد اصل چیز لے لیتے ہیں۔ اسی طرح ان میں یہ بھی دستور ہے کہ وہ کسی علاقہ کی مشہور پیداوار کا نام لے کر اس سے وہ علاقہ مراد لے لیتے ہیں اور اس بات کی تائید اس سورت کی اگلی دو آیات سے بھی ہو جاتی ہے یعنی طور سینین اور شہر مکہ سے کہ یہ سب مقامات انبیاء کے مولد و مسکن رہے ہیں۔

[۳] طور سینین کو سورۃ المومنون کی آیت نمبر ۲۰ میں طور سیناء کہا گیا ہے۔ اور آج کل بھی سیناء کا نام سیناء ہی ہے۔ یہ ایک بلند پہاڑ ہے جو مصر سے مدین یا مدین سے مصر جاتے ہوئے راستہ میں پڑتا ہے۔ اسی پہاڑ کی ایک چوٹی کا نام طور ہے۔ اور اسی پہاڑ کے دامن میں وادی کا نام طویٰ ہے جسے قرآن میں وادی مقدس اور البقعۃ المبارکہ بھی کہا گیا ہے۔ اسی مقام پر موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی اور دو دفعہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔

[۴] البلد الامین یعنی شہر مکہ معظمہ جہاں طوفان نوح کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے مل کر دوبارہ کعبہ تعمیر کیا تھا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی ساری زندگی یہیں بسر کی تھی اور جہاں افضل الانبیاء نبی آخر الزمان پیدا ہوئے۔ یہیں آپ ﷺ کو نبوت عطا ہوئی اور نبوت کے بعد تیرہ سال یہیں گزارے۔ اسی مقام کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اس شہر کو محترم اور امن والا بنادے۔ اور اڑھائی ہزار سال گزرنے کے بعد اس شہر کا احترام بدستور قائم رہا۔ عرب بھر میں ہر جگہ لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رہتا تھا۔ بس یہی ایک جگہ تھی جہاں لوگوں کو امن میسر آتا تھا اور مکہ کی یہ حرمت آج تک قائم ہے اور آئندہ بھی قائم رہے گی۔

تَقْوِيْمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۶﴾ فَمَا

بہترین ساخت[۵] پر پیدا کیا ہے (۴) پھر ہم نے اسے ادنیٰ ترین مخلوق کے درجہ[۶] میں لوٹا دیا۔(۵) بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے' ان[۷] کے لیے غیر منقطع اجر ہے (۶) پھر اس کے بعد جزا و سزا کے بارے[۸] میں

[۵] انسان کی دوسرے جانداروں پر فضیلت کن باتوں میں؟ اولوالعزم انبیاء کے مساکن کی قسم اللہ تعالیٰ نے اس بات پر کھائی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین ساخت پر پیدا فرمایا ہے۔ اسے جسم سیدھا اور استوار دیا گیا ہے جو اور کسی مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ پھر اسے فکر و فہم، علم و عقل، قیاس و استنباط اور علت و معلول سے نتائج اخذ کرنے کی جو قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں وہ اور کسی مخلوق کو نہیں دی گئیں۔ آدم کو مسجود ملائکہ بنایا گیا۔ زمین اور اس میں موجود اشیاء کو اس کے لیے مسخر کر دیا گیا۔ انبیاء اسی نوع سے مبعوث ہوئے جو اللہ کے ہاں افضل الخلائق ہیں۔

[۶] انسان تمام مخلوق سے پست کیسے؟ یعنی اگر انسان اپنی ان خداداد ذہنی صلاحیتوں اور جسمانی قوتوں کو برائی کے راستے میں استعمال کرے اور اللہ کی نافرمانی اور بغاوت پر اتر آئے تو انسان حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے وہ اس طرح کہ حیوانوں کو اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کی تمیز نہیں بخشی اور انسان اگر اس تمیز کے ہوتے ہوئے بھی اسے استعمال نہ کرے تو جانوروں سے بدتر ٹھہرا۔ لیکن انسان تو اخلاقی لحاظ سے اتنی پستی میں جا گرتا ہے جس کا حیوانوں میں تصور بھی محال ہے۔ انسانی معاشرے میں حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، ظلم و بربریت، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت جیسی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ حیوانوں میں کہاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس لحاظ سے انسان فی الواقع تمام مخلوق سے پست اور کہتر بن جاتا ہے۔

[۷] یعنی بنی نوع انسان کی اکثریت ایسی ہی تھی جو احسن تقویم پر برقرار رہنے کے بجائے اسفل السافلین کی پستی تک جا پہنچی۔ پھر انہی قوموں پر اللہ کے عذاب آتے رہے اور وہ تباہ و برباد ہوتی رہیں۔ نبی ہمیشہ اس وقت مبعوث کیے جاتے ہیں جب کوئی قوم اسفل السافلین کی پستیوں میں جا گرتی ہے پھر ان انبیاء پر بھی تھوڑے ہی لوگ ایمان لانے والے ہوتے ہیں۔ پھر ان ایمان لانے والوں اور اعمال صالح بجا لانے والوں کی نسلیں بھی بعد میں انتشار، شرکیہ عقائد یا ایسے عقائد و اعمال میں مبتلا ہو جاتی ہے جو ایمان بالآخرت کو عملاً باطل بنا دیتے ہیں اور صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو انبیاء پر صحیح طور پر ایمان لاتے، صحیح عقائد پر قائم رہتے اور انہیں عقائد کے مطابق نیک اعمال بجا لاتے ہیں۔ یہی لوگ اس صفت احسن تقویم کا حق ادا کرتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تھا اور انہی لوگوں کے لیے اخروی نجات اور غیر منقطع اجر ہوگا۔

[۸] یعنی یہ بات تو ہر ایک کے مشاہدہ میں آ رہی ہے کہ بنی نوع انسان دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اس کی اکثریت اسفل السافلین کی پستیوں میں گری ہے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے احسن تقویم پر ہونے کے تقاضے پورے کیے۔ کیا یہ دونوں گروہ ایک جیسے ہو سکتے ہیں یا ان کے اعمال کے نتائج ایک ہی جیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا اس بات سے انکار کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ اچھے عمل کرنے والوں کو اچھا بدلہ دیا جانا چاہیے یا بدکردار لوگوں کو ان کے اعمال کی پوری پوری سزا دی جانی چاہیے؟ اور یہی چیز نظریہ آخرت ہے۔

[۹] یعنی دنیا کے بادشاہوں میں بھی عدل کا یہ قانون رائج ہے کہ مجرموں کو سزا دیتے ہیں اور اچھے اور نمایاں کام کرنے والوں کو

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝۷ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸

آپ کو کون جھٹلا سکتا ہے؟(۷) کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا[۹] حاکم نہیں؟(۸)

انعام دیتے ہیں۔ تو اللہ جو سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کے ہاں ہی یہ قانون رائج نہ ہوگا؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ دنیا چونکہ دارالعمل ہے اس لیے ان گروہوں کا حساب اسی دنیا میں فوراً نہیں چکا دیا جاتا بلکہ اس جزا و سزا کو آخرت پر مؤخر کر دیا گیا ہے جو دارالجزاء ہے۔ البتہ اگر کسی فرد یا کسی قوم کا ظلم حد سے تجاوز کر جائے تو اللہ باقی لوگوں کو اس کے ظلم سے بچانے کی خاطر اس دنیا میں بھی اسے عذاب سے دوچار کر کے اور تباہ کر کے دوسروں کو اس سے بچا لیتا ہے۔

سیدنا ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ سورت پڑھے تو جب ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ﴾ پر پہنچے تو اس کے بعد کہے بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

۱۹ آیاتھا سورۃ العلق مکیۃ رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ

کلمات ۷۲ آیات ۱۹ (۹۶) سورۃ العلق[۱] مکی ہے (۱) رکوع ۱ حروف ۲۹۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے[۲] جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا (۱) (اور) انسان کو خون کے[۳] لوتھڑے سے پیدا کیا (۲) پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم[۴] ہے (۳) جس نے قلم کے ذریعہ[۵] علم سکھایا (۴)

[۱] اس سورت کی ابتدائی ۵ آیات غار حرا میں نازل ہوئیں اور انہی آیات سے آپ کی نبوت کا اور وحی کا آغاز ہوا۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کی نبوت یوں شروع ہوئی کہ آپ ﷺ کے خواب سچے ہونے لگے آپ ﷺ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح سامنے آجاتا۔ پھر آپ ﷺ کو تنہائی بھلی لگنے لگی۔ آپ غار حرا میں جاکر عبادت کیا کرتے اور کئی کئی راتیں وہاں رہتے، گھر نہ آتے اور توشہ ساتھ لے جاتے پھر اپنے گھر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے اور اتنا ہی توشہ اور لے جاتے۔ یہاں تک کہ غار حرا میں آپ پر وحی نازل ہوئی۔

❁ وحی کا آغاز کیسے ہوا؟ آپ ﷺ کے پاس فرشتہ (جبریلؑ) آیا اور کہنے لگا: "پڑھیے" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں ان پڑھ ہوں"۔ آپ ﷺ کہتے تھے کہ پھر فرشتہ نے مجھے بڑے زور سے بھینچا۔ پھر چھوڑا اور کہا: "پڑھیے" میں نے کہا: میں ان پڑھ ہوں پھر دوبارہ اس نے مجھے زور سے بھینچا۔ چھوڑا اور کہا "پڑھیے" میں کہا: "میں پڑھا لکھا نہیں" فرشتہ نے پھر تیسری بار زور سے بھینچا۔ پھر چھوڑا اور کہا: ﴿اقرا باسم...... لم یعلم﴾ پھر آپ ﷺ اپنے گھر کو لوٹے اور آپ ﷺ کے کندھے اور گردن کا گوشت (ڈر کے مارے) پھڑک رہا تھا۔ آکر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "مجھے کپڑا اوڑھادو' کپڑا اوڑھادو" پھر جب آپ ﷺ کا ڈر جاتا رہا تو آپ ﷺ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا: "خدیجہ! پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ مجھے تو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا" پھر آپ ﷺ نے انہیں سارا واقعہ سنایا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں۔ "ہرگز ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ آپ خوش ہو جائیے۔ اللہ کی قسم! آپ ﷺ کو اللہ کبھی ضائع نہ کرے گا۔

❁ نبوت سے پہلے آپ کا کردار: کیونکہ آپ ﷺ قرابتداروں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ ناتوانوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں۔ محروم لوگوں کو (ضرورت کی) اشیاء مہیا کرتے ہیں۔ مہمان کی ضیافت کرتے ہیں اور مصائب میں حق کی پاسداری کرتے ہیں" پھر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھے۔ یعنی ان کا باپ اور ورقہ کا باپ بھائی بھائی تھے۔ دور جاہلیت میں وہ عیسائی ہو گئے تھے (کیونکہ اس وقت یہی دین حق تھا) وہ عربی لکھنا خوب جانتے تھے اور انجیل کا عربی زبان میں ترجمہ لکھا کرتے تھے جتنی کہ اللہ کو منظور ہوتا۔ وہ

بہت بوڑھے تھے اور اندھے ہو گئے تھے۔

❁ ورقہ بن نوفل کا آپ کو تسلی دینا:۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: "بھائی ذرا اپنے بھتیجے کی بات تو سنو" چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا۔ وہ کہنے لگے: "یہ تو وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترتا تھا۔ کاش میں اس وقت جوان ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب تمہاری قوم تمہیں (مکہ سے) نکال دے گی۔

❁ ہجرت کی بات پر آپ کا تعجب؟ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" ورقہ کہنے لگے "ہاں! کیونکہ جو چیز آپ ﷺ لائے ہیں وہ جو بھی لایا اسے تکلیف ہی دی گئی اور اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو تمہاری بھرپور مدد کروں گا" پھر اس واقعہ سے تھوڑی ہی مدت بعد ورقہ فوت ہو گئے۔ اور وحی کا آنا بھی موقوف رہا جس کی وجہ سے آپ غمگین رہا کرتے تھے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

آیت نمبر ۶ سے آخر تک کی چودہ آیات اس وقت نازل ہوئیں۔ جب آپ ﷺ نے دار ارقم سے نکل کر بیت اللہ شریف میں نماز ادا کرنا شروع کی تھی۔ ان آیات میں بھی مخاطب کا نام نہیں لیا گیا مگر جو صفات بیان کی گئیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا روئے سخن ابوجہل کی طرف ہے جو آپ کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے روکا کرتا تھا۔ اور ایسا واقعہ کوئی ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ پیش آیا تھا۔

[۲] ❁ آغاز وحی میں ہی تین اہم سوالوں کا جواب:۔ ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل نے غار حرا میں جو وحی آپ پر پیش کی۔ وہ مکتوب شکل میں تھی۔ ورنہ آپ کو جواب میں ما أنا بقاری (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اگر کوئی استاد کسی بچہ کو یا شاگرد کو زبانی پڑھائے تو اسے ایسا فقرہ جواب میں کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

وحی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی معرفت سے کیا گیا۔ کائنات کی تخلیق کس نے کی؟ کیسے ہوئی؟ انسان کا اس کائنات میں کیا مقام ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو ابتدائے نوع انسانی سے ہی صاحب فکر انسانوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اسی سوال کا جواب سب سے پہلے دیا گیا اور بتایا گیا کہ کائنات از خود ہی مادہ سے پیدا نہیں ہو گئی۔ نہ یہ حسن اتفاقات کا نتیجہ ہے۔ بلکہ کائنات کی ایک ایک چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی کے نام سے یعنی بسم اللہ کہہ کر آپ ﷺ یہ وحی پڑھنا شروع کیجیے۔

[۳] یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے؟ اور جواب یہ ہے کہ جیسے کائنات کی ہر چیز اللہ کی مخلوق ہے، ویسے ہی انسان بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ مخلوق کو یہ کسی طرح جائز نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسی مخلوق کے آگے سر جھکائے۔ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک معجز نما طریق سے پیدا کیا۔ استقرار حمل کے بعد وہ ایک بے جان لوتھڑا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے کئی مراحل گزارے۔ اس لوتھڑے پر اس کے اعضاء کے نقش و نگار بنائے۔ جسم کے اندرونی اعضاء پیدا کیے پھر اس میں کئی طرح کی ظاہری اور باطنی قوتیں پیدا کر کے اسے ماں کے پیٹ سے باہر نکالا۔

[۴] ❁ اللہ اکرم کس لحاظ سے ہے؟ جس نے انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی زندگی کی بقا کے وہ تمام اسباب مہیا کر دیے جو اس غرض کی تکمیل کے لیے ضروری تھے۔ پھر انسان کو ان اسباب سے کام لینے اور انہیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی اس کی فطرت میں رکھ دیا۔ اسی پروردگار کا نام لے کر آپ پڑھیے۔

[۵] انسان کی بہت بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ صاحب علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ مہربانی فرمائی کہ اسے قلم کے استعمال

بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ ﴿۶﴾ أَنْ رَآهُ اسْتَغْنَىٰ ﴿۷﴾ إِنَّ إِلَىٰ
رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ ﴿۸﴾ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ﴿۹﴾ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ﴿۱۰﴾ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ ﴿۱۱﴾ أَوْ أَمَرَ

انسان کو وہ کچھ سکھا دیا[۶] جو وہ نہیں جانتا تھا۔(۵) ہرگز ایسا نہیں چاہیے کہ انسان سرکشی کرنے لگتا ہے(۶) اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا[۷] ہے(۷) یقیناً (تجھے) اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا[۸] ہے(۸) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع[۹] کرتا ہے(۹) جب بندہ نماز پڑھے۔(۱۰) ذرا سوچو تو، اگر وہ بندہ راہ راست پر ہو(۱۱) یا نافرمانی سے بچنے کا حکم دیتا ہو(۱۲)

کا طریقہ سکھایا۔ جس سے علم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی ہے اور لکھی ہوئی چیز کسی عالم کی موت کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔ اور اگلی نسلوں میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو علم اور کتابت کے فن کا طریقہ الہام نہ کرتا تو انسان کی علمی قابلیتیں سمٹ کر انتہائی محدود رہ جاتیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عام دستور ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جو علم انبیاء کو بذریعہ وحی عطا فرماتا ہے وہ انسانی علوم سے بلند تر اور ہر قسم کی غلطیوں سے پاک ہوتا ہے۔ یہ استثنائی صورت ہے اور بالخصوص رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعہ علم نہیں سکھایا جس میں کفار کے کئی اعتراضات کے جواب اور کئی دیگر مصلحتیں تھیں جن کا قرآن نے جابجا ذکر کر دیا ہے۔

[۶] انسان جب ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے اس وقت وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ اسے قلم کے استعمال سے پہلے ہی بہت سی باتیں سکھا دیتا ہے۔ یہ پہلی وحی کی آخری آیت ہے جس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ آپ ﷺ کو وہ علم دیا جا رہا ہے جو جاننے کے لیے آپ ﷺ عرصہ سے بے تاب تھے اور اس نے آپ کو اپنا نبی بنا لیا ہے۔

[۷] آیت نمبر ۶ اور آیت نمبر ۷ میں انسانوں کی اکثریت یا خدا فراموش انسان کی ایک عام خصلت بیان کی گئی ہے کہ جب کسی کو سیر ہو کر کھانے کو ملنے لگتا ہے اور اس پر خوش حالی کا دور آتا ہے تو وہ اپنے جیسے انسانوں کو درکنار اپنے خالق و مالک کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور اس کی سرکشی اور بغاوت پر اتر آتا ہے۔

[۸] رُجْعٰی بمعنی لوٹ کر واپس جانے کا مقام، یعنی انسان دنیا میں خواہ کتنی ہی سرکشی اختیار کر لے۔ بالآخر اسے اپنے پروردگار کے پاس جانا پڑے گا۔ اس وقت اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی اس متکبرانہ روش کا انجام کیسا ہوتا ہے؟

[۹] آپ ﷺ کے بیت اللہ میں نماز پڑھنے پر ابوجہل کا سیخ پا ہونا اور متعدد بار حملے کرنا۔ ایک دفعہ ابوجہل نے قریشی سرداروں سے کہا: محمد (ﷺ) تم لوگوں کے سامنے اپنا چہرہ خاک آلود کرتا ہے۔ (یعنی بیت اللہ میں نماز ادا کرنے کے دوران سجدہ کرتا ہے) لوگوں نے کہا: "ہاں" کہنے لگا: لات و عزیٰ کی قسم! اگر میں نے اسے اب اس حال میں دیکھ لیا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا اور اس کا چہرہ مٹی پر رگڑ دوں گا۔ اس کے بعد جب اس نے آپ کو کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا تو اس برے ارادے سے آپ کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک پیچھے ہٹنے لگا۔ سرداران قریش نے جب اپنے رئیس کو اس حال میں دیکھا تو حیرانی سے پوچھا: "ابوالحکم کیا ہوا؟" وہ گھبرایا ہوا کہنے لگا: کہ "میرے اور محمد ﷺ کے درمیان ایک خوفناک آگ حائل ہو گئی تھی" اور رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو اچک لیتے" (بخاری، کتاب التفسیر۔ تفسیر لئن لم ینته، نیز مسلم کتاب

بِالتَّقْوٰى ﴿۱۲﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا

(اور) ذرا سوچو (وہ منع کرنے والا) اگر حق کو جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو (۱۳) تو کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے[۱۰] (۱۴) ہرگز ایسا نہیں چاہیے۔ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اسے گھسیٹیں گے (۱۵)

صفة القيامة والجنة والنار)

نیز ایک دفعہ ابو جہل اپنے اہل مجلس سے کہنے لگا کہ: "محمد ﷺ نے ہمارے معبودوں کی تذلیل اور بزرگوں کی توہین کر کے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب میں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ جب اسے نماز میں دیکھوں گا۔ اس کا سر ایک بھاری پتھر سے کچل دوں گا۔ پھر تم خواہ بنو عبد مناف سے میری حفاظت کرو یا مجھے بے یار و مددگار چھوڑ دو" اس کے ساتھیوں نے کہا: "ہم تجھے بے یار و مددگار نہ چھوڑیں گے۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو" چنانچہ جب صبح ہوئی اور آپ ﷺ حسب دستور نماز ادا کرنے لگے تو وہ اپنے پروگرام کے مطابق ایک بھاری پتھر اٹھا کر آگے بڑھا اور آپ ﷺ کے سجدہ میں جانے کا انتظار کرنے لگا۔ قریب پہنچا ہی تھا کہ پھر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا رنگ اڑ گیا اور وہ بدحواسی کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے پتھر بھی نیچے نہ پھینک سکا۔ اس کے دوستوں نے پوچھا: "ابو الحکم! یہ کیا ماجرا ہے؟" اس کے حواس ٹھکانے آئے تو کہنے لگا: "کیا بتاؤں۔ ایک کریہہ المنظر اونٹ آڑے آ گیا تھا۔ اس اونٹ جیسی کھوپڑی، اس جیسی گردن اور اس اونٹ کے دانتوں جیسے دانت میں نے آج تک نہیں دیکھے یہ اونٹ مجھے نگل جانا چاہتا تھا" (ابن ہشام ۱: ۲۹۸، ۲۹۹)

ایذا پہنچانے والے کافروں کے حق میں آپ کی بددعا:۔ ایک دفعہ آپ خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو جہل اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا: تم میں سے کون ہے جو فلاں شخص کے ہاں ذبح شدہ اونٹنی کا بچہ دان اٹھا لائے۔ اور محمد ﷺ جب سجدہ میں جائے تو اس کی پیٹھ پر رکھ دے؟" عقبہ بن ابی معیط جھٹ بول اٹھا کہ یہ کام میں کروں گا" چنانچہ وہ گیا اور بچہ دان اٹھا لایا۔ پھر جب آپ سجدہ میں گئے تو اسے آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان رکھ دیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ "میں ان کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کاش! میں آپ ﷺ کی کچھ مدد کر سکتا" یہ منظر دیکھ کر ابو جہل اور اس کے ساتھی ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے اور آپ ﷺ اتنے بوجھ کی وجہ سے اپنا سر اٹھا بھی نہ سکتے تھے۔ اتنے میں کسی نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر کر دی۔ وہ آئیں اور آپ ﷺ کی گردن سے بچہ دانی کو اٹھا کر پرے پھینک دیا اور انہیں برا بھلا کہنے لگیں۔ آپ ﷺ نے سجدہ سے سر اٹھایا پھر تین بار فرمایا: "اللهم عليك بقريش" (اے اللہ ان قریشیوں سے تو خود نمٹ لے) یہ کلمات سن کر وہ لوگ سہم گئے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ آپ ﷺ کی بددعا رنگ لا کے رہے گی۔ پھر آپ ﷺ نے اس مجمع کے چھ آدمیوں کے نام لے کر انہیں بددعا دی اور فرمایا: "یا اللہ! ابو جہل سے نمٹ لے، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن امیہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط سے نمٹ لے۔" سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: "اس اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ یہ سب لوگ بدر کی لڑائی میں مارے گئے اور بدر کے کنوئیں میں پھینکے گئے تھے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب دعاء النبی علی المشرکین)

[۱۰] یعنی ایک طرف تو اللہ کا ایک بندہ اللہ کی عبادت میں مصروف ہے، وہ خود بھی اللہ سے ڈرتا ہے۔ دوسروں کو بھی اللہ سے ڈر

بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾ كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَ
اسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ السجدۃ ۱۹ ع ۲۱

وہ پیشانی جو جھوٹی اور خطاکار[11] ہے(۱۶) سو وہ اپنے اہل مجلس کو بلالے(۱۷) ہم عذاب کے فرشتوں کو بلائیں[12] گے(۱۸) ہرگز ایسا نہیں چاہیے۔ آپ اس کی بات نہ مانیے اور سجدہ کر کے (اپنے پروردگار کا) قرب[13] حاصل کیجئے(۱۹)

کر زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دوسری طرف اللہ کا باغی ہے دعوت حق کو ٹھکراتا ہے اور ازراہ تکبر منہ پھیر کر چل دیتا ہے پھر وہ اپنے آپ کو حق پر بھی سمجھتا ہے۔ ذرا سوچو! اس اللہ کے باغی کی عقل پر پتھر نہیں پڑ گئے۔ اسے یہ بھی خیال نہیں آتا کہ کسی کے اعمال خواہ اسے ناپسند ہوں بہرحال اسے اللہ کی عبادت سے کبھی نہ روکنا چاہیے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ اللہ اس کو بھی دیکھ رہا ہے اور اس اللہ کے باغی کو بھی۔ ان میں سے جو شخص جس سلوک کا مستحق ہوگا اللہ اس سے ویسا ہی سلوک کرے گا۔

[11] یعنی اس کی پیشانی یا دماغ میں تکبر کا جو خناس سمایا ہوا ہے۔ اگر وہ اپنی ایسی حرکتوں سے باز نہ آیا تو ہم اس کی بدکردار اور بد طینت پیشانی کو ذلیل مجرموں کی طرح پیشانی کے بالوں سے گھسیٹ کر جہنم رسید کر دیں گے۔

[12] اس آیت کا سبب نزول درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

سیدنا ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ (کعبہ میں) نماز پڑھا کرتے تھے۔ ابوجہل آیا اور کہنے لگا: کیا میں تمہیں اس کام سے منع نہیں کر چکا۔ تین بار اس نے یہ الفاظ دہرائے۔ نبی اکرم ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو اسے سخت سست کہا۔ ابوجہل کہنے لگا: یہ تو تم جانتے ہو کہ کسی کے ہم نشین مجھ سے زیادہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ وہ اپنے ہم نشین بلالے، ہم دوزخ کے فرشتے بلاتے ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم! اگر وہ اپنے ہم نشین بلاتا تو اللہ کے فرشتے اسے پکڑ لیتے (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

❁ زبانیہ کا لغوی مفہوم:۔ الزبانیۃ۔ زبانیہ سے مراد بالاتفاق دوزخ کے عذاب دینے والے فرشتے ہیں۔ زبانی العقرب بمعنی بچھو کا ڈنگ۔ اس لحاظ سے ایسے فرشتے مراد ہیں جو سخت دکھ دینے والے اور بے رحم ہوں گے۔ نیز زبانیۃ سے مراد پولیس بھی ہے اور یہ قتادہ کا قول ہے اور زبن کے معنی دھکے دے کر نکال دینا بھی ہے۔ جیسے بادشاہوں اور بڑے لوگوں کے ہاں چوبدار ہوتے ہیں جو اس غرض سے رکھے جاتے ہیں کہ جس سے سرکار ناراض ہوا سے دھکے مار کر نکال دیں۔ مراد یہ ہے کہ ابوجہل اپنی مجلس کے لوگوں کو جس پر اسے بڑا ناز ہے بلا کر دیکھ لے ہم عذاب دینے والے فرشتوں سے ان کی بری طرح گت بنا دیں گے۔

[13] ❁ سجدہ کی فضیلت:۔ یعنی اس بدکردار شخص کی بات مان کر کعبہ میں نماز کی ادائیگی سے رکنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اسی طرح نماز ادا کرتے رہو۔ جیسے پہلے ادا کرتے رہے ہو۔ واضح رہے کہ یہاں سجدہ سے مراد صرف سجدہ نہیں بلکہ نماز ہے اور عربوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی چیز کا جزء اشرف بول کر اس سے کل یا اصل چیز مراد لیتے ہیں اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ آپ ﷺ جس قدر نمازیں ادا کریں گے اتنا ہی زیادہ اللہ کا قرب حاصل ہوگا۔ لہٰذا نمازیں بکثرت ادا کیا کیجیے۔ سجدہ کی فضیلت سے متعلق درج ذیل

احادیث ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ربیعہ بن کعب اسلمی فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں ہی رات کو رہا کرتا اور آپ ﷺ کے پاس حاجت اور وضو کے لیے پانی لایا کرتا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے۔ میں نے عرض کیا "جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت چاہتا ہوں" آپ نے پوچھا: "کچھ اور بھی؟" میں نے عرض کیا: "بس یہی کچھ چاہتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا: "اچھا تو کثرت سجود کو اپنے اوپر لازم کر لو اور اس طرح اس سلسلہ میں میری مدد کرو" (مسلم۔ کتاب الصلوۃ باب فضل السجود والحث علیه)

۲۔ اس سورہ کے اختتام پر بھی سجدہ تلاوت کرنا چاہیے۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سورت ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ اور سورہ اقراء میں سجدہ کیا۔

سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ ۵ آیاتھا رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳

کلمات ۳۰ آیات ۵ (۹۷) سورۃ القدر مکی ہے (۲۵) رکوع ۱ حروف ۱۱۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر [۱] میں نازل کیا (۱) اور آپ کو کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ (۲) شب قدر ہزار مہینوں [۲] سے بہتر ہے (۳)

[۱] لیلۃ القدر اور شب قدر یا لیلہ مبارکہ ایک ہی رات کے نام ہیں:۔ اس سورت میں قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ اور سورۃ الدخان کی آیت نمبر ۳ میں فرمایا کہ ہم نے اس قرآن کو لیلۃ مبارکہ میں نازل کیا جس سے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر اور لیلۃ مبارکہ ایک ہی رات کی دو صفات یا دو نام ہیں۔ یہ الگ الگ راتیں نہیں ہیں اور لیلۃ القدر ہی کا ترجمہ فارسی میں "شب قدر" یا "شب برات" ہے۔ گویا شب قدر یا شب برات، لیلۃ القدر سے علیحدہ کوئی رات نہیں۔ جیسا کہ ہمارے یہاں ۱۵ شعبان کو شب برات کبھی بلکہ آتش بازی سے منائی جاتی ہے اور اس نظریہ کا ماخذ چند انتہائی ضعیف روایات ہیں۔ پھر قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات رمضان میں ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں فرمایا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (۲:۱۸۵) اور معتبر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات رمضان کے آخری عشرہ میں آتی ہے اور بعض روایات کے مطابق وہ ستائیسویں شب رمضان ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل دو احادیث ملاحظہ فرمایئے:

لیلۃ القدر کونسی رات ہے؟:۔ ۱۔ عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنے حجرہ سے نکلے۔ آپ لوگوں کو لیلۃ القدر بتانا چاہتے تھے۔ اتنے میں دو مسلمان لڑ پڑے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں اس لیے نکلا تھا کہ تمہیں لیلۃ القدر بتاؤں مگر فلاں فلاں لڑ پڑے تو وہ بات (میرے دل سے) اٹھالی گئی۔ اور اسی میں شاید تمہاری بہتری تھی۔ اب تم اسے (آخری عشرہ) کی ساتویں، نائویں اور پانچویں رات میں تلاش کرو" (بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب خوف المومن ان یحبط عملہ)

۲۔ زر بن حبیش کہتے ہیں کہ میں نے ابی بن کعب سے کہا کہ: "تمہارے بھائی عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جو شخص سال بھر قیام کرے وہ اس رات کو پالے گا" ابی بن کعب کہنے لگے: "اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن (عبداللہ بن مسعود کی کنیت) کو بخشے وہ خوب جانتے ہیں کہ لیلۃ القدر، رمضان کے آخری عشرہ میں ہے۔ اور وہ ستائیسویں رات ہے۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اسی پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں" پھر ابی نے بغیر استثناء کے قسم کھائی کہ وہ ستائیسویں رات ہے" میں نے پوچھا: "ابوالمنذر! (ابی بن کعب کی کنیت) تم کیسے یہ بات کہتے ہو" انہوں نے کہا: اس نشانی کی بنا پر جو رسول اکرم ﷺ نے ہمیں بتائی اور وہ علامت یہ ہے کہ اس کی صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو اس میں شعاع نہیں ہوتی۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن تو بتدریج تیئس سال کے عرصہ میں نازل ہوا تھا۔ مگر یہاں سارا قرآن ایک ہی رات میں نازل ہونے کا ذکر ہے تو اس کا جواب مفسرین دو طرح سے دیتے ہیں ایک یہ کہ اس رات کو سارا قرآن لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر

ع ۱ ۲۲

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

روح اور فرشتے اس رات اپنے پروردگار کے اذن سے ہر حکم لے کر نازل[۳] ہوتے ہیں(۴) (وہ رات) سراسر سلامتی[۴] ہے طلوعِ فجر تک۔(۵)

نازل کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے حسب موقع و ضرورت بتدریج تیئس سال میں نازل کیا جاتا رہا اور دوسرا یہ کہ سارا قرآن اس رات کو حاملان وحی فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا تھا پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بتدریج نازل کیا جاتا رہا۔

[۲] ❁ ہزار مہینے سے بہتر ہونے کے مختلف مفہوم:۔ یہاں ہزار مہینوں سے مراد ہزار مہینے کی معینہ مدت نہیں جس کے تراسی سال اور چار مہینے بنتے ہیں۔ اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ جب انہیں بہت زیادہ مقدار یا مدت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا تو ہزار یعنی الف کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ وہ حساب نہیں جانتے تھے۔ اور ان کے ہاں گنتی کا سب سے بڑا عدد الف یعنی ہزار ہی تھا۔ بلکہ اس سے مراد ایک طویل زمانہ ہے۔ اس وضاحت کے بعد اس آیت کے دو مطلب بیان کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ بنی نوع انسان کی خیر و بھلائی کا کام جتنا اس ایک رات میں ہوا (یعنی قرآن نازل ہوا) اتنا کام کسی طویل دور انسانی میں بھی نہیں ہوا تھا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ایک طویل مدت کی عبادت سے بہتر ہے اور اس مطلب کی تائید درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے قیام کرے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (بخاری، کتاب الایمان۔ باب قیام لیلة القدر من الایمان)

علاوہ ازیں بعض حضرات ہزار مہینے سے مراد ہزار مہینے (یعنی ۸۳ سال اور ۴ ماہ) ہی لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس ایک رات کی عبادت تراسی سالوں کی عبادت سے بہتر ہے جن میں شب قدر کو شمار نہ کیا جائے۔

❁ لیلۃ القدر سے متعلق ایک سوال کا جواب:۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس رات مثلاً مکہ معظمہ میں شب قدر ہوگی تو اس وقت زمین کے آدھے حصے پر تو دن ہوگا اور سورج چمک رہا ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اصل چیز رات ہے۔ قرآن میں جب کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کا اکٹھا ذکر فرمایا تو رات کا پہلے ذکر فرمایا۔ نیز بعض مقامات پر اللہ نے صرف لیلۃ کا ذکر کر کے اس سے مراد رات اور دن کا عرصہ (یعنی پورے چوبیس گھنٹے) لی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ (تورات دینے کیلئے) کیا تھا۔ تو ان تیس راتوں سے مراد تیس راتیں اور ان کے دن بھی تھے۔ اس لحاظ سے ہر مقام پر رمضان کی وہی مخصوص رات ہی لیلۃ القدر سمجھی جائے گی اور اس رات کا تعین اس خاص مقام پر چاند دیکھنے سے متعلق ہوگا۔

[۳] روح سے مراد جبریل امین ہیں جن کی قدر و منزلت کی وجہ سے ان کا علیحدہ ذکر کیا گیا اور اتنی کثیر تعداد میں فرشتے نازل ہوتے ہیں جن سے ساری زمین بھر جاتی ہے اور ہر "حکم" سے مراد انسانوں کی تقدیریں ہیں جو اس دن طے کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الدخان کی آیت ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾ کے تحت اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

[۴] اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جو فرشتے نازل ہوتے ہیں وہ ساری رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں کے لیے امن و سلامتی کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس میں جتنے بھی فیصلے کیے جاتے ہیں وہ سب خیر و سلامتی پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی فرد کی ہلاکت یا کسی قوم کی تباہی کے متعلق فیصلہ کیا جائے تو وہ بھی اہل زمین کی خیر و سلامتی پر مبنی ہوگا۔

۸ آیاتها سورۃ البینۃ مدنیۃ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُوْلٌ

کلمات ۹۵ آیات ۸ (۹۸) سورۃ البینۃ[۱] مدنی ہے (۱۰۰) رکوع ۱ حروف ۴۱۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو کافر[۲] تھے وہ (اپنے کفر سے) الگ ہونے والے[۳] نہ تھے تا آنکہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آجائے ۝

[۱] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب (جو نہایت خوش الحان قاری تھے) سے فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں ﴿لم یکن الذین کفروا﴾ کی سورت پڑھ کر سناؤں" ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں" پھر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: "کیا اللہ تعالیٰ کے سامنے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے، میرا ذکر آیا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں" یہ سن کر ابی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے (خوشی کے) آنسو بہنے لگے۔ قتادہ کہتے ہیں پھر آپ ﷺ نے انہیں یہ سورت سنائی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۲] ❁ اہل کتاب اور مشرکین میں فرق اور اس کے چند پہلو:۔ اس آیت میں کافروں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک اہل کتاب اور دوسرے مشرکین۔ اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جن کے پاس اللہ کی کتاب موجود تھی۔ اگرچہ ان کی کتابوں میں تحریف بھی ہو چکی تھی اور انسانی اضافے بھی تھے اور مشرکین سے مراد عرب کے بت پرست اور ایران کے آتش پرست تھے جن کے پاس سرے سے کوئی الہامی کتاب موجود ہی نہ تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نصاریٰ بھی مشرک تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو تین خداؤں میں کا ایک خدا قرار دیتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا سمجھتے تھے اور بعض انہیں اللہ ہی قرار دیتے تھے۔ بعض لوگ الوہیت میں سیدہ مریم کو بھی شریک بناتے تھے۔ اسی طرح یہود بھی عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے مگر ان کے ایسے واضح شرک کے باوجود انہیں مشرک نہیں کہا بلکہ اہل کتاب کے نام سے ہی پکارا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے دین کی اصل بنیاد توحید ہی تھی اور وہ توحید ہی کے قائل تھے مگر شیطانی اغوا اور بیرونی فلسفیانہ افکار و نظریات نے انہیں بعض شرکیہ عقائد میں ملوث کر دیا تھا جبکہ مشرکوں کے دین کی اصل بنیاد ہی شرک تھا اور توحید انہیں سخت ناگوار تھی جیسا کہ کفار مکہ کی اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ پھر اسلام نے اہل کتاب اور مشرکین کے اس فرق کو بعض شرعی احکام میں پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً اہل کتاب کا ذبیحہ کھانا جائز ہے اور مشرکوں کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں۔ اسی طرح کتابیہ عورت سے نکاح جائز ہے مگر مشرکہ عورت سے نکاح جائز نہیں۔ اہل کتاب سے جزیہ لے کر ایک اسلامی ریاست کا فرد تسلیم کیا جاسکتا ہے مگر مشرکوں کے لیے ایک اسلامی ریاست میں ایسی گنجائش نہیں۔

مِنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ

(یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو انہیں پاکیزہ صحیفے پڑھ[۴] کر سناتا ہے (۲) جس میں محکم کتابیں[۵] موجود ہیں (۳) اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ اس بات کے بعد پیدا ہوا

❁ کافروں کی قسمیں:۔ علاوہ ازیں کفر و شرک کے بھی کئی درجے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو سرے سے اللہ کی ہستی کے ہی منکر ہیں۔ کچھ دوسرے اللہ کو تو مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ دوسروں کو بھی اللہ کا شریک بناڈالتے ہیں۔ کچھ اللہ کو مانتے ہیں مگر اس کے رسولوں کے یا بعض رسولوں کے منکر ہیں۔ کچھ لوگ آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتے اور کچھ لوگ آخرت پر یقین تو رکھتے ہیں مگر ساتھ ساتھ ایسے عقیدے بھی وضع کر رکھے ہیں کہ قانون جزاوسزا کو بے کار بنادیتے ہیں۔ کچھ عقائد بھی درست ہوں تو ان کے اعمال ایمان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے ایسے سب لوگ درجہ بدرجہ کفار و مشرکین ہی کے گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

[۳] یعنی یہ اہل کتاب و مشرکین اور ان کے ذیلی فرقے، خواہ وہ کتنی ہی تعداد میں ہوں، سب کے سب اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں اور اپنے عقائد و نظریات انہیں اس قدر پسندیدہ اور مرغوب ہیں وہ ان سے اس طرح چپٹے ہوئے ہیں جن سے ان کا جدا ہونا ناممکن تھا۔ ان میں سے کوئی اپنا دین چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسی روشن اور واضح دلیل آجائے جو ان پر ان کی غلط فہمیاں اور گمراہیاں منکشف کردے۔

[۴] ❁ آپ کی رسالت کے دلائل:۔ وہ روشن اور واضح دلیل اللہ تعالیٰ کا جلیل القدر رسول ہے۔ جو اپنی رسالت پر خود دلیل ہے۔ اس کے لیے کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس کی پوری زندگی، اس کی صداقت اور دیانت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اگر وہ کہتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو فی الواقع وہ اللہ کا رسول ہے۔ نیز جو قرآن وہ ان اہل کتاب اور مشرکین کو پڑھ کر سناتا ہے اور امی ہونے کے باوجود سناتا اور ایسا معجز نما کلام پیش کرتا ہے۔ تو ایسے قرآن کی آیات پڑھ کر سنانا ہی اس کی رسالت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ایک امی ہونے کے باوجود وہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جس کی مثال پیش کرنے سے عرب کے فصحاء اور بلغاء سب عاجز آگئے تھے۔

﴿صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴾ کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ جو قرآن وہ پیش کرتا ہے۔ وہ ہر طرح کی تحریف، اضافہ یا ترمیم اور حذف سے پاک ہے۔ نیز وہ ہر قسم کی انسانی دستبرد سے پاک ہے۔ جبکہ اہل کتاب کی کتابوں میں تحریف بھی موجود ہے۔ انسانوں کے اضافے بھی اور حذف بھی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم نہایت پاکیزہ ہے وہ کسی نبی کی سیرت و کردار کو داغدار نہیں بناتا جبکہ اہل کتاب نے بعض انبیاء کی سیرت پر گھناؤنے الزامات لگائے انہیں ان سے پاک کرتا ہے۔

[۵] اس آیت کے دو مطلب ہیں اور وہ دونوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی ہر سورت ایک مستقل کتاب ہے اور یہ قرآن ایسی ہی ۱۱۴ مستقل کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی ایک ایک سورت اپنے موضوع و مضمون کے لحاظ سے مکمل ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس میں سابقہ تمام کتب سماویہ کا خلاصہ یا جو باتیں دین کی اصل بنیاد رہی ہیں سب ذکر کردی گئی ہیں۔

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ

جبکہ پہلے ان کے پاس واضح احکام آ چکے[۶] تھے (۴) اور انہیں حکم تو یہی دیا گیا تھا کہ خالصتاً اللہ کی مکمل حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کی عبادت[۷] کریں، پوری طرح یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی درست دین ہے (۵) اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا[۸] ہے

[۶] ۞ فرقہ بندی کی اصل وجہ:۔ اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ ان اہل کتاب کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ جیسے جلیل القدر پیغمبر اور قرآن جیسی روشن کتاب آنے کے بعد ان میں تفرقہ پیدا ہو گیا۔ کچھ تھوڑے بہت لوگ ایمان لے آئے باقی کافر کے کافر ہی رہے حالانکہ ان کے پاس واضح دلائل آ چکے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے بعد ان کی امت جو فرقوں میں بٹنا شروع ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ان کے پاس روشن دلائل موجود نہیں ہوتے یا ان پر حق بات مبہم رہ جاتی ہے۔ بلکہ وہ اپنی اپنی اغراض، مفادات اور جاہ طلبی کی ہوس میں فرقہ در فرقہ بٹتے چلے جاتے ہیں۔

[۷] ۞ دین قیم کے تین اہم ارکان:۔ دین قیم بمعنی ایسا مستحکم اور قائم دین جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان تک ایک ہی رہا ہے۔ اس دین کے اہم اجزاء تین باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ اکیلے ہی کو خالق و مالک سمجھا جائے۔ اس کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا شرک نہ کیا جائے۔ اس کے حکم اور قانون کو سب سے بالاتر سمجھا جائے اور اس کے قانون اور حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے حکم یا قانون کی پروانہ کی جائے۔ اکیلے اسی کی عبادت کی جائے اور یکسو ہو کر کی جائے۔ دوسری یہ کہ نماز کو ٹھیک طریقے سے باقاعدگی کے ساتھ ہمیشہ ادا کیا جائے اور تیسری یہ کہ اپنے اموال میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔ واضح رہے کہ نماز اور زکوٰۃ کو ٹھیک طور پر اور باقاعدگی کے ساتھ وہی ادا کر سکتے ہیں جو عقیدہ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ دوسرے نہیں کر سکتے۔ منافق لوگ بھی نماز اور زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے۔ مگر نمود و نمائش اور دکھلاوے کے لیے اور اپنی طبیعت پر بوجھ سمجھ کر۔ یہی تینوں باتیں اسلام کے تین اہم ابتدائی ارکان ہیں۔ روزہ اور حج بھی سابقہ امتوں پر فرض تھے مگر اختصار کی وجہ سے اکثر مقامات پر ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ جیسے سورہ بقرہ کی ابتدا میں متقین کی تعریف میں بھی انہیں تین اہم ارکان کا ذکر ہے۔ روزہ اور حج کا نہیں ہے۔ اور یہی تین باتیں کسی کو ایک اسلامی مملکت میں شہریت کے حقوق عطا کرتی ہیں۔ جیسے سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا: "پھر اگر یہ مشرک شرک سے توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں" نیز رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر وہ یہ شرائط تسلیم کر لیں تو ان کی جانیں مجھ سے محفوظ ہو جائیں گی۔ الا یہ کہ وہ اسلام کے کسی حق کے تحت اس حفاظت سے محروم کر دیے جائیں۔ رہا ان کے باطن کا معاملہ تو وہ اللہ کے ذمہ ہے۔" (مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب الامر بقتال الناس)

[۸] ۞ کفر کے درجے:۔ کفر کے سو درجے ہیں اور ہر درجہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ کی ذات کا سرے سے انکار کر دینا بھی کفر ہے۔ نماز کو عمداً چھوڑ دینا بھی۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں قسم کے کفر ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ یہود، اللہ،

فِیۡ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّةِ ؕ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ
هُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّةِ ؕ﴿۷﴾ جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ
اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾ ع
ع ۸ / ۲۲

وہ یقیناً دوزخ کی آگ میں ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہی لوگ بدترین خلائق ہیں(۶) (اور) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے یہی لوگ بہترین خلائق[۹] ہیں(۷)

ان کے پروردگار کے ہاں ان کا بدلہ ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہ سب کچھ اس کے لیے ہے جو اپنے پروردگار[۱۰] سے ڈرتا رہا(۸)

اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں حتیٰ کہ آخرت پر بھی پورا پورا ایمان رکھتے تھے۔ مگر ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم اللہ کے چہیتے اور پیارے ہیں اور ہمیں بس چند دن ہی آگ چھوئے گی۔ تو اللہ نے ان کے اس عقیدہ کو بھی کفر سے تعبیر کیا۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ان کا کفر مشرکوں کے کفر سے کم تر درجہ کا ہے جو سرے سے انسان کی دوبارہ زندگی کے ہی قائل نہ تھے۔ اس آیت میں کفر کی سب قسمیں مراد ہیں۔

[۹] بریۃ کا لغوی مفہوم: بریۃ: برء سے مشتق ہے یعنی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا، لہٰذا ہر وہ چیز جو وجود رکھتی ہے۔ بریہ میں شامل ہے۔ یعنی پوری مخلوق۔ ساری کائنات، زمین و آسمان اور دیگر سیارے سب اس میں شامل ہیں۔ ان دو آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ کافر تمام مخلوق سے بدتر مخلوق ہیں کیونکہ انہوں نے عقل و تمیز ہونے کے باوجود اپنے خالق و مالک کے حق کو نہیں پہچانا۔ اور مومن جو نیک اعمال بجالاتے رہے تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔ حتیٰ کہ فرشتوں سے بھی بہتر ہیں۔ اس لیے کہ فرشتوں کو خیر و شر کا اختیار ہی نہیں دیا گیا۔ ان کی اطاعت الٰہی اضطراری ہے اختیاری نہیں۔ جبکہ مومنوں کی اطاعت اختیاری ہوتی ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ عام مومن عام فرشتوں سے اور مقرب مومن مقرب فرشتوں سے افضل ہیں اور افضل الخلائق ہیں۔ اور آپ ﷺ تمام مخلوق سے، جن میں سب فرشتے بھی شامل ہیں، افضل ہیں۔

[۱۰] یعنی ایمان اور عمل صالح کی توفیق اسی صورت میں ملتی ہے جبکہ انسان اللہ سے ڈرتے ہوئے اور ہر بات میں اس کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے زندگی گزارے۔ اللہ ایسے ہی لوگوں سے خوش ہوتا ہے اور وہ بھی اللہ کی مشیت پر ہر وقت خوش رہتے ہیں اور جب انہیں آخرت میں اللہ تعالیٰ جنت اور بیش بہا نعمتیں عطا فرمائے گا تو وہ اللہ سے اور بھی زیادہ راضی ہو جائیں گے۔

۸ آیاتها سورۃ الزلزال مدنیۃ رکوعها ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ

کلمات ۳۷ آیات ۸ (۹۹) سورۃ الزلزال مدنی ہے (۹۳) رکوع ۱ حروف ۱۵۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جب زمین اپنی پوری شدت سے ہلا[۱] دی جائے گی (۱) اور وہ اپنے اندر کے سارے[۲] بوجھ نکال باہر کرے گی (۲) اور انسان[۳] کہے گا کہ اسے کیا ہو رہا ہے؟ (۳) اس روز

[۱] یعنی زمین پر لگاتار زلزلے آئیں گے اور یہ علاقائی قسم کے نہیں ہوں گے۔ بلکہ پوری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ ان مسلسل اور متواتر زلزلوں کی وجہ سے زمین میں کوئی نشیب و فراز باقی نہیں رہے گا۔ اور ایسے زلزلے نفخۂ صور ثانی کے وقت آئیں گے نفخۂ صور اول کے وقت جو زلزلہ آئے گا اس سے قیامت برپا ہو گی اور سب جاندار مخلوق مر جائے گی۔ نفخۂ صور ثانی کے وقت شدید زلزلوں سے زمین کے نشیب و فراز ختم کر کے اسے ہموار اور چٹیل میدان بنا دیا جائے گا۔ دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں غرضیکہ ہر چیز کو ختم کر دیا جائے گا جس سے اس زمین کی ہیئت ہی بدل جائے گی پھر اس پر میدان محشر قائم ہو گا۔

[۲] ❁ زمین میں تین قسم کے بوجھ جنہیں وہ باہر نکال پھینکے گی:۔ یہ زمین کے اندر بوجھ تین قسم کے ہوں گے۔ (۱) زمین کی معدنیات، زر و جواہر کے مدفون خزانے، اسی طرح سیال چیزوں اور گیسوں کے خزانے جن کے حصول کے لیے انسان دنیا میں مارا مارا پھرتا تھا۔ ناجائز اور حرام ذرائع استعمال کرتا تھا۔ ایک دوسرے سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ ایک ملک دوسرے ملک سے جنگ و جدال کرتا تھا۔ اس دن زمین ایسے سب خزانے باہر نکال پھینکے گی لیکن اس دن انسان کو ان سے کچھ غرض نہ ہو گی۔ وہ نہ اس کے کسی کام آ سکیں گے۔ (۲) دفن شدہ مردوں کے بوجھ یعنی سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر تا قیام قیامت جتنے انسان زمین کے اندر مدفون ہوں گے اور ان میں سے اکثر مٹی میں مل کر مٹی بن چکے ہوں گے۔ زمین ان کے تمام اجزاء کو نکال باہر پھینکے گی۔ یہی اجزاء اللہ کے حکم سے مل جائیں گے اور ہر انسان کو جسم عطا کیا جائے گا۔ (۳) زمین کے وہ اجزاء جن پر کسی انسان نے کوئی اچھا یا برا کارنامہ سرانجام دیا ہو گا جسے عام زبان میں موقع کی شہادت یا قرینہ کی شہادت کہتے ہیں۔ زمین کے یہی حصے اللہ کی عدالت میں مجرموں کے خلاف گواہی کے لیے پیش کیے جائیں گے اور وہ شہادت دیں گے۔

[۳] اس آیت میں اگر انسان سے مراد عام انسان لیا جائے تو بھی درست ہے۔ ہر انسان جب نیند سے بیدار ہوتا یا کسی اتفاقی حادثہ سے بے ہوش ہو جانے کے بعد ہوش میں آتا ہے اور اجنبی صورت حال دیکھتا ہے تو سب سے پہلا سوال یہی کرتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں اس وقت کہاں ہوں؟ "پھر جب ذرا ہوش ٹھکانے آ جائیں گے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ میدان محشر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور اگر انسان سے مراد ایسا انسان لیا جائے جو آخرت کا منکر تھا۔ وہ تو دیوانگی اور حیرانی کے عالم میں پوچھے گا کہ اس زمین کو کیا ہو گیا ہے پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی یہ حیرانی حسرت و یاس میں تبدیل ہونے لگے گی اور اسے یقین ہو جائے گا کہ جن

تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝۵ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا
اَعْمَالَهُمْ ۝۶ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸

وہ اپنی پوری خبریں بیان کر دی گی (۴) کیونکہ اسے آپ کے پروردگار کا حکم ہی یہی ہوگا (۵) اس دن لوگ متفرق[۵] ہو کر واپس لوٹیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے[۶] جائیں (۶) چنانچہ جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا (۷) اور جس نے ذرہ بھر بدی کی ہوگی وہ (بھی) اسے[۷] دیکھ لے گا (۸)

باتوں کا وہ ساری زندگی منکر رہا ہے۔ آج وہ واقع ہونے لگی ہیں۔

[۴] قیامت کے دن زمین کی گواہی:۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: "جانتے ہو اس کی خبریں کیا ہیں؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: "اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس کی خبریں یہ ہیں کہ وہ ہر بندے اور بندی پر گواہی دے گی کہ اس نے میری پشت پر کیا کچھ کام کیے۔ وہ کہے گی کہ اس نے فلاں دن یہ یہ کام کیے۔ یہی اس کی خبریں ہیں" (ترمذی، ابواب التفسیر)

قدیم زمانے کے انسان تو شاید زمین کے اس طرح خبریں بیان کرنے پر متعجب ہوں مگر آج کے زمانہ کا انسان تو یہاں دنیا میں ہی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ویڈیو فلم کی ایجاد کے بعد یہ بات انسان کے لئے قطعاً حیران کن نہیں رہ گئی۔ جس میں جائے وقوع کی پوری تصویریں بھی سامنے آجاتی ہیں اور ہر انسان کی گفتگو کو بھی منضبط کر کے اس طرح واقعات کو مربوط کر دیا جاتا ہے کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ اصل واقعہ کے بجائے اس کی فلم دیکھ رہا ہے۔ انسان اس دنیا میں جو اعمال بجالا رہا ہے۔ ان سب کی فلمیں تیار ہو رہی ہیں۔ اسی طرح ہر انسان کی آوازیں فضا میں محفوظ ہیں اور اس کے اعمال کے اثرات جو زمین پر ثبت ہو رہے ہیں یہی چیزیں اس دن زمین پیش بھی کر دے گی اور بیان بھی کر دے گی۔

[۵] اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ سب انسان متفرق اور الگ ہو جائیں گے اور ہر ایک سے انفرادی طور پر اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔ اور دوسرا یہ کہ جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ شرابیوں کا گروہ الگ ہوگا، زانیوں کا الگ، چوروں کا الگ، ڈاکوؤں اور لٹیروں کا الگ، غرض ہر انسان اپنے اپنے ہم جنسوں سے مل جائے گا۔

[۶] یہاں صرف اعمال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی سب قسم کے لوگوں کو ان کے اعمال دکھا دیے جائیں گے اور اس کی صورت وہی ہوگی جو اوپر مذکور ہوئی۔ یعنی ان کے اعمال کی فلمیں ہر ایک کو دکھا دی جائیں گی۔ تاکہ کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کا اعمال نامہ اس کے حوالہ کر دیا جائے گا کہ وہ خود اپنے اعمال کو ٹھیک طرح پڑھ لے اور دیکھ بھال کر لے۔

[۷] ان دونوں صورتوں میں جو بھی صورت ہو یہ ممکن نہ ہوگا کہ کسی شخص نے کوئی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی ہو لیکن وہ اعمال میں درج ہونے یا ریکارڈ ہونے سے رہ جائے۔ اسی طرح جس شخص نے کوئی چھوٹے سے چھوٹا برائی کا کام کیا ہوگا وہ اسے اپنے اعمال نامہ یا ریکارڈ میں دیکھ لے گا۔

❁❁❁

۱۱ آیاتھا سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ

کلمات ۴۰ آیات ۱۱ (۱۰۰) سورۃ العادیات مکی ہے (۱۴) رکوع ۱ حروف ۱۷۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

قسم ان گھوڑوں[۱] کی جو دوڑتے وقت ہانپتے ہیں(۱) پھر ان کی جو اپنی ٹاپوں[۲] سے چنگاریاں نکالتے ہیں(۲) پھر ان کی جو صبح دم چھاپہ[۳] مارتے ہیں(۳) پھر ان کی جو غبار اڑاتے[۴] ہیں(۴) پھر اسی حالت میں وہ لشکر[۵] میں جا گھستے ہیں(۵)

[۱] ❁ عادیات کا لغوی مفہوم:۔ عادیات: عادیۃ کی جمع ہے جو عادی کا مونث ہے اور عادی بمعنی وہ جماعت جو قتل و قتال کے لیے تیار ہو اور تَعَادَا الْقَوْمُ بمعنی لوگوں نے دوڑ میں مقابلہ کیا اور عَدَا الْفَرَسُ بمعنی گھوڑے نے دوڑ لگائی اور عادیات سے مراد وہ جنگ پر جانے والے (گھوڑے) ہیں جو مقابلہ کی دوڑ میں حصہ لیتے رہے ہوں۔ واضح رہے کہ عادیات کے معنی میں گھوڑوں کا مفہوم شامل نہیں ہے۔ بلکہ ضَبْحًا کا لفظ عادیات کو گھوڑوں سے مخصوص کر دیتا ہے۔ کیونکہ ضبح صرف اس آواز کو کہتے ہیں جو سرپٹ دوڑنے کی وجہ سے گھوڑوں کے منہ سے نکلتی ہے۔ یعنی گھوڑوں کا ہانپنا۔

[۲] اس آیت میں گھوڑوں کے رات کو دوڑنے کا مفہوم از خود شامل ہے کیونکہ ان کے سموں کی پتھروں پر ضرب سے جو چنگاریاں نکلتی ہیں وہ زیادہ تر رات کو نظر آتی ہیں۔

[۳] اہل عرب ہر وقت قبائلی لڑائیوں اور لوٹ مار میں مشغول رہتے تھے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ حملہ کے لیے رات کے وقت سفر کرتے تاکہ دشمن کو حملہ کی خبر نہ ہو سکے۔ رات کو وہ شب خون مارنا اپنی کسر شان اور اپنی شجاعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ رات کو سفر کرنے کے بعد صبح دم حملہ کر دینے میں انہیں تین فائدے حاصل ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ دوسرے اس وقت انہیں ہر چیز واضح طور پر نظر آنے لگتی تھی۔ تیسرے شب خون مارنے کی بدنامی سے بھی بچ جاتے تھے۔

[۴] نَقْعًا بمعنی گرد و لہ، وہ گرد و غبار جو کوئی تیز رفتار سواری اپنے پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ یہ خاکی ذرات بوجھل ہونے کی وجہ سے پھر آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس آیت میں دراصل گھوڑوں کی تیز رفتاری کی تعریف ہے جو رات کو زمین ٹھنڈی اور شبنم آلود ہونے کے باوجود اس سے گرد و غبار اٹھاتے ہیں۔

[۵] اس بات میں اختلاف ہے کہ اس میں جمعًا سے مراد کون سی جمعیت یا لشکر ہے؟ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں جمعًا سے مراد وہ قبیلہ ہے جس پر انتقام یا لوٹ مار کی غرض سے حملہ کیا جاتا ہے۔ اور گھوڑوں سے مراد وہی گھوڑے ہیں جو عرب قبائل ایسے موقعوں پر استعمال کیا کرتے تھے۔ اپنے اس موقف کے حق میں ان کی دلیل یہ ہے کہ آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے جواب قسم کے دوران فرمایا کہ: انسان مال کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے" اور چونکہ عرب قبائل مال کی محبت کی وجہ سے ہی ایسے حملے کرتے تھے لہٰذا یہاں جن گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے وہ وہی لوٹ مار کرنے والے گھوڑے ہیں اور بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ ان آیات

جَمْعًا ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ اَفَلَا

کہ انسان اپنے پروردگار کا سخت ناشکرا[۶] ہے(۶) اور اس بات کا یقیناً[۷] وہ (خود بھی) گواہ ہے(۷) اور وہ مال کی محبت[۸] میں بُری طرح مبتلا ہے(۸)

میں اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی نہیں بلکہ گھوڑوں کے رسالہ اور ان پر سوار مجاہدین کی قسم کھائی ہے جو کافروں کے لشکر پر جا پڑتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ کسی منزل پر پہنچ جاتے تو صبح کا انتظار کرتے رہتے۔ اگر بستی سے اذان کی آواز آجاتی تو پھر حملہ نہیں کرتے تھے اور اگر نہ آتی تو حملہ کر دیتے۔ (مسلم، کتاب الصلوۃ۔ باب الامساك عن الاغارة على قوم في دار الكفر اذا سمع فيهم الاذان) اور درج ذیل حدیث اگرچہ اس بات کی صراحت نہیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ نے عام گھوڑوں کی قسم کھائی ہے یا مجاہدین اور ان کے گھوڑوں کی۔ تاہم اس میں جہاد کے لیے تیار کیے ہوئے گھوڑوں کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔

❁ جہاد کے لیے گھوڑا رکھنے کی فضیلت:۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "گھوڑوں کا حال تین طرح پر ہے۔ کسی کے لیے تو وہ باعث ثواب ہیں، کسی کے لیے معاف اور کسی کے لیے عذاب۔ ثواب تو اس کے لیے جو انہیں جہاد کی نیت سے باندھے اور چراگاہ یا باغ میں ان کی رسی کھلی چھوڑ دے وہ جہاں سے اور جہاں تک چریں گے اس کے لیے نیکیاں ہوں گی اور اگر انہوں نے رسی تڑالی اور قدم دو قدم آگے چلے گئے تو ان کے پاؤں کے نشانات اور ان کی لید سب کچھ اس کے لیے نیکیاں ہوں گی اور اگر وہ کسی نہر پر جا کر پانی پی لیں۔ خواہ مالک کا انہیں پانی پلانے کا ارادہ نہ ہو تو بھی مالک کو نیکیاں ملیں گی۔ ایسے گھوڑے تو مالک کے لیے باعث ثواب ہیں۔ اور جس نے اپنی ضرورت پوری کرنے اور دوسرے سے سوال کرنے سے بچنے کے لیے گھوڑا رکھا اور اللہ کا جو حق گھوڑے کی گردن اور پشت پر ہے اور اسے نہ بھولا۔ تو ایسے شخص کے لیے گھوڑا رکھنا معاف ہے۔ اور جس نے گھوڑا فخر، ریا اور مسلمانوں کو ستانے کے لیے رکھا تو وہ اس کے لیے عذاب ہے" پھر کسی نے آپ ﷺ سے گدھوں کے متعلق پوچھا: "کہ کیا ان کا بھی یہی حکم ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کوئی خاص حکم نازل نہیں کیا مگر یہ اکیلی جامع آیت (جو گدھوں کو بھی شامل ہے) ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

ان علماء کے خیال کے مطابق اللہ کے ہاں مجاہدین اور ان کے گھوڑے ہی ایسی قدر و منزلت رکھتے ہیں کہ ان کی قسم کھائی جائے۔ عام گھوڑے یہ اہمیت نہیں رکھتے۔

[۶] ❁ کنود کا لغوی مفہوم:۔ جواب قسم میں اللہ تعالیٰ نے تین باتیں بیان فرمائیں بالفاظ دیگر ایسے گھوڑوں کی تین باتوں پر قسم کھائی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت اللہ سے غافل اور اکثر ناشکرے ہوتے ہیں۔ کنود ایسے ناشکرے کو کہتے ہیں جو مصائب و مشکلات کا تو ہر دم ذکر کرتا رہے مگر اللہ کے احسانات کا کبھی نام تک نہ لے یعنی وہ اللہ کا احسان ناشناس ہونے کے علاوہ ہر وقت اللہ اور اس کی تقدیر یا اپنی قسمت کا شاکی بھی رہتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے نرم سے نرم لفظ نمک حرام ہی ہو سکتا ہے۔

[۷] دوسری بات جس پر اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی یہ ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ گھوڑا اپنے مالک کا اتنا وفادار ہوتا ہے کہ وہ اس کی خاطر لڑائی کے میدان میں جا گھستا ہے۔ جہاں ہر طرف قتل و غارت ہو رہی ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ اپنے مالک کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ مگر انسان ایسا نمک حرام واقع ہوا ہے کہ اپنے مالک اور رازق کے لیے جان و

﴿يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝ إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝﴾

کیا وہ جانتا نہیں کہ قبروں [۹] میں جو کچھ ہے جب وہ باہر نکال لیا جائے گا (۹) اور جو کچھ سینوں میں (چھپے ہوئے راز) ہیں انہیں [۱۰] ظاہر کر دیا جائے گا (۱۰) تو اس دن [۱۱] ان کا پروردگار یقیناً ان سے پوری طرح باخبر ہوگا (۱۱)

مال کی قربانی تو درکنار، وہ اپنے پروردگار کا شکر تک ادا نہیں کرتا بلکہ الٹا اس کے شکوے شکایت کرتا رہتا ہے۔

[۸] مال و دولت سے انسان کی بے پناہ محبت:۔ تیسری بات جس پر قسم کھائی گئی ہے یہ ہے کہ انسان مال کی محبت میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ پیسہ ہی اس کا دین و ایمان ہے۔ مال و دولت کے حصول کی خاطر ہی وہ حلال و حرام میں تمیز نہیں کرتا۔ لوگوں سے فریب اور جھگڑے کرتا اور اللہ کی نافرمانی پر اتر آتا ہے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں انتہائی بخیل واقع ہوا ہے۔ مال و دولت سے جس قدر انسان کو محبت ہوتی ہے وہ ہر انسان بذات خود مشاہدہ کر سکتا ہے۔ نیز درج ذیل حدیث بھی اسی بات کی وضاحت کر رہی ہے:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بحرین (بصرے اور عمان کے درمیان ایک شہر) سے آپ ﷺ کے پاس بہت سی رقم آئی۔ اور یہ رقم ان سب رقوم سے زیادہ تھی جو آپ ﷺ کو اس سے پیشتر آئی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے مسجد میں ڈال دو۔ پھر آپ ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے اور اس رقم کو دیکھا تک نہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ اس رقم کے پاس آ بیٹھے۔ پھر جس کسی پر آپ ﷺ کی نظر پڑی اسے دینا شروع کیا۔ اتنے میں سیدنا عباس آئے اور کہنے لگے: یارسول اللہ ﷺ! مجھے بھی عطا کیجیے۔ میں نے اپنا بھی فدیہ ادا کیا تھا اور عقیل کا بھی (جنگ بدر میں اور اب زیر بار ہوں) آپ ﷺ نے فرمایا: (جتنا چاہو) لے لو۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ لپیں بھر بھر کر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے۔ پھر اسے اٹھانے لگے تو اٹھا نہ سکے۔ کہنے لگے یارسول اللہ ﷺ! کسی کو حکم دیجیے کہ مجھے اٹھوا دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں (یہ نہیں ہو سکتا) پھر سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "اچھا پھر ذرا خود ہی اٹھوا دیجیے" آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں (یہ بھی نہ ہوگا)" آخر انہوں نے کچھ درہم نکال دیے۔ پھر اٹھانے لگے تو بھی نہ اٹھا سکے اور کہا: "یارسول اللہ ﷺ! کسی کو حکم دیجیے کہ مجھے اٹھوا دے" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ نہیں ہو سکتا" پھر سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: "آپ ﷺ ہی ذرا آسرا دیجیے" آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں پھر انہوں نے مجبوراً اور درہم نکال دیئے اور اپنے کندھے پر لاد کر چل دیے۔ آپ انہیں اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے سیدنا عباس کی حرص پر بہت تعجب کیا۔ غرض آپ ﷺ وہاں سے اس وقت اٹھے جبکہ ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔ (بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ باب القسمۃ فی المسجد)

[۹] قبروں سے مراد قبرستان میں موجود قبریں ہی نہیں بلکہ ہر انسان کا مدفن ہے خواہ یہ سمندر کی تہ میں چلا جائے یا کسی درندہ کے پیٹ میں چلا جائے یا آگ میں جل کر راکھ بن جائے جو بھی صورت ہو بالآخر وہ زمین کے ذرات میں مل جائے گا اور اللہ ۔۔۔۔ ان ذرات کو جمع کرنے اور زمین سے باہر نکال لانے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

[۱۰] اس کی تشریح سورۃ الطارق کی آیت ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾ کے تحت حاشیہ نمبر ۷ میں گزر چکی ہے۔

[۱۱] اللہ تو آج بھی، پہلے بھی اور اس وقت بھی یعنی ہر وقت بندوں کے اعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن تمام لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اللہ دنیا کی زندگی میں بھی ان کے احوال سے پوری طرح باخبر تھا اور آج بھی پوری طرح باخبر ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔

۱۱ آیاتھا سورۃ القارعۃ مکیۃ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ

کلمات ۳۵ آیات ۱۱ (۱۰۱) سورۃ القارعۃ مکی ہے (۳۰) رکوع ۱ حروف ۱۶۰

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کھڑکھڑانے والی[۱] (۱) کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی (۲) اور آپ کیا جانیں کہ وہ کھڑکھڑانے[۲] والی کیا ہے؟ (۳) جس دن لوگ بکھرے[۳] ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے (۴) اور پہاڑ ایسے جیسے مختلف رنگوں[۴] کی دھنکی ہوئی اون (۵) پھر جس کے (نیک اعمال کے) پلڑے بھاری[۵] ہوئے (۶) وہ تو

[۱] اَلْقَارِعَةُ۔ قرع بمعنی ایک چیز کو دوسری چیز پر اس طرح مارنا کہ آواز پیدا ہو اور قَرَعَ الْبَابَ بمعنی اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور قَارِعَةٌ بمعنی کھڑکھڑانے والی اور ابن الفارس کے نزدیک ہر وہ چیز جو انسان پر شدت کے ساتھ نازل ہو وہ قَارِعَةٌ ہے (مقاییس اللغۃ) یعنی کوئی عظیم حادثہ یا بھاری آفت جو انسان کو گھبراہٹ میں ڈال دے اور اس سے مراد قیامت ہے۔

[۲] یعنی آپ اس دن کی پوری کیفیت کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے۔ پس اس کے کچھ آثار ہی بتائے جاسکتے ہیں جن سے اس دن کی شدت کا قدرے اندازہ ہو سکتا ہے۔

[۳] یہ کیفیت نفخہ صور اول کے وقت ہوگی۔ یعنی اس دن لوگ اس قدر بدحواس اور گھبراہٹ کا شکار ہو جائیں گے کہ نہایت بدنظمی کے ساتھ ایک دوسرے کے اوپر گر رہے ہوں گے۔ جیسے پروانے اپنی کثرت، ضعف اور بدنظمی کی وجہ سے شمع تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ ان کا ہدف شمع ہوتی ہے جو گرمی کی وجہ سے انہیں بھون ڈالتی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔

[۴] یعنی زمین میں پہاڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ پھر وہ زمین بوس ہوں گے۔ اس دن گرد و غبار بن کر اڑتے پھریں گے۔ پہاڑوں کے بھی چونکہ مختلف رنگ ہوتے ہیں کوئی لال، کوئی کہیں سے سفید، کوئی کالا اور اسی طرح اون کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ اس لیے جب پہاڑ ہوا میں اڑیں گے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے دھنکی ہوئی اور رنگی ہوئی اون کے گالے اڑ رہے ہیں۔

[۵] ❁ موازین کے مختلف معنی اور میزان الاعمال کی صورتیں: اس آیت میں نفخہ صور ثانی کے بعد میدان محشر کا ایک منظر پیش کیا جا رہا ہے۔ جبکہ لوگوں کے اعمال کا وزن کیا جا رہا ہوگا۔ مَوَازِيْنُ کا واحد موزون بھی ہے اور میزان بھی۔ اور ان دونوں کی جمع موازین آتی ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے دو مطلب ہوئے۔ ایک یہ کہ صرف موزون یا کچھ وزن رکھنے والی باتوں کو ہی تولا جائے گا۔ اور اللہ کے نزدیک وزن دار یا قابل قدر باتیں صرف نیک اعمال ہیں اور ان کے ساتھ ایمان ہونا بھی شرط اول ہے۔

عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝

دل پسند عیش میں ہوگا۔(۷) اور جس کے پلڑے ہلکے ہوئے(۸) تو اس کا ٹھکانا۔ گہری کھائی[۶] ہوگا(۹) اور آپ کیا جانیں کہ وہ کیا چیز ہے؟(۱۰) وہ آگ[۷] ہے بھڑکتی ہوئی۔(۱۱)

کیونکہ کافروں کے نیک اعمال کا بھی وزن نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ سورہ کہف کی آیت نمبر ۱۰۵ میں فرمایا کہ ﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ یعنی ہم ان کے اعمال کو سرے سے تولیں گے ہی نہیں۔ دوسرا یہ کہ میزان کے معنی ترازو بھی ہے۔ اور وہ بوجھ یا وزن بھی جو ترازو کے کسی پلڑے میں تلنے کے لیے رکھا جائے اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں سے ہر ایک پلڑا بھی۔ اس لحاظ سے یہ مطلب ہوگا کہ جس شخص کی نیکیوں کا پلڑا وزن دار یا بھاری ہو گیا تو ایسے لوگ ہی کامیاب سمجھے جائیں گے اور وہ اس روز خاطر خواہ عیش و آرام میں رہیں گے۔ واضح رہے کہ اعمال کے اوزان پر دو باتیں نہایت گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص نے یہ عمل کس نیت سے کیا تھا؟ اور دوسرے یہ کہ اس میں خلوص اور محض رضائے الٰہی کا حصہ کتنا ہے۔ مثلاً نماز ہی کو لیجیے۔ نماز منافق بھی ادا کرتا ہے اور مومن بھی۔ لیکن ان کے ایک ہی جیسے عمل کے وزن میں زمین و آسمان جتنا بھی فرق ہو سکتا ہے۔ یا مثلاً ایک شخص محض رضائے الٰہی کی خاطر خلوص نیت کے ساتھ ایک مسکین کو کھانا کھلاتا ہے۔ دوسرا بھی یہی کام کرتا ہے لیکن مسکین سے کوئی بیگار لینا چاہتا ہے یا اس لیے کرتا ہے کہ لوگوں میں اس کی مسکین پروری کا چرچا ہو تو ان دونوں کے اس ایک جیسے عمل کے وزن میں بہت فرق ہوگا۔ اللہ چونکہ لوگوں کی نیتوں اور دل کی سب باتوں سے واقف ہے۔ لہٰذا اعمال کا وزن نہایت انصاف پر مبنی ہوگا۔

[۶] هاوية: هوٰى يهوى بمعنی بلندی سے زمین پر گرنا۔ أهوية گہرے کنوئیں کو بھی کہتے ہیں اور گہرے گڑھے کو بھی اور هاوية سے مراد جہنم کی گہرائی یا گہری جہنم بھی ہو سکتا ہے۔ اور دوزخ میں ایک گہرے گڑھے کا نام بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی نیکیوں کا پلڑا اوپر اٹھ گیا، اسے جہنم کی گہرائی میں یا جہنم کے گہرے گڑھے میں پھینک دیا جائے گا اور اُمّ کا لغوی معنی ماں یعنی جس طرح بچہ کا ملجا و ماویٰ ماں اور اس کی گود ہی ہوتی ہے اسی طرح ایسے شخص کا ملجا و ماویٰ بھی هاویہ ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی اور ٹھکانہ میسر نہ آئے گا۔

[۷] یعنی وہ محض ایک گہرا گڑھا ہی نہ ہوگا بلکہ اس کی آگ جہنم کی دوسری آگ کے مقابلہ میں زیادہ گرم اور تیز ہوگی۔

سُوْرَۃُ التَّکَاثُرِ مَکِّیَّۃٌ

۸ آیاتھا — رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ③ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ

کلمات ۲۸ — آیات ۸ (۱۰۲) سورۃ التکاثر مکی ہے (۱۶) رکوع ۱ — حروف ۱۲۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تمہیں کثرت (کی ہوس) نے غافل کر رکھا[۱] ہے (۱) تا آنکہ تم قبروں کو جا ملتے ہو[۲] (۲) ایسا ہرگز نہیں چاہئے، جلد ہی تم جان[۳] لو گے (۳) پھر (سن لو) ایسا ہرگز نہیں چاہیے، جلد ہی

[۱] ❁ لہو کا لغوی مفہوم:۔ اَلْهٰىكُمْ: لہو کا معنی عموماً کھیل تماشا لیا جاتا ہے۔ لیکن اصل میں لہو ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اصل مقصد سے یا کسی اہم تر چیز سے ہٹائے رکھے اور الہٰی کے معنی ہیں کسی گھٹیا کام میں مشغول رہ کر اس سے اہم تر کام سے خیال ہٹا دینا گویا الہٰی میں توجہ ہٹا دینے کا سبب غفلت یا بھول نہیں ہوتی بلکہ دوسرے فضول کام ہوتے ہیں۔

❁ تکاثر کی مختلف صورتیں:۔ تَکَاثُر کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(۱) آدمی کوئی چیز زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ (۲) لوگ کسی چیز کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں (۳) وہ ایک دوسرے پر فخر جتلائیں کہ دوسرے کے مقابلہ میں انہیں فلاں چیز کثرت سے حاصل ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ کثرت کس چیز میں ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کے نفس کو مرغوب ہو وہ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد یا مقدار میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ چیزیں مال و دولت، اولاد اور بلند و بالا اور عالیشان رہائش گاہیں، منصب و اقتدار، کسی قبیلے کے افراد کی کثرت سب کچھ ہو سکتا ہے۔

[۲] انہیں چیزوں کے حصول میں انسان اپنی پوری زندگی کھپا دیتا ہے اور ان چیزوں سے اہم تر چیزوں سے اس کی توجہ ہٹی رہتی ہے اور وہ اہم تر چیزیں یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یاد، اخلاقی حدود و قیود کی پابندی، حقداروں کے حقوق کی ادائیگی اور اپنی عاقبت کی فکر۔ ایسی باتوں سے غافل رہ کر وہ مرغوبات نفس کے حصول میں ہی پڑا رہتا ہے تا آنکہ اسے موت آجاتی ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک دفعہ دو قبیلے اپنے اپنے جتھے کی کثرت تعداد پر فخر کر رہے تھے۔ جب گننے پر ایک قبیلہ کے آدمی دوسرے سے کم نکلے تو شکست خوردہ قبیلہ کہنے لگا کہ ہمارے اتنے آدمی فلاں لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔ چیک چل کر قبریں شمار کر لو۔ وہاں پتہ لگے گا کہ ہماری جمعیت تم سے کتنی زیادہ ہے اور ہم میں کیسے کیسے نامور گزر چکے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ قبریں شمار کرنے لگے۔ ان کی اس جہالت پر متنبہ کرنے کے لیے یہ سورت نازل ہوئی۔ اس روایت کی صحت کے متعلق تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے تاہم یہ ایک پہلو سے اس مضمون کی خوب وضاحت کرتی ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں درج ذیل حدیث صحیح اور قابل احتجاج ہے:

عبداللہ بن شخیر آپ ﷺ کے پاس آئے اور وہ یہ سورت پڑھ رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ابن آدم کہتا ہے کہ یہ میرا مال ہے۔ یہ میرا مال ہے۔ حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جو تو نے صدقہ کر دیا اور جاری کیا، یا کھا لیا اور فنا کر دیا یا پہن لیا اور پرانا کر دیا۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

[۳] یعنی تمہاری کثرت کے حصول کی خواہشات اور انہیں باتوں پر فخر و مباہات کی باتیں سراسر لغو اور باطل ہیں اور مرنے کے

تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝
ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝

تم جان لو گے (۴) ایسا ہر گز نہیں چاہیے کاش! تم یقینی طور پر جان لیتے (۵) کہ تمہیں ضرور [۴] جہنم کو دیکھنا ہے (۶) پھر (سن لو) کہ تم اسے آنکھوں دیکھے یقین کے ساتھ [۵] دیکھ لو گے۔(۷) پھر اس دن ضرور تم سے نعمتوں کے بارے میں باز پرس [۶] ہو گی۔(۸)

ساتھ ہی تمہیں خوب معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری یہ زندگی بھر کی کوششیں فضول اور بے کار تھیں۔ اور ان میں کوئی کوشش اور کوئی چیز ایسی نہ تھی جو مرنے کے بعد تمہارے کام آسکے۔

[۴] دوبارہ اور سہ بارہ تاکیداً فرمایا گیا کہ تمہارے ایسے خیالات قطعاً درست نہیں ہیں۔ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے دلائل میں کچھ تھوڑا بہت بھی غور و فکر کر لیتے تو تمہیں یقیناً یہ بات معلوم ہو جاتی کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے سب سامان ہیچ ہیں اور اس طرح غفلت میں نہ پڑے رہتے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حقیقتاً اچھے کام کون سے ہیں؟ اور آخرت سے توجہ ہٹانے اور غافل کر دینے والے کون سے؟ نیز یہ کہ کثرت کے حصول کے چکر میں پڑ کر زندگی گزارنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہیں یقیناً جہنم کو دیکھنا ہو گا اور اس کے کچھ آثار تمہیں مرنے کے فوراً بعد عالم برزخ میں ہی نظر آنے لگیں گے۔

[۵] دوزخ کے آثار تو تم مرنے کے فوراً بعد دیکھ لو گے۔ پھر جب قیامت کے دن تم میدان محشر میں اکٹھے کیے جاؤ گے تو پھر اسے اپنی آنکھوں سے یوں دیکھ لو گے کہ تمہیں اس کے یقینی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہ جائے گا۔

[۶] انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو لاتعداد ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمایا کہ ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (۱۴: ۳۴، ۱۶: ۱۸) یعنی تم پر اللہ کی نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ اگر تم انہیں شمار کرنا چاہو تو شمار بھی نہیں کر سکتے۔ تاہم ان نعمتوں کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خداداد ہیں مثلاً جوانی اور صحت جو اکیلے ہی ہزار نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ ایسی نعمتوں کے متعلق یہ سوال ہو گا کہ ان کو تم نے کس قسم کی کوششوں میں صرف کیا تھا۔ اور دوسری وہ نعمتیں ہیں جن میں انسان کے اپنے کسب کو بھی دخل ہے۔ جیسے مال و دولت اور ہر قسم کی جائداد۔ ایسی نعمتوں کے متعلق دو طرح کے سوال ہوں گے۔ ایک یہ کہ ان چیزوں کو کن اور کیسے ذرائع سے حاصل کیا اور دوسرا یہ کہ ان کو خرچ کون سے کاموں میں کیا۔ یعنی ان کا مصرف جائز تھا یا ناجائز؟ اس کی مزید تفصیل درج ذیل احادیث میں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! کون سی نعمت کا ہم سے سوال ہو گا (ہماری خوراک) یہی دو کالی چیزیں (کھجور اور پانی) ہے دشمن سر پر ہے اور تلواریں ہمارے کندھوں پر رہتی ہیں (پھر باز پرس کس چیز کی ہو گی؟)'' آپ نے فرمایا: تاہم یہ ضرور ہو گا۔ (ترمذی۔ ابواب التفسیر)

۲۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے اور ہم نے آپ ﷺ کو تر و تازہ کھجوریں کھلائیں اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ: یہ ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ (مسلم۔ کتاب الاشربہ۔ باب جواز استتباعه غيره)

۳ آیاتھا سورۃ العصر مکیۃ رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا

کلمات ۱۴ آیات ۳ (۱۰۳) سورۃ العصر مکی ہے (۱۳) رکوع ۱ حروف ۷۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

زمانے[۱] کی قسم (۱) بلاشبہ انسان گھاٹے[۲] میں ہے (۲) سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے

[۱] عصر کے دو معنی:۔ عصر کا لفظ بنیادی طور پر دو معنوں میں آتا ہے (۱) عصر کا وقت جو انتہائی مصروفیات کا وقت ہوتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اس وقت کی نماز کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی﴾ (۲۳۸:۲) اور احادیث میں یہ صراحت مذکور ہے۔ کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کی عصر کی نماز ضائع ہو گئی۔ وہ سمجھ لے کہ اس کا گھر بار اور مال لٹ گیا۔ (ترمذی، ابواب الصلوٰۃ۔ باب ماجاء فی السھو عن وقت صلوۃ العصر) اور عصر کا دوسرا معنی "زمانہ" اور اس سے وہی زمانہ یا عرصہ مراد لیا جاسکتا ہے۔ جو بنی نوع انسان کی پیدائش سے لے کر قیامت تک کا وقت ہے۔ بنی نوع انسان کی پیدائش سے پہلے کا نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عصر کو بنی نوع انسان پر بطور شاہد بیان فرماتے ہیں اور جب انسان کا وجود ہی نہ تھا تو شہادت کیسی؟

[۲] اس آیت کے مختلف مفہوم:۔ خُسْرٍ بمعنی راس المال میں کمی واقع ہونا۔ کسی سودے میں نفع کی بجائے الٹا نقصان ہو جانا، ٹوٹا، گھاٹا اور اس کی ضد ربح ہے بمعنی کسی سودے میں نفع ہو جانا۔ اب اگر زمانہ سے مراد گزرا ہوا زمانہ لیا جائے تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ گزرے ہوئے زمانہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان انفرادی طور پر بھی اور بحیثیت مجموعی بھی ہمیشہ گھاٹے میں ہی رہا مگر اس گھاٹے سے صرف وہ لوگ بچ سکے ہیں جن میں وہ چار صفات پائی جائیں جو آگے مذکور ہیں اور اگر عصر سے مراد گزرنے والا زمانہ لیا جائے جو بڑی تیزی سے گزرتا جارہا ہے تو اس سے مراد ہر انسان کی مدت عمر ہو گی جو اسے اس دنیا میں بطور امتحان عمل کے لیے دی گئی ہے اور بڑی تیزی سے گزر رہی ہے۔ یہ مدت بھی اس بات پر شاہد ہے کہ جو شخص اس مدت سے صحیح فائدہ نہیں اٹھا رہا وہ اعمال سرانجام نہیں دے رہا جو آگے مذکور ہیں۔ وہ سراسر گھاٹے میں جارہا ہے اور اس کا سرمایہ حیات دم بہ دم لٹ رہا ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے اس سورۃ والعصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو یہ صدا لگا رہا تھا۔ "اس شخص پر رحم کرو جس کا سرمایہ دم بدم پگھل کر ضائع ہوتا جارہا ہے" اور امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ سورت اپنے مضامین کے لحاظ سے اتنی جامع ہے کہ انسانی ہدایت کے لیے صرف یہی ایک سورت بھی کافی تھی اور طبرانی کی ایک روایت کے مطابق جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے جدا ہونے لگتے تو یہ سورت ایک دوسرے کو پڑھ کر سناتے پھر سلام کہہ کر ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے۔ واضح رہے کہ اس آیت میں خسارہ سے مراد اخروی نقصان ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان چار صفات کے حامل انسان دنیا میں خسارہ میں ہی رہتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بھی ایسے لوگ خسارہ کے بجائے فائدہ میں رہ سکتے ہیں لیکن یہ بات

بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳

اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے [۳]۔(۳)

یقینی نہیں۔ ممکن ہے انہیں دنیا میں خسارہ ہی رہے تاہم یہ بات یقینی ہے کہ آخرت میں بہرحال یہی لوگ خسارہ سے محفوظ رہیں گے اور اخروی نجات ان کے لیے یقینی ہو گی۔

[۳] مومنوں کی چار لازمی صفات:۔ اس آیت میں وہ چار صفات مذکور ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان اخروی خسارہ سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ پہلی صفت ایمان بالغیب ہے۔ جس کے چھ اجزاء ہیں اور وہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳ کے تحت تفصیل سے ذکر کیے جا چکے ہیں۔

دوسری صفت اعمال صالحہ کی بجا آوری ہے۔ اعمال صالحہ کا لفظ اس قدر وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ خیر اور بھلائی کا کوئی کام اس سے باہر نہیں رہتا۔ البتہ اس کی دو اہم شرائط ہیں۔ ایک ایمان بالغیب جس کا پہلے ذکر ہو چکا۔ ایمان کے بغیر اعمال صالحہ کا کوئی تصور ہی نہیں اور دوسری یہ کہ وہ کام شریعت کی ہدایات کے مطابق سر انجام دیا جائے۔

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی تاکید کرتے رہتے ہیں۔ حق کی ضد باطل ہے۔ حق کا لفظ عموماً دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) سچ اور سچائی۔ حقیقت، درست یعنی ہر وہ بات یا چیز جو تجربہ اور مشاہدہ کے بعد درست ثابت ہو۔ اور (۲) وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ اللہ کا حق ہو یا بندوں کا حق ہو یا خود اس کے اپنے نفس کا حق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خود ہی راستباز رہنے یا حقوق ادا کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کو حق اختیار کرنے اور حق پر قائم رہنے اور حقوق ادا کرنے کی تاکید بھی کرتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام اجتماعی زندگی کو خاص اہمیت دیتا ہے اور ان لوگوں کے کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب بھی اور جہاں کہیں باطل یا برائی سر اٹھانے لگتی ہے تو سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور حق کو غالب کرنے اور رکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر تواصوا بالحق کا مفہوم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی ہے جس کی اہمیت کتاب و سنت میں بے شمار مقامات پر مذکور ہے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ اسلام یا حق کو غالب کرنے یا رکھنے کے راستہ میں جتنی مشکلات حائل ہوتی ہیں یا مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ صرف خود ہی صبر اور برداشت سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک دوسرے کو اس کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں صبر کا ایک مفہوم احکام شریعت پر ثابت قدمی سے پابند رہنا بھی ہے۔ ایسی باتوں کے لئے بھی وہ ایک دوسرے کو تلقین کرتے رہتے ہیں۔

جس معاشرہ میں اور اس کے افراد میں یہ چاروں صفات پائی جائیں ان کے متعلق یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے لمحات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور آخرت میں وہ خسارہ سے محفوظ رہیں گے۔

۹ آیاتھا — سُورَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ — رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا

کلمات ۳۳ — آیات ۹ (۱۰۴) سورۃ الھمزہ مکی ہے (۳۲) رکوع ۱ — حروف ۱۲۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ہر طعنہ زن اور عیب گیری[۱] کرنے والے کے لیے ہلاکت ہے (۱) جس نے مال جمع کیا[۲] اور اسے گن گن کر رکھا (۲) وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال[۳] اسے (دنیا میں) ہمیشہ رکھے گا (۳) ہرگز نہیں

[۱] **ھمز کا لغوی مفہوم:۔** ھُمَزَۃٌ :ھَمَزَ بمعنی کسی شخص کی کسی حرکت، کام یا بات پر طعن و تشنیع کرنا، خواہ وہ کام طعن و تشنیع کے قابل ہو یا نہ ہو۔ نیز یہ طعن و تشنیع زبان سے کی جائے یا آنکھوں کے اشارے سے ہی کام چلا لیا جائے اور لَمَز بمعنی کسی کے عیب تلاش کرتے رہنا اور اس ٹوہ میں رہنا کہ اس کا کوئی کمزور پہلو ہاتھ آجائے۔ عیب جوئی یا عیب چینی کرنا پھر دوسرے سے ایسی باتوں کی غیبت کرنا۔ اس آیت میں دراصل ان معززین قریش کو متنبہ کیا جارہا ہے جو ہر وقت مسلمانوں اور پیغمبر اسلام کا مذاق اڑاتے، ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے، جو غلطیاں ان کی نظر میں معلوم ہوتیں ان پر طعن و تشنیع کرتے اور جو باتیں معلوم نہ ہوتیں ان کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ تمہاری ایسی حرکتوں کا انجام تمہاری اپنی تباہی اور ہلاکت ہے۔

[۲] ان کا ایسی حرکتیں کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مالدار تھے اور اپنی دولت کے نشہ میں مسلمانوں کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر ایسی حرکتیں کرتے تھے۔ مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بخیل بھی انتہا درجے کے تھے۔ روپے پیسے کو محفوظ رکھنے اور اسے گن گن کر رکھنے میں انہیں خاص لطف آتا تھا۔ واضح رہے کہ اگرچہ ان آیات کا روئے سخن رؤسائے قریش کی طرف ہے۔ لیکن الفاظ عام ہیں اور ان کا اطلاق ایسے تمام مالداروں پر ہوتا ہے جو ان صفات کے حامل ہوں اور یہ تو عام مشاہدہ کی بات ہے کہ مالداروں اور زر پرستوں کو مال جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے میں ایک خاص فرحت محسوس ہوتی ہے۔

[۳] اس آیت کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مال کے جمع کرنے میں اس قدر منہمک ہے جیسے اسے کبھی موت آئے گی ہی نہیں۔ اور اس کا مال علاج وغیرہ کے ذریعہ اس کو موت کے منہ سے بچانے کا سبب بن جائے گا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کا یہ مال و دولت ہمیشہ اس کے پاس ہی رہے گا۔ حالانکہ دولت ایک ڈھلتی چھاؤں اور آنی جانی چیز ہے۔

لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴ۡ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ۭ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷ۭ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝۸ۙ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹ۧ

ع ۱ ۲۹

وہ یقیناً چکنا چور کر دینے والی میں پھینک دیا[۴] جائے گا(۴) اور آپ کیا جانیں کہ وہ چکنا چور کر دینے والی کیا ہے؟(۵) اللہ کی آگ ہے خوب بھڑکائی[۵] ہوئی(۶) جو دلوں[۶] پر چڑھ جائے گی(۷) وہ ان پر ہر طرف سے بند کر دی[۷] جائے گی(۸) (جبکہ وہ) اونچے اونچے ستونوں[۸] میں (گھرے ہوں گے)(۹)

[۴] لَيُنْبَذَنَّ: نَبَذَ بمعنی کسی چیز کو ردی اور بے کار سمجھتے ہوئے پھینک دینا یا کسی چیز کی پرواہ کرتے ہوئے اسے پس پشت ڈال دینا اور حُطَمَة سے مراد دوزخ ہے۔ حَطَمَ یعنی توڑنا مروڑنا اور حُطَام توڑی مڑوڑی ہوئی یا ریزہ ریزہ شدہ چیز کو کہتے ہیں اور یہ لفظ کسی کو روند کر ریزہ ریزہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان دولت کے نشہ میں بدمست لوگوں کو نہایت حقیر اور ذلیل سمجھ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

[۵] سارے قرآن میں غالباً یہی ایک مقام ہے جہاں دوزخ کی آگ کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے کہ اللہ نے اس آگ کو بھڑکایا ہے۔ اسی سے اس آگ کی شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اللہ متکبرین کو سب سے زیادہ رسوا کن عذاب دیتا ہے۔

[۶] ❁ فواد کا لغوی مفہوم:۔ اَفْئِدَة: فواد کی جمع ہے جو فاد سے مشتق ہے اور فَادَ اللَّحْمَ بمعنی گوشت کو بھوننا اور لَحْمٌ فَئِيْدٌ یعنی بھونا ہوا گوشت، ابن الفارس کے نزدیک یہ لفظ گرمی اور شدید حرارت پر دلالت کرتا ہے۔ اور فُؤَادٌ سے مراد دل کا وہ حصہ ہے جو انسان کے جذبات، جذبات کی شدت اور تاثیر سے تعلق رکھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ دل کے اس حصے پر پہنچے گی جو جذبات کا مرکز ہے۔ جس میں زر پرستی کا جذبہ ہے اور جو دوسرے لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے اور اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے کے جذبات سے معمور ہے۔ یہ آگ اس کے جذبات کو اور دل کے اس حصے کو بھون کر رکھ دے گی۔

[۷] یعنی ایسے لوگوں کو نہایت ذلت کے ساتھ بے کار چیز سمجھ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا پھر اوپر سے منہ بند کر دیا جائے گا اور اس میں دروازے یا کھڑکی تو درکنار کوئی سوراخ تک نہ رہنے دیا جائے گا۔

[۸] اس آیت کے کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آگ ہی لمبے لمبے ستونوں کی طرح بلند ہوگی۔ جس میں یہ بند کیے جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ آگ کے لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ جکڑ کر اوپر سے منہ بند کر دیا جائے گا اور تیسرا یہ کہ دوزخ کا منہ بند کرنے کے بعد اس کے اوپر لمبے لمبے ستون کھڑے کر دیے جائیں گے۔

٥ آیاتها ۔۔۔ سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ ۔۔۔ رکوعها ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝١ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝٢ وَّاَرْسَلَ

کلمات ٢٣ ۔۔۔ آیات ٥ (١٠٥) سورۃ الفیل مکی ہے (١٩) رکوع ١ ۔۔۔ حروف ٩٣

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی[1] والوں سے کیا برتاؤ کیا؟(١) کیا اس نے ان کی تدبیر[2] کو بے کار نہیں[3] بنا دیا تھا؟(٢) اور ان پر پرندوں

[1] یمن میں ابرہہ کا عالی شان گرجا تعمیر کرنا۔ اس آیت میں اگرچہ بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ تاہم اس کے مخاطب تمام اہل عرب ہیں۔ قرآن میں ان ہاتھی والوں کی کوئی تفصیل مذکور نہیں کہ یہ لوگ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے اور کس غرض سے آئے تھے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ بالکل قریبی زمانہ میں پیش آیا تھا اور عرب کا بچہ بچہ اس کی تفصیلات سے واقف تھا اور بہت سے شعراء نے اس واقعہ کو اپنے اپنے قصائد اور منظوم کلام میں قلمبند کر دیا تھا۔ واقعہ مختصراً یہ تھا کہ یمن میں اہل حبشہ کی عیسائی حکومت قائم تھی اور ابرہہ نامی ایک شخص حکومت حبشہ کا نائب السلطنت مقرر تھا۔ وہ بیت اللہ کے اثر و رسوخ اور عزت و عظمت سے بہت حسد کرتا تھا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ عرب بھر میں یمن کے دارالخلافہ صنعاء کو وہی حیثیت حاصل ہو جائے جو مکہ کو حاصل ہے۔ اور قریش مکہ کعبہ کی وجہ سے جو سیاسی، تمدنی، تجارتی اور معاشی فوائد حاصل کر رہے ہیں وہ ہماری حکومت کو حاصل ہونا چاہئیں۔ اسی غرض سے اس نے صنعاء میں ایک عالی شان کلیسا تعمیر کر لیا۔

کعبہ پر حملہ کا ارادہ۔ کلیسا کی عمارت کعبہ کے مقابلہ میں بڑی پرشکوہ اور عالی شان تھی۔ اس کے باوجود لوگ ادھر متوجہ نہ ہوئے۔ بلکہ جب عرب قبائل کو اس کلیسا کی تعمیر کی غرض وغایت معلوم ہوئی تو کسی نے خفیہ طور پر اس کلیسا میں پاخانہ کر دیا۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق کسی نے اسے آگ لگا دی۔ جس سے ابرہہ کو کعبہ پر چڑھائی کرنے اور اسے تباہ و برباد کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اور یہ ممکن ہے کہ اس نے خود ہی کعبہ پر چڑھائی کرنے کی کوئی معقول وجہ پیدا کرنے کے لیے خود ہی اس کلیسا کو آگ لگوائی ہو یا اس کی بے حرمتی کروائی ہو۔ بہر حال ابرہہ نے کعبہ پر چڑھائی کے لیے ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر جرار تیار کیا۔ اس لشکر میں تیرہ ہاتھی بھی تھے اور وہ خود بھی ایک اعلیٰ درجہ کے محمود نامی ہاتھی پر سوار تھا۔ یہ لشکر مکہ کی طرف روانہ ہوا تو راستہ میں اکثر عرب قبائل مزاحم ہوئے لیکن ابرہہ کے اتنے بڑے لشکر کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت تھی۔ وہ شکست کھاتے اور گرفتار ہوتے گئے۔ بالآخر ابرہہ منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ایک مقام محسر تک پہنچ گیا۔ اس نے وہاں ڈیرے ڈال دیے۔ کچھ لوٹ مار بھی کی۔ عبدالمطلب جو ان دنوں کعبہ کے متولی اعظم اور قریشیوں کے سردار تھے، کے دو سو اونٹ بھی اپنے قبضہ میں کر لیے۔ پھر اہل مکہ کو پیغام بھیجا کہ میں صرف کعبے کو ڈھانے آیا ہوں۔ آپ لوگوں سے لڑنے نہیں آیا۔ لہٰذا اگر تم لوگ تعرض نہ کرو گے تو تمہارے جان و مال محفوظ رہیں گے اور میں اس سلسلہ میں گفت و شنید کے لیے تیار ہوں۔

ابرہہ اور عبدالمطلب کا مکالمہ:۔ اس پیغام پر عبدالمطلب اس سے گفتگو کرنے کے لیے اس کے ہاں چلے گئے۔ قریش مکہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ وہ کسی طرح بھی ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ لہٰذا عبدالمطلب نے روانگی سے قبل ہی لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت خود کریں اور اپنے اموال سمیت پہاڑوں میں چھپ جائیں۔ پھر ان لوگوں نے کعبہ میں جا کر خالصتاً اللہ تعالیٰ سے نہایت خلوص نیت کے ساتھ دعائیں کی تھیں کہ وہ اپنے گھر کی خود حفاظت کرے۔ کیونکہ ہم میں اتنی سکت نہیں۔ اس وقت بھی کعبہ میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے مگر اس آڑے وقت میں وہ اپنے سب معبودوں کو بھول گئے اور اکیلے اللہ سے دعائیں کرتے رہے جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائیں۔ جب عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے تو وہ ان کی وجاہت سے بہت متاثر ہوا اور خود آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ عبدالمطلب نے بڑی سادگی سے جواب دیا: "اپنے اونٹوں کی واپسی" اس جواب پر ابرہہ سخت حیران ہوا جیسے آپ کی قدر و منزلت اس کی نظروں سے گر گئی ہو، پھر کہنے لگا: میرا تو خیال تھا کہ آپ کعبہ کے متعلق کوئی بات کریں گے؟" عبدالمطلب نے پھر سادگی سے جواب دیا کہ: "اونٹوں کا مالک میں ہوں اس لیے ان کا مطالبہ کر دیا۔ کعبہ کا مالک میں نہیں۔ اس کا جو مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ آپ جانیں اور وہ جانے۔ اس جواب پر وہ اور بھی حیران ہوا تاہم اس نے عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیے۔ عبدالمطلب واپس چلے آئے اور آکر لوگوں کو پھر اپنی حفاظت کی تاکید کر دی۔ اور ابرہہ نے کعبہ کی طرف پیش قدمی کی تیاری شروع کر دی۔ سب سے پہلا کام تو یہ ہوا کہ اس کے اپنے ہاتھی محمود نے کعبہ کی طرف پیش قدمی کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے بہتیرے تیر لگائے گئے اور آنکس مارے گئے مگر وہ آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا تھا اور جب اس کا رخ کعبہ کے علاوہ کسی دوسری طرف کیا جاتا تو فوراً دوڑنے لگتا تھا۔ یہ لوگ اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی جانب سے ہزاروں کی تعداد میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ یا بالفاظ دیگر اپنے لشکر بھیج دیے۔

ابابیلوں کی کنکر باری:۔ ان پرندوں میں سے ہر ایک کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور دو کنکر دونوں پنجوں میں تھے۔ ان پرندوں نے وہی کنکر اس لشکر پر پھینک کر کنکروں کی بارش کر دی۔ یہ کنکر ایسی تیزی سے لگتے تھے جیسے بندوق کی گولی لگتی ہو۔ جہاں کنکر لگتا زخم ڈال دیتا تھا اور کبھی آر پار بھی گزر جاتا تھا۔ چنانچہ اس لشکر کے بیشتر افراد تو وہیں مر گئے۔ باقی جو بچے وہ واپس مڑے لیکن وہ راستہ میں مر گئے۔ ابرہہ خود بھی راستے میں ہی مرا تھا۔ اور اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت سے صرف ۵۰ دن پہلے محرم میں پیش آیا تھا۔

[۲] ابرہہ کے مقاصد کیا تھے؟ کَیْدَ بمعنی چال یا خفیہ تدبیر۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو علی الاعلان دن دہاڑے کعبہ پر حملہ کرنے آیا تھا اور برملا کہتا تھا کہ میں کعبہ پر حملہ کرنے آیا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں نے ہمارے کلیسا کی توہین کی ہے تو اس میں اس کی چال یا خفیہ تدبیر کیا تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی خفیہ تدبیر یہ تھی کہ کعبہ کی تخریب کے بعد اہل عرب کی توجہ اپنے کلیسا کی طرف مبذول کرے۔ اور اس سے اس کا مقصد مذہبی فوائد کا حصول نہیں تھا بلکہ وہ تمام تر تجارتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا جو کعبہ کی وجہ سے قریش مکہ کو حاصل تھے۔

[۳] تَضْلِيْلٍ۔ ضلّ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جس غرض کے لیے کوئی کام کیا جائے وہ مقصد حاصل نہ ہو اور وہ کام بالکل بے نتیجہ اور بے کار ثابت ہو۔ اس کی مزید تشریح سورۂ والضحیٰ کی آیت ﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى﴾ کے حاشیہ میں دیکھیے۔

عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ﴿٣﴾ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ﴿٤﴾ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ﴿٥﴾

کے غول کے غول بھیج دیے (۳) جو ان پر کنکروں[۴] کے پتھر پھینکتے[۵] تھے (۴) پھر انہیں یوں بنا دیا جیسے کھایا ہوا بھوسا[۶] ہو (۵)

[۴] سجیل فارسی کے لفظ سنگ گل (بمعنی مٹی کا پتھر) سے معرب ہے۔ یعنی وہ کھنگر کنکریاں جن میں مٹی کی بھی آمیزش ہوتی ہے اور مٹی سے کنکریاں بن رہی ہوتی ہیں۔

[۵] تَرْمِیْھِمْ رمی بمعنی کسی چیز کو نشانہ بنا کر دور سے پتھر کنکر وغیرہ پھینکنا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ پرندے ان پر کنکر گراتے تھے۔ بلکہ فرمایا نشانہ بنا کر پھینک رہے تھے۔ واضح رہے کہ تیر اندازی کے لیے بھی رمی کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ گویا وہ پرندے یا اللہ کے لشکر باقاعدہ ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔

[۶] عَصْف بمعنی غلہ کے دانہ کے اوپر کے پردے اور چھلکے نیز توڑی اور بھوسہ وغیرہ جو مویشیوں کے لیے چارہ کا کام دیتا ہے۔ اور عَصْفٍ مَّأْكُولٍ سے مراد یا تو چارے کا وہ حصہ یا ڈنٹھل ہیں جو جانور چرنے کے بعد آخری حصہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یا چارے کا وہ حصہ ہے جو جانور کھاتے وقت یا جگالی کرتے وقت منہ سے نیچے گرا دیتے ہیں۔ گویا اس عذاب کے بعد ہاتھی والوں کی لاشوں کی حالت بھی سخت بگڑ گئی تھی۔

جو لوگ قرآن میں مذکور معجزات کی مادی تاویل کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں وہ اس معجزہ کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ دور حاضر میں پرویز صاحب نے اپنی تفسیر مفہوم القرآن میں اس کی آخری تین آیات کا ترجمہ یا مفہوم یوں بیان فرمایا ہے: (انہوں (یعنی اصحاب الفیل) نے پہاڑ کے دوسری طرف ایک غیر مانوس خفیہ راستہ اختیار کیا تھا تاکہ وہ تم پر اچانک حملہ کر دیں لیکن چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ (جو عام طور پر لشکر کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں، کیونکہ انہیں فطری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بہت سی لاشیں کھانے کو ملیں گی) ان کے سروں پر منڈلاتے ہوئے آگئے اور اس طرح تم نے دور سے بھانپ لیا کہ پہاڑ کے پیچھے کوئی لشکر آ رہا ہے۔ یوں ان کی خفیہ تدبیر طشت از بام ہو گئی) چنانچہ تم نے ان پر پتھراؤ کیا۔ اور اس طرح اس لشکر کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ (یعنی ان کا کچومر نکال دیا۔) (مفہوم القرآن ص ۱۴۸۴)

❁ پرویزی تاویل اور اس کا جواب:۔ اب دیکھیے پرویز صاحب کا بیان کردہ مفہوم درج ذیل وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

۱۔ آپ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ "چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ عام طور پر لشکر کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں تاکہ انہیں بہت سی لاشیں کھانے کو ملیں" دور نبوی میں بے شمار جنگیں ہوئیں تو کیا کسی اور موقع پر بھی چیلوں ور گدھوں کے لشکر کے اوپر منڈلائے تھے؟ دور نبوی کے علاوہ اور کسی بھی جنگ کے موقعہ پر کہیں اوپر چیلیں اور گدھ کبھی نہیں منڈلائے۔ لہٰذا یہ پرویز صاحب کی گپ ہے۔

۲۔ سجیل کا معنی پہاڑوں کے پتھر نہیں۔ بلکہ مٹی ملے کنکر ہیں اور یہ فارسی لفظ سنگ گل سے معرب ہے۔

۳۔ ایسے کنکر یا کنکریاں پہاڑوں کے اوپر نہیں ہوتیں۔ نہ ہی ایسی کنکریوں سے کسی ایسے لشکر جرار کو ہلاک کیا جا سکتا ہے جس میں ہاتھی بھی ہوں۔

۴۔ تَرْمِیْ واحد مونث غائب کا صیغہ پرندوں کی جماعت کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن آپ نے اس کا ترجمہ "تم نے ان پر پتھراؤ کیا" بیان فرمایا۔ یہ تَرْمُوْنَ کا ترجمہ ہے۔ ترمی کا نہیں ہو سکتا۔

۵۔ علاوہ ازیں تاریخ سے بھی ایسی کوئی شہادت نہیں مل سکتی کہ اہل مکہ اصحاب الفیل کے مقابلے کے لیے نکلے ہوں۔

سُوْرَۃُ الْقُرَیْشِ مَکِّیَّۃٌ　۴ آیاتھا　رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝۲ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝۳ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ

کلمات ۱۵　آیات ۴ (۱۰۶) سورہ قریش مکی ہے (۲۹) رکوع ۱　حروف ۷۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

چونکہ (اللہ نے) قریش کو مانوس کر دیا[1] تھا(۱) کہ وہ سردیوں اور گرمیوں میں (تجارتی) سفر سے مانوس ہو گئے تھے(۲) لہٰذا[2] انہیں چاہیے کہ اس گھر (کعبہ) کے مالک کی (ہی) عبادت کریں(۳) جس نے انہیں بھوک (کے

[1] ❁ ایلاف کے دو پہلو:۔ اِیْلاف کا مادہ الف ہے اور اس سے الفت مشہور و معروف لفظ ہے۔ الفت کا معنی ایسی محبت ہے جو خیالات میں ہم آہنگی کی وجہ سے ہو (مفردات) اور الف کے معنی کسی چیز کے منتشر اجزاء کو اکٹھا کر کے انہیں ترتیب کے ساتھ جوڑ دینا۔ کسی کتاب کی تالیف کا بھی یہی مفہوم ہے۔ گویا ایلاف کے مفہوم میں الفت، موانست اور قریش کے منتشر افراد کی اجتماعیت کے سب مفہوم پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایلاف کے دو مختلف پہلو ہیں۔ ایک کا پس منظر یہ ہے کہ قبیلہ قریش حجاز میں متفرق مقامات پر بکھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے قصیّ بن کلاب (رسول اللہ ﷺ کے جدّ اعلیٰ) کو یہ خیال آیا کہ اپنے قبیلہ کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے سارے قبیلہ کو مکہ میں اکٹھا کر دیا۔ اسی بنا پر قصیّ کو مُجَمِّع کا لقب دیا گیا۔ اس طرح کعبہ کی تولیت اس قبیلہ کے ہاتھ آ گئی۔ اور ایلاف کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہاشم کے بیٹوں کو خیال آیا کہ اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینا چاہیے جو ان قافلوں کے ذریعے ہوتی تھی جو یمن سے شام و فلسطین تک جاتے تھے۔ یمن میں بلاد مشرق سے تجارت ہوتی تھی اور شام میں افریقہ و مصر سے۔ چنانچہ ہاشم کے بیٹوں نے آس پاس کے علاقوں سے تجارتی روابط قائم کیے اور عملاً تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ جس سے مکہ ایک بین الاقوامی منڈی بن گیا۔ قریش کے قافلے سال بھر میں دو تجارتی سفر کرتے تھے۔ گرمیوں میں وہ شام و فلسطین کی طرف جاتے تھے۔ کیونکہ یہ علاقہ مکہ کی نسبت بہت ٹھنڈا تھا اور سردیوں میں ان کا قافلہ یمن کی طرف جاتا تھا کیونکہ یہ علاقہ مکہ کی نسبت گرم تھا۔ سال میں ان دو تجارتی سفروں سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ سال کا باقی حصہ آرام سے گھر بیٹھ کر کھاتے تھے پھر بھی ان کے پاس بہت کچھ بچ جاتا تھا۔ اس طرح وہ آسودہ حال اور خاصے مالدار بن گئے۔ یہ دونوں موسموں کے تجارتی سفر ہی ان کی تمام تر دلچسپیوں کے مرکز و محور بن گئے تھے۔

[2] لِاِیْلٰفِ میں ابتدائی لام تعلیل کے لیے آیا ہے یعنی چونکہ اللہ نے قریش کے منتشر افراد کو مکہ میں ایک مقام پر اکٹھا کر دیا تھا ان میں الفت پیدا کر دی تھی اور وہ ایک دوسرے سے مانوس تھے۔ پھر کعبہ کی تولیت بھی ان کے سپرد کر دی تھی۔ مزید برآں انہیں گرمی اور سردی کے تجارتی سفروں سے مانوس کر دیا تھا لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر یعنی کعبہ کے مالک ہی کی عبادت کریں۔ کیونکہ قریش معاشرتی، سیاسی، تمدنی اور تجارتی جو فوائد بھی حاصل کر رہے تھے وہ اس کعبہ کی بدولت ہی حاصل کر رہے تھے۔ لہٰذا

مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴

دنوں) میں کھانا کھلایا اور انہیں خوف سے (بچا کر) امن[۴] عطا کیا (۴)

انہیں صرف ایک ہی رب کی عبادت کرنی چاہیے جو اس گھر کا مالک ہے۔ دوسرے معبودوں یا ان تین سو ساٹھ بتوں کی نہیں کرنی چاہیے۔

[۴] قریش مکہ پر اللہ کے احسانات:۔ مکہ اور اس کے آس پاس کا تمام علاقہ یا پہاڑی ہے یا ریگستانی۔ جہاں کوئی پیداوار نہیں ہوتی تھی بلکہ پورے علاقہ حجاز کا یہی حال تھا۔ لوگوں کا عام پیشہ بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا تھا۔ یا پھر لوٹ مار اور ڈاکہ زنی۔ عرب قبائل تجارتی قافلوں کو بھی لوٹ لیتے تھے اور ایک دوسرے کو بھی۔ اس بدامنی اور رہزنی سے صرف قریش بچے ہوئے تھے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے انہیں عرب بھر میں عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ رہزن قبیلے ان کے تجارتی قافلہ سے تعرض نہیں کرتے تھے، بلکہ جس قافلے کو قریش پروانہ راہداری دے دیتے وہ بھی محفوظ سفر کر سکتے تھے۔ اور قریش کا وطن مکہ تو ویسے ہی امن والا شہر تھا اور لوگ یہیں آ کر پناہ لیتے تھے۔ قریش کے قافلوں سے راستہ میں چنگی بھی وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ قریش کے بدامنی سے محفوظ ہونے کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص کبھی نادانستہ کسی قریش پر حملہ آور ہو جاتا اور وہ صرف اتنا کہہ دیتا کہ انا حرمی تو حملہ آور کے اٹھے ہوئے ہاتھ وہیں رک جاتے تھے۔ قریش مکہ کو دوسرے قبائل عرب پر جو سیاسی اور معاشی تفوق حاصل تھا اس کی وجہ محض کعبہ کی تولیت تھی۔ جسے تمام قبائل عرب اللہ کا گھر سمجھتے تھے۔ اس اللہ کے گھر میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن توڑا تھا۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سارے بت صرف قریش کے نہیں تھے بلکہ تمام قبائل عرب اپنے اپنے بت کا ایک مثنیٰ بیت اللہ میں بھی لا کر رکھ دیتے تھے اور یہ قریش کی مہربانی تھی کہ کسی قبیلہ کو اپنا بت بیت اللہ میں رکھنے دیں یا نہ رکھنے دیں۔ کیونکہ بیت اللہ کے متولی یہی لوگ تھے۔ پھر اگر کوئی قبیلہ قریش مکہ سے کوئی ناروا سلوک کرتا تو قریش اس قبیلہ کے بت کی گردن مروڑ سکتے تھے۔ اسے توڑ پھوڑ بھی سکتے تھے اور کعبہ سے باہر بھی پھینک سکتے تھے۔ بالفاظ دیگر قبائل عرب کعبہ میں اپنے بت اس لیے رکھتے تھے کہ ان کا اور ان کے خدا کا نام بلند ہو اور قریش اس لیے رکھ لیتے تھے کہ ان قبائل کے خدا ہمارے پاس بطور یرغمال رہیں گے۔ یہ تھی وہ اصل وجہ جس کی بنا پر دوسرے قبائل قریشیوں کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ اور کسی کو ان کے تجارتی قافلوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اور اسی بت پرستانہ نظام کی بدولت قریش مکہ کئی طرح کے فائدے اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان بتوں اور اس بت پرستانہ نظام کے خلاف صدا بلند کی تو قریش نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ اگر ہم تمہاری بات مان لیں تو پھر تو ہم زمین سے اچک لیے جائیں گے۔ ہمارے تجارتی قافلے بھی لوٹ مار کی زد میں آ جائیں گے۔ قبائل عرب میں جو ہمارا احترام اور عزت کی جاتی ہے وہ سب کچھ خاک میں مل جائے گا اور ہمارے سیاسی تفوق کا بھی جنازہ نکل جائے گا۔ ان حالات میں ہم تمہاری باتوں کو کیونکر قبول کر سکتے ہیں؟ تو قریش کے اس اعتراض کے اللہ تعالیٰ نے پانچ جواب دیئے تھے۔ (تفصیل کیلئے دیکھیے سورۃ قصص کے حواشی ۷۸ تا ۸۵)

علاوہ ازیں تھوڑی مدت پہلے ابرہہ نے کعبہ پر چڑھائی کی تو اللہ نے اس کے لشکر کو برباد کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے اہل عرب کے

دلوں میں قریش کا عزت و احترام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اسی عزت و احترام کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ان کے تجارتی قافلے ہر طرح کی لوٹ مار اور چنگی ٹیکس سے محفوظ سفر کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں کثیر منافع حاصل ہو جاتا تھا۔ اتنا زیادہ جتنا کسی دوسرے تجارتی قافلے کو ہونا ناممکن تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسرے عرب قبائل تو بھوکوں مر رہے تھے جبکہ قریش نہایت آسودہ حالی اور امن و چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے انہیں احسانات کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان احسانات کا نتیجہ تو یہی ہونا چاہیے کہ تم صرف اکیلے پروردگار کی جو اس کعبہ کا مالک ہے عبادت کرتے۔ مگر تم ایسے احسان فراموش ثابت ہوئے ہو کہ اس کے ساتھ اپنے دوسرے معبودوں کو بھی شریک بنا لیتے ہو۔

۷ آیاتھا سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳

کلمات ۲۵ آیات ۷ (۱۰۷) سورۃ الماعون مکی ہے (۱۷) رکوع ۱ حروف ۱۱۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا [۱] کو جھٹلاتا ہے (۱) یہی تو ہے جو یتیم کو دھکے [۲] دیتا ہے (۲) اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب [۳] (بھی) نہیں دیتا (۳)

[۱] دین کے چار معنی:۔ دین کا لفظ چار معنوں میں آتا ہے۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی کامل اور مکمل حاکمیت (۲) انسان کی مکمل عبودیت اور بندگی (۳) قانون جزا و سزا (۴) قانون جزا و سزا کے نفاذ کی صورت۔ کفار مکہ ان چاروں باتوں کے منکر تھے۔ وہ صرف ایک اللہ ہی کو الٰہ نہیں مانتے تھے بلکہ اپنی عبادت میں دوسرے معبودوں کو بھی شریک کرتے تھے۔ اللہ کے قانون جزا و سزا کے بھی منکر تھے اور آخرت کے بھی۔ اس آیت میں اگرچہ بظاہر خطاب آپ ﷺ کو ہے لیکن تبصرہ کفار مکہ پر ہے کہ انکار آخرت نے ان میں کون سی معاشرتی اور اخلاقی برائیاں پیدا کر دی تھیں۔

[۲] اہل عرب عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے۔ حالانکہ حقیقتاً میراث کے وہ ضرور حقدار ہونا چاہئیں۔ لیکن اہل عرب کا دستور تھا کہ جو شخص میت کے وارثوں سے زیادہ بااثر اور زور آور ہوتا وہی ساری میراث پر قبضہ جما لیتا تھا اور یتیموں کو دھتکار دیتا تھا۔ یہ ان کی زر پرستی اور انکار آخرت کا نتیجہ تھا۔ نیز اگر کوئی یتیم ان سے مدد مانگنے آتا تو اس سے برا سلوک کرتے تھے۔ اور اس کے اصرار پر دھکے مار کر دفع کر دیتے تھے اور اگر کوئی کسی یتیم کی پرورش کا ذمہ لیتا بھی تھا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ ہی کرتا رہتا تھا۔

[۳] یتیموں کی پرورش سے غفلت برتنا یا محتاجوں کے کھانے تک کی فکر نہ کرنا، انہیں خود کھلانا تو درکنار کسی کو اس کی ترغیب تک نہ دینا ایسی اخلاقی اور معاشرتی برائیاں ہیں جو ہر مذہب میں مذموم سمجھی جاتی ہیں اور سمجھی جاتی رہی ہیں۔ مگر جب انسان کو مال و دولت جوڑنے اور اسے سنبھال سنبھال کر رکھنے کی فکر لاحق ہو جائے تو وہ اتنا بخیل بن جاتا ہے کہ اسے اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کی حالت زار دیکھنے پر قطعاً رحم نہیں آتا اور ان کی اس سنگدلی کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہیں روز آخرت کی جوابدہی کا یقین ہی نہیں ہوتا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ ع ۲۲

پھر ایسے نمازیوں کے لیے (بھی) ہلاکت ہے(۴) جو اپنی نماز سے غافل[۴] رہتے ہیں(۵) جو ریاکاری کرتے[۵] ہیں(۶) اور معمولی برتنے کی چیزیں (بھی مانگنے پر) نہیں دیتے[۶]۔(۷)

[۴] اس سورت کی آیت نمبر ۴ اور ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے۔ کیونکہ ان میں منافقوں کی نماز کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور منافقوں کا مکی دور میں کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فرقہ مدنی دور میں ہی وجود میں آیا تھا جب مسلمانوں کی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ نماز سے غافل رہنے سے مراد یہ ہے کہ کبھی پڑھ لی، کبھی نہ پڑھی، کبھی بے وقت پڑھ لی جب وقت تنگ ہو چکا ہو۔ جلدی جلدی چند ٹھونگیں مار لیں۔ نماز کو بس ایک عادت اور ورزش کے طور پر پڑھ لیا۔ مگر اللہ کی یاد ایک لمحہ کے لیے بھی نہ آئی۔ بس دنیوی خیالات میں مستغرق رہے۔ غرض نماز سے غفلت کی بے شمار صورتیں ہیں جو اسی ضمن میں آتی ہیں۔

[۵] اگر اس آیت کو سابقہ آیت سے متعلق قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسی بھی وہ نماز پڑھتے ہیں وہ بھی اللہ کے حکم یا آخرت کے ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کو دکھانے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ پھر اس ریا کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ منافق نماز اس لیے پڑھتے ہیں کہ دوسرے مسلمان انہیں دیکھ لیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں ہو جائے۔ دوسری یہ کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص انہیں نماز پڑھتے دیکھ رہا ہے تو اس وقت وہ نماز بنا سنوار کر اور لمبی کر کے پڑھنے لگتے ہیں۔ ایسی نمازیں ان کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ان کی ہلاکت کا سبب بن جائیں گی اور حقیقتاً ایسے لوگ بھی آخرت کے منکر ہی ہوتے ہیں۔

[۶] مَاعُوْن ہر اس برتنے والی چیز کو کہتے ہیں جو معمولی قسم کی ہو اور عام لوگوں کے استعمال میں آنے والی ہو۔ برتنے کی اشیاء گھریلو استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً کلہاڑی، ہنڈیا، کھانے کے برتن، ماچس وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ زر پرستی کی ہوس اور آخرت سے انکار نے ان لوگوں میں اتنا بخل پیدا کر دیا ہے کہ یتیموں کو ان کا حق ادا کرنا اور محتاجوں کی ضروریات کا خیال رکھنا تو درکنار، وہ معمولی معمولی عام برتنے کی چیزیں عاریتاً مانگنے پر بھی دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ بعض لوگ مانگ کر کوئی برتنے کی چیز لے لیتے ہیں پھر واپس ہی نہیں کرتے یا اس چیز کا نقصان کر دیتے ہیں تو ایسی صورت میں شریعت نے جو احکام دیے ہیں وہ درج ذیل احادیث میں ملاحظہ فرمایئے:

❁ <u>عاریتاً مانگی ہوئی چیز کے متعلق احکام</u>:۔ ۱۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی کسی بیوی کے ہاں قیام پذیر تھے۔ کسی دوسری بیوی نے کھانے کی رکابی بھیجی تو اس بیوی نے جس کے ہاں آپ ﷺ ٹھہرے ہوئے تھے (از راہ رقابت) خادم کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ رکابی گر گئی اور ٹوٹ گئی۔ آپ ﷺ رکابی کے ٹکڑے اور جو کھانا اس میں تھا اسے جمع کرنے لگے اور فرمایا: "تمہاری ماں کو غیرت آ گئی" پھر خادم کو ٹھہر لیا اور اس بیوی سے ایک سالم رکابی لے کر اس بیوی کے ہاں بھجوا دی جس نے بھیجی تھی اور یہ ٹوٹی ہوئی رکابی اسی گھر میں رکھ لی، جہاں ٹوٹی تھی۔ (بخاری، کتاب المظالم۔ باب اذا کسر قصعة اوشيئا لغيره)

۲۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "مانگی ہوئی چیز واپس کرنا، ضامن کو تاوان بھرنا، اور قرضہ کی ادائیگی لازم ہے۔" (ترمذی۔ ابواب البیوع، باب ان العارية مؤداة)

۳۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس ہاتھ نے جو کچھ لیا ہو اسی پر اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ (خواہ نقد رقم ہو یا کوئی اور چیز) (ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی تضمین العارية)

۳ آیاتھا ۔ سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ ۔ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③

کلمات ۱۰ ۔ آیات ۳ (۱۰۸) سورۃ الکوثر مکی ہے (۱۵) رکوع ۱ ۔ حروف ۴۷

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ہم نے آپ کو کوثر[۱] عطا کیا ہے(۱) تو آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز ادا[۲] کیجیے اور قربانی کیجیے(۲) بلاشبہ آپ کا دشمن ہی جڑ کٹا[۳] ہے(۳)

[۱] کوثر کے مختلف مفہوم اور مختلف پہلو: کَوْثَر، کَثُرَ سے مشتق ہے جس میں بہت مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اور اہل لغت نے اس کا معنی خیر کثیر لکھا ہے اور بہت سی احادیث سے ثابت ہے کہ کوثر بہشت میں ایک نہر کا نام ہے جو آپ کو عطا کی گئی۔ چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ کو اونگھ آ گئی۔ اٹھے تو تبسم فرمایا۔ اور تبسم کی وجہ یہ بتائی کہ ابھی ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی۔ پھر یہی سورت کوثر پڑھی اور فرمایا جانتے ہو کہ کوثر کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں" فرمایا: وہ ایک نہر ہے جو اللہ نے مجھے بہشت میں دی ہے۔ نیز اس سلسلے میں درج ذیل احادیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کے قصہ میں فرمایا: میں ایک نہر پر پہنچا جس کے دونوں کناروں پر خولدار موتیوں کے ڈیرے لگے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا: یہ نہر کیسی ہے؟ اس نے جواب دیا: "یہ کوثر ہے" (جو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا کی) (بخاری۔ کتاب التفسیر)

۲۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ "کوثر سے کیا مراد ہے؟" انہوں نے کہا: "کوثر ایک نہر ہے جو تمہارے پیغمبر ﷺ کو ملی ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر خولدار موتیوں کے ڈیرے ہیں وہاں ستاروں کی تعداد جتنے آبخورے رکھے ہیں۔ (حوالہ ایضاً)

۳۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کوثر سے ہر وہ بھلائی مراد ہے جو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا کی۔ ابوبشیر کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: "لوگ تو کہتے ہیں کہ کوثر جنت میں ایک نہر کا نام ہے" سعید نے جواب دیا کہ: "جنت والی نہر بھی اس بھلائی میں داخل ہے۔ جو اللہ نے آپ ﷺ کو عنایت فرمائی۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر)

علاوہ ازیں کوثر سے مراد حوض کوثر بھی ہے جو آپ ﷺ کو قیامت کے دن میدان محشر میں عطا کیا جائے گا۔ جس دن سب لوگ پیاس سے انتہائی بے تاب ہوں گے اور ہر شخص العطش العطش پکار رہا ہوگا۔ آپ ﷺ اس حوض پر بیٹھ کر اہل ایمان کو پانی پلائیں گے اور جس خوش قسمت کو اس حوض کوثر کا پانی میسر آ جائے گا اسے قیامت کا سارا دن پھر پیاس نہیں لگے گی اور اس سلسلے میں اتنی احادیث صحیحہ وارد ہیں جو تواتر کو پہنچتی ہیں۔

اوپر جو کچھ ذکر ہوا اس خیر کثیر کا تعلق تو اخروی زندگی سے ہے۔ دنیا میں بھی آپ کو خیر کثیر سے نوازا گیا۔ آپ ﷺ کو نبوت دی گئی اور قرآن جیسی عظیم نعمت دی گئی جس نے ایک وحشی اور اجڈ قوم کی ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں کایا پلٹ کے رکھ دی۔ آپ ﷺ کا ذکر بلند کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے مشن کو اپنے جیتے جی پوری طرح کامیاب ہوتے دیکھ لیا۔ عرب میں کفر و شرک کا کلی طور پر استیصال ہو گیا اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک ایسی جماعت چھوڑی جو تھوڑے ہی عرصہ میں تمام دنیا پر چھا گئی۔

[۲] یعنی ان نعمتوں اور احسانات کے شکریہ کے طور پر آپ ﷺ اپنے پروردگار کے لیے نماز بھی ادا کیجیے اور قربانی بھی دیجیے۔ بدنی عبادتوں میں سے نماز بہت اہمیت رکھتی ہے اور مالی عبادتوں میں سے قربانی۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (۶:۱۶۲) یعنی آپ ﷺ کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میری قربانی میری زندگی اور میری موت سب کچھ اس پروردگار کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ گویا ان آیات میں مشرکین مکہ پر تعریض ہے جو عبادت بھی بتوں کی کرتے تھے اور قربانی بھی بتوں کے نام پر اور ان کے لیے کرتے تھے۔ مسلمانوں کو یہ کام خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا چاہیے۔ واضح رہے بعض علماء نے نحر سے مراد عید الاضحیٰ کے دن کی قربانی لی ہے۔ اور نماز سے مراد اسی دن کی نماز عید جو قربانی سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔

[۳] ❁ کفار مکہ کے اخلاف:۔ شانیٔ ۔شنأ۔ شاہ۔ مصدر شَنَآنٌ اور اسم فاعل شانیٔ ہے اور اس سے مراد ایسا دشمن ہے جو بدخواہ بھی ہو اور کینہ پرور بھی۔ یعنی عداوت بھی رکھتا ہو اور بغض بھی اور یہ دشمنی کا تیسرا اور انتہائی درجہ ہے قریش مکہ آپ ﷺ کے ایسے ہی دشمن تھے۔ بالخصوص ان کے سردار اور معتبر لوگ۔ جب آپ ﷺ کا دوسرا بیٹا (جسے طیب بھی کہتے ہیں اور طاہر بھی) بھی فوت ہو گیا تو یہ سب لوگ بہت خوش ہوئے اور تالیاں بجانے لگے اور ایک دوسرے کو مبارک کے طور پر کہنے لگے۔ بتر محمد اور بتر کا لفظ کسی جانور کے دم کاٹنے سے مخصوص ہے اور معنوی لحاظ سے مقطوع یا لاولد کو کہتے ہیں یا جس کا ذکر خیر کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ محمد ﷺ کی کوئی نرینہ اولاد تو رہی نہیں۔ اس کا معاملہ بس اس کی اپنی زندگی تک ہی محدود ہے۔ اس کے بعد اس کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا۔ اسی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَبْتَرْ آپ ﷺ نہیں بلکہ آپ کے دشمن ہیں۔ ان دشمنوں میں سے اکثر تو جنگ بدر میں مارے گئے اور اگر ان کی نسل کہیں بچی بھی ہے تو ان کی اولاد میں کوئی بھی اپنے ایسے اسلاف کا نام لینا اور اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرنا گوارا تک نہیں کرتا۔ ان کا ذکر خیر کرنا تو بڑی دور کی بات ہے۔ سب لوگ ان پر لعنت ہی بھیجتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو جو شان و عظمت اور آپ ﷺ کے ذکر خیر کو جو بقا بخشی ہے وہ دائم زوال ہے۔ دنیا کے اربوں مسلمان ہر روز کئی مرتبہ آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل پر درود بھیجتے ہیں۔ اذانوں اور نمازوں میں آپ ﷺ کا نام لیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ پھر میدان محشر میں آپ ﷺ کو جو درجات عطا کیے جائیں گے اور مقام محمود عطا کیا جائے گا ان کے ذکر سے قرآن اور حدیث کی کتب بھری پڑی ہیں۔

❁❁❁

٦ آیاتھا سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّۃٌ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ① لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ③ وَلَآ

کلمات ۲۶ آیات ٦ (۱۰۹) سورۃ الکافرون مکی ہے (۱۸) رکوع ۱ حروف ۹۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آپ کہہ دیجیے: اے کافرو!(۱) جس کی تم عبادت[۱] کرتے ہو میں اس کی عبادت نہیں کر سکتا(۲) اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے[۲] ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں(۳)

[۱] کفار مکہ کی ایک خطرناک چال' حق وباطل میں سمجھوتہ: اس سورت میں ان کافروں سے خطاب ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ طُغْیَانًا وَّکُفْرًا﴾ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ الکافرون)

جب آپ ﷺ کی دعوت سے مکہ میں کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تو کفار مکہ کو ابتداءً اسلام اور کفر میں سمجھوتے کی سوجھی اور اس کے لیے کئی راہیں اختیار کی گئیں۔ کبھی لالچ کا راستہ اور کبھی دھمکی اور دھونس کا راستہ۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ کفار نے یہاں تک پیش کش کر دی کہ آپ چاہو تو ہم آپ کے قدموں میں مال و دولت کے انبار لگا دیتے ہیں۔ حکومت چاہو تو وہ بھی حاضر ہے۔ کسی مالدار اور حسین لڑکی سے شادی چاہتے ہو تو وہ بھی حاضر ہے مگر ہمارے معبودوں کی توہین نہ کیا کرو۔ منجملہ ایسی تدابیر کے ایک تدبیر یا تجویز یہ بھی تھی کہ کافروں نے آپ سے کہا کہ ایک سال ہم آپ ﷺ کے معبود کی عبادت کیا کریں گے بشرطیکہ اگلے سال تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو۔ کفار کی یہ تدبیر کسی رواداری کی بناء پر نہیں تھی بلکہ ایک انتہائی خطرناک چال تھی۔ جس سے وہ دعوکا دے کر پیغمبر اسلام کو ان کے قدموں سے اکھیڑنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی معبود برحق بلکہ سب سے بڑا معبود تسلیم کرتے تھے۔ ان کا جرم تو صرف یہ تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کی بھی عبادت کیا کرتے تھے۔ اس لیے اس شرط سے نہ ان کے عقیدہ میں کچھ فرق آتا تھا اور نہ ہی طرز زندگی میں، جبکہ اللہ کے رسول کو وہ شرک کی نجاست میں مبتلا کرنا چاہتے تھے جسے مٹانے کے لیے ہی آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ باطل کبھی اکیلا چل نہیں سکتا۔ جب تک اس میں کچھ نہ کچھ حق کی آمیزش نہ کی جائے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ وہ اکیلا چل نہیں سکتا جب تک اس میں سچ کی آمیزش نہ ہو اور یہی ان کافروں کا مذہب تھا۔ جبکہ حق باطل کی ادنیٰ سی آمیزش بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ حق میں باطل کی ادنیٰ سی آمیزش سے حق باطل بن جاتا ہے۔ جیسے ایک من دودھ میں اگر ایک پاؤ بھر پیشاب ملا دیا جائے تو سارے کا سارا نجس، پلید اور ناقابل استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

باطل دوئی پرست ہے، حق لاشریک ہے   شرکت میانہ حق وباطل نہ کر قبول

کافروں کی اسی سمجھوتے کی تجویز کا جواب اس سورت میں دیا گیا ہے۔

[۲] قرآن نے کافروں کی اس تجویز کا دوٹوک فیصلہ کر دیا اور آپ ﷺ ہی سے فرمایا کہ سب کافروں کے سامنے یہ اعلان کر دو کہ اس

اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ ع ۳۲

اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم (اور تمہارے آباءواجداد) عبادت کرتے رہے (۴) اور نہ ہی تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت [۳] کرتا ہوں (۵) تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے [۴] لیے میرا دین (۶)

شرط پر ہمارے تمہارے درمیان کبھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں کسی قیمت پر تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتا۔ جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم بھی ایک اکیلے اللہ کی عبادت کرنا گوارا نہ کرو گے اور اپنے دوسرے معبودوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہو گے۔

[۳] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت نمبر ۳ اور ۵ میں آیت ۲ اور ۳ کے مضمون کا ہی تکرار ہے اور اگر اسے تکرار ہی تسلیم کیا جائے تو بھی یہ تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ تاہم یہ محض تکرار نہیں بلکہ ان میں دو قسم کا فرق ہے۔ ایک یہ کہ پہلی دو آیات میں "ما" کو موصولہ اور پچھلی دو آیات میں "ما" کو مصدریہ قرار دیا جائے۔ اس صورت میں پچھلی آیات کا معنی یہ ہو گا کہ جو طریق عبادت میں نے اختیار کیا ہے۔ اسے تم قبول نہیں کر سکتے اور جو تم نے اختیار کر رکھا ہے اسے میں نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ کا طریق عبادت یہ تھا کہ آپ نماز میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے تھے اور اس طریق عبادت سے کافروں کو خاصی چڑ تھی اور اس سے منع بھی کرتے تھے جیسا کہ سورت علق میں ابو جہل اور عقبہ بن ابی معیط سے متعلق کئی واقعات درج کیے جا چکے ہیں۔ اور کافروں کا طریق عبادت یہ تھا کہ گاتے، سیٹیاں اور تالیاں بجاتے، کعبہ کا ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ آپ بھلا ان کا یہ طریق عبادت اختیار کر سکتے تھے۔؟

اور اگر بعد کی آیات میں بھی "ما" کو موصولہ ہی سمجھا جائے تو بھی دو فرق واضح ہیں۔ ایک یہ کہ پہلی آیت میں لَآ اَعْبُدُ آیا ہے اور بعد کی آیات میں لَآ اَنَا عَابِدٌ اور ظاہر ہے کہ جو تاکید لَآ اَنَا عَابِدٌ (یعنی میں کسی قیمت پر عبادت کرنے والا نہیں) میں پائی جاتی ہے وہ لَآ اَعْبُدُ میں نہیں پائی جاتی اور دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی آیات میں مَا تَعْبُدُوْنَ (یعنی جنہیں تم آج کل پوجتے ہو) ہے۔ اور بعد والی آیات میں مَا عَبَدْتُّمْ صیغہ ماضی میں ہے یعنی جنہیں تم پہلے پوجتے رہے یا تمہارے آباءواجداد پوجا کرتے تھے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ مشرک اپنی حسب پسند اپنے معبودوں میں تبدیلی کر لیا کرتے تھے۔ جو چیز فائدہ مند نظر آئی یا جو خوبصورت سا پتھر نظر آیا اسے اٹھا کر معبود بنا لیا اور پہلے کو رخصت کیا۔

[۴] ❁ شرک سے متعلق کسی قسم کی لچک اور رواداری کی کوئی گنجائش نہیں:۔ یہ ہے وہ دو ٹوک فیصلہ جو صرف مکہ کے کافروں کو نہیں، دنیا بھر کے کافروں کو بھی نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی واضح الفاظ میں بتا دیا گیا کہ مشرکوں کو ان کے معبود مبارک رہیں۔ مگر مسلمان اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتے۔ شرک کے معاملہ میں اسلام نے کسی قسم کی لچک اور رواداری برداشت نہیں کی۔ خواہ یہ مشرک کافر ہوں یا اپنے آپ کو مسلمان ہی کہلاتے ہوں۔ کیونکہ اللہ پر ایمان لانے کے باوجود لوگوں کی اکثریت مشرک ہی ہوتی ہے جیسا کہ سورت یوسف کی آیت نمبر ۱۰۶ میں فرمایا: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾

❁❁❁

۳ آیاتہا — سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ — رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾ ع ۲۷

کلمات ۱۹ — آیات ۳ (۱۱۰) سورۃ النصر مدنی ہے (۱۱۴) رکوع ۱ — حروف ۸۲

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

جب اللہ کی مدد اور فتح[۱] آ پہنچی(۱) اور آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہو رہے[۲] ہیں(۲) تو آپ اپنے پروردگار[۳] کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے۔ اور اس سے بخشش طلب کیجیے۔ یقیناً وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔(۳)

[۱] ❁ فتح مکہ۔ مکہ پر چڑھائی کا سبب اور کیفیت:۔ فتح سے مراد کسی عام معرکہ کی فتح نہیں بلکہ اس سے مراد مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن قریش کا مرکز شہر مکہ ہے۔ تمام قبائل عرب اس بات کے منتظر تھے کہ آیا مسلمان مکہ کو فتح کر سکیں گے یا نہیں؟ اگر کر لیں تو اسلام سچا مذہب ہے ورنہ نہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اسلام لانے کو بھی فتح مکہ سے مشروط اور فتح مکہ تک مؤخر کر رکھا تھا۔ گویا فتح مکہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک فیصلہ کن فتح تھی۔ اور خالصتاً اللہ کی مدد سے اور معجزانہ انداز سے واقع ہوئی تھی۔ جس میں مسلمانوں کو معمولی سے معرکہ کی بھی ضرورت پیش نہ آئی۔ مکہ پر چڑھائی کا فوری سبب قریش مکہ کی عہد شکنی تھی جو انہوں نے صلح حدیبیہ کی شرائط کو پس پشت ڈال کر اور اپنے حلیف قبیلہ بنو بکر کی علی الاعلان مدد کر کے کی تھی۔ اور جب بنو خزاعہ کی فریاد پر رسول اللہ ﷺ نے قریش کے سامنے کچھ شرائط پیش کیں تو قریشی نوجوانوں نے انہیں ٹھکرا دیا تھا۔ اسی دوران آپ ﷺ نے انتہائی خفیہ طریق سے مکہ پر چڑھائی کی تیاری شروع کر دی اور اپنے حلیف قبائل کو بھی خفیہ طور پر پیغام بھیج دیا تھا۔

❁ ابو سفیان کی گرفتاری:۔ جب آپ ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے تو لشکر کی تعداد چار ہزار تھی۔ راستہ میں حلیف قبائل ملتے گئے اور مکہ پہنچنے تک دس ہزار کا جرار لشکر آپ کے ہمرکاب تھا۔ آپ ﷺ نے مکہ کے قریب مر الظہران میں پڑاؤ ڈالا تو اس لشکر کو میلوں میں پھیلا دیا اور حکم دیا کہ آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن کیے جائیں۔ دشمن یہ منظر دیکھ کر اس قدر مرعوب ہو گیا کہ اس میں مقابلہ کی سکت ہی نہ رہی۔ ابو سفیان اپنے دو ساتھیوں سمیت حالات کا جائزہ لینے نکلا ہی تھی کہ گرفتار ہو گیا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے گھوڑے کے پیچھے بٹھایا تاکہ بلا تاخیر اس کے لیے دربار نبوی سے امان کا پروانہ حاصل کر لیا جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی فوراً دربار نبوی کو روانہ ہوئے تاکہ ابو سفیان کو دربار نبوی میں پہنچنے سے پہلے اور امان ملنے سے پیشتر ہی قتل کر دیا جائے۔ اتفاق کی بات کہ سیدنا عباس پہلے پہنچ گئے اور ابو سفیان کی جان بچ گئی۔ آپ ﷺ نے اسے معاف کر دیا اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اسے اپنے خیمہ میں لے جائیں۔

❁ آپ کا مسلمانوں کو کفار کے سامنے شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے کا حکم:۔ دوسرے دن آپ ﷺ نے ابوسفیان کو پہاڑی کے ایک بلند مقام پر کھڑا کیا اور اسلامی لشکر، جو قبائل کے لحاظ سے مختلف فوجی دستوں میں بٹا ہوا تھا، کو حکم دیا کہ ابوسفیان کے سامنے پوری شان و شوکت کے ساتھ گزرتے جائیں۔ اس نظارہ نے صرف ابوسفیان پر ہی نہیں، تمام کفار کے دلوں پر اسلام کی ایسی دھاک بٹھا دی کہ مقابلہ کا کسی کو خیال تک نہ آیا اور اس طرح عرب کا یہ مرکزی شہر بلا مقابلہ اور بغیر کسی خون خرابہ کے فتح ہو گیا۔

❁ معافی کا اعلان:۔ فتح کے بعد آپ ﷺ نے اپنے ان جانی دشمنوں کو بڑی فراخدلی کے ساتھ معاف کر دیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف ابوسفیان اور اس کے اہل خانہ مسلمان ہو گئے بلکہ اہل مکہ کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ کافروں کے دلوں میں اس طرح رعب ڈال دینا اور مکہ کا اس طرح بلا مقابلہ فتح ہو جانا بلاشبہ اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔

[۲] ❁ فتح مکہ اور مشرک قبائل کا جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا:۔ عرب قبائل تو پہلے ہی اس بات کے انتظار میں تھے کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو یہ قبیلے دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ مکہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا تھا۔ ۹ھ میں اس قدر وفود اسلام لانے کے لیے مدینہ حاضر ہوئے کہ اس سال کا نام ہی عام الوفود پڑ گیا۔ ہر قبیلے کے چند معتبر لوگ مدینہ جاتے، اسلام کی تعلیم حاصل کرتے پھر واپس آ کر اپنے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگے۔ ۹ھ میں حج کے موقع پر اعلان برات کیا گیا جس کا تفصیلی ذکر سورہ توبہ کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ اس اعلان کی رو سے اب مشرکین عرب کے لیے دو ہی راستے رہ گئے تھے یا تو وہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا پھر جزیرہ عرب سے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ مشرکین عرب نے بھی پہلی ہی بات قبول کی اور اسلام لے آئے۔ اس طرح ۱۰ھ میں سرزمین عرب کفر و شرک سے پاک ہو گئی۔

[۳] ❁ آپ کی وفات کی طرف اشارہ:۔ یہ سورت سب سے آخری نازل ہونے والی مکمل سورت ہے۔ (مسلم، کتاب التفسیر) اور یہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد چند متفرق آیات نازل ہوئیں جیسے ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ......﴾ (۵:۳) وغیرہ مگر مکمل کوئی سورت نازل نہیں ہوئی اور یہ آیت بھی اسی موقع پر نازل ہوئی تھی۔ اس سورت سے آپ ﷺ نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد پورا ہو چکا ہے اور آپ ﷺ عنقریب اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ چنانچہ اسی سال حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے جو عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا اس میں یہ کہہ کر کہ: "شاید آئندہ سال تم میں موجود نہ ہوں گا" اس بات کی طرف واضح اشارہ کر دیا تھا، اور سمجھدار صحابہ بھی اس سورت سے یہی کچھ سمجھتے تھے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مجھے (اپنی مجلس مشاورت میں) بزرگ بدری صحابہ کے ساتھ بلا لیا کرتے تھے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات ناگوار گزری اور کہنے لگے: "آپ اسے ہمارے ساتھ بلا لیتے ہیں جبکہ ہمارے بیٹے اس جیسے ہیں" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "اس کی وجہ تم جانتے ہو" چنانچہ ایک دن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے بھی بزرگ صحابہ کے ساتھ بلا لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دن آپ نے مجھے صرف اس لیے بلایا کہ انہیں کچھ دکھائیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ: "اللہ تعالیٰ کے قول ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ سے تم کیا سمجھتے ہو؟" بعض لوگوں نے کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں فتح حاصل ہو تو ہمیں چاہیے کہ اللہ کی تعریف کریں اور اس سے بخشش چاہیں" اور بعض خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا۔ پھر مجھے پوچھا گیا: "کیا

تمہارا بھی یہی خیال ہے؟" میں نے کہا: "نہیں" کہنے لگے: "پھر تم کیا کہتے ہو؟" میں نے کہا: اس سورت میں آپ ﷺ کی وفات کی طرف اشارہ ہے جس سے اللہ نے اپنے رسول کو آگاہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور مکہ فتح ہو گیا اور یہی تمہاری وفات کی علامت ہے۔ سو اب آپ ﷺ اللہ کی تعریف کیجیے، اس سے بخشش مانگیے وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "میں بھی اس سے وہی کچھ سمجھا ہوں جو تم کہہ رہے ہو" (بخاری، کتاب التفسیر)

اس آیت میں آپ ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے پروردگار کے اتنے بڑے احسانات کے شکریہ کے طور پر اب پہلے سے زیادہ اللہ کی تسبیح و تحمید کیا کریں اور آپ ﷺ کی زندگی بھر کی کاوشوں میں جو کوئی لغزش رہ گئی ہو تو اس کے لیے اللہ سے استغفار کریں۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورت نصر نازل ہوئی تو اس کے بعد آپ ﷺ رکوع اور سجدہ میں اکثر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ "سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ" (بخاری، کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ النصر)

آیاتہا ٥ سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ رکوعہا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ

کلمات ۲۴ آیات ۵ (۱۱۱) سورۃ اللھب مکی ہے (٦) رکوع ۱ حروف ۸۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

ابو لہب[1] کے دونوں ہاتھ تباہ ہوں اور وہ (خود بھی) ہلاک ہو (۱) نہ اس کا مال اس کے کسی کام آیا اور نہ وہ جو اس[2] نے کمایا (۲) جلد ہی[3] وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا (۳)

[۱] ابولہب کا تعارف:۔ ابولہب کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا اور رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا حقیقی چچا تھا۔ نہایت ہی حسین و جمیل تھا۔ رنگ سیب کی طرح دمکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی کنیت ابولہب ہوئی۔ مالدار تھا مگر طبعاً بخیل تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ولادت کی خبر اسے اس کی لونڈی ثویبہ نے دی تو اس خوشی میں اس نے ثویبہ کو آزاد کر دیا۔ (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب امھاتکم التی ارضعنکم) آپ ﷺ کے والد تو آپ ﷺ کی ولادت سے پیشتر ہی وفات پا چکے تھے۔ بڑا چچا ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو باپ کا قائم مقام سمجھ کر اس نے اپنی طبیعت کے خلاف اس خوشی کا اظہار کیا تھا یا اسے کرنا پڑا تھا۔ یہ اس کے بخل ہی کا نتیجہ تھا کہ جب آپ کے دادا عبدالمطلب فوت ہونے لگے تو انہوں نے آپ کی کفالت (اس وقت آپ ﷺ کی عمر آٹھ برس تھی) ابولہب کے بجائے ابوطالب کے سپرد کی جو مالی لحاظ سے ابولہب کی نسبت بہت کمزور تھے۔ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد تین سال تک اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام نہایت خفیہ طور پر ہوتا رہا۔ پھر جب یہ حکم نازل ہوا۔ ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (۲۶:۲۱۴) اپنے قریبی کنبہ والوں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈراؤ تو آپ ﷺ نے اس حکم کی تعمیل میں بنوہاشم اور بنو عبدالمطلب کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ کل ۴۵ آدمی جمع ہوئے۔

ابولہب کی مخالفت:۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے لا الٰہ الا اللہ کی دعوت پیش کی تو ابولہب جھٹ سے بول اٹھا: دیکھو! یہ سب حضرات تمہارے چچا یا چچازاد بھائی ہیں۔ نادانی چھوڑ دو اور یہ سمجھ لو کہ تمہارا خاندان سارے عرب کے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتا۔ اور میں سب سے زیادہ حقدار ہوں کہ تمہیں پکڑ لوں۔ بس تمہارے لیے تمہارے باپ کا خانوادہ ہی کافی ہے۔ اور اگر تم اپنی بات پر اڑے رہے اور عرب کے سارے قبائل تم پر ٹوٹ پڑے تو ایسی صورت میں تم سے زیادہ اور کون شخص اپنے خاندان کے لیے شر اور تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ ابولہب کی یہ تلخ اور ترش باتیں سننے کے بعد آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کر لی اور دوسرے لوگ بھی اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ابوطالب کی حمایت:۔ چند دن بعد آپ ﷺ نے دوبارہ اپنے قرابتداروں کو مدعو کر کے اپنی دعوت ذرا کھل کر پیش کی۔ جس کے نتیجہ میں آپ کے چھوٹے چچا ابوطالب نے کھل کر آپ ﷺ کی حمایت کا اعلان کر دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ

دیا کہ میں ذاتی طور پر عبدالمطلب کا دین چھوڑنے کو تیار نہیں۔ ابوطالب کی اس حمیت کے جواب میں ابولہب کہنے لگا: "خدا کی قسم! یہ (یعنی دعوت توحید) برائی ہے۔ لہٰذا محمد ﷺ کے ہاتھ دوسروں سے پہلے تم خود ہی پکڑ لو" اس کے جواب میں ابوطالب نے کہا: "اللہ کی قسم! جب تک جان میں جان ہے ہم اس کی حفاظت کرتے رہیں گے" اس دوسری دعوت کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ معززین بنوہاشم میں کم از کم ایک آدمی (یعنی ابوطالب) ایسا ہے جس کی حمایت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

❁ **کوہ صفا پر دشمنوں کا اعتراف:۔** اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک تیسرا جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ ایک دن آپ کوہ صفا پر چڑھ گئے اور ایک فریادی کی طرح واصباحاہ کی آواز لگائی اور قریش کے ایک ایک قبیلے کا نام لے کر پکارا اور کہا اے بنی فہر، اے بنی عدی، اے بنی کعب وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ سب قبائل کے قابل ذکر اشخاص آپ ﷺ کے پاس اکٹھے ہو گئے اور جو نہ پہنچ سکا اس نے اپنا نمائندہ بھیج دیا۔ آپ ﷺ ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے پوچھا: اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے اس پار ایک لشکر جمع ہو رہا ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا: "ہاں" اس لیے کہ آپ ﷺ کے متعلق ہمارا ہمیشہ سچ ہی کا تجربہ رہا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا تو سن لو کہ میں تمہیں ایک سخت عذاب سے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں لہٰذا تم اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ میں تمہیں اللہ سے بچانے کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔

❁ **ابولہب کی برہمی:۔** آپ ﷺ ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ابولہب یکدم بھڑک اٹھا اور کہنے لگا تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا (سارا دن تم پر ہلاکت ہو کیا اس بات کے لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا) (بخاری۔ کتاب التفسیر)

اگرچہ ابولہب کی اس بدتمیزی کی وجہ سے یہ اجتماع کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ آپ ﷺ نے حسب ارشاد باری اپنے پورے قبیلے کو اپنی دعوت سے آگاہ کر دیا اور آپ ﷺ کی یہ پکار مکہ کے ایک ایک فرد تک پہنچ گئی اور ابولہب کی بدخلقی اور گستاخی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

❁ **ابولہب کا ہی قرآن نے کیوں نام لیا؟** یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے دشمن تو اور بھی بہت تھے، بلکہ ابولہب سے بھی زیادہ تھے۔ تو ان تمام دشمنوں میں صرف ابولہب کا ہی قرآن میں کیوں نام لے کر ذکر کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ درج ذیل دو وجوہ کی بنا پر ابولہب کا جرم واقعی اتنا شدید جرم تھا کہ قرآن میں اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت تو تھی نہیں، جہاں فریاد کی جا سکے۔ لے دے کر ایک قبائلی حمیت ہی وہ چیز تھی جو ایسے اوقات میں کام آتی تھی۔ مظلوم شخص فوراً اپنے قبیلے کو دادرسی کے لیے پکارتا اور پورا قبیلہ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس لیے ان کو اضطراراً بھی صلہ رحمی کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ ابولہب ہی وہ واحد بدبخت شخص ہے جس نے اس دور کے واجب الاحترام قانون کو توڑ کر اپنے قبیلہ کے علی الرغم ڈٹ کر آپ کی مخالفت کی۔ علاوہ ازیں جب بنوہاشم اور بنومطلب کو معاشرتی بائیکاٹ کی وجہ سے شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا تھا تو اس وقت بھی ابولہب نے اپنے قبیلے کا ساتھ نہیں دیا تھا اور یہ تو واضح ہے کہ شعب ابی طالب کے محصورین میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل تھے جو آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائے تھے تاہم قبائلی حمیت کی بنا پر انہوں نے سب کچھ گوارا کیا تھا اور اس قانون کے احترام کا حق

ادا کیا۔ حد یہ ہے کہ آپ کے چھوٹے چچا ابو طالب نے آپ کی حفاظت کے لیے زندگی بھر قریش مکہ کی مخالفت مول لی۔ حالانکہ آخری دم تک وہ ایمان نہیں لائے تھے۔ (بخاری، کتاب التفسیر زیر آیت ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس قبائلی معاشرہ میں چچا کو بھی باپ کا درجہ حاصل تھا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ حقیقی والد فوت ہو چکا ہو۔ اس لحاظ سے بھی ابولہب کو آپ ﷺ کی حفاظت کا فریضہ بطریق احسن بجا لانا چاہیے تھا خواہ وہ ایمان لاتا یا نہ لاتا۔ مگر وہ آپ کی حفاظت کی بجائے بغض و عناد میں اتنا آگے نکل گیا کہ اس کا شمار آپ ﷺ کے صف اول کے دشمنوں میں ہوتا ہے۔ اس نے کوہ صفا پر جس بد خلقی اور گستاخی کا مظاہرہ کیا اس پر آپ کے خاموش رہنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ معاشرتی سطح پر ابولہب آپ ﷺ کے باپ کے مقام پر تھا اور باپ ہونے کے ادب کا تقاضا یہی تھا کہ آپ خاموش رہتے۔ لہٰذا اس کی اس بدتمیزی کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے اس کا نام لے کر دے دیا۔

واضح رہے کہ ﴿تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ﴾ سے یہ مراد نہیں کہ جسمانی لحاظ سے ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں بلکہ یہ بددعا کی قسم کے کلمات ہیں جو ناراضگی اور خفگی کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔ اور ایسے الفاظ صرف عربی میں نہیں۔ ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔

[۲] ❁ <u>ابولہب کا جنگ بدر میں شامل نہ ہونے کا منصوبہ</u>:۔ مال کی ہوس اور بخل مل کر ایک تیسری صفت پیدا کرتے ہیں اور وہ ہے بزدلی۔ جب جنگ بدر کے لیے بھرتی کا اعلان عام ہوا تو ابولہب اس سے فرار کی راہیں سوچنے لگا۔ ایک شخص سے اس نے چار ہزار درہم قرضہ لینا تھا جس کے ملنے کی اسے کوئی توقع نہ تھی۔ کیونکہ وہ شخص مفلس تھا۔ ابولہب نے اس سے سودا بازی کی کہ اگر وہ اس کی جگہ جنگ بدر میں شریک ہو جائے تو وہ اس سے اپنے قرض کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ اس طرح ابولہب نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ڈوبے ہوئے قرضہ کی وصولی بھی ہو گئی اور جنگ سے بچاؤ کا مقصد بھی حاصل ہو گیا۔ جنگ بدر میں قریشیوں کی شکست فاش کی خبر سن کر اسے اتنا صدمہ ہوا کہ بیمار پڑ گیا۔

❁ <u>ذلت کی موت</u>:۔ ساتویں دن یہ بیماری چیچک کی شکل اختیار کر گئی تو اسے اپنی ساری عمر کی کمائی برباد ہوتی نظر آنے لگی کیونکہ اب اسے اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ چھوت کی وجہ سے اس کے بیٹوں نے اس کے ساتھ کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ بالآخر وہ نہایت بے کسی کی موت مرا۔ مرنے کے بعد بھی اس کا کوئی بیٹا اس کے قریب نہ گیا۔ تین دن تک اس کی لاش بے گور و کفن گھر میں سڑتی رہی۔ پھر جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو انہوں نے ایک حبشی کو کچھ معاوضہ دیا کہ وہ ایک گڑھا کھود کر اس میں لاش کو دھکیل دے اور اوپر سے مٹی ڈال دے۔ یا پتھر وغیرہ دور سے پھینک کر لاش کو چھپا دے۔

واضح رہے کہ اس آیت میں مَاكَسَبَ سے مراد اس کی اولاد ہے جیسا کہ احادیث صریحہ سے ثابت ہے۔ اس طرح اللہ کا یہ قول پورا ہوا کہ نہ اس کا مال کام آیا نہ اولاد۔

[۳] ابولہب کنیت ہونے کی دنیا میں مناسبت یہ تھی کہ اس کا رنگ سیب کی طرح لال تھا اور آخرت میں مناسبت یہ ہو گی کہ شعلوں والی آگ میں پھینکا جائے گا۔

لَهَبٍ ﴿۳﴾ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴿۴﴾ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

اور اس کی بیوی جو ایندھن [۴] اٹھائے پھرتی ہے (۴) اس کی گردن میں مضبوط [۵] بٹی ہوئی رسی ہوگی (۵)

[۴] ابولہب کی بیوی کا تعارف:۔ ابولہب کی بیوی کا نام اروی اور کنیت ام جمیل تھی۔ ابوسفیان بن حرب بن امیہ کی بہن تھی۔ جو ابوجہل کی موت کے بعد رئیس قریش اور سپہ سالار افواج بنا تھا۔ رسول دشمنی میں یہ عورت بھی اپنے خاوند سے کسی صورت کم نہ تھی۔ جنگل سے خاردار جھاڑ جھنکار اٹھا لاتی اور رات کے اندھیرے میں آپ ﷺ کے گھر کے آگے ڈال دیتی تاکہ جب آپ صبح بیت اللہ کو جائیں تو آپ ﷺ کے پاؤں میں کانٹے چبھ جائیں۔ نیز آپ کے بال بچے بھی زخمی ہوں۔ خاصی بدزبان اور مفسدہ پرداز عورت تھی۔ جب سورہ لہب نازل ہوئی تو یہ مٹھی بھر کنکریاں لے کر بیت اللہ کو چل کھڑی ہوئی۔ تاکہ آپ ﷺ کو ہجو کی صورت میں سورہ لہب کا جواب دے اور کنکریاں مار کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرے۔ اتفاق کی بات کہ اسے اللہ کے رسول ﷺ نظر ہی نہ آئے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگی: ''تمہارا ساتھی کدھر ہے؟ سنا ہے وہ میری ہجو کرتا ہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''اس نے تو کوئی ہجو نہیں کی۔ (یعنی اگر ہجو کی ہے تو وہ اللہ نے کی ہے آپ ﷺ نے نہیں کی) یہ جواب سن کر وہ واپس چلی آئی۔

[۵] ابولہب کی بیوی کی موت:۔ جید بمعنی لمبی اور خوبصورت گردن، ہرن کی طرح پتلی اور لمبی گردن۔ اس گردن میں وہ ایک سونے کا ہار پہنا کرتی تھی اور کہتی تھی کہ میں یہ ہار بیچ کر محمد ﷺ کی مخالفت کے کاموں میں لگاؤں گی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جس مونج کی چبھنے والی موٹی رسی سے وہ جھاڑ جھنکار باندھا کرتی وہی اس کی گردن میں اٹک گئی اور ایسی پھنسی کہ بالآخر اس کی موت کا سبب بن گئی۔

آیاتها ۴ سُورَةُ الْإِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

ع ۲۶ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴

کلمات ۱۷ آیات ۴ (۱۱۲) سورۃ الاخلاص مکی ہے (۲۲) رکوع ۱ حروف ۷۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آپ کہہ دیجیے[۱] کہ: اللہ ایک[۲] ہے (۱) اللہ بے نیاز[۳] ہے (۲) نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی[۴] کی اولاد ہے (۳) اور اس کا ہمسر کوئی[۵] نہیں۔ (۴)

[۱] ❁ اللہ کے اکیلے اور وحدہ لاشریک ہونے پر کفار کا تعجب اور سوالات:۔ آیت کے انداز سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کسی سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ اکیلے اللہ کی دعوت دے رہے تھے جبکہ دور نبوی کی ساری دنیا طرح طرح کے شرک میں جتلا تھی۔ لہٰذا اللہ کی ذات کے متعلق آپ سے کئی بار سوال ہوا اور کئی قسم کے فرقوں کی طرف سے ہوا۔ سب سے پہلے یہ سوال مشرکین مکہ نے اٹھایا تھا۔ جو ہر خوبصورت پتھر کو معبود بنا لیتے تھے اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اس سوال کی نوعیت درج ذیل حدیث سے واضح ہوتی ہے۔

سیدنا ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ مشرکوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ اپنے رب کا ہم سے نسب بیان کرو۔ تو اللہ نے یہ سورت اتار دی کہ آپ انہیں کہہ دیں کہ "وہ اکیلا ہے۔ اللہ صمد ہے اور صمد وہ ہوتا ہے جو نہ کسی سے پیدا ہوا ہو اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہو۔ اس لیے کہ جو کسی سے پیدا ہو گا ضرور مرے گا اور جو مرے گا اس کا کوئی وارث بھی ہو گا۔ اور اللہ نہ مرے گا اور نہ اس کا کوئی وارث ہو گا اور نہ اس کا کوئی کفو ہے۔" راوی کہتا ہے کہ کفو کی معنی یہ ہے کہ نہ کوئی اس کے مشابہ ہے اور نہ برابر ہے اور اس کی مثال کوئی چیز نہیں۔ (ترمذی۔ کتاب التفسیر)

مشرکوں کے بعد جس نے بھی آپ ﷺ سے اللہ کے بارے میں کوئی سوال کیا تو آپ ﷺ یہ سورت پڑھ کر سنا دیتے تھے۔

[۲] ❁ مختلف قوموں کے خداؤں کی تعداد:۔ اَحَدٌ بمعنی لاثانی، بے نظیر، یکتا، اس لحاظ سے اس لفظ کا اطلاق صرف ذات باری تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ غیر اللہ کے لیے واحد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ گنتی میں ایک، دو، تین کے لیے واحد، اثنین، ثلثۃ آتا ہے۔ واحد کے بجائے احد نہیں بولا جاتا۔ البتہ دو موقعوں پر احد کا لفظ واحد کا مترادف ہو کر آتا ہے۔ (۱) اسمائے اعداد کی ترکیب میں جیسے احد عشر (گیارہ) احدهما (دونوں میں سے کوئی ایک۔) اَحَدُمِنْكُمْ (تم میں سے کوئی ایک) اَحَدُكُمْ (تمہارا کوئی ایک) یوم الاحد (اتوار) وغیرہ (۲) نفی کی صورت میں صرف ذوی العقول کے لیے آتا ہے جیسے لَيْسَ فِي الدَّارِ اَحَدٌ (گھر میں کوئی بھی نہیں ہے) جبکہ واحد کا لفظ عام ہے جو ماسوا اللہ کے لیے تو عام مستعمل ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے صرف اس صورت میں کہ اللہ کی کوئی صفت بھی مذکور ہو جیسے هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۶:۱۳) یعنی اللہ وہ ہے جو اکیلا ہے سب کو دبا کر رکھنے والا)۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ صرف ایک ہی ہے۔ دو نہیں۔ جیسا کہ مجوسیوں کا عقیدہ ہے کہ نیکی کا خدا یزدان ہے اور بدی کا خدا اہرمن ہے۔ تین بھی نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں خدا ہیں اور تینوں مل کر بھی ایک ہی خدا بنتا ہے۔ یا ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ خدا، مادہ اور روح تینوں ہی ازلی ابدی ہیں۔ وہ تینتیس کروڑ بھی نہیں جیسا کہ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کی تعداد شمار کرتے ہیں بلکہ وہ ایک اور صرف ایک ہے۔

[۳] صمد کا مفہوم اور صمد اور غنی میں فرق:۔ صَمَدٌ میں دو باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں (۱) کسی چیز کا ٹھوس اور مضبوط ہونا (۲) لوگ ہر طرف سے اس کی طرف قصد کریں۔ اور الصَّمَدُ ایسی ذات ہے جو خود تو مستقل اور قائم بالذات ہو۔ وہ خود کسی کی محتاج نہ ہو مگر دوسری سب مخلوق اس کی محتاج ہو۔ بے نیاز کے لیے عربی زبان میں غنی کا لفظ بھی آتا ہے اور اس کی ضد فقیر ہے۔ اور غنی وہ ہے جسے کسی دوسرے کی احتیاج نہ ہو مگر یہ لفظ صرف مال و دولت کے معاملہ میں بے نیاز ہونے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور غنی دولت مند کو کہتے ہیں۔ یعنی کم از کم اتنا مالدار ضرور ہو کہ اسے معاش کے سلسلے میں دوسروں کی احتیاج نہ ہو جبکہ صمد کا لفظ جملہ پہلوؤں میں بے نیاز ہونے کے معنوں میں آتا ہے اور دوسرے لوگ بھی جملہ پہلوؤں میں اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ کھانے پینے سے بھی بے نیاز ہے اور سونے اور آرام کرنے سے بھی۔ وہ اپنی زندگی اور بقا کے لیے بھی کسی کا محتاج نہیں ہے۔ مگر باقی سب مخلوق ایک ایک چیز رزق، صحت، زندگی، شفاء، اولاد حتیٰ کہ اپنی بقا تک کے لیے بھی اللہ کی محتاج ہے۔ کوئی بھلائی کی بات ایسی نہیں جس کے لیے مخلوق اپنے خالق کی محتاج نہ ہو۔

[۴] اللہ کی اولاد قرار دینے والے فرقے:۔ انسان نے جب بھی اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق سوچا ہے تو اسے انسانی سطح پر لا کر ہی سوچا ہے اور چونکہ انسان اولاد کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس لیے انسان نے اللہ کی بھی اولاد قرار دے دی۔ حالانکہ جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کا مرنا اور فنا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور جو چیز مرنے والی یا فنا ہونے والی ہو وہ کبھی خدا نہیں ہو سکتی۔ نیز انسان کو اولاد کی خواہش اور ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قائم مقام بنے اور اس کی میراث سنبھالے جبکہ اللہ کو ایسی باتوں کی کوئی احتیاج نہیں۔ وہ حی لایموت ہے، اسی خیال سے عیسائیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہود نے سیدنا عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا۔ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اور یونانی، مصری اور ہندی تہذیبوں نے کروڑوں کی تعداد میں دیوی اور دیوتا بنا ڈالے۔ کوئی دیوی ایسی نہ تھی جس کا انہوں نے کوئی دیوتا شوہر نہ تجویز کیا ہو۔ اور کوئی دیوتا ایسا نہ تھا جس کے لیے انہوں نے کوئی دیوی بیوی کے طور پر تجویز نہ کی ہو۔ پھر ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ چلا کر کروڑوں خدا بنا ڈالے۔ یہ بھی غنیمت ہی سمجھئے کہ کسی قوم نے کسی کو اللہ کا باپ نہیں بنا ڈالا۔ ورنہ ایسے مشرکوں سے کیا بعید تھا کہ وہ ایسی بکواس بھی کر ڈالتے۔ اس آیت سے ایسے توہمات کی تردید ہو جاتی ہے۔ اللہ کی اولاد قرار دینا اتنا شدید جرم ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی شدید مذمت وارد ہوئی ہے۔ نیز درج ذیل حدیث بھی اس جرم پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔

اللہ کی اولاد قرار دینا اسے گالی دینے کے مترادف ہے:۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بنی آدم نے مجھے جھٹلایا اور یہ اسے مناسب نہ تھا اور مجھے گالی دی اور یہ اسے مناسب نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانے کا مطلب یہ ہے کہ جو وہ یہ کہتا ہے کہ میں اسے دوبارہ ہرگز پیدا نہ کروں گا حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ مشکل نہیں ہے اور اس کا مجھے گالی دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے حالانکہ میں اکیلا ہوں، بے نیاز ہوں، نہ

میری کوئی اولاد ہے اور نہ میں کسی کی اولاد ہوں اور میرے جوڑ کا تو کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔(بخاری۔ کتاب التفسیر)

[۵] کفو کا لغوی مفہوم:۔ کُفُوًا: کفاء کپڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اس جیسے دوسرے ٹکڑے سے ملا کر خیمہ کی پچھلی طرف ڈال دیا جاتا ہے اور کفو اور کُفی بمعنی ہم پایہ، ہم پلہ، مرتبہ و منزلت میں ایک دوسرے کے برابر ہونا۔ اس کے مقابلہ اور جوڑ یا ٹکر کا ہونا۔ کفو کا لفظ عموماً میدان جنگ میں دعوت مبارزت کے وقت یا نکاح اور رشتہ کے وقت بولا جاتا ہے۔ فلان کفو لفلان یعنی فلاں شخص فلاں کے جوڑ کا یا مد مقابل یا ہمسر ہے۔ رشتہ کے وقت بھی فریقین یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے فریق کی معاشی، معاشرتی اور تمدنی حالت اس جیسی ہے یا نہیں؟ بس یہی کفو کا مفہوم ہے۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی ذات کے متعلق طرح طرح کے سوال کرتے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ اس کائنات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کے جوڑ کی ہو اور تمہیں سمجھایا جا سکے کہ اللہ فلاں چیز کی مانند ہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾

سورۂ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے:۔ واضح رہے کہ چونکہ اس سورت میں توحید کے جملہ پہلوؤں پر مکمل روشنی ڈال دی گئی ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس سورت کو تہائی قرآن کے برابر قرار دیا ہے اور یہ چیز بیشمار احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں بنیادی طور پر تین عقائد پر ہی زور دیا گیا ہے۔ اور وہ ہیں توحید، رسالت اور آخرت۔ اس سورت میں توحید کا چونکہ جامع بیان ہے اس لیے اسے قرآن کی تہائی کے برابر قرار دیا گیا۔ جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہے:

۱۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے پوچھا: کیا تم ہر رات کو ایک تہائی قرآن پڑھنے سے عاجز ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: کوئی شخص تہائی قرآن کیسے پڑھ سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ "تہائی قرآن کے برابر ہے" (مسلم۔ کتاب فضائل القرآن۔ باب فضل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ)

۲۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ جمع ہو جاؤ تاکہ میں تمہارے سامنے قرآن کا تیسرا حصہ پڑھوں۔ ہم جمع ہوئے تو نبی ﷺ نکلے۔ اور سورت ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھی۔ پھر اندر چلے گئے۔ ہم ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ شاید آسمان سے کوئی خبر آئی ہے جس کے لیے آپ اندر چلے گئے۔ پھر آپ باہر نکلے تو فرمایا: "میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے سامنے تہائی قرآن پڑھوں گا۔ سو یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔(حوالہ ایضاً)

۳۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ایک فوج پر سردار مقرر کر کے بھیجا۔ وہ اپنی فوج کی نماز میں قرآن پڑھتے اور قراءت کو ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پر ختم کرتے تھے۔ جب فوج لوٹ کر آئی تو لوگوں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اس سے پوچھو وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ رحمٰن کی صفت ہے اور میں اسے دوست رکھتا ہوں کہ اسے پڑھا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہ اسے کہہ دو کہ اللہ تمہیں دوست رکھتا ہے" (حوالہ ایضاً)

۵ آیاتھا   سورۃ الفلق مکیۃ   رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ﴿۴﴾

کلمات ۲۳   آیات ۵ (۱۱۳) سورۃ الفلق مکی ہے (۲۰) رکوع ۱   حروف ۷۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آپ کہیے کہ: میں صبح کے پروردگار سے[۱] پناہ مانگتا[۲] ہوں (۱) ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی[۳] ہے (۲) اور اندھیری[۴] رات کے شر سے جب وہ چھا جائے (۳) اور گرہوں میں[۵] پھونک مارنے والیوں کے شر سے (۴)

[۱] ﷺ فلق کا لغوی مفہوم:۔ فَلَقَ کے معنی پھٹنا اور الگ ہونا بھی ہے۔ اور پھاڑنا بھی۔ ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ﴾ (۶:۹۶) یعنی صبح کو پھاڑنے اور ظلمت سے الگ کرنے والا۔ اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو رات کی تاریکی سے صبح کی روشنی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور حقیقت میں دیکھا جائے تو جو چیز بھی ظہور میں آتی ہے۔ وہ تاریکی اور پردہ غیب سے ہی ظہور میں آتی ہے۔ جیسے اس سے پہلی آیت میں فرمایا: ﴿فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی﴾ (۶:۹۵) یعنی وہ ذات جو زمین کو پھاڑ کر اس سے دانہ اور گٹھلی کی کونپل نکالنے والا۔ اسی طرح انڈے کا چھلکا توڑ کر چوزے کو باہر نکالنے والا۔ یا رحم مادر سے بچہ کو باہر لانے والا۔ زمین یا پتھر کو پھاڑ کر اس سے چشمے جاری کرنے والا۔ حتیٰ کہ اللہ نے ایک ملے جلے مادے کو ہی پھاڑ کر اس سے آسمان و زمین کو الگ الگ کیا اور انہیں وجود میں لایا تھا۔ اس لحاظ سے فالق اور خالق تقریباً ہم معنی ہیں۔

[۲] ﷺ اللہ کے علاوہ دوسرے سے پناہ مانگنا شرک ہے:۔ پناہ اس وقت مانگی جاتی ہے جب انسان کو کوئی ایسا خطرہ درپیش ہو جس کی مدافعت کرنے کی وہ اپنے آپ میں ہمت نہ پاتا ہو۔ اور اس ہستی سے پناہ مانگی جاتی ہے جو نہ صرف یہ کہ پناہ مانگنے والے سے زیادہ طاقتور ہو بلکہ اس چیز سے بھی طاقتور ہو جس سے حملہ یا تکلیف کا خطرہ درپیش ہے۔ اور سب سے زیادہ طاقتور اور ظاہری اسباب کے علاوہ باطنی اسباب پر حکمران اللہ کی ذات ہے۔ لہٰذا پناہ صرف اسی سے مانگنی چاہیے۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ ظاہری اسباب مفقود ہوں۔ ایسی صورت میں اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے پناہ مانگنا شرک ہے جیسا کہ دور جاہلیت میں لوگ جب کسی جنگل میں مقیم ہوتے تو اپنے مزعومہ عقائد کے مطابق وہاں کے جنوں کے بادشاہ سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ ہاں اگر ظاہری اسباب کی بنا پر کسی سے پناہ مانگی جائے تو یہ جائز ہے۔ تاہم بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہی کرنا چاہیے۔ واضح رہے کہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس دونوں میں مختلف اشیاء سے اللہ کی پناہ مانگنے کا ذکر ہے۔ اور دونوں کا مضمون باہم ملتا جلتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں سورتوں کو معوذتین کہا جاتا ہے یعنی وہ سورتیں جنہیں پڑھ کر اپنے پروردگار سے پناہ مانگی جاتی ہے اور رسول اللہ ﷺ ان دونوں سورتوں کو پڑھ کر پہلے اپنے ہاتھوں پر پھونکتے پھر ہاتھوں کو جسم کے ہر اس حصے پر پھیرتے تھے جہاں تک ہاتھ پہنچ سکتے تھے۔

[۳] جو کچھ کائنات میں موجود ہے وہ سب کچھ اللہ ہی نے پیدا کیا خواہ وہ چیزیں جاندار ہوں یا بے جان۔ اور ہر چیز خواہ کتنی ہی فائدے مند ہو اس کا کچھ نہ کچھ نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس آیت میں ہر چیز کے برے یا نقصان دہ پہلو سے اللہ کی پناہ طلب کرنے

کی ہدایت کی گئی ہے خواہ وہ شر وجود میں آ چکا ہو یا اس سے کسی شر کے پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ اس آیت میں تو ہر چیز کے شر سے پناہ مانگنے کا عمومیت کے ساتھ ذکر ہے۔ البتہ اگلی تین آیات میں ان چند مخصوص چیزوں کا ذکر ہے جن کا شر بہت واضح ہے۔

[۴] ❁ جرائم زیادہ تر رات کی تاریکی میں کیے جاتے ہیں:۔ غاسق۔ غسق بمعنی شفق غائب ہو جانے کے بعد کا اندھیرا۔ اس لحاظ سے غاسق اس ابتدائی رات کو کہتے ہیں کہ جب وہ تاریک ہونے لگتی ہے اور وقب کسی چٹان وغیرہ میں گڑھے کو کہتے ہیں اور وَقَبَ بمعنی گڑھے میں داخل ہو کر غائب ہو جانا اور وَقَبَ الظَّلَامُ بمعنی اتنی تاریکی چھانا جس کے اندر اشیاء غائب ہو جائیں اور تاریک رات کے شر سے پناہ مانگنے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر گناہ کے کام رات کی تاریکیوں میں کیے جاتے ہیں۔ چوری، ڈاکہ، لوٹ مار، زنا وغیرہ کے مجرم عموماً رات کی تاریکیوں میں ہی ایسے کام کرتے ہیں۔ اور عرب قبائل میں تو دستور ہی یہ تھا کہ جب کسی قبیلے پر لوٹ مار کرنا ہوتی تو رات میں سارا سفر ختم کر لیتے اور صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے تھے۔

[۵] ❁ آپ پر جادو:۔ گرہ میں پھونکیں مارنے کا کام عموماً جادوگر کیا کرتے ہیں اور جو لوگ بھی موم کے پتلے بنا کر اس میں سوئیاں چبھوتے ہیں اور کسی کے بال حاصل کر کے ان میں گرہیں لگاتے اور پھونکیں مارتے جاتے ہیں سب جادوگروں کے حکم میں داخل ہیں۔ اور ہمارے ہاں ایسے لوگوں کو جادوگر نہیں عامل کہا جاتا ہے۔ اور جادو کرنا صریحاً کفر کا کام ہے۔ جیسے سورت بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۲ میں یہ صراحت موجود ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جادو چونکہ کفر کا کام ہے۔ اس لیے جادو کا اثر کسی ایماندار یا مومن پر نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ رسول اللہ ﷺ پر بھی جادو کیا گیا تھا اور اس جادو کا آپ ﷺ کی طبیعت پر اثر بھی ہو گیا تھا۔ اور یہ بات اتنی احادیث صحیحہ میں مذکور ہے جو حد تواتر کو پہنچتی ہیں لہٰذا یہ حضرات اپنے اس نظریہ کے مطابق ایسی تمام احادیث کا انکار کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم پہلے یہاں بخاری سے ایک حدیث درج کرتے ہیں پھر ان کے اعتراضات کا جائزہ پیش کریں گے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو آپ پر جادو کیا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ آپ ﷺ کو معلوم ہوتا کہ آپ ﷺ ایک کام کر رہے ہیں حالانکہ وہ کر نہیں رہے ہوتے تھے۔ آخر آپ ﷺ نے ایک روز دعا کی (کہ اللہ اس جادو کا اثر زائل کر دے) پھر فرمانے لگے: "عائشہ رضی اللہ عنہا! تجھے معلوم ہو کہ اللہ نے مجھے وہ تدبیر بتا دی جس سے مجھے اس تکلیف سے شفا ہو جائے۔ ہوا یہ کہ (خواب میں) دو آدمی میرے پاس آئے۔ ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پائنتی کی طرف۔ ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا: "اس شخص کو کیا تکلیف ہے؟" دوسرے نے کہا اس پر جادو کیا گیا ہے" پہلے نے پوچھا: "کس نے جادو کیا ہے؟" دوسرے نے جواب دیا: "لبید بن اعصم (یہودی) نے" پہلے نے پوچھا: "کس چیز میں جادو کیا؟" دوسرے نے جواب دیا۔ "کنگھی اور آپ کے بالوں اور نر کھجور کے خوشے کے پوست میں" پہلے نے پوچھا: "یہ کہاں رکھا ہے؟" دوسرے نے جواب دیا: "ذروان کے کنوئیں میں" غرض آپ ﷺ اس کنوئیں پر تشریف لے گئے جب وہاں سے پلٹے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "اس کنوئیں کے درخت ایسے ڈراؤنے ہو گئے تھے جیسے ناگوں کے پھن ہوں" سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے اس کو (یعنی جادو کے سامان کو) نکالا کیوں نہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ نے اچھا کر دیا۔ اب میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ لوگوں میں ایک جھگڑا کھڑا کر دوں" پھر وہ کنواں مٹی ڈال کر بھر دیا گیا۔ (بخاری۔ کتاب بدء الخلق باب صفة ابلیس و جنوده) اور بخاری کی دوسری روایت جو کتاب الادب میں مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اکیلے نہیں بلکہ چند صحابہ کے ساتھ اس کنوئیں پر گئے تھے اور آپ ﷺ نے وہ جادو کی اشیاء کنوئیں

سے لٹکوائی تھیں نیز یہ کہ اس کنوئیں کا پانی جادو کے اثر سے مہندی کے رنگ جیسا سرخ ہو گیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب الادب، باب ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان) اور بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) لبید بن اعصم ایک ماہر جادوگر تھا۔

۲۔ لبید کی دو لڑکیاں بھی جادوگری کے فن میں ماہر تھیں۔ ان لڑکیوں نے ہی کسی طریقہ سے آپ ﷺ کے سر کے بال حاصل کر کے ان میں گرہیں لگائی تھیں۔

۳۔ ذروان کنوئیں سے جو اشیاء برآمد کی گئیں۔ ان میں کنگھی اور بالوں میں ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور ایک موم کا پتلا تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں۔ جبریل نے آ کر بتایا کہ آپ ﷺ معوذتین پڑھیں۔ چنانچہ آپ ﷺ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں کیونکہ ان دونوں سورتوں کی گیارہ ہی آیات ہیں۔ اور ساری سوئیاں نکل گئیں اور آپ جادو کے اثر سے نکل کر یوں آزاد ہو گئے جیسے کوئی بندھا ہوا شخص کھل گیا ہو۔

۴۔ لبید بن اعصم کو پوچھا گیا تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا مگر آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

ان احادیث پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ نبی پر جادو نہیں ہو سکتا یعنی اگر کوئی کرے بھی تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نبی پر جادو کا اثر ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ فرعون کے جادوگروں نے جب ہزارہا لوگوں کے مجمع میں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں اور وہ سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو اس دہشت کا اثر موسیٰ علیہ السلام کے دل پر ہو گیا تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى﴾ (۲۰:۶۷،۶۸) موسیٰ علیہ السلام اپنے دل میں ڈر گئے تو ہم نے (بذریعہ وحی) کہا: موسیٰ علیہ السلام ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے۔

❁ **چند اعتراضات اور ان کے جواب:۔** دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر نبی پر جادو کا اثر تسلیم کر لیا جائے تو شریعت سازی کی ساری ناقابل اعتماد ٹھہرتی ہے۔ کیا معلوم کہ نبی کا فلاں کام وحی کے تحت ہوا تھا یا جادو کے زیر اثر؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ ۷ھ میں (جنگ خیبر اور صلح حدیبیہ کے بعد) پیش آیا۔ جبکہ یہودی ہر میدان میں پٹ چکے تھے۔ پہلے خیبر کے یہود ایک سال جادو کرتے رہے جس کا خاک اثر نہ ہوا۔ پھر وہ مدینہ میں لبید بن اعصم کے پاس آئے جو سب سے بڑا جادوگر تھا اور اس کی بیٹیاں اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔ انہوں نے بڑا سخت قسم کا جادو کیا۔ اس کا بھی چھ ماہ تک آپ ﷺ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بعد میں اس کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ تاہم اس کا اثر محض آپ کے ذاتی افعال تک محدود تھا۔ یعنی آپ یہ سوچتے کہ میں فلاں کام کر چکا ہوں جبکہ کیا نہیں ہوتا تھا۔ یہ: ہی کوفت آپ کو چالیس دن تک رہی۔ بعد میں اللہ نے آپ ﷺ کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا اور آپ ﷺ شفایاب ہو گئے۔ اب دیکھیے یہ بات واضح ہے کہ اس وقت تک قرآن نصف سے زیادہ نازل ہو چکا تھا۔ اہل عرب اس وقت دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک مسلمان اور ان کے حلیف، دوسرے مسلمانوں کے مخالفین، اگر اس دوران آپ ﷺ پر جادو کا اثر شریعت میں اثر انداز ہوتا، یعنی کبھی آپ ﷺ نماز ہی نہ پڑھاتے۔ یا ایک کے بجائے دو بار پڑھا دیتے یا قرآن کی آیات خلط ملط کر کے یا غلط سلط پڑھ دیتے یا کوئی اور کام منزل من اللہ شریعت کے خلاف آپ ﷺ سے سرزد ہو جاتا تو دوست دشمن سب میں یعنی پورے عرب میں اس کی دھوم مچ جاتی۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں ایک بھی ایسی روایت نہیں ملتی جس

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝

اور حاسد کے شر سے جب[۶] وہ حسد کرے۔(۵)

میں یہ اشارہ تک بھی پایا جاتا ہو کہ اس اثر سے آپ ﷺ کے شرعی اعمال وافعال میں کسی حرج واقع ہوا ہو۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ کفار کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ انبیاء کو یا تو جادوگر کہتے تھے اور یا جادو زدہ (مسحور)۔اب اگر ہم خود ہی آپ ﷺ پر جادو اور اس کی اثر پذیری تسلیم کرلیں تو گویا ہم بھی کفار کے ہم نوا بن گئے۔ یہ اعتراض اس لیے غلط ہے کہ کفار کا الزام یہ ہوتا تھا کہ نبی نے اپنی نبوت کے دعویٰ کا آغاز ہی جادو کے اثر کے تحت کیا ہے اور جو کچھ یہ قیامت، آخرت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے افسانے سناتا ہے۔ یہ سب کچھ جادو کا اثر یا پاگل پن کی باتیں ہیں۔ گویا وہ نبوت اور شریعت کی تمام تر عمارت کی بنیاد جادو قرار دیتے تھے لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ واقعہ آپ ﷺ کی نبوت کے بیس سال بعد پیش آتا ہے جبکہ آدھا عرب آپ ﷺ کی نبوت اور احکام شریعت کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان رکھتا تھا۔ پھر یہ واقعہ احکام شریعت پر چنداں اثر انداز بھی نہیں ہوا البتہ اس واقعہ سے اس کے برعکس یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔ کہ آپ ہرگز جادوگر نہ تھے۔ کیونکہ جادوگر پر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔

[۶] حَسَدَ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نعمت، فضیلت، عزوشرف عطا کیا ہو تو اس پر کوئی دوسرا شخص اس سے جلے اور یہ چاہے کہ اس سے یہ نعمت چھن کر حاسد کو مل جائے یا کم از کم اس سے ضرور چھن جائے۔ البتہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس جیسی نعمت مجھے بھی اللہ عطا کردے تو یہ حسد نہیں بلکہ رشک ہے جسے عربی زبان میں (غِبطة) کہتے ہیں اور یہ جائز ہے۔ حاسد سے پناہ اس صورت میں مانگی گئی ہے جب وہ حسد کرے اور حسد کی بنا پر کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ اس سے پہلے وہ محسود کے لیے ایسا شر نہیں بنتا کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔ وہ اپنے طور پر اندر ہی اندر جلتا ہے تو جلتا رہے۔ اسے اپنے اس عمل کی یہی سزا کافی ہے۔

سورۃ الناس مکیۃ ۶ آیاتھا رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١ مَلِكِ النَّاسِ ۝٢ إِلَٰهِ النَّاسِ ۝٣ مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝٤
الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦

ع ۱ / ۲۹

کلمات ۲۰ آیات ۶ (۱۱۴) سورۃ الناس مکی ہے (۲۱) رکوع ۱ حروف ۷۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

آپ کہیے کہ: میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں (۱) جو لوگوں کا بادشاہ ہے (۲) جو لوگوں کا الٰہ [۱] ہے (۳) اس وسوسہ [۲] ڈالنے والے کے شر سے جو (وسوسہ ڈال کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے (۴) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا رہتا ہے (۵) خواہ وہ جنوں [۳] سے ہو یا انسانوں سے (۶)

[۱] ❁ شیطان کے شر سے پناہ دینے والے کی صفات:۔ اس سورت کی ابتدائی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات بیان کر کے اس سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ وہ تمام لوگوں کا پرورش کرنے والا ہے۔ اسے یہ خوب معلوم ہے کہ فلاں شخص کے فلاں شر سے فلاں انسان کو کیا تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ تمام انسانوں کا بادشاہ بھی ہے۔ یعنی وہ انسانوں پر پورا اقتدار اور اختیار بھی رکھتا ہے اور ظاہری اسباب پر بھی اس کا پورا کنٹرول ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ الٰہ بھی ہے۔ اور الٰہ کے مفہوم میں یہ بات از خود شامل ہے کہ وہ ہر ایک کی فریاد سنتا اور اس کی دادرسی بھی کر سکتا ہے اور تمام باطنی اسباب پر بھی اس کا کنٹرول ہے۔ اور حقیقت میں ایسی ہی ہستی اس بات کی سزاوار ہو سکتی ہے کہ لوگ اس سے دوسروں کے شر سے پناہ طلب کریں۔ وہ پناہ دے بھی سکتا ہے اور دوسروں کے شر سے محفوظ بھی رکھ سکتا ہے۔

[۲] ❁ خناس کا لغوی مفہوم:۔ وَسْوَاس طبی نقطہ نگاہ سے یہ ایک مرض ہے جسے وہم بھی کہتے ہیں۔ یہ مرض غلبہ سودا کی وجہ سے ذہن کو ماؤف کر دیتا ہے اور انسان ایسی فضول باتیں کرنے لگتا ہے جو پہلے اس کے ذہن میں نہیں ہوتیں۔ دل میں آنے والی برائی اور بے نفع بات اور شرعی نقطہ نگاہ سے اس کا معنی شیطان کا کسی برے کام کی طرف راغب کرنا اور برے خیال دل میں ڈالتے رہنا اور اس کی نسبت صرف شیطان کی طرف ہوتی ہے۔ جس کی ایک صفت خنّاس ہے اور خنّاس شیطان ہی کا صفاتی نام ہے۔ خنّاس بمعنی ظاہر ہو کر چھپ جانے والا یا سامنے آ کر پھر پیچھے ہٹ جانے والا۔ شیطان کا یہ عمل صرف ایک بار ہی نہیں ہوتا بلکہ بار بار ہوتا ہے۔ وَسْوَس کے لفظ میں تکرار لفظی ہے جو تکرار معنوی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ شیطان ایک بار وسوسہ ڈال کر چھپ جاتا ہے۔ پھر دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے پھر چھپ جاتا ہے تاآنکہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

[۳] ❁ شیطان، انسان یا نفس بھی ہو سکتا ہے جو وسوسے ڈالتا ہے:۔ الجِنَّۃ: انسان کے علاوہ دوسری مکلف مخلوق جن ہے۔

جنوں میں سے کچھ نیک اور صالح بھی ہوتے ہیں اور کچھ خبیث، موذی اور بدکردار بھی۔ اس دوسری قسم کو شیطان کہتے ہیں۔ پھر شیطان کے لفظ کا اطلاق ہر موذی چیز، سرکش اور نافرمان پر بھی ہونے لگا خواہ انسان ہو یا جن یا کوئی جانور۔ مثلاً سانپ کو اس کی ایذا دہی کی وجہ سے شیطان اور جن اور جانّ (۲۷:۱۰) کہتے ہیں۔ پھر یہ شیطان یا خنّاس صرف جن اور انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ انسان کا اپنا نفس بھی وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾ (۵۰:۱۶) چنانچہ آپ ﷺ ایک دفعہ مسجد نبوی میں اعتکاف بیٹھے تھے کہ رات کو آپ کی زوجہ محترمہ صفیہ بنت حیی آپ ﷺ کے پاس ملنے کے لیے آئیں۔ آپ ﷺ انہیں الوداع کرنے کے لیے ساتھ گئے۔ رستہ میں دو انصاری آدمی ملے آپ ﷺ نے انہیں بلایا اور فرمایا کہ یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہے۔ وہ کہنے لگے۔ "سبحان اللہ" (یعنی آپ ﷺ پر کون شک کر سکتا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: "اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنْ ابْنِ اٰدَمَ مَجْرَی الدَّمِ" (بخاری، کتاب الاحکام۔ باب الشھادۃ تکون عند الحاکم۔۔۔) یعنی شیطان ہر انسان میں خون کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔ اس حدیث کی رو سے بھی انسان کے اپنے نفس کو بھی شیطان کہا گیا ہے۔ نیز آپ ﷺ کے خطبہ مسنونہ کے یہ مشہور و معروف الفاظ ہیں۔ "وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا" یعنی ہم اپنے نفوس کی شرارتوں اور وسوسوں سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

❁ معوذات سے دم جھاڑ کرنا مسنون ہے:۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو معوذتین کہتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ سورہ اخلاص کو بھی ملا لیا جائے تو انہیں معوذات کہتے ہیں۔ اور آپ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ اکثر یہ سورتیں پڑھ کر پہلے اپنے ہاتھوں پر پھونکتے پھر ہاتھوں کو چہرہ اور جسم پر پھیرا کرتے تھے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے بھی واضح ہوتا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مرض الموت میں معوذات پڑھ کر اپنے اوپر پھونکتے۔ پھر جب آپ ﷺ کی بیماری میں شدت ہوئی تو میں معوذات پڑھ کر آپ ﷺ پر پھونکتی اور اپنے ہاتھ کے بجائے برکت کی خاطر آپ ہی کا ہاتھ آپ کے جسم پر پھراتی۔ معمر نے کہا: میں نے زہری سے پوچھا (یہ دونوں اس حدیث کی سند کے راوی ہیں) کہ کیونکر پھونکتے تھے۔ انہوں نے کہا: دونوں ہاتھوں پر دم کر کے ان کو منہ پر پھیرتے (بخاری۔ کتاب الطب و الرقیٰ۔ باب الرقی بالقرآن والمعوذات)

❁ تعویذ لکھ کر پلانا یا لٹکانا سب ناجائز اور بدعت ہے:۔ واضح رہے کہ دم جھاڑ کے سلسلے میں مسنون طریقہ یہی ہے کہ قرآن کی کوئی آیت یا آیات یا مسنون دعائیں پڑھ کر مریض پر دم کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ جتنے طریقے آج کل رائج ہیں۔ مثلاً کچھ عبارت لکھ کر یا خانے بنا کر اس میں ہندسے لکھ کر اس کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکانا۔ یا گھول کر پانی پلانا یا بازو یا ران پر باندھنا سب ناجائز ہیں۔ بلکہ اگر قرآنی آیات یا مسنون دعائیں بھی لکھی جائیں جن میں شرک کا شائبہ تک نہ ہو تب بھی یہ خلاف سنت، بدعت اور ناجائز ہیں۔ اور ہم انہیں بدعت اور ناجائز اس لیے کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس طرح تعویذ لکھنے لکھوانے کو اچھا سمجھتے تو اس دور میں بھی لکھوا سکتے تھے اور اس میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ لہٰذا ایسے سب طریقے ناجائز اور خلاف سنت ہیں اور بدعت کی تعریف میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چوتھی جلد تمام ہوئی اور قرآن مجید کی یہ تفسیر "تیسیر القرآن" مکمل ہوئی۔

سرٹیفکیٹ

میں نے اس تفسیر کے متن' ترجمہ' حاشیہ کو اپنی مقدور بھر
کوشش کے مطابق حرفاً حرفاً پڑھا ہے اور میں تصدیق کرتا ہوں
کہ اس میں اب کوئی غلطی نہیں ہے۔ ان شاء اللہ

پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی
خریج جامعہ الملک سعود۔ الریاض

قارئین سے گزارش!

قارئین سے بصد ادب گزارش ہے کہ ہم نے اس ترجمہ اور تفسیر کو غلطیوں سے مبرا تیار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی بشری لغزش کی بنا پر آپ اس میں کسی جگہ کوئی کوتاہی یا غلطی محسوس کریں تو اولین فرصت میں ہمیں اس کی اطلاع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جا سکے۔ اگر آپ کو کسی طباعتی کوتاہی کی بنا پر غلط نسخہ ملا ہو تو بھی ہم سے رابطہ کر کے اس کو تبدیل کروا سکتے ہیں۔

ہم علمائے کرام سے بھی اس سلسلے میں علمی تعاون اور کسی تسامح کی نشاندہی کی گزارش کرتے ہیں۔

ناشر: مکتبہ السلام

تیسیر القرآن

قرآنی علوم ومعارف کی خدمت کا اولین اعزاز عربی زبان کے مفسرین کرام کو حاصل ہے۔

عربی زبان کے بعد یہ سعادت اردو زبان کے حصے میں آئی۔ تراجم وتفاسیر کا جو عظیم الشان ذخیرہ بیسویں صدی میں اردو زبان میں پیش کیا گیا وہ اپنی علمیت' افادیت اور وسعت کے اعتبار سے گزشتہ تمام صدیوں پر بھاری ہے۔ ہر چند اس عہد کی بعض اردو تفاسیر میں تفسیر ماثور کے منہج اور اسلوب سے انحراف بھی دکھائی دیتا ہے جس کے باعث ذہن میں انتشار اور قلب میں اضطراب رہتا ہے۔

فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید سے ایک خصوصی شغف عطا کیا تھا۔ آپ بیک وقت کاتب قرآن' مترجم قرآن' محشی قرآن اور مفسر قرآن کے منصب جلیل پر فائز دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مبارک زندگی میں پچاس سے زائد قرآن مجید کے نسخوں کی کتابت کا شرف حاصل کیا۔ نیز اہم ترین علمی' دینی' تاریخی' معاشی' معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر لکھتے رہے مگر حق تعالیٰ نے ان کی زندگی کے انتہائی آخری حصے میں ان سے جو کام لیا وہ تفسیر قرآن کی تکمیل ہے جو "تیسیر القرآن" کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔

مولانا کیلانی کی یہ تفسیر بیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر اردو زبان میں سلفی منہج اور تفسیر ماثورہ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ آیات قرآنی کی تشریح وتفسیر میں قرآن مجید کی آیات کے علاوہ صحیح احادیث سے مدد لی گئی ہے۔ عصر حاضر میں جو مسلکی تعصب نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ تفسیر اس شدت اور افراط وتفریط میں ایک راہ اعتدال کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ طالبان حق کے لیے قرآن مجید کی یہ تفسیر ایک محکم استدلال اور موزوں اسلوب کی حامل ہے۔ اس کے ترجمہ میں معانی کو مجروح کیے بغیر سلاست دکھائی دیتی ہے۔ تفسیر میں ایک عام فہم اسلوب کے باعث یہ کوشش علمائے کرام' خطیب حضرات اور عامۃ الناس کے لیے یکساں افادیت کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ مفسر مرحوم کی اس کاوش کو مقبول اور مسلمانوں کے علم وعمل کے لیے نافع بنائے۔ (آمین)

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈائریکٹر بیت الحکمت لاہور

تیسیر القرآن

قرآنی علوم ومعارف کی خدمت کا اولین اعزاز عربی زبان کے مفسرین کرام کو حاصل ہے۔ عربی زبان کے بعد یہ سعادت اردو زبان کے حصے میں آئی۔ تراجم وتفاسیر کا جو عظیم الشان ذخیرہ بیسویں صدی میں اردو زبان میں پیش کیا گیا وہ اپنی علمیت' افادیت اور وسعت کے اعتبار سے گذشتہ تمام صدیوں پر بھاری ہے۔ ہر چند اس عہد کی بعض اردو تفاسیر میں تفسیر ماثور کے منہج اور اسلوب سے انحراف بھی دکھائی دیتا ہے جس کے باعث ذہن میں انتشار اور قلب میں اضطراب رہتا ہے۔

فضیلۃ الشیخ مولانا عبد الرحمٰن کیلانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید سے ایک خصوصی شغف عطا کیا تھا۔ آپ بیک وقت کاتب قرآن' مترجم قرآن' محشی قرآن اور مفسر قرآن کے منصب جلیل پر فائز دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مبارک زندگی میں پچاس سے زائد قرآن مجید کے نسخوں کی کتابت کا شرف حاصل کیا۔ نیز اہم ترین علمی' دینی' تاریخی' معاشی' معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر لکھتے رہے مگر حق تعالیٰ نے ان کی زندگی کے انتہائی آخری حصے میں ان سے جو کام لیا وہ تفسیر قرآن کی تکمیل ہے جو ''تیسیر القرآن'' کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔

مولانا کیلانی کی یہ تفسیر بیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر اردو زبان میں سلفی منہج اور تفسیر ماثورہ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ آیات قرآنی کی تشریح وتفسیر میں قرآن مجید کی آیات کے علاوہ صحیح احادیث سے مدد لی گئی ہے۔ عصر حاضر میں جو مسلکی تعصب نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ تفسیر اس شدت اور افراط وتفریط میں ایک راہ اعتدال کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ طالبان حق کے لیے قرآن مجید کی یہ تفسیر ایک محکم استدلال اور موزوں اسلوب کی حامل ہے۔ اس کے ترجمہ میں معانی کو مجروح کئے بغیر سلاست دکھائی دیتی ہے۔ تفسیر میں ایک عام فہم اسلوب کے باعث یہ کوشش علمائے کرام' خطیب حضرات اور عامۃ الناس کے لیے یکساں افادیت کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ مفسر مرحوم کی اس کاوش کو مقبول اور مسلمانوں کے علم وعمل کے لیے نافع بنائے۔ (آمین)

پروفیسر عبد الجبار شاکر
ڈائریکٹر بیت الحکمت لاہور

12 ستمبر 2000ء